

# نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

۶۹	فہرست مضامین جنوری، فروری ۱۹۵۶ء	شمارہ ۱-۲
----	---------------------------------	-----------

۹	کا آغاز و ارتقاء
۱۴	اقوام کا مذہب
۱۷	تاریخ کا مذہب
۲۰	حق کا مذہب
۲۳	پیم کا مذہب
۲۸	فنیقی مذاہب
۳۲	کا مذہب
۳۴	مذہب
۴۰	مذہب
۴۳	فی قوم کا مذہب
۴۵	کا مذہب
۴۶	امیکہ کے مذاہب
۴۹	رد مذہب
۵۲	ن مذہب
۵۴	ہ مذہب
۵۷	ین کے مذاہب
۶۱	ایان کا مذہب
۸۳	برانی مذاہب
۸۹	ہودی مذہب
۱۰۳	یسوی مذہب
۱۱۳	ربیب اسلام
۱۲۰	مافقہ اسلام
۱۲۶	تصوٹ اسلام
۱۳۵	عقلیت کا عروج

# کتابیات ۱۶۸

جن انگریزی کتابوں سے مدد لی گئی ہے، ان میں خاص خاص کا نام درج کیا جاتا ہے، غیر انگریزی کتابوں کے حوالے فٹ نوٹ کی صورت میں ہر مضمون کے ساتھ درج کر دیئے گئے ہیں۔

GRANT ALLEN	EVOLUTION OF THE IDEA OF GOD.
JAMES HASTINGS	ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION & ETHICS.
JOSEPH MCCABE	A RATIONALIST ENCYCLOPAEDIA.
FUNK & WAGNALL	STANDARD DICTIONARY OF FOLKLORE, MYTHOLOGY & LÉGENDE.
C. P. TIELE	OUTLINES OF THE HISTORY OF RELIGION
DR. A. CHURCHWARD	ORIGIN & EVOLUTION OF RELIGION.
JOSEPH. GAER	HOW THE GREAT RELIGIONS BEGAN.
LIFE MAGAZINE (1955)	THE WORLD'S GREAT RELIGIONS.
R.A. GREGORY	RELIGION IN SCIENCE & CIVILIZATION.
A.C. BOQUET	COMPARATIVE RELIGION.
BHAGAVAN DAS	THE ESSENTIAL UNITY OF ALL RELIGIONS
RADHA KRISHNAN	HISTORY OF EASTERN & WESTERN, PHILOSOPHY.
M. HIRIYANNA	THE ESSENTIALS OF INDIAN PHILOSOPHY
SWAMI ABHEDANAND	DIVINE HERITAGE OF MAN.
M. J. MORGAN	PREHISTORIC MAN.
A. HYATT VERRILL	OLD CIVILIZATIONS OF THE NEW WORLD
C. HUART	ANCIENT PERSIA & IRANIAN CIVILIZATION.
GEORGE RAWLINSON	PHOENICIA.
W. A. CRAIGIE	RELIGION OF ANCIENT SCANDINAVIA.
B. ANWYL	CELTIC RELIGION.
CHARLES SELTMAN	THE TWELVE OLYMPIANS.
W. G. ASTON	SHINTO: THE RELIGION OF JAPAN.
LUZAC	ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM.
MOHD. ALI	THE RELIGION OF ISLAM.
A. GUILLAUME	ISLAM (PELICAN SERIES)
J. A. SUBHAN	SUFISM: ITS SAINTS & SHRINES.

## ہنگار کا قرآن نمبر

جو تالیف تھا اس کے دو نسخے مل گئے ہیں اور اب معہ محصول پانچ روپیہ میں مل سکتا ہے۔

## رعایتی اعلان

من ویزدوں — مذہبی استفسارات و جوابات — جماعتان — ہنگارستان — شہوانیات —  
 مکتوبات نیازتین حصے — انتقادات — حسن کی عیاریاں — مالہ و ماعلیہ — شہاب کی سرگزشت —  
 فلاسفہ قدیم — مذاکرات نیاز — فراموش الہد — مذہب — نقاب اٹھ جانے کے بعد —

تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول مرٹ چالیش روپے میں مل سکتی ہیں۔

## ہنگار کے پچھلے فائل

ع ۳۱	=	جولائی تا دسمبر	=	(سالنامہ ہندی شاعری)	=	ع ۳۱
ع ۳۲	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ اصحابِ کتب و خلافت نمبر)	=	ع ۳۲
ع ۳۳	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ مصحفی نمبر)	=	ع ۳۳
ع ۳۴	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ نظیر نمبر)	=	ع ۳۴
ع ۳۵	=	جولائی تا دسمبر	=	(سالنامہ انتقادات نمبر)	=	ع ۳۵
ع ۳۶	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ ماحدولین نمبر)	=	ع ۳۶
ع ۳۷	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ افسانہ نمبر)	=	ع ۳۷
ع ۳۸	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ تنقید نمبر)	=	ع ۳۸
ع ۳۹	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ حسرت نمبر)	=	ع ۳۹
ع ۴۰	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ داغ نمبر)	=	ع ۴۰

نوٹ: ۱۔ صرف ایک ایک قابل موجود ہے اور سب سے پہلے جس کا آرڈر پہنچے گا اسی کو دیا جائے گا۔ قیمت محصول ہنگ کے علاوہ۔

## ”نگار“ کے پچھلے تین سالنامے

سالنامہ ۳۱	جس میں علم ”فرست التحریر“ کے اصول پیش کئے گئے تھے اور جن کو دیگر کتاب ایک شخص کا سوا خطا دیکھ کر اس کے لیکچر کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ صرف ایک کاپی باقی ہے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول
سالنامہ ۳۲	اس میں ”ڈراما اصحاب کہف“ اڈیٹر کے قلم سے پورا شایع ہوا ہے اور خلافت و امامت کے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز ہوا ہے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول
سالنامہ ۳۳	اس میں ”تاریخ اسلامی“ کے عہد خلافت و امامت پر مختصر بحث کی گئی ہے جس کی ابتداء ۳۳۵ میں ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

### گہائے جعفری

ینے

جناب اشرف لکھنوی کے ڈیڑھ سو اشعار

جو اڈیٹر نگار نے اپنے تعارفی مقدمہ کے ساتھ بہت اہتمام سے شائع کئے تھے اس کی چند جلدیں اتفاق سے رو گئی ہیں۔ ہر کے ٹکٹ ۱۰ پر انتخاب ذریعہ پوسٹ مل سکتا ہے۔

### فلسفہ مذہب

مولوی مقبول احمد صاحب کی وہ ہنگامہ خیز تصنیف جس نے علماء اسلام کی ”کافر ساز“ مجالس میں پھیل ڈال دی تھی اس میں مذہب کی ابتداء و ضرورت، مذہب، قومیت، قومیت و الہیات، مذہب و نبوت، مذہب و تکوین، مذہب و معاد، مذہب و تقریر، مذہب و اخلاق، مذہب و عبادات اور انجام مذاہب پر نہایت محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت تین روپیہ

### توقیت

تاریخ اسلامی ہند کے سلسلہ میں اڈیٹر نگار نے یہ توقیت مرتب کی تھی جس میں ۱۹۳۷ء تک کے تمام اہم تاریخی واقعات اہم شخصیات کی کہنے گئے ہیں تاریخ کے طلبہ کے لئے بڑی کارآمد چیز ہے۔ قیمت ایک روپیہ

### ملک خطا کے شہزادے

وصی احمد بلگرامی کا وہ مشہور مقالہ جس میں انھوں نے اپنے مخصوص انداز بیان میں مسئلہ تحریر مولانا شبلی مرحوم کی تحریر پر اعتراض کیا تھا اور اڈیٹر نگار نے اس پر تبصرا کیا تھا۔ قیمت بارہ آنے

### عورت اور اسلام

ڈاکٹر رام صاحب ایم اے کی مشہور کاوش کا نتیجہ ہے جس میں انھوں عورت کی زندگی کے ہر پہلو پر اسلامی نقطہ نظر سے گفتگو کی ہے قیمت تین روپیہ

### مرثیہ نگاری اور میر انیس

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا بسیط مقالہ جس میں جدید اصول نقد پر مشتمل مرثیہ نگاری سے بالکل نئے زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے نگار

### قول فیصل

جس میں ملک کے مشہور مفکر و بلند خیال شاعر علی اختر حیدر آبادی نے ثابت کیا ہے کہ انسان لاکھ ترقی کرے کتنی ہی عقل و فراست کام لے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کو خدا کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ فنی جمہیت سے اختر کا یہ بڑا بد دوست کارنامہ ہے۔ ثبوت میں آگیا۔ شروع میں حضرت نماز فقیر کوئی کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ کاغذ و پیر و ڈیڑھ سو روپے رنگین۔ قیمت دو روپے۔ ایکسپریس ریکارڈ۔ سوم۔ معہ محصول دو روپیہ۔

# بعض کمیاب کتابیں

فتہی الارباب دو جلدیں کامل	۱۰۰	شعوی تمدن	ابوالفیض فیضی	۱۰۰
القاموس چہار حصص	۱۰۰	شعوی غنیمت	محمد اکرام	۱۰۰
تاج المصادر	۱۰۰	شعوی مخزن الاسرار	شیخ نظامی گنجوی	۱۰۰
کشاف اصطلاحات الفنون	۱۰۰	دیوان ظہیر	حکیم ظہیر قاریابی	۱۰۰
شاہنامہ	۱۰۰	کلیات اسمعیل	اسمعیل اصفہانی	۱۰۰
جہانگیر نامہ	۱۰۰	دیوان ناصر علی سرہندی		۱۰۰
تاریخ فرشتہ ۲ حصے	۱۰۰	دیوان صائب	محمد علی صائب	۱۰۰
فضائل السعادت تاریخ و نسب نامہ افافنہ	۱۰۰	کلیات صائب	محمد علی	۱۰۰
آئین اکبری مصورہ حصص ابو الفضل فیضی	۱۰۰	شرح شادانی قصاید خاقانی		۱۰۰
تاریخ جہانگشاہ نادر صوری مصور	۱۰۰	کلیات سعدی	شیخ مصلح الدین سعدی	۱۰۰
سکندر نامہ مصور	۱۰۰	بیلی مجنوں نظامی	مولانا نظامی	۱۰۰
وقایع نعمت خان عالی انشائے حسن و عشق	۱۰۰	دیوان عرفی	جمال الدین عرفی	۱۰۰
درہ نادرہ	۱۰۰	دیوان بلالی محشی	بلالی	۱۰۰
تاریخ گلستان ہند مصور	۱۰۰	دیوان قصاید عنقری	حکیم ابوالقاسم	۱۰۰
تاریخ جامع التواریخ	۱۰۰	سبع سابل	عبدالواحد بلکزی	۱۰۰
اقبال نامہ جہانگیری سہ حصہ محمد شریف معتد خاں	۱۰۰	اخلاق محسنی	طاحین واعظ کاشفی	۱۰۰
سیر القاضین سہ حصہ	۱۰۰	مصطلحات الشعر و محشی خلاصہ بہار عجم		۱۰۰
کارنامہ جہدی	۱۰۰	غیاث اللغات	محمد غیاث الدین مطبوعہ ۱۳۲۵ھ	۱۰۰
حالات شہر سلطان مرتبہ شاہزادہ محمد سلطان	۱۰۰	برہان قاطع کشوری ۲ حصے کامل محمد حسین برہان		۱۰۰
مذکرہ نجوم السما	۱۰۰	تجلی شایگان معروف بہ کمال محمد رفیع تاریخ سکدحات مصور		۱۰۰
مذکرہ صبح گلشن	۱۰۰	حسن التواریخ	تاریخ صدیق اودھ نشتی رام سہائے تمنا	۱۰۰
مذکرہ دولت شاہ	۱۰۰	محل خاندہ شاہی	فدا علی تنجر حالات محلات و امجد علی شاہ	۱۰۰
مذکرہ آخر الکرام و فتر ثانی سر و آزاد	۱۰۰	تاریخ ڈھاکہ مصور	رحمان علی عطیش	۱۰۰
کلیات ظہیر حکیم ظہیر قاریابی	۱۰۰	آثار غالب	شیخ محمد اکرام	۱۰۰
قصاید عرفی محشی	۱۰۰	غالب	غلام رسول تہر	۱۰۰
دوسرے ذیل	۱۰۰	غالب	الحق حسین حالی	۱۰۰

نظیر عشق دیوان خلق - خواجہ اسد علی قلی - ..... لے	نغمہ زلی - شبلی نعمانی - ..... لے
آفتاب داغ - نواب مرزا خاں داغ - ..... لے	نذرہ کا طعن رام پور - احمد علی خاں - ..... لے
کلیات جعفر - مرتبہ محمد فرحت اللہ - میر جعفر زکری - ..... لے	نذرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی سید احمد قادری - ..... لے
دیوان حیدر علی - طباطبائی - ..... لے	حیات امیر خسرو - سعد احمد - ..... لے
مجموعہ قصاید مومن - مرتبہ ضیاء احمد - ..... لے	نذرہ آب بقا - عبدالرؤف عشرت - ..... لے
کلیات نظیر الکر آبادی - مرتبہ عبدالباری آسی - ..... لے	چند شعراء - ..... لے
ثنوی میر حسن - میر حسن - ..... لے	نذرہ الخواتین - عبدالباری آسی - ..... لے
ثنوی گلزار نسیم - پنڈت دیا سنگھ - ..... لے	نذرہ آب حیات - حسین آزاد - ..... لے
ثنوی زہر عشق - نواب مرزا - ..... لے	کلیات گارسان و ناسی - چند دستاوی زبان پر شائع کردہ کتب قیام الدین - ..... لے
مراثی میر انیس - جلد اول و دوم و سوم و چہارم - میر انیس - ..... لے	نذرہ ہندی - مصطفیٰ - ..... لے
مراثی میر انیس جلد ششم - مرتبہ میر عبدالحسین - ..... لے	دیوان میر حسن - میر حسن حق - ..... لے
دریائے لطافت - افشار اللہ خاں - ..... لے	مرآۃ الیوب - امیر احمد امیر - ..... لے
فساد عجائب - مرزا رجب علی بیگ سور - ..... لے	کلیات ناسخ - امام بخش ناسخ - ..... لے
رسالہ فن شاعری - مرزا سلطان احمد - ..... لے	مجموعہ قصاید و نغمہ ۱۳ عدد قصاید مع ترجمہ - ..... لے
تتبیح اللغات - ضامن علی جلال لغت قلمی - ..... لے	نذرہ - مرزا محمد ہادی عزیز - ..... لے
بحر الفصاحت - حکیم محمد نجم الغنی عروض و قوافی - ..... لے	دیوان رنگین و افشاء - رفیق کلام - ..... لے
موافقہ انیس و دو تیر - شبلی نعمانی - ..... لے	دیوان تان سخن - جلیل حسن خاں جلیل - ..... لے
فردوسی پر چار مقالے - محمود شیرانی - ..... لے	کلیات سودا - مرزا رفیع سودا - ..... لے
نذرہ آب بقا - عبدالرؤف عشرت - ..... لے	نظیر معانی دیوان مجروح - میر محمد حسین - ..... لے
رسائل شبلی - شبلی نعمانی تاریخی و علمی مضامین - ..... لے	آیات وجدانی - محمد غفرانیات مع شرح - ..... لے
عود ہندی - اسد اللہ خاں غالب خطوط - ..... لے	کلیات حسرت - فضل الحسن موہانی - ..... لے
نکچر دل کا مجموعہ ۲ جلد - شمس العلماء ڈاکٹر علیہ صاحب - ..... لے	کلیات مومن - مومن خاں دہلوی - ..... لے
تاریخ حبیب السیر غلام الدین بن ہمام الدین - ..... لے	کلیات میر - میر تقی میر - ..... لے
آفتاب داغ - نواب مرزا داغ - ..... لے	کلیات شرح کلام غالب - مرتبہ عبدالباری آسی - ..... لے
کلیات ظفر چہار دیوان - بہادر شاہ ظفر - ..... لے	کلیات لعل غالب شرح دیوان غالب - شارح مرزا سہا - ..... لے
	دیوان شکر گوت - دیوان نسیم محمد اصغر علی خاں - ..... لے

ان کتابوں پر کمیشن نہیں دیا جائے گا قیمتیں علاوہ محصول تک ہیں

منکار ہیکل کینسی لکھنؤ

## مذہب کا آغاز و ارتقاء

مذہب کیا ہے؟ — مذہب کی ایسی تعریف کرنا جو تمام مذاہب کے جملہ روحانی مقصدات پر حاوی ہو، بہت مشکل ہے۔ تاہم مذہب کا تصور یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ مذہب نام ہے انسان کے احساس بیچارگی اور کسی ایک یا متعدد اعلیٰ قوتوں کے اعتراف و پرستش کا۔ پھر مذہب نام صرف ذہنی احساس ہی کا نہیں بلکہ اس کے زیر اثر کردار و عمل کا بھی ہے جسے اصطلاح میں شعائر کہتے ہیں۔

مذہب اور اخلاق — بعض مذاہب نے اخلاقیات کو مذہب کا ضروری جزو قرار دیا ہے، لیکن دراصل یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص کسی اعلیٰ قوت کی پرستش نہ کرے لیکن پھر بھی وہ سماج کا ایک اچھا فرد ثابت ہو۔ مثلاً قدیم اہل یونان زنا کو برا سمجھتے تھے لیکن خود ان کے دیوتا بار بار اس کے مرتکب ہوئے تھے، اسی طرح بائبل کثرت ازدواج کی تائید کرتی ہے لیکن عیسائی ایک وقت ایک عورت سے زیادہ شادی نہیں کرتے۔

الہام یا ایجاد — ہر چند زندہ قدیم کے ہر مذہب نے الہامی ہونے کا دعویٰ کیا ہے لیکن اب اس خیال کے مؤیدوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے کہ مذہب خود انسان کی ایجاد ہے۔

ابتدائی مذہبیت — اگر نظریہ ارتقاء صحیح ہے (اور اُس کے غلط ہونے کی کوئی وجہ نہیں) تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس وقت انسان پیدا ہوا تو وہ مذہب کے تصور سے بالکل خالی الذہن تھا اور جانوروں کی طرح وہ بھی کسی شے کی پرستش نہ کرتا تھا، لیکن چونکہ غور و فکر انسان کی فطری ذلیلت ہے، اس لئے اول اول جب اسے مناظر فطری و حوادث طبیعی سے واسطہ پڑا ہوگا تو ضرور اس نے سمجھنے کی کوشش کی ہوگی کہ پہاڑوں کی آتش فشانی، طوفان برق و باد، دریاؤں کی طغیانی، سردی کی شدت، آفتاب کا طلوع و غروب کب سے ہے، وہ ذہنی و جسمانی حیثیت سے ان تمام باتوں سے متاثر ہوتا ہوگا، سو دو زبان کا سوال بھی اس کے سامنے آتا ہوگا اور عملی طور پر اس نے دفع ضرر کی کوشش کی ہوگی اور غالباً اسی سلسلہ کی ابتدائی چیزوں میں آگ کا انکشاف بھی تھا جس کی اسے سخت ضرورت تھی اور اس طرح سرد ممالک میں آگ کی پرستش شروع ہو گئی، اسی کے ساتھ جب وہ کاشتکارانہ زندگی بسر کرنے کے لئے پانی برسائے والے آسمان کو امید و بیم کی نگاہوں سے دیکھنے لگا، تو اپنی بیچارگی اور کسی دوسری عظیم قوت کے وجود کا احساس اس میں اور زیادہ قوی ہو گیا۔

روح کا انکشاف — مناظر خلوت کو دیکھ کر قدیم انسان پر مختلف قسم کے جذبات طاری ہوتے تھے، لیکن وہ بنی مابیت کو نہ سمجھ سکا تھا اپنے جسم کی حفاظت، غذا کی فراہمی اور جنسی جذبات کی تسکین کے بعد جس چیز نے اُس کے دماغ کو پریشان کیا وہ اپنے کسی عزیز کی موت تھی وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ کیا چیز تھی، جو اس شخص میں بولتی تھی اور کیا تھی جسے جو اس کے اعضاء کو جنبش دیتی تھی کہ اب اُس کے نکل جانے کے بعد نہ تو وہ بولتا ہے اور نہ اپنے جسم کو حرکت دے سکتا ہے۔

پھر جب انسان نے اپنے اعزہ و اقربا کو خواب میں دیکھا تو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ ضرور اب بھی کسی نہ کسی طرح زندہ ہیں۔ اگرچہ اپنی کا جسم فنا ہو گیا لیکن روح باقی ہے، جو ہے تو ہوا کے مثل لیکن اپنی قدیم حالت پر قائم ہے اور اسے اب بھی ضروریات زندگی کی حاجت ہے۔ اس خیال کی بنا پر مردہ کے ساتھ ساتھ اُس کا سارا سامان بھی دفن کیا جانے لگا۔

اسلاف و اکابر پرستی — مردوں کے ساتھ اُس کا سامان دفن کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کہیں وہ اپنے سامان کے لئے زندوں کو

ریشان نہ کریں، انسان خالی ہاتھ آتا ہے اور خالی ہاتھ جاتا ہے، یہ مقولہ بعد کا ہے، پہلے تو لوگ اپنا سارا ساز و سامان ساتھ لے جایا کرتے تھے بلکہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ جس غار یا گھر میں موت ہو جاتی تھی تو لوگ اُسے چھوڑ کر جھاگ جایا کرتے تھے کہ کہیں ایسا دھوکہ نہ مارے جائے کہ روح یا اس کا انفرادی جہت زندوں کو پریشان کرے۔

نذرہ کا زندگی میں جس شخص کی زیادہ عزت ہوتی تھی، مرنے کے بعد بھی، اُس کے مرتبہ کا امتیاز باقی رکھا جاتا تھا۔ سردار قبیلہ، ساحیل، جادو نذرہ بگروں اور بادشاہوں کی رو میں بہت بڑی رو میں تھیں۔ لہذا انھیں خوش کرنے کے لئے بہت کچھ کیا جاتا تھا، یہاں تک کہ ان میں سے بعض کو حیات دیتا یا خدا سمجھا جانے لگا۔

نذرہ تمدن ہرکستی (Animism) - اس کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ جس طرح انسان و حیوان میں روح موجود ہے، اُسی طرح چندہ نظام ہرکستی میں ارواح کے حامل ہیں، کیونکہ بغیر اس کے آفتاب کی حرکت، بجلی کی چمک اور ہوا کی سنسنائیت کی تشریح نہیں کی جاسکتی تھی لہذا انھیں قدیم انسان کو سہجہ روح ہی روح نظر آتی تھی، کوئی سمجھا، کوئی فحش اور بیماری کو روح عجیبہ کے اثرات کا نتیجہ سمجھ کر انھیں زیر کرنے لگا کہ آج کے جادو کو نے اور جھاڑ پھونک سے مدد لی جاتی۔

سطوات جب انسان کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ ہر چیز روح کی حامل ہے تو اُس نے اپنے تصور سے کام لیکر ان کی مختلف صورتیں قرار دیں۔ اور نذرہ جن کے مجھے بنائے گئے۔

دیوان سماج کا اولین نظام انہائی نظام (Matriarchal) تھا اور مرد کے مقابلہ میں عورت کو زیادہ فضیلت حاصل مراد انہائی (یہاں تک کہ بچوں کے نام ماں کے نام پر رکھے جاتے تھے) اور چونکہ زمین جس پر انسان رہتا تھا اس کی طرح اس کی زندگی کا سارا تعلیمات پر مبنی تھی اس لئے سب سے پہلے زمین کی پرستش شروع ہوئی اور اسے مادہ زمین یا دھرتی مانا جانے لگا اور مختلف ملکوں میں اسے مختلف مجسموں میں پجارتے گئے۔ اس کے بعد جب کارزار حیات میں مرد کی اہمیت زیادہ بڑھ گئی،

نذرہ پیدہ گئی اور انہائی نظام کی جگہ ابوی نظام نے لے لی تو اہمیت کے تصور میں بھی تغیر پیدا ہوا اور دھرتی ماں کے مقابلہ میں "آسمانی باپ کی اہمیت دیوان کو زیادہ پختگی اور اس سلسلہ میں چاند سورج وغیرہ کی بھی پرستش ہونے لگی۔

دیوان سورج اور چاند۔ چاند کی پرستش نسبتاً کم ہوئی، سورج کا شمار معبودان اعلیٰ میں تھا، چاند کو متحرک دیکھنا اور تیز رفتاری سے چلنا، آسمان کی کشش اہمیت شریوں کا آشور سب آفتاب ہی تھے۔

نظم سماج یونان، ایٹروپیہ، جرمنی، برطانیہ اور اسکینڈینیویا کے لوگ بھی آفتاب پرست تھے۔ ہندوستان میں ویدک دور سے لیکر اب تک آیات و سورتیں پڑھا جاتی ہیں اور جاپان میں اپنے بادشاہ میکادو کو بھی آفتاب ہی کا اوتار مانا جاتا ہے۔ جب انسان نے سیر و فساد کی زندگی چھوڑ لی آیات و سورتیں زندگی شروع کی اور سورج کی حرکات سے غلہ بونے اور کاٹنے کا زمانہ متعین کیا تو شمس پرستی کا عروج ہونے لگا۔

ایات و سورتیں۔ سیاروں کی پرستش مختلف اقوام نے کی ہے لیکن اُسے انتہائی پہچاننے والے اہل بابل تھے۔ سیارہ پرستی کا ایک بڑا حصہ ایات و سورتیں میں تھا اور بعد میں خلیات کی بنیاد پڑی۔ قدیم سیارہ پرستی کا ثبوت ہندی اور یونانی یونانیوں کے نام سے بھی ہوتا ہے۔

نظم سماج چاند، سورج کی طرح ہر ستارہ کا ایک دیوتا تھا اور اس میں روح کا پایا جانا تسلیم کیا جاتا تھا، لیکن ان میں سب سے زیادہ اہمیت عطیہ قطب ستارے کو حاصل تھی کیونکہ وہ آسمان کا مرکزی نقطہ ہے اور تمام ستارے اُس کے گرد گھومتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ متعین کے دیوتا دیوان کا قول ہے کہ "میں وہ ہوں جو آسمان کے قطب پر نصب نہیں ہے اور تمام خداؤں کی طاقتیں میری طاقتیں ہیں۔" سمیری قوم کا سب سے بڑا معبود اُنو بھی قطب ستارے کا دیوتا تھا اور ہندوؤں کے برہما کا تعلق بھی قطب ستارے سے ہے۔ اسی طرح جاپان میں سب سے بڑے خدا کے ام کے معنی ہیں جو آسمان کے مقدس مرکز کا مالک دیتا ہے۔

پہلے لڑے۔ نہ صرف اپنے پرشکوہ منظر کی بناء پر قابل پرستش ٹھہرے، بلکہ اس نے بھی کردہ بادلوں کو روک کر پانی پر سارے کا سب سے

علاوہ ازیں وہ آسمانی سے قریب تر تھے، جسے سب سے بڑا معبود مانا جاتا تھا۔ ہر قوم نے بعض پہاڑوں کو مقدس مانا ہے مثلاً ہندوؤں نے کیلاش پریت۔ یہودیوں میں کوہ صیون اور مسلمانوں میں کوہ طور۔

مختلف اقوام کی دیوتاؤں میں ایک ایسے مقدس پہاڑ کا ذکر پایا جاتا ہے جو دریائوں کا مسکن ہے۔ مثلاً ہندوؤں کا سمیرو، بابل والوں کا کرساک گرز۔ چینیوں کا کوئن لوئین۔ یونانیوں کا اولمپس، ایویضوں کا المبرز (یا ہیرمزایتی) وغیرہ وغیرہ۔

درخت — مقدس پہاڑ سے ایک مقدس درخت کا تصور بھی وابستہ ہے، مثلاً ہندوؤں کا سووم، ایرانیوں کا ہوم، نارڈک قوم کا ایش برگ ڈراڈل، یہودیوں کا شجرۃ الحیات (یا شجرۃ العلم) مسلمانوں کا طوبی وغیرہ۔ اہل بابل اپنے ”ہبشتی درخت“ کی نقل بنا کر پوجتے تھے جسے ایشیر کہتے تھے۔ نارڈک قوم میں بھی مقدس درخت کی پرستش ہوتی تھی اور یہ رسم عیسائیوں میں ”کرسس ٹری“ کی صورت میں اب بھی جاری ہے۔

اس روایتی درخت سے قطع نظر ہر ملک میں درختوں کا احترام کسی نہ کسی صورت میں ضرور پایا جاتا ہے، عربوں انھیں جاندار مانتے ہیں ہندوستان میں درختوں کو بھوتوں، جنوں اور شہیدوں کا مسکن مانا جاتا ہے، اسی لئے رات کو بھول توڑنے یا دوپہر کو درخت (خصوصاً چمپل) پر چڑھنے سے لوگ پرہیز کرتے ہیں ہندوؤں میں کسی وقت درختوں سے لڑکیوں کی شادی کرنے کا بھی رواج تھا۔

آگ — عناصر اربعہ میں سب سے زیادہ آگ کی پرستش چھٹی ہے۔ غالباً اس کی بنیاد اُس زمانہ میں پڑی جب انسان نے آگ کو دریافت کیا تھا، اور چونکہ ایک مرتبہ آگ بجھنے پر اُس کا دوبارہ فراہم کرنا مشکل ہوتا لہذا جہاں تک ممکن ہوتا آگ کو بجھنے نہ دیتے تھے۔ آگ کو زمین پر آفتاب کا نمائندہ مانا جاتا تھا۔ سورج یا آگ کی روشنی ہی کی بنا پر یہ خیال پیدا ہوا کہ خدا نور محض ہے۔ بجلی بھی آگ کی ایک صورت تھی جسے ”خدا کی تازیانہ“ اور طغیب الہی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح بعض اقوام نے آتش فشاں پہاڑوں کی بھی پوجا کی ہے۔ قدیم ہند کے آریہ لوگوں میں آگنی سب سے بڑا معبود تھا۔ اب بھی جب ایک ہندو چرائے روشن کرتا ہے تو اسے ہاتھ جوڑ کر شکریہ ادا کرتا ہے۔ پارسی زمانہ قدیم سے آتش پرست رہے ہیں۔ یونان کے ہر شہر میں ایک بڑا آتشکدہ ہوا کرتا تھا جہاں رات دن آگ روشن رہا کرتی تھی۔ اٹلی میں بھی یہی رواج تھا وہاں آگ کی دیوی کا نام ویستا تھا۔

پانی — آگ کے بعد پانی سب سے بڑا معبود تھا۔ زمانہ قدیم کی تمام مشہور تہذیبیں دریائی وادیوں میں پروان چڑھی تھیں مصر میں رودینل، عراق میں دجلہ و فرات، ہندوستان میں سندھ اور گنگا و جمنہ، چین میں ہوانگ ہو کی وادیاں زمانہ قدیم میں تہذیب کا خاص مرکز تھیں۔ اس لئے ہمیں تعجب نہ ہونا چاہئے کہ یہاں کے باشندوں نے کسی نہ کسی صورت سے ان دریاؤں کی بھی پرستش کی ہے۔ اہل مصر نیل ندی کو دیتا مانتے تھے، جس کا نام اپتی تھا۔ عراق میں پانی کا دیوتا ایلا پوجا جاتا تھا۔ اور ہندوستان میں ایشیر گنگا اہل مقدس ہے اور دریائے سرسوتی کی دیوی علوم و فنون کی مرنی بن گئی ہے۔ دریاؤں کو خوش کرنے کے لئے انسان نے قربانیاں بھی پیش کی ہیں اور بسا اوقات اپنے ہی ابنائے جنس کو بھینٹ چڑھا ہے۔

ہوا اور مٹی — آگ اور پانی کے مقابلہ میں ہوا کی پرستش کم ہوئی ہے اگرچہ ہر ملک کی دیوتا میں ہوا کا دیوتا ضرور پایا جاتا ہے مٹی کو زمین کے ساتھ ہی پوجا گیا ہے علاوہ نہیں۔ اس کا تعلق کاشتکاری اور جڑ پھیلانے سے رہا ہے۔

اعضائے جنسی — غذا اور پانی کی طرح جنسی خواہش بھی بالکل فطری تھا ضابطہ اور اس کی تسکین کے دو مقصود ہوتے ہیں، ایک حصول لذت اور دوسرے افزائش نسل اور اسی اہمیت کے پیش نظر اعضائے جنسی کی پوجا مصر، عراق، ہندوستان یونان، روم وغیرہ ہر جگہ ہونے لگی۔

حیوان پرستی (Zoo-latry) — کاپتہ ہر جگہ چلتا ہے۔ شاید ہی کوئی جانور ایسا ہو جس کی پرستش نہ کی گئی ہو۔ مصری گبرے (Scarab) سے لیکر ہاتھی، شیر تک پوجے گئے ہیں۔ حیوان پرستی کا آغاز غالباً جانوروں کے خوف سے ہوا لیکن بعد

جب انسان کا عقیدہ یہ ہوا کہ مردوں کی رو میں حیوانی قالب میں نمودار ہوتی ہیں تو حیوان پرستی کا رواج زیادہ ہو گیا اور اسی سلسلہ میں انسان اور حیوان نے ہوئے "مکرب دیوتا" (Composite gods) پیدا ہو گئے، جیسے ہندوؤں میں گنیش جی۔ دشنو کے بعض اوتار بھی اسی نوعیت کے تھے۔

مصری حیوان پرستی کا ایک شرمناک پہلو بھی تھا یعنی یہ کہ عورتیں اپنے کو مقدس جانوروں کے سامنے (جو مندوں میں پائے جاتے تھے) پیش کر دیتی تھیں۔ اسی طرح جاپان میں آئو قوم کے لوگ اپنی عورتوں سے دیکھ کے بچوں کو دودھ پلاتے تھے اور جب بچہ جان بوجھتا تو اسے رتبیوں سے باز رکھ کر میدان میں لایا جاتا اور اس پر تیرا انداز کی جاتی تھی۔ بعد ازاں اس کا گوشت سب لوگ منکر کھاتے۔ بچہ ان کا معبود دیا "ٹوٹم" تھا۔

ٹوٹم پرستی (Totemism) بھی حیوان پرستی ہی کے سلسلہ کی ایک گڑی ہے۔ شمالی امریکہ کی اوجیوا (Ojibwa) قوم اپنے مقدس جانوروں کو "ٹوٹم" کہتی تھی۔ اس ٹوٹم پرستی کا رواج شمالی امریکہ کے قدیم باشندوں کے علاوہ افریقہ، آسٹریلیا اور ہندوستان میں بھی رہا ہے اور کسی مذہب اب بھی ہے۔ جانوروں کے علاوہ پر پڑ پودے یا بعض دوسری چیزیں بھی ٹوٹم ہو سکتی ہیں۔

ابنل کا بیان ہے کہ "خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا" حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ توحید کا تصور اور سماجی نظام خود انسان نے خدا کو اپنا ایسا تصور کیا۔

زمانہ قدیم کے بادشاہ اپنے کو "خدا کا سایہ" کہتے تھے لیکن اگر بادشاہ وجود میں نہ آتے تو خدا کا یہ تصور غالباً پیدا نہ ہوتا۔ ہیکٹر ٹاشن کہتا ہے کہ چونکہ مذہب سماجی نظام کا انعکاس ہوا کرتا لہذا کسی ایسی قوم میں توحید کا فیصل پیدا ہونا محال ہے جس میں بادشاہ نہ گزرے ہوں۔ جب بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں تو یہ خیال پیدا ہوا کہ کائنات کا بھی کوئی حکمران ہے۔ کائناتی خدا کے تصور سے پہلے قبائلی اور عامل معبودوں کا تصور عام تھا۔

ہر شہر کا ایک الگ دیوتا ہوا کرتا تھا۔ جب کوئی شخص اپنے شہر کو چھوڑ کر دوسرے شہر میں جاتا تو اسے اپنے معبود کو چھوڑ کے وہاں کے معبود کو اختیار کرنا پڑتا تھا اور جب ایک شہری ریاست دوسری شہری ریاست کو زیر کر لیتی تھی تو فاتح شہر کا معبود فاتح اور مفتوح شہر کا معبود مفتوح مانا جاتا تھا اور جب ایک شہری ریاست کئی شہری ریاستوں کو زیر کر لیتی تھی تو فاتح ریاست کے معبود کی اہمیت بہت بڑھ جاتی تھی۔ یہ صورت ہمیں قدیم عراق میں نظر آتی ہے۔

ایسا حالات ایسا بھی ہوا ہے کہ فاتح معبود میں مفتوح معبود کی صفاتیں ضم کر دی گئیں ہیں اس اصولی نے جسے (Syncretism) کہتے ہیں توحید کا تہذیب بدلا کرنے میں بڑی مدد کی ہے۔

توحید ناقص (Henotheism)۔ مذہب عالم کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہر اپنے معبود کو پرستش کرتے وقت دوسرے معبودوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اپنے مخصوص معبود سے تمام وہ صفات منسوب کرتے ہیں جو خدا کے شایان شان ہیں۔ اسے ہم توحید ناقص کہہ سکتے ہیں۔ اس کی ایک عمدہ مثال ہندو مذہب ہے۔ آج بھی ہندوؤں کے نزدیک اگرچہ ہزاروں دیوتا معبود ہیں لیکن جب وہ اپنے معبودان اعلیٰ (دشنو، شیو، رام، کرشن) کی پرستش کرتے ہیں تو ان سے وہی صفات منسوب کرتے ہیں جو خدا کے برتر اعلیٰ میں ہونا چاہئیں۔

توحید خالص (Monotheism)۔ اس تصور کو نہ تو ایروپیائی پڑھا کر سکے کیونکہ وہ ثنویت (Dualism) کے قائل تھے اور نہ عیسائی جو تثلیث (Trinity) کے قائل ہیں۔ ایرانیوں نے خدا و نبی کا نام بدواں رکھا اور خدا و مذہب کا اثر میں (شیطان) کی طرح عیسائی "باپ، بیٹا اور روح القدس" کی تثلیث کو مانے ہیں۔ ہندوؤں میں بھی توحید کا تصور پیدا ہو چکا تھا، لیکن چونکہ انھوں نے ثقافت دیوی دیوتاؤں کو بھی ایک ہی خدا کی مختلف صورتیں سمجھا اور بت پرستی کو بھی نہ چھوڑا اس لئے وہ موعود نہ کہلا سکے۔

ثنویت، تثلیث اور شرک کی تردید اور بت پرستی کا مکمل استیصال اسلام نے کیا، ہر چند ظہور اسلام سے قبل بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی توحید کا عقیدہ پایا جاتا تھا لیکن وہ اتنا صاف و منور نہ تھا جو اسلام نے پیش کیا۔

حدت الوجود (Monism) توحید میں خدا کا تصور شخصی تصور ہے اور انسان و خدا کے درمیان وہی رشتہ ہے جو صانع و مصنوع خالق و مخلوق میں ہونا چاہئے۔ بر خلاف اس کے وحدت الوجود کا عقیدہ ہمہ اوست کے مطابق روح اور مادے کی تفریق غلط ہے۔ دنیا کی ہر شے خود مادے اسی طرح جیسے قطر، حباب، جھاگ، لہریں وغیرہ پانی ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ اور اگر انسان کو شش کرے تو وہ بھی خدا ہو سکتا ہے یا خدا سے مل سکتا ہے۔ یہی فلسفہ ویرانت ہے۔ جسے سب سے پہلے ہندوؤں نے اپنشدوں میں پیش کیا اور پھر مسلمانوں نے اُسے اختیار کیا اور اسلامی تعلیمات سے ملکر تصوف کی شکل میں ظاہر ہوا۔

الحادیہ کفر (Atheism) اس کے معنی ہیں خدا کے وجود سے انکار کرنا یا اُسے نہ ماننا۔ تاریخ مذہب شاہد ہے کہ پہلے انسان لشت پرست تھا، اس کثرت پرستی سے توحید پیدا ہوئی اور (۱) خدا کو صاحبِ صورت و صاحبِ صفات مانا جانے لگا پھر (۲) خدا کو بے صورت لیکن صاحبِ صفات مانا گیا اور (۳) تیسری منزل میں آکر خدا کو بے صورت اور بے صفت مانا گیا۔ بدھ اور جین مذہب میں خدا کا یہی تخیل پایا جاتا ہے اور یہ مذہب لمحہ کہلاتے ہیں۔

الحادیہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بدھ اور جین مذہب کے وجود میں آنے سے پہلے یا ان کے زمانہ میں ہندو قدیم میں چاروں گناہی ایک فرقہ تھا جو پکا لمحہ تھا۔ اسی طرح اسلام نے بھی بڑے بڑے لمحہ پیدا کئے ہیں۔ آخر میں یورپ اور امریکہ کا فیر کا، جہاں اب اس کا اثر بڑھتا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کا کہنا ہے کہ خدا وہ سری غیر مادی اشیا کی ماہیت ہم جان ہی نہیں سکتے کیونکہ ہمارا ادراک اور عقل محدود ہے اور یہ مسائل ہماری عقل کے لئے ناقابلِ فہم ہیں۔ اس عقیدہ کو لا ادریت (Agnosticism) کہتے ہیں۔



یہ آسمان کے وہ تازیانے (رومانی) یا جو بیڑ (روحی) کی تصویر ہے۔  
آسمان کو مختلف اقوام نے خدا یا اُس کا مسکن مانا ہے۔

## ابتدائی اقوام کا مذہب

اس وقت بھی دنیا میں بعض قومیں ایسی پائی جاتی ہیں، جن کا تمدن قدیم عجمی عہد کا ہے۔ یہ وہ قومیں ہیں جو اب سے تقریباً لاکھ سال قبل ترقی پذیر اقوام سے جدا ہو گئی تھیں اور ان کی ترقی رک گئی تھی۔ ان کے عقاید کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم ترین انسان کا عقیدہ تصور و ماحول کیا تھا۔

**نیگریٹو اقوام** اس نسل کے لوگ جزیرہ فلپائن، انڈیا، سیلون، ملائیا، آسٹریلیا، تسمانیہ اور افریقہ وغیرہ میں آباد ہیں اور ان کا مذہب و شائستگی کی سب سے ادنیٰ منزل میں ہیں۔ ان میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے مذہب کہا جاسکے۔ ان کو ان میں سے بعض روح کو "سایہ" کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی آدمی کا سایہ برقرار رہتا ہے۔

آسٹریلیا کے جنگلی باشندے نیگریٹو لوگوں سے ذرا اونچی سطح پر ہیں۔ ان میں بقائے روح کا واضح خیال پایا جاتا ہے، علاوہ ان میں وہ بھی ایسی اہلی، سچی کے عقیدہ ہیں جسے سب کا آپ کہتے ہیں۔ مختلف قبائل میں اسکے مختلف نام ہیں ان میں ایک بائی بھی ہے جسکے معنی "بٹانے والا" کے ہیں۔ اسکے ایک بڑھا شخص ظاہر کیا جاتا ہے۔ جو پہلے زمین پر رہتا تھا پھر آسمان پر سے کسی دوسری جگہ چلا گیا، جہاں وہ اب بھی رہتا ہے اور انسانوں کی نگہداشت کرتا ہے۔ اسی نے آسمان، زمین، انسان، جانور اور درخت پیدا کئے اور اسی نے انسانوں کو ہتھیار بنانا حال بنانا وغیرہ مختلف مشاغل حیات سکھائے۔

ڈاکٹر اے۔ ڈبلیو ہوٹ (Dr. A. W. Howitt) کا خیال ہے "سب کے باپ" کا خیال محض قبیلے کے بزرگ پر مبنی ہے۔ اور ہیکٹر ہارٹن (Hector Horton) نے بھی اس خیال کی ترجمانی کی ہے کہ آسٹریلیا کے قبائل میں خدا کا تصور پیدا ہو گیا تھا۔ کیونکہ کسی قوم میں خدا کا تصور پیدا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں بادشاہ گزرے ہوں۔ اور آسٹریلیا میں بادشاہی تو درکنار موجود نہیں ہے۔

میلانیشیا کے باشندے آسٹریلیا کے جنگلی باشندوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ یہ لوگ فہمی، نیوگنی اور جزائر سالومن وغیرہ میں آباد ہیں۔ ان میں انسانی اور غیر انسانی رگوں اور درختوں کا بہتائی خیال موجود ہے وہ ایک خاص اہلی کے قتل میں جسے قاتل کہتے ہیں۔ ایک ایسی پراسرار قوت ہے جو انسانوں، حیوانوں، درختوں، الغرض کائنات میں ہر جگہ محسوس ہے اور ساری کامیابی، صحت اور مادی خوشحالی اس غیر مادی قوت کا نتیجہ ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ آگ، طوفان، روک سکتا ہے تو اسے لانے پر بھی قادر ہے۔ ان لوگوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ مردوں کی روہیں یکسر فنا ہوتی ہیں۔

پالی نییشیا کے لوگ میلانیشیا کے لوگوں سے زیادہ اونچی سطح پر ہیں۔ ساتھ آؤن کا خاص معبود ہے جو خالق ہے۔ وہ کائناتی بیمنہ کی تارکی میں چھپا تھا جسے توڑ کر وہ باہر آیا اور کچھ عرصہ تک جنت میں تنہا رہا۔ پھر اس نے ایک عورت کو پیدا کیا جس کی مدد سے اس نے زمین، آسمان اور

اس سے اتنی جلیقہاات ہندوستان اور چین میں بھی پائی جاتی ہیں اس لئے ممکن ہے کہ اسی معبود میں ان ممالک کے بعض لوگ پالی نییشیا پہنچے ہوں اور ان کے ساتھ یہ عقیدہ بھی لایا ہو۔

سمندر کو بنایا۔ بعض روایات کے مطابق اُس نے زمین کو پھل کی طرح کاٹنے سے پکڑ کر سمندر کی گہرائی سے باہر نکالا۔ پھر اُس نے کچھ ہل مٹی لیکر انسان بنایا۔ ایک روایت کے مطابق اُس نے آدمی پر گہری میند بھیجی اور اُس کی ایک ہڈی نکال کر عورت بنائی، یہ روایت غالباً عیسائی تبلیغ کا نتیجہ ہے۔  
 مغربیہ۔ ہرڈنر میکس مگر (Prof. Max Müller) افریقی مذہب کے عناصر اعلیٰ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "مگریم افریقی اقوام کو توحید کا قابل نہ مانیں تو اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہ توحید کی حدوں سے بہت قریب ہیں۔"

اوجی (Odji) یا اشانتی (Ashanti) قبائل کے نزدیک آسمان سب سے بڑا معبود ہے جسے وہ شخصی خدا، خالق اور تمام اچھائیوں کا مالک مانتے ہیں۔ تاہم دنیا کی حکومت اُس نے اپنی پیدا کی ہوئی رعوں کے حوالے کر دی ہے جو پہاڑوں، وادیوں، جنگلوں، دریاؤں اور سمندروں میں رہتی ہیں۔ ان میں سے بعض سجدہ ہیں اور بعض خمیت۔ ان میں ایک بدترین روح کا تصور بھی پایا جاتا ہے جو انسان کو مٹی دشمن ہے اُس کا مقابلہ ہم شیطان سے کر سکتے ہیں۔

یہو (Yebu) لوگ خدا کی یوں حمد کرتے ہیں: "آسمان کے خدا بیماری اور موت سے ہماری حفاظت کر، اے خدا ہمیں خوشی اور دانش عطا کر۔" یوربا (Yoruba) لوگ بھی آسمان کے خدا میں اعتقاد رکھتے ہیں جسے اولورون (Olorun) کہتے ہیں۔ آکرا (Akra) لوگوں میں سب سے بڑے بڑے دیوتا کا نام جونگما (Jongma) ہے جس کے معنی "بارش کے دیوتا" کے ہیں۔ غالباً نیونگمو (Nyongmo) کی بدلی ہوئی صورت ہے جو گولڈ کوسٹ پر خدا کا نام ہے۔ وہاں اس کے معنی آسمان کے ہیں جو ہر جگہ ہمیشہ سے موجود ہے۔

گولڈ کوسٹ کے نیگرو لوگوں میں بہت پرانے زمانہ سے نیونگمو کو خدا کے برتر مانا جاتا ہے جس نے دنیا کو بنایا اور اُس پر حکومت کرتا ہے اُسے وہ "ہمارا بڑا دوست" یا "وہ جس نے ہمیں بنایا" کہتے ہیں۔ کسی بڑی مصیبت کے وقت اُن کے منہ سے یہی نکلتا ہے کہ "ہم خدا کے ہاتھوں میں ہیں وہ جو مناسب سمجھے گا کرے گا" یا "خدا قدیم ہے۔ وہ سب سے بڑا ہے۔ وہ مجھے دیکھتا ہے، میں اس کے ہاتھوں میں ہوں" مالوکا (Maluka) لوگوں میں خدا، آسمان اور بادل کے لئے ایک ہی نام ہیں۔ خرطوم سے تقریباً تین سو میل جنوب دیکھا (Dinka) لوگ آباد ہیں۔ ان لوگوں میں خدا کو ڈینگڈٹ (Dengdit) کہتے ہیں۔ اس لفظ کے معنی ہیں "بارش عظیم" اس کا دوسرا نام ہے نیالچے (Nyalich) جس کے معنی ہیں "ادب کا" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بارش کا دیوتا ہے اور آسمان اُس کا مقام ہے، اُسے دنیا کا خالق اور اُس کے نظام کا بانی بھی مانا جاتا ہے۔

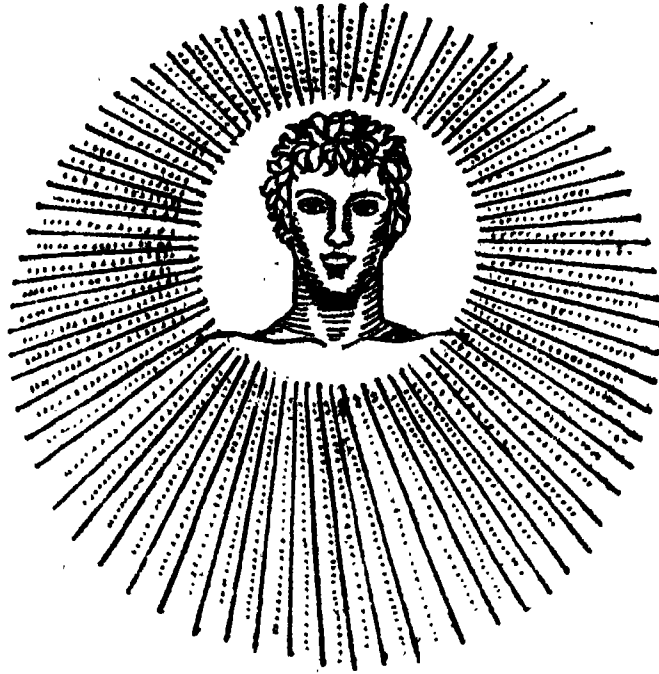
داہومی (Dahomey) میں سورج کو سب سے بڑا دیوتا مانا جاتا ہے لیکن اُس کی پرستش نہیں کی جاتی۔ کیمبرون (Cameroon) کے دواتھا (Duala) لوگوں میں خدا کے لئے وہی نام ہے جو سورج کا ہے، آکرا لوگ طلوع ہونے والے آفتاب کی پرستش کرتے ہیں۔

ایبو (Ibo) لوگ دنیا کی بنانے والی ایک ہستی میں اعتقاد رکھتے ہیں جسے تشوکو (Tshuku) کہتے ہیں۔ اُس کے دو آنکھیں اور دو کان ہیں جن میں سے ایک زمین پر ہے اور ایک آسمان پر۔ وہ غیر مٹی ہے اور کبھی نہیں سوتا۔ وہ سب کچھ سنتا ہے لیکن انھیں کے قریب جاتا ہے جو اُس کے پاس آتے ہیں۔ نیک لوگ اُسے مرنے کے بعد دیکھیں گے اور بڑے لوگ آگ میں جائیں گے۔ بشمن (Bushman) بھی خدا میں اعتقاد رکھتے ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ "اُس نے سب چیزیں بنائی ہیں اور ہم اُس کی عبادت کرتے ہیں۔" اسی طرح زولو (Zulu) لوگ بھی خالق میں یقین رکھتے ہیں۔

امریکہ۔ مغربی اقوام کے یورپ میں آباد ہونے سے قبل وہاں جو لوگ آباد تھے وہ امریکن ہندی کہلاتے ہیں، کوہلس نے جب امریکہ کو فتح کیا

نوردہ سمجھا کہ میں ہندوستان پہنچ گیا ہوں اس لئے وہاں کے باشندوں کو جن کا رنگ سُرخ مائل تھا اُس نے سُرخ ہندی (Red Indians) کہا اور جب سے نام مشہور ہو گیا۔ امریکن ہندی مختلف قبائل میں منقسم ہیں اور اب اُن کی نسل فنا ہونے کے قریب ہے۔ ان میں ٹوٹم پستہ اور جادو ٹوٹنے کے سوا میٹاٹیشیا والوں کے آقا کی طرح ایک روحانی قوت کا اقتقاد پایا جاتا ہے جسے الگان کوئی (Algonquian) زبان میں مانیتو (Manitou) کہتے ہیں۔ یہ لفظ ہر فوق الفطرت حقی کہ ریل اور موٹر کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ساؤتک، دلاور سے اور دوسرے الگان کوئی قبائل میں خالق اور دوسری فوق الفطرۃ ہستیوں کو بھی مانیتو کہا جاتا ہے۔ دلاور سے لوگوں میں خالق کے لئے ایک خاص نام ہے، گیتا نتووت جس کے معنی ”حافظِ عظیم“ کے ہیں۔

اوکوئی (Ojibwa) لوگوں میں مانیتو کا مقابل اور تہیڈا (Ojibwa) ہے جسے طلسمی قوت سمجھا جاتا ہے۔ گس (Kispiox) نسل کے لوگ فوق الفطری قوت کو واکن (Wakan) یا واکنڈا (Wakanda) کہتے ہیں مثلاً واکنڈا تلوار کے معنی ہیں ”بہت تیز تلوار“۔ الغرض خالق کے بارے میں یہ قبائل کوئی خاص تصور نہیں رکھتے۔



اتوام نے جب زیادہ پرستش کی ہے

آفتاب جس کی ہند اور نیم ہند

## عہد قبل تاریخ کا مذہب

ہائل میں آدم اور ان کی نسل کا جو شجرہ دیا ہے اس کو سامنے رکھ کر پادری آشر نے ظاہر کیا تھا کہ ہماری دنیا ۴۰۰۰ ق م ۲۶ اکتوبر کو ۹ بجے عالم وجود میں آئی۔ لیکن تحقیقات جدیدہ نے اس خیال کو بالکل لغو ثابت کر دیا ہے۔

نظریۂ ارتقاء کے مطابق انسان اور انسان نامیہ (چیمپنزی، اورنگ، گوریلا اور گین وغیرہ) دونوں کا مورث اعلیٰ ایک تھا۔ قدیم ترین انسانوں کی ہڈیاں چین (پکنگ) اور جاوا میں ملی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان اب سے پانچ لاکھ سال پہلے پایا جاتا تھا۔ جنوبی انگلستان اور جرمنی میں جن انسانوں کی ہڈیاں ملی ہیں ان سے بھی انسان کا پچاس ہزار سال پہلے پایا جانا ظاہر ہوتا ہے۔ ان ہڈیوں کا معائنہ کرنے کے بعد ماہرین نے یہ معلوم کیا ہے کہ وہ سیدھے نہ کھڑے ہو سکتے تھے اور جھکے جھکے چلتے تھے ان کی ٹھوڑیاں نہ تھیں اور غائبانہ باتیں بھی نہ کر سکتے تھے۔ یہ ایسے ہمدانگوں نے آگ کا استعمال معلوم کر لیا تھا۔ آگ کو غار کے سامنے جلا کر دندلوں کو دور رکھا جاتا تھا۔ ان کی غذا جانوروں کا گوشت تھا جنھیں لکڑی یا چھاق کے بھتے ہتھیاروں سے مارتے تھے ان کا لباس جانوروں کی مسکھائی ہوئی کھالیں تھیں۔ جہاں تک ممکن ہوتا وہ دریاؤں کے کنارے رہتے تھے۔ اس لئے کہ ان کے پاس پانی لے جانے کے لئے برتن تھے حفاظت کے خیال سے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں رہتے تھے۔ ہر گروہ کا ایک سردار ہوا کرتا تھا اور جب وہ گروہ موجانا تو کوئی اور اُسے مار کر اُس کی جگہ لے لیتا۔ اس کے بعد یورپ میں جو انسان ظاہر ہوئے ہیں انھیں مکمل انسان (*Homo Sapiens*) کہتے ہیں جو اب سے تقریباً ۲۵۰۰۰ سال پہلے شمالی افریقہ یا جنوبی ایشیا سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ ان کے آثار فرانس میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں اسپین اور فرانس کے تقریباً ۳۰ غاروں میں موجود ہیں جن سے ان کے مذہبی عقاید پر بڑی روشنی پڑتی ہے۔ عموماً تصاویر کو غار کے دہانے سے بہت اندر کی طرف بنایا گیا ہے۔

(*des Combarelles*) کے غار میں تصاویر کی تعداد ۴۰۰ سے اوپر ہے عالموں کا خیال ہے کہ یہ تصاویر جانوروں کی افزائش کے لئے بنائی جاتی تھیں۔ چنانچہ اب بھی بعض نیم فہذب اقوام اس اصول پر کاربند ہیں ایک سیاح نے وسطی آسٹریلیا کے ایک قبیلے کے متعلق لکھا ہے کہ وہ کسی چٹان پر ایک خاص قسم کے کیڑوں کی تصویریں بناتے ہیں جسے وہ کھاتے ہیں اور پھر ان کے سامنے گا کر افزائش نسل کی التجا کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک دوسرے قبیلے کے لوگ جن کی خوراک ایتھنامی پرندہ ہے اُس کی افزائش کے لئے یہ تدبیر کرتے ہیں کہ بعض لوگ اپنے خون سے زمین کو رنگتے ہیں اور پھر اُس پر ایتھو اور اُس کے انڈوں کی تصویریں بنا کر بعض رسوم ادا کرتے ہیں اور یہ رسوم حور قبل سے چھپا کر ادا کی جاتی ہیں اس لئے بالکل ممکن ہے کہ عہد قدیم کا انسان بھی غار کے بعد ترین حصوں میں اس لئے تصویریں بناتا ہو کہ وہاں تک عورتیں نہ پہنچ سکیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مذہب صرف جادو ٹوٹا تھا اور اس کا ثبوت ایک جادوگر کی تصویر سے ملتا ہے جس میں اسے بارہ شکلیں کے روپ میں دکھایا گیا ہے۔

غاروں میں انسانی تصاویر بہت کم پائی گئی ہیں۔ انسانی تصاویر میں سب سے اہم (*Cogul*) کا ایک نقش ہے جس میں نو حور توں کو ایک جانور کے گرد قفس کرتے دکھایا ہے۔

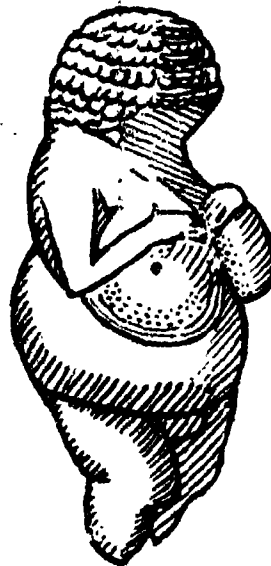
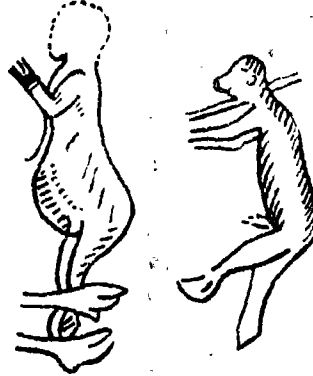


یہ تصویریں جس رقص کا منظر پیش کرتی ہیں اُس کا تعلق جانوروں کی افزائش نسل کی مذہبی رسم سے معلوم ہوتا ہے۔

انسانی تصاویر پائی گئی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے  
ابہیت حاصل تھی مثلاً نیچے کی تصویر میں ایک مرد  
عورت کی ہے۔

چلتا ہے۔ نیچے کا مجسمہ آسٹریا میں ملا تھا۔ ہمیں  
کو باتھوں سے دباتے دکھایا ہے گویا وہ دودھ  
"ماں" ہے ایسے بت تمام اُن ممالک میں پائے  
لیکن اس ماں سے مراد انسانی مائیں نہ تھیں بلکہ  
کو پورا کرتی ہے۔

پہنچ چکی تھی چنانچہ وہاں کی بعض نیم ہندو اقوام  
تھا کہ زمین سب کی ماں ہے جس طرح ماں دودھ  
پہنچا کر دیتی ہے اور صحرائی پیداوار جو حقیقتاً جسم  
کلاتہ کے وحشی کہتے ہیں کہ زمین کی ماں اپنے  
میں بڑے بڑے انعام دیا کرتی ہے۔ جمیلین  
جن سے نہروں اور دریاؤں کی صورت میں  
عہد قبل تاریخ کے یورپ میں پائے جاتے تھے  
کے ممالک مثلاً ایشیائے کوچک، مصر اور عراق  
اور وسط ایشیائے کوچک میں پائے جاتے تھے ان تمام  
گئے ہیں جو اپنے ہاتھ سے سینے کو دبا رہی ہیں (دیا  
ہیں یہی نہیں بلکہ ہندو علم اساطیر میں ایک ایسی



بعض جانوروں کے سینگوں پر بھی ایسی  
کہ قدیم انسان کے نزدیک افزائش نسل کو بڑی  
کو دکھایا ہے اور دوسری تصویر ایک حاملہ  
اسی زمانہ میں "مادر پرستی" کا بھی پتہ  
ایک گھونگھروالے بالوں والی عورت کو اپنی چھاتیوں  
نکال رہی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ  
گئے ہیں جہاں "مادر پرستی" کا رواج پایا جاتا تھا۔  
"مادر فطرت" تھی جو انسانوں کی جملہ ضرورتوں  
زمانہ قدیم میں اور پرستی امریکہ تک  
میں اس کے آثار باقی ہیں۔ مثلاً زدنوم کا عقیدہ  
چلاتی ہے اُسی طرح زمین انسانوں کے لئے پانی  
زمین کا گوشت ہے غذا کا کام دیتا ہے۔۔۔۔۔  
بچوں یعنی انسانوں کو غلہ اور پھل وغیرہ کی صورت  
اُس کی آنکھیں ہیں اور پہاڑیاں اُس کا سینہ  
دودھ جاری رہتا ہے غالباً ایسے ہی خیالات  
اور پھر ماضی بعید کی یورپی اقوام سے بحیرہ روم  
وغیرہ پہنچے اور بتدریج یہ سلسلہ وادی سندھ  
مقامات پر ایسی دیویوں کے بت بکثرت پائے  
مضی سینے پر رکھے ہیں گویا دودھ نکال رہی

دیوی کی تصویر موجود ہے جو اپنے ہاتھوں سے چھاتیوں کو دبا رہی ہے اور اُن سے دودھ کی دھاریں نکل نکل کر فرش پر گر رہی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ مادہ فطرت یا ”دھرتی ماتا“ ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہو گا کہ عہد قبل تاریخ میں مذہب کی بنیاد تو پڑھ چکی تھی لیکن وہ جادو ٹوٹنے کی حد سے لگے نہ بڑھا تھا۔ البتہ ”مادہ فطرت“ کا تخیل ضرور ایک بلند چیز تھا۔ لوگ ”حیات بعد ممات“ کے بھی قائل تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ مرنے کے بعد روح برقرار رہتی ہے اور مردے کو کھانے پینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس خیال سے اور نیز اس ڈر سے کہ کہیں مردے کی روح زندوں کو اپنے سامان کے لئے پریشان نہ کرے اُس کا سب سامان بھی ساتھ ساتھ دفن کر دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ نیچے کی تصویر میں دکھایا ہے :-



مردوں کو دفن کرنے کا ایک خاص طریقہ تھا یعنی لاش کو اُسی طرح لٹاتے تھے جس طرح بچہ پیدا ہوتا، ٹانگیں موڑ کر پیٹے سے لگادی جاتی تھیں اور ہاتھوں کو موڑ کر ٹھوڑی سے ملا دیتے تھے۔

عہد قبل تاریخ کے بارے میں جتنا اچھا علم ہمیں یورپ کے بارے میں حاصل ہے اتنا دوسرے ملکوں کے بارے میں نہیں اور اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے یعنی یورپ والوں نے حقیقی تحقیقات اپنی سرزمین کے بارے میں کی ہے اُسی دوسرے ملکوں میں نہیں ہوئی ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی تحقیقات ہوئی ہے اسکی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دیگر ممالک میں بھی قدیم اور جدید عصر حجری میں وہی معتقدات تھے جو یورپ میں ان ادوار میں پائے جاتے تھے۔

## قدیم عراق کا مذہب

عہد قبل تاریخ کے مذہبی عقاید پر تبصرہ کرنے کے بعد اب ہم تاریخی زمانہ کے ان مذاہب کو دیکھتے ہیں جو فنا ہو چکے ہیں۔  
زمانہ قدیم میں تمام وہ ممالک جو خطہ سلطان کے شمال میں واقع ہیں نہایت ہی عالیشان تہذیبوں کے گہوارہ تھے۔ پُرانی دنیا میں  
وادی سندھ، وادی فرات اور وادی انیل گویا ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں تھیں۔ مصر کے شمال میں کریت، یونان اور روم کے ممالک نے  
بالترتیب عروج حاصل کیا۔ ہندوستان کے شمال میں چین نے بڑی ترقی کی۔ نئی دنیا میں صرف وسط امریکہ (میکسیکو) ایک اہم تہذیب کا  
مرکز بن سکا اور جنوبی امریکہ میں سرونے ایک اہم نشان تہذیب پیدا کی۔

روم، یونان اور چین کو چھوڑ کر بقیہ ملکوں کی پرانی تہذیبیں مٹ چکی تھیں۔ ان کا تمدن ہزاروں من مٹی کے نیچے دبا ہوا تھا۔ یہاں تک  
کہ مغرب کے بعض لوگوں نے اس طرف توجہ کی اور یکے بعد دیگرے انہیں کھود نکالا۔ اس کھدائی کے سلسلہ میں بہت سے کھنڈر نکلے اور ان  
کھنڈروں میں بہت سے کتبے نکلے۔ کھنڈروں سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ مختلف زمانوں میں فن تعمیر کی کیا صورتیں تھیں اور سامان سے یہ معلوم  
ہوا کہ مختلف عہدوں میں انسان کس طرح کی زندگی بسر کرتا تھا۔ کتبوں کا رسم خط اور زبان آج کل سے بالکل جدا تھی۔ ان پر عبور حاصل  
کرنے سے ہمیں قدامت کے مذہب اور علمی مشاغل کا علم حاصل ہوا اور آج ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ زمانہ خاصی کی تاریخ نہایت تفصیل  
کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں۔ مذاہب قدیمہ میں مہود کا تخیل کیا تھا؟ یہ اسی تاریخ کا ایک سوال ہے جس کا جواب آپ آئندہ صفحات  
میں پائیں گے۔

اب سے کچھ عرصہ پہلے تک اس بارے میں اختلاف آراء تھا کہ دنیا کا سب سے پرانا تمدن کون ہے۔ بعض علماء مصری تہذیب  
کو سب سے زیادہ قدیم مانتے تھے لیکن اب یہ بات طے ہو چکی ہے کہ عراق کی تہذیب مصری تہذیب سے پرانی ہے۔ عراق میں ۴۰۰۰ ق۔ م کے  
مکانات برآمد ہوئے ہیں اور گہیوں کی کھیتی کے نشانات ملے ہیں۔

عراق کے سب سے پرانے باشندے سمیری تھے، یہ لوگ کہاں سے ہجرت کر کے آئے تھے؟ نسلی اور لسانی اعتبار سے ان کا تعلق  
کس گروہ سے تھا؟ اسکی پوری تحقیق ابھی تک نہیں ہو سکی ہے۔ ان کے عروج کا زمانہ ۳۵۰۰ سے ۳۰۰۰ ق۔ م ہے۔

عراق کا جنوبی حصہ سمیریہ اور شمالی حصہ اکاد کہلاتا تھا۔ اکاد میں سامی قوم آباد تھی جو جزیرہ نمائے عرب سے ہجرت کر کے آئی  
تھی۔ اس کا سب سے مشہور حکمران سارگون اول (زمانہ ۲۵۰۰ ق۔ م) تھا جس نے سمیری ریاستوں کو زیر کر کے سامی حکومت قائم کی  
شاہان اکاد کے زوال کے بعد شہر بابل نے عروج حاصل کرنا شروع کیا بابل (باب ایل) کے معنی ہیں ”خدا کا دروازہ“ اس کا  
پہلا بادشاہ حمورابی (۱۷۰۰ ق۔ م) تھا۔ اس کی حکومت رفتہ رفتہ اکاد کی پوری مملکت پر پھیل گئی اور اس کا نام بجائے اکاد کے  
بابل پڑ گیا۔ بابل کے لوگ بھی سامی النسل تھے۔

وادی دجلہ و فرات کا شمالی حصہ آشوریہ یا اسیر کہلاتا تھا۔ یہ نام ان کے مشہور شہر آشوریہ سے ماخوذ ہے، خود اس شہر کا  
نام ان کے دیوتا کے نام پر رکھا گیا تھا۔

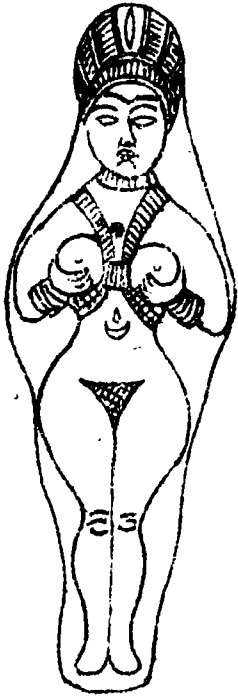
سمیری قوم کا مذہب مناظر فطرت کی پرستش تھا اور اس سلسلہ میں بہت سے دیوی دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی تھی۔ ایسے

ملاوہ شاماں پرستی (Kamamism) کا بھی رواج تھا۔ شاماں پرستی کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ اس دنیا کی حکومت سمیر اور فہیث روحوں کے ہاتھ میں ہے جنہیں سحر و افسوں سے قابو میں کرنا ضروری ہے۔

سمیری معبودوں میں سب سے بڑے تین دیوتا تھے۔ (۱) آنو، آسمان کا دیوتا۔ (۲) ایننل، فضا اور زمین کا دیوتا۔ (۳) ایا، پانی کا دیوتا۔ غالباً دنیا کی قدیم ترین تثلیث ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عراق میں پہلے اہباتی نظام کا دور دورہ تھا اور دھرتی ماما کی پرستش ہوا کرتی تھی جسے نینایا ماما کہتے تھے اُس کا خطاب ”مقدس پہاڑ کی ملکہ“ تھا۔ گویا وہ ہندوؤں کی پاربتی کی مقابل تھی جنہیں ہمالیہ پرست کی لڑکی مانا جاتا ہے اسی طرح کرتھ کی دھرتی ماما کو بھی پہاڑ پر کھڑے دکھایا جاتا تھا۔

اس کے بعد جب اہباتی نظام کی جگہ ابوسی نظام نے لی تو نانا دیوی کی جگہ پانی کے دیوتا ایا کو مل گئی اور نانا یا نینا کو اس کی بیٹی قرار دیا گیا۔ پہلے نانا دیوی کا بت اسے بتایا جاتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے چھاتیوں کو دبا کر دودھ نکال رہی ہے۔ بعد میں اس عسریائیت کو چھپانے کے لئے اُس کے ہاتھوں میں ایک ایسا ٹوٹا دکھایا جانے لگا جس سے پانی اُبل اُبل کر باہر نکل رہا ہے اور پھر یہی لوٹے ایا دیوتا کے ہاتھوں میں دکھائے جانے لگے۔

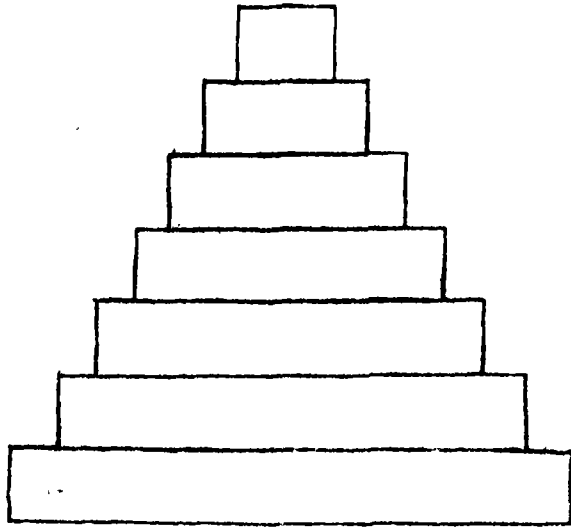


شاید سمیری قوم کسی پہاڑی مقام سے ہجرت کر کے آئی تھی اور چونکہ جنوبی عراق میں پہاڑ نہ تھے اس لئے وہ اپنے مندروں کو مصنوعی پہاڑوں پر بنایا کرتی تھی۔ انہیں زگورات کہتے تھے۔ یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ ایسے ہی مندر میکسو میں بھی ملے ہیں۔ ہر چند بعد کو سمیری قوم کا سیاسی حیثیت سے زوال ہو گیا لیکن اُس کے تمدنی اثرات باقی رہے، کیونکہ سامی قوم بابلی و آشوری اقوام نے سمیری تمدن اختیار کر لیا تھا۔ شاماں پرستی کا اثر بابل کے ادنیٰ طبقے میں اس کے وجود تک باقی رہا۔ اسی طرح بابلی معبودی الواقعہ وہی تھے جو سمیری قوم کے تھے۔

بابل والوں میں دوہری تثلیث پائی جاتی تھی۔ پہلی تثلیث آسمان، زمین اور پانی کے دیوتاؤں پر مشتمل تھی، جن کے نام بالترتیب آنو، ہیل (سمیری قوم کا ایشل) اور آتھا تھے۔ دوسری تثلیث سورج، چاند اور زہرہ سیارے پر مشتمل تھی۔ سورج اور چاند کے دیوتاؤں کے نام بالترتیب شماس (شمس) اور سین تھے۔ زہرہ سیارے کا نام ایشتر دیوی تھا۔ یہ چھ معبود بابل والوں کے مذہب کی بنیاد تھے ان کے علاوہ دیگر سیاروں کے بھی دیوتا تھے۔

سیارہ پرستی کی سب سے حیرت انگیز یادگار بارسپ (موجودہ برصغیر) کا ”مندریفت سیارگان“ ہے جسے فیبو کو نیز دیکھیں۔ ۶۰۰ ق۔ م بنایا تھا۔ اس کے باقی ماندہ آثار سے پتہ لگایا گیا ہے کہ اس کی اونچائی اپنی اصلی حالت میں ۵۶ فٹ رہی ہوگی۔ یہ مندرسات منزلوں کی صورت میں تھا جو بتدریج نیچے سے اوپر کو چھوٹی ہوتی چلی گئی تھیں، ہر منزل ایک دیوتا یا سارے سے منسوب تھی اور اسی مندر سے اُس کا رنگ بھی تھا:-

نقری (قمر)	سین دیوتا
نیلگوں (عطارد)	ہیل دیوتا
زرد (زہرہ)	ایشتر دیوی
طلائی (شمس)	شماس دیوتا
سرخ (مریخ)	نرگل دیوتا
نارنجی (شعری)	مردوک دیوتا
سیاہ (زحل)	ننب دیوتا (یا اور دیوتا)



یہ مندر دراصل سمیری قوم کے ”زگورات“ کی نقل تھی اور غالباً انھیں مندروں سے برج بابل کا تخیل پیدا ہوا جس کا کتاب پیدا میں میں ذکر ہے۔

بابل کے ہر دیوتا کے کئی پہلوئے مثلاً سورج دیوتا کی طلوع و غروب کے لحاظ سے دو صورتیں تھیں۔ ایشتر دیوی کے بھی دو روپ تھے۔ جب زہرہ سیارہ شام کو طلوع ہوتا تو اُسے جنسی محبت کی دیوی مانتے اور جب صبح کو طلوع ہوتا تو جنگ و جدل کی دیوی۔ ایسے ہی آتن کی بھی دو حیثیتیں تھیں ایک تو بجلی کا دیوتا اور دوسرے بادل کی گرج کا دیوتا۔ دیوتاؤں کے اہل و عیال بھی تھے اور خدمت کار و حیں بھی۔ الغرض بابل والوں کا مذہب ظاہر کثرت پرستی تھا۔ لیکن جب ہم دیوتاؤں کا سون پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی چیز کی مختلف صورتیں تھیں۔

ان کے یہاں ہر ہر شہر کا ایک خاص دیوتا ہوتا تھا۔ ہر شہر کے الگ الگ پروہت ہوا کرتے تھے جو اپنے ہی معبود کے گن گاتے۔ ڈرائیو میں جب کوئی شہر غالب آجاتا تو اُس کا دیوتا بھی ذہنی طور پر غالب آجاتا۔ چونکہ ہر شہر کا دیوتا الگ تھا اور لوگ اپنے شہر کے سوا دوسرے شہروں کے معبودوں سے غرض نہ رکھتے تھے اس لئے بابل والوں کے مذہب کو کثرت پرستی کے بجائے توحید ناقص کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

بابل والوں کے بعد جب اسیروں کے لوگوں نے عروج حاصل کیا تو انھوں نے اپنے سرپرست دیوتا آشور (Ashur) کی ذات سے تمام وہ تصورات وابستہ کر دئے جو خدا کی صفات کہے جاسکتے ہیں۔ ان کی بے نظیر فوجی کامیابی کی وجہ سے بابل والوں کے تمام دیوتاؤں کی صفات بھی صرف اس ایک دیوتا میں مرکوز ہو گئیں یا اُسے ان تمام قوتوں سے متصف مانا گیا جو بابل والے اپنے دیوتاؤں میں دیکھتے تھے۔ آشور، اسیروں والوں کا واحد

قوی دیوتا تھا۔ اس دیوتا کی پرستش توحید سے زیادہ قریب تھی اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اشور بنی اسرائیل کے خدا یہوواہ (Jehovah) کے مماثل تھا۔ شاہانِ اسیر، اشور کے سوا بہت کم دوسرے دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے اور ان دوسرے دیوتاؤں کا بھی اشور سے الگ وجود نہ تھا۔ اشور کی پرستش اور اسرائیل کے یہوواہ کی پرستش میں بڑا فرق تھا۔ اسرائیل میں بادشاہ کے علاوہ کوئی دیوتا کا ایک علاوہ طبقہ تھا لیکن اشور کا سب سے بڑا پروہت خود بادشاہ ہوا کرتا تھا۔ ان کی دعاؤں اور مناجاتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے تمام دیوتاؤں میں کسی قوت برتر کا نفوذ و افروض تسلیم کرتے تھے۔ مثلاً، سین (چاند دیوتا) کا ترانہ حمد ہے۔

”آسمان میں افضل کون ہے؟ صرف تو ہی افضل ہے  
جب تیرا حکم زمین پر سے گزرتا ہو تو وہ سب ہوتا ہے پودوں کے اگنے کا  
تیرے حکم سے صطبل اور غنے کے گودام سبھر جاتے ہیں  
اُس سے جانداروں کی افزائش ہوتی ہے۔“

مناجات کا یہی زور ذیل کے نغمہ حمد میں پایا جاتا ہے جس کا مخاطب بابل کا سورج دیوتا مردوک ہے لیکن اس میں تخلیقی طاقت کے بجائے قہرانی قوت کا تذکرہ ہے :-

”تیرا حکم ایک حکمِ رفیع ہے جو تو آسمان و زمین پر شائع کرتا ہے  
وہ سمندر کی طرف رجوع ہوتا ہے اور سمندر پیچھے ہٹ جاتے ہیں  
وہ کھیتوں کی طرف رجوع ہوتا ہے اور مرغزار ماتم کرتے ہیں  
وہ فزات کی پر جوش طغیانی کی طرف رجوع ہوتا ہے اور  
مردوک کا حکم اُسے پانی کا ایک گڑھا بنا دیتا ہے  
اے آقا تو افضل ہے۔ تیرا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟“

گناہ سے دیوتا ناراض ہو جاتے تھے لیکن وہ اپنے نائب بندوں پر رحم و مہربان بھی ہو جاتے تھے۔ ہر انسان کی پیدائش ایک الہی فضل تھا اور انسان من حیث القوم خدا کی خاص مخلوق تھے۔ ذیل کی مناجات گناہ کے ارتکاب اور دیوتاؤں کی قوت عفو کی مظہر ہے :-

”جو اپنے دیوتا سے نہیں ڈرتا وہ نرکل کی طرح کٹ جاتا ہے  
جو اکثر دیوی کی عزت نہیں کرتا اُس کے اعضاء و رگڑ گڑھ جاتے ہیں  
وہ آسمان کے ستاروں کی طرح غائب ہو جاتا ہے  
وہ رات کے پانی کی طرح پھسل جاتا ہے۔“

ابھی قوتِ رحمان و رحیم تھی اور سچا نائب اپنے دیوتا سے معافی کی توقع کر سکتا تھا :-

”میں اپنے رحمدل دیوتا سے رجوع کرتا ہوں۔ اُسکی مدد چاہتا

ہوں اور آپیں بھرتا ہوں

جو افعالِ بد میں نے کئے ہیں سوا انہیں اُڑا لے جائے

میرے گناہوں کو کپڑے کی طرح چھپا ڈال :-“

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ ہر دیوتا کو انفرادی طور پر سب سے بڑا سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ہر دیوتا کا نام بچے اور واحد خدا کا نام نہ تھا۔ یا بالفاظِ دیگر کہ وہ ان سب میں ایک ہی خدا کی قوت کو کارفرما پاتے تھے۔

# مصر قدیم کا مذہب

مصر کی تاریخ نہایت وسیع ہے۔ مینیس نے ۳۴۰۰ ق۔ م پہلے حکمران خاندان کی بنیاد ڈالی۔ ۳۳۲ ق۔ م جب سکندر نے مصر کو اپنی مملکت میں شامل کیا تو اُس وقت مصری اہلسل حکمرانوں کے ۳۱ ویں خاندان کا خاتمہ ہوا۔ اس کے بعد یونانی، رومی اور مسلمان حکمرانوں نے مصر پر حکومت کی۔ چونکہ اہل یونان درودہ بُت پرست تھے لہذا ان اقوام کی حکومت کے زمانہ تک مصر کا قدیم مذہب زندہ رہا لیکن مصر میں اسلامی اقتدار قائم ہونے کے بعد اُس کا خاتمہ ہو گیا۔

تاریخی زمانہ سے قبل مصر کا ملک چھوٹے چھوٹے ملکوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہر حصے کو "نوم" کہتے تھے اور ہر نوم کا ایک **حیوان پرستی** الگ "ٹوٹم" یا حیوانی دیوتا تھا۔ جب انسانی صورت و صفات والے دیوتاؤں کی پرستش شروع ہوئی تو انسانی جسم پر حیوان کا سر لگا کر "مرکب معبود" بنائے گئے۔ غالباً ابتدا میں مصریوں کا یہ عقیدہ نہ تھا کہ فی الحقیقت دیوتاؤں کی یہی صورت ہے بلکہ اسے محض رمز و کنایہ سمجھا جاتا تھا۔ بعض مذہبی رسوم میں پر و ہمت جانوروں کے مصنوعی چہرے لگا کر دیوتاؤں کا پارٹ ادا کیا کرتے تھے۔ اس کا مقابلہ ہم تبت کے مذہبی ناچوں سے کر سکتے ہیں۔

اگرچہ اہل مصر، تمدن کے دوسرے شعبوں میں کافی ترقی کر گئے تھے لیکن مذہب کے معاملہ میں بہت پیچھے تھے ان میں کثرت پرستی اتنا کو پہنچ گئی تھی۔ تخمینہ کیا گیا ہے کہ اہل مصر کے تقریباً دو ہزار دوسو معبود تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک خاص جانہ تھا۔ مصری معبودوں اور ان کے مخصوص جانوروں کی ایک مختصر فہرست یہ ہے :-

۱۔ آئی سس دیوی (گائے)	۱۔ اوسرنہ دیوتا (بیل)
۲۔ ہاتھور " (گائے)	۲۔ ہورس " (باز)
۳۔ باست " (بٹی)	۳۔ سیٹ " (گدھا)
۴۔ شیتہ " (گدھ)	۴۔ انومیس " (گیدڑ)
۵۔ رافوت " (سانپ)	۵۔ پتاح " (گوبریا)
۶۔ سرک " (بجھو)	۶۔ تھوتہ " (غلق)
۷۔ سخیت " (شیرنی)	۷۔ سبیک " (گمر)

ان میں سے بیشتر کا جسم انسان کا اور سر حیوان کا تھا۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ مصر کے تمام وہ دیوتا جن کے حیوانی سر تھے مصر والوں کے اپنے تھے اور جن کے سر حیوان کے نہ تھے وہ باہر سے آئے تھے۔ چنانچہ اس بات کے کافی ثبوت موجود ہیں کہ اوسرنہ اور آئی سس کی پرستش تک شام سے آئی تھی۔ اسی طرح پتاح جس کا سر انسان کا بنایا جاتا تھا سامی قوم کا معبود تھا جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے اُس کے نام کے معنی "کھولنے والے" کے ہیں (عربی مفتاح - معنی "کنجی")

مصر والوں کا عقیدہ تھا کہ دیوتا مختلف جانوروں کے قالب میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بیل کو اوسرنہ کا اوتار مانتا جاتا تھا۔ اس کے شاخوں کے لئے چند نشانیاں مقرر تھیں۔ جس بیل میں وہ علامتیں پائی جاتیں وہ اوسرنہ کے مندر میں لا کر رکھ دیا جاتا تھا اور اُس کا دیوتا کی طرح اختتام لہاتا تھا اور یہی حال تمام دوسرے جانوروں کا تھا۔ ہر دیوتا کے مندر میں مخصوص جانور رکھتے تھے جن کی پرستش کی جاتی تھی۔ اگرچہ بعد

اعلیٰ معبودوں سے اس حیوان پرستی کا خاتمہ ہو گیا لیکن جانوروں کی عزت میں فرق نہ آیا۔ بعض صورتوں میں جانوروں کو مارنے کی سزا موت تھی اور جانوروں کے مرنے کے بعد ان کی جی بنائی جاتی تھی۔ جانوروں کی حفاظت کا اس قدر خیال تھا کہ دو شہریوں میں عرصہ تک صرف اس لئے جنگ ہوتی رہی کہ ایک شہر والوں نے گھر کو ارڈالا تھا جس کی دوسری شہر پرستش کرتا تھا۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ اہل مصر میں پہلے منظر فطرت کی پرستش کا رواج ہوا یا حیوان پرستی کا۔ بہر حال ان کے معبودان فطرت پرستی فطرت میں خاص تھے :-

۱۔ نوط (آسمان کی دیوی)	۷۔ اوسرنہ (خداوند نور)
۲۔ سیب (زمین کا دیوتا)	۸۔ ہورس سورج دیوتا
۳۔ تھوتہ (چاند کا دیوتا)	۹۔ را
۴۔ آئی سس (چاند کی دیوی)	۱۰۔ ہراجس
۵۔ ہاپی (روہنل کا دیوتا)	۱۱۔ آمین
۶۔ سیت (خداوند ظلمت)	۱۲۔ آٹن

اس مختصر فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ سورج مصریوں کا خاص معبود تھا جس کی نمائندگی مختلف دیوتا کرتے تھے۔ ان کی ذہنی روایتوں میں آفتاب کو خالق عالم کی حیثیت حاصل ہے۔ آئی سس اُس کی بیوی تھی اور ہورس اُس کا بیٹا۔ یہ مصریوں کی خاص نشیبت تھی۔

مصر میں بادشاہوں کو سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا تھا۔ فراعزہ مصر اپنے کو "سورج کا بیٹا" کہتے تھے اور ان کی دیوتاؤں بادشاہ پرستی کی طرح تنظیم کی جاتی تھی۔ اگرچہ اسلامی روایات میں فرعون کا خدائی کا دعویٰ کرنا ظاہر کیا جاتا ہے، لیکن تاریخی اعتبار سے اس قول میں تین غلطیاں ہیں۔ (۱) فرعون کوئی ایک شخص نہ تھا بلکہ ہر بادشاہ کا لقب تھا (۲) کسی فرعون نے "خدا" ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ کوئی شخص باور کر سکتا تھا کہ وہ دنیا کے خالق اور موت سے مستثنیٰ ہیں۔ (۳) مصر میں خالص توحید کا وجود نہ تھا۔ فراعزہ مصر توحید کے تئیں ہی سے نا آشنا تھے تو وہ خدائے واحد ہونے کا دعویٰ کیسے کر سکتے تھے۔

اہل مصر کا یہ عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد انسان کی روح برقرار رہتی ہے اور اُس کا تعلق جسم سے بھی قائم رہتا ہے۔ اس خیال کے پیش نظر انھوں نے لاش کو حنوط کرنے کا فن ایجاد کیا اور خاص قسم کے مقبرے (اہرام) بنائے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جب کوئی آدمی مر جاتا ہے تو اُس کی روح قوت یعنی دوسری دنیا میں ایک خوفناک سفر کے بعد اوسیرنہ کے انصاف کے کمروں میں پہنچنا پڑتا ہے۔ کتاب الموتی (Book of Dead) اور کتاب الابواب (Book of Gates) اس بات کی ہدایت کے لئے لکھی گئی تھیں کہ دوسری دنیا کے سفر میں ارواح فہینہ سے کیونکر بچ جائے۔ جب روح اوسیرنہ کے سامنے پہنچتی تھی تو وہاں تین محاسب ہوتے (۱) اوسیرنہ (۲) انوبیس (۳) تھوتہ۔ انصاف یوں ہوتا تھا کہ انسانی اعمال ترازو کے ایک پتے میں رکھے جاتے جاتے اور دوسرے پتے میں شتر مرغ کا پرچہ نیک کرداری کی علامت تھی۔ اب اگر دونوں پتے برابر ہوتے تو روح کو جنت میں بھیج دیا جاتا ورنہ اُسے ایک جانور کے سامنے ڈال دیا جاتا تھا جسے "مردہ خور" کہتے تھے۔ یہ جانور شیر، لکڑ اور دریائی گھوٹے کا مرکب تھا۔

دیوتا انسانوں، حیوانوں، پودوں وغیرہ کی صورت اختیار کر سکتے تھے انھیں خدا کی ضرورت تھی اور قربانی انسانوں جیسے دیوتا میں انھیں کھانا پانی پیش کیا جاتا تھا اور کپڑے زیور وغیرہ بھی دیوتاؤں کی نذر کئے جاتے تھے، دیوتاؤں کے کہنے

کے لئے مناد اور عبادت کا پس بنائی جاتی تھیں۔

انسانوں اور دیوتاؤں کا تعلق لین دین کا ساتھ تھا۔ عابد معبود کی ضرورتوں کا خیال رکھتا اور معبود عابد کو سادی تھے۔ زندگی، صحت برومندی، خوشی اور فتح وغیرہ عطا کرتا۔ مندروں کی ابھری ہوئی تصویروں میں بادشاہوں اور دیوتاؤں کو روبرو معاہدہ کرتے یا آپس میں تحفے تبدیل کرتے دکھایا گیا ہے۔

بھوک پیاس کے علاوہ مقررے دیوتاؤں کی راحت اور خوشی کو بھی محسوس کرتے تھے۔ وہ بیمار بھی پڑتے تھے۔ بوڑھے بھی ہوتے اور مرتے بھی تھے۔ مہوگ پیاس کے علاوہ مقررے دیوتاؤں کا خاص دیوتا تھا جس کی عبادت کا خاص مرکز ہیلیوپولس تھا۔ پانچویں حکمران خاندان کے بادشاہوں نے ہرمس کے قرب و جوار میں اُس کے متعدد معابد بنوائے تھے اور اسی وقت سے فراغہ مقررے کو "واکا بیٹا" کہنے لگے۔ راکو دیوتاؤں اور انسانوں کا بادشاہ مانا جاتا تھا۔

## دیوتا جادو ٹونے کے تابع

مصر میں ابتدائی سے سحر و افسوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی، چنانچہ پانچویں اور چھٹے حکمران خاندان کے اہم پر جو کہتے ہیں وہ سب سحر و افسوں پر مشتمل ہیں، ان کا نشانہ دیوتاؤں کو اس بات پر مجبور کرتا تھا کہ وہ مرنے والی کو دوسری دنیا میں ایک پرست زندگی بخشیں۔ کتاب الموتی تیار کرنے کا بھی یہی مقصد تھا۔ بیماریوں کے علاج میں (جنہیں اراج فہیہ کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا) صحیح منتر کو صحیح طور پر پڑھنا ضروری سمجھا تھا۔ طب کی کتابوں میں پندرہ بھی شامل کئے جاتے تھے۔ اُس ساحر کو جو منتروں کو ذبانی یا کتاب سے صحیح طور پر پڑھ سکے مصری سماج میں بڑی عزت حاصل تھی اور ہر شخص سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ خاص خاص منتروں کو ذبانی یاد کرے تاکہ مرنے کے بعد دوسری دنیا میں اُن کا استعمال کر کے اراج فہیہ کو وضع کر سکے۔ تعویذ بھی اسی خیال کے پیش نظر رکھے جاتے تھے۔ جن کے پاس وہ تعویذ ہوتے اُن کی حفاظت کرنے کے لئے دیوتا مجبور تھے اور بری رو میں اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکتی تھیں۔

زمانہ مابعد میں مصر کے غریب طبقہ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر دیوتاؤں سے التجا اور التماس کی جائے تو وہ انسانوں کی ضرورت مدد کرتے ہیں۔ یہ چیز ۱۲۰۰ ق۔ م کے نقیش کے کتبوں میں خصوصیت سے نظر آتی ہے۔ اس خیال کے پیش نظر بعض دیوتاؤں کے بہت سے کان بنائے جاتے تھے تاکہ وہ ہر ایک کی گزارش کو سن سکیں۔

مصر کے تمام دیوی دیوتاؤں میں امن راکا مرتبہ سب سے بلند تھا۔ وہ زرخیزی و بار آوری کا دیوتا تھا، جنگ کا دیوتا دو بڑے معبود تھا، سورج اور دریائے نیل کا دیوتا تھا۔ دیوتاؤں کا بادشاہ اور دنیا کے بادشاہوں کا آقا تھا۔ وہ نظر آنے والی اور نظر آنے والی دنیاؤں کا مالک تھا۔ وہ کائنات کی پراسرار روح اور مخفی خالق تھا۔

اسی طرح میفس کے پتلیج کا تصور بھی خدا کے تصور سے قریب تر تھا۔ مصری روایات کے مطابق اُس نے ہتھوڑے سے پیٹ کر لوہے کا آسمان بنایا، اُسے گہوارے کے چاک کا موجد مانا جاتا تھا جس پر اُس نے سورج، چاند اور پہلے مرد اور عورت کو بنایا۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ وہ ایک بڑے پر مٹیہا ہے۔ اُس کا سر آسمان کو روکے ہے اور اُس کے پیر تحت الارض تک پہنچتے ہیں۔ گویا وہ ساری دنیا کا دیوتا ہے۔ اُس کے بارے میں ایک شاعر کہتا ہے :-

"کسی باپ نے تجھے پیدا نہیں کیا اور نہ کسی ماں نے تجھے جنم دیا

تو نے خود اپنے کو بنایا، بغیر کسی دوسری ہستی کی مدد کے"

پیدائش عالم کے بارے میں دو نظریے تھے۔ ایک تو یہ کہ دنیا ایک خاص قسم کے مادے سے پیدا ہوئی ہے اسے "مادی وحدت" (Materialistic Monism) کہتے ہیں۔ بعد کو داغ کا مرتبہ مادے سے برتر مانا گیا اور یہ عقیدہ سدا ہوا تھا کہ ہر جان توئی ایک برتر داغ کے زیر اثر ہیں جو علت اولیٰ ہے اسے "تصور وحدت" (Idealistic Monism) کہتے ہیں۔ ہندوستان اور مصر قدیم میں یہ خیال پایا جاتا تھا۔

**ایک فرعون کی پیغمبری** جب آمین حوٹیب سوم نے وفات پائی تو اُس کا کسوس بیٹا آمین حوٹیب چہارم (۳۴۵ء - ۳۵۸ء ق۔ م) تخت نشین ہوا جس نے باوجود اس کے کہ صرف ۱۷ سال حکومت کی اور ۳۰ سال کی عمر میں مر گیا تاریخ عالم میں ایک بہت بڑی مذہبی تحریک چلائی۔ اُس نے حکم دیا کہ اُس کی قبر میں ہر جگہ صرف آتش (Aton) یعنی آفتاب کی پرستش کی جائے پڑانے دیوتاؤں کے منادر (جن میں کارناک کا آمین راکا مندر بھی شامل تھا) بند کر دئے گئے۔ یہی نہیں بلکہ دیواروں پر سے دوسرے دیوتاؤں کے نام بھی مٹا دئے گئے اور دارالحکومت کو تھیبیس سے آمرنہ (موجودہ تل الکامرنہ) منتقل کر دیا گیا۔ آمین حوٹیب نے اپنا نام بھی بدل دیا۔ (اُس کے نام کے معنی ہیں "آمین آرام کرتا ہے") اور اختاٹن رکھا جس کے معنی ہیں "آمین مطمئن ہے"۔

آتش کی عبادت نئی نہ تھی لیکن اس کا تصور ضرور نیا تھا۔ سورج دیوتا کی پرستش سارے ملک میں عام تھی لیکن وہ سرسرخ خرافات کا مجموعہ تھی۔ اختاٹن نے آفتاب کی افادیت پر زور دیا۔ حیات بعد ممات کے بارے میں مصریوں میں جو بہت تنگ تصورات پائے جاتے تھے انھیں بھی اختاٹن نے اپنے مذہب میں کوئی جگہ نہ دی۔ اختاٹن کا خیال تھا کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اُس کی روح ایک غیر مادی صورت میں برقرار رہتی ہے جیسا کہ جنت کے خواب آور کورل میں آرام کرتی ہے اور کبھی کبھی سایہ کی صورت میں زمین کے اُن مقامات کو دیکھنے جلی آتی ہے جنہیں وہ اپنی زندگی میں بہت عزیز رکھتی تھی۔ روح اب بھی خوشگوار دھوپ۔ چڑیوں کے نغموں اور پھولوں کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہو سکتی تھی۔ بدکار روحوں کے لئے دوزخ کا کوئی ذکر نہیں کیونکہ اختاٹن کے نزدیک خدا کسی بھی مخلوق کو خواہ وہ کیسا ہی گناہگار کیوں نہ ہو دائمی اذیت میں مبتلا نہیں کر سکتا۔ بدروحوں کے لئے ایک ہی سزا تھی یعنی مرنے کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتیں۔

اختاٹن نے آتش کا کوئی مجسمہ بنانے کی بھی اجازت نہیں دی۔ وہ خدا کو بے شکل و صورت بتاتا تھا۔ ایک قسم کا الہی جو ہر جسامت میں فضا میں پھیلا ہوا ہے۔ اُس کا نظریہ ایک عجیب چیز تھی جو نہ صرف اپنے اعلیٰ ظرفی کے لحاظ سے قابل قدر تھا بلکہ اُس میں سائنسی طرز پر بھی کافی صحت تھی۔ اُس سے پہلے کسی بھی شخص کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہوا کہ آفتاب اپنی شعاعوں کے ذریعہ عمل کرتا ہے اور وہی حیات، حسن اور توانائی کا منبع ہے۔

ملک گیر ی اور غیر مذہبی آتش پرستی کے خلاف تھی۔ اختاٹن کے بعض محکموں نے بغاوت کر دی۔ ایشیائے کوچک کی حملی قوم نے شام پر قبضہ کر لیا اور فلسطین پر عبرانیوں نے حملہ کر دیا اور اُس پر قبضہ بھی کر لیا لیکن اختاٹن نے انھیں دوبارہ حاصل کرنے کے لئے فوج کشی تک نہ کی۔ دراصل اختاٹن اپنے زمانہ اور اپنی قوم کے لئے بہت بڑا شخص تھا۔ اُس نے جس مذہب کی بنیاد ڈالی وہ اُس کے بعد صوف چند سال باقی رہا اور اُس کے داماد توت عنخ آمون نے قدیم مذہب کی تجدید کی۔ آمرنہ کو چھوڑ دیا۔ تھیبیس دوبارہ مصر کا دارالحکومت ہو گیا اور آمین کے بچاریوں کو اپنا کھویا ہوا اقتدار مل گیا۔ اختاٹن کو بد معاش اور بدعتی قرار دیا گیا اور اُس کی ممی (حسوس شدہ لاش) کی بے حرمتی کی گئی۔

آرتھر ویلی فرماتے ہیں :-

"قومیات کے زمانے میں اور ایک ایسے ملک میں جہاں معبودوں کی کثرت انتہا کو پہنچ گئی تھی اختاٹن نے ایک

ایسا وحدت پرست مذہب ایجاد کیا جو پاکیزگی میں صرف عیسائی مذہب کے بعد دوسرا تھا۔"

لیکن تمام ماہرین مصراٹ اس بات پر شفق نہیں ہیں کہ اختاٹن کوئی بہت بڑا مذہبی معلم تھا بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ وہ ایک گمراہ متعصب تھا جس کی لاعلمی اور کٹرین نے ملک کو تباہ کر دیا جس نے اپنے وفادار خادموں کو شام اور فلسطین میں قتل ہونے کے لئے چھوڑ دیا اور اپنی رعایا پر ایک ایسا مذہب مسلط کر دیا جس سے وہ سخت نفرت کرتی تھی۔

# حطی و فنیقی مذاہب

## حطی مذہب

حطی قوم کے عروج کا زمانہ ۲۰۰۰ سے ۱۲۰۰ ق۔ م ہے یہ لوگ ایشیائے کوچک اور شام میں آباد تھے، ان کا دار الحکومت بومفاذ کوئی تھا جہاں سے ماہرین آثار نے ۱۰،۰۰۰ مٹی کی تختیاں برآمد کی ہیں جن کے کتبے پیکانی رسم خط کے ہیں۔ ان کتبوں سے حطیوں کی تاریخ، قوانین اور مذہب پر خاص روشنی پڑتی ہے۔ علاوہ ازیں حطی مذہب کا علم اُن جبری نقوش سے حاصل ہوتا ہے جو اُن کے معابد اور بعض دیگر مقامات سے برآمد ہوئے ہیں۔

اس قوم کا خاص معبود آفتاب تھا جسے بجائے دیوتا کے دیوی مانا جاتا تھا۔ واسلی کہا (Vasili Kaya) کے ایک نقش میں سورج دیوی کو تین دوسے یا چھتے پڑاپنے خادموں کے جھرمٹ میں استادہ دکھایا ہے۔ اُس کے مقابل اُس کا شوہر تیشپ یعنی طوفان کا دیوتا بیل پڑاپنے خادموں کے درمیان کھڑا ہے۔

کتبوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے (ان کی زبان ہند یورپی شاخ سے تعلق رکھتی ہے اور لاطینی سے مشابہ ہے) کہ ان لوگوں نے بہت سی مذہبی رسمیں باقی اور آشوریہ والوں سے حاصل کی تھیں۔ اسی طرح یہ لوگ سریانی معبود حداد کی پرستش کرتے تھے۔ یہ لوگ ارواح خبیثہ پر بھی اعتقاد رکھتے تھے جن سے بچنے کے لئے سحر و افسوں سے کام لیا جاتا تھا۔ بیماری کو دور کرنے اور زرخیزی کو بڑھانے کے لئے کچھ قوم آمیز رسوم ادا کی جاتی تھیں۔

فنیقی قوم بھرمتوسط کے مشرقی ساحل پر آباد تھی اور انھیں کے نام سے یہ علاقہ فنیقیہ (Phoenicia) کہلاتا تھا۔ فنیقی مذہب اُس کی پشت پر کوہ لبنان واقع تھا جو انھیں بیرونی حملوں سے محفوظ رکھتا تھا اور جس کے جنگل اُن کے جہازوں کے لئے کڑی جہیزا کرتے تھے۔ لبنان کے دوسری طرف بنی اسرائیل آباد تھے جو اہل فنیقیہ کی طرح سامی النسل تھے۔ یہ دو قومیں تقریباً ۱۲۰۰ ق م میں ساحل بحرین (جنوبی عراق) سے ہجرت کر کے آئی تھیں۔

فنیقی قوم نے جو دنیا کی زبردست تاجروں میں سے ایک تھی اپنے ملک سے باہر دوسرے ملکوں میں (بھرمتوسط کے کئی کئی ملک) نوآبادیاں قائم کر لی تھیں فنیقیہ میں اُس نے دو زبردست تجارتی شہر صیدا (Tyre) اور صیدون (Sidon) آباد کئے تھے۔ علاوہ ازیں بائبلوس (Byblos) بھی اُن کا ایک مشہور شہر تھا۔

اہل فنیقیہ کی زبان عربی سے مشابہ تھی۔ اُن میں شمالی سامی رسم خط مستعمل تھا جو عربی، عبرانی، سریانی اور یونانی رسم خط کا اخذ تھا۔ ۸۰۰ ق م کلدانی حکمران بخت نصر نے فنیقیہ کو فتح کر لیا اور صیدا کو برباد کر دیا۔ صیدا کی بربادی کے بعد فنیقی قوم کا زوال شروع ہو گیا جسے سکندر کی فتوحات مکمل کر دیا۔

ابستاء بعض مستشرقین کا یہ خیال ہے کہ ابتدا میں یہ لوگ غالباً موحد تھے اور ایک قوت مطلق کے قائل تھے۔ مگر وہ اپنی (مطلق) قوت یارمن (بلند)، بعل (آقا)، میلک یا مورخ (بادشاہ)، ایلیون (برترین)، ایڈونائی (میرا آقا)، بیل سامین (آقا کے ملک) وغیرہ ناموں سے پکارتے تھے۔ وہ اُسے مادہ سے بالکل جدا مانتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اُس نے سب مادی چیزوں کو بنایا اور ہر شے کو پیدا کیا۔ لیکن جلد ہی اس عقیدہ میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور مختلف دیوتاؤں کی پرستش ہونے لگی۔ جن میں سے بعض بابل سے لائے گئے جیسے اشتر اور بعض

نصرے جیسے تھوٹے اور آئین اس طرح خدائے واحد (ایل "اعلیٰ" یا ایلوین "برتر ہستی") کا تصور پارہ پارہ ہو گیا اور ہر پارہ ایک جدا معبود بن گیا۔ لیکن ان تمام دیوی دیوتاؤں میں بعل اور استارہ کو خاص امتیاز حاصل تھا۔

بعل دیوتا۔ یہ آسمان، آفتاب اور آگ کا دیوتا تھا۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ بعل اور بایلی دیوتا بیل (Bel) میں کیا تعلق تھا۔ کیونکہ بایلی میں بیل کا آفتاب سے کوئی تعلق نہ تھا اور بعل یقیناً آفتاب کا دیوتا تھا اور اُس کا تعلق تولید و تخلیق سے بھی تھا۔ زمانہ قدیم میں بعل کی پوجا (صنوبر اور اُس کی نوآبادیوں میں) بغیر بت کے کی جاتی تھی۔ لیکن بعد میں اس نے شدید بت پرستی کی صورت اختیار کر لی۔ اُس کا بت بیل پر سوار دکھایا جاتا تھا، کیونکہ بیل تولیدی قوت کا مظہر تھا اور اُس کے ہاتھوں میں انگور کے خوشے اور انار ہوتے تھے۔ اُسے آسمان کا حکمران مانا جاتا تھا جو زمین کو حاملہ کرتا ہے، اُس کے انسانی چہرے کے گرد کرفوں کا حلقہ ہوتا تھا۔

بعل کی عزت میں یونان جلانے کے علاوہ بیلیوں کی قربانی بھی کی جاتی تھی اور شاید گھوڑے بھی ذبح کئے جاتے تھے۔ لیکن خاص قربانی بچوں کی ہوتی تھی۔ یہ ہولناک رسم اس تخیل پر مبنی تھی کہ بچے والدین کے لئے سب سے پیاری شے تھے اور پاک اور معصوم ہونے کی بنا پر ان کی قربانی دیوتا کا غصہ فرو کرنے کے لئے زیادہ کارگر ہوتی تھی۔ بچوں کی قربانی کا یہ طریقہ تھا کہ مولگ کا بت جو دھات کا بنا ہوتا اندر آگ جلا کر گرم کیا جاتا تھا اور بچوں کو اُس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں دے دیتے جو ہاتھوں سے ٹھک کر وہ اُس کی آتشیں گود میں جا گرتے۔ والدین خوشی اپنے بچوں کی قربانی کرتے تھے حتیٰ کہ پہلا بلکہ اکلوتا بیٹا بھی قربان کر دیا جاتا تھا۔ بچوں کو پہلا پھسلا کر چپ کر دیتے کیونکہ بھینٹ چڑھائے جانے والے بچے کو رونانہ چاہئے تھا۔ اُس کی چیخ کی آوازوں کو بانسریوں اور نقاروں کی آواز سے دبا دیا جاتا تھا۔ پوتارچ کے بیان کے مطابق مائیں قریب ہی کھڑی رہتیں اس طرح کہ تو اُن کی آنکھوں میں آنسو ہوتے اور نہ لبوں پر آہ وزاری۔ اگر وہ سسکیاں بھرتیں تو قربانی کی عزت جاتی رہتی۔ یہ قربانیاں یا تو سالانہ کسی مقررہ دن میں ہوتیں یا پھر کسی مصیبت کے وقت دیوتا کا غصہ فرو کرنے کے لئے۔

استارہ دیوی۔ یہ زمین، پانی اور چاند کی دیوی تھی۔ چاند سے تعلق ہونے کی بنا پر اسے آسمان کی ملکہ اور ستاروں کی حکمران مانا جاتا تھا۔ بعل اس کا شوہر سمجھا جاتا تھا اور عورتوں میں وہ زرخیزی و بار آوری کی دیوی سمجھی جاتی تھی، اسی لئے اس کی عبادت شہر پوتی اور جنسی ہوسرانی پر مبنی تھی۔

اس کا بت یوں بنایا جاتا کہ ہاتھ میں عصائے شاہی اور تھکا ہوتا، کمر میں چمکا اور سر پر کرنوں کا تاج یا سینگ جو ہلال کی علامت تھے کبھی اُس کے سر پر ایک قیمتی پتھر رکھا جاتا جس سے رات کو سارا مندر جگمگا اٹھتا۔ اُس کا سنہرے بعل کے ساتھ ایک رتھ میں بھرا یا جاتا جس میں شیر جتے ہوتے۔

استارہ کی پرستش دوسری طرح ایک مخروطی ستون کی صورت میں بھی کی جاتی تھی جسے اخیر کہتے تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اشوریوں کا "مقدس درخت" تھا۔ جسے عموماً مندروں میں نصب کیا جاتا تھا (۲ سلاطین باب ۲۱، آیت ۷، باب ۲۳، آیت ۶) افاکا (Aphaca) میں اُس کا مندر زرد جواہر سے چڑھتا تھا یہاں تک کہ کمر لیس (Circumference) کو وہاں کے سونے چاندی کے کل برتنوں اور دیگر قیمتی اشیاء کو تولنے میں کئی دن لگے۔ مندر کے صحن میں مقدس جانور پے ہوئے تھے اور ایک تالاب میں مقدس مچھلیاں۔ ان کے علاوہ بانسری بجانے والوں اور مجذوب عورتوں کی بھی کثیر تعداد موجود رہتی تھی۔

بہار کے ہوا میں جسے "مٹھلوں کا جشن" کہتے تھے، لوگ جتنے درجنے شریک ہوتے، بڑے بڑے درخت جن میں قیمتی چڑھاوے لٹکے ہوتے جلائے جاتے تھے۔ بچوں کی بھی قربانی کی جاتی تھی۔ انھیں چرٹ کے تھیلوں میں بند کر کے مندر کے بلند ترین مقام سے فرش پر پٹکایا جاتا تھا اور یہ بیان کیا جاتا کہ اُن میں بچے نہیں ہیں۔ بلکہ پھڑے ہیں۔ صحن کے اگلے حصے میں دو زبردست لنگ نصب تھے، ڈھولیں، بانسریں

لے کشتان میں بعل کا نام لگ یا مولک تھا۔

اور گیتوں کے پیمان انگیز شور میں مجذب و جوش نہیں جھیں گے (Zillah) کہتے تھے اپنے بازوؤں کو زخمی کرتیں اور تاشائی بھی برتنوں کے ٹوٹنے جوئے ٹکڑوں سے جیسی منشا سے قریب ہی ڈال دے جاتے تھے اپنے آپ کو زخمی کرتے، خونچکاں حالت میں وہ شہر میں دوڑتے پھرتے اور لوگ انھیں پہننے کو زمانہ لباس دیتے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اب یہ بھی دیوی ہو گئے ہیں۔

ٹانوی مجبوس - ان کے علاوہ بعض ایسے دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے جنہیں ٹانوی حیثیت حاصل تھی۔  
ٹانوی مجبوس یہ تھے:-

(۱) ایل یا ایل - شروع میں خدائے تعالیٰ کا نام تھا جسے بعد میں ایک معمولی مجبوس بنا دیا گیا۔ کاریج میں اسے خصوصیت کے ساتھ پوجا جاتا تھا۔ ایل کا مقابلہ یونانی اپنے کروئوس سے اور روم والے بیرون سے کرتے تھے۔

(۲) میلکارمہ - اسے ایک کتبے میں بعل سور یعنی "سور کا آقا" کہا گیا ہے اسے شہر کا محافظ و سرپرست مانا جاتا تھا۔ یونانیوں نے اسے اپنا برقیس سمجھا (دیکھئے ۹) اور فنیقیوں نے بھی اسے تسلیم کر لیا، چنانچہ ان فنیقی سکول پر یونانی سکول کی نقل میں بنائے گئے تھے اکثر ہرقلیس کی شبیہ نظر آتی ہے گویا وہ ان کے شہر کا مجبوس ہو۔

(۳) دجون یا داگن (Dagon) - غیر ملکی مجبوسوں میں سے ایک تھا جسے فنیقیوں نے اپنا لیا تھا (سموئیل باب ۵، آیت ۴ میں اس کا ذکر ہے) عام طور سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس کی صورت مچھلی کی تھی اور اس کے بیماری اس کے مندر میں مچھلی کی کھال اوڑھ کر جاتے تھے۔ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اس کے نام کا تعلق عبرانی زبان کے لفظ "دج" سے مانا جاتا ہے جس کے معنی مچھلی کے ہیں۔ فلسطینیوں میں اس کا مقام بہت بلند تھا، فنیقیہ میں وہ ایک جھوٹے درجہ کا مجبوس تھا اور اسے فیلو کی سند پر فنیقی مجبوسوں میں شامل کیا گیا ہے۔

(۴) حداد (Hada) (اداد یا ادود) ایک سریانی مجبوس تھا جسے اہل فنیقیہ سورج مانتے تھے۔ لیکن زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔

(۵) ایڈونیس (Adonis) یا زیادہ صحیح ایڈونائی کے معنی "میرے آقا" کے ہیں۔ زمانہ قدیم میں شاید بعل کا لقب تھا لیکن بعد میں یہ سورج دیوتا یا اس کی ایک خاص حالت کا نام ہو گیا۔ جازوں میں جب سورج شمالی نصف کرے سے جنوب کی طرف مایل ہوتا تو یہ سمجھا جا کہ وہ وقتی طور پر مر گیا ہے۔ اسے ایڈونیس کی موت سے تعبیر کرتے۔

در اصل ایڈونیس اس مشہور بابلی روایت کا ہیرو ہے جو "فسانہ تموز و اشتر" کے نام سے مشہور ہے۔ وہ تموز کا مقابل ہے اور اشتر ہی کو اہل فنیقیہ، استارتہ کہتے تھے۔ اشتر کا تعلق زہر و سیارہ اور حسن و عشق سے مانا جاتا تھا۔ ایک روایت کے مطابق جو "قصہ تموز و اشتر" کے نام سے مشہور ہے وہ اپنے مردہ شوہر تموز کو زندہ کرنے کے لئے پناہ لوگ میں آجہاںات لینے جاتی ہے اسے مردوں کی دنیا کی با آقا تو تک پہنچنے کے لئے سات دروازوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ ہر دروازے پر ایک نقاب یا پوشش اتارنے پر مجبور کی جاتی ہے یہاں تک کہ جب وہ آخری دروازہ پر پہنچتی ہے تو بالکل ہی عریان ہوتی ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں زمین کی زرخیزی و بار آوری ختم ہو جاتی ہے لیکن جب وہ واپس آتی ہے تو پھر دوبارہ زندہ ہو جاتی ہے۔

(۶) صادق (Sad yk) یعنی عدل و انصاف کا مجبوس۔

(۷) ایشیم (Eshmun) ، صادق کا آٹھواں بیٹا تھا۔ فنیقی روایات کے مطابق وہ ایک خوبصورت اور پاکدامن فوجاں تھا۔ شکار کا شوقین تھا۔ استارتہ دیوی اس کی محبت میں مبتلا ہو گئی اور وہ یقیناً اس سے ناجائز تعلقات قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی تھا۔

۱۱۔ اس صورت میں اس کا مقابلہ ایل والوں کے اوچس (Oannes) سے کیا جاسکتا ہے جس کا بیچ کا جسم مچھلی کا اور اوپر کا جسم انسان کا تھا۔ کہتے ہیں اسی نے انسان کو تمدن کی تعلیم دی۔

اُس نے بچنے کے لئے اپنے ہوا سنہ نہ کر دیا ہوا۔

(۸) گامیری یا کیری (Kalyani) بمعنی ”بڑے معبود“ کہتے ہیں انھوں نے پہلے پہلی دھات کی چیزیں بنانا معلوم کیا اور جہاز بنائے اس لئے انھیں جہاز رانی کے دیوتا اور دھات کے کام کے نگہبان مانا جاتا تھا۔ انھیں پونا اور جسمانی لحاظ سے ناقص دکھایا جاتا تھا۔  
(۹) ڈرکیٹو (Derketu) غالباً فلسطینی معبود تھی نہ کہ فنیقی۔ اس کی عبادت کا خاص مرکز اسکلن (Ascalon) تھا۔  
اسے فلس ماہی سے ڈھکا ہوا دکھایا جاتا، اسے ہم استارتہ کی طرح فطرت کی دیوی مان سکتے ہیں۔

(۱۰) اونکا (Onca) ایک دیوی تھی۔ یونانی اس کا مقابلہ اپنی اٹھینے (Athena) سے کرتے تھے جو عقل کی دیوی تھی۔  
(۱۱) بلیٹس (Beltes) یہ بابل کی دیوی تھی جس کی پرستش بکرہ روم کے ساحل تک پھیل گئی تھی۔  
ان کے علاوہ اہل فنیقیہ بعض غیر ملکی معبودوں کی بھی پرستش کرنے لگے تھے جن میں مصری معبود اوسیرس آئین اور تھوٹہ خاص تھے۔  
آئین کو ”حمس“ کہتے تھے اور اُسے بعل کے مائل مانا جاتا تھا۔

ان کے مذہب میں ایک طرف تو بے باک مذہبی عیاشیاں پائی جاتی تھیں اور دوسری طرف مافوق البشر قوتوں کی برہمی اور مکر کے لئے انسانی قربانیاں، لبنان میں دریائے ایڈونیس کے منبع کے قریب افاکا (Aphaca) میں مذہبی عصمت فروشی نے انتہائی شرمناک صورت اختیار کر لی تھی اور پورے فنیقیہ اور اُس کی نوآبادیوں میں ناگہانی آفت کے وقت انسانی قربانی کا عام رواج ہو گیا تھا۔ اس طرح کے خوفی مراسم نے ان لوگوں کے دلوں میں انتہائی سختی پیدا کر دی بجائے اس کے کہ سوداگری اور تجارت سے اُن کی طبیعت میں نفاست اور نرمی پیدا ہوئی، وہ اپنے قیدیوں کے ساتھ بہت بے رحمی کا برتاؤ کرتے تھے۔ بھری ڈاک زنی، اغوا اور ہروادھوں کے سلسلہ میں دیگر وحشت ناک حرکات اُن کی فطرت کا جزو بن گئی تھیں۔

ان کے یہاں موت کو عام طور سے ”ہستی کے نیست ہونے کا وقت“ کہا جاتا تھا۔ مرنے والے ایک ”عالم غموشی میں چلے جاتے تھے“ اور ”گوگئے“ ہو جاتے تھے۔ اُن کی روح ”فنا ہو جاتی“ اور ”گزرے ہوئے دل کی طرح“ ناپید ہو جاتی تھی اس لئے وہ صرون اس بات کی تمنا کرتے تھے کہ مرنے کے بعد بھی لوگ اُنھیں یاد رکھیں۔



بابل والوں کا اونیس دیوتا جو فنیقیوں  
میں دانگن کہلاتا تھا اس کا مقابلہ ہم  
ہندوؤں کے دشنو کر سکتے ہیں۔

# کرپٹ کا مذہب

**مختصر تاریخ** تقریباً ۳۴۰۰ ق۔ م سے لیکر ۱۱۰۰ ق۔ م تک، کرپٹ ایک خاص تہذیب کا مرکز تھا جس کے آثار سرگرمیوں نے ناسس (Knossos) اور دوسرے شہروں میں کھود کر نکالے۔ بعد میں یہی تہذیب یونان کے تین شہروں میں کئی اگست او ٹیڈس میں پھیل گئی۔ کرپٹ کے بادشاہوں نے اسے مغرب میں سسلی اور اٹلی تک اور شمال میں ٹرائے تک پھیلا دیا تھا۔ ان کل مقامات کی تہذیب ایک جہت پر مبنی تھی اور موجودہ یورپی تہذیب کا سرچشمہ ہے۔ خود کرپٹ میں تہذیب کا آغاز مہر اور بابل سے تجارتی تعلقات کی بنیاد پر ہوا تھا۔

**مادر فطرت** کرپٹ کے لوگ مناظر فطرت کی پرستش کرتے تھے اور بعض دیگر اقوام کی طرح ان میں بھی فطرت کا تصور ماں کی حیثیت سے کیا جاتا تھا۔ اس کے مجسمے اس طرح کے ہیں کہ وہ ایک خاص قسم کا پلیٹوں دار فرک پہنے ہوئے ہیں جس کے نیچے کو اس قدر نیچا کر کے گاٹا گیا ہے کہ دونوں چھاتیاں نمایاں ہیں (بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس زمانہ کی عورتوں کا عام لباس تھا) اس دیوی کے ساتھ بعض اور تصاویر بھی بنائی جاتی ہیں جن سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ کرپٹ کے لوگ پانچ دیویوں کی پرستش کرتے تھے (۱) پہاڑ کی دیوی۔ (۲) درختوں کی دیوی۔ (۳) سانپ کی دیوی۔ (۴) فاختہ کی دیوی (۵) جنگلی جانوروں کی دیوی۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ ایک ہی دیوی کی مختلف صورتیں ہوں۔

اس دیوی کو کبھی پہاڑ پر کھڑے دکھایا جاتا ہے جس کے دونوں طرف شیر کا ایک جوڑا پہرہ دے رہا ہے۔ یہ چیز ہمیں ہندوؤں کا دُرگایا پارتی کی یاد دلاتی ہے۔ دُرگاکا سواری شیر اور پارتی کو ہاتھ کی دختر مانا جاتا ہے اور یوں بھی اُس کا پریت یعنی پہاڑ سے کھلا ہوا تعلق ہے۔ شیر طاقتور اور بہادر ہونے کی وجہ سے شجستگی کا مظہر ہے گویا کرپٹ والوں کی دیوی دُرگاکا کی طرح قوائے فطرت کی مظہر تھی۔ اس دیوی کے ساتھ درختوں کی تصویریں بھی بنائی جاتی ہیں جس سے ہمارا خیال فوراً نیچر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ نیچر سے اُس تعلق سانپ سے بھی ظاہر ہے۔ خزاں میں درختوں کی پتیاں جھڑ جاتی ہیں اور بہار میں از سر نو کو نکلیں پھوٹتی ہیں اور درخت ہرے بھرے ہو جاتے ہیں گویا فطرت اپنا پرانا لباس اتار کر نیا پہنتی ہے جیسے سانپ اپنی کچل بدلتا ہے۔ اسی لئے موسموں کی تبدیلی کے اظہار کے سانپ کو بطور علامت اختیار کیا گیا۔ بسا اوقات اس دیوی کے کوہوں پر دو سانپوں کو لپٹے ہوئے دکھایا جاتا ہے اور کبھی سانپوں کو اُس کے بازوؤں اور چھاتیوں پر رینگتے، بالوں میں لپٹے یا سر پر بیٹھے دکھاتے ہیں۔ ہندوؤں میں پارتی کے شوہر شیوجی کے گھڑے پر ناگ لپٹے ہوئے دکھائے جاتے ہیں)

کبھی کبھی اس دیوی کے ہاتھوں یا سر پر فاختہ کو بیٹھے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ فاختہ معصومیت و محبت کی علامت تھی اس سے دیوی کی عصمت کی طرف اشارہ ہے نیز یہ کہ وہ (حیثی) محبت کی بھی دیوی ہے۔ ہندوؤں میں شیوجی کو ”پشو پتی“ بھی کہتے ہیں گویا وہ جانوروں کے مالک ہیں۔ اسی طرح کرپٹ والوں میں بھی مادر فطرت جنگلی جانوروں سے گھرا ہوا دکھایا جاتا ہے۔

المختصر اس دیوی کا تعلق کل مناظر فطرت سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، جانور، سانپ، پرند، سمندر، پہاڑ

اور آبی حفریتوں وغیرہ سے تھا اور ان سب کی پرستش کی جاتی تھی۔

شروع میں اہل کریتیت صحت اسی ایک دیوی کی پرستش کرتے تھے بعد میں ایک مرد دیوتا بھی آگیا جسے ثانوی حیثیت حاصل تھی اس دیوتا کو کبھی اُس کا محبوب اور کبھی اُس کا شوہر ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس دیوی کے بیٹے کا نام ویلکانس (Velchanos) ہے وہ گود میں لئے رہتی ہے اور جسے اُس نے پہاڑ کے ایک غار میں جنم دیا تھا۔ یہی ویلکانس بعد میں یونانی روایت کا زیوس (Zeus) بن گیا اور وہ خود رہیاد (Rhea) بن گئی۔ زیوس کی پیدائش کا مقام اور مدفن کریت کو بتایا جاتا تھا۔ دوسرے دیوتا۔ مادر فطرت کے علاوہ اہل کریت (۱) دوسرے تہر۔ (۲) مقدس جانوروں۔ (۳) مقدس سینگوں اور (۴) ستوں کی بھی پرستش کرتے تھے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:-

تہریا کلہاڑی — کلہاڑی کا پتہ قدیم مصر عجمی سے چلتا ہے۔ دھات سے پہلے کلہاڑیاں پتھر کی بنائی جاتی تھیں۔ کریت قبیلوں اور معبدوں میں جو چڑھاوے کی کلہاڑیاں ملی ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے کلہاڑیاں اکہری ہوتی تھیں۔ دوسرے پھلوا کلہاڑیاں تلنے کا رواج ہونے کے بعد ظاہر ہوئیں۔

انسانی تاریخ میں ایک ایسا بھی زمانہ گزرا ہے جب ہر چیز کو جاندار مانا جاتا تھا اس لئے ممکن ہے کہ کلہاڑی کو بھی جاندار روح کا حامل مانا جاتا ہو۔ تہریا کلہاڑی ”طاقت“ کی علامت تھی۔ مصر میں خدا، دیوتا اور ہر قسم کی ارواح کو جو عام نام دیا، تھا وہ ”نیرت“ تھا (مونٹ ”نیرت“ بمعنی دیوی) جسے ایک دستہ دار کلہاڑی سے ظاہر کرتے تھے۔ غالباً دوسرے تہر پرستش کریت میں مصر سے آئی۔

بیل کے سر اور سینگ — دوسری قوموں کی طرح اہل کریت بھی بعض جانوروں کو مقدس مانتے تھے۔ خصوصاً بیل کو جس کے سر سینگوں کے چھوٹے چھوٹے نمونے لے ہیں۔

مقدس ستھلن — اس سے مراد وہ کھجے تھے جن پر آسمان کو ٹکا ہوا مانا جاتا تھا اور یا پھر یہ اُس پہاڑ کی رموز علامت تھا جس کی چو پر آسمان کو ٹکا ہوا مانتے تھے۔

الغرض کریت والوں کا مذہب ضروری باتوں میں مصر والوں کے مذہب سے مشابہ تھا جو ان دونوں ملکوں کے تجارتی تعلقات سے پیدا ہوئی تھی۔



## یونانی مذہب

یورپ کی زبانیں ہندوستان، افغانستان، ایران، اور آرمینیا کی زبانوں سے گہرا تعلق رکھتی ہیں، اسی لئے انھیں ہند یورپی زبانیں کہتے ہیں۔ ان کا ایک مشہور نام آریائی بھی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان زبانوں کے بولنے والے پہلے کسی ایک مقام پر آباد تھے (خالفاً وسط ایشیا یا مشرقی یورپ میں) وہ ایک ہی نسل کے لوگ تھے اور اپنے کو آریہ کہتے تھے۔ بعد میں یہ لوگ مختلف ممالک میں ہجرت کر کے چلے گئے۔ دیگر اقوام سے شادی بیاہ کرنے سے ان کی نسل مخلوط ہو گئی اور اب آریہ کسی خاص نسل کا نہیں بلکہ زبانوں کے ایک خاندان کا نام ہے۔

ان آریہ نسل کے لوگوں میں سے صرف ہندو اور پارسی اپنے قدیم مذہب پر قائم ہیں۔ بقیہ لوگوں نے یا تو مذہب اسلام کو قبول کر لیا یا عیسائیت۔ یورپ کا موجودہ مذہب عیسائیت ہے۔ قدیم مذہب فنا ہو چکے ہیں۔ ان میں یونانی، رومی، ٹیوٹانی اور کیلتی اقوام کے مذہب خاص تھے جن کا ہندوستان کے قدیم مذہب سے گہرا تعلق تھا۔

یونان میں آریہ نسل کے لوگوں کا پتہ تقریباً ۱۰۰۰ ق۔ م سے چلتا ہے۔ یونان کا تمدن کریٹ اور ایشیائے کوچک کی تہذیبوں سے متاثر ہوا تھا۔ ہندوستانی آریہ لوگوں کی طرح قدیم یونان کا مذہب بھی مناظر فطرت کی پرستش تھا۔ یونانی دیوی دیوتاؤں کے بارہ میں بڑی دلچسپ روایتیں مشہور تھیں جنہیں انیسویں شاعر ہومر نے اپنی مشہور رزمیہ نظمیں *Iliad* اور *Odyssey* میں اور ہیزوڈ نے اپنی تھیوگنی (*Theogony*) میں بیان کیا ہے۔

یہ دیوی دیوتا یونانیوں کے تخیل غیر محدود کی پیداوار تھے۔ یونان سے زیادہ تجسیم بشری کا پتہ کہیں نہیں چلتا۔ نہ صرف مناظر فطرت بلکہ ہر جذبہ و قوت کو شخص مانا جاتا تھا۔

**مناظر فطرت کی پرستش** مناظر فطرت میں سب سے زیادہ آسمان کی پرستش ہوتی تھی۔ اُس کے بعد زمین کی پورا آسمان کا دیوتا تھا اور گے زمین کی دیوی تھی اور یہ دونوں آپس میں پہلے میاں بیوی تھے۔ ان کے ملاپ سے بہت سے بچے پیدا ہوئے جن میں کرائس دیوتا اور ریہ دیوی خاص تھے۔ زیدس جو یونانیوں کا معبود اکبر تھا، کرائس اور ریہ کا بیٹا تھا اور وہ بھی آسمان کا بادشاہ تھا۔

آسمان کے بعد سورج و سہارا ہم معبود تھا۔ اسپارٹاکس کو اُس کے شعلہ بار تھ کو آسمان پر کھینچنے کے لئے گھوڑوں کی ٹہنیوں کو تھے۔ جزیرہ رود کے لوگ ہیلیس کو اپنا خاص معبود مانتے تھے اور سالانہ سمندر میں اُس کے استعمال کے لئے چار گھوڑے اور ایک رتھ ڈالتے تھے اور اُس کے نام پر کالوسس (*Colossus*) کا دیوپیکر مجسمہ معنون تھا جس کا شمار قدیم محفّت عجائبات عالم میں ہوتا ہے۔

سورج کے مقابلہ میں چاند کی اہمیت کم تھی اور سیاروں اور ستاروں کی بہت کم۔ ان کے علاوہ چار جواؤں کے بھی الگ الگ دیوتا تھے جن کا سردار ایولس (*Aeolus*) تھا۔

زیوس کا بھائی ہیریز پاتال کا حکمران تھا جہاں مردوں کی رھیں رہتی ہیں اور جس کے نام پزیرین کے اندر دینی تھے کا نام ہی ہیریز پزیر گیا  
ابلی یونان زمانہ سلف کی دیگر اقوام کی طرح تو اسے تولید کی بھی پرستش کرتے تھے۔ اور ان کے معبودوں کا شمار  
جنسی معبود جنسی جذبات سے تھا۔ ان میں ڈائیونیسس (Dionysus) خاص تھا جس کے نام پر یونانیوں کا سنا  
بڑا شہوار ڈائیونسیا (Dionysia) منایا جاتا تھا۔ اس شہوار میں مردانہ عضو کی صورتوں کا جلوس نکالا جاتا تھا۔ اور مرد  
عورت یکجا ہو کر آزادانہ ایک دوسرے سے مخلط ہوتے تھے۔ ہریمیز (Hermes) دیوتا کا تعلق بھی رنگ پوجا سے تھا  
صنعت لطیف کی نمائندہ ایفرودٹ (Aphrodite) دیوی تھی۔ اپریل کے آغاز میں یونان کے مختلف شہر اس کا بڑا اتہوا،  
ایفرودیزیا (Aphrodisia) مناتے تھے۔ اس موقع پر شہوار میں حصہ لینے والوں کو پوری جنسی آزادی حاصل ہوتی تھی اور  
وہ دل کھول کر داد و تحش دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یونان میں پہلے مختلف دیویوں کی پرستش ہوتی تھی جن کا تعلق زمین سے تھا  
لیکن جب آریہ لوگ آئے تو انھوں نے ”مادری نظام“ کا خاتمہ کر کے ”پدری نظام“ کی بنیاد ڈالی اور دیویوں کو مادری جذبات،  
محرم کر کے شہوانی جذبات کا مظہر قرار دیا۔

قدیم یونانیوں میں بعض جانور بطور نیم معبود کے پوجے جاتے تھے۔ مصر کی طرح انھوں نے انسانی جسم پر حیوانی سر نہیں  
جیوانی معبود لگائے بلکہ مثل ہندوؤں کے اپنے دیوی دیوتاؤں سے خاص خاص جانور منسوب کر دئے یا ان کی علامت قرار د  
یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ کبھی کبھی دیوتا جانوروں کے بھیس میں ظاہر ہوتے ہیں۔ خصوصاً سانپ کی صورت میں۔ غالباً سانپ کو  
پرستش یونان میں کریت سے آئی جہاں ایک ”سانپ دیوی“ کا پتہ چلتا ہے۔ یونان میں سانپ ایتھینہ، ہائیمہ اور اسقلاپ  
کا مظہر تھا۔ بیل، زیوس کا، گائے ہیریز کی، سور ڈیمیٹر کا، چوہا ہائٹو کا، گھوڑا پوزیڈان کا، ہرن آرٹیمس کا، فاختہ ایفرودٹ  
گردہ ایزیز کا اور بکرا پین کا مظہر مانا جاتا تھا۔

یونانیوں کے اعلیٰ معبود کو اولمپس پر رہتے تھے جو تھیسلی میں واقع ہے۔ اولمپیائی معبودوں کی تعداد  
اولمپیائی معبود بارہ تھی :-

(۱) زیوس (Zeus) آسمان کا دیوتا	(۷) ہرمیز (Hermes) تجارت کا دیوتا
(۲) ہیرا (Hera) شادی کی دیوی	(۸) ایتھینہ (Athena) عقل کی دیوی
(۳) پوزیڈان (Poseidon) پانی کا دیوتا	(۹) ہیفائٹس (Hephaestus) صنعت و حرفت کا دیوتا
(۴) ڈیمیٹر (Demeter) اناج کی دیوی	(۱۰) ایفرودٹ (Aphrodite) تولید کی دیوی
(۵) اپولن (Apollo) قانون کا دیوتا	(۱۱) ایریز (Ares) جنگ کا دیوتا
(۶) آرٹیمس (Artemis) شکار کی دیوی	(۱۲) ڈائیونیسس (Dionysus) شراب کا دیوتا

دوسرے اہم معبود یہ تھے :-

ہیسٹیا (Hestia) چولہے کی دیوی	پین (Pan) گلوں کا دیوتا
ایراس (Eros) عشق کا دیوتا	پرسیفون (Persephone) تحت الارض کی دیوی
ہیلیس (Helios) سورج کا دیوتا	ہیڈز (Hades) تحت الارض کا دیوتا،
سلین (Selene) چاند کی دیوی	ملک الموت

ان کے علاوہ بعض دیوی دیوتا ایسے تھے جن کی پرستش ماضی بعید میں ہوئی تھی لیکن بعد میں وہ ثانوی حیثیت  
کے رہ گئے :-

گے (Ge) زمین کی دیوی : کروئس (Cronus) زئوس کا باپ  
یورانس (Uranus) زمین کا شوہر : ریا (Rhea) زئوس کی ماں  
بعض فانی انسان بھی دیوتا بنائے گئے تھے مثلاً :-

ہرقلیس (Herakles) محنت و مشقت کا دیوتا

اسکلاپس (Asklepias) صحت و شفا کا دیوتا

ان میں سے بیشتر وہ تھے جو یونانی عقیدہ کے مطابق دیوتاؤں کے فانی عورتوں سے صحبت کرنے سے پیدا ہوئے تھے مثلاً زئوس دیتا  
رائقینہ کا شہر اتصال ہرقلیس تھا۔ اسی طرح اسکلاپس کا باپ اپالو تھا۔

کلاسیک زمانہ سے پہلے اہل یونان کا عقیدہ تھا کہ مردوں کی رو میں اپنے اخلاق کو فائدہ اور نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ اسلئے  
مائی معبود خاندانی معبود کے سامنے ہر وقت آگ جلا کرتی تھی اور اُس میں اشیا و خوردنی اور شراب کو ڈالا جاتا تھا۔ کلاسیک زمانہ میں  
ان مہم ارواح سے محبت کرنے کے بجائے خون کھانے لگے تھے اور انھیں دور رکھنے کے لئے خاص مذہبی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔

خانگی معبودوں کے علاوہ ہر شہر کے معبود جدا تھے۔ یہ شہری معبود وہی تھے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ یونان کا ملک چھوٹی  
نہری معبود چھوٹی شہری ریاستوں میں بنا ہوا تھا۔ شہر کا مرکز کسی پہاڑ کی چوٹی ہوا کرتی تھی جس پر دیوتا کا معبد تعمیر کیا جاتا تھا  
ہر کسی شہر کے لوگ جنگ کے لئے کوچ کرتے تو فوج میں سب سے آگے اُس شہر کے معبود کی شہید ہوتی اور بغیر دیوتا سے مشورہ کئے کوئی  
روسی قدم نہ اٹھایا جاتا تھا۔ ایک شہر ہی دوسرے شہر پر غالب نہ آتا تھا بلکہ ایک دیوتا بھی دوسرے دیوتا کو مغلوب کر لیتا۔ شہر کے  
وَن ہال میں ہر وقت قربان گاہ پر مقدس آگ جلا کرتی تھی اور وقتاً فوقتاً لوگ اُس کے سامنے ”مذہبی ضیافت“ میں شریک ہوتے تھے  
ہر شہر کا ایک پرہیزگار ہوا کرتا تھا جسے آرکون (Archon) کہتے تھے۔

زئوس، یونانیوں کا معبود اکبر تھا۔ وہ رب العالمین نہ تھا کیونکہ یونانیوں کے نزدیک دیوتاؤں نے دُنیا کو  
معبود اعلیٰ: زئوس پیدا کیا تھا بلکہ اس کے برخلاف اُن کا عقیدہ تھا کہ دُنیا نے دیوتاؤں کو پیدا کیا البتہ انسان ضرور دیوتاؤں  
مخلوق تھا۔ یونانی دیو مالا کے مطابق پرومیتیس نے اپنے نمونے پر مرد کو اور ہیفائستس نے اپنی بیوی ایفرودائٹ کے نمونے پر عورت کو  
تایا تھا۔

دیوتاؤں کے وجود میں آنے سے پہلے زمین و آسمان کی تخلیق ہو چکی تھی۔ گے زمین کی دیوی تھی اور یورانس آسمان کا دیوتا تھا۔ وہ  
پہلے زمین اور اولین والدین تھے۔ ٹیٹان (Titans) یعنی قوی میکیل دیو اُن کے بیٹے تھے اور دیوتا اُن کے پوتے تھے۔  
زئوس اور اُس کے بھائیوں نے دُنیا کی تقسیم کے لئے قرعہ اندازی کی۔ زئوس کو آسمان ملا، پوزیڈان کو سمندر اور ہمدرد کو زمین  
لے نیچے کا حصہ۔ یہ تین دیوتا یونانی تثلیث کے مراد ہیں۔

زئوس بڑا عاشق مزاج تھا۔ اُس نے یکے بعد دیگرے مختلف دیویوں سے بیاہ رچایا جن میں سے بعض اُس کی بہنیں تھیں۔ مینوٹو  
نے اُس کی رہائی محبتوں اور اُس کی ذریات کی ایک طویل فہرست نقل کی ہے۔

اہل یونان فلسفہ جبر کے قائل تھے۔ انسانوں کے خیالات، جذبات، اُن کی خوبیاں و خرابیاں سب دیوتاؤں کی طرف سے سمجھی  
جاتی تھیں۔ جب تک دیوتا ساتھ دیتے کامیابی حاصل ہوتی اور جب دیوتا ساتھ چھوڑ دیتے تو شکست لازمی تھی۔

یونانی معبود اور اخلاقیات  
ہوئے کے نقادوں کا کہنا ہے کہ اُس کے دیوی دیوتا انسانوں کے سامنے کوئی اعلیٰ اخلاقی تصور  
نہیں پیش کرتے۔ وہ انسانوں سے محبت کم اور حسد زیادہ کرتے ہیں اُن کی مثال بد اخلاق  
مطلق العنان بادشاہوں کی ہے۔ انھیں خوش رکھنے کے لئے خوشامد اور اطاعت ضروری ہے۔ وہ انسانوں کو مرفہ الحال اور

عروش و خرم دیکھ کر درپے انتقام ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک عمدہ مثال ایفروڈایت کی ہے جو باوجود حسن کی دیوی ہونے کے سیکمی تاسی حسین عورت کو اپنا نشانہ غضب بناتی ہے۔

جن حوادث طبیعی کو عوام دیوی دیوتاؤں سے منسوب کرتے تھے اُن کی عقلی توجیہ کرنے کی بھی کوشش فلاسفہ یونان کے عقاید کی گئی ہے۔ ٹکون عالم کے سلسلہ میں یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ اولین اور اساسی عنصر کونسا ہے۔ تالیس (Thales) کے نزدیک جس کا زمانہ تقریباً ۶۰۰ ق۔ م ہے اصل عنصر پانی ہے۔ اسی کے ایک شاگرد ایکسی منڈر (Anaximander) نے ایتھر کو بنیادی عنصر قرار دیا۔ ہیراکلیتوس (Heraclitos) نے آگ کو اصلی عنصر کائنات ٹھہرایا۔ ظاہر ہے کہ یہ فلسفی جو کائنات کو علم و عقل کی روشنی میں سمجھنا چاہتے تھے دیوتاؤں کے معتقد نہ رہ سکتے تھے۔ چنانچہ ہیراکلیتوس "شاعروں کے بھی خلاف تھا جو عوام کے لئے اصنام سازی اور دروغ بانی کا کام کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہوتر کا بھی کچھ احترام اُسکے دل میں نہیں تھا۔ وہ کہتا ہے کہ واجب یہ تھا کہ ہوتر کو پکڑ کر دُرسے لگائے جاتے۔" اسی طرح مذہب کو وہ ایک "مقدس بیماری" بتاتا ہے۔

فیثاغورث (Pythagoras) نے کائنات کی عددی تشریح کی کوشش کی اُس کے نزدیک "تمام اعداد ایک عدد یعنی وحدت سے نکلے ہیں۔ اشیاء کا جو ہر عدد ہے اور اعداد کا جو ہر وحدت - وحدت دو قسم کی ہے ایک وہ وحدت ہے جو تمام اشیاء اور اعداد کی اصل ہے۔ یہی وحدت خدا ہے واحد اور تمام دیوتاؤں کا دیوتا ہے۔ یہ وحدت مطلقہ ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی عدد نہیں دوسرا عدد عددی ہے جو دو اور تین کے پہلے آتا ہے۔ یہ مخلوق اکائی اور اضافی وحدت ہے۔ تمام اشیاء اور اعداد وحدت اور کثرت کے تخالف سے پیدا ہوتے ہیں۔"

امپیدوکلینز (Empedocles) نے جو سہ سلی کارہنے والا تھا یہ فلسفہ پیش کیا کہ عناصر اربعہ کی مختلف نسبتوں سے لاتعداد چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ کائنات میں دو اور قوتیں بھی ہیں یعنی محبت اور نفرت۔ ایک سے اتفاق اور اجتماع پیدا ہوتا ہے اور دوسرے سے اختلاف اور انتشار۔ کائنات میں ان دونوں کی حکومت ہے۔ ان دو قوتوں کا مقابلہ ہم پاریوں کے اہرمن و یزدان سے کر سکتے ہیں جن کی باہمی جنگ زندگی کے ہر شعبے میں ملتی ہے۔ یہ فلسفی بھی موحد ہے اور کہتا ہے کہ وحدت الہی اعداد سے اور ہے۔

انیکساغورث (Anaxagoras) پر پیکیز (Pericles) کے زمانہ کا زبردست فلسفی تھا۔ جس کے انکشافات موجودہ سائنس کے مطابق تھے۔ اُس کا کہنا تھا کہ سورج ایک بہت بڑا آئینہ کرہ ہے، چاند میں پہاڑ اور وادیاں ہیں اور چاند اپنی روشنی سورج سے اخذ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دیوی دیوتاؤں کے ماننے والے ان باتوں کو کیسے مان سکتے تھے۔ ایتھنس والوں نے جب یہ سنا کہ انیکساغورث کہتا ہے کہ سورج کوئی دیوتا نہیں ہے بلکہ محض آگ کا گولہ ہے تو اُسے بہت مارا۔ بہر حال انیکساغورث خدا کا قابل تھا لیکن وہ روح اور مادے کو بھی ازلی مانتا تھا۔ اُس کے خدا کے تصور کی نسبت یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ علم اور ناظم ہے لیکن خالق نہیں کیونکہ کوئی قوت کسی جوہر کو عدم سے وجود میں نہیں لاسکتی نہ وجود سے عدم میں لے جاسکتی ہے۔ عناصر اپنی ذات میں غیر مخلوق ہیں مگر ایک خدا کے زیر فرمان ہیں۔ انیکساغورث خدا کے مقاصد کا اور روح کلی کا ہر شے میں جاری و ساری ہونا اس طرح بیان کرتا ہے کہ وحدت الوجود کا قابل معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اسی لئے انیکساغورث کو یونانیوں میں تعلیم توحید کا اول معلم کہنا چاہیے۔

لے ملاحظہ ہو "کپوٹ اور سامی" از مولانا نیاز فتح پوری - لے ڈاکٹر خلیفہ عبدالکلیم "داستان واقش" (۱۹۴۷ء) صفحہ ۶۰ - لے ایضاً صفحہ ۶۱ صفحہ ۶۲ - لے صفحہ ۶۳ - لے صفحہ ۶۴ - لے صفحہ ۶۵ - لے صفحہ ۶۶ - لے صفحہ ۶۷ - لے صفحہ ۶۸ - لے صفحہ ۶۹ - لے صفحہ ۷۰ - لے صفحہ ۷۱ - لے صفحہ ۷۲ - لے صفحہ ۷۳ - لے صفحہ ۷۴ - لے صفحہ ۷۵ - لے صفحہ ۷۶ - لے صفحہ ۷۷ - لے صفحہ ۷۸ - لے صفحہ ۷۹ - لے صفحہ ۸۰ - لے صفحہ ۸۱ - لے صفحہ ۸۲ - لے صفحہ ۸۳ - لے صفحہ ۸۴ - لے صفحہ ۸۵ - لے صفحہ ۸۶ - لے صفحہ ۸۷ - لے صفحہ ۸۸ - لے صفحہ ۸۹ - لے صفحہ ۹۰ - لے صفحہ ۹۱ - لے صفحہ ۹۲ - لے صفحہ ۹۳ - لے صفحہ ۹۴ - لے صفحہ ۹۵ - لے صفحہ ۹۶ - لے صفحہ ۹۷ - لے صفحہ ۹۸ - لے صفحہ ۹۹ - لے صفحہ ۱۰۰

اس کے بعد سقراط، افلاطون اور ارسطو میں توحید کا تصور بہت ترقی کر گیا۔ ارسطو نے بعد میں اٹلی کا غورٹ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اُس کا خدا عالم سے ایک خارجی قوت ہے۔۔۔۔۔ (ہنذا) اُس کی تعلیم توحید کی تعلیم نہیں بلکہ ثنویت کی تعلیم ہے کیونکہ اس میں خدا اور عالم ایک دوسرے سے متناقض اور جدا جدا ہیں۔

دمیترطیس (Democritus) جس نے سب سے پہلے ذرہ لاتیجری کا نظریہ (Atomic Theory) پیش کیا۔ دیوتاؤں کے وجود کا قائل تھا۔ لیکن اُس کے خیالات عوام سے مختلف تھے۔ اُس کے نزدیک دیوتاؤں کا وجود ہے لیکن ہم میں اور اُن میں کچھ فرق ہے۔ وہ بھی ذرات ہی کے اجتماع سے بنے ہیں لیکن ہم سے بہت زیادہ قوی اور پایدار ہیں۔ انجام اُن کا بھی وہی ہو گا جو ہمارا ہوتا ہے۔ حرکت اور مادے کے قوانین سے اُن کو بھی نجات نہیں۔ کائنات میں کسی کو کوئی خاص حق حاصل نہیں۔ چونکہ دیوتا ہم سے دانا تر اور قوی تر ہیں اس لئے ہمیں ان کا احترام کرنا چاہئے۔ لیکن ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ ہم سے کچھ راہ ورابطہ بھی رکھتے ہوں لیکن ہم اور وہ سب مادہ اور حرکت کے اذی آئین کے تحت ہیں۔ اس آئین میں کسی کا کچھ لحاظ نہیں ہے۔ عاقل کو چاہئے کہ اس آئین کو پہچان کر تقدیر کے سامنے تسلیم کرے، اسی تسلیم و رضا سے مسرت اور سعادت حاصل ہو سکتی ہے۔

پروٹاگوراس (Protagoras) جس کا سنہ پیدائش ۴۹۰ ق۔ م ہے دیوتاؤں کا منکر تھا۔ اس لئے عوام اُس کے خلاف ہو گئے۔ "سلسلہ ق۔ م کے قریب اس پر دہریت کا الزام لگایا گیا اور اُس کے خلاف فتویٰ صادر ہوا۔ جن جن کے پاس اُس کی کتابیں تھیں وہ طلب کی گئیں اور نذر آتش کی گئیں۔ وہ خود فرار ہو کر سیسیلی جا رہا تھا کہ راستے میں اُس کا انتقال ہو گیا۔

سقراط (Socrates) جس کا زمانہ ۴۶۹ - ۳۹۹ ق۔ م تھا صحیح معنی میں یونان کا پیغمبر کہا جا سکتا ہے۔ لیکن جمہور نے اُسے سزائے موت دی۔ "الزام یہ تھا کہ وہ دیوتاؤں کو نہیں مانتا تھا اور خلاق روایت عقاید سے نوجوانوں کے اخلاق خراب کرتا تھا۔ لیکن اُس نے مذہب کے خلاف علانیہ بغاوت نہیں کی۔ جا بجا وہ بھی دیوتاؤں کے قصے مثلاً بیان کرتا ہے لیکن حکیمانہ انداز میں اور عام لوگوں کو شک ہوتا ہے کہ یہ دیوتاؤں کو ہادی طرح مانتا بھی ہے یا نہیں۔ سقراط اپنی قوم کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ دیوتا براخلاق نہیں ہو سکتے، اس لئے فقط اچھے خوش اخلاق دیوتاؤں کو رکھ لینا چاہئے اور وہ بھی بچوں کی تعلیم کے لئے۔ وہ حقیقت میں خدائے واحد کا قائل تھا جو سراپا عقل و عدل ہے اُس کے نزدیک خدا خیر مطلق تھا۔ "مسیحی کا یہ بھی قول ہے کہ "انسان سے اعلیٰ تر فوق الفطرت ہستیوں کا وجود ہے لیکن اصل الوہیت ایک خدائے واحد کو حاصل ہے جو خیر مطلق اور علم مطلق ہے اور رب العالمین ہے۔

افلاطون (Plato) کے مکالموں میں جا بجا دیوتاؤں کے قصے ملتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ اُن کے وجود کا قائل تھا یا محض انھیں تشبیہات و تمثیلات کے طور پر بیان کرتا ہے یا یہ کہ وہ عوام کو اس دھوکے میں رکھنا چاہتا ہے کہ وہ بھی ان کی طرح خرافات کا معتقد ہے۔ بہر حال اپنی مشہور ترین تصنیف جمہوریہ (Republic) میں یہ سلسلہ تعلیم وہ یہ بیان کرتا ہے کہ "بچوں کی دینیات میں یہ تعلیم نہیں ہونی چاہئے کہ جو کچھ کرتا ہے وہ خدا ہی کرتا ہے ان کو فقط بتانا چاہئے کہ خدا فقط اچھی باتیں کرتا ہے، شر کو بھی خدا کی طرف منسوب کرنا برا ظلم ہے۔ ان کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ خدا جسے جیسا چاہتا ہے بنا دیتا ہے، کسی کو جہنم کے لئے بناتا ہے اور کسی کو جنت کے لئے۔ جب وہ کسی کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو پہلے اُسے گناہ میں مبتلا کر دیتا ہے پہلا اصول یہ ہے کہ خدا کو خیر مطلق کے طور پر پیش کیا جائے۔ دوسرا اصول خدا کے بارے میں یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنی فطرت نہیں بدلتا۔ خدا میں سب صفات حسنہ کا کمال ہے۔ اُس کو بدنے کی ضرورت نہیں، بہرہ دینے دیوتاؤں کو بچوں کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت نہیں، خدا صدق مطلق ہے اور صداقت مطلقہ میں کوئی تغیر ممکن نہیں ہے۔ افلاطون شاعروں کے بھی خلاف سخت اس لئے کہ "اُس کے زمانہ کے شعرا دیوتاؤں کے محض اخلاق قصے دہراتے تھے۔ سو اچھا اچھے اخلاق کی تعلیم دینے والے شاعروں کے وہ سب

شاعروں کو اپنی مجوزہ ملکیت میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔  
 (Aristotle) افلاطون کا مشہور شاگرد جس کا سنہ پیدائش ۳۸۴ ق۔ م ہے توحید کا قائل تھا، وہ کہتا ہے کہ:  
 ”خدا خالص روح یا خالص تصور ہے..... خدا سے برتر کوئی تصور نہیں اس لئے خدا کے اندر مادے کا کوئی شائبہ نہیں۔ خدا عقل کل اور تصور  
 بے مادہ ہے وہ فکر خالص ہے جو خود ہی اپنا موضوع فکر ہے۔ عقل الہی اشیا کے ادراک سے موث نہیں ہوتی۔ تمام کائنات مختلف حارج  
 میں اسی عقل کل کے تحقق میں لگی ہوئی ہے اور یہ سرچشمہ عقل آفریدہ نہیں وہ کون و فساد سے مادی ہے..... خدا کائنات کا نصب العین  
 ہے اور نصب العین کی طرف بڑھنے کا نام حیات و وجود ہے۔“

اقتباسات بالا سے ظاہر ہوگا کہ عوام اور خواص کے عقاید میں کتنا زبردست فرق تھا۔ عوام کثرت پرست تھے اور فلاسفہ توحید کے  
 قائل۔ دراصل ہر بڑے مفکر کو ”خدا کی تلاش“ تھی۔ ان میں سے بعض نے اپنے مقصود کو پایا تھا اور بعض اُس کے لئے سراپا نگ و دو تھے۔  
 لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کھل کر نہ کر سکتے تھے ”سچی باتیں“ کہنے والوں کا انجام اُن کے سامنے تھا، جن میں سے بعض جلاوطن  
 کئے گئے۔ بعض کو زود کو بھجوا دیا گیا اور کسی کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ یہی وجہ تھی کہ مشیر یونانی فلاسفہ نے معبود کے بارے میں اپنے  
 خیالات دہی زبان میں پیش کئے ہیں۔

اسی سلسلہ میں زینوفین (Xenophanes) کا بیان پڑھنے کے قابل ہے۔ کہتا ہے:-

”خدا ایک ہے جو دیوتاؤں اور انسانوں میں سب سے بڑا ہے

اُس کا جسم اور دماغ مثل انسان کے نہیں ہے

وہ سراپا بصارت، سراپا سماعت اور سراپا عقل ہے

لیکن فانی انسان نے دیوتاؤں کو اپنی صورت پر بنایا ہے

انھیں اپنا جسم، اپنا لباس اور اپنی آواز عطا کی ہے

میرے خیال میں اگر بیلوں، شیروں، درگھوڑوں کے فقط ہاتھ ہوتے

تو انھوں نے اپنے ہی ایسے دیوتا بنائے ہوتے

گھوڑوں کے دیوتا گھوڑوں کے ایسے ہوتے اور بیلوں کے دیوتا بیلوں کے ایسے۔“

باوجود اس کے کہ یونانی فلاسفہ توحید کے قائل ہو چکے تھے عوام نے توحید کو کبھی قبول نہ کیا، یونانی تہذیب کے قیام تک عوام کثرت پرستی  
 میں مبتلا رہے۔ البتہ زمانہ مابعد میں بعض لوگ جو ان مفکرین سے متاثر ہوئے تشکیک میں مبتلا ہو گئے اور انھوں نے ایک ”نامعلوم خدا کے لئے“

قرآن گاہ بنائی جیسا کہ اتھینس میں پولس کے وعظ سے ثابت ہوتا ہے۔ (عہد نامہ جدید اعمال“ باب ۱۷، آیات ۲۲-۲۸)

اس تشکیک کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد یونانیوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا جس میں یونانی فلسفہ کے برخلاف خدا کا ایک واضح  
 تکمیل موجود تھا۔

## رومی مذہب

روایتاً شہر روم کی بنیاد رومولس اور رمیس نامی چڑواں بھائیوں نے ۵۳ ق۔ م۔ ڈالی تھی۔ ۵۱۰ ق۔ م۔ سے روم میں ایک آزاد حکومت کا پتہ چلتا ہے۔ ۹۰ ق۔ م۔ سے ۲۷ ق۔ م۔ کے درمیان اہل رومہ نے پورے اٹلی کو فتح کر لیا اور اطالوی ریاستوں کو متحد کر کے اطراف کے ممالک پر حملے شروع کر دیے۔ ان کا خاص حریف کارٹیج کی ریاست تھی۔ ۲۶۴ ق۔ م۔ میں اس سے پہلی جنگ ہوئی۔ ۲۱۸ اور ۲۰۲ ق۔ م۔ کے درمیان دوسری جنگ ہوئی جس میں کارٹیج کا جنرل ہنی بال، آلیس کو پار کر کے خود اٹلی آپہنچا لیکن بالآخر شکست ہوئی۔ اسی زمانہ میں رومن یحییٰ نے یونان اور ایشیائے کوچک کو فتح کر لیا۔ ۱۴۶ ق۔ م۔ انھوں نے کارٹیج اور کارٹھ کو برباد کر دیا۔ اس طرح بحیرہ روم پر ان کا پورا اقتدار قائم ہو گیا۔ ۵۸ اور ۵۰ ق۔ م۔ کے درمیان جولیس سیزر نے فرانس (گالی) کو فتح کر لیا۔ ۴۴ ق۔ م۔ میں اسے قتل کر دیا گیا۔ ۳۱ ق۔ م۔ میں مارک انطانی کو آکیٹویس سیزر نے شکست دی اور مصر پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں وہ آگسٹس کے لقب سے روم کا پہلا شہنشاہ ہوا۔ اسلئے میں سلطنت رومہ اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی۔ اس کی چار قدرتی حدیں تھیں۔ شمال میں دریائے رائن اور ڈینیوب۔ مشرق میں بحیرہ اسود۔ دریاے فرات اور عرب کا ریگستان۔ جنوب میں دشت صحارا اور مغرب میں بحر اٹلانٹک۔ روم والوں نے اپنے مذہب کو دوسرے ملکوں میں پھیلانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کا مذہب دیگر ممالک خصوصاً یونان کے مذہب سے متاثر ہوا۔ اسی اثنا میں عیسائی مذہب نہایت سرعت کے ساتھ عروج حاصل کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ ۳۱۳ء میں قسطنطین اعظم نے عیسائی مذہب کو سلطنت رومہ کا سرکاری مذہب قرار دیا۔ اس طور پر انگلستان، فرانس، اسپین، ایشیائے کوچک اور مصر وغیرہ میں عیسائیت پھیل گئی اس کے بعد سے سلطنت رومہ کا زوال شروع ہوا یہاں تک کہ ۴۷۶ء میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔

روم والوں کا قدیم مذہب جادو ٹونے پر مشتمل تھا۔ وہ برتنے میں ایک روح کو کار فرما پاتے تھے جسے *ہومین* (Numen) ارواح پرستی کہتے تھے۔ یہ روحیں معمولی سے معمولی کاموں سے لیکر بڑے سے بڑے کاموں تک کی نگرانی تھیں۔ یہ روحیں بے صورت اور بے جسم تھیں اسی لئے روم کے قدیم مذہب میں ہمیں تجسیم بشری کا پتہ نہیں چلتا۔

اہل رومہ اپنے خاندانی بزرگوں کی بھی پرستش کرتے تھے۔ ہر گھر میں اس کے لئے ایک مقام متعین **اسلاف پرستی** ہوتا تھا۔

گھر کے معبودوں میں تین خاص تھے۔ ۱۔ *ویشتا* (Vesta) آگ کی دیوی جو چولے کی محافظ تھی۔ شہر روم میں خاکی معبود ایک بڑا آتشکدہ تھا جہاں آگ کی کسی بجھنے نہ دیا جاتا تھا۔ کنواری لڑکیاں جنہیں "ویشتا کی کنواریاں" (Vestal Virgins) کہتے تھے اس کی حفاظت کرتی تھیں۔ (۲) *پانیس* (Penates) وہ دیوتا جن کا کام اناج کی کوشری کی حفاظت کرتا تھا۔ (۳) *جنس* (Janus) دروازے کا محافظ دیوتا۔ اس کے آگے پیچھے دو چہرے بنائے جاتے تھے۔ اس واپشتی کے دنوں میں روم میں اس کا مندر بلند رہا کرتا تھا انگریزی چھینے جنوری (January) کا نام اسی سے منسوب ہے۔ کھیتی باڑی کا خاص دیوتا *سیٹرن* (Saturn) یعنی زمیں تھا جس کے نام پر مہینہ کا نام "سیٹرن ڈے" کھیتوں کے دیوتا پڑا جو مخف ہوا کر "سیٹرن ڈے" (Saturday) ہو گیا۔ اس کو ہندوشتی *ہار* یا *سنیچر* کہتے ہیں۔

سردول کے دیوتا (Terminus) رومیوں میں جائداد کی حدیں مقرر کرنے والے پتھر بھی پوجے جاتے تھے جنہیں ٹرمینس (Terminus) کہتے تھے۔

معبود اکبر اور ملائکہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ دیوتاؤں کا سردار اور آسمان کا بادشاہ تھا۔ پانی پرسانا اُس کا خاص کام تھا اُس کا نام یونانی (Zeus-pater) کی بدلی ہوئی صورت ہے جو ہمیں ہندی آریوں کے ”دیوش پتر“ کی یاد دلاتا ہے۔ جو پتر کے بعد دوسرا بڑا معبود مارتس (Mars) یعنی مریخ تھا۔ وہ لاطینی کا دیوتا تھا اُس کے نام پر انگریزی کے تیسرے مہینے کا نام مارچ (March) پڑا۔

در اصل اہل روم کے مذہب، یونانیوں کے مذہب اور قدیم ہندی آریوں کے مذہب میں بڑی مشابہت تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ تینوں شروع میں ایک ہی مذہب رکھتے تھے جسے ہم ”قدیم آریہ مذہب“ کہہ سکتے ہیں۔ اس میں بعد ازاں مقامی تبدیلیاں ہوئیں لیکن باوجود اس کے تینوں میں بنیادی مشابہت برقرار رہی۔ رومیوں کے دیوتا نذر و نیاز سے خوش ہوتے تھے اور وہ مرادوں کو پورا کرتے تھے۔ اگر ٹھیک سے قربانیاں عابد اور معبود کا تعلق نہ پیش کی جاتیں تو دیوتا ساتھ نہ دیتے۔

ان کے یہاں شہنشاہ پرستی کا بھی رواج تھا، بادشاہ کو جو پتر کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔ اکثر سلاطین اس بادشاہ پرستی کو سلاطین پرستی ایک ڈھکوسلا اور سوائگ سمجھتے تھے مگر چند ایسے فاتر العقل شہنشاہ بھی ہوئے ہیں جو اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ سچ مع خدا ہیں۔ کالیکولا (Caligula) اس کی ایک مثال ہے۔ وہ اپنے کو جو پتر سے منشاہ کرنے کے لئے سونے کے باریک تاروں کی مونچھیں لگایا کرتا تھا جن کا وزن ۴ اقراط تھا۔ ان مونچھوں کی وضع بالکل ایسی ہی تھی جو پتر کے مجسموں میں ظاہر کی جاتی تھی۔ ”عملی زندگی میں اس بادشاہ پرستی کا نتیجہ ہوا کہ سلاطین کی تصاویر اور ہت مثل دیوتاؤں کے پوجے جانے لگے۔ اب وہ ایک ایسی مقدس و مطہر شے بن گئے تھے کہ ان کے ساتھ خیف سی ہے ادبی کار تکاب شدید تعزیر کا مستوجب بنا دیتا تھا۔ غالباً یہ بادشاہ پرستی مصر سے آئی تھی جہاں فرعون کو دیوتاؤں کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔

حکمائے روم کے خیالات جس طرح کثرت پرستی کے خلاف فلاسفہ یونان میں رد عمل پیدا ہوا اور وہ رفتہ رفتہ توحید کے قابل عمل سے سب سے پہلے انھوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ مذہب کی اصلیت کیا ہے۔

لکریشیش (Lucretius) کا قول ہے کہ خون نے دیوتاؤں کو جنم دیا اور مذہب خون (خصوصاً موت کے ڈر) کی پیداوار ہے۔ اسی طرح یونانیوں نے دیوتاؤں کی شان نزول یہ بیان کی کہ ”یہ اپنے زمانہ میں بادشاہ تھے مگر ان کی موت کے بعد لوگ انھیں خدا سمجھنے لگے۔ دوسرا نظریہ جو رومن تشلیک کے دور اول میں زیادہ مقبول ہوا یہ تھا کہ مختلف معبود دراصل فطرت کے مختلف مظاہر یا قوت ہستی کے مختلف قوتی ہیں مثلاً بچوں پانی ہے، پلوٹو آگ ہے، ہرقل قدرت باری ہے۔ منرو دانش الہی ہے وھیو۔ وارو (Varro) نے سلطنت روم کی بنیاد پڑنے سے سو برس پیشتر یہ کہا تھا کہ کائنات کی روح ذات باری ہے اور اُس کے مختلف قوا دیگر معبود ہیں۔ ورجیل (Virgil) و مینیلیس (Manilius) نے اس خیال کو یوں نظم کیا کہ تمام زندگی کا اصل الاصول، تمام حرکت کی علت فاعلی ایک عالمگیر روح ہے جو کائنات کے گوشہ گوشہ میں جاری و ساری ہے۔ پلینی (Pliny) کے الفاظ یہ تھے: ”آسمان و زمین، فرض جملہ کائنات کو بجائے خود، خدا سمجھنا چاہئے جو انی و ادبی، لایکذب و لایزال ہے۔ بس اس سے زیادہ کسی بات کی جستجو کرنا انسان کے لئے مفید نہیں کیونکہ اس کے ہوا جو اعداد و اشیاء کی تعداد (number) کے ستمور (Cicero) کا افلاطون کے اس مقولہ پر ایمان تھا

ہذا انسان کے دل میں ہے

بعض فلاسفہ روم کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ ”ہر انسان میں روح ربانی حلول کئے ہوئے ہے۔ کوئی بڑا شخص ایسا نہیں ہوا جس میں اس کی عظمت اتنا بڑی ہو“ سب کا کہنا تھا کہ: ”ہم ہیں سے ہر شخص کے اندر ایک روح القدس رمتی ہے جو ہمارے اعمال کی حاکم و نگران ہے۔ خدا سے علوہ ہو کہ کوئی شخص نیک نہیں ہو سکتا“

یہ فلاسفہ روم میں وحدت وجود کا تئیں پیدا ہوا لیکن بعد میں اُس کی جگہ ایک شخص خدا نے لی اور اُس کا خدا کا اعتراف کئے کئے لفظوں میں اعتراف کیا جانے لگا۔ اپیکٹیتس (Epictetus) کے یقین سے فقہ پڑھنے قابل ہیں:-

”سب سے پہلے جاننے کی چیز یہ ہے کہ ایک رب کا وجود ہے جس کا علم تمام کائنات کو محیط ہے اور جو نہ صرف ہمارے اعمال سے بلکہ ہمارے اندرونی جذبات و تصورات تک سے خبردار رہتا ہے۔۔۔۔۔ جو شخص نیکی کی راہ چلنا چاہتا ہے اُسے لازم ہے کہ خود اوصافِ ربی کا اتباع کرے۔ جس طرح خدا صادق ہے وہ بھی صداقت اختیار کرے، جس طرح خدا آزاد ہے، وہ بھی آزادی حاصل کرے جس طرح خدا نیک ہے، وہ بھی نیکی کرے اور جس طرح خدا فیاض ہے وہ بھی فیاضی کرے۔۔۔۔۔ لیکن حکماء کی آزاد خیالی صرف اُن کی زبان و قلم تک محدود تھی، اور عملاً وہ تمام مہل رسوم کی پابندی کرتے تھے۔

بالآخر یونان کی طرح روم میں بھی عیسوی مذہب کی اشاعت ہوئی اور وہاں کے دیوتاؤں کی حکومت ہمیشہ کے لئے  
تم ہو گئی۔

# یوٹانی قوم کا مذہب

یوٹانی قوم کے لوگ ناروے، سویڈن، ڈنمارک، ہالینڈ، سوئٹزرلینڈ، جرمنی، انگلستان اور آئس لینڈ میں آباد ہیں۔ ان ملک کی زبانیں آپس میں گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ اور اسی لئے خدا کے لئے جو الفاظ ان ملک میں مستعمل ہیں وہ تقریباً ایک ہی سے ہیں۔ خدا کے لئے یہ لفظ یعنی گاؤسی دوسری آریائی زبان میں نہیں پایا جاتا۔ پہلے اس کے معنی "بت" یا "خیمہ" کے تھے لیکن جب یوٹانی قوم نے عیسائی مذہب قبول کیا تو وہ اس نام سے عیسائی مذہب کے خدا کو موسوم کرنے لگی۔ ایڈا (Edda) یوٹانی قوم کی پرانی مذہبی کتاب ہے جس کا قدیم ترین نسخہ مسیحی عہد کا ہے۔ اس سے ان کے مذہبی عقاید پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

**دیوتاؤں کا مسکن** یوٹانی دیوتاؤں کے مطابق کائنات ایک درخت کی صورت میں ہے جسے اگ ڈراسل (Yggdrasil) کہتے ہیں۔ اس کی جڑوں میں موت کا ملک ہے۔ وسطی حصے میں انسانوں کی دنیا ہے اور چوٹی پر بہشت ہے جسے آسگارڈ (Asgard) کہتے ہیں۔ وہاں بارہ دیوتا اور نہرہیں دیویاں رہتی ہیں جن کا سردار اوڈن ہے

**چار قدیم معبود** اگرچہ یوٹانی قبائل کے الگ الگ دیوتا تھے لیکن ان میں چار معبود مشترک تھے۔ شاید ان کی پرستش ہی یوٹانی چار قدیم معبود اودن: اودن یوٹانی قوم کے دیوی دیوتاؤں میں اودن یا وودن کا مرتبہ سب سے اعلیٰ ہے وہ دیوتاؤں کی مجلس کا سردار ہے۔ پہلے وہ شخص ہوا کہ دیوتا تھا لیکن چونکہ انسان کی روح کو ہوا ہی سمجھا جاتا تھا اس لئے وہ ملک الموت بن گیا۔

وہ شعر و شاعری اور سحر و انسوں کا بھی دیوتا ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ اُسے ایک بڑھا آدمی ظاہر کیا جاتا ہے۔ اُس کی داڑھی بہت لمبی ہے۔ دو بھیرٹے اُس کے ساتھ چلتے ہیں اور دو کوسے جو اس کے کندھوں پر بیٹھے رہتے ہیں اُسے ہر خبر پہنچاتے رہتے ہیں۔ وہ کھانا نہیں کھاتا جو کھانے اُسے پیش کئے جاتے ہیں وہ اپنے پیڑوں کو دسے ڈالتا ہے۔ وہ زبردست جنگجو ہے۔ وہ بہادری کو کو پسند کرتا ہے۔

**آسمانی دیوتا: ستھار** اودن کے بعد دوسرا اہم معبود تھا۔ وہ بادل کی گرج یا بجلی کی کوک کا دیوتا ہے اُس کے ہاتھ میں ایک ہتھوڑا دکھایا جاتا ہے جسے وہ آسمان سے پھینکتا ہے۔ اُسے ایک طاقتور جوان ظاہر کیا جاتا ہے جس کے چہرے پر شرمیلہ دارھی ہے۔ طوفان برق و باد کے موقعوں پر وہ ہوا میں ایک رتھ دوڑاتا پھرتا ہے جس میں دو بکریاں جتی ہوتی ہیں۔ وہ ایک خاص قسم کی بیٹی پرست ہے۔ اُسے انسانوں کا محافظ اور معاون مانا جاتا ہے۔ وہ انھیں ارواحِ خبیثہ سے جنگ کرنے میں مدد کرتا ہے۔ دیوتاؤں سے جنگ کرنا اُس کا خاص کارنامہ ہے۔ ناروے اور آئس لینڈ میں اُسے خاص اہمیت حاصل تھی جہاں اُس کے مندر کثرت سے پائے گئے ہیں۔

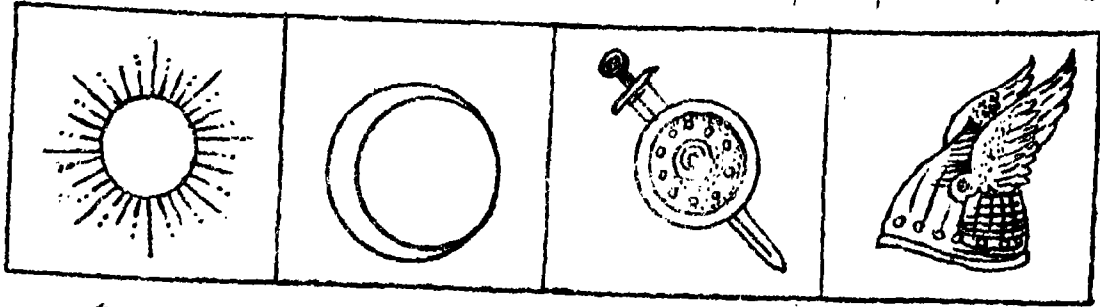
بعض عالموں کا خیال ہے کہ لفظ وید (Veda) سے تعلق رکھتا ہے جو ہندوؤں کے قدیم ترین مذہبی صحیفے ہیں۔

جنگ کا دیوتا: میو نامی بھیڑنے کی چال بازی سے ضایع ہو گیا۔  
 تلوار اور ڈھال اس کے خاص ہتھیار ہیں لیکن اس کے ایک ہی بازو ہے۔ دوسرا فینرس (Fenris)۔

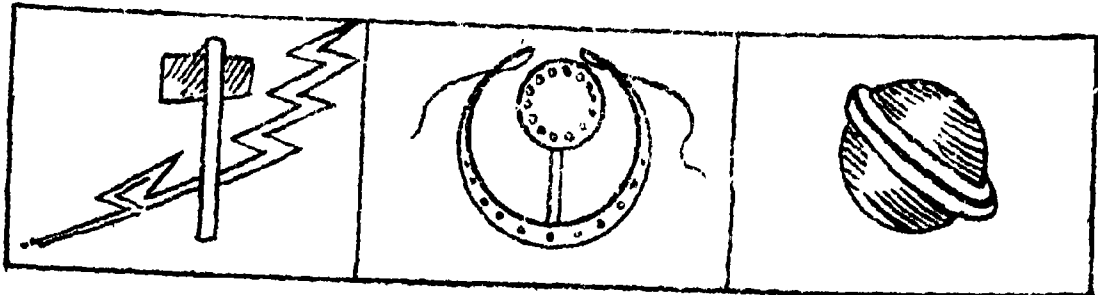
فریجا دیوی عورتوں کی محافظ ہے۔ اوڈن کے وقار کے بڑھنے سے اس کا مرتبہ بھی اونچا ہو گیا اور وہ دیوتاؤں کی ماں بن گئی۔  
 اوڈن اور فریجا کا خاص بیٹا بالڈر (Balder) تھا جو دیوتاؤں اور انسانوں میں بے حد مقبول تھا لیکن ایک دیو

کی سازش سے ہلاک ہو گیا اور وہ بھی ایک معمولی تنکے کے ذریعہ! دیوتا اور دیو نہر آزمائی کر رہے ہیں۔ قیامت کے دن ٹیوٹانی عقیدے کے مطابق دنیا میں خیر و شر کی جنگ جاری ہے۔ دیوتا اور دیو نہر آزمائی کر رہے ہیں۔ قیامت کے دن دنیا کا انجام ہے (Ragnarok) کہتے ہیں نیکی و بدی کی آخری جنگ میں دیوتا اور دیو باہم کٹ مریں گے اور ساری دنیا معد جنت کے فنا ہو جائے گی۔

ٹیوٹانی قوم نے عیسائی مذہب قبول کر لیا ہے اور اب اس کے قدیم عقاید کی یاد دلانے کو صحن دنوں کے نام باقی رہ گئے ہیں۔  
 سن ڈے (سورج کا دن) من ڈے یا مون ڈے (چاند کا دن) اور سیٹر ڈے یا سیٹرن ڈے (زحل کا دن) سیارہ پرستی کا کھلا ثبوت ہیں۔ ابقیہ چار دنوں کے نام ٹیوٹانی قوم کے چار معبودوں کے نام پر ہیں۔



اینگریزی نام      سن ڈے      من ڈے      ٹیوٹر ڈے      ویڈینس ڈے  
 ہندی مقابل      (آدیت وار)      (سوم وار)      (منگل وار)      (بدھ وار)



اینگریزی نام      تھرس ڈے      فرائی ڈے      سیٹر ڈے  
 ہندی مقابل      (برہمپت وار)      (شکر وار)      (شنی وار)

# کیلٹی مذہب

یورپ کی کیلٹی (Celtic) قوم بھی آریوں کی ایک شاخ ہے۔ کیلٹی زبان بولنے والے برطانیہ اور گال (فرانس) وغیرہ میں آباد ہیں لیکن اب ان کی نسل مخلوط ہو گئی ہے۔ عیسائی مذہب قبول کرنے سے پہلے ان کا جو مذہب تھا اُس کا ذکر یہاں پر مقصود ہے۔ کیلٹی پجاری جو جادوگر اور کاہن بھی ہوا کرتے تھے ڈروئیڈ (Druid) کہلاتے تھے اور ان کی رعایت سے کیلٹی مذہب کو ڈروئیڈ (Druidism) بھی کہتے ہیں۔ حیوان پرستی اور شجر پرستی اس کی نمایاں خصوصیات تھیں۔

دیگر آریہ اقوام کے برخلاف کیلٹی قوم میں ٹوٹم پرستی کا کثرت سے رواج تھا۔ بعد میں مقدس جانور دیویوں سے منسوب کر دئے گئے یا خود دیویاں ان جانوروں کی سرپرست مان لی گئیں مثلاً ایپونا (Epona) گھوڑے کی دیوی تھی آرتیو (Artio) رینگہ دیوی تھی۔ ڈامونا (Damona) بھیڑیا گائے دیوی تھی۔ اسی طرح موکس (Moccus) سور دیوتا تھا۔

دشتوں میں شاہ بلوط (Oak) کی پرستش خصوصیت سے ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں دریاؤں اور چشموں کی رومیں بھی پوجی جاتی تھیں۔ چوراہوں کی بھی دیویاں تھیں اور ہریش کے الگ الگ دیوتا تھے مثلاً (Amaltheon) کاشتکاری کا دیوتا تھا اور (Gofannon) دھات کا کام کرنے والوں کا مربی تھا۔

کیلٹی معبودوں میں سب سے اہم ”جنگ کا دیوتا“ مریخ (Mars) تھا جس کے مختلف قصوں میں مختلف نام تھے عطارد (Mercury) اور مشتری (Jupiter) کی پرستش کم ہوتی تھی۔ ان دونوں کے مقابلہ میں اپالو (Apollo) کی اہمیت زیادہ تھی جو صحت و شفا کا دیوتا تھا۔ کیلٹی لوگ بقائے روح اور آواگون میں بھی اعتقاد رکھتے رکھتے۔ ڈیس (Dis) تخت الارض کا دیوتا تھا۔

دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے انسانی قربانیاں پیش کی جاتی تھیں جنہیں بید کے جھاؤں میں بند کر کے زندہ جلادیا جاتا تھا۔ جولیس سیزر نے اس کا ذکر کیا ہے اور شہنشاہ کلاؤڈیس (Claudius) نے ڈروئیڈ پر بعض پابندیاں عاید کر دی تھیں جن میں خاص یہ تھی کہ اگھانوں کے بجائے جانوروں کی قربانیاں کی جائیں۔

در اصل کیلٹی قوم فطرت پرست تھی اور اُس کے سیکڑوں معبود تھے جن کا چڑھا دے کے کتبوں سے پتہ چلتا ہے۔ لیکن ان معبودوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے ”خدا“ کا مشبہد کہا جاسکے۔

## قدیم امریکہ کے مذاہب

۱۳۹۲ء میں کولمبس نے امریکہ دریافت کیا اور اسی وقت سے وہاں کی یورپی تہذیب مغربی تہذیب سے متاثر ہونے لگی۔ امریکہ کی مایا (Maya) قوم کی یورپی تہذیب کا مرکز میکسیکو تھا۔ ان کا تمدن یوکاتان سے لیکر سیلوٹز تک پھیلا ہوا تھا۔ ان نے علم نجوم اور فلکیات میں زبردست ترقی کی تھی۔ یوکاتان میں آج بھی ان کی بنائی ہوئی رصد گاہ موجود ہے۔ ان کی تقویم چولکینلند بھی زیادہ صحیح تھی جس کے ذریعہ سے وہ (۵۰۰۰,۰۰۰) سال تک کا حساب کر سکتے تھے۔ مذہب سے بھی انھیں بڑا شغف تھا جیسا کہ ان کے ہونے ہوئے عالیشان مندروں اور بے شمار بتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

ان میں آفتاب کی پرستش کثرت سے رائج تھی جسے کنی چا ہاؤ (Kanichahau) یعنی "آفتاب کا آقا" کہتے تھے۔ ان کا حریف خداوند ظلمت زوتزی لہا چلمن (Zotzi laka - Chimalmian) تھا جسے چگاڈڑ دیوتا ظاہر کیا جاتا تھا۔ وہ ایک تاریک غار میں چھپا رہتا تھا۔ چانکو اتزا (Itzma) کہتے تھے وہ دیوتاؤں اور انسانوں کا پاپا انا جاتا تھا۔ بارش دیوتا چک مول (Chac - Mool) کو بھی ان میں بڑی اہمیت حاصل تھی جس کے نام پر فصل ببار میں چھپیں آتے۔ Chichen - Itza کے مقدس کنوئیں میں حسین کنواریاں بطور قربانی کے ڈال دی جاتی تھیں۔ ہر سال ان کا انتخاب ہوتا تھا اور اس میں لڑکیاں اُسی فوق و شوق سے حصہ لیتی تھیں جسے آج کل "ملکہ حسن" کے مقابلہ میں کسی لڑکی کا چن لیا جاتا اس کے لئے رُسے خمر کی بات تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ان لڑکیوں کو دیوتا اپنی دلچسپی بنالینا ہے۔

کوکل کان (Kukulcan) یعنی "کلفی دار سائب" بھی ان کا بڑا معبود تھا۔ مایا قوم کے حکمران جب تک وقت بادشاہ ہی تھے اور پروہت بھی اس کو اپنا مورث اعلیٰ مانتے تھے۔ غالباً آسمان کی کھلی کی کرک کا دیوتا تھا چچین آتھ کا مشہور شہر اسی سے منسوب تھا۔ لیکن یہ مایا قوم کا سب سے بڑا معبود نہ تھا یہ شرن ہونا کو (Hunab Ku) کو حاصل تھا جو غیر مرئی معبود برتر تھا۔ اسے کل دیوتاؤں کا مجموعہ مانا جاتا تھا۔

اسپین والوں کے آنے سے پہلے مایا تہذیب مٹ چکی تھی۔ "التیق لوگوں نے اُسے برباد کر دیا تھا (یہ لوگ جنوبی میکسیکو میں آباد تھے) مایا قوم کے لوگ آج بھی باقی ہیں۔ اگرچہ انھیں عیسائی بنالیا گیا ہے لیکن اب بھی وہ چوری چھپے اپنے آباؤ اجداد کے بتوں کی پرستش کر رہا کرتے ہیں ازریق (Aztec) جب کولمبس، امریکہ پہنچا تو التیق اور مایا تہذیبیں مٹ چکی تھیں اور میکسیکو میں ازریق لوگوں کا دور دورہ تھا اگرچہ ان لوگوں نے اپنے سے پہلے کی تہذیبوں سے بہت سی باتیں سیکھ لی تھیں، تاہم ان کا تمدن ۱۵۱۹ء میں (جب اسپین کے لوگ وہاں پہنچے) اُس منزل میں تھا جہاں سمیر و اور مصر... سق۔ م تھے یعنی پھر کا زمانہ ختم ہو رہا تھا اور دھات کا استعمال شروع ہو چکا تھا۔

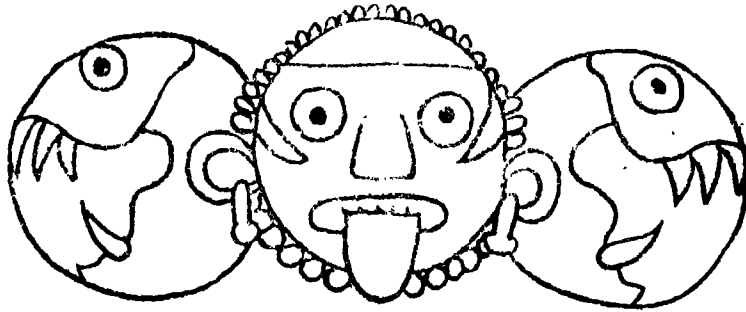
ازریق قوم کا آخری بادشاہ مانٹی زوما (Montezuma) تھا جسے ہسپانوی سردار کورتیز (Cortez) نے اپنا جہان بلایا اور پھر اسے گرفتار کر کے میکسیکو پر قابض ہو گیا۔ یہ ۱۵۱۹ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد وہاں کے لوگ عیسائی بنائے گئے۔

ہسپانوی فتح کے وقت ازریق لوگوں کا رجمان ایک خدا کی پرستش کی طرف تھا۔ یہ امید ہوا کے دیوتا تیزکٹلی پوکا (Tezcatli - pooa) سے وابستہ تھی جسے "آئینہ آتشیں" بھی کہتے تھے۔ اسے ازریق قوم کا جو پٹر سمجھنا چاہئے۔ اس کے بارے میں یہ عقیدہ تھا

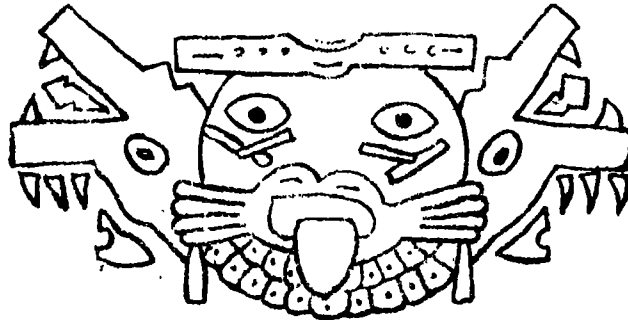
کہ وہ اپنی صیقل شدہ ڈھال میں انسانوں کے کل اعمال دیکھتا ہے۔ اُسے زندگی اور موت کا مالک بھی سمجھا جاتا تھا۔ جن کا وقت آجانا اُن کی روح کو قبض کرنے کے لئے وہ تاریک راستوں میں مثل ہوا کے دوڑتا پھرتا۔ اس لئے اُس کے القاب میں ”بھوکا سردار“، ”دشمن“، ”نوجوان جنگجو“ اور ”رات کی ہوا“ ایسے الفاظ شامل تھے۔ اُس کے آرام کرنے کے لئے درختوں کے کنجوں میں پتھر کی کرسیاں بنائی جاتی تھیں۔ اُسے عجیب لد عورت بھی مانا جاتا تھا۔ اس لئے اُس کے بالوں سے ایک سنہرا کان لٹکا ہوا دکھایا جاتا تھا، جس کے گرد مستند دھچوٹی چھوٹی زبانیں دکھائی جاتی تھیں۔

لیکن یہ دیوتا ازتیک قوم کا سب سے بڑا محبوب نہ تھا۔ یہ خرسورج دیوتا توناتیہ (Tonatiuh) کو حاصل تھا جسے نذر کی بناج مانا جاتا تھا۔ اور سب سے زیادہ انسانی قربانیاں اسی کو پیش کی جاتی تھیں۔ قربانی کا یہ طریقہ تھا کہ پتھر کے چاقو سے انسان کا سینہ چاکر کیے دل نکال کر دیوتا کے قدموں میں ڈال دیتے اور لاش کو اٹھا کر پھینک دیا جاتا تھا۔ بہت سے جنگجوؤں نے یہ پیشہ بنا رکھا تھا کہ وہ سورج دیوتا کی نہ مٹنے والی اشتہا کی تسکین کے لئے روزانہ قربانیوں کے واسطے دشمن قبائل سے انسانوں کو گرفتار کرتے اور جو سب سے زیادہ قیدی لاتا اُس کی ہری توقیر ہوتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ کسی بادشاہ کی تخت نشینی یا مندر کی تعمیر کے وقت بھی ہزاروں آدمیوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑتا اور کبھی کبھی انسانی قربانیوں کا یہ سلسلہ کئی کئی دن تک چلا کرتا۔ ایک مقام پر جسے ”کھوپڑیوں کا اہرام“ (Pyramid of Skulls) کہتے ہیں۔ اسپین کے لوگوں نے ایک لاکھ چھتیس ہزار انسانی کھوپڑیاں گنی تھیں۔

سورج دیوتا کی خوں آشامی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اُس کی تصویر یا بت کو اس طرح بنایا جاتا تھا کہ اُس کے منہ سے زبان نکلی ہوئی ہے اور وہ اپنے ہاتھوں میں دو تیندوے پکڑے ہوئے ہے یا اُس کے چہرے سے طاقتور دوسے کے دوسرے بھی بنا دئے جاتے تھے۔ بالکل اسی طرح پیرو کے ناسکا (Nasca) لوگ بھی اپنے خاص دیوتا کی شبیہ بناتے تھے لیکن اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ ازتیک لوگوں اور ناسکا قبیلے میں کچھ تعلق تھا۔



(۱)



(۲)

سورج دیوتا (۱) ازتیک (۲) ناسکا

نیرا اہم معبود جنگ کا دیوتا ہوتنرلوپوتلی (Huitzilopochtli) تھا جو ایک دیندار بیوہ کے بطن سے پیدا ہوا۔ روایت کے مطابق وہ پہاڑ پر عبادت کر رہی تھی کہ اُس کی گود میں آسمان سے ایک خوبصورت پروں کا گلدستہ آگرا جیسے اُس نے سید سے لگا لیا اور وہ اُسے سورج دیوتا کی نذر کر کے لیکن بعد میں اُسے معلوم ہوا کہ وہ اس گلدستہ کے اثر سے حاملہ ہو چکی ہے۔ لیکن پہلے شوہر کی لے اسے بد فعلی کا نتیجہ سمجھا اور اُسے مارنے کی غرض سے وہ اُس پر ٹوٹ پڑے اتنے میں اُس کے ”بچہ“ پیدا ہو گیا جو بالکل جوان اور بند تھا اُس نے اپنے ناخلف بھائیوں اور بہن کو مار ڈالا۔ اور اس کے بعد سے وہ جنگ کا دیوتا بن گیا اور اُس کی ماں زمین کی دیوی (Coatlantona) بن گئی۔

ازتیک قوم کا سب سے مشہور معبود توئتنرل کوئل (Quetzalcoatl) تھا جس کے نام کے معنی ”کھنٹی دار سانپ“ کے ہیں اس کا مقابلہ ہم مایا قوم کے کوئل کان (Kukulcan) سے کر سکتے ہیں۔ وہ انسانی قریبیوں کے بجائے اپنے پرستاروں کا چاہتا تھا لہذا اُس کے پر و بہت اپنی زبانوں اور کانوں میں شگاف کر کے خون نکالتے اور پھر دیوتا کے منہ پر تھے۔ اسے ایک گورا ظاہر کیا جاتا تھا جس کے چہرے پر لہرائی ہوئی داڑھی ہوتی۔ ان میں یہ روایت مشہور تھی کہ وہ ایک عجیب صورت کے جہاز میں سوار اٹھا اور اُس نے انھیں تہذیب و مدنیت کی تعلیم دی اور بہت سے علوم و فنون سکھائے۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ اس روایت دم ہوناسے کو کوئل سے پہلے بعض یورپی لوگ امریکہ پہنچ چکے تھے اور انھیں کے سردار کے گرد یہ روایت طیارہ کی گئی تھی۔ اس روایت کی حسیہ تھا کہ توئتنرل کوئل یہ کہہ گیا تھا کہ میں فلاں فلاں وقت واپس آؤں گا۔ اس وقت کا لوگوں کو انتظار تھا اور منجھوں نے اس کی تاریخ بھی متعین کر دی تھی چنانچہ جب کوئیزالکوئل ۱۵۱۹ء کو ازتیک ملک میں پہنچا تو وہاں کے لوگوں کو تعجب نہ ہوا کیونکہ وہ اُس کا ہی کر رہے تھے۔ جلد ہی یہ خبر پھیل گئی کہ توئتنرل کوئل واپس آگیا ہے۔ اہل اسپین کا دیوتاؤں کی طرح استقبال کیا گیا لیکن ان نامانجیشوں نے وہاں کے باشندوں سے کیا سلوک کیا، اس کی طرف ہم مضمون کے شروع میں اشارہ کر چکے ہیں۔

آٹکا (Aztec) جنوبی امریکہ میں تہذیب کا خاص مرکز پیرو (Peru) تھا جہاں آٹکا قوم آباد تھی۔ اس کے پنے کو ”سورج کی اولاد“ بتاتے تھے۔ سورج کو پیرو میں کس قدر اہمیت حاصل تھی اسے یوں سمجھئے کہ اُس کے دار الحکومت کنزکو (Cuzco) میں سورج دیوتا کا مندر اس قدر مال مال تھا کہ ۱۵۳۵ء میں اسپین کے لوگوں نے جب اسے لوٹا تو سونے اور جواہرات میں جو دولت ہاتھ آئی اُس کا اندازہ ۱۲ ملین ڈالر کیا جاتا ہے۔ سورج دیوتا کو آتلی (Atli) کہتے تھے۔ اُس کے بارے عقیدہ تھا کہ وہ ہرگز نہیں پر مر جاتا ہے اور اس کے بعد دوبارہ پیدا ہوتا ہے۔ اسے ایک معبود برتر کے تحت مانا جاتا تھا جسے آتلی (Pacha-Kamac) یعنی ”دنیا کا خالق“ کہتے تھے، وہ آسمان پر رہتا تھا۔ پانچ قاصد اور ان کی ماہلہ عیسائی مذہب کے خدا اور عیسائی سے کہا جاتا ہے۔ عیسائیوں کی طرح آٹکا لوگوں میں بھی حیات بعد ممات اور دوزخ و جنت کا وہ پایا جاتا تھا۔

آٹکا حکومت کا خاتمہ تاریخ عالم کا ایک المیہ ہے اُس کے آخری تاجدار آتا ہواٹپا (Atahualpa) کو ہسپانوی سوار و (Pizarro) نے ۱۵۳۲ء میں دھوکا دیکر گرفتار کر لیا اور آزادی کی یہ شرط عطا کی کہ جب فلاں فلاں ہال کو فرش سے نیک سونے سے پاٹ دیا جائے گا تو چھوڑ دیں گے لیکن جب رعایا نے یہ شرط پوری کر دی تو اُس کے محبوب حکمران کو بیدار دی سے کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہاں کے لوگوں پر طرح طرح کے مظالم کئے گئے اور انھیں عیسائی بنالیا گیا لیکن آج بھی وہاں کی اکثریت اپنے اجداد کے معبودوں کی معتقد ہے۔

## ہندو مذہب

ہندوؤں کا خیال ہے کہ ان کے مذہب کا وجود ۱۰۰۰۰۰ ق۔ م سے پایا جاتا ہے اور وہ دنیا کا سب سے پُرانا مذہب ہے۔ یہ خیال سراسر بے بنیاد نہیں ہے۔ ہندو مذہب کی تاریخ کو کم ہندوستان کی تاریخ کے لحاظ سے مختلف ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

ہندوستان کے قدیم باشندے آسٹریلیا اور افریقہ کی سیاہ فام اقوام سے رشتہ رکھتے تھے۔ اب یہ آریوں کے آنے سے پہلے ملک کے مختلف حصوں میں منتشر حالت میں آباد ہیں اور ان کی آبادی گھٹ رہی ہے۔ غالباً ان میں مناظر فطرت کی پرستش اور جادو ٹونے کا رواج تھا۔

ان کے بعد قریباً ۱۰۰۰ ق۔ م بحیرہ روم کی ساحلی اقوام سے رشتہ رکھنے والے دروڑ لوگ آئے اور شاید انھیں لوگوں نے ہندوستان کے شمالی مغربی حصہ میں اُس زبردست تہذیب کی بنیاد ڈالی جس کے آثار ۱۹۱۱ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان ہڑپا (پنجاب) اور موہنودھو (سندھ) میں کھود کر نکالے گئے۔ سر جان مارشل کی تحقیقات کے مطابق یہ تہذیب ۲۵۰۰ تا ۲۰۰۰ ق۔ م کے درمیان اپنے شباب پر تھی۔ اس کا نام ”وادی سندھ کی تہذیب“ رکھا گیا ہے۔

وادی سندھ کے لوگوں کو جادو ٹونے پر زیادہ اعتقاد تھا، اس کا ثبوت تانبے کے ان تعزیدوں اور پتھر کی ان مہروں سے ہوتا ہے جو کافی تعداد میں برآمد ہوئی ہیں۔ ان کے اوپر کے حصے میں تصویری خط پایا جاتا ہے جسے ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا ہے اور نیچے میں کسی جانور کی تصویر ہوتی ہے۔ حیوانی تصاویر میں بیل، ہرن، ہاتھی، چیتا اور دیگر خاص ہیں، ان میں سے بعض کے سامنے کھانے یا بخور جلانے کا برتن ہوتا ہے۔ بیل کی تصویروں والی مہر سب سے زیادہ ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں بھی بیل کو تقدس کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا (ہندو بیل کو شیوجی کی خاص سواری سمجھتے ہیں) ایک مہر پر شیوجی کا ”پشوپتی روپ“ پایا جاتا ہے یعنی ایک مرد کو سینک کا تاج پہنے حرا تے کی حالت میں دکھایا ہے جسے جنگلی جانور گھیرے ہیں۔ غالباً یہی سینک بعد میں جانہ سے بدل گیا اور اس طرح شیوجی کا لقب ”چندر شیکھر“ ہو گیا۔ ایک شخص کا مجسمہ بلا ہے جس کے لباس پر تپا نشان ہے پایا جاتا ہے جو غالباً مہل کے پتے سے سے ماخوذ ہے۔ ان پتوں کا استعمال آج بھی شیو پوجا میں کیا جاتا ہے۔ اسی طرح رنگ پوجا کے مادی شواہد ملے ہیں۔ بعض مہروں کی انسانی تصاویر ”یوگ“ کے رواج کو ظاہر کرتی ہیں اور بعض پر ناگا یعنی سانپ دیوتاؤں کی تصویروں پائی جاتی ہیں۔

ایک مہر پر پیل کے سات پتوں کا گلدستہ اور ایک پر پیل کے درخت میں دیوی کو دکھایا ہے جس سے شجر پرستی کا پتہ چلتا ہے (پیل کی آج بھی پرستش ہوتی ہے) شکتی پوجا کا ثبوت ایک دیوی کے مجسمے ہیں جس کے سینہ کو عریاں اور نمایاں کر کے بنایا گیا ہے۔ یہاں وہ ”مادر فطرت“ ہے جس کی پرستش ایران، عراق اور کرمیٹ وغیرہ میں بھی ہوتی تھی۔

اس میں شک نہیں وادی سندھ کے لوگوں کے تجارتی تعلقات سوتسا (ایران) اور سمیریہ (جنوبی عراق) وغیرہ سے بھی تھے اور ان مقامات کی تہذیب نے سندھ کے تمدن کو کافی متاثر کیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اُس میں مقامی رنگ بھی پوری آج تاپ کے ساتھ جلوہ گر تھا۔

ان شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ ہندو مذہب کی بنیاد وادی سندھ میں پڑ چکی تھی

تیسرا اہم معبود جنگ کا دیوتا ہوتنٹیل کوٹلی (Huizilopochtli) تھا جو ایک دیندار بیوہ کے بطن سے پیدا ہوا۔ روایت کہ ایک دن وہ پہاڑ پر عبادت کر رہی تھی کہ اُس کی گود میں آسمان سے ایک خوبصورت پروں کا گلدستہ آگرا جیسے اُس نے سینہ سے لگا لیا اور دچاک وہ اُسے سورج دیوتا کی نذر کرے گی لیکن بعد میں اُسے معلوم ہوا کہ وہ اس گلدستہ کے اثر سے حاملہ ہو چکی ہے۔ لیکن پہلے شوہر کی لادنے اسے بد فعلی کا نتیجہ سمجھا اور اُسے مارنے کی غرض سے وہ اُس پر ٹوٹ پڑے اتنے میں اُس کے ”بچہ“ پیدا ہو گیا جو بالکل جوان اور نصیار بند تھا اُس نے اپنے ناخلف بھائیوں اور بہن کو مار ڈالا۔ اور اس کے بعد سے وہ جنگ کا دیوتا بن گیا اور اُس کی ماں زمین کی دیوی بلنتونا (Coatlantona) بن گئی۔

ازتیک قوم کا سب سے مشہور معبود توٹنٹیل کوٹلی (Quetzalcoatl) تھا جس کے نام کے معنی ”کلشی دار سانپ“ کے ہیں۔ اس کا مقابلہ ہم مایا قوم کے کوکل کان (Kukulcan) سے کر سکتے ہیں۔ وہ انسانی قریبیوں کے بجائے اپنے پرستاروں باخون چاہتا تھا لہذا اُس کے پر و ہمت اپنی زبانوں اور کانوں میں شگاف کر کے خون نکالتے اور پھر دیوتا کے منہ پر تپتے۔ اسے ایک گورا شخص ظاہر کیا جاتا تھا جس کے چہرے پر لہرائی ہوئی داڑھی ہوتی۔ ان میں یہ روایت مشہور تھی کہ وہ ایک عجیب صورت کے جہاز میں سوار ہو کر آیا تھا اور اُس نے انھیں تہذیب و دینیت کی تعلیم دی اور بہت سے علوم و فنون سکھائے۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کوٹلیس سے پہلے بعض یورپی لوگ امریکہ پہنچ چکے تھے اور انھیں کے سردار کے گرد یہ روایت طیار کی گئی تھی۔ اس روایت کا آخری حصہ تھا کہ توٹنٹیل کوٹلی یہ کہہ گیا تھا کہ میں فلاں فلاں وقت واپس آؤں گا۔ اس وقت کا لوگوں کو انتظار تھا اور منجھوں نے اس کی صبح تاریخ بھی متعین کر دی تھی چنانچہ جب کورٹیز ۱۵۱۹ء کو ازتیک ملک میں پہنچا تو وہاں کے لوگوں کو تعجب نہ ہوا کیونکہ وہ اُس کا انتظار ہی کر رہے تھے۔ جلد ہی یہ خبر پھیل گئی کہ توٹنٹیل کوٹلی واپس آگیا ہے۔ اہل اسپین کا دیوتاؤں کی طرح استقبال کیا گیا لیکن ان ”دیوتا ناخیشوں“ نے وہاں کے باشندوں سے کیا سلوک کیا، اس کی طرف ہم مضمون کے شروع میں اشارہ کر چکے ہیں۔

انکا (Inca) جنوبی امریکہ میں تہذیب کا خاص مرکز پیرو (Peru) تھا جہاں انکا قوم آباد تھی۔ اس کے افراد اپنے کو ”سورج کی اولاد“ بتاتے تھے۔ سورج کو پیرو میں کس قدر اہمیت حاصل تھی اسے یوں سمجھئے کہ اُس کے دار الحکومت کزکو (Cuzco) میں سورج دیوتا کا مندر اس قدر مالا مال تھا کہ ۳۵۳۵ء میں اسپین کے لوگوں نے جب اُسے لوٹا تو سونے اور جواہرات کی صورت میں جو دولت ہاتھ آئی اُس کا اندازہ ۱۲ ملین ڈالر کیا جاتا ہے۔ سورج دیوتا کو انتی (Inti) کہتے تھے۔ اُس کے بارے میں یہ عقیدہ تھا کہ وہ ہر گزہن پر مرجھاتا ہے اور اس کے بعد دوبارہ پیدا ہوتا ہے۔ اُسے ایک معبود برتر کے تحت مانا جاتا تھا جسے پاچہ قاسق (Pacha-Kamac) یعنی ”دنیا کا خالق“ کہتے تھے، وہ آسمان پر رہتا تھا۔ پاچہ قاسق اور انتی کا مقابلہ عیسائی مذہب کے خدا اور عیسیٰ سے کیا جاتا ہے۔ عیسائیوں کی طرح انکا لوگوں میں بھی حیات بعد ممات اور دوزخ و جنت کا عقیدہ پایا جاتا تھا۔

انکا حکومت کا خاتمہ تاریخ عالم کا ایک المیہ ہے اُس کے آخری تاجدار اٹا ہواٹپا (Atahualpa) کو ہسپانوی سردار پتارادو (Pizarro) نے ۱۵۳۲ء میں دھوکا دیکر گرفتار کر لیا اور آزادی کی یہ شرط مقرر کی کہ جب فلاں فلاں مال کو فرش سے چھت تک سونے سے پاٹ دیا جائے گا تو چھوڑ دیں گے لیکن جب رعایا نے یہ شرط پوری کر دی تو اُس کے محبوب حکمران کو بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہاں کے لوگوں پر طرح طرح کے مظالم کئے گئے اور انھیں عیسائی بنایا گیا لیکن آج بھی وہاں کی اکثریت اپنے آباد اجداد کے معبودوں کی معتقد ہے۔

# ہندو مذہب

ہندوؤں کا خیال ہے کہ ان کے مذہب کا وجود... ہق۔ م سے پایا جاتا ہے اور وہ دنیا کا سب سے پرانا مذہب ہے۔ یہ خیال سراسر بے بنیاد نہیں ہے۔ ہندو مذہب کی تاریخ کو کم ہندوستان کی تاریخ کے لحاظ سے مختلف ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کے قدیم باشندے آسٹریلیا اور افریقہ کی سیاہ فام اقوام سے رشتہ رکھتے تھے۔ اب آریوں کے آنے سے پہلے ملک کے مختلف حصوں میں منتشر حالت میں آباد ہیں اور ان کی آبادی گھٹ رہی ہے۔ غالباً ان پر مناظر فطرت کی پرستش اور جادو ٹونے کا رواج تھا۔

ان کے بعد فالتا... ہق۔ م بحیرہ روم کی ساحلی اقوام سے رشتہ رکھنے والے دروڑ لوگ آئے اور شاید انھیں لوگوں نے ہندو کے شمالی مغربی حصہ میں اُس زبردست تہذیب کی بنیاد ڈالی جس کے بظاہر ۱۹۱۱ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان پہڑی (پنجاب) اور موجودہ (سندھ) میں کھود کر نکالے گئے۔ سر جان مارشل کی تحقیقات کے مطابق یہ تہذیب ۳۲۵۰ اور ۲۰۵۰ ق۔ م کے درمیان اپنے شباب میں تھی۔ اس کا نام "وادھی سندھ کی تہذیب" رکھا گیا ہے۔

وادھی سندھ کے لوگوں کو جادو ٹونے پر زیادہ اعتقاد تھا۔ اس کا ثبوت تانبے کے ان تعویذوں اور پتھر کی ان مہروں سے ہوتا ہے۔ جو کافی تعداد میں برآمد ہوئی ہیں۔ ان کے اوپر کے حصے میں تصویریں خط پایا جاتا ہے جسے ابھی تک پڑھا نہیں جاسکا ہے اور نیچے میں کس جانور کی تصویر ہوتی ہے۔ حیوانی تصاویر میں بیل، ہرن، بھتھی، چیتا اور گرگ خاص ہیں، ان میں سے بعض کے سامنے کھانے یا پورے جانور کا برتن ہوتا ہے۔ بیل کی تصویروں والی مہریں سب سے زیادہ ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں بھی بیل کو تقدس کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا (ہندو بیل کو شیوجی کی خاص سواری مانتے ہیں) ایک مہریہ شیوجی کا "پشوپتی روپ" پایا جاتا ہے یعنی ایک مرد کو سینک کا تاج پہنے مہراجے کی حالت میں دکھایا ہے جسے جنگلی جانور گھیرے ہیں۔ فالتا بھی سینک بعد میں چاند سے بدل گیا اور اس طرح شیوجی کا لقب "چندر شیکھر" ہو گیا۔ ایک شخص کا مجسمہ ملا ہے جس کے لباس پر تپا نشان پایا جاتا ہے جو فالتا بیل کے پتے سے ماخوذ ہے۔ ان پتوں کا استعمال آج بھی شیوپو جا میں کیا جاتا ہے۔ اسی طرح لنگ پوجا کے مادی شواہد ہیں۔ بعض مہروں کا انسانی تصاویر "یوگ" کے رواج کو ظاہر کرتی ہیں اور بعض پر ناگ یعنی سانپ دیوتاؤں کی تصویریں پائی جاتی ہیں۔

ایک مہر پر پیل کے سات پتوں کا گلدستہ اور ایک پر پیل کے درخت میں دیوی کو دکھایا ہے جس سے "شجر پرستی" کا پتہ چلتا ہے (پیل کی آج بھی پرستش ہوتی ہے) شکتی پوجا کا ثبوت ایک دیوی کے مجسمے ہیں جس کے سینہ کو عریاں اور نمایاں کر کے بنایا گیا ہے۔ یہی وہ "مادر فطرت" ہے جس کی پرستش ایران، عراق اور کریمٹ وغیرہ میں بھی ہوتی تھی۔

اس میں شک نہیں وادھی سندھ کے لوگوں کے تجارتی تعلقات سوسا (ایران) اور سمیریہ (جنوبی عراق) وغیرہ سے بھی تھے اور ان مقامات کی تہذیب نے سندھ کے تمدن کو کافی متاثر کیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اُس میں مقامی رنگ بھی پوری آج تار کے ساتھ جلوہ گر تھا۔

ان شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ ہندو مذہب کی بنیاد وادھی سندھ میں پڑ چکی تھی

یورپ کی زبانوں کا ہندوستان، افغانستان، ایران اور آرمینیا کی زبانوں سے گہرا تعلق ہے۔ اسی لئے انھیں ہند یورپی  
 بول کی آہ زبانیں کہتے ہیں ان کا ایک مشہور نام آریائی بھی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان زبانوں کے بولنے والے پہلی کسی ایک مقام  
 اوتھے اور وہاں سے ہجرت کر کے اُن کی ایک شاخ ایران و ہندوستان چلی آئی اور دوسری یورپ چلی گئی۔ ان زبانوں کے بولنے  
 ، شروع میں ایک ہی نسل کے لوگ تھے جو اپنے کو آریہ (یعنی ”شریف“ یا ”ممتاز“) کہتے تھے۔ بعد کو دیگر اقوام میں شادی  
 کرنے سے اُن کی نسل مخلوط ہو گئی اور اب آریہ کسی خاص نسل کا نہیں بلکہ زبانوں کے ایک خاندان کا نام ہے۔

آریوں کے اصلی وطن کے بارے میں اختلاف ہے۔ بال گنگا و ہرتک منطقہ بارودہ ظاہر کرتے ہیں۔۔۔۔۔  
فیسٹ میکس ملرا رسا ایشیا اور مسٹر بیغی روس کا مشرقی حصہ بعض کا کہنا ہے کہ وہ کہیں باہر نہیں آئے تھے بلکہ تہت  
نمہ میں آباد تھے جہاں سے وہ سارے ہندوستان میں پھیل گئے اور یورپ وغیرہ کو بھی گئے۔

وہ گروہ درگروہ سیلاب کی مانند اس ملک میں آتے گئے اور یہاں کے دراوڑ باشندوں کو جنوب اور مشرق کی طرف ڈھکیل کر اگلی بن پر قابض ہو گئے اور شمالی ہندوستان "آریہ ورت" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

ہمیں ہندوستانی آریوں کے ابتدائی مذہب کا حال ان کے سب سے قدیم مصنفے رگ وید سے معلوم ہوتا ہے اس میں ۱۰۲۸ لوید کا زمانہ بھجیوں میں جو دس کتابوں میں منقسم ہیں۔ ان میں سے آخری کتاب بلیہ کے مقابلہ میں نہایت ہی فلسفیانہ ہے۔ سری عالموں کا خیال ہے کہ یہ کل بھجیوں ۱۵۰۰ اور ۱۰۰۰ اق۔ م کے درمیان تصنیف کئے گئے تھے۔

عبدود کا شجیل یہی لفظ خدا کے لئے تمام لاطینی اور یونانی زبانوں میں ادنیٰ تغیر کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہندو آریائی زبانوں میں لفظ دیو محض اسم صفت کے طور پر مستعمل تھا۔ اور ہر منور شدہ اس نام سے موسوم ہو جاتا تھا، چنانچہ ہندوؤں کے مذہبی ادب میں یہ لفظ آسمان، سورج، چاند، ستاروں، صبح صادق، آگ، ہوا اور پانی کے لئے استعمال کیا ہے۔ بعد میں اسے اسم ذات کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اس طرح اس کے معنی "معبود" اور "شریف شخص" کے ہو گئے۔

آریوں میں پہلے یہ خیال پیدا ہوا کہ فطری قوتیں ”روح“ کی حامل ہیں۔ یہی (Animism) ہے۔ پھر انہیں منسانی  
 حاصل معبود شخصیت و شکل سے منصف کرنے کا فعل شروع ہوا اور رفتہ رفتہ بہت سے معبود وجود میں آ گئے اور کثرت پرستی  
 (Polytheism) کا رواج ہو گیا۔ لیکن یہ پرستش ہندوستانی آریوں میں محض عہد وثنا (بھجن) اور قریبا نیندیں (گیگے) تک محدود  
 تھی۔ روگتیر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی آریوں کے تصور مذہبی میں کس درجہ تجسیمیت (Anthropomorphism)  
 فی جاتی تھی۔ ان کے یہاں آسمان (دیوس) بھی انسانی شخصیت رکھتا ہے، سورج (سوریہ) کی کرفوں کو وہ ہاتھ اور آگ (اگنی)  
 کے شعلوں کو زبان کہتے ہیں اور بادش کا دیوتا (اندر) تو پورے طور پر انسانی شخصیت کا حامل ہے۔

رگوید سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی آریوں نے دیوتاؤں کو تین درجوں میں تقسیم کیا تھا (۱) آسمان کے دیوتا (۲) فضلہ کے دیوتا اور (۳) زمین کے دیوتا۔ ان کا خیال تھا کہ ہر طبقہ میں گیارہ دیوتا ہیں، گویا کل ۳۳ دیوتا ہیں، لیکن رگوید میں تقریباً بیس

۱۰۔ ہو سکتا ہے کہ علی، اعلیٰ، عالی، عالیہ وغیرہ عربی الفاظ (یعنی بلند و برتر) بھی آریہ کی جڑی ہوئی صورت ہوں، کیونکہ مفرد آدائیں اور آدلی آپس میں جلتی رہتی ہیں۔

یہی الفاظ قرآن میں آتے، فضیلا اور صواب ہے جن کے معنی "موشی" کے ہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلے سامی اور آریائی زبانیں آپس میں گہرا رشتہ رکھتی تھیں۔

ہی کی حمد و ثنا کی گئی ہے۔ جن میں سے خاص یہ ہیں۔

(۱) دیوس اور دیوین	آسمان کے دیوتا	۱۔ اندر	بارش کا دیوتا (۳)	پرتھوی	زمین
(۲) سوریا، مہتر، سوتار	سورج دیوتا	۲۔ پرچینا	بارش	آگنی	آگ
پیشان اور دشنور		۳۔ دور، مہرت	طوفان کے دیوتا	سوم	نشہ آور
آشون	توام دیوتا (۴)	۴۔ واپو	ہوا		عرق
آشا	صبح کی شفق	۵۔ آپ	پانی		
			(بھینسہ جھج)		
۱۔ آسمان کے دیوتا		۲۔ فضا کے دیوتا		۳۔ زمین کے دیوتا	

ہندی آریوں کا سب سے بڑا معبود آند تھا، رگوید کے تقریباً چوتھائی بھجی اُسی کی شان میں ہیں۔ اُس کا خاص کارنامہ ورتہ نامی سانپ سے جنگ کر کے امساک باراں کو دور کرنا تھا۔ وہ دیوتاؤں کا بادشاہ اور لڑائیوں میں آریوں کا سردار تھا۔ آند کی طرح مہتر بھی ایک جنگجو دیوتا تھا۔ آگنی اور یرہ پستی کو پرستہ بتایا جاتا ہے۔

ان دیوتاؤں میں ہر ایک رتھ پر سوار ہوتا جسے گھوڑے کھینچتے۔ ان کی غذا وہی تھی جو ہندی آریوں کی، یعنی دودھ، مکھن، اناج اور بھیل، مگر یوں وغیرہ کا گوشت، یہ کھانا انھیں بگیہ کے ذریعہ پیش کیا جاتا۔ (انھیں ہون کنڈ میں ڈال کر ادھر سے پھلایا ہوا مکھن ڈالتے تھے) جسے آگ کا دیوتا بہشت میں لے جاتا۔ دیوتاؤں کا دلپسند مشروب، سوم، اس تھا (جو اسی نام کے پودے سے طیار کیا جاتا تھا) جسے پی کر وہ مخمور ہو جاتے۔

ان معبودوں کی مختصر فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں صرف دو دیویاں ہیں یعنی اوشا (شفق صبح کی دیوی) اور پرتھوی (زمین) اور باقی سب دیوتا ہیں، اس کا سبب غالباً یہ کہ آریوں کا سماجی نظام بطریق (Patriarchal) تھا اور اس میں مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل تھی۔

رگوید میں بعض موقعوں پر دو دیوتاؤں کی ایک ساتھ حمد کی گئی ہے ایسے دیوتاؤں کے تقریباً ۲۴ جوڑے پائے جاتے ہیں جیسے مہتر ورن (یعنی مہتر اور ورن) غالباً یہ دیو و پرتھوی (آسمان اور زمین) کے نمونے پر بنائے گئے تھے جنھیں زن و شو یا ماں، باپ کا مثالی جوڑا مانا گیا تھا۔

بسا اوقات رگوید میں جس دیوتا کی حمد کی جاتی ہے اُس کو اُس وقت کے لئے سب سے بڑا مان لیا جاتا ہے اور دوسروں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسے توحید ناقص (Henotheism) کہتے ہیں۔

بالآخر ہنسی اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان تمام دیوی دیوتاؤں کے اوپر ایک ہستی ہونا چاہئے جو ان سب کی حاکم یا خالق ہے۔ آخر کار دیوتا کو رگوید میں پرہاجتی (مخلوقات کا مالک) و شوکرمن (خالق کل) اور پرش (انسان اعلیٰ) وغیرہ ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ چونکہ تخلیق عالم خدا کی ایک صفت ہے لہذا ان خلاق دیوتاؤں کو ہمیں ”خدا کے پیشرو“ سمجھنا چاہئے۔

پرہاجتی — رگوید میں پرہاجتی کی تصریح یوں کی گئی ہے :-

”پرہاجتی نے کارگیر کی طرح اس عالم کو گھڑا“

دیوتاؤں کے ابتدائی زمانہ میں ”لاشے“ سے ”نشے“ وجود میں آئی۔

(منڈل دہم سوکت ۷۷)

پیش — بعض مذاہب میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ خود انسان ایک چھوٹی سی دنیا ہے اس ”عالم صغیر“ (Microcosm) کے

ابجد میں "عالم کبیر" (Macrocosm) یعنی کائنات کو بھی انسانی صورت پر چونا چاہئے۔ چنانچہ رگوید کے پریش سوکت (سوکت ۹۰) میں ایک ایسے مردِ عظیم (جہا پریش) کا تذکرہ ہے جو خدائی صفات رکھتا ہے۔ اُس کے ہزار سر، ہزار آنکھیں اور ہزار پاؤں ہیں (گویا وہ ہمہ جا اور ہمہ داں ہے) دیوتا اُسے قربانگاہ پر چڑھاتے ہیں اور اُس کے اعضاء جسم سے کارخانہٴ عالم مرتب تھے ہیں یعنی اُس کے سر سے آسمان، پیروں سے زمین، ناک سے فضا، سانس سے ہوا، دماغ سے چاند، اور آنکھ سے سورج پیدا ہو گئے۔ پریش کے منہ سے برہمن پیدا ہوئے، اُس کے بازو چترئی (سپاہی) بنے اُس کی رانیں ویش (اہلِ حرفہ) ہو گئیں اور اُس کے برہمدر (خدمتگار ہو گئے) یہی پریش بعد کی روایات کا برہما ہے۔

اس سے ایک خاص بات ظاہر ہوتی ہے اور وہ یہ کہ..... خالق کو مخلوقات سے جدا نہیں مانتا ہے بلکہ خود اس کا عالم ایسا ہی تبدیل ہو جانا بتاتا ہے۔

**خلیق کا گیت** (دوسری کتاب، سوکت ۱۲۵) میں تخلیقِ عالم سے پہلے کی حالت جس خوبی سے بیان کی گئی ہے اُس کی مثال ادبیاتِ عالم میں نسا محال ہے، اگرچہ اس میں کوئی واضح ٹکونی نظریہ پیش نہیں کیا گیا ہے تاہم "وہ ایک" (تدائیکم) سے خالق یا خدا کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

یہ خواہش عقل یا روح کا ابتدائی تخم تھی  
جس کو برشیل نے اپنے دل و داغ کی کاوش سے  
معلوم کیا۔

کہ وہ (تخم) عدم و وجود میں واسطہٴ اتصال ہے۔  
بند ۵

"وہ شعاع نورِ عالموں میں پھیلی  
کیا وہ عالمِ ہستی سے نمودار ہوئی یا عالمِ بلا سے؟  
پھر بچے بوسے گئے اور قوتیں پیدا ہوئیں  
کارخانہٴ قدرتِ عالمِ ہستی میں اور اقتدار و ارادہ  
عالمِ بال میں۔"

حقیقت کی کس کو خبر ہے؟ یہاں اُس کا اعلان  
کون کر سکتا ہے؟  
کائنات (وہ عالمِ مخلوقات) کی پیدائش کہاں سے  
یا کس سے ہوئی؟  
کیا دیوتا بھی اُس کے ساتھ ظہور میں آئے؟  
(یا دیوتا بھی بعد کی پیدائش ہیں)

بند - ۱

"اُس وقت عدم تھا اور نہ وجود  
نہ عالمِ باد اور نہ آسمان جو اُس سے پر ہے ہے  
کیا چیز سب کو محیط تھی اور وہ سب کچھ کہاں قائم تھا؟  
کیا وہ پانی اور شمع بے پایاں تھا؟

۲

اُس وقت فنا و بقا کا کوئی وجود نہ تھا  
اور نہ دن رات کا کوئی فرق تھا  
"وہ ایک آہنے آپ میں مغیر سانس (یا نوا) کے سانچے کا تھا  
اور اُس کے سیاہ کوئی دوسری شے نہ تھی

۳

"ابتدا میں تاریکی پر تاریکی چڑھی ہوئی تھی  
سب کچھ (کائنات) غیر تمیز صورت میں پانی ہی پانی تھا  
"وہ ایک" جو غلغلہ میں جامہٴ عدم پہنے ہوئے تھا  
حرارت نے اُس کو اپنی طاقت سے پیدا کیا

۴

"اُس میں ابتدا و خواہش نمودار ہوئی

لے یہ سوکت قدیم نہیں ہے بلکہ رگوید کے مرتب ہوجانے کے بعد اضافہ کیا گیا ہے کیونکہ اس میں آگے چلکر رگوید، ستم دیدار و اشوروید کا حوالہ دیا گیا ہے (جو رگوید کے بعد تصنیف کئے گئے تھے) اور چار ذوالوں کا بھی ذکر ہے۔ اس روایت کے تقابلی مطالعہ کے لئے دیکھیے میرا مضمون "پیدائشِ عالم" مطبوعہ تھلہ و سمبر ۱۹۵۸ء

تو پھر کون جانتا ہے کہ وہ (کائنات) کہاں سے  
منو دار ہوئی؟

یا یہ کہ وہ خلق بھی ہوا ہے یا نہیں؟  
وہ جو بالاترین آسمان سے سب کچھ دیکھتا ہے  
اس حقیقت کا علم صرف اُسی کو ہے یا شاید  
وہ بھی نہیں جانتا؟

یہ عالم مخلوقات کہاں سے منو دار ہوا؟

لیکن توحید کے اس تخیل نے بہت جلد ”ہمہ اوست کے عقیدے“ (Pantheism) کی صورت اختیار کر لی۔

**ہمہ اوست کا عقیدہ** — ایک خدا کا علم ہو جانے پر بھی انھوں نے دوسرے معبودوں کو مخلوق اور آخریچہ نہ مانا بلکہ ایک ہی خدا کے مختلف  
مظاہر تسلیم کئے۔

”ایک اگنی (آگ) ہے جو بہت سی جگہوں پر روشن ہوتی ہے ایک سورج (سورج) ہے جو سب پر چمکتا ہے،

ایک آشا (شفیع صبح) ہے جو اس سب کو منور کرتی ہے۔ وہ جو ایک ہے یہ سب کچھ ہو گیا ہے۔“

(رگ وید منڈل ۸، سوکت ۵۸ بند ۲)

انھوں نے اپنے ہر معبود یا کل مظاہر فطرت کو خدا ہی کی ایک صورت سمجھ لیا۔ ویدوں کے دوسرے دور میں ان خیالات پر اور جلا ہو گئی  
اور جو باتیں اب تک مبہم اور غیر واضح تھیں وہ واضح کر دی گئیں۔

**ویدوں کا دوسرا دور** — رگ وید کے زمانہ میں آریہ لوگ پنجاب میں آباد تھے اور جانب جنوب و مشرق ان کی پیش قدمی جاری تھی لیکن ویدوں  
کے دوسرے دور میں وہ پورے شمالی ہند میں پھیل گئے۔

سماجی حالت — رگ وید کے زمانہ میں ذات پات کی تفریق نہ تھی۔ اس دور میں چار ذاتیں قائم ہو گئی تھیں۔ (۱) برہمن جن کا کام مذہبی  
تعلیم اور پوجا پاٹ کرنا تھا۔ (۲) چھتری، جن کا کام حکومت اور جنگ کرنا تھا۔ (۳) ویشی، جن کا کام زراعت اور حرفت تھا۔ (۴) شودر،  
جن کا کام اول تین ذاتوں کی خدمت کرنا تھا۔ اس طبقہ میں مفتوح اقوام شامل تھیں۔

اسی دور کے آخری حصہ میں چار آشرم وجود میں آئے یعنی انسان کی اوسط عمر ۱۰۰ سال مانکر پہلی تین ذاتوں کے افراد کی زندگی کو پچیس  
بچیس سال کے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا جنھیں آشرم کہتے تھے وہ یہ ہیں:-

(۱) برہمچریہ آشرم — پچیس سال کی عمر تک ضبط نفس کرتے ہوئے گرو سے مذہبی تعلیم حاصل کرنا جس میں ویدوں کا حافظہ اور ان کے  
معنی سمجھنا خاص تھا۔ یہ ساری تعلیم زبانی ہوا کرتی تھی۔

(۲) گریہستھ آشرم — پچاس سال کی عمر تک خاندان کا نام چلانے کے لئے اہلی زندگی بسر کرنا جس کے دیگر فرائض میں ویدوں کی تلاوت،  
دیوتاؤں کے لئے قربانیاں، آباؤ اجداد کی نذر و نیاز، جہان نوازی، خیرات اور پرندوں کو کھانا شامل تھا۔

(۳) وان پرستھ آشرم — پچھتر سال کی عمر تک گھربار اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر جنگل میں جا کر یوگی کی زندگی بسر کرنا۔ اسی دور میں آریہک نامی  
مذہبی کتب کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔

(۴) سننیا س آشرم — بقیہ زندگی بھکشو (فقیر) بن کر بغیر کسی جگہ قیام کے ہوئے بسر کرنا۔ اس دور میں بھی مذہبی غور و فکر کا سلسلہ جاری  
رہتا تھا اور ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی مذہب کی تعلیم دی جاتی تھی۔

تاریخ عالم میں انسانی زندگی کے واسطے ایسا زبردست لائحہ عمل کہیں نہیں پایا جاتا۔ قدیم ایشیائیوں کے زمانہ تک چار آشرموں کا نظم  
پیدا ہو چکا تھا اور لوگ اُس پر عمل پیرا بھی ہو رہے تھے۔ بعد میں ان کا رواج عام ہو گیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ لوگوں کو مابعد الطبیعیاتی  
مسائل پر غور و فکر کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع مل سکا۔ اس پر ذات پات کی تفریق مسترد تھی جس نے برہمن طبقہ کو فکر معاش سے آزاد  
کر کے ہر قسم کے علمی مسائل پر غور کرنے کا اہل بنا دیا۔

ہی گتے۔ اس دور میں سام وید، یجور وید اور اتھرو وید کے سنگتھا، چار ویدوں کے برہمن، آرنیک اور اُپنشد تصنیف ہوئے۔

اب ہم ذکرہ بالا کتابوں سے کچھ اقتباسات نقل کرتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ اس دور میں خدا کا تخیل کیا تھا۔ تین دیدوں کے آئینہ نقاسات سے ظاہر ہوگا کہ ہندی آریائی تو حید اور وحدیت (عقیدہ ہمہ اوست) دونوں ہی کے قابل تھے۔

مکرم وید۔۔۔ (۱) ”وہ اگنی ہے، وہ آدیتیہ ہے، وہ دیوہ ہے، وہ چنڑا ہے، وہ روشنی ہے، وہ آپہ، وہ پرہاسی ہے“ (۲)

(۲) ”کیا میں اُس روح برترین کو جان سکتا ہوں جو سب کچھ ہے اور تاریکی سے پرس ہے، صرف اُسی کو جان کر

کوئی موتِ عظیم پر فتح پاسکتا ہے۔ نجات کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے" (۳۱/۲)

(۳) ”خدا ایک ہے۔ وہ غیر متحرک ہے تاہم دماغ سے زیادہ سریع السیر ہے، جو اس تک نہیں پہنچ سکے کہ اللہ“

وہ ان میں ہے۔

مام وید۔۔ (۴) 'اسے خدا تو ہمارا باپ ہے، ہمارا بھائی ہے، ہمارا دوست ہے۔' (۱۸۴۱)

تھروید - (۵) "تو مرد ہے، تو عورت ہے، تو کنواری لڑکی ہے، تو بوڑھا آدمی ہے جو لاشیں لئے لڑکھڑاہا ہو، تو ہر طرف موجود ہے" (۱۰-۲۵۷۸)

(۶) ”وہ ایک ہے، تنہا ایک، اُس میں تمام معبود ایک ہو جاتے ہیں“ (سورہ)

(۷) صحیح علم دین کے جاننے والے ۳۳ دیوتاؤں کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ صرف ایک ہی میں موجود ہیں اور

”اس کے ذریعہ سے اپنے صحیح اور فطری فرائض انجام دیتے ہیں“ (۱۰-۲-۲۷)

تمام وید ہی معبودوں میں ورن کا مرتبہ اخلاقی حیثیت سے نہایت ہی بلند ہے۔ اتھرو وید کے چند بند ملاحظہ ہوں :-

(۸) ”وَرْنِ آقائے اعلیٰ دیکھتا ہے، گویا وہ نزدیک ہو جب کوئی شخص کھڑا ہوتا یا چلتا ہے یا بیٹھتا ہے، اگر وہ لیٹے

جانتا ہے یا اُٹھتا ہے۔ جب وہ آدمی پاس میں پہنچ کر کانا پھنوسی کرتے ہیں تو بھی شاہ درجن کو اس کا علم ہوتا ہے وہ

وہاں مثل ثالث کے موجد ہوتا ہے۔

”یہ زمین بھی شاہِ ورن کی ہے اور یہ آسمان بھی جس کے گناہ بہت بعید ہیں۔ دونوں سمندر ورن کی کمرہیں

وہ پانی کے اس قطرے میں بھی موجود ہے۔“

”اگر کوئی آسمان سے پرے بھاگ کر جانا چاہے تو بھی وہ شاہ و رتن سے نہیں بچ سکتا۔ اُس کے جاسوس آسمان

۱۷۔ اس کا مقابلہ زبور ۲۴ - آیت اسے کیجئے۔ ۱۸۔ اس کا مقابلہ زبور ۱۲۹ کی آیات ۱ تا ۱۲ سے کیجئے۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ دونوں میں اس قدر مشابہت ہے کہ بجائے توار کے زبور کی آیتیں سرقہ معلوم ہوتی ہیں ۔

دنیا کی طرف پڑھتے ہیں اور ہزار آنکھوں سے اس زمین کی نگراں کرتے ہیں۔

”خداہ ورتن سب کچھ دیکھتا ہے جو زمین و آسمان کے درمیان اور اُس کے پرے ہے اُس نے انسانوں کے چک

چپکائے ملک کا شمار کیا ہے جیسے ایک کھلاڑی ہاتھ پھینکتا ہے دیکھ ہی وہ سب چیزوں کا فیصلہ کر دیتا ہے۔“ (۴-۱۶-۵)

یہاں پر ورتن سے تمام تر خدائی اوصاف منسوب کر دئے گئے ہیں اور دوسرے دیوتاؤں کو غیر موجود مانا گیا ہے یہی ”توحید ناقص“ ہے جس کی مثالیں ہندو ادب میں بہت پائی جاتی ہیں۔ اُنھیں آگے نقل کیا جائے گا۔

پنشنہ کے لفظی معنی ”راز کی تعلیم“ (رہسید) ہیں جسے ہندوؤں کی تین اعلیٰ ذاتوں میں سے صرف وہی حاصل کر سکتے تھے جنہیں گوروں کا اہل سمجھتے تھے۔ خاص اُپنشنہ تقریباً ۱۴ ہیں۔

ان کا موضوع روح (آتمن) خدا (برہمن) اور نیچر ہے۔ نیچے ان کا بالتفصیل ذکر کیا جاتا ہے :-

بعض کے نزدیک روح انسان خدا سے مختلف ہے۔ خدا قادر مطلق اور عالم کل ہے لیکن روح کی طاقت اور علم محدود ہے۔ خدا بطل کل ہے اور روح جسم تک محدود ہے۔ خدا مسرت کامل ہے لیکن روح بسا اوقات خوش ہوتی ہے اور بسا اوقات غمگین۔ خدا غیر فخر کس ہے اور روح سراپا تنگ و دو ہے۔ خدا مقصود ہے اور روح اُس کی متلاشی ہے وغیرہ وغیرہ۔

اُپنشنہوں کے مطابق روح اور خدا میں کوئی فرق نہیں۔ بقول شری رام کرشن برہمنس ”روح مقید انسان ہے اور روح اودھا ہے۔“ روح کی قید و بند محض اُس وقت تک ہے جب تک وہ لاعلمی کے طلسم میں گرفتار ہے اور جب انسان نے اپنے نفس کو بان لیا تو ”دوئی“ مٹ گئی۔ گویا ہم اُپنشنہوں کے فلسفہ کو مختصر یوں ظاہر کر سکتے ہیں (برہمن = آتمن) برہمن اور آتمن کی وحدت برہما آتما ایکم) فلسفہ ویدانت کا اذعان اصول ہے۔

جس طرح ایک آہو مشک کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ جو خوشبو اُس کے مشام جان کو مضر کر رہی ہے اُسی ہے، اُس طرح ہم بھی یہ نہیں جانتے کہ جس خدا کی ہمیں تلاش ہے وہ کہیں آسمان پر نہیں بیٹھا ہے بلکہ خود ہمارے اندر ہے اور ہم اُس کے اندر ہیں۔ اُپنشنہوں کا خدا داخلی بھی ہے اور خارجی بھی۔ اُپنشنہ پر زور الفاظ میں انسان کو یہ بتاتے ہیں کہ ”وہ تو ہے“ نت تو م اسی) اور ”میں برہمن ہوں“ (اہم برہم اسی)

اگرچہ میرا دل کہتا ہے کہ میں آپ سے مختلف ہوں اور اس سے نتیجہ نکالتا ہوں کہ آپ کی نسبت سے میرا ایک علیحدہ وجود ہے۔ اس طرح میں خدا سے بھی جدا ہوں، لیکن ویدانتی کہتا ہے کہ یہی تو ساری پریشانیوں کی جڑ ہے اور جب تک انسان اس کثرت، احساس کو ترک نہ کرے گا آواگون سے نجات نہیں مل سکتی اس لئے :

”دل میں یہ سمجھنا چاہئے کہ یہاں کثرت نہیں ہے جہاں کثرت پر نظر جاتا ہے وہ موت سے موت تک اندھے پن سے بھٹکتا ہے“

(برہید آرینک ۴-۴-۱۹)

اُپنشنہوں کا نصب العین عابد و معبود کے فرق کو مٹانا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :-

”جو اپنے سوا، دوسرے معبود کی پرستش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ایک ہے اور میں دوسرا ہوں، وہ شخص عقلمند نہیں ہے“ (برہید ۴-۱۰)

جو کہتا ہے کہ ”خدا ہے“ اُس کے سامنے محاب ہے اور جو کہتا ہے کہ (میں) ”خدا ہوں“ اُس نے یقیناً خدا کو جان لیا ہے۔ مان کو خود اپنی ذات کے بارے میں سوچنا چاہئے ”مطالعہ نفس“ کے سوا کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں :

لے اسے برہمن ذات اور برہمن نامی کتابوں سے مختلف سمجھنا چاہئے۔ اس کے معنی ہیں ”عظیم ترین“ اور یہ لفظ بے جنس ہے۔ اسی کی دو نکل وحدت برہما ہے جسے اُس برہما (ذکر) سے مختلف سمجھنا چاہئے جو ہندو تثلیث کا پہلا اقسام ہے۔

” دراصل جس نے اپنے نفس کو دیکھ لیا، سن لیا، سمجھ لیا اور جان لیا اس نے سارے عالم کو جان لیا۔“ (برہیدہ ۲-۳-۵)  
 اس صداقت تک پہنچنا ہی ویرانت کی معراج ہے۔ یہ وہ روشنی ہے جس کے طلوع ہونے کے بعد رات ہوجا محال ہے :-  
 ” اُس کے لئے کیا غم ہو سکتا ہے جس نے اس وحدت کو جان لیا اس کے دل کی قید ٹوٹ گئی اور تمام شبہات زائل ہو گئے؟ (منذک ۲-۱۰-۸)  
 پیدائش عالم کے بارے میں آپشند ایک خاص نظریہ پیش کرتے ہیں۔ آپشندوں کا خالق کسی خارجی مادے سے دُنیا کو نہیں پیدا کرتا بلکہ خود اپنے اندر سے :-

” جس طرح کٹری جالا بنتی ہے جس طرح کہ پودے زمین سے اُگتے ہیں اُسی طرح یہ سب کچھ جہاں ہے اُس غیر فانی سے نکلتا ہے۔“ (منذک ۱-۱-۴)

دوسری جگہ اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے :-  
 ” جیسے چھٹی چھوٹی چکاریاں آگ سے اڑتی ہیں اسی طرح اس آگ سے تمام عالمیں، دیوتا، ارواح حیوانی اور کل زندہ مخلوقات برآمد ہوئی ہیں۔“ (برہیدہ ۲-۱-۲)

اور یا پھر مخلوقات کا خالق سے پیدا ہونا ویسا ہی ہے جیسے سطح آب پر ملبول کا پیدا ہونا اور پھر اُس میں غائب ہو جانا۔  
 ویرانت فلسفہ ”کثرت فی التوحید“ (بہت میں ایک) اور ”توحید فی الکثرت“ (ایک میں بہت) کا قائل ہے۔ دنیا کی ہر شے خدا میں ہے اور ہر شے میں خدا ہے۔ اب سے ڈھائی ہزار سال پہلے ایک فلسفی اُدلک اپنے بیٹے شویت کیتو کو ہدایت کرتا ہے :-  
 ” اے میرے بیٹے شروع میں یہ کائنات اور مٹی واحد ایک تھے۔ اُس مٹی نے خواہش کی کہ میں کثیر ہوں گا۔ میں اپنے کو ظاہر کر دوں گا اس لئے اُس نے تھیں (حرارت) کو پیدا کیا۔“ (چھاندوگیا ۲-۲-۲-۳)

اُس کے چل کر وہ مٹی ’مطلق‘ پر یوں روشنی ڈالتا ہے :-

” یہ تمام کائنات بالجوہرہ ہے، وہ صداقت ہے، وہ آتما ہے اور وہ توبہ؟“ (چھاندوگیا ۴-۸-۴)  
 اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوتاؤں کی طاقت اور فطرت کا اصل منبع، خدا کی ذات ہے اور بغیر اُس کی مرضی کے کچھ نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ کہتے ہیں کہ :-  
 ” سورج نہیں چمکتا اور نہ چاند سارے چمکتے ہیں۔ بجلی چمکتی ہے۔ آگ تو کسی شمار و قطار میں نہیں اُس کے (خدا کے) چمکنے

سے سب کچھ چمکتا ہے اُس کے نور سے یہ سب کچھ منور ہوتا ہے۔“ (کٹھ ۵-۱۵-۲-۱۰)

آپشند روح اور مادے کی تفریق کو تسلیم نہیں کرتے۔ اُن کے مطابق علت اولی روح ہی ہے :-

” یہ سب روح پر مبنی ہے، روح کائنات کی بنیاد ہے، روح برہمن ہے۔“

ہماری روح ہی اصل حقیقت ہے اور جو کچھ نظر آتا ہے وہ مایا (فریب نظر) ہے اگرچہ یہ خیال نہایت پُرانا ہے لیکن مایا کا فطرت سے پہلے شوتہا شوتر آپشند (۱۰-۱۰) میں استعمال ہوا ہے۔ مغربی فلاسفہ میں افلاطون کا کہنا تھا کہ دُنیا میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ حقیقت نہیں ہے بلکہ محض اُس کا سایہ ہے اور کائنات کی بھی یہی رائے ہے۔

آپشندوں کا خدا شخصی (سکن) بھی ہے اور غیر شخصی (ذیرگن) بھی۔ پہلی صورت میں وہ یہودی اور عیسائی مذہب کے خدا سے مشابہ ہے۔ وہ کائنات کا بنائے والا، پالتے والا، مٹانے والا اور اُس کا حکمران ہے۔ دنیا والوں کی قسمت اُسی کے قبضے و اختیار میں ہے۔ وہ نیکیوں کو جزا اور بدوں کو سزا دیتا ہے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ چونکہ برہمن ہر شے میں سایا ہوا (انتریاہی) ہے اس لئے اُس کا جسم تمام جسموں کا مجموعہ ہے۔ اُس کا دماغ تمام دماغوں کا مجموعہ ہے۔ سب کے ہاتھوں سے وہ کام کرتا ہے۔ سب کے پیروں سے وہ چلتا ہے۔ سب کی آنکھوں سے وہ دیکھتا ہے اور

سب کے کافوں سے وہ سنتا ہے۔

ایک طرف تو آریائی فلاسفہ نے برہمن کی یوں تعریف کی کہ وہ ایسا ہے ایسا ہے اور پھر دیکھ کر اُس کی صحیح تعریف نہیں کی جاسکتی۔  
کہہ دیا کہ ”وہ ایسا نہیں ہے، ایسا نہیں ہے“ (نیتی نیتی) ذیل کا اقتباس اسی انداز میں لکھا گیا ہے۔

”وہ کثیر ہے نہ دقیق نہ وہ خفیف ہے نہ طویل، نہ وہ آگ کی طرح سرخ ہے نہ پانی کی طرح سیال۔ اُس کا سایہ نہیں ہے  
اُس میں تاریکی نہیں ہے وہ بغیر ہوا، بغیر تعلق کے، بغیر ذائقہ کے، بغیر ٹوکے، بغیر آنکھوں کے، بغیر گویائی کے، بغیر دماغ  
کے، بغیر سانس کے، بغیر دھانے کے، بغیر ناپ کے اور بغیر ظاہر و باطن کے ہے“ (برہمد ۳-۳-۸)

اس طرح اُنھوں نے برہمن کو تمام صفات سے معزک کر دیا۔ بظاہر یہ خیالات متضاد معلوم ہوں گے کہ ایک طرف تو خدا کو نرگن نرکھ  
(بے صفت اور بے صورت) کہا جاتا ہے اور دوسری طرف سگن ساکار (صاحب صورت و صفات) لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب تک ہم اپنے  
کو مجسم اور محدود سمجھتے ہیں اُس وقت تک خدا شخصی ہے اور جب ہم اپنی شخصیت کے حدود سے باہر ہو گئے، تو شخصی خدا اور مادی دنیا  
ہمارے لئے غائب ہو جاتی ہے اور صرف غیر شخصی خدا رہ جاتا ہے۔ ہم اور ”وہ“ ایک ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت دوئی مٹ جاتی ہے اور  
”ہست مطلق“ کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ ان معنوں میں روح (جیو آتما) اور خدا (برہمن) ایک ہیں اور جب تک ہم اپنی خودی کو فنا  
نہیں کرتے، دونوں مختلف ہیں۔

مسئلہ تناسخ (آواگون) انسان کے مرنے کے بعد روح کا کیا حشر ہوتا ہے اس کی تین ہی صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) جسم کے ساتھ  
روح بھی ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے۔ (۲) اُسے اپنے اعمال کے مطابق ہمیشہ کے لئے دوزخ یا جنت میں  
رہنا پڑے۔ (۳) اُسے اپنے اعمال کے مطابق مختلف قالب بدلنا پڑیں تا وقتیکہ وہ اپنی اصلی حالت پر آکر خدا سے مل جائے۔  
ان میں سے پہلا خیال ادمین کا ہے، دوسرا یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کا اور تیسرا خیال ہندوؤں اور بعض دیگر اقوام میں  
پایا جاتا ہے۔

ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ انسان کی روح غیر فانی ہے اور دراصل آواگون میں بھی روح میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی وہ تو محض  
قالب بدلتی ہے جس کا انحصار اعمال پر ہے۔ اگرچہ روح کو جس تو خوب سے خوب تر جسم کی ہوتی ہے تاہم وہ کبھی تو حشرات الارض یا  
پودوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی انسان اور انسانِ کامل کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ رحوں کے ہمارے میں ایک جگہ  
ارشاد ہوتا ہے :-

”اپنے گزشتہ اعمال اور علم کے مطابق بعض حصولِ جسم کے لئے رحم میں داخل ہوتی ہیں اور بعض مقیمِ اشیا (دیوؤں وغیرہ) میں۔“

(کٹھ ۵-۵)

بعض اُپنیشدوں کے مطابق مرنے کے بعد رحوں کو دو راستوں میں سے ایک سے سفر کرنا ہوتا ہے۔ ایک تو دیوتاؤں کا راستہ (دیوتاؤں) ہے  
اور دوسرا آبار کا راستہ (پترائن) ہے۔ اعلیٰ ترین رحوں کو پہلے راستے سے سفر کر کے برہمن کوک (عالمِ خداوندی) تک پہنچتی ہیں اور دھیان  
میں محو ہو کر اپنے کو مکمل کرتی ہیں اور بالآخر خدائے تعالیٰ میں جذب ہو جاتی ہیں۔ نیک رحوں کو دوسرے راستے سے سفر کر کے چاند تک پہنچتی  
ہیں اور وہاں جا کر اپنی نیکیوں کا سکھ اُٹھاتی ہیں اور وقت پورا ہونے پر پھر زمین پر دوبارہ پیدا ہونے کے لئے آتی ہیں۔

اُپنیشدوں سے پہلے آواگون کا ذکر نہیں ملتا (منڈک ۱-۲-۱، چھاندا گیتہ ۵-۳-۱۰) لیکن یہ خیال غالباً برہمنوں کے زمانہ میں پیدا

ہو چکا تھا۔

لے بھائی فلسفیوں میں نیشا غوث اور قراط آواگون کے قابل تھے۔ موجودہ دور میں شامی انسل شاعر جبران مسد تناسخ سے کافی متاثر ہوا ہے۔

لے ملاحظہ ہو چھاندا گیتہ ۲-۱۵، ۵-۱۰، برہمد ۱۲-۲، کوشکی ۱-۲-۳، گیتا آتھوان ادھیائے شلوک ۲۲-۲۵

بظاہر پیدا ہونے سے نجات اُسی وقت مل سکتی ہے جب انسان کی روح (جیو آتما) خدا (برہمن) میں مل جائے۔ خدا سے ملنے کا نام ہی موکشا یا نرکان (نجات) ہے اور ازل کی روح سے وصال حاصل کرنا ہی ہندو مذہب کا نصب العین ہے۔ اُپنیشدوں کی تعلیم پر عمل کر کے ایک شخص کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ جیتے جی برہمن سے واصل ہو جائے اور بار بار پیدا ہونے سے نجات حاصل کر لے۔

ہندو مذہب کے مطابق انسانوں میں جو غیر مساوات پائی جاتی ہے وہ خدا کی تلون مزاجی کا نتیجہ نہیں ہے کہ جیسا چاہا فلسفہ اعمال (کرم) قسمت میں لکھ دیا بلکہ یہ ہر شخص کے اعمال (کرم) کا نتیجہ ہے۔ ہندوؤں کا اعتقاد ہے کہ ایک شخص اس زندگی میں اعلیٰ یا ادنیٰ ذات میں یا غیر انسانی صورت میں پیدا ہوتا ہے تو یہ اُس کی گزشتہ زندگی کے اعمال کا پھل ہے جیسا کوئی اس زندگی میں کرنا اُسی کے مطابق وہ آئندہ زندگی میں جنم لے گا۔ اس نظریے کے مطابق جسے ہم مقدر یا قسمت کہتے ہیں وہ ہماری گزشتہ پیدائشوں کے اعمال کا نتیجہ ہے جو ہماری موجودہ حالت کو متعین کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہندو اپنی بُری حالت یا تکالیف کے لئے خدا کو ذمہ دار نہیں قرار دیتا بلکہ ساری ذمہ داری اپنے سر لے لیتا ہے۔

رامائن — ہندوؤں کی دو مشہور رزمیہ نظمیں ہیں رامائن اور مہابھارت، موجودہ رامائن رزمیہ نظموں کا زمانہ (مہا دوویہ کال) چوبیس ہزار اشعار (اشوک) پر مشتمل ہے جو سات حصوں میں منقسم ہیں۔ دوسرے حصے سے نیکر چھٹے حصے تک میں رام چندر جی کو ایک بہادر انسان کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ مورخین کے مطابق یہ حصے والہیک کے تصنیف کردہ ہیں جن کا زمانہ کم از کم چھٹی صدی ق۔ م تھا۔ پہلے اور ساتویں حصے میں رام چندر جی کو خدا (وشنو) کا اوتار مانا ہے۔ انہیں خاندان بعض دوسرے مصنفین نے دوسری صدی ق۔ م میں اضافہ کیا تھا۔

ہندوؤں میں اس کتاب کا پڑھنا ثواب میں داخل ہے۔ جو لوگ سنسکرت سے ناواقف ہیں وہ ہندی میں رامائن پڑھتے ہیں جسے گڑناہی تسمی داس جی نے اکبر اعظم کے عہد میں لکھا تھا۔ اس کا پورا نام رام چترنامس ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے رامائن کا موضوع رام کی زندگی ہے؟ اگر دھما کے راجہ دسرتھ کے تین بیویاں تھیں۔ کوشلیا، کیکیٹی اور مہتر کوشلیا سے رام چندر جی، کیکیٹی سے بھرت اور مہتر سے لکشمن اور مہتر سے پیدا ہوئے۔ رام چندر جی کی شادی ودیہ کے راجہ جنگ کی لڑکی سیتا جی سے ہوئی اور چونکہ رام چندر جی سب سے بڑے اور قابل شہزادے تھے اس لئے راجہ دسرتھ نے ان کو اپنا ولی عہد قرار دیا، اس پر ان کی سوتیلی ماں کیکیٹی کو حسد پیدا ہوا اور انھوں نے راجہ دسرتھ پر زور دے کر اپنے بیٹے بھرت کو ولی عہد بنوا دیا اور رام چندر جی کو جلاوطن کر دیا۔ وہ تنہا جانا چاہتے تھے لیکن اُن کی وفادار بیوی سیتا ابھرائی لکشمن ساتھ چلنے پر مہر ہوئے اور ساتھ گئے، بعد ازاں سیتا کو لنگا کا راجہ راون اغوا کر لے گیا۔ رام نے ہنومان جی کی مدد سے ایک بڑی فوج طیار کی۔ ہنومان کے ہندوؤں نے جنوبی ہند سے لنگا تک ایک پل طیار کیا جس پر سے ہو کر رام کی فوج لنگا پہنچی۔ لکھنمان کی لڑائی ہوئی، راون مارا گیا اور سیتا کو واپس لے آیا گیا۔ آج بھی اس واقعہ کی یادگار میں دہرے کا جھوار منایا جاتا ہے، کہتے ہیں راون کو مارنے سے پہلے رام نے دُر کا کی پوجا کی تھی سو اسی نمونے پر بنگالی پہلے تین دن دُر کا پوجا کرتے ہیں اور ادھر کے لوگ چوتھے دن رام لیلا کے تماشے میں راون کی شبیہ بنا کر جھونکتے ہیں۔

ہندوؤں کے نزدیک رام اپنی شرافت نفس اور فرزندانہ اطاعت کی بنا پر ایک مثالی انسان ہیں اور "رام راج" ایک مثالی حکومت کا نمونہ ہے۔ سیتا جان نثاری اور شوہر پرستی کی بنا پر ایک مثالی عورت ہیں۔ لکشمن برادرانہ وفاداری اور ہنومان اطاعت گزار کی علامت ہیں، ہر فرشتے کے لوگ رام کی عزت کرتے ہیں اور رام سے زیادہ ہندو بچوں کا کوئی دوسرا نام نہیں رکھا جاتا۔ لوگ رام کا نام لیتے ہوئے مرنا پسند کرتے ہیں۔

خود راتوں اور براتوں میں رام کو مشغول بھگون کا ساتواں اوتار تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ جامعہ بشری میں خدا تھے لہذا ان کی خدا کے طور پر پرستش کی جاتی ہے۔ گو سوامی تسی داس جی فرماتے ہیں :-

”واقعی رام وہ خدا ہے جو سراپا وجود، ہمہ تن عقل اور سترتا پامست ہے جو نامعلوم ہے جس کا جوہر ہی علم ہے اور جو توانائی کا ایک عظیم مخزن ہے۔ وہ سب میں سمایا ہوا ہے اور وہ ان اشیاء پر بھی مشتمل ہے جن میں وہ سرایت کئے ہوئے ہے وہ ناقابل تقسیم اور غیر محدود ہے۔ وہ غیر مشروط اور وسیع ہے وہ گویائی اور دیگر حواسوں کے ذریعہ ناقابل رسائی ہے غیر جانبدار، بے عیب، بے داغ، ناقابل تسخیر، بے صورت، جہالت سے بری، ابدی اور مایا سے پاک ہے۔ وہ انبساط کا انہار ہے، وہ پراگرتی (قدیم مادے) کی دسترس سے باہر ہے، ہر دل کا مالک اور اُس میں بسنے والا ہے خواہشات سے آزاد، علایق سے پاک، اور غیر فانی ہے۔“

اس اقتباس میں لفظ رام، خدا کے نام کے طور پر استعمال ہوا ہے اور رام کی ناماंतर صفات اوصاف خداوندی ہیں۔ ہما بھارت — ہندوستان کی دوسری مشہور رزمیہ نظم ہے جس کا پڑھنا اور سننا راتوں کی طرح ضروری ہے۔ یہ راتوں سے عجم میں کہیں لپاؤ ہے اس میں ایک لاکھ سے کچھ زیادہ اشلوک ہیں جو ۱۸ حصوں میں تقسیم ہیں۔ دراصل اس سے طویل رزمیہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں پایا جاتا۔ اگرچہ اس کا مصنف دیاس رشی کو بتایا جاتا ہے لیکن اس کی طوالت خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کسی فرد واحد کی نہیں بلکہ مختلف اشخاص کی تصنیف ہے اس کے زمانہ تصنیف میں اختلاف ہے لیکن اتنا یقینی ہے کہ وہ گوتم بدھ سے بہت پہلے کی چیز ہے کیونکہ اس میں مہا نادر اور بدھ مذہب کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

اس میں راجہ دھرت راتھ کے سو بیٹوں (جو کوئی کہلاتے تھے) اور پانڈو کے پانچ بیٹوں بودھیشٹر، بھیم، ارجن، بھل اور سہدیو (جو پانڈو کہلاتے تھے) کی باہمی جنگ کا ذکر ہے۔ کورو کی حکومت موجودہ دہلی کے قریب وجار کے علاقہ میں تھی جو ہستنا پور کہلاتا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس جنگ عظیم میں ہندوستان کے تمام راجہ شریک ہوئے تھے اور اس نے ہندو قدیم کے تمدن کو غارت کر دیا لیکن دراصل یہ بھارت اور پنجال قوموں کے درمیان ایک مقامی جنگ تھی جس کا زمانہ ۱۵۰۰ اور ۱۰۰۰ ق۔ م کے درمیان مانا جاتا ہے۔

کوروں اور پانڈو کی جنگ کے ساتھ اس رزمیہ میں اور بھی سیکڑوں کہانیاں اور قصے بیان کئے گئے ہیں جس کی وجہ سے یہ نظم بہت طویل ہو گئی ہے۔

بھاگو دگیتا — ہما بھارت کی چھٹی کتاب میں وہ مشہور اور فلسفیانہ نظم شامل ہے جسے شری مدھاگو دگیتا (نغمہ مقدس) یا محض گیتا کہتے ہیں دراصل یہ ایک وعظ ہے جسے شری کرشن نے میدان جنگ میں ارجن کو دیا تھا۔ ارجن ایک انسان مکمل ہے جو باوجود جبری ہونے کے اپنے پہلو میں ایک نرم دل رکھتا ہے۔ اپنے ہی عزیز واقارب کا خون بہا کر تخت و تاج حاصل کرنا اُسے اچھا نہیں معلوم ہوتا لیکن شری کرشن جو اس جنگ (ہما بھارت) میں ارجن کے ساتھ بان کی حیثیت سے شریک ہیں اُسے اپنے فرض کا احساس دلاتے ہیں :-

”ادا کرو جو اس دم ترا فرض ہے ترے ذمہ اسے چھتری فرض ہے

پئے حق بدل ہو تو اس کے سوا سپاہی کو درکار ہے اور کب“

بتدریج ان کے اپدیش میں گہراؤ پیدا ہوتا ہے، حتیٰ کہ گہرا رہیں باب میں دگیتا میں کل ۱۸ باب اور ۷۰۰ اشلوک ہیں) وہ ارجن کو اپنا ”دشوروپ“ دکھاتے ہیں ارجن ان کے جسم میں ساری کائنات (برہما نڈ) کو گردش کناں دیکھتا ہے اور اُسے کل دیوتا انھیں کے اندر نظر آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جامعہ بشری میں خدا ہیں اور انھوں نے کوروں کے مظالم کا سدباب کرنے کے لئے مادہ قوم میں اوتار لیا ہے

”گنا، خدا کے بارے میں کہتی ہے کہ اس کا نہ کوئی شروع ہے نہ آخر، وہ سب میں بسا ہوا ہے اور سب سے الگ ہے، وہ سب کے دلوں میں ہے۔ پر وہ خیال کی پہونچ سے بھی پرے ہے، نہ آدمی کا دماغ اس کا تصور کر سکتا ہے اور نہ اُس کی زبان اُسے بیان کر سکتی ہے۔  
پیدائشِ عالم کے بارے میں گیتا نے ایک خاص نظریہ پیش کیا ہے دُنیا بار بار پیدا ہوتی ہے اور بار بار مٹتی ہے۔ اس دُنیا سے پہلے نہ معلوم کتنی دُنیاں پیدا ہو چکی ہیں اور نہ معلوم کتنی اور پیدا ہوں گی۔  
خلقِ عالم کو سرشتی اور اُس کے تحلیل یا خاتمے کو پرتیہ (قیامت) کہتے ہیں۔ اُس عرصہ کو جب تک ایک عالم موجود رہتا ہے کَلپ یا برہم دِن (خدا کا دن) کہتے ہیں اور وہ زمانہ جب تک عالم معدوم رہتا ہے برہم راتری (خدا کی رات) کہلاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک ہزاروں کَلپ کے برابر ہوتا ہے ارشاد ہوتا ہے :-

”غیر ظاہر سے تمام مظاہر دِن کی آمد پر پیدا ہوتے ہیں اور اُس کی رات کے آنے پر اُسی محض ہستی میں جذب ہو جاتے ہیں“

(آشواں ادھیائے شلوک ۱۶-۱۹)

اسی خیال کو دوسری جگہ یوں ادا کیا ہے :-

”ہر ایک کَلپ کے خاتمے پر سب چیزیں مہری طرف پلٹتی ہیں اور (دوسرے) کَلپ کے آنے پر میں اُنھیں پھر نکالتا ہوں۔“

(نواں ادھیائے شلوک ۷)

قدمِ اُپشَدول میں یہ خیال نہیں پایا جاتا لیکن بعد کے سانکھیہ فلسفہ میں ان کا پوری طور پر نشو و نما ہوا اس لئے بعض عالموں کے نزدیک گیتا میں کائنات کی تخلیق و تحلیل نیز کائناتی زمانوں کا خیال سانکھیہ فلسفہ ہی سے ماخوذ ہے اور عموماً مادے سے متعلق بھاگوت گیتا کے کام نظر لئے سانکھیہ فلسفہ سے متفق ہیں۔

گیتا روح اور مادے کی ابدیت کو تسلیم کرتی ہے لیکن مادہ آزاد نہیں ہے بلکہ روح کا تابع ہے (پہلے) خدا مادے میں تَم رکھتا ہے جس سے تکوین شروع ہوتی ہے، اس لئے وہ تمام مخلوقات کا باپ ہے جبکہ مادے کا مقابلہ ماں کے رحم سے کیا جاسکتا ہے (پہلے) ادہ تغیر پذیر ہے لیکن روح غیر تغیر ہے۔ گیتا کی تعلیم کے مطابق روح کو نہ ایذا پہونچائی جاسکتی ہے نہ اُسے برباد کیا جاسکتا ہے اور نہ اُسے تکلیف اور موت کا احساس ہوتا ہے، کیونکہ یہ چیزیں محض فانی جسم کو متاثر کرتی ہیں۔  
فلسفہ جبر و اختیار میں گیتا کا رجحان جبر کی طرف ہے۔ کرشن جی فرماتے ہیں :-

”اے ارجن! مالک سب کے دلوں میں رہتا ہے اور اُنھیں اپنے پائے کے چکر پر چھاتا ہے۔“ (ادھیائے ۱۸ شلوک ۶۱)

گیتا پر زور الفاظ میں انسان کو ایک خدا کی پر خلوص پرستش (بھگتی) کی ہدایت کرتی ہے اور انسانوں کے سامنے ایک خاص طریقہ عمل پیش کرتی ہے یعنی نتیجہ کے خیال کو ترک کر کے اپنے فرض کو انجام دینا (نشتام کرم) انسان کا نصب العین ہونا چاہئے۔  
آخر میں ہم خود شری کرشن کے بارے میں تحقیقاتِ جدیدہ کا خلاصہ پیش کریں گے جنھوں نے دُنیا کو گیتا ایسی ہندو پائے تصنیف عطا کی۔  
تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ کرشن جی ایک غیر برہمن جو بانی اور جنگجو قوم کے سردار تھے۔ اُن کے باپ کا نام وسودیو تھا اُن کا زمانہ گوم پڑ اور جہا تیر سے کچھ پہلے تھا۔ اُنھوں نے ایک خاص مذہب کی بنیاد ڈالی جس میں توحید پر بڑا زور دیا گیا، اُن کا خدا شخصی تھا جسے وہ بھگوان (قابلِ پرستش) کہتے تھے۔ اس خدا کا تحلیل اخلاقی حیثیت سے مثل ورن کے بہت بلند تھا۔ یہ نیا مذہب اور اُس کے ماننے والے بھاگوت کہلاتے تھے۔ بھاگوت گیتا اسی مذہب کی مقدس کتاب تھی جس میں بعد ازاں ویدانت کا فلسفہ (جس کا خدا غیر شخصی ہے) اور سانکھیہ یوگ کے عناصر بھی شامل کر لئے گئے یہی وجہ ہے کہ موجودہ گیتا کی تعلیمات توحید اور وحدت (عقیدہ ہمہ اوست) کا ایک حیرت انگیز مرکب نظر آتی ہیں۔

جب میگستھینز، ہندوستان آیا تو بھاگوت مذہب کا خاصہ دور دورہ تھا۔ بعد میں یہ مذہب دشمن ہستی میں جذب ہو گیا اور اُس کے

برہمنی کرشن جی کو دشمنو نارائن کا اوتار مان لیا گیا اور خود گیتا، مہا بھارت میں شامل کر لی گئی اس طور پر اُس کی اہمیت دن بدن بڑھتی گئی۔ کرشن جی کے بارے میں جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں اُن میں سے بعض اندر سے متعلق ہیں جن کا رگ وید میں ذکر ہے مثلاً اندر کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ دوترا نامی سانپ کو مارتا ہے۔ کرشن جی کا کاتیا نامی سانپ کے مارنے کا بھاگوت پیران میں تذکرہ ہے۔ اسی طرح رگ وید میں برہمنی کا ذکر نامی سانپ کو مار کر اُن کا یوں کو آزاد کرنے کا تذکرہ ہے جو پہاڑ میں چھپی تھیں اور کرشن جی کا گوہر دھن پہاڑ کے نیچے گاؤں حفاظت کرنے کا ذکر ہے، اسی روایت نے انھیں گوند اور گوبال کے ایسے خطاب دلوائے۔

بعض عالموں کے نزدیک جس کرشن کو گیتا کا مصنف بتایا جاتا ہے وہ ایک فلسفی اور پتیر ہے اور اُس کرشن سے مختلف ہے جس کے لئے عوام میں مشہور ہیں۔ یہ کرشن گوانوں (جنھیں گوبیاں کہتے ہیں) کی محبت کا مرکز ہے اور اُن میں سے ایک یعنی را دھاسے اُس کا اصل عشق ہے۔

**فلسفہ (شٹ درشن)** ۲۰۰ ق۔ م اور سن ۲۰۰ء کے درمیان ہندو فلسفے نے بہت ترقی کی اور رفتہ رفتہ اُس کی چھ شاخیں ہو گئیں۔ انھیں باہمی تعلق کے لحاظ سے دو دو کے تین مجموعوں میں تقسیم کیا جاتا ہے یعنی نیلے اور شیشنگ، سانگھیہ اور یوگ، پورو میمانسا اور ویدانت۔ ان سب کا منشا انسانوں کو نجات اخروی حاصل کرنے میں مدد دینا ہے لیکن ان کے بانیوں نے کوئی مذہبی جماعت نہیں قائم کی۔

**نیلے درشن**۔ اس کا موضوع علم کلام اور منطق ہے۔ یہ صحیح طریقہ استدلال سکھاتا ہے تاکہ انسان اپنے اعمال کا احتساب کر کے بڑے کاموں سے محفوظ ہو کر نجات حاصل کر سکے۔

**شیشنگ درشن**۔ دینیات سے زیادہ اس کا موضوع طبیعیات ہے۔ اس میں روح اور مادے کی تفریق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ مادہ پرفانی، غیر مرئی اور بے صورت ذرات پر مشتمل ہے۔ انھیں کی ترکیب سے کائنات کی تخلیق ہوتی ہے اور برہم دن کے خاتمہ پر وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں اور دُنیا ختم ہو جاتی ہے۔ یہ فلسفہ جینیوں کے فلسفہ سے مشابہ ہے۔

**سانگھیہ درشن**۔ یہ سب سے پرانا ہے، تقریباً ۸۰۰ اور ۵۰۰ ق۔ م کے درمیان وجود میں آیا۔ اس میں خدا کی ہستی سے انکار کیا گیا ہے۔ کائنات کی تخلیق روح (پریش) اور مادے (پراکرتی یا پردھان) کے باہمی عمل سے ظاہر کی گئی ہے۔ اس کے مطابق ہماری معیہوں کا باعث صرف یہ ہے کہ ہم روح اور مادے میں تمیز نہیں کرتے لیکن ان میں فرق کرنے سے ہمیں غم و محن سے نجات مل سکتی ہے۔ اس فلسفہ کا سب سے بڑا مفسر گوبل تھا۔

**یوگ درشن**۔ اگرچہ یوگ کی ابتدا وادی سندھ کے زمانہ میں ہو چکی تھی لیکن یہ فلسفہ پانچویں سے منسوب ہے۔ اس میں خدا کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے اور اس تک پہنچنے کا ذریعہ یوگ کو قرار دیا ہے جس کے لئے مختلف طرح کی ریاضتیں کر کے اپنے جسم اور نفس کو قابو میں لایا جاتا ہے جو یوگ کی مشق کہلاتا ہے وہ یوگ (جوگی) کہلاتا ہے۔ تپسیا یعنی ریاضت و نفس کشی اسی زمرہ میں شامل ہے۔

**پورو میمانسا درشن**۔ یہ فلسفہ جینیوں سے منسوب ہے۔ یہ انسان کو راہِ عمل (کریم مارگ) دکھاتا ہے۔ اس میں ویدوں کی مذہبی رسوم پر بحث کی گئی ہے اس کے مطابق آواز داہمی (قدیم) ہے اور چونکہ وید شہدوں (لفظوں) پر مشتمل ہیں اس لئے وہ بھی ازلی وابدی ہیں بعد میں یہ فلسفہ ویدانت میں ضم ہو گیا۔

**ویدانت درشن** یا اُتر میمانسا۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ویدانت کے معنی ہیں ”ویدوں کا آخری حصہ“ یا اُن کا بخوڑ۔ اس کی بنیاد واپشنندوں کے فلسفہ پر ہے اور یہ انسان کی راہِ علم (گہان مارگ) کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس کی سب سے اہم کتاب بدارائن کا برہم سوترا (یا ویدانت سوترا) ہے جو سنہ عیسوی کے آغاز میں لکھی گئی تھی یہ آپشنندوں اور گیتا کے مقابلہ میں نہایت ہی پیچیدہ ہے مختلف عالموں نے اس کی شرح بیان کی ہے جن میں شنگر اچاریہ (۱۲ویں صدی عیسوی) کی شرح بہت مشہور ہے۔

یہ فلسفہ ہندوستان کا مقبول ترین فلسفہ ہے، شری رام کرشن پریم ہنس (۱۸۳۳ء - ۱۸۸۶ء)۔ سوامی ودیکانند (۱۸۶۲ء - ۱۹۲۷ء) ان کے شاگرد اور مخلصی آروہیند گھوش مشہور ویڈیو بنی ہوئے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں سرسپس رادھا کرشنن اس فلسفہ کے زبردست ماہر ہیں۔ منو سمرتی۔۔ ہندو دھرم شاستری یعنی مذہبی قوانین کے مجموعوں میں سب سے مشہور منو سمرتی ہے جو پہلی یا دوسری صدی ق۔ م کی تصنیف ہے۔ اس میں ہمارے موضوع سے متعلق ایک خاص چیز ہے یعنی برہم دن اور برہم راتری کی تفصیل (۱ - ۶۹ - ۷۰)۔ ان میں ہر ایک ہمارے ..... ۲۴ سالوں کے برابر ہوتا ہے ہندوؤں نے یہ حساب اس طرح لگا یا ہے۔

انسانوں نے ایک سال کے برابر دیوتاؤں کا ایک دن ہوتا ہے۔ دیوتاؤں کے چار ہزار دنوں یعنی چار ہزار انسانی سالوں کے برابر ست یگ (یا کرتیا یگ) ہوتا ہے اور یگ کے پہلے چار سو برس کی سندھیا (صبح کا دھندلا) ہوتی ہے اور یگ کے اخیر میں اتنے ہی سال کا سندھیا کش (شام کا دھندلا) ہوتا ہے۔ اسی طرح کرتیا یگ تین ہزار سال۔ دو پریگ دو ہزار سال، اور کالی یگ (دھبگ) ایک ہزار سال کا ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے شروع اور اخیر میں بالترتیب تین سو، دو سو اور ایک سو سال کی سندھیا اور اتنے ہی سالوں کے سندھیا کش ہوتے ہیں۔ ان چار یگوں کے مجموعہ کو جو بارہ ہزار سال ہوتا ہے "چتر یگ" کہتے ہیں ۴۰ چتر یگوں کا ایک مہا یگ اور ایک ہزار مہا یگوں کا ایک برہم یگ یا کلپ ہوتا ہے اور اتنے ہی عرصہ کی ایک رات ہوتی ہے۔

غالباً اس حساب کا آغاز ویدوں کے بعد کے زمانہ میں ہوا۔ انھروید (۱ - ۲ - ۷۱) میں چار یگوں کا حوالہ ملتا ہے۔ مہا بھارت اور پراٹوں میں بھی اس کا ذکر ہے۔

**بہت پرستی کی ابتدا** چھٹی صدی ق۔ م میں جین اور بدھ مذہب وجود میں آئے۔ ان کا تفصیلی ذکر ہم آئندہ کریں گے یہاں پر صرف بہت پرستی کی ابتدا اور مذہب پر ان کے اثرات کا ذکر کرنا مقصود ہے۔

ان دونوں مذہب کے بانیوں نے خدا کے بارے میں سکوت اختیار کیا تھا۔ خدا کا کوئی واضح تخیل نہ پیش کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود انھیں کو خدا مان لیا گیا اور سب سے پہلے گوتم بدھ (بدھ مذہب کے بانی) اور مہا ہیر سوامی (جین مذہب کے بانی) کے قوی ہیکل بت بنائے گئے۔ غالباً فارسی زبان کا لفظ "بت" بدھ ہی کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

سب سے پہلے مہاتا گوتم بدھ کا بت کا نذر ہار کے فنکاروں نے پہلی صدی عیسوی میں طیار کیا۔ کشمیر کے زمانہ تک مجسمہ سازی کا فن متھرا تک پہنچ گیا اور ایک صدی میں ہنارس، آندھرا اور امداتی میں بدھ کے بت بننے لگے۔ بدھ مذہب والوں کی دیکھا دیکھی جین مذہب والے بھی اپنے اکابر کے بت بنانے لگے اور ہندو بھی اپنے معبودوں کو مورتی صورت میں دیکھنے کی تمنا کرنے لگے اور ان کی مورتیں بھی ہزاروں کی تعداد میں طیار کی جانے لگیں اور ہر طرف بت پرستی کا دور دورہ ہو گیا پھر انھیں بتوں کی حفاظت کے لئے مندر بنائے جانے لگے۔

دیوتاؤں کی شبیہیں بنانے کے لئے تمام مذہبی کتابیں دیکھی گئیں اور دیوتاؤں کی سماعت کو سامنے رکھ کر شبیہ سازی کی گئی مثلاً گیتا میں خدا کو "وشتو تگم" یعنی سب طرف منہ والا کہا گیا ہے اسی کے پیش نظر برہما کا بت یوں بنایا گیا کہ انسان کے جسم پر چھائے ایک کے چار سر لگا دئے جو چاروں طرف دیکھ رہے ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ واقعی کسی ایسی چار سر والی ہستی کا وجود ہے بلکہ یہ محض نشان ہے خدا کے عالم کل ہونے کا، اسی طرح بعض بتوں کے وجہ بنائے گئے جس سے مقصود معبود کی قوت عمل کی زیادتی کا اظہار تھا۔ اسی طرح دیگر دیوتاؤں کی شبیہیں بنانے کے لئے کافی قیاس آرائی اور شاعری سے کام لیا گیا۔ مثال کے طور پر راون کو لیچے جس کے دس انسان کے سر بنائے جاتے ہیں اور ان پر ایک گدھے کا سر بھی لگا دیا جاتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ واقعی وہ ایسا ہی تھا بلکہ اس سے مراد ہے کہ وہ چار ویدوں اور چھ شاستر فلسفہ کا عالم تھا لیکن باوجود اس علمیت کے وہ بے وقوف بھی تھا۔ ورنہ وہ رام سے نہروا کا

لے اگرچہ کائناتی زمانوں کا سا کھید درشن میں بھی ذکر ہے لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ اس میں بھی ان کی وہی تفصیل پائی جاتی ہے جو منو سمرتی میں درج ہے۔

اپنی جان و مال سے ہمت نہ دھوتا۔

ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اگر بت پرستی نہ ہوتی تو ہندوستان میں سنگتہ اشئی و نقاشی اس قدر ترقی نہ کر سکتے۔ یورپ کو اپنے ہم عصر (Venus of Mil) کے مجسمہ پر ناز ہے لیکن ہندوستان کے قدیم مندروں میں نہ معلوم ایسے کتنے بلکہ اس سے بھی کہیں بورت مجسمے اور شبیہیں موجود ہیں۔

ہندوؤں نے تجسیم بشری کے اصول کو کس قدر برہمن سے یوں سمجھے کہ علم موسیقی میں ہر راگ کی شکل و صورت اور سن و سال مقرر کئے گئے تو بالکل ہی انسانی خواہشات اور ضروریات کا بندہ مان لیا گیا۔ پجاری بتوں کو غسل کراتا ہے، کپڑے پہنتا، زیورات اور پھولیں لگا کر کرتا، کھانا کھلاتا اور رات کو شال میں لپیٹ کر بستر میں سلاتا ہے۔

سا۔ اگر ایک طرف ہندوؤں نے بدھ اور جین مذہب سے متاثر ہو کر بت پرستی سیکھی تو دوسری طرف اہنسا کا اعلیٰ اصول سیکھا۔ اہنسا غلطی معنی میں کسی کو نہ مارنا، ان مذاہب سے پہلے کثرت سے قربانیاں ہوا کرتی تھیں لیکن ان کے ظہور میں آنے کے بعد سے قربانیوں اور دن بدن گھٹنا لگتا گیا یہاں تک کہ لوگ گوشت خوردگی سے بھی پرہیز کرنے لگے اور لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ بلا ضرورت کسی بھی کو نہ مارنا چاہیے۔ فلسفہ ویدانت سے بھی اس کو نفوریت ہوئی۔ چونکہ ہر شے میں خدا کا ظہور ہے اس لئے وہ قابل تقسیم ہے ایک شہور ہے کہ خدا میں جب کسی مقدس ہندو کو ایک انگریز نے سنگین مار مار کر ہلاک کر دیا تو اُس نے مرتے مرتے کہا ”اور تو بھی وہ ہے“ (تو اسی) یعنی خدا ہے اس نظریے کے مطابق مجرم اور زاہد اُسی صداقت عظیم کے مظہر ہیں لہذا دونوں ہی نہیں ہیں۔

ہندوؤں کا عمل ”جیو اور جینے دو“ کے اصول پر ہے۔ ہندو مذہب کے اکابر نے اس چیز کو تسلیم کیا ہے کہ مختلف مذاہب خدا تک پہنچنے کے لئے راستے ہیں بلکہ بعض نے تو اس کا تجربہ بھی کیا ہے۔ سوامی رام کرشن پرم ہنس پہلے کالی کے بھکت تھے، پھر انھوں نے اسلام قبول کر لیا بعد میں وہ عیسائی ہو گئے اور پھر اپنے پُرانے مذہب پر آگئے انھوں نے ہر مذہب کی تہنیک پہنچ کر یہ معلوم کیا کہ ہر مذہب میں ایک ہی جلوہ نظر آتا ہے اس لئے ہر مذہب اپنی جگہ پر ٹھیک ہے۔ اسی چیز نے انھیں اور ان کے شاگردوں کو خدمت خلق اللہ پر آمادہ کیا جس کا نام کرشن مشن کی صورت میں ہمارے سامنے ہے جس کی شاخیں دنیا کے ہر حصہ میں بلامتیاز مذہب و ملت نوع انسانی کی خدمت عروج ہیں۔

**ہندو مذہب** سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۸۰۰ء تک کا زمانہ تاریخ ہند میں پُرانوں کا دور کہلاتا ہے کیونکہ اس زمانہ میں ۱۸ پران تصنیف ہوئے یہی وہ زمانہ تھا جب جدید ہندو مذہب کی بنیاد پڑی۔ بدھ اور جین مذہب والوں کو نیپا دکھانے کے لئے ان نے اپنے مذہب اور سنسکرت زبان کی پر زور تبلیغ کی اور بت پرستی کو رواج دیا۔ اس دور میں آپشندوں کی تعلیمات اور ویدوں کی تفسیریں پشت جا پڑیں۔ جو معبود ویدی دور میں ثانوی اہمیت کے حامل تھے وہ اول درجہ کے معبود بن گئے اور صعب اول کے معبود بھیجے گئے مثلاً وشنو کی شان میں رگوید میں صرف پانچ بھیجے ہیں اور وہ محض سورج دیوتا ہے لیکن اب وہ خدائے تعالیٰ بن گیا۔ اس طرح ویدو جو محض طوفان کا دیوتا تھا اب ہندوؤں کا دوسرا بڑا معبود بن گیا۔ سرسوتی جو پہلے محض اسی نام کے دریا کی دیوی تھی اب علوم و فنون کی سرچشمہ بن گئی اور آندرجو رگوید کے زمانہ میں سب سے بڑا معبود تھا محض دیوتاؤں کا راجہ ہو کر رہ گیا، اس طرح آپشندوں کے برہمن (بے محض خدا) برہما (مذکر دیوتا) نے لے لی وہ اپنے پیشرو کی صورت ہے۔ ہندوؤں کے خاص خاص معبود کون ہیں نیچے ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

**یدہ تثلیث** (تریمورتی)۔ برہما، وشنو اور شیو (یا ہمیش) ہندوؤں کے سب سے بڑے معبود ہیں۔ انھیں وہ ایک ہی خدا کی صورتیں ماننے ہیں۔ بحیثیت خالق کے وہ برہما ہے، بحیثیت پروردگار (پالنے والے) کے وہ وشنو ہے اور بحیثیت تہا رہ یعنی دنیا کے

مثانے والے وہ تھوہے۔ یہ تینوں الگ الگ دیوتا نہیں ہیں بلکہ ایک ہیں اس لئے کبھی کبھی ان کا مجسمہ یوں بنایا جاتا ہے کہ ایک ہی انسان کے جسم پر تین سر لگائے جاتے ہیں ایسے بت کو ”تریمیوتی“ کہتے ہیں۔ یہ ایسے دیوتا برہما کو چھوڑ کر الگ الگ پوجے جاتے ہیں اور ان کے علیحدہ علیحدہ بت بھی بنائے جاتے ہیں۔

برہما - ہندو تثلیث کا پہلا اقنوم ہے، خالق دیوتا ہے لیکن وہ کائنات کو ہمیشہ موجود رہنے والے مادے سے پیدا کرتا ہے نہ کہ لائے سے۔ اس کے چار سر اور چار ہاتھ دکھائے جاتے ہیں جن میں سے ایک میں چیم، دوسرے میں لوطا (قربانی کا سامان) تیسرے میں تسبیح اور چوتھے میں دیر ہوتا ہے اس کی سواری (واہن) سنس ہے یہ میرو برہت پر مہ اپنی بیوی سرتوتی کے رہتا ہے جو فنون لطیفہ کی دیوی ہے اور مور پر سوار ہوتی ہے برہما کو دیوتاؤں کی حکومت کا صدر سمجھنا چاہئے اگرچہ یہ سب سے بڑا معبود ہے لیکن اس کا کوئی مندر نہیں پایا جاتا۔ عوام کے مذہب میں بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے اس لئے کہ بحیثیت خالق کے وہ اپنا فرض پورا کر چکا ہے اور اب وشنو کی عکسراہی ہے۔

وشنو - ہندوستان میں وشنو کے ماننے والوں کا بڑا زور ہے۔ وشنو کے ماننے والے وشنو کہلاتے ہیں۔ وشنو ایک ویدی معبود ہے۔ منتروں میں اسے معبودِ شمس ظاہر کیا گیا ہے اس طرح اس کا تعلق نور و حیات سے رہتا ہے۔ منتروں میں اس کے تین ڈگ (تری وکرا) بھرنے کا ذکر جس سے غالباً سورج کا طلوع، عروج اور غروب مراد ہے۔ اسی نے غالباً برانوں کے دامن اوتار کے قصہ کو جنم دیا۔ اسی آفتاب پرستی نے بعد ازاں خدا پرستی (وشنو بمعنی ”محیط کل“ خدا) کی صورت اختیار کر لی بعض عالموں کا یہ خیال ہے کہ وشنو سے ملتا جلتا تخیل ایک دوسرے معبود ناریں کا تھا اس لئے یہ دونوں ایک مان لئے گئے۔

وشنو کے چار ہاتھ دکھائے جاتے ہیں جن میں سے ایک میں سنگ، دوسرے میں گدا (گرنہ) تیسرے میں چکر (چرخ) اور چوتھے میں پرتم (کنول) ہوتا ہے، وشنو کی سواری گرنٹھ ہے جو انسان اور پرند کی مرکب صورت ہے، ان کی بیوی لکشمنی حسن اور دولت کی دیوی ہیں جو سمندرِ تنقہ کے وقت برآمد ہوئی تھیں۔ پیدائش عالم کی تصویر یوں بنائی جاتی ہے کہ وشنو ایک بہت سے سروں والے سانپ سمنی اننت پر لیٹے ہیں اور ناف سے ایک کنول اُگا ہے جس پر برہما جی بیٹھے ہوئے ہیں۔

وشنو ایک نہایت ہی رحیم و کریم دیوتا ہیں۔ دنیا کو تباہی سے بچانے کے لئے انھوں نے نو اوتار لئے اوتار کے معنی ”نزول یا اترنے“ کے ہیں۔ جب دنیا کی حالت خراب ہو جاتی ہے تو خدا اُس کی درستی کے لئے حیوان یا انسان کی صورت میں زمین پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس نظریے کی بنا پر بعض دیگر مذاہب ہندو مذہب میں جذب ہو گئے مثلاً بدھ مذہب اور بھاگوت مذہب۔ وشنو کے اوتاروں میں رام اور کرشن کے اوتار سب سے اہم مانے جاتے ہیں۔ کل اوتار ترتیب وار یہ تھے :-

(۱) متسیہ اوتار مچھلی کی صورت میں - (۲) کورم اوتار کچھوے کی صورت میں - (۳) ورم اوتار سور کی صورت میں - (۴) نرسنگھ اوتار انسان اور شیر کی مرکب صورت میں (۵) دامن اوتار بونے کی صورت میں (۶) پرش رام کی صورت میں - (۷) رام چندر کی صورت میں - (۸) کرشن کی صورت میں - (۹) بدھ کی صورت میں - ابھی دسواں یعنی کال کی اوتار باقی ہے جو ۴۵۰۰ سال میں ظاہر ہوگا۔ نیچے چوتھے اوتار کی کہانی مختصر بیان کی جاتی ہے :-

ہریشہ کشیپ نام کا ایک خود سر راجہ تھا جو کافر مطلق بلکہ خدا کی گادعوے دار تھا لیکن اُس کا لڑکا پرہلا دہندہ انتہائی دہندہ تھا اُس کا خدا میں پورا اعتقاد تھا لہذا اُس کے باپ نے اُس کے طور طریق سے ناراض ہو کر اُس کو مروا ڈالنا چاہا اسے پیار کی چوٹی سے پھینکا گیا لیکن غیر مرنی خدا نے پہونچ کر اسے روک لیا۔ سے زہر دیا گیا لیکن اُسے بھی خدا نے بے نیام اُس کو جلانے کے لئے اُس کی پھوپھی ہنکا جس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ اُسے آگ نہیں جلا سکتی آگ میں سکر بیٹھی مگر پرہلا دہنچ گیا اور ہنکا جل کر خاک ہو گئی (اسی خوشی میں ہولی کا تہوار منایا جاتا ہے)۔ اس طرح ہریشہ کشیپ

لے پرہلا کے قصہ کی حضرت ابراہیم اور آتش نرود کے قصہ سے مشابہت حیرت انگیز ہے۔

جب اپنے ارادوں میں پہلے در پہلے ناکام ہوا تو بالآخر اُس نے پرہیز کو بلوا بھیجا اور پوچھا کہ وہ کیوں اُس کی برتری کو تسلیم نہیں کرتا اور کس کے کہنے سے یہ شعار اختیار کیا ہے۔ لڑکے نے جواب دیا۔ ”کائنات کے حکمران نے تمام اقوام کے مالک نے جو آپ سے عظمت میں کہیں بڑا اور طاقتور ہے، میرے دل و جان کو اپنے قابو میں کر رکھا ہے اور اُسی نے مجھے یہ طریقہ سکھایا ہے۔“ یہ جواب سن کر وہ طیش میں آگیا اور فوراً میاں سے تلوار کھینچ کر بولا: ”تو یہ کہنے کی کیسے جرأت کرتا ہے کہ تیرا مالک مجھ سے زیادہ صاحبِ قوت اور طاقتور ہے؟ تیرا آقا کہاں ہے؟ اُسے مجھے دکھا لڑکے نے جواب دیا۔ ”وہ ہر جگہ موجود ہے!“ راجہ نے سوال کیا کہ ”کیا وہ اس تاج میں ہے؟“ جواب ملا ”ہاں“ یہ سن کر اُس نے تاج پر تلوار کا وار کیا اور وہ دو ٹکڑے ہو گیا پھر پوچھا کہ ”کیا وہ اس کھچے میں ہے؟“ پرہیز نے دل میں خدا کو یاد کرتے ہوئے کہا ”ہاں وہ اس کھچے میں بھی ہے“ راجہ نے یہ کہتے ہوئے کہ ”اب اپنے خداوند سے کہہ کر وہ تجھے قتل ہونے سے بچائے“ زور سے کھچے پر تلوار کا ایک ہاتھ مارا، فوراً شاندار کھمبا پھٹ گیا اور دشمنو بھگوان نے نرسنگھ کی صورت میں نمودار ہو کر اُس باپي راجہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے اور اس طرح اپنے ایک بچے عابد کو شہید ہونے سے بچا لیا۔

شیو - شیو کے ماننے والے شیو اور یہ مذہب شیو رورمت کہلاتا ہے شیو جی کا پیشرو گوہر کا زور (لفظی معنی ”رونے یا چلانے والا“) شیو قدرت کی تحریری قوتوں کا دیوتا تھا جس کے مظہر اتم بجلی اور طوفان تھے اگرچہ رگوید میں چند ہی سچن زور کی تعریف میں ہیں تاہم شیو جی کی بعض خصوصیات کا اُن میں ذکر ہے مثلاً اُن کا پہاڑ پر رہنا، لمبی لمبی جٹائیں اور کھال کا بانوہنا وغیرہ۔ بعد ازاں انھیں مہایوگی اور یوگیوں کا مرنی مان لیا گیا۔ انھیں شیو (”مبارک“ ”ایک فال“) اور مہادو (”معبود اعظم“) کے خطاب دئے گئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وادی سندھ کے زمانہ میں بھی شیو جی کی پوجا ہوتی تھی جس میں بعد ازاں زور کے تخیل کی آمیزش ہو گئی۔

ہندو عقیدے کے مطابق شیو جی تنہا کن دہتا ہیں اُن کی پیشانی پر ایک تیسری آنکھ (تری لوجن) ہے جب وہ اُسے کھول دیتے ہیں تو آگ اس طرح ٹھکانا شروع ہو جاتی ہے گویا ایک آتش فشاں پھٹ پڑا ہو اور ہر چیز جل کر خاک ہو جاتی ہے۔ کام دیو (عشق و محبت کا دیوتا) اُن کی نگاہ غضب کا شکار ہو کر اپنے جسم سے محروم ہو گیا۔ اس لئے وہ ان آنکھ (دلاجسم) کہلاتا ہے اور رخص اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب مرد اور عورت کیجا ہوتے ہیں۔ بیشتر شیو جی مراقبہ (دھیان) کی حالت میں رہتے ہیں اور گنگا آسمان سے اتر کر پہلے اُن کے سر پر گرتی ہے اور پھر جب اُس کا زور اُن کی پریچ جٹاؤں میں کم ہو جاتا ہے۔ تب زمین پر آتی ہے۔ اُن کی سواری مندی نام کا بیل ہے اور اُن کی بیوی پاربتی ہمالیہ کی دختر ہیں۔ اُن کا مقام کیلاش پر ہے۔

شیو جی کا تعلق رقص و غنا سے بھی رہتا ہے انھیں بعض مجسموں میں ایک نہایت ہی دلکش انداز میں نقش کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ یہ اُن کا نٹ راج روپ ہے اور اس سے نظام کائنات کی باقاعدہ حرکت (Cosmic Rhythm) کی طرف اشارہ ہے۔ شیو اور پاربتی کی پوجا کا ایک اور پہلو بھی ہے یعنی لنگ (مردانہ عضو) اور یونی (زنانہ عضو) کی علامات کی صورت میں پرستش جو ایک نہایت ہی قدیم چیز ہے۔ ان سے دنیا کی تخلیق اور تولیدی قوتوں کی طرف اشارہ ہے۔

شیو کے ایک بیٹے جگجو کا ریتھ کے ہیں جو دیوتاؤں کی فوج کے سردار ہیں اور دوسرے بیٹے گنیش ہیں جن کا سر ہاتھی کا اور جسم انسان کا بنایا جاتا۔ ان کی سواری ایک چرہا ہے۔ گنیش اور لکشمی ہندوؤں کے نہایت ہی مقبول معبود ہیں جن کے بتوں کی جوڑی ہزاروں کی دوکان اور مکان پر نظر آتی ہے۔

شیو کی بیوی پاربتی کی متعدد صورتیں ہیں جن میں سے خاص یہ ہیں:-

(۱) پاربتی اور آما کی حیثیت سے وہ ایک حسین عورت اور رحمدل ماں ہیں جیسے ماں اپنے بچے کو بلانے کے لئے اپنے ہاتھ پھیلاتی ہے ویسے ہی وہ ہر مخلوق کی طرف اپنا دستِ احانت بڑھاتی ہیں۔

(۲) درگا کی حیثیت سے وہ انتہائی غضبناک ہے، جسے خوش کرنے کے لئے بنگالی اپنا سب سے بڑا تہوار یعنی درگا پوجا مناتے ہیں۔

(۳) کالی کی حیثیت سے وہ وباؤں، زلزلوں، طوفانوں اور سیلابوں کی دیوی ہے اس صورت میں اُسے ہاتھ میں ایک گناہا سروسنگے میں کھڑکیوں کی پلاٹینے ہوئے کھایا جاتا ہے۔  
 نسکتی پوجا۔ ایشیاد و شینہیت کے ماننے والوں کے بعد سب سے زیادہ نسکتی کے بھکت ہیں جو خدا کو بحیثیت ماں کے مانتے ہیں اس فرستہ کا بنگال میں سب سے زیادہ روبر ہے۔ ہندوؤں کے بعض مشہور و معروف علماء اور درویش شکر آچاریہ، رام کرشن پرم ہنس، سماجی و دیگر گاندھیرو "مادر باپنی" کے ماننے والے تھے۔

عوام کے مذہب میں نسکتی کو شیو کی بیوی مانا جاتا ہے جس کے بہت سے نام ہیں، آنا، پاربتی، دُرگا اور کالی وغیرہ جن کا اوپر ذکر چھاپے مگر کالی کی خون آلود ٹیپیں کسی بھی شخص کو پسند نہیں آسکتیں، لیکن کالی کے ایک بھکت کا کہنا ہے کہ نفرت کی پر جلال اور حبیب قوتوں کو مثل اُس کی خوشگوار صورتوں کے خدا کا ایک جزو کیوں نہ سمجھا جائے؟  
 نسکتی کے ماننے والے فلاسفر روح کو مذکر اور مادے کو مونث مانتے ہیں جنہیں پُرش اور پراکرتی کہتے ہیں۔ انہیں کے ہٹے سے سانس عالم کی

تخلیق ہوئی ہے۔ ہندوؤں کا مشہور بت "اردھاناری ایشوری" بھی اسی چیز کی طن اشارہ کرتا ہے۔ "یہ بت گواہ رہا کا ہے۔۔۔ جب وہ نگوین عالم کے کام میں مصروف تھا۔ اس کا داہنا حصہ مردانہ اور بایاں زنانہ دکھایا جاتا ہے اور اعضاء جنسی کو درتہ دار صلیب کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں جو زنانہ و مردانہ اعضاء کے اتصال باہمی کی نشانی ہے۔"

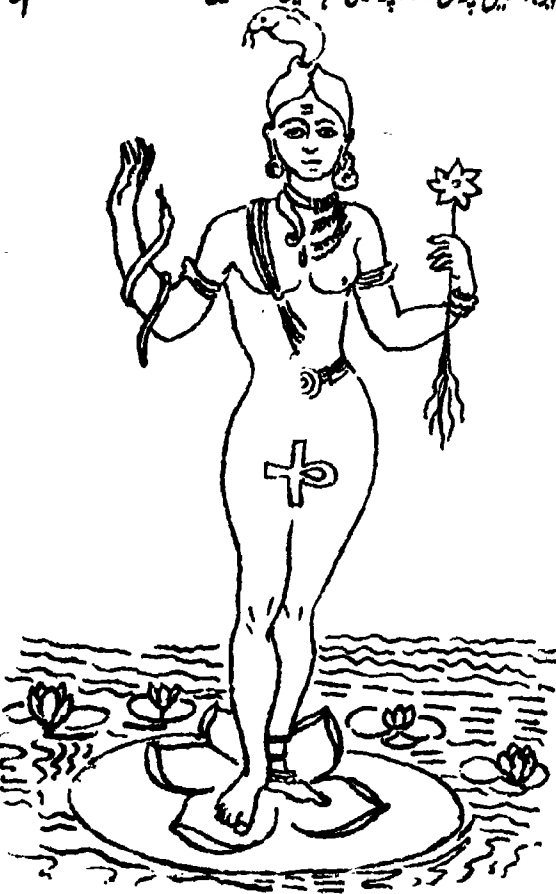
برہما، وشنو اور شیو کے بعد دوسری زمانہ کے دیوتا ہیں جنہیں ثانوی حیثیت حاصل ہے اور پھر ان سے بھی کمتر درجے کی فوق البشر ہستیاں ہیں جیسے (۱) اپسرائیں یا جنت کی رقا صائیں جو راہبوں کو سمجھاتی ہیں (۲) کتھر، سماجی موسیقار جن کا اوپری حصہ جسم انسان کا اور نیچے کا پرندہ ہوتا ہے۔ (۳) ناگا یعنی سانپ دیوتا۔ (۴) وگیش دیوتا جو درختوں کے محافظ ہیں (۵) کیشی (عورت) اور یکش (مرد) جو دولت کے دیوتا کبیر کے ماننے والے ہیں (۶) کرکیش یا دیو جن میں سب سے مشہور راون ہوا ہے جس کے دس رستے۔ مذکورہ بالا دیوی دیوتاؤں کے علاوہ ذاتی، خانگی اور گاؤں کے الگ الگ دیوتا ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوؤں کے کل دیوی دیوتاؤں کی کل تعداد ۳۳ کروڑ ہے۔

ہندو مذہب کے مصلحین ہندوستان میں ساتویں صدی سے

بارہویں صدی عیسوی تک کا زمانہ ہندو اصلاحی تحریکوں کا زمانہ کہلاتا ہے، اس زمانہ میں کامل بھت،

سے نیاز چوری، تریبیات جنسی (مطبوعہ ۱۹۷۷ء) ص ۱۹۷۔ ساتھ کی تصویر کی کوئی اس وقت ظاہر ہوئی جب آپ اس کے نصف حصہ کو عمودی طور پر چھپا کر دیکھیں

مردانہ عضو اور زنانہ عضو کے اتصال سے جو صورت بنتی ہے اس سے پہلے صریح یعنی "نشان حیات" تھے تھے چونکہ زندگی کا ظہور ان کے ہٹے سے ہوتا ہے لہذا علامت بالکل موزوں تھی۔ یہاں پراس جیر کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آیا یہ نشان صرف ہندوستان کا اس کے برعکس صورت ہے۔



شکرآچاریہ، رانج، نمبارک، مادھوآچاریہ اور رامانند ایسے بڑے بڑے مصلحین پیدا ہوئے جنہوں نے بدھ اور جین مذہب کے عالموں سے بحث کر کے ان مذاہب کا استیصال کیا اور ویدک مذہب، نیز وشنو پرستی کو رواج دیا۔ ہندو فلسفہ میں بھی انہوں نے معتد بہ اضافہ کیا۔ اس دور کے تین فلسفے بہت مشہور ہیں :-

- (۱) شکرآچاریہ (۱۱۵۰ء - ۱۲۰۰ء) کا ادویت واد (Advaita) یعنی "وحدت وجود"
  - (۲) رانج آچاریہ (۱۱۵۰ء - ۱۲۰۰ء) کا دی شتادویت واد (Vishishtadvaita) یعنی "مشروط ثنویت"
  - (۳) مادھوآچاریہ (۱۱۵۰ء - ۱۲۰۰ء) کا ادویت واد (Advaita) یعنی "ثنویت"
- شکر کے نزدیک دنیا محض دھوکا (دھماکا) ہے۔ اصل ہستی خدا کی ہے۔ تمام دیوتا ایک ہی ایشور کے مختلف روپ ہیں۔ لہذا انکی پرستش جائز ہے۔ وہ خود شیو کی پوجا کرتے تھے اور ان کے پیرو بھی شیو کے پرستار ہیں۔ شکر کا یہ قول نقل کرنے کے قابل ہے :-
- "اے خدا، میرے تین گناہوں کو معاف کر

میں نے تصور میں تیری تصویر قائم کی، حالانکہ تیری کوئی صورت نہیں۔

میں نے مدح میں تیرا بیان کیا حالانکہ تیری تعریف ہو ہی نہیں سکتی۔

اور مندر میں جاتے وقت یہ بھول گیا کہ تو ہر جگہ موجود ہے۔"

شکرآچاریہ کے برخلاف رانج نے بھکتی پر زور دیا اور دنیا کو اصل اور واقعی بتایا اُن کا خدا سگن ساکار (صاحب صوت و صاحب مضاف) ہے۔ وہ وشنو کے ماننے والے تھے۔

مادھوآچاریہ روح اور مادے دونوں کی ابدیت کے قائل تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ انسان مرگن ایشور کا دھیان نہیں کر سکتا۔ مگر سگن وشنو بھگوان کی پوجا کر کے نجات حاصل کر سکتا ہے۔

نمبارک نے جو رانج کے ہم عصر تھے مذکورہ فلسفوں کے اختلافات کو دور کرنے کے لئے ایک درمیانی راستہ نکالا۔ وہ برہمن (خدا) کو کائنات کا روحانی سبب اور مادی سبب بھی مانتے تھے۔ برہمن مرگن اور سگن دونوں ہی ہے، یہ دنیا دھوکا نہیں ہے بلکہ اصلی اور واقعی ہے ہاں اسے ان معنوں میں ضرور دھوکا کہا جاسکتا ہے کہ اُس کی ہر چیز میں تغیر کا عمل جاری ہے اور اُس کا برہمن سے الگ وجود نہیں۔ یہ دنیا برہمن سے مختلف بھی ہے اور خود برہمن بھی ہے۔ اُسی طرح جیسے لہریں، پہلے، جھاگ، پہواری، قطرے، بھاپ اور برون درحقیقت پانی ہی ہیں لیکن پانی سے صوتاً مختلف بھی ہیں۔ ان کے نزدیک انسان محض خدا کی معرفت کے ذریعہ ہی نجات حاصل کر سکتا ہے۔ نردان حاصل کرنے کے دو ہی ذرائع ہیں اپنی روح کی حقیقت کو پہچاننا اور اپنی زندگی کو خدا کے لئے وقف کر دینا !! نمبارک نے کرشن اور رادھا کی پرستش پر خاص طور سے زور دیا۔ اسی طرح رامانند (چودھویں صدی عیسوی) نے رام کو وشنو کا سب سے بڑا اوتار مانا اور اسی اُس جی بھی اُن سے متاثر ہوئے۔

ہندو مذہب پر اسلام کا اثر جب سے مسلمان ہندوستان آنا شروع ہوئے اور ہندوؤں نے اُن کے مذہب سے واقفیت حاصل کی اُن میں سے بعض لوگ اس چیز کو محسوس کرنے لگے کہ ہمارا مذہب بہت کچھ اصلاح کا محتاج ہے اور مسلمانوں کی بہت سی باتیں یکساں اور اپنائی جاسکتی ہیں۔ مثلاً :- (۱) مسلمان ایک خدا کو مانتے ہیں۔ (۲) اُن میں بہت پرستی کا رواج نہیں (۳) ذات بات کی تفریق نہیں۔ (۴) شادی بیاہ کے طریقے آسان ہیں اور طلاق کا چلن ہے۔ (۵) لڑکے اور لڑکی کے حقوق میں زیادہ فرق نہیں ہے۔

اسلامی حکومت کے قائم ہونے کے بعد سے اہل ہندو اپنی خرابیوں کو شدت سے محسوس کرنے لگے اور اُن کی اصلاح کی طرف رجوع ہوئے اور ہنوز اُس کا سلسلہ جاری ہے مثلاً : کبیر صاحب نے کہا تھا ہے

جات بات مانے نہ کوئے

جو ہر کو بجھے سوہر کو ہوئے

یعنی ذات پانت کا تفریق بیکار ہے جو خدا کی پرستش کرے گا وہ خدا کا ہوگا۔ لیکن ذات پانت کی تفریق ہنوز باقی ہے اگرچہ حکومت وقت اس قسم کی بغولیت کو دور کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسی طرح ہندو کو ڈبل کے پاس ہو جانے سے شادی بیاہ میں آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں اور غورثوں کے حقوق پہلے سے بڑھ گئے ہیں۔ ہندو مذہب کا سوال سو اگر ہم ہندو مذہب اور اسلام کو دو دریا فرض کریں تو کبیر، دادو اور گردوانک کے پلاسے ہوئے مذہبوں کو ان دریاؤں کا شکم کہا جائے گا۔

کبیر پنڈت۔ کبیر ۱۹۰۰ء کے قریب بنارس میں پیدا ہوئے وہ برہمن زادہ تھے لیکن پرورش ایک مسلمان بولا ہے کے گھر میں ہوئی تھی اسی لئے انھوں نے پارچہ بانی کا پیشہ اختیار کیا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے تعلیم کی طرف پوری توجہ کی ہندو مذہب، اسلام نیز تصوف کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا۔ وہ رامائنڈ کے شاکر و تھے۔ ان مذہبوں کے تقابلی مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کے ماننے والے ظاہر داری میں پڑے ہیں۔ مذہب کی اصلی روح تک کوئی نہیں پہنچتا۔ انھوں نے لوگوں تک اپنے خیالات دو ہوں کی شکل میں پہنچائے۔ کبیر کے دوہے ہندی ادب میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ جنہیں ان کے ماننے والوں نے (اور کبیر کے ماننے والے ہندو اور مسلمان دونوں ہی تھے) ان کے مرنے کے بعد کئی صورت میں جمع کیا جسے بیگ کہتے ہیں۔ کبیر کے ماننے والے کبیر پنڈت یعنی کبیر کے مسلک کے ماننے والے کہلاتے ہیں۔ نیچے کبیر کے بعض دوہوں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:-

”ہندو کہتے ہیں ہمارے پیارے کا نام رام ہے، مسلمان کہتے ہیں ہمارے یتیم کا نام رحمان ہے۔ دونوں آپس

میں لڑ لڑ کر مرے جاتے ہیں اس کی اصلیت سے دونوں ناواقف ہیں؟

”اب بھائی! اس دنیا کے دو مالک، دو خدا کیسے ہو سکتے ہیں، کہو تمہیں کس نے ہیکا دیا؟۔ اللہ اور رام،

کریم اور ریشو، ہرئی اور حضرت۔ سب صرف الگ الگ نام رکھ لئے گئے ہیں۔“

”اگر خدا مسجد ہی میں رہتا ہے تو باقی ملک کس کا ہے؟ ہندو سمجھتے ہیں رام تیرتھ اور مورت میں رہتا ہے۔ پر

ان دونوں میں سے کسی کو بھی رام نہیں ملا۔ جو سمجھتے ہیں ایشور پررب میں ہے یا اللہ پیچم میں ہے وہ دونوں ٹھوٹے

میں ہیں۔ اسے ڈھونڈنا ہے تو اپنے دل کے اندر ڈھونڈو۔ وہ وہیں ملے گا۔ وہی کریم ہے اور وہی رام ہے۔“

دادو پنڈت۔ سولہویں صدی کے دوسرے مشہور صوفی واعظ جو کبیر سے کافی متاثر ہوئے، دادو دیال جی تھے (اگرچہ کبیر کا انتقال دادو کے پیدا

ہونے سے ۶۶ سال پہلے ہو چکا تھا) بعض محقق انھیں احمد آباد کا روئی صاف کرنے والا بتاتے ہیں اور بعض کا کہنا ہے کہ وہ ذات کے موچی تھے

لیکن زیادہ صحیح یہ مانا جاتا ہے کہ وہ سرموت برہمن تھے، ان کا اصلی نام مہابلی تھا لیکن رحمدل ہونے کی وجہ سے وہ دیا کو کہلانے لگے اور چونکہ

یہ سب کو دادو، دادو کہہ کر خطاب کرتے تھے اس لئے بعض لوگ انھیں دادو کہنے لگے اور ان کا یہی نام مشہور ہو گیا۔ ان کا چلایا ہوا مذہب دادو پنڈت کہلاتا

ہے۔ ایک روایت ہے کہ شہنشاہ اکبر نے انھیں چالیس دن کے واسطے مذہبی بحث و مباحثہ کے لئے بلوایا بھیجا تھا۔ گرواجن کے سکھوں کی مذہبی

لئے یہ ترجمہ پنڈت سند لال جی کی اہم کتاب ”گیتا اور تترن“ سے منقول ہیں۔

شہنشاہ اکبر مذہب کے معاملہ میں نہایت وسیع النظر تھا۔ اس نے مختلف مذاہب کے اختلافات کو مٹا کر ایک بین الاقوامی مذہب چلانے کی کوشش کی جس کا

نام دین اپنی رکھا تھا۔ اس نے ہر مذہب کے لوگ۔ مسلمان، ہندو، پارسی، عیسائی۔ بلوئے جن کی مذہبی بحثوں کو فتح پور سیکری کے لال محل کے اس حصے میں

جس کا نام عبادت خانہ تھا وہ رات گئے تک سنا کرتا تھا۔ ان کے خیالات سے واقفیت حاصل کر کے ہر مذہب کی خوبیاں لے کر اس نے جس مذہب کو چلانا چاہا

وہ کامیاب نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قبائلاً آؤ خیال اور وسیع النظر و تھا دوسرے لوگ نہ تھے۔

دیتا۔ اے ایشید! میں سب کے اندر تیرا ہی درشن کرتا ہوں۔۔۔۔۔“

راستہ کون سا ہے؟ یہ دونوں اصلی راستہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو یہ دہائی، الگ الگ راستے چن رہی ہیں۔

پندرہ: دونی جھوٹی ہے۔ اس مالک کو سچ ہی پیارا ہے۔

سکھ مذہب۔ اس مذہب کے ماننے والوں کی تعداد تقریباً تیس لاکھ (۳۰۰۰۰۰) ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے ۹۵ فیصدی سکھ پنجاب میں آباد تھے لیکن پاکستان بننے کے بعد ان میں سے بیشتر ہندوستان چلے آئے یا دیگر ممالک کو چلے گئے۔

دنیا کے زندہ مذاہب میں سکھ مذہب بالکل ہی نیا ہے اس کے بانی گرو نانک ۱۴۶۹ء میں لاہور سے تیس میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹے سے قصبہ میں پیدا ہوئے جسے اب ننگران کہتے ہیں لیکن قدیم نام تلونڈی ہے۔ ۱۵۳۹ء میں ان کی وفات ہوئی، انھوں نے جس مذہب کی تبلیغ کی اُس کا منشا ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملانا تھا۔ دونوں ہی ان کے ماننے والے تھے اور یہ اتفاق و اتحاد عرصہ تک قائم رہا حتیٰ کہ امرتسر کے شہرہ آفاق سنہری مندر کی بنیاد گرو ارجن نے ایک مسلمان صوفی سائیں میاں میر سے رکھوائی تھی۔

سکھوں اور مسلمانوں کی باہمی دشمنی اُس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے اس مذہب کے ماننے والے ہندوؤں نے سیاسی قوت حاصل کی اور بادشاہت کے خواب دیکھنے لگے جس کے نتیجے میں اُن کی مغل بادشاہوں سے جنگیں ہوئیں اور ان دونوں کے درمیان مغائرت اور دشمنی کی دیوار کھڑی ہوئی۔

اگرچہ سکھ معاشرت کے لحاظ سے ہندو ہیں لیکن خیالات کے لحاظ سے مسلمان ہیں، وہ خدا کو وحدہ لاشریک مانتے ہیں۔ بتوں کو نہیں پوجتے ان کے مندروں میں جو گوردوارے کہلاتے ہیں، مہت نہیں ہوتے بلکہ ان کی مذہبی کتاب ”گرنتھ صاحب“ ہوتی ہے جسے ریشم کے غلاف میں لپیٹ کر رکھتے ہیں اور صل پر رکھ کر پڑھتے ہیں، یہ سکھوں کا قرآن ہے جس کے بعض حصوں کے پڑھنے کے خاص اوقات ہیں مثلاً جب چاند کو طلوع آفتاب سے پہلے پڑھتے ہیں اور ”رواس“ کو غروب آفتاب سے قبل اسی طرح ”آسا کی بار“ کی جب جی صاحب کے بعد تلاوت کی جاتی ہے۔ ان سب میں خدا کی حمد و ثنا ہے اور یہی سکھوں کی عبادت ہے۔

گزنہ صاحب یا آدمی گزنہ (قدیم یا پہلی کتاب) کو سکھوں کے پانچویں گرو ارجن نے ۱۶۰۴ء میں مرتب کیا تھا۔ یہ گرو نانک، اُن کے بعد کے گروؤں، نیز راناند، کبیر، میلانی اور بعض مسلمان شعرا کی حمدوں اور سمجھنوں پر مشتمل ہے۔ سکھوں کی دوسری مقدس کتاب دس گزنہ (دسویں کتاب) یا دسویں پادشاہی ہے جسے دسویں گرو یعنی گوبند سنگھ نے مرتب کیا تھا اس میں عہد اُن کی زندگی کے حالات اور ہندو مذہب کی مقدس کتابوں کے اقتباسات ہیں۔

نانک کے اصول مذہب کو ہم مختصراً ایک جملے میں بیان کر سکتے ہیں "خدا ایک ہے اور سب انسان بھائی بھائی ہیں۔" مسلمانوں کا خدا ہندوؤں کے خدا سے جدا نہیں ہے اور نہ ہر مذہب کے الگ الگ خدا ہیں، خدا ایک ہے جو رام کی طرح صورت نہیں رکھتا اور نہ وہ صاحب صفات

جیسا کہ مسلمان بیان کرتے ہیں۔ وہ وعدہ لاشریک ہے۔ ناقابل تقسیم۔ ناقابل فہم۔ بہت مطلق، قید زماں سے آزاد اور ہر شے میں سلاہوا لرحمہ اُس کی تعریف نہ ممکن ہے تاہم نام سے موسوم کرنا ضروری ہے۔

گرونانک نے ذاتِ ذات کی تصریح کو باطل قرار دیا اور یہ بتایا کہ سب انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور خدا کے سامنے برابر ہیں۔ نہ کوئی اونچا ہے نہ نیچا، نہ گوارا ہے نہ کالا نہ مقبول ہے نہ مردود اُس کے حضور میں سب یکساں ہیں۔

در اصل نانک کا مذہب ہندو اور بدھ مذاہب نیز اسلام کا آمیزہ ہے۔ اُن کا مسلمانوں کی طرح ایک خدا میں اعتقاد تھا۔ بدھ مذہب والوں کی طرح وہ نروان (نجات) میں یقین رکھتے تھے، مثل صوفیہ کے وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہر روح فوراہی کی ایک غیر فانی شاعر ہے اور ہندوؤں کی طرح وہ سوئم (میں وہ ہوں) کے قابل تھے۔ انھوں نے توحید پر بڑا زور دیا۔ آدمی گرتھ میں ارشاد ہوتا ہے:-

”تو ایک کا نام چننا ہے، تو ایک کو اپنے دھیان میں رکھنا ہے، تو ایک کو ماننا ہے

وہ ایک آنکھ میں ہے، لفظ میں اور منہ میں، تو ایک کو دونوں جہاں میں ماننا ہے

سوئے میں ایک، جاگتے میں ایک، تو ایک میں غرق ہے۔“

آدمی گرتھ میں جا بجا عقیدہ ہمہ اوست کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ”تو میں ہوں، میں تو ہوں، پھر دونوں میں کیا فرق ہے؟“ ”سب میں

ایک رہتا ہے، ایک سما ہوا ہے۔“ ”ساری دنیا آقا کے صادق میں سمائی ہوئی ہے۔“

ثمنویت کے خیال کی گرونانک نے تردید کی، اُن کی (نیز صوفیوں کی) دُست میں ایک ہی خدا صورتوں کی کثرت کا باعث ہے۔ یہ دنیا خدا ہی

کا ظہور ہے۔ آدمی گرتھ کے بعض دوسرے اقتباسات جن سے گرونانک کا خدا کے بارے میں نقطہ نظر واضح ہوتا ہے یہ ہیں:-

”ہم نرکار ہی ہیں (یعنی بے شکل خدا کے بجاری) اور نہ نکار نے ہمارے نام بندھن کاٹ دئے ہیں۔ ہر قسم کی

قیود وہی اور باطل خیالات سے آزاد ہیں۔ ہمارا تھا کہ وہی نرکار ہے یعنی اُس کی کوئی شکل و صورت نہیں جو

لوگ ساکار بتاتے ہیں ہم اُن کو راہِ راست پر نہیں جانتے۔“

”نہم ہندو ہیں مسلمان، ان دونوں کو غیرت کے شیطان نے بھار رکھا ہے اس نے ہندو کو راستہ ہٹا دیا۔“

مسلمان کو۔۔۔ دونوں نام اور رجم کو دو سمجھ کر مٹاتے ہیں۔ ان میں کسی کو ایک خدا پر ایمان نہیں ہے۔“

جپ جی صاحب میں روحانی ارتقا کی پانچ منزلیں بتائی گئی ہیں یعنی دھرم کھنڈ (عالم فرایض)، گیان کھنڈ (عالم بصیرت) شرم کھنڈ

(عالم استغراق)۔ کرم کھنڈ (عالم قوت روحانی)۔ اور سچ کھنڈ (عالم صداقت) یا عرفان، اس منزل تک پہنچ کر انسان خدا سے مل جاتا ہے

برہم سماج۔ اس فرقہ کے بانی راجہ رام موہن رائے ۱۷۷۴ء میں بمقام بردوان ایک معزز برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اسال کی عمر

ہی میں انھوں نے یہ محسوس کر لیا کہ ہندو مذہب کلیتہً اصلاح کا محتاج ہے اُنہندوؤں کے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ خدا ایک ہے جو

شکل و صورت سے معرا ہے اور وہی پرستش کے لائق ہے، یہ محسوس کرنے کے بعد انھوں نے بت پرستی کی مخالفت شروع کی۔ انھوں نے ہندو مذہب

کی کتابیں پڑھیں جس کے لئے عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی، اردو، یونانی اور عبرانی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنی پہلی

کتاب توحید پر فارسی زبان میں لکھی اور اُس کا دیباچہ عربی زبان میں تحریر کیا۔ ۱۸۲۸ء میں انھوں نے کلکتہ میں برہم سمجھا کی بنیاد ڈالی اور اُس کے

پہلے پرنٹس ہوئے ۱۸۳۳ء میں اُن کا برٹش (انگلستان) میں انتقال ہو گیا اور برہم سمجھا کے دوسرے صدر بابو دیندرا ناتھ ٹیگور (۱۸۱۶ء-۱۹۰۷ء)

۱۹۰۷ء۔ راہبندرا ناتھ ٹیگور کے والد) ہوئے اور تیسرے کشیش چندر سین (۱۸۳۵ء-۱۹۰۷ء)۔ اس کے بعد کی برہم سمجھا کی تاریخ چنداں

اہم نہیں اور دراصل خود رام موہن رائے کے بعد ہی اُن کے جانشینوں نے اس مذہب کے اصولوں میں بہت کچھ رد و بدل کر دیا تھا۔ نیچے برہم مت

والوں کے عقاید نقل کئے جاتے ہیں:-

(۱) اصلی اور ابتدائی ایک خدا ہے برتر ہے اُس کی شان میں جو کچھ کہئے تھوڑا ہے وہ از بسکہ نیک اور رحیم ہے۔

(۲) وہ مبارک خدا اسرار روح ہے۔ اس محقول باعث سے اُس کی کوئی شکل اور شبیہ نہیں۔

(۳) صرت اُسی کی پرستش اور اطاعت سے اس دُنیا اور آنے والے جہاں کی خوش وقتی حاصل ہوتی ہے۔

(۴) بندگی اور ستائش اُس کی پرستش ہے اور نیکی اور بھلائی کرنا اُس کی عبادت اور اطاعت ہے۔

(۵) انسان کی روح جب تک گناہوں سے پاک نہ ہو اور عنایات ایزدی شامل نہ ہوں قلب بہ قلب پھرتی رہتی، یعنی آواگون کیا کرتی ہے

(۶) اصل مذہب معرفت ہے جو لوگ کہ ذہمک اور عقلمند اور تجربہ کار ہیں اس وسیلہ سے نجات پاتے ہیں۔

جہاں تک اخلاقی اصولوں اور طریقہ عبادت کا تعلق ہے راجہ رام موہن رائے نے عیسائی مذہب کے اصولوں کو اختیار کیا تھا اسی لئے برہم سماج کو ”مذہب عیسائی بے عیسیٰ“ (Christianity without Christ) کہتے ہیں۔

آریہ سماج — اس کے بانی ہرشی دیانند سروتی (۱۸۲۳ء — ۱۸۸۳ء) تھے۔ ان کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ

شیدو راتری کو وہ اپنے والد اور دوسرے لوگوں کے ساتھ شیوہی کی پوجا کر رہے تھے۔ سویرے پہر سب لوگ سو گئے لیکن وہ جاگ رہے تھے

انہوں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس نے اُن کی زندگی کا رخ بدل دیا یعنی خود شیوہ مورتی کے سر پر ایک چمکا بیٹھا ہوا چاول کھا رہا تھا۔ انھوں نے

سوچا کہ اگر شیوہ کی مورتی میں اتنی بھی طاقت نہیں کہ ایک ادنیٰ چوہے کو بجائے تو اس پرستش سے کیا حاصل۔ اُس وقت سے انہوں نے یہ

طے کر لیا کہ وہ مورتی پوجا نہ کریں گے اور اس کے بعد انہوں نے دیگر مذاہب کی کتابوں کا گہرا مطالعہ شروع کیا تا کہ اُن کے عقاید سے واقفیت

حاصل کریں۔ اُن کے والدین نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے ارادوں سے باز آجائیں اسی غرض سے اُن کی شادی بھی طے کر دی اور

جب کل طیاریاں ہو گئیں تو سوامی جی گھر سے غائب ہو گئے اور مختلف عاملوں کی صحبت سے جنسیاب ہوئے انہوں نے قرآن اور بائبل وغیرہ کا

مطالعہ کیا۔ نیز برہم سماج کے اصولوں سے واقفیت حاصل کی اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ بجائے بہت سے دیوی دیوتاؤں کے ایک خدا کی پرستش

کرنا چاہئے انہوں نے ذات بات کی تفریق کو لغو قرار دیا لیکن آواگون اور نزدان کے اصولوں کو تسلیم کیا۔ ۱۸۵۵ء میں جب وہ ۱۷ سال کے تھے

انہوں نے ایک خاص مسلک کی بنیاد ڈالی جسے آریہ سماج کہتے ہیں اس کا منشا بت پرستی اور شرک کو دور کر کے ویدک مذہب کو زندہ کرنا تھا۔

اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے انہوں نے سارے ملک کا دور دیکھا، ہر مذہب کے عاملوں سے مناظرے کئے اور ۱۹ کتابیں لکھیں جن میں رگوید

آدی بھاشیہ بھوسکا اور سینتارند پرکاش بہت مشہور ہیں۔ ان میں سے پہلی کتاب چار ویدوں کی تفسیر کا دیباچہ ہے اور دوسری کتاب کے پیدھند

میں ویدک اصولوں پر روشنی ڈالی ہے اور دوسرے میں مذاہب عالم پر بے لاگ تنقید کی ہے۔ آریہ سماج کی بنیاد ڈالنے کے بعد ہرشی کا انتقال

ہو گیا لیکن اُن کے ماننے والوں نے اُن کے کام کو جاری رکھا اور آج اس مذہب کے ماننے والوں کی تعداد ۷ کروڑ (۷۰۰۰۰۰) ہے۔

اگرچہ آریہ سماجی اس بات کے زعمی ہیں کہ وہ ایک خدا کے پرستار ہیں لیکن دراصل اُن کی توحید ناقص ہے۔ رگوید آدی بھاشیہ بھوسکا میں لکھا ہے:

”پیدائش کا ثبات سے پہلے شونیہ اکاش (خدا محض) بھی نہ تھا اس وقت پرانہ کی اور کائنات کی فیہ محسوس علت جس کو

ست کہتے ہیں وہ بھی نہ تھی اور نہ پرانڈو (ذرے) تھے اس وقت صرت برہم کی سامتہ (قدت) تھی۔“

یعنی خدائے تعالیٰ نے جب کائنات کو پیدا کیا تو اُس کی ذات کے سوا کوئی دوسری شے موجود نہ تھی مگر آریہ سماجی پھر بھی کہتے ہیں کہ روح اور

وادہ قدیم ہے جیسا کہ سینتارند پرکاش اور رگوید آدی بھاشیہ بھوسکا میں لکھا ہے۔

”پریشدہ (خدا) جیہ (روح) اور پرانہ کی (وادہ) (قدیم) ہیں۔ پریشدہ نے اپنے گیان سے جیہ اور

پرانہ کی پر قابو پا کر ان سے دنیا قائم کی۔“

لے منقول از رسالہ ”برہم مذہب“ (مطبوعہ میٹروپولیٹن پبلشنگ ہاؤس کلکتہ ۱۹۵۷ء)۔ یہ شروع میں محض چار ذاتیں تھیں لیکن اب انیس ہزار مختلف

ذاتیں ہیں ان سے اکثر کچھوت یا بھگن ہیں۔ لے ملاحظہ ہو ”ویانند سرہانت بھاسکر“ مولف کنہ چند (راولپنڈی ۱۹۷۳ء)

## جین مذہب

**مختصر تاریخ** جینیوں کے مطابق ان کے مذہب کی تعلیم چوبیس پیغمبروں (تیر تھنکروں) نے دی جو سب چھتری گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن تاریخ سے آخری دو پیغمبروں ہی کا پتہ چلتا ہے یعنی پارسوناتھ اور جہادیر۔ عموماً جہادیر (۵۴۰-۵۶۷ ق۔ م) کو جین مذہب کا بانی سمجھا جاتا ہے لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس مذہب کی بنیاد پارسوناتھ نے ڈالی تھی جن کا زمانہ ۸ ویں صدی ق۔ م ہے۔ جہادیر کا اصلی نام وردھمان تھا۔ وہ پندرہویں ۲۷ میل شمال میں دیسائی کے ایک چھتری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بیس سال کی عمر میں انھوں نے گھربار چھوڑ کر سنہاس لے لیا۔ بارہ سال انھوں نے سخت ریاضت (تپسیا) کی۔ بیالیس سال کی عمر میں انھیں عرفان کیا حاصل ہوا۔ اپنے نفس کو جیت لینے کی وجہ سے لوگوں نے ان کو جین (ظنخ) اور جہادیر (بڑا بہادر) کے خطاب دیے۔ اپنی زندگی کے بقیہ بیس سال انھوں نے بہار، تربہت اور اودھ میں جین مذہب کی تبلیغ کرنے میں گزارے بالآخر ۷۲ سال کی عمر میں پاوا میں انتقال کیا۔ جہادیر سوامی کے زمانہ تھے اس مذہب کے ماننے والوں کی دو قسمیں رہی ہیں ایک تو سراوک یا گرتھتھ جو اپنی زندگی بسر کرتے ہوئے جین مذہب کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں اور دوسرے شرامن یا سادھو جو دنیا کو ترک کر دیتے ہیں اور جماعت (سنگھ) بنا کر جین مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔

چند گہت سورہ کے زمانہ میں جو اس مذہب کا پیرو تھا اس مذہب کے سادھوؤں کے دو فرقے ہو گئے ایک تو شوتیا مہر جو سفید کپڑے پہنتے ہیں اور دوسرے دیگر (لفظی معنی "آسمان میں ملبوس") جو برہنہ رہتے تھے لیکن اسلامی حکومت کے زمانہ سے انھیں ستر پوشی پر مجبور کیا گیا۔

جین مذہب ہمیشہ ہندوستان تک محدود رہا۔ بیرونی ممالک میں اس کی اشاعت نہ ہوئی پہلے اس مذہب کا مکدھ میں بڑا زور تھا لیکن جب مورتی خاندان کے زمانہ میں اس کا دھڑ زوال ہوا تو اچین اور متھرا میں اس نے عروج پایا۔ دکن میں شنکر اچاریہ کے زمانہ میں اس کا تنزل ہوا مگر گجرات اب بھی جینیوں کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ اسی صوبہ میں کوہ آبو پر اس کے عالیشان منادیں جن کا شمار ہفت عجائبات ہند میں ہوتا ہے ہندوستان میں کل جین مندر تقریباً چالیس ہزار ہیں اور اس کے ماننے والوں کی تعداد تخمیناً بیس لاکھ ہے۔

**ارکان مذہب** اہل ہندو کی طرح جینیوں کا بھی آواگون اور کرم کے فلسفہ میں اعتقاد ہے۔ ہندوؤں کی طرح ان کا مقصد بھی نروان یا موکش (بار بار پیدا ہونے سے نجات) حاصل کرنا ہے۔ موکش حاصل کرنے کیلئے تین اصول ہیں: (۱) صحیح عقیدہ۔ (۲) صحیح علم۔ (۳) صحیح عمل۔ انھیں "تین رتن" کہتے ہیں۔ صحیح عمل کے لئے پانچ عہد (دورت) ہیں: (۱) اہنسا یعنی کسو، جاندار کو ہلکا نہ دینا۔ (۲) سچ بولنا۔ (۳) چوری نہ کرنا۔ (۴) برہمچریہ یعنی ضبط نفس (۵) لالچ نہ کرنا۔

**معتقدات** جینیوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے مذہب کی تبلیغ سب سے پہلے آدمی ناتھ نے کی تھی جو ..... اپنا پہلا پوتا تھا۔ پتیا کیا ہے اسے یوں سمجھئے کہ اگر ایک کعب میل کنویں کو باریک ترین بالوں سے دبا دبا کر بھرا جائے اور پھر ایک چٹا سوسال میں ایک بال نکالے اور جب سب بال نکل جائیں تب ایک پتیا ہوگا۔ جینیوں کی مقدس کتابوں میں تیر تھنکروں کے قد

عمر کے لکھنے میں بڑے مبالغہ سے کام لیا ہے۔

تیرتھنکروں کی بعض صورتیں بہت لمبی بنائی جاتی ہیں۔ عموماً ان کو برہنہ بناتے ہیں۔ بعض میٹھی ہوتی ہیں اور بعض کھڑی۔ انھیں بتوں کو جین مندروں میں پوجا جاتا ہے (جین ہندو دیوی دیوتاؤں کو نہیں مانتے اور نہ دیویوں کو مستند سمجھتے ہیں) جینیوں کا عقیدہ ہے کہ ان تیرتھنکروں کی پوجا سے نجات حاصل ہوتی ہے اور دراصل ہندوستان میں بہت پرستی جینیوں ہی کی مروجہ ہے، لیکن شتوتیا مہروں میں ایک فرقہ ”ڈھیا“ ہے جو بت پرستی نہیں کرتا۔ خود مہاویر سوامی کا دعاؤں میں اعتقاد نہ تھا اس لئے شروع میں جینیوں میں بتوں اور مندروں کا رواج نہ تھا۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، جین لوگ بھی ہندوؤں کی طرح آواگون اور مکتی میں اعتقاد رکھتے ہیں۔ لیکن مکتی کے بارے میں ان کا عقیدہ ہندوؤں سے مختلف ہے۔ ان کے نزدیک جب کوئی روح گناہ کرتی ہے تو وہ سجاری ہو کر نیچے کی طرف ڈوبنے لگتی ہے حتیٰ کہ وہ اس قدر وزنی ہو سکتی ہے کہ ساتویں دوزخ میں جا کر قرار لے لیکن جو روح پاک اور صاف ہو جاتی ہے وہ ہلکی ہو کر اوپر کو اٹھنے لگتی ہے اور چھبیسویں بہشتوں میں سے کسی ایک میں جا کر قیام کرتی ہے (یہ بہشتیں تین اوپر واقع ہیں) اور جب وہ اس قدر لطیف اور پاکیزہ ہو جاتی ہے کہ چھبیسویں بہشت میں پہنچ جائے تب اسے نردون حاصل ہو جاتا ہے۔

ہندوؤں کی طرح جینی خدا کے قابل نہیں۔ مادہ اور روح (جیو) کو الہی (الہادی) مانتے ہیں۔ یعنی یہ چیزیں نہ تو پیدا ہوئی ہیں اور نہ فنا ہوں گی۔ جس طرح دھان جھلکا آتا رہتا ہے یا جھن جھن سے پھرتا ہے یا جھن جھن سے پھرتا ہے۔ جیو کو اسی طرح مکتی پانا اور جیو کو پیدائش اور موت کے چکر میں نہیں آتا۔ کرموں سے مخلصی پانے ہی کا نام مکتی ہے جو مکتی حاصل کر لیتا ہے وہ بہشت (نردون) ہو جاتا ہے۔ جو جین تیرتھنکروں نے مکتی حاصل کر لی اس لئے وہ پریشور ہیں۔ جہاں میں ایک پریشور نہیں ہے بلکہ جس قدر کست جیو ہیں وہ سب پریشور ہیں۔ جہاں کا کوئی بنانے والا نہیں ہے بلکہ جہاں خود بخود بنا ہے۔ جینی فلسفہ اور منطق سے ایسے خدا کے وجود کی تردید کرتے ہیں جیسے قدیم اور خالق کہا جاسکے۔ ان کے اعتقادات اس قسم کے ہوتے ہیں اگر ایشور کو جہاں کا بنانے والا اور جیوؤں کے کرموں کا نتیجہ دینے والا مانتے تو ایشور دنیا کا پابند ہو جائے گا حالانکہ وہ آزاد ہے۔ ایشور کی خواہش سے کچھ نہیں ہوتا جو کچھ ہوتا ہے وہ کرم سے ہوتا ہے۔ جیو کرموں (اعمال) کے نتیجے کو اسی طرح سمجھتا ہے جس طرح وہ سمجھ گپنے کے نشے کو اپنے آپ ہی بھوگتا ہے۔ اس میں ایشور کا کچھ دخل نہیں ہے

جینی اپنے تیرتھنکروں کی عموماً ان الفاظ میں پرستش کرتے ہیں:-

”آقا جینندر کے سامنے میں اپنا سر عاجزی سے جھکاتا ہوں، جو ساری دنیا کا مجھ کو اور امن و راحت کا بخشنے والا ہے

دنیا کی تمام مخلوقات کو وہ الہی سکون عطا کرتا ہے، کا شکہ میں اس کی مہربانی سے نردوان کا اعلیٰ ترین تحفہ حاصل

کر سکوں۔ شری شانق!!“

لیکن وہ یہ جانتے ہیں کہ پریم دیوتا یا تیرتھنکر انھیں اس پرستش سے کوئی نفع یا نقصان نہ پہنچائیں گے کیونکہ ان کا دھرم سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ البتہ وہ دیوتا جو جین مذہب کے ضابطہ کے نگران ہیں ان کی دعاؤں کو سن کر صلہ دیں گے۔ جنوں کے بنائے مابطلہ پر عمل کرنا ہی ان کی سب سے بڑی پرستش ہے۔

## بدھ مذہب

دنیا کے تین بڑے مذاہب میں سے ایک ہے۔ جو آج سے لیکر جاپان تک اور ایشیا کے بہت سے ملکوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے تقریباً چاس کروڑ ماننے والے ہیں اور اس کی تاریخ اب سے ۲۵۰۰ سال قبل شروع ہوتی ہے۔

اس مذہب کے بانی مہاتما گوتم (۵۶۳ ق م) سنہ ۵۶۳ ق م میں نپال اور ہندوستان کی سرحد پر کپل دستونامی مقام پر پیدا ہوئے۔ انکے والد شردھو دھن وہاں کے راجہ تھے۔ وہ نہایت ہونہار شہزادے تھے لیکن ہمیشہ غور و فکر میں مبتلا رہتے تھے۔ ان کے والد نے بیٹو دھرانامی ایک خوبصورت شہزادی سے سولہ سال کی عمر میں انکی سادی کر دی جس سے ان کے ایک بچہ راجن پیدا ہوا۔ باپ کی سخت تاکید اور

### بانی مذہب

پہرے کے باوجود ایک دن وہ اپنی بیوی اور بچے کو سونا چھوڑ کر محل سے نکل گئے اور سادھو بن گئے۔ اُس وقت ان کی عمر ۲۹ سال کی تھی۔ اُس زمانہ کے دستور کے مطابق انھوں نے عرفان حاصل کرنے کے لئے ۶ سال سخت ریاضت کی۔ یہاں تک کہ ان کا جسم سوکھ کر

کاٹا ہو گیا۔ اسی عالم میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ ریاضت بیکار ہے اور وہ کھانے پینے لگے۔ یہ دیکھ کر ان کے پانچ ساتھیوں نے انکا ساتھ چھوڑ دیا لیکن گوتم نے اس کی کچھ پروا نہ کی اور اپنی تلاش کو جاری رکھا۔ بالآخر وہ بدھ گیا میں ایک نیپل کے درخت کے نیچے مراقبہ میں بیٹھ گئے اور یہ طے کر لیا کہ جب تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوں گے نہ اٹھیں گے۔ انھیں ایک خواب کی صورت میں مارا (شیطان) نے ساری دنیا

لی دولت بخشنا چاہی کہ وہ اپنے ارادوں سے باز آجائیں لیکن جب ان کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی تو اُس نے ان پر طوفان باد و باران، چٹانوں اور مشتعل ہتھیاروں سے حملہ کیا لیکن اس کا بھی اُن پر کچھ اثر نہ ہوا۔ مارا کی فوجیں باؤس ہو کر چلی گئیں اور اُس درخت کے نیچے ہم دن کے مراقبہ کے بعد گوتم پر سارے اسرار عیاں ہو گئے اُن کا ضمیر روشن ہو گیا۔ تب سے انھوں نے بدھ (روشن ضمیر یا عارف) کا لقب اختیار کیا اور وہ دشت بودھی و رکش یا بودکش کے نام سے مشہور ہو گیا۔ جو اب بھی موجود ہے اور بدھ مذہب والوں کی مشہور زیارت گاہ ہے۔

گوتم بدھ نے اپنی روشن ضمیری کو اپنے تک محدود نہ رکھا بلکہ دوسروں کو راہ راست دکھانے کے لئے وہاں سے چل دئے اور سب سے پہلے بنارس پہنچے اور بارناتھ نامی مقام پر مرگ بن (ہرن والے باغ) میں انھیں اپنے پانچ پرانے ساتھی ملے جو اُن پر ایمان لائے۔ اس کے بعد بہت سے دوسرے لوگ اور ان کے اہل خاندان نے ان کی تعلیمات کو قبول کیا۔ انھوں نے بہار، اودھ اور نپال میں گھوم پھر کر ۴۵ سال تک اپنے خیالات کی اشاعت کی بالآخر کسی آرائنامی مقام پر (گورکھپور کے علاقے میں) جب ان کی عمر ۸۰ سال کی تھی کچھ ثقیل غذا کھانے سے وہ بیمار پڑ گئے اور اپنی سالگرہ کے دن انتقال کیا یا بدھ مذہب والوں کے الفاظ میں نروان حاصل کیا۔ یہ ۸۳ ق م کی بات ہے۔

گوتم بدھ نسبتاً جلد و تھیں لہذا انھیں اپنے مذہب سے دلچسپی تھی لیکن وہ اُس کی بہت سی باتیں ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کا قریانیوں پر اعتقاد نہ تھا۔ اور وہ پرستش کے خلاف تھے۔ ان کا منشا تھا کہ انسان خود اپنی اصلاح اپنے

### مذہبی تعلیمات

بھروسہ پر کرے اور کسی فوق الفطری قوت کی امداد کا طالب نہ ہو انھوں نے سخت ریاضت یا تپسیا کو بھی غیر ضروری بتایا۔ ویدانت کی رو سے زندگی کا بلند مقصد وصال حقیقی (برہم پراپتی) یا آتمن اور برہمن کا ایک ہو جانا (برہم بھوت) ہے لیکن گوتم بدھ نے محض پیدایش اور موت کے چکر یعنی آدا کوٹن سے نجات حاصل کرنا (نروان) ہی کافی بتایا اور خدا (برہمن) کے بارے میں مکمل سکوت اختیار کیا۔ وہ روح کو خدا کا جزو نہ مانتے تھے بلکہ آزاد سمجھتے تھے۔ نروان کے حصول کے لئے انھوں نے ذات پات کی تفریق کو بھی باطل قرار دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ

انھوں نے ہندو مذہب کے بعض عملی طریقے یعنی ضبط نفس (برہمچریہ) اور یوگ (مراقبہ) وغیرہ کو اختیار کیا اور بعض نظری اصول بھی تسلیم کئے مثلاً (۱) آواگون کا نظریہ یعنی انسان پیدا ہوتا ہے، مرتا ہے اور مرکر دوبارہ پیدا ہوتا ہے اور پیدائش اور موت کا یہ سلسلہ برابر چلتا رہتا تاوقتیکہ انسان کو نروان حاصل ہو جائے (۲) کرم کا نظریہ یعنی انسان کا دوسرا جنم اس زندگی کے اعمال کے مطابق ہوتا ہے اگر اس زندگی میں کسی کے اعمال اچھے ہیں تو دوسرے جنم میں اس سے بہتر حالت میں پیدا ہوگا اور اگر خراب تو اس سے بھی سقیم حالت میں۔ (۳) دنیا کی تکالیف کا سبب لاعلمی (آدویا) اور خواہشات (کام، ترشہن) ہیں لیکن اس سے نجات حاصل کرنے کا جو طریقہ انھوں نے بتایا وہ ہندوؤں سے مختلف تھا۔

جس طرح ایک معالج پہلے مرض کے اسباب معلوم کرتا ہے اور پھر اس کا علاج تجویز کرتا ہے اُسی طرح جہا تا بدھ نے زندگی کی "چار اعلیٰ صداقتیں" (آریہ سیتہ) بتائی ہیں (۱) زندگی دکھ ہے۔ (۲) دکھ کا سبب خواہشات ہیں۔ (۳) خواہشات کو دور کیا جاسکتا ہے۔ (۴) اس کے لئے نہ تو سخت ریاضت کی ضرورت ہے اور نہ عیش پرستی کی بلکہ "درمیانی راستہ" اختیار کرنا چاہئے جس کے آٹھ اصول ہیں۔ اسی لئے اسے "آٹھ اصولوں والا راستہ" (اشٹانگ مارگ) بھی کہتے ہیں وہ اصول یہ ہیں :- (۱) صحیح علم۔ (۲) صحیح ارادہ (۳) صحیح کلام۔ (۴) صحیح عمل۔ (۵) حلال کمائی۔ (۶) صحیح کوشش۔ (۷) نیک خیال۔ (۸) سچا دھیان۔ ان میں سے تیسرے اور چوتھے کو مزید تفصیل سے "پانچ نصیحتوں" کی صورت میں بیان کیا ہے :- (۱) کسی کی جان نہ لینا۔ (۲) جو چیز نہ دی جائے اُس کے لینے سے احتراز کرنا۔ (۳) غیر قانونی جنسی لذت کے حصول سے پرہیز کرنا۔ (۴) جھوٹ نہ بولنا۔ (۵) نشہ آور چیزوں سے پرہیز کرنا۔ بدھ مذہب قبول کرنے کے لیے کسی رسم کے ادا کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ آٹھ اصولوں والے راستے پر عمل کر کے ہر شخص نروان حاصل کر سکتا ہے یا بالفاظ دیگر دنیوی خواہشات کو ترک کر کے مطمئن اور آسودہ زندگی بسر کر سکتا ہے۔

خالق اور کائنات کے بارے میں گوتم بدھ کے خیالات سائنکھیا فلسفہ سے ماخوذ تھے جس میں ہر چیز کی روح مابعد الطبیعیاتی مسائل اور مادے (پریش اور پراکرتی) سے تشریح کی گئی ہے اور کسی الہی قوت کی مداخلت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے بدھ مذہب کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب گوتم بدھ سے اُن کے شاگردوں نے دوسری دنیا اور روح کے بارے میں سوالات کئے تو انھوں نے روحانی اور غیر مادی دنیا کے بارے میں بتانے سے انکار کر دیا لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جاسکتا کہ وہ عالم فوق الفطری یا خدا پر یقین نہ رکھتے تھے اور انھوں نے اپنے شاگردوں کو الٰہی دینی تعلیم دی۔ اُن کے سکوت کے دو سبب تھے :- (۱) وہ یہ سمجھتے تھے کہ لامحدود خدا کی ماہیت کا جاننا انسان کی محدود عقل سے باہر ہے۔ (۲) وہ یہ چاہتے تھے کہ اُن کے شاگرد نروان حاصل کرنے کے لئے خود اپنی کوششوں پر بھروسہ کریں اور کسی خارجی یا فوق الفطری مدد کا سہارا نہ لیں۔ انھوں نے اس موضوع پر قیاس آرائی کو بھی منع کیا کیونکہ اس سے خود اعتمادی کے جذبے کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا اور وہ لوگوں کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ نجات خود تمھارے ہاتھ میں ہے اور اُسے تم اپنی کوشش سے حاصل کر سکتے ہو اس لئے گوتم بدھ کے رویہ کو نہ تو الٰہی دے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور نہ لاادریت سے۔

گوتم بدھ نے صرف مذہب کے عملی پہلو یا اخلاقیات پر زور دیا اور مابعد الطبیعیاتی پہلو کو نظر انداز کر دیا تھا لیکن چونکہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ زندگی کی جدوجہد میں خارجی یا فوق الفطرت امداد چاہے اس لئے بعض لوگوں نے خود انھیں کو پوجنا شروع کر دیا۔

مذہبی فرقے تیسری صدی ق۔م میں شہنشاہ اشوک نے بدھ مذہب قبول کیا اور اُس کی کوشش سے بدھ مذہب نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر ممالک میں بھی پھیل گیا۔ بعد میں مذہبی اختلافات کی بنا پر اس مذہب کا دو شاخیں ہو گئیں: (۱) ہنایان (صراطِ صغیر) جو چٹا گانگ، سیلون، برما، تھائی لینڈ (سیام) کمبوڈیا اور لاؤس میں

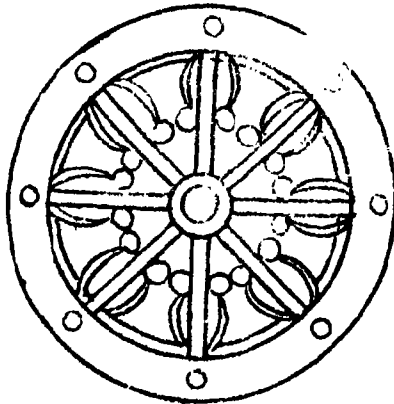
۲) جہاں (صراطِ عظیم) جو نیپال، تبت، چین، جاپان، کوریا اور منگولیا میں مروج ہے۔  
 جہاں فرقتے کی مذہبی کتابیں پالی زبان میں اور جہاں فرقتے کی سنسکرت زبان میں ہیں۔ ان کتابوں میں اللت و ستار،  
 جی پٹک اور جاتک خاص ہیں :-

جہاں فرقتے کے مذہبی اصول قدیم بدھ مذہب سے قریب تر ہیں۔ جہاں مذہب قدیم مذہب کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔  
 جہاں فرقتے کے نزدیک نروان حاصل ہونے پر روح کو مکمل سکون حاصل ہو جاتا ہے، برخلات اس کے جہاں فرقتے کا عقیدہ ہے کہ  
 نروان حاصل کرنے پر بھی روح اپنی نوع کی بہتری کے لئے کام کر سکتی ہے۔ ایسی روح کو بدھستوا (دانشور مہستی) کہتے ہیں، چنانچہ گوتم بدھ  
 نے عرفان حاصل کرنے سے پیشتر بدھستوا کی بے شمار زندگیاں گزاری تھیں جن کا جاتک نامی کتابوں میں تذکرہ ہے۔

جہاں مذہب والوں کے نزدیک کل مخلوقات دھرم کا یا مظہر ہیں۔ اس کے مظاہر اہم کا نام بدھستوا ہے جو انسانی صورت  
 میں زمین پر انسانوں کو نروان حاصل کرنے کے اصول سکھانے کے لئے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی امی تابھا (جاپانی  
 امیدا) تھا اور آخری گوتم بدھ۔ دراصل جہاں مذہب میں تاریخی گوتم بدھ کی جگہ امی تابھا نے لی ہے جو ایک مثالی بدھ ہے۔ یہی وجہ  
 ہے کہ بدھ کے ہزاروں مجسمے جو ایشیا کے مندروں میں پائے جاتے ہیں کسی ایک شخص کی ہو ہو تصور نہیں ہیں بلکہ ”روشن ضمیری“ کا نشان  
 یا علامت ہیں، محبت عظیم (مہا مہتری) اور بے صدر حمدی (جہا کروٹرا) اور فہم و دانش اُس کی خصوصیات ہیں۔ اُسے عجیب لوحات مانا  
 جاتا ہے۔ چین اور جاپان وغیرہ میں اُس کی پرستش ہوتی ہے۔ اُس کا ایک خاص مقام ہے جسے ”عظیم مقدس بہشت“ یا ”ملک صفا“  
 کہتے ہیں اس مذہب کا ہیرو دہاں پہنچنے اور امی تابھا کو اُس کی نورانی صورت میں دیکھنے کی تمنا کرتا ہے۔ جہاں مذہب، بدھ مذہب اور  
 مقامی مذاہب کا مجموعہ یا آمیزہ ہے۔

گوتم بدھ کے انتقال کے بعد جب رسوم میت ادا کی جا چکیں تو اُن کے جسم کی راکھ، ہڈیاں، دانت اور بال وغیرہ محفوظ  
 کر لئے گئے اور انہیں گنبد یا مینار کی وضع کی عمارتوں میں رکھا گیا جنہیں استوپ کہتے ہیں۔ سیلون کے استوپ، داگو باؤ  
 برا وغیرہ کے پیگوڈا کہے جاتے ہیں (خیال کیا جاتا ہے کہ لفظ پیگوڈا، بنگلہ کی بگمبی ہوئی صورت ہے) ایشیا میں لاکھوں استوپ ہیں۔ چونکہ  
 گوتم بدھ کے اتنے بال یا ہڈیاں وغیرہ موجود نہیں ہیں اس لئے ان میں سے بہت سی محض بت، مقدس تحریریں یا مناجاتیں رکھی گئی ہیں استوپوں  
 کا طواف کیا جاتا ہے اور اُن پر بار پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ یہ گویا بدھ کے آثار جسم کی پرستش ہے۔ اس طرح کی پرستش نیز استوپوں  
 کا بنوانا یا حفاظت کرنا، بدھ کا دھیان کرنا، بیکشوڈل کو کھلانا، یہ سب کا رتوب ہیں جن سے حصول نروان میں مدد ملتی ہے۔

دھرم چکر بدھ مذہب کی خاص علامت ہے۔ اس سے مراد آٹھ اصولوں والا راستہ ہے :



# چین کے مذاہب

چین کے لوگ مذہب کے باب میں بڑے آزاد خیال ہیں۔ انھیں دوسری زندگی سے زیادہ موجودہ زندگی کی فکر ہے۔ کنفوشش (Confucius) سے جب اُس کے ایک شاگرد نے حیات بعد ممات کے بارے میں سوال کیا تو اُس نے جواب دیا کہ ”ہمیں ابھی زندگی ہی کا علم حاصل نہیں ہے، موت کو ہم کیسے جان سکتے ہیں۔“ چینی سماج کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ کنفوشش کی اخلاقی تعلیمات پر ہے جس نے والدین کی اطاعت پر بڑا زور دیا تھا۔ عیسائیت، یہودیت اور اسلام کی طرح چین کا مذہب خدا کوئی واضح تصور پیش نہیں کرتا۔

چینیوں کی آزاد خیالی کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے یہاں وقتاً فوقتاً مختلف مذاہب کا رواج ہوا لیکن ان میں کبھی مذہب کے نام پر خونریزی نہیں ہوئی۔ چین کے مقبول ترین مذاہب تین ہیں :- (۱) تاؤ کا مذہب - (۲) کنفوشش کا مذہب - (۳) بدھ کا مذہب اور ان میں ہمیشہ چلی دامن کا ساتھ رہا۔

دو مشہور فلسفی یا پیغمبر چین کے دو مشہور فلسفی یا پیغمبر تھے۔ ان کا زمانہ وہی تھا جو ہندوستان میں جہا تا بدھ اور جہا پر سوامی کا تھا (یعنی چھٹی صدی ق۔ م) جو مذہب کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

لاؤتزو (پیدائش ۶۰۴ ق۔ م) کے لفظی معنی ہیں ”بوڑھا فلسفی“ یا ”بوڑھا لڑکا“ (کہتے ہیں جب وہ پیدا ہوا تو اسکے ہال بالکل سفید تھے) وہ عرصہ تک شاہی کتب خانہ کا مہتمم رہا لیکن بعد ازاں مستعفی ہو کر گوشہ نشین ہو گیا اور پھر چین کا ملک چھوڑ کر نہ جانے کدھر نکل گیا۔ اُس نے اپنے خیالات ۲۵ صفحے کی ایک مختصر کتاب تاؤ - تیسہ - کنگ یا تو - تا - چنگ (Tao Te Ching) میں قلمبند کئے ہیں جو تاؤ کی بات والوں کی بائبل ہے۔ کہتے ہیں لائوتزو نے تاؤ مذہب کی بنیاد ڈالی لیکن دراصل چین میں تاؤ کا تخیل نہایت قدیم زمانہ سے پایا جاتا تھا البتہ وہ پہلا شخص تھا جس نے تاؤ کی ماہیت کو تفصیل سے بیان کیا لیکن ہمیں کہیں پر اُس نے نہایت اوق زبان استعمال کی ہے جس کی وجہ سے اُس کی کتاب کا سمجھنا مشکل ہے۔

کنفوشش (۵۵۱ - ۴۷۸ ق۔ م) نے کوئی نیا مذہب نہیں چلایا، بلکہ اپنے زمانہ کے مذہب کی تائید کرتے ہوئے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانے پر بڑا زور دیا۔ اُس نے لوگوں کے سامنے ایک خاص اخلاقی نظام رکھا جس پر چینی سماج کی تعمیر ہوئی۔ اُس کا کہنا تھا کہ ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے خود اپنی اصلاح کرے اور پھر اپنے گھر والوں کی اصلاح کی طرف رجوع ہو اس سے ہر شہر اور بعد ازاں پوری سلطنت کی اصلاح ہو جائے گی۔ ۳۴ سال کی عمر میں اُس کے تقریباً ۳۰۰ ماننے والے تھے لیکن اب اُس کے ماننے والوں کی تعداد ۲۵۰۰۰۰ سے زائد ہے۔ اس غیر معمولی مقبولیت کی وجہ اُس کی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات اور اُس کے ہم خیال عاملوں کی کوششیں ہیں جن میں منگندھی یا

سے چین میں جہا تا بدھ مذہب کا رواج غالباً پہلی صدی عیسوی سے شروع ہوا۔ اسی کے ساتھ ساتھ پرہیزگار طبقہ، مراسم عبادت اور بھگت مآزی کا فن بھی آیا۔ یہ کنفوشش اس کی لاطینی صورت ہے اور اصل نام سے زیادہ مشہور ہے۔

میتسی (Meng-tze) کا نام بہت مشہور ہے اُس کا زمانہ ۳۷۱ - ۲۸۸ ق۔ م ہے۔ کنفوشش چین کا ”پہلا فلسفی“ اور وہ ”دوسرا فلسفی“ کہلاتا ہے۔

بعض عالموں کو لاؤتزو کے وجود کے بارے میں شبہ ہے اور دراصل اُس کے بارے میں بڑی مبالغہ آمیز روایتیں بیان کی جاتی ہیں برخلاف اس کے آج بھی کنفوشش کی ۴۴ ویں پشت میں اُس کا ایک خاندانی موجود ہے جس کے پاس غالباً دنیا میں سب سے پرانا مستند تجربہ زمانہ قدیم کی بیشتر اقوام کی طرح چین کا مذہب بھی مناظر فطرت کی پرستش تھا جواب بھی رائج ہے۔ چین کے کوروں فطرت پرستی عوام جو کنفوشش، لاؤتزو یا بدھ کی تعلیمات سے ناواقف ہیں متعدد مافوق الفطرت قوتوں کی پرستش کرتے ہیں فیض رساں روئے شیش (Shen) کہلاتی ہیں اور حضرت رساں کوئی (Kwei) جو انسانوں کی قسمت پر حکومت کرتی ہیں۔ چینیوں کے نزدیک ہر جگہ حیوانوں، پرندوں اور پھلیوں وغیرہ کی صورت میں شیطاں اور اژدہے چھپے رہتے ہیں۔ جنہیں اگر چھیڑ دیا جائے تو وہ سخت مصیبتیں لاتے ہیں لیکن خوش قسمتی سے ارواحِ خبیثہ بے وقوف ہوتی ہیں۔ وہ سیدھے راستے پر چلنے کی عادی ہوتی ہیں۔ اسی لئے مکانوں کے راستے اور پل لہریا (W) بنائے جاتے ہیں تاکہ وہ راستہ بھول جائیں کبھی کبھی انھیں بیوقوف بنانے کے لئے دروازے کے سامنے صحرا و بیابان کی تصویریں بنادی جاتی ہیں اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس طرح وہ بھٹکتی پھرس گی اور مکان میں داخل نہ ہو سکیں گی۔ ماہرینِ روحانیات سے مشورہ لئے بغیر کوئی تقریب شادی یا سالگرہ وغیرہ نہیں منائی جاسکتی اور نہ کسی عمارت کی تعمیر ہو سکتی ہے اور نہ کوئی قبر کھودی جاسکتی ہے۔ نیک روجوں کو چاول، سبزی، گوشت اور پھلوں وغیرہ کی نذریں پیش کر کے خوش کیا جاتا ہے۔ چینیوں کا عقیدہ ہے کہ روہیں کھانے کا جو ہر جوس لیتی ہیں اس لئے نذر یا فاتحہ کے بعد کھانے کو سب لوگ مل کر کھا لیتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں ہر ساٹویں سال خاقان چین ایک سفر کرتا تھا جس میں اپنے ملک کے خاص دریاؤں اور پہاڑوں کو قربانیاں پیش کرتا۔ اس قدیم فطرت پرستی کو ”مذہب اور کنفوشش کے مذہب میں شامل کر لیا گیا۔“

بزرگ پرستی اس کے سوا چینیوں میں زمانہ قدیم سے آبا و پرستی کا بھی رواج ہے۔ چینی حیات بعد ممات کے قابل ہیں اور کنفوشش نے بزرگ پرستی پر بڑا زور دیا تھا۔ اُس کا قول ہے کہ ”جو لوگ مر گئے ہیں اُن کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا چاہئے گویا وہ زندہ ہوں۔ یہی سب سے بڑی سعادت مندی ہے“ چنانچہ اب بھی بزرگوں کی روجوں کو قربانیاں پیش کی جاتی ہیں اور ہر چینی گھر میں ایک حصہ خاص اسی کام کے لئے وقف ہوتا ہے عرصہ سے اصلی قربانیوں کی جگہ علامتی رسوم نے لے لی ہے۔ مثلاً کاغذ کا مکان جلانا جس سے مقصود دوسری دنیا میں روح کے لئے مکان ہیا کرنا ہے۔ خاندانی بزرگوں کے سوا ناموران قوم کی پرستش کا بھی رواج ہے چنانچہ مش آفتاب و ماہتاب کے کنفوشش کی بھی پرستش ہوتی ہے۔ لیکن اُس کے مندرجہ میں کوئی صورت نہیں ہوتی بلکہ ایک شخص پر ”کنفوشش“ لکھا یا کندہ ہوتا ہے۔

چینیوں کا زمانہ قدیم میں یہ بھی عقیدہ تھا کہ کسی دور کے ملک میں اب حیات کا ایک چشمہ موجود ہے جسے پی کر انسان امر ہو سکتا ہے لیکن وہ اُس کی تلاش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آبا و پرستی کے علاوہ چینیوں میں دعا، تعویذ، جادو ٹوٹے، فال و تنگون وغیرہ کا بھی رواج رہا ہے اور ان سب کو تاؤ مذہب کا جزو مانا جاتا ہے۔

شانگٹی (Shangti)؛ شخصی خدا چینیوں میں خالص توحید کا رواج کبھی نہیں ہوا، وہ ہمیشہ کثرت پرستی میں مبتلا رہے۔ آسمان اور زمین کو شوہر اور بیوی اور کل اشیا کا والدین مانا جاتا ہے لیکن زمین کے مقابلہ میں آسمان کی اہمیت بہت زیادہ رہی ہے۔

۱۔ چین کے مندروں کے سامنے اکثر خرفناک محافطوں کے مجسمے رکھے جاتے ہیں جن کا منشا ارواحِ خبیثہ کو دھکے کرنا ہوتا ہے۔

آسمان کے لئے چینی زبان میں دو الفاظ پائے جاتے ہیں شانگٹی بمعنی "اوپر کا بادشاہ" اور تھیان (Tien) بمعنی "آسمان"۔ چین کی تاریخ میں خدا بلکہ مذہب کی طرف قدیم ترین اشارہ ان الفاظ میں پایا جاتا ہے: "شہنشاہ زرو (۲۶۹۷-۲۵۹۸ ق م) شانگٹی کے نام پر قربانی کی۔ کل عوام کو جمع کیا اور انھیں حکومت اور مذہب کے اصول بتائے۔" زمانہ قدیم میں بادشاہ اور ملکہ آسمان کی پرستش کیا کرتے تھے۔ چینی رسوم کی کتاب لی کی میں لکھا ہے کہ: "بہار کے پہلے چینی آسمان کا بیٹا اچھی فصل کے لئے شانگٹی سے دعا کرتا اور خود اپنے ہاتھ میں ہل لیتا ہے۔" ۱۹۱۷ء تک چین میں جاری تھی۔ چینیوں کا عقیدہ تھا کہ حکمران کا تقرر آسمان کی طرف سے ہوا کرتا ہے۔ آسمان بدکاروں کو مصلیبتوں میں مبتلا کرتا ہے اور نیکو کاروں پر کتوں کا نزول فرماتا ہے۔

کنفوشس نے لکھا ہے کہ: "تجذ میں جو کچھ خوبیاں ہیں ان کا منبع آسمان ہے۔" لاؤتزو کہتا ہے: "آسمان کا جال ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ اُس کے پھندے وسیع ہیں اُن سے کوئی چیز نہیں بچتی۔" مشہور چینی مورخ پانگو (متوفی ۹۲ء) نے لکھا ہے کہ:-

"آسمان خوش بھی ہوتا ہے اور ناراض بھی۔ اُس کے پاس رنج و راحت کا احساس کرنے والا دل ہے اور

یہ بالکل انسانوں کے مثل ہے۔ اس طور پر آسمان اور انسان یکساں ہیں۔"

ڈاکٹر ولیم ایف وارین (Dr. W. F. Warren) کی تحقیقات کے مطابق اگرچہ شانگٹی آسمان کا دیوتا ہے لیکن آسمان بھی اُس کا ایک خاص مقام ہے یعنی قطب ستارہ۔ چینیوں کا عقیدہ ہے کہ کوئن کوئین (Queen - Kun) پہاڑ دُنیا میں سے اونچا ہے۔ اُس کی وادیوں میں جانب شمال مغرب۔ شانگٹی کا ارضی رنگ محل ہے۔ اُس کے سامنے نو دیواریں ہیں اور ایک پتھروں کا احاطہ ہے۔ اطراف میں نو دروازے ہیں جن سے روشنی نکلتی ہے اور جانور اُس کی حفاظت کرتے ہیں۔ شانگٹی کی بیوی اربہتی ہے اور اس کے ٹھیک اوپر شانگٹی کا آسمانی محل ہے جو آسمان کے وسط یعنی قطب ستارے میں واقع ہے جسے تزوئی (Tszu - Wei) کہتے ہیں۔ قطب ستارہ کو "آسمان کا عظیم خسروی حکمران" بھی کہا جاتا ہے۔ اسی تخیل کے تحت شہنشاہ اور اُس کے درباری قربان گاہ فلک میں مذہبی مراسم ادا کرتے وقت ہمیشہ شمال کی طرف منہ کرتے تھے اور شمال کو قطب ستارہ سے موصیت ہے وہ ظاہر ہے، چین کی طرح بعض دیگر اقوام میں بھی قطب ستارہ کو معبود اکبر یا خدا مانا جاتا تھا۔

شانگٹی، چینیوں کا شخصی خدا ہے اور تاؤ غیر شخصی۔ شانگٹی کا تخیل غیر فلسفیانہ ہے اور تاؤ کے تخیل میں کافی فلسفہ پایا جاتا ہے۔ ہم تاؤ کا مقابلہ ہندوؤں کے برہمن اور برہمنہ کی بدھی (عقل) سے کر سکتے ہیں۔

تاؤ کے محدود معنی "راستے"۔ "طریقہ" اور وسیع معنی "طرز زندگی" یا "قانون فطرت" کے ہیں۔ انسان تاؤ میں پیدا ہوتا اور تاؤ میں رہتا ہے۔ ویسے ہی جیسے مچھلی پانی میں پیدا ہوتی ہے اور پانی میں رہتی ہے اس لئے کہ تاؤ ہر شے میں سما ہوا ہے اور اُسے بے ہوش ہے۔ بایں ہمہ وہ غیر متغیر اور تنہا ہے، تاؤ کو نہ تو دیکھا جاسکتا ہے، نہ سنا جاسکتا ہے اور نہ اُس کے بارے میں کچھ کہا جاسکتا۔ صورت ہے لیکن ہر شے کا صورت گر ہے۔ تاؤ نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے لیکن وہ خود کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ خالق ہے لیکن تخلیق عالم بے بھی موجود تھا۔ وہ ہر چیز کی روح ہے تاہم نہ وہ عرض ہے اور نہ جوہر۔ اور چونکہ وہ غیر محدود ہے اس لئے تاؤ مذہب انسان زمین اور زمان کی قید سے آزاد ہو کر عالم غیر محدود میں گم ہو جانے کی تعلیم دیتا ہے۔ تاؤ مذہب دنیا اور دنیا داری کو برا بتاتا۔ ورنہ اس سے ہمارے روحانی احساسات کو صدمہ پہنچتا ہے، اس کے مطابق باطنی زندگی ہی اچھی اور ظاہری کچھ نہیں ہے۔ عمل کرنے سے روحانی سکون حاصل ہو سکتا ہے۔

تاؤ مذہب کا یہ بھی کہنا ہے کہ انسان کی زندگی کا اصل مقصد تاؤ کا علم حاصل کرنا اور اُس سے ہم آہنگ ہونا ہے۔ انسان کو تاؤ کی اطاعت کرنی چاہئے کیونکہ جو شے تاؤ کی مخالفت کرتی ہے وہ جلد ضائع ہو جاتی ہے۔

تاؤ مذہب کے مطابق انسان کی برآمدگی ہی اس پر مصائب لاتی ہے۔ اُن کے نزدیک عالم فائق الفطرت، قدرت اور انسان کی دنیا میں حد فاصل نہیں کھینچی جاسکتی۔ یہ آپس میں ملے ہوئے ہیں اور تینوں پر ایک ہی کائناتی قانون (تاؤ) حاوی ہے۔ اس لئے انسان کو چاہئے اپنے اعمال سے قدرت کے اصولوں میں خلل نہ ڈالے۔ اگر وہ قدرت کے اصول کے مطابق عمل کرتا ہے تو ساج مہک سکون اور امن رہتا ہے اور اگر وہ قدرت کے قوانین کو توڑتا ہے تو آسمان اور زمین میں اتحاد قائم نہیں رہتا اور کائناتی مشین بگڑ جاتی ہے جس کا انجام تباہی و بربادی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہو گا کہ چینییوں کے نزدیک تاؤ سے مراد دراصل ”قانون فطرت“ ہے جس کا پتہ غالباً انھوں نے اجرام فلکی کی باقاعدہ گردش، موسموں کی آمد، پودوں کے اُگنے، دریاؤں کی شاندار روانی وغیرہ سے لگایا ہو گا اور سیلابوں کی بے پناہی اور قحط سالی وغیرہ کو قانون فطرت میں خلل پڑنے کا نتیجہ بتایا ہو گا۔

تقریباً ۱۰۰۰ ق۔ م میں چینییوں نے مشاہدہ قدرت کی بنا پر ایک خاص فلسفہ وضع کیا جسے ہم ثنویت کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے ثنویت قدرت میں دو قوتوں کی کارفرمائی دیکھی جو متضاد خصوصیات کی حامل ہیں یعنی: (۱) یانگ (Yang) جو مثبت، مذکر، سفید، گرم، سخت اور متحرک ہے۔ (۲) یین (Yin) جو منفی، مونث، سیاہ، سرد، نرم اور غیر متحرک ہے اور دنیا کی ہر چیز انھیں کے باہمی عمل سے بنی ہے۔

یانگ دھوپ اور آگ کا جوہر ہے اور یین سایہ اور پانی کا جوہر ہے۔ آسمان یانگ ہے اور زمین یین ہے۔ یہ دو قوتیں آپس میں بدلتی بھی رہتی ہیں۔ مثلاً لکڑی یین ہے لیکن آگ میں ڈالنے سے یانگ ہو جاتی ہے۔

دیگر مذاہب کی ثنویت میں نور و ظلمت، نیکی اور بدی وغیرہ کو ایک دوسرے کا مخالف مانا جاتا ہے اور اُن میں ادھی جنگ جاری سمجھی جاتی ہے۔ برضلاف اس کے چینییوں کے نزدیک یانگ، اور یین میں مکمل اتحاد ہے۔ کائنات کو چلانے کے لئے یانگ اور یین دونوں ضروری ہیں۔ اگرچہ یہ قوتیں متضاد ہیں لیکن تاؤ کے باعث ان میں مکمل ہم آہنگی قائم ہے جو ساری کائنات پر حاوی ہے۔

”کائناتی قوتوں کو روایتاً ایک دائرے میں ہم آغوش دکھایا جاتا ہے۔ سفید سے (یانگ) اور سیاہ سے (یین) کو ظاہر کرتے ہیں۔“



# جاپان کا مذہب

اہل جاپان شنتو (Shinto) مذہب کے ماننے والے ہیں۔ شنتو، جپنی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "دیوتاؤں کا راستہ"۔ اس مذہب کا علم ہمیں دو کتابوں سے حاصل ہوتا ہے کوچیکی اور نونگی جو بالترتیب شنتو اور شنتو کی تالیف ہیں۔ شنتو مذہب مناظر فطرت کی پرستش پر مشتمل ہے اور اگرچہ اس میں کئی بڑے معبود پائے جاتے ہیں لیکن دیوتاؤں کی موتیں بنکر انہیں نہیں پوجا جاتا، البتہ بڑے مذہب کے زیر اثر دیوتاؤں کی تصویریں ان کے معبودوں میں پائی جاتی ہیں۔ جہاں تک شنتو مذہب کے آغاز کا تعلق ہے یہ بتانا مشکل ہے کہ اسے جاپان کے قدیم باشندوں (جو آئینو (Aino) کہلاتے ہیں) کہاں تک متاثر کیا اور وہ چین کے مذہب سے کیا تعلق رکھتا ہے۔ اگرچہ کنفوشس کے مذہب نے شنتو مذہب کو متاثر کیا علاوہ ازیں چین کی طرح جاپان میں بھی آباؤ پرستی اور مناظر فطرت کی پرستش کا رواج ہے لیکن چین اور جاپان کے مذہبوں میں بڑا فرق ہے۔ چین میں سب سے بڑا معبود آسمان ہے اور اس کے بعد زمین، چاند، سورج وغیرہ لیکن جاپان میں سب سے بڑا معبود سورج ہے۔

**معبود کا تخیل** جاپانی زبان میں معبود کو کاتمی کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں "اعلیٰ" یا "اوپر کا"۔ برخلات شنتو کے جس کے معنی ہیں "ادنیٰ" یا "نیچے کا"۔ چنانچہ جسم کے اوپر کے حصہ کو کاتمی کہتے ہیں اور نیچے کے حصے کو شیمو۔ اعلیٰ طبقے کا آدمی کاتمی ہے اور ادنیٰ طبقے کا شیمو، آسمان، کاتمی ہے اور زمین شیمو۔

**آفتاب پرستی** جاپان کا خاص مذہب آفتاب پرستی ہے چین کے ایک بادشاہ نے جاپان کا نام دای نپون (Dai Nippon) رکھا تھا۔ برخلات دیگر مذاہب کے جاپان میں سورج کو مونٹ مانا جاتا ہے کیونکہ قدیم جاپان میں عورت ہی کو حقوق حاصل تھا۔

جاپانی شہنشاہ جو میکیدو کہلاتے ہیں اپنا مورث اعلیٰ سورج دیوی (Amaterasu) کو مانتے ہیں اور نیابت الہی کے قابل ہیں، اسی لئے جاپان میں زمانہ قدیم سے شہنشاہ پرستی کا رواج رہا ہے۔ جاپان کا شاہی خاندان دنیا کا سب سے پرانا خاندان ہے۔ ہیرو ہیٹو اس خاندان کا ۱۲۴ واں شہنشاہ تھا اور پہلا شہنشاہ جم ۶۶۰ ق۔ م یعنی اب سے ۲۶۱۵ سال پہلے ہوا تھا۔

**دیگر معبود** سورج کے مقابلہ میں چاند (جو مذکور ہے) اور ستاروں کے معبود کم اہم ہیں۔ زمین پرستی کا بھی رواج ہے۔ کچھ بڑے بالو اور چکنی مٹی کے الگ الگ معبود ہیں۔ سہ پہاڑ کا ایک الگ دیوتا ہے، جاپان زلزلوں کا ملک ہے لیکن زلزلے کا کوئی

لے پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی میں بدھ مذہب کو رپا سے جاپان پہنچا، جس نے وہاں کے لوگوں کے عقائد کو بہت متاثر کیا۔ کل شنتو دیوتاؤں کو بدھ اور بدھتوا کے اقدار مان لیا گیا۔ اس کے علاوہ حماٹ بعدمات اور دو زخ و جنت کے خیالات بھی اپنا لئے۔

ایرانی روایات کے مطابق انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی غریبوں کی خدمت میں گزاری۔ بیس سال کی عمر میں وہ ایک پہاڑی میں گوشہ نشین ہو کر غور و فکر میں منہمک ہو گئے اور ۳۰ سال کی عمر میں انھیں عرفان حاصل ہوا۔

انھوں نے عرصہ تک اپنی قوم کو اپنی تعلیمات کی طرف متوجہ کیا لیکن ان کے چچا زاد بھائی کے سوا کوئی ان کا شاگرد نہ ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ ان کی تعلیمات کا تعلق کسی قوت غیر مرئی سے تھا اور لوگ ایسے معبود چاہتے تھے جنہیں وہ آنکھوں سے دیکھ سکیں اور ہاتھوں سے چھو سکیں۔ اپنے بھائی کے کہنے سے وہ شاہ وقت گشتاسپ (بادشاہ) سے بیچ میں جا کر لے اور بادشاہ نے دین زردشتی قبول کر کے ان کے اقوال قلمبند کرائے۔ ان کی کتابی صورت کو آویستا کہتے ہیں جو پیروان زردشت کا قرآن ہے۔ اب زردشت نے شاہ ایران کی مدد سے اپنے مذہب کو توران میں بھی پھیلاتا چلا جس کا نتیجہ ان دو ملکوں کی جنگ کی صورت میں نمودار ہوا۔ یہی نہیں بلکہ زردشت کو ایک تورانی سپاہی نے بیٹھ میں خنجر بھونک کر شہید کر دیا۔

زردشت کے مرنے کے ڈھائی سو سال بعد سکندر نے ایران کو فتح کر لیا (۳۳۰ ق۔ م) اور زردشتی مذہب کی جائیداد کو سب بھیلانا چاہا۔ اُس نے آویستا کے قدیم نسخہ کو بھی جلا دیا۔ ایرانی حکومت کا خاتمہ پارٹھیا والوں نے کیا لیکن یونانی اور پارٹھی دونوں حکومتوں کے زمانوں میں زردشتی مذہب تنزل کی حالت میں رہا۔

ساسانی حکومت کے زمانہ میں الہیہ زردشتی مذہب نے عروج حاصل کیا۔ اس خاندان کا بانی اور شیر باک (۲۲۶ء - ۲۷۲ء) تھا۔ ساسانی حکومت کے خاتمہ کے ساتھ زردشت کے مذہب کی قومی حیثیت بھی ختم ہو گئی مسلمانوں نے زردشت کے صحیفے ڈھونڈ کر ڈھونڈ کر جلائے۔ پارسیوں کو تہذیبی مذہب پر مجبور کیا گیا۔ بہت سے لوگوں نے تبدیلی مذہب پر ترک وطن کو ترجیح دی اور ایران سے ہجرت کر گئے۔ ایک روایت کے مطابق پہلے وہ خلیج فارس میں ہرز کے جزیرے میں ٹھہرے۔ وہاں سے گجرات کے ساحل پر پہونچے (نویں صدی میں) اور پھر سورت سے ممبئی تک پھیل گئے۔ آج ایران میں صرف ۱۰,۰۰۰ زردشتی آباد ہیں اور ہندوستان میں انکی تعداد ۹۰,۰۰۰ ہے۔ یہ پیروان زردشت پارسی کہلاتے ہیں اس لئے کہ وہ پارسی یا فارس سے ہجرت کر کے آئے تھے۔

توحید - آویستا کے پانچ حصے ہیں :- (۱) یاسنا - (۲) گاتھا - (۳) وسپر - (۴) ویندیاد - (۵) یاشت - ان میں سے پہلے دو حصے خاص طور پر اہم ہیں۔ پہلا عبادت یا قربانی سے متعلق ہے اور دوسرا حمد و مناجات سے۔

زردشت کی پانچ گاتھاؤں میں (کل ۱۷ ہیں) خدا کا سب سے قدیم اور سب سے اعلیٰ تخیل پایا جاتا ہے۔ خدا کا نام آہورا مادا (Ahura Mazda) یا مادا آہورا ہے۔ اس کی مختصر صورت ہرمزد (Ormuzd) ہے۔ آہورا کے معنی "آقا" اور مادا کے معنی "دانش" یا "روشنی" کے ہیں۔ گویا وہ "خداوند نور" ہے۔ میرا خیال ہے کہ آہورا کی اصل دہی سورج دیوتا ہے جسے سامی قوم کی ایک شمالی شاخ اشور کہتی تھی، چنانچہ اپنی مذہبی کتابت میں آہورا

لے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ آویستا کی ابتدائی صورت کیا تھی۔ سکندر کے حملہ میں اُس کا بڑا حصہ تلف ہو گیا۔ اندھیرا باکوں اور اُس کے بیٹے شاپور اول نے آویستا کے پرانے نسخہ جمع کرنا شروع کئے اور شاپور دوم کے زمانہ (۳۰۹ء - ۳۳۵ء) میں اُس کے زہر آور بادشاہ سپندر کی نگرانی میں اُس کا ایک مستند نسخہ تیار ہو گیا جو غائب پہلوی خط میں تھا۔ پہلوی رسم خط میں کل ۲۲ نشانات کام آتے تھے جو ایرانی آوازوں کی توجہ کی کے لئے ناکافی تھے لہذا آویستا کو قلمبند کرنے کے لئے ایک نیا رسم خط ایجاد ہوا جو آویستی کہلاتا ہے اس میں تقریباً ۵۰ نشانات کام آتے تھے۔ موجودہ آویستا اسی خط میں ہے۔ یہ نہایت مختصر ہے اور اس کے اجزائے مشرقی حالت میں ہیں۔ آویستا کے قدیم ترین ہندوستانی نسخے تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی کے ہیں اور فارسی نسخے سترھویں صدی عیسوی کے بعد کے ہیں لیکن ہندوستانی نسخوں سے زیادہ صحیح اور معتبر ہیں۔ آویستا کی زبان جو آویستی کہلاتی ہے سنسکرت سے بہت مشابہ ہے۔

کی تصویر بالکل اُسی طرح بنائی گئی ہے جیسے آشوری قوم اپنے معبود آشور کی بنائی تھی :-



زردشت نے فطرت پرستی کی مخالفت کی تھی اور اُس کا خدا روحانی تھا۔ یا سنائیں خدا کی جو صفات مرقوم ہیں اُن میں سے چند ہیں :

وہ پاکیزہ ترین ہستی ہے (۴۴)	وہ تمام چیزوں کا خالق ہے (۴۵)
وہ پاکیزگی کا منبع ہے (۴۶)	وہ تمام عالم کا پیدا کرنے والا ہے (۴۷)
وہ خود مختار ہے (۴۸)	اُس نے پانی، درخت اور کل
وہ تمام ہستیوں کا مالک ہے (۴۹)	دوسری چیزوں کو پیدا کیا (۵۰)
وہ عاقل ہے (۵۱)	وہ انسانی ارواح کا خالق ہے (۵۲)
وہ سب کچھ جانتا ہے (۵۳)	اُس کے قبل کچھ بھی نہ تھا (۵۴)
وہ سب کچھ دیکھتا ہے (۵۵)	وہ بزرگ ترین ہے (۵۶)
وہ تمام رازوں کا جاننے والا ہے (۵۷)	وہ بہترین ہے (۵۸)
وہ کل باتوں سے واقف ہے (۵۹)	وہ غیر متغیر ہے (۶۰)
	وہ رحیم ہے (۶۱)

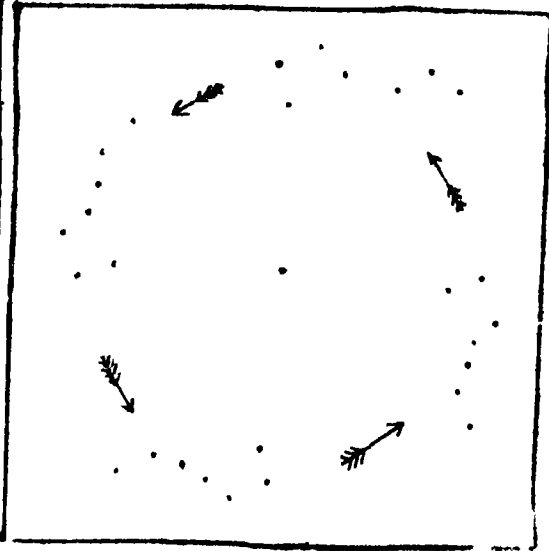
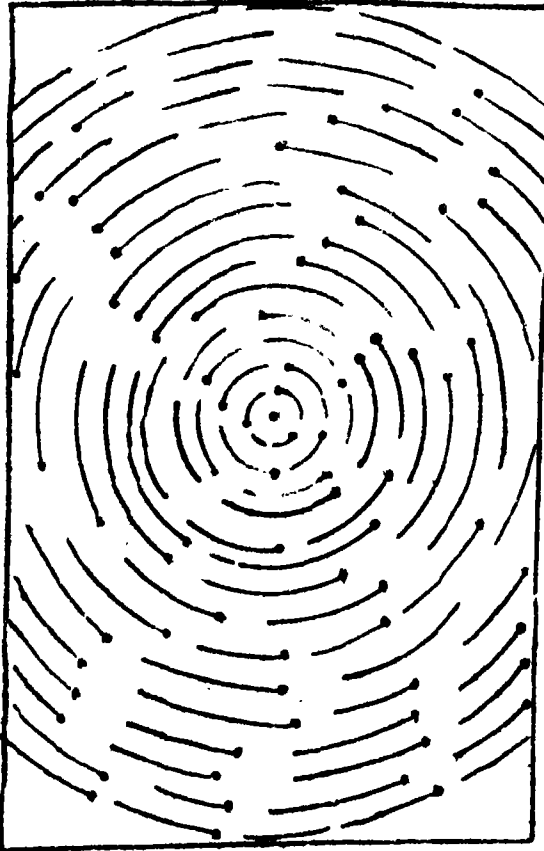
**مشنویت** : اِس ہمہ آہورا مازدا قادر مطلق نہیں ہے کیونکہ اسے سوا ایک دوسری قوت بھی موجود ہے جو ہر چیز میں اُس کی مخالفت کرتی ہے۔ اس متضاد قوت کا نام جو ”مبداء شر“ ہے اینگرا مینو (Angra Mainyu) ہے اور غالباً اسی کی بگڑی ہوئی صورت موجودہ فارسی کا لفظ اہرمن ہے جس کا ضد یزدان (آہورا مازدا) ہے۔ دنیا میں سب کچھ چیزیں اُسی کی بنائی ہوئی ہیں اور دنیا میں جو کچھ بُرائی ہے وہ اہرمن کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اہرمن کا مقابلہ ہم شیطان سے کر سکتے ہیں۔ شیطان کا تخیل اسلام اور عیسائیت میں یہودی مذہب سے آیا اور خود یہودی مذہب نے اُسے ایران سے لیا لیکن شیطان اہرمن میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ شیطان کا تخیل شخصی ہے اور اہرمن محض ایک قوت ہے۔

عربی کا مقولہ ہے کہ :- ”ہر چیز اپنی ضد سے پیدا جاتی ہے“ فطرت میں اجتماع ضدین ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ اسی نے زردشت کی تعلیم یہ تھی کہ دنیا میں دو قوتیں پائی جاتی ہیں ایک نور و نیکی ہے اور دوسری تاریکی و بدی۔ قوت خیر سے یہ امید کرنا کہ وہ کوئی بُرا کام انجام دے، ناممکن ہے۔ اسی طرح قوت شر سے کسی بھلائی کی توقع کرنا عبث ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور

خاص معبود نہیں بلکہ ہر معبود ناراض ہو کر زلزلہ پیدا کر سکتا ہے۔ سمندر کے تین دیوتا ہیں۔ سمندر کی دھکا دیوتا، سمندر کے بیج کا دیوتا۔ سمندر کی سطح کا دیوتا۔ کبھی کبھی انھیں تثلیث فی التوحید کی صورت میں ایک ہی دیوتا مانا جاتا ہے۔ دریاؤں کے دیوتا سانپوں اور آژدھوں کی صورت میں ظاہر کئے جاتے ہیں جنہیں پہلے انسانی قربانیاں پیش کی جاتی تھیں۔ بارش، بجلی، ہوا اور آگ کے بھی دیوتا ہیں، بڑے بڑے درخت اور کنوئیں بھی پوجے جاتے ہیں۔ سورج دیوی، کھانے کی دیوی اور زمین کا دیوتا سب سے بڑے معبود ہیں۔ آگ، بجلی اور طوفان کے دیوتاؤں سے ڈرا جاتا ہے کیونکہ جاپان میں زیادہ تر مکان کاغذ اور لکڑی کے ہوتے ہیں۔

سرسری طور پر جاپانی معبودوں کو سات مجموعوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :- (۱) اجرام فلکی - (۲) عناصر الاربعہ - (۳) غیر معمولی مظاہر قدرت - (۴) نمایاں مظاہر فطرت بہاڑ، چٹانیں، درخت اور غار وغیرہ - (۵) غیر معمولی انسان - (۶) طاقتور حیوان - (۷) نوعات، تلواریں، کٹاریں وغیرہ۔ المختصر غیر معمولی اور اعلیٰ درجے کی چیز قابل پرستش ہے حتیٰ کہ بسا اوقات پرستار کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ جس شے کی پرستش کر رہا ہے اس کی ماہیت کیا ہے؟ ایک جاپانی مقولہ ہے ”ہمیں یہ نہیں معلوم کہ یہ کیا چیز ہے لیکن اس میں ضرور کوئی دیوتا ہے!“

کونجیکی سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں قطب ستارے کو بھی ایک اہم بلکہ معبود اکبر مانا جاتا تھا کیونکہ ملکین عالم کے سلسلہ میں سب سے پہلے جس دیوتا کا پیدا ہونا ظاہر کیا جاتا ہے وہ یہی تھا۔ اسے وہ ”آسمان کے مقدس مرکز کا مالک دیوتا“ کہتے تھے۔ چونکہ قطب ستارہ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے اور دیگر ستارے اس کے گرد گھومتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اس لئے مختلف اقوام قطب ستارہ کو معبود اکبر مانتی تھیں۔



اوپر دیا گیا (سپت رشی) کے سات ستارے قطب ستارہ کے گرد گردش کر رہے ہیں جو دبلا سنہری واقع ہے۔ بائیں طرف کا خاکہ ایک فوٹو گرائف کی نقل ہے جس میں قطب ستارے کے گرد ستاروں کی گردش دکھائی ہے۔

## ایرانی مذاہب

ایران مخفف ہے ایریانا کا جس کے وہی معنی ہیں جو آریہ ورت اور آئرلینڈ کے ہیں یعنی ”آریوں کا ملک“ یہ اس بات کا ثبوت ہے پہلے ان ممالک میں ایک ہی نسل کے لوگ آباد تھے۔ چنانچہ فارسی اور سنسکرت زبانوں کی مشابہت کی بھی یہی وجہ ہے۔ زبان کی طرح ہندوستان اور ایران کا قدیم مذہب بھی ایک ہی تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہایت قدیم زمانہ میں ان دو ملکوں میں کچھ مذہبی اختلاف پیدا ہو گئے اس حقیقت کے ثبوت میں دو لفظ باقی رہ گئے ہیں، ایک دیو جس کے معنی سنسکرت میں ”نورانی مخلوق“ کے ہیں اور فارسی میں بھوت پریت کے۔ دوسرا لفظ آسور ہے جس کے معنی سنسکرت میں دیو کے ہیں اور فارسی میں یہی لفظ دیو کے معنی میں آہوا ہو گیا۔ اہل ایران کا قدیم مذہب مناظر فطرت کی پرستش آبا پرستی اور جادو ٹونا تھا۔ خاص معبود یہ تھے :- پہر (آسمان) ابتدائی معبود خورشید (سورج) ماہ (چاند) ارمانتی (زمین) آتش (آگ) آب (پانی) باد (ہوا)۔ ہیرودوٹس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵ ویں صدی ق۔ م کے وسط میں ایرانی ان معبودوں کی پرستش کرتے تھے۔ اسٹریبو نے بھی ایرانیوں کے آگ اور پانی پوجنے کا ذکر کیا ہے۔ سنسکرت میں سورج کی سورت یہ کہتے ہیں جو قدیم ایرانی میں جاگرہر ہو گیا اور فارسی میں خورجو خورشید کے معنی میں اب بھی مستعمل ہے۔

میتراہیت (Mithraism) فارسی میں سورج کا ایک اور نام بھی ہے، قہر جو مخفف ہے متھرا کا۔ وہی معبود ہے جسے ویدوں میں میترا کہا گیا ہے۔ متھرا آویتا میں چنداں اہم معبود نہیں لیکن ایرانی اقتدار کے بڑھنے سے اُس کی اہمیت بھی بڑھ گئی۔ چونکہ ایشیائے کوچک میں فارس کی نوآبادیاں تھیں اس لئے اس کی پرستش وہاں بھی رائج ہو گئی اور سکندر کی فتوحات کے بعد اُسے مغرب میں بڑھنے کا مزید موقع مل گیا۔ یہ نیا مذہب روم میں پہلی صدی ق۔ م میں پہونچا اور بعد کی دو صدیوں میں پوری سلطنت روم پر چھا گیا۔ پہلے مانویت کی طرح عیسائی مذہب سے زیادہ اس کی توقیر کی جاتی تھی، لیکن جب عیسائی مذہب نے عروج حاصل کرنا شروع کیا تو پادریوں نے رومی شہنشاہوں کو اسے کچل ڈالنے پر آمادہ کیا اور یہ رفتہ رفتہ غائب ہو گیا تاہم اس کے متعدد عقاید و رسوم عیسائیت میں بھی داخل ہو گئے۔

زردشتی (Zoroaster) اپنے ملک کا پہلا پیغمبر تھا جس نے کثرت پرستی کی مذمت اور توحید کی تائید کی۔ دین زردشتی عام طور سے اُس کا زمانہ ۶۶۰ - ۵۸۳ ق۔ م مانا جاتا ہے لیکن بعض عالم... اق۔ م ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی زندگی حضرت ابراہیم سے مشابہ تھی۔ روایت ہے کہ جب موسیٰ کو اپنے علم کے زور سے یہ معلوم ہوا کہ وہ رائج الوقت مذہب کی بجائے کسی کریں گے اور انھیں ملک بدر کر دیں گے تو وہ ان کی جان کے درپے ہو گئے۔ زردشت ہمنوز بچہ تھے کہ آگ میں ڈال دیا گیا لیکن خدا کی قدرت کہ وہ پرہیزگار اور ابراہیم کی طرح محفوظ رہے۔

بعض مسلم مصنفین نے زردشت اور ابراہیم کو ایک ہی ہستی قرار دیا ہے۔ مغربی علماء میں Dr. Spiegel نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ابراہیم اور زردشت کا زمانہ ایک ہی تھا اور وہ ایک ہی مقام کے رہنے والے تھے۔

ایرانی روایات کے مطابق انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی غریبوں کی خدمت میں گزاری۔ بیس سال کی عمر میں وہ ایک پہاڑی میں نشین ہو کر غور و فکر میں منہمک ہو گئے اور ۳۰ سال کی عمر میں انھیں عرفان حاصل ہوا۔

انھوں نے عرصہ تک اپنی قوم کو اپنی تعلیمات کی طرہ متوجہ کیا لیکن ان کے چچا زاد بھائی کے سوا کوئی ان کا شاگرد نہ ہوا۔ وجہ تھی کہ ان کی تعلیمات کا تعلق کسی قوت غیر مرئی سے تھا اور لوگ ایسے معبود چاہتے تھے جنہیں وہ آسمانوں سے دیکھ سکیں اور انھوں ہ چھو سکیں۔ اپنے بھائی کے کہنے سے وہ شاہ وقت گشتاسب (یا وستاشپ) سے ملنے میں جا کر گئے اور بادشاہ نے دین زردشتی قبول کر کے ان کے اقوال قلمبند کرائے۔ ان کی کتابی صورت کو آویستا کہتے ہیں جو پیروان زردشت کا قرآن ہے۔ اب زردشت نے شاہ ایران ہمدوسے اپنے مذہب کو توران میں بھی پھیلاتا چاہا جس کا نتیجہ ان دو ملکوں کی جنگ کی صورت میں نمودار ہوا۔ یہی نہیں بلکہ زردشت ایک تورانی سپاہر نے بیچ میں خنجر بھونک کر شہید کر دیا۔

زردشت کے مرنے کے ڈھائی سو سال بعد سکندر نے ایران کو فتح کر لیا (۳۳۰ ق۔ م) اور زردشتی مذہب کی جاگرتائی عطا کی پھیلاتا چاہا۔ اُس نے آویستا کے قدیم نسخہ کو بھی جلا دیا۔ یونانی حکومت کا خاتمہ پارٹھیا والوں نے کیا لیکن یونانی اور پارٹھوی دونوں حکومتوں کے زمانوں میں زردشتی مذہب تنزل کی حالت میں رہا۔

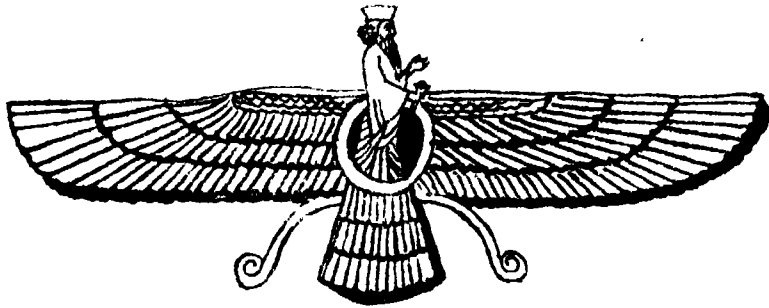
ساسانی حکومت کے زمانہ میں الہیہ زردشتی مذہب نے عروج حاصل کیا۔ اس خاندان کا بانی اردشیر بابکاں (۲۲۴ء - ۲۴۲ء) تھا۔ ساسانی حکومت کے خاتمہ کے ساتھ زردشت کے مذہب کی قومی حیثیت بھی ختم ہو گئی۔ مسلمانوں نے زردشت کے صحیفے ڈھونڈ کر موزوں کر جلانے۔ پارسیوں کو تہذیبی مذہب پر مجبور کیا گیا۔ بہت سے لوگوں نے تبدیلی مذہب پر ترک وطن کو ترجیح دی اور ایران سے باگ نکلے۔ ایک روایت کے مطابق پہلے وہ خلیج فارس میں ہرمز کے جزیرے میں ٹھہرے۔ وہاں سے گجرات کے ساحل پر پہونچے (نویں صدی میں) اور پھر سورت سے ممبئی تک پھیل گئے۔ آج ایران میں صرف ۱۰,۰۰۰ زردشتی آباد ہیں اور ہندوستان میں انکی تعداد ۹۰۰۰ ہے۔ یہ پیروان زردشت پارسی کہلاتے ہیں اس لئے کہ وہ پارسی یا فارس سے ہجرت کر کے آئے تھے۔

حمید - آویستا کے پانچ حصے ہیں :- (۱) یاستا - (۲) گاتھا - (۳) وِسپرود - (۴) ویندیاد - (۵) یاشت - ان میں سے پہلے دو حصے خاص طور پر اہم ہیں۔ پہلا عبادت یا قربانی سے متعلق ہے اور دوسرا حمد و مناجات سے۔

زردشت کی پانچ گاتھاؤں میں (کل ۱۷ ہیں) خدا کا سب سے قدیم اور سب سے اعلیٰ تئیں پایا جاتا ہے۔ خدا کا نام ہورامازدا (Ahura Mazda) یا ماژدا آہورا ہے۔ اس کی مختصر صورت ہرمزد (Ormuzd) ہے۔ آہورا کے معنی "آقا" اور ماژدا کے معنی "دانش" یا "روشنی" کے ہیں۔ گویا وہ "خداوند نور" ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہورا کی اصل وہی سورج دیوتا ہے جسے سامی قوم کی ایک شمالی شاخ آشور کہتی تھی، چنانچہ ہخامنشی کتابت میں آہورا

لے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ آویستا کی ابتدائی صورت کیا تھی۔ سکندر کے حملہ میں اُس کا بڑا حصہ تلف ہو گیا۔ اردشیر بابکاں اور اُس کے بیٹے شاپور اول نے آویستا کے پورے نسخہ جمع کرنا شروع کئے اور شاپور دوم کے زمانہ (۳۱۹ء - ۳۳۷ء) میں اُس کے زیرِ آد بادشاہی اسپند کی نگرانی میں اُس کا ایک مستند نسخہ تیار ہو گیا جو خانہ یہودی خط میں تھا۔ یہودی رسم خط میں کل ۲۲ نشانات کام آتے ہیں جو ایرانی آوازوں کی ترجمانی کے لئے ناکافی تھے لہذا آویستا کو قلمبند کرنے کے لئے ایک نیا رسم خط ایجاد ہوا جو آہستہ آہستہ کہلاتا ہے اس میں نمونیا۔ ۲۲ نشانات کام آتے تھے۔ موجودہ آویستا اسی خط میں ہے۔ یہ نہایت مختصر ہے اور اس کے اجزا منقطع حالت میں ہیں۔ آویستا کے ہم ترین ہندوستانی نسخے تیسرے صدی اور چودھویں صدی عیسوی کے ہیں اور فارسی نسخے تیسرے صدی عیسوی کے بعد کے ہیں لیکن ہندوستانی نسخوں سے زیادہ صحیح اور معتبر ہیں۔ آویستا کی زبان جو آویستی کہلاتی ہے سنسکرت سے بہت مشابہ ہے۔

کی تصویر بالکل اسی طرح بنائی گئی ہے جیسے آشوری قوم اپنے معبود آشور کی بنائی تھی :-



زردشت نے فطرت پرستی کی مخالفت کی تھی اور اُس کا خدا روحانی تھا۔ یا سنا میں خدا کی جو صفات مرقوم ہیں اُن میں سے چند یہ ہیں :

وہ تمام چیزوں کا خالق ہے (۴۶)	وہ پاکیزہ ترین ہستی ہے (۴۷)
وہ تمام عالم کا پیدا کرنے والا ہے (۴۸)	وہ پاکیزگی کا منبع ہے (۴۹)
اُس نے پانی، درخت اور کل	وہ خود مختار ہے (۵۰)
دوسری چیزوں کو پیدا کیا (۵۱)	وہ تمام ہستیوں کا مالک ہے (۵۲)
وہ انسانی ارواح کا خالق ہے (۵۳)	وہ عاقل ہے (۵۴)
اُس کے قبل کچھ بھی نہ تھا (۵۵)	وہ سب کچھ جانتا ہے (۵۶)
وہ بزرگ ترین ہے (۵۷)	وہ سب کچھ دیکھتا ہے (۵۸)
وہ بہترین ہے (۵۹)	وہ تمام رازوں کا جاننے والا ہے (۶۰)
وہ غیر متغیر ہے (۶۱)	وہ کل باتوں سے واقف ہے (۶۲)
وہ رحیم ہے (۶۳)	

**مشہوریت** : اِس ہمہ آہورا ماژدا قادر مطلق نہیں ہے کیونکہ اسے سوا ایک دوسری قوت بھی موجود ہے جو ہر چیز میں اُس کی مخالفت کرتی ہے۔ اس متضاد قوت کا نام جو ”مبداء شر“ ہے اینگر امینو (Angra Mainyu) ہے اور غالباً اسی کی بگڑی ہوئی صورت موجودہ فارسی کا لفظ اہرمن ہے جس کا ضد یزدان (آہورا ماژدا) ہے۔ دنیا میں سب کچھ چیزیں اُسی کی بنائی ہوئی ہیں اور دنیا میں جو کچھ بُرائی ہے وہ اہرمن کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اہرمن کا مقابلہ ہم شیطان سے کر سکتے ہیں۔ شیطان کا تخیل اسلام اور عیسائیت میں یہودی مذہب سے آیا اور خود یہودی مذہب نے اُسے ایران سے لیا لیکن شیطان اور اہرمن میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ شیطان کا تخیل شخصی ہے اور اہرمن محض ایک قوت ہے۔

عربی کا مقولہ ہے کہ :- ”ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے“ فطرت میں اجتماعِ ضدین ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ اسی لئے زردشت کی تعلیم یہ تھی کہ دنیا میں دو قوتیں پائی جاتی ہیں ایک نوری و نیکی ہے اور دوسری تاریکی و بدی۔ قوت خیر سے یہ امید کرنا کہ وہ کوئی بُرا کام انجام دے، ناممکن ہے۔ اسی طرح قوت شر سے کسی بھلائی کی توقع کرنا عبث ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور

۱۔ دو قوتوں کی جنگ کا تخیل نہایت قدیم ہے۔ غالباً اس کی بنیاد وہی روایت ہے جسے رگ وید میں اند اور ورت کی جنگ کہا گیا۔ شریج یوں کی گئی ہے کہ اندر سے مراد سورج ہے اور ورت سے بادل جو وقتی طور پر سورج کو چھپا لیتا ہے لیکن پھر ہٹ جاتا۔ ایک طویل سانپ نظر کیا جاتا ہے اور سامی روایات میں سانپ کو شیطان سے بڑا تعلق حاصل ہے۔ یہی قصہ مردوک اور جنگ کے عنوان سے بائبل افسانہ آفریش عالم میں بیان کیا گیا ہے اور اس کا مقابلہ ہم مقرر میں اوسیرن (خداوند نور) اور سیٹ (میت) کی جنگ سے کر سکتے ہیں اور غالباً لفظ شیطان، سیٹ سے نکلا ہے۔

دشت نے یہ بھی زاہر کیا کہ جس طرح خارجی دنیا میں خیر و شر کی جنگ جاری ہے اسی طرح خود انسان کا دل بھی خیر و شر کی لڑائی بنا ہوا ہے۔ لہذا انسان کو چاہئے کہ قوت خیر کا ساتھ دے اور قوت شر کا استیصال کرے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ نیکو دل رنے سے جنت حاصل ہوگی اور اہل حق کا اتباع کرنے سے جہنم میں جانا ہوگا۔ یزداں کی پیروی کے تین اصول ہیں نیک خیالات، نیک اقوال (بخت) نیک افعال (چورشت) بالآخر خداوند خیر کی جیت ہوگی اور باطل کو شکست ہوگی۔ بالکل یہی بات بتائی گئی ہے۔

ہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اگرچہ زردشتی ثنویت کے قابل ہیں لیکن ثنویت پرست نہیں بقول ہر و فیسر فارسل کی جگہ سے بھی اس کا پتہ نہیں چلتا کہ زردشتی کیرہ نے کسی وقت بھی اہل حق کا کسی صورت میں احترام کیا ہو، بلکہ بالکل برعکس اہل حق کی مخالفت اصول مذہب میں داخل ہے۔

آویتا کا جو حصہ زردشت کے بعد تصنیف ہوا اُس میں خدا کا تخیل زوال پذیر ہے۔ (۱) خدا کی صفات کو مشخص کر کے **ازوال** "سات غیر خانی ہستیاں" (امیشا سپنتا) قرار دی گئیں۔ یہ سات روصیں جن میں سرفہرست خود آہورا ماترہ کا نام ہے۔ وہ ہونو (ہمن) عقل اول، اشا و ہشت (اردی بہشت) راستی، شتھرا ویر (شہر یور) ارضی نعمتیں، اپنتا راستی (ارم) دینداری، ہوروا (نوراد) صحت، اتراد (مرداد) حیات جاوداں۔ انھیں ہفت ملائکہ سے یہود ہوں نے یہ نتیجہ خداوند کے تخت کے سامنے سات روصیں ہیں۔ (۲) آگ کو آہورا ماترہ کا بیٹا مان کر پوجنے لگے۔ (۳) ماہ و مہر کی بھی پرستش ہونے لگی۔ آگ کو آہورا ماترہ کی آنکھ مانا گیا۔ (۴) مٹھرا کے نام کو آہورا ماترہ کے نام سے ملا دیا گیا۔ (۵) ایک دیوی کی بھی پوجا ہونے لگی جس کا ردی سورانا تھا جس کے معنی ہیں "بندہ طاقتور اور پاکیزہ ہستی" غالباً یہ پانی کی دیوی تھی۔ مختصراً اسے انا ہستہ کہتے تھے۔ باہمی لفظ موجودہ فارسی کا ناہید بن گیا جس کے معنی زہرہ ستارہ کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوی تھی جیسے شمالی نوام ایشتر یا استارتہ کہتی تھیں۔ ان کے علاوہ فرشتوں اور محافظ ارواح کا بھی عقیدہ تھا لیکن ان سب کو (بشمول مٹھرا اور انا ہستہ) خدا کی تخلیق مانا جاتا تھا۔

ہمنا منشی دور میں معبود کے تخیل میں مزید زوال ہوا اور نادیدہ خدا کی تصویریں بھی بنائی جانے لگیں، آہورا ماترہ کی یہ تصاویر مثل بنائی جاتی تھیں۔

دنیا کے ہر مذہب نے خدا کی ایک صفت پر خاص طور سے زور دیا ہے یعنی وہ نور ہے۔ گیتا، آویتا، بائبل، قرآن چاروں اس پر زور کا مظہر تین چیزیں ہیں آسمان پر آفتاب و مانتاب اور زمین پر آگ لہذا پھر ان زردشتی ان تینوں کی پرستش کرتے ہیں۔ بلکہ ان کی نگاہ میں ہر عنصر مقدس ہے اسی لئے وہ اپنے مردوں کو دفن نہیں کرتے کہ اس سے مٹی گندی ہوگی، دریا میں نہیں بہاتے جس ہوگا، آگ میں نہیں جلاتے کہ وہ ناپاک ہو جائے گی۔ ان میں یہ رواج ہے کہ لاش کو "مینار خوشاں" میں لے جا کر رکھ دیتے ہیں۔ نہ کہتے ہیں اور وہاں اُسے گدھ آکر کھا جاتے ہیں۔

## مانوی مذہب

مانی ایک ایرانی نژاد اور مجوسی الاصل شخص تھا۔ وہ ۲۴۰ یا ۲۵۰ء میں موجودہ بغداد کے قریب پیدا ہوا۔ اسے فنون لطیفہ سے بے حد دلچسپی تھی اور نقاشی میں اسے کمال حاصل تھا۔ وہ فلسفی بھی تھا اور علوم فلسفہ والہیات میں غور و تدبر کرنے کے بعد اس نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی جس کی تبلیغ اس نے شاپور اول کے عہد سے ۳۰۰ء میں شروع کی۔ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے شاپور کو اپنا ہم خیال بنالیا تھا یا نہیں لیکن اتنا یقینی ہے کہ شاپور کا بھائی پرویز اس کا مربی تھا لیکن ایرانی کاہنوں اور زرتشتی مذہب کے معتقدوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مانی کو وطن چھوڑنا پڑا۔ اس نے وسط ایشیا، چین اور ہندوستان کا سفر کیا اور یہاں کے مذاہب میں بھی بصیرت حاصل کی (غالباً سلطنت رومہ میں اس کا گزرنہ ہوا) پھر وہ ترکستان واپس آیا۔ یہاں اس نے ایک سنسان وادی میں جا کر خلوت اختیار کی اور اسی خلوت کدہ میں اس نے اپنی کتاب ارژنگ یا ارتنگ طیار کی۔ اس میں ہنایت اعلیٰ درجہ کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ اس کتاب کو لیکر وہ ایران واپس آیا اور اپنے کو صاحب کتاب پیغمبر کی حیثیت سے پیش کیا۔ اب اسے نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ شاپور دوم (شاپور اول کے بیٹے) نے اس کی اعانت کی لیکن جب بہرام (شاپور دوم کا بیٹا) بادشاہ ہوا تو آتش پرستوں کے موبدوں اور دستور کو نے اسے اس قدر اچھا لگا کہ وہ مانی کا دشمن ہو گیا۔ آخر ۳۰۰ء میں وہ گرفتار کر کے بہرام کے سامنے لایا گیا جس نے زندگی میں اس کی کھال کچھو کچھو بھس بھروادیا۔ مانی کی کھال کا پتلا ایک حوصلہ تک شہر شاپور کے بھاٹک پر رکھا مرنے حجت بنا رہا۔

اس ظلم سے خوفزدہ ہو کر مانی کے ماننے والے مشرق کی طرف بھاگ گئے اور دین مانوی کو ایران کے باہر وسط ایشیا اور چین میں پھیلا دیا۔ تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں مانی کا مذہب مغربی ایشیا، شمالی افریقہ، جنوبی یورپ، گال (فرانس) اور اسپین میں پھیل گیا۔ لیکن ساتویں صدی سے اس کا اثر نازل ہونے لگا اور تیرھویں صدی کے بعد وہ غائب ہو گیا۔

مانی کی تصانیف میں سات کتابیں تھیں۔ چھ سریانی زبان میں اور ایک پہلوی میں۔ آخری کا نام شاپور خان ہے جس کے بارہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ شاپور کے لئے لکھی گئی تھی۔ ۲۹۰ء میں خان لی کا ق نامی محقق نے طرخان (وسط ایشیا) سے بعض مانوی صحیفے برآمد کئے۔ یہ ایک خاص خط میں لکھے ہیں جو اپنے موجد کے نام پر مانوی کہلاتا ہے۔

مانی کا مذہب دین زرتشتی، عیسائیت اور بدھ مذہب کا حیرت انگیز مجموعہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ خالق دو ہیں، خالق خیر و خالق شر، ازلی وابدی عناصر بھی دو ہیں یعنی نور و ظلمت۔ جن میں سے ہر ایک پانچ صفات سے منقسم ہے یعنی رنگ، ذائقہ، بو، لمس اور صوت۔ ابتدا میں یہ حق صر الگ الگ تھے لیکن بعد میں متصل ہو گئے۔ انھیں کے اتصال سے آفرینش عالم ہوئی۔ ہر شے میں نور کا ظہور ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ظلمت کے عناصر بھی دست و گریباں ہیں لہذا انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ نور کے اجزاء کو، یکی کے اجزاء کی قید سے آزاد کرائے۔ اس کے لئے نفس کشی اور عبادت (نماز، روزے) کی ضرورت ہے۔ مانوی حمد کا ایک نمونہ یہ ہے:-

(۱) ہمارا ہادی، نور کا سفیر مبارک ہے، اس کے محافظ فرشتے مبارک ہیں اس کے منور ملائکہ کی مدح ہو۔

(۲) مانی، اے منور ہستی تو قابل ستائش ہے، ہمارے ہادی، نور کے سرچشمے، حیات کی شاخ، اے شجر عظیم جو کہ سر لا شفا ہے۔

(۳) میں سر بسجود ہوتا ہوں اور حمد کرتا ہوں کل دیوتاؤں کی، نورانی فرشتوں کی، کل تجلیات کی سب ملائکہ کی جن کا منبع خداوند تعالیٰ ہے۔

(۴) میں سر جھکاتا ہوں اور مدح کرتا ہوں گروہ ملائکہ کی اور منور دیوتاؤں کی جنھوں نے اپنی دانش سے تاریخ میں نفوذ کر کے اسے زیر کیا اور دفع کر دیا۔

(۵) میں سجدہ کرتا ہوں اور تجید کرتا ہوں رب ذوالجلال کی، ہستی عظیم اور سر لا نور کی۔

مانی نے سحر و افسوں اور بہت پرستی کی سخت ممانعت کی، اہنسا، راستی اور بکثرت پر زور دیا۔ اس کا مذہب اعلیٰ اخلاقی اصولوں کا حامل

تھا۔ اُس نے انبیاء و عارفان کو اپنے نفع سے خارج کر دیا لیکن حضرت عیسیٰ کو نبی برحق مان لیا اور زردشت اور بدھ کو بھی نبی مرسل تسلیم کیا وہ عدم عصیبت کی تلقین کرتا تھا اور یہی وجہ تھی اُس کے مذہب کی غیر معمولی کامیابی کی!

**مزدک** خراسان کے شہر نیشاپور میں پیدا ہوا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی کا مقصد دین زردشت کی اصلاح قرار دیا تھا۔ اُسکی تعلیمات مانی سے ماخوذ تھیں۔ مانی کی طرح اُس نے بھی نور و ظلمت کے وجود کو تسلیم کیا۔ روشنی کو علم و دانش کا حامل بتایا اور ظلمت کو جہل کا۔ کائنات کی تخلیق اُس کے نزدیک تین عناصر آگ، پانی اور مٹی سے ہوئی تھی۔ دنیا کی تمام اچھی چیزیں ان عناصر کے طبعیت اجزاء سے بنی تھیں اور خراب چیزیں کثیف اجزاء سے۔ مزدک کے نزدیک روحانی عالم بھی مثل اسی دنیا کے ہے۔ آسمان پر دونوں جہاں کا حکمران تخت نشین ہے۔ اُس کے سامنے چار قوتیں ہیں :- اداک، عقل، حافظہ اور انبساط۔ یہ چار قوتیں سات وزیروں کے ذریعہ سے دنیا کا نظم و نسق کرتی ہیں۔ ان وزرائے سے صرف چھ کے نام بتائے گئے ہیں یعنی :- سالار، پیشکار، بلوائن (یا بردار) کاروائں دستور اور کوک۔ یہ سات مدبر بارہ ملائکہ کے ذریعہ عمل کرتے ہیں :-

خورندہ (پکالنے والا)	خورندہ (کھانے والا)	زرنندہ (مارنے والا)
دہندہ (دینے والا)	دوندہ (دور کرنے والا)	کشدہ (کھودنے والا)
ستاندہ (پینے والا)	خیزندہ (اُٹھنے والا)	آئندہ (آنے والا)
بارندہ (اُٹھانے والا)	کشدہ (ہلاک کرنے والا)	سوندہ (ہونے والا)

عراقی مورخ شہرستانی نے ایک تیرہویں ہستی پابندہ (قائم رہنے والا) کا بھی ذکر کیا ہے۔ مزدک کے نزدیک دنیا میں تمام جملہ گروں کی بنیاد ملکیت کا جذبہ ہے۔ اگر تندر، زمین اور وزن پر سے شخصی تصرف ہٹا دیا جائے تو ساری کردہ تین دور جو جائیں اور فسادات سے پاک ہو کر یہ دنیا جنت بن جائے۔ اسی لئے اُس نے مساوات اور اشتراک کی تعلیم دی۔ اُس نے بتایا کہ تمام انسانوں کو حق حاصل ہے کہ وہ ہر چیز سے کیساں مستفید ہوں۔ عورتوں کے معاملہ میں بھی اشتراک کے اصول کو برتنا چاہیے۔ کسی عورت کو اپنے لئے مخصوص کرنا سخت ناانصافی ہے۔ ہر عورت سے ہر مرد کیساں متمتع ہو سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے آگ، پانی یا ہوا سے! اس کے ساتھ ہی اُس نے لباس میں سادگی اختیار کرنے اور جانوروں کا گوشت نہ کھانے کی تاکید کی۔ اُس نے یہ تجویزیں بالکل بے غرض ہو کر پیش کی تھیں لہذا ہر طبقہ خیال کے لوگ اُس کے گرد جمع ہوئے گئے اور روز بروز اُس کے تابعین کی تعداد بڑھتی گئی حتیٰ کہ شاہ وقت قباد بھی دل سے اُس کا معقد ہو گیا اور حکم کھلا اُس کی حایت کرنے لگا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سماجی نظام میں خلل پڑ گیا۔ قانون کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں۔ اعرائے ایران نے اس کا تدارک کرنے کے لئے شاہ قباد کو تخت سے ہٹا کر اُس کے بھائی زاماسب کو بادشاہ بنایا۔ لیکن قباد قید سے بھاگ نکلا اور ایک پڑوسی حکومت کی امداد سے پھر تخت ایران پر قابض ہو گیا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا لہذا اُس نے یہ اعلان کیا کہ اگرچہ وہ نظری طور پر مزدک سے منفق ہے لیکن بادشاہ ہونے کے باعث اُس کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے سے اس لئے قاصر ہے کہ اس سے سلطنت کے استحکام کو صدمہ پہونچنے کا احتمال ہے۔ اس طرح ملک میں جو بد امنی پھیل گئی تھی دور ہو گئی۔

قباد کے چار بیٹوں میں سے تین مزدک کی اشتراکیت کے خلاف تھے خصوصاً خسرو (جو نوٹرواں عادل کے نام سے مشہور ہے) کہا جاتا ہے کہ مزدک نے قباد سے خسرو کی ماں کو طلب کیا تھا اور خسرو نے بڑی مشکل سے اپنی ماں کو اس ذلت سے بچا ہوا تھا اس لئے جب وہ تخت نشین ہوا تو اس نے خسرو سے مل کر مزدک کو معاف کرنے کا حکم دیا۔

## یہودی مذہب

**مختصر تاریخ** دوسری سامی اقوام کی طرح عبرانی قوم کا وطن بھی عرب تھا۔ تقریباً ۵۵۰۰ ق۔م سے یہ لوگ کنعان میں آباد ہونا شروع ہوئے۔ اور مختلف اوقات میں مختلف اطراف سے قبیلوں کی صورت میں آکر ۱۲۰۰ ق۔م تک وہ کنعان و فلسطین میں پوری طرح آباد ہو گئے۔

یہودی روایت یہ ہے کہ انھیں حضرت ابراہیم، کلدانیوں کے پائے حکومت آر سے نکال کر لائے تھے پہلے وہ فلسطین میں ٹھہرے پھر مصر چلے گئے جہاں انھیں غلام بنایا گیا، آخر کار حضرت موسیٰ نے انھیں اس غلامی سے نجات دلوائی۔ اور موسیٰ ویشوع کی سرکردگی میں تقریباً ۱۳۰۰ ق۔م میں وہ مصر چھوڑ کر کنعان آ گئے۔

عبرانی قوم سے تقریباً ۱۰۰۰ سال پہلے سے کنعان میں ایک دوسری سامی نسل قوم آباد تھی جسے کنعانی کہتے ہیں۔ یہ عبرانیوں سے کہیں زیادہ تمدن تھے ان کا اپنا مذہب تھا، اپنی حکومت تھی اور یروشلم ان کا دارالحکومت تھا، عبرانی بہت جلد کنعانیوں میں گھل مل گئے اور ان کی تہذیب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ دونوں میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔

فلسطین میں ایک دوسری قوم بھی آباد تھی جو فلسطینی کہلاتی تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ کریت سے ہجرت کر کے آئے تھے فلسطینی قوتوں نے یہودیوں کو متحد کر دیا اور ۱۰۰۰ ق۔م انھوں نے حضرت صالح کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔ ان کے دوسرے بادشاہ داؤد نے یروشلم کو کنعانیوں سے چھین لیا جو اُس دن سے آج تک فلسطین کا دارالسلطنت ہے

حضرت سلیمان نے جو داؤد کے بیٹے تھے یروشلم کا ہیکل بنوایا اور اُس کی تعمیر کو پورا کرنے کے لئے سبھاری ٹیکس لگائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا سلیمان کے بیٹے ربہووم (۹۳۰ ق۔م) کے زمانہ میں دس شمالی قبیلوں نے اپنی ایک علیحدہ ریاست قائم کرنی جو حکومت اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی ان کا دارالحکومت سمارہ تھا۔ دو جنوبی قبیلوں نے یہودا کی ریاست بنائی جس کا دارالحکومت یروشلم برقرار رہا۔

۵۵۰ ق۔م میں فرعون مصر شیشاک نے ہیکل سلیمانی کو لوٹا اور ۵۲۲ ق۔م میں اسرائیل کی زرخیزی اور دولت کی فراوانی نے آشوری حکمران سادگون کو حملہ کرنے پر اکسایا۔ وہ اُسکے کل باشندوں کو قیدی بنا کر لے گیا اور پھر یہ پتہ نہ چلا کہ اسرائیل کے دس قبیلے کہاں گئے۔ وہ اور ان کی حکومت صفحہ تاریخ سے ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی۔

اسرائیل کے بعد یہودا کی باری آئی ۵۸۶ ق۔م کلدانی حکمران بخت نصر نے حملہ کیا اور یروشلم کو مسمار کر کے وہاں کے باشندوں کو قیدی بنا کر بابل لے گیا ۵۳۹ ق۔م ایرانی بادشاہ سائرس (Cyrus) نے بابل پر قبضہ کر کے کلدانی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور یہودیوں کو واپس جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد سے یہ قوم کبھی تو ایرانیوں کی ماتحت رہی اور کبھی یونانیوں کی حتیٰ کہ ششائیں یروشلم کو رومی حکمران شیش (Tiberius) نے مسمار کر کے یہودی ریاست کا خاتمہ کر دیا تب سے یہودیوں کو ابھرنے کا موقع نہ ملا۔ یہر حال وہ زندہ ہیں اور اپنے مذہب پر قائم ہیں۔

لے یہودی کے معنی ہیں یہودا کا باشندہ۔ یہ نام پوری قوم کے لئے اسرائیل کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد سے قابل استعمال ہے اس سے پہلے عبرانی کا نام یروشلم

یہودیوں کے مذہب کے بارہ میں ہمارے علم کا خاص ذریعہ بائبل ہے جس کے دو حصے ہیں :- عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید۔ آخری حصہ حضرت عیسیٰ سے متعلق ہے اس لئے عیسائیوں کے نزدیک پہلے حصے سے زیادہ اہم ہے جو یہودیوں کی تاریخ اور مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔

یہودی مذہب کی تاریخ کو آسانی کے لئے دو زمانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور حضرت موسیٰ کے زمانہ (۱۳۰۰ ق۔م) سے لے کر ایلیاہ نبی (۸۵۰ ق۔م) تک ہے اور دوسرا اس کے بعد سے حضرت عیسیٰ کے زمانہ تک۔

فاصل توحید کا تصور پیدا ہونے سے پہلے یہودی کثرت پرست تھے اور یہ حالت حقیقہ کے زمانہ تک برقرار رہی۔ چھٹی صدی میں یرمیاہ پیغمبر نے کہا کہ ”اے یہود! جتنے تیرے شہر ہیں اتنے ہی تیرے معبود ہیں“

**خاندانی معبود** ایک بت حضرت داؤد کی بیوی بنت حضرت صالح میکیل کے پاس تھا۔ (اسموئیل ۱۹)۔ ان بتوں کا تعلق آبا پرستی سے تھا اس کی تاریخ پیدائش کے باب ۳۱ سے ہوتی ہے۔ جب یعقوب، لائبن کے وہاں سے بھاگے تو ان کی بیوی ماضل لے اپنے باپ کے بتوں کو چرالیا۔ لائبن نے ان کا تعاقب کیا اور جالیا۔ وہ یعقوب سے ناراض ہو کر پوچھتا ہے کہ ”کس واسطے تو میرے معبودوں کو خیر لایا ہے؟“ میکاہ نامی ایک شخص کے بارہ میں ہم پڑھتے ہیں کہ اُس نے اپنے ترائیم کے بت بنوائے اور اپنے بیٹوں میں سے ایک کو خاندانی کا بن مقرر کیا۔ (قاضیون باب ۱۷) جو تین نے انھیں کاٹھ کے پتے کہا ہے (باب ۴ آیت ۱۲) اور ذکر یہاں نے انھیں ایسے بت کہا ہے جو لوگوں سے جھوٹ بولتے ہیں (ذکر یہاں باب ۱۰ آیت ۲)

بائبل کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترائیم ہر گھر میں بڑی عزت و احترام کے ساتھ رکھے جاتے تھے۔ مخصوص موقعوں پر انھیں قربانیاں دی جاتی تھیں اور ہر مشکل یا تذبذب کی حالت میں اُن سے گھر کے ربوہت کے ذریعہ مشورہ کیا جاتا تھا۔ (خرقی ایل باب ۲۱ آیت ۲۱) پوچھتے باب ۳۰ آیت ۴) اگر ہم کل اشارات کو یکجا کر کے ترائیم کا مقابلہ دوسرے مذاہب کے گھریلو دیوتاؤں سے کریں تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ اُن کا تعلق آبا پرستی (Ancestor Worship) سے تھا۔

ایک دوسرے قسم کے بت بھی یہودیوں میں پائے جاتے تھے جنھیں انود کہتے تھے، ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ کس قسم کے بت تھے۔ بہر حال اُنے مشورہ کیا جاتا تھا۔ (اسموئیل باب ۳۰۔ آیات ۷-۸)

**غیر ملکی معبود** ان میں بعل اور مولک خاص تھے۔ اہل کنعان میں ان کی پرستش فنیقیوں سے آئی اور جب کنعانیوں کو بنی اسرائیل نے شکست دی اور اُن کے ملک پر قابض ہو گئے تو ان معبودوں کی بھی پرستش کرنے لگے۔

بعل۔ فنیقیوں کا معبود اور زرخیزی و بار آوری کا دیوتا تھا اس لفظ کے معنی ”آقا“ یا ”مخدوم“ کے ہیں۔ ہر جگہ کے الگ الگ بعل تھے۔ مثلاً شہر صور کا بعل میلکارت تھا۔ عساربت بلبس کی بعلت تھی ایک لبنان کا بعل تھا، ایک کوہ حزون کا (قاضیون ۳۳) ایک کوہ نعور کا (گنتی ۳۳) وغیرہ وغیرہ بعض مقامات نے بعلیم (جمع بعل) کے ناموں کو محفوظ رکھا ہے جیسے بعل تمر یعنی ”گھریوں کا آقا“ (قاضیون ۳۳) بعل بریت (قاضیون ۳۳) بعل معون (خرقی ایل ۲۴) بعل صفون (خروج ۳۴) وغیرہ وغیرہ۔

مولک۔ اکاد والوں کا آگ کا دیوتا تھا جو آشوری قوم میں کسی قدر اتو میں جذب ہو گیا اور کس قدر آدمیوں میں۔ بعد میں اُس کی پرستش کو فنیقیوں، موآبیوں، بنی معون اور اُن کی قربت دار دیگر اقوام نے اختیار کر لیا۔ اسی سلسلے میں مولک پرستی یہودیوں میں آئی۔

عبرانی میں مولک کے معنی ”بادشاہ“ ہیں (عربی ملک) اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ شروع میں یہ کسی خاص معبود کا نام نہ تھا بلکہ لقب تھا۔ بہر حال اُس کا سرخیل کا او جسم انسان کا بنایا جاتا تھا۔ عہد نامہ قدیم میں یہودیوں کو جابجا منع کیا گیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو مولک کے لئے آگ میں نہ گزاریں۔ (احبار ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰)

یہوداہ میں جذب ہو گیا اور اُسے بھی انسانی قربانیاں پیش کی جائے گئیں۔

**شجر پرستی** یہودیوں کی قربانگاہ کے نزدیک ایک نئی یا محرومی چوب نصب ہوتی تھی جسے اشیر (Asherah) کہتے تھے۔ اسکی پرستش یہودیوں میں فنیقیوں سے آئی۔ استثناء میں ارشاد ہوتا ہے کہ ”تو یہوداہ کی قربان گاہ کے نزدیک کسی قسم کی لکڑی کا اشیرانہ لگاؤ نہ اپنے لئے کسی قسم کی صورت بنائی کہ اس سے خداوند تیرا خدا نفرت رکھتا ہے۔“ (استثناء باب ۱۶، آیت ۲۱) خرقیہ کے بارہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ ”اُس نے اپنے مکافوں کو ڈھادیا اور ستونوں کو توڑا اور اشیرا کو کاٹ ڈالا۔“ (مسلطین باب ۱۸، آیت ۴) اشیرا کا ترجمہ ”کنج باغ“ کیا جاتا ہے جو غلط ہے۔ اشیرا دراصل لکڑی کا ایک محرومی کھمبا ہوا کرتا تھا جو شجر مقدس کی مرموز علامت تھا۔

بنی اسرائیل بعض جانوروں کو بھی پوجتے تھے جن میں بیل اور سانپ خاص تھے :-

**حیوان پرستی** (۱) بیل - داق اور بیت آیل میں ایک نوجوان بیل دیوتا کی طرح پوجا جاتا تھا۔ خروج میں اسرائیلیوں کا ایک ”سنہرا بھرا“ بنا کر پوجنے کا ذکر ہے۔ ۸ ویں صدی کے پیغمبروں کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیل کو پوجنے والے یہ سمجھتے تھے کہ وہ یہوداہ کی پرستش کر رہے ہیں۔ چنانچہ (Kuenen) نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ”بچھڑے کی پرستش دراصل یہوداہ کی پرستش تھی۔“ برخلاف اس کے (Grant Allen) کا کہنا ہے کہ جس دیوتا کی بچھڑے کی شکل میں پوجا کی جاتی تھی وہ یہوداہ سے الگ تھا اور بعد ازاں یہوداہ میں ضم ہو گیا۔ بیل قدرت کی تخلیقی قوتوں کا مظہر تھا اور یہوداہ زرخیزی و بار آوری کا دیوتا تھا لہذا دونوں کا تعلق استوار ہونا یقینی تھا۔ یروشلیم کے ہیکل میں بھی بیل کے مجسمے داخل کر لئے گئے۔ ”بیتل کا بجر“ بارہ بیل کے بتوں پر قائم تھا علاوہ ازیں قربان گاہ میں چار سینک نصب تھے۔

(۲) سانپ - ایک دوسرا حیوانی معبود جس کی یہودیوں نے پرستش کی ”بیتل کا سانپ“ تھا۔ کنی باب ۲۱ میں حضرت موسیٰ کو اس کا موجد بتایا گیا ہے، اس سانپ کی پوجا خرقیہ کے زمانہ تک جاری رہی تھی کہ ”اُس نے بیتل کے سانپ کو جو موسیٰ نے بنایا تھا توڑ کے چکنا چور کیا کیونکہ بنی اسرائیل اُن دنوں تک اُس کے آگے خوشبو جلاتے تھے۔“ (مسلطین باب ۱۸، آیت ۴) خرقیہ کے زمانہ تک یہوداہ کی پرستش میں کافی ”وعدانیت“ پیدا ہو گئی تھی لہذا اس بت کا توڑنا ضروری معلوم ہوا۔ غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ سانپ کو اہل مقرر بہت مقدس مانتے تھے اس لئے ممکن ہے کہ یہودیوں میں یہ افہمی پرستی مقرر سے آئی۔ بائبل میں خدا کے لئے دو نام استعمال کئے گئے ہیں ایک تو الوہم اور دوسرے یہوداہ۔

**قومی معبود** الوہم - عہد نامہ قدیم کے انگریزی ایڈیشنوں میں اس کا ترجمہ خدا کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے معنی شروع میں تھے ”وہ جس سے ڈرا جائے“ اور یہ نام اُن غیر مرئی قوتوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا جو انسان کے دل میں خون پیدا کرتی ہیں مثلاً اسموئیل باب ۲۸ آیت ۱۶ میں ہم پڑھتے ہیں کہ عین دور کی جادوگر نے ”معبودوں (الوہم) کو دیکھا کہ زمین سے اوپر کوچہ تھے“ یہاں پر الوہم سے مراد غالباً روہیں ہیں۔ لیکن عام طور پر یہ لفظ قبیلوں کے دیوتاؤں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ کمونس، واکن، بعل

۱۔ زمانہ قدیم میں بیل کی پرستش نہایت عام تھی۔ کریت میں بیل پوجا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں مقرر میں آپس ہیں (میفس میں) اور مینوس بیل (آق یا ہیلوپوس میں) پوجے جاتے تھے۔ مینوس کو را کا اقدار اور آپس کو پیلے پتاج کا اور بعد میں اوسریر کا اقدار مانا گیا۔

۲۔ اس کی بنا پر عالموں نے یہ پتہ چلا کہ موجودہ بائبل کا ماخذ دو جدا جدا نسخے ہیں، جس نسخہ میں خدا کو یہوداہ کہا گیا ہے وہ (۱۔ ص ۱۰۰) (۲۔ ص ۱۰۱) (۳۔ ص ۱۰۲) کہلاتا ہے اور جس میں الوہم کہا گیا ہے وہ (۱۔ ص ۱۰۳) کہلاتا ہے۔ بعد میں ان دو نسخوں کو ایک ساتھ ملا کر مرتب کیا گیا اور اس طرح بائبل میں جا بجا تضاد پیدا ہو گیا۔

اور یہوداہ سب کو ہی الوہیم کہتے تھے۔

جب بنی اسرائیل نے دوسرے قبیلوں پر فتح پائی تو اُن کا قبلائی معبود مفتوح قبیلوں کا سردار (خداوند خدا) ہو گیا اور یہودی پتھر یہوداہ کو دوسرے قبیلوں کے الوہیم سے بڑا ماننے لگے۔

یہوداہ — دراصل یہوداہ ہی بنی اسرائیل کا خاص معبود تھا۔ لیکن یہوداہ کے پہلے یہودی خدا کو ال شددائی کہتے تھے جس کے معنی ہیں ”میرا عفریت“ (My de-mon) اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہایت ہی خوفناک قسم کا دیوتا تھا اور یہ بالکل ممکن ہے کہ اُس کی بعض خصوصیات یہوداہ میں ضم ہو گئی ہوں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ سے خدا کو بچاے ال شددائی کے یہوداہ کہنے لگے۔

یہوداہ کے معنی میں ارمہوت ہے۔ ایک معنی میں ”وہ جو نفسانی محبت کو ہیجان میں لاتا ہے“ اور یہ معنی اُن عالموں کی موافقت میں ہیں جن کے مطابق یہوداہ پہلے زرخیزی و بار آوری کا دیوتا تھا۔ برخلاف اس کے ڈاکٹر اسپانگل (Dr. Spangl) کا خیال ہے کہ لفظ یہوداہ کے وہی معنی ہیں جو آہورا کے ہیں۔ ان دونوں کا مادہ لفظ (سُسکرت ”اس“) ہے جس کے معنی ”ہونے“ کے ہیں، اس لئے آہورا اور یہوداہ دونوں کے معنی ہیں ”وہ جو ہے“ چنانچہ خدا نے موسیٰ سے کہا: ”میں وہ ہوں جو میں ہوں اور اُس نے کہا کہ تو بنی اسرائیل سے یوں کہیو کہ وہ جو ہے اُس نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے“ (خروج باب ۳، آیت ۱۴)

خدا کا یہی نام زرتشت میں پایا جاتا ہے۔ جو زرتشت میں آہورا کا دے اپنے بیس نام گناے ہیں اُن میں سے پہلا ہے اہمی (سُسکرت اسمی) ”میں ہوں“ آخری ہے اہمی (سُسکرت اسمی یا اسمی) ”میں وہ ہوں جو میں ہوں“ گویا اس نظر کے مطابق لفظ یہوداہ فارسی الاصل ہے اور غالباً بابل میں بہ زمانہ اسیری یہودی خدا کے اس نام سے واقع ہوئے۔

یہوداہ یہودیوں کا خاص معبود تھا اور دیگر اقوام کے معبودوں کی طرح انسانی صورت اور انسانی صفات کا حامل تھا۔ چنانچہ حمید نامہ قدیم میں یہوداہ کا باغ عدن میں آدم کے ساتھ چلنے اور بات کرنے کا ذکر ہے۔ اور انھوں نے خداوند خدا کی آواز سنی جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا اور آدم اور اُس کی بیوی نے آپ کو خداوند خدا کے سامنے سے باغ کے درختوں میں چھپا (پیدائش باب ۳، آیت ۸) انسانی صورت، انسانی صفات اور انسانی شخصیت کا حامل یہی یہوداہ عیسائی توحید پرستوں کا بھی خدا ہے۔ اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ شروع میں یہوداہ کیا تھا اور اُس کے تخیل میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں۔

گرنٹ ایلن کی رائے میں یہوداہ پہلے زرخیزی و بار آوری کا دیوتا تھا انھوں نے اپنے دعوے کی تائید میں بائبل کی متعدد آیات پیش کی ہیں مثلاً :- یہ قومی دیوتا حاران میں ابراہام کو نظر آیا اور کہا کہ وہ اُسے ایک ”بڑی قوم“ بنائے گا (پیدائش باب ۲، آیت ۱۲) بعد میں ابراہام نے یہوداہ سے اپنے بے اولاد ہونے کا شکوہ کیا (باب ۱۵، آیت ۲) ”تب یہوداہ اُس کو باہر لے گیا اور کہا اب تو آسمانوں کی طرف نگاہ کر اور ستاروں کو گن اگر تو اُنھیں گن سکے تیری اولاد ایسی ہی ہوگی“ (باب ۱۵، آیت ۶)۔ ان کے علاوہ بائبل میں اور بہت سی آیات پائی جاتی ہیں جن سے گرنٹ ایلن کی تصدیق ہوتی ہے۔

دُنیا کے دوسرے حصوں میں بھی اسی طرح کے بعض توحید و بار آوری کے دیوتا پائے جاتے ہیں۔ یہ دیوتا عموماً ایک سنگی ستون کی صورت میں ہوتے ہیں۔

بائبل کے متعدد دیانات سے اس کی تائید ہوتی ہے مثلاً :-

”اور یعقوب صبح سویرے اُٹھا اور اُس پتھر کو جسے اُس نے اپنا کلمہ کیا تھا ایک ستون کھڑا کیا اور اُس کے

سرے پر تیل ڈالا اور اُس مقام کا نام بیت الی رکھا“ (پیدائش باب ۲۸، آیات ۱۸-۱۹)

ہندوستان میں لنگ پوجا بھی اسی قبیل کی چیز ہے۔

گرانٹ آئین کا خیال ہے کہ چکنے پتھر قدیم سامی قوم کے فیثش تھے جن پر ایک نہایت ہی قدیم رسم کے مطابق تیل لگایا جاتا تھا۔ یعقوب نے بھی ایک ایسے ہی پتھر کی پرستش کی تھی۔ ایسے پتھروں کو بیت آیل یعنی ”خدا کا گھر“ سمجھا جاتا تھا۔

ستون پرستی کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جب بنی اسرائیل مکرے روانہ ہوئے تو یہود وہاں کے آگے دن کو ایک بادل کے ستون اور رات کو آگ کے ستون کی صورت میں رہنمائی کرتا تھا (خروج باب ۱۴)

ہندوستان میں اکثر ہادیوجی کی مورتیاں گول پتھروں کی صورت میں بعض مقدس درختوں (پمپل، برگد وغیرہ) کے نیچے رکھی رہتی ہیں۔ یہودیوں کے مقدس پتھر بھی بعض درختوں کے نیچے پائے جاتے تھے جن میں سے چند کا نیچے ذکر کیا جاتا ہے۔

سکیم کے نزدیک شاہ بلوط کا ایک درخت تھا جسے ”پیغمبروں کا بلوط“ یا ”کاہنوں کا بلوط“ کہتے تھے۔ اُس کے پاس ایک پتھر تھا جسے کبھی حضرت ابراہیم کی قربان گاہ بتایا گیا ہے اور کبھی حضرت یعقوب کی اور کبھی یسوع کی یادگار کہا گیا ہے۔ دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اکثر اُس پر قربانیاں چڑھاتے تھے اور اُس سے مشورہ بھی کیا جاتا تھا۔ (پیدائش ۱۲، ۳۳، یسوع ۲۲، قاضیوں ۴)

جبرون کے نزدیک ”محرے کا بلوط“ تھا جس کے نیچے ایک مقدس پتھر تھا اُسے حضرت ابراہیم کی قربان گاہ بتایا جاتا تھا (پیدائش ۱۲) اُس پر حضرت داؤد کے زمانہ میں بھی قربانیاں کی جاتی تھیں۔

سرتبع میں ایک قیسر درخت تھا جسے حضرت ابراہیم نے لگایا تھا (پیدائش ۱۲) اُس کے نیچے ایک قربان گاہ یا پتھر تھا جو سختی سے منسوب تھا۔

بیت آیل کے مقدس پتھر کے علاوہ حضرت یعقوب نے کئی اور پتھر بھی نصب کئے تھے۔ ایک جگہ درج ہے کہ ”یعقوب نے ایک پتھر لے کر ستون کھڑا کیا اور یعقوب نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ پتھر جمع کرو“ انھوں نے پتھر جمع کر کے ایک تودہ بنالیا اور انھوں نے وہاں اُس تودہ پر کھانا کھایا“ (پیدائش باب ۳۱-آیات ۴۵-۴۶)۔ سنگ پرستی کی ایسی بہت سی مثالیں قدیم عبرانی صحائف میں موجود ہیں۔

اسی سلسلہ میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے مقدس پتھر جب شرق یرون میں پائے جاتے ہیں تو فلسطین میں کیوں نہیں پائے جاتے؟ اس باب میں کوئڈر کا خیال ہے کہ جب خرقیہ اور یسوع کے زمانہ میں خالص یہود وہاں پرستی شروع ہوئی تو یہود وہاں کے پرستاروں نے ”بیت پرستی“ کے تمام نشانات کو مٹا دیا۔

**خداوند کا صندوق** یہود وہاں شروع میں محض ایک لنگ تھا جو ایک صندوق میں محفوظ رکھا جاتا تھا۔ بعد میں اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی اور ”یہود وہاں کے صندوق“ کو ”یہود وہاں کے عہد کا صندوق“ کہا جانے لگا مگر یہ بائبل میں یہ بتایا گیا ہے کہ: ”صندوق میں کچھ نہ تھا سوا پتھر کی ان دو لوحوں کے جنہیں موسیٰ نے بہ مقام حورب اُس میں رکھا تھا جبکہ خداوند نے بنی اسرائیل سے اُن کے سرزمین مکرے نکلنے وقت عہد باندھا تھا“ (انوارینج باب ۸ آیت ۹)۔ لیکن گرانٹ آئین کا خیال ہے کہ یہ پتھر دراصل لنگ تھا جس پر بعض نقوش بنے تھے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ وہ ایک کتبہ ہے۔ قاضیوں، سموئیل اور سلاطین میں پائی جانے والی روایات سے صاف ظاہر ہے کہ اُس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہود وہاں خود صندوق میں رہتا ہے جسے وہ سفر و حضر میں ساتھ لئے لے پھرتے تھے اور اُس کے سامنے ناچنا گانا یہود وہاں کے سامنے ناچنے گانے کا مصداق تھا۔

اس صندوق کو جنگ کے وقت لشکر کے سامنے لے جاتے تھے مثلاً ابن عزر میں فلسطینیوں سے جو بڑی جنگ ہوئی اُس میں یہود وہاں کا صندوق اٹھا کر لے جایا گیا (اسموئیل باب ۴) اور جب انھوں نے اس صندوق پر قبضہ کر لیا تو اُن کا معبود دجون (داگن) اُس کے سامنے منہ کے بل گر پڑا اور وہ خود بوا سیر میں مبتلا ہو گئے (اسموئیل باب ۵) جب فلسطینیوں نے وہ مقدس صندوق واپس کر دیا تو وہ کچھ عرصہ تک قریت یعزیم میں رہا اور جب داؤد نے یروشلیم کو فتح کیا تو صندوق کو ایک نئی گاڑی پر لاد لیا اور داؤد خداوند کے آگے اپنے سارے بل سے ناچتے ناچتے چلا“ (۲ سموئیل باب ۶ آیت ۱۴)

بعض علماء و یہود نے مذہب کے اس پہلو کو چھپانا چاہا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہود وہ صنف انسانی قربانیوں سے خوش ہوتا تھا بلکہ خاص طور پر پہلی اولاد کی بھینٹ چاہتا تھا۔ چند بیانات ملاحظہ ہوں :-

سموئیل نے اجاج کو خداوند کے آگے ٹکڑے ٹکڑے کیا " (اسموئیل باب ۱۵-آیت ۳۳) اور افتتاح نے اپنی اکلوتی لڑکی کو جو کنواری بھی تھی یہوداہ کے حضور میں قربان کیا کیونکہ اُس نے منت مانی تھی کہ "میں جب بنی عمون کی طرف سے - ملاستی کے ساتھ پھروں گا تو جو لوئی میرے گھر کے دروازہ سے پہلے میرے استقبال کو نکلتے گا وہ خداوند کا ہوگا اور میں اُس کی سوختنی قربانی گزاروں گا (قاضیوں باب ۳) آیت ۳) جب ابراہام نے اپنے بیٹے کو چھری سے ذبح کرنا چاہا تو یہوداہ نے اُسے روک دیا۔ کیونکہ وہ اُس کی نسل کو آسمان کے ستاروں اور دریا کی ریت کے مانند ٹرھانا چاہتا تھا (پیدائش باب ۲۲-آیت ۱-۱۴) داؤد نے یہوداہ کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ساؤل (صالح) کے دو بیٹوں اور پانچ فواسوں کی قربانیاں کیں۔ (سموئیل باب ۲۱-آیت ۹)۔

گزشتہ آئین کا خیال ہے کہ انسانی قربانیوں کی جگہ بعد میں ختنہ کی رسم نے لے لی۔ بائبل میں اسے حضرت ابراہیم سے منسوب کیا گیا ہے

**ختنہ** ارشاد ہوتا ہے :-

"یہ میرا عہد ہے جو میرے اور تمہارے اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے اسے تم یاد رکھو تم میں

سے ہر ایک فرزند زمرہ کا ختنہ کیا جائے" (پیدائش باب ۱۵-آیت ۱۰-۱۲)

سورج دیوتا۔ یہوداہ کے تصور میں بعد کو متعدد تبدیلیاں ہوئیں چنانچہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب سورج دیوتا یہوداہ میں ضم ہو گیا مثلاً بائبل میں یہوداہ کی سواری کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ ایک رتھ میں چلتا تھا جس میں کروڑی جتے ہوتے تھے۔ (زبور باب ۱۸-آیت ۱۰-۱۱) حزقی ایل باب ۱-آیت ۲۰)۔ اس سادہ رتھ میں سفر کرتے وقت یہوداہ کروڑیوں کے پھیلے ہوئے پیروں کے سایہ میں رہتا تھا۔ اُس وقت اُن کے پیروں سے جتے ہوئے انکاروں اور چراغوں کی طرح روشنی پھیلتی تھی۔ حرکت کرتے وقت رتھ سے آگ اور بجلی نکلتی تھی۔ (خرقی ایل باب ۱-آیت ۱۳-۱۴)

کروڑی ایک خرافاتی حیوان تھا۔ بائبل سے پتہ چلتا ہے کہ وہ پہلے ایک الگ معبود تھا جس کا شیریں اور میلوں سے کچھ تعلق تھا۔ (اسلاطین۔ باب ۲۹-آیت ۲۹)۔ بعد میں ان دو جانوروں میں عقاب اور انسان کا اضافہ کر کے ایک چار حیوانوں سے مرکب مرکب طیار ہوا لیکن یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ یہ چاروں حیوان مختلف ممالک میں آفتاب کی علامت تھے۔ یہوداہ کے گرد شعاعوں کا ہالاس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ کروڑی کا سور خود سورج دیوتا تھا۔

اسی سلسلے میں یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مصر میں مخروطی مینار (Obelisk) کو پہلے رنگ یعنی تخلیقی قوت کا مظہر مانا جاتا تھا بعد میں اُسے شعاع آفتاب کی علامت مانا گیا۔ اسی طرح یہوداہ میں جو پہلے محض پتھر کا رنگ تھا، آفتابی خصوصیات پیدا ہو گئیں۔ یہودی مذہب میں اکادمی تو م یا کلدانیہ والوں کے اثر سے انجم پرستی کے بھی بعض عناصر شامل ہو گئے۔ جیسے کیوان (زحل) کی پرستش زحل کو منہوس خیال کیا جاتا تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ جو کام سینچر کو شروع ہوگا وہ پورا نہ ہوگا اسی لئے یہودیوں نے سینچر کو کسی قسم کا کام گزارا ہی بند کر دیا۔ بعد میں یہی تخیل یہوداہ کی پرستش میں داخل ہو گیا اور بتایا گیا کہ چونکہ خدا نے چھ دن میں دُنیا بنائی اور ساتویں دن آرام کیا اسی لئے ساتواں دن جسے سبت کہتے ہیں آرام کا دن ہے۔

اس انجم پرستی کی کچھ اور بھی گڑیاں ہیں جیسے قمری جبینہ کا سات دن کے چار ہفتوں میں تقسیم کیا جانا اور ہر دن کا ایک سیارے سے تعلق ظاہر کرنا۔ غموس کے مطابق کیوان کی پرستش بت کے طور پر کی جاتی تھی۔ (غموس باب ۵-آیت ۲۲-۲۴)

اسی سلسلے میں یہوداہ کا تعلق بجلی اور آگ سے بھی ہو گیا ایک اہل فنی ہے کہ وہ دوسرے سادہ۔ جنگل کی آگ بجلی اور آگ کا خدا اور کوہ آتش نشان اُس کے ارضی مظاہر تھے۔ آخر الذکر سے یہوداہ کا خاص تعلق نظر آتا ہے۔ خروج باب

یتیم ملاحظہ ہوں :-

”اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ دیکھ میں اندھیری برلی میں تجھ پاس آتا ہوں تاکہ لوگ جب میں تجھ سے باتیں کروں، سنیں اور اب تک تیرے مقتدر رہیں اور موسیٰ نے لوگوں کی باتیں خداوند سے کہیں (آیت ۹) اور یوں ہوا کہ تیسرے دن صبح کو بادل گرے اور بجلیاں چلیں اور پہاڑ پر کالی گھٹا آٹری اور ترنار کی آواز نہایت بلند ہوئی، چنانچہ سارے لوگ ڈیروں میں کانپ گئے (آیت ۱۶) اور سب کو سینا پر زبرد بالا دھواں تھا کیونکہ خداوند شعلے میں ہوئے اُس پر اُترا اور تنور کا سادھواں اُس پر سے اُٹھا اور پہاڑ سر اسر مل گیا (آیت ۱۸)

پھر ارشاد ہوتا ہے :-

”اور خداوند کا جلال بنی اسرائیل کی نظریں پہاڑ کی چوٹی پر دکھتی آگ کی مانند دکھائی دیتا تھا“

(خروج باب ۲۴ - آیت ۱۷)

اسی طرح یہوداہ کا جلال کبھی تو ”آگ کے شعلے“ میں ایک جھاڑی پر ظاہر ہوتا ہے (خروج باب ۳ آیت ۲) اور کبھی وہ رات کو اسرائیل کے سامنے ”آگ کے ستون“ کی صورت میں جلتا ہے تاکہ رہنمائی کرے (خروج باب ۱۳ - آیت ۲۲)

**نبد کا ارتقا** میں مذہب میں یہ خاص بات پائی جاتی ہے کہ تمام دیوی دیوتاؤں میں ایک کا مرتبہ زیادہ بلند ہوتا ہے مثلاً یونانیوں میں زیوس (Zeus) - رومیوں میں جوپیٹر (Jupiter) - اسی طرح بنی اسرائیل میں ایک زمانہ یہوداہ اور مختلف مقامات کے بعلیم میں تفوق کے لئے جنگ جاری تھی یہاں تک کہ بالآخر یہوداہ ہی بنی اسرائیل کا واحد معبود بن گیا یہودیوں کا مخصوص خدا تھا اور وہ اُس کی منتخب قوم تھے۔

اگر ہم فلسطین میں یہودیوں کی حالت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ابتدائی صدیوں میں وہ اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے دشمنوں جنگ کر رہے تھے، لیکن کامیابی کی اسی وقت توقع کر سکتے تھے جب اُن کی تعداد تیزی سے بڑھتی رہی اور باہمی اختلافات دور ہو جائیں۔ ”ماں بنتا“ عبرانی عورت کی سب سے بڑی آبروتھی، اس لئے یہ فطری بات تھی کہ تولد کا خدا مقامی معبودوں میں سب سے زیادہ اہم بھا جائے اور یہ یہوداہ تھا۔ جس کی پرستش رفتہ رفتہ توحید کی طرف مایل ہوئی، چنانچہ بعد کو وہ ایک ”غیور خدا“ مانا جانے لگا جو اپنے تھ کسی دوسرے کی عبادت کو رد کر سکتا تھا۔

اس طرح تدریجی طور پر یہوداہ کی پرستش میں گہرائی پیدا ہونے لگی لیکن باوجود اس کے دوسرے معبود بھی موجود تھے اور اس طرح تاران یہوداہ اور پرستاران بعلیم کے درمیان اندرونی جنگ شروع ہو گئی جس میں پرستاران یہوداہ کو کامیابی حاصل ہوئی اور دوسرے بودوں کو محض بے جان بت سمجھا جانے لگا۔

اس کے بعد خالص توحید پرستی پیدا کرنے کے لئے جس چیز کی ضرورت تھی وہ قومی جوش و خروش تھا جو بیرونی حملوں سے پیدا ہوا ب سے پچھلے آستوریوں نے حملہ کیا اور پھر بابل والوں نے اور اس طرح یہودی عرصہ تک مقرر عراق کے زیر اثر رہے۔ ٹھیک اسی زمانہ میں پیغمبروں کا عہد شروع ہوا جنہوں نے لوگوں کو یقین دلایا کہ اگر وہ مصر کی امداد کا خیال چھوڑ دیں اور آستوریہ سے معاہدہ نہ کریں کہ صرف یہوداہ پر بھروسہ کریں تو یہوداہ آستوریہ کی طاقت توڑ دے گا۔

اسی کے ساتھ پیغمبروں نے مذہبی اصلاح شروع کر دی۔ یہوداہ کے متعصب لوگوں کو یقین دلادیا کہ خالص یہوداہ پرستی ہی اسرائیل کے ہر مرض کی دوا ہے۔ ”یشوع“ نے ”بت پرستی“ کے انہدام پر کمر باندھ لی اور دربانوں کو حکم دیا کہ سارے برتن جو نعل اور بیڑے بنائے گئے تھے، ہیکل سے باہر نکال کر جلادئے جائیں (۲ سلطین باب ۲۳ - آیت ۴) اُس نے یروشلم کے گرد و پیش کے دیگر صہوں کو بند کر دیا اور اُن کے بت پرست کاہنوں کو موقوف کر دیا (ایضا آیت ۵) اُس نے یہوداہ کے مندر سے اثیر (یسیرت کو

نکلوا کر جلا دیا (آیت ۶) اُس نے اُن گھوڑوں کو جو یہود کے بادشاہوں نے سورج کی نذر کئے تھے کھلا اور "سورج کے رتھوں کو جلا دیا" (آیت ۱۱) اور اُن مندروں کو مسمار کرنے کے بعد جو کوس، ملکوم اور عسارات کے لئے سلیمان نے بنوائے تھے صرف یہوداہ کی واحد پرستش کو بنی اسرائیل کا عام مذہب بنا دیا۔

لیکن یہ تمام اصلاحات وقتی تھیں کیونکہ مذہبی عصبیت یہودیوں کے ملک کو اپنے طاقتور پڑوسیوں کے مظالم سے نہ بچا سکی۔ بیشع کی اصلاحات کے بیس یا تیس سال کے اندر بابل والوں نے یروشلم پر تین بار قبضہ کیا، یہوداہ کے مندر کو مسمار کیا گیا۔ اُس کے بیش قیمت سامان کو لوٹ لیا گیا اور خاص باشندوں کو قیدی بنا کر بابل لے گئے۔ اور اسی اسیری کے زمانہ میں یہودیوں میں پہلی مرتبہ خالص توحید پرستی کا رواج ہوا اور انھیں یقین ہو گیا کہ یہ یہوداہ سے بے اعتنائی برتنے کا نتیجہ تھا کہ انھیں یہ تکلیفیں سہنا پڑیں اس لئے وہ اسیری میں پہلے سے زیادہ اُس معبود کو ماننے لگے جو اُن کے قومی اتحاد اور قومی وجود کا منظر تھا۔ دو پشتوں کے بعد وہ اپنے ملک کو واپس آئے۔ یہ راسخ عقیدہ لے کر کُرّان کی تمام تر خوشی کا انحصار اخلاقی صفائی پر ہے۔

**یہودی پیغمبر اور توحید** — حضرت موسیٰ کے زمانہ (۱۳۰۰ ق۔ م) سے لے کر ایلیاہ نبی کے زمانہ (تقریباً ۸۵۰ ق۔ م) تک یہودی مذہب صحیح معنوں میں توحید نہ تھا۔ وہ موسیٰ کے خدا کی پرستش کرتے تھے لیکن دوسرے دیوتاؤں کے منکر نہ تھے۔ چنانچہ سلیمان نے یہوداہ کے مندر کے علاوہ یروشلم میں بنی عمون کے معبود مویخ اور موآبیوں کے خیموش کے مندر بھی بنوائے۔ اہاب کے زمانہ میں جس نے شمالی ریاست پر ۸۴۶ ق۔ م سے ۸۴۲ ق۔ م تک حکومت کی۔ یہوداہ کی پرستش پر بعل پرستی غالب آگئی جو معبود کا معبود تھا جہاں سے اہاب کی بیوی یزہیل آئی تھی۔ ایلیاہ بڑے نبیوں کے پیشرو تھے۔ انھوں نے بعل پرستی کی مخالفت کی اور یہ تعلیم دی کہ یہوداہ ہی واحد خدا ہے اس کے معنی تھے کہ اُس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔

ایلیاہ کے زمانہ کے تقریباً سو سال بعد سے یہودی پیغمبروں کا زمانہ شروع ہوتا ہے جن میں عموں (۶۰ ق۔ م) یوشع (۵۰ ق۔ م) یسعیاہ (۴۴۰ - ۴۰۰ ق۔ م) اور میکاہ (۶۲۶ - ۶۸۰ ق۔ م) نے اُس کا عظیم کی تجدید کی جسے ایلیاہ اور یسعیاہ نے شروع کیا تھا اور یہوداہ کو اسرائیل کا واحد خدا بنایا۔

**خدا کی عظمت اور انسان** یسعیاہ نبی نے خدا کی عظمت اور اُس کی قدرت کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:-

"کس نے پانیوں کو اپنے ہاتھ کے چلو سے ناپا اور آسمان کو بالشت سے پیمائش کیا اور زمین کی گرد کو پیمانے میں بھرا۔ اور پہاڑوں کو پٹھوں میں ڈال کے وزن کیا اور شیلوں کو ترازو میں تولی؟ کس نے خداوند کی روح کو انداز کیا ہے۔۔۔۔۔ دیکھ تو میں ڈول کی ایک بوند کے مانند ہیں اور پڑے کی مہمیں گرد کے مانند گئی جاتی ہیں۔ دیکھ وہ بھری ممالک کو ایک ذرے کی مانند اٹھا لیتا ہے۔ بیتان ایندھن کے لئے کافی نہیں اور اس کے بہائم سوختنی قربانی کے لئے بس نہیں۔ ساری قومیں اُس کے آگے کچھ چیز نہیں بلکہ وہ اُس کے نزدیک بطلات اور ناجیزے بھی حساب میں گترہیں۔ (یسعیاہ باب ۴۰ - آیات ۱۲ - ۱۸)

اس کا مقابلہ زبور ۸ کی ان آیات سے کیجئے:-

"جب میں تیرے آسمانوں پر جو تیری دستکاریاں ہیں دھیان کرتا ہوں اور چاند اور ستاروں پر جو تو نے بنائے تو انسان کیا ہے کہ تو اُس کی یاد کرے اور آدمزاد کیا کہ تو اُس کی خبر لے؟ تو نے اُس کو فرشتوں سے تھوڑا ہی کم کیا اور شان و شوکت کا تاج اُس کے سر پر رکھا ہے تو نے اُس کو اپنے ہاتھ کے

کاموں پر حکومت بخشی تو نے سب کچھ اُس کے قدموں کے نیچے کیا ہے :-

زبور میں خدا کا ذکر ان الفاظ میں ہے :-

”تیری روح سے میں کدھر جاؤں ؟ اور تیری حضور ہی سے میں کہاں بھاؤں ؟ اگر میں آسمان کے اوپر چڑھ جاؤں تو تو وہاں ہے۔ اگر میں باتال میں اپنا بستر بھاؤں تو دیکھ تو وہاں بھی ہے۔ اگر صبح کے پنکھ لے کے میں سمندر کی انتہا میں جا رہا ہوں تو وہاں بھی تیرا تھکے لے چلے گا اور تیرا دہنا ہاتھ مجھے سنبھال لے گا۔ اگر میں کہوں کہ تاریکی تو مجھے چھپائے گی تب رات میرے گرد روشنی ہو جائے گی۔ یقیناً تاریکی تیرے سامنے تیرگی نہیں پیدا کرتی پر رات دن کی مانند روشن ہے تاریکی اور روشنی دونوں یکساں ہیں“ (زبور ۱۳۹-آیات ۱۲-۱۳)

اسی سلسلہ میں اُنھوں نے بعض غلط فہمیوں کا بھی ازالہ کیا اور اُن اعتراضات کا جواب دیا جو یہود و آہ پر کئے جاتے تھے مثلاً کتاب پیدائش میں بتایا گیا تھا کہ خدا نے چھ دن میں تلوین عالم سے فرصت پائی اور ساتویں دن کو مبارک کیا اور انسان کو حکم ہوا کہ وہ چھ دن محنت کرے لیکن ساتویں دن آرام کرے (باب ۲ آیات ۱-۳، خروج باب ۲۰ آیات ۸-۱۱) اس سے بعض لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ کیا خدا نے چھ دن تک بڑی محنت کی تھی کہ جس سے تھک کر ساتویں دن سو گیا ؟ اس کا جواب یسعیاہ نبی نے یوں دیا :-

”کیا تو نے نہیں جانا ؟ کیا تو نے سنا ؟ خداوند سوا بدی خدا ہے زمین کے کناروں کا پیدا کرنے والا۔ وہ تھک نہیں جاتا اور اندر نہیں ہوتا اُس کے فہم کی تمنا نہیں ہوتی وہ تھکے ہوؤں کو زور بخشتا ہے اور ناتوانوں کی توانائی کو زیادہ کرتا ہے“ (باب ۴۸ آیت ۲۸)

اسی طرح اُنھوں نے ثنویت کی بھی تردید کی۔ اہل ایران کے نزدیک دنیا میں دو زبردست قوتیں ہیں ایک تو نور اور نیکی کی قوت اور دوسرے تاریکی اور بدی کی قوت، یہ دونوں قوتیں دنیا کی حکومت کے لئے باہم نبرد آزما رہتی ہیں اور بالآخر قوت خیر کا مہاب ہوگی۔ اس کی تردید میں یسعیاہ نبی خدا کی زبان سے کہلاتے ہیں :-

”میں ہی خداوند ہوں اور کوئی نہیں میرے سوا کوئی خدا نہیں۔۔۔۔۔ میں ہی روشنی بناتا ہوں اور تاریکی پیدا کرتا ہوں۔ میں سلامتی کو بناتا ہوں اور شر کو پیدا کرتا ہوں میں ہی خداوند ان سبھوں کا بنانے والا ہوں“

(یسعیاہ باب ۴۵-آیات ۵-۷)

پیدائشی عالم کے بارے میں یہودیوں کا اعتقاد تھا کہ دنیا خدا کے حکم سے وجود میں آئی۔ یہ وہی چیز ہے جسے مسلمانوں میں **کلام خدا** ”کن فیکون“ کہتے ہیں۔ اسی سلسلے میں بائبل کی بعض آیات قابلِ نقل ہیں :-

”اور خدا نے کہا کہ اجالا ہو اور اجالا ہو گیا۔۔۔۔۔

اور خدا نے کہا کہ پانیوں کے نیچے فضا ہو اور پانیوں کو پانیوں سے جدا کرے۔۔۔۔۔ اور خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے کے پانی ایک جگہ جمع ہوں کہ خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہو گیا“ وغیرہ وغیرہ (پیدائش باب ۱)

”خداوند کے کلام سے آسمان بنے اور اُن کے سارے لشکر اُس کے منہ کے دم سے۔۔۔۔۔ اُس نے کہا اور وہ ہو گیا اُس نے فرمایا اور وہ ہر پڑا ہوا“ (زبور ۳۳-آیات ۶-۹)

”ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا“

(یوحنا کی انجیل باب ۱)

لے اگرچہ زبور، داؤد سے منسوب ہے لیکن اُس کے مزامیر میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جسے یقین کے ساتھ داؤد سے منسوب کیا جاسکے۔

**خدا بحیثیت خالق** یہودیوں میں تکونین عالم کا تخیل غالباً بائبل والوں سے آیا تھا۔ اس کا بائبل میں متعدد مقامات پر ذکر ہے۔ چنانچہ پہلے ہی صحیفے یعنی کتاب پیدائش کی ابتدائی آیتیں ہیں :-

”ابتدا میں خدا نے آسمان کو اور زمین کو پیدا کیا، اور زمین ویران اور سسنان تھی اور گہراؤ کے اہر اندھیرا

تھا اور خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی“ (پیدائش باب ۱، آیات ۱-۲)

شروع میں پانی اور اُس پر خدا کی روح کے جنبش کرنے کا تخیل بہت سے مذہبوں میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کی آیت ہے :-

”وكان عرشه على الماء“ (خدا کا عرش پانی پر ہے) اسی طرح ہندوؤں میں خدا کا ایک نام نارائن ہے جس کے معنی ہیں ”پانی پر حرکت کرنے والا“

یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ زمین نہ صرف پانی سے پیدا ہوئی بلکہ پانی ہی پر قائم ہے چنانچہ زبور میں ارشاد ہوتا ہے :-

”زمین خداوند کی ہے اور اُس کی معموری بھی جہاں اور اُس کے سارے باشندے اُس کے ہیں اس لئے کہ اُس نے

اُس کی بنا پانیوں پر رکھی اور اُسے سیلابوں پر قائم کیا“ (زبور ۲۴-۱ آیات ۱-۲)

خدا دنیا کا خالق ہونے کے باعث اُس کا حکمران بھی ہے۔ عموماً نبی فرماتے ہیں :-

”اُس کی تلاش کی وجہ سے تریا اور جبار ستاروں کو بنا یا ہے جو موت کی پرچھائیں کو جمع کر دیتا اور دن کو نوچری

رات کرتا ہے اور سمندر کے پانیوں کو بلاتا ہے اور اُنھیں روئے زمین پر اُتاتے ہیں، اس کا نام خداوند ہے۔“

(عموس باب ۵-آیت ۸)

اس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ یہودیوں کا قبیلائی معبود یہو وہ کس طرح بعض مفکرین کی کوششوں سے ساری دنیا کا خدا، خالق اور حکمران

بن بیٹھا۔ لیکن باوجود اس کے خدا کے یہودی تخیل میں ایک بہت بڑا نقص ہے (اور وہ تقریباً ہر مذہب میں پایا جاتا ہے) یعنی خدا کو انسانی صورت

اور صفات کا حامل بتایا جاتا ہے۔ اپنے قول کی تائید میں ہم چند آیتیں پیش کرتے ہیں :-

## خدا کی انسانی صورت اور صفات

(۱) خداوند تعالیٰ مہیب ہے۔ وہ تمام زمین کے اوپر بادشاہ عظیم ہے۔ (زبور ۴۴-آیت ۱)

(۲) میں نے خداوند کو اُس کی کرسی پر بیٹھا دیکھا اور سارا آسمانی لشکر اُس کے پاس اُس کے داہنے ہاتھ

اور اُس کے بائیں ہاتھ کھڑا تھا۔ (سلاطین باب ۲۲-آیت ۱۹)

(۳) خداوند آسمان پر سے دیکھتا ہے، وہ سارے بنی آدم پر نگاہ کرتا ہے وہ اپنی سکونت کے مقام سے زمین کے

سب باشندوں کو گنتا ہے۔ (زبور ۳۳-آیات ۱۳-۱۴)

(۴) خداوند کا تخت آسمان پر ہے اُس کی آنکھیں دیکھتی ہیں، اُس کی پلکیں بنی آدم کو آزما تی ہیں (زبور ۱۱-آیت ۴)

آخر میں ہم اُن پیغمبروں کے بارے میں تحقیقات جدید کا خلاصہ پیش کریں گے جو صحیح معنی میں توحید کے علمبردار تھے یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ۔

اگرچہ انھوں نے خدا کا جو تخیل پیش کیا تھا وہ بہت اعلیٰ نہ تھا لیکن بحیثیت توحید کے بانیوں کے اُن کا ذکر ناگزیر ہے۔

یہاں ہمیں ناظرین کی توجہ تالیس (۳۰) ق-م کے اس قول کی طرف مبذول کروں گا کہ ”پانی تمام زمین کو گھیرے ہوئے ہے، زمین ایک تاپید اکنار

سمندر پر تیرتی ہے۔ اصل منظر یہی ہے۔ باقی تمام عناصر اور اجسام پانی کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔“ (ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، داستان دانش، صفحہ ۱۵) اس سے

صاف طور پر یہ بات عیاں ہے کہ یونانی عقیدہ کے مطابق زمین محض جزیرہ تھی جو پانی پر تیرتا ہوا اور پانی سے گھرا ہوا معلوم پڑتا تھا۔

اس سلسلہ میں یسعیاہ باب ۴۴-آیت ۱۸ اور زبور ۱۰۱-آیات ۱-۵ ملاحظہ ہوں۔

**حضرت ابراہیم** یہودی روایت کے مطابق آرمین تارح نامی ایک بُت ساز تھا۔ حضرت ابراہیم انھیں کے بیٹے تھے۔ ایک دن تارح ابراہیم کو دوکان پر بٹھا کر کسی کام سے گیا۔ دوکان پر ایک ضعیف شخص آیا جس نے مٹی کا ایک بت انتخاب کیا اور خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ لڑکے نے پوچھا کہ وہ اُسے خرید کر کیا کرے گا۔ جب لڑکے کو معلوم ہوا کہ وہ اُس کی پرستش کرے گا، تو اُس نے اظہارِ تعجب کیا کہ ایک ایسا بزرگ شخص ایک ایسی شے کی تعظیم کرے گا جو کل ہی بنائی گئی تھی اور ہنوز اُس میں آنسو کی کمری باقی تھی۔ اُس نے بڑھے اور ہر خریدار پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ بت بیکار ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بت بھی نہ بکا اور جب وہ بازار سے ان بتوں کو لے کر لوٹا تو اُسے انھیں مرگ کے کنارے کھڑا کر دیا اور اُن سے پوچھا کہ کیا وہ اُسے کھانا پانی دیں گے اور جب اُسے جواب نہ ملا (اور ملتا بھی کیسے وہ محض لکڑی اور پتھر کے ٹکڑے تھے) تو اُس نے انھیں ٹھوکر مار دی اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈئے۔

بعد ازاں اُس نے اپنے باپ سے پوچھا کہ اُس کے کارخانہ میں سب سے طاقتور بت کون ہے اور جب اُسے یہ بتایا گیا کہ سب سے بڑا بت سب سے طاقتور ہے تو اُس نے اُس کے سوا سب کو توڑ کر چکنا چور کر دیا۔ واپسی پر تارح نے بدحواسی سے پوچھا کہ یہ آفت کس نے برپا کی اس پر ابراہیم نے بڑے بت کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اُس نے سب کو توڑ ڈالا ہے۔ ناراض دوکاندار نے قسم کھا کر کہا کہ یہ جھوٹ ہے اسلئے کہ وہ بت محض پتھر کا ایک ٹکڑا ہے اور وہ یہ کیسے کر سکتا تھا۔ لڑکے نے باپ کی زبان پکڑ لی اور بولا کہ پھر اُن کی پرستش بے کار ہے۔ جب ابراہیم اپنی بدعتوں سے باز نہ آیا تو اُسے عدالت میں پیش کیا گیا۔ وہاں اُس نے مزید فلسفیانہ گفتگو کی۔ بت محض کسی شے کی نقل ہوتے ہیں اس لئے بجائے نقل کے اصل کی عبادت کرنا چاہئے انسان سورج، چاند، ستاروں یا آگ، پانی اور ہوا کی بجائے خود پرستش کیوں کرے اور اُن کے بت کیوں بنائے؟ لیکن وہ بھی امتحان لینے پر مخلوق ثابت ہوئے نہ کہ خالق۔ حضرت ابراہیم کو تمام مناظرِ فطرت کے پیچھے ایک غیر مرئی اور محیط کل خدا کی ذات نظر آئی جس کی پرستش کی طرف انھوں نے لوگوں کو بلایا۔

یہودی ادب میں سب سے پہلے یہ روایت کتابِ جبل میں نظر آتی ہے جو ۱۳۵ ق۔م کے بعد لکھی گئی تھی اور اس کے بعد درآسم میں جو بیشتر حضرت مسیح کے بعد لکھی گئیں۔ یہی یہودی روایت اسلامی روایت کا ماخذ ہے جس کا قرآن و احادیث میں ذکر ہے لیکن تفصیلات میں قدرے اختلاف ہے۔

ذکر۔ یہودی روایت تاریخی لحاظ سے چنداں اہم نہیں۔ خود یہودی اسے غیر مستند مانتے ہیں۔ عہد نامہ عتیق میں اس کی طرف اشارہ بھی نہیں پایا جاتا اس کے دو وجہ ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ عہد نامہ عتیق کے لکھنے والوں کے زمانہ تک یہ روایت گہری نہ گئی تھی اور انھیں اس کا علم نہ تھا اور دوسرے یہ کہ انھوں نے اسے نقل کرنے کے قابل نہ سمجھا ان میں سے اول الذکر صورت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اسی سلسلہ میں آتشِ نمرود کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اسلامی روایت کے مطابق جب حضرت ابراہیم کو اُن کے والد نے شہادہ وقت نمرود بن گش کے حوالہ کر دیا تو اُس نے انھیں آگ میں ڈلوادیا لیکن خدا کے حکم سے آگ بجھ گئی اور وہ بچ گئے۔ اس روایت پر ڈاکٹر سٹڈل نے اپنی کتاب ”ماخذ القرآن“ میں تفصیلی بحث کی ہے جو نگار کے سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۷۷ء) میں شائع ہو چکی ہے یہ روایت محض ایک غلطی سے پیدا ہوئی یعنی کتابِ پیدائش باب ۵ کی آیت ۷ ہے ”میں خداوند ہوں جو تجھے کلدانیوں کے اُسے نکال کر لایا“ جو ناخن نے اُسے اور سمجھ لیا جس کے معنی عبرانی میں نور یا روشنی کے ہیں۔ لہذا اُس نے منقولہ آیت کا ترجمہ کیا ”میں وہ خدا ہوں جس نے تجھے کلدانیوں کی آگ کی بھٹی سے باہر نکالا“ اس طرح یہ تمام قصہ محض ایک لفظ کے غلط معنی کرنے سے پیدا ہو گیا ورنہ اس کی کوئی بنیاد نہ تھی رہی یہ بات کہ سب سے پہلے غلطی جو ناخن نے کی تھی صحیح طور پر نہیں بتایا جاسکتا۔ ممکن ہے اُس نے یہ خیال دوسرے لوگوں سے لیا ہو۔

بہر حال یہودی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد تارح (اسلامی روایت کے آذر) بت ساز تھے اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود اُن کا بت کیا تھا۔ چونکہ ابراہیم کلدانیوں کے اُسے سے ہجرت کر کے آئے تھے اور وہاں نائتر یعنی چاند کے دیوتا کی پرستش کی جاتی تھی

اس لئے تاریخ قمر پرست رہے ہوں گے۔ اب اس چیز کو پیش نظر رکھ کر ان آیات پر غور کیجئے:-

”ابراہیم کا خدا اور خور کا خدا اور ان کے باپ کا خدا ہمارے بیچ میں انصاف کرے“ (پیدائش باب ۳۲-آیت ۳۵)

یہ الفاظ لاطین نے یعقوب سے حاران میں کہے تھے جہاں وہ چودہ سال سے اوپر رہ چکے تھے اور ان سے پہلے جہاں تاریخ اور ابراہیم رہے تھے۔ اب اگر یہ مان لیا جائے کہ ابراہیم موصد تھے تو ان کا خدا ان کے بھائی کا خدا کیسے ہو سکتا تھا مزید برآں ان کے باپ کا جو بت ساز تھا جو ابراہیم کو خدائے واحد کا علم حاران میں اپنے باپ کے مرنے کے بعد ہوا تھا اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا خدا تھا جو ان میں مشترک تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ ان کا ”خاندانی معبود“ ہی ہو سکتا تھا یعنی ترائیم۔ علاوہ ازیں اس زمانہ تک ”توحید“ کا علم بھی لوگوں کو نہ تھا اس طرح ابراہیم کا خدا، خاندانی معبود تھا جس کا شروع میں کوئی نام بھی نہ تھا اور عرصہ تک وہ ”ابراہیم، اسحق اور یعقوب کے خدا“ کے نام سے مشہور رہا۔ جیسا کہ خروج کی ان آیات سے ظاہر ہے:-

”میں فدودہ ہوں اور میں نے ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب پر خدائے قادر مطلق کے نام سے اپنے تئیں ظاہر

کیا اور یہوداہ کے نام سے ان پر ظاہر ہوا“ (خروج باب ۶-آیت ۳)

سر لیو نارد اولی لکھتے ہیں کہ:- ”حضرت ابراہیم توحید پرست نہ تھے بلکہ ”ایک بت کے پرستار“ تھے اور اسی ایک بت کی پوجا کرنے لگے چلے گئے توحید پرستی کی صورت اختیار کر لی۔“

**حضرت موسیٰ** مذہبی دنیا میں حضرت موسیٰ کا مقام بہت بلند ہے کیونکہ ان کے مشہور احکام عشرہ نے یہودیوں کو بت پرستی سے باز رکھے اور ان کی اخلاقی حالت کو درست کرنے میں بڑا کام کیا۔

حضرت موسیٰ کا زمانہ کوئی ۱۵۰۰ ق۔ م جتنا ہے اور کوئی ۱۰۰۰ ق۔ م۔ عہد نامہ قدیم کی پہلی پانچ کتابیں (Pentateuch) کہلاتی ہیں روایتاً حضرت موسیٰ سے منسوب ہیں لیکن تحقیقات جدیدہ کے مطابق انھیں ۵۰ ق۔ م میں عزرا اور نمبیہ نے مرتب و مدون کیا تھا بعض علماء کو حضرت موسیٰ کے تاریخی وجود کے بارے میں شبہ ہے، ان کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ یہودیوں کو مصر کی غلامی سے نجات دلا کر کنعان میں لائے لیکن تاریخ سے یہودیوں کا مصر میں بحیثیت قیدی رہنا ثابت نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں حضرت موسیٰ کی ابتدائی زندگی بھی پردہ خفا میں ہے۔ ان کے بچپن کا افسانہ بابل کے بادشاہ سارگون کی حکایت سے ملتا جلتا ہے۔ خروج باب ۲ میں ہم پڑھتے ہیں:-

”اور جب وہ (موسیٰ کی ماں) اُسے آگے کو نہ چھپا سکی تو اُس نے سرکندوں کا ایک ٹوکرا بنایا اور اُس پر لاس

اور مال لگا یا اور لڑکے کو اُس میں رکھا اور اُس نے اُسے دریا کے کنارے پر چھوڑ دیا“ (آیت ۳)

اسی کے ساتھ سارگون کے متعلق کینیڈینک کی تختیوں کی تحریروں کو دیکھیے:-

” (۱) میں سارگون ہوں، طاقتور بادشاہ، اکاد کا بادشاہ۔ (۲) میری ماں ایک شہزادی تھی، اپنے باپ کو میں نہیں جانتا، میرے باپ کا ایک بھائی حکومت کرتا تھا۔ (۳) شہزادہ پیرن میں جو رہا اُسے فرات کے کنارے ہے۔ (۴) میری ماں یعنی شہزادی حامدہ موئی، بڑی مشکل سے اُس نے مجھے جنم دیا۔ (۵) اُس نے مجھے سینے کے ایک صندوق میں رکھا اور اُس نے میرے جانے کے راستے کو آں سے بند کیا۔ (۶) اُس نے مجھے دریا میں ڈال دیا جس نے مجھے ڈوبایا نہیں۔ (۷) دریا مجھے بہا کر آئی پانی لے جانے والے کے پاس لے گیا۔ (۸) آئی پانی لے جانے والے نے ترس لھا کر مجھے اٹھا لیا۔ وغیرہ وغیرہ۔“

سارگون کا زمانہ حضرت موسیٰ سے بہت پہلے تھا ۵۰ ق۔ م، اس سے بعض عالموں نے نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت موسیٰ کا افسانہ طولیہ سارگون کی حکایت سے ماخوذ ہے جسے عزرا نے موسیٰ سے چسپاں کر دیا اور یہ عزرا نے اُسے بابل کی اسیری کے دوران میں منسا ہوا ہے۔

۸۰۰ ق۔ م میں بابل کا بادشاہ بنو کر نیر (بخت نصر) نے فلسطین پر حملہ کیا اور یروشلم کو ساراک کے وہاں کے باشندوں کو قیدی بن کر لے کر حکومت کو لے گیا، ادب کو بھی ضائع کر دیا۔ (تقریباً نوٹ صفحہ ۱۰۱ پر ملاحظہ فرمائیے)

جدید تحقیقات کے مطابق دنیا کی مختلف اقوام اپنے ”ہیرو“ کی پیدائش اسی طور پر بیان کرتی ہیں۔ یونانی، رومی اور عہد بائبل میں بھی موسیٰ اور سارگون کی پیدائش سے ملنے جلتے افسانے بعض لوگوں کے بارے میں بیان کئے جاتے ہیں جو ان روایات کے مشترک لاصل ہونے کی بنا پر ہے اور یا پھر اس لئے کہ بعض اقوام نے دوسروں کے دیکھا دیکھی اُن سے ملحق حلقی روایات گھڑ لی ہیں۔ بہر حال واقعی صورت کیا ہے اس کا بتانا ہمارے لئے بہت مشکل ہے۔

**حضرت موسیٰ کے قوانین** حضرت موسیٰ کی ابتدائی زندگی کے علاوہ اُن کے مشہور قوانین پر بھی بائبل قوانین کا اثر نمایاں ہے۔ بائبل اس میں ایک تصویر بھی ہے۔ جس میں حمورابی کو سورج دیوتا سے مجموعہ قوانین لیتے ہوئے دکھایا ہے۔ یہ قوانین سامی زبان میں ہیں (حضرت موسیٰ کی زبان بھی سامی تھی) اور حضرت موسیٰ کے قوانین سے ملنے جلتے ہیں۔ یقیناً موسیٰ نے ان قوانین سے استفادہ کیا ہوگا۔

بائبل میں اسیری کے دوران میں یہودی لوگ ایران کے زردشتی مذہب سے بھی واقف ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ خود حضرت موسیٰ کی کہانی کے بعض حصے زردشتی مذہب کے اثر کو ظاہر کرتے ہیں مثلاً بائبل میں ہم پڑھتے ہیں کہ ”موسیٰ خدا پاس چڑھا اور خداوند نے اُسے پہاڑ سے بلایا اور کہا کہ تم یعقوب کے خاندان سے یوں کہو اور بنی اسرائیل سے یوں بیان کیجیو“ (خروج باب ۱۹-آیت ۳) اس طرح زند آدیشا میں آہورا مزدا، زردشت سے ”مقدس سوالوں کے پہاڑ پر بات کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ (فرگرد ۱۲-۱۹)

برخلاف اُن عالموں کے جو افسانہ موسیٰ میں بائبل و ایرانی عناصر دیکھتے ہیں مشہور ماہر نفسیات سنگنڈ فرایڈ نے اپنی کتاب موسیٰ اور توحید (Moses & Monotheism) میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت موسیٰ یہودی نہ تھے بلکہ مصری تھے اور وہ فرعون مصر خناتن کے مذہب کے پیرو تھے جو توحید کا اصلی بانی تھا، اپنے قول کے ثبوت میں اُنھوں نے جو بحث کی ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) حضرت موسیٰ کے یہودی ہونے کا ثبوت اُن کا نام ہے جو یونانی میں مونیز (Moses) عبرانی میں موسے اور عربی میں موسیٰ ہے اگرچہ موسیٰ کے معنی نامعلوم ہیں لیکن ایک پرانا خیال ہے کہ یہ لفظ قدیم مصری زبان کے لفظ میتس یا موس سے نکلا ہے جس کے معنی بچے کے ہیں اور یہ لفظ متعدد فرعون مصر کے ناموں میں پایا جاتا ہے جیسے تھوتھ موس (یا تھوتھ میتس) راموس (یا رامیتس) جن کے معنی ہیں ”را کا بیٹا“ (یا راکا پیدا کیا ہوا) یا ”تھوتھ کا بیٹا“ (یا تھوتھ کا پیدا کیا ہوا)۔ موسیٰ پرانا نام نہیں ہے اُس کا شروع کا حصہ لوگوں نے بھلا دیا اور وہ آخری حصے کے نام سے مشہور ہو گئے۔

(۲) اگرچہ آئین پرستی کے بارے میں ہماری معلومات اتنی مکمل نہیں ہیں کہ اُس کا یہودی مذہب سے تفصیلی موازنہ کیا جاسکے جو کافی تبدیلیوں کے بعد انتہائی ترقی یافتہ صورت میں نظر آتا ہے۔ لیکن کسی حد تک ایسا مواد ضرور موجود ہے کہ جس سے آئین پرستی اور یہودیوں کے قدیم مذہب کی مشابہتوں کا پتہ چلتا ہے مثلاً آئین یا آتش کا مقابلہ سریانی کے ایڈونائی (ایڈونیس) سے کیا جاسکتا ہے جسے یہودیوں نے یہوواہ کے نام کے طور پر اختیار کر لیا۔ مصر میں یہ نام غالباً سریانی شہزادیوں کے ذریعہ پہنچا تھا جن کی شادیاں مصر کے شاہی گھرانے میں ہوئی تھیں اور غالباً خود اخناتن کی ملکہ نفرتیتی ایک سریانی شہزادی تھی۔

(۳) اپنے معبود کے عالمی تخیل میں اخناتن نے لائبریت پسندی کا بھی اضافہ کیا تھا وہ کہتا ہے کہ ”اے تو، واحد خدا! تیرے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں“ اُس کے حکم کے بموجب دوسرے دیوتاؤں کے معبد بند کر دیئے گئے اور اُن کی پرستش پر روک لگا دی گئی۔ یہودی مذہب اس سے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۰۰) اس کے ایک صدی بعد فارس کے بادشاہ سائرس نے بائبل سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور یہودیوں کو یروشلم واپس جانے کی اجازت دیدی اس واپسی کے بعد عزرا اور نحسیا نے ۵۰ ق۔ م عہد نامہ قدیم کی پہلی پانچ کتابوں کی ترتیب و تدوین کی، جنھیں غلطی سے حضرت موسیٰ سے منسوب کیا جاتا ہے۔

لے فرایڈ نے اپنی تحقیقات میں (E. Meyer) اور (E. Sellan) کی تحقیقات سے استفادہ کیا ہے۔



## عیسوی مذہب

عیسائی مذہب کے بارے میں ہماری معلومات کا خاص ذریعہ ”عہد نامہ جدید“ ہے جسے ”عہد نامہ قدیم“ کی طرح الہامی مانا جاتا ہے۔ (ان دونوں کو ملا کر بائبل یا کتاب مقدس کہتے ہیں) لیکن باخبر حضرات جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ یا اُن کے براہ راست شاگردوں میں سے کسی نے کوئی تحریر نہیں چھوڑی تھی اور اسی لئے بائبل میں جا بجا تضاد پایا جاتا ہے۔

اگرچہ نیا عہد نامہ ۲۷ کتابوں پر مشتمل ہے لیکن ان میں چار انجیلیں خاص ہیں جو حضرت عیسیٰ کے چار رسولوں متی، مرقس، لوقا اور یوحنا سے منسوب کی جاتی ہیں یہ سنہ ۷۰ء اور سنہ ۸۰ء کے درمیان لکھی گئی تھیں۔ لیکن سب سے پہلے جس شخص نے ان کا ذکر کیا ہے وہ گال کا بشپ ایرینی (Irenaeus) تھا جس کا زمانہ ۱۸۰ء تا ۲۰۰ء عیسوی ہے۔

انجیلوں میں حضرت عیسیٰ کی جو زندگی بتائی گئی ہے وہ غیر مستند ہے اور سچ تو یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے صحیح سوانح لکھے ہی نہیں جاسکتے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک یہودی پیغمبر تھے جنہوں نے رائج الوقت مذہب سے انحراف کیا اور انہیں صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ انجیلوں میں عیسیٰ کے جو سوانح حیات پیش کئے گئے ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے:-

لفظ ”عیسیٰ“ عبرانی، یسوع کی عربی صورت ہے جس کے معنی ہیں ”نجات دلانے والا“۔ یسوع ہی سے لفظ جیسس (Jesus) نکلا ہے جو یونانی، لاطینی اور انگریزی زبانوں میں پایا جاتا ہے۔

وہ یہودیہ کے شہر بیت لحم میں کنواری مریم سے پیدا ہوئے تھے، جن کا عقد یوسف نامی بڑھئی سے ہو چکا تھا لیکن قربت کی نوبت نہ آئی تھی۔ اُس کا وطن صوبہ گلیل کا شہر ناصرہ تھا جو یروشلم سے پچاس میل کے فاصلے پر تھا۔ عیسیٰ کی تعلیم گھر ہی میں معمولی طریقے سے ہوئی تھی، نہ بچپن ہی سے وہ مذہبی معاملات میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ تیس سال کی عمر میں انھوں نے اپنے نبی اور مسیح ہونے کا اعلان کیا اور اپنے شاگردوں میں سے بارہ حواری چن کر چاروں طرف اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے روانہ کئے۔ وہ لوگوں سے یہ کہتے پھرتے تھے کہ جس مسیح (یعنی مسیح) کیا ہوا، منجی و شفیع) کی وہ موتی کے زمانہ سے امید کرتے چلے آ رہے تھے اور جس کی دانیال نے اپنے مختصر صحیفے میں پیشین گوئی کی تھی وہ گیا ہے۔

ہر چند اُن کے ماننے والوں کی تعداد بہت جلد بڑھ گئی لیکن اُنکے دشمن بھی بہت سے پیدا ہو گئے، خصوصاً یروشلم کے وہ مذہبی رہنما جو عیسیٰ کہلاتے تھے۔ وہ لوگوں کو اُسی مذہب کی طرف لوٹانا چاہتے تھے جو یہودیوں میں اُن کے بائبل میں اسیر ہونے سے پہلے رائج تھا۔ اُن کا دوزخ بشت پر اعتقاد نہ تھا اور وہ تمام اُن تعلیمات کے مخالف تھے جو شریعت موسوی سے مختلف تھیں۔ بر خلاف اس کے عیسیٰ نے وقتاً فوقتاً بہت نا اسی باتیں کہیں تھیں جو فریسیوں کے نزدیک صریحاً بدعت یا کفر تھیں، یہی نہیں بلکہ عیسیٰ نے اُن کے حقوق میں بھی دخل اندازی کی تھی نہ یوں ہے کہ:-

جب حضرت عیسیٰ تیس سال کے تھے تو وہ یروشلم گئے تاکہ عید فصح کے تہوار میں شریک ہوں لیکن بیت المقدس میں انھوں نے جو منظر دیکھا اُس کی تاب نہ لاسکے، یعنی خدا کے مقدس گھر میں صرافوں کی چوکیاں کبھی تھیں جہاں روپیہ کا لین دین ہو رہا تھا علاوہ ازیں کبوتر اور بچا بیچنے والوں کا اڑدھام تھا۔ انھوں نے غضب ناک ہو کر ایک کوڑا اٹھا کر اٹھا لیا اور جانوروں کو مندر کے صحن سے بھگا دیا اور

رافوں کی چوکیاں آٹھ دیں اور تاجروں سے ڈانٹ کر کہا کہ ”یہاں سے یہ سب لے جاؤ۔ خدا کے گھر کو ہزار بناؤ۔“  
اس واقعہ سے بیت المقدس کے کاہن اذ حدنا رض ہوئے کیونکہ انھیں کی اجازت سے مندر کے اندر خرید و فروخت ہوا کرتی تھی  
۳۳ سال کی عمر میں عیسیٰ تیسری بار یروشلم عید فصح میں شرکت کے لئے گئے لیکن اب وہ اکیلے نہ تھے بلکہ ماننے والوں کا ایک بڑا گروہ لے کر  
ساتھ تھا۔

اب کی بار پھر عیسیٰ کی آنکھوں نے وہی منظر دیکھا اور وہی کیا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ فریسی اور سردار کاہن، عیسیٰ کی جرأت پر  
دل ہی دل میں برہم ہوئے۔ جب تک وہ تنہا تھے تو انھیں کوئی خوف نہ تھا لیکن اب ان کے ساتھ ایک جماعت تھی لہذا وہ ان کی طاقت  
اور اثر سے ڈرنے لگے اور خفیہ طور پر جمع ہوئے تاکہ کوئی ایسی تدبیر ڈھونڈ سکیں کہ عیسیٰ اپنی تعلیم سے باز آجائیں اور لوگ ان کا ساتھ  
چھوڑ دیں۔

اس وقت ان کے بارہ شاگردوں میں سے ایک نے جس کا نام یہوداہ اسکریوٹی تھا سردار کاہن کے پاس جا کر کہا کہ ”اگر میں نے  
تمہارے حوالے کر دوں تو مجھے کیا دو گے۔“ انھوں نے اسے تیس روپے قتل کر دئے اور وہ اس وقت سے عیسیٰ کو گرفتار کرانے کا موقع  
ڈھونڈنے لگا۔

رات کو عیسیٰ شہر سے باہر ایک باغ میں گئے جہے گشتیہ کہتے تھے، ان کے کل شاگرد ساتھ تھے، بہز یہوداہ بن شمعون کے جو سر شام ہی  
جدا ہو گیا تھا۔ چونکہ سب تھکے ہوئے تھے لہذا جلد ہی سو گئے اسی رات کے وقت یہوداہ کی رہبری میں یہ لوگ مسیح کو گرفتار کرنے کے لئے چلے۔  
ان کا شور راس کریمسج کے شاگرد فرار ہو گئے اور وہ گرفتار کر کے سردار کاہن کے گھر لے جائے گئے جہاں وہ سرے کاہن جمع ہو گئے تھے۔

ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ:- ”ہم نے اسے یہ کہتے سنا ہے کہ بیت المقدس کو جو ہاتھ سے بنا ہے ڈھاؤں گا اور تین دن میں دوسرا  
بناؤں گا جو ہاتھ سے نہ بنا ہو۔“ علاوہ ازیں خود عیسیٰ نے سردار کاہن سے بحث کے دوران میں کہا کہ ”تم ابن آدم کو قادر مطلق کی جانتے  
طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں کے ساتھ آتے دیکھو گے۔“ سردار کاہن نے اپنے کپڑے پھاڑ کے کہا ”اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت  
رہی؟ تم نے یہ کھڑنا تمہاری کیا رائے ہے؟“ ان سب نے فتویٰ دیا کہ وہ قتل کے لائق ہے۔ تب بعض ان پر تنقید کرنے لگے اور ان کا  
منہ ڈھانپنے اور ان کو گتے مارنے لگے۔۔۔ اور پیادوں نے انھیں طانچے مار مار کے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ (مرقس باب ۱۴، آیات ۵۳-۶۵)  
دوسرے دن عیسیٰ کو نسطس پلاطس (Pontius Pilate) کی عدالت میں پیش کیا گیا جو یروشلم کا رومی گورنر  
تھا۔ اسے یہودیوں کے مذہبی جھگڑوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے عیسیٰ سے جرح کی تاکہ معلوم کرے کہ وہ ان سرفراؤں میں سے  
تو نہیں ہے جو لوگوں کو فلسطین کی رومی حکومت کے خلاف اُسیارہتے ہیں اور اسے معلوم ہوا کہ وہ باغی نہ تھے۔ وہ انھیں چھوڑ دینا  
چاہتے تھے لیکن عیسیٰ کے مخالفین نے دوسرے الزامات پیش کر دئے۔

اس زمانہ کا یہ دستور تھا کہ جید کے موقع پر گورنر و قیدیوں میں سے ایک کو جس کو لوگ چاہتے آزاد کر دیتا تھا۔ پلاطس کے  
سامنے وہ تہیدی تھے یسوع ناصری (عیسیٰ) اور یسوع برابا جس نے رومی سلطنت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا لیکن گرفتار  
کر لیا گیا تھا اور موت کی سزا مقرر ہوئی تھی۔ پلاطس نے عدالت میں سرداروں سے پوچھا کہ تم کس کی رہائی چاہتے ہو۔ انھوں نے  
جواب دیا ”برابا“ کی!

برابا کو آزاد کر دیا گیا اور عیسیٰ کو سہا ہیوں کے حوالہ کر دیا گیا جو انھیں گُلگتھا (یعنی ”کھوپڑی کی جگہ“) نامی پہاڑی پر لے گئے اور  
صلیب پر چڑھا دیا۔ کھنڈوں صلیب پر چڑھے رہنے کے بعد عیسیٰ کا درد ناقابل برداشت ہو گیا اور آخر کار وہ مر گئے۔

”جب شام ہوئی تو یوسف نامی امتیہ کا ایک دوستانہ شخص آیا جو خود بھی یسوع کا شاگرد تھا اس نے یسوع کے پاس جا کر  
لاش مانگی۔ اس پر پلاطس نے دس دینے کا حکم دیا اور یوسف نے لاش کو لے کر صاف مہین چادر میں لپیٹا اور نئی قبر میں رکھ دیا جو آج

چٹان میں کھدوائی تھی اور ایک بڑا پتھر قر کے منہ پر لڑھکاکے چلا گیا۔ (متی باب ۲۷ - آیات ۵۴ - ۶۰)  
اس کے بعد وہ پتھر اپنی جگہ سے ہٹا ہوا پایا گیا اور مسیح کی لاش غائب تھی۔ لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ عیسیٰ مرکز زندہ ہو گئے اور آسمان پر جا کر خدا کے دائیں جانب جا بیٹھے۔ یہ ہے عیسیٰ کا افسانہ حیات جو بائبل میں مذکور ہے۔

**عیسائیت کی تاریخ** عیسیٰ کے مصلوب ہونے کے بعد اس مذہب کے ماننے والوں میں وقتی طور پر انتشار پیدا ہو گیا لیکن اس کے بعد تیس سال کے اندر ہی اندر عیسائی مذہب یورپ کے مختلف حصوں میں پھیل گیا۔

عیسائی مذہب کی ترقی کے تین اسباب تھے (۱) اُس کی بعض خوبیاں جو اُس زمانہ کے مذاہب میں پائی جاتی تھیں۔ (۲) عیسائیوں کا جوش و خروش اور پاکیزہ زندگی جو انھیں اُس زمانہ کے عیاشی میں مبتلا لوگوں سے ممتاز کرتی تھی۔ (۳) تبلیغی کوششیں خصوصاً پال (۱) سال) کی کاوشیں جو غالباً دنیا کا سب سے بڑا مبلغ تھا۔

**دیگر مذاہب کے اثرات** جب عیسائی مذہب فلسطین سے نکل کر یورپی ممالک میں پھیلا تو اُس وقت بحیرہ روم کے آس پاس کے ممالک میں آفتاب پرستی کا رواج تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آفتاب پرستی کے بیشتر عناصر عیسوی مذہب میں داخل ہو گئے۔ حضرت عیسیٰ کی زندگی کا سب سے عجیب واقعہ اُن کا کنواری مریم کے بطن سے پیدا ہونا اور مرکز زندہ ہونا ہے۔ لیکن یہ عقیدہ عیسوی مذہب میں دوسرے مذاہب سے آیا ہے اور آفتاب کے عروج و زوال سے تعلق رکھتا ہے۔ عیسوی مذہب کے آغاز سے پہلے مختلف ممالک میں ایسے دیوتا کی کہانیاں رائج تھیں جو دوشیزاؤں کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں، دشمن انھیں قتل کر دیتے ہیں اور وہ مرکز زندہ ہو جاتے ہیں۔ یہ مرکز زندہ ہونا دیوتا فی الحقیقت آفتاب تھا۔ جب وہ خط استوا کے جانب جنوب یا پتال لوک کو جاتا تو موسم سرما یا خزاں کا آغاز ہوتا اور یہ گویا اُس کا موت تھی۔ جب وہ خط استوا سے شمال کی طرف جاتا اور گرمی یا فصل بہار آتی تو سمجھتے کہ وہ مرکز زندہ ہو گیا ہے ان دیوتاؤں کے نام مختلف ممالک میں مختلف تھے۔

انھیں قصوں سے متاثر ہو کر حضرت عیسیٰ کا کنواری مریم سے پیدا ہونا اور مرکز زندہ ہونا بیان کیا جانے لگا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ عیساٰ میں مریم کی تصویریں بنائی جاتی ہیں کہ وہ گود میں ایک خوبصورت بچہ لٹے ہوئے ہے۔ یہ صریحاً مصر کی آئی سرس دیوی کی نقل ہے۔ ہورس کو گود میں لٹے ہوئے دکھایا جاتا تھا۔ عیسائیوں میں اس تصویر کا سنہ عیسوی کی پہلی تین چار صدیوں میں پتہ نہیں چلتا۔ غالباً اس بنیاد اسکندریہ کے کلیسا نے پانچویں صدی میں ڈالی تھی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ مرنے کے تیسرے دن ۱۲ مارچ کو بروز اتوار زندہ ہو گئے تھے۔ اس احوالے ثانیہ کی خوشی میں عیسوا ۲۱ مارچ یا اُس کے بعد کے پہلے اتوار کو ایٹر کا تہوار مناتے ہیں جس میں رشتہ داروں اور دوستوں کو رنگے ہوئے انڈے اور کیک بھیجے جاتے ہیں دراصل یہ رسم انیکلوکسیس قوم میں بہار کی دیوی ایٹر کی پرستش کے لئے مخصوص تھی۔ لیکن یہ یہ وہی دیوی ہے جو سامی اقوام میں ایٹر یا استارتہ کہلاتی تھی جس کی پرستش فنیقیوں کے ذریعہ سے انگلستان پہنچی ہوگی۔ ایٹر کو مادر زمین مانا جاتا تھا اور انڈے کی مشابہت سے ظاہر ہے۔

عیسائیوں کا مشہور تہوار کرسمس ۲۵ دسمبر کو منایا جاتا ہے کہتے ہیں یہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کی تاریخ ہے لیکن عیسیٰ سے پیشتر متو مرکز زندہ ہونے والے دیوتاؤں کی پیدائش بھی اسی تاریخ میں ظاہر کی جاتی تھی۔

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: حضرت عیسیٰ علیہ السلام "مجموعہ استفسار و جواب جلد دوم" یا "من ویزاں جلد دوم" از مولانا نیاز فتحپوری

مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں مجموعہ استفسار و جواب جلد سوم" یا "من ویزاں جلد سوم" از مولانا نیاز فتحپوری

پادری شتاق احمد صاحب پال نے بھی اپنی کتاب "میں نے کیوں اسلام قبول کیا" میں اس موضوع پر بڑی دلچسپ بحث کی ہے۔

حضرت عیسیٰ کی زندگی میں ایک دوسری آفتابی صفت یہ ہے کہ اُن کا چرخ چہارم پر رہنا بیان کیا جاتا ہے اور فیثاغورث کے نظام ہیئت کے مطابق آفتاب کی جگہ چوتھا آسمان ہے۔

حضرت عیسیٰ کے بارہ شاگرد ظاہر کرنا بھی سال کے بارہ مہینوں کے لحاظ سے ہے عیسیٰ سے پیشتر متھرا کے بھی بارہ شاگرد بیان کئے جاتے تھے اور یونان کا ستر قریب بھی بارہ بڑے کام انجام دیتا ہے۔

اس سے میں فطن نے یہ فرمان جاری کیا کہ آئندہ سے سبت بجائے ہفتے کے اتوار کو منایا جائے کیونکہ ہفتہ کو یہودی سبت مناتے تھے اور وہ یہودیوں کے کل عراسم سے نفرت کرتا تھا، اُس نے کہا ”یہ دن آفتاب ہمارے خداوند کا دن ہے“ اُس وقت سے کلیسا نے بھی اس کو تسلیم کر لیا اور یہ بات بھلا دی کہ غیر عیسائی اقوام میں یہ آفتاب پرستی کا دل تھا۔

مشہور ہے کہ عیسیا جبل کا مقدس نشان صلیب قطنین اعظم کی اختراع ہے جسے اُس نے عالم خواب میں آسمان پر دیکھا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ صلیب کا نشان مسیح سے صدیوں پیشتر مصر، کلدانیہ، افریقیہ، یونان، روم، آئرلینڈ حتیٰ کہ امریکہ میں زندگی کی علامت کے طور پر متعلق تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ صلیب کا نشان تناسلی اعضا کی مرموز علامت تھا۔

گر جاکے تعمیر بھی سورج دیوتا اپالو کے مندر کے نمونے پر کی جاتی ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت آئسٹر یعنی مذبح کا گوشہ مشرق میں ہونا علاوہ انہیں رومن کیتھولک گرجوں میں کم عمر کے بچوں کا گیت گانے کے لئے رکھا جاتا، تارک لینڈیا مرد اور عورت (Monks & Nuns) کا رہنا بھی اپالو دیوتا کے مندروں کی یاد دلاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جس طرح اپالو کے راہب اپنے سر کے بالوں کو قرص آفتاب کی شکل میں کٹاتے تھے اُس کی شکل آج بھی عیسائی راہب اور کیتھولک پادری کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ جسے آج کل عیسائی مذہب کہا جاتا ہے اُس میں کافی آفتاب پرستی پنہاں ہے۔ ان تفصیلات کو پیش کرنے کے بعد اب ہم اُن عقاید کا ذکر کرتے ہیں جو عیسائیوں میں خدا اور عیسیٰ سے متعلق پائے جاتے ہیں۔

**کنواری پیدائش** ہوئے۔ اس طرح کی پیدائش کا عقیدہ عیسیٰ سے پہلے بھی مختلف اقوام میں پایا جاتا تھا۔ قدیم مصریوں کا اعتقاد تھا کہ اُن کی رانہاں دیوتاؤں کے ذریعہ حاملہ ہوتی تھیں۔ اہل یونان و روم بھی یہی سمجھتے تھے کہ خداوند زئوس انسانی عورتوں سے مباشرت کرتا ہے۔

(Diogenes Laertius) نے ”حیات افلاطون“ میں لکھا ہے کہ اس کا بھتیجا اس بات کا مدعی تھا کہ افلاطون کی ماں ایک دیوتا سے حاملہ ہوئی تھی بعد کے بودھی ادب میں گوتم بدھ کی ماں کے بارے میں بھی یہی بات بتائی گئی ہے۔ ان تمام باتوں سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ممکن ہے انھیں کی نقل میں حضرت عیسیٰ کے پیدا ہونے کا قصہ بھی گھڑ لیا گیا ہو۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ عہد نامہ قدیم کا یونانی میں ترجمہ کرتے وقت مہعباہ باب ۷۔ آیت ۱۴ میں ”لوکی“ یا ”نوجوان عورت“ کے لئے عبرانی لفظ کا ترجمہ ”کنواری“ کر دیا گیا۔ اور پھر یہی غلطی عہد نامہ جدید میں بھی داخل ہو گئی۔

تاریخ یہود کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیوں تک ایرانیوں، یونانیوں اور دیگر اقوام سے مغلوب رہنے کے بعد ان میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوا اور انھیں یہوداہ کے وہ وعدے یاد آئے جو مختلف پیغمبروں کی تحریر

۱۔ یہی سن ڈے (Sunday) ہندی اتوار مخفف ہے ”آوتیہ وار“ کا دونوں کے معنی ہیں سورج کا دن۔

۲۔ ”ترغیبات مبنی“ مصنفہ نیاز گنجپوری (مطبوعہ ۱۹۱۷ء) صفحات ۶۹ - ۷۰

۳۔ کہا جاتا ہے کہ جرجیل آرمون اسکندر اعظم کی ماں اولمپاس سے سانپ کے بھیس میں ملاتا تھا اور اس مواصلت سے سکندہ پیدا ہوا (ترغیبات مبنی ص ۷۰)

سے اُن تک پہنچتے تھے اور وہ غیبی امداد کی امید کرنے لگے !  
 بنی اسرائیل اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ یہوداہ کی برگزیدہ قوم تھے جو واحد سچا خدا تھا اور اس بات کی توقع کرنے لگے کہ  
 یہوداہ کی فوق الفطرت قوت سے اُن کے اجداد کی حکومت از سر نو قائم ہو جائے گی اور یہ کہ داؤد کے گھرانے کا ایک فرد بطور مسیح کے ظاہر  
 ہوگا جو عمان حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں کو اپنے عصا کے زور سے متحد کر دے گا اور امن و امان کو قائم کرے گا۔  
 یہ عقیدہ اُن شاعروں اور پیغمبروں کا خاص موضوع تھا جو بائبل میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے، بنی اسرائیل کا عروج اور  
 پرستار ان یہوداہ کی دینی خوشحالی اُن کا اعلیٰ ترین نفع حاصل تھا اور مسیح سے ان کا مطلب کوئی روحانی نجات دہندہ نہ سمجھا جو  
 گناہگاروں کو ازلی عذاب سے بچائے، کیونکہ وہ کسی قسم کی ابدی زندگی میں اعتقاد نہ رکھتے تھے اس لحاظ سے عیسائیوں کا عقیدہ  
 آمد مسیح یہودیوں سے بالکل مختلف تھا اور غالباً ایران سے ماخوذ تھا جہاں آپورا مزدک کے وعدے کے مطابق بروز محشر سو سیوسش  
 کا عقیدہ رائج تھا۔

**عیسیٰ کی قربانی** پہلے کھانے سے منع کیا (باب ۲ آیات ۱۶-۱۷) لیکن انھوں نے حکم عدولی کی اور اس کی پاداش میں جنت  
 سے نکالے گئے، یہی گناہ انسان کی فطرت میں آگیا اور وہ مستوجب سزا ٹھہرا خدا کے انصاف کا تقاضہ تھا کہ انسان کو سزا دی جائے  
 لیکن خدا کی محبت اُسے عذاب سے بچانا چاہتی تھی لہذا کفارہ کی ضرورت پڑی مگر کوئی انسان فطرتاً گناہگار ہونے کے باعث کفارہ نہ ادا  
 کر سکتا تھا سو مسیح کے جوہن اُتارے ہوئے کے باعث گناہ سے بری تھے لہذا انھوں نے صلیب قبول کی اور انسانی گناہوں کو بخشوا دیا۔  
 اس خیال کی تائید مختلف آیات سے ہوتی ہے۔

**احیائے ثانیہ** عیسائیوں کا اعتقاد ہے کہ ”مسیح کتاب مقدس کے بموجب ہمارے گناہوں کے لئے مرا اور دفن ہوا اور تیسرے دن  
 کتاب مقدس کے بموجب جی اُٹھا“ (اکرنتھیوں باب ۱۵ آیات ۳-۴)

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ سے پہلے مختلف ممالک میں دیوتاؤں کے مرکز زندہ ہونے کا تخیل پایا جاتا تھا  
 خصوصاً مصر میں جہاں اوسیرس کا مرکز زندہ ہونا عوام کے اعتقاد میں داخل تھا۔ ہو سکتا ہے کہ مصر ہی سے یہ عقیدہ عیسوی مذہب  
 میں داخل ہوا کیونکہ اسکندر یہ عیسائی مذہب کی تبلیغ کا ایک خاص مرکز تھا۔

اسی سلسلہ میں یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ عیسیٰ کے مرکز زندہ ہونے کے خیال کی تحریک اس طرح پیدا ہوئی کہ اُن کی لاش  
 دفن سے غائب ہو گئی تھی، اس باب میں کہا جاتا ہے کہ عیسیٰ کی موت صلیب پر نہ ہوئی تھی۔ جب وہ صلیب سے اتارے گئے تو غشی کی  
 حالت میں تھے۔ لوگوں نے انھیں مردہ سمجھ لیا اور اُن کا ایک شاگرد مسمیٰ یوسف جو ارمینیا کے شہر کا ایک دو لہند شخص تھا انھیں گھر لے گیا  
 (متی ۲۷، مرقس ۱۵، لوقا ۲۴، یوحنا ۱۹)۔ اُن کی مرہم پٹی کی اور پھر انھیں بھگا دیا، اس کے بعد عیسیٰ نے اپنی بقیہ زندگی عیسیٰ  
 نامی مذہبی فرقے کے درمیان محنت و مشقت اور غور و فکر میں گزار دی۔ جب سینٹ پال اُن سے ملا تو وہ گذرے کی زندگی بسر کر رہے تھے  
 اور اپنے مسیح ہونے کے دعوے کو چھوڑ چکے تھے۔

**عقیدہ تثلیث** اس میں ذرا شبہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ موجد تھے چنانچہ ایک جگہ وہ خدا کو ”خداے واحد اور برحق“ کہتے ہیں (یوحنا ۱۰)  
 اور دوسری جگہ فرماتے ہیں: ”تو کیوں مجھے نیک کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا“ (لوقا ۱۹)  
 حضرت عیسیٰ عقیدہ توحید کے قابل تھے۔ لیکن بعد کو عیسائیوں نے بجائے توحید کے تثلیث کا عقیدہ اختیار کر لیا جس کے اسباب کچھ اور تھے۔

مشلت قدیم زمانہ میں ایک متبرک نشان سمجھا جاتا تھا اور اعضائے جنسی کی رموز شکل تھا اگر اُس کی چوٹی نیچے ہوتی تو وہ نسائی عضو کی علامت سمجھا جاتا تھا اور اگر اُس کی چوٹی اوپر ہوتی تو اُسے مردانہ عضو کی نشانی سمجھتے تھے اور دو مثلثوں کے میل سے جو چھ کوڑوں کا ستارہ بنتا ہے اُس کو دونوں اعضا کا اتصال سمجھا جاتا تھا۔ یہودیوں کے تمام معابد میں اس قسم کے نشانات بکثرت دیکھنے میں آتے ہیں اور اُن کی اصطلاح میں انھیں ہیریلیمائی کہتے ہیں۔

قدیم مصریوں میں ہر مندر میں تین بت ہوا کرتے تھے :- (۱) دیوتا - (۲) دیوی - (۳) ان دونوں کا شرعاً اتصال یعنی بچہ، لیکن یہ تینوں تثلیث فی التوحید کی صورت میں جوتے تھے اور اس تثلیث کے اظہار کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک حلقہ میں مثلث کھینچ دیا جاتا تھا اس کے معنی سیت، ہوئرس اور شوتھے اور تینوں معبودوں کی تشریح یہ کی جاتی تھی کہ ہوئرس برسات ہے - سیت خشک سالی اور شوتھ ہواؤں اور طوفانوں کا دیوتا ہے۔

قدیم مصریوں کی سب سے مشہور تثلیث اوسریر، آسٹس اور ان کے بیٹے ہوئرس پر مشتمل تھی اور اسی تثلیث سے غالباً مسیحی تثلیث لی گئی جس کا مفہوم ان کے یہاں باپ، بیٹا اور روح القدس ہے۔  
مصر کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی تثلیث یا تریمری کی کاخیل پایا جاتا تھا۔ مثلاً :-

سمیری (بابلی)	ہندو	یونانی	رومی	کیفیت
آنو	برہما	زیوس	جوپیٹر	آسمان کا دیوتا
ایا	وشنو	پوزیڈان	نیپچون	پانی کا دیوتا
بیل	ہمیش (شیو)	ہمڈس	پلوٹو	زمین کا دیوتا

ان دیوتاؤں کی خصوصیات سے یہ چیز واضح ہوتی ہے کہ عدد "تین" کا تعلق مردانہ عضو کی ساخت کے علاوہ بعض دیگر اشیاء سے بھی تھا مثلاً آسمان زمین اور پانی (بحر محیط جسے زمین کے چاروں طرف مانا جاتا تھا) زمان، مکان اور مادہ، طول، عرض اور اونچائی (ابعاد ثلاثہ) اور زمانہ موجودہ، گزشتہ اور آئندہ وغیرہ اس لئے تین کو ایک رموز اور مقدس عدد مان لیا گیا۔

اگرچہ خدا کی ابوت کا تخیل یہودیوں میں بہت پہلے سے پایا جاتا تھا لیکن بعض کا خیال ہے کہ اُن میں اس خیال کو مستحکم کیا آقا نیم مثلثہ یونانی مذہب نے۔ حضرت عیسیٰ کی ولادت سے دو صدی پہلے یہودی یونانی دیوالا کے جوپیٹر (Jupiter) سے آشنا ہوئے جو نہ صرف تمام دیوتاؤں کا بلکہ ساری دنیا کا باپ تھا اور ۱۷۵ اور ۱۶۳ ق۔ م کے مابین اسی کی پرستش نے بابل اور شمالی فلسطین میں رواج پایا۔

پھر چونکہ جوپیٹر آسمان کا دیوتا تھا اس لئے عیسائی بھی خدا کو آسمانی باپ ماننے لگے اور حضرت عیسیٰ نے دنیا میں ملکیت الہیہ یا آسمانی بادشاہت (Kingdom of Heaven) کے قیام ہونے یا اُس کے آنے کی خوشخبری دی۔

یہودی مذہب میں خدا کا انسان سے وہی تعلق تھا جو ایک مطلق العنان حکمران کا اپنی رعیت یا آقا کا اپنے غلام سے ہوتا ہے۔ لیکن عیسائی مذہب میں خدا اور انسان کا تعلق باپ اور بیٹے کا تعلق ہے۔ اس نئے تعلق کا قیام گویا انفرادی روح اور کائناتی روح کا اتحاد تھا۔

۱۔ تریبیات جنسی - مصنفہ نیاز فقہوری - مطبوعہ ۱۹۴۱ء - صفحات ۷۱ - ۷۳

۲۔ زمین میں اُس کی ادہری سطح اور اندرونی حصہ (بائبل لوک یا تحت الارض) دونوں شامل ہیں۔

۳۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ خدا کی ابوت کا تخیل سامی قوم سے پہلے آریہ قوم میں پیدا ہوا۔

**بن اللہ** (یوحنا ۱۴) ہی کہتے تھے بلکہ بعض کو تو اس بارے میں بھی شبہ تھا اور وہ انھیں ناجائز مولود سمجھتے تھے۔ انھیں مریم کے عقیقہ ہونے میں شک تھا۔ خود حضرت عیسیٰ نے بعض مقامات پر اپنے کو ”ابن آدم“ کہا ہے۔ لیکن عیسائیوں کا اعتقاد ہے کہ حضرت عیسیٰ خدا کے اکلوتے بیٹے تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ ہی کو خدا کا واحد بیٹا کیوں کہا جائے؟ کیا ہر شخص آسمانی باپ کا بیٹا نہیں ہو سکتا جبکہ امتنا باب ۱۴ کی آیت میں صریحاً مذکور ہے ”تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو“ یا جیسا کہ موسیٰ فرماتے ہیں: ”کیا وہ تیرا باپ نہیں ہے جس نے تجھے مول لیا“ (امتنا ۲۲)۔ ان سوالات کا ایک مختصر سا جواب یہ ہے کہ عہد نامہ قدیم کی ان عبارتوں میں جہاں رکھا گیا ہے کہ ”تم خدا کے بیٹے ہو“ اُس سے محض خالق کی پدرانہ شفقت اور مخلوقات کی اطاعت کا اظہار ہے (جیسے بیٹا باپ کی طاعت کرتا ہے) اس سے ان کا وہ مطلب نہیں ہے جو عیسائی حضرت عیسیٰ کی الہی ولایت سے لیتے ہیں۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ خود حضرت عیسیٰ کا اپنے کو ابن اللہ کہنے سے کیا مطلب تھا کیونکہ انھوں نے خود اپنی کوئی تحریر نہیں چھوڑی ہے لیکن انجیلوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں کے مصنفین میں ابن اللہ کے بارے میں دو تصور تھے۔ متی اور لوقا حضرت عیسیٰ کی فوق الفطرت (یعنی کنواری مریم سے) پیدائش کی بنا پر خدا کا بیٹا مانتے تھے۔ برخلات اس کے یوحنا کی انجیل میں ابن اللہ کا تخیل پیش کیا گیا ہے اُس میں کافی فلسفہ پنہاں ہے۔

یہودی مذہب میں خدا کا تخیل عالم مادی سے اس قدر بلند ہے کہ تقرب خداوندی کا خیال بھی یہودیوں کے نزدیک خدا کی توہین ہے۔ اُس کا انسان سے تعلق ویسا ہی ہے جیسے خالق کا مخلوق سے، حکمران کا رعیت سے یا آقا کا ملازم سے، خدا اور انسان کے درمیان تعلیق کی یہ وسیع خلیج عاقل تھی اسے متعدد پیغمبروں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا خصوصاً اس وقت جب یہودی مذہب یونانی مذہب کے مقابل ہوا، جس میں خدا انسان سے بہت نزدیک تھا۔ اس خلیج کو پُر کرنے کے لئے اسکندریہ کے نو فلاطونی یہودیوں نے یونانی فلسفیوں کے نظریہ کلام (Logos Theory) کا سہارا لیا۔ اس خیال کا محرک فیلو (Philo) اور اُس کے متبعین تھے۔ فیلو حضرت عیسیٰ کا ہم عصر بھی تھا لیکن اُن سے ناواقف (اُس نے اُن کا ذکر تک نہیں کیا) متعدد مستشرقین اور عہد نامہ جدید کے نقادوں کا خیال ہے کہ چوتھی انجیل کا لکھنے والا فیلو کا پیرو اور حضرت عیسیٰ کا معتقد تھا کیونکہ صرف اسی انجیل میں حضرت عیسیٰ کو یونانی لوگس کا مترادف ٹھہرایا گیا ہے۔ اور اسی لئے اُس نے اپنی انجیل کا آغاز اُس مشہور آیت سے کیا ہے جس نے عرصہ تک عیسائی اہل برہنہ دینیات کو دماغی الجھن میں مبتلا رکھا یعنی ”ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا“ (یوحنا ۱)۔

فیلو کے نزدیک جس کی تعلیم نو فلاطونی اسکول میں ہوئی تھی لوگس سے مراد وہ مثالی تخلیق تھی جو عقل الہی میں اصل تخلیق سے پہلے موجود تھی مثلاً روشنی کی پیدائش سے پہلے خدا نے کہا کہ ”اُجالا ہو“ یہ محض روشنی کے اُس تخیل کا مسموع اظہار تھا جو عقل الہی میں موجود تھا اُس نے ظاہری صورت اختیار کر لی۔ اس مثالی یا خیالی روشنی کو مادی روشنی اور غیر مرئی عقل الہی کی درمیانی کڑی کہا جاسکتا ہے۔ اس طرح مثالی تخلیق غیر مرئی خالق اور ظاہر مخلوقات کے درمیان واسطہ بن جاتی ہے۔ عقل الہی کا یہی خیال فیلو کا لوگس تھا۔ چونکہ یہ لوگس یا مثالی عالم کا بنیادی دماغ کا پہلا اظہار تھا اس لئے اسے ”مولود اول“ اور ”پیدا کیا ہوا واحد بیٹا“ کہا گیا۔ بہر حال ان کلمات کو فیلو اور اُس کے متبعین نے شاعرانہ یا استعارانہ انداز میں استعمال کیا تھا۔

لے زبور ۲ کی، دین آیت ہے: ”تو میرا بیٹا ہے۔ آج تو مجھ سے پیدا ہوا“  
 ۷۷ نو فلاطونیت (Neo Platonism) جسے اشراقیت بھی کہتے ہیں تیسری صدی عیسوی کا ایک خاص فلسفہ تھا جو فلاطونی خیالات میں مشرقی باطنیت کی آمیزش سے پیدا ہوا تھا۔

اس نظر سے کے مطابق عقل اپنی میں تخلیق عالم سے پہلے کائنات میں موجود کل اشیاء کے مثالی نمونے موجود تھے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ انسان ظہور میں آئے ایک مثالی انسان یا اُس کا ایک مکمل نمونہ خدا کے ذہن میں موجود تھا۔ اب چونکہ چوتھی انجیل کا لکھنے والا فیثو کے نظریے کا حامی اور حضرت عیسیٰ کا معتقد تھا لہذا اُس نے حضرت عیسیٰ کو کلام مجسم، انسانِ کامل اور خدا کا بیٹا بنادیا۔

روح القدس (Holy Spirit) عیسائی تثلیث کا تیسرا رکن ہے۔ عہد نامہ قدیم میں اس کا ذکر متعدد مقامات پر پایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے کتاب پیدائش میں اس کا یوں تذکرہ ہے:-

”اور میں دیوان اور سسنان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی“

(باب ۱ - آیت ۲)

عہد نامہ جدید میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے سلسلہ میں اس کا یوں تذکرہ ہے:-

”جب اُس کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہو گئی تو ان کے اکٹھا ہونے سے پہلے وہ روح القدس سے

(متی باب ۱ - آیت ۱۸)

حاملہ پائی گئی“

بعد ازاں یہی روح حضرت عیسیٰ کے ہمتہ کے سلسلہ میں ظاہر ہوتی ہے:-

”اور یسوع (عیسی) ہمتہ لے کر فی الفور پانی کے پاس سے ادا ہو گیا اور دیکھو اُس کے گلے آسمان کھل گیا اور

اُس نے خدا کی روح کو کبوتر کی مانند اترتے اور اپنے اوپر آتے دیکھا اور دیکھو آسمان سے یہ آواز آئی کہ یہ

میرا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں“ (متی باب ۳ - آیات ۱۶ - ۱۷)

در اصل روح القدس کا تخیل وادیِ وجد و خرات کے سورج دینا آشور سے اخوذ تھا جس کی علامت کو ایرانیوں نے اپنے خدا ”آہورا ماژدا

کی روح“ کے لئے اپنا لیا اور اُسی آشور کی بی بی ہوئی صورت عیسائیوں میں روح القدس کے لئے بنائی جاتی ہے۔ (تصویر صفحہ ۱۱۲ پر ملاحظہ ہو)

بائبل میں بعض مقامات پر روح القدس کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا اُس کے لکھنے والے ہندوؤں کے آتما اور پرستار کے تخیل سے

واقعہ تھے۔ ایک طرف تو خدا کو ”سارے جسموں کی جانوں کا خدا“ کہا گیا ہے (گنتی ۱۶) اور دوسری طرف ”روحوں کا باپ“ (عبرانیوں ۴)

حضرت عیسیٰ کی زندگی پر نظر ڈالنے اور اُن کے اقوال پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک صوفی منش انسان تھے

عیسیٰ اور تصوف چنانچہ انھوں نے اپنی روحانی قوت سے ہر قسم کے مریض اچھے کئے اور دوسرے صوفیوں کی طرح رہبانیت کی بھی تعلیم دی مثلاً

”دو ہمتندوں کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے“ (متی باب ۱۹ - آیت ۲۳)

”اپنا مال اسباب بیچ کر خیرات کر دو“ (لوقا - باب ۱۲ - آیت ۳۳)

وہ خود بھی مجدد تھے اور دوسروں کے لئے بھی تجدد ہی پسند کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰ نے روحانیت پر بڑا زور دیا اور کہا کہ: ”خدا کی

بادشاہت تمہارے اندر ہے“ (لوقا ۱۱) اور ”میں اور میرا باپ ایک ہیں“۔ ”جو مجھے دیکھتا ہے وہ میرے پیچھے والے کو دیکھتا ہے“

(یوحنا ۱۲) اور یہی بات اُن کے ماننے والے بھی بیان کرنے لگے مثلاً ”یسوع خدا کی صورت پر تھا“ (فلپیوں ۲) ”وہ غیر مرئی

خدا کی صورت ہے“ (کلسیوں ۱) ”وہ خدا کے جلال کا پرتو اور اُس کی ذات کی صورت ہے“ (عبرانیوں ۱)۔ یہاں پر یہ بتانا

بھی ضروری ہے کہ صرف حضرت عیسیٰ ہی خدا کی صورت پر نہ پیدا کئے گئے تھے بلکہ کل انسانوں کو ”خدا نے اپنی صورت پر پیدا کیا اور اپنی

مانند بنایا“ (پیدائش باب ۱ - آیات ۲۶ - ۲۷) اس لئے کل انسان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ کامل ہوں۔

حضرت عیسیٰ نے عبادت و ریاضت سے زیادہ خدمت اور عالمگیر اخوت پر زور دیا جسے ان کے مشہور شاگرد یوحنا نے ایک نہایت ہی دلکش انداز میں پیش کیا یعنی :-

”اے عزیزو۔ آؤ ہم ایک دوسرے سے محبت رکھیں کیونکہ محبت خدا کی طرف سے ہے اور جو کوئی محبت رکھتا ہے وہ خدا سے پیدا ہوا ہے اور خدا کو جانتا ہے محبت نہیں رکھتا وہ خدا کو نہیں جانتا کیونکہ خدا محبت ہے۔“ (۱- یوحنا ۳)

**عیسیٰ کی نبوت** عیسائی مذہب کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۔ ”خدا ایک ہے اور خدا اور انسان کے بیچ میں واسطہ بھی ایک ہے یعنی یسوع مسیح جو انسان ہے۔“ (۱ تیمتھیس باب ۲- آیات ۴-۵)۔ خود حضرت عیسیٰ کو بھی اس کا احساس تھا جیسا کہ ان آیات سے ظاہر ہے :- ”باپ جس نے مجھے بھیجا ہے اُس نے مجھے حکم دیا ہے کہ کیا کہوں اور کیا بولوں بس جو کچھ میں کہتا ہوں جس طرح باپ نے مجھ سے فرمایا اُس طرح کہتا ہوں۔“ (یوحنا ۱۴: ۱۰)۔ ”جو کلام تم سنتے ہو وہ میرا نہیں ہے بلکہ باپ کا ہے جس نے مجھے بھیجا“ (یوحنا ۱۴: ۱۰)۔ عیسائی حضرت عیسیٰ کو خدا کا اکلوتا بیٹا مانتے ہیں جس کا خدا نے یوں اقرار کیا ہے :- ”میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں۔“ (متی ۳: ۱۷)۔ یہی نہیں بلکہ خدا نے اپنے سارے اختیارات عیسیٰ کو سونپ دئے ہیں جیسا کہ عیسیٰ کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے :- ”آسمان اور زمین کا سارا اختیار مجھے دیا گیا ہے۔“ (متی باب ۲۸- آیت ۱۸)

عیسائیوں کا یہ بھی اعتقاد ہے کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر خدا کے دائمی طرف منسوب ہیں اور ”جب تک وہ سارے دشمنوں کو اپنے پاؤں تلے نہ لے آئے اُس کو بادشاہی کرنا ضروری ہے۔“ (۱- کرنتھیوں ۱۵)۔ انہیں خیالات سے وابستہ عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ خدا کے اوتار تھے۔

**عیسیٰ: خدا کا اوتار** عیسائیوں کا اعتقاد ہے کہ اب سے ۱۹۶۰ سال پہلے خدا نے حضرت عیسیٰ کے انسانی جامہ میں اوتار لیا تاکہ بنی نوع انسان پر اپنی محبت ظاہر کرے اور اُسے ازلی عذاب سے بچائے۔ دوسری صدی عیسوی سے پہلے اس عقیدہ کا پتہ نہ تھا۔ جسٹن شہید نے دوسری صدی کے وسط میں پہلی دفعہ اس نظریہ کو پیش کیا اور اپنی اس دریافت کو اہامی قرار دیا ہے۔

باپ اور بیٹے کا صحیح تعلق کیا ہے، ابتدائی صدیوں میں یہ مسئلہ خاص موضوع بحث تھا خصوصاً اسکندریہ میں یہ بحث اتنی بڑھی کہ قسطنطنیہ اعظم نے ۳۲۵ء میں ایک مجلس طلب کی اور پادریوں کے جھگڑے کا یوں فیصلہ ہوا :- ”مقدس کیتھولک کلیسہ اُن لوگوں کو مردود قرار دیتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب خدا کا بیٹا نہ تھا اور یہ کہ وہ (باپ سے الگ) کسی دوسرے جوہر سے بنایا گیا اور یہ کہ وہ مخلوق اور تغیر پذیر ہے۔“ اکثریت کی تائید سے یہ فیصلہ منظور ہو گیا۔

اس کے بعد پھر باپ اور بیٹے کا رشتہ معرض بحث میں آیا اور ۴۳۱ء میں ایفیسس کی مجلس میں اکابر دین نے یہ فیصلہ کیا کہ ”جو (باپ اور بیٹے کی) دو انواع کو تسلیم کرتا ہے نہ طور ہی ہے اُسے قتل کر دیا جائے۔ اس طرح تلوار کی زور سے مذکورہ عقیدہ کو منوایا گیا۔“

**خدا کی صفات** یہودیوں کی طرح عیسائی بھی ایک ”ازلی بادشاہ یعنی غیر مرئی واحد خدا“ (۱ تیمتھیس ۱: ۱۷) میں اعتقاد رکھتے ہیں جو اول و آخر ہے۔ جس کی ”ان دیکھی صفات یعنی اُس کی ازلی قدرت اور الوہیت دنیا کی .... چیزوں کے ذریعہ سے۔“

۱۔ افلاطونی اسکول ایک فرد تھا جس نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ وہ افلاطون کے اصول تثلیث میں اعتقاد رکھتا تھا۔

۲۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ اوتار کا خیال ہندوستان سے ماخوذ تھا۔

صاف نظر آتی ہے" (رومیوں ۱۶)۔ "اُس سے مخلوقات کی کوئی چیز چھپی نہیں بلکہ جس سے ہم کو کام ہے اُس کی نظروں میں سب چیزیں کھلی اور بے پردہ ہیں" (عبرانیوں ۱۱)۔ "وہ قادر مطلق ہے اُس کے کام بڑے اور عجیب ہیں" (مکاشفہ ۱۵)۔ "وہی تعجید اور عزت اور قدرت کے لائق ہے کیونکہ اُس نے ساری چیزیں پیدا کیں" (مکاشفہ ۱۶)۔ "وہ انسانوں کا روزِ قیامت میں حساب کرے گا۔" (رومیوں باب ۲ - آیات ۵-۶)

وہ رحمدل بھی ہے:-

(کرنتھیوں ۱۳)

"خدا کی حمد ہو جو رحمتوں کا باپ ہے"

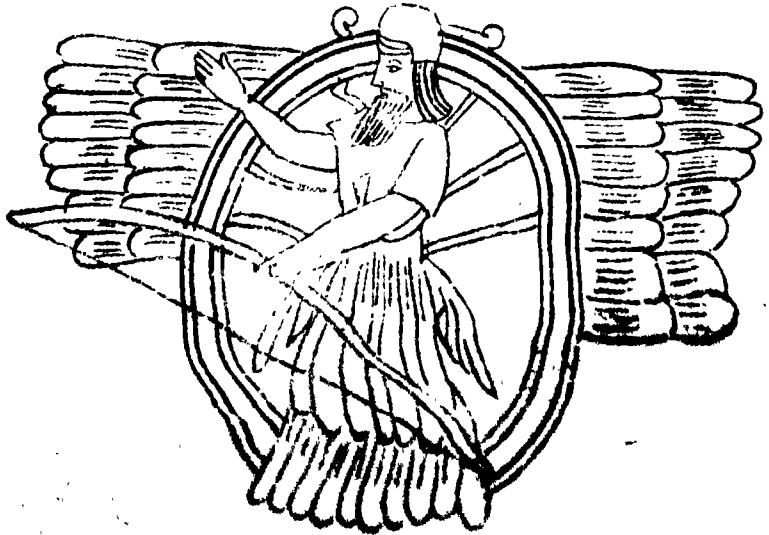
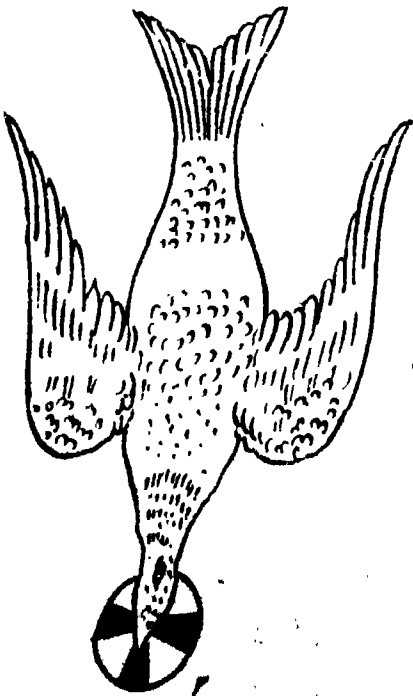
اور ظالم بھی:

"ہمارا خدا بھسم کر دینے والی آگ ہے"

(اشنا ۱۶ ، عبرانیوں ۱۶)

عہد نامہ جدید میں سب سے بہتر خیال اُس کے ہم جا ہونے سے متعلق ہے۔ پولس نے ایٹھس کے وعظ میں اسی چیز کو بیان کیا:

"جس خدا نے دنیا اور اُس کی ساری چیزوں کو پیدا کیا وہ آسمان اور زمین کا الگ ہو کر ہاتھ کے بنائے ہوئے مندروں میں نہیں رہتا۔ نہ کسی چیز کا محتاج ہو کر آدمیوں کے ہاتھوں سے خدمت لیتا ہے کیونکہ وہ تو خود سب کو زندگی اور سانس اور سب کچھ دیتا ہے اور اُس نے ایک ہی اصل سے آدمیوں کی ہر ایک قوم تمام روئے زمین پر رہنے کے لئے پیدا کی اور ان کی میعادیں اور سکونت کی حدیں مقرر کیں تاکہ خدا کو ڈھونڈیں شاید کہ ٹھول کر آسے جائیں۔ ہر چند کہ وہ ہم میں کسی سے دور نہیں کیونکہ اُسی میں ہم جیتے اور جیتے پھرتے اور موجود ہیں" (اعمال باب ۱۷ - آیات ۲۴-۲۸)



خدا کا تعظیم کرنے والی چیزیں (۱) کا تعظیم اٹھانا

سورہ ۵۳ (النجم) کی آیات ۱۹ - ۲۱ میں اللات، العزى اور مناة کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ انھیں اللہ کی بیٹیاں یا بہنیں قرار دینا صحیح نہیں ہے بلکہ جیسے اللہ کے معنی "معبود" کے تھے اللات کے معنی "معبودہ" یا "دہوی" کے تھے۔ اس سے یہ مطلب نہیں نکلا جاسکتا کہ اللہ کی بیٹیاں تھیں۔

قدیم عربی کتب اور قبل اسلامی شعرا کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ دراصل یہ دھرق مادہ تھی جس کی پرستش ساری دنیا میں ہوتی تھی۔ انگریز کے معنی "طاقتور" کے تھے۔ اس کی پرستش کا قوم سہا میں بھی پتہ چلتا ہے اور اس کے نام پر لوگ اپنا نام عبدالغفری رکھتے تھے۔ جن اسکن (متوفی ۱۰۱۵ھ) کے بیان کے مطابق انگریز محض ایک مکان تھا جس کی اہل قریش تعظیم کرتے تھے لیکن واقدی (متوفی ۱۰۱۵ھ) کا بیان ہے کہ وہ ایک بت تھا جس کے توڑنے سے ایک حبشی عورت برآمد ہوئی۔ خود دیوی تھی۔ اس نے جہانگے کی کوشش کی لیکن بت شکن نے اسے تباہ کر دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود قدیم مورخین کو اس دیوی کی ماہیت کا صحیح علم نہ تھا۔

"مذہب زروشت کے بعض علماء کا خیال ہے کہ عرب پر پہلے ایرانیوں ہی کی حکومت تھی، چنانچہ وہ آبادیوں کی باقیات، اوصالیات میں ابھی تک کہ اور مدینہ کا وجود پایا جاتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک شہر کہ، مہ آبادی، ایرانیوں کا آباد کردہ ہے۔ مہ آبادیوں نے وہاں ایک مندر تعمیر کیا جس میں چاند کی مورت رکھی تھی اور زحل کی یاد میں ایک سیاہ پتھر بھی نصب کیا۔ اس عبادت خانے کا نام مہ کہ یعنی "چاند دیوتا کی جگہ" رکھا جو کثرت استعمال سے کہ ہو گیا اور کیوان کا سیاہ پتھر حجر اسود، اسی طرح انھوں نے لفظ مدینہ کو مہ دینہ بتایا ہے جس کے معنی "چاند کی بستی" کے ہیں۔ اس لفظ مدینہ سے لفظ مدین نکلا ہے جو ایران کا پایہ تخت تھا اور جہاں چاند کی مورتوں کے بہت سے مندر تھے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ عرب میں چاند کی دیوی کو منات کہتے تھے۔" بہر حال کہ ایک تجارتی مرکز تھا کیونکہ یہاں سے ہو کر ہندوستان کا مال مصر، عراق اور ایران وغیرہ جایا کرتا تھا۔ کہہ ہی میں عربوں کی مرکزی عبادت گاہ تھی جسے کہتے تو بیت اللہ (خانہ خدا) کہتے تھے، خداوند بت خانہ جہاں سال کے دنوں کی مناسبت سے ۳۶۰ بت نصب تھے۔ علاوہ ان کے کعبہ کی چھت پر ایک قوی ہو بیکل بت نصب تھا جسے پہل کہتے تھے۔ بعض قبائل اسے صنم کہہ رہے تھے۔ اس کی ہیبت ایک تنومند فرہ آدمی کی تھی اور یہ تانبے یا سیسے کا بنا ہوا تھا۔ بڑی بڑی مزیں اس پر چڑھائی جاتی تھیں اور بغیر اس کی اجازت کے کسی اہم کام کی ابتداء نہ کی جاتی تھی۔ اس کے سامنے ہمیشہ سات تیر پڑے رہتے تھے۔ ۱۰۰ یر بات یا نہایت لکھا ہوتا تھا۔ کوئی عرب جب کوئی کام کرنا چاہتا تو ان حیردوں پر قمر و فلک اور بات یا نہیں جو کچھ نکلتا اسی کے مطابق عمل کرتا۔ غالباً یہ دیوی دیوتا تھا جسے اہل فنیقیہ بعل کہتے تھے۔

ان بتوں کے علاوہ ان میں خدائے برتر کا اعتقاد بھی پایا جاتا تھا جسے اللہ یا اللہ تعالیٰ کہتے تھے۔ اللہ کا لفظ بہت پرانا ہے خود آنحضرت کے والد کا نام عبداللہ (یعنی "اللہ کا بندہ") تھا خانہ کعبہ کو بیت اللہ (خانہ خدا) کہتے تھے۔ مانہ جاہلیت کی ان نظموں میں جنھیں المعلقات کہتے ہیں لفظ اللہ کثرت سے استعمال ہوا ہے۔

فران مجید سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اہل مکہ اپنے تمام معبودوں کو اللہ کا تحت سمجھتے تھے (اگرچہ وہ علی طور پر دوسروں کی اللہ سے کہیں زیادہ تعظیم کرتے تھے) اللہ کی نسبت یہ عقیدہ تھا کہ وہ اتنا بڑا معبود ہے کہ کوئی اس تک نہیں پہنچ سکتا اس نے چھوٹے چھوٹے سیکڑوں معبود اسی خیال سے پوجے جاتے تھے کہ وہ اللہ کی درگاہ میں شفیع ہوں گے۔ وہ اللہ اور جنوں میں رشتہ مانتے تھے (۱۵۸) اور جنوں کو اللہ کا ساجھی سمجھتے تھے (۱۶۱) اور اسی لئے ان سے استمداد کرتے تھے (۱۶۲) اللہ کے بیٹے بیٹیاں بھی مانے جاتے تھے (۱۶۳) اللہ کی بیٹیوں کا کئی مقامات پر ذکر ہے (۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶)۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل مکہ اللہ کو خالق اور قادر مطلق مانتے تھے (۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲) شدید مصیبت میں اسے یاد کرتے تھے (۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶) سب سے بڑی قسم اللہ کی سمجھی جاتی تھی (۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹) وہ نذر و نیاز کے موقعوں پر اللہ کا حصہ دوسرے معبودوں سے الگ رکھتے تھے (۱۸۰) اور یہ بھی کہتے تھے کہ اگر انھیں یا ان کے اسلاف کو اللہ نے دوسرے معبودوں کی پرستش سے منع کیا

اتو وہ کبھی ایسا نہ کرتے (۲۶، ۲۷)

**اصلاح کی ضرورت** اہل عرب مختلف قبیلوں میں منقسم تھے۔ یہ قبیلہ باہم لڑا کرتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر تلوار کھینچ جایا کرتی تھی اور سالوں گنت خون کا بازار گرم رہا کرتا تھا۔ سماج میں عورت کی حالت نہایت گری ہوئی تھی میں غلاموں سے برتر سمجھا جاتا تھا اور غلاموں کی حالت جانوروں سے بدتر تھی۔ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے یا پانچ چھ سال ہونے پر زندہ دفن کر دیتے۔ کثرت ازدواج اور اشتراک فی النساء کا رواج تھا۔ شراب خواری کا یہ عالم تھا کہ زیادہ پی جانے اکثر موتیں ہو جایا کرتی تھیں اور جوئے کا ایسا شوق تھا کہ لوگ خود اپنی بازی لگا دیتے اور ہارنے پر غلام بن کر زندگی گزارتے۔ ان کے گھبراہٹ کا طوائف مرد اور عورت پر ہند ہو کر کرتے تھے اور بھائے ایک کے سیکڑوں معبودوں کے آگے جبین سائی کرتے تھے۔ ان ایہوں کو دور کرنے کے لئے اصلاح کی سخت ضرورت تھی۔ خود مکہ اور مدینہ میں یہودی اور عیسائی کثرت سے آباد تھے۔ وہ مذہب پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگرچہ اس قسم کی کوئی منظم کوشش تو نہ کی گئی تھی تاہم بعض عربی قبائل ان کے اثر آگے تھے ان کا مذہب بہر حال عربوں کے مذہب سے افضل تھا۔ کم از کم وہ بت پرست نہ تھے اس لئے بعض اہل عرب د اپنی اصلاح کی ضرورت محسوس کرنے لگے۔ رسول اللہ سے پہلے ایک فرقہ عرب میں پایا جاتا تھا جو مذہبی اصلاح کا حامی تھا با فرقہ کے لوگ اپنے کو ”دین ابراہیمی“ کا پیرو کہتے تھے لیکن ان کے عقاید یہودیوں سے مختلف تھے لہذا یہودیوں نے انہیں بھی کہنا شروع کر دیا جس کے اصلی معنی ”کافر“ یا ”جیٹی“ کے ہیں لیکن بعد میں یہ لفظ دین ابراہیمی کے پیرو کے معنی میں استعمال آ جانے لگا اور تاریخ میں یہ فرقہ حنیف کے نام سے مشہور ہوا۔ اس فرقہ میں زید ابن عمر ایک بڑے پایہ کی شخصیت گزری ہے جس سے رسول صلعم بہت متاثر ہوئے تھے۔

**محمد کا ظہور** جب عربوں کی ذہنی اور اخلاقی حالت اتنی گر گئی تو عرب میں رسول اللہ کا ظہور ہوا۔ آپ ﷺ میں مکہ میں پیدا ہوئے بڑے ہو کر آپ نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ اس سلسلہ میں آپ مکہ کی ایک معمول خاتون جناب خدیجہ کا سالانہ تجارت لے شام گئے۔ حضرت خدیجہ ان کی غیر معمولی شخصیت سے اتنا متاثر ہوئیں کہ شادی کا پیغام دے دیا۔ حالانکہ ان کی عمر ۴۰ سال کی تھی اور محمد صرف کچیس سال کی تھی۔ بہر حال یہ شادی نہایت کامیاب رہی اور آپ فارغ البال ہو کر زیادہ سے زیادہ وقت عوام الناس کی خدمت رغور و غرض میں صرف کر لے لگے۔ دیگر مذہبی رہنماؤں کی طرح وہ بھی کچیں سے غور و فکر کے عادی تھے۔ آپ اکثر کوہ حرا پر چلے جاتے رگٹی کٹی دن ایک غار میں بیٹھے سوچا کرتے۔ انہیں انوس تھا اپنی قوم کے ذہنی و اخلاقی انحطاط کا اور روحانیت کے فقدان کا۔ وہ فرقہ حنیف کی تعلیمات خصوصاً زید ابن عمر کے خیالات سے کافی متاثر تھے۔ انہیں یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی تہاؤں خیال کا قیاس تھا مگر بعض عرب قبائل نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا اور عرب میں یہودی اور عیسائی کافی تعداد میں آباد تھے۔ خود حضرت خدیجہ کے برادر زادہ نے یہودیت اختیار کر لی تھی اس لئے ممکن ہو کہ محمد کو بائبل سننے کا بھی اتفاق ہوا ہو اور جب وہ مسلسل سفر شام گئے ہوں تو صاحبین عقاید سے بھی واقفیت حاصل کی ہو۔

مروجہ مذاہب سے مکمل واقفیت حاصل کرنے کے بعد آپ نے ایک اصلاحی تحریک کا خاکہ مرتب کیا اور ۶۱ء میں جب آپ کی عمر پچیس سال کی تھی آپ نے تبلیغ و اصلاح کا کام شروع کیا۔

۱۔ یہودیوں، عیسائیوں اور صاحبین کا ذکر قرآن کے سورہ ۲ (البقرہ) کی آیت ۶۲ اور سورہ ۵ (المائدہ) آیت ۶۹ میں موجود ہے۔

۲۔ سورہ ۲۲ (الحج) کی آیت ۱۷ میں مذکورہ فرقوں کے علاوہ مجوسیوں کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔

جب رسول اللہ نے اپنی قوم کو یہ پیغام پہنچایا کہ بت پرستی اور شرک کو چھوڑ کر ایک خدا کی پرستش کرو تو معدومہ چند لوگوں کے بقیہ اصناف انکار کر دیا بلکہ ان کا مضحکہ اڑایا۔ لیکن جب آپ کی تبلیغی کاوشیں بڑھیں تو تجارت کے خطرہ محسوس کرنے لگے کہ بت پرستی کے ختم ہونے یعنی تھے کہ کی تجارتی اور مذہبی اہمیت کا زایل ہو جانا۔ لہذا آپ کو پہلے ہر طرح کا لالچ دیا گیا اور پھر آپ کے جانی دشمن ہونے چنانچہ رسول اللہ مدین کے متبعین کو سخت تکلیفیں پہنچائی جانے لگیں اور دوبار آپ کو حبشہ، ایک بار طائف اور چوتھی بار مدینہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی یہ آخری ہجرت ۶۲۸ء کا واقعہ ہے۔ اسی سال سے سنہ ہجری کا آغاز ہوتا ہے۔

مدینہ کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور اپنے پیغمبروں کی ہر طرح سے مدد کی۔ پہلے مدینہ کا نام یثرب تھا لیکن اب وہ مدینۃ النبی یعنی نبی کا شہر ہونے لگا۔ اس سے کہ اور مدینہ والوں میں دشمنی بڑھ گئی اور خود رسول کو مسلمانوں کی حفاظت کے لئے تلوار سنبھالنا پڑی بڑی کئی جنگیں ہوئیں، آخر ۶۳۰ء میں مدینہ والوں کے لشکر نے جو دس ہزار مسلمانوں پر مشتمل تھا رسول کی قیادت میں کہہ چڑھائی کی و دشہر کو یہ آسانی فتح کر لیا۔ رسول کے اشارہ پر خانہ کعبہ کے سارے بتوں کو مسمار کر دیا گیا (بجز حجر اسود کے جو اب بھی خانہ کعبہ کے ایک رخسہ میں نصب ہے) اب کہہ والوں نے بھی اسلام قبول کر لیا اور جب آپ نے اپنی زندگی کا آخری حج ادا کیا تو ایک لاکھ چودہ ہزار مومنین آپ کے ساتھ تھے اور اسی موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی (المائدہ ۱)

”الیوم اکملت لکم دینکم، واتممت علیکم نعمتی“  
(آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی)

اور مختصر سی علالت کے بعد ۶۳۲ء میں آپ نے رحلت فرمائی۔

**قرآن و احادیث** قرآن مسلمانوں کا مذہبی صحیفہ ہے جسے ”کلام الہی“ مانا جاتا ہے یعنی اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ محمد پر بخواب اللہ ظاہر کیا گیا، جب آپ کو منصب نبوت عطا ہوا (۶۱۰ء) تو تنزیل وحی کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ سلسلہ آپ کی وفات (۶۳۲ء) تک جاری رہا۔ چونکہ آپ پڑھے لکھے نہ تھے اس لئے جو پیغامات ان تک پہنچتے وہ اپنے صحابہ کو دیکھ کر دیتے یا لکھوا دیتے۔ ان دونوں کاغذ نہ تھا اس لئے لوگ لکھو۔ کی شاخوں، سفید پتھروں اور چمڑے کے ٹکڑوں پر لکھ لیا کرتے تھے۔ آنحضرت کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر نے پیغمبر اسلام کے کاتب خصوصی زید بن ثابت کو اس پر راضی کیا کہ حفاظت کے خیال سے تمام ابواب کو کھلیا کرو۔ اس طرز پر سال دو سال میں قرآن مجید مرتب ہو گیا۔ حضرت عثمان غنیہ ثانی کے عہد میں اس قرآن پر نظر ثانی کی گئی۔ یہی موجودہ قرآن ہے جو ۱۱ سورقوں یا ابواب پر مشتمل ہے۔

قرآن کے بعد مسلمانوں کے نزدیک دوسری مقدس چیز حدیث ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور ان میں سے بعض موضوع ہیں لہذا انہیں نے روایت کے اصول مقرر کئے ہیں جن سے ان کے صحیح یا غلط ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اب ہم قرآن و احادیث کی روشنی میں معبود کا اسلامی تصور پیش کرتے ہیں وہ انیت اسلام کی بنیادی تعلیم ہے۔ مسلمان ہونے کے لئے کلمہ طیبہ پر دل سے ایمان لانا ضروری ہے جس کا جزو اول اسلامی توحید توحید الہی سے متعلق ہے اور دوسرا جزو رسالت محمدی سے :-

لا الہ الا اللہ (کوئی معبود نہیں اللہ کے سوا)

محمد رسول اللہ (حضرت محمد اللہ کے رسول ہیں)

سے بعض عالموں کا خیال ہے کہ یہ زندہ آدمی کے ”نیست ایندوگر نیرداں“ کا لفظی ترجمہ ہے۔ اسی طرح بسم اللہ الرحمن الرحیم (شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے) ”ہنام نیرداں کشش گروادار“ کا ترجمہ ہے جس سے مذکورہ کشتی اپنی کتاہوں کو شروع کرتے ہیں۔

پڑت سند رلال، گیتا اور قرآن، صفحہ ۱۱

توحید کے معنی ہیں کہ خدا اپنی ذات، صفات اور افعال میں ایک ہے۔ ذات کی وحدت سے یہ مراد ہے کہ معبود کئی نہیں ہیں اور نہ اس میں ایک سے زائد ذاتیں شامل ہیں۔ صفات کی وحدت سے یہ مراد ہے کہ اس کی جملہ صفات کسی شے یا شخص میں نہیں پائی جاتی ہیں اور افعال کی وحدت سے یہ مراد ہے کہ جو کام اللہ کر سکتا ہے اسے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا اور نہ اس کے معاملات میں کسی دوسرے کو دخل ہے۔

قرآن کے ایک باب (۱۱۲) کا نام ہی ”سورہ توحید“ ہے جسے ثلث قرآن کہتے ہیں اس کا ترجمہ یہ ہے :-

”اسے پیغمبر یہ لوگ جو تم سے خدا کا حال پوچھتے ہیں تو ان سے کہو کہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے نہ اس سے

کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی اس کی برابر ہی کا ہے۔“

اس سورہ کے ذریعہ، شفویت، تشکیث اور کثرت پرستی ہر ایک کی تردید کی گئی ہے۔ اسی سلسلہ میں قرآن کے پہلے سورہ الفاتحہ

(بمعنی ”شروع“۔ ”کھلنا“) کا نقل کرنا بھی ضروری ہے :

”سب طرح کی تعریف خدا ہی کو (سزا دار) ہے جو تمام مخلوقات کا پروردگار ہے بڑا مہربان، نہایت رحم والا

(اور) انصاف کے دن کا حاکم (ہے) ہم خیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہم کو سیدھی راہ

چلا، اُن لوگوں کی راہ جن پر تپنا اپنا فضل و کرم کرتا رہا، نہ اُن کی جن پر تیز غضب نازل ہوا اور نہ گمراہوں کی“ (آیات ۱-۷)

قرآن نے اشیاء الوہیت میں دو قسم کے دلائل پیش کئے ہیں۔ دلائل آفاق اور دلائل نفس۔ ان میں سے اول قسم ان دلائل کی ہے جو مشاہدہ کائنات سے حاصل ہوتے ہیں اور دوسری قسم کی دلائل کا اخذ خود ہمارا نفس ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

”ہم ان کو اپنی دلیلیں کائنات میں اور خود ان کے اندر دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر آشکارا ہو جائے کہ وہ حق ہو“

سورہ ذاریات میں ہے :-

”اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لئے اور خود تمہارے نفوس کے اندر بھی ہیں، کیا تمہیں دکھائی

نہیں دیتی ہیں - (۲۰-۲۱)

دنیا کی ہر شے اپنے پیدا کرنے والے کا ثبوت ہے۔ صحیفہ کائنات کے مطالعہ سے ہر شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ضرور اس کا رخانہ عالم کا کوئی چلانے والا ہے۔ یہ مصنوعات کسی صانع کی محتاج ہیں۔ اسی لئے قرآن نے بار بار مطالعہ کائنات کی تاکید کی ہے۔

مخلوقات سے خالق کا پتہ لگانے کے لئے قرآن نے جو مطالبہ کیا ہے اس کا اندازہ ذیل کی آیات سے ہو سکتا ہے :-

(۱) ”یہ لوگ مناظر ارضی کی کیوں سیر نہیں کرتے کہ ان کے دل سمیٹنے لگ جائیں اور کان سننے کی نعمت سے بہرہ ور ہوں“ (پہم)

(۲) ”ارض و سما میں کتنی ہی ایسی آیات ہیں جن سے :- فاضل لوگ منہ پھیر کر گزر جاتے ہیں۔“ (۱۱۳)

(۳) ”اے رسول ! کہو کہ وہ زمین میں چل پھر کر دیکھیں کہ خدا کس طرح آفرینش کی ابتدا کرتا ہے۔“ (۲۹)

(۴) ”اللہ وہ ہے جس نے زمین و آسمان پیدا کئے، جس نے بارشیں برسا کر تمہارے لئے پھل طیار کئے۔ سمندر و دریاؤں میں اپنی

قانون سے تیرنے والے جہاز تمہارے قبضہ میں دئے، نہریں تمہارے لئے مسخر کیں، گھوٹنے والے آفتاب و مہتاب پر

تمہیں حکموں بنا دیا اور سب دن و رات کا سلسلہ تمہارے بس میں کر دیا۔ نیز تمہیں وہ سب کچھ دیا، جس کی تمہیں تمنا تھی۔“ (۲۱۰-۲۱۱)

اس آخری اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کائنات کا حاکم ہے، محکوم نہیں۔ اسے ہر چیز کا اختیار دیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ مناظر

طرت کی پرستش کرتا پھرے جیسا کہ اقوام سلف کرتی تھیں یا کرتی ہیں، نہ صرف کائنات کا حسن و جمال بلکہ اس کا نظم و نسق بھی اپنے ناظم کا

بھوت ہے، ارشاد ہوتا ہے :-

”بار بار دیکھو، کیا تمہیں اس لا انتہا سلسلہ اخلق میں کوئی بغلی نظر آتی ہے؟“ (۱۱۷)

”اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا اور بھی معبود ہوتے تو یہ درہم برہم ہو جاتے۔“ (۱۱۸)

**حقیقت شرک** شرک کے فعلی معنی ہیں "شریک کرنا" یعنی خدا کی ذات، صفات یا افعال میں کسی دوسری شے یا شخص کا شامل کرنا۔ قرآن کے مطابق "شرک ایک گناہ عظیم ہے" (سورہ بقرہ ۲۲۰)

قرآنی ہدایت ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کو عبادت نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شرک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے (پہلے) اس کے سوا شرک کی ایک اور قسم ہے جس کی طرف قرآن میں یوں اشارہ کیا ہے "کیا تم نے اُس شخص کو نہیں دیکھا جس نے خواہش نفس کو اپنا معبود بنالیا ہے؟" (پہلے)۔ قرآن نے جا بجا کثرت پرستی، طغوت پرستی، بت پرستی، ثنویت اور تثلیث وغیرہ کی تردید کی ہے۔

**شرک فی العبادات** اسلام کے پانچ ارکان ہیں :- (۱) خدا اور رسول پر ایمان لانا۔ (۲) دن میں پانچ وقت کی نماز پڑھنا۔ (۳) ماہ رمضان میں تیس دن کے روزے رکھنا۔ (۴) زکوٰۃ یعنی اپنی جمع شدہ دولت کا کچھ حصہ اللہ کے نام پر خرچ کرنا۔ (۵) اگر استطاعت ہو تو حج کرنا۔

اگرچہ اللہ کا لفظ اور اُس کا تصور عربوں میں محمد سے پہلے بھی پایا جاتا تھا لیکن ذہنی و عملی توحید کا فقدان تھا۔ نماز اور روزہ بھی دنیا کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھے کیونکہ صابئین دن میں سات وقت کی نماز پڑھتے تھے اور سال میں ایک مہینہ کے روزے رکھتے تھے لیکن طہارت نفس کے علاوہ ان کا مقصود اپنے مخصوص معبودوں کی خوشنودی حاصل کرنا تھا لہذا رسول نے یہ شرط لگا دی کہ نمازیں پڑھو اور روزے بھی رکھو لیکن خدا کے لئے۔ نماز کا مقصد خدا کی عظمت کا اقرار اور اپنی فروتنی کا اظہار ہے علاوہ ان میں ایک دوسرا مقصد مسلمانوں میں اخوت اور مساوات کا احساس پیدا کرنا ہے۔ روز کی نمازیں محلے کے اجتماعات ہیں، جمعہ کی نماز کئی کئی محلوں کا اجتماع، عید کی نماز شہر اور حج مختلف شہروں اور ملکوں کے مسلمانوں کا اجتماع ہیں۔ رسول سے پہلے بھی حج ہوا کرتا تھا لیکن عروا اور عورتیں برہنہ ہو کر فتنہ کھینچا کرتی تھیں۔ لیکن رسول اکرم نے اسے بھی منع کر دیا۔ اور عبادات کے سلسلہ میں جو مشرکانہ حرکتیں ہوتی تھیں ان کو بھی دور کر دیا۔

قرآن نے خدا کی وحدت کے ساتھ نوری انسان کی وحدت پر بھی زور دیا۔ "رب العالمین" کے فقرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا دنیا کی ساری قوموں کی یکساں نگہداشت کرتا ہے۔ سب اقوام کا خدا ہے ہر ایک سے یکساں پیش آتا ہے۔

**اسم ذات** خدا فارسی زبان کا لفظ ہے جسے "خود" کا مخفف سمجھا جاتا ہے یعنی وہ "ہستی جو خود سے وجود میں آئی ہو" لیکن معنوی اعتبار سے اس نام میں یہ نقص ہے کہ خدا کی ذات ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گی لہذا اس کے عدم سے وجود میں آنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ ثنائی لفظ ٹھکانی زبان کے اُن الفاظ سے تعلق رکھتا ہے جن میں سے ایک لفظ انگریزی کا "گاڈ" (God) ہے اور یہی گاڈ، خدا ہو گیا۔

عربی میں خدا کا خاص نام اللہ ہے جو مخفف ہے اللہ کا۔ ال حرف تخلص ہے لفظ اللہ جو اسم نکرہ ہے معبود کے معنی میں کل سامی زبانوں میں پایا جاتا ہے۔

عربی کی سامی زبان میں خدا کا نام ایل تھا چنانچہ مشہور شہر بابل کا نام مخفف ہے 'باب ایل'، کا جس کے معنی ہوئے "خدا کا دروازہ"۔ آرامی زبان میں خدا کو ایل کہتے تھے۔ کنعانی میں بھی یہی لفظ تھا۔ عبرانی میں الہ ہے جس کی جمع الہیم آتی ہے۔ یہی آشوری زبان میں الہ تھا۔ اللہ کی پرانی صورت یعنی ایل فرشتوں کے ناموں کا آخری جز بھی ہے جیسے جبرئیل، میکائیل، عزرائیل، اسرافیل وغیرہ اور یہی سوئیل اور ایمنویل ایسے انگریزی ناموں کا بھی لاحقہ ہے۔ یہی نہیں پنڈت سند لال لکھتے ہیں :-

"رگ وید میں الہوں کے ناموں میں سے ایک نام الہ ہے جو سنسکرت میں ال دھاتو سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں پوجا کرنا۔ رگ وید میں ایک پورا سوکت الہ کے نام پر ہے۔"

اسماء و صفات  
لفظ اللہ خدا کا اسم ذات ہے جس کے تحت اس کے جملہ صفات آتے ہیں۔ قرآن میں متعدد جگہوں پر (بیشمار) لفظ اللہ کے نہایت خوبصورت ناموں (الاسماء الحسنی) کا حوالہ دیا گیا ہے۔

۱۔ بعض مشہور اسماء الحسنی یہ ہیں۔

الواحد	( ایک )	الرب	( پالنے والا )	الرشید	( راہ راست دکھانے والا )	القہار	( قہر کرنے والا )
الاحد	( ایک )	الرحمن	( مہربان )	الرزاق	( رزق دینے والا )	الجبار	( جبر کرنے والا )
الحي	( باطن کا ضد )	الرحيم	( بہت مہربان )	العظيم	( عظمت والا )	المستقم	( انتقام لینے والا )
القدوس	( پاک )	الغفار	( بخشنے والا )	العزيز	( غالب )	الاول	( پہلا )
الغفور	( روشنی )	الغفور	( " )	العلی	( بلند و پرتر )	الآخر	( آخری )
الحی	( زندہ )	الغفور	( درگزر کرنے والا )	المتعالی	( بلند و عالی )	الظاهر	( کھلا ہوا )
القيوم	( قائم )	الغواب	( بہت بخشنے والا )	الکبیر	( بڑا )	الباطن	( اندرونی )
الواجد	( موجود بالذات )	الحلیم	( بردبار )	المتکبر	( بڑا )	اللطیف	( لطافت کرنے والا )
الضی	( بے نیاز )	الصبور	( صبر کرنے والا )	الماجد	( بزرگ )	المستین	( مضبوط )
المصور	( دائم )	المتاب	( توبہ قبول کرنے والا )	المجید	( بزرگ )	المقدم	( اقدام کرنے والا )
الباقی	( باقی رہنے والا )	الحی	( معاف کرنے والا )	الحمد	( لائق حمد )	الغنی	( غریب نہ ہونے والا )
الوارث	( صاحب میراث )	المشکور	( شکر کرنے والا )	الجلیل	( عظمت والا )	الغنی	( غنی ہونے والا )
الخالق	( پیدا کرنے والا )	الکریم	( کرم کرنے والا )	القوی	( طاقتور )	الضار	( ضرر پہنچانے والا )
البارئ	( بنانے والا )	الرفیق	( مددگار ہونے والا )	القادر	( قدرت والا )	المعز	( عزت دینے والا )
المصور	( صورتگر )	الودود	( محبت کرنے والا )	المقتدر	( صاحب قدرت )	المدل	( ذلیل کرنے والا )
الهادی	( ناہر )	الولی	( دوست )	الوالی	( حاکم )	الرائع	( بلند کرنے والا )
المہدی	( ہدایت کرنے والا )	البر	( محسن )	الملک	( بادشاہ )	الغنی	( غنی لانے والا )
الصمیم	( جاننے والا )	المخفی	( حفاظت کرنے والا )	الکریم	( کار ساز )	الواسط	( فراخ کرنے والا )
الحکیم	( دانہ )	السلام	( سلامتی عطا کرنے والا )	الفتاح	( منصف )	الغنی	( غنی کرنے والا )
الخبیر	( واقف )	المومن	( امن دینے والا )	العدل	( انصاف کرنے والا )	المحلی	( عطا کرنے والا )
السمیع	( سننے والا )	الواسع	( وسیع کرنے والا )	المعید	( حافظ )	الغنی	( غنی کرنے والا )
البصیر	( دیکھنے والا )	المنعم	( نعمتیں عطا کرنے والا )	الباہع	( موعظ کرنے والا )	الحی	( زندہ کرنے والا )
الرقیب	( نگہبان )	المنقذ	( نجات دہانے والا )	الجامع	( جمع کرنے والا )	المحیت	( مارتے والا )
الشہید	( گواہ )	المنفی	( غنی کرنے والا )	المحصی	( شمار کرنے والا )	الجلال	( جلالت والا )
المبین	( نگہبان )	الہادی	( ہدایت کرنے والا )	الحسب	( حساب کرنے والا )	صاحب جلال	( صاحب بزرگی عطا کرنے والا )

# فلسفہ اسلام

اسلامی فلسفہ کا اصل ماخذ یونان ہے۔ جب مسلمانوں نے شام، مصر، عراق اور عجم کو فتح کیا تو وہ یونانی فلسفہ سے واقف ہوئے کیونکہ سکندر کی فتح بعد ان ممالک میں یونانی عظیم و فنون کا بہت چرچا ہو گیا تھا۔ خلیفہ ابو جعفر منصور (۳۵۲ھ - ۳۵۵ھ) کے زمانہ سے یونانی ادب کے ترجمہ کی ابتدا ہوتی ہے اور یہ سلسلہ خلیفہ ہارون الرشید (۱۶۷ھ - ۱۹۰ھ)۔ مامون الرشید (۱۹۳ھ - ۲۳۳ھ) اور المتوکل (۲۳۳ھ - ۲۴۲ھ) کے عہد تک اور اس کے بعد بھی صدیوں تک جاری رہا۔ حکماء یونان میں افلاطون اور ارسطو کی طرف بہت زیادہ توجہ کی گئی، جن پر ابو نصر فارابی (۲۶۰ھ - ۳۲۰ھ) اور ابن سینا (۳۵۰ھ - ۴۲۰ھ) نے بہت کام کیا۔ مغرب (اسپین) میں ابن طفیل (متوفی ۵۰۹ھ) اور ابن رشد (۵۲۰ھ - ۵۹۵ھ) نے فلسفہ کو فروغ دیا۔ بعض مشہور فلاسفہ اسلام یہ تھے۔

ابو یعقوب بن اسحاق الکندی (متوفی ۳۴۰ھ)۔ مسلمانوں میں پہلا شخص تھا جو فلسفی کے لقب سے مشہور ہوا۔ وہ فیثاغورث، بقراط، افلاطون اور ارسطو کی تعلیمات سے کافی متاثر تھا اور اُس نے اپنی تصانیف میں زیادہ تر ارسطو کی پیروی کی۔ اُس نے خدا کی وحدت اور عدل پر زور دیا ہے۔ کندی کے نزدیک دنیا خدا کے تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہے لیکن یہ سلسلہ آفرینش خدا اور عالم کے درمیان بہت سے درمیانی واسطے پاسے جاتے ہیں۔ ہر اعلیٰ چیز اپنے سے ادنیٰ چیز کی علت ہے لیکن کوئی معاملہ اُس چیز پر اثر نہیں ڈال سکتا جو سلسلہ وجود میں اُس سے بالاتر ہے۔ مادہ عقل کے تحت ہے اور اُسے وہی شکل اختیار کرنا پڑتی ہے جو عقل چاہتی ہے۔ دراصل عقل ہی قوت فاعلہ کی حامل ہے اور باقی عقل اور مادی جسم کے درمیان روح کا درجہ ہے۔

ابو نصر فارابی (۳۲۰ھ - ۳۹۵ھ) مسلمانوں میں "افلاطونیت جدیدہ" کا امام تھا۔ جس کا آغاز الکندی نے کیا تھا اور جسے بعد ازاں ابن سینا نے ترقی دی اُس کا رجحان مذہب کی طرف تھا اور اُس نے خدا کے خیالات سے بہیزاری کا اظہار کیا۔ فارابی کا نظام مدلل و جانبدار یا زیادہ صحیح لفظ میں عقلیت پر قائم ہے۔ وہ صفائے قلب کو تمام فلسفیانہ غور و فکر کی بنیاد سمجھتا تھا۔ فلسفہ اُس کے نزدیک حقیقت اشیا کا علم ہے جسے حاصل کر کے انسان خدا سے مشابہ ہو جاتا ہے۔ عقل انسانی کا مقصد اور اُس کی سعادت یہ ہے کہ پہلے عقل کا نشاۃ میں اور پھر ذات خداوندی میں جذب ہو جائے۔ فارابی کے نزدیک خدا واجب الوجود ہے۔ علت سے بری، قدیم، غیر متغیر عقل مطلق اور خیر محض، خود ہی عالم اور خود ہی معلوم ہے۔

ابن سینا (۳۵۰ھ - ۴۲۰ھ) نے اپنے فلسفہ کی بنیاد فارابی کی تعلیم پر رکھی تھی۔ اس کے فلسفہ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ خدا واجب الوجود ہے۔ وہی تمام کائنات کی تخلیق کا علت اعلیٰ ہے اور اسی سے چشمہ وجود جاری ہے۔ اس لئے کائنات بھی قدیم ہے۔ وہ اس بات کا بھی قائل تھا کہ قانون قدرت تمام نظام عالم پر حاوی ہے اور اس میں تغیر و تبدل ممکن نہیں۔ قرآنی تصور "کیف ما یشاء" کا ہے

یعنی خود چاہے کر سکتا ہے لیکن ابن سینا اس کا قائل نہ تھا۔  
ابن مسکویہ (متوفی ۱۰۳۰ء) نے اپنی تصنیف الفوز الاصرر میں تین اہم مسائل سے بحث کی ہے:۔ (۱) خدا کا وجود اور اس کے اوصاف  
(۲) نفس کا وجود مرنے کے بعد (۳) نبوت اور اس کے متعلقات وحی والہام وغیرہ اور ان کو فلسفیانہ طریقہ پر ثابت کیا ہے۔ دوسرے  
مشہور فلسفی ابن طفیل اور ابن رشد وغیرہ ہیں جن کا ذکر آئے گا۔

معتزلہ - اعتزال در اصل ایرانی تحریک تھی جس کا بانی واصل ابن عطا (۲۹۹ء - ۳۷۷ء) مانا جاتا ہے یہ شخص ایرانی تھا اور  
مشہور متکلم خواجہ حسن بھری کا شاگرد۔

(۱) نفی صفات معتزلہ میں بھی وہ اس فرقہ کا بانی تھا جو واصلیہ کہلاتا ہے۔ اس کے خاص عقاید یہ تھے:۔  
یعنی خدا کی صفات عین ذات ہیں (۲) مسئلہ قدر یعنی انسان خود اپنے افعال کا ذمہ دار ہے۔

اگرچہ معتزلہ کوئی مذہبی فرقہ نہ تھا بلکہ ایک دبستان خیال تھا جس میں سنی و شیعہ دونوں شامل تھے تاہم معتزلہ کا عقلی نظام سب سے  
زیادہ شیعوں میں مقبول ہوا لیکن اپنی بے انتہا آزاد خیالی کی بنا پر اسے اکبر نے کاموق نہ دیا گیا۔ اس فرقے کے دوسرے زبردست نمائندے  
یہ تھے:۔

عمر بن عبد اللہ (۲۹۹ء - ۳۷۷ء)۔ یہ بھی خواجہ حسن بھری کے شاگرد تھے واصل نے انھیں اپنے ساتھ طلب کیا تھا۔ قدیم عقیدہ  
رکھتے تھے۔ معتزلہ کی شاخ عمرہ انھیں سے منسوب ہے۔ واصل کا گروہ بغداد سے اور عمر کا گروہ بصرہ سے تعلق رکھتا تھا۔

ابو الہذیل (ولادت ۳۵۳ء - وفات ۴۵۰ء یا ۴۵۱ء) ایمان کے استاد اور بصرہ کے علماء اعتزال کے پیشوا تھے۔ فرقہ ہذیلیہ انھیں  
کے نام سے منسوب ہے، اس کے خاص خاص عقاید یہ تھے:۔ (۱) خدا عالم اس کی قدرت اس کا وجود عین ذات ہیں (۲) خدا کے بعض  
ارادے ایسے ہیں جن کا کوئی عمل نہیں جیسے خدا کا قول کن اور عین از دول کا محل ہے جیسے او امر و نہی۔ (۳) خدا کے مقدرات محدود ہیں کسی  
چیز کو وجود میں لانا، فنا کرنا اور مارتا اس کے دائرہ قدرت سے باہر ہے۔ (۴) احکام شرع کے واجب ہونے سے پہلے عقل کے ذریعہ خدا کا  
پہچاننا واجب ہے (۵) خدا کا ارادہ اور وہ چیز جس کا وہ ارادہ کرتا ہے دونوں ایک ہیں۔

نظام ولادت ۳۸۵ء وفات ۴۵۰ء اور ۴۵۱ء کے درمیان)۔ بصرہ میں نشوونما ہوا اور عمر کا آخری حصہ بغداد میں بسر کیا۔  
ان کے خاص عقاید یہ تھے:۔ (۱) ہر ہی اور کثرہ خدا کی قدرت سے خارج ہیں۔ (۲) احکام شرع کے وارد ہونے سے قبل "لا یل عقل سے  
خدا کی معرفت حاصل کرنا چاہیے۔

الجاحظ - (متوفی ۸۶۵ء یا ۸۶۹ء) نظام کے شاگرد تھے اور جماعت معتزلہ کے بڑے مقبول امام۔ ان کے خصوص عقاید یہ تھے:۔  
(۱) کوئی مادی جسم معدوم نہیں ہوتا۔ (۲) خدا کثرتوں کا دار و رہبر نہیں کرتا۔ (۳) خدا کی رویت ناممکن ہے۔ یہ مذہب اعتزال کے خاص فرقہ  
جاحظیہ کے بانی تھے۔

الجہانی - (متوفی ۹۱۵ء) آخر وقت تک مسلک اعتزال پر قائم رہے۔ وہ صفات باری کو عین ذات قرار دیتے تھے۔

۱۔ نگار سالانہ صفحہ ۴۴۔ تفصیل کے لئے مولوی خضر علی خاں کی کتاب "فلسفہ ابن سینا" ملاحظہ ہو۔ ۲۔ اردو میں اس کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے  
ملاحظہ ہو صفحہ ۱۲۱ ترقی اردو نمبر ۶۔ القول الاخر ترجمہ الفول الاصرر ترجمہ مولانا حکیم محمد حسن صاحب فاروقی (۱۹۲۳ء)۔ ۳۔ مولانا عبد السلام ندوی  
"علمائے اسلام" حصہ اول صفحہ ۲۳۸۔ ۴۔ ڈاکٹر ذوال "فلسفہ عجم" مترجمہ میر حسن الدین (حیدر آباد دکن) صفحات ۵۰-۵۱۔ ۵۔ سالانہ "نگار"  
۶۔ صفحہ ۱۰۶۔ ۷۔ ایضاً صفحہ ۱۰۶۔ ۸۔ دجلہ میں تصنیف کی "سلیت" صفحہ ۱۰۶۔ ۹۔ قرآن کی آیت ہے "بب وہ کچھ کرنا چاہتا ہے تو (یہ نہیں کہہ سکتا  
کرنا چاہتا ہے بلکہ آیت کہتا ہے کہ بویا، پس جو جاتا ہے (دکن ٹیکون) ۱۰۔ سالانہ "نگار" صفحہ ۵۵۔ ۱۱۔ صفحہ ۴۹۔ ۱۲۔ صفحات ۱۱۸-۱۱۹۔ ۱۳۔ صفحات ۱۱۸-۱۱۹۔ ۱۴۔ صفحہ ۱۱۸۔

## اشاعرہ

ابو الحسن الاشعری - (۳۰۰ھ - ۳۴۹ھ) - الجبائی کے شاگرد تھے لیکن بعد کو اپنے استاد سے منحرف ہو گئے اور اعتزال کے خلاف متعدد وسائل لکھے۔ انھوں نے خدا کو جمیعت اور انسانیت سے بالاتر قرار دیا اور اُسے قادر مطلق، فعال مطلق اور عالم مطلق قرار دیا حیات بعد ممات اور دیدار الہی کی تائید کی۔

طحاوی اور ماتریدی - \_\_\_\_\_ بھی اشعری کے ہم عصر تھے اور معتزلی عقاید کے مخالف تھے۔ ماتریدی نے اللہ کی ابدی صفات میں ٹکوتین (جنات) کا اضافہ کیا تھا۔ اس صفت کے دوسرے نام نلق (پیدا کرنا)، احیاء (جان ڈالنا)، رزق (خوراک جیسا کرنا) اور ابات (بار ڈالنا) ہیں۔ انھیں "صفات الافعال" کہتے ہیں۔ اشعری کے نزدیک یہ پیدا ہوتی ہیں لیکن ماتریدی مسلک کے ماننے والوں کے نزدیک ابدی ہیں۔ انسان مجبر ہے یا مختار۔ اس باب میں اشعری نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ ہر انسان میں اکتساب کا مادہ ہوتا ہے جو اگرچہ خدا کی طرف سے ہے لیکن اس کے استعمال کرنے میں انسان کی مرضی کو بھی دخل ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم کسی حد تک مختار ہیں، گویا اشعری نے درمیانی راستہ اختیار کیا تھا لیکن ماتریدی نے صاف کہہ دیا کہ ہمیں اپنے افعال میں پورا "اختیار" حاصل ہے اور اس کے لئے ہمیں سزا یا جزا ملے گی۔

فقہ اکبر دوم جو سنہ ۳۰۰ھ میں مرتب کی گئی تھی بیشتر اشعری کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ یہ ۲۹ مقالات پر مشتمل ہے جن میں سے اہم ترین کا خلاصہ یہ ہے -

اللہ خیر و شر کا حاکم مطلق ہے۔ وہ اپنی مخلوقات سے کسی طرح بھی مشابہ نہیں ہے۔ وہ ابد سے معہ اپنی صفات کے موجود ہے۔ یہ صفتیں اُس کے جوہر اور افعال سے متعلق ہیں۔ قرآن خدا کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے لیکن موسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کا کلام مخلوق ہے۔ جہاں پر قرآن میں خدا نے موسیٰ اور دوسرے پیغمبروں سے خطاب کیا ہے تو یہ اُس کا کلام اُن کی نسبت سے ہے۔ ہم الفاظ اور حروف کے ذریعہ مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں لیکن اللہ کو اس کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک تشبیہی عقاید کا تعلق ہے خدا کے چہرہ، ہاتھ اور روح ہے لیکن ان کا تعلق اُس کی صفات سے ہے جسم سے نہیں ہے۔ لوح محفوظ میں گزشتہ اور آئندہ زمانہ کے واقعات بیان شدہ انداز میں لکھے ہیں بطور مقدمہ کے نہیں۔ خدا اپنی کسی بھی مخلوق کو تجویز نہیں کرتا۔ انسان کے تمام افعال اکتسابی ہیں لیکن خدا اُن کو پیدا کرتا ہے اور وہ اُس کی مرضی سے سرزد ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ گناہ کا مرتکب ہمیشہ کے لئے دوزخ میں ڈال دیا جائے۔ اللہ اُسے معاف بھی کر سکتا ہے۔ رسول کی حمایت سے بھی گناہ معاف ہو سکتے ہیں موعنین خدا کا بہشت میں جلوہ دیکھیں گے اور اپنے جسم کی آنکھوں سے اور اُس وقت اُن میں اور خالق کے درمیان کوئی فاصلہ نہ ہوگا۔

یہاں پر "خدا کے کلام" کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ آسمان کا سب سے بلند مقام عرش ہے اُس کے نیچے گرجی ہے، گرجی پر لوح محفوظ ہے جس پر گزشتہ و آئندہ زمانہ کے تمام حالات منقوش ہیں۔ قرآن مجید بھی لوح محفوظ میں موجود ہے (سورۃ البروج کی آیات ۲۱-۲۲ میں اس کا ذکر ہے) اور ارضی قرآن اسی لوح محفوظ سے منقول ہے۔ معتزلہ اسے ماننے کے لئے طیارہ تھے۔ اُن کی حجت یہ تھی کہ اگر قرآن ابدی اور غیر مخلوق ہے تو پھر اُسے دوسرا خدا ہونا چاہئے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن میں بعض مقامات پر موسیٰ (اور دوسرے پیغمبروں) سے خطاب کیا گیا ہے اب یہ الفاظ کیسے ابدی اور غیر مخلوق ہو سکتے ہیں جبکہ موسیٰ ایک خاص وقت میں پیدا ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ معتزلی حکماء نے اعلان کیا کہ قرآن حادث ہے اور جو اس سے انکار کرتا

اسے سراہا اور سزا دی جاتی ہے۔ کیونکہ بعض مسلم حکمران معتزلی خیال کے ہو گئے تھے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی اہل حدیث اور عوام معتزلہ سے برگشتہ ہو گئے اور اسی رد عمل کے سلسلہ میں اشاعرہ کا فرقہ وجود میں آیا۔

اشراقیین — اس فرقہ کے بانی شہاب الدین سہروردی (۵۲۱ھ - ۵۹۱ھ) تھے۔ وہ فلسفہ میں ارسطو اور ابن سینا کے تابع تھے۔ انھوں نے فلسفہ، مذہب اور تصوف قینوں کو ملا کر ایک نیا نظریہ مذہب و اخلاق کا پیش کیا جسے حکمت اشراق کہتے ہیں۔ دراصل وہ حکمائے ایران کے سخت معتقد تھے اور ان کے فلسفہ کو زندہ کرنا چاہتے تھے۔ اپنی مشہور کتاب حکمت الاشراق کے مختلف مقامات پر انھوں نے زردشت وغیرہ کا نام نہایت ادب و احترام سے لیا ہے اور ان کے فلسفیانہ نظریات کی تائید کی ہے یہی وجہ تھی کہ فقہانے ان پر کفر والحاد کا فتویٰ لگایا اور بعض سیاسی بدگمانیوں کی وجہ سے ۳۶ سال کی عمر میں سلطان صلاح الدین کے حکم سے قتل کر دئے گئے۔ بہر حال ان کے زمانہ میں ان کا فلسفہ بہت مقبول تھا اور ان کی کتاب (حکمت الاشراق) اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔

ملاحدہ — فلسفیانہ غور و غوض کے مسلمانوں میں بڑی آواز خیالی پیدا کر دی تھی۔ یہاں تک کہ اس آزاد روی نے نمایاں طور پر احادی کی شکل اختیار کر لی اور وقتاً فوقتاً مختلف حکماء اسلام کو قرار دئے گئے۔ شیخے ان کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔  
 احمد بن حنبل (تیسری صدی ہجری) مشہور معتزلی امام نظام کے شاگرد تھے۔ یہ تنازعہ کے قابل تھے اور انہیں سمجھ کے مخالف — حیوانات میں بھی اولیا و انبیاء کے پیدا ہونے کے معتقد تھے۔ رسول اللہ کی کثرت ازواج پر معترض تھے اور ابو ذر غفاری کو رسول اللہ سے زیادہ زاہد و متواضع سمجھتے تھے۔ انھیں عام طور پر محد خیال کہا جاتا ہے۔  
 ابوبکر رازمی (۶۲۳ھ - ۶۹۲ھ) — پانچ چودوں کو قدیم تسلیم کرتے تھے (خالق، روح، مادہ، وقت اور فضا) کیونکہ خدا کے تصور کے ساتھ ان چودوں کو قدیم تسلیم کرنا ضروری ہے۔ تخلیق کے باب میں وہ اس بات کے قابل تھے کہ کائنات (مبیوی مطلقہ) کی تخلیق سے قبل منتشر اجزاء و لا تجزئی پائے جاتے تھے اور انھیں اجزاء سے بعد کو زمین، ہوا، پانی، آگ اور سارے وجود میں آئے۔

اخلاقیات میں وہ ترک دنیا کے قابل نہ تھے۔ مذہبیات میں انھوں نے معتزلہ کی بھی مخالفت کی ہے اور غالی شیعوں کی بھی۔ لگے دہرے یا محدود ہونے کے ثبوت میں ان کی دو کتابیں پیش کی جاتی ہیں ”مخارج الانبیاء“ اور ”فقد الادیان“ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱) ان کے نزدیک تمام انسان ضرور ایکساں و برابر ہیں۔ (۲) انبیاء کو کسی خاص ذمہ داری یا روحانی برتری کے حامل نہیں تھے۔ (۳) معجزے مکر و فریب ہیں یا غش تھے کہ انہیں۔ (۴) دنیا میں جنگ و فساد کا باعث صرف مذہب ہے۔ (۵) عقل و مذہب میں قطعی ممکن نہیں۔ (۶) الہامی کتابوں سے زیادہ انسانی خدمت اخلاطوں، ارسطو، اقلیدس اور بقراط کی ہے۔

ابن رشد (۱۱۶۹ھ - ۱۲۰۱ھ) اسپین کے سب سے بڑے فلسفی و حکیم تھے۔ الحاد کے الزام میں یہ جلا وطن کر دئے گئے تھے لیکن پھر واپس بلائے گئے۔ جن مسائل میں ابن رشد پر محدود ہونے کا الزام لگایا گیا وہ کائنات کی قدامت، بقا و روح اور حشر و نشر کے عقاید سے متعلق تھے۔ وہ مروجہ عقاید اسلامی کے بالکل منکر نہ تھے لیکن وہ انھیں عقل و فلسفہ سے مطابق کرنا چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر قرآن میں کوئی بیان ایسا نظر آتا ہے جو عقل کے خلاف ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا مفہوم کچھ اور ہے جسے عقلی حیثیت سے سمجھنا چاہئے۔ علماء و فلاں انھیں عقاید کی وجہ سے مخالف تھے اور محدود کہتے تھے۔

تیسری (۶۳۰ء - ۶۳۹ء) کے الحاد کے متعلق علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ ۶۳۹ء میں جبکہ وہ قاہرہ میں تھے ان سے بات خداوندی کے متعلق استفسار کیا گیا۔ ان کے جواب سے شافعی علماء پرہم ہو گئے اور پروفیسری کے عہدہ سے ہٹا دیا۔ ۶۳۹ء میں دس الزام میں معہ اپنے دو بھائیوں کے نظر بند کر دئے گئے۔ وہ خدا کی جسمیت کے قابل تھے۔ غزالی اور ابن عربی کے مخالف تھے۔ فیہ کو بھی برا سمجھتے تھے اور ابن سینا کے فلسفہ پر بھی اعتراض کرتے تھے۔

حیان (چوتھی صدی ہجری) مشہور فقیہ، فیلسوف اور صوفی تھے۔ اپنے خدا کے خیالات کی وجہ سے بغداد سے نکال دئے گئے۔ راونڈی اور ابو العلاء المعری کی طرح ان کا بھی زمانہ میں شمار ہوتا تھا۔

۱۱۔ الراونڈی - تیسری صدی ہجری کا محد اعظم تھا۔ پہلے اُس نے مذہب اعتزال اختیار کیا لیکن جاتی ہی میں خدا اور دہر ہو گیا، نے تمام انبیاء کی تردید میں کتابیں لکھیں اور قرآن کے مقابلہ میں بھی ایک کتاب تصنیف کی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ انبیاء افسانوی کو ہی شیعہوں سے دھوکے دیا کرتے تھے۔ کتاب الذرائع میں کہتا ہے: خدا کے پاس قتل و غارت کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، جو ہمیشہ کینہ پرور غضبناک دشمن کیا کرتا ہے، پھر کتاب اور رسول بھیجے کی کیا حاجت تھی؟

ایک جگہ لکھتا ہے: یہ خدا کا زعم ہے کہ وہ عالم الغیب ہے۔ چنانچہ قرآن میں کہتا ہے کہ (وما تسقط من ورقۃ الا یعلمہا) یعنی خدا جانتے کو بھی جانتا ہے جو درخت سے ٹوٹ کر گرتا ہے۔ اسی طرح اُس نے جنت کا بھی مذاق اڑایا ہے۔ اُس کا یہ بھی خیال تھا کہ دنیا کچھ یہاں نظر آتا ہے اور چاند تارے وغیرہ قدیم ہیں۔ ان کا بنانے والا کوئی نہیں ہے۔

۱۲۔ العلاء المعری (۶۲۶ء - ۷۰۹ء) کو عام طور پر محد خیال کیا جاتا ہے، لیکن وہ موجد تھے۔ البتہ خدا کا تصور ان کے یہاں موجود تصور سے علو تھا۔ وہ وحی اور الہام کے قابل تھے۔ وہ مذہب کو خود انسانی ذہن و دماغ کی تخلیق سمجھتے تھے۔ وہ روشنی اور بقا و روح کے بھی معتقد تھے۔ وہ نماز، روزہ سے زیادہ بلندی اخلاق کے قابل تھے۔

۱۳۔ الفزازی (۵۸۷ء - ۶۸۷ء) اسلام کے نہایت مشہور مفکر و متکلم تھے وہ ابتدا ہی سے ہر مسئلہ میں ذاتی و فکر سے کام لیتے تھے۔ عرصہ تک فلسفہ کے مطالعہ میں منہمک رہے اور عقاید مذہبی سے منحرف ہو گئے۔ بالآخر جب علوم ظاہری ان کی تشریف نہ ہوئی تو تصوف کی طرف مایل ہوئے اور کچھ خدا رسول و شرف و نشر تمام باتوں کے قابل ہو گئے۔ اُس وقت جبکہ فلسفہ کے بلکہ میں مذہب کے پاؤں اکھڑے جا رہے تھے غزالی نے بڑا کام کیا۔ انہوں نے فلسفہ پر دو کتابیں لکھیں: (۱) مقاصد الفلاسفہ، (۲) تحفۃ الفلاسفہ۔ یہ آخری کتاب فلسفہ کی تردید میں لکھی گئی تھی اس کی وجہ تصنیف کے متعلق امام موصوف دہباجہ میں فرماتے ہیں کہ مذہب اسلام سے مسلمانوں کے برگشتہ ہونے کا سبب اکابر فلاسفہ سقراط، بقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ کے نام ہیں کہ یہ لوگ مذہب کے منکر تھے لہذا ان کے متبعین نے بھی تقاید لاد مذہبیت اختیار کی لیکن خود فلسفیوں کا مذہب بھی یقینی نہیں ظنی ہے۔ وہ ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں حتیٰ کہ ارسطو اپنے استاد افلاطون کے اقوال کو بھی رد کر دیتا ہے لیکن ان کے عقلی الہیات مثل ریاضی و منطق کے صحیح ہوتے تو اس قدر اختلاف آراء نہ ہوتا۔ اس پر ترجمین نے ترجموں میں جو تحریفیں کی ہیں سستزا دیں۔ لہذا فلاسفہ قدیم کی غلطیوں کے اظہار اور ان کے رد کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

غزالی نے اپنی کتاب میں مختلف مقامات پر اس امر کا اظہار کیا ہے کہ اس کتاب کا مقصد فلسفیوں کے مذہب کی تردید ہے، مدافعت اور یہ مقصد پورا ہو چکا ہے۔ اس کتاب نے مسلمانوں کے خیالات کو بہت متاثر کیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس کی وجہ سے مشرق

۱۴۔ سالنامہ جگہ ۱۹۵۷ء صفحہ ۶۶ - ۶۷ - ۶۸ - ۶۹ - ۷۰ - ۷۱ - ۷۲ - ۷۳ - ۷۴ - ۷۵ - ۷۶ - ۷۷ - ۷۸ - ۷۹ - ۸۰ - ۸۱ - ۸۲ - ۸۳ - ۸۴ - ۸۵ - ۸۶ - ۸۷ - ۸۸ - ۸۹ - ۹۰ - ۹۱ - ۹۲ - ۹۳ - ۹۴ - ۹۵ - ۹۶ - ۹۷ - ۹۸ - ۹۹ - ۱۰۰ - ۱۰۱ - ۱۰۲ - ۱۰۳ - ۱۰۴ - ۱۰۵ - ۱۰۶ - ۱۰۷ - ۱۰۸ - ۱۰۹ - ۱۱۰ - ۱۱۱ - ۱۱۲ - ۱۱۳ - ۱۱۴ - ۱۱۵ - ۱۱۶ - ۱۱۷ - ۱۱۸ - ۱۱۹ - ۱۲۰ - ۱۲۱ - ۱۲۲ - ۱۲۳ - ۱۲۴ - ۱۲۵ - ۱۲۶ - ۱۲۷ - ۱۲۸ - ۱۲۹ - ۱۳۰ - ۱۳۱ - ۱۳۲ - ۱۳۳ - ۱۳۴ - ۱۳۵ - ۱۳۶ - ۱۳۷ - ۱۳۸ - ۱۳۹ - ۱۴۰ - ۱۴۱ - ۱۴۲ - ۱۴۳ - ۱۴۴ - ۱۴۵ - ۱۴۶ - ۱۴۷ - ۱۴۸ - ۱۴۹ - ۱۵۰ - ۱۵۱ - ۱۵۲ - ۱۵۳ - ۱۵۴ - ۱۵۵ - ۱۵۶ - ۱۵۷ - ۱۵۸ - ۱۵۹ - ۱۶۰ - ۱۶۱ - ۱۶۲ - ۱۶۳ - ۱۶۴ - ۱۶۵ - ۱۶۶ - ۱۶۷ - ۱۶۸ - ۱۶۹ - ۱۷۰ - ۱۷۱ - ۱۷۲ - ۱۷۳ - ۱۷۴ - ۱۷۵ - ۱۷۶ - ۱۷۷ - ۱۷۸ - ۱۷۹ - ۱۸۰ - ۱۸۱ - ۱۸۲ - ۱۸۳ - ۱۸۴ - ۱۸۵ - ۱۸۶ - ۱۸۷ - ۱۸۸ - ۱۸۹ - ۱۹۰ - ۱۹۱ - ۱۹۲ - ۱۹۳ - ۱۹۴ - ۱۹۵ - ۱۹۶ - ۱۹۷ - ۱۹۸ - ۱۹۹ - ۲۰۰ - ۲۰۱ - ۲۰۲ - ۲۰۳ - ۲۰۴ - ۲۰۵ - ۲۰۶ - ۲۰۷ - ۲۰۸ - ۲۰۹ - ۲۱۰ - ۲۱۱ - ۲۱۲ - ۲۱۳ - ۲۱۴ - ۲۱۵ - ۲۱۶ - ۲۱۷ - ۲۱۸ - ۲۱۹ - ۲۲۰ - ۲۲۱ - ۲۲۲ - ۲۲۳ - ۲۲۴ - ۲۲۵ - ۲۲۶ - ۲۲۷ - ۲۲۸ - ۲۲۹ - ۲۳۰ - ۲۳۱ - ۲۳۲ - ۲۳۳ - ۲۳۴ - ۲۳۵ - ۲۳۶ - ۲۳۷ - ۲۳۸ - ۲۳۹ - ۲۴۰ - ۲۴۱ - ۲۴۲ - ۲۴۳ - ۲۴۴ - ۲۴۵ - ۲۴۶ - ۲۴۷ - ۲۴۸ - ۲۴۹ - ۲۵۰ - ۲۵۱ - ۲۵۲ - ۲۵۳ - ۲۵۴ - ۲۵۵ - ۲۵۶ - ۲۵۷ - ۲۵۸ - ۲۵۹ - ۲۶۰ - ۲۶۱ - ۲۶۲ - ۲۶۳ - ۲۶۴ - ۲۶۵ - ۲۶۶ - ۲۶۷ - ۲۶۸ - ۲۶۹ - ۲۷۰ - ۲۷۱ - ۲۷۲ - ۲۷۳ - ۲۷۴ - ۲۷۵ - ۲۷۶ - ۲۷۷ - ۲۷۸ - ۲۷۹ - ۲۸۰ - ۲۸۱ - ۲۸۲ - ۲۸۳ - ۲۸۴ - ۲۸۵ - ۲۸۶ - ۲۸۷ - ۲۸۸ - ۲۸۹ - ۲۹۰ - ۲۹۱ - ۲۹۲ - ۲۹۳ - ۲۹۴ - ۲۹۵ - ۲۹۶ - ۲۹۷ - ۲۹۸ - ۲۹۹ - ۳۰۰ - ۳۰۱ - ۳۰۲ - ۳۰۳ - ۳۰۴ - ۳۰۵ - ۳۰۶ - ۳۰۷ - ۳۰۸ - ۳۰۹ - ۳۱۰ - ۳۱۱ - ۳۱۲ - ۳۱۳ - ۳۱۴ - ۳۱۵ - ۳۱۶ - ۳۱۷ - ۳۱۸ - ۳۱۹ - ۳۲۰ - ۳۲۱ - ۳۲۲ - ۳۲۳ - ۳۲۴ - ۳۲۵ - ۳۲۶ - ۳۲۷ - ۳۲۸ - ۳۲۹ - ۳۳۰ - ۳۳۱ - ۳۳۲ - ۳۳۳ - ۳۳۴ - ۳۳۵ - ۳۳۶ - ۳۳۷ - ۳۳۸ - ۳۳۹ - ۳۴۰ - ۳۴۱ - ۳۴۲ - ۳۴۳ - ۳۴۴ - ۳۴۵ - ۳۴۶ - ۳۴۷ - ۳۴۸ - ۳۴۹ - ۳۵۰ - ۳۵۱ - ۳۵۲ - ۳۵۳ - ۳۵۴ - ۳۵۵ - ۳۵۶ - ۳۵۷ - ۳۵۸ - ۳۵۹ - ۳۶۰ - ۳۶۱ - ۳۶۲ - ۳۶۳ - ۳۶۴ - ۳۶۵ - ۳۶۶ - ۳۶۷ - ۳۶۸ - ۳۶۹ - ۳۷۰ - ۳۷۱ - ۳۷۲ - ۳۷۳ - ۳۷۴ - ۳۷۵ - ۳۷۶ - ۳۷۷ - ۳۷۸ - ۳۷۹ - ۳۸۰ - ۳۸۱ - ۳۸۲ - ۳۸۳ - ۳۸۴ - ۳۸۵ - ۳۸۶ - ۳۸۷ - ۳۸۸ - ۳۸۹ - ۳۹۰ - ۳۹۱ - ۳۹۲ - ۳۹۳ - ۳۹۴ - ۳۹۵ - ۳۹۶ - ۳۹۷ - ۳۹۸ - ۳۹۹ - ۴۰۰ - ۴۰۱ - ۴۰۲ - ۴۰۳ - ۴۰۴ - ۴۰۵ - ۴۰۶ - ۴۰۷ - ۴۰۸ - ۴۰۹ - ۴۱۰ - ۴۱۱ - ۴۱۲ - ۴۱۳ - ۴۱۴ - ۴۱۵ - ۴۱۶ - ۴۱۷ - ۴۱۸ - ۴۱۹ - ۴۲۰ - ۴۲۱ - ۴۲۲ - ۴۲۳ - ۴۲۴ - ۴۲۵ - ۴۲۶ - ۴۲۷ - ۴۲۸ - ۴۲۹ - ۴۳۰ - ۴۳۱ - ۴۳۲ - ۴۳۳ - ۴۳۴ - ۴۳۵ - ۴۳۶ - ۴۳۷ - ۴۳۸ - ۴۳۹ - ۴۴۰ - ۴۴۱ - ۴۴۲ - ۴۴۳ - ۴۴۴ - ۴۴۵ - ۴۴۶ - ۴۴۷ - ۴۴۸ - ۴۴۹ - ۴۵۰ - ۴۵۱ - ۴۵۲ - ۴۵۳ - ۴۵۴ - ۴۵۵ - ۴۵۶ - ۴۵۷ - ۴۵۸ - ۴۵۹ - ۴۶۰ - ۴۶۱ - ۴۶۲ - ۴۶۳ - ۴۶۴ - ۴۶۵ - ۴۶۶ - ۴۶۷ - ۴۶۸ - ۴۶۹ - ۴۷۰ - ۴۷۱ - ۴۷۲ - ۴۷۳ - ۴۷۴ - ۴۷۵ - ۴۷۶ - ۴۷۷ - ۴۷۸ - ۴۷۹ - ۴۸۰ - ۴۸۱ - ۴۸۲ - ۴۸۳ - ۴۸۴ - ۴۸۵ - ۴۸۶ - ۴۸۷ - ۴۸۸ - ۴۸۹ - ۴۹۰ - ۴۹۱ - ۴۹۲ - ۴۹۳ - ۴۹۴ - ۴۹۵ - ۴۹۶ - ۴۹۷ - ۴۹۸ - ۴۹۹ - ۵۰۰ - ۵۰۱ - ۵۰۲ - ۵۰۳ - ۵۰۴ - ۵۰۵ - ۵۰۶ - ۵۰۷ - ۵۰۸ - ۵۰۹ - ۵۱۰ - ۵۱۱ - ۵۱۲ - ۵۱۳ - ۵۱۴ - ۵۱۵ - ۵۱۶ - ۵۱۷ - ۵۱۸ - ۵۱۹ - ۵۲۰ - ۵۲۱ - ۵۲۲ - ۵۲۳ - ۵۲۴ - ۵۲۵ - ۵۲۶ - ۵۲۷ - ۵۲۸ - ۵۲۹ - ۵۳۰ - ۵۳۱ - ۵۳۲ - ۵۳۳ - ۵۳۴ - ۵۳۵ - ۵۳۶ - ۵۳۷ - ۵۳۸ - ۵۳۹ - ۵۴۰ - ۵۴۱ - ۵۴۲ - ۵۴۳ - ۵۴۴ - ۵۴۵ - ۵۴۶ - ۵۴۷ - ۵۴۸ - ۵۴۹ - ۵۵۰ - ۵۵۱ - ۵۵۲ - ۵۵۳ - ۵۵۴ - ۵۵۵ - ۵۵۶ - ۵۵۷ - ۵۵۸ - ۵۵۹ - ۵۶۰ - ۵۶۱ - ۵۶۲ - ۵۶۳ - ۵۶۴ - ۵۶۵ - ۵۶۶ - ۵۶۷ - ۵۶۸ - ۵۶۹ - ۵۷۰ - ۵۷۱ - ۵۷۲ - ۵۷۳ - ۵۷۴ - ۵۷۵ - ۵۷۶ - ۵۷۷ - ۵۷۸ - ۵۷۹ - ۵۸۰ - ۵۸۱ - ۵۸۲ - ۵۸۳ - ۵۸۴ - ۵۸۵ - ۵۸۶ - ۵۸۷ - ۵۸۸ - ۵۸۹ - ۵۹۰ - ۵۹۱ - ۵۹۲ - ۵۹۳ - ۵۹۴ - ۵۹۵ - ۵۹۶ - ۵۹۷ - ۵۹۸ - ۵۹۹ - ۶۰۰ - ۶۰۱ - ۶۰۲ - ۶۰۳ - ۶۰۴ - ۶۰۵ - ۶۰۶ - ۶۰۷ - ۶۰۸ - ۶۰۹ - ۶۱۰ - ۶۱۱ - ۶۱۲ - ۶۱۳ - ۶۱۴ - ۶۱۵ - ۶۱۶ - ۶۱۷ - ۶۱۸ - ۶۱۹ - ۶۲۰ - ۶۲۱ - ۶۲۲ - ۶۲۳ - ۶۲۴ - ۶۲۵ - ۶۲۶ - ۶۲۷ - ۶۲۸ - ۶۲۹ - ۶۳۰ - ۶۳۱ - ۶۳۲ - ۶۳۳ - ۶۳۴ - ۶۳۵ - ۶۳۶ - ۶۳۷ - ۶۳۸ - ۶۳۹ - ۶۴۰ - ۶۴۱ - ۶۴۲ - ۶۴۳ - ۶۴۴ - ۶۴۵ - ۶۴۶ - ۶۴۷ - ۶۴۸ - ۶۴۹ - ۶۵۰ - ۶۵۱ - ۶۵۲ - ۶۵۳ - ۶۵۴ - ۶۵۵ - ۶۵۶ - ۶۵۷ - ۶۵۸ - ۶۵۹ - ۶۶۰ - ۶۶۱ - ۶۶۲ - ۶۶۳ - ۶۶۴ - ۶۶۵ - ۶۶۶ - ۶۶۷ - ۶۶۸ - ۶۶۹ - ۶۷۰ - ۶۷۱ - ۶۷۲ - ۶۷۳ - ۶۷۴ - ۶۷۵ - ۶۷۶ - ۶۷۷ - ۶۷۸ - ۶۷۹ - ۶۸۰ - ۶۸۱ - ۶۸۲ - ۶۸۳ - ۶۸۴ - ۶۸۵ - ۶۸۶ - ۶۸۷ - ۶۸۸ - ۶۸۹ - ۶۹۰ - ۶۹۱ - ۶۹۲ - ۶۹۳ - ۶۹۴ - ۶۹۵ - ۶۹۶ - ۶۹۷ - ۶۹۸ - ۶۹۹ - ۷۰۰ - ۷۰۱ - ۷۰۲ - ۷۰۳ - ۷۰۴ - ۷۰۵ - ۷۰۶ - ۷۰۷ - ۷۰۸ - ۷۰۹ - ۷۱۰ - ۷۱۱ - ۷۱۲ - ۷۱۳ - ۷۱۴ - ۷۱۵ - ۷۱۶ - ۷۱۷ - ۷۱۸ - ۷۱۹ - ۷۲۰ - ۷۲۱ - ۷۲۲ - ۷۲۳ - ۷۲۴ - ۷۲۵ - ۷۲۶ - ۷۲۷ - ۷۲۸ - ۷۲۹ - ۷۳۰ - ۷۳۱ - ۷۳۲ - ۷۳۳ - ۷۳۴ - ۷۳۵ - ۷۳۶ - ۷۳۷ - ۷۳۸ - ۷۳۹ - ۷۴۰ - ۷۴۱ - ۷۴۲ - ۷۴۳ - ۷۴۴ - ۷۴۵ - ۷۴۶ - ۷۴۷ - ۷۴۸ - ۷۴۹ - ۷۵۰ - ۷۵۱ - ۷۵۲ - ۷۵۳ - ۷۵۴ - ۷۵۵ - ۷۵۶ - ۷۵۷ - ۷۵۸ - ۷۵۹ - ۷۶۰ - ۷۶۱ - ۷۶۲ - ۷۶۳ - ۷۶۴ - ۷۶۵ - ۷۶۶ - ۷۶۷ - ۷۶۸ - ۷۶۹ - ۷۷۰ - ۷۷۱ - ۷۷۲ - ۷۷۳ - ۷۷۴ - ۷۷۵ - ۷۷۶ - ۷۷۷ - ۷۷۸ - ۷۷۹ - ۷۸۰ - ۷۸۱ - ۷۸۲ - ۷۸۳ - ۷۸۴ - ۷۸۵ - ۷۸۶ - ۷۸۷ - ۷۸۸ - ۷۸۹ - ۷۹۰ - ۷۹۱ - ۷۹۲ - ۷۹۳ - ۷۹۴ - ۷۹۵ - ۷۹۶ - ۷۹۷ - ۷۹۸ - ۷۹۹ - ۸۰۰ - ۸۰۱ - ۸۰۲ - ۸۰۳ - ۸۰۴ - ۸۰۵ - ۸۰۶ - ۸۰۷ - ۸۰۸ - ۸۰۹ - ۸۱۰ - ۸۱۱ - ۸۱۲ - ۸۱۳ - ۸۱۴ - ۸۱۵ - ۸۱۶ - ۸۱۷ - ۸۱۸ - ۸۱۹ - ۸۲۰ - ۸۲۱ - ۸۲۲ - ۸۲۳ - ۸۲۴ - ۸۲۵ - ۸۲۶ - ۸۲۷ - ۸۲۸ - ۸۲۹ - ۸۳۰ - ۸۳۱ - ۸۳۲ - ۸۳۳ - ۸۳۴ - ۸۳۵ - ۸۳۶ - ۸۳۷ - ۸۳۸ - ۸۳۹ - ۸۴۰ - ۸۴۱ - ۸۴۲ - ۸۴۳ - ۸۴۴ - ۸۴۵ - ۸۴۶ - ۸۴۷ - ۸۴۸ - ۸۴۹ - ۸۵۰ - ۸۵۱ - ۸۵۲ - ۸۵۳ - ۸۵۴ - ۸۵۵ - ۸۵۶ - ۸۵۷ - ۸۵۸ - ۸۵۹ - ۸۶۰ - ۸۶۱ - ۸۶۲ - ۸۶۳ - ۸۶۴ - ۸۶۵ - ۸۶۶ - ۸۶۷ - ۸۶۸ - ۸۶۹ - ۸۷۰ - ۸۷۱ - ۸۷۲ - ۸۷۳ - ۸۷۴ - ۸۷۵ - ۸۷۶ - ۸۷۷ - ۸۷۸ - ۸۷۹ - ۸۸۰ - ۸۸۱ - ۸۸۲ - ۸۸۳ - ۸۸۴ - ۸۸۵ - ۸۸۶ - ۸۸۷ - ۸۸۸ - ۸۸۹ - ۸۹۰ - ۸۹۱ - ۸۹۲ - ۸۹۳ - ۸۹۴ - ۸۹۵ - ۸۹۶ - ۸۹۷ - ۸۹۸ - ۸۹۹ - ۹۰۰ - ۹۰۱ - ۹۰۲ - ۹۰۳ - ۹۰۴ - ۹۰۵ - ۹۰۶ - ۹۰۷ - ۹۰۸ - ۹۰۹ - ۹۱۰ - ۹۱۱ - ۹۱۲ - ۹۱۳ - ۹۱۴ - ۹۱۵ - ۹۱۶ - ۹۱۷ - ۹۱۸ - ۹۱۹ - ۹۲۰ - ۹۲۱ - ۹۲۲ - ۹۲۳ - ۹۲۴ - ۹۲۵ - ۹۲۶ - ۹۲۷ - ۹۲۸ - ۹۲۹ - ۹۳۰ - ۹۳۱ - ۹۳۲ - ۹۳۳ - ۹۳۴ - ۹۳۵ - ۹۳۶ - ۹۳۷ - ۹۳۸ - ۹۳۹ - ۹۴۰ - ۹۴۱ - ۹۴۲ - ۹۴۳ - ۹۴۴ - ۹۴۵ - ۹۴۶ - ۹۴۷ - ۹۴۸ - ۹۴۹ - ۹۵۰ - ۹۵۱ - ۹۵۲ - ۹۵۳ - ۹۵۴ - ۹۵۵ - ۹۵۶ - ۹۵۷ - ۹۵۸ - ۹۵۹ - ۹۶۰ - ۹۶۱ - ۹۶۲ - ۹۶۳ - ۹۶۴ - ۹۶۵ - ۹۶۶ - ۹۶۷ - ۹۶۸ - ۹۶۹ - ۹۷۰ - ۹۷۱ - ۹۷۲ - ۹۷۳ - ۹۷۴ - ۹۷۵ - ۹۷۶ - ۹۷۷ - ۹۷۸ - ۹۷۹ - ۹۸۰ - ۹۸۱ - ۹۸۲ - ۹۸۳ - ۹۸۴ - ۹۸۵ - ۹۸۶ - ۹۸۷ - ۹۸۸ - ۹۸۹ - ۹۹۰ - ۹۹۱ - ۹۹۲ - ۹۹۳ - ۹۹۴ - ۹۹۵ - ۹۹۶ - ۹۹۷ - ۹۹۸ - ۹۹۹ - ۱۰۰۰ - ۱۰۰۱ - ۱۰۰۲ - ۱۰۰۳ - ۱۰۰۴ - ۱۰۰۵ - ۱۰۰۶ - ۱۰۰۷ - ۱۰۰۸ - ۱۰۰۹ - ۱۰۱۰ - ۱۰۱۱ - ۱۰۱۲ - ۱۰۱۳ - ۱۰۱۴ - ۱۰۱۵ - ۱۰۱۶ - ۱۰۱۷ - ۱۰۱۸ - ۱۰۱۹ - ۱۰۲۰ - ۱۰۲۱ - ۱۰۲۲ - ۱۰۲۳ - ۱۰۲۴ - ۱۰۲۵ - ۱۰۲۶ - ۱۰۲۷ - ۱۰۲۸ - ۱۰۲۹ - ۱۰۳۰ - ۱۰۳۱ - ۱۰۳۲ - ۱۰۳۳ - ۱۰۳۴ - ۱۰۳۵ - ۱۰۳۶ - ۱۰۳۷ - ۱۰۳۸ - ۱۰۳۹ - ۱۰۴۰ - ۱۰۴۱ - ۱۰۴۲ - ۱۰۴۳ - ۱۰۴۴ - ۱۰۴۵ - ۱۰۴۶ - ۱۰۴۷ - ۱۰۴۸ - ۱۰۴۹ - ۱۰۵۰ - ۱۰۵۱ - ۱۰۵۲ - ۱۰۵۳ - ۱۰۵۴ - ۱۰۵۵ - ۱۰۵۶ - ۱۰۵۷ - ۱۰۵۸ - ۱۰۵۹ - ۱۰۶۰ - ۱۰۶۱ - ۱۰۶۲ - ۱۰۶۳ - ۱۰۶۴ - ۱۰۶۵ - ۱۰۶۶ - ۱۰۶۷ - ۱۰۶۸ - ۱۰۶۹ - ۱۰۷۰ - ۱۰۷۱ - ۱۰۷۲ - ۱۰۷۳ - ۱۰۷۴ - ۱۰۷۵ - ۱۰۷۶ - ۱۰۷۷ - ۱۰۷۸ - ۱۰۷۹ - ۱۰۸۰ - ۱۰۸۱ - ۱۰۸۲ - ۱۰۸۳ - ۱۰۸۴ - ۱۰۸۵ - ۱۰۸۶ - ۱۰۸۷ - ۱۰۸۸ - ۱۰۸۹ - ۱۰۹۰ - ۱۰۹۱ - ۱۰۹۲ - ۱۰۹۳ - ۱۰۹۴ - ۱۰۹۵ - ۱۰۹۶ - ۱۰۹۷ - ۱۰۹۸ - ۱۰۹۹ - ۱۱۰۰ - ۱۱۰۱ - ۱۱۰۲ - ۱۱۰۳ - ۱۱۰۴ - ۱۱۰۵ - ۱۱۰۶ - ۱۱۰۷ - ۱۱۰۸ - ۱۱۰۹ - ۱۱۱۰ - ۱۱۱۱ - ۱۱۱۲ - ۱۱۱۳ - ۱۱۱۴ - ۱۱۱۵ - ۱۱۱۶ - ۱۱۱۷ - ۱۱۱۸ - ۱۱۱۹ - ۱۱۲۰ - ۱۱۲۱ - ۱۱۲۲ - ۱۱۲۳ - ۱۱۲۴ - ۱۱۲۵ - ۱۱۲۶ - ۱۱۲۷ - ۱۱۲۸ - ۱۱۲۹ - ۱۱۳۰ - ۱۱۳۱ - ۱۱۳۲ - ۱۱۳۳ - ۱۱۳۴ - ۱۱۳۵ - ۱۱۳۶ - ۱۱۳۷ - ۱۱۳۸ - ۱۱۳۹ - ۱۱۴۰ - ۱۱۴۱ - ۱۱۴۲ - ۱۱۴۳ - ۱۱۴۴ - ۱۱۴۵ - ۱۱۴۶ - ۱۱۴۷ - ۱۱۴۸ - ۱۱۴۹ - ۱۱۵۰ - ۱۱۵۱ - ۱۱۵۲ - ۱۱۵۳ - ۱۱۵۴ - ۱۱۵۵ - ۱۱۵۶ - ۱۱۵۷ - ۱۱۵۸ - ۱۱۵۹ - ۱۱۶۰ - ۱۱۶۱ - ۱۱۶۲ - ۱۱۶۳ - ۱۱۶۴ - ۱۱۶۵ - ۱۱۶۶ - ۱۱۶۷ - ۱۱۶۸ - ۱۱۶۹ - ۱۱۷۰ - ۱۱۷۱ - ۱۱۷۲ - ۱۱۷۳ - ۱۱۷۴ - ۱۱۷۵ - ۱۱۷۶ - ۱۱۷۷ - ۱۱۷۸ - ۱۱۷۹ - ۱۱۸۰ - ۱۱۸۱ - ۱۱۸۲ - ۱۱۸۳ - ۱۱۸۴ - ۱۱۸۵ - ۱۱۸۶ - ۱۱۸۷ - ۱۱۸۸ - ۱۱۸۹ - ۱۱۹۰ - ۱۱۹۱ - ۱۱۹۲ - ۱۱۹۳ - ۱۱۹۴ - ۱۱۹۵ - ۱۱۹۶ - ۱۱۹۷ - ۱۱۹۸ - ۱۱۹۹ - ۱۲۰۰ - ۱۲۰۱ - ۱۲۰۲ - ۱۲۰۳ - ۱۲۰۴ - ۱۲۰۵ - ۱۲۰۶ - ۱۲۰۷ - ۱۲۰۸ - ۱۲۰۹ - ۱۲۱۰ - ۱۲۱۱ - ۱۲۱۲ - ۱۲۱۳ - ۱۲۱۴ - ۱۲۱۵ - ۱۲۱۶ - ۱۲۱۷ - ۱۲۱۸ - ۱۲۱۹ - ۱۲۲۰ - ۱۲۲۱ - ۱۲۲۲ - ۱۲۲۳ - ۱۲۲۴ - ۱۲۲۵ - ۱۲۲۶ - ۱۲۲۷ - ۱۲۲۸ - ۱۲۲۹ - ۱۲۳۰ - ۱۲۳۱ - ۱۲۳۲ - ۱۲۳۳ - ۱۲۳۴ - ۱۲۳۵ - ۱۲۳۶ - ۱۲۳۷ - ۱۲۳۸ - ۱۲۳۹ - ۱۲۴۰ - ۱۲۴۱ - ۱۲۴۲ - ۱۲۴۳ - ۱۲۴۴ - ۱۲۴۵ - ۱۲۴۶ - ۱۲۴۷ - ۱۲۴۸ - ۱۲۴۹ - ۱۲۵۰ - ۱۲۵۱ - ۱۲۵۲ - ۱۲۵۳ - ۱۲۵۴ - ۱۲۵۵ - ۱۲۵۶ - ۱۲۵۷ - ۱۲۵۸ - ۱۲۵۹ - ۱۲۶۰ - ۱۲۶۱ - ۱۲۶۲ - ۱۲۶۳ - ۱۲۶۴ - ۱۲۶۵ - ۱۲۶۶ - ۱۲۶۷ - ۱۲۶۸ - ۱۲۶۹ - ۱۲۷۰ - ۱۲۷۱ - ۱۲۷۲ - ۱۲۷۳ - ۱۲۷۴ - ۱۲۷۵ - ۱۲۷۶ - ۱۲۷۷ - ۱۲۷۸ - ۱۲۷۹ - ۱۲۸۰ - ۱۲۸۱ - ۱۲۸۲ - ۱۲۸۳ - ۱۲۸۴ - ۱۲۸۵ - ۱۲۸۶ - ۱۲۸۷ - ۱۲۸۸ - ۱۲۸۹ - ۱۲۹۰ - ۱۲۹۱ - ۱۲۹۲ - ۱۲۹۳ - ۱۲۹۴ - ۱۲۹۵ - ۱۲۹۶ - ۱۲۹۷ - ۱۲۹۸ - ۱۲۹۹ - ۱۳۰۰ - ۱۳۰۱ - ۱۳۰۲ - ۱۳۰۳ - ۱۳۰۴ - ۱۳۰۵ - ۱۳۰۶ - ۱۳۰۷ - ۱۳۰۸ - ۱۳۰۹ - ۱۳۱۰ - ۱۳۱۱ - ۱۳۱۲ - ۱۳۱۳ - ۱۳۱۴ - ۱۳۱۵ - ۱۳۱۶ - ۱۳۱۷ - ۱۳۱۸ - ۱۳۱۹ - ۱۳۲۰ - ۱۳۲۱ - ۱۳۲۲ - ۱۳۲۳ - ۱۳۲۴ - ۱۳۲۵ - ۱۳۲۶ - ۱۳۲۷ - ۱۳۲۸ - ۱۳۲۹ - ۱۳۳۰ - ۱۳۳۱ - ۱۳۳۲ - ۱۳۳۳ - ۱۳۳۴ - ۱۳۳۵ - ۱۳۳۶ - ۱

فلسفہ بری طرح مجروح ہوا لیکن امام صاحب کی وفات کے ایک صدی بعد ابن رشد نے ”تہافت الفلاسفہ“ کی تردید میں ایک مستقل باب ”تہافت تہافت الفلاسفہ“ لکھی اور اس طرح فلسفہ کا احیاء ثانیہ کیا۔

**قل اور عقل کی کشمکش** مسلمانوں کی اکثریت، علما و فلو اہل اور اہل حدیث کا خیال ہے کہ مذہب کے مسائل میں عقل کو دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ قرآن و حدیث میں تاویل کرنے کے بجائے ظاہری معنی کو سامنے رکھنا چاہئے اور اس پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا چاہئے۔

عموماً لوگ خدا کے شخصی تصور کے حامل ہیں یعنی خدا کی ذات کو انسانی صورت و نہات سے متصف مانا جاتا ہے بحقیقت ایندول نے اس پر احتجاج کیا ہے۔ انھوں نے عقل کی رہنمائی میں قرآن و حدیث کو سمجھنے کی کوشش کی۔ معتزلہ نے خصوصاً مذہب کی بنیاد عقل رکھنا چاہی۔ فلسفہ اور منطق کو مشعل ہدایت بنا کر انھوں نے خدا کی ذات و صفات پر غور کیا۔ وہ وحدت الہی کے ماننے والے تھے لیکن خدا کی ذات کو صفات سے بری سمجھتے تھے اُس کی صرف ایک ہی سفت ہو سکتی ہے یعنی ابدیت۔ اُن کا کہنا تھا کہ قرآن میں خدا کے لئے تمام استعمال کئے گئے ہیں اور اُن سے جن صفات کا اظہار ہوتا ہے اگر خدا کو اُن جملہ صفات کا حامل مانا جائے تو اس سے خدا کی وحدت نا ہو جائے گی اور اُس میں کثرت کا اجتماع ماننا پڑے گا۔ وہ ہر قسم کے تشبیہ و استعارہ سے گریز کرتے تھے اور چونکہ قرآن میں خدا کے نعوں، آنکھوں اور چہرے کا ذکر ہے اور عرش پر قرار پکڑنے کا حوالہ ہے اس لئے ان امور کی عقلی توجیہ کرتے تھے۔ ان کے خیالات عوام نے خیالات سے قطعاً مختلف تھے۔ انھوں نے تنزیہ (پاک کرنا) اور تنخلف (مخالفت کرنا) کے اصول کو اس قدر بڑا کر دیا کہ محض ایسا ہی بدورہ کیا جس کی تعریف ہی نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً خدا کا ایک نام علیم (جانتے والا) ہے اب ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اسے کس چیز کا علم حاصل ہے۔ وہ چیز اُس کے اندر ہے یا باہر ہے پہلی صورت میں اُس کی ذات میں دوئی پیدا ہو جاتی ہے اور دوسری صورت میں اُس کا لحم کامل نہیں ہو سکتا۔ خارجی نے اس گتھی کو بید سلجھنا چاہا کہ خدا خود ہی تخلیل ہے، خود ہی عمل تخلیل اور خود ہی موضوع تخلیل، عقل ہ بقول تمہوں ہی اللہ ہیں لیکن یہ مسئلہ خاطر خواہ نہ سلجھا اور سچ تو یہ ہے کہ یہ سائل کبھی حل ہونے کے نہیں بلکہ جن حکماء نے یہ باہ ہے کہ ”خدا کی تعریف نہیں کی جاسکتی“ بالکل ٹھیک کہا ہے۔

ہم نے اوپر تنزیہ اور تنخلف کے اصول کا ذکر کیا ہے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بھی تفصیل کر دی جائے۔ تنزیہ کے معنی ہیں پاک کرنا یعنی اللہ کی ذات سے انسانی صورت و صفات کو علیحدہ کرنا۔ اور تنخلف کے بھی یہی معنی ہیں کہ ”ہر خیال جو غبارے و داغ میں آتا ہے فانی ہے اور اللہ اُس سے مختلف ہے“ (کل ما خطر لی باک، فا ہو باک واللہ فی خلاف ذالک) نہ دو اصولوں کے برتنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے ناموں سے اُس کی ذات کا کوئی صحیح تخلیل نہیں قائم کیا جاسکتا، اُس کی عظمت ہمیشہ زمر بہتہ رہے گی۔ — بایں ہمہ حکمائے اسلام کی اکثریت فلسفہ واجب الوجود کی قابل رہی ہے یعنی خدا اپنے وجود میں غیر کا محتاج نہیں سمجھتا جسما نیت سے معرا ہے اور جب یہ ثابت ہے کہ خدا کے جسم نہیں۔ تو یہ بھی ثابت ہے کہ خدا کے لئے آلات، ادراک، حواس ظاہری و طنی جیسے قوت لامسہ و ذائقہ و وہم و خیال اور افعال کے لئے اعضاء و جوارح نہیں ہیں وہ غیر مادی اور غیر متغیر ہے۔ متاثر ہونا اور متفعل ہونا اُس کے لئے محال ہے اور اُس کا حلی کسی شے میں ناممکن ہے وہ نقایس سے پاک اور جملہ کمالات سے متصف ہے، اُسکی صفات ہیں ذات ہیں خدا کی ذات و صفات کے بعد دوسرا مسئلہ جس پر علماء اسلام نے سب سے زیادہ بحث و مباحثہ کیا ہے مسئلہ جبر و اختیار جبر و اختیار ہے یعنی انسان اپنے افعال میں مختار ہے یا مجبور، وہ جو جی چاہے کر سکتا ہے یا سب کچھ منجانب اللہ دتا ہے قرآن کی آیت ہے: ”جس کو اللہ راہ دکھاوے وہی راہ پائے والے ہیں اور جس کو گمراہ کرے وہ خسارہ میں رہنے والے ہیں“ (۱۱۰/۱) ”ان میں متعدد مقامات پر خدا کا انسانوں کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر چمکرنے کا ذکر ہے (۱۱۰/۱، ۱۱۱/۱، ۱۱۲/۱، ۱۱۳/۱، ۱۱۴/۱، ۱۱۵/۱، ۱۱۶/۱، ۱۱۷/۱، ۱۱۸/۱، ۱۱۹/۱، ۱۲۰/۱، ۱۲۱/۱، ۱۲۲/۱، ۱۲۳/۱، ۱۲۴/۱، ۱۲۵/۱، ۱۲۶/۱، ۱۲۷/۱، ۱۲۸/۱، ۱۲۹/۱، ۱۳۰/۱، ۱۳۱/۱، ۱۳۲/۱، ۱۳۳/۱، ۱۳۴/۱، ۱۳۵/۱، ۱۳۶/۱، ۱۳۷/۱، ۱۳۸/۱، ۱۳۹/۱، ۱۴۰/۱، ۱۴۱/۱، ۱۴۲/۱، ۱۴۳/۱، ۱۴۴/۱، ۱۴۵/۱، ۱۴۶/۱، ۱۴۷/۱، ۱۴۸/۱، ۱۴۹/۱، ۱۵۰/۱، ۱۵۱/۱، ۱۵۲/۱، ۱۵۳/۱، ۱۵۴/۱، ۱۵۵/۱، ۱۵۶/۱، ۱۵۷/۱، ۱۵۸/۱، ۱۵۹/۱، ۱۶۰/۱، ۱۶۱/۱، ۱۶۲/۱، ۱۶۳/۱، ۱۶۴/۱، ۱۶۵/۱، ۱۶۶/۱، ۱۶۷/۱، ۱۶۸/۱، ۱۶۹/۱، ۱۷۰/۱، ۱۷۱/۱، ۱۷۲/۱، ۱۷۳/۱، ۱۷۴/۱، ۱۷۵/۱، ۱۷۶/۱، ۱۷۷/۱، ۱۷۸/۱، ۱۷۹/۱، ۱۸۰/۱، ۱۸۱/۱، ۱۸۲/۱، ۱۸۳/۱، ۱۸۴/۱، ۱۸۵/۱، ۱۸۶/۱، ۱۸۷/۱، ۱۸۸/۱، ۱۸۹/۱، ۱۹۰/۱، ۱۹۱/۱، ۱۹۲/۱، ۱۹۳/۱، ۱۹۴/۱، ۱۹۵/۱، ۱۹۶/۱، ۱۹۷/۱، ۱۹۸/۱، ۱۹۹/۱، ۲۰۰/۱، ۲۰۱/۱، ۲۰۲/۱، ۲۰۳/۱، ۲۰۴/۱، ۲۰۵/۱، ۲۰۶/۱، ۲۰۷/۱، ۲۰۸/۱، ۲۰۹/۱، ۲۱۰/۱، ۲۱۱/۱، ۲۱۲/۱، ۲۱۳/۱، ۲۱۴/۱، ۲۱۵/۱، ۲۱۶/۱، ۲۱۷/۱، ۲۱۸/۱، ۲۱۹/۱، ۲۲۰/۱، ۲۲۱/۱، ۲۲۲/۱، ۲۲۳/۱، ۲۲۴/۱، ۲۲۵/۱، ۲۲۶/۱، ۲۲۷/۱، ۲۲۸/۱، ۲۲۹/۱، ۲۳۰/۱، ۲۳۱/۱، ۲۳۲/۱، ۲۳۳/۱، ۲۳۴/۱، ۲۳۵/۱، ۲۳۶/۱، ۲۳۷/۱، ۲۳۸/۱، ۲۳۹/۱، ۲۴۰/۱، ۲۴۱/۱، ۲۴۲/۱، ۲۴۳/۱، ۲۴۴/۱، ۲۴۵/۱، ۲۴۶/۱، ۲۴۷/۱، ۲۴۸/۱، ۲۴۹/۱، ۲۵۰/۱، ۲۵۱/۱، ۲۵۲/۱، ۲۵۳/۱، ۲۵۴/۱، ۲۵۵/۱، ۲۵۶/۱، ۲۵۷/۱، ۲۵۸/۱، ۲۵۹/۱، ۲۶۰/۱، ۲۶۱/۱، ۲۶۲/۱، ۲۶۳/۱، ۲۶۴/۱، ۲۶۵/۱، ۲۶۶/۱، ۲۶۷/۱، ۲۶۸/۱، ۲۶۹/۱، ۲۷۰/۱، ۲۷۱/۱، ۲۷۲/۱، ۲۷۳/۱، ۲۷۴/۱، ۲۷۵/۱، ۲۷۶/۱، ۲۷۷/۱، ۲۷۸/۱، ۲۷۹/۱، ۲۸۰/۱، ۲۸۱/۱، ۲۸۲/۱، ۲۸۳/۱، ۲۸۴/۱، ۲۸۵/۱، ۲۸۶/۱، ۲۸۷/۱، ۲۸۸/۱، ۲۸۹/۱، ۲۹۰/۱، ۲۹۱/۱، ۲۹۲/۱، ۲۹۳/۱، ۲۹۴/۱، ۲۹۵/۱، ۲۹۶/۱، ۲۹۷/۱، ۲۹۸/۱، ۲۹۹/۱، ۳۰۰/۱، ۳۰۱/۱، ۳۰۲/۱، ۳۰۳/۱، ۳۰۴/۱، ۳۰۵/۱، ۳۰۶/۱، ۳۰۷/۱، ۳۰۸/۱، ۳۰۹/۱، ۳۱۰/۱، ۳۱۱/۱، ۳۱۲/۱، ۳۱۳/۱، ۳۱۴/۱، ۳۱۵/۱، ۳۱۶/۱، ۳۱۷/۱، ۳۱۸/۱، ۳۱۹/۱، ۳۲۰/۱، ۳۲۱/۱، ۳۲۲/۱، ۳۲۳/۱، ۳۲۴/۱، ۳۲۵/۱، ۳۲۶/۱، ۳۲۷/۱، ۳۲۸/۱، ۳۲۹/۱، ۳۳۰/۱، ۳۳۱/۱، ۳۳۲/۱، ۳۳۳/۱، ۳۳۴/۱، ۳۳۵/۱، ۳۳۶/۱، ۳۳۷/۱، ۳۳۸/۱، ۳۳۹/۱، ۳۴۰/۱، ۳۴۱/۱، ۳۴۲/۱، ۳۴۳/۱، ۳۴۴/۱، ۳۴۵/۱، ۳۴۶/۱، ۳۴۷/۱، ۳۴۸/۱، ۳۴۹/۱، ۳۵۰/۱، ۳۵۱/۱، ۳۵۲/۱، ۳۵۳/۱، ۳۵۴/۱، ۳۵۵/۱، ۳۵۶/۱، ۳۵۷/۱، ۳۵۸/۱، ۳۵۹/۱، ۳۶۰/۱، ۳۶۱/۱، ۳۶۲/۱، ۳۶۳/۱، ۳۶۴/۱، ۳۶۵/۱، ۳۶۶/۱، ۳۶۷/۱، ۳۶۸/۱، ۳۶۹/۱، ۳۷۰/۱، ۳۷۱/۱، ۳۷۲/۱، ۳۷۳/۱، ۳۷۴/۱، ۳۷۵/۱، ۳۷۶/۱، ۳۷۷/۱، ۳۷۸/۱، ۳۷۹/۱، ۳۸۰/۱، ۳۸۱/۱، ۳۸۲/۱، ۳۸۳/۱، ۳۸۴/۱، ۳۸۵/۱، ۳۸۶/۱، ۳۸۷/۱، ۳۸۸/۱، ۳۸۹/۱، ۳۹۰/۱، ۳۹۱/۱، ۳۹۲/۱، ۳۹۳/۱، ۳۹۴/۱، ۳۹۵/۱، ۳۹۶/۱، ۳۹۷/۱، ۳۹۸/۱، ۳۹۹/۱، ۴۰۰/۱، ۴۰۱/۱، ۴۰۲/۱، ۴۰۳/۱، ۴۰۴/۱، ۴۰۵/۱، ۴۰۶/۱، ۴۰۷/۱، ۴۰۸/۱، ۴۰۹/۱، ۴۱۰/۱، ۴۱۱/۱، ۴۱۲/۱، ۴۱۳/۱، ۴۱۴/۱، ۴۱۵/۱، ۴۱۶/۱، ۴۱۷/۱، ۴۱۸/۱، ۴۱۹/۱، ۴۲۰/۱، ۴۲۱/۱، ۴۲۲/۱، ۴۲۳/۱، ۴۲۴/۱، ۴۲۵/۱، ۴۲۶/۱، ۴۲۷/۱، ۴۲۸/۱، ۴۲۹/۱، ۴۳۰/۱، ۴۳۱/۱، ۴۳۲/۱، ۴۳۳/۱، ۴۳۴/۱، ۴۳۵/۱، ۴۳۶/۱، ۴۳۷/۱، ۴۳۸/۱، ۴۳۹/۱، ۴۴۰/۱، ۴۴۱/۱، ۴۴۲/۱، ۴۴۳/۱، ۴۴۴/۱، ۴۴۵/۱، ۴۴۶/۱، ۴۴۷/۱، ۴۴۸/۱، ۴۴۹/۱، ۴۵۰/۱، ۴۵۱/۱، ۴۵۲/۱، ۴۵۳/۱، ۴۵۴/۱، ۴۵۵/۱، ۴۵۶/۱، ۴۵۷/۱، ۴۵۸/۱، ۴۵۹/۱، ۴۶۰/۱، ۴۶۱/۱، ۴۶۲/۱، ۴۶۳/۱، ۴۶۴/۱، ۴۶۵/۱، ۴۶۶/۱، ۴۶۷/۱، ۴۶۸/۱، ۴۶۹/۱، ۴۷۰/۱، ۴۷۱/۱، ۴۷۲/۱، ۴۷۳/۱، ۴۷۴/۱، ۴۷۵/۱، ۴۷۶/۱، ۴۷۷/۱، ۴۷۸/۱، ۴۷۹/۱، ۴۸۰/۱، ۴۸۱/۱، ۴۸۲/۱، ۴۸۳/۱، ۴۸۴/۱، ۴۸۵/۱، ۴۸۶/۱، ۴۸۷/۱، ۴۸۸/۱، ۴۸۹/۱، ۴۹۰/۱، ۴۹۱/۱، ۴۹۲/۱، ۴۹۳/۱، ۴۹۴/۱، ۴۹۵/۱، ۴۹۶/۱، ۴۹۷/۱، ۴۹۸/۱، ۴۹۹/۱، ۵۰۰/۱، ۵۰۱/۱، ۵۰۲/۱، ۵۰۳/۱، ۵۰۴/۱، ۵۰۵/۱، ۵۰۶/۱، ۵۰۷/۱، ۵۰۸/۱، ۵۰۹/۱، ۵۱۰/۱، ۵۱۱/۱، ۵۱۲/۱، ۵۱۳/۱، ۵۱۴/۱، ۵۱۵/۱، ۵۱۶/۱، ۵۱۷/۱، ۵۱۸/۱، ۵۱۹/۱، ۵۲۰/۱، ۵۲۱/۱، ۵۲۲/۱، ۵۲۳/۱، ۵۲۴/۱، ۵۲۵/۱، ۵۲۶/۱، ۵۲۷/۱، ۵۲۸/۱، ۵۲۹/۱، ۵۳۰/۱، ۵۳۱/۱، ۵۳۲/۱، ۵۳۳/۱، ۵۳۴/۱، ۵۳۵/۱، ۵۳۶/۱، ۵۳۷/۱، ۵۳۸/۱، ۵۳۹/۱، ۵۴۰/۱، ۵۴۱/۱، ۵۴۲/۱، ۵۴۳/۱، ۵۴۴/۱، ۵۴۵/۱، ۵۴۶/۱، ۵۴۷/۱، ۵۴۸/۱، ۵۴۹/۱، ۵۵۰/۱، ۵۵۱/۱، ۵۵۲/۱، ۵۵۳/۱، ۵۵۴/۱، ۵۵۵/۱، ۵۵۶/۱، ۵۵۷/۱، ۵۵۸/۱، ۵۵۹/۱، ۵۶۰/۱، ۵۶۱/۱، ۵۶۲/۱، ۵۶۳/۱، ۵۶۴/۱، ۵۶۵/۱، ۵۶۶/۱، ۵۶۷/۱، ۵۶۸/۱، ۵۶۹/۱، ۵۷۰/۱، ۵۷۱/۱، ۵۷۲/۱، ۵۷۳/۱، ۵۷۴/۱، ۵۷۵/۱، ۵۷۶/۱، ۵۷۷/۱، ۵۷۸/۱، ۵۷۹/۱، ۵۸۰/۱، ۵۸۱/۱، ۵۸۲/۱، ۵۸۳/۱، ۵۸۴/۱، ۵۸۵/۱، ۵۸۶/۱، ۵۸۷/۱، ۵۸۸/۱، ۵۸۹/۱، ۵۹۰/۱، ۵۹۱/۱، ۵۹۲/۱، ۵۹۳/۱، ۵۹۴/۱، ۵۹۵/۱، ۵۹۶/۱، ۵۹۷/۱، ۵۹۸/۱، ۵۹۹/۱، ۶۰۰/۱، ۶۰۱/۱، ۶۰۲/۱، ۶۰۳/۱، ۶۰۴/۱، ۶۰۵/۱، ۶۰۶/۱، ۶۰۷/۱، ۶۰۸/۱، ۶۰۹/۱، ۶۱۰/۱، ۶۱۱/۱، ۶۱۲/۱، ۶۱۳/۱، ۶۱۴/۱، ۶۱۵/۱، ۶۱۶/۱، ۶۱۷/۱، ۶۱۸/۱، ۶۱۹/۱، ۶۲۰/۱، ۶۲۱/۱، ۶۲۲/۱، ۶۲۳/۱، ۶۲۴/۱، ۶۲۵/۱، ۶۲۶/۱، ۶۲۷/۱، ۶۲۸/۱، ۶۲۹/۱، ۶۳۰/۱، ۶۳۱/۱، ۶۳۲/۱، ۶۳۳/۱، ۶۳۴/۱، ۶۳۵/۱، ۶۳۶/۱، ۶۳۷/۱، ۶۳۸/۱، ۶۳۹/۱، ۶۴۰/۱، ۶۴۱/۱، ۶۴۲/۱، ۶۴۳/۱، ۶۴۴/۱، ۶۴۵/۱، ۶۴۶/۱، ۶۴۷/۱، ۶۴۸/۱، ۶۴۹/۱، ۶۵۰/۱، ۶۵۱/۱، ۶۵۲/۱، ۶۵۳/۱، ۶۵۴/۱، ۶۵۵/۱، ۶۵۶/۱، ۶۵۷/۱، ۶۵۸/۱، ۶۵۹/۱، ۶۶۰/۱، ۶۶۱/۱، ۶۶۲/۱، ۶۶۳/۱، ۶۶۴/۱، ۶۶۵/۱، ۶۶۶/۱، ۶۶۷/۱، ۶۶۸/۱، ۶۶۹/۱، ۶۷۰/۱، ۶۷۱/۱، ۶۷۲/۱، ۶۷۳/۱، ۶۷۴/۱، ۶۷۵/۱، ۶۷۶/۱، ۶۷۷/۱، ۶۷۸/۱، ۶۷۹/۱، ۶۸۰/۱، ۶۸۱/۱، ۶۸۲/۱، ۶۸۳/۱، ۶۸۴/۱، ۶۸۵/۱، ۶۸۶/۱، ۶۸۷/۱، ۶۸۸/۱، ۶۸۹/۱، ۶۹۰/۱، ۶۹۱/۱، ۶۹۲/۱، ۶۹۳/۱، ۶۹۴/۱، ۶۹۵/۱، ۶۹۶/۱، ۶۹۷/۱، ۶۹۸/۱، ۶۹۹/۱، ۷۰۰/۱، ۷۰۱/۱، ۷۰۲/۱، ۷۰۳/۱، ۷۰۴/۱، ۷۰۵/۱، ۷۰۶/۱، ۷۰۷/۱، ۷۰۸/۱، ۷۰۹/۱، ۷۱۰/۱، ۷۱۱/۱، ۷۱۲/۱، ۷۱۳/۱، ۷۱۴/۱، ۷۱۵/۱، ۷۱۶/۱، ۷۱۷/۱، ۷۱۸/۱، ۷۱۹/۱، ۷۲۰/۱، ۷۲۱/۱، ۷۲۲/۱، ۷۲۳/۱، ۷۲۴/۱، ۷۲۵/۱، ۷۲۶/۱، ۷۲۷/۱، ۷۲۸/۱، ۷۲۹/۱، ۷۳۰/۱، ۷۳۱/۱، ۷۳۲/۱، ۷۳۳/۱، ۷۳۴/۱، ۷۳۵/۱، ۷۳۶/۱، ۷۳۷/۱، ۷۳۸/۱، ۷۳۹/۱، ۷۴۰/۱، ۷۴۱/۱، ۷۴۲/۱، ۷۴۳/۱، ۷۴۴/۱، ۷۴۵/۱، ۷۴۶/۱، ۷۴۷/۱، ۷۴۸/۱، ۷۴۹/۱، ۷۵۰/۱، ۷۵۱/۱، ۷۵۲/۱، ۷۵۳/۱، ۷۵۴/۱، ۷۵۵/۱، ۷۵۶/۱، ۷۵۷/۱، ۷۵۸/۱، ۷۵۹/۱، ۷۶۰/۱، ۷۶۱/۱، ۷۶۲/۱، ۷۶۳/۱، ۷۶۴/۱، ۷۶۵/۱، ۷۶۶/۱، ۷۶۷/۱، ۷۶۸/۱، ۷۶۹/۱، ۷۷۰/۱، ۷۷۱/۱، ۷۷۲/۱، ۷۷۳/۱، ۷۷۴/۱، ۷۷۵/۱، ۷۷۶/۱، ۷۷۷/۱، ۷۷۸/۱، ۷۷۹/۱، ۷۸۰/۱، ۷۸۱/۱، ۷۸۲/۱، ۷۸۳/۱، ۷۸۴/۱، ۷۸۵/۱، ۷۸۶/۱، ۷۸۷/۱، ۷۸۸/۱، ۷۸۹/۱، ۷۹۰/۱، ۷۹۱/۱، ۷۹۲/۱، ۷۹۳/۱، ۷۹۴/۱، ۷۹۵/۱، ۷۹۶/۱، ۷۹۷/۱، ۷۹۸/۱، ۷۹۹/۱، ۸۰۰/۱، ۸۰۱/۱، ۸۰۲/۱، ۸۰۳/۱، ۸۰۴/۱، ۸۰۵/۱، ۸۰۶/۱، ۸۰۷/۱، ۸۰۸/۱، ۸۰۹/۱، ۸۱۰/۱، ۸۱۱/۱، ۸۱۲/۱، ۸۱۳/۱، ۸۱۴/۱، ۸۱۵/۱، ۸۱۶/۱، ۸۱۷/۱، ۸۱۸/۱، ۸۱۹/۱، ۸۲۰/۱، ۸۲۱/۱، ۸۲۲/۱، ۸۲۳/۱، ۸۲۴/۱، ۸۲۵/۱، ۸۲۶/۱، ۸۲۷/۱، ۸۲۸/۱، ۸۲۹/۱، ۸۳۰/۱، ۸۳۱/۱، ۸۳۲/۱، ۸۳۳/۱، ۸۳۴/۱، ۸۳۵/۱، ۸۳۶/۱، ۸۳۷/۱، ۸۳۸/۱، ۸۳۹/۱، ۸۴۰/۱، ۸۴۱/۱، ۸۴۲/۱، ۸۴۳/۱، ۸۴۴/۱، ۸۴۵/۱، ۸۴۶/۱، ۸۴۷/۱، ۸۴۸/۱، ۸۴۹/۱، ۸۵۰/۱، ۸۵۱/۱، ۸۵۲/۱، ۸۵۳/۱، ۸۵۴/۱، ۸۵۵/۱، ۸۵۶/۱، ۸۵۷/۱، ۸۵۸/۱، ۸۵۹/۱، ۸۶۰/۱، ۸۶۱/۱، ۸۶۲/۱، ۸۶۳/۱، ۸۶۴/۱، ۸۶۵/۱، ۸۶۶/۱، ۸۶۷/۱، ۸۶۸/۱، ۸۶۹/۱، ۸۷۰/۱، ۸۷۱/۱، ۸۷۲/۱، ۸۷۳/۱، ۸۷۴/۱، ۸۷۵/۱، ۸۷۶/۱، ۸۷۷/۱، ۸۷۸/۱، ۸۷۹/۱، ۸۸۰/۱، ۸۸۱/۱، ۸۸۲/۱، ۸۸۳/۱، ۸۸۴/۱، ۸۸۵/۱، ۸۸۶/۱، ۸۸۷/۱، ۸۸۸/۱، ۸۸۹/۱، ۸۹۰/۱، ۸۹۱/۱، ۸۹۲/۱، ۸۹۳/۱، ۸۹۴/۱، ۸۹۵/۱، ۸۹۶/۱، ۸۹۷/۱، ۸۹۸/۱، ۸۹۹/۱، ۹۰۰/۱، ۹۰۱/۱، ۹۰۲/۱، ۹۰۳/۱، ۹۰۴/۱، ۹۰۵/۱، ۹۰۶/۱، ۹۰۷/۱، ۹۰۸/۱، ۹۰۹/۱، ۹۱۰/۱، ۹۱۱/۱، ۹۱۲/۱، ۹۱۳/۱، ۹۱۴/۱، ۹۱۵/۱، ۹۱۶/۱، ۹۱۷/۱، ۹۱۸/۱، ۹۱۹/۱، ۹۲۰/۱، ۹۲۱/۱، ۹۲۲/۱، ۹۲۳/۱، ۹۲۴/۱، ۹۲۵/۱، ۹۲۶/۱، ۹۲۷/۱، ۹۲۸/۱، ۹۲۹/۱، ۹۳۰/۱، ۹۳۱/۱، ۹۳۲/۱، ۹۳۳/۱، ۹۳۴/۱، ۹۳۵/۱، ۹۳۶/۱، ۹۳۷/۱، ۹۳۸/۱، ۹۳۹/۱، ۹۴۰/۱، ۹۴۱/۱، ۹۴۲/۱، ۹۴۳/۱، ۹۴۴/۱، ۹۴۵/۱، ۹۴۶/۱، ۹۴۷/۱، ۹۴۸/۱، ۹۴۹/۱، ۹۵۰/۱، ۹۵۱/۱، ۹۵۲/۱، ۹۵۳/۱، ۹۵۴/۱، ۹۵۵/۱، ۹۵۶/۱، ۹۵۷/۱، ۹۵۸/۱، ۹۵۹/۱، ۹۶۰/۱، ۹۶۱/۱، ۹۶۲/۱، ۹۶۳/۱، ۹۶۴/۱، ۹۶۵/۱، ۹۶۶/۱، ۹۶۷/۱، ۹۶۸/۱، ۹۶۹/۱، ۹۷۰/۱، ۹۷۱/۱، ۹۷۲/۱، ۹۷۳/۱، ۹۷۴/۱، ۹۷۵/۱، ۹۷۶/۱، ۹۷۷/۱، ۹۷۸/۱، ۹۷۹/۱، ۹۸۰/۱، ۹۸۱/۱، ۹۸۲/۱، ۹۸۳/۱، ۹۸۴/۱، ۹۸۵/۱، ۹۸۶/۱، ۹۸۷/۱، ۹۸۸/۱، ۹۸۹/۱، ۹۹۰/۱، ۹۹۱/۱، ۹۹۲/۱، ۹۹۳/۱، ۹۹۴/۱، ۹۹۵/۱، ۹۹۶/۱، ۹۹۷/۱، ۹۹۸/۱، ۹۹۹/۱، ۱۰۰۰/۱، ۱۰۰۱/۱، ۱۰۰۲/۱، ۱۰۰۳/۱، ۱۰۰۴/۱، ۱۰۰۵/۱، ۱۰۰۶/۱، ۱۰۰۷/۱، ۱۰۰۸/۱، ۱۰۰۹/۱، ۱۰۱۰/۱، ۱۰۱۱/۱، ۱۰۱۲/۱، ۱۰۱۳/۱، ۱۰۱۴/۱، ۱۰۱۵/۱، ۱۰۱۶/۱، ۱۰۱۷/۱، ۱۰۱۸/۱، ۱۰۱۹/۱، ۱۰۲۰/۱، ۱۰۲۱/۱، ۱۰۲۲/۱، ۱۰۲۳/۱، ۱۰۲۴/۱، ۱۰۲۵/۱، ۱۰۲۶/۱، ۱۰۲۷/۱، ۱۰۲۸/۱، ۱۰۲۹/۱، ۱۰۳۰/۱، ۱۰۳۱/۱، ۱۰۳۲/۱، ۱۰۳۳/۱، ۱۰۳۴/۱، ۱۰۳۵/۱، ۱۰۳۶/۱، ۱۰۳۷/۱، ۱۰۳۸/۱، ۱۰۳۹/۱، ۱۰۴۰/۱، ۱۰۴۱/۱، ۱۰۴۲/۱، ۱۰۴۳/۱، ۱۰۴۴/۱، ۱۰۴۵/۱، ۱۰۴۶/۱، ۱۰۴۷/۱، ۱۰۴۸/۱، ۱۰۴۹/۱، ۱۰۵۰/۱، ۱۰۵۱/۱، ۱۰۵۲/۱، ۱۰۵۳/۱، ۱۰۵۴/۱، ۱۰۵۵/۱، ۱۰۵۶/۱، ۱۰۵۷/۱، ۱۰۵۸/۱، ۱۰۵۹/۱، ۱۰۶۰/۱، ۱۰۶۱/۱، ۱۰۶۲/۱، ۱۰۶۳/۱، ۱۰۶۴/۱، ۱۰۶۵/۱، ۱۰۶۶/۱، ۱۰۶۷/۱، ۱۰۶۸/۱، ۱۰۶۹/۱، ۱۰۷۰/۱، ۱۰۷۱/۱، ۱۰۷۲/۱، ۱۰۷۳/۱، ۱۰۷۴/۱، ۱۰۷۵/۱، ۱۰۷۶/۱، ۱۰۷۷/۱، ۱۰۷۸/۱، ۱۰۷۹/۱، ۱۰۸۰/۱، ۱۰۸۱/۱، ۱۰۸۲/۱، ۱۰۸۳/۱، ۱۰۸۴/۱، ۱۰۸۵/۱، ۱

۴۴ (۹۳۱) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کرتا ہے اور انسان مجبور محض ہے۔ ایک دوسری آیت سے بھی انسان کا مجبور ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ”کہو کہ ہمیں کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا بجز اس کے جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے“ (۹/۱) ایک حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:-

”اگر سب بندے مل کر کوشش کریں کہ تم کو کوئی ذرہ برابر ایسا نقص پہنچادیں جو خدا نے تمہارے لئے مقدر نہیں کیا تو وہ نہیں پہنچا سکیں گے اور اگر سب مل کر تم کو کوئی ایسا نقصان پہنچانا چاہیں جس کا ارادہ خدا نے نہیں کیا تو وہ ہرگز نہیں پہنچا سکیں گے“ (ترمذی شریف)

اشعری (متوفی ۳۲۵ھ) لکھتا ہے کہ: ”ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ روئے زمین پر خیر و شر میں سے کوئی شے ایسی نہیں ہے جو خدا و تعالیٰ کے ارادے کے بغیر واقع ہو۔ کہ سب کچھ اس کے ارادے سے ہوتا ہے خدا کے مشاؤ کے غلات کوئی شخص کچھ نہیں کر سکتا۔ خدا کے سوا اور کوئی خالق نہیں ہے اور تمام افعال انسانی اس کے پیدا کئے ہوئے ہیں جس کا اس آیت شریف سے ظاہر ہوتا ہے ”خدا نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا ہے۔“ اشعری کے نزدیک قتل کا فاعل بندہ نہیں بلکہ خدا ہے اور بندہ محض محل فہور ہے۔

امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ:- ”انسان صورت مختار میں مجبور ہے“ (الانسان مجبور فی مختار) شرح فقہ اکبر صفحہ ۱۰۵ میں ہے کہ ”اس پر اتفاق ہے کہ سب کچھ خدا ہی کی طرف منسوب کیا جائے کیونکہ تمام کائنات خدا کے ارادے سے ہے۔ بعض نے تفصیل سے منع کیا ہے اور کہا ہے کہ برہانیت ادب و نہ کہا جائے کہ خدا کفر و ظلم اور فسق کا سبب ارادہ کرتا ہے“ ابو محمد ہشام بن الحکم (دوسری صدی ہجری) جبر و عقیدہ رکھتے تھے، غالباً اس لئے کہ ابتدا میں انھوں نے جہم بن صفوان سے تعلیم حاصل کی تھی جو توحید کی آڑے لے کر جبر کے قائل ہو گئے تھے (کیونکہ ان کے نزدیک فاعلیت خدا ہی میں منحصر ہے)۔ اسی طرح عمر خیام بھی جبر و نظریہ کے موید تھے۔

فلسفہ جبر پر سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اگر سب کچھ متناہب اللہ ہوتا ہے اور انسان افعال کے کرنے میں آزاد نہیں تو پھر وہ بے قصور ہے اور خدا کے انصاف سے معید ہے کہ وہ بے قصوروں کو سزا دے۔ اس لئے بعض علما نے انسان کے خود مختار ہونے کی تعلیم دی۔ ایک فرقہ جو تاریخ میں قدیم کے نام سے مشہور ہوا انسان کے باختیار ہونے کا قائل تھا۔ معبد جہنمی مسئلہ قدر کا موجب تھا۔ غیلان دمشقی (پہلی صدی ہجری) اور خواجه حسن بھری نے اس نظریہ کی شد و دھ سے اشاعت کی اور مذہب اعتزال کی تاریخ اسی وقت سے شروع ہوئی (بعد میں قدیم فلسفہ میں ضم ہو گیا) معتزلہ گروہ یہ کہتا تھا کہ انسان خیر و شر کے انتخاب میں قطعاً آزاد ہے اور اس انتخاب کے بعد کام کرنے میں ہر طرح سے مختار ہے۔

معتزلی امام واصل بن عطاء (۲۹۹ھ - ۳۳۶ھ) مسئلہ قدر کے قائل تھے یعنی انسان خود اپنے افعال کا ذمہ دار ہے۔ ابو عثمان عمر بن عبید (۲۹۹ھ - ۳۳۶ھ) بھی واصل کی طرح قدر پر تھے۔ ایک شخص نے اس مسئلہ پر ان سے بحث کی۔ انھوں نے کہا کہ خدا نے قضا و قدر کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ مسلمانوں کی تسلی و اطمینان کے لئے کافی ہے۔ خدا کا ارشاد ہے: ”خو رہے کہ انکسہم جمیع ما عملوا“ ”یعنی ہم ان کاموں کا سوال کریں گے جو وہ کرتے تھے“ ”ہم نے جو کچھ ان کے مقدس لکھ دیا تھا“ اس سے انسان کا اپنے افعال میں خود مختار ہونا ظاہر ہے۔ یقیناً یہ آیت فلسفہ قدر کی تائید میں ہے لیکن دوسری آیات جبر کی تائید میں ہیں۔ علمائے مغرب نے اسے ”تفاد فی القرآن“ کہا ہے اور اس کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا ہے (ملاحظہ ہو) ”انسان کو پیڈیا آف اسلام“ مقالہ خدا

نے شمول از ”اسلامی توحید“ مولف مولانا منظور نعمانی صفحہ ۱۱۔ کہ حقائق الاسلام حصہ اول صفحہ ۳۰۔ علامہ ہندی فائدۃ الاسلام جلد اول صفحات ۵۰-۵۱۔ کہ سالنامہ نگار ۵۵ھ صفحہ ۱۲۔ کہ فلسفۃ الاسلام جلد اول صفحہ ۵۰۔ کہ سالنامہ نگار ۵۵ھ صفحہ ۱۰۔ کہ حقائق الاسلام جلد اول صفحہ ۳۰۔ کہ سالنامہ نگار ۵۵ھ صفحہ ۱۲۔ کہ سالنامہ ۵۵ھ صفحہ ۱۰۔

## تصوف اسلام

خدا کو جاننے کے لئے انسان نے دو راستے اختیار کئے۔ ایک کا تعلق دل سے ہے اور دوسرے کا دماغ سے۔ جب دماغ تنگ کیا تو دل سے کام لیا اور جب دل نے ساتھ نہ دیا تو دماغ سے یہاں تک کہ دل و دماغ کی یہ جنگ خدا کے بارے میں اب تک جاری ہے۔ دماغ یا عقل سے کام لینے والوں نے فلسفہ و حکمت کے ذریعہ سے خدا کی حقیقت معلوم کرنا چاہی اور جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وہ محدود منکر ہو گئے۔ دل والوں نے صرف جذبات سے کام لیا اور وہ بھی آخر کار مافوق الحکیم کی حد سے آگے نہ بڑھ سکے اور صوفیہ کا تعلق اسی جماعت سے ہے اس خیال کے لوگ مختلف قوموں میں پیدا ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں یہی چیز فلسفہ ویدانت کہلاتی۔ یونان و روم میں باطنیت (Mysticism) کے نام سے مشہور ہوئی اور اسلام میں تصوف کے نام سے۔

**صوفی** — لفظ صوفی کے ماخذ کے باب میں اختلاف آرا پایا جاتا ہے۔ (۱) بعض اسے صفائے مشق کہتے ہیں کیونکہ صوفیوں کے لئے صفائے قلب ضروری چیز ہے، لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ اس صورت میں وہ صوفی ہونا نہ کہ صوفی بننا۔ (۲) بعض صوفیہ سے استخراج کرتے ہیں کیونکہ خدا سے تعلق رکھنے والوں میں وہ پہلی صف میں آتے ہیں لیکن اس صورت میں اسے صنفی ہونا چاہئے تھا۔ (۳) بعض اس کا تعلق صوفیہ سے ظاہر کرتے ہیں۔ اہل صوفیہ رسول کے زمانہ میں صحابہ کی ایک جماعت تھی جو تارک دنیا ہو کر مسجد نبوی کے ایک گوشہ میں عبادت و ریاضت میں مصروف رہتی تھی، لیکن اگر یہ لفظ صوفیہ سے ماخوذ ہو تو اسے صنفی ہونا چاہئے تھا۔ (۴) بعض کے نزدیک لفظ صوفی یونانی لفظ صوف سے لیا گیا ہے جس کے معنی حکمت کے ہیں اور ایرانیوں نے سین کو صاف سے بدل دیا۔ (۵) آخری رائے یہ ہے کہ لفظ صوفی صوف سے نکلا ہے جس کے معنی "اون" کے ہیں گویا صوفی کے معنی ہوئے "پشمینہ پوش" یہ آخری نام (پشمینہ پوش) فارسی زبان میں تارک دنیا فقیروں کا لقب تھا، کیونکہ شروع میں یہ لوگ مثل عیسائی راہبوں کے بے رنگے ہوئے موٹے اون کا لباس پہنا کرتے تھے۔ اس رائے کو سب سے پہلے ابو نصر السراج (متوفی ۳۲۰ھ) نے اپنی کتاب اللہ میں پیش کیا تھا اور اسی کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ امام قشیری کی تحقیقات کے مطابق یہ لفظ دوسری صدی ہجری کے اواخر (۳۸۰ھ) میں وجود میں آیا۔

**تصوف کا ماخذ** خان کریم اور ڈوئری نے ایرانی تصوف کا ماخذ ہندی ویدانت کو ظاہر کیا ہے اور نکلسن نے نوافلاطونیت کو براؤن نے اسے سامی مذہب کے خلائ آریائی رد عمل قرار دیا ہے۔ یہ خلائ اس کے علمائے اسلام کا یہ کہنا ہے کہ قرآن و احادیث میں صوفیانہ نظریہ کی طرف اشارات موجود تھے جو عربوں کی خالص عملی دہانت کی وجہ سے نشوونما پا کر بار آور نہ ہو سکے لیکن جب ان کو مالک فیر میں موزوں حالات میسر آ گئے تو وہ ایک جداگانہ نظریہ کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

قرآن کے سورہ ۵۹ (واقفہ) کی آیات ۸، ۹ اور ۱۰ میں انسانوں کی تین قسمیں بتائی گئی ہیں۔ اصحاب الیمین (دائیں ہاتھ والے) یعنی مومن جو خدا پر ایمان لائے اور اُس کی عبادت کرتے ہیں۔ اصحاب المشئمہ (بائیں ہاتھ والے) یعنی جو لوگ بھٹک گئے اور دھڑلے سے مہودوں کی پرستش کرنے لگے۔ مقربون (مقرب کی جمع) جو لوگ خدا سے بالکل قریب ہیں۔ شیخ شہاب الدین سہروردی حوائج المسائل

(باب اول) میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ لفظ صوفی قرآن مجید میں نہیں استعمال ہوا ہے لیکن اُس کے مفہوم کو لفظ ”مقرب“ سے ظاہر کیا صوفیہ کے یہاں مراقبہ خاص چیز ہے جس کے ثبوت میں قرآن کی بعض آیات پیش کی جاتی ہیں جن میں مشاہدہ کائنات اور مطالعہ نفس کی ہدایت کی گئی ہے مثلاً :-

”اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لئے اور خود تمہارے نفوس کے اندر بھی ہیں۔ کیا تمہیں

دکھائی نہیں دیتی ہیں۔“ (سورہ اہ آیات ۱۰-۲۱)

اسی طرح عقیدہ وحدت الوجود ان آیات سے استنباط کیا جاتا ہے :-

”مشرق اور مغرب اللہ کا ہے اس لئے جد مگر تم مڑو ادھر ہی اللہ کا چہرہ ہے۔“ (۱۱۵)

”ہر تم جہاں کہیں ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اُس کو دیکھ رہا ہے۔“ (۱۱۶)

”وہ (سب سے) اول (سب سے) آخر اور (ہر شے کا) ظاہر و باطن ہے اور وہ عام چیزوں کو مانتا ہے۔“ (۱۱۷)

”خدا ہر چیز کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔“ (۱۱۸)

”اور ہر شے رنگ ہے، بھی زیادہ اُس سے تریب ہیں۔“ (۱۱۹)

اس سلسلہ میں ”مقرب“ کے معنی ”مجاہد“ کے ہیں۔ ”مقرب“ سے ”مجاہد“ کی نسبت سے ”مجاہد“ کے معنی ”مجاہد“ کے ہیں۔

جواب قرآن میں :- کہ ”وہ زمین اور آسمان کا نور ہے۔“ سورہ نور آیت ۳۵ اور نور کا گہوارہ ہر شے میں مکن ہے۔

قرآن کے بعد جب ہم ”وہ“ کے لفظ کو دیکھتے ہیں تو ہم اسے صوفیہ کا یہ دعویٰ آتا ہے کہ یہ غیر علیہ السلام نے قرآن

ما سوا اپنے نفس صواب کو باطنی تعلیم بھی دی تھی لیکن اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں ہے کہ پیغمبر

حضرت علی یا حضرت ابو بکر کو کوئی باطنی علم سکھایا تھا۔ معرفت نفس کے سلسلہ میں یہ بیخ جلد اپنے آپ کو پہچان ”سفر

منسوب ہے لیکن صوفیہ اسے حضرت علی بلکہ خود رسول کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ”من عرف نفسه فقد عرف ربه“ یعنی

اپنے آپ کو پہچان لیا اُس نے خدا کو پہچان لیا۔

بلکہ شیعہ تصوف جہاں تک حب الہی، اخلاق حسنہ، اعمال صالحہ، تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کا تعلق ہے

سے لی گئی ہے، لیکن زندگی کے صوفیانہ فیصلے العین اور فلسفہ تصوف پر مسیحیت، نوظلاطونیت، بدھ مذہب اور ویدا

اثر آفرینی ناقابل انکار حقیقت ہے۔

ویدانت کی اثر اندازی کا امکان آٹھویں صدی کے بعد سے پیدا ہوتا ہے جب عباسی خلفاء نے سندھ کو فتح کر لیا۔ منہ

اور مامون رشید کے زمانوں میں سنسکرت ادب کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ البتہ کہ نے (جو عباسی خلفاء کے وزیر تھے) خصوصاً ہند

نفس و اشاعت میں بڑا حصہ لیا۔ البیرونی (۱۰۷۴ء - ۱۰۴۸ء) نے ”کتاب الہند“ کے ذریعہ اپنے معاصرین کو ہندوستان

فنون، مذہب اور سماجی حالت سے آگاہ کیا۔ اُس نے اہل کے سانگھیہ فلسفہ اور پانچویں کے یوگ سوترا کا سب سے پہلے سند

عربی میں ترجمہ کیا اور مسلمانوں کو مجاہد کیساتھ متعارف کیا۔

ہندوستانی صوفیہ کا ویدانت سے متاثر ہونا یقینی تھا۔ شہنشاہ اکبر نے اسلام اور ہندو مذہب میں موافقت پیدا کرنے کا

کی اور داراشکوہ نے سنسکرت سے راقی، اکیلا، ایشور اور یوگ و مہشت کے ترجمے کئے، ایشور و یوگ کا ترجمہ ”سراکھ“ قرار

آقا ل ”فلسفہ عجم“ صوفیہ اور مولانا جلال الدین آرومی ”تصوف اسلام پر ایک مورخانہ نظر“ ننگہ نومبر ۱۹۲۹ء

۱۵۵ صفحہ ۴۵

ام سے کہا گیا۔ یوں تو دوا شکوہ نے علوم اسلامی کے علاوہ تورات، زبور اور انجیل کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا لیکن اُس کی تسلی اپنے شہدوں سے ہوئی جنہیں وہ معدنی توحید، سرچشمہ توحید اور قدیم ترین الہامی صحیفہ کہتا ہے۔ اُس نے ویرانت اور قصوں کے اتحاد کو دکھانے کے لئے "بحرین البحرین" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو اب تک موجود ہے۔

پہلا صوفی۔ مولانا جامی (۱۳۱۲ھ - ۱۳۹۶ھ) کے تذکرہ صوفیہ (نفحات الانس) سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا شخص جس نے قصوت کی حلیم دی، ذوالنون مصری (متوفی ۷۲۵ھ - ۷۲۵ھ) تھے جو مشہور فقیہ و محدث مالک بن انس (متوفی ۱۷۹ھ) کے شاگرد تھے۔ ذوالنون کی تعلیمات کو حضرت جنید بغدادی (متوفی ۲۹۵ھ) ضبط تحریر میں لائے۔ اور جنید کے اصول کی تبلیغ ابو بکر شبلی خراسانی (متوفی ۳۳۵ھ) نے کی انکی تعلیمات کو ابو نصر اسراج (متوفی ۳۳۵ھ) نے اپنی کتاب اللعہ میں اور ابو القاسم القشیری (متوفی ۳۳۵ھ) نے اپنے رسالہ میں مضمین کیا۔ یہ امام غزالی (۳۹۵ھ - ۵۰۵ھ) کا کارنامہ تھا کہ انھوں نے دینیات میں فلسفہ کے علاوہ قصوت کو بھی شامل کر لیا اور اس طرح قصوت کو اسلام کا ایک ضروری جزو بنادیا۔

صوفی خانوادے۔ صوفیہ کے مختلف سلسلے "خانوادے" کہلاتے ہیں۔ ان میں سے چودہ خاص ہیں :-

- ۱۔ زید بن ابی عبد الوہید بن زید (متوفی ۱۷۹ھ) ۸۔ جنید بن ابی جنید بغدادی (متوفی ۲۹۵ھ)
- ۲۔ عیادیہ ۹۔ فضل بن عیاد (۱۸۵ھ) ۹۔ جبریا ۱۰۔ حیرۃ البصری (۲۸۵ھ)
- ۳۔ ادہم ۱۱۔ ابراہیم بن ادہم (۲۱۰ھ) ۱۰۔ چشتیہ ۱۱۔ خواجہ علودیناوری (۲۹۹ھ)
- ۴۔ عجمیہ ۱۲۔ حبیب عجمی (۲۵۶ھ) ۱۱۔ غزرونیہ ۱۲۔ ابو اسحق غزرونی (۳۲۶ھ)
- ۵۔ کرخیہ ۱۳۔ معروف کرخی (۳۲۰ھ) ۱۲۔ طوسیہ ۱۳۔ علاء الدین طوسی (۳۹۰ھ)
- ۶۔ سقطیہ ۱۴۔ سری سقطی (۳۵۳ھ) ۱۳۔ سہروردیہ ۱۴۔ ابو نجیب سہروردی (۳۶۳ھ)
- ۷۔ طیفوریہ ۱۵۔ یزید برطانی (۳۶۰ھ) ۱۴۔ فردوسیہ ۱۵۔ نجم الدین کبری (۴۱۵ھ)

ہندوستان میں صوفیہ کے چار سلسلہ پائے جاتے ہیں :- قادریہ، سہروردیہ، چشتیہ اور نقشبندیہ۔ چشتیہ سلسلہ کو ہندوستان میں چھ مصلحین الدین چشتی (متوفی ۶۳۳ھ) اور نقشبندی سلسلہ کو خواجہ باقی باللہ (متوفی ۷۱۰ھ) اور ان کے شاگرد شیخ احمد سرہندی (متوفی ۸۰۵ھ) نے رواج دیا۔ ہندوستان میں قصوت کی تجدید کی بنا پر شیخ موصوف محمد الہی ثانی کہلاتے ہیں۔

فارسی شعرا۔ فارسی میں ابوسعید فضل اللہ خراسانی (۴۶۵ھ - ۵۰۵ھ) کو صوفیانہ شاعری کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ یہ صرف رباعیاں تھیں۔ ان کی ۹۲ رباعیاں مع جہن جہ کے ۱۸۵ھ میں شائع ہوئی تھیں۔ نظامی گنجوی (۵۸۰ھ - ۶۰۲ھ) جو فارسی ادب میں رائے سخن کہلاتے ہیں قصوت کی طرف بہت مایل تھے۔

تیرھویں صدی میں تین بڑے صوفی شاعر پیدا ہوئے فرید الدین عطار، جلال الدین رومی اور شیخ سعدی۔ انھوں نے مسلمانوں کو بہت متاثر کیا۔ آج بھی ان کا کلام شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

جلال الدین عطار۔ امام غزالی کے انتقال کے ۸ سال بعد ۱۱۹ھ میں نیشاپور میں پیدا ہوئے تھے، تصوف میں وہ شیخ ذکری الدین کے ہم درجہ تھے۔ ۶۹۹ھ میں چنگیز خاں کے حملہ کے دوران میں اہل منگل نے شہید کر دیا۔ ان کا تذکرہ الاولیاء اور نظم میں پند نامہ اور منطق الطیر

جلال الدین عطار اور حبیب عجمی (متوفی ۳۲۰ھ) خواجہ حسن بصری (متوفی ۱۷۹ھ) کے شاگرد تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے متاثر ہو کر ان کو جہنم میں داخل کرے۔

مشہور ہیں۔ جے۔ ۱۲۰۵ء میں پنج میں پیدا ہوئے لیکن بعد میں قونیہ (ایشیائے کوچک) میں سکونت اختیار کر گئی تھی۔ ان کی شہرت کو مسلمانوں میں بڑی عزت حاصل ہے۔

مولانا اردم مولوی خانوادے کے بانی تھے۔ اس سلسلہ کے فقیر ”رقاصی درویش“ کہلاتے ہیں۔ شیخ مصلح الدین سعدیؒ۔ شیراز کے مشہور شاعر تھے۔ ۱۱۸۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۹ء میں وفات پائی۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ ان کے مرشد تھے۔ ان کی گستاخانہ (نثر میں) اور بوستان (نظم میں) مشہور کتابیں ہیں۔ تصون میں ان کے رسائل مشہور ہیں۔ بعد کے صوفی شعرا میں صاحب گلشن راز، حافظ شیرازی اور جامی بہت مشہور ہیں۔ محمود شبستری۔ ان کے بارے میں ہماری معلومات ناکافی ہیں۔ غالباً ان کا زمانہ تیرھویں صدی کا آخر اور چودھویں صدی کا شروع تھا۔ ان کی مثنوی گلشن راز بہت مشہور ہے جو تقریباً ۱۰۰۰ اشعار پر مشتمل ہے اس میں صوفیانہ مسائل کا سوال و جواب کی صورت میں ذکر ہے۔

حافظ شیرازی۔ پورا نام خواجہ شمس الدین تھا (متوفی ۱۳۸۹ء) انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ شیراز میں بسر کیا۔ دیوان حافظ ان کے کام کا مجموعہ ہے۔ بعض عزیز تصون کے رنگ میں ہیں۔ مولانا جامی۔ (۱۴۱۳ء - ۱۴۹۲ء) پورا نام نور الدین عبدالرحمن تھا۔ خراسان کے ضلع جام میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ نقش بندہ سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آخری عمر میں مجذوب ہو گئے تھے اور بولنا ترک کر دیا تھا۔ ان سے تین دیوان اور سات مثنویاں یادگار ہیں جن میں مثنوی یوسف زلیخا بہت مشہور ہے۔ ان کا تذکرہ صوفیہ (نفحات الانس) بھی بہت مقبول ہوا۔ چونکہ اردو شاعری کا فارسی شاعری سے گہرا تعلق رہا ہے۔ اس لئے تقریباً سبھی اردو شعرا نے مسائل تصون کو بہانہ کیا ہے۔ عربی میں ابن الفریہ (۱۱۸۱ء - ۱۲۳۵ء) سب سے بڑا صوفی شاعر تھا جو قاہرہ میں پیدا ہوا۔ طائیہ اُس کا شاہکار مانا جاتا ہے جو عربی اشعار پر مشتمل ہے۔ ترکی کے صوفی شعرا میں نسیمی اور نیازی کے نام قابل ذکر ہیں۔

۶۰۔ اشعار پر مشتمل ہے۔ تصور باری کے اعتبار سے صوفیہ تین گروہوں میں منقسم ہیں۔ ۱۔ ایجادیت، وجودیت اور شہودیت۔ خدا کا تخلیق اس کا مقابلہ ہم مادھو آچاریہ کے ”دویت داد“ (ثنویت) سے کر سکتے ہیں۔ اس مسلک کے فلسفہ حاکم کے مطابق کائنات کی تخلیق لاشے سے ہوئی ہے اور خالق کا جوہر مخلوقات سے جدا ہے یہ نظریہ ”ہمہ از اوست“ (سب اُسی نے بنایا) کے قائل ہیں اور ان کا کلمہ ”لا مبود الّا ہو“ ہے۔ یہ ہوا باری کا نعرہ بلند کرتے ہیں یعنی خدا قدرت سے ماورا اور اُس کا خالق ہے۔ اس نظریہ کے مطابق خدا اور انسان کا تعلق خالق اور مخلوق حاکم اور محکوم کا سا ہے لہذا خدا کو محبوب کل ماننے کے باوجود عاشق حق و عابدہ (میں اُس کا غلام ہوں) کی منزل سے آگے نہیں بڑھتا۔

وجودیت۔ اس کا مقابلہ ہم شکر آچاریہ کے ”ادویت داد“ (وحدت الوجود) سے کر سکتے ہیں۔ اس مسلک کے ماننے والوں کے مطابق کائنات میں بجز خدا کے اور کچھ نہیں ہے۔ خالق اور مخلوق کا جوہر ایک ہے۔ یہ نظریہ ”ہمہ اوست“ (سب وہی ہے) کے قائل ہیں اور ان کا کلمہ ”لا موجود الّا ہو“ ہے۔ یہ ہوا کل کا نعرہ بلند کرتے ہیں یعنی کائنات کی ہر شے میں خدا کا ظہور ہے اور ماسوا اللہ کے اور کچھ موجود نہیں۔

۷۰۔ ان کے کلام کا نمونہ ”شعر الہم“ جلد دوم میں دیکھئے۔ یہ تفصیلی حالات کے لئے مولانا شبلی نعمانی کی کتاب ”سوانح عمری مولانا اردم“ ملاحظہ کیجئے۔ تفصیلی معلومات کے لئے مولانا حالی کی کتاب ”حیات سعدی“ دیکھئے۔

انسان اور خدا میں وہی نسبت ہے جو قطرہ اور دریا میں ہے۔  
 پہلی وجہ ہے کہ جب طالب حق کمال کے درجہ کو پہنچتا ہے تو وہ منصور کی طرح انا الحق (میں حق ہوں) چلا اٹھتا ہے۔ اس نظر کے مطابق عشق، عاشق اور معشوق تینوں ایک ہیں اور انسان میں خدا کا حلول، یا خدا سے انسان کا اتحاد اور وصال ممکن ہے۔ عشق حقیقی کی آخری منزل میں انسان اور خدا کا رابطہ۔

من تو شدم، تو من شدی      من تن شدم، تو جاں شدی

کا ہو جاتا ہے۔

وحدت الوجود کے قابل زندگی کو ایک بار گراں سمجھتے ہیں۔ انھیں خدا سے ”جدائی“ کا احساس ستا رہتا ہے۔  
 شہود یہ۔ اس کا مقابلہ ہم رائج کے ”و شمسٹ اویت واد“ (مشروط ثنویت) سے کر سکتے ہیں۔ یہ نظریہ ایکادہ اور وجودیہ کے درمیان کی چیز ہے۔ اس مسلک کے ماننے والوں کے مطابق عالم و مافیہا مثل آئینہ کے ہیں جن میں الہی صفات کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ نظریہ ”ہندو راستہ“ (سب اسی میں ہے) کے قابل ہیں اور ان کا کلمہ ”لا مشہود الاہو“ ہے۔

تخلیق عالم کے بارے میں اس مدرسہ کا یہ خیال ہے کہ

در آئینہ گرچہ خود نمائی باشد      پیوستہ ز خویش تن جدائی باشد

خود را بہ لباس غیر و بدن عجب است      کیں بواجبی کارِ خدائی باشد

شہود کے معنی دیکھنے یا مشاہدہ کرنے کے ہیں اور اہل تصوف کی اصطلاح میں یہ ایک درجہ بھی ہے جس کے حاصل ہو جانے کے بعد سالک کو تمام موجودات میں جلوہ حق نظر آنے لگتا ہے۔ اس مسلک کے ماننے والے شہودی کہلاتے ہیں۔ اور دراصل وجودی اور شہودی ہی صوفیوں کے دو بڑے گروہ ہیں۔

شہود یہ دبستان خیال کے بانی شیخ رکن الدین علاؤ الدولہ تھے۔ ان کا صحیح زمانہ نامعلوم ہے لیکن اتنا یقینی ہے کہ وہ شمس میں بغداد میں مقیم تھے۔

بایزید بسطامی (متوفی ۳۵۵ھ) البزید خراسانی (۳۶۶ھ - ۴۴۹ھ) اور محی الدین ابن عربی (۳۶۵ھ - ۴۵۵ھ) فلسفہ وحدت الوجود کے سب سے بڑے مبلغ تھے۔ الجلیلی (۳۶۵ھ - ۴۴۹ھ) نے انسان کا کل میں اس نظر کے کی تائید کی۔ وہ کہتا ہے کہ ”خدا پانی ہے اور فطرت آب نجمہ یبرق“ ابن العربی کے نزدیک بھی ”خالق اور مخلوق دونوں کا جوہر ایک ہے“ (وجودات مخلوقات میں وجود خالق) بایزید بسطامی نے تصوف میں ”فنا“ کے تصور کو داخل کیا۔ یعنی جب عارف نہایت درجہ تک پہنچتا ہے تو اس کی ذات منفي ہو جاتی ہے اور صرف خدا ہی خدا رہ جاتا ہے اور یہ مرتبہ ”فانی اللہ“ کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ صوفیہ کے عقیدہ میں حصول فنا کے بعد بقائے دوام حاصل ہوتا ہے۔ اس عقیدے کا مقابلہ بدھ مذہب کے موکش یا نرانا سے کیا جاتا ہے۔

اسی سلسلہ میں عقیدہ حلول کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ”اللہ تعالیٰ ہر شے کے رنگ دے دیے، میں اس طرح ہر شے میں ہو جاتا ہے کہ جسے ذات الہی سے کوئی جدا شے قرار دینا ممکن نہیں اور اس سے اگر خود اس پر خدا کا اطلاق کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ فرقہ حلویہ کے مطابق خدا ہر شے کے جزو جزو میں اس طرح گھل کر لپکایا ہوا ہے کہ اس شے ہی کو بجائے خود اللہ قرار دے دیا جائے تو صحیح ہوگا۔ یہ عقیدہ ویرانت سے تعلق رکھتا ہے۔ حسین بن منصور حلاج بھی حلول کا قابل تھا۔ ”وہ دلی تھا کہ تذکیہ نفس و تصفیہ قلب اور کثرت عبادات

۱۱۱ الحق ہمیں ویرانت کے ”اہم برہم اسی“ (میں خدا ہوں) اور ”تو اسی“ (تو وہ ہے) کی یاد دلاتا ہے۔

۱۱۲ حسین بن منصور حلاج از جناب مولوی محمد اسماعیل تیسے ”عالمگیر“ جون ۱۹۴۶ء۔

سے انسان بشریت سے منزہ ہو جاتا ہے اور اُس میں ایک خاص استعداد و صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اُس وقت روح الہی اُس میں حلول کر جاتی ہے اور وہ انسان سے بالکل خراب ہوتا ہے۔ اسی عقیدے کے پیش نظر اس نے "الحق (میں حق ہوں) اور" لیس فی حقیقی الحق" (میرے لباس حق کے سوا کچھ نہیں ہے) کا نعرہ لگایا، اسی دعوے کو ہیبت کی بنا پر اسے مسیحیوں میں قتل کر دیا گیا۔

**شریعت سے انحراف** منصور کے ایسے مرموز فقرے بآزید بسطامی سے بھی منسوب کئے جاتے ہیں مثلاً، "میرے جبہ میں خدا کے سوا کوئی نہیں ہے۔" "میری شان کیسی عالی ہے۔" "فی الحقیقت میں خدا ہوں، میرے سوا کوئی خدا نہیں رکھتا۔" میری پرستش کرو، وغیرہ وغیرہ۔ وہ خواب "معراج" حاصل ہونے کے بھی مدعی تھے۔ انھیں کا قول ہے کہ عشق عاشق اور معشوق تمہوں ایک ہیں میں اور تو (خدا) کا تفریق سے خدا کی توحید میں فرق پڑتا ہے۔

ابو سعید خراسانی (متوفی ۳۸۰ھ) عارفین کے لئے شریعت کو غیر ضروری بتاتے تھے۔ اپنے سلسلہ کے درویشوں کو انھوں نے ہدایت کی تھی کہ جب موزن اذان دیں تو سلسلہ قص کو منقطع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ حج کی بھی ممانعت کرتے تھے۔ شمس تبریز کے اشعار ذیل سے بھی حج کی نفی ہوتی ہے۔

اے قوم! بہ حج رفت! کجا اید کجا اید  
معشوق ہمیں جاست بیائید بیائید  
معشوق تو ہمسایہ تو دیوار بہ دیوار  
در باد یہ سرگشتہ چرا اید چہ اید  
آنان کہ طلبگار خدا اید، خدا اید!  
حاجت بہ طلب نیست شما اید شما اید!  
چیزے کہ نگر دید گم از بہر چہ جو اید  
کس غیر شما نیست کجا اید کجا اید!

قدیم صوفیوں کے برخلاف جو سنت رسول کا اتباع کرتے تھے، یہ شریعت سے سرکش انحراف ہے۔ یہی وجہ تھی کہ فقہاء اور شریکین نے ہمیشہ تصوف کو نفاق سمجھا۔ خارجیوں اور امامیوں نے بھی اس کی مذمت کی۔ معتزلہ اور علماء اظہار نے تصوف کی اس لئے مخالفت کی کہ خالق اور مخلوق کے عشق کو تسلیم کرنے کے معنی نظری طور پر "تشبیہ" کے اصول کو تسلیم کرنا اور عملی طور پر ملائمت اور حلول کو ماننا ہے۔

**حقیقت محمدی** بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے صوفیہ کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمدؐ کے ساتھ قرآن کا تصور بھی انھوں نے شامل کیا تھا، لیکن دراصل یہ خیال بڑا پرانا ہے۔ ابن سینا (ولادت ۳۹۰ھ) نے اپنی کتاب الاشارات میں

نفسہ از طوق عقل (علت اولی) کا مقابلہ خدا کے فور سے کیا تھا جس کا قرآن (۱۰۰/۱) میں ذکر ہے۔

یوحنا کی انجیل میں حضرت عیسیٰ کا یہ قول "جس نے مجھے دیکھا اُس نے باپ کو دیکھا" (۱۰/۱)

رسول اللہ سے اس طرح منسوب کیا جاتا ہے "جس نے مجھے دیکھا اُس نے اللہ کو دیکھا" بعض صوفیہ کے نزدیک محمدؐ جامع بشری میں خدا تھے نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی کہ وہ تخلیق عالم سے پہلے موجود تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے صوفیہ کے نظام تکوین میں محمدؐ کا وہی مقام ہے جو عیسائیت میں "کلام" (Logos) کا ہے۔ یوحنا کی انجیل کی ابتدائی آیات ہیں:-

لے حسین بن منصور صلاح الاجناب مولوی محمد اسماعیل تاصع "عالمگیر" جون ۱۹۳۷ء۔

لے امام غزالی کی کتاب "مشکوٰۃ الانوار" کے ایک باب میں حقیقت محمدی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

”ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔۔۔۔۔ ساری چیزیں اُس کے وسیع سے پیدا ہوئیں اور جو کچھ پیدا ہوا ہے اُس میں سے کوئی چیز بھی اُس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی اُس میں زندگی تھی اور وہ زندگی آدمیوں کا فور تھا۔“ (باب ۱- آیات ۱-۴)

حدیث نبوی ہے کہ ”سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا کیا تھا اور پھر اُس نور سے زمین و آسمان اور ساری مخلوق کو پیدا کیا۔ دوسری حدیث ہے :- ”میں پیدا ہوا ہوں اللہ کے نور سے اور میرے نور سے ساری مخلوق ہے۔“ (قصص الانبیاء)

محمی الدین ابن عربی (۶۱۱ھ - ۷۲۶ھ) نے حقیقت محمدی پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :- ”حقیقت محمدی کا تخلیقی، احمائی اور عقلی اصول ہے۔ وہ ”حقیقت الحقائق“ ہے جس کا ظہور ”انسان کامل“ میں ہوتا ہے۔ کامل انسان وہ عالم کبیر کے جملہ صفات کا اجتماع ہو۔“

عبد الکریم الجلیلی (۶۱۳ھ - ۷۲۶ھ) نے اپنی مشہور تصنیف ”الانسان الکامل“ میں حقیقت محمدی پر یوں روشنی ڈالی کہ ”اُس کا ایک نام امر اللہ ہے اور تمام موجودات میں اُس کا مرتبہ افضل ترین ہے۔ وہ تمام مخلوقات کا محور ہے۔ ملائکہ اُس کے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو قطرے بحر ذفار کے سامنے۔“

تخلیق عالم کو صوفیہ کی اصطلاح میں ”نزل“ کہتے ہیں۔ اس نظریے کی تائید میں حدیث قدسی نقل کی جاتی ہے یعنی ”میر ایک مخفی خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں پس میں نے مخلوقات کو پیدا کیا۔“

صوفیہ کے نزدیک ساری کائنات دو حصوں میں منقسم ہے۔ عالم امر اور عالم خلق۔ عالم امر سے مراد وہ لطیف اشیا لفظ ”کن“ سے پیدا ہو گئیں۔ یہ غیر فانی ہیں اور عالم خلق سے مراد وہ اشیا ہیں جو مادے سے پیدا کی گئیں۔ فانی ہیں۔ ان دو ملاکر عالم کبیر کہتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں انسان کو عالم صغیر کہا جاتا ہے جو عالم امر کے پانچ عناصر (قلب، روح، سر، مخفی اور عالم خلق کے پانچ عناصر (نفس، خاک، باد، آتش، آب) کی ترکیب سے بنتا ہے۔

صوفی کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ترکیبی عناصر (جنہیں لطائف کہتے ہیں) کو منزہ کر کے عرفان حاصل کرے۔ تصوف کی اصطلاح میں روحانی زندگی کو ”سفر“ کہتے ہیں اور حق کی طالب روح ”سالک“ کہلاتی ہے۔

**طریقہ تصوف** منزل مقصود ”معرفت“ ہے اور راستہ ”طریقہ“۔ وہ مختلف ”مقامات“ اور ”حوال“ سے گزر کر منزل پہنچ کر ”فانی فی الحقیقت“ ہونا چاہتی ہے۔

امام غزالی، مشکوٰۃ الانوار میں لکھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ روشنی اور تاریکی کے ۷۰ ہزار حجابات میں مخفی ہے جن میں سے نو پر دے نور کے ہیں اور نصف بیرونی تاریکی کے۔ وصال کی آرزو مند روح سات منازل سے گزرتی ہے اور ہر منزل طے کرنے پر دس ہزار دور ہو جاتے ہیں بالآخر جب روح آخری منزل کو پہنچتی ہے تو سارے حجابات دور ہو جاتے ہیں اور طالب مطلوب کے روبرو ہفت منازل کے بارے میں صوفیہ میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک وہ منزلیں یہ ہیں :- (۱) عبودیت (۲) عشق (۳) زہد (۴) معرفت (۵) حقیقت (۶) وصل۔ بعض روحانی نشو و نما کی صرف چار منزلیں مانتے ہیں یعنی شریعت، طریقت، معرفت، حقیقت، ان کا نام مسیحی صوفیوں کی تین اصطلاحوں سے کر سکتے ہیں :- (۱) تزکیہ نفس (۲) تنویر قلب (۳) واصل۔

صوفیہ کشف کے بھی قابل ہیں یعنی ہر انسان میں خدا تک پہنچنے اور اُس کو جاننے کے لئے ایک قوت مخفی موجود ہے۔ اس خواب پر بیدار کرنا ہی صوفیہ کا نصب العین ہے۔ اس کا آغاز دنیا کی حرص و ہوس کو چھوڑ کر عبادت، ریاضت اور مراقبہ سے ہوتا ہے۔ طریقت کے ”راہ حق“ اس منزل میں قدم رکھنے کے بعد سالک کو الہام حاصل ہوتا ہے۔ بعد ازاں انسان خدا کا سچا علم (عرفان) حاصل کرتا ہے۔ منزل وہ ہوتی ہے جب انسان کی اپنی خودی بالکل مٹ جاتی ہے اور خدا ہی خدا رہ جاتا ہے۔

روحانی نشوونما کے لئے انسان کو ان تمام منازل سے گزرنا پڑتا ہے جن سے خدا کو بین عالم کے فعل میں گزرا لیکن خدا کا عالم مخلوقات میں ظہور منزل کی صورت میں ہوتا ہے اور بندہ کا خدا تک پہنچنا عروج کی صورت میں انھیں کو توس نزول اور توس عروج کہتے ہیں اور یہی سفر طریقی اور مظهریہ کہلاتا ہے۔

**عشق مجازی** صوفیہ عشق مجازی کو عشق حقیقی کی ایک منزل قرار دیتے ہیں یعنی جب انسان کو دنیاوی عشق میں ناکامی ہوتی ہے تو وہ خدا کی طرف رجوع ہوتا ہے اور دنیا داری کو چھوڑ کر خدا سے محبت کرنا سیکھتا ہے۔ وہ ذات خداوندی کو اپنا مقصود قرار دیتا ہے اور خدا کے لئے خودی کو مٹا دیتا ہے دنیا میں پڑ کر خدا کا حاصل کرنا صوفیہ کے نزدیک محال ہے۔

اگرچہ رہبانیت اسلام کے متنافی ہے (حدیث ہے "لا رہبانیت فی الاسلام") لیکن ترک دنیا صوفیہ کا شعار ہے۔ ابراہیم بن ادہم (متوفی ۸۵۰ھ) بیخ کے شہزادے تھے لیکن انھوں نے تخت و تاج چھوڑ کر فقری لے لی (ان کی زندگی ہمیں گوتم بدھ کی یاد دلاتی ہے) ابو حامد غزالی (متوفی ۵۰۵ھ) جو بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں پروفیسر تھے فلسفہ اور دیہیات میں روحانی تسکین نہ پا کر تصوف کی طرف مائل ہوئے اور اپنے ہندسے سے استغفار کے کر تلاش حق میں مبتلا ہو کر خدا جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی۔ اسی طرح فرید الدین عطار (ولادت ۶۰۵ھ) نے بھی اپنا پیشہ چھوڑ کر فقری اختیار کی۔ مختصر یہ کہ فقر و فاقہ اور ترک دنیا صوفیہ کی زندگی کا ایک ضروری جزو رہا ہے۔

**صوفیہ کی آزاد روی** غری کہتا ہے۔ چونکہ صوفیہ کا واحد مقصود "تلاش حق" ہوتا ہے لہذا وہ مذہب میں تفریق نہیں کرتے۔

فارسی آرد و شعرا نے کثرت اس خیال کو ظاہر کیا ہے۔  
 عاشق ہم از اسلام خراب است و ہم از کفر  
 ہرگز گو کہ کعبہ زبجہ نہ خوشتر است  
 پروانہ چراغ حرم و دیر : داند  
 ہر جا کہ هست جلوہ جانا نہ خوشتر است

**قبال اور فلسفہ خودی** تصوف کی بنیاد متافانی اللہ کے عقیدے پر ہے۔ وہ دنیاوی علوم و فنون میں ترقی کے بجائے ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے توکل، قنوطیت اور تقدیر پرستی اس کے لازمی ثمر ہیں اور جب تصوف شعروادب میں داخل ہو گیا تو عوام پر اس کی اثر اندازی بڑھ گئی جس سے عوام کے ذوق عمل کو صدمہ پہنچا اور من حیث الکل تصوف مسلمانوں کے تشرک کا باعث ہوا۔ لہذا اسس راہ روی کے استیصال کے لئے ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال (۱۸۸۹ء - ۱۹۳۸ء) نے اپنی شہرہ آفاق "اسرار خودی" میں تصوف کی ایک نئی تفسیر پیش کی اور ان کے پیغام نے مسلمانان عالم میں بیداری کی ایک نئی روح پھونک دی۔ اقبال نے فلسفہ اور تصوف کا گہرا مطالعہ کیا تھا تصوف کے انسان کامل اور فلسفہ کے "فوق البشر" (Superman) سے انھوں نے "فلسفہ خودی" کا بنیادی تخیل اخذ کیا۔

انسان و خدا کے باہمی تعلق پر اقبال نے اپنے فلسفہ خودی میں جو خیال آرائی کی اس کا خلاصہ یہ ہے:۔ خدا کے مقابلہ میں انسان ایک مستقل ہستی ایک ہے اور اُسے "دھل" کی آرزو کے بجائے اپنی "خودی" میں راحت پید کرنا چاہئے۔ صوفیہ کے نزدیک "ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اپنے نفس کو نفسِ کامل بن کر دیں مخلوق کی سعادت اسی میں ہے کہ وہ دریا کی بے پایاں اور لازوال موجوں میں گم ہو جائے۔ لیکن اقبال کا کہنا ہے کہ جب انسان کی مزادیت ہی ضایع ہو گئی تو مصالح کا کیا لطف۔ اگر قطرہ دریا میں نہ گتا تو اپنے جدا گانہ ہستی کھو بیٹھے گا لہذا ہمیں نفی خودی کے بجائے حفظ خودی ترمیم کرنا چاہیے۔ دراصل "فلسفہ خودی تصوف کے اس مخصوص تصور کا روپ جو انسان کو اپنی جدا گانہ ہستی مٹانے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ ہستی صوفیہ کے نزدیک باعث تنگ اور مریخ آلام ہے اقبال کے نزدیک ماہ صدف و مہر و مہر ہے اور وہ اس کی تکمیل کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ خدا سے ملنے والا ہے لیکن اپنی ہستی کھو کر نہیں"۔ اقبال انسان کی مجبوری کے قابل نہ تھے۔ نوع انسان کے لئے ان کا یہ پیغام تھا ہے خودی کو بلند اتنا کر کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے پوچھے بتا دے کہ کیا ہے

قبال اور اس کا پیغام صفحہ ۱۶-۱۷-۱۸-۱۹ اقبال اور خدا "اقبال اور خدا" از نواب عبداللطیف صاحب ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل مالک رحیم علی

## عقلیت کا عروج

تاریخ عالم کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب اور علم ہمیشہ ایک دوسرے سے نبرد آزما رہے ہیں اور ایسا ہونا چاہئے تھا کیونکہ مذہب اپنی تعلیمات پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا چاہتا ہے اور علم ہر چیز کو تسلیم کرنے سے پہلے عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ اسی لئے علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ لوگوں میں تشکیک کا مادہ بڑھتا گیا اور پھر اسی تشکیک نے آگے چل کر الحاد و کفر کی صورت اختیار کر لی۔ جب کسی قوم کے مذہب اخلاق میں بہت زیادہ خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو مفکرین اصلاح کی ضرورت محسوس کرنے لگتے ہیں اور جب کوئی شخص اصلاح کی غرض سے سامنے آتا ہے تو اس کی سخت مخالفت کی جاتی ہے۔ مگر میں جب اخلاط نے اصلاحی قدم اٹھایا تو قوم اس کی دشمن ہو گئی۔

ہندوستان میں بدھ اور جین مذاہب کا ظہور برہمنوں کے مذہب کے رد عمل کی صورت میں ہوا تھا چونکہ ان دو مذاہب کے بانیوں (جہاتما گوتم بدھ اور جہاگیر سوامی) نے ویدک مذہب کے بنیادی عقاید کو تسلیم کر لیا تھا اس لئے مصلح و پیغمبر کہلائے لیکن چارواک نامی فریق نے ویدک مذہب پر سخت تنقید کی اور مصالحت پر طیار نہ ہوا اس لئے مجھ کہلایا۔ یونان و روم کے ملاحہ کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے خیالات عوام سے قطعاً مختلف تھے اور وہ کسی طرح ان سے مفاہمت کرنے پر طیار نہ تھے۔

عرب میں محمد کا ظہور اُس وقت ہوا تھا جب عربوں کا مذہب خرافات اور مکروہات کا مجموعہ بن کر رہ گیا تھا۔ ان کی ہر طرح سے مخالفت کی گئی، لیکن بالآخر انھوں نے اپنے بلند اخلاق اور کردار سے بددلوں کو رام کر لیا اور پیغمبر کہلائے۔ پھر مسلمانوں ہی میں بن المروان ایسے مجاہد ظہور پیدا ہوئے اور بہت سے دوسرے لوگ بھی جنہوں نے اسلامی تعلیمات پر علم و عقل کی روشنی میں نکتہ چینی کیا اصلاح پر کمر بستہ ہوئے۔

افریقہ الحاد اور کفر دنیا میں کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن یورپ اور امریکہ سے پہلے جن ممالک میں الحاد کا ظہور ہوا وہ محض ذاتی غور و فکر کا نتیجہ تھا، اُس میں سائنس کا دخل نہ تھا اور موجودہ الحاد سائنس پر مبنی ہے۔

قرون وسطیٰ میں یورپ میں تہذیب و شائستگی کا زوال ہو چکا تھا۔ جا بجا چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم تھیں۔ دور جدید کا آغاز جاگیرداروں کا زور تھا۔ عوام کی حالت نہایت خراب تھی۔ تعلیم کا فقدان اور مذہب کا غلبہ تھا۔

مذہبی معاملات میں پوپ کی رائے آخری تسلیم کی جاتی تھی اور گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی میں مغربی یورپ میں تقریباً نصف جاگیردار چرچ کے افسر تھے۔

سولھویں صدی سے جاگیرداری مٹنے لگی اور حکومت کی باگ ڈور طاقتور بادشاہوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ بادشاہوں نے

اگرچہ بدھ اور جین مذاہب بھی مجھ میں تاہم ہندوؤں کی نگاہ میں گوتم بدھ کی اتنی اہمیت ہے کہ انھیں دشمن کا اوتار مان لیا گیا۔ جین مذہب بھی ہندو مذہب کی ایک شاخ مانا جاتا ہے۔ لیکن چارواک فرقہ کو ہندوؤں نے ہمیشہ ذلت کی نگاہ سے دیکھا۔

اس بات کی بھی کوشش کی کہ سیاسی صیغہ کی طرح مذہب پر بھی اُن کا اقتدار قائم ہو جائے۔ اس پر پوپ اور بادشاہوں میں جھگڑا نہ ہوا۔ بالآخر پوپ کی طاقت محدود ہو گئی اور بادشاہوں کے اختیارات مذہب کے معاملہ میں بھی بڑھ گئے۔ وہ "نمایب الہی" کے اصول کے قابل تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ بادشاہوں کا تقرر خدا کی جانب سے ہوتا ہے لہذا وہ خدا کے سوا اپنے اعمال اور افعال کے لئے کسی کے روبرو جوابدہ نہیں لیکن علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ عوام کو اپنے حقوق اور فرائض کا پورا احساس ہو چکا تھا۔ اٹھارویں صدی سے استبدادی حکومتوں کا زوال شروع ہوا اور دور جدید کے دوسرے نصف (پہلا نصف سولہویں سے اٹھارویں صدی تک مانا جاتا ہے) یعنی انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں دنیا کے بیشتر ممالک سے بادشاہت رخصت ہو گئی اور جمہوریت قائم ہو گئی۔

یونان و روم کے زوال کے بعد سے یورپ میں جہالت کا دور شروع ہو گیا تھا۔ چودھویں سے سترہویں صدی علوم و فنون کا احیاء و رنایسنس (Renaissance) کہلاتی ہے۔ جو بڑی حد تک مسلمانوں کی رہنمائی سے ہے۔ تمدن یورپ پر اسلامی اثرات کی ابتداء صلیبی جنگوں سے ہوتی ہے۔ علم کا پہلا مرکز اٹلی تھا وہاں سے علمی خروق فرانس۔ اسپین اور انگلستان وغیرہ منتقل ہوا۔ بعد کو کاغذ سازی کے رواج اور چھاپے خانوں کے قیام سے اشاعتِ علوم میں بڑی مدد ملی۔

مذہبی اصلاح (Reformation) اول اول پوپ کو کلیسا کا صدر مانا جاتا تھا اور ملک کی حکومت پر بھی اس کا بڑا اقتدار تھا حتیٰ کہ جب جرمنی کے بادشاہ ہینری چہارم کو پوپ گرگوری ہفتم (۱۵۲۳ء - ۱۵۸۵ء) نے عیسائی برادری سے خارج کر دیا تو وہ ننگے پاؤں اور ٹٹاٹ لپیٹ کر اُس سے معافی مانگنے گیا تھا۔

اس کے بعد جب علم کی روشنی پھیلی تو لوگ پوپ پر بھی رائے زنی کرنے لگے اور اصلاحِ کلیسا کی طرف لوگوں کو توجہ ہوئی۔ اس سلسلہ میں جان وکلف (John Wycliffe) کا نام سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے جو چودھویں صدی عیسوی میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں دینیات کی تعلیم دیتا تھا۔ وہ بڑا آزاد خیال شخص تھا۔ اُس کی نکتہ چینی سے ناراض ہو کر پوپ نے اُسے برادری سے خارج کر دیا (اُس زمانہ میں کسی بھی آدمی کے لئے یہ سب سے بڑی راہِ سزا خیال کی جاتی تھی) اور اُسے یہ حکم ملا کہ یونیورسٹی میں تعلیم کا کام ترک کر دے اور جب وہ مر گیا تو ایک مذہبی جلسہ اور کے حکم کے مطابق اُس کی لاش پاک مقام سے کھود کر ناپاک جگہ پر پھینک دی گئی اور اُس کے پیروؤں کی کثیر تعداد زندہ جلادی گئی۔ دوسرا شخص ایراسم (Erasmus) تھا جس نے چرچ کی خرابیوں کو طشت ازباہ کیا۔ اُس کا زمانہ ۱۴۶۹ء سے ۱۵۳۶ء ہے۔ اگرچہ وہ ہالینڈ میں پیدا ہوا تھا مگر اُس کی زندگی کا زیادہ حصہ فرانس۔ انگلستان، اٹلی اور جرمنی میں گزرا۔ ایک تھا۔ پوپ کو بے نقاب کرنے کے لئے اُس نے ۱۵۱۸ء میں ایک کتاب "حقائق کی تعریف" (The Praise of Folly) لکھی جس سے پوپ کے وقار کو سخت نقصان پہونچا۔

تیسرا شخص مارٹن لوتھر (Martin Luther) تھا۔ اُس نے مذہبی اصلاح کی سب سے زیادہ کوشش کی۔ ۱۵۱۷ء میں جرمنی میں پیدا ہوا اور ۱۵۴۶ء میں وفات پائی۔ اُس نے لیوڈیم (Louvain) کی سخت مخالفت کی۔ سوڈ اور آخر کار جرمنی میں پروٹسٹنٹ مذہب کی بنیاد پڑ گئی جو یورپ کے دیگر ممالک میں بھی پھیلنے لگا یہاں تک کہ اب اسپین و اٹلی کے علاوہ وہ تمام یورپ و امریکہ پروٹسٹنٹ کلیسا کا مقلد ہے۔

۱۔ آر۔ کے۔ واکٹر ایم۔ اے۔ ارتقاءِ انسان، صفحات ۱۸۵-۱۸۸ (کاغذ ۱۹۵۷ء)۔ ۲۔ آر۔ کے۔ واکٹر ایم۔ اے۔ "دنیا کی مختصر تاریخ" کاغذ ۱۹۵۷ء

۳۔ آر۔ کے۔ واکٹر ایم۔ اے۔ صفحات ۱۸۷-۱۸۸۔ ۴۔ آر۔ کے۔ واکٹر ایم۔ اے۔ صفحات ۱۸۷-۱۸۸۔ ۵۔ آر۔ کے۔ واکٹر ایم۔ اے۔ صفحات ۱۸۷-۱۸۸۔

**دھرم سے انحراف** پروٹسٹنٹ مذہب کے قیام سے دھرم میں فرقہ وارانہ خونریزی کا آغاز ہوتا ہے۔ جب کسی ملک کا حکمران کیتھولک مذہب کا پیرو ہوتا تو پروٹسٹنٹ لوگوں کا خون بہتا اور جب کوئی حکمران پروٹسٹنٹ ہوتا تو کیتھولک لوگوں کا

تل عام کرتا۔ پروٹسٹنٹ مذہب والوں کو سرزدینے کے لئے پوپ نے ایک خاص ٹیکہ تفتیش (Inquisition) قائم کیا جس نے چند سال کے مختصر عرصہ میں اسپین اور اٹلی میں لاکھوں انسانوں کی جان بڑی عقوبت سے لی۔ اور جب بھی کسی عالم نے کوئی ایسی بات کہی جو بائبل کی تعلیم کے خلاف ہوئی تو وہ بھی پوپ کا نشانہ غضب بنا۔ انفرنس جیتی علمی ترقی ہوتی جاتی تھی اتنی ہی لوگوں کو اس بات کا احساس ہوتا جاتا تھا کہ بائبل "الہامی صحیفہ" نہیں ہے اور اُس کی بعض تعلیمات علم کی روش سے غلط ہیں۔ چنانچہ گیارڈانو برنو (Giordano Bruno) اطلاوی عالم کو اسی جرم میں پوپ کے حکم سے سات سال کے لئے قید میں ڈال دیا گیا اور پھر ارغروی سنہ ۱۶۰۰ء کو زندہ جلادیا گیا اور گالیلو (Galileo) کو اس جرم میں کہ وہ سورج کے گرد زمین کی گردش کا قائل تھا، قانونی شکنجہ میں کسایا۔

پھر عالموں کے دشمن صرف کیتھولک مذہب کے ماننے والے ہی نہ تھے بلکہ پروٹسٹنٹ مذہب کے لوگ بھی تھے۔ انھوں نے عیسائی مذہب میں صرف اتنی ہی اصلاح کی تھی کہ پوپ کی غلامی کے جوئے کو اتار پھینکا تھا، اور گرجوں سے مریم اور عیسیٰ کے بت اور تصویروں نکلا دیں تھیں لیکن وہ اس کے لئے طیار نہ تھے کہ کوئی شخص بائبل کے بیانات کو غلط ثابت کرے۔ اگرچہ ارباب مذہب نے سائنسدانوں اور فلاسفہ پر طرح طرح کے ظلم کئے تاہم ان کی ترقی برابر جاری رہی۔

فرانس - ڈیکارٹ (۱۵۹۶ء - ۱۶۵۰ء) کو فلسفہ جدید کا بانی مانا جاتا ہے وہ پہلا شخص تھا جس نے فلسفہ اور مذہب میں تفریق پیدا کی۔ اگرچہ وہ خدا کا قائل تھا تاہم خدا کے بارے میں اُس کا تصور عوام سے مختلف تھا۔ جیسوٹ پادریوں کے خون سے اُس نے اپنے خیالات کا اظہار کھل کر نہیں کیا لیکن اس میں ڈراشہ نہیں کہ وہ عقلیت کا زبردست حامی تھا۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت اس کی کتاب (Discourse on Metha) ہے۔ ڈیکارٹ کے انتقال کے صرف تین سال کے بعد اُس کے فلسفہ پر پابندی عاید کر دی گئی یاں ہمہ اُس کا

فلسفہ ترقی کرتا رہا۔  
ہولنس فریٹ (۱۶۰۱ء - ۱۶۵۰ء) فرانس کا پہلا عالم تھا جس نے اپنے کو لا مذہب ظاہر کیا اور روش (۱۶۵۰ء - ۱۶۵۹ء) اور لیٹر (۱۶۵۹ء - ۱۶۸۵ء) سماجی انقلاب پیدا کرنے میں بڑی گرفتار خدمات انجام دیں۔ اگرچہ یہ دونوں خدا پر ایمان رکھتے تھے لیکن وحی کے قائل نہ تھے اور دائیٹر کو بقائے روح سے بھی انکار تھا۔ جب دائیٹر نے اپنے فلسفیانہ خطوط (Philosophical Letters) شائع کئے تو اصحاب کلیسا اس قدر برہم ہوئے کہ اُس کی جلدوں کو فراہم کر کے جلادیا اور غریب دائیٹر کو جان بچانے کے لئے ایک قلعہ میں پناہ یعنی پڑی۔

دائیٹر اور روش کا ہم عصر ایک دوسرا زبردست عالم ڈویٹرٹ (۱۶۱۳ء - ۱۶۵۰ء) تھا جس نے فلسفہ تشکیک سے متاثر ہو کر ۱۶۴۶ء میں ایک کتاب لکھی اور اس کی پاداش میں اسے ایک سال کے لئے قید کر دیا گیا۔

اسی سلسلہ میں مشہور عالم فطرت بٹان (۱۶۰۶ء - ۱۶۸۸ء) کا ذکر بھی ضروری ہے جس نے ۳۵ سال کے عرصہ میں (۱۶۴۹ء - ۱۶۸۵ء تک) ۳۶ جلدوں میں اپنی شہرہ آفاق کتاب (Natural History) لکھی تھی۔ اس کتاب میں اُس نے سورج اور سیاروں کی پیدائش کا وہ نظریہ بھی شامل کر لیا جس کا بعد خاکہ ڈیکارٹ نے بنایا تھا اور جسے سائنسی صورت لاپلاس نے عطا کی۔ پادریوں نے اُسے مجبور کیا کہ وہ اس کتاب کی بعض عبارتیں بدل دے۔ غالباً اُس نے ایسا ہی کیا کیونکہ بعد کو اُس نے اپنے ایک دوست سے

Voltaire & Rousseau & Nicolas Freret & Descartes

Buffon & Diderot





امرو گیا۔ ٹامس پین (1786-1793) نے عیسائی مذہب کی غلطیوں اور بائبل کی خرافات کو ظاہر کرنے کے لئے اپنی مشہور کتاب (Age of Reason) لکھی جو بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ بینٹھام (1748-1832) رابرٹ اوپن (1781-1857) شیلی (1792-1842) اور کارلائل (1795-1834) وغیرہ یہ سب لاد مذہب تھے۔

جب چارلس ڈارون (1799-1882) نے اپنا مشہور "نظریۃ ارتقاء" پیش کیا اور اُس کی کتابیں "مصدر انواع" (Origin of Species) اور "سلالت انسان" (Descent of Man) پھیلیں تو دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا کیونکہ ان کتابوں نے بائبل کے وقار کو سخت نقصان پہونچایا۔ ارباب مذہب نے نظریۃ ارتقاء کی سخت مخالفت کی۔ ٹامس ہنری کپلے (1817-1895) اور ارنسٹ ہیکل (1832-1919) نے ڈارون کی پرچوش حمایت کی اور بالآخر سائنس اور مذہب کی اس جنگ میں سائنس کی جیت ہوئی۔ اب تک ناسب مابعد الطبیعیات، سیاسیات، اخلاقیات، قصص و حکایات کا مجموعہ تھا، لیکن رفتہ رفتہ جہیز مذہب کی گرفت سے آزاد ہونے لگیں۔ سائنس کی ترقی سے یہ ظاہر ہو گیا کہ زمین کی پیدائش اور اُس کی صورت کے بارے میں مذہب کے آراء کس قدر غلط ہیں۔ آثار قدیمہ کے کشفیات اور تقابلی علم المذہب نے مذہب کی اصلیت کو ظاہر کر دیا۔ دن بدن لوگوں میں تفکیک کا مادہ بڑھتا گیا۔ چنانچہ کپلے اور ہربرٹ کنگ (1832-1903) وغیرہ مشکل تھے۔ چارلس بریڈلاؤ (1833-1909) نے اپنے کو لاد مذہب ظاہر کیا اور بت شکن (Acomodation) کے نام سے مذہب کے خلاف مضامین لکھے۔ کولس (1839-1909) اور مہیلیٹن (1849-1939) وغیرہ بھی مذہب کو خیر باد کہہ دیا۔ برنارڈ شو نے بائبل کو "جموٹوں کا بتل" (Packet of Lies) بتایا اور خدا کو "قوت حیات" (Forced Life) ظاہر کیا۔ عصر جدید کے مشہور فلسفی اور ماہر ریاضی بریڈلاؤ (1833-1903) (ولادت 1833) بھی خدا کو ایک قسم کی "کائناتی روح" تسلیم کرتے ہیں۔ امریکہ - امریکی معلم اخلاق ایمرسن (1803-1882) وحدت الوجود کا قائل تھا۔ وہ خدا کو "روح برتر و اعلیٰ" (Over Soul) کہتا تھا اور اُس کا منبع فیلڈنگ ہال (1809-1919) "روح عالم" (World Soul) - ولیم جیمس (1829-1909) امریکی ماہر نفسیات نے اپنی کتاب "کثری کائنات" (A Pluralistic Universe) مطبوعہ 1897ء میں خدا کے عیسوی تخیل کی خدمت کی۔ ماہر عضویات لوئس (1809-1903) نے اپنی کتابوں میں مادیت کی پرزور تائید کی ہے۔ جارج سنٹایانا (1817-1903) نے اپنے کتاب (Reason in Science) میں اس بات کا اعتراف کیا کہ "فلسفہ طبیعی میں میں پکا مادیتی ہوں... لیکن میں یہ جاننے کا مدعی نہیں کہ خود مادہ کیا ہے"۔ اطالوی فلسفی کروچے (ولادت 1861) نے اگرچہ مادیت کی مخالفت کی تاہم بقائے روح اور شخصی خدا کا قائل اُس نے دین عیسوی ترک کر دیا۔

الغرض یورپ و امریکہ میں ارباب فکر و نظر رفتہ رفتہ مذہب سے منحرف ہوتے رہے اور آخر کار یہ وہ اس نقطہ پر پہونچ گئے جہاں شخصی خدا ختم ہو کر قوت مجردہ اس کی جگہ لے لیتی ہے اور یہ ابتداء تھی اس لاد مذہبیت کی جس نے آگے چل کر امریکہ میں ایک مستقل ادارہ کی صورت اختیار کر لی اور مذہب کا تصور داستان پارینہ ہو کر رہ گیا۔

Carlyle    Shelley    Robert Owen    Bentham    Thomas Paine     
Ernest Haeckel    Sir Thomas Henry Huxley    Charles Darwin     
Hamilton    Collins    Charles Bradlaugh    Herbert Spencer     
Emerson    Bertrand Russell    Bernard Shaw     
Loeb    William James    Fielding Hall     
Croce    George Santayana

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۵۶)

دیوان ظہیر	حکیم ظہیر خاریانی	ع
کلیات اسمعیل	اسماعیل اسمعیلی	ع
دیوان ناصر علی سرمندی		ع
دیوان مصائب	محمد علی مصائب	ع
دیوان حافظ	خواجہ شمس الدین محمد شیرازی مطبوعہ ممبئی	ع
کلیات سعدی	شیخ مصطفیٰ الدین سعدی	ع
لیلیٰ مجنوں	نظامی - مولانا نظامی	ع
متفرق فارسی قلمی و مطبوعہ :		
رقعات و مضحکات نعمت خان خللی		ع
فرمانہ ساہو تر نامہ	سید ولی اللہ علی بیٹنڈ فارسی ہندی قلمی ۱۲۳۲ھ	ع
اخیر العاشقین	عالم کوک کے مجرب نسخے - فارسی قلمی مکتوبہ جلوسہ عالمیہ شاہ شاہ	ع
شفاء المؤمنین	مجبور نسخے حکمائے متقدمین کے قلمی مکتوبہ	ع
قدیم ہر دو کتب ہجملہ		ع
مجموعہ نسخہ جات اکسیر	محمد بن ثابت نیشاپوری	ع
منتخب اللغات شاہ جہانی	عبد الرشید مطبوعہ ممبئی	ع
کشف اللغات جلد اول	عبد الرحیم	ع
مصطلحات الشعرا محشی خلاصہ بہار عجرب		ع
غیاث اللغات	محمد غیاث الدین مطبوعہ ۱۲۶۵ھ	ع
برہان قاطع کشوری	محمد کمال محمد حسین برہان	ع
مصطلحات وادستہ - وادستہ		ع
حق الیقین	محمد باقر مجلسی قلمی خوشخط	ع
کتاب المکاتیب الرسائل	عبد الحق دہلوی	ع

نگار ہیک ایکشن لکھنؤ

## اکستان کے خریداران "منکار"

7 چھتول روڈ - ویسٹ گارڈن - کراچی

اڈیشہ نگار کا قیام ۱۱ مارچ سے ۱۹ مارچ تک بھوپال میں رہے گا اس لئے ذاتی خطوط کا جواب ۲۰ مارچ کے بعد دیا جا

# نگار

اڈیشہ: نیاز فچوری

امرو گیا۔ ٹاٹا  
(Reason)  
(۱۹۹۲)  
جب

(ecies)  
ان کتابوں  
(۱۹۹۵)

جیت ہوئی۔  
آزاد ہونے لگے  
کے کشافات  
(۱۹۸۵)  
کے نام سے  
بڑا روشنی  
ظاہر کیا  
امریکہ۔

کہتا تھا اور  
امریکی ماہرین  
میسوی تھیں  
(۱۹۹۲)  
مادیتی ہوں  
تاکم بقائے  
ختم ہو کر  
کرتی اور

۱۹  
۱۹  
۱۹  
۱۹  
۱۹

جلد ۶۹	فہرست مضامین مارچ ۱۹۵۶ء	شما
۲	یادداشتیں	
۵	بھوپال کی فضا کے شاعری کا ایک نیم درختاں	
۲۳	منظومات۔ فضا بہ فضا۔ ساقی۔ آبی ہادی۔ حیات گھنٹہ	
۲۸	سیف حسن پوری۔ عید الفطر اور شفقت۔ عربیہ۔ راز۔ مکتبہ	
۳۳	پرتاب بریلوی۔ کنول سیم کناہی۔ اکرم دھولوی	

## ملاحظات

### روس و امریکہ کی شاطرانہ چالیں

ایک زمانہ تھا جب جس ملک میں اپنی سلطنتوں کی توسیع کے لئے بغیر کسی عذر کے دوسری حکومتوں پر حملہ کر دیا کرتی تھیں وہ جاتی تھی اس کے بعد جب ملوکیت کو زوال شروع ہوا اور جمہوریت کا دور آیا تو اس استبداد نے دوسرا روپ اختیار کیا، یعنی کوئی نہ کوئی بہانہ پیدا کیا گئے لگا اور یہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ختم ہو گیا، لیکن جنگ کا خطرہ بدستور دنیا میں باقی کی رسم ختم ہونے کے بعد اب اس کی جگہ حصول اقتدار نے لے لی ہے جو اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہے اور اس وقت یہی ہے۔ ایک طرف اشتراکیت ہے، دوسری طرف ڈاکرسی اور انھیں دونوں کے ذہنی تضاد کو ایک نہا

جنگ میں قہریل ہو جاتا ہے۔  
اس سے انکار ممکن نہیں کہ اشتراکیت نے پچھلے ربع صدی میں کافی وسعت اختیار کر لی  
ڈاکرٹیک حکومتوں نے جن کا قیام انظم امریکہ ہے، اشتراکیت کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑی ز  
تہ ہیں کہ اس طرح نہ اشتراکیت کے اثرات کو وسیع ہونے سے روکا جاسکتا ہے اور نہ ڈاک  
۱۹۵۶ وہ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے جنگ سے ہٹ کر کسی اور طریقہ پر غور کر سکیں  
اس وقت ہر طرف سے "صلح و آشتی" اور "امن و سکون" کا  
۱۹۵۶ کے بین الاقوامی اجتماعات بھی ہونے لگے ہیں، لیکن فضا  
اس میں شک نہیں کہ اشتراکیت کے زمانہ میں

نے اپنی یورپ و امریکہ کے دلوں میں "اندیشہ ہائے دور و دراز" پیدا کر دئے تھے، لیکن اب بھی جبکہ حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں اور روس خود امریکہ و برطانیہ کی طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے، امریکہ، روس کی اس پیشکش کو ماننے کے لئے طیار نہیں، وہ سمجھتا ہے کہ یہ بھی نشان ہی کا دوسرا چہرہ ہے لیکن ذرا مسکراتا ہوا اور مسکراتا ہوا دشمن ظاہر ہے کہ سخت خطرناک ہوتا ہے۔ اس سے قبل اشتراکیت کا پروپیگنڈا زیادہ تر نظریہ کی حد تک محدود تھا اور اشتراکی جماعتیں مختلف ممالک میں اس کا پروپاگنڈا کرتی رہتی تھیں، لیکن اب اس کے لئے روس غنیمت اور عملی اقتصاد کی راہیں اختیار کر رہا ہے اور دوسرے ملکوں کو خواہ وہ کسی اصول حکومت کے پابند ہوں، ہر قسم کی اقتصادی، صنعتی و تجارتی امداد دینے کے لئے آمادہ ہے اور بھر دی و اعانت کرنے والے کی طرف مایل ہو جانا بالکل فطرت انسانی ہے۔

یہ طریقہ کار نیا نہیں ہے اور دوسری جنگ کے بعد سب سے پہلے امریکہ نے اس کو اختیار کیا تھا جس سے روس نے بھی بالواسطہ فائدہ اٹھایا۔ یہ زمانہ اشتراک کے اقتدار کا تھا اور روس خود اپنی اقتصادی، لچھنوں میں گرفتار تھا، اس لئے وہ امریکہ کی اس ترکیب کو سمجھتا تو تھا لیکن عمل نہ کر سکتا تھا۔ امریکہ کی یہ چال اس میں شک نہیں کافی کامیاب ہوئی اور اسی کا نتیجہ آج تک پیکٹ تھا۔

اطلانک پیکٹ ایک بڑا محاذ تھا روس کے خلاف اور اس کا جواب روس کی طرف سے صرف یہی ہو سکتا تھا کہ وہ بحر الکاہل کو امریکہ کے لئے خطرناک بنا دے اور اسی غرض سے اس نے چین و شمالی کوریا کو فوجی و اقتصادی امداد دی۔ گو روس کا مقصد یہ تھا کہ ان کو امریکہ پر ظلم یورپ کو اس کے لئے ناقابل گزر بنانا چاہتا ہے تو وہ امریکہ کے خلاف ایشیا میں اپنے اثرات کو وسیع کرے، چنانچہ افغانستان اور ہندوستان کے ساتھ اپنے تعلقات اس نے بڑھانے شروع کئے اور ہر قسم کی اقتصادی و صنعتی امداد کے لئے آمادہ ہو گیا۔

روس کی یہ چال نہ صرف اطلانک پیکٹ بلکہ بغداد پیکٹ کا بھی جواب ہے جس کو پاکستان اور ایوان کی شرکت نے فی الجملہ کافی اہم بنا دیا ہے۔ ہر چند بغداد پیکٹ خالص برطانیہ کی ڈپلومیسی سے تعلق رکھتا ہے اور امریکہ اس سے فی الحال غریزہ ہے، لیکن چونکہ مشرق وسطیٰ کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا اثر روس پر نہ پڑے اس لئے جلد یا بدیر امریکہ کا اس سے دلچسپی لینا ناگزیر ہے۔

بغداد پیکٹ جب تک سعودی عرب اور مصر دونوں اس میں شامل نہ ہوں ایک کمزور چیز ہے، حقیقت رکھتا ہے اور ان دونوں کی شرکت بہت دشوار ہے، جب تک اسرائیلی حکومت کے نکالے ہوئے دس لاکھ عربوں کی قسمت کا فیصلہ نہ ہو جائے اور امریکہ مشرق وسطیٰ میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا جو سعودی عرب کے رجحان کے خلاف ہو۔

مشرق وسطیٰ میں روس کا درخوردیران کی وجہ سے آسان نہیں، لیکن اس دوران میں ایک طرف مصر و لیبی و یوگیا کے خوشگوار تعلقات اور دوسری طرف افغانستان میں اس کے اثرات بڑھ جانے کی وجہ سے روس کو کم از کم اس بات کا خیال ضرور ہو گیا ہے کہ اگر وہ مشرق وسطیٰ نہیں ہو سکتا تو برطانیہ و امریکہ کی کامیابی بھی یقینی نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ اگر کسی وقت اسرائیلی حکومت کی وجہ سے مشرق وسطیٰ چھڑ جائے تو عرب حکومتیں روس کی طرف مایل ہو جائیں، کیونکہ برطانیہ، اسرائیلی حکومت کے خلاف قدم اٹھانے پر کسی طرح

بھی جبکہ ہر چھوٹی بڑی حکومت امن و سکون ہی کی جستجو میں ہے، دنیا امن و سکون سے دور ہے اور ہمیشہ جنگی دوسروں کو ضعیف و کمزور بنانے اور حصول امن کے لئے امن شکن آلات حرب بنانے کی پالیسی ترک

ال کیا جاتا تھا کہ دستور بننے کے بعد پاکستان میں فی الجملہ ٹھہراؤ پیدا ہو جائے گا اور اس کے بعد سے اپنے اپنے کاموں میں لگ جائیں گے، لیکن افسوس ہے کہ یہ آرزو بھی پوری نہ ہو رہی ہے۔

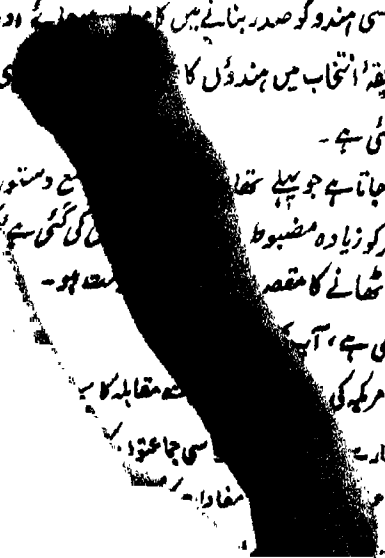
۴۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر دستور جوں کا توں منظور ہو گیا تو وہ پاکستان

# پیش کشی

(۱) فیما بین مسلم و غیر مسلم

(۲) غیر مسلم کی حیثیت سے مغربی پاکستان میں۔ (۳) اسلامی اور اگلی ہیں۔ (۴) دستور کی حیثیت سے ایسی حکومتوں میں جو دکانیوں کی دکانی اور اسلامی غیر مسلمی جمہوری ہے آمرانہ۔ (۵) سیاسی حیثیت سے ایسی خود مختار حکومتوں میں جو مرکزی حکومت میں اپنی اپنی نیابت کے لئے ایک دوسرے کا ٹکڑا رہیں گی اور (۶) اقتصادی حیثیت سے کراچی و غیر کراچی یا مرکزی و غیر مرکزی عناصر میں۔

دستور میں ایک بڑا اہم مسئلہ مخلوط و غیر مخلوط انتخاب کا تھا، مغربی پاکستان کا اصرار غیر مخلوط انتخاب پر تھا اور مشرقی پاکستان مخلوط انتخاب پر تھا۔ اس اختلاف و تضاد کو یوں دو کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہر صوبہ کو اختیار دیدیا گیا کہ وہ اپنے یہاں جو صورت مناسب سمجھے اختیار کرے، لیکن اس سلسلہ میں اس نکتہ کو فراموش کر دیا گیا کہ اس طرح مشرقی و مغربی پاکستان کو مخالفت زیادہ بڑھ جائے گی اور مشرقی پاکستان کی مخالفت ایک حد تک اکثریت کی مخالفت ہے۔ دستور میں صدر کے مسلمان ہونے پر اسی لئے زور دیا گیا تھا کہ اگر اصولاً کسی غیر مسلم کا صدر ہونا تسلیم کر لیا گیا تو بالکل ممکن ہے کہ کسی وقت مشرقی پاکستان (جہاں ہندوؤں کا کافی اثر ہے اور جہاں کے مسلمان بھی اپنے آپ کو محض بنگالی سمجھتے ہیں اور مسلم و غیر مسلم تفریق کو اہمیت نہیں دیتے) کسی ہندو کو صدر بنانے میں کامیاب ہو جائے اور مغربی پاکستان اپنے اثر و نفوذ کو بالکل کھو بیٹھے۔ اس لئے اگر مشرقی پاکستان کے غیر مخلوط طریقہ انتخاب میں ہندوؤں کا کسی حد شدہ رائے نہ آجائے گا۔



جس سے ڈر کر حکومت کی صدارت محض مسلمان کے لئے مخصوص کر دی گئی ہے۔ بہر حال اس وقت بھی پاکستان میں وہی انتشار و اختلاف پایا جاتا ہے جو پہلے تھا۔ ہونے کے بجائے کچھ اضافہ ہی ہو گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مرکز کو زیادہ مضبوط اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب مرکز کی اس مضبوطی سے فائدہ اٹھانے کا مقصد اس سلسلہ میں زمیندار نے اپنے ادارہ میں بڑے پتہ کی بات لکھی ہے، آپ ایک بھائی نے بڑی دسوری سے پوچھا ہے:- ”برطانیہ اور امریکہ کی ہے آخر کیا وجہ ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں کارکردگی اور ہمارے اعتبار سے اس سوال کا جواب ایک جہاز میں ہے کہ پاکستان کی سیاسی جامع میں روزانہوں نے اصولوں کی خاطر ہر قسم کے سیاسی و ذاتی مفادات میں خود بخود ایک نئے دور کا آغاز ہو جائے گا۔“

پاکستان میں سیاسی جماعتوں کا ایک سرسری مطالعہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ملک میں جس یا جمہوری اقتدار کو کوئی صدر پہنچا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ سیاسی جماعتوں کے اپنے اصولوں کو مفادات آج ملک میں شاید ایک بھی سیاسی جماعت ایسی نہیں جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس کا دامن مفاد پرستی سے بے غبار ہے۔ میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس ملک میں کوئی صحت مندانہ قابل تقلید سیاسی روایت قائم ہو۔ یا اس عوام آزادی جوش اور امنگ کے ساتھ پردہ ریش پاسکیں۔

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ صرف وہی سیاسی جماعتیں عظیم کہلا سکتی ہیں جو ملک کے بچہ محمد و ذاتی مفادات پر ترجیح دیں اور اپنے عقاید و نظریات سے کسی بھی لالچ قومن اور ملکوں کی شہامانہ رہنمائی کر سکتی ہیں۔ عوام میں نیا خود جرات مندانہ مسلک سے صاف پہچانی جاسکتی ہیں۔

# رشید احمد صدیقی

رشید احمد صدیقی

مضمون نگار کی رائے سے آئینہ صاحب متفق ہونا بلکہ ان کا اس مضمون کو پڑھنا بھی ضروری نہیں۔  
نقدِ صدیقی

میں اکثر کسی نے غزل گوئی کی ہے تو وہ رشید صاحب ہیں۔ جب یہ بات میرے ذہن میں آئی تھی تو مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی کہ میں نے  
کچھ شے پتے کی بات دریافت کر لی ہے۔ لیکن میری خوشی بہت گریزاں ثابت ہوئی کیونکہ کچھ ہی دنوں کے بعد رشید صاحب کا ایک  
کراسے متعلق رشید صاحب نے یہ بات خود بھی دریافت کر لی تھی اور مجھ سے بہت پہلے دریافت کر لی تھی۔ دوپٹے مضمون

کراسے کے ہوتے تھے۔ مربوط اور مسلسل نظم کی مانند نہیں۔

میں نے سب سے پہلے جوجانا مجھے کچھ اچھا معلوم نہ ہوا۔ لیکن مجھے اس قوار و میں تسکین و مسرت کا پہلو ڈھونڈتے دیر نہ لگی۔ نور ایک  
کراسے کی طرح برسرِ سوختے ہیں۔ میں نے دل میں کہا: رشید صاحب کی عظمت پہلے سے مسلم ہے۔ میری عظمت اب مسلم ہو جائے گا۔ ہوجانی  
میں ہم دونوں الفاظ میں اور لفظ 'صدیقی' دونوں ناموں میں مشترک ہے۔

میں نے غزلیوں کو میں نے رشید صاحب کے مضامین کو غزل سے تشبیہ کیوں دی اور خود رشید صاحب نے دونوں کو مشابہ کیوں قرار دیا تو  
میں نے رشید صاحب کے پاس ایسا کہنے کی وجہ صرف ایک ہے اور میرے پاس ایک سے زیادہ۔ انھوں نے اپنے مضامین کو غزل سے مشابہ  
کہا کہ وہ نظم کے مانند جوہر مسلسل نہیں ہوتے۔ اور میں نے اس نے بھی کہا کہ ان کے جملے مرصع غزلوں کے اشعار کی طرح حافظے کی کمزوری کے  
موکر رہ جاتے ہیں۔ ذہن میں پیوست اور دل میں جاگزیں ہو کر رہ جاتے ہیں جو صفت اور جتنی صدا حیت اچھی غزلوں میں پائی جاتی ہے  
مقدمہ میں نہیں آتی۔

ہرگز نہیں کہ اردو ادب کی جو سی تاریخ میں رشید صاحب سے بہتر انشا پرداز کوئی نہیں۔ اگر یہ اردو ادب میں انشا پرداز

کو آپ اسے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر لگیں۔ ہمارے ادب میں ایک سے ایک منفرد اور دل نشین اسلوب

میں سے بعض نے شاعری کے سہارے شریکاری کی ہے اور بعض نے شریکاری کے سہارے شاعری کی ہے

تاریخ کو تکلف۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کے یہاں خیال کی رعنائی سے ان کی شاعری سے بڑھ گئی

منوم و معنی کے سن کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ کوئی اپنے اندازِ مزاج سے میں متاثر کر جاتا

سے ہمیں چونکا تا ہے اور کوئی اپنی اندازِ اہستہ سے روا ہے۔ غرض کہ جتنے

تنوع شخصیت کا، صد حیرت کا اور سلفہ انصاف کا نمونہ کے ساتھ

کو تقسیم کر دے گا (۱) مذہباً مسلم و غیر مسلم جماعتوں میں - (۲) جغرافیائی حیثیت سے مشرقی و مغربی پاکستان میں - (۳) لسانی اعتبار سے اردو، بنگالی اور انگریزی میں - (۴) دستوری حیثیت سے ایسی حکومتوں میں جو نہ وفاقی ہوں گی نہ وحدانی، نہ اسلامی نہ غیر مذہبی نہ جمہوری ہوں گی نہ آمرانہ - (۵) سیاسی حیثیت سے دو ایسی خود مختار حکومتوں میں جو مرکزی حکومت میں اپنی اپنی نیابت کے لئے ایک دوسرے کا گھنا کاٹتی رہیں گی اور (۶) اقتصادی حیثیت سے کراچی و غیر کراچی یا مرکزی و غیر مرکزی عناصر میں -

دستور میں ایک بڑا اہم مسئلہ مخلوط و غیر مخلوط انتخاب کا تھا، مغربی پاکستان کا اصرار غیر مخلوط انتخاب پر تھا اور مشرقی پاکستان مخلوط انتخاب چاہتا تھا۔ اس اختلاف و تصادم کو یوں دور کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہر صوبہ کو اختیار دیدیا گیا کہ وہ اپنے یہاں جو صورت مناسب سمجھے اختیار کرے، لیکن اس سلسلہ میں اس نکتہ کو فراموش کر دیا گیا کہ اس طرح مشرقی و مغربی پاکستان کو مخالفت زیادہ بڑھ جائے گی اور مشرقی پاکستان کی مخالفت ایک حد تک کثرت کی مخالفت ہے۔ دستور میں صدر کے مسلمان ہونے پر اسی لئے زور دیا گیا تھا کہ اگر اصولاً کسی غیر مسلم کا صدر ہونا تسلیم کر لیا گیا تو بالکل ممکن ہے کہ کسی وقت مشرقی پاکستان (جہاں ہندوؤں کا کافی اثر ہے اور جہاں کے مسلمان بھی اپنے آپ کو محض بنگالی سمجھتے ہیں اور مسلم و غیر مسلم تفریق کو اہمیت نہیں دیتے) کسی ہندو کو صدر بنانے میں کامیاب ہو جائے اور مغربی پاکستان اپنے اثر و نفوذ کو بالکل کھو بیٹھے۔ اس لئے اگر مشرقی پاکستان کے غیر مخلوط طریقہ انتخاب میں ہندوؤں کا غلبہ ہو گیا تو کیا پھر وہی خدشہ سامنے نہ آ جائے گا جس سے ڈر کہ حکومت کی صدارت محض مسلمان کے لئے مخصوص کر دی گئی ہے۔

بہر حال اس وقت بھی پاکستان میں وہی انتشار و اختلاف پایا جاتا ہے جو پہلے تھا بلکہ سچ ہو چیکے تو وضع دستور کے بعد اس میں کمی ہونے کے بجائے کچھ اضافہ ہی ہو گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مرکز کو زیادہ مضبوط بنانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ کوشش اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب مرکز کی اس مضبوطی سے فائدہ اٹھانے کا مقصد ملک و قوم کی خدمت ہو۔

اس سلسلہ میں زمیندار نے اپنے ادارہ میں بڑے پتہ کی بات لکھی ہے، آپ بھی سن لیجئے:-

ایک بھائی نے بڑی دسوری سے پوچھا ہے:- ”برطانیہ دور امریکہ کی بات چھوڑنے کو ان سے مقابلہ کا سوال ہی خارج از بحث ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں کارکردگی اور مہار کے اعتبار سے ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتیں؟“ اس سوال کا جواب ایک جملہ میں یہ ہے کہ پاکستان کی سیاسی جماعتوں نے ابھی تک مفادات کو اصولوں پر قربان کرتا نہیں سیکھا جس روز انھوں نے اصولوں کی خاطر ہر قسم کے سیاسی و ذاتی مفادات کو قربان کرنا سیکھ لیا۔ اسی روز ان کی اور اس ملک کی تاریخ میں خود بخود ایک نئے دور کا آغاز ہو جائے گا۔

پاکستان میں سیاسی جماعتوں کا ایک سرسری مطالعہ یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ ملک میں جب بھی ہنگامی حالات پیدا ہوں یا جمہوری اقدار کو کوئی صدمہ پہنچا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ سیاسی جماعتوں نے اپنے اصولوں کو مفادات پر قربان کر دیا۔ آج ملک میں شاید ایک بھی سیاسی جماعت ایسی نہیں جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس کا دامن مفاد پرستی سے بے داغ ہے۔ میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس ملک میں کوئی محنت مند اور قابل تقلید سیاسی روایت قائم ہو۔ یا اسے عوام آزادی جوئی اور امن کے ساتھ پرورش پاسکیں۔

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ صرف وہی سیاسی جماعتیں عظیم کہلا سکتی ہیں جو نتائج کے بعد

محمد و ذاتی مفادات پر ترجیح دیں اور اپنے عقاید و نظریات سے کسی بھی لاپرواہی

فروغ اور ملکوں کی شہنائی نہ دھنائی کر سکتی ہیں۔ عوام میں نمایاں

جرات مند مسلک سے صاف پہچانی جاسکتی ہیں۔

# رشید احمد صدیقی

## نظیر صدیقی



مضمون نگار کی رائے سے رشید صاحب کا متفق ہونا بلکہ ان کا اس مضمون کو پڑھنا بھی ضروری نہیں۔  
نظیر صدیقی

اُردو نثر میں اگر کسی نے غزل گوئی کی ہے تو وہ رشید صاحب ہیں۔ جب یہ بات میرے ذہن میں آئی تھی تو مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی کہ میں نے رشید صاحب کے بارے میں بڑے پتے کی بات دریافت کر لی ہے۔ لیکن میری یہ خوشی بہت گریز پائانت ہوئی کیونکہ کچھ ہی دنوں کے بعد رشید صاحب کا ایک مضمون پڑھتے وقت مجھے معلوم ہوا کہ اپنے متعلق رشید صاحب نے یہ بات خود بھی دریافت کر لی تھی اور مجھ سے بہت پہلے دریافت کر لی تھی۔ وہ اپنے مضمون ”اپنی یاد میں“ لکھ چکے تھے کہ :-

”میرے مضامین غزل کی نوعیت کے ہوتے تھے۔ مربوط اور مسلسل نظم کی مانند نہیں۔“

میری دریافت کا توار میں تبدیل ہو جانا مجھے کچھ اچھا معلوم نہ ہوا۔ لیکن مجھے اس توار میں تسکین و مسرت کا پہلو ڈھونڈتے دیر نہ لگی۔ فوراً ایک نثر یاد آئی کہ بڑے آدمی کیساں طور پر سوچتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا: رشید صاحب کی عظمت پہلے سے مسلم ہے۔ میری عظمت اب مسلم ہو جائے گی یا ہو جانی چاہئے۔ یوں بھی رشید اور نظیر ہم وزن الفاظ ہیں اور لفظ ”صدیقی“ دونوں ناموں میں مشترک ہے۔

لیکن جب میں نے غور کیا کہ میں نے رشید صاحب کے مضامین کو غزل سے تشبیہ کیوں دی اور خود رشید صاحب نے دونوں کو مشابہ کیوں قرار دیا تو زحمتوں کیا کہ رشید صاحب کے پاس ایسا کہنے کی وجہ صرف ایک ہے اور میرے پاس ایک سے زیادہ۔ انھوں نے اپنے مضامین کو غزل سے مشابہ دیا کہ وہ نظم کے مانند مربوط و مسلسل نہیں ہوتے۔ اور میں نے اس لئے بھی کہا کہ ان کے جملے مرصع غزلوں کے اشعار کی طرح حافظ کی مکروری کے موکر رہ جاتے ہیں۔ ذہن میں پیوست اور دل میں جاگزیں ہو کر رہ جانے کی جو صفت اور جتنی صلاحیت اچھی غزلوں میں پائی جاتی ہو قصہ میں نہیں آتی۔

ہرگز نہیں کہ اُردو ادب کی پوری تاریخ میں رشید صاحب سے بہتر انشا پرداز کوئی نہیں۔ اگرچہ اُردو ادب میں انشا پرداز

کو آپ اسے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر لگیں۔ ہمارے ادب میں ایک سے ایک منفرد اور دل نشین اسلوب

میں سے بعض نے شاعری کے سہارے شرنکاری کی ہے اور بعض نے شرنکاری کے بہانے شاعری

”سرت کو تکلف“ کچھ ایسے بھی ہیں جن کے بہانے خیال کی و عنائی بیان کی زیبائی ہے بڑھ گئی

منوم و معنی کے سن کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ کوئی اپنے انداز تحریر سے ہمیں متاثر کر جاتا

سے ہمیں چمکاتا ہے اور کوئی اپنی انفعالییت سے رلاتا ہے۔ فرض کر جتنے

تنوع شخصیت کا، صلاحیت کا اور سلیقہ اظہار کا۔ تنوع کے ساتھ

ات کہنے کا جو انداز رشید صاحب کو نصیب ہوا ہے وہ

کلام انشا پر دازوں کے طریقے سے مختلف ہے۔ ان کا انداز بیان کم سے کم آراستہ ہونے کے باوجود اپنے اندر زبان و دعاء اشعار یا شرب الامثال کا ساحس و لطف رکھتا ہے۔ دوسرے انشا پر دازوں کو پڑھتے وقت مجھے محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ بات یا یہ خیال بڑے خوبصورت پیرایہ میں ادا کیا۔ لیکن رشید صاحب کو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خیال اسی طرح ادا ہونا چاہتے تھے اور بس۔ اسلوب کی معرقلہ یہی ہے کہ یہ بات ضرب المثل بن کر رہ جائے۔

جہاں تک انداز بیان کا تعلق ہے میرے نزدیک رشید صاحب کی سب سے بڑی خوبی و خصوصیت یہی ہے کہ وہ صرف بات کہنے کے قابل نہیں۔ وہ بات کو دل میں اتار دینا بھی کافی نہیں سمجھتے۔ ان کے یہاں اسلوب کا مصروف یہ ہے کہ بات بہک وقت دل میں اتر جائے اور زبان پر چڑھ جائے۔ یہ کام بہت ہی مشکل ہے اور کیا ہوتا ہے کہ اس مشکل کو سر کرنے کے لئے رشید صاحب کا کچھ اہتمام نہ کرتے ہوں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ رشید صاحب اپنے خیالات و افکار کے اظہار میں اہتمام کو ذرا بھی راہ نہیں دیتے۔ کم از کم ان کے انداز بیان سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں کی شاعری یا فلاں کی تحریر بہت بے ساختہ ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ وہ شاعری یا وہ تحریر پڑھتے وقت صدر درجے تکلف اور بے ساختہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ اور بات کہ لکھنے والے کو اس بے تکلفی اور بے ساختگی کے پیدا کرنے میں بڑی ریاضت کرنی پڑی ہو۔ اوپ میں نہ تو ہر سادہ عبارت کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے لکھنے میں کاوش نہیں کی گئی ہو نہ ہمیشہ مرصع عبارت کے متعلق ہ فرض کر لیتا اور مست ہو گا کہ عبارت یقیناً کاوش کا نتیجہ ہے فرانس کی ادبیہ *ملا محلا* کے بارے میں سرسٹ مائٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:-

”میرا خیال ہے کہ آج کل فرانس میں اس سے زیادہ دل پذیر انداز میں کوئی نہیں لکھتا اور اس کی عبارت میں اتنی بے ساختگی باقی جاتی ہے کہ کوئی شخص بار نہیں کر سکتا کہ وہ لکھنے میں ذرا بھی کاوش کرتی ہوگی۔ لیکن میں اس کی زبان سے یہ سن کر حیران رہ گیا کہ وہ ہر چیز کو بار بار لکھتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ بعض اوقات وہ صرف ایک صفحے پر اپنی پوری سچ سون کر دیتی ہے۔“

دوسری طرف مولانا ابوالکلام آزاد کی مثال ہے۔ وہ بار بار اس بات کا ثبوت دے چکے ہیں کہ جیسے مرصع جملے وہ لکھتے ہیں ویسے ہی تقریر میں بول بھی سکتے ہیں۔ غرض کہ کوٹ کی انتہائی کاوش کے باوجود اس کی تحریروں میں کاوش کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ اور مولانا آزاد کی ہر تحریر میں اہتمام کا گلا ہوتا ہے خواہ وہ کتنی ہی قلم برداشتہ لکھی ہو۔ لہذا میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ رشید صاحب فی الواقع اہتمام کرتے ہیں یا نہیں لیکن ان کے مضامین پڑھتے وقت معلوم ایسا ہی ہوتا ہے جیسے لکھنے والے نے یہ عبارت بنیر سخی و کاوش کے لکھی ہے۔ چنانچہ مجھے ان کی تحریروں میں پڑھنے کے دوران میں ”حسن بے پردہ“ کی ترکیب اکثر یاد آتی ہے۔ لیکن ان کی نگارشات میں ”حسن بے پردہ“ کے باوجود الفاظ کا بہت ہی صحیح اور حیرت انگیز انتخاب ملتا ہے۔ بعض اوقات ان کا صرف ایک لفظ پورے ماحول اور سارے حالات کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ علامہ اقبال کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:-

”اقبال جو کچھ کہتے تھے زبانوں کی حیثیت سے کہتے تھے۔ ہم مغرب کا نام لے کر جب اور جس طرح چاہتے تھے مشرق کو سنگسار کر دیتے تھے۔ لیکن اقبال کے کہنے کو کس طرح ٹال سکتے تھے جو ہم سے زیادہ یورپ کو پرکھ چکے تھے۔“

یہاں ”سنگسار“ کا لفظ کس قدر برحق ہے۔ مغرب کے اثر سے مشرق کی طرف اہل مشرق کا جو رویہ تھا اس کی معرکہ لفظ رشید صاحب ہی استعمال کر سکتے تھے۔ پھر یہ لفظ نہ صرف خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے بلکہ بڑی بے تکلفی سے رشید صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:-

”اگر نے اردو شاعری کے ساتھ جتنی بے تکلفی برتی ہے ان سے پہلے شاید ہی کسی نے برتی ہو۔“

جو زبان چاہی استعمال کر ڈالی۔ جو لہجہ چاہی آٹا اختیار کیا۔۔۔۔۔ زبان اسلوب

ہنر و خیالات کے اظہار پر قادر تھے۔ اس لئے کہ وہ ہر بات کو

اسے سامنے لا کر رکھتے تھے۔

میرا خیال ہے کہ اردو شعر کے ساتھ جتنی بے تکلفی رشید صاحب

بر کی طرح رشید صاحب نے بھی جو موضوع چاہا اختیار کر لیا یا آل انڈیا ریڈیو دہلی کی خاطر اختیار کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن موضوع کو ہمیشہ اپنی اہمیت میں رکھا۔ خود کبھی موضوع کی گرفت میں نہ آئے۔ جہاں سے جی چاہا مضمون شروع کر دیا اور پہنچنے کے باوجود عنوان اور موضوع کو ایک دوسرے سے بے تعلق نہ ہونے دیا۔ پھر جس موضوع کے متعلق جو بات بھی کہنا چاہا اسے کہے کم لفظوں میں جلد سے جلد کہہ دیا بلکہ اکبر کی طرح کہنے کی بجائے اسے سامنے لا کھڑا کیا۔ یہ باتیں جو میں کہہ رہا ہوں ان کی صحت کا صحیح اندازہ صرف رشید صاحب کی تحریریں پڑھنے سے نہیں ہو سکتا۔ انکے لئے ضروری ہے کہ آپ ایک ہی موضوع پر اور پھر دو یکمیں کہ جو چیز دوسروں کے یہاں مروج نفس کی حیثیت رکھتی ہے وہ رشید صاحب کے یہاں مکہب تک کس طرح بن جاتی ہے۔ آئیے اس قسم کے تقابلی مطالعے کا سامان میں ہی فراہم کئے دیتا ہوں۔ اقبال کے متعلق پہلا ایک ایسے ادیب کی چند سطریں ملاحظہ فرمائیے جو دورِ حاضر کے نہ صرف بڑے نقادوں میں سے ہے بلکہ ایک خاص اسلوب کا ناگ بھی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو تعزیرات سے نکال کر نعتِ فلک پر سپوچٹ کے لئے اقبال نے تعلیماتِ اسلام کا زینہ اختیار کیا۔ مگر تو کوئی نئی بات نہیں۔ یہ اندھ کو پڑانا ہے اور مسلمانوں کو مرضِ یسّٰی سے نجات دلانے کے لئے مصلحینِ اسلام نے بار بار یہی دوا و انجیز کیا۔ مگر اس کا حاصل کچھ نہ ہوا۔ کتنے خطیبوں، واعظوں اور مقررین نے منبر پر کھڑے ہو کر ان الفاظ کو دہرایا ہے کہ مسلمانو! تمhari یسّٰی و ذلت کا سبب صرف یہ ہے کہ تم نے احکامِ اسلام کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ تم تعلیماتِ اسلامی سے بے بہرہ ہو گئے ہو۔ تم نے خدا اور رسول کی نافرمانی پر کمر باندھی ہے۔ اگر تم کچھ اصلاح سمجھنا چاہو، اگر تم سنتِ صالحین کے نقش قدم پر چلنے لگو تو آج سبترم دنیا میں سر بلند رہ جاؤ۔ پھر ایک بار دنیا کے تخت و تاج تمھارے قدموں پر پڑے جوں کے ۔ مگر ان گراگرم تقریروں نے مسلمانوں کے پیٹے ہونے والوں میں کبھی حرارتِ زندگی پیدا نہیں کی۔ پھر آج کہا بات ہے کہ اسی پرانی اسلامی تعلیم کو اقبال مسلمانوں کے ہر درد کا علاج سمجھ رہے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ اسی سے مسلمانوں کی مردہ رگوں میں خونِ زندگی دو جسے گا۔

..... لیکن اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ شریعت کے احکام ہوں یا بزورِ گن دین کے اقبال، جب ہم انھیں اقبال کے سوا کسی دوسرے

..... کہن اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ شریعت کے احکام ہوں یا بزرگان دین کے اقوال، جب ہم انھیں اقبال کے ہوا کسی دوسرے کی زبان سے سنتے ہیں تو ہمارے دل پر خاک بھی اتر نہیں جوتا۔ لیکن وہی باتیں جب اقبال کے اشعار کا جامہ پہن کر ہم تک پہنچتی ہیں تو ہم تڑپ اٹھتے ہیں۔ جھوٹ لگتے ہیں اور ان کے ایسا نقش ہمارے دل پر قلم ہو جاتا ہے جو آسانی سے نہیں مٹ سکتا۔

کتنی شستہ و شگفتہ عبارت ہے، نوک پرکاش، درست، زبان و بیان کی خامیوں سے پاک، لطف و لطافت سے بھرپور۔ لیکن اب ان ہی باتوں کا جواب دینا ہے۔

۱۰ اقبال نے زیادہ تر وہی باتیں کہی ہیں جو قرآن و حدیث میں ہیں۔ ائمہ کے اقوال میں ہیں۔ بزرگوں کے کارناموں میں ہیں۔ اب بھی ہمارا یہ کہہ کر ہم کہیں یا سنیں کہ قرآن میں آیا ہے، رسول کا یہ ارشاد ہے، بزرگوں نے یہ فرمایا ہے تو ہم پر اس کا اثر نہیں ہوتا، لیکن قلم کو جب اقبال اپنی زبان سے اپنے اشعار میں بیان کرتے ہیں تو ہم وجد میں آجاتے ہیں۔ اس پر ایمان لے آتے ہیں۔ اسکی سحر پکڑتے ہیں۔ اور اس پر اڑ جاتے ہیں۔ یہ آخر کیوں؟ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ہمارے ذہن و دماغ جیسے ہوئے تار جب کوئی پہنچا ہوا ان کو پہچان کر چھڑ دیتا ہے تو سحر زخمی اور مصل کے نغمے بڑا دھواتے تھے اور ہم فوراً محسوس کر لے گئے ہیں کہ ہم بھی کچھ ہیں اور بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“

دیکھ کر مجھے غالب کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے :-

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

ہو تو میں رشید صاحب ہی کی عبارت کو ترجیح دوں گا۔ اس لئے نہیں کہ وہ عبارت

عجب نے اس عبارت میں جو باتیں میں قدر سادگی ہے ساختگی اور

میرے دوست صاحب کے یہاں ادا نہ ہو سکیں حالانکہ جس طرح

انھوں نے وہ باتیں ادا کی ہیں وہ بھی غریبوں سے خالی نہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ رشید صاحب کے جن خیالات کا اظہار دوسروں کے یہاں تھا ہے یا دوسروں کے جن خیالات کا اظہار رشید صاحب کے یہاں ملتا ہے ان میں جہاں تک اظہار کا تعلق ہے بالکل اعتبار سے باہمی رشید صاحب ہی کے ہاتھ رہتی ہے۔ کسی بات یا خیال کو ان سے پہلے دو ہزار شخصوں نے کیوں نہ بیان کیا ہو لیکن جب اسی بات یا خیال کو رشید صاحب بیان کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نفس خیال کے اعتبار سے وہ بات جس کی بھی موافقت بیان کے اعتبار سے اس پر سب سے زیادہ حق رشید صاحب کا ہے۔ اور اگر کہیں اس بات کا حوالہ دینا ہو تو سب سے پہلے انھیں کے جملوں کی طرف نظر جائے گی کیونکہ اردو میں ان سے زیادہ حوالہ دینے کے انداز

quotable manner میں بات کہنے والا کوئی اور نہیں۔ میں اپنے اس خیال کی تائید و توثیق کے لئے دو ایک مثالیں کی ضرورت لگتا

اردو میں عوامی ادب کی ضرورت اور افادیت پر بہتوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے اس باب میں کسی کا انداز اتنا دلنشین نہیں جتنا رشید صاحب کا اس عبارت میں ہے:

”اگر آپ غور کریں تو اس بات کا پتہ آسانی سے چلی جائے کہ اب تک ہمارے شعر و ادب میں مخصوص سائیکس میں ڈھل چکی خصوصیات ہیں۔ یہی راہ پاتی رہی ہیں۔ جن سے ہم اکتانے لگے تھے۔ اسلوب بیان اور موضوع دونوں میں اس وجہ کی کمی تھی اور باسی پن آگیا تھا کہ جس سے بعض یہ سمجھنے لگے تھے کہ ”یہی لکھنا“ اور ”یہی لکھنا“ مقصود بالذات ہے۔ لیکن نامے کی طرح زندگی بھی پائے نہیں۔ نئے ادب نے ہم کو بعض نئی اچھی چیزیں بھی سکھائی ہیں جن کو اب ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کچھ اور چیزیں تو یہ کیا کہ ہے کہ ہمارے ادب میں جو ایک کی نہایت درجہ نمایاں تھی اس کو یہ پورا کر رہا ہے۔ مثلاً اردو میں پریم چند سے پہلے غریبوں کا ادب نہ تھا تو تھا جس پر محبت ہو بہادری ہو عظمت ہو سچائی ہو قابلیت ہو، فرض ہنسنا دلنا، رونا دھونا، مرنا جینا، آداب تسلیمات، تو تو میں میں اس کا سب طبقہ ادبی یا امر سے متبیں ہوتے تھے۔ سب کچھ جمل سین خالی“ کے لئے تھا۔ غریبوں یا عوام کو اتنا بھی سزا دیا

”خان صاحب کی نظر سے محفوظ رہیں“

ان چند سطروں میں رشید صاحب نے جو کچھ مثنوی خوبصورتی سے کہہ دیا ہے وہ دوسروں کے یہاں چند صفحوں میں بھی اتنی خوبصورتی کے ساتھ نہ لکھا رشید صاحب کا فن واقعی غزل کا فن ہے۔ ان کی تحریروں میں نثر کی وضاحت اور مصراع کم، اور غزل کا ایجاز و اختصار اور مزوایا زیادہ ہے۔ ان کا آٹھ سطروں کو صفحوں میں پھیلانے کا آٹھ نہیں بلکہ صفحوں کو سطروں میں سمیٹ لینے کا آٹھ ہے۔ مجھے اس موقع پر رشید صاحب کا ایک جملہ یاد آ رہا ہے جسے میں نے مدتوں پہلے کسی صاحب کے مضمون میں دیکھا تھا۔ یوپی والوں کی وضع داری اور قدامت پرستی کی بہت سی داستانیں آپ نے پڑھی ہوں گی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ رشید صاحب کا یہ ایک جملہ ان تمام داستانوں پر بھاری رہے گا ”یوپی والے ہوا کے رخ پر مثنوی نظر نہیں رکھتے جتنی ان جنوں کا“ ہوا کی زو میں ہوتی ہیں“ رشید صاحب کے یہاں اس قسم کے فقرے کثرت سے ملتے ہیں۔ میں ایسے فقروں کو ”مضمون طلب“ فقرہ خیال ہے کہ مضمون طلب فقرہ لکھنے میں جتنا اور جیسا کمال رشید صاحب کو حاصل ہے اتنا اور ویسا کمال اردو میں شاید ہی ملے۔ ان تو بات یہ ہو رہی تھی کہ رشید صاحب کا انداز بیان اردو سے زیادہ حوالہ دے جانے کے قابل ہے اس کی دو ایک مثالیں اور بھی دیکھ لیجئے۔

اردو غزل پر حسرت موہانی کے احسانات طرح طرح سے بیان کئے گئے ہیں اور اس سلسلہ میں یہ میں غزل کی نشاۃ اش نہ حسرت کی رہی منت ہے۔ دیکھئے رشید صاحب اس بات کو کتنے جیتے ہوئے

..... یہ کہنے میں شاید یہ کسی کو تامل ہو کہ حسرت کا غزل پر بڑا احسان اس کا پوری اردو شاعری اور اردو زبان پر احسان ہے۔ حسرت

ہر نام اور ہر طرف سے نغمے میں تھی۔ انھوں نے

مکمل ہے آپ کا کہیں کہ میں صرف رشید صاحب کی طرف



ہے۔ شاید اپنی قیمت مدد اور کہیں سے حاصل بھی نہیں ہو سکتی۔

شاعر کے کلام میں زمانہ اور زندگی کی جنگ ضرورتی ہے۔ لیکن اکثر وہ نقوش اتنے واضح اور اتنے جتنے جتنے جاتے نہیں ہوتے جتنے آکر کے۔ دوسروں کے یہاں اس طرح کے نقوش دریافت کرنے پڑتے ہیں۔ بڑی چھان بین۔ بڑی آٹ پیپر اکثر خواہ مخواہ کی خوش عقیدتی یا سوسائٹی کو دخل دینا پڑتا ہے۔ آکر کے یہاں بات نہیں۔ ہر بات پوری دلالت، قومیت، سکونت، پیشہ، اور ملیہ کے ساتھ کہیں قلندرانہ آہنگ میں، کہیں شاعرانہ رنگ میں، کہیں تراش خراش کے ساتھ، کہیں جوں کی توئی کہیں روایتی، کہیں انقلابی۔

ایک جاگہ ڈاکر صاحب کے متعلق لکھتے ہیں :-

”ڈاکر صاحب کے سین اور بھائیوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ یہ خاندان تقریباً بارہ سال تک علی گڑھ کی دزم و بزم میں پورے طور پر بے نقاب رہا۔ وہ بھی اس زمانہ میں جب علی گڑھ اپنے طنطنہ و دبہہ کے نصف النہار پر تھا۔ جب یہاں دوسرے درجے کی کوئی بات معائنہ نہیں کی جاتی تھی اور ہر شخص کی ہر حرکت ایسی میزان میں ملتی رہتی تھی جو بڑی ہی بے دردیہ خطا تھی۔۔۔۔۔“

حضرت مولائی سے متعلق بھی ایک عبارت دیکھتے چلیے :-

”شادی اور غم کی ان کے پاس شاید کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ ان کو فطرت کے ان مظاہر سے زیادہ وقعت نہ دیتے تھے جو حلقہ شام و شکر میں امیر تھے۔ آئے اور چلے گئے۔ آتے رہیں گے اور جاتے رہیں گے ان کو معلوم نہ ہو کیا ہیں۔ کیوں ہیں۔ کیونکر کہاں گئے۔ اور کب تک۔ نہ ہم کو۔ جس طرح حلقہ شام و شکر میں ہم امیر ہیں حلقہ حضرت میں شاید رنج و راحت، نفع و ضرر اور خیر و شر امیر تھے کہیں ایسا تو نہیں کہ حضرت کی دنیا و عقبی حضرت خود سے اور کون اپنی دنیا و عقبی خود نہیں ہے۔“

میں نے رشید صاحب کی عبارتوں کے صریح اچھوتے پن کو واضح کرنے کے لئے اتنے اقتباسات دیدئے ہیں۔ لیکن ان عبارتوں میں صریح اچھوتاپہ

ہی تو نہیں ؟

”ڈاکر صاحب“ والے مضمون میں ڈاکر صاحب کی تقریر کے متعلق رشید صاحب نے لکھا ہے کہ :-

”..... ہر طرح کے تکلفات سے قطعاً بری، رواں، جھپٹی، دل لیش، فکر انگیز، ڈگریزی تقریر میں نے ڈاکر صاحب ہی کی ذہنی سنی۔ ان کی تقریر کا اب جلد بھی زاید از ضرورت نہیں ہوتا اور شروع سے آخر تک استوار، شریفانہ۔ اور ہر فقرے میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے۔ آپ ان کے کسی فقرے کے ابتدائی الفاظ سن کر یہ نہ بتا سکیں گے کہ اس فقرے کی یہ پرداخت ہوگی یا بوجہ ختم ہوگا

ہیشہ وہ اس کو اس طرح ختم کریں گے کہ آپ تیر بھی ہوں گے اور دعوش بھی۔“

میں نے نہ کبھی ڈاکر صاحب کو دیکھا اور نہ کبھی ان کی تقریر سنی۔ اور ان کی تھوڑی بہت تحریریں جو میری نظر سے گزری ہیں ان میں مجھے وہ صد خوبیاں نظر آئیں جنہیں رشید صاحب ان کی تقریروں کا خاصہ بتا رہے ہیں۔ لیکن اگر ڈاکر صاحب کی انگریزی تقریروں کے متعلق رشید صاحب کی رائے صرف بھرت صحیح ہے تو مجھے کہنے دیجئے کہ اردو ادب میں ڈاکر صاحب کی انگریزی تقریروں سے ملتی جلتی جو چیز ہے وہ صرف رشید صاحب کی تحریریں ہیں۔ یہاں میں دو باتوں پر خصوصیت کے ساتھ زور دینا چاہتا ہوں۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ رشید صاحب کی رائے میں حلقہ چٹی ملی ہمد نہ ہو لیکن وہ انداز و الفاظ بڑے چبے تے ہوتے ہیں جن میں وہ رائے ظاہر کی جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ رشید صاحب کے فقرے کے ابتدائی الفاظ کو سننا یا پڑھ کر اس کے آخری الفاظ یا انداز کا اندازہ اتنا ہی مشکل ہے جتنا اس آخری الفاظ یا انداز سے پیدا ہونے والی حیرت اور مسرت یقینی ہے۔ یہ نہیں جانتا آپ میری اس رائے سے اتفاق کریں گے یا نہیں لیکن میں اس کا اظہار کرے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ممکن ہے رنگینی و رعنائی، شستگی و شگفتگی، لطافت اور ذوق و تار کے اعتبار سے اردو کے دوسرے افسانہ پردازوں کا پلہ رشید صاحب سے بھاری ہو لیکن جہاں تک فقرہوں اور جملوں کی طرکی و تازگی اور انداز بیان کی برستگی و بے ساختگی کا تعلق ہے رشید صاحب اپنا جواب آپ ہیں۔

رشید صاحب کے یہاں ایک اور چیز ملتی ہے جو کم از کم مجھے دوسروں کے یہاں نظر نہیں آئی۔ وہ یہ کہ ان کی جو باتیں جتنی زیادہ گہری اور اہم ہوتی ہیں انھیں وہ اتنے ہی سرسری اور ضمنی طور پر کہہ جاتے ہیں وہ ان باتوں کو کہنے یا ان پر زور دینے کے لئے خود نہیں رکے لیکن وہ باتیں پڑھنے والے کو ضرور روک لیتی ہیں۔ مثلاً:-

”شاعری اصناف سخن میں نہ کبھی قید ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ زندگی کے بدل جانے سے شاعری کی وضع قطع، موضوع، اسلوب و انداز کا بدل جانا بھی کوئی قیامت نہیں۔ ایسا ہوتا رہا ہے، ہوتا چاہئے اور ہو کر رہے گا۔ وضع قطع اور موضوع بھی شاعری نہیں ہے۔ شاعری کو وضع قطع میں محدود کر دینا رسم ہے اور موضوع میں مقید کرنا پروپگنڈا۔ مجھے دونوں میں سے کسی ایک پر بھی غرض نہیں۔

اس عبارت کے آخر میں کتنے پتے کی بات بھی گئی ہے لیکن کس قدر سرسری طور پر!

رشید صاحب کے فکر و فن کے سلسلہ میں آسکر وائلڈ، چسٹرٹن اور برنارڈ شا کے اثرات کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے اور کبھی کبھی سوئفٹ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں ان کے فکر و فن کو سوئفٹ سے کوئی علاقہ نہیں۔ رشید صاحب جیسے آدمی کے فکر و فن میں اس دراک کی دھل خراشی اور اس خشونت و خشم گئی کی گنجائش نکل ہی نہیں سکتی جو سوئفٹ کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ وہ دنیا کے بے انگم پن اور دنیا والوں کی بے راہروی پر غلین و غضبناک ہونے کے باوجود کبھی اپنے آپ کو اس برہمی و ہیزاری کا شکار نہیں ہونے دیتے جس میں سوئفٹ کے طرز و طمنز نے پرورش پائی تھی۔ رشید صاحب کی مذہبیت انھیں سوئفٹ کی سسی دل آزادی و مردم بیزاری دونوں سے باز رکھتی ہے۔

جہاں تک آسکر وائلڈ، چسٹرٹن اور برنارڈ شا کے اثرات کا تعلق ہے رشید صاحب پر ان تینوں کی گرفت نمایاں ہے۔ اردو میں آسکر وائلڈ کے مقلدوں کی تعداد جتنی بھی رہی ہو لیکن اس کے فیضان کی اچھی مثالیں دو ہی ہیں۔ ایک رشید صاحب اور دوسرے نیاز صاحب۔ رشید صاحب جیسے ذہین و طباع کسی کا مقلد بن کر رہ جانا پسند نہیں کر سکتے لیکن اس کا کیا علاج کہ ان پر آسکر وائلڈ کا اثر اتنا گہرا ہے کہ بعض اوقات ان کے قلم سے شعوری یا غیر شعوری طور پر بالکل آسکر وائلڈ کے سے جملے ٹپک پڑتے ہیں۔ ”ذاکر صاحب“ کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

”عام تقریر کرنے والوں کی مانند وہ جسم کے کسی حصہ کو خاص طور پر جیش یا جھکے نہ دیں گے۔ لیکن بہ نیشیت مجموعی آپ کو یہی محسوس ہوگا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں ان کے سارے جسم و جان کی کارفرمائی ہے۔“ بتانا مشکل ہے کہ وہ اپنی تقریر سے اپنے گرد ویں ہی فضا بیدار کر لیتے ہیں یا وہ خود ایک فضا ہیں جس سے ویسی ہی تقریر برآمد ہوتی ہے؟

آخری جملے کو پڑھتے وقت آسکر وائلڈ کے مشہور ڈراما *Lady Windermere's Fan* کے کردار

Mrs. Flynne کے یہ جملے بے اختیار یاد آجاتے ہیں کہ:-

”London is too full of fogs — and serious people, Lord Windermere. Whether the fogs produce the serious people or whether the serious people produce the fogs, I do not know, but the whole thing rather gets on my nerves ....“

آسکر وائلڈ اور رشید صاحب کے دو متوازی جلوں کو پیش کرنے سے میرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ رشید صاحب آسکر وائلڈ کے جلوں کا چرچہ اتارتے ہیں میں صرف آسکر وائلڈ کے اثر کی شدت کو واضح کرنا چاہتا تھا۔ جب ایک ادیب کسی دوسرے ادیب سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے تو اس کے یہاں اپنے محبوب ادیب کی بعض ادائیں آہی جاتی ہیں۔ ہندی افادی علامہ شبلی کے اسلوب و انشا پر فریفتہ تھے۔ چنانچہ ان کے یہاں اپنے مخصوص طرز نگارش کے باوجود جس پر خود شبلی کو رشک تھا شبلی کے لکھنے ہی خاص الفاظ اور فقرہ درآتے ہیں۔

رشد صاحب کی تحریروں میں *paradox*, *epigram* اور *Self-assertion* کے جو نقشہ مشق ملتے ہیں وہ یقیناً آسکر و آئلڈ، چرٹرٹن اور برنارڈشا کی دین ہیں۔ انگریزی میں یہ تینوں ادیب علی الترتیب متذکرہ خصوصیات کے امام مانے جاتے ہیں اور دو میں رشد صاحب کو ان تینوں خصوصیات کا امام مشہور نام تو صحیح نہ ہوگا کیونکہ جہاں تک *epigram* کا تعلق ہے۔ نیاز صاحب کے یہاں بھی اس کا استعمال خاصا ہے اور *self-assertion* والی خصوصیت رشد صاحب کے علاوہ سجاد انصاری مرحوم نیاز صاحب و مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں بھی نمایاں ہے۔ رہا *paradox* سو یہ یقیناً رشد صاحب کا حصہ ہے۔ لیکن مجموعی طور پر تینوں خصوصیات کا ہمیشہ امتزاج رشد صاحب کے یہاں ملتا ہے دیکھا اور کہیں نظر نہیں آتا۔

لیکن رشد صاحب کے فکر و فن کی تشکیل و تعمیر میں صرف آسکر و آئلڈ، چرٹرٹن اور برنارڈشا کو دخل نہیں بلکہ اس کے اجزاءء ترکیبی اور بھی ہیں جن کی تحقیق و تعین کا حق وہی لوگ ادا کر سکتے ہیں جنہوں نے نہ صرف رشد صاحب کو قریب سے دیکھا ہے بلکہ ان لوگوں کو بھی جن کی صحبتیں خود رشد صاحب نے اٹھائی ہیں۔ میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا لیکن رشد صاحب کے مرقعوں کو پڑھتے وقت مجھے بار بار محسوس ہوا ہے کہ مولانا سلیمان اثر، مولانا اقبال، تہیل، اصغر گوڈوی اور ڈاکٹر صاحب جیسے ”ہم نشینوں“ کا ”جمال“ ان پر کسی نہ کسی حد تک اثر انداز ہوا ہے۔ ان کے مزاج و میلان اور زبان و بیان میں انگریز آبادی کی کارفرمائی نو سائنس کی چیز ہے۔ آل احمد ترور کا خیال ہے کہ رشد صاحب نے سجاد انصاری کے بھی اسلوب فکر اور اسلوب بیان دونوں سے فائدہ اٹھا لیا ہے۔ پروڈیسر اسلوب احمد انصاری کو رشد صاحب کے یہاں انگریزی کے مشہور ادیب اوائس کا بھی عمل دخل نظر آتا ہے۔ الغرض رشد صاحب کے فکر و فن کی ساخت، مادہ و ساخت میں کئی عناصر کو دخل سہہ جن کا پتہ لگائے اور چہ بتانے کے لئے ایک الگ مضمون کی بھی ضرورت ہے اور ایک خاص قسم کے مضمون نگار کی بھی۔ ”خاص قسم کے مضمون نگار“ سے میری مراد صرف اتنی ہے کہ وہ رشد صاحب سے بھی اچھی طرح واقف ہو اور ان لوگوں سے بھی ہو۔ رشد صاحب کے باب میں موثرات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

رشد صاحب ہندوستان و پاکستان کے طول و عرض میں بڑی وسیع و عریض طور پر طنز نگار و مزاح نگار کی حیثیت سے یاد فرمایا جاتے ہیں۔ لیکن ان کے طنز و مزاح کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور اگر جانتا ہوں تو صرف اتنا ہی کہ اردو ادب میں رشد صاحب پہلے اور تنہا شخص ہیں جس نے طنز و مزاح کو فلسفہ اور فلسفہ کو آرٹ بنا دیا۔

رشد صاحب کے متعلق یہ سوال دلچسپی سے خالی نہیں کہ وہ طنز نگار پہلے ہیں یا مزاح نگار۔ آل احمد ترور کی رائے تھی کہ وہ طنز نگار پہلے ہیں اور مزاح نگار بعد میں۔ لیکن اب ان کی رائے اس کے برعکس ہے۔ میں اس باب میں اب بھی مستور و احب کی سابقہ رائے کو نیا دہ قرن صحت سمجھتا ہوں۔ رشد صاحب کی ہر قسم کی تحریروں میں طنز و مزاح کی دھوپ چھاؤں اور شورش مچاتی ہے۔ یعنی طنز کی دھوپ اور مزاح کی چھلک حیات و کائنات کی طرف رشد صاحب جیسے شخص کا رویہ بنیادی طور پر مزاحیہ ہوتی نہیں سکتا۔ اپنے ذہن و ذوق کی ساخت و دیر داخت کے اعتبار سے رشد صاحب محض ہنسنے ہنسانے پر اکتفا کرتے نہیں سکتے تھے۔ ان کے یہاں ظرافت طنز کے جلو میں آتی ہے نہ کہ طنز ظرافت کے جلو میں۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو رشد صاحب کے ”ابتدائی مضامین پر وہ ہر کرتے ہیں اور بعد کی چیزوں کو خاطر میں نہیں لاتے“ ایسوں کے پاس میں سرور صاحب کی یہ رائے بہت صحیح ہے کہ ایسے لوگ کچھ چھلوں کے زیادہ شوقین ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت کے رشد صاحب، شعور کے شریعت سے مختلف ہرگز نہیں البتہ ”خوبتر“ ضرور ہیں۔ ان کا اسلوب فکر اور انداز بیان آج بھی ویسا ہی ہے جیسا شروع میں تھا۔ لیکن جو نگار اور بہا اب ان کی تحریروں میں نظر آتی ہے اس سے ان کے ابتدائی مضامین مثالی تھے۔ یہاں، ابتدائی مضامین سے میری مراد ”مضامین رشد“ اور ”خداں“ کے مضامین سے ہے۔ رشد صاحب کی ان کتابوں میں بہار کی بشارت موجود تھی۔ بعد کی تحریروں میں خود بہار موجود ہے۔ اپنا شروع کی خامیاں دور ہو گئی ہیں بلکہ شروع کی خوبیاں زیادہ روشن ہو گئی ہیں۔ پہلے ان کے مضمون کے بعض حصے نقیب اور بے کیف بھی ہوتے تھے اب اس خامی کو ان کے یہاں ماہ نہیں مٹی۔ لیکن بعض باتیں اب بھی ان کے یہاں ایسی ہیں جن کو بعض لوگ خامیوں ہی سے تعبیر کریں گے۔ رشد صاحب کا موضوع سے الگ ہو کر انہیں کرتا، مضمون میں ترتیب و تسلسل کو نہ ہونا، بیچ میں لمبی لمبی فلسفیانہ بحثیں چھیڑ دینا اور جہاں

تہاں علی گڑھ کی فضیلت اور فضائل جتنا وغیرہ۔ ان باتوں کے وجود سے نہ رشید صاحب انکار کر سکتے ہیں اور نہ میں البتہ ان باتوں کے جواز میں کچھ انھوں نے بھی کہا ہے اور کچھ میں بھی کہنا چاہتا ہوں۔

جہاں تک موضوع سے منحرف ہو کر باتیں کرنے کا تعلق ہے رشید صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میرے ”مضامین میں جو باتیں غیر متعلق اور ہلکی ہلکی معلوم ہوتی ہیں وہ میرے فن کی شریعت کے عین مطابق تھیں۔“ یہ خود ”میں“ کہتا تھا۔ دوسروں کو ہلکے پتلے کی فرصت دیتا تھا عقل کی باتیں دیر تک نہ سنی جاسکتی ہیں نہ سنائی جاسکتی ہیں۔ میرے نزدیک رشید صاحب کا یہ اعتذار قابل قبول ہے۔ ویسے کسی طنز نگار اور طرائف نویس پر یہ پابندی عاید ہونی بھی نہیں چاہئے کہ وہ ہمیشہ اپنے موضوع کی حدود میں مقید رہے۔ Essay کی صنف اس پابندی کی متخل جو بھی نہیں سکتی۔ پھر سب شخص کا بہکنا بھی دلچسپی سے غامی نہیں اس کا ہرگز قابل معافی ہے۔

جہاں تک رشید صاحب کے مضامین میں فلسفیانہ بحثوں کا تعلق ہے ہمیں کچھ چکا ہوں کہ انھوں نے طنز و مزاح کو فلسفہ اور فلسفہ کو آرٹ بنا دیا ہے۔ ممکن ہے ایسا کرنے میں وہ سہیلگہ کامیاب نہ ہوئے ہوں لیکن یہ کیا ضرور کہ ان کی ناکامیوں کو پیش نظر رکھ کر ان پر اعتراض کیا جائے اور ان کی کامیابیوں کا اعتراف کہیں بھی نہ کیا جائے۔

رشید صاحب کے مضامین میں علی گڑھ کی فضیلت اور فضائل کی جو قصیدہ خوانی ملتی ہے ذاتی طور پر میں اس کا بھی بڑا نہیں اتنا۔ جس اور۔۔۔ نے خود رشید صاحب کو اور ایک بدوی قوم کو بہت دیا ہو اس کی مدح سرائی میں کیا برائی؟ مجھے سرور صاحب کے اس خیال سے بھی اتفاق نہیں کہ ”مقتاحی رنگ کی وجہ سے ان کی مقبولیت یقیناً محدود ہو جاتی ہے۔“ رشید صاحب نے جب کبھی اور جہاں کہیں علی گڑھ کا ذکر کیا ہے وہاں کی خاص خاص اصطلاحات و روایات کی طرف اشارہ کر دئے ہیں، جن کی مدد سے باہر والے بھی علی گڑھ کے افسانہ و افسوں کو نہ صرف سمجھ سکتے ہیں بلکہ اس سے لطف اندوز بھی ہو سکتے ہیں۔ البتہ اس باب میں ایک بات محل نظر ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح جاری برنارڈ شاپس بات پر ترس لکھا تا رہتا تھا کہ دنیا کا ہر دوسرا آدمی جاری برنارڈ شاپس ہے اس طرح رشید صاحب ہر اس معقول آدمی پر ترس لکھتے رہتے ہیں جو علی گڑھ کی فیض بخششوں سے محروم رہ گیا ہے۔ لیکن برنارڈ شاپس یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی تھی کہ اگر یہ دنیا بڑا ”دشائوں“ سے بھری ہوتی تو کس درجہ ناقابل برداشت ہوتی۔ واضح رہے رشید صاحب بھی اس پر غور کرتے کہ پورا دنیا نہ سمجھے اگر صرف ہندوستان و پاکستان کا ہر معقول آدمی ”علی گڑھ مارکہ“ ہوتا تو ان دنوں انکو ”کہ معقول“ آدمیوں کی دنیا بگڑتی ایک رنگ و برج بگڑتا ہوتا ہے۔

رشید صاحب نے ”طنز و مزاح“ دائرہ گفتار وسیع ہے اور طنز و مزاح کی تخلیق میں ان کا طریق کار کیا ہے، ان پہلوؤں پر مجھ سے پہلے دوسرے لوگ تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ لیکن طریق کار کے باب میں ایک بات ایسی ہے جس کی طرف دوسروں نے غائبانہ تک تو جہ نہیں کی۔ وہ یہ کہ رشید صاحب بعض ہلکا ہلکا بحالات و حوادث اور تحریکات و واقعات کا عواد کچھ اس انداز سے دیتے ہیں کہ ان کی تحریروں میں طنز و مزاح کی ہر ہر دوڑ جاتی ہے۔ اس سوجھ بوجھ کی دو تین مثالیں دیکھتے چلیں:-

”ہمارے نقاد کی سب سے بڑی الجھن یہ ہے کہ اردو کے تمام لکھنے والے روس میں کیوں نہ پیدا ہوئے۔ ایک ایک دو دو کر کے کیوں

پیدا ہوئے۔ بیک وقت ہمارے کے سارے کیوں نہیں۔ اور اب جبکہ ان باتوں میں سے ایک بھی وقوع میں نہ آئی تو پھر تو نام شاعر

اور ادیب عرض البلدہ ۳ پر کیوں نہیں آجاتے۔“

”شاعری بالخصوص غزل میں الفاظ، محاورہ اور جملوں کی آباد کاری اس طرح ہونی چاہیے جس طرح ہندوستان اور پاکستان میں ہاجرین کی ملکیت تقسیم ہوئی ہے۔“

”..... جگر صاحب کے پاس جو نقدی ہوتی ہے اسے ضبط کر لیتا ہوں تاکہ وہ علی گڑھ میں روپے اس طرح نہ خرچ کرے جس طرح بعض

حکومتیں بعض حکومتوں پر خرچ کرتی ہیں۔“

رشید صاحب اس صنعت کے بہت دلدادہ ہیں جسے انگریزی میں *Allegorization* کہتے ہیں۔ اس صنعت کا تصور ثابت

استعمال ہر ادیب کے یہاں ملتا ہے، لیکن رشید صاحب اس کثرت سے اس صنعت کو بروئے کار لائے ہیں کہ یہ صنعت ان کے اسلوب کی ایک پہچان بن گئی ہے۔ اس کی مدد سے وہ نہ صرف اپنے اسلوب میں خوش آہنگی پیدا کرتے ہیں بلکہ اپنی تحریروں میں مزاج بھی۔ رشید صاحب کی طنز اور مزاحیہ تحریروں میں صرف ذہانت و لطافت کا کارنامہ نہیں ان میں وسیع علم اور گہری فکر کی کارفرمائی کو بڑا دخل ہے۔ اسی لئے ان کی تحریروں سے لطف اندوز ہونا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے ایسے ذہن و شعور کی ضرورت ہے جو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ بھی ہو۔

رشید صاحب کی تنقید نگاری اگرچہ کبھی کبھار کا مشغلہ ہے، پھر بھی انھیں نقاد کی حیثیت سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اردو میں وہ اپنی طرز کے واحد نقاد ہیں۔ جس خصوصیت کے ساتھ کہ ان کا طرز تنقید مشرق سے مستعار ہے نہ مغرب سے مغلوب۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اپنے اسلوب نقد کے پیشرو بھی ہیں اور جانشین بھی۔ رشید صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:-

”میں کسی ایسی تنقید کا قائل نہیں ہوں جس کے سامنے دھلے دھلائے پہلے سے موجود ہوں۔ بنے بنائے اصول باہرے کمیشن پر منگنا اور کام نکل جانے پر کارخانہ کو واپس کر دینا تنقید نہیں، لائق ہے۔ شاعری کا کوئی گارخانہ نہیں ہوتا جہاں فرمایش کی چیز بالکل نئی نئی ایک ہی طرح کی بے شمار تعداد میں نکلتی ہوں۔ شاعری مشینی عمل نہیں ہے۔ شخصی کردار ہے جس کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے تنقید کے اصول اتنے ضروری نہیں ہوتے جتنا خود شاعر کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے؟“

یہ عبارت رشید صاحب کے نظریہ تنقید کی ترجمان ہے اور ان کے تنقیدی مضامین اس نظریہ پر ان کے عمل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ رشید صاحب تنقید و تبصرے میں دوسروں کا سہارا لینے یا حوالہ دینے کے قائل نہیں۔ بات بہت کم نقادوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم چیز جو رشید صاحب کو دوسرے تمام نقادوں سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے تنقیدی مضامین معلومات افزا ہونے سے زیادہ بصیرت افروز ہوا کرتے ہیں۔ وہ کسی ادیب یا شاعر کے متعلق یہ نہیں بتاتے کہ وہ کس حالات میں پیدا ہوا اور کس مجبوروں کے تحت جانی بحق ہو گیا۔ یا کوئی ادبی تحریک کس انقلاب کی پیداوار تھی اور کس حادثات کا شکار ہو کر رہ گئی۔ ان کے مضامین ادیبوں، شاعروں، تحریکوں اور نظریوں کے متعلق رموز و نکات کی آلاہوا کرتے ہیں جس میں زندگی، زمانہ، تہذیب، تمدن اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں کے بارے میں ان کے اچھوتے اور انوکھے خیالات کے موتی جگمگا رہے ہوتے ہیں۔ میں ان کے تنقیدی مضامین کو اس خیال سے کبھی نہیں پڑھتا کہ ان سے زیر بحث ادیب یا شاعر کے بارے میں مجھے وہ سب کچھ معلوم ہو جائے گا جو اس کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ معلومات کے لئے میں دوسرے نقادوں کے پاس جاتا ہوں، بصیرت کے لئے رشید صاحب کے پاس آتا ہوں۔ آپ اسے میرا باز یا میری کروڑی سمجھیں کہ مجھے اپنے دل و دماغ میں جتنی آسودگی اور پائیدگی، جتنی روشنی اور گرمی رشید صاحب کے مضامین کو پڑھ کر محسوس ہوتی ہے اتنی اردو میں کسی اور کے مضامین کو پڑھ کر محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مجھے رشید صاحب سے ہر جگہ اتفاق ہے۔ رشید صاحب کی بعض رائیں ایسی ہوتی ہیں جن سے رشید صاحب کے موافق کوئی اتفاق نہیں کر سکتا۔ لیکن فور طلب بات یہ ہے کہ اختلاف کس سے نہیں ہوتا اور غلطیوں سے کون بڑے۔ جب نقد و انتقاد کے بانی و باو آدم افلاطون و ارسطو سے اختلاف کیا جاسکتا ہے تو پھر دوسروں کا ذکر ہی کیا ہے۔ بعض ادیبوں اور شاعروں کے متعلق اگر کسی نقاد کی رائیں لائق اعتماد نہ ہیں تو نہ سہی دیکھنا یہ چاہئے کہ مجموعی طور پر وہ شعر و ادب اور زندگی کے متعلق ہماری بصیرت میں کس حد تک اضافہ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے مجھے رشید کا رتبہ بہت بلند نظر آتا ہے۔ انھوں نے بہت سے ادبی اور فکری مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اور بڑے سچے کی باتیں کہی ہیں۔ رشید صاحب نے لکھا ہے کہ رشید صاحب کو نئے خیالات سے خدا واسطے کامیاب تو نہیں مگر وہ اس نئے پن کو پوری طرح مضامین نہیں کر پاتے۔ بات اپنی جہت پر درست ہے، لیکن رشید صاحب جس طرح اپنے حافظہ کی کوری کے باوجود بر محل شعر کا حوالہ دینے میں خاص کمال رکھتے ہیں اسی طرح نئے خیالات کے علم برداروں اور نئے ادب کے پرستاروں سے جو باتیں کہی ہیں وہ بڑی حد تک معقول بھی ہیں اور مفید بھی۔ رشید صاحب

ادب اور زندگی کے رشتہ کے قابل ہیں اور ادیب و ادب پر عوام کے حقوق کو بھی تسلیم کرتے ہیں مگر وہ اسے پسند نہیں کرتے کہ ادب ہندوستان کا ہو اور زندگی ماسکو کی۔ یا ادب میں ادیب کے سوا ہر کس و ناکس کی جلوہ گری پائی جائے یا ہر کس و ناکس کو شعر و ادب کے جمہور پادوں سے کھینچ دیا جائے۔ ان کے اس قول میں بہت کچھ صداقت بھی ہے اور وزن بھی کہ:-

”اچھا اور بڑا شاعر کسی مخصوص طبقہ کا شاعر نہیں ہوتا۔ وہ ہر طبقہ اور ہر عہد کا شاعر ہوتا ہے۔“ اشتراکی نظام کا اچھا اور بڑا شاعر اتنا ہی قابل قدر اور قابل فخر ہوگا جتنا کسی اور نظام کا اچھا اور بڑا شاعر خواہ وہ نظام آج سے ہزاروں سال پہلے تھا یا ہزاروں برس بعد آئے۔“

اسی طرح ان کا یہ خیال بھی صحت و صداقت سے دور نہیں کہ ”آرٹ ہو یا ادب اس کا کاروبار قطعاً ذاتی اور انفرادی ہوتا ہے۔“ اس خیال سے نہ تو میراجی کے ہم مشرعوں کو مسرور ہونا چاہئے اور نہ سردار جعفری اور ان کے ہم قافلوں کو نابوس۔ کیونکہ رشید صاحب کے نزدیک شعر و ادب میں نہ تو انفرادیت کے معنی اُس دھندلکے میں اسیر رہنے کے ہیں جس میں میراجی اور ان کے ہم مشرب اسیر ہیں اور نہ اجتماعیت کے معنی اُس تھکے اور تبلیغ کے ہیں جس میں سردار جعفری اور ان کے رفقاء راہ مصروف و مبتلا ہیں۔ وہ شعر و ادب میں انفرادیت اور اجتماعیت کو متوازی اور متوازن رکھنے کے قابل ہیں اور اس اصول کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اگر رشید صاحب نے ایک طرف ان کا مطالبہ کیا ہے کہ ”شاعری ڈفلی بھی اپنی ہو اور راگ بھی اپنا“ تو دوسری طرف انھوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ:-

”میں ادب، آرٹ اور زندگی سب کو علیحدہ علیحدہ اور بحیثیت مجموعی بھی صرف سلیقہ، شرافت اور سرفروشی سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔“

”ادب انسانیت سے خارج نہیں ہے اور انسانیت کا کوئی ایسا مفہوم نہیں ہے جس کو آپ کچھ اور سمجھتے ہوں۔ ہم کچھ اور انسانیت کو انسانیت ہی کہتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں۔“

”ذہنی دنیا میں رہنا یا دھنسی شاعری کی آرٹ پکڑنا میرے نزدیک یکسر عمل ہے اگر شاعر اپنے آپ کو خارج سے بے نیاز کرے اور خارج کو توڑنے مڑوڑنے اور سلجھانے سنوارنے میں خون پسینہ ایک نہ کر دے یا نہ کر سکے۔“

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ رشید صاحب شعر و ادب میں انفرادیت اور اجتماعیت کا ایسا استخراج دیکھنا چاہتے ہیں جس کے بغیر کسی کا شعر و ادب نہ منظر بن سکتا ہے نہ مفید۔

رشید صاحب الفاظ و اسلوب کے عمدہ پارکھ، روایات و رجحانات کے بالغ نظر نقاد اور شعر و ادب کے بڑے اچھے مزاج والی ہیں۔ انکی تنقیدی تحریریں اگر دو ادب کے تنقیدی سرمایہ میں قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سردار صاحب نے ان کی تنقید نگاری کے متعلق ایک بات یہ کہی ہے کہ ”تنقید میں اگرچہ انھوں نے کبھی کبھار کسی اچھی چیز کی تعریف نہ کی، لیکن آج تک میں نے ان کی کوئی ایسی تنقید نہ دیکھی جس میں کسی بہت اور ناقص کارنامے کو انھوں نے سراہا ہو۔“ یہ بات صحیح نہیں۔ رشید صاحب نے بعض بہت اور ناقص چیزوں کو سراہا ہے یا سراہنے پر مجبور کر دئے گئے ہیں۔ یہاں میں مثالیں نہ دوں گا کیونکہ ان سے ان لوگوں کو تکلیف پہونچے گی جنھوں نے اپنے بہت اور ناقص کارناموں پر رشید صاحب سے اچھی رائے لکھوائی ہے۔ مگر رشید صاحب کا یہ گناہ اس لئے قابل معافی ہے کہ خود سردار صاحب اور اردو کے دوسرے نقادوں کے ”شہر“ میں اس گناہ کا ارتکاب بڑے وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے۔ سردار و اقتشام جیسے سنجیدہ و رگزیرہ نقاد بعض لوگوں کے جہلات و مخرقات کی تعریف تو وصیت میں جس فیاضی سے کام لے رہے ہیں اس پر انھیں شرم آتی ہو یا نہیں لیکن میرے ایسے عقیدت مند کو یقیناً شرم آنے لگی ہے۔

رشید صاحب کی مرقع نگاری ان کی مزاح نگاری سے کچھ کم مقبول نہیں۔ بلکہ بعض لوگوں کو ان کی مرقع نگاری ان کی مزاح نگاری سے

زیادہ محبوب ہے۔ یہاں میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ وہ مرقع نگاری کی حیثیت سے زیادہ اچھے اور بڑے ادیب ہیں یا طنز نگار۔ و مزاح نگاری کی حیثیت سے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ رشید صاحب نے جس صنف ادب کو چھوڑا اس میں نہ صرف ایک نئے اسلوب کی طرح ڈال دی بلکہ مجموعی اس اسلوب کے سارے امکانات کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ میں رشید صاحب کو ادب کی کسی بھی صنف پر خرف آختر نہیں مانتا لیکن انھوں نے جس صنف میں جو رنگ اختیار کیا اس کے حروف اول اور حروف آخر وہ ضرور ہیں۔ یہی حال ان کی مرقع نگاری کا بھی ہے۔ رشید صاحب کے مرقعوں کے دو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ”گنج ہائے گرانمایہ“ اور ”ذکر صاحب“ اور اگر ”شیخ نیاز سی“ کو بھی مرقع نگاری کی صنف میں شمار کیا جائے اور کوئی وجہ نہیں کہ ایسا نہ کیا جائے تو اس اعتبار سے ان کے مرقعوں کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ رشید صاحب نے حسرت، جنگر، اقبال، سہیل، اور شفیق الرحمن قدوائی کے جو مرقعے لکھے ہیں وہ ابھی تک رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ رشید صاحب کے ان مضامین اور مجموعوں سے پہلے بھی اردو میں مرقع اور خاکے لکھے جا چکے تھے اور اب بھی لکھے جا رہے ہیں، ادب کی اس صنف کو اردو ادب کی بعض بہت بڑی شخصیتوں کا ارتقا حاصل رہا ہے اور اسی لئے اردو میں مختلف و متنوع اسالیب کی مرقع نگاری وجود میں آچکی ہے۔ لیکن ان میں جس قدر لطیف انگیزہ دل آویز اسلوب رشید صاحب کا ہے اتنا اور کسی کا نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی مرقع نگاری نسبتاً زیادہ مقبول رہی ہے۔

رشید صاحب نے جن شخصیتوں کے مرقعے لکھے ہیں ان سے انھیں صرف ذہنی دلچسپی نہیں بلکہ جذباتی وابستگی بھی رہی ہے۔ اسی لئے ان مرقعوں میں وہ بے تعلقی (detachment) نہیں پائی جاتی جو سائنٹفک مرقع نگاری کے لئے نہایت اہم شرط ہے۔ اردو میں سائنٹفک مرقع نگاری کے اچھے نمونے فرحت اللہ بیگ، عصمت چغتائی اور منٹو کے یہاں ملتے ہیں۔ فرحت اللہ بیگ کے مضمون ”نذیر احمد کی کہانی میری زبانی“ عصمت چغتائی کا مضمون ”دوزخی“ اور منٹو کے کئی مضامین اس فن کا راز بے تعلقی اور بے رحمی کے ترجمان ہیں جو سائنٹفک مرقع نگاری کی بنیادی خصوصیت قرار دی گئی ہے۔ لیکن رشید صاحب کا فن ان فن کاروں سے مختلف بھی ہے اور زیادہ دل پذیر بھی۔ مرقع نگاری کے متعلق ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ ۱۔

”آپ کا کسی سے خوش ہونا یا ناخوش ہونا آپ کے لئے جتنا آسان ہے اتنا ہی یہ مشکل ہے کہ آپ اس شخص کو میری پسند یا

اپنڈ کا موجب بنادیں“

مرقع نگاری میں رشید صاحب کا فن کسی شخصیت سے سرور و متاثر ہو کر اسے ہماری آپ کی پسند کا موجب بنا دینے کا فن ہے۔ ”ذکر صاحب“ اور ”گنج ہائے گرانمایہ“ میں جن شخصیتوں پر جس انداز سے مضامین لکھے گئے ہیں اس سے والے کی محبت کا بوجھان اور شخصیت کا عرفان دونوں نمایاں ہیں۔ ان کتابوں کے موضوعات انسان سے زیادہ ان اقدار و فضائل کے مجسمے معلوم ہوتے ہیں جنہیں رشید صاحب عزیز رکھتے ہیں اور جنہیں وہ ہر دل عزیز بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ ان کے یہاں قدروں اور شخصیتوں کا ربط بڑا گہرا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رشید صاحب ان دونوں کا جواز ایک دوسرے میں ڈھونڈتے اور پاتے ہیں اور اگر وہ دونوں ایک دوسرے کا جواز نہ ہوتے تو رشید صاحب ان میں سے کسی کے قابل نہ ہوتے۔ باہر جمہ ان کے مرقعے جاندار بھی ہیں اور جانفزا بھی۔ دلکش ہی ہیں اور دلکشا بھی۔ ان مرقعوں کے موضوعات قارئین کو اپنا لازماً بنائے بغیر ان کے رفیق بن جاتے ہیں۔ قارئین پر اعتماد نہ کرنے کے باوجود ان پر اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں ان مرقعوں میں جن شخصیتوں کی تصویریں ہیں ان سے میری آپ کی ملاقات ہمیشہ جلو توں میں ہوتی ہے۔ غلو توں میں کبھی نہیں۔ لیکن ان کی جلو توں میں دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ان کے یہاں غلو ت کے معنی ہرگز اس ”کارویگر“ کے نہ ہوں گے جس کے لئے ہم سبھی ایک دوسرے کی غلو ت میں جھلکنے کے درپے رہا کرتے ہیں۔ یہاں میں اس تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتا کہ رشید صاحب نے کن شخصیتوں پر کیا لکھا۔ ان کی کن خوبیوں کو روشنی میں لائے اور کن خصوصیتوں کو سائے میں رکھا۔ لیکن شاہ سلیمان صاحب اور ذکر صاحب کے سلسلہ میں دو ایک باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ سرور صاحب نے لکھا ہے کہ ۱۔

”رشید صاحب، ذکر صاحب سے بھی متاثر تھے اور مولانا سلیمان اثرن سے بھی۔۔۔۔۔ وہ ذکر صاحب کے ساتھ

زیادہ دور تک نہ جائے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کا یہ احترام ان سے بہ محبت اور خلوص ظاہر کرتا ہے کہ ان کا دل کسی طرف ہے۔ پھر بھی یہ ایک دلچسپ مشغولہ ہے کہ ان کے سلیبان اثرات پر مضمون میں جو عظمت و جلال ہے وہ ڈاکٹر صاحب والے مضمون میں کیوں نہیں؟

اس "کیوں نہیں" کے جواب میں پہلی بات مجھے یہ کہنی ہے کہ ڈاکٹر صاحب والے مضمون میں ان کی عظمت یقیناً نمایاں ہے۔ البتہ جلال کا احساس نہیں ہوتا جس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت ہی میں جلال نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے متعلق مضامین سے جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں ان کی شخصیت سرتاسر جمالی ہے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب والے مضمون میں جلال کی جستجو ہی بے معنی ہے۔ رہا یہ سوال کہ رشید صاحب، ڈاکٹر صاحب کے ساتھ زیادہ دور تک نہ جاسکے تو اس باب میں سرور صاحب کے سوچنے کی بات یہ ہے کہ رشید صاحب اپنی محبوب شخصیتوں میں کس کے ساتھ دور تک گئے؟ انھوں نے جو مرتے لکھے ہیں ان سے جہاں دوسروں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوتا ہے وہاں خود رشید صاحب کے متعلق بھی اتنی بات تو معلوم ہو چکی جاتی ہے کہ وہ زیادہ دور تک نہ سولانا سلیمان اثرات کا ساتھ دے سکتے تھے نہ ڈاکٹر صاحب کا۔ نہ فرزانگی کا ساتھ دے سکتے ہیں نہ دیوانگی کا۔ رشید صاحب کی شخصیت کو پرکھنے کا یہ معیار صحیح نہیں کہ انھوں نے کتنی دور تک کس کا ساتھ دیا۔ دراصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ وہ کس کی داد کس حد تک دے رہے ہیں۔ جب آپ اس نقطہ نظر سے انھیں جانچیں گے تو یہ باتیں گئے کہ وہ دیوانوں کا ساتھ نہ دے سکتے تھے اور خود زیادہ قابل دیوانوں ہی کے ہیں کیونکہ بقول ان کے "اگر دیوانے ہوں تو فرزائے نہیں کے نہ رہیں"۔ پھر بات بھی نظر میں رکھنے کی ہے کہ رشید صاحب، سلیمان صاحب، متاثر جس قدر بھی ہوئے ہوں لیکن انھوں نے اپنا ارشد ڈاکٹر صاحب ہی کو بنایا۔

ڈاکٹر صاحب والے مرتعہ پر سرور صاحب کا ایک اعتراض یہ ہے کہ:-

"ڈاکٹر صاحب، رشید صاحب کا بہترین کارنامہ ہے نہ ڈاکٹر صاحب کی بہترین تصویر۔"

ایک دوسری جگہ سرور صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"ڈاکٹر صاحب پر رشید صاحب کی چھٹی سی کتاب مدوح کی شخصیت کی جامع تصویر نہیں ہے۔"

ان دونوں جملوں کو ایک ساتھ پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اگر سرور صاحب کے نزدیک "ڈاکٹر صاحب" ڈاکٹر صاحب کی بہترین تصویر نہیں ہے تو اس لحاظ سے کہ وہ ان کی جامع تصویر نہیں ہے۔ لیکن بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ سرور صاحب ایک مرتعہ میں اس جامعیت کی جستجو کر رہے ہیں جس کا حق صرف سیرت (سیرت) میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ سرور صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"ڈاکٹر صاحب کی عظمت کا راز صرف دوست کا دل رکھنے میں نہیں قوم کی آبرورکھنے میں ہے۔۔۔۔۔ رشید صاحب نے اس

بات پر توجہ نہیں کی کہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کی عظمت محض ان کی ذہانت، خلوص، تقریر، تحریر کے کمال، علم و عمل کی

صلاحیت، زندگی اور زندہ دلی میں نہیں، ان کی ایک نصب العین کی تلاش اور اس تلاش کے لئے وقف ہوجانے میں۔"

اس عبارت کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرور صاحب جن باتوں کا ذکر کر رہے ہیں یا جن باتوں کی طرف توجہ دلا رہے ہیں ان سے ڈاکٹر صاحب کا مرتعہ خالی ہے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ "ڈاکٹر صاحب" کے معاملہ سے ان کی شخصیت کا یہ پہلو سامنے آجاتا ہے کہ وہ دوست کا دل رکھنا بھی جانتے ہیں اور قوم کی آبرورکھنا بھی۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ایک لکھال کو عمل، ایک تصور کو تحریک اور ایک خواب کو حقیقت بنادینے سے عبارت ہے۔ البتہ اس مرتعہ سے اس کا پتہ نہیں چلتا کہ قوم کی آبرورکھنے میں خود ڈاکٹر صاحب کہاں کہاں بے آبرو ہوتے ہوتے بچے اور جس خواب کو انھوں نے حقیقت بنادیا ہے اس کو حقیقت بنانے میں انھیں کن مسائل اور مراحل سے گزرنا پڑا۔ لیکن کیا یہ تفصیلات مرتعہ نگاری کی حدود سے باہر نہیں ہیں؟

سرور صاحب اس بات پر ہم نظر کرتے ہیں کہ "ایک ایسے قوی نظام کی تشکیل جس کے انقلابی امکانات اب جاگرتے ہوئے ہیں

دستور صاحب کی مراد بنیادی تعلیمی اسکیم کی رپورٹ سے ہے جسے ڈاکٹر صاحب نے رشید صاحب کے مکان پر بیسیوں ملاقاتیوں سے لئے جتنے بات چیت کرنے کے باوجود ایک ہفتے میں مرتب کیا تھا۔ اس کام میں غفل اندازوں کو دیکھ کر رشید صاحب نے ازراہ مذاق کہا: ”مرشد! یہ کہاں کا کھڑاگ پھیلا...۔۔۔۔۔ تمام دن خدائی خواروں یا حق بخشوئے ہوئے لوگوں کا مجمع رہتا ہے اور جس نے ڈاکٹر صاحب کی شہرت کو عالمگیر بنا دیا ہے کتاب میں خدائی خواروں یا حق بخشوئے ہوئے لوگوں کے مجمع سے یاد کی گئی ہے۔“

سرور صاحب کی یہ برہمی قطعاً بجا ہے۔ اس لئے کہ رشید صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے مرقع میں: تو اس انقلابی امکانات والے قوی نظام کی توہین کی ہے اور اس کی اہمیت کو نشانے کی کوشش۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کتنے بڑے کام کو کتنے چھوٹے چھوٹے کاموں اور لافنی مصروفیتوں کے بھجوم میں کتنی خوش دلی کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس بحث کو واضح کرنا ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے ایک اہم پہلو کو واضح کرتا ہے۔ رباب خدائی خواروں اور حق بخشوئے ہوئے لوگوں والا فقرہ مویہ صرف مزاح ہے اور مزاح کا بڑا نشانہ خوش مذاقی کے منافی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ”ڈاکٹر صاحب“ ڈاکٹر صاحب کی بہترین تصویر بھی ہے جو اب تک ہمارے سامنے آئی ہے اور رشید صاحب کے بہترین کارناموں میں سے ایک کا نامہ بھی۔ پہلا یہ کہ لوگوں کو دکھانا جو اڈل تصور کو سب سے زیادہ پسند آئے یا سب سے زیادہ متاثر کرے اسی کی تصویر کشی میں وہ ناکام رہے۔ بڑی شخصیتوں کے جتنے حرقے رشید صاحب نے لکھے ہیں ان میں ”ڈاکٹر صاحب“ سب سے زیادہ طویل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی صورت رنگ شخصیت کو شاید ہی کوئی اہم پہلو ایسا ہو جو اس مرقع میں اسیر نہ کر لیا گیا ہو۔ مرقع نگاری میں زیادہ تر شخصیات کے حالات کی بجائے اس کی سیرت کے خصوصیات پر اور کارناموں سے زیادہ کردار پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی بقول انجمن انصاری: ”آپ کو ڈاکٹر صاحب کے حالات کہیں نہیں ملیں گے مگر ڈاکٹر صاحب ہر جگہ ملیں گے۔“

رشید صاحب طبعاً دل آویز شخصیتوں کے پرستار واقع ہوئے ہیں۔ مگر وہ شخص کی پرستش شخص کو شخص ہی سمجھ کر کرتے ہیں نہ کہ خدا یا بت سمجھ کر۔ وہ جس کی پرستش کرتے ہیں اس کی خامیوں کی طرف اشارہ نہیں کرتے اسی لئے رشید صاحب کے تمام حرقے یک رنگ ہیں مگر اس کی خوبیوں کا ناطہ نہ دیا جنوں کے اوصاف سے نہیں جوڑتے، رشید صاحب کی یہ خصوصیت ان کے تمام مرقعوں کی طرح ”ڈاکٹر صاحب“ میں بھی موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ شعر کی شرح سے زیادہ مشکل شخصیت کی شرح ہے۔ رشید صاحب نے ”ڈاکٹر صاحب“ والے مضمون میں شخصیت کی شرح کا جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ اردو ادب میں ہمیشہ اپنا جواب طلب کرتا رہے گا۔ یہاں ایک اقتباس دے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ دیکھئے رشید صاحب ڈاکٹر صاحب کی عظیم و حسین شخصیت کے گونا گوں اوصاف کو کتنے دل آویز و دل نشیں انداز میں بیان کرتے ہیں:

”ڈاکٹر صاحب جامعہ کو ۲۵ سال سے چلا رہے ہیں۔ اس دور میں جامعہ اور جامد میں کام کرنے والوں کو طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ دونوں پرسلسل اور بے پناہ غیر شریفانہ حملے ہوئے۔ لیکن نہ یہاں کوئی اسٹراٹک جھوٹی نہ کوئی بد دل ہوا۔ جامعہ کو چھوڑ کر شہرت یا روزی کمانے کہیں اور گیا۔ یہاں ایسے لوگ بھی نہ تھے جن پر رزق اور موت کے دروازے بند رہے ہوں۔ اور جامعہ کے علاوہ کہیں اور ٹھکانا نہ ہو۔ بلکہ ان میں سے اکثر اپنے علم و فضل کے اعتبار سے ایسی شہرت رکھتے تھے کہ ہندوستان کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی میں ان کی پذیرائی احترام کے ساتھ ہو سکتی تھی۔ یہ صرف ڈاکٹر صاحب کی بلند و برگزیدہ شخصیت تھی جس نے جامعہ کے تار و پود کو نہ صرف بکھلے سے سجا دیا بلکہ اس کو مربوط و مستحکم کر دیا۔“

جامعہ کا ہر چھوٹا بڑا ہر وقت یہ دیکھتا تھا کہ وہ خود کیا ہے اور کیا کر رہا ہے اور ڈاکٹر صاحب کیا ہیں۔ سارا قضیہ اسی ترازو میں تل کو ختم ہو جاتا۔ ذہنی قابلیت میں جو شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا ڈاکٹر صاحب کی ذہنی قابلیت کے سامنے سر جھکا دیتا، اپنے اشار قرآنی اور اخلاقی فضائل کا کسی کو خیال آتا تو وہ یہ پاتا کہ ان فضیلتوں میں بھی ترازو کا پلڑا ڈاکٹر صاحب کی طرف جھکتا ہے۔ خاندانی شرافت و عظمت

موشل اور سرکاری تعلقات یا رسوخ پر کسی کو ناز ہوتا تو وہ یہ پاتا کہ ان کا سردار خاندانی اعتبار سے بھی درخالص ہے اور اس کے تعلقات بھی یادہ وقیع، زیادہ مستحکم اور زیادہ وسیع ہیں محنت کرنے اور فراہم سے عہدہ برآ ہونے کو دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ ذکر صاحب جیسا محنت شاقہ کرنے والا اور اپنے فراموش پر آرام و تفریح کو قربان کر دینے والا حلقے میں ان جیسا کوئی اور نہ تھا۔ کسی کو اپنے ذوق و فطانت کا دھیان ستانا تو وہ دیکھتا کہ اس وادی میں بھی امام ذکر صاحب ہی ہیں۔ کلرک ۲ دیکھتا کہ ذکر صاحب اس سے زیادہ کلرک کی کرتے ہیں پر اسی ۲ پاتا کہ ذکر صاحب اس سے زیادہ دوڑ دھوپ اٹھاتے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اپنے ہاتھ سے کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں یہ دیکھتا کہ ذکر صاحب جیسا بچہ کوئی نہیں۔ جوان ۲ محسوس کرتا کہ ذکر صاحب اس سے زیادہ جوان ہیں اور بوڑھا ۲ جانا کہ جب بوڑھا ۲ ذکر صاحب کے قریب جانے سے ڈرتا ہے تو سپردہ بڑھا پنے کیوں خاطر میں لائے۔

ان کے علاوہ ہر شخص کا عقیدہ تھا کہ ذکر صاحب دوسروں کے فائدے کے لئے جان کھپاتے ہیں۔ اس کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد اور اس کی محنت و فراغت کو اپنی محنت و فراغت سمجھتے ہیں تو پھر کون ایسا ہو سکتا تھا جو ذکر صاحب کو چھوڑ کر اپنے ضمیر کی سرزنش کو ادا کرتا؟ رشید صاحب نے جن شخصیتوں کے مرتبے لکھے ہیں ان میں بعض ایسی بھی ہیں جن کے مرتبے دوسرے ادیبوں نے بھی لکھے ہیں مثلاً مولانا محمد علی پر رشید صاحب کے علاوہ ڈاکٹر عبدالحق، مولانا عبدالحق، مولانا عبدالحق، اور قاضی عبدالغفار نے معنائیں لکھے ہیں۔ ذکر صاحب پر رشید صاحب کے علاوہ ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا ہے۔ احسن، مہر، وادی اور محفوظ علی بدایونی پر رشید صاحب کے علاوہ پروفیسر ضیاء الدین نے بھی لکھا ہے جن کا شمار ادیبوں سے زیادہ فاضلوں میں ہوتا ہے۔ باقی لوگ یعنی عبدالحق، عبدالحق، عبدالحق اور عبدالحق جس پایہ کے ادیب، دانشور و دانشور ہیں اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر آپ مشترک موضوعات پر رشید صاحب اور ان ادیبوں کے مرقعوں کا تقابلی مطالعہ کریں تو ایک بات ضرور محسوس کریں گے۔ وہ یہ کہ زیر مطالعہ شخصیتوں کے ذہن و ذوق، ظرف و وقت، سلیقہ و شرافت، عظمت و رفعت، جمال و جلال، وزن و وقار، نفسی و ایثار، خلوص و خودداری، خدمت و اہلیت، دیباچی و فراہمی اور دوسرے اوصاف کے جیسے واضح، روشن اور خوش نقش رشید صاحب کے مرقعوں کو پڑھ کر ذہن پر مرتسم ہو جاتے ہیں ویسے دوسروں کے مرقعوں کو پڑھ کر نہیں ہوتے۔ خواہ ان کے لکھنے والے کہتے ہی بڑے کیوں نہ ہوں۔ یہاں پہونچنے کی بجائے ان کی اپنی پٹنی ہے کہ انشا پر داز مرقع نگاری کی حیثیت سے رشید صاحب چھوٹوں میں بڑے نہیں بلکہ بڑوں میں بڑے ہیں۔

رشید صاحب کے مرقعوں کو پڑھنے وقت مجھے ایک بات بار بار محسوس ہوئی۔ جہ۔ وہ یہ کہ رشید صاحب صرف طنز و نکار، مزاح و نکتہ نقید نگار اور مرقع نگار نہیں بلکہ شاعر اور مصور بھی ہیں۔۔۔۔۔ جذبات و کیفیات کے شاعر اور ماحول و منظر کے مصور۔۔۔۔۔ ان کی شاعری اور مصوری اگر ادبی یا علمی و سرگرمی کی ہوتی تو میں سرگرمی کا ذکر نہ کرتا لیکن رشید صاحب کی شاعری اور مصوری تو اس انداز میں ہے کہ چیزیں جس کی ذہنیوں تک پہونچنے میں بہت سے پیشہ ور شاعروں اور مصوروں کا دم بھول جا۔۔۔۔۔ آج کل میں بہت سے شاعروں کے کہیں صدودم مہیا رہے سے کام لے رہے ہوں۔ لیکن اس بدگمانی کی کیا ضرورت۔۔۔۔۔ نہ ایک شاعر کی شاعری انکھوں سے دیکھ لیجئے۔ میں تو اختیاس دینے کا شاعر ہوں ہی۔ میر خیال ہے اس قدر کہ آپ بھی اکتبا سامعین سے پترے کے خاکر ہو چکے ہوں گے۔ محمد علی والے مضمون میں رشید صاحب لکھتے ہیں۔

”محمد علی کے باب میں بعض کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے۔ لیکن ان کو کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ یہ تک دلوں اور نگاہوں کا فیصلہ ہے۔ ہماری قومی زندگی میں آج کتنے دھارے بہہ رہے ہیں۔ کتنے چشمے ابل رہے ہیں۔ کتنے عوام بیدار اور نشی رویں دار و رسن کی طلبگار ہیں۔ یہ کس کا فیضان ہے۔ محمد علی نے ہمارے خون کو گول میں دوڑنا پھرنا ہی نہیں بتایا بلکہ وہ آج خود ہماری آنکھوں سے خون بن کر ٹپک رہے ہیں۔ مرقع نگاری کے کارناموں کا اندازہ مقبوضات کی وسعت مال غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی ہمہی و طرب انگیزی، برگستواں کی زینت، تمغہ اور اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے





تک ان کا اسلوب (اگر میرا اندازہ غلط نہیں) خود رشید صاحب کے اسلوب سے زیادہ مقبول ہے۔ مگر سرور صاحب کا چراغ رشید صاحب ہی کے چراغ سے جلا ہے۔ اگر رشید صاحب نہ ہوتے تو اردو ادب صرف رشید صاحب ہی کے اسلوب و انشا سے محروم نہ رہتا بلکہ سرور صاحب کے بھی اسلوب و انشا سے اس کا دامن خالی ہوتا۔

لوگوں کو اس کا شکوہ ہے کہ رشید صاحب نے لکھنا بہت کم کر دیا ہے۔ مجھے اس کا رونا ہے کہ انھوں نے اب تک جو کچھ لکھا ہے وہ بھی ہماری دسترس میں نہیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ رشید صاحب کی جو کتابیں چھپ گئیں وہ چھپ گئیں جو ضامین رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں وہ بکھرے پڑے ہیں۔ کوئی ان کی چھپی ہوئی کتابیں کوئی ایک مدت سے نایاب ہیں دوبارہ چھاپنے والا نہیں۔ کوئی ان کے بکھرے ہوئے مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے والا نہیں۔ یہ بات میں کس سے کہوں اور کس کو سمجھاؤں کہ رشید صاحب کی ہر جنبش قلم کا حاصل محفوظ کر کے جانے کے لائق ہے اور ایسا نہ کر سکتا ہماری اتنی بڑی بد موقعی ہے جسے اردو ادب کبھی معاف نہیں کر سکتا۔

یہ بات بھی کہ کم از کم رسناک نہیں کہ رشید صاحب کی سیرت (Biography) لکھنے کی کوشش کا تو ذکر ہی کیا ہے (کہ اردو میں نہ تو ہر بڑے ادیب کی سیرت لکھنے کا رواج ہے اور نہ کسی کو اس کا سلیقہ آتا ہے) آج تک ان کی شخصیت پر ایک جامع مضمون بھی نہیں لکھا گیا۔ اب تک رشید صاحب کی شخصیت اور ان کے فن پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں سب سے اچھے مضامین سرور صاحب کے ہیں لیکن جہاں تک رشید صاحب کی شخصیت کا تعلق ہے سرور صاحب کا بھی مضمون پڑھتے وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ مرقع نگاری کے لئے ہرگز نہیں بنے۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ جس ادیب کا قلم بے جان شخصیتوں میں جان پیدا کر سکتا ہے اس کی جاندار شخصیت کو لفظوں میں محفوظ کر لینے والا ہم میں کوئی نہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہر سال بیسیوں ادیب، شاعر اور نقاد پیدا کرتی ہے۔ کاش وہ رشید صاحب کے لئے ایک انڈول Bowdler بھی پیدا کر سکتی!

رشید صاحب سے میری دل چسپی دیرینہ ہے۔ جب میں اسکول کا طالب علم تھا اسی زمانہ سے مجھے ان کی انشا پر داری ان کے مضامین کی طرف اور ان کی شخصیت، جس کی جلوت گری ان کے ہر مضمون میں پائی جاتی ہے، علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف کھینچنے لگی تھی۔ میں نے ارادہ بھی کر لیا تھا کہ اسکول کے مرحلوں سے فارغ ہوتے ہی علی گڑھ چلا جاؤں گا۔ لیکن میرے علی گڑھ جانے کی پہلی کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں کو کچھ بچو بچ گیا اور وہاں سے آئی اسے پاس کرنے کے بعد جب دوسری مرتبہ علی گڑھ جانے کی کوشش کی تو میں نے اپنے آپ کو ڈھانکے میں پایا اور ابھی تک پار ہا ہوں۔ یہاں آنے کا ایک قایدہ مذکور ہوا کہ مجھے شکوہ آتی ہے۔ صاحب! مجھے جو میرزا ادب و زندگی میں زبردست اثر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر آپ شادانی صاحب کو میری شراور شاعری میں ڈھونڈیں گے تو آپ کو یاسی ہوئی۔ انھوں نے میری شراور شاعری کو نہیں سہرا ذہن اور فکر کو متاثر کیا ہے۔ ان کے اثر سے مجھ میں جرات، فکر بھی آئی اور جرأت اظہار بھی۔ اور یہ اثر بڑا بڑا ہوا ہے۔ اس نے مجھ کو روک دیا جاؤں تو مجھے اس محرومی کا اتنا ہی افسوس ہو گا جتنا رشید صاحب کے قرب و فیض سے محروم رہ جانے کا۔ اور رشید صاحب کی فیض بخشوں سے محروم نہ جانے کی غلش ابھی تک اس لئے تازہ ہے کہ آئی صاحب، شادانی صاحب، جیوں اور رشید صاحب! آپ رشید صاحب! دونوں ایک دوسرے کا بدلہ نہیں دے سکتے ہیں۔

میں نے اس مضمون میں رشید صاحب کے متعلق اپنے متفرق خیالات و تاثرات کو یکجا کر دیا ہے۔ میری آرزو ہے کہ اگر رشید صاحب کی تمام تحریریں میرے آجائیں اور ساتھ ہی اطمینان و فرصت بھی تو ان کی ادبی شخصیت کے ہر پہلو پر جب بھر کر تفصیل سے لکھوں۔ مجھے اس کی بھی قناعت ہے کہ میں رشید صاحب پر جو کچھ تفصیل کے ساتھ لکھنا چاہتا ہوں وہ ان کی زندگی میں لکھا جائے اور خود میری زندگی میں شائع ہو جائے۔ مگر کون جانتا زندگی اس کا موقع دے گی بھی یا نہیں۔

# ہندستانی تہذیب کا ارتقاء

(سجاد ظہیر)

سات بے برسوں کے بیت جانے کے بعد وطن لوٹنے پر دلی کیفیتوں اور تاثرات کا اظہار کوئی سہل کام نہیں۔ جس و ہند کے نفس و محدود دلائل، محرومیوں، مصائب و غمناک و حند لگوں اور غریب سالیوں سے محل کر جب کوئی انسان کھلی ہوئی آواز اور روشن فضاؤں میں یکایک پہنچتا ہے۔ تب اس کی آنکھوں کا بکا چونہ ہو جاتا اور اس کے ذہن کا کسی تغیر متوازن ہونا شاید فطری اور لازمی ہے۔ بہت سی وہ چیزیں جن کی روزمرہ کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں محسوس ہوتی۔ جن کی طرف ہم بالکل متوجہ نہیں ہوتے یا جن کے وجود کو ہم یوں مان کر جتے ہیں۔ جیسے وہ ہوا اور پانی کی طرح بے دام اور بے خدہ کے ہم کو لگتے ہیں اور ہمارا ان پر پیدائشی حق ہے، اب نایاب اور نادر معلوم ہونے لگتی ہیں۔

ہم ہندوستان کے جس علاقے کے باشندے ہیں وہ سہرا بھرا اور شاداب ہے۔ آسمان کا جو شامیانہ ہمارے حصے میں آیا ہے اور جسے ہم اپنے سروں پر کھنچا ہوا ہاتھ ہیں اس کی مصطفیٰ اور کھلی ہوئی نیلا ہٹ دن کے وقت اور رات کو تاروں کی جواہری افشاں سے بھری ہوئی اس کی سیاہ اور نرم کاکلیں ہمارے موسم کی رنگین نیلگی اور ان کا اعتدال، ہماری چاندی کی طرح اجملی دھلی ہوئی روشنیاں اور ہمارے لہرے خواب آور سائے، کتنے اچھے اور کتنے حسین ہیں یہ سب !

حال میں مجھے اپنے دیس کی اس موہنی دھرتی کو ایک ہوائی جہاز پر سوار ہو کر اور اوپر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ برسات ختم ہو چکی تھی لاکھ شروع تھا۔ کبھی کبھی بادل کے ٹکڑے ادھر ادھر سے آکھیں دھند میں گم لپکتے تھے۔ لیکن ان میں شبنمی کیفیت زیادہ اور اودی گالی سرشاری کم تھی۔ دھوپ چھاؤں کے اس کھیل کے نیچے ساحلہ نگاہ سبز کھیتیاں، ہم کے درختوں کی گچھائیں، انگوٹھی کے گلینہ کی طرح چمکے ہوئے نالاب اور کہیں کہیں پیرساف کی طرح پیچھے کھائی ہوئی ندیاں اور نائے دکھائی دیتے تھے اور ان سب کے درمیان انسانوں کی بستیاں، گھر وندوں کے مانند ! لیکن ان گھر وندوں سے بھی زیادہ انسان، اس کی محنت، معیشت اور ہند کی قدیم سرزمین پر اس کی بود و باش کا احساس ان لامتناہی چوکھٹوں اور مستطیلوں اور چومیری کی مختلف قسم کی ٹکڑوں اور لکیروں سے ہوتا تھا جو اس ساری زمین پر سلسلہ وار چھوٹی چھوٹی کھیتوں کے گرد گھمبی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔

کرہ ارض کی عمر ہر جگہ اور ہر ملک میں تقریباً ایک سی ہے، لیکن جب ہم بھارت کو ایک پراچین دیس کہتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہی ہے کہ ہمارے ملک میں اس وقت تک کی معلومات کے مطابق انسان نے تہذیب کا جامہ آج سے تقریباً پانچ ہزار برس پہلے پہننا شروع کیا، ہم ایسی تہذیبوں سے بھی واقف ہیں جو اس سے بھی زیادہ پرانی ہی جاسکتی ہیں، مثلاً بابل اور مصر کی تہذیبیں۔ لیکن جو چیز بھارت اور چین کی ہیبت کی خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں ملکوں میں تہذیبی عمل کا سلسلہ بدلتا تو ہے اس میں تبدیلیاں تو ہوتی ہیں اور زوال و عروج کے دور نظر آتے ہیں لیکن وہ کسی بھی موقع پر بالکل ٹوٹ نہیں جاتا۔ اقبال نے اسی بات کی طرف تو اشارہ کیا ہے :-

یونان و مصر و داسب مٹ گئے جہاں سے  
باقی گھر ہے اب تک نام و نشان ہمارا  
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری  
صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

تہذیبی طرح ہو !

سمنسکرت کا وافر ادب ہوا تھا بھارت اور راجا میں سے شروع ہوتا ہے۔ اگر کچھ دریدروں اور ہنشدوں کوئی الحال ادب کے ذریعے سے علیحدہ رکھیں اور جو مصیبت کال تک مختلف مسکوں اور مختلف قسم کی تہذیبوں کے روپ میں ہم تک پہنچا ہے، یقینی اپنے تنوع اور معنویت کے لحاظ سے ہمارے چکر کے بہترین خزانوں میں سے ہے۔ ہم نے اوپر کالی داس کی غنائیہ اور عاشقانہ شاعری کا ذکر کیا۔ اس کے ڈراموں کی عظمت بھی مسلم ہے اس کے تین سو سال بعد ساتویں صدی عیسوی کا ایک بڑا شاعر بھرتھری ہے جس کی چار سطرے قطعوں (سمنسکرت کی رباعیاں) میں دنیا کی سوچہ بوجھ عشق اور تیاگ کے مضامین کے نہایت دلچسپ نمونے ملتے ہیں۔ بھرتھری کہتا ہے :

”تم جرات کر کے ایک گھڑیاں کے جڑ سے میرا جھین سکتے ہو“

”تم سمندر کے طوفانی لہروں کے باوجود اسے تیر کر پار کر سکتے ہو“

اور تم ایک غنیمت کا سانپ کو پھول کی طرح اپنے بالوں کو سجا سکتے ہو“

لیکن تم ایک مورگھ کو مٹھیں نہیں کر سکتے جو اپنی بات پراڈ جائے !“

کیا رھوں اور بارھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد افغانستان، وسطی ایشیا اور ایران سے نئی قوموں کے ہندوستان میں آنے کے بعد ہمارے وطن کی سماجی اور تہذیبی زندگی میں بڑی بڑی تبدیلیاں آئیں۔ ان تبدیلیوں کا اثر ہمارے ملک کی زبانوں کے ارتقاء ہمارے ادب ہمارے سنگیت اور مصوری ہمارے فن تعمیر ہمارے لباس اور رہن ہمارے سوچنے کے طریقوں اور ہماری ذہنی اور روحانی زندگی پر بہت دور رس اور گہرا اثر یعنی مختلف قوموں کی لڑائیاں۔ حملہ۔ تشدد اور تصادم ایک بڑی اور بڑی تکلیف دہ چیزیں نہیں ہیں جیسا کہ مولانا حالی نے اپنی نظم حب وطن میں کہا ہے :-

ملک روندے گئے ہیں پیروں سے چین کس کو ملا ہے غیروں سے

لیکن یہاں پر اپنی تاریخ کے اس پہلو سے ہمارا سروکار نہیں۔ جس کی اہمیت بہر حال اب صرف تاریخ کی کتابوں تک محدود ہونا چاہئے وہ حاکم اور وہ محکوم عیدوں پہلے ختم ہو چکے ہیں۔ ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ تقریباً آٹھ سو۔ ان کی تعمیری کاوش میں وہ بہت اہم شمار کئے جانے کے لائق ہے۔ آج کل بعض ”سمجو یا متعصب لوگ“ سمجھتے ہیں کہ چونکہ اس زمانہ کے حکمرانوں کا مذہب اسلام تھا اور چونکہ وہ باہر سے آکر یہاں بسے تھے اور یہاں پر انھوں نے اپنی حکومتیں قائم کی تھیں اس لئے ہمارے اس دور کے آرٹ کے نمونے ”خالص“ ہندستانی نہیں۔ ایسی ذہنیت صرف ان لوگوں کی ہو سکتی ہے جو اپنی نسل کی ایک سے ناواقف ہیں اور جو یہ نہیں جانتے کہ دنیا کی کوئی قوم یا اس کی تہذیب خالص نہیں ہوتی اور تہذیب کا مروجہ اور تاریخی اعتبار سے صرف ایسے حالات میں سب سے زیادہ ہوتا ہے جب مختلف تہذیبی دھارے اور خیالات ایک دوسرے سے آکر ملتے ہیں ایک دوسرے کو سیراب کرتے ہیں اور پھر اپنے خاص ماحول اور خاص سرزمین میں اس کی تمام گزشتہ اچھی خصوصیات کو لے کر کسی نئی اور ایسی چیز کی تعمیر کرتے ہیں جو اس قوم یا ملک کی ہی ضرورتوں، اس کی نئی خواہشوں اور حسین ترین خواہوں کا اظہار کرتی ہے۔

”تاج محل متفقہ طور پر ہمارے ملک کی سب سے حسین عمارت مانی جاتی ہے اور بالکل بجا طور پر اس کا شمار دنیا کے گنتی کے عظیم ترین تعمیری شاہ کاروں میں ہے۔ وہ حسن اور محبت کا ایک ایسا دل کو بھانے والا خواب ہے جس نے سفید سنگ مرمر کا روپ اختیار کر لیا ہے اس کا سبک توازن اگر ہمیں سکون اور آسودگی بخشتا ہے تو اس کا دلربا گنبد اس کے چار مینار اور چوتھرے، رفعت اور وسعت، اس کی جالیوں اور نقوش ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چپکے چپکے ہمارے کانوں میں پیار اور محبت کی باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے پاکیزہ چمن کی کسی قدر شرمیلی ہوئی سسی خاموش نہرو اور اس کے فوارے دروازے سے داخل ہوتے ہیں اگر آپ شام کو تاج محل دیکھنے جائیں تو نیچے سروں میں بہک وقت غم و آرزو انبساط و دل گرفتگی کا شام کلیان سنائے لگتی ہیں تاج محل اتنا غماز و رت کیوں ہے ؟ اس لئے کہ اس کے بنانے والے وہ معمار تھے جسے کے بزرگوں نے صدیوں پہلے ساجی اور اجنتا اور ایلو را بنائے تھے۔ جنھوں نے کو تاریک اور بھونیشور کے مندروں کی تعمیر کی تھی اور جنھوں نے تیرھویں صدی



# اقبال اور غالب

(رجلیلی)

”تا تو بیدار شوی ناله کشیدم در نہ  
عشق کا ریت کہے آہ و فغاں نیز کنند

یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص اپنی شورش پسندی کی تسکین کے لئے کسی کی تنقید کو انتقاد کا کمال سمجھے اور دو مختلف العصر شعرا کا تقابلی اس حیثیت سے کرنے کے درپے ہو کہ وہ ایک کو بہت اور دوسرے کو بلند ثابت کرنے کی سعی بجا میں صداقت اور ادبی دیانت سے بھی چشم پوشی کرے ایسی صورت میں بھی انتقاد کا معیاری طریقہ نہیں کہا جاسکتا اور بالخصوص جبکہ اس نوع کی ساری کوشش کا حاصل کوئی تحقیق یا افادیت محض پر بنائے ”عناد“ یا ”تفریح“ ایسا کیا جائے۔ اس نوع کی کوششوں میں مصروف ہو کر بعض حضرات نقد و نظر کے بنیادی اصولوں تک انداز کر دیتے ہیں۔

ایک از مرید شاہ فرمان فقوری کا مضمون ”اقبال اور غالب“ ہے جو دسمبر ۱۹۷۷ء کے شمار میں شائع ہوا ہے۔ ہر چند مضمون بڑا بے خود کسی استحقاق نہیں مگر اگر ایسے موقر جریدہ میں اس کی اشاعت نے اسے کسی حد تک توجہ طلب بنا دیا ہے۔ جہاں تک اقبال کی تنقید کا تعلق ہو صاحب نے اقبال کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے بلکہ غالب کی ستائش کا مسئلہ تو اس مضمون کو بڑھ کر اسے بھی تحسین ناشناس رہتا ہے۔

پسندیدگی اور ناپسندیدگی شخص کا انفرادی فعل ہے اور اس سلسلہ میں ہر فرد کی رائے آزاد اور حق بجانب ہے کہ وہ اپنے فیصلہ پر قائم ہے۔ لیکن ایک نقاد کے لئے یہ بے انتہا ضروری ہے کہ وہ اپنی اس قسم کی رائے کے استحکام کے لئے دلائل و براہین کو منطقیانہ تسلسل سے بیان کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہاں اگر وہ ہی اظہار پسندیدگی و ناپسندیدگی کا فعل انتقاد بن جاتا ہے۔ ایک ہی فعل کہیں رائے ہے اور کہیں انتقاد۔ صاحب اقبال کو پسند نہیں کرتے یہ ان کی رائے ہے لیکن جب وہ اس کے اسباب و علل بیان کریں گے تو اس کے لئے نقد و تبصرہ کے نام تو اعداد بطور کی بجائے ان کا اولین فرض ہو جائے گا اس لئے کہ اس بجائے اور ہی سے کوئی تاہی ناقد کو سلامت ردی سے دور کر دیتی ہے جس کا شمار صاحب بھی ہوئے ہیں۔

انتقاد کا سائنٹفک ہونا ضروری ہے اور اس کا محض خیالی آرائی سے کوئی تعلق نہیں۔ تاریخ، عمرانیات، نفسیات اور منطق جو سائنٹفک ہیں ناقد کے لئے لادبی ہیں اور ان کے صحیح استعمال کے بغیر صحت مند انتقاد کا منسبہ شہود پر آنا ناممکن ہے۔ مندرجہ بالا علوم اربعہ غفلت رکھی صحیح نتائج تک نہیں پہنچے دے گی۔ اسی طرح دو شاعروں کا موازنہ یا تقابلی مطالعہ جبکہ ان کے ماحول، ان کے ادوار اور ان کے ذرائع کی علم مختلف ہوں بہت مشکل ہے اور ہر کس و نا کس کے اختیار سے باہر ہے۔ فرمان صاحب کا زیر بحث مضمون دیکھ کر مجھے یاد آگیا کہ مولانا اسلم پوری نے اقبال کی مثنوی ”اسرار و رموز“ پر مضمون لکھتے ہوئے کسی معترض کے جواب میں لکھا تھا کہ ایک بزرگ نے چترپن کے دیوان کی مقصوداً بالکل غلطی اور میرزا خیال ہے کہ فرمان صاحب نے بھی اپنی کوشش کو بڑی حد تک اسی قدر مضحکہ خیز بنا لیا ہے۔ یہ صرف قرین قیاس اور ممکن میں بلکہ عین حقیقت ہے کہ چند خیالات و عقاید میں اقبال اور غالب ایک دوسرے کے مماثل ہیں اور چند اقدار دونوں میں مشترک ہیں لیکن

غالب کے یہاں وہ سب کچھ ہوتا جو اقبال کے یہاں ہے قطعی لایعنی ہے۔

اقبال اور غالب میں اہم ترین فرق ان کے نقطہ نظر کا ہے۔ اقبال کا نقطہ نظر اجتماعی اور سیاسی ہے اور غالب کا نقطہ نظر انفرادی اور غیر سیاسی۔ غالب جاگیردارانہ نظام کا پروردہ اور عہد انحطاط کا تربیت یافتہ ہے اور اقبال عصر بیداری کا آئینہ ہے۔ غالب کے اشعار میں ندرت خیال اور بدعت اسلوب کی لاتعداد مثالیں مل سکتی ہیں لیکن بیداری کا پیغام نہیں مل سکتا وہ کسی سیاسی انقلاب کا نقیب ہرگز نہیں تھا۔ غالب انفرادیت کا نمایندہ ہے اور اس کے کلام میں فرد کی ذہن عالی اور ہستی کی عکاسی ضرورتی ہے اس لئے کہ اس کی اپنی زندگی بانداز چکیدن سرنگونی میں گزری جس کا تعلق اقبال کی شاعری سے ہرگز نہیں۔ غالب کے عقاید و خیالات میں ہم آہنگی نہیں برخلات اس کے اقبال کے یہاں زندگی کا ایک واضح تصور ملتا ہے اور اس کا نقطہ نظر سائنٹفک ہے۔ اقبال کا مطالعہ دوسرے شعراء کے مطالعہ سے مختلف طریقہ کار چاہتا ہے۔ غالب کو سمجھنے کے لئے اس کے شخصی حالات یا زیادہ سے زیادہ ہندوستان کی صد سالہ تاریخ کافی ہے، لیکن اقبال کو سمجھنے کے لئے ایک قوم کی تاریخ درکار ہے جو تیرہ صدیوں پر محیط ہے اور عرب کے ریگزاروں سے لیکر تقریباً دو تہائی گروہ ارض پھیلی ہوئی ہے۔

ہمارے اکثر ناقد جو اقبال کو پسند نہیں کرتے یا تو بنیادی طور پر اس کے نقطہ نظر کے مخالف ہیں یا پھر ایک طبقہ وہ ہے جو اسے سمجھنے میں غفلت پر آمادہ ہو گیا ہے۔ موخر الذکر طبقہ نے اقبال کے مطالعہ کا کوئی مضبوط طریقہ اختیار نہیں کیا ہے بلکہ دوسرے شعراء کی طرح اس کے کلام کا جستہ جستہ مطالعہ کر کے رائے قائم کر لی ہے۔ اسی طبقہ کی ایک شاخ یہ ہے جو اقبال کو صرف نقال منوانے کے درپے ہے۔ ہمارے اکثر نوجوان اور بعض بزرگ بھی اس خط میں مبتلا ہیں کہ وہ اقبال کے آغز برگسان نقطے، کانٹ اور کارل مارکس یا دوسرے مشرقی اور اسلامی حکماء و فیروہم کو ثابت کریں حالانکہ واقعہ نفس الامری یہ ہے کہ بعض مقامات پر مغربی اکابرین فلسفہ خود ان اصولوں سے قریب تر ہو گئے ہیں جہاں سے اقبال بھی استفادہ کرتا ہے لیکن ہم اس التباس ذہنی میں مبتلا ہو گئے کہ یہ مشابہت اقبال اور ان متقدمین میں ہے حالانکہ دراصل یہ مشابہت ان متقدمین اور اسلام کے بعض عالمگیر اصولوں میں ہے۔

ہمیں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ یہ عالم عالم اسباب ہے اور یہاں کا کاروبار فرق عادات یا معجزات کا مرحوم نہیں بلکہ قوت عقل کا رہین منت ہے۔ یہاں ہمیشہ چراغ سے چراغ جلتا رہا ہے اور جلتا رہے گا۔ اس نوع کا استفادہ نسل انسانی کا ایسا ورثہ ہے جس سے کسی کو محروم نہیں کیا جاسکتا اور نہ کیا جاسکے گا۔ ذہنی توارث کا یہ عمل ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا ورنہ تہذیب و تمدن کی ساری عمارت ڈھیر ہو جائے گی۔ ماضی سے قطع ہو کر حال اور مستقبل دونوں جہل ہیں بغیر ”دوش“ کے ”امروز و فردا“ کا تصور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ ندرت پسندی اور جدت طرازی کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ ہیک صدائے ”کن“ کوئی چیز عدم سے وجود میں آجائے برخلات اس کے یہاں قطرے سے گہر ہونے تک، صد ہا منزلیں ہیں۔ یونان میں علم و حکمت کی جو شمعیں روشن ہوئی تھیں ان سے آج بھی الکتساب ہو رہا ہے۔ جنھیں قدرت کی فیاضی بدعت و اختراع کی قوت و دیعت کرتی ہے وہ صرف یہ کرتے ہیں کہ :-

مشاط را بگو کہ بر اسباب حسن یار چیزے فردی کند کہ تا شاہ مار سدا

ارتقائے خیال اور افزائش اسباب حسن کی مثالوں سے تاریخ ادب کے اور ناگزیر پڑے ہیں مثلاً سعدی کا شعر ہے کہ :-

از در طہ ما خسر نہ دارد آسودہ کہ بر کنار دریاست

حافظ نے اس پر اضافہ کر کے یوں کر دیا کہ :-

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنین جایل کجا دانند حالی ما سبکساران ساحلہا

اور غالب نے یوں بدل دیا کہ :-

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز گسستہ فکر کشتی و نا خدا خفت است

ظاہر ہے کہ یہ نہ صرف ہے نہ توارد بلکہ استفادہ ہے اور نہ حافظ کے لئے شرمناک ہے نہ غالب کے لئے اور نہ اس سے ان دونوں

شاعرانہ عظمت پر حوت آتا ہے، بقول ایک انگریزی نقاد کے کہ:-

”یہی سن کے کلام میں چاسر اور کوئچ جیہ شگفتگی اور ایچ، اسپنسر کی خوبی ترتیب اور وسعت نظر، شکسپیر کی ہمہ گیری اور رفعت و عبق، لہتن کی شان و شوکت اور سنجیدگی، درڈزور تھ کی فطرت پرستی وغیرہ مجموعی حیثیت سے پائی جاتی ہے۔“  
روح تنقید صفحہ ۲

گویا یہی سن کا اپنا کچھ نہیں ہے مگر بقول ڈاکٹر زور ظاہر ہے کہ اس سے یہی سن کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔  
اخذ و استفادہ یا مماثلت کی چند واضح مثالیں غالب کے کلام سے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں:-

زبان، اہل زباں میں ہے مرگ خاموشی	شد روشنم از شمع کہ در بزم حریفان
یہ بات برم میں روشن ہوئی زبانی شمع	خاموش شدن مرگ بود اہل زباں را
غالب	غنی
کھٹا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ	راز دیرینہ زرخ پر درہ بر انداخت دیرین
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے	حالِ ماشہرہ بانٹائے غزل ساخت دیرین
غالب	نظیری
نہ بدرجستہ شرار نہ بجبا ماندہ رما د	لکڑی جل کوئلہ بھی کوئلہ جل بھیو راکہ
سو ختم بیک ندامت بچہ عنوانم سوخت	میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھی نہ راکہ
غالب	اعلوم

مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی پاک نہیں کہ میرا مقصد یہ نہیں صرف ان صاحب کا ہے بلکہ غلط فہمی کا ازالہ مقصود ہے کہ ایسا کون ہے جو استفادہ نہیں کرتا اور نہ اس قسم کی جزوی مماثلت اور اشتراک عیب ہے۔ اس بحث کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ غالب جو اس کا مدعی تھا کہ اگر محض آئین دہر ہوتا تو اس کا دیوان اس دین کی کتاب ہوتا اس قسم کے توار سے محفوظ نہیں تو پھر اقبال ہی کے لئے یہ عیب کیوں ہے جبکہ وہ تو ناعری کا دعویٰ بھی نہیں کرتا اور بے باک دہل کہتا ہے کہ:-

مری فوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ	کہ میں ہوں محسوم راز درونِ میخانہ
نہ زباں کوئی غزل کی نہ غزل سے باخبریں	کوئی دلکش صدا ہو غبی ہو یا کہ تازی
نہ پنداری کہ من ہے بادہ مستم	مثالی شاعران افسانہ مستم
نہ بیخی خیرا زان مردِ فردوست	کہ بر من تہمت شعر و سخن بست

اس روشنی میں اقبال کی شاعرانہ عظمت کے درپے ہونا ایک مہل سی بات ہے کیونکہ وہ تو خود ہی اس کا مدعی نہیں ہے اور بات ہے کہ اس کے باوجود اقبال کے یہاں اس کی شاعرانہ اور فنکارانہ عظمت کی بھی لاتعداد مثالیں موجود ہیں۔

بر خلاف اس کے کہ کوئی نفسیہ جو نوع بشر میں مشترک ہیں ان کے اظہار میں مماثلت دیکھنا کچھ مضحکہ خیز سی چیز ہے اس لئے کہ بعض اوقات تو اس سلسلہ میں بعد المشرقین بھی قدسے فاصلہ دار دوسے زیادہ قریع نہیں ہوتا کیونکہ

ہر کوئی دامن کی میں نالہ سے ناچار ہے

اس سلسلہ کی ایک واضح مثال اوپر پیش کر چکا ہوں۔ گویہ کہنا دشوار ہے کہ غالب نے اپنے فارسی شعر میں دوسے سے استفادہ کیا ہے لیکن اس کے باوجود معنوی یکسانیت مجبور کرتی ہے کہ ایسا مان لیا جائے اب یہ اور بات ہے کہ تحقیق کی کسوٹی پر یہ دعویٰ پورا نہ آتے۔ ہمارے نوجوان نقاد اکثر صداقت اور اصول کو کسی عارضی مقصد پر قربان کر دیتے ہیں جو کم از کم میری نظر میں ادبی اور ناقدانہ نقطہ نظر

کے متافی ہے ہر چیز میرا مقصد کسی کی نیت پر حملہ کرنا نہیں لیکن محض خلوص نیت کی بنا پر زہر حریاق نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قرآن صاحب سے بھی یہ ایک لغزش ہوئی ہے اور اکثر انھوں نے غالب کے اشعار کو ایسے ایسے بعد انھیں مطالب دئے ہیں کہ ”بسوخت عقل زحیرت“ کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

”اقبال کہتے ہیں کہ فطرت کی لگھاریاں انسان کی شوقی افکار کے بغیر بے روح وبے جان ہیں لالہ کا دل ہزار داغ دار سہی لیکن وہ انسان کے دل کی طرح آرزو کا گھل نہیں، نرگس میں لاکھ بصارت سہی لیکن اس میں وہ بصیرت کہاں جلد زت دیدار سے سرفراز ہوتی ہے چنانچہ زبور مجھ میں کہتے ہیں:-

لادائیں لگستاں داغ ترنائے نہ داشت نرگس غماز او چشم تماشاے نہ داشت

غالب بھی فطرت کے ہر نقش کو گوشت ہوسٹ کے انسان کے مقابلہ میں بیچ بتاتے ہیں کہ انسان میں جمیع حسن و لطافت مرکوز ہیں گل و نرگس کی رونق و زینت صرف انسانی توجہ کی پابند ہے۔

تھکت را ذوا نرگست را تماشا، تو داری بہار سے کہ عالم ندارد

مجھے افسوس ہے کہ قرآن صاحب نے صرف گل، نرگس تماشا کے لفظی اشتراک کی بنا پر جو معنوی مماثلت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ نقش بر آب سے زیادہ نہیں درحقیقت نہ دونوں شعروں میں کوئی معنوی مماثلت پائی جاتی ہے نہ قرآن صاحب کے فرمودہ مطالب اور شعریں مطابقت ہے۔ غالب کے شعرا حسن اور اقبال کے شعریں معنویت دونوں ناقد کے ذریعہ قلم کے زور سے گئے غالب کے شعرا صحیح مفہوم یہ ہے کہ شاعر نے پہلے تو محبوب کے لبوں کو گل اور آنکھوں کو نرگس فرض کر لیا اور پھر گل و نرگس کے لئے فواد تماشا کو لازم کر کے کہتا ہے کہ ایسی بہار تو سارے عالم میں نہیں جیسی تیرے پاس ہے کیونکہ دنیا کی کسی بہار کے لئے ممکن نہیں کہ اس کے گل کو ذوا اور نرگس کو تماشا نصیب ہو سکے۔ اقبال کے شعرا کو ان معنی سے کوئی تعلق نہیں وہ صرف اپنے عہد اور اپنے قوم و وطن کی بے بصری کا قلم کر رہا ہے اور بس نہ جانے قرآن صاحب کے فرمودہ مطالب انھیں کیسے حاصل ہوئے یہ بے بڑا فرق جو دونوں شعروں میں ہے وہ اقبال اور غالب کے ذہنی پس منظر کو ملحوظ رکھنے سے اجاگر ہو جاتا ہے۔ اس ہٹ دھرمی پر ایک لطیفہ یاد آگیا جب جوش ملیح آبادی کا مجموعہ ”آیات و نعمات“ شایع ہوا تو اس پر معاذانہ اظہار خیال کرتے ہوئے یاس یگانہ چنگیزی نے شاید ”نیرنگ خیال“ میں لکھا تھا کہ یہ ہیں وہ شاعر انقلاب جنھیں اپنے مجموعہ کے لئے نام نہیں ملتا اور انھوں نے میرے مجموعہ کلام ”آیات و دعا“ سے لفظ ”آیات“ لے لیا۔ گویا آیات تو یگانہ کو الاٹ ہو چکا تھا دوسرا کیونکر استعمال کر سکتا ہے۔ ایسی ہی بات قرآن صاحب نے کہی ہے:-

یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

مندرجہ بالا قسم کی مثالوں کے ساتھ ساتھ قرآن صاحب نے اس مضمون میں عجیب متضاد اور متباہن خیالات کا اظہار کیا ہے جن کے پیش نظر ان کے مافی الضمیر کا متعین کرنا کم از کم میرے لئے تو دشوار ہے اور پورا مضمون بڑھکر بھی یہ نہیں کھلتا کہ ناقد کا سطح نظر کیا ہے اور تنقیدیں و تحسین کا کیا معیار قائم کرنا چاہا ہے اس کی ادنیٰ سی مثال مندرجہ ذیل اقتباسات ہیں:-

(ا) ”غالب شاعری میں فلسفہ کی صرف ایک صفت یعنی موضوع کی کلیت و ہمہ گیری کو ملحوظ رکھتے تھے ان کے یہاں انسان کے عام نظری تقاضوں، خواہشوں، دلوں، بالو سیوں اور تجربوں کی عکاسی ہے، زندگی کے مختلف حقیقی اور دائمی پہلوؤں کی تشریح ہے، انسانی محسوسات کے نفسیاتی تجربے ہیں۔۔۔۔۔۔ غالب کے یہاں فلسفہ ہمیشہ فن سے مغلوب رہتا ہے۔“

(ب) ”اقبال کے یہاں ایک متین و مخصوص فلسفہ حیات ملتا ہے جو عقلی اور فکری ہونے کے باوجود بڑی حد تک نظری اور جامد ہے اقبال اقتصاد بشری اور انسانی نفسیات کو اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں اور ایسا بزدل شکار و گنہگار اور رجائیت کا سبق دیتے ہیں جو زندگی کے عملی میدان میں اس قدر کار آمد نہیں جس قدر وہ نظری طور پر معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کے یہاں اکثر فلسفہ فن پر غالب آ جاتا ہے۔“

- (ج) "غالب اور اقبال کے ان چند مسائل پہلوؤں سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں میں بڑی حد تک فکری یکسانیت و جھنجھل مناسب ہے۔"
- (د) "غالب اور اقبال دونوں بالکل متضاد ماحول کے ترجمان ہیں۔"
- (ه) "اقبال کے خیالات و افکار اگر غالب سے ماخوذ نہیں تو ان کے معنوی فیض سے کیسے غافل رہیں؟"
- (و) "جس طرح اقبال نے دوسرے حکماء اور علماء سے استفادہ کیا ہے وہاں خود اردو کے ایک شاعر سے بہت کچھ لیا ہے۔"
- (ز) "اردو شاعری میں اقبال کے یہاں غالب کی روح کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔"
- (ح) "یہ کہنا کہ اقبال کی شاعری میں غالب کی روح کام کر رہی ہے یا یہ کہ اقبال کی صورت میں غالب نے دوبارہ جنم لیا ہے کسی طرح درست نہیں۔"

(ط) "ایک گزشتہ نمبر کے بعد دو ہم انہیں ایک دوسرے کی بازگشت نہیں کہہ سکتے۔"

اگر اقتباسات کی بہتات کا اندیشہ دامنگیر نہ ہو تو ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ میری رائے میں تو یہ مضمون صرف لکھنے کے لئے لکھا گیا تھا اور بس اس لئے کہ اتحاد فکر اور مرکزیت کیسے مفقود ہے مثلاً مضمون شکار نے اقتباس (ا) میں جن خصائص کو غالب سے زیادہ داغ کا طرہ امتیاز میں اور جہاں غالب نے انہیں اختیار کیا ہے وہاں غالب غالب نہیں رہتا مثلاً :-

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی یکن  
پنیں میں گزرتے ہیں جو کوچہ سے وہ میرے کندھا بھی کہاں کو بدلتے نہیں دیتے  
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا تیرے پیچھے یہ دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

غالب ساری عمر "رسم و رد عام" سے بچ کر چلتا رہا اور آج ہمارے فاضل نقاد کو بھی "رسم و رد عام" غالب کی خوبی نظر آ رہی ہے اس طرح اقتباسات (ا) اور (ب) میں اقبال اور غالب کا فرق جس طرح بیان کیا گیا ہے وہ بھی کچھ کم مضحکہ خیز نہیں یعنی غالب کے مقابل میں اقبال کی بستی کا سبب یہ ہے کہ "اقبال کے یہاں ایک متعین اور مخصوص فلسفہ حیات ملتا ہے" دراصل ہمارے نوجوان اقبال کے فلسفہ سخت کوشی سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر سکتے، اس لئے وہ اس کی رجائیت کو نظری اور حامد کہنے لگتے ہیں محض اس لئے کہ اس کے نظریات ان کی تن آسانی اور سہل انکاری سے متضاد ہوتے ہیں اور ان کے ذہنی تعیش کا شکار خانہ منہدم ہو جاتا ہے۔ اقبال کا کایہ کہنا کہ "یزداں بکمند آدراسے ہمت مردانہ" ان کی خواہش کہ "بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے" کے منافی ہے! اقبال کا یہ کہنا کہ "خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں وہ ٹنگستاں کہ جہاں گھات میں نہو صیاد" غیر نظری تقاضا ہے اور انسانی نفسیات کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے برخلاف اس کے غالب کا یہ کہنا ہے کہ :-

نے تیر کہاں میں ہے نہ صیاد کیوں میں گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

زندگی کے حقیقی اور دائمی پہلوؤں کی تشریح ہے -

علیٰ بن القیاس اقتباسات (ج) تا (ط) فکری یکسانیت کے برخلاف متضاد دعاوی کی ناپسندیدگی کر رہے ہیں -

میں سطور بالا میں کہیں عرض کر چکا ہوں کہ غالب عہد انحطاط کا تربیت یافتہ ہے اور اقبال عصر سیداری کا آئینہ اور آپ دیکھیں گے کہ بنیادی فرق دونوں کے کلام میں قدم قدم پر ملے گا۔ ہمارے ادب کے لئے یقیناً دونوں مایہ ناز ہیں لیکن دونوں کی حیثیتیں مختلف ہیں ہر چند ہمارے لئے دونوں قابل احترام ہیں لیکن دونوں کے مدارج جدا ہیں، اور ایک نقاد کو یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ وہ ان چیزوں کو نظر انداز کر دے اور ضد، تعصب اور ہٹ دھرمی کی عینک لگا کر جاوید کا امتیاز ہی، مثلاً دے -

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے

کر تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

# خیام کی رباعیاں

(عابد رضا بیدار)

فخر جبر الہ کے ترجمہ سے یورپ میں خیام کی مقبولیت کی ابتدا ہوتی ہے ترجمہ کا پہلا ایڈیشن ۱۸۵۹ء میں نکلا۔ فخر جبر الہ نے بوڈلین کے قلمی نسخہ کو اپنی اساس بنایا تھا جو ۱۸۶۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ ترجمہ بالکل آزاد قسم کا تھا۔ ۱۸۹۶ء میں روسی مشرقی ژورنل کی مقالہ ”خیام کا آوارہ گرد رباعیاں“ کے عنوان سے شائع ہوا اس نے بتایا کہ نکولس کے پیرس ایڈیشن میں جو ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا تھا اور جس میں ۴۴ رباعی تھیں ان میں ۸۲ رباعیاں ۳۹ مختلف شاعروں سے منسوب پائی گئیں۔ اس کے بعد سر ڈینی سن راس اور کرسٹنزن کی تحقیق کی رو سے ان ”آوارہ گرد“ رباعیوں کی تعداد بڑھ کر ۱۰۸ تک جا پہنچی۔

۱۹۱۳ء میں کرسٹنزن نے صرف ۱۲ رباعیوں کو صحیح طور پر خیام کی ملکیت تسلیم کیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں اس کی تحقیق کے مطابق یہ تعداد ۱۲۱ ہو گئی۔ ۱۲۱ کی یہ تعداد اس نے ان ۱۲۳۱ رباعیوں میں سے جہاں جہاں کر کے نکالی تھی جو مختلف جگہوں پر خیام کی طرف منسوب پائی گئی تھیں کرسٹنزن نے تو بہت گنجائش نکالی لیکن نکالنے کے خیال میں موجودہ رباعیوں میں کسی ایک کا انتساب بھی خیام کی طرف غلط ہے۔ اور شیدائے ۱۹۲۵ء میں اس جگہ سے ہی کو ختم کر دیا تھا اس کا خیال تھا کہ خیام نے حقیقت میں کچھ لکھا ہی نہیں ہے اور یہ کہ خیام کا نام تاریخ ادب فارسی سے نکال دینا چاہئے۔ براؤن رباعی کو خیام کا قابل تھا مگر کسی ایسی رباعی کے وجود کا قائل نہ تھا جس میں ”آمیزش“ نہ ہوئی ہو۔

یہ سب محققین جنہیں ان رباعیوں پر شبہ تھا استدلال اس بات سے کرتے تھے کہ خیام کی رباعیوں کے قبضے نسخے اب تک ملے ہیں ان میں جو جتنا قدیم ہے اس میں اتنی ہی کم رباعیاں ہیں۔ بوڈلین کے نسخہ میں ۵۸ رباعیاں ہیں۔ یہ نسخہ خیام کے انتقال کے ۳۸۸ سال یا ڈاکٹر جبر کی تحقیق کی رو سے ۳۳۸ سال بعد لکھا گیا ہے۔ استنبول میں کئی نسخے ملے۔ ایک جو بوڈلین کی تصدیق کا ہے اس میں ۳۱۵ رباعیاں ملیں لیکن ایک اور جو اس سے چار سال پہلے کا ہے اس میں صرف ۱۳۱ رباعیاں تھیں۔ دیکھا یہ کہ اس سولہویں صدی اور اس کے بعد کے نسخوں میں یہ تعداد تیزی سے بڑھتی گئی ہے۔

۱۹۲۵ء تک نسخہ بوڈلین سے قدیم تر کوئی نسخہ نہیں ملا اسی سال جرمن اسکالر روزن نے ۱۳۲۵ء کا ایک نسخہ ڈھونڈ نکالا جس میں ۳۲۹ رباعیاں تھیں مگر بہت جلد اس نسخہ کی قدامت شبہ میں پڑ گئی اور بعد میں ثابت ہو گیا کہ اس کی کتابت سولہویں بلکہ سترھویں صدی عیسوی کی ہے۔

خود خیام کے ہونے جو کچھ کام کر رہے تھے ان میں قزوینی اور محمد علی فروغی قابل ذکر ہیں۔ قزوینی نے ایک بیاض میں جو ۱۳۳۵ء کی لکھی ہوئی تھی خیام کی ۱۳ رباعیاں پائیں۔ اسی قسم کا ایک مجموعہ ریٹس کے ہاتھ بھی لگا تھا اور وہ اس سے دس سال پہلے کا لکھا ہوا تھا اس میں ۳۳ رباعیاں تھیں۔ محمد علی فروغی نے ڈاکٹر قاسم کے ساتھ مل کر ۱۹۲۵ء میں ۱۴۰ رباعیاں تلاش کر کے صحت کے ساتھ قائم کیں۔

فروغی ایڈیشن، خیام کے سلسلہ میں مشرق کا پہلا کارنامہ تھا اور مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے کام کو پیش نظر رکھتے ہوئے دوسرا۔ یہ صرف قدیم نسخوں کا نہیں موجود تھا آوارہ گرد رباعیوں کی تعداد متعین ہی نہیں ہو پائی تھی، آخر کیا معیار اختیار کیا جائے جس کی رو سے کسی رباعی کو یقینی طور سے خیام سے منسوب کیا جاسکے۔ فروغی نے اس کے لئے بڑی صحیح راہ اختیار کی اور وہ یہ کہ بعض ایسی رباعیوں کے مطالعے سے

جنا خیاتم کے علاوہ کسی کی نہیں ہیں خیاتم کے رنگ کا پتہ چلایا جائے اور اس کے بعد دوسری رابعیوں میں جو خیاتم سے منسوب ہیں لیکن مشکوک ہیں رنگ کو تلاش کیا جائے اور اسی اس کسوٹی میں پوری اترے اور خطا ہر کسی دوسرے شاعر کی طرف منسوب کرنے کے لئے کوئی معقول وجہ بھی تو اسے خیاتم کی ملکیت مان لیا جائے۔

خوش قسمتی سے ایک قابل ملاحظہ تعداد میں خیاتم کی وہ رابعیاں مل گئیں جو یقینی طور سے اسی کی ملکیت تھیں جن پر کسی قسم کا شک شبہ کیا جاسکتا تھا یہ رابعیاں تعداد میں ۶۶ تھیں۔ اتنی بڑی تعداد کے مطالعہ کے بعد خیاتم کے اسلوب اس کی فکر اور اس کے رنگ کا ان سے اندازہ ہو سکتا تھا یہ ۶۶ رابعیاں کہاں کہاں سے ملیں اس کی تفصیل آگے آئے گی (یہ تعداد سلیمان ندوی مرحوم کی دی ہوئی روکے ساتھ مل کر ۷۲ ہو جاتی ہے)

یہ سب کچھ ہو رہا تھا مگر رافی مطمئن نہ تھا۔ خیاتم کے بارے میں مشرق و مغرب میں اتنا کچھ لکھا جا چکا تھا کہ کسی بھی بڑے مصنف کی طرح مہر پر جمی خاصی لائبریری بنائی جاسکتی تھی لہٰذا ابھی تک باقی تھی وہ خیاتم جس کی اب تک کئی کئی سو رابعیاں بڑھی جاتی تھیں اس کے بارے میں آخر ۷۲ پر کیسے قانع ہو سکتے تھے۔

بالآخر پروفیسر آربری کا کام اس سلسلہ میں حرت آخرین کے رہا۔ ۱۹۵۷ء میں انھوں نے ۱۷۲ رابعیاں شائع کیں۔ ۱۹۵۸ء کا نسخہ تھا الا کتاب کوئی محمد القوام نیشاپوری تھا ان ۱۷۲ رابعیوں میں ۸ بالکل نئی تھیں۔ اس کے فوراً بعد ایران۔ ادبی ماہنامہ ”یادگار“ میں غالباً ہر عباس اقبال کا ایک مضمون نکلا جس میں انھوں نے ۱۹۵۷ء کے ایک نسخہ کا تعارف لکرایا اور کچھ رابعیاں غور سے نقل بھی کیں۔ یہ نسخہ کسی کی بوٹ ملکیت تھا۔ ۱۹۵۷ء ہی میں کیمبرج یونیورسٹی کی لائبریری نے اسے خرید لیا اور ۱۹۵۷ء میں آربری نے اس کا ترجمہ شائع کیا۔ افسوس میں اصل متن شامل نہیں درج خیاتم کے اسکا اس سے کافی مستفید ہو سکتے۔ حقیقت میں اس نسخہ کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ خیاتم کے ال کے تقریباً ۷۵ سال بعد لکھا گیا ہے جو کسی نہ کسی طرح تاتاری رتخیز سے بچ گیا۔ کتاب کی صراحت کے مطابق یہ رابعیات کا مکمل مجموعہ بلکہ انتخاب ہے اس انتخاب میں ۲۵۲ رابعیاں ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ کل تعداد کم از کم ۵۰۰ تو ہو ہی گی۔ یہی ایک خیال ہے جو دیگر نگار و گرد رابعیوں کو ایک بار پھر مزید تحقیق و جستجو کا موضوع بنا دیتا ہے۔

تاہم یہ ۲۵۲ رابعیاں بھی ابھی ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ ان کے ترجمہ سے مقابلہ کا کام تو نہیں لیا جاسکتا۔ اس لئے ابھی تک مشرق کے پاس اصل یقینی رابعیاں وہی ۷۲ ہیں جن کو بنیاد بنا کر فروغی نے ۱۷۲ رابعیوں کا ترجمہ شائع کیا۔ ان ۱۷۲ رابعیوں میں تو خود فروغی کا ستم غنی کا ذوق شامل ہے اس لئے ان کے متعلق ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے اور کیمبرج ایڈیشن کے متن کی اشاعت سے قبل ان ۷۲ رابعیوں کو اس کا سراپہ سمجھتے ہیں۔ وہ رابعیاں اور ان کے ماخذ کی تفصیل درج ذیل ہے۔

رابعیاں پیش کرنے سے پہلے پروفیسر آربری نے اپنے ترجمہ پر جو تعارف لکھا ہے اس میں دو بڑے مفید چارٹ دئے ہیں وہ یہاں نقل ہاتے ہیں:-

### مشترک رابعیاں (۱)

۱۷۲ کا نسخہ :	۳۱ رابعیاں	ان رابعیوں میں سے ۱۱ نسخہ کیمبرج میں ہیں ۱۹۵۷ء کے ایڈیشن میں صرف ۹ ہیں
نسخہ بوڈلین :	۱۵۸ رابعیاں	ان میں سے ۶۰ نسخہ کیمبرج میں ہیں اور صرف ۴۲ پہلے نسخہ میں -
نسخہ کرسٹنزن :	۱۶۱ رابعیاں	نسخہ کیمبرج میں ۶۰ اور ۱۹۵۷ء کے ایڈیشن میں ۴۸ ہیں
فروغی ایڈیشن :	۱۷۸ رابعیاں	نسخہ کیمبرج میں ۸۹ اور ۱۹۵۷ء کے نسخہ میں ۶۹

## مشترک رباعیاں (۲)

۳ رباعیاں کیمرج اور ۱۹۷۵ء کے نسخوں میں	۵ رباعیاں	”سند نامہ“ محمد مرقندی تالیف ۱۵۵۷ء
۲ کیمرج میں ایک ۱۹۷۵ء ایڈیشن میں	۲ رباعیاں	”مرصاد العباد“ رازی
۱ رباعی دونوں میں نہیں	۱ رباعی	”تاریخ گزیدہ“ مستوفی
۶ کیمرج نسخہ میں ۴ پہلے والے میں	۱۱ رباعیاں	سعید نفیسی کی دریافت کردہ ’بیاض‘
۲ رباعیاں دونوں نسخوں میں ہیں	۵ رباعیاں	قاسم غنی کی دریافت کردہ ’بیاض‘

✱

اے دل حذر زمستی و مخموری کن      وز ہمدی رطل گراں دوری کن  
از بادہ شفا خیزد و از مستی شوق      توبہ ز شفا مکن ز مخموری کن

✱

یک شیشہ مے کہن ز ملکہ نوبہ      وز ہرج (چہ) نہ مے طریں بیرون شوبہ  
چرخشت بہ از ملک فریدوں صد بار      خشت سرخس ز تاج کینخس و بہ

✱

گویند بحسب جستجو خواہر بود      و آں یار عزیز تند خو خواہر بود  
از خیر محض جز نکوئی ناید      خوش باش کہ عاقبت نکو خواہر بود  
از واقعہ ترا خیر خواہم کرد      و آرزو بد حرف مختصر خواہم کرد  
با عشق تو در خاک فرو خواہم شد      با مہر تو سر ز خاک بر خواہم کرد

✱

در دایرہ کادمن و رفتن ماست      آخر نہ بدایت نہ نہایت پیدا ست  
کس مے نزنو مے دریں معنی راست      کایں آمدن از کجا و رفتن بجا ست  
دارندہ چو ترکیب طبائع آراست      از بہر چہ او فکندش اندر کم و کاست  
گر نیک آمد شکستن از بہر چہ بود      ورنیک نیامد ایں صور عیب کر است

۱۔ امیر غفر العالی کی لکھنؤ میں جو ۱۹۷۵ء کی تصنیف ہے سلیمان ندوی مرحوم کے بقول، شربخوری کے آداب کے ذیل میں غریب نام سے یہ رباعی نقل کی ہے۔ افسوس قابوس نامہ میں باوجود تلاش بسیار ہمیں یہ رباعی کہیں نہ مل سکی۔ یہ رباعی اور کسی نسخہ میں نہیں پائی جاتی۔

۲۔ ابو بکر راوندی کی ”راحت الصدور“ میں جو ۱۹۹۷ء سلیمان ندوی کی تالیف ہے یہ رباعی بلا مصنف کے نام کے درج ہے لیکن یہی رباعی خیام کے اکثر نقلی مجموعوں میں ملتی ہے اس لئے یہ گمان غلط نہیں کہ یہ خیام ہی کی ہے۔ بعض نسخوں میں تیسرے مصرع میں پہلا لفظ ”جامست“ ہے اور بعض جگہ ”درست“۔ (سلیمان ندوی) ۳۔ یہ دونوں رباعیاں شمس الدین شہر زوری کی ”نزهت الادواح“ کے فارسی نسخہ میں خیام کے نام سے درج ہیں کتاب مذکور ۱۹۷۵ء سلیمان ندوی کی تصنیف ہے۔

۴۔ شیخ نجم الدین رازی معروف بہ دای نے اپنی کتاب ”مرصاد العباد“ میں فلسفیوں کی گزری اور لادریہ کے سلسلہ میں خیام کے نام سے دو رباعیاں نقلی ہیں۔ ”مرصاد“ ۱۹۷۵ء کی تصنیف ہے یعنی خیام کی وفات کے سو سال کے اندر اور پھر رازی جیسا ثقہ راوی۔ فروغی

اجزائے پہاڑ کو درہم پیوست، بشکستن آں روا نمیدارد دست  
چندیں سرو پائے نازنین از سر دست، بر مہر کہ پیوست و بنام کہ شکست

ہر ذرہ کہ بروئے زینے ہودہ است، خورشید رنے زہرہ جینے ہودہ است  
گرد از رخ نازنین باز دم نشان، کال ہم رخ و زلف نارینے ہودہ است

تارہ قلندری نیونی نشود، رخسارہ بخون دل نشونی نشود  
سوچہ پزی تاکہ چو دلسوختگان، آزاد بترک خود نگونی نشود  
یک روز ز بند عالم آزاد نیم، یکدم زدن از وجود خود شاد نیم  
شاگردی روزگار کردم بسیار، در کار جہاں ہنوز استاد نیم  
ہم گز دل من ز علم محروم نشد، کم ہمت ز اسرار کہ مفہوم نشد  
ہفتاد و دو سال فکر کردم شبے روز، معلوم شد کہ هیچ معلوم نشد  
دشمن بغلط گفت کہ من فلسفیم، ایزد داند کہ آنچہ آؤ گفت نیم  
لیکن چو درین غم آشیان آمدہ ام، آخر کم از آنکہ من بدانم کریم  
مائیم کہ اصل شادی و کان غمیم، سراپائے دادیم و نہاد ستیم  
پستیم و بلندیم..... و کیم، آئینہ زنگ خوردہ و جام جمیم  
ترکیب طبائع چو بکام تودے است، روشاد بزی اگرچہ بر توستے است  
باہل خرد با شش کہ اصل تن تو، گردے دیشے و خوارے و دے است

خوش باش کہ بخت اندو سودائے تودے، فارغ شدہ اند از تمنائے تودے  
تفقتہ بکشم کہ بے تقاضائے تودے، دادند قرار کار فردائے تودے  
از دسی کہ گزشت ہیچ از یاد کن، فردا کہ نیامدہ است فریاد کن  
بر نامہ و گزشتہ بنیاد کن، حالے خوش باش و عمر بر باد کن  
پیش از من و تو بیل و نہاں ہودہ است، در ہر قرنے بزرگوارے ہودہ است  
ہر جا کہ قدم نہی تو بر روئے زمین، آں مرد یک چشم نگارے ہودہ است

۱۔ یہ رباعی "تاریخ جہانگشاہ جہین" میں جو شش یعنی وفات خیام کے ۴۰ سال کے اندھ لکھی گئی ہے خیام کے نام سے درج ہے۔ — فروغی

۲۔ محمد مستوفی: "تاریخ گزیدہ" — تالیف ۱۳۳۵ھ۔ — فروغی

۳۔ نویں رباعی سے ۳۹ ویں رباعی تک کی ۳۱ رباعیاں جرمن مستشرق پریسیس کی دریافت کردہ "نزهت المجالس" سے ماخوذ ہیں۔ کتاب مذکورہ پہلے کسی کتاب خانہ میں مستشرق موسونہ گوئی یہ ۴۰۰۰ کے قریب رباعیات کا مجموعہ ہے جس میں مختلف شعرا کی رباعیاں ہیں۔ سال کتابت ۱۳۳۵ھ۔ اس میں کئی باب ہیں ایک باب کا عنوان ہے "در معانی حکیم عمر خیام" اور اس کے قبل میں یہ رباعیاں درج ہیں ان رباعیوں میں سے بعض کا سری جگہ پر نہیں چلتا۔

ہر ذرہ کو در خاک زینے بودہ است      پیش از من و تو تاج و تگینے بودہ است  
گرد از رخ نازنین باز م نشان      کاہم رخ خوب نازینے بودہ است  
ہر راز کہ اندر دل دانا باشد      باید کہ نہفتہ تر ز عفا باشد  
کاندر صدف از نہفتگی گردد در      آن قطرہ کہ راز دل دریا باشد  
ہم دانہ امید بخسمن ماند      ہم باغ و سراے بے تو دمن ماند  
سیم و زبر خویش از درے تابجئے      بادوست بخور گزہ بدشمن ماند  
بر شاخ امید اگر برے یافتے      ہم رشتہ خویش را سب یافتے  
تا چند زنگنائے زندان وجود      ایکاش سوائے عدم درے یافتے  
کے جبرے مے کہن ز لکے نو بہ      وز ہر چہ بے طریق بیرون شو بہ  
ور دست بہ از تخت فریدوں صد بار      خشت سرخس ز تاج کیخسرو بہ  
در دہر چو آواز گل تازہ دہند      فرمائے بتا کہ مے باندا زہ دہند  
از حور و قصور و بہشت و دوزخ      فارغ بشیں کہ آن ہر آوازہ دہند  
گیرم کہ با سدا رہ مناسی      در شہیوہ عاقلان ہمانا نرسی  
از سبزہ دے خیز بہشتے بر ساز      کاخجا بہشت رسی یا نرسی

۳۳

من مے کہ تیرہ رنگ دستی نخورم      یا از غم رسوائی دستی نخورم  
من مے ز برائے خوشدلی میخورم      اکنون کہ تو بردلم نشستی نخورم  
گر کار فلک بعدل سنجیدہ بدی      احوال فلک جلد پسندیدہ بدی  
در عدل بدی بکار ہا در گر دوں      کے خاطر اہل فضل رنجیدہ بدی  
ہر یک چندے یکے بر آید کہ منم      بالتمت و باسیم وزر آید کہ منم  
چوں کا زکب او نظام گیرد روزے      ناگہ اجل از کمیں در آید کہ منم  
حرے است مرا تیرہ دکارے است راست      محنت ہمہ افزودہ و راحت کم و کاست  
فکر ایند را کہ آنچہ اسباب بلاست      مارا ز کسے دگر نمیباید خواست  
ترکیبے پیالہ کہ در ہم پیوست      بشکستن آن روانمیدارد دست  
چندیں سرو پائے نازنین از سویت      بر مہر کہ پیوست و بکین کہ شکست  
آئرا کہ بصحرائے علل تاختہ اند      بے او ہمہ کا۔ ہا بہر داختہ اند  
امروز بہائے در انداختہ اند      فردا ہمہ آں بود کہ در ساختہ اند

لے یہ راہی حوالہ مستوفی نے بھی دی ہے وہاں تیسرا مصرع بالکل دوسری طرح ہے اور چوتھے میں ایک لفظ کا فرق ہے، قزوینی اس راہی کو قطعاً نظر انداز کرتے ہیں مگر انے اسے راہیوں کی گنتی میں شامل نہیں کیا ہے۔ لے راہی سیدان ندوی کی تحقیق کے مطابق راوندی کی تلاوت الصدود میں موجود ہے۔ ہم کلان مگر یہ ہے۔ لے راہی تاریخ جیا کشا میں موجود ہے جسے ہم نے نقل کر دیا ہے۔ دیکھئے نمبر ۱۔ پہلے اور آخری مصرعوں میں خطیف سا اختلاف ہے

خوشید بگل نہفت می نتوانم      واسرار زمانہ گفت می نتوانم  
 از بسہ تفکرم بر آورد خورد      درے کہ ز بیم سفت می نتوانم  
 رستم کہ دریں منزل بیداد بدی      در دست نخواہد بجز از باد بدی  
 آنرا باید برگ من شاد بدی      کز دست اجل تواند آزاد بدی  
 چوں روزے و عمر بیش و کم نتوان کرد      دل را بچنین غصہ و ذرم نتوان کرد  
 کار من دتو چنانکہ رائے من وقت      از موم بدست خویش ہم نتوان کرد  
 ز آوردن من نہ بود گردوں را سود      وز بردن من جاہ و جمالش نفوذ  
 ورنہ کس نبود و گو شمش نشود      کاوردن و بردن من از ہر چہ بود  
 مشنوخن از زمانہ ساز آدگان      می خواہد مروتی بطراز آدگان  
 رفتند یکان یکان فراز آدگان      کس می نہد نشان ز باز آدگان

۳۳  
۳۴

در کار کہ کوزہ گرے رستم دوش      دیدم دو ہزار کوزہ گویا دوش  
 از دست ہر کوزہ بر آوردہ فروکش      صد کوزہ گرد کوزہ خورد کوزہ فروکش  
 بر گیر پیالہ و سبواسے دلجوئے      تا بنرا میم گرد باغ و لب جوئے  
 بس شخص عزیز را کہ چرخ بدخو      صد بار پیالہ کرد و صد بار سبوسے  
 از کوزہ گریب کوزہ خریدم بارے      آل کوزہ سخن گفت زہر اسرارے  
 شاہے بودم کہ بایم ز زہیم بود      اکنون شدہ ام کوزہ ہر خمارے  
 این کوزہ کہ آبخوار کہ مزدوریت      از دیدہ شاہیت و دل دستوریت  
 ہر کامے کہ در کف مخموریت      از عارض متے و لب مستوریت

۳۵  
۳۶

عالم اگر از بہر قومی آرائید      مگر رائے ہر اے کہ عاقلان نگرانید  
 بسیار چہاروند بسیار آئید      بر بایے نصیب خویش کت بریانید  
 چوں روزے و عمر بیش و کم نتوان کرد      خود بہ کم و بیش و ذرم نتوان کرد  
 کار مود و تو چنانکہ رائے من و تو      از موم بدست خویش ہم نتوان کرد  
 وقت سحر است خیز اسے مایہ ناز      نرمک نرمک بادہ خور و چنگ نواز  
 کانہا کہ بجا نید نہانید بے      دانہا کہ سشدند کس غمی آید باز  
 چوں نیست مقام مادرین دہر مقیم      پس بے و مشوق خطائے است عظیم  
 تاکے ز قدیم و محدث امید و بیم      چوں من رستم جہاں چہ محدث چہ قدیم

۱۹۳۱ء - ضلعہ میں قزاقوں کو ایک مجموعہ اخبار طالع میں کام "منازل الاحرار"ی دقائق الاخبار ہے اس میں خیام کی ۱۲ راجاں دی گئی ہیں جن میں سے ۲ راجے پہلے آئند ہیں اس کی کتابت ۱۸۸۵ء کی ہے یعنی قزاقوں نے اسے دوسال بعد - ۱۹۰۷ء میں ۲ راجاں نمبر ۳۷ سے ۳۹ تک ہیں۔  
 ۱۹۳۱ء - "دینت المہاس" کی راجاں میں موجود ہے۔

چوں ابر بنو روز رخ لاله بشت  
بر خیز و بجام بادہ کن عزم درست  
کایں سبزہ کہ امروز تاشاگد ماست  
فردا ہمہ از خاک تو برخواہد رست  
بر سنگ زدم دوش سبوی کاشی  
سرسر بم چو کردم این او باشی  
با من بزبان حال می گفت سبوی  
من چوں تو بم تو نیز چوں من باشی  
یک قطر آب بود باور شد  
یک ذرہ خاک باز من یکتا شد  
آمد شدن تو اندرین عالم چیست  
آمد کسی پدید و نا پیدا شد

ایام زمانہ از کسے دارد ننگ  
کو از غم ایام نشیند دلتنگ  
مے خور تو در آئینہ و نالہ جنگ  
زاں پیش کہ آئینہ آید بر سنگ  
این بحر وجود آمدہ بیرون زہفت  
کس نیست کہ این گہ تحقیق بسفت  
ہر کس سخن از سر سودا گفتند  
زاں روئے کہ هست کس غمیدانہ گفت  
اسے پیر خرد مند پگہ تر بر خیز  
واں کو دک خاک پزیرا بنگہ تیز  
پندش دہ و گو کہ نسیم ترک می پند  
مغز سر کیقباد دوششم پرویز  
دورے کہ در آمدن و رفتن ماست  
اورانہ نہایت نہ بدایت  
کس می نزدیک دے درین معنی راست  
کایں آمدن از کجا در رفتن بجاست  
مے خور کہ فلک بہر ہلاک من و تو  
تصدے دارد بجان پاک من و تو  
در سبزہ نشین و مے روشن میخور  
کایں سبزہ بے دم ز خاک من و تو  
اسے آنکہ نتیجہ چہار و ہفتی  
وزہفت و چہار دائم اندر نفی  
مے خور کہ ہزار بار پشت گفتم  
باز آمدنت نیست چو رفتی رفتی

آہنہا کہ کہن شدند و آہنہا کہ فوند  
ہر کس براد خویش یک یک بروند  
این کہنہ جہاں کس نمائند باقی  
رفتند و رویم و دیگر آئینہ و روند  
آیند یکے و دیگرے بر بائند  
بر ہیچ کسے زاز ہی نکشائند  
مارا ز قضا جز این قدر نمائند  
پیماہ عمر است مہ پیماہ  
از جہم گل سیاہ تا اوج زحل  
کردم ہمہ مشکلات کلی راحل  
ہر بند کشادہ شد بجز بند اجل  
بکشادم بند ہائے مشکل بجیل

۱۔ وہی مشہور رباعی ہے جس میں خیام کے پرستاروں نے آیام کو خیام بنا دیا ہے  
۲۔ خفیت سے فرق کے ساتھ یہی رباعی مرصع و انشاع میں نقل ہوئی ہے جس کا حوالہ دے چکے ہیں۔ ۳۔ سفید نقی نے ۱۹۲۲ء - ۱۹۲۳ء میں کتاب فی  
مجلس شملہ فی میں ایک بیاض دریافت کی جس کا سال کتابت ۱۱۵۷ھ تھا یعنی "مولی الاحرار" کے ۹ سال بعد لکھی گئی تھی اس میں گیارہ رباعیاں خیام کے  
نام سے شامل ہیں۔ جو ہمارے یہاں ۱۱۵۷ھ تک پہنچیں مرن ۹ - کیونکہ اس میں کی دور باہیاں "مولی الاحرار" میں پہنچ چکی ہیں۔

برخیزد بتا بیا بہر دل ما  
مل کن بجمال غولیشتن مشکل ما  
ہم کو ذہ شراب تا بہم نوش کنیم  
زاں پیش کہ کو ذہ ہا کنند از گل ما

اے دوست حقیقت شنو از من سخن  
با بادہ لعل و با سیم تن  
کاں کس کہ جہاں کرد فراغت دارد  
از بہت چوں چوں توئی دریش چو تن  
چوں نیست مقام مادر این دہریم  
پس بے مئے و معشوق خطایست عظیم  
تا کے ز قدیم و محدث اے مرد سلیم  
چوں من مردم جہاں چہ محدث چہ قدیم  
آں مایہ ز دنیا کہ خوری یا پوشی  
معدوری اگر در طلبش میکوشی  
باقی ہمہ را ننگاں میرزد ہشدار  
تا عمر گر انہما بجاں نفروشی  
گر چہ غم و رنج من درازی دارد  
عیش و طرب تو سہم فرازی دارد  
بر دہر مکن تکیہ کہ دوران فلک  
در پردہ ہزار گونہ بازی دارد  
از رنج کشیدن آدمی خر گردد  
قطرہ چو کشت جس صدت در گردد  
گر مال نماند سہ باناد بجائے  
پیمانہ چو شد تہی دگر پیر گردد  
بر چشم تو عالم ارچہ آرائند  
مگر اے بدو کہ عاقلان نگرانند  
بسیار چو تو شد ندیسیار آئند  
بر بائے نصیب خویش کت بر پائند  
بر خیز ز خواب تا شرابے بخوریم  
زاں پیش کہ از زمانہ تا بے بخوریم  
کایں چرخ ستیزہ روی تا گر روزے  
چنداں نہ ہر اماں کہ آہے بخوریم

از جملہ رفقاں این راہ دراز  
باز آمدہ کیت تا بسا گوید راز  
پس بر سر این دو راہیہ آزدنیاز  
تا ہیچ منہائی کہ نہی آئی باز  
آنی کہ نبودت بخور و خواب نباز  
کردند نیاز شدت این چار انباز  
ہر یک بتو آنچہ داد بستاند باز  
تا باز چنان شوی بود زاعناز  
بر پشت من از زمانہ تو میآید  
وز من ہمہ کار ناگو میآید  
جاں عزم رحیل کرد و گفتم برد  
گفتا چکنم خانہ فرو میآید  
بردار قریب و سہو اے دلجوئے  
فارغ بنشین کشت زار و لب جوئے  
بس نفس عزیز را کہ این چرخ کبود  
صد بار مرا بہ کرد و صد بار سہوئے

۱۔ یہ رباعی طیف سے فری کے ساتھ "موش الاحرار" میں موجود ہے جو ہم نقل کر چکے ہیں۔ ۲۔ یہ رباعی بھی "موش" میں آچکی ہے۔  
۳۔ فروغی کے ہمارے اکثر قاصد غنی کو ایک "مجموعہ تذکرہ" ملا جس میں سب شاعر مقدسین میں سے ہیں، فردوسی سے سہدی تک لیکن خواجہ حافظ کا ذکر نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کاتب حافظ سے پہلے کا ہے مگر، انداز تحریر، اور رسم خط سے اندازہ پایا جاتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری سے بعد کا نہیں اور اگر "موش" و فروغی کے قاصدین معاصر فردوسی ہیں تو رباعی کے مضمون بن خبائیس نہیں۔ رباعیماں شاعرانہ - ۴۔ یہ رباعی "نوبت المجالس" کے حوالہ سے ہم پہلے دے چکے ہیں۔

گر شلخ بقا ز بیع بخت رستت در برتن تو عمر با سے چستت  
در خیمہ تن کہ سایہ بانیمت ترا ہاں تکبہ مکہ کہ چارمیش رستت

تو شے متفکر نہ اندر رہ دیں تو سے گہماں خستادہ در راہ یقین  
میرسم از آنکہ بانگ آید روزے کا سے پیچراں راہ نہ آفت نہ این  
قانع بیک استخوان چو کرکس بودن یہ زانکہ طفیل خوان ناکس بودن  
بانہ جوی خوش تھا کہ بہ است کالودہ بپا لودہ ہر خس بودن  
تا چند کنی خدمت دونان و خساں جاں بر سر ہر طمہ منہ چون کساں  
تائے بدو روز غور کش منت کس خون دل خود غوری بہ از ناں کساں  
یک نان بدو روز اگر شود حاصل مرد دز کوزہ شکستہ دے آئے سرد  
مامور کم از خودی چہرا باید لود یا خدمت چوں خودی چہرا باید گرد  
اسے دیدہ انگر کور نہ گور ہیں دین عالم پر رفتہ و پر شور ہیں  
شاہاں و سراں و سرور اں زیر گل اند رو ہائے چومہ در دہن مور ہیں  
اسے دل غم این جہان فرسودہ مخور بیہودہ نہ اسی عثمان بیہودہ مخور  
چوں بودہ گرفت دنیست نابودہ پیر خوش باش و غم بودہ و نابودہ مخور  
بر چرخ فلک ہیج کسے چہر نشد وز غور دن آدمی زمین سیر نشد  
مغرور بدانی کہ غور دست ترا تعجیل کن ہم بخورد دیر نشد  
چوں نیست زہرچہ ہست جز باد بدست چوں ہست بہرچہ ہست نقصان و شکست  
انکار کہ ہرچہ ہست در عالم نیست پندار کہ ہرچہ نیست در عالم ہست  
حتی کہ بقدرت سرود رومی سازد ہموارہ ہموکار عدوی سازد  
گویند قراہ گر مسلمان نبود اورا توجہ گزئی کہ کدومی سازد  
دیکہ دائرہ کہ آمد و رفتن ماست آترانہ ہدایت نہ ہدایت پیدا است  
کس می نژدہ در اہل جہاں یکدم راست کیں آمدن از کجا و رفتن کجا است

سیر آدم اسے عدائے از ہستی خویش از تنگ دلی و از تہی دستی خویش  
از نیست چہ ہست میکٹی میرول آر زمین نیستیم بحرمت ہستی خویش

(محمد تقی قزوینی کے "سند نامہ" میں بھی خیام کی ۵ رباعیاں موجود ہیں۔ انہیں کی تصنیف ہے، انہوں نے مضمون لکھے وقت ہم ان رباعیوں کو نقل کیا ہے۔ قزوینی اور ڈاکٹر حاتم قنی کی ان رباعیوں میں بعض ایسی رباعیاں ہیں جن کے کتبے والوں کا نام درج نہیں کیا گیا ہے لیکن جن میں سے اکثر خیام کے دو سونے چھوٹے ہیں جن جاتی ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان رباعیوں میں کچھ تعدادیں دس ہیں، دسویں رباعی "مرصاد العباد" میں خیام کے نام سے درج ہے۔ اس سے چار شبہ یقین کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور ان رباعیوں کو ہم اپنے مضمون کے اعتبار سے بھی قطعاً خیامی ہی خیام کی ملکیت ماننے میں کوئی شک نہیں رہتا۔  
نہے یہ رباعی "مرصاد" میں موجود ہے اور نقل کی جا چکی ہے۔ علامہ مولانا خضر البرقوی کی "فردوس التواریخ" میں جو حشمت کی تائید ہے، خیام کی دو رباعیاں نقل ہیں، ایک وہ جو علامہ مستوفی نے دی ہے اور دوسری یہ علامہ نے معلوم اس رباعی کو قزوینی نے نیکر کسی معقول وجہ کے کیوں خشک کر ڈھیر کیا ہے۔

ان ۴۲ رباعیوں کے مطالعہ سے (جن میں سند نامہ کی ۵ رباعیاں شامل نہیں ہیں) جو یقیناً خیام کی ہیں اور جنہیں ہم تاخذ کے حوالوں کے ساتھ نیچے نقل کر رہے ہیں، خیام کی فکر اس کے اسلوبِ ادا، رنگِ شاعری، اور طرزِ سخن کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ انہیں پڑھ کر ہم کلامِ خیام کی خصوصیات متعین کر کے ایک معیار یا کسوٹی بنا سکتے ہیں جس پر خیام کی طرف منسوب دوسری رباعیوں کو پرکھ سکتے ہیں۔

اس کلام کی سب سے نمایاں اور پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بے حد سادہ اور بے آرائش ہے، ہر قسم کے تکلف یا تصنع اور تزییناتِ شاعرانہ جاری اور مجموعی طور سے کہا جاسکتا ہے کہ ان 'قسمِ شاعری' ان میں سوائے وزن اور قافیہ کے کچھ بھی نہیں۔ تاہم فصاحت اور بلاغت میں اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے الفاظ اور معانی ایک ہو گئے ہیں۔ بہت کم الفاظ بھرتی کے طور سے استعمال ہوئے ہیں ایسے ہی بہت کم جگہ کسی لفظ کی کمی محسوس ہوتی ہے ابتذال یا ناقص انداز بیان کہیں نہیں۔ بس ہر جگہ ظاہر ہوتا ہے کہ کتنے والا الفاظ اور چرب زبانی ہند نہیں کرتا سیدھے سادے طریقے سے اصل بات کہہ دینا چاہتا ہے، امر و نواہات، بات بڑی دلچسپ و دقیق اور ہر دینے ہوتی ہے۔ پورے کلام میں کہیں ہر لہ انداز نہیں ملے گا کہیں کہیں بے حد نازک ظرافت ضرور ہے۔ اندازِ بیان نرمی لئے ہوئے ہے لیکن زمانہ پر نہیں۔

جہاں تک رباعیوں کے مضامین، سب کے سب ایک متعین حکیم اور منکر کا نتیجہ طبع معلوم دیتے ہیں۔ ایسا مفکر جو کائنات کا معرہ حل کرنے کی فکر میں ہے جو کوینِ عام، رازِ ابد و تقدیر انسانی کی کنہ تک پہنچنا چاہتا ہے، وہ رازِ جو موت چھپائے بیٹھی ہے وہ اسے زندگی ہی میں پا لینے کے لئے مضطرب ہے۔

مفکر انسانی زندگی کی ناپائیداری اور سامانِ جہاں کے بچے ہونے پر متاسف بھی ہے، متاثر بھی، جوانوں اور نازنینوں کی موت پر افسردہ ہے، حسن، نفاست اور پاکیزگی کے لئے وہ بڑا ذکی الحس ہے اور اس کے احساس میں شدت بھی ہلا کی ہے، وہ ان سب سے پر اثر کرتا ہے مگر جانتا ہے کہ ان کا وجود اور ساتھ ہی خود اس کا اپنا وجود، دوامی نہیں اس بات پر وہ اکثر جھنجھلا بھی اٹھتا ہے مگر بھرپوش کی دنیا میں آجاتا ہے اور کہتا ہے اتنی عمر بھی غنیمت جانتا چاہئے جسے سلیقہ سے گزار دیا جائے۔ ایک بار گئے تو پھر تو کبھی بھی ادھر کو آنا ہی نہیں ہے۔ تو بچنے کا وہ سلیقہ کیا ہے جس کے ذریعہ 'رخشِ عمر' کو جس کاغذ کاغذ پر ہے نہ پائے رکاب میں، رام کر کے سکون کی زندگی گزار جائے اور اطمینان کی موت آئے۔ اس کے لئے اس نے کچھ اصول بتائے:

ہمیشہ خوش رہو۔ کسی کے ساتھ بڑائی مت کرو۔ حرص و آرزو سے جہاں تک ہو سکے بچو۔ قناعت سیکھو جو اپنی جگہ پر بادشاہت ہے۔ دوسروں کے مقابلہ میں خود کو حقیر نہ کرو۔ کوتاہ نظروں کے انکار اور ان کی چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کو جو دنیاوی ہوں یا اخروی نیچا سمجھو۔ بلند ہمت کے ساتھ جیو۔

ماہ و جلال، حسن و جمال، قدرت و شوکت، غرور و تکبر، عیش و طلب یہ سب کے سب بے بنیاد اور ناپائیدار ہیں۔ سب مرجاتے ہیں اور خاک ہو جاتے ہیں اور پھر اسی خاک سے انہیں اور کوڑے بنتے ہیں۔ اور موت کے سامنے امیر و دروغریب بڑے ادا چھوٹے سب برابر ہیں۔ جب ایسا ہے تو دنیا سے دل کیوں لگاؤ اور کسی بھی جانے والی چیز پر غور کیوں کرو۔ سب ہند و حکمت، یہ سب جنت کی باتیں ان رباعیوں میں ہیں لیکن کسی بات پر نصیحت کی تلخی نہیں ہے سب کچھ لئے و معشوق اور ہرزہ و گل کے پیڑ میں کہا گیا ہے۔

ان باتوں کے علاوہ اس کے یہاں نہ درد و غم ہے نہ مفاد و معاشقہ، وہ نہ فراق پر روتا ہے نہ وصال سے خوش ہوتا ہے، نہ غنا کہتا ہے نہ مفات، نہ آہ و ناری کرتا ہے نہ عافانہ باتیں۔ وہ تو ہر وقت کائنات کے راز کی تہ تک پہنچنے کی فکر میں ہے۔ ہم کیوں آئے اور کیوں چلے جاتے ہیں؟ کوئی بھی حقیقت تک نہ پہنچ سکا اور اس شبہ تاریک سے ہارنا آسکا۔ سب افسانے کہتے رہے اور لوگوں کو سلاتے رہے اور بالآخر خود بھی پیشے کے لئے سوئے۔

اسے خیام کی فکر اور اس کے اسلوب کا خلاصہ۔ جس پر ہر دینس آج بھی کے ترجمہ سے مزید روشنی پڑتی ہے، کاش اصل رباعیاں بھی

شاید کردی جائیں۔

اب تک خیام کی جو تصویروں ہمارے سامنے پیش کی جاتی رہی ہیں وہ اصل خیام سرگز نہیں وہ نہ تو روبرو مست تھا نہ خرقہ پوش صوفی۔ زاہدین خشک نے اُسے صوفی بنا ڈالا اور زندوں نے بادہ خواہ۔ اور پھر اس کی رباعیوں کے ساتھ مختلف قسے تصنیف کر ڈالے یہاں تک ہوا کہ رباعیاں اور قسے ساتھ گھڑے گئے۔ یہ دو رباعیاں:

ابرین سے مرا شکستی ربی، بر من در عیش را بستی ربی  
من مے خورم و میکنی بدستی، خالم بدہن مگر تو مستی ربی  
ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو، آگس کہ گنہ ز کرد چوں زیست بگو  
من بدکنم و تو بد مکافات دہی، پس فرق میاں من و تو چیست بگو

اور اس کے ساتھ کی مشہور حکایت پڑھئے تو لطف آجائے گا اور لطف یہ ہے کہ خود وہ دونوں رباعیاں غریب خیام نے نہیں کہیں بلکہ کسی قدر دان کی عنایت ہے۔ وہ لوگ جو اُسے میخوار بد اعتقاد اور دہرے سمجھے انھوں نے اس کے اشعار کی اسپرٹ کو بروج کر ڈالا، خیام نے ایسے ہی گردہ کے متعلق کہا ہے:-

بایں دوسہ ناداں کہ چنین میدانند از جہل کہ دانائے جہاں ایشانند  
خیر باشش کہ این جماعت از فرط خمری ہر کو نہ خراست کا فرش میخوانند

خود خیام کے بزرگ معاصروں نے اسے بڑے احترام اور ادب سے یاد کیا ہے اور اسے امام اور حجت الحق جیسے القاب سے یاد کیا ہے۔ خیام تو محض ایک مفکر تھا، اسلامی علوم کی اصطلاح میں ایک حکیم جس کے کلام کی اصل اسپرٹ 'جستجو' ہے، 'میں کیا ہوں'، 'یہ سب کیا ہے'، 'میں کسی لئے پیدا ہوں'، 'کہاں ہوں'، 'بالآخر کہاں جاؤں گا؟' ان سوالات کے جواب سوچنے اور ان مسئلوں کو سمجھنے کی اپنی حد تک کوشش کی، 'نزع کے عالم میں خیام کی زبان پر جو الفاظ جاری تھے، جنہیں یہ سبق نے نقل کیا ہے وہ اگر سمجھ نہ بھی ہوں تو بھی خیام کی اصل اسپرٹ کو مکمل طور سے ظاہر کرتے ہیں:-

"ہر روز گوار! تو جانتا ہے کہ اپنے امکان بھر میں تجھے جانا ہے مجھے معاف کرنا کہ میں نے میری جستجو

ہی تیرے پاس آنے کا اور تجھ تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔"

خیام زندہ میخوار نہیں تھا لیکن وہ صوفی خانقاہ بھی نہ تھا۔ اسے دوسالہ اس کے یہاں یقیناً قرآن کے ہم معنی نہیں نہ محبوب چہارہ ہاتھ سے اس نے رسول اکرم کی ذات مراد ہی ہے لیکن شرب سے فروغ خاطر، مسرت و خوشی اور کسی قدر رواجی پابندوں کی شکست یقیناً مراد کی جاسکتی ہے اور خیام نے اسے اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ خیام کو اسی اسپرٹ میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

(خیام کے یہاں الحاقی کلام کے بارے میں مستشرقین کافی لکھ چکے ہیں۔ آخری کام خود مشرق والوں نے کیا سیر صاحب مرحوم کی 'خیام' اور فروغی ایڈیشن میں کافی اشارے مل جاتے ہیں۔ فروغی نے ایک خاص چیز کی طرف توجہ دلائی۔ کرشنن کے مقالہ میں عام طور سے ہر اس رباعی کو خیام کی ملکیت تسلیم کر رہے تھے جس میں خیام کا تخلص آیا ہو، فروغی نے متعدد ایسی رباعیاں پیش کیں جو جعلی تھیں اور جن میں خیام کا نام شامل تھا اس طرح یہ بات کوئی ضروری نہیں رہی کہ خیام کا نام جس رباعی میں ہو وہ لازماً خیام ہی کی ہو۔ خیام کے قدر دان اس معاملہ میں کافی ہوشیار رہے ہوں گے اور کسی رباعی کی سزا انتہائی ثقہ ٹھہرانے کے لئے ان کے پاس اس سے اچھی راہ کوئی نہ ہوگی کہ خیام کا تخلص رباعی میں ڈال دیا جائے۔ اور حکیم فیثا پور نے بہت ممکن ہے کہ کبھی بھی خود کو خیام نہ لکھا ہو اس لئے کہ یہ نام تو اس کے باپ ابراہیم کے نام کے ساتھ ملا لکھا جاتا تھا)

# یادِ پاستین

جنوری ۱۹۳۳ء

## حضرت جوش کا ایک خطِ علی آخر کے نام

اب سے بائیس سال پہلے کی بات ہے جب حضرت جوش ملیح آبادی اور علی اختر اختر دونوں حیدر آباد میں بہ سلسلہ ملازمت مقیم ہیں اور یہ زمانہ ان دونوں کی شاعری کے شباب کا ہے۔ میں بھی اتفاق سے اسی زمانہ میں وہاں پہنچتا ہوں اور ان دونوں کی شاعری کا تقابلی مطالعہ دسمبر ۱۹۱۳ء کے انگارے میں شائع کرتا ہوں۔ اس کو دیکھ کر حضرت جوش، علی اختر صاحب کو ایک خط لکھتے ہیں، جس کا مطالعہ آج بھی لطف سے خالی نہیں، کیونکہ اس وقت پھر جوش اور علی اختر کا اجتماع کراچی میں ہو گیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

”میرا لڑکے تم کن باتوں میں کھیل رہے ہو، ان باتوں کو تمہیں مس کرنے کا کوئی حق نہیں، یہ بات ناپاک ہیں، اچھے بچے، تم اس گود سے اتر آؤ، کھلائی بڑی علامہ ہے، تمہیں میری بڑی باتیں سکھا دے گی۔“ سنتا ہوں تم اس مضمون سے بہت خوش ہو، بہو ہوں نہیں سنا۔ اس مضمون کے کھولے کو تم نے لے پھرتے ہو، دیکھو ہمارا اچھا اچھا کھولنا، اتانے دیا ہے، اور کھیلے اکثر منہ میں بھی رکھ لیتے ہو۔ استفراشد۔ تم جانتے ہو یہ ساری جھل کو دس بات کی ہے؟ میاں آنکھیں کھولو، یہ تمہاری محبت نہیں، میری عداوت ہو جسے صبر علی سمجھ ہوئے ہو، وہ بعض صواب ہے، سمجھ؟ میری نفی سی جان! سمجھ؟

ارے یہ مضمون، یہ مضمون۔ تو یہ۔ لکھنے والے نے اتنا بھی انتظار نہیں کیا کہ جوش پر کیا ہوا قصہ قضا ٹھنڈا ہو جائے تو کھوں، ورنہ مضمون کی غایت ہی مفقود و معدوم ہو جائے گی، کیا اہل دنیا اتنے آٹو کے پیچے ہیں کہ اس مضمون کی روح تک ان کی آن میں نہ پہنچ جائیں گے، اور کان کڑے کر کے رسواں نہ کر سگے کہ دوپٹے کو کس نے چھڑ دیا ہے کہ قصہ میں چین مار رہا ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ اس مضمون میں عناد کی آگ بھڑکی ہوئی ہے، سطر پر قصہ سے اگڑی نظر آ رہی ہیں، الفاظ کا منہ نہ تھکا ہوا ہے، دائیہ کھت دروہاں ہیں، اور کشیش با رفیظ سے ڈھری ہوئی چلی جاتی ہیں۔

اس مضمون کی علت یہ ہے کہ (۱) اس خط پر کہ میں صاحب مضمون کو حقیر و فرومایہ سمجھتا ہوں، مجھے نظروں سے گرا دیا جائے (۲) میری اور تمہاری جدائی ہو جائے، یہ دوسری مرثیہ تمہاری سمجھ میں نہ آئے، اس لئے کہ تم اس بے پایاں خبیثت کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ بعض لوگوں کو وہ دوستوں میں نفاق ڈال دینے سے مڑا آتا ہے۔

میاں اختر، تم جانتے ہو میں تمہارا ہمیشہ سے راج رہا ہوں، میں تمہارے شاعرانہ جوہروں کا دل سے قدر داں ہوں اور ہمیشہ رہوں گا، میں تمہارا ہوں، تم میرے ہوں۔ اچھے بچے! یہ تحریر جا کو صاحب مضمون کے منہ پر مار کر جوش کی یہ تحریر ہے وہ مجھ سے جدا نہیں ہو سکتا، ہم اتنے ٹوٹے نہیں کہ ایک کو ایک پر ترجیح دینے سے ہم قوت نہیں دے سکتے، ہپ ہپ ہو کر نہ لگیں۔ شاعری ان اہل بازیوں سے بہت بلند ہے، اگر شاعری کسی کو لے کر اڑ رہی ہے تو کوئی قوت اسے گرا نہیں سکتی، چار چکنا رہتا ہے، گتے سمجھ لگتے رہتے ہیں، البتہ اگر کسی کی شاعری ہی گزور ہے تو تمام دنیا کی تھوئیاں اس کے لئے بیکار رہیں، اسے گرنے سے کوئی بچا نہیں سکتا صاحبزادے، تمہیں مجھے کوئی چھین نہیں سکتا، میں کہیں تمہارا مقابلہ نہیں کروں گا، خاک کھاؤں، دھول کھاؤں، کیا بھانجے کو کھاجاؤ

کیا میں اس دوسرے بھی کہا کرتا ہوں

”نیاز مند جو شے“ ”نا بھڑ“ ”دوم“

اوسے ہنسی کے مارے دم نکلا جاتا ہے۔ ”نا بھڑ“ ”نا بھڑ“ ”اٹ کوئی گر گرائے ڈالتا ہے“ اوسے مارا مارا، یہ بطنی آواز کہاں سے آ رہی ہے، دیکھو کوئی انصاف تو جان بچ کر تسلیم نہیں ہو رہا ہے۔“

اپریل ۱۹۲۹ء - اشتراکیت کیا چیز ہے، اس کی تاریخی قدامت کیا ہے اور یہ کہ ہندوستان یا کسی اور متمدن ملک میں اس کا رواج مناسب ہے یا نہیں، بنگال کی اولین اشاعت میں، اس موضوع پر میں نے روشنی ڈالی تھی، اور اس وقت بھی بحالات موجودہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس یاد کو تازہ کیا جائے۔ کمیونزم (COMMUNISM) جسے سوشلزم (SOCIALISM) بھی کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ اشتراکیت کیا جاتا ہے، اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے نہایت دلکش چیز معلوم ہوتی ہے کیونکہ تمام افراد انسانی کا ہر چیز میں شریک رہنا فطرت کے تمام انعامات سے یکساں طور پر فائدہ اٹھانا، جو منہ ہوم اشتراکیت کا ہے ایک ایسا دلچسپ مطالبہ ہے کہ کوئی شخص جو انسانیت اخوت کاہ اور امن عام کی حکومت دیکھنا چاہتا ہے وہ بغیر ایک لمحہ تامل کے ہوئے اس مطالبہ کے استخوان پر فتویٰ دیدے گا لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے یعنی جس حد تک اشتراکیت کے قابل عمل و نافذ پذیر ہونے کا واسطہ ہے، یہ مطالبہ اس قدر آسان و خوشنما نہیں اور زمانہ قدیم سے لے کر اس وقت تک جب کبھی اشتراکیت کا جذبہ دنیا میں پیدا ہوا ہمیشہ اس کی مخالفت کی گئی اور کبھی اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔

اشتراکیت کی دو قسمیں ہیں: ایک ”اشتراکیت محض“ دوسرے ”اشتراکیت تعاون“ اول الذکر سے مراد یہ ہے کہ تمام افراد انسانی متعلق عالم میں برابر کے شریک ہو جائیں اور دوسرے سے مقصود یہ ہے کہ افراد انسانی تقسیم عمل کے تحت خدمات انجام دیں اور نفع میں سب کا حصہ برابر ہو۔ الغرض اس کا نصب العین یہ ہے کہ جمہور کی مدد سے افراد انسانی کی عام حالت درست کی جائے۔

اشتراکیت دنیا کا کوئی نیا خیال نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اس کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جب سے طوکیٹ یا قسط کی بنیاد پڑی اور ہمیشہ یہی ہوا کہ جب اصحاب دولت یا سرمایہ داروں نے غریبوں پر ظلم شروع کیا، اشتراکی خیالات دنیا میں رونما ہونے لگے۔

یونان قدیم میں فالٹا اس کا اشتراکیت کو رواج دینا جس کے ذریعہ سے وہ تعلیم و معاشرت میں امیر و غریب دونوں کو دوش بروش چلاتا چاہتا تھا، تاریخ کا کھلا ہوا واقعہ ہے اور افلاطون کا یونانی جمہوریت کو ترتیب دینا جس میں زمین، عورت اور غلام کو مشترک ملکیت قرار دیا گیا تھا، اہل عالم پر واضح ہے۔

قبل مسیح دوسری صدی میں اسرائیلیوں کی ایک جماعت جو فرقہ اسینیہ (ESSEMES) کے نام سے موسوم تھی بحسب مردہ (DEAD SEA) کے ساحل پر آباد تھی، ان کے ہاں بھی سب لوگ مال میں شریک تھے یہاں تک کہ عورت کو بھی مال ہی سمجھا جاتا تھا اور وہ بھی شریک چیز بھی جاتی تھی۔ یہی حال ایک مسیحی جماعت کو کرکراٹیا کا تھا جو چھٹی صدی عیسوی میں معدوم ہو گئی، ہالینڈ میں بھی متعدد جماعتیں اشتراکی اصول پر قائم ہوئیں جن میں سے بہت زیادہ شہرت اس جماعت کو حاصل ہوئی جسے جزار گروت نے ۱۵۳۰ء میں قائم کیا تھا، دوسری صدی عیسوی میں ایک گروہ اوٹاٹا نمودار ہوا جو راستوں پر برہمن پھرتا تھا اور عورت پر اس کے مشترکہ حقوق قائم تھے۔

جزمی کے عہد اصلاح میں کاشتکاروں نے زمینداروں کو مجبور کیا کہ زمین میں انھیں برابر کا حصہ دیں، جس پر سخت غور و خوض ہوا اور انھوں نے جو ”جنگ مزاحمت“ کے نام سے مشہور ہے۔ ایسے واقعات بھی تاریخ میں ملتے ہیں کہ کبھی جماعتوں نے مالداروں پر زور ڈالا کہ وہ اپنی دولت فقرا پر برابر تقسیم کر دیں۔

الغرض ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اشتراکی خیالات پیدا ہوئے، دولت و حکومت نے ان کا مقابلہ کیا اور اس تصادم نے دنیا میں بہت کچھ اضطراب پیدا کیا۔ اشتراکی اصول پر عہدِ وسطیٰ میں متعدد دکتا میں بھی لکھی گئیں جن میں سب سے زیادہ مشہور کتاب سارنوفس مور کی ہے جو

۱۹۱۵ء میں طبع ہوئی تھی۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ متمدن دنیا میں اشتراکی جماعت کی تعداد ہمیشہ بڑھتی ہی گئی اور حکومت اس کو فنا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ فرانس میں بھی زمانہ قدیم میں اصول اشتراکیت قائم ہوئے۔ اور باپون نے تو نظام حکومت آٹ ویسے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن اس کے متبعین میں اختلاف پیدا ہو گیا اور یہ تحریک خود فنا ہو گئی۔

اٹھارویں صدی میں سان سیمون فرانسسی نے ایک نیا مذہب نکالا جسے وہ نصرانیت جدید کہتا تھا اور اپنے اصول مشترکہ کے ذریعہ سے وہ عقاید مذہب و سیاست کی اصلاح کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی عمر نے وفات کی اور اس کے تلامذہ میں باہم اختلافات پیدا ہو جانے کی وجہ سے حکومت نے اس انتشار سے فائدہ اٹھا لیا اور ان کی قوت کو فنا کر دیا۔ اس کے بعد شارل فوریر (۱۷۹۷ء - ۱۸۴۷ء) کا ظہور ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ ہیئت اجتماعی کی براداری اور تعاون پر جس زمانہ میں فوریر اور اس کے مقلدین ہیئت اجتماعی کی اصلاح کرنا چاہتے تھے ایک اور شخص کوئی بلان نے اس امر پر زور دیا کہ حکومت تعین عمل اور تقسیم اجرت کو اپنے ہاتھ میں لے، چنانچہ حکومت کی طرف سے اجرت پر مزدور رکھے گئے، مگر کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔ اور ملک میں صرف اشتراکی بغاوت پیدا ہو کر رہ گئی۔ برودان (۱۸۰۹ء - ۱۸۶۵ء) کا دستور العمل کوئی کے خلاف تھا، وہ کہتا تھا کہ حکومت کو وضع قوانین کا اختیار نہیں ہے۔ انگلستان میں رابرٹ اوپن (۱۷۸۱ء - ۱۸۵۵ء) نے اشتراکی خیالات کی اشاعت شروع کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ اس کے بعد بہت سی اشتراکی جماعتیں قائم ہوئیں جن کی تعداد ۱۳۰۸ تک پہنچتی ہے ان میں سب سے زیادہ کامیاب آئسن رائڈیل تھی۔ اس نے اسباب تجارت کا ایک عام و مشترک ذخیرہ فراہم کیا تھا، چند سال کے عرصہ میں اس نے غیر معمولی ترقی کر لی اور ہر قسم کی تجارت اس کے ہاتھ میں آگئی مگر نتیجہ کے لحاظ سے یہ بھی بد قسمت ثابت ہوئی اور حکومت نے اس کو بھی فنا کر کے چھوڑا۔

اس وقت یورپ امریکہ اور ایشیا میں بہت سی اشتراکی انجمنیں پائی جاتی ہیں اور اکثر "اشتراکیت تعاون" کے اصول پر قائم ہیں لیکن سب سے زیادہ کامیابی روس میں ہوئی اور اسی کی کامیابی نے روسی زمین میں پھر از سر نو اشتراکیت کے جراثیم پیدا کر دیے ہیں اور روز بروز ان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ چین کا موجودہ انقلاب اسی کا نتیجہ سمجھا جائے گا اور ہندوستان میں ایسی جماعتوں یا انجمنوں کا قائم ہونا بھی اسی کا پر تو ہے۔

اگست ۱۹۲۹ء۔ اوائل عمر اور زمانہ طالب علمی میں، جس لکھنؤ کو میں نے دیکھا وہ موجودہ لکھنؤ سے بہت مختلف تھا۔ مولوی صدیقی حسن غازی پوری میرے تالیق ہر وقت میرے ساتھ رہتے تھے اور ہر چیز پر اپنے حلقہ احباب میں بہت رنگین مزاج مشہور تھے، مگر میرے لئے وہ ایک مستقل بے آب و رنگ چیز تھے اور میری حالت ایک طائر پر بند سے زیادہ نہ تھی۔ اس لئے اگر کسی دن مجھ کو آزادی نصیب ہو جاتی تھی تو میں لکھنؤ کو حدود جہ حریص نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اس قلیل فرصت کو نسا کی مطالعہ سے نہیں بلکہ زیادہ تر صرف قیاس و خیال سے کام لے کر رنگین بنانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اب بھی مجھے وہ نامعلوم سی کشش یاد ہے جو یہاں کی درو دیوار میں محسوس کرتا تھا اور ہنوز اس محبت کی لذت میرے دل سے محو نہیں ہوئی جو یہاں کی فضا سے پیدا ہوئی تھی اور اس کو میری لکھنؤی زندگی کا دور اولیں سمجھنا چاہئے۔

میری عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ تیرہ چودہ سال کی ہو گئی، فارسی ادبیات ختم کر چکا تھا، اور عربی کے درس نظامی کے نشا و کش مشغلہ کے باوجود ابھی تک عربی و فلسفہ، غالب و بیتل میرے دل و دماغ پر مستولی تھے۔ میرے والد اُس وقت دولت گنج کے تھانہ میں انتظامیہ تھے اور چونکہ خود فارسی کے اچھے ادیب شاعر تھے اور اپنے اخلاق و خصایص کی وجہ سے نہایت ہی دلچسپ و ہر عنصر نے انسان تھے اس لئے صبح و شام ایک اچھی خاصی مجلس شعراء اہل و نظافا کی برپا ہو جاتی تھی۔

الفرض وہ ماحول جو اوائل عمر میں یہاں پیدا ہو گیا تھا وہ میرے احساسات کے لحاظ سے ایسا پر لطف تھا کہ ہر وقت میرے دماغ پر نشہ سا چھایا رہتا تھا اور لکھنؤ کی ساری فضا ایک خاص کیفیت میں ڈوبی ہوئی نظر آتی تھی۔

دن گزرتے گئے اور رفتہ رفتہ میری عمر کے ساتھ پابندیاں بھی کم ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ آیا جب مجھے بہت زیادہ آزادی ملی یہی وہ تیسرے دور تھا جس نے مجھے بتایا کہ زندگی کسے کہتے ہیں، شاعری کا غلاف کیا ہے اور بہت سے شاعرانہ الفاظ و ترکیب کا صحیح مفہوم ہو سکتا ہے۔

اس سے قبل فارسی ادبیات اور اردو شاعری کا جو مطالعہ میں نے کیا تھا، وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی مرنے والی چیز کا درس صرف سہ کے ذریعہ سے دیا جائے۔ لیکن اب مجھے اجازت تھی کہ دیکھنے کی چیزوں کو دیکھوں، سننے کی باتوں کو سنوں، اور جو اشیا و چھوٹے سائے وضع ہوں انہیں چھوڑوں۔ اس سے قبل میں غالب کی ایک مثنوی کا یہ شعر پڑھ چکا تھا

جلوہ گرے آفتِ نظر اے برقِ زمشال وے انکار

لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرا استاد باوجود کوشش بلینے کے مجھے کسی نہ سمجھا سکا کہ جلوہ گری کا صحیح مفہوم کیا ہے اور ”آفتِ نظر“ کا نوع کا معاشوب جیشم ہے لیکن اب از خود نہ صرف اس کی حقیقت مجھ پر واضح ہو رہی تھی بلکہ

”قامتِ قامتوں مژگاں درازاں“

اور ”زہرہ راندہ رداے نور مژگیاں دیام“

نشہ آور تجربات سے گزر رہا تھا۔

الغرض لکھنؤ کے مطالعہ اولین کا آخری منظر جس طرح ختم ہوا وہ تو ایک ایسی چیز تھا جو ہر حال و صورت میں دعوتِ برگ و نوائے کسند

اس لئے جب میں یہاں سے جدا ہوا تو میری حالت ایسی تھی جیسے ساون میں کسی کی بینائی زایل ہو جائے، میں نے لکھنؤ کو اپنی عمر کے خوشگوار موسم میں اول اول دیکھا ہے۔

”زموچ گل بہاراں بستہ زنار“

چاہئے اور اس کا تعلق بالکل خود فراموشانہ اور اس لئے غیر ذمہ دارانہ زندگی سے تھا۔ اس کے بعد بھی بارہا لکھنؤ آنے کا اتفاق ہوا لیکن مسافرنہ یا کبھی کبھی کسی خاص ضرورت سے مجبورانہ، جس کو شاعری یا شاعرانہ احساس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس مرتبہ جب میں نے لکھا یہاں قیام کا ارادہ کیا تو حالات زندگی بالکل بدل چکے تھے، حیات کی مشکلات اور عاقلانہ ذمہ داریوں نے مقول غالب:

”زوشواری زیستن مردہ“

تھا تھا ورنہ وہ فراغتِ خیال تھی، نہ آسودگیِ حال، نہ وہ جوشِ نشاط تھا، نہ وہ سن و سال، ”فکرِ فضول“ کی جگہ ”غور و تامل“ نے تہِ روانہ کی جگہ ”احتیاط و فکرانہ“ نے لی تھی اور خیالات کے شیریں عالم سے ہٹ کر واقعات کی تلخ دنیا میں آگیا تھا۔ بہر حال تیسرے دور کے عہد گزشتہ کی یاد تازہ کرنے کے لئے تھا اور نہ اس کا اتم کرنے کے لئے، بلکہ بجائے تماشائی کے، یہاں کی آبادی میں ہو کر خود تماشہ بننے کے لئے۔

## فلسفہ مذہب

مولوی مقبول احمد صاحب کی وہ چنگامہ خیز تصنیف جس نے علماء اسلام کی ”کافر ساز“ مجالس میں ٹپل ڈال دی تھی اس میں مذہب کی ابتدا مفہوریت، قومیت، قومیت و اہلیات، مذہب و نبوت، مذہب و تکوین، مذہب و معاد، مذہب و تقرر، مذہب و اخلاق، مذہب و عبادات اور مذہب پر نہایت محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت دو روپیہ

منجھنگار لکھنؤ

# بھوپال کی فضا کی شاعری کا ایک نظم و خشاں

## اختر بھوپالی

بھوپال کے موجودہ فوجی شہر کی فہرست کافی طویل ہے اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ ان میں بہت کم ایسے ہیں جن کا کلام قابل توجہ نہ ہو، لیکن جدید رجحانات اور زندگی کے نئے اقدار کے احساس کے ساتھ حسن تغزل اور دلہانہ لب و لہجہ کے لحاظ سے اس سب میں اختر (اختر سعید خاں) کو جو خصوصیت حاصل ہے وہ کافی تفصیل کی محتاج ہے، فی الحال اس اجمال کے ساتھ ہی ان کا کلام ملاحظہ فرمائیے

(نیاز)

کانٹوں کی خلتش سے ہر خطہ بیہوش کی طلب بڑھتی ہی گئی  
ہر شاخ پہ کانٹے تھے مگر ان ہر موڑ پہ پتھریں تھے لیکن  
کچھ سوچ کے ہم نے کشتی کو گرداب کی جانب موڑا ہے  
اسے مطرؔ امروز سناٹا عسرتِ فردا کا نمبر  
کل اس کی گلی میں اختر کو برگشتہ وحیراں دیکھ لیا  
جب بھی ہم تجھ سے نہ ملے کی قسم کھاتے ہیں  
اے دلِ منتظرِ یار تجھے کیا معلوم  
اب نہ دیکھے گا ہمیں طعنہ کفر و الحاد  
سچی دنا اتنی بھی کہا رائیگاں  
فون دل و برق نظر الاماں  
یوں تو اندھیرا بھی قیامت کا ہے  
ذوقِ طلب اور زرا چند کام  
رو حیات میں جب تیری رہنمائی آئی  
اب آگے قافلہ زینت کون روکے گا  
غم حیات نے فرصت زرا نہ دی لیکن  
رموز عشق سے میں بے خبر نہیں مگر یہ کیا  
خوشبو پہلے گلشن گلشن دور رہے دیرانوں سے  
جانے نہ جانے اس کو میریں مانے نہ مانے شیخِ جرم

صو سے گزر کر دیوانہ نزدیک گلستاں آہی گیا  
کلیوں نے چٹکنا سیکھ لیا پھولوں کو ہلکا آہی گیا  
کیا غم جو کنارہ چھوٹ گیا کیا فکر جو طوفان آہی گیا  
غم دل کا پرانا ساتھی ہے دل غم سے مگر اکٹا ہی گیا  
کس درجہ خرد پر ملازاں تھا صد شکر کہ ٹھوکر کھا ہی گیا  
اور بھی کچھ ترے نزدیک نظر آتے ہیں  
وہ سلاتے بھی ہیں جو نیند اڑا جاتے ہیں  
لیجے ہم آپ پر ایمان لئے آتے ہیں  
دوست ہے دشمن سے سوا ہنگام  
آگ لگی اور نہ آٹھا دھواں  
ہاں مگر رات کی تنہائیاں  
اور ہے کچھ فاصلہ درمیاں  
زمین تھی مگر اک آسماں نظر آئی  
اجل کی راہ سے بھی زندگی گزر آئی  
تمہاری یاد جو آتی تھی عمر بھر آئی  
تمہارا نام سنا اور آنکھ بھڑو آئی  
سوج بہاراں چھڑا اچھی دیکھ نہیں دیاںوں سے  
کہے کہ جو راہ گئی ہے گزری ہے بتانوں سے

درد جھیلے مسکرا کر زخم ہنسکر کھائے ہے  
ہر ارادہ لڑکھڑائے ہر قدم تھرائے ہے  
اسے نگاہِ یار کہہ لینے دے تجھ کو دل کی بات  
دیکھ پورے ہوں کب تک میرے اراؤں کے خواب  
دیدنی ہے اسے وفا دشمن ہماری سادگی  
فیصلہ اس کا نہیں ہوتا ہے راہِ شوق میں  
کار و بار زمیست میں دل سے تعلق ہونہ ہو  
کہیں ایسا نہ ہو تم نے مجھے دل سے بھلایا ہو  
یہ کس امید پر اٹھ آئے تھے ہم ان کی محفل سے  
جو تیرے لطف سے روشن ہوا تھا دل میں شہر  
چھو کر اس زلف کو آتا ہے جو کوئی جھوٹکا  
کون جانے دل وحشی پہ گزرتی کیا ہے  
وہ بھی ہوتا ہے ہمیں سا کوئی مجبور حیات  
جس کو دیوانہ بتاتے ہیں گلستان والے

کوئی ربط باہمی ہو کہ نہ ہو مگر یہ سچ ہے  
یہی ماحصل ہے شاید مری داستانِ غم کا  
اسی نسبت سے سحر نکھری ہوئی آئے گی  
بھمنیوان چین مل کے پکاریں تو زرا  
زمانہ منتظر چشمِ افقبات رہے  
کہیں نے مجھے لیکن پیامِ صبح لے  
روِ طلب میں ہمیں کوئی ہمسفر نہ ملا  
جھلے پیہم نے اہل دل کو وفا سے بیزار کر دیا ہے

کبھی دل جو یاد آیا مجھے تم بھی یاد آئے  
کہیں ہنس دیا زمانہ کہیں آپ مسکرائے  
جس قدر رات یہ بیاہ پہ بھاری ہوگی  
یہیں خواہید کہیں بادِ بہاری ہوگی  
ہم اٹھ بھی آئے ترے در سے جھاڑو کا من  
فراز دار سے دیکھوں سحر کی پہلی کرن  
بس ایک دل جو کبھی دوست ہے کبھی دشمن  
اگر تمہیں کھیلنا تھا دل سے کبھی ہنسائے بھی رلاتے

## رعایتی اعلان

میری وزوں - مذہبی استغاثات و جوابات - جاہلستان - بھارتی زبان - شہوانیات - مکتوبات نیازتین حصے - اعتقادات - مالہ و اعلیہ  
میں کی مہاروں - شہاب کی سرگزشت - فلاسفہ قدیم - مذاکرہ نیاز - فرات الہید - نقاب اٹھ جانے کے بعد - میزان  
تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کر کے پڑھ کر حاصل کرنے چاہئیں روپے میں مل سکتی ہیں - فیبرنگار - لکھنؤ

## ”اہل فردوس سے“

(فضا ابن فضی)

تھی کہیں جو پائے گا ہر امن  
لیکن اس فردوس میں رکھا ہو کیا  
چند حوروں کی جوانی کا کھنکھ  
طوبی و تسخیم، خار و سبیل  
اس سے آگے نہ گزرتا ہو  
زکمر نوشا نوش صہبائے طہور  
خشک سہی یکسانیت بہر و پیر  
نہ نفس میں ہوئے اسرار و حکم  
عشق کے سوزِ فیرہ کا مقام  
نہ سیاست کا شعور بے پناہ  
حاصل عسر و آس  
ایک نم خورہ شراب و شوق  
مرگِ دل، مرگِ نظر، مرگِ جنوں  
حاصل افسردہ گہائے حیات  
کیا نہیں اس راز سے آگاہ تو  
دیر سے فطرت کے آئینے میں ہے  
ہاں ہرے سوزِ نفس کے فیض سے  
دور تیری جنت بوسیدہ سے  
دیکھ! اے فردوس کے مارے ہوئے  
ذرہ ذرہ ہے مری اس خاک کا  
یہ چراغِ خندہ گل کی بہار  
یہ جمالِ زرگسب رنگیں نظر  
رات کی ڈالی میں تاروں کے پھول  
یہ فسوں تاشیریٰ عسلم و ہنر  
یہ تمدن کی ہوائے شعلہ کار  
آئندہ میں جمعیت، خاطر کا امن

کیا وہی فردوس ہے تیرا وطن  
جز نبیند کوثر و نہس و بین  
چند علمائوں کے جموں کی چین  
زندگی کے چند عنوانِ حسن  
زندگانیِ خستہ و افسردہ تن  
بے سرو و لنگہ شعرو سخن  
بے طرب حسن تنوع کا چین  
نہ نظریں شوخی تہذیب و فن  
ما تم ذوقِ نظم کی انجمن  
نہ تمدن کا کیشلا بانگین  
شعلہ سہی مسلسل کا کفن  
آئندہ میں آئندہ آندہ میں جلن  
مرگِ عشق و مرگِ فکر و مرگِ فن  
ہائے یہ تیری بہا ہے چین  
اے شہید کوثر و نہر بین  
میرا حسن زندگی پر تو لگن  
جل رہی ہے تیری شمع انجمن  
ایک میں نے بھی بنایا ہے چین  
سے عروس رنگ و بو میرا وطن  
کار کا گاہِ نشتین و نشتین  
پر تو کشمیر ہے خاکِ وطن  
یہ فروغِ لالہ رنگیں بری  
سج کے آنچل میں سورج کی کرن  
یہ کرشمہ کوئی تہذیب و فن  
یہ سیاست کی بساطِ عقل و فن  
اضرابِ شوقِ دل میں موجزن

ان لٹاکٹھ اے رنگارنگ سے  
کتنے فردوس بریں کا عطر ہے  
اور وہ ماحولِ افسردہ ترا  
جیسے چھپ جائے خزاں کی گردیں  
تیری دنیا میں فقط یزداں کی دشت  
تو بلاک لذتِ شرب و طعام  
تیری دنیا میں کاوشِ نعم و غلہ  
انجمنِ تیری دنیا میں سیم و بزم  
میرا حسن دنیا میں تاج  
تیری دنیا میں تاج  
میری دنیا میں تاج  
رشتہ تیری دنیا میں تاج  
شہید کوثر و نہر بین  
نہ سیاست کا کیشلا بانگین  
شعلہ سہی مسلسل کا کفن  
آئندہ میں آئندہ آندہ میں جلن  
مرگِ عشق و مرگِ فکر و مرگِ فن  
ہائے یہ تیری بہا ہے چین  
اے شہید کوثر و نہر بین  
میرا حسن زندگی پر تو لگن  
جل رہی ہے تیری شمع انجمن  
ایک میں نے بھی بنایا ہے چین  
سے عروس رنگ و بو میرا وطن  
کار کا گاہِ نشتین و نشتین  
پر تو کشمیر ہے خاکِ وطن  
یہ فروغِ لالہ رنگیں بری  
سج کے آنچل میں سورج کی کرن  
یہ کرشمہ کوئی تہذیب و فن  
یہ سیاست کی بساطِ عقل و فن  
اضرابِ شوقِ دل میں موجزن

کیوں تھی دامن ہے تیری انجمن؟  
دیکھ تو میرے جہاں کا بانگین  
جیسے گل ہو جائے شمع انجمن  
کار و ابن لالہ و سرو و سمن  
میری دنیا میں خدا و اہرمن  
میں شہید غزہ و دار و رسن  
میری دنیا میں ضروتِ خیر و شکر  
میری دنیا میں خلیل و بت شکن  
خلوتِ فردوس تیری انجمن  
میرے مرنم میں بھی زخموں کی جلن  
تیری صحوں پر اندھیرے غزہ و دن  
ہر نگہ میری تماشا پیر من  
حد تری پرواز کی صحن چین  
میری دنیا میں حریفِ جان و تن  
تیری دنیا کوثر و نہر بین  
بجھ کو تن کو شہی ہے خار پیر من  
میری پاکیزہ امیدوں کا چین  
تیرے عیشِ تازہ و پیکر کی کرن  
میں نقیص ہوں اور تو تخمین و فن  
وہ انجمن ہے یا عروسی پیر من  
تاج کے بے شمع تیری انجمن  
اپنی مستی کو بنا جینا شکن  
موج دریا بن، سر ہٹاں نہ بن  
آ سوزے شہر نگار آب و گل  
چھوڑ دے میری طرح تو بھی وطن

## کبریائی

(ساقی جاوید - بی - اے)

تو اے تری صنعت ارض و جنت نامرصمتوں کے ٹیڑوں پہ قائم  
 گاہ یہ تیرا رنگ خانہ ہمیشہ زمیں پر اک آتش کردہ بن کے دہکا  
 ازل کے کہن سال ماہر شکاری تیرے تیر کا آدمی ہے نشانہ  
 تیرے بندگان وفا آشنا کی عرق ریزوں کا یہ شاید صلہ ہے  
 ستارے ہیں تیرے گمراہ ستارے کسی شبکہ سے کے دئے بھی نہیں ہیں  
 کبھی دیکھ اپنے کسی گلستاں کو نظر ڈال اپنی کسی انجمن پر  
 ادھر گڑا گڑا تے رہے تیرے بندے ادھر سکراتی رہی کبریائی  
 کم از کم یہی راز ہم کو بتا دے یہ دنیا تیرے بس میں ہے یا نہیں ہے  
 چمکتے ہیں زریں کلاہوں پتارے یہ تارے بھی تجھ سے نہیں ٹوٹ سکتے  
 یہ شاہی خزانے غریبوں میں کیا تو برابر برابر نہیں بانٹ سکتا  
 تیرے پاس لئے سوائے ماہ و انجم، مہ و نجم کی اک کرن بھی نہیں ہے  
 چمکتے ہیں جاگڑیں اور تارے ہمیں ایسی اختر شکاری سے حاصل ؟  
 ہم اہل محبت کو کیا تو نے بخشا، خزانے میں کیا تیرے کچھ بھی نہیں ہے  
 قری کیا خدائی کہ اک لمحہ شادمانی نہیں بخش سکتا کسی کو  
 کم از کم یہی ایک مشکل ہماری خداوند مطلق تو آسان کردے  
 نزول کرم کو اگر مان بھی لیں تو پھر یہ بتا اس کا معیار کیا ہے ؟  
 جو دامن تیرے ہاتھ میں آگیا ہے اسی میں گہر ٹانکتا جا رہا ہے ؟  
 تری غمے سلطوت فوازی کے قربان تری غمے سلطوت فوازی نے مارا  
 تیرا اہل مسلم مگر اس کی عظمت اجدادوں سے بڑھ کر نہ دھروں یہ قائم  
 تیرے غلگدے کا ہر اک نقش جھلکا تیرے گستاخان کا ہر اک پھول ہلکا  
 ہر اک ابی آدم قاتل عبادت ہر اک ہنست عذر شہید زانہ  
 تیرے آستان پر چینیں جھلکا کر تری بارگہ سے ہمیں غم ملا ہے  
 بہاریں ہیں تیری مگر یہ بہاریں گل و سمن کیلئے بھی نہیں ہیں  
 یہی ہے ترافن تو پھر اسے مصورتجھے ناز اتنا ہے کیوں اپنے فن پر  
 تجھے معبودوں میں پوج کر پکارا مگر کوئی آواز اب تک نہ آئی  
 ہم انسان تسلیم کر رہی چلے ہیں یہ تیرا فلک ہے یہ تیری زمیں ہے  
 مگر تو ہے قادر تو پھر اسے خدا یہ منارے بھی تجھ سے نہیں ٹوٹ سکتے  
 نزل کے خدا بلا سے کیا تو بچہ ایسے قوانین ہستی نہیں چھانٹ سکتا  
 کسی نوع و جنس کے لئے کیا تیرے پاس اک پیر میں جو نہیں ہے  
 یہ مانا اطاعت تری فرض لیکن بتا اس اطاعت گزار کی کوئی مثال  
 شادوں کے مالک بہادوں کے آقا خزانے میں کیا تیرے کچھ بھی نہیں ہے  
 غضب ہے کہ اک جبر بادۂ ارغوانی نہیں بخش سکتا کسی کو  
 نظام جہاں تیرے بس میں نہیں ہے تو مجبوریوں کا ہی اعلان کر دے  
 چراغ یقین کے عطا کرنے والے تری یہ مشیت کی دیوار کیا ہے ؟  
 اک اندھے کی لامٹی ہے تیری خدائی ازل سے بونہی مانکتا جا رہا تو  
 معابد معابد مساجد مساجد ترا ڈھونڈتے پھر رہے ہیں سہارا

ہا عظمت کبریائی بجا اب ترار از سر بستہ کھٹنے لگا ہے

ازل کے مصورترا مسئلہ بھی خرو کی ترازو میں تنے لگا ہے

## (مانی جایی)

یاس میں آج تمناؤں کو رو بیٹھا میں  
دل گئی کش مکش ساحلِ دریا سے نجات  
تم کو جس راہ پہ چلنا ہے وہ اب صاف بھی ہے  
روزِ دنیاے محبت میں یہی ہوتا ہے  
راہ پر خار ہے، میں آبدار ہوں مانی  
اعتبارِ المِ عشق ہی کھو بیٹھا میں  
بیچ منہ حار میں کشتی کو ڈوب بیٹھا میں  
راستہ چھوڑ کے اک سمت کو رو بیٹھا میں  
بات ہی کیا ہے تمنا کو جو رو بیٹھا میں  
غم منزل سے تو اب ہاتھ ہی دھو بیٹھا میں

## (حیات لکھنوی)

کہا یہ قسمتِ ناکام نے کہ آئے ہم،  
جہاں غم سے یہ ذوقِ بلا ہے دادِ طلب  
وہ آج عشقِ ستم پر ہوئے ہیں آمادہ  
تمام عمر کا رونا بھی یاد آ ہی گیا  
بیاں ہو کیسے بھرے مجمعِ قیامت میں  
کبھی جو حرفِ تمنا زباں پہ لائے ہم  
جگر پہ زخم لگے اور مسکرائے ہم  
زہے نصیب کہ پھر ان کو یاد آئے ہم  
کبھی جو بھول کے دم بھر کو مسکرائے ہم  
وہ رازِ دل جسے خلوت میں کہہ نہ پائے ہم

## (سیفِ حسن پوری)

بڑھ چال ہیں غمِ ہستی سے تیرے دیوانے  
ستمِ شعارِ استم سے ترے نجات کہال  
بہت طویل سہی، رہ گزارِ عشق لے دوست!  
بیکارِ ناز! نہ دے شوق کا پیام ابھی  
قریبِ رستم و فاطمہ جہاں میں عام ابھی  
مشاہد ہیں جہاں سے جنوں کا نام ابھی!

## (عبداللہ خاوری، لے)

یہ کائنات ہے جذبِ کوشش کے دم سے مگر  
خیال و قلب و نظر، ہو گئے۔ غبارِ آلود  
گزر رہے ہیں مہ و سال تیز گامی سے  
ہر اک فسانہ کا ہے حاصل یہی خاورد  
نصیبِ مذبذبِ کوشش۔ بخود ہی در سوائی  
یہ سوچنا ہوں نسیم بہار۔ کیا لائی۔!  
نہ جانے کون سی منزلِ قریب تر آئی!!  
کہ آرزو کو ملا۔ داغِ ناشکیبائی!

## (شفقت کاظمی)

اور ہوں گے جنہیں جوگی امید  
جراتِ آموزِ محسوس میں کیا کیا  
تم نے اچھا کیا اگر نہ سنا  
ان سے ملنے کی آرزو ہے مجھے  
آپ سے دادِ وفا پانے کی  
یہ ادائیں ترے شرمانے کی  
درِ دل قابلِ بیاں بھی نہیں  
جن کے ملنے کا اب گماں بھی نہیں

## حدیث میکرہ

(عزیز عظیم آبادی)

حاصل نہیں لطف - اب کسی بات میں بھی      افلاس کے پرے ہیں - خرابات میں بھی  
 اشد رے ظلم - چشمِ رحمت کا عزیز      بے ہادہ گزر رہی ہے - برسات میں بھی  
 سوکھے ہوئے ہونٹ ہیں - زبان چھلتی ہے      پینے کو - شراب تک - نہیں ملتی ہے  
 افکار کے بھول - کیا شگفتہ ہوں عزیز      بنے بادِ سحر - کہیں کئی کھلتی ہے  
 اے کشتی 'سے' کے ناخدا - پیتا ہوں      اپنی طاقت سے کچھ سوا - پیتا ہوں  
 پیمانہ و ظرف کی بجھے تاب نہیں      پیتا ہوں - شراب - یا دوا پیتا ہوں  
 رحمت کی گٹھا - بہار بن کر چھائی      پیغامِ سرور و کامرانی لائی  
 یہ ہرزہ و گل - یہ برق و بزاں کا ہجوم      اے حسرت میگشی - قیامت آئی  
 ساقی کو - قدح کشوں کو - میخانوں کو      حبشیشوں کو - حراہوں کو - پیمانیوں کو  
 اے دورِ تمام - یاد کر لیتا ہوں      دل جن کو بھلا چکا - ان افغانوں کو  
 پیری سے بدل گئی - جوانی ساقی      فانی - سب کا - و بار - فانی ساقی  
 ہاں بادہ بقدرِ شوق - زندوں کو پلا      مہلت دے گی نہ زندگان ساقی  
 اُن موسمِ گل کا یہ زمانہ ساقی      رنگ و نکبت کا اک خزانہ ساقی  
 وہ گوشہ مشرق سے اٹھا ابرسیاہ      ساغر کو - مری طون بڑھانا ساقی  
 ٹھنڈی ٹھنڈی ہو - گٹھائیں کالی      خنداں - ہر شاخ میں - چین کی پالی  
 اے ابرو کرم - یہی ہے فیضِ رحمت      میکش پیاسے رہیں - صراحی خالی  
 زندگی کی 'لغنیوں' سے کارزار آسان نہیں      کارزار آسان بھی ہو لیکن خزانہ آسان نہیں  
 آہ یہ مجبور بن جانے کی ذمہ داریاں      اب کھلا دل پر کہ ترکِ انتہا آسان ہیں  
 تو بھی ان کا نام لیتا ہے تو بل جاتا ہو دل      دل - جسے پہچانتا اے راز دار آسان نہیں  
 اب تصور میں بھی احساس تصور ہو چلا      یوں بھی اب تسکین جانِ ہتیرا آسان نہیں  
 راز اس دنیا میں آوازِ شکستِ دل کے بعد      ہر صدا پر جھوٹا مستانہ وار آسان نہیں  
 اس دل کو تمھارا - تمھیں اپنا نہیں ہم      کہنے کی کوئی بات ہی گویا نہ کہیں ہم  
 تمھیں کے تلووں سے کانٹے نکالنے والے      یہ ہوش ہے تو جنوں کا میاب کیا ہوگا  
 دامنِ صبر بھی ہاتھوں سے اُگر چھوٹ گیا      اومرے ہاتھ سے دامن کو پھڑانے والے  
 نگاہِ ناز کو تکلیفِ التفات نہ دو      تباہیوں کا طال اس قدر نہیں ہے مجھے  
 یہ کیا ہو گیا اے عجب نامرادی      کہ میں رو دیا - زندگی مسکرا دی  
 نثار جلوہ دل و دین - ذرا نقاب اٹھا      وہ ایک لمحہ سہی ایک لمحہ کیا کم - ہے  
 شاید نگاہِ حدِ ادب سے گزر گئی      دیکھ اے جنوں شوق کوئی مسکرا دیا  
 بقدرِ ظرف کہیں عشق کا میاب ہوا      بہت ہوا تو کوئی خانما خراب ہوا

(راز پردانی)

## میتین نیازی :-

بچا کے خار سے دامن کو ہب چلا ہوں میں تلاش غنچہ و گل میں بٹک گیا ہوں میں  
 نہیں نہیں مجھے واللہ شکوہ دوری کہ تم ہی تم ہو جہاں تک بھی دیکھتا ہوں میں  
 صحن چین ہے خون تمنا سے لالہ زار دیوانے چھوڑ کر یہ بہاریں کہاں چلے  
 میتین ان کا تغافل بھی ہے خلوص آمیز خوش نصیب کہ وہ یاد آئے جاتے ہیں  
 یہ راز پوچھنے لکھائے نوشتہ گفتم سے ہنسی جب آتی ہے کیوں ہے اختتام لاتی ہے  
 یہ اور بات ہے کانٹوں کو تازگی نہ ملے چین میں ایک سی سب پر بہار آتی ہے  
 پیدا نہ ہو نگاہ میں جب تک شعور دید جلوے تمھارے دیکھ لے ایسی نظر کہاں  
 طوفان سے بچ کے ڈوبی ہے کشتی کہاں نہ پوچھ ساحل بھی اعتبار کے قابل نہیں رہا  
 یہ ہستی اور الجھتی جاری ہے میں اس کو جس قدر سلجھا رہا ہوں  
 آگئی پھر بہار، دیوانے راہ نکتے ہیں تیری، ویرانے  
 ہنس پڑے دیکھ کر وہ آئینہ آگیا کیا نظر خدا جانے  
 بخود ہوئے کچھ ایسے نام بہار سن کر آگے نہ بڑھ سکے ہم عنوان داستان سے  
 حسرت بھری نظر سے ان کو دیکھتا ہوں راتوں کو ٹوٹتے ہیں تارے جب آسماں سے

## (میتاب بریلوی بی۔ ایل۔ ایل۔ بی)

خود جرات نگاہ نے پردے اٹھانے غنچے کھلے نہ شیشہ و ساغر تھے رقص میں  
 آواز کچھ اٹھی بھی تو آخر اٹھی کہاں چھانے لگی تھی منہم حوادث کے سار پر  
 ہم نے ہجوم شوق میں آواز دی کہاں اتنا تو تھا کہ شکوہ آئینہ ان نہ تھا  
 آواز کچھ اٹھی بھی تو آخر اٹھی کہاں کہنت دل نے ٹوٹ کے آواز دی کہاں  
 پتے رہے نگاہ سے ساغر میں تھی کہاں

وہ آسماں وہ بزم نہ وہ رہگذار دوست

بیٹھے ہیں آج کھوئے ہوئے آپ بھی کہاں

## رقم کنول نسیم کنجا ہی :-

صاحب عرش نے خود خاک نشینوں کو دئے  
 کتنے ہی سینوں پہ انوار اُتارے اُسے  
 کتنے ہی امن کے شہزادے جہاں میں آئے  
 فطرت انساں کی ہے پیکار و تصادم یکسر  
 مذہب و دین بھی پردہ ہیں ملکیت کا  
 کارواں گزرے بہر رنگ اسی منزل سے  
 فکر و احساس کی قندیل بجھا دو لکڑی  
 ذہن مجبوس ہیں فکر آج بھی زندانی ہے  
 نہ کوئی شمع نہ جگنو نہ ستارہ نہ چراغ  
 ابن آدم کو ہے تجزیہ پسندی کا جنوں  
 غم کی ظلمت میں یہ ڈوبا ہوا گہرا سا سکوت  
 اپنی خوں گشتہ تمنائیں بھی ہنسنا سیکھیں  
 دل میں امید کی اک شوخ کرن پھیرا بھری  
 آسماں تاب نظاروں کو پلٹ کر دیکھو  
 کتنے رخشندہ تحایف کی زباں سے پیغام  
 کتنی سائووں میں ڈھلا نغمہ ساز اہام  
 جنگ کے چہرے پہ لیکن ہے وہی برنائی  
 سب بپا غلغلہ قیصری و چینگیزی  
 نام پر حضرت یزدان کے رونا خونریزی  
 ہر قدم شورش پر دہائی و سلطانی ہے  
 اس کی فطرت بھی تو غمزدی و ہامانی ہے  
 کس نے دی خاک کے پتے کو غلامی سے نجات  
 زندگی ہے کہ بہتے ہوئے سادوں کی رات  
 خون آلود ہے تاریخ کا ایک ایک ورق  
 سوچتی ہوں کبھی ہنگامہ گشتار بنے  
 (دل کا) یہ خانہ آریک ضیا کا رہنے  
 آفتق ذہن پہ یہ ترخ نشان کیسا ہے  
 شفق نو کا یہ سیلاب جواں کیسا ہے  
 یہ بھی زائین و منقش سمانہ دھوکا ہو کہیں

## رقم دھولسوی :-

نیرنگی چمن کا پوچھو نہ کچھ فسانہ  
 جس وقت یاد آئی بے اختیار آئی  
 رودادِ آرزو کی نیرنگیاں نہ پوچھو  
 آتے رہے وہ جب تک تجدیدِ آرزو کو  
 لک بات بخودی میں منہ سے نکل گئی تھی  
 اکثر بہار ہی میں اجڑا ہے آشیانہ  
 اب تک ہے تم سے ہمہ کاک : باد و اہسانہ  
 میرے لئے حقیقت ان کے لئے فسانہ  
 آیا کیا پلٹ کر گزرا ہوا زمانہ  
 دنیا بنا رہی ہے اب تک اُسے فسانہ

# بعض کیاب کتابیں

(ان کتابوں پر گیش نہیں ملے گا)

تاریخ اردو مطبوعہ :

تاریخ شاہجہاں معونہ پانچ سال محمد علیہ تاریخ سکجات مصور ..... غے

تاریخ دربار تاجپوشی ..... حافظ نذیر احمد ..... غے

قدیم ہندو ہنرمندان اودھ مصور ..... اسرار حسین ..... غے

تاریخ ڈھاکہ مصور ..... رحمان علی قیش ..... غے

تاریخ انوار تاریخ مصور سہ جلد کاس ..... نصرت علی ..... غے

سوانح عمری اردو مطبوعہ :

الغزالی ..... شبلی نعمانی ..... غے

تذکرہ کاکان رامپور ..... احمد علی خاں ..... غے

تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ..... سید احمد قادری ..... غے

حیات خسرو ..... شبلی نعمانی ..... غے

بہادر شاہ ظفر ..... امیر احمد ..... غے

حیات امیر خسرو ..... سعید احمد ..... غے

سیرۃ النعمان ..... سوانح الام ابو حنیفہ ..... شبلی نعمانی ..... غے

ادبیائے کرام کی سوانح عمری ..... ..... غے

تذکرہ شعراء اردو مطبوعہ :

تذکرہ آب بقا ..... عبد الرؤف عسکرت ..... غے

ہندو شعراء ..... ..... غے

تذکرہ الخواتین ..... عبدالباری آسی ..... غے

تذکرہ آب حیات ..... محمد حسین آزاد ..... غے

خطبات گارسان و قاسمی ..... گہندوستانی زبان پر شائع کردہ غزلی اردو غے

ادب اردو مطبوعہ :

صنایع عشق ..... امیر احمد امیر ..... غے

دیوان ذوق ..... شیخ ابراہیم ..... غے

کلیات ناسخ ..... امام بخش ..... غے

دیوان میر حسن ..... میر حسن حسن ..... غے

دیوان رنگین وانشا ..... رفیق کلام ..... غے

دیوان تاج سخن ..... حبیب حسن خاں حبیبی ..... غے

نظم دل افروز کلیات تسلیم ..... منشی امیر اللہ ..... غے

آیات وجدانی ..... مجموعہ غزلیات مع شرح ..... مرزا واجد حسین ..... غے

کلیات حسرت ..... فضل الحسن موہانی ..... غے

دیوان نایب ..... ذاکر حسین شاقب ..... غے

دیوان صفی ..... سید علی نقی صفی ..... غے

مکمل شرح کلام غالب ..... مرتبہ عبدالباری آسی ..... غے

کلیات نظیر ..... نظیر اکبر آبادی ..... غے

مجموعہ تصانیف مومن ..... مرتبہ ضیاء احمد ..... غے

کلیات نظیر اکبر آبادی ..... مرتبہ عبدالباری آسی ..... غے

شعوی میر حسن ..... میر حسن ..... غے

شعوی گلزار نسیم ..... ہدایت دیا شنکر ..... غے

مرثیے اردو مطبوعہ :

مرثیہ میر انیس ..... جلد اول و دوم و سوم و چہارم ..... میر انیس ..... غے

مرثیہ میر انیس ..... جلد ششم ..... مرتبہ میر عبدالحسین ..... غے

مرثیہ میر انیس ..... جلد ششم ..... مرتبہ میر عبدالحسین ..... غے

مشفق اردو مطبوعہ :

فساد عجائب ..... مرزا رجب علی بیگ سرور فقہ ..... غے

رسالہ فن شاعری ..... مرزا سلطان احمد ..... غے

تقیق اللغات ..... ضامن علی جلال لغت قلمی ..... غے

مولانا انیس و دبیر ..... شبلی نعمانی ..... غے

محاسن کلام غالب ..... ذاکر عبدالحسین ..... غے

تذکرہ آب بقا ..... عبد الرؤف عسکرت ..... غے

تاریخ فارسی مطبوعہ :

جہانگیر نامہ ..... خواجہ ابو الحسن ..... غے

تاریخ فرشتہ ..... محمد قاسم فرشتہ ..... غے

درہ نادردہ ..... مرزا محمد علی خاں ..... غے

(بقیہ کتابیں صفحہ اول پر ملاحظہ کیجیے)

نگار گاہ کتب خانہ کتب خانہ

# بعض کیمیا کی کتابیں

(ان کتابوں پر کمیشن نہیں دیا جائے گا۔ قیمتیں علاوہ محصول ڈاک ہیں)

کشتان اصطلاحات الفنون	شیخ محمد علی	ع
جہانگیر نامہ	نور احمد ابوالحسن	ش
تاریخ فرشتہ ۲ حصے	محمد قاسم فرشتہ	ش
خصائل السعادت تاریخ و نسب نامہ افغانہ		ع
آئین اکبری مصورہ حصہ ابو الفضل فیض		ع
تاریخ جہانگیر نامہ نادری مصور		ع
سکندر نامہ مصور	مولوی نظامی گنجوی	ش
وقایع نعمت خان عالی انشاء حسن و عشق		ش
درہ نادریہ	مرزا محمد صدیقی خاں	ع
تاریخ گلستان ہند مصور	دروگہ بہادر	ع
اقبال نامہ جہانگیری حصہ محمد شریف مستوفی خاں		ش
تاریخ جامع التواریخ	فقیر محمد	ع
سیر المتاخرین حصہ	غلام حسین خاں	ع
کارنامہ حیدری حالات حیدر علی خاں	شیخ سلطان مرزا بہادر مرزا سلطان	ع
تذکرہ دولت شاہ	دولت شاہ سمرقندی	ع
تذکرہ آثار الکرام و فرشتانی سرور آزاد	غلام علی آزاد	ع
تذکرہ خدیجہ الاصفیاء		ع
دیوان احمد جام		ع
تاج التواریخ مصور		ع
تاریخ نادری مصور تاریخ حکماء		ع
در بار اکبری آزاد		ع
مقدمہ تاریخ ابن خلدون ترجمہ اردو		ع
البرکۃ	عبدالرزاق	ع
سیرۃ النعمان	شبلی	ع
تذکرہ گل رعنا عبدالغنی		ع
کلیات ظہیر	حکیم ظہیر قاریابی	ع
تصاویر عرفی محشی	جمال الدین	ع
یوسف زلیخا	عبدالرحمن جامی	ع
ثنوی ندمن	ابوالفیض فیضی	ع
ثنوی غنیمت	محمد اکرام	ع
ثنوی مخزن الاسرار	شیخ نظامی گنجوی	ع
کلیات اسمعیل	اسماعیل اصفہانی	ع
دیوان ناصر علی سرہندی		ع
دیوان صائب	محمد علی صائب	ع
کلیات صائب	محمد علی	ع
کلیات سعدی	شیخ مصلح الدین سعدی	ع
لیلیٰ مجنون	نظامی۔ مولانا نظامی	ع
دیوان عرفی	جمال الدین عرفی	ع
دیوان ہلالی محشی	ہلالی	ع
دیوان تصاویر غفری	حکیم ابوالقاسم	ع
اخلاق محسنی	لاحسن واعظ کاشفی	ع
مسطلمات الشعر و محشی خلاصہ بہار نجم		ع
احسن التواریخ	تاریخ صوبہ اودھ۔ نقشبندی رام سہائے ممنا	ع
تاریخ دھاکہ مصور	رحمان علی طیش	ع
تذکرہ کاطلان رامپور	احمد علی خاں	ع
تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دیوبند	سید احمد قادری	ع
حیات امیر خسرو	سعید احمد	ع
تذکرہ آب بقا	عبدالرؤف عشرت	ع
ہندو شعراء		ع
تذکرہ الخواتین	عبدالباری آسی	ع
تذکرہ سخن قہر شاخ		ع
تذکرہ گلشن ہند مرزا علی لطف		ع
تذکرہ مخزن نکات	قائم	ع
تذکرہ عقرب ثریا	مصطفیٰ	ع

جناب دارغ .....  
 گلزار دارغ .....  
 آفتاب دارغ .....  
 کلیات جعفر .....  
 مجموعہ قصاید مومن .....  
 کلیات نظیر الکر آبادی .....  
 ثنوی میر حسن .....  
 ثنوی گلزار نسیم .....  
 ثنوی زہر عشق .....  
 مرثیہ میر انیس .....  
 مرثیہ میر انیس .....  
 مرثیہ دبیر کامل .....  
 مرثیہ مونس .....  
 مرثیہ تہش .....  
 دریائے لطافت .....  
 فساد عجبائے .....  
 موازنہ دبیر و انیس .....  
 آئینہ تاریخ .....  
 چراغ سخن .....  
 منیر اللغات .....  
 کریم اللغات .....  
 تنقیح اللغات .....  
 سفرنامہ حکیم ناصر خسرو .....  
 وقایع سیر و سیاحت .....  
 بحر الفصاحت .....  
 فردوسی پر چار مقالے .....  
 تذکرہ آب بقا .....  
 تاریخ حبیب السیر .....  
 کلیات ظفر چہار دیوان

تذکرہ چغتایان شعراء .....  
 تذکرہ ہندی .....  
 دیوان میر حسن .....  
 دیوان رکنی و انشا .....  
 دیوان تاج کنج .....  
 دیوان میر وزیر علی صبا .....  
 دیوان ولی دکنی .....  
 دیوان رند .....  
 دیوان خواجہ وزیر .....  
 دیوان شکر گرت .....  
 دیوان حیدر علی .....  
 مظہر عشق دیوان تنق .....  
 کلیات ناسخ .....  
 کلیات تسلیم .....  
 کلیات نظیر شہباز .....  
 کلیات ریاض خیر آبادی .....  
 کلیات جان صاحب .....  
 کلیات سودا .....  
 کلیات حسرت .....  
 کلیات مومن .....  
 کلیات میر .....  
 مکمل شرح کلام غالب .....  
 طالب اللغات شرح دیوان غالب .....  
 مرآۃ العیال .....  
 مجموعہ قصاید ذوق .....  
 مظہر معانی دیوان محمد رح .....  
 آیات و جہان .....  
 دستور الشعراء .....  
 پاکستان میں یہ کتابیں صرف اس صورت سے پہنچ سکتی ہیں کہ پوری قیمت مع محصول ڈاک ذریعہ بنگ ڈرافٹ پہنچے وصول ہو جائے

میجر نگار لکھنؤ

ضروری اعلان: - جرہری کی فیس اب ۸ روپے ہے اسلئے آئندہ مکار کا دیڈی پیسے میں روانہ ہوگا۔ پاکستان کے خرمیاد بھی اپنا چندہ پیسے جمع کرالیں۔ (دشہر)  
 ماہنی طرن کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ  
 آٹھ روپیہ دس آنے میں دی ہنی ہوگا جس میں سالنامہ  
 آپ کا چندہ اپریل میں ختم ہو گیا اور مئی کا "مکار"  
 ۵۰۰ کی قیمت (مع مصارف جرہری) بھی شامل ہے۔

مکار

ادیر: نیار فچوری

جلد ۶۹	فہرست مضامین اپریل ۱۹۵۶ء	شمار ۴
۳۰	آبی شمعیں --- وحید الدین خان متین	۳۴
۳۱	گاہے گاہے باز خواں --- (مذہب و عقل کی ہنگ)	۴۱
۳۲	ٹوٹا ہوا رشتہ --- پرویں	۴۶
۳۳	باب الاستفسار ---	۴۹
۳۴	منظومات --- فضا ابن فیضی - عزیز لکھنوی - ۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵ - ۶ - ۷ - ۸ - ۹ - ۱۰ - ۱۱ - ۱۲ - ۱۳ - ۱۴ - ۱۵ - ۱۶ - ۱۷ - ۱۸ - ۱۹ - ۲۰ - ۲۱ - ۲۲ - ۲۳ - ۲۴ - ۲۵ - ۲۶ - ۲۷ - ۲۸ - ۲۹ - ۳۰ - ۳۱ - ۳۲ - ۳۳ - ۳۴ - ۳۵ - ۳۶ - ۳۷ - ۳۸ - ۳۹ - ۴۰ - ۴۱ - ۴۲ - ۴۳ - ۴۴ - ۴۵ - ۴۶ - ۴۷ - ۴۸ - ۴۹ - ۵۰ - ۵۱ - ۵۲ - ۵۳ - ۵۴ - ۵۵ - ۵۶ - ۵۷ - ۵۸ - ۵۹ - ۶۰ - ۶۱ - ۶۲ - ۶۳ - ۶۴ - ۶۵ - ۶۶ - ۶۷ - ۶۸ - ۶۹ - ۷۰ - ۷۱ - ۷۲ - ۷۳ - ۷۴ - ۷۵ - ۷۶ - ۷۷ - ۷۸ - ۷۹ - ۸۰ - ۸۱ - ۸۲ - ۸۳ - ۸۴ - ۸۵ - ۸۶ - ۸۷ - ۸۸ - ۸۹ - ۹۰ - ۹۱ - ۹۲ - ۹۳ - ۹۴ - ۹۵ - ۹۶ - ۹۷ - ۹۸ - ۹۹ - ۱۰۰	۵۱
۳۵	مطبوعات موصولہ ---	۵۴
۳۶	ملاحظات ---	۵۷
۳۷	سیرت نبوی کے عرب مصنفین پر ایک جمالی نظر --- ڈاکٹر سعید حسن الدہادی پورہ ٹی ۵	۶۰
۳۸	آخر لکھنوی --- شام احمد فاروقی	۱۰
۳۹	ایلیس --- ارشد کاکوی	۲۲
۴۰	نیار فچوری --- سید حامد حسین ایم۔ اے۔	۲۶
۴۱	اردو شعری میں ہیئت کے تجربات --- قیوم نظر	۳۰
۴۲	آوارہ گرد اشعار --- پرو فیض عطاء الرحمن کاکوی	۳۴

ملاحظات



جمہوریت اسلامیہ پاکستان

خوشی کی بات ہے کہ پاکستان نے اپنا دستور بنایا اور مارچ سے اس کا نفاذ بھی ہو گیا۔ پاکستان اب "جمہوریت اسلامیہ پاکستان" کے نام سے پکارا جائے گا اور تاریخ اسلام میں غالباً یہ سب سے پہلا نام ہے جس میں کسی حکومت اسلامی کے ساتھ نسبت اسلام کو بقدر نمایاں طور پر ظاہر کیا گیا ہو۔ اسلام کا مفہوم اگر عام طور پر غلط نہ سمجھ لیا گیا ہوتا، تو شاید یہ بات تمام دنیا کے لئے خوشی کا باعث ہوتی لیکن چونکہ ہمارے روایتی اکابر و علماء نے مسلم و غیر مسلم کے درمیان ایک آہنی دیوار کھڑو اسلام کی قائم کردی ہے اس لئے بھارت کی بعض جماعتوں کو یہ پنے اور سمجھنے کا موقع مل گیا کہ پاکستان کا نیا دستور ایک متعصب مذہبی حکومت کا دستور ہے جس میں غیر مسلموں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔

اس سلسلہ میں یہ سوال اٹھانا کہ اگر مسلمان، ہندو کو کافر کہتا ہے تو کیا ہندو مسلمان کو ملکش نہیں سمجھتا اور اگر پاکستان میں ہندوؤں کے لئے کوئی جگہ نہیں تو کیا مسلمان کے لئے بھارت میں جگہ ہی جگہ ہے، مناسب نہیں بلکہ ہم کو پاکستان کے ارباب سیاست سے یہ کہنا ہے کہ اگر وہ پاکستان کو "اسلامی جمہوریت" کے نام سے موسوم کرتے ہیں تو ان کو واقعی دہی روح، دہی دسعت قلب نظر

اپنے اندر پیدا کرنا چاہئے جو اسلام کا حقیقی منشا ہے اور جس کا اظہار بھی اکابر پاکستان کی طرف سے ہوتا رہتا ہے۔

اس سے پہلے جو کچھ ہوا، سو ہوا، لیکن اب پاکستان کی ذہنیت بدلنا چاہئے اور اس کو زندگی کی وہی راہیں اختیار کرنا چاہئے جو خلفاء راشدین نے متعین کردی تھیں۔ سادہ معاشرت، بلند اخلاق، اتحاد عمل، عزم راسخ، خدا پر بھروسہ (جو اپنی قوت عمل پر اعتماد کا دوسرا نام ہے) اور اجتماعیت صحیحہ (جو عبادات ہی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے)

اس میں شک نہیں کہ پاکستان اس وقت بہت سی داخلی و خارجی مشکلات میں مبتلا ہے۔ لیکن یہ تمام مشکلات خود اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں، خود وہاں کے امراء اکابر دولت کی پیدا کی ہوئی ہیں جو حکومت و اقتدار کے لئے ایک دوسرے سے برس بھر کا رہ چکے ہیں اور عوام کی ذہنیت میں آزادی و بیداری یا صحیح جمہوری احساس و توانائی کا نشو و نما دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے سوائے یہ کہ پاکستان اس کھوڑ ہوئی دولت کو کیونکر حاصل کر سکتا ہے۔

اس حقیقت سے غالباً کسی کو انکار نہ ہو گا کہ دنیا میں انقلاب قانون و دستور کے نفاذ سے نہیں ہوا کرتے بلکہ اسے شخصیتیں پیدا کرتی ہیں۔ قرآن آج بھی وہی ہے جو رسول اور خلفاء راشدین کے عہد میں تھا، لیکن مسلمان آج وہ نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ شخصیتیں موجود نہیں جو زندگی کا لائحہ عمل پیش کرنے سے پہلے خود اپنے اوپر عمل کی کیفیت طاری کر لیتی تھیں۔

ہمدرد اسلام میں روحانی و سیاسی قیادت ایک ہی شخص کے سپرد ہوتی تھی، لیکن پہلے یہ دیکھ لیا جاتا تھا کہ جس کو قوم نے اپنا سردار چنا ہے وہ اپنے اعمال و کردار کے لحاظ سے اس کا اہل ہے یا نہیں اور پھر اس کے بعد اس کو سیاسی رہنما تسلیم کیا جاتا تھا لیکن بعد کو معاملہ برعکس ہو گیا اور سیاسی اہلیت کے مقابلہ میں اخلاقی اہلیت کو نظر انداز کیا جانے لگا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احکامات بڑھنے لگے اور اسلام کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ اس لئے اگر پاکستان صحیح معنی میں اسلامی جمہوریت بننا چاہتا ہے تو اس کو عہدہ بنی امتیہ نہیں بلکہ عہدہ خلفاء راشدین اپنے سامنے رکھنا چاہئے اور اسی کو اپنا امیر یا صدر منتخب کرنا چاہئے جو ذہنی طور پر خلافت راشدہ سے قریب تر ہو خواہ وہ طبقہ عوام کا فرد ہو یا طبقہ خواص کا۔

اسلامی حکومت کا صحیح رنگ پیدا کرنے کیلئے اخلاقی بنیاد حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور یہ ممکن نہیں جب تک شعائر اسلام کو زندہ نہ کیا جائے جن میں بنیادی چیز ”عبادات“ ہیں اور ان کا رولج اسی وقت ہو سکتا ہے جب خود ارادہ حکومت سختی سے اس کی پابندی کریں۔ اگر نافرمانی ہے تو اس کی فرضیت سب سے پہلے اسکندر مرزا، چودھری محمد علی اور گورانی وغیرہ پر عاید ہوتی ہے، اگر بادہ خواری حرام ہے تو سب سے پہلے ایوان حکومت کی صحبتوں میں اس کو حرام قرار دینا چاہئے، اور اگر روزہ رکھنا پھری ہے تو ماہ رمضان میں امراء کے مطبخوں سے بھی دھواں نہ اٹھنا چاہئے۔ الغرض جب تک پاکستان کے اکابر و امراء اپنی ذہنیت میں تبدیلی نہ کریں اور عوام سے اس قدر قریب نہ ہو جائیں کہ محمود و آواز ایک ہی صفت میں کھڑے ہو سکیں، پاکستان کی ”جمہوریت اسلامیہ“ بالکل بے معنی چیز ہے اور اس صورت میں ہم اس کے سوا کیا کر سکتے ہیں کہ؟

یار سب زسیل حادثہ طوفان رسیدہ باد بہت خاندان کو خانقہ شش نام کردہ اند

اس وقت تک کشمیر کا مسئلہ بالکل گولم گول کی حالت میں تھا لیکن اب پنڈت تہرو کے تازہ بیان نے اس طلسم کو توڑ دیا ہے اور پاکستان کو کشمیر کو ہندوستان کا نقطہ نظر زیادہ واضح طور پر سمجھنے کا موقع مل گیا ہے۔ اس بیان پر پاکستان میں جو رد عمل ہوا ہے وہ خلاف توقع نہیں، لیکن ذرا نیمہ منہر کی مانند اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا اور اگر سیکورٹی کونسل ہی پر اس کا فیصلہ چھوڑ دیا گیا تو شاید یہ بعد کم ہونے کی جگہ بڑھتا ہی جائے گا اور ہندوستان و پاکستان کی موجودہ نسل غالباً اس کا انجام نہ دیکھ سکے گی۔

اس میں شک نہیں کہ اس مسئلہ میں پاکستان کا موقع ”دامن زیر سنگ“ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس پتھر کو ہٹانے دامن افشانی آسان نہیں، اس لئے پاکستان کو اب جن راہوں سے گزرنے کا ہے وہ کہیں زیادہ پیچیدہ و ناہموار ہیں اور ہمیں دیکھنا ہے کہ وہ کس طرح ان سے گزرتا ہے۔

# سیرت نبوی کے مصنفین پر ایک جمالی نظر

ڈاکٹر سعید حسن (الہ آباد یونیورسٹی)

ظہور اسلام کے قبل کا زمانہ عہد جاہلیت کے نام سے موسوم ہے۔ جن کتابت سے عام ناواقفیت کی وجہ سے اس زمانہ میں کسی مدنی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔ عرب اپنے آباء و اجداد کے بہادری، کرم اور ایفائے عہدہ کے قصے زبانی بیان کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر اہم تاریخی واقعات مثلاً نحر مزہم، جرقم، سرد مارپ وغیرہ کے تذکرے بھی زبانی بیان تک محدود تھے۔ ان سب واقعات کو سن کر لوگ یاد کرتے تھے اور کئی یا زیادہ کی کے ساتھ لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔

ظہور اسلام کے بعد بھی عرصہ تک تاریخ نویسی کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زندگی کے حالات بھی عرصہ تک زبانی بیان تک محدود تھے۔ یہی زبانی بیان کردہ واقعات بعد میں سیرت نگاروں کے لئے اہم ذخیرہ ثابت ہوئے۔

رسول اکرم کے زمانہ سے بڑے خلفائے راشد بن رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے زمانہ تک کلام مجید اور بعض روایات کے مطابق نحو کی تدوین کے علاوہ اور کسی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اکرم اور آپ کے بعد خلفائے راشدین کو کلام مجید کے تحفظ کا سب سے زیادہ خیال تھا۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت کلام مجید کی کتابت رسول اکرم کے زمانہ سے شروع ہوئی تھی۔ خلیفہ اول اور خلیفہ دوم نے بھی کلام مجید کی جمع اور تدوین کی طرف توجہ کی۔ خلیفہ سوم نے ان دونوں کی کوششوں کو تکمیل کو پہنچایا۔ انھوں نے ایسے صحابہ کرام کا ایک بورڈ مقرر کیا کہ کلام مجید کی شان نزول وغیرہ سے بخوبی واقف تھا۔ چنانچہ اس بورڈ نے نہایت کوشش کے بعد کلام مجید کو جمع کر کے اور آیات کو صحیح ترتیب دے کر کلام مجید کو مدون کیا، جس کی تلاوت مسلمان آج تک کرتے ہیں۔

کلام مجید کی کتابت اور تدوین کے بعد عربوں کو تدوین کا خیال ہوا، جس کا اصل مقصد قرآن کریم اور زبان عربی کی حفاظت تھا۔ اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہونے پر فاتح اور مفتوح اقوام میں باہم اختلاف ہوا۔ عرب اور غیر عرب کے اختلاف سے نہ صرف زبان مخلوط ہوئے گی بلکہ زبان میں نحو غلطیاں واقع ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ لوگ کلام مجید کی تلاوت میں ایسی غلطیاں کرنے لگے، جس سے کلام مجید کے معنی میں فرق ہونے لگا۔ مثلاً بیان کیا جاتا ہے کہ زیاد بن ابیہ کے سامنے ایک شخص لایا گیا جو قرآن کی آیت ”ان اللہ برئ من المشرکین ورسولہ“ میں رسول کو کلام کو زیر سے پڑھتا تھا۔ جس کے معنی یہ ہو جاتے تھے کہ بے شک اللہ اپنے رسول اور مشرکین سے بیزار ہے، حالانکہ آیت کے دراصل معنی یہ ہیں کہ اللہ اور رسول مشرکین سے بیزار ہے۔ بہر حال اس قسم کی غلطی کا اشد ضروری خیال کیا گیا، جس کی وجہ سے صحیح زبان ہونے اور پڑھنے کے لئے قواعد وضع کئے گئے۔ رسول اکرم اور خلفاء راشدین کو اس کا بھی بہت خیال تھا کہ کلام مجید میں دوسری آسمانی کتابوں کی طرح تحریف نہ واقع ہو۔ چنانچہ اس احتیاط کے تحت لوگوں کو سوا کلام مجید کی کتابت کے اور کسی چیز کی کتابت اور تدوین کی اجازت نہیں دی گئی۔ مسلمانوں کے لئے کلام مجید کے بعد احادیث نبوی کو خاص اہمیت اور تقدس ہے، لیکن کلام مجید اور احادیث میں باہمی اختلاف کے خوف سے ہادی خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز کے زمانہ تک تدوین احادیث کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔

ظہور اسلام کے بعد تاریخ نویسی کی طرف اولین توجہ کرنے والے خاندان بنو امیہ کے خلیفہ معاویہ بن ابوسفیان خیال کئے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے عبید ابن شریہ کو صنعاء سے طلب کر کے اس سے ایک تاریخ کی کتاب لکھنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ

ابن شریح نے خلیفہ معاویہ کی فرمائش کے مطابق ایک کتاب "کتاب الملوک و اخبار المصطفین" تحریر کی۔ یہ عربی زبان میں سب سے اہم تاریخ خیال کی جاتی ہے۔ اس کے کچھ زمانہ کے بعد لوگوں نے تاریخ نویسی کی طرف توجہ کی۔

رسول اکرم کا ظہور اور آپ کا دعوت توحید پیش کرنا تاریخ عرب میں خاص طور سے اور تاریخ انسانی میں عام طور سے اہم واقعہ ہے۔ رسول نے دعوت توحید پیش کر کے عربوں کی زندگی میں خاص طور سے اور دیگر اقوام کی زندگی میں عام طور سے ایک عظیم انقلاب پیدا کر لیا۔ آپ کی امت کا نتیجہ ہوا کہ عرب قوم جو اب تک حقیر خیال کی جاتی تھی، میدانِ عمل میں کامزن ہوئی، اور انسانی مساوات، شجاعت، تائید حق پسندی، تقویٰ اخلاق جہاں گیر اور جہاں داری وغیرہ کی اعلیٰ مثال دُنیا کے سامنے پیش کی۔

ظاہر ہے کہ ایسی قوم کو اپنے زبردست ہادی اور اس کے ساتھیوں وغیرہ کے کارناموں کو زندہ رکھنے کا قدرتنا شوق ہوگا۔ جنہوں نے اقامت و تبلیغ رسالت میں نہایت جان فحاری سے کوشش کر کے عرب کی شان و شوکت اور جاہ و جلال کو اعلیٰ مرتبے پر پہنچا دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کارناموں کو قائم رکھنے کے شوق نے عمر بن عبدالعزیز کو تودین احادیث پر آمادہ کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اسی شوق کے تحت، نے سیرت نگاری کی طرف توجہ کی۔

چونکہ شروع میں محدث اور سیرت نگار دونوں کا واحد مقصد رسول اکرم اور صحابہ کرام کے کارناموں کو محفوظ رکھنا تھا، اس لئے اولین نگار عموماً مشہور محدث تھے۔ ان کی سیرت پر تالیفات عموماً جامع احادیث کی طرز پر ہیں۔ اس قسم کی اولین تالیفات مغازی یا سیر کے نام سے ہیں۔ یعنی مغازی و سیر سے تاریخ کے وہ صفحات مراد ہیں، جن میں رسول اکرم و صحابہ کرام کے حالات زندگی کے علاوہ وہ واقعات آئے ہیں، جو سلسلہ اقامت دین اور تبلیغ رسالت ظہور پذیر ہوئیں۔ مذکورہ بالا طرز کے مؤلفین میں عروہ ابن زبیر ابن العوام، زکریا، قابل ذکر ہیں۔ ان کے والد مشہور صحابی زبیر ابن العوام کی والدہ حضرت ابوبکر کی مشہور صاحبزادی اسماء تھیں۔ عروہ جن کی سیرت بیان کی جاتی ہے، مشہور فقیہ اور محدث خیال کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے رسول اکرم کی زندگی کے حالات صحاح اسلام واقعات کے جمع کئے ہیں۔ ان کے اس گرواں بہادر خیر سے ابن اسحاق واندی اور بعد کے مؤرخین مثلاً ابن جریر، بطری وغیرہ نے کچھ افذ کیا، خاص کر وہ واقعات جو حبشہ اور مدینہ کی ہجرت اور جنگ بدر کے حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔ عروہ ابن زبیر کے بعد آبان عثمان بن عفان المدنی متوفی ۳۵ھ نے ایک کتاب سیرت پر تالیف کی۔ اس کتاب میں آبان بن عثمان نے رسول اکرم کے حالات زندگی تعلق احادیث جمع کیں۔ آبان بن عثمان کے بعد وہیب ابن منعب نے ایک کتاب سیرت پر تالیف کی، جس کا کچھ حصہ اب بھی موجود ہے۔ مذکورہ بالا مؤلفین کے بعد اور لوگوں نے بھی جن کی وفات دوسری صدی ہجری کے شروع چوتھائی یا اُس کے لگ بھگ واقع ہوئی، ان کے حالات قلم بند کئے مثلاً عاصم بن قتادہ متوفی ۷۵ھ، شریک بن عبدالمطلب ابن سعد متوفی ۱۰۵ھ، ابن شہاب الزہری متوفی ۱۲۵ھ، عبد اللہ ابن بکر ابن حزم متوفی ۴۵۰ھ۔ ان چاروں مؤلفین نے مغازی کے حالات نہایت شرح و بسط سے لکھے۔ ان کے دوسری صدی کے نصف کے قریب یا اُس کے کچھ ہی بعد کے لوگوں نے سیرت نگاری کی طرف توجہ کی مثلاً موسیٰ بن عقبہ متوفی ۲۵۰ھ، ابن راشد متوفی ۲۵۰ھ سیرت نویسوں کے زمرے میں سب سے زیادہ مشہور محمد بن اسحاق متوفی ۲۴۰ھ وغیرہ۔

ان کے بعد رسول اکرم اور صحابہ کرام کے حالات لکھنے والوں کے زمرے میں مشہور مؤلفین میں زیادہ البکائی متوفی ۳۵۰ھ، دی صاحب المغازی متوفی ۳۵۰ھ، محمد بن سعد صاحب طبقات کبریٰ متوفی ۲۵۰ھ خیال کئے جاتے ہیں۔ عام طور سے دوسری صدی کے نصف کے قریب مؤلفین میں ابن اسحاق کو خاص حیثیت حاصل ہوئی اور اس معلومات کے بحرِ ذخار سے قریب قریب مدد کے سیرت نگاروں نے استفادہ کیا محمد بن اسحاق بن یسار ابوبکر اور ابن کوفان کے لقب سے بھی مشہور ہیں۔ مدینہ ۳۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا یسار زامی عین القمر کے قیدیوں میں سے تھے۔ عین القمر مغربی کوفے کے حصہ میں شہر انبار قریب ایک مقام تھا، جس کو خالد ابن ولید نے خلیفہ اول حضرت ابوبکر کے زمانہ میں ۳۵۰ھ میں فتح کیا تھا۔ ابن اسحاق کی شروع

تعلیم و تربیت دین میں ہوئی۔ ۱۵۰ھ میں انھوں نے اسکندریہ کا سفر کیا۔ اہل مصر کے مشہور علمائے حدیث مثلاً عبداللہ ابن مغیرہ اور ابن الجلبیب وغیرہ کے حلقہ درس میں شامل ہو کر انھوں نے علم حدیث کی تکمیل کی۔ اس کے بعد کونہ جزیرہ رستے اور حیرہ کا سفر کرتے ہوئے میں سکونت پذیر ہوئے۔

ان کی مشہور تصنیف کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ بغداد میں یہ خلیفہ منصور کے پاس گئے۔ اس وقت منصور کا دھکا دلی عہدِ مہدی بھی منصور کے پاس بیٹھا تھا۔ منصور نے اس وقت ابن اسحاق سے مہدی کے لئے ایک ایسی تاریخ کی کتاب لکھنے کی فرمائش کی جس میں آدم سے لے کر اس وقت تک کے حالات درج ہوں۔ ابن اسحاق نے خلیفہ کے ارشاد کی تعمیل میں اس قسم کی کتاب لکھ کر خلیفہ کا خدمت میں پیش کی۔ یہ کتاب بہت طویل تھی۔ اس لئے خلیفہ نے اس کو مختصر کرنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ ابن اسحاق نے اس کتاب کو مختصر کر دوبارہ خلیفہ کی خدمت میں پیش کیا، اور خلیفہ نے اصل مفصل کتاب کو اپنے خزانے میں محفوظ کر دیا۔

ابن اسحاق کے متعلق علماء کی رائے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء اُن پر تدلیس، قدر اور تشیع کا اتہام لگاتے ہیں۔ یہ علماء ان کو معتبر محدثین میں شمار نہیں کرتے۔ ان علماء کے ذمے میں جو ان کو معتبر خیال نہیں کرتے، ”امام مالک“ جن سے ابن اسحاق سے ہمیشہ چشمک رہی تھی، اور ”ہشام بن عروہ بن زہیر“ وغیرہ ہیں۔ اس کے برخلاف ایک دوسرا علماء کا زمرہ جو زمرہ مخالفین سے کم مشہور نہیں خیال کیا جاتا، ان کو معتبر اور ثقہ خیال کرتا ہے، مثلاً ”شعبہ“ ثوری اور ”زیاد البکائی“ وغیرہ۔ بخاری بھی کبھی کبھی ابن اسحاق سے استہداد کرتے ہیں ابو داؤد، ترمذی اور نسائی، ابن اسحاق کے حوالے سے حدیث بھی بیان کرتے ہیں۔ بہر حال ابن اسحاق کی تصنیف قابلِ قدر اولین تصنیفات میں شمار کی جاتی ہے اور سوائے واقعی اور ابن سعد وغیرہ کے سب اس تصنیف سے اخذ کرتے ہیں۔

ابن اسحاق کے ایک عرصہ کے بعد مشہور سیرت نگار ابن ہشام نے اپنی مشہور تصنیف میں ابن اسحاق کی تصنیف کا اختصار ترقیہ اور اضافہ کیا۔ ابن ہشام نے جن کا اصل نام ابو محمد عبدالملک بن ہشام بن یوب الحمیری ہے، بصرہ میں تربیت پائی، اور مصر میں مقیم ہوئے۔ ان کی زندگی کے حالات انھیں دو فہرہوں تک محدود ہیں۔ مقررین ان کا امام شافعی کا ساتھ ہوا، اور دونوں نے مل کر اشعار عرب کا گہرا مطالعہ کیا۔ ابن ہشام کا نحو، لغت اور دیگر علوم عربیہ کے عالموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ذہبی اور ابن کثیر ان سے احادیث بھی بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے ابن اسحاق کی تصنیف کو اپنا خاص اخذ قرار دے کر ایک مشہور سیرت پر کتاب لکھی۔ نودان کے بیان کے مطابق انھوں نے ابن اسحاق سے وہ واقعات اخذ کئے ہیں، جن کا تعلق رسول اکرم کی حیات طیبہ یا آپ کے خاندان سے تھا۔ ابن ہشام نے اس کا بھی لحاظ رکھا ہے کہ ابن اسحاق کے بیان کردہ ایسے واقعات جن کے متعلق ان کو خود یقین نہ تھا اور جن کی تائید کلام مجید سے بھی نہیں ہوتی، اور نہ کوئی معتبر شہادت دستیاب ہوتی ہے، اپنی تصنیف میں شامل نہ کریں۔ چونکہ ابن ہشام خود علم شعر کے ماہر تھے۔ اس لئے انھوں نے ابن اسحاق کی تصنیف سے ایسے اشعار کو بھی نہیں لیا، جن کو علم اشعار کے ماہرین نے نہ کبھی دیکھا۔ سنا۔ ان سب باتوں کے علاوہ ابن ہشام نے ان روایات کو بھی چھوڑ دیا، جن کا تذکرہ بکائی نے اپنی روایات میں نہیں کیا۔ بہر حال ابن ہشام نے نہایت چھان بین کے بعد اپنی مشہور تصنیف میں صرف ان واقعات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو روایات اور علم سے پایہ ثبوت کو پہنچتے ہیں۔

ابن ہشام کی تصنیف اس قدر مقبول ہوئی کہ لوگ ابن اسحاق کو بھول گئے۔ ابن ہشام کی تصنیف کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ باوجود اس قدر کوشش کے ابن ہشام کی تصنیف میں بھی جابجا ایسے واقعات پائے جاتے ہیں، جن کی تصدیق کلام مجید یا احادیث صحیحہ سے نہیں ہوتی۔ ابن ہشام کے بعد سیرت نگار علماء کا ایک ایسا طبقہ ظہور پذیر ہوا، جنھوں نے ابن اسحاق یا ابن ہشام کی تصنیف کی تشریح یا اضافہ کیا۔ مثلاً ابوالقاسم عبدالرحمن بن سہیل متوفی ۱۵۵ھ۔

ابوالقاسم عبدالرحمن بن سہیل اندلس کے شہر القلۃ کے باشندے تھے۔ ان کی شروع تعلیم اندلس میں ہوئی۔ یہ اپنے زمانے میں

مشہور عالم شمار کئے جاتے تھے۔ دور دور سے طلبہ تحصیل علوم کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ان کی متعدد تصانیف پہلوں کی جاتی ہیں۔ جن میں سب سے مشہور "روضۃ الافان" ہے۔ روضۃ الافان سیرت پر ایک ضخیم کتاب ہے۔ جس میں ابن ہشام نے ابن اسحاق اور ابن ہشام کی تالیفات کی تشریح و تعلیق کی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر کتابوں سے بھی استفادہ کر کے جامع اطرافہ کیا ہے۔ یہ تالیف قابل قدر کوشش اور وسیع معلومات پر مبنی ہے۔

ابن ہشام کی تالیف کی تقلید کرتے ہوئے بدرالدین محمد ابن احمد العینی الخفی متوفی ۷۵۰ھ نے ایک کتاب سیرت پر لکھی۔ یہ تالیف بھی ابن ہشام کے طرز پر ہے اور قابل قدر تالیف خیال کی جاتی ہے۔

اس موقع پر ابو ذر الحاشی کی مساعی کو نظر انداز کرنا انصاف کے خلاف ہوگا۔ ابو ذر افریقہ کے مقام خشن کے باشندے تھے۔ انھوں نے مختلف مقامات کا سفر کیا۔ ان کے مختلف مشہور علماء سے علوم حاصل کئے۔ عربی لغت اور اشعار کے مشہور عالم خیال کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے ابن اسحاق کی تصنیف کی ایک نہایت اچھی شرح لکھی اور ابن اسحاق کی تصنیف میں جو غلطیاں تھیں، ان کو درست کیا۔ ان کی مشہور تصنیف ابن اسحاق اور ابن ہشام کی تالیفات کا اچھا خاصہ تتمہ ہو گئی۔

علاوہ ازاں ایک ایسا طبقہ ہوا جس نے ابن اسحاق اور ابن ہشام کی سیرت کی تلخیص کی۔ مثلاً برہان الدین بن ابی ہشام بن محمد المرسل الشافعی ۳۵۰ھ نے ایک کتاب "الذخیرۃ فی مختصر السیرۃ" تصنیف کی، جو اشعار باب پر مشتمل ہے۔ اسی طرح عماد الدین بن ابوالعباس نے ابن ہشام کی سیرت کو مختصر کر کے ایک کتاب "مختصر سیرت ابن ہشام" لکھی۔

بعض علماء نے سیرت کے رسول اکرم کی سیرت کو نظم کیا، تاکہ لوگ آسانی سے یاد کر سکیں۔ ان میں عبدالعزیز بن احمد المعروف سعد الدیری متوفی ۳۷۰ھ۔ ابوالحسن نفع بن موسیٰ ۴۰۰ھ۔ متوفی ۳۷۰ھ اور ابن شہید المتوفی ۴۹۰ھ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ابن ہشام کے بعد کے مصنفین نے مقدمین کے جمع کردہ سرائے سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ ظاہر ہے کہ مآخذ کے لئے نقص واقعات میں حدت کی گنجائش نہ تھی۔ لہذا انھوں نے واقعات میں بغیر کسی رو و بدل کے صورت، شکل اور ترتیب میں رد و بدل کی کوشش کی۔ چنانچہ ان لوگوں نے کبھی ابن اسحاق اور ابن ہشام کی تالیفات کا اختصار کیا۔ کبھی تشریح کی اور کبھی نظم کے قالب میں ڈھلا۔ بعض سیرت نگاروں نے اپنی تالیفات کو اس طرز میں پیش کرنے کی کوشش کی، گویا یہ ان کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ لیکن دیکھنا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے متعدد سیرت کی کتابوں کو جمع کیا اور ان سب میں سے واقعات اخذ کر کے سیرت پر ایک کتاب تالیف کی۔ چنانچہ ان کی تالیفات میں موجود ہیں۔ ایسے مؤلفین کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان میں ابن فارس اللغوی متوفی ۳۰۰ھ، محمد بن علی بن یوسف الشافعی متوفی ۳۰۰ھ، ظہیر الدین علی بن محمد الکازرونی متوفی ۳۹۰ھ، محمد بن یوسف الصالحی صاحب سیرۃ الشاہ متوفی ۳۹۰ھ، علی ابن برہان الدین صاحب "سیرۃ الجبیبہ" متوفی ۳۷۰ھ قابل ذکر ہیں۔

بعض علماء نے متعدد ایسے رسائل تالیف کئے جس میں رسول اکرم کی زندگی کے خاص پہلوؤں کو بیان کیا۔ مثلاً وہ خوارجی عادات واقعات، جو دورانِ طفلی میں آپ سے ظہور پذیر ہوئے۔ آپ کی صفات حمیدہ اور عہد شباب میں آپ کا ان چیزوں سے متعلق جن سے اس زمانہ کے نوجوان عادی تھے۔ الغرض ان رسالوں میں شروع حیات سے لے کر بعثت کے بعد تک کے واقعات ایک خاص طرز سے تحریر کئے گئے ہیں۔ مولود النبی کے نام سے موسوم ہیں اور جن کا علماء و دین سجدوں اور مغللوں میں پڑھتے ہیں یا بیان کرتے ہیں۔

سیرت نگاروں کے علاوہ بہت سے ایسے مصنفین بھی ہیں جنھوں نے رسول اکرم کے حالات، آپ کے بعد کے حالات اپنے زمانہ تک تحریر کئے۔ ان مصنفوں نے دراصل ایک عام تاریخ لکھی ہے جس میں رسول اکرم کی زندگی کے حالات بسط و شرح کے ساتھ درج کئے۔ مثلاً ابن جریر الطبری وغیرہ۔

علم سیرت کے گزشتہ زفیرو کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان میں جذبہ تنقید کا عموماً فقدان پایا جاتا ہے۔ ان مصنفین نے بعض ایسے واقعات کو جو حقیقت سے دور معلوم ہوتے ہیں، ضعیف قرار نہیں دیا۔ ممکن ہے کہ یہ جذبہ تقدس تنقید کے مانع ہو، کیونکہ تنقید کے لئے جرأت اور اقدام کی ضرورت ہے۔ ان علماء نے تقدس کی بنا پر ایسے واقعات کو، جو حقیقت سے دور معلوم ہوتے، رائے زنی کرنے سے احتراز کیا ہے۔ گزشتہ زمانہ کے مورخین کی تاریخی تصنیفات کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ گزشتہ زمانہ کے مورخین نہیں ناقصین تھے۔ انھوں نے وہ واقعات جو لوگوں سے سُنے یا پڑھے، اُن کو بغیر اپنی رائے کے دخل معہ راویوں کے نام کے اپنی تصنیف میں درج کر دئے۔ جن لوگوں نے سیرت کی کتابوں کی تلخیص کی، انھوں نے عموماً اُن واقعات کو، جن کی صحت کے متعلق اُن کو شبہ تھا، نظر انداز کر دیا۔ ایسی تصنیفات کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعات اصلے نظر انداز نہیں کئے گئے کہ تصنیف کی ضخامت کے اضافے کا اندیشہ تھا، بلکہ ان واقعات پر تنقید کی بجائے انھوں نے اُن کا ترک کرنا زیادہ بہتر خیال کیا۔

آج کل جب ہم جیت پسند سیرت نگاروں کی تصانیف کو دیکھتے ہیں، مثلاً محمد عبیدہ اور محمد حسین میمنی وغیرہ، تو ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چند واقعات خاص طور سے پیش نظر رکھ لیتے ہیں۔ جن کے متعلق دشمنان اسلام نے اعتراض کئے ہیں، اور جن کی بنا پر رسول اکرم کی ذات گرامی کو الزام کا آماج گاہ بنایا ہے۔ ان جذبات پسند سیرت نگاروں نے دلائل، در براہین سے معترضین کے الزامات کی تردید کی، مثلاً زینب بنت جحش سے زید ابن حارثہ کی شادی اور طلاق کا واقعہ۔ طلاق کے بعد رسول اکرم کی زینب بنت جحش سے شادی جس کے متعلق دشمنان ایمان نے رسول اکرم کی ذات بابرکات پر غلط افواہ اور غلط الزامات عاید کئے۔ بہر حال مذکورہ بالا مصنفین نے اس قسم کے حالات لکھے ہیں، نا ممکن ہے۔ رسول اکرم کے حالات اور شمایل شریفہ مسلمانوں کے لئے ہمیشہ اہم ترین موضوعات میں خیال کئے گئے ہیں، اور خیال کئے جائیں گے۔

معتبر اقوام نے متعدد زبانوں میں رسول اکرم کے حالات تحریر کئے ہیں اور تحریر کریں گے، لیکن رسول اکرم بہ صورت بشر تھے، لیکن سیرت، حیات اور کمالات میں فوق البشر تھے۔ چنانچہ اس مقدس شخصیت کے شہنہ طریقہ سے بھی حالات بیان کئے جائیں، کم ہیں۔ بقول شاعر؎

و علیٰ تعین و اصفیٰ بحسبہ یفتی الزمان و فیہ عالم یوصف

جو ہر طرح طرح کے محاسن بیان کرنے والوں کے زمانہ ختم ہو جائے گا، اور ان کے بہت کچھ اوصاف بغیر بیان کئے رہ جائیں گے۔

## رعایتی اعلان

من ویزواں - مذہبی استفسارات و جوابات - جاستان - نگارستان - شہوانیات - مکتوبات نماز تین حصے  
استقادیات - ماہ و ماہیہ - حسن کی عیاریاں - شہاب کی سرگزشت - فلاسفہ قدیم - مذاکرات نیاز -  
فرست الہد - نقاب اٹھ جانے کے بعد -

میزان  
میں

تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ حصول صرف چالیس روپیہ میں مل سکتی ہیں۔

نیچر نگار لکھنؤ

# آثر لکھنوی

(اپنے خطوط کے آئینے میں)

(نثار احمد فاروقی)

نواب مرزا جعفر علی خاں آثر لکھنوی کے مورث اعلیٰ ایران کے باشندے تھے اور شاہی دربار کے طبیب تھے۔ طبابت کے علاوہ دہریہ علوم مردجہ میں بھی اُن کی عظمت و اہمیت قائم تھی۔ کسی بات پر اُن کے دادا حکیم محمد شفیع مرحوم کا وزیر سلطنت ایران سے اختلاف ہوا اور وہ اصفہان سے ترک وطن کر کے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ مصطفیٰ کی روایت (تذکرہ عقد ثریا) کے مطابق کشمیر میں اقامت فرما ہوئے۔ اُن کی اولاد نے وہاں سے نکل کر آگرہ کو مسکن بنایا۔

حضرت آثر لکھنوی کے جد اعلیٰ حکیم محمد شفیع مرحوم کے تین فرزند تھے۔ ایک میرزا محمد سمیع ڈوہ عرن میرزا بچو، دوسرے حکیم رضا قلی خاں آثر تیسرے فرزند میرزا محمد وحسی تھے۔ میرزا محمد سمیع ڈوہ بھی اپنے عہد کے مسلم الشیوخ زبان داں اور خوشگو شاعر تھے۔ زبان فارسی کے رموز و سخا اور فن شاعری کے دقائق و حقایق پر اُن کی نظر بڑی گہری تھی۔

مصطفیٰ نے تذکرہ عقد ثریا میں ڈوہ کے متعلق لکھا ہے کہ اُن کا دیوان لکھنؤ میں میری نظر سے گزرا، قصاید، رباعیات اور ترجیع کے علاوہ تقریباً ڈیڑھ ہزار اشعار کا تھا۔

حضرت آثر لکھنوی نے مجھ سے بیان کیا کہ فارسی کی یہ مشہور رباعی جو سرود شہید کی طرف منسوب کی جاتی ہے ڈوہ کی ہے:-

سرا بگزشت وایں دل زار ہاں      گرا بگزشت وایں دل زار ہاں  
القصۃ تمام سرود گرم عالم      برا بگزشت وایں دل زار ہاں

ڈوہ نواب شجاع الدولہ کے دربار میں اور بہر آصف الدولہ کی بارگاہ میں عہدہ طبابت پر مامور تھے۔ آخر عمر میں زیادت عذبات عالمیات کے لئے کئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ لکھنؤ کے مشہور عالم علامہ تفضل حسین خاں بھی آثر لکھنوی کے اسلاف میں تھے اور اُن کے تبحر علمی کا زندہ آج بھی معترف ہے۔ حضرت آثر لکھنوی کے والد کا نام میرزا تفضل حسین خاں تھا۔ اُن کا گھرانہ ”جاگیر والے“ کے خطاب سے پکارا جاتا تھا اور علمی مجلسوں میں ”ثقافت کمرہ“ کے لقب سے یاد ہوتی تھی۔ حضرت آثر نے ایک قطعہ میں لکھا بھی ہے:

۱۔ مرزا رضا قلی خاں آشفقہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں (بحوالہ گلشن ہند: میرزا علی لطف)

۲۔ جی تھا آنکھوں میں یار تھا دل میں      کس قدر انتظار تھا دل میں  
۳۔ مرگیا ایک صنم پہ آشفقت      موت ایسی خدا نصیب کرے  
۴۔ شعلہ جو آگے تو اتنا نہ جلاتا تھا مجھے      آج تو آگ ہو اغیروں کے بھرد کا نے سے  
۵۔ دیکھتے ہی اُسے کل میرے یہ ادب ہاں گئے      اپنے بیگانے وہاں جتنے تھے سب جان گئے

اشیر نگرنے تذکرہ سرور اور تذکرہ گلشن کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ”۱۵“ میں لکھنؤ میں تھے۔

ثقافت کٹرہ کہہ کر لوگ ہم کو یاد کر سکتے تھے سند خود لکھنؤ میں بھی تھا معیار زبان اپنا  
آخر تم کیا ہو سو جواب اس کہنے سے کیا حاصل کہ تھا ممتاز ادب ادب میں دو دہائی اپنا  
حضرت آثر کے والد مفسور ”بڑے زندہ دل اور بار بار تھے شاعر بھی تھے اور طبیعت میں غضب کی آمد تھی۔ غزل کے علاوہ مزاجیہ اشعار  
کہتے تھے۔“ حضرت آثر کے پہلے دیوان ”آثرستان“ کے مقدمہ میں ان کے استاد حضرت عزیز لکھنوی مرحوم نے میرزا فضل حسین خاں مفسور کے  
شعار نقل کئے ہیں۔

نواب میرزا جعفر علی خاں آثر لکھنوی ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے اکلوتے فرزند تھے، بڑے ناز و نعم سے پرورش  
پائی۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم دستور زمانہ کے مطابق گھر ہی میں باپ نے عری بھی پڑھنا شروع کی لیکن میزان، منشعب سے آگے نہ پڑھ سکے۔ فرماتے تھے کہ  
داں۔ نہ حواس بگاڑ دئے!۔ اپنے ایک مکتوب میں (موضوع ۲۸ جون ۱۹۵۵ء بنام راقم الحروف) تحریر فرماتے ہیں :-

”میرے استاد کا نام سید محمد جعفر تھا۔ خوشنویسی میرزا علی حسین صاحب سے سیکھی۔ شہسوار سی ایک انگریز سے جو مسلمان ہو گیا تھا  
اور گھوڑ دوڑ میں گھوڑے دوڑاتا تھا۔ پورا نام نہ معلوم کیا تھا، لوگ ”چارلی“ کہتے تھے۔  
اسی مکتوب میں میرے ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :-

”میرے صنف میں لکھنؤ میں شاعری کا گھر گھر چلا تھا۔ میں نے اسی محل میں تربیت پائی۔ لڑکوں کا مشغلہ بیت بازی یا پہیلیاں  
بوجھنا تھا۔ بیت بازی کے لئے شعر یاد کرنا ہوتے تھے اور سات سے کچھ کو کبھی کبھی فی البدیہہ بھی موزوں کر لے جاتے تھے، شعر تو کیا تنگ بندی  
جو تھی تھی۔ مجھ میں شعر کا ذوق میرے چچا صاحب مرحوم نواب دلاور حسین خاں نے پیدا کیا وہ میری دادی صاحبہ کے بھائی کے فرزند تھے۔

اُس زمانہ میں جس کو اب سے ساٹھ برس ہوئے ہوں گے، غالب کی کوئی شرح شایع نہیں ہوئی تھی، اور پہل گو سمجھا جاتا تھا۔ چچا  
صاحب مرحوم، اُس کے اشعار کے وہ معنی بیان کرتے تھے کہ باید و شاید۔ اکثر شعرا کا کلام اُن کو حفظ تھا اور مختلف شعراء کا کلام بالمشابہ  
پڑھتے تھے اور اشعار کی خوبیاں بیان کرتے تھے تو بڑا لطف آتا تھا۔ انھیں کافیض نے کچھ میں شعر لکھنے کی استعداد پیدا ہوئی۔ میرے  
پچھو چچا صاحب قبل نواب مرزا محمد جعفر علی خاں تعلقدار و رئیس شیش محل اور ان کے صاحبزادے بھی میری تعلیم اور مشق سخن میں مبین  
ہوئے۔ دوران تعلیم میں کبھی کبھی شعر کہ لیا کرتا تھا۔ ۱۹۱۶ء سے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد فیصل مستقل ہو گیا اور مرزا محمد بادی  
صاحب عزیز لکھنوی مرحوم کو کلام دکھایا۔ اُن سے پیشترے خاندانی مراسم تھے۔ اور شاگردی سے پہلے باہم دوستانہ و برادرانہ تعلقات  
تھے وہ مجھ سے چند سال ہی بڑے تھے۔“

حضرت آثر نے ۱۹۰۶ء میں جوبلی ہائی اسکول سے جواب کینک انٹر میڈیٹ کالج ہے انٹرنس پاس کیا تھا۔ اور ۱۹۰۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے  
اسے کیا۔ ۱۹۰۹ء سے انگریزی ملازمت شروع کی۔ براہ راست ڈپٹی کلکٹری پر تقرر ہوا۔ اس کے بعد کانپور کے ایگزیکٹو آفیسر رہے، کلکٹر رہے  
اکسٹرن اور پھر الہ آباد ڈویژن کے ایڈیشنل کمشنر بنائے گئے۔ دوران ملازمت میں حسن خدمات کا صلہ خان بہادر، ایم، بی، اسی  
۱۹۳۵ء اور بے شمار تمغوں کی شکل میں ملا۔ ۱۹۳۵ء میں پنشن ملی اس کے بعد ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۵ء تک حکومت کشمیر  
وزیر تعلیم، وزیر داخلہ اور قائم مقام وزیر اعظم رہ کر خدمات انجام دیں۔

مب تک کسی کی شخصیت کا مطالعہ ڈوب کر نہ کیا جائے اُس کے بارے میں قائم کی ہوئی کوئی رائے مشکل ہی سے منصفانہ ہو سکتی ہے حضرت  
لکھنوی سے میرا تعارف عجیب طریقے سے ہوا۔ اُن کے تنقیدی مضامین اور کلام تو میں اکثر رسالوں میں پڑھتا رہا تھا۔ اُن کے مزید علم و فضل وقت  
اور زبان پر قدرت کا معترف بھی تھا۔ لیکن میں نے کبھی کسی شاعر یا ناقد کو اُس کی شہرت کے معیار و اعتبار سے تسلیم نہیں کیا نہ کسی کی عظمت کا

لے کٹرہ ابو تراب خاں، لکھنؤ کا ایک محدث ہے جہاں حضرت آثر کے بزرگوں کی بود و باش تھی۔

محض اس وجہ سے قابل ہوسکا کہ اُسے عظیم کہا جاتا ہے۔ حضرت اتر کے بارے میں مجموعی طور پر میری رائے ایسی نہیں تھی کہ بلا واسطہ اور بغیر تعارض و تکی طوف متوجہ کرتی۔ مگر ہوا یہ کہ ۱۹۵۷ء کی ابتدا میں مجھے سید سعادت علی احمد ہوی پر ایک مضمون لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ ان کے متعلق مختلف تذکروں میں خصوصاً تھوڑا حال پڑھا تھا اور چار دن طوف سے سچنے کے بعد بشکل پندرہویں اشعار ہاتھ آئے تھے لیکن مضمون لکھنے کا خیال تیر کی اس تحریر سے ہوا کہ میں نے سعادت کی ایما و ترغیب اور اصلاح سے ریختہ کوئی شروع کی ت۔ اس مضمون کے لئے میں نے علی گڑھ کا سفر کیا اور جب خدو می پر گھسیر رشید احمد صدیقی سے اس معاملہ میں رہبری چاہی تو انھوں نے فرمایا کہ نواب جعفر علی خاں اتر لکھنؤی نے تیر کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے اُن سے مفید مطلب مضامین حاصل ہوسکتے ہیں۔ رشید صاحب نے ہی مجھے حضرت اتر کا پتہ لکھوا دیا اور اس طرح مجھے اول اول ان سے خائبانہ تعارف حاصل ہوا۔

کشمیری محامہ، لکھنؤ - ۸ ستمبر ۱۹۵۳ء  
 کرم بنده - سلام مسنون  
 ..... آپ کا خط خلوص کا آئینہ دار ہے

[illegible]

لے (نگار) حضرت اقرنہ جو مفہوم بیان کیا ہے، دراصل وہی ہونا چاہئے اور غالباً کا مقصد وہی تھا کہ وہ گھر کو دشت سے زیادہ دیرانی قرار دے، ایکسٹنڈیبل  
غالباً لکھا ہوا ہے۔ اس شعر میں کوئی اور تسمیہ و توفہ تو مد طلب ہیں۔ لفظ تسمیہ یقیناً ذہن کی رمبہری اسی مفہوم کی طرف کرتا ہے جو حسانی نے بیان کیا ہے اور کوئی سے  
تینکے تھانے کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے اگر مجھے اے تسمیہ کے میں لکھا جاتا تو شعر تو تضاد باقی نہ رہتا اور مفہوم واضح ہو جاتا۔

آپ کا فرمایا بالکل درست ہے کہ جگر تشنہ (یا تشنہ جگر) اور تشنہ ہم معنی ہیں مگر میں عرض کروں گا کہ ہر جگہ نہیں مثلاً تشنہ غول کے بجائے تشنہ جگر غول، یا جگر تشنہ غول لانا غلط ہوگا۔ تشنہ یا تشنہ جگر (جگر تشنہ ترکیب مقلوب) کے مجازی معنی "کثرت سے آرزو مند ہونا" ہیں۔ غالب نے صرٹ جگر تشنہ کو نہیں بلکہ "جگر تشنہ فریاد" کو دل کی صفت قرار دیا ہے۔ جس کے معنی میری ناچیز رائے میں اس کے سوا نہیں ہو سکتے کہ "دل بذریعہ فریاد جگر کے غلے ہونے کے درپے ہوا"

۳۔ میں نے مجنوں پر لڑکپن میں اسد سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

اس شعر پر آپ کا اعتراض آپ کی وقت نظر پر دلالت کرتا ہے، میں نے اس شعر کو کبھی وقعت نہیں دی۔ مگر مجھے اعتراف ہے کہ جو اعتراض آپ نے وارد کیا ہے کبھی نہیں سوچا۔ شعر میں کوئی نکتہ نہ پہنچتا تھا معلوم ہوا نہ اب معلوم ہوتا ہے۔ شاید یہ بھی نہیں صرٹ متناسب الفاظ جمع کر دئے گئے ہیں۔

اس خط کے ساتھ پہلے شعر کا مفہوم تو صاف ہو گیا، مگر "پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا" میں چند در چند اختلافات پیدا ہوتے گئے۔ میرا خیال ہے کہ "جگر تشنہ فریاد" کا مطلب وہ نہیں جو حضرت آخر فرماتے ہیں کہ "دل بذریعہ فریاد جگر کے خون ہونے کا درپے ہوا"۔ اگر یہ مفہوم مان لیا جائے تو "جگر تشنہ" کی ترکیب غلط ہو جاتی ہے اور شعر میں کوئی معنی نہیں رہتے۔ میں نے شعر کو یوں سمجھا کہ "میرا دل فریاد کا بے حد آرزو مند ہوا تو مجھے اسکی تشنگی فرو کرنے کے لئے دیدہ تر یاد آیا (جو) اب دیدہ خشک میں تبدیل ہو چکا ہے" دیدہ تر یاد آیا "کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ "آمنسو ناباب ہیں" تو دیدہ تر کو آدہ گریہ کرنا بھی "یاد آیا" کے ضمن میں آ سکتا ہے۔ اب توضیح یوں کریں گے کہ اشک باری کرتے کرتے دیدہ تر نے ڈرام ہی لیا تھا کہ دل جو فراق یار میں فریاد کرنے کا عادی ہو گیا ہے، فریاد کی شدید پیاس محسوس کرنے لگا۔ آخر صاحب کے بیان کردہ مفہوم میں "جگر تشنہ فریاد" ایک ترکیب نہیں رہتی۔ تشنہ اور فریاد کے درمیان علاقہ اضافت ختم ہو جاتا ہے۔ آخر صاحب نے فرمایا کہ "فریاد کی تسکین گھر سے کیے گھر ہو سکتی ہے" میرا کہنا ہے کہ فریاد کوئی مستقل فعل نہیں بلکہ کچھ اضطرابی حرکتوں کا نام ہے جس میں گریہ و زاری، آہ و نالہ، اشک باری وغیرہ شامل ہیں۔ دل کا خواہش مند فریاد ہونا گویا گریہ و زاری اور اشک باری کا شغل جاری رکھنے پر اصرار کرنا ہوا۔ شاعر کے ذہن میں یہ خیال ہے کہ فراق یار میں مسلسل اشک و آہ اس کا مشغلہ ہے اور دل کو بھی اب اس کے بغیر چین نہیں پڑتا۔ گویا یہ وظیفہ فراق غذائے دل بن گیا ہے۔ دیدہ تر ڈرام ہی لیا تھا کہ دل نے پھر وہی تقاضا شروع کر دیا اور فریاد کرنے کے لئے بے چین و مضطرب ہوا۔ یہاں دو باتیں قابلِ لحاظ ہیں کہ "جگر تشنہ" دیدہ تر "استعمال کی گئی ہے اور یہ اشارہ کہیں نہیں ہے کہ "آمنسو خشک ہو چکے ہیں" اثر مظلہ نے فرمایا کہ "اگر آنا اس کی دلیل ہے کہ وہ (اشک) اس وقت موجود نہیں" اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ وہ دیدہ تر کا یاد آنا اس کے خشک ہونے کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ جو غالب کی مراد نہیں۔

ثانیاً جگر کا لفظ زاید محض تو نہیں لیکن وہ جگر تشنہ فریاد سے ہٹ کر اپنا مفہوم ادا نہیں کر رہا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ "دل بذریعہ فریاد جگر کے خون ہونے کے مصرع ہوا" تو یہ مصرع ترکیب کے اعتبار سے ناقص رہ جاتا ہے، کیونکہ اثر مظلہ کا مفروضہ مطلب "چشنہ خون جگر" کہنے سے تو نکل سکتا تھا "جگر تشنہ فریاد سے نہیں نکلتا۔ آخر صاحب نے شدید پیاس اور خواہش کا مفہوم بھی اسی ترکیب سے مستعار لیا ہے۔ جب یہ مفہوم افادہ کر لیا گیا تو وقت واحد میں جگر کے معنی علحدہ تصور کرتے ہوئے دل کا اس کے خون کا ذریعہ فریاد مبرا ہر کرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟

اس تمہید سے میرا سہو ذہنی واضح ہو گیا ہوگا۔ اب اثر مظلہ کا دوسرا مکتوب ملاحظہ فرمائیے :-

۴۔ اس شعر پر میرا اعتراض یہ تھا کہ پہلا مصرع میں لڑکپن کا لفظ محل غور ہے۔ دو کپڑے مس دور کہتے ہیں کہ انسان شعور سے محروم ہوتا ہے اور انجام و عواقب کی طرہ اس کی نظر نہیں ہوتی، مجنوں پر پتھر اٹھانے وقت سر کا یاد آنا اگر اسی سب سے ہے جو شاعریں نے بیاں لیا تو یہ لڑکپن کی عمر سے مستبعد ہے۔ لہذا شعر غلط ہوا۔ (نثار)

کشمیری محلہ لکھنؤ ، ۱۹ ستمبر ۱۹۵۳ء

کرمی ، تسلیم - عنایت نامہ مل گیا - بہت بہت شکریہ

سہ پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا دل جگر تشنہ فریاد آیا

میں نے آپ کے بیان کردہ مطالب پر غور کیا۔ میں ادب عرض کر دوں گا کہ میری شرح کا یہ جملہ اب بھی تشنہ جواب ہے: ”فریاد کی تسکین گریہ سے کیونکر ہو سکتی ہے؟“ آپ کا فرما ہے کہ ”دل فریاد کی شدید پیاس محسوس کر رہا ہے اور مجھے اپنا دیدہ تر یاد آ رہا ہے کہ وہ اس کی پیاس بجھائے“ فریاد کی شدید پیاس ہوئی فریاد کی شدید خواہش۔ اس کی تسکین رونے سے کیونکر ہو سکتی ہے؟ فریاد کی خواہش فریاد کرنے سے پوری ہو سکتی ہے اور اس میں کوئی امر مانع نہیں۔ مزید برآں کسی کی یاد آنا اس کی دلیل ہے کہ وہ اس وقت موجود نہیں۔ ”دیدہ تر یاد آتا ہے“ مواکرات لکھیں ہیں مگر آسنو نایاب ہیں۔ لفظ ”بھر“ سے اس طرف اشارہ ہے کہ آنکھیں پہلے ہی اتنا رو چکی ہیں کہ آنسو خشک ہو گئے اب آنسوؤں کا قطع ہے۔

میری شرح میں آپ کے اس اعتراض کا جواب موجود ہے کہ ”دل جگر کے خون ہونے پر آمادہ ہوگا تو دیدہ تر کیا کریں گے؟“ آنکھیں بجائے اشکوں کے جگر کا خون رویش کی شرح کے الفاظ یہ ہیں:- ”دل جو بیتاب گریہ تھا مصر ہوا کہ آنکھ میں آنسو نہیں تو فریاد کر کے جگر کا خون کرد اور اسی خون کے آنسو روؤ۔ میری تشنگی شوق کی تسکین بہر صورت ہونا چاہئے۔ کہا غلط ہوگا اگر عرض کر دوں کہ میری شرح کا آخری جملہ کہ ”فریاد کی تسکین گریہ سے کیونکر ہو سکتی ہے“ ہنوز تشنہ جواب ہے! اور آپ کی مزید توجہ کا محتاج۔ یقین ماننے کا یہ میری ہٹ دھرمی نہیں بلکہ آپ کے خرمودات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد عرض کر رہا ہوں۔

نیاز مند اثر

دیدہ تر یاد آیا“ کی یہ بحث نہیں ہوئی اور ذیل کے مکتوب پر اس شعر کی مزید رد و قدح کا خاتمہ ہوا

کشمیری محلہ لکھنؤ ، ۲۵ ستمبر ۱۹۵۵ء

کرمی ، تسلیم - عنایت نامہ کا بہت بہت شکریہ

سہ پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا دل جگر تشنہ فریاد آیا

میرا اب تک یہ سمجھتا تھا کہ فریاد کا مفہوم داد خواہی کے لئے، شور و غل پنانے، دہائی دینے تک محدود ہے۔ اسی سے میری مطبوعہ شرح کا آخری جملہ یہ تھا کہ ”فریاد کی تسکین گریہ سے کیونکر ہو سکتی ہے۔ یہ اگر فریاد میں گریہ و زاری بھی شامل ہے تو آپ کے بیان کردہ مطلب کی صحت میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ مگر مزید اطمینان کر لیجئے۔ میں اس باب میں آپ سے حقیق نہیں اور — مزید بحث کا بھی دم نہیں۔

شاید میں اپنے پچھلے عریضے میں سہو یہ لکھ گیا کہ ”دل خون جگر کو آنسو بنا کر بہانے پر صحر ہوا“ تاکہ اس کی تشنگی فریاد و فو ہو سکے (یہ عبارت آپ کے خط سے نقل کی ہے، میرے پاس مسعودہ محفوظ نہیں) میرا مشاء ابتدا سے یہ رہا ہے کہ دل فریاد کا نہیں بلکہ رونے کا مقتضی ہوا مگر میں پہلے ہی اتنا رو چکا تھا کہ آنکھوں میں تو آب اشک تھا یہ حالت دیکھ کر دل مقرر ہوا کہ ”دنیائی اشک پر“ فریاد کر کے جگر کا خون کرد اور اس خون کے آنسو روؤ۔ میری تشنگی شوق (گریہ) کی تسکین بہر صورت ہونا چاہئے۔ اگر ”جگر تشنہ فریاد“ سے یہ مراد ہے کہ دل فریاد کی شدید پیاس محسوس کرنے لگا تو بھی آپ کا بیان کردہ مطلب درست ہے۔ خصوصاً جب دیدہ تر یاد آنا بر بنائے ”دنیائی اشک نہیں“ بلکہ برائے تجدید گریہ ہے اور اس میں خشکی اشک کا مفہوم نہیں ہے۔

آپ فراتے ہیں کہ میں ”جگر تشنہ فریاد“ کو ایک لفظ تصور نہیں کرتا۔ غالباً مجھ سے پھر جگم خرم عریضہ سابق لغزش ہوئی ورنہ مطبوعہ شرح میں یہ جملہ موجود ہے ”جگر تشنہ فریاد“ ترکیب مرکب ہے، فرق ہمارے مابین اس ترکیب کے مفہوم پر ہے۔

آپ اس سے دل کی شدید پیاس مراد لیتے ہیں اور میں دل کا بذریعہ فریاد خون کرنے کا مطلب نکالتا ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر فریاد میں گریہ شامل ہے اور دیدہ ترکے یاد آنے میں خشکی، اشک کی طوفان لفظ پھر سے اشارہ نہیں ہے تو آپ کی شرح صرف صحیح نہیں بلکہ صاف اور میری شرح کی طرح پیچ در پیچ نہیں ہے۔

پگتھی یوں بھی سلجھ سکتی ہے کہ کچھ آپ سمجھیں کچھ میں سمجھوں۔ آپ یہ مان لیں کہ دیدہ ترکے یاد آنا یہ ہے کہ آنکھ میں آنسو نہیں مگر رونے کی شدید خواہش ہے۔ میں یہ مان لوں کہ اس ناپائی اشک پر دل شدید عطش سے فریاد کرنے لگا۔ یعنی جگر تشنہ فریاد کے وہی معنی ہیں جو آپ نے لے۔ فریاد کی شدید خواہش یا پیاس۔ کہئے یہ شرائط صلیح آپ کو منظور ہیں؟

مومن کا جو شعر آپ نے نقل کیا ہے، میں نے کبھی اس کی شرح کی تھی، ”مومن آج کل کے مولویانہ مذاقی سخن رکھنے والوں میں اس شعر کی بنا پر بہت بدنام ہے۔“

لے شب وصل غیر بھی کافی تو مجھے آزمائے گا کب تک

یہ لوگ نہیں سمجھتے یا سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ شعر کا حاصل کیا ہے۔ کوئی بے غیرت سی بے غیرت بازاری عورت تھی، اپنے چاہنے والے سے نہ کہے کی کہ آج شب وصل غیر ہے چلتے بنے یہ مومن عشق کی سوچی ہے کہ مومن کے آزمائے کو ایک جھوٹی اور فرضی بات کہتا ہے۔ دیکھنا چاہتا ہے کہ اگر اس کو دراصل مجھ سے محبت ہے تو سخت سے سخت آزمائش میں بھی پورا اترے گا؟ اور اس سے زیادہ سخت آزمائش کیا ہوگی کہ وصل غیر کی طوفان اشارہ کروں۔ مومن دوسرے دن کہتا ہے کہ لے شب وصل غیر بھی کافی! دوسرے مصرعے میں لفظ آزمائے سے جتنا دیتا ہے کہ وصل غیر محض افسانہ تھا۔ میرے آزمائے کو ایک جیلہ تراشا گیا تھا ۶

”ہوا ہے نہ تو“ اور نہ ہو گا کسی کا یہ مگر ذرا باتوں باتوں میں کبھی غیر سے بھی کہدے کہ آج مومن کی شب وصل ہے۔ پھر دیکھ اس کا کیا حال ہوتا ہے اگر امتحان میں ثابت قدم نکلے تو خط غلامی لکھتے ہوں۔ بہت سنجے فرائض کی۔ امیدوار غفور ہوں۔ اثر

مومن کے جس شعر کا مندرجہ بالا خط میں مفہوم بیان ہوا اس کے بارے میں برادر گرامی ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (ریڈر ویلیونیورسٹی دہلی) کا خیال ہے کہ ”شب وصل غیر محض ایک افسانہ نہیں جو مومن کی آزمائش کے لئے تراشا گیا، بلکہ مومن کی غیرت عشق کا امتحان تھا، اس کی ثابت تین اور استقلال کی آزمائش تھی جس میں مومن کامیاب ہوا۔“

فراق گورکھپوری نے اپنے ایک مضمون ”نظم و غزل“ کے تحت لکھا تھا،

”۔۔۔۔۔ کچھ دن ہوئے حضرت جوش نے اپنے نام سے غزل گوئی کے خلاف ایک مضمون سپرد قلم کیا تھا۔ حضرت جوش، مومن کے مشہور شعر:-

لے شب وصل غیر بھی کافی تو مجھے آزمائے گا کب تک

کو بے غیرتی کی مثال بتاتے ہیں۔ اس شعر میں احساس کرب کے مضطرب اور بے اختیار اظہار کے باوجود آہنگ الفاظ میں جو روک تھام ہے وہ معترض کے کثیف اور گند احساس کو چھو بھی نہ سکا۔ جو سکوت اس شعر میں سمویا ہوا ہے جو سخت الشعرات تعاشات اس شعر میں موجود ہیں ان کا پتہ چلانے کے لئے بہت جہد سماعی تفصیل کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔“ (منقول از بنیت راوی لاہور۔ ۱۵ اپریل ۱۹۵۷ء)

دیکھا جائے تو فراق بھی جو حضرت جوش کے اعتراض کا جواب دے رہے ہیں اس شعر کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے۔ ”تحت الشعرات تعاشات“ اور ”آہنگ لفظ کی روک تھام“ کو محسوس کرنے سے زیادہ مومن کی شاعری کے غالب عناصر اور اس کی غزل کے اجزائے ترکیبی یعنی شوخی بیان، رمز، طنز اور تیزخی نظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ حضرت اثر غلامی نے اس شعر کی شرح بیان فرمائی ہے وہ ایسی جامع اور واقعاتی ہے کہ اس کے بعد کسی دوسرے مطلب کی گنجائش رہتی ہو نہ رہتی۔

لے دنگاں اس شعر پر اتنی مدد بخود ضروری تھی مفہوم صاف ہے۔ دل کا فریاد پر آمادہ ہونا اور اشکباری لازم لزوم ہیں، دوسرے مصرعہ کو پہلے پڑھے اور پہلے کو اس کے بعد۔

لے (دنگاں میں اس باب میں ڈاکٹر فاروقی اور فراق نے تعلق ہوں مگر عاشق سمجھتا تھا کہ محض بہانہ ہے اور حقیقت نہیں تو پھر اس آزمائش پر پھر وکیل کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔

کشمیری جملہ، لکھنؤ - ۲۲ ستمبر ۱۹۵۲ء

کرمی - تسلیم - گرامی نامہ وصول ہوا ہے

ہے بزمِ بتاں میں سخنِ آزرده لبوں سے تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے  
آپ کے دونوں بیان کردہ مطالب میں لبوں کو خوشامد طلب فرض کیا گیا ہے۔ یہ امر مستبعد ہے۔ لب خوشامدی ہو سکتے ہیں  
خوشامد طلب نہیں ہو سکتے۔ جس کا مطلب ہے خوشامد کا خواہاں یا متوقع ہونا۔ لبوں کو گفتار سے توریڈ ہے مگر سخن سے طلب، خوشامد  
کیونکر کریں گے۔ سخن کا لبوں سے آزرده ہونا یا یہی رشتہ منقطع ہو جانا ہے جس کا آل خاموشی ہے۔ چونکہ بہت خاموش رہتے ہیں لہذا  
اُن کی بزم اور ار کے قہقہے میں سخن بھی لبوں سے بیگانہ ہو جاتا ہے، مدٹھ جاتا ہے۔ حسرت و تیر کے اشعار کا مفہوم غالب سے بالکل  
مختلف ہے۔ تیر کہتے ہیں کہ معشوق کا سامنا بھی ہوتا، منہ سے بات بھی نہ نکالتی۔ اس کا سبب رعبِ حسن ہو یا محویت و دوار، یا  
افراطِ شوق یا شدتِ اضطراب یا ان سب کا مجموعی اثر۔

حسرت کہتے ہیں کہ تیر بنائے احتیاط اظہارِ مدعا ہوا (مبادا معشوق ناراض ہو، یا عشق کی تذلیل کرے)  
ہے میں عدم سے بھی پرہے ہوں ورنہ غافل باربا میری آہ آتشیں سے بالی حقا جل گیا  
ورنہ کا لفظ بھرقی کا نہیں ہے بلکہ مخاطب کے خیال کی تردید کرتا ہے: اے غافل (رموزِ معرفت سے بیگانہ) تو سمجھتا ہے کہ میں معدوم  
ہوں۔ نہیں میں اس سے بھی بالاتر منزل میں ہوں جہاں وجود و عدم کا فرق اور تضاد مٹ گیا ہے۔ غالب کا شعر فلسفیانہ ہے  
اس کو مجازی عشق کے معاملات سے منسوب کرنا شاید درست نہ ہو۔ اس میں غافل سے مراد معشوق نہیں ہے لہذا معشوق کا آہوں  
کی بے اثری پر طعنے دینے کی بھی گنجائش نہیں بلکہ ایسا شخص مخاطب ہے جو وجود و عدم کے صحیح مفہوم سے نا آشنا ہے۔ نیاز مند اثر  
مکتوب مندرجہ بالا میں دو اشعار آئے ہیں، پہلا شعر ہے

ہے بزمِ بتاں میں سخنِ آزرده لبوں سے تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

شارعین نے سخن کو مخاطب بتایا ہے اور اس پر غور نہیں کیا کہ وہ حصہ واحد استعمال ہوا ہے اور مصروفِ ثانی میں اس کی صفت (خوشامد طلبوں)  
بھی جمع آئی ہے۔ اثر صاحب یہ صفت بتوں کی قرار دیتے ہیں۔ اس شعر کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ (۱) معشوق کی بزم میں سبب رعبِ حسن  
لب سخن آشنا نہیں ہوتے اور بلحاظِ آداب خاموش ہیں یا محویت کے سبب سے۔ سخن کو لبوں سے اسی خاموشی کی شکایت ہے یعنی لبوں کی خاموشی  
سبب خوشامد طلبی ہے، اور یہ شکوہ سخن کو ہے کہ مصروفِ ثانی میں تنگ آئے ہیں ہم سے شاعر نے اپنی ذات ہی مراد لی ہے) کہ:-  
”تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے“۔ یعنی خوشامد طلب لبوں سے نہ کہ ”بتاں“ سے۔

(۲) مدت میں بزمِ ناز میں باریابی نصیب ہوئی۔ چاہتے ہیں کہ کچھ بات کریں، راز دارانہ و دوستانہ شکوہ شکایات ہوں۔ مگر ایسے موقع پر  
لب سخن سے آزرده ہو گئے ہیں۔ (یعنی ہونٹ ریل گئے ہیں بات منہ سے نہیں نکلتی!) ان خوشامد طلب لبوں نے ہمیں تنگ کر دیا ہے۔ اسی مفہوم  
اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ اور پیرائے میں بہت سے شاعروں نے باندھا ہے مگر غالب سب سے الگ راہ کیوں نہ نکالتے؟ وہ تو  
دائے عام میں سب کے ساتھ مزنا بھی طبعِ جدت طراز کی تو ہیں سمجھتے تھے۔ میں نے یہاں تیر اور حسرت کے ان شعروں کو پیش کیا تھا  
کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عسمر ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا۔ (حسرت)  
یوں کہتے تھے، یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا (تیر)

میں نے حضرت اثر سے عرض کیا تھا کہ غالب کے اس شعر میں ”بتاں“ اور ”خوشامد طلبوں“ جمع ہے لیکن ظاہر ہے، غالب کے معشوق ایک  
سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ حضرت اثر کے بیان کردہ مطلب کا خلاصہ یہ ہے کہ بتوں کی خاموشی کے نتیجے میں ہمارے لب بھی بند ہیں لیکن اس  
مفہوم کو درست مان لینے کے بعد میری رائے میں شعر کسی خاص کیفیت کا آئینہ دار نہیں رہتا۔

دوسرا شعر نمبر ۱۰ بکثرت ہے:

میرا مفروضہ مطلب یہ تھا کہ ”فنائے وجود کی خواہش نے مجھ اب عدم سے بھی ماورائیک ایسی منزل میں پہنچا دیا ہے جہاں مجھ پر ’عدم‘ کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا۔ یعنی جب تک میں عدم میں تھا، میرا عدم سے وجود کی طرف مراجعت کرنے کا امکان باقی تھا، اب وہ اضافی منزل گزر گئی اور عدم سے مراجعت کرنے کا امکان باقی تھا، اب وہ اضافی منزل گزر گئی اور عدم سے مراجعت الی الوجود کا امکان بھی ختم ہو گیا۔ موجودہ مقام ”ماورائے عدم“ سے پہلے جب میں ”عدم محض“ کی منزل میں تھا تو میری آتشناک آہوں نے غنقا کے بال و پر جل کر خاک تر کر دئے تھے اور اسی لئے اب غنقا کی مراجعت ہستی کی طرف ممکن نہیں ہے۔ اس شعر میں ”ورنہ“ کا لفظ بار بار کھٹکتا ہے۔ ممکن ہے وزن پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہو۔ غافل کو یا تو اسی قبیل سے سمجھا جائے جیسا دوسرے شاعروں نے ہم نشین، ہم صغیر، ہم نفس، ہم دم وغیرہ الفاظ کا طلب کے لئے استعمال کئے ہیں، یا پھر غافل سے مراد وہ شخص ہے جو شاعری کی کیفیات اور اس کی منزلوں سے، یا اس کے مقام و موقع سے، واقف نہیں اور بے بھری سے طعنہ زن ہے۔

ایک مطلب اس شعر کا یہ بھی ممکن ہے (محازی معنوں میں) کہ تم میری آہوں کی بے اثری کا طعنہ نہ دو۔ میں محبت میں فنا و عدم کی منزلوں سے بھی گزر گیا ہوں۔ جب تک عدم میں تھا اس وقت تک بھی آہ میں اتنی آتشناکی تھی کہ اس سے غنقا کے بال و پر جل جاتے تھے اب جہاں میں ہوں وہ منزل ہی عدم سے ماوراء ہے، یہاں تو عیناً بھی نہیں، اب آہوں کی آتشناکی کا اثر ہو تو کس پر ہو؟ مقام فنا کی انتہائی بلندی کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ آہوں کو بے اثر مت کہو، کہ وہ چیز ہی اب کون سی ہے جس پر آہ اثر کرے! میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اس شعر کو ”منصوفانہ“ کہنا غالباً درست نہ ہوگا۔ بلاشبہ اس میں تصوف کی جھلک ہے لیکن پھر اس کا مطلب اتنا پیچ در پیچ نکلے گا کہ ”کوہ کندن و کاکہ برآوردن“ کا مصداق ہو جائے گا اور ذرا بقاء کے نظریات کی اصولی بحث چھڑ جائے گی کیونکہ دراصل مقامات تصوف میں کوئی منزل فنا کے بعد بجز وصل کے نہیں ہے۔ اپنے وجود کی نفسی باری تعالیٰ کی ذات کا ایجاب و اثبات ہے۔ ”عشر طہرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا“ قطرے کے واصل بدیا ہونے کے بعد اور کوئی منزل نہیں رہتی جو مانع وصال ہو۔ اس لئے باعتبار مفہوم اس شعر میں عدم میں بھی رنج و جھوجی کا ظاہر کرنا بے بسی بات ہوگی۔ کم از کم اخلاق تو ضرور ہے۔ شائیاں بدیں صورت بال غنقا کا جلنا کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔ حرمت اثر اتنا کہہ کر میرے ہم نوا ہوئے ہیں کہ ”جب تفریق فنا و بقا مٹ گئی تو اب آہ کی کیا ضرورت ہے؟“ لیکن یہیں سے اپنا راستہ بدل دیا۔ تفریق فنا و بقا مٹنے سے زیادہ یہاں فنائے وجود کہنا مناسب تھا شاعر فنا کی منزل سے گزرا، اور وصل کی منزل میں آیا ہے۔

ان تمام شکوک کے اظہار کے بعد میں نے عرض کیا تھا کہ شعر کا قرن قیاس مفہوم یہ ہو سکتا ہے: (میری آہوں کی بے اثری کا شکوہ کرنے والے) غافل، میں تو (محبت میں) فنا کی منزل سے گزر چکا ہوں۔ (اس لئے اب آہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا) ورنہ جب تک فنائے محض کی منزل میں بھی تھا میری آہوں کی اتنی تاثیر تھی کہ اس سے غنقا کے پر و بال جل جاتے تھے۔ عدم محض کی منزل میں غنقا کے پر جل جانا قرن قیاس ہے جس طرح ماورائے عدم میں پہنچ کر عاشق کی مراجعت ہستی کی طرف ممکن الایم نہیں۔ اسی طرح اس نے غنقا کے ہستی کی طرف ممکن الایم نہیں۔ اسی طرح اس نے غنقا کے ہستی کی طرف رجعت کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ کیونکہ اب وہ سوختہ بال ہے۔ اس میں ایک پہلو اور بھی ہے۔ جو اگرچہ خیال آرائی سے زیادہ نہیں لیکن بہر حال بات کا ایک پہلو ہے۔ محبت میں عاشق کو کسی کی رقابت گوارا نہیں۔ وہ معشوق کو اپنے میں سمولینا اور خود معشوق میں سما جانا چاہتا ہے۔ غنقا کا منزل عدم میں ہونا اگر وصل محبوب کے لئے ہے تو سالک نے منزل عدم کو اپنا رقیب جان کر اس کے آگے بڑھنے کے امکانات اپنی آواز آتشک کے اثر سے ختم کر دئے۔ اب غنقا نہ ہستی کی طرف لوٹ سکتا ہے نہ عدم کی منزل سے ماوراء وصال محبوب کے مقام تک آ سکتا ہے وصل کے بعد عشق کے تمام لوازمات آد و نالہ وغیرہ چونکہ ختم ہو گئے، عاشق کا ساتھ انھوں نے منزل عدم تک دیا اور وہاں بھی یہ

لہائے ذکر حقائق رقابت سے عاشق کو محفوظ و مطمئن کر دیا۔

اسی شعر کی بحث کے سلسلہ میں چونکہ تصوف کی بات درمیان میں آگئی تھی اس لئے مجھے "تصوف کا نظریہ فنا و عدم" (مطبوعہ معیار ۱۹۵۳ء) غلطہ لکھنا پڑا۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ غالب کے زیر نظر شعریں متصوفانہ مفہوم کی گنجائش ختم نہیں ہے بلکہ مجازاً معنی ہلہل اور قریب ہیں۔ اگر سے تصوف کے رنگ میں دیکھا جائے تو بال حقائق کے جلنے کو استعارہ کہیں گے خیال ماسوی اللہ کا۔ اب حقائق بھی راہ عدم میں مراد ہے خیال غیر کے۔ بعد حضور ہی قلب میں مانع و مزاحم ہو سکتا ہے لہذا اسے سوخت کر دیا بعض شاعرین اس شعر کو جہل کہہ کر چھوڑ دیا ہے، لیکن فی الحقیقت یہ شعر جہل نہیں ہے بلکہ فشار معنی کے سبب سے بیدار معلوم ہوتا ہے۔ اسٹے بڑا پیش نظر بعد حضرت آثار و غلہ کا مکتوب گرامی ملاحظہ فرمائیے:-

کشمیری مجلہ لکھنؤ - ۱۹ ستمبر ۱۹۵۲ء

مکرمی - تسلیم - ۱۹ ماہ حال کا گرامی نامہ ملا۔ جس خط کا آپ نے ذکر کیا ہے اس کا جواب ارسال کر چکا ہوں۔ امید ہے کہ مل گیا ہوگا ہے

ہے بزم بتاں میں سخن آزرده لبوں سے تنگ آئے ہیں ہم اپنے خوشامد طلبوں سے  
"بتاں" بصیغہ جمع اکثر شاعروں نے استعمال کیا ہے۔ اس سے عموماً مراد ہوتی ہے کہ جس خصوصیت کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب معشوقوں (بتوں) میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثلاً میر کے یہ اشعار:-

لطف گریہ ہے بتاں صندل پیشانی کا حسن کیا سبج کے پھر چہرہ نورانی کا  
بتاں کے عشق بے اختیار کر ڈالا وہ دل کہ جس کا فدائی میں اختیار رہا

غالب کے شعریں بزم بتاں سے یہ مطلب نکلا کہ ہریت (معشوق) کی بزم میں یہ عام دستور ہے کہ سخن لبوں سے آزرده رہتا ہے۔ (لب آشتائے گفتار نہیں ہوتے)۔ سخن کا لبوں سے آزرده ہونا یہ ہے کہ سخن میں اور لبوں میں رابطہ نہیں رہتا علاوہ بریں بعض مواقع پر کثرت کا اطلاق مجموعہ کی ہر فرد پر ہوتا ہے۔ جمع سے واحد مراد لی جاتی ہے۔ کسی خط میں عرض کر چکا ہوں کہ خوشامد طلبوں سے بجائے معشوق کے لبوں سے مراد لینا میری طبیعت قبول نہیں کرتی۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بار ہا میری آہ آتشیں سے بال حقائق جل گیا  
آپ فرماتے ہیں کہ "رموز معرفت کے آشنا (سالمک و مجذوب) کو آہ آتشیں سے کیا علاقہ؟" تصوف کا دار و مدار عشق پر ہے۔ (عشق حقیقی - بندے کا عشق خدا سے) جب تک رنج مجبوری ہے آہ و زاری ہے۔ غالب اس شخص کو جو حقیقت سے نا آشنا ہے اور ان کے ترک نالہ و آہ کو مایوسی اور بے تاثیر پر محمول کرتا ہے، مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اب میں اس منزل فنا میں ہوں جو عدم سے بھی ماورا ہے۔ فنا کی ہوس بھی فنا ہو گئی۔ جب منزل عدم میں تھا تو احساس و فکر تھا اور آہ آہ کرتا تھا اور آہ میں اتنی تاثیر تھی کہ حقائق کے بال و پر جل جاتے تھے۔ عدم کی منزل سے بالاتر ہو جانے کے بعد جب تھریق فنا و بقا مثلاً کو اب آہ کی کیا ضرورت رہی؟ میں نہ تو سالمک ہوں نہ مجذوب، البتہ مسایل تصوف سے آگاہی کا شغف ہی نہیں رہا ہے بلکہ (باوجود شیعہ ہونے کے) اکثر حضرات صوفیائے کرام کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کیا ہے اور ان سے متنبع ہونے کے علاوہ کتب تصوف کا مطالعہ بھی کیا ہے اور اس کے "مقامات" کو سمجھنے کی کوشش کی ہے

۱۔ (تنگار) یہ شعرا کی بحث کا محتاج نہ تھا۔ بتاں اور خوشامد طلبوں دونوں ایک دوسرے کا بدل ہیں۔ اس شعر کا مفہوم یہی ہے جسے غالب بھی  
طرح ظاہر کرتا ہے۔ "وہ کہیں اور نہ لکھ کر کوئی"



اس کے بعد جو مکتوب درج کیا جا رہا ہے اس کی شان نزول یہ ہے کہ برادر گرامی جناب سہیل عظیم آبادی پٹنہ سے ایک معیاری موبی رسالہ ”تہذیب“ نکالتے تھے۔ جس میں حضرت اثر لکھنوی کے ایک مضمون سے (جو غالباً نعمان احمد صدیقی نام کے ایک مضمون نگار کے جواب میں تھا) فراق کی شاعری پر بحث کا آغاز ہوا۔ بحث کافی دلچسپ تھی۔ اس میں بہت سے لوگوں نے حصہ لیا، طالب جے پوری اور ناشاد کے مضامین بھی فراق کی حمایت میں چھپے تھے۔ سہیل بھائی کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے میں نے بھی مضمون (تیسرے فراق معروض بحث میں) لکھا، اور اس میں کہیں یہ جملہ لکھ دیا کہ ”جہاں تک آفاقی اقدار کا تعلق ہے وہ شاعر کے کلام میں ہیں نہ فراق کے“۔ حضرت اثر لکھنوی نے میری توجہ اس طرف دلائی۔ اور ان کی ہدایت سے میں نے مزید مطالعہ کے بعد اس غلطی کی اصلاح کی۔ میں اپنی کم علمی سے یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ آفاقی اقدار کا تعلق صرف ان عناصر سے ہے جو سماج، تہذیب، اور تاریخ کی تعمیر مدد دیں، اور ان کا انفرادی محسوسات و محرکات سے کوئی علاقہ نہیں گہرے مطالعہ کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ”آفاقی قدریں“ جو میں سمجھے بیٹھا تھا ان سے کہیں زیادہ افضل، اعلیٰ اور اہم ہوتی ہیں لیکن اس غلطی کی تبدیلی کے بعد بھی میرے مذکورہ جملے کا یہ جو صحیح ہے کہ ”آفاقی اقدار فراق کے کلام میں نہیں۔“ اب مکتوب ملاحظہ ہو:

کشمیری محلہ لکھنؤ - ۵ اکتوبر ۱۹۵۳ء

مکرمی - تسلیم - گرامی نامہ مع مضمون مل گیا۔ اگر آپ اپنے مضمون کو مجھ پر واضح کر دیں کہ ”آفاقیت“ اور ”عالمگیر اقدار“ سے آپ کا متعلق کیا ہے اور بطور نمونہ کسی شاعر کے دو چار شعر درج کر دیں جن میں آفاقیت ہے اور عالمگیر اقدار پر روشنی پڑتی ہے اور جو مشاہدہ اور مطالعہ کی بنیادوں پر کہے گئے ہیں تو میں غور کرنے کے بعد تیسرے کلام کا دوبارہ مطالعہ کروں اور دیکھوں کہ آپ کی اس رائے سے متفق ہو سکتا ہوں کہ ان چیزوں کا تیسرے کلام میں فقدان ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہر قسم کے تعصب اور عقیدت سے خالی الذہن ہو کر آپ کے فرمودات پر غور کروں گا اور جس نتیجہ پر پہنچوں گا آزادی سے بیان کروں گا۔

نیا زمند اثر

انھیں دنوں میری علالت کا سلسلہ چلا۔ حضرت اثر مدظلہ نے گرامی نامے کا جواب نہ پا کر یہ خیال فرمایا ہوگا کہ درج بالا مکتوب کے کسی جملے سے میں ناراض ہو گیا، ذرا قدامت کی اس وسوسہ داری کو، اور نواب میرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی اس فراخ دلی عالی شان اور بلند ظرفی کو ملاحظہ فرمائیے کہ کہاں فرمایا یہ نثار اور کہاں یہ انداز معذرت۔

کشمیری محلہ - لکھنؤ - ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۳ء

مکرمی - تسلیم - شاید میری کوئی بات ناگوار ہوئی کہ آپ نے خط بھیجنا بند کر دیا۔ میری لغزش سے مجھے مطلع کیجئے اور مددخواہی کا موقع دیجئے۔

میں نے دانش محل کتاب گھر کو ہدایت کی تھی کہ ”آثر کے تنقیدی مضامین“ اور ”چھان بین“ کی ایک ایک جلد آپ کی خدمت میں روانہ کر دی جائے۔ معلوم نہیں کہ تعمیل ہوئی یا نہیں۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔ نیاز مند اثر

میں نے بیماری کے عالم میں ہی لکھا کہ قبلہ میں اور آپ سے ناراض ہو جاؤں۔ یہ تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اب دیکھیے:-

کشمیری محلہ لکھنؤ - ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۳ء

مکرمی - تسلیم - آپ کا مفصل خط ملا۔ جان میں جان آئی۔ اس خلفشار میں مبتلا تھا کہ آپ ناراض ہو گئے۔ اطمینان ہوا اور شکر خدا بجالایا۔ غالب کے پیچیدہ اشعار کے مطالب میں اختلاف رائے ناگزیر ہے۔ مطالعہ غالب پر آپ کی مجموعی رائے کا بڑے شوق سے انتظار ہے تاکہ طبع ثانی کی اگر نوبت آئے تو اس سے استفادہ کروں۔

صوفیوں کے متعلق ہمارے باہمی اختلاف کا آپ کے اس جملے نے خاتمہ کر دیا: ”قصوں میں کوئی اصلاحی، علمی یا مفید پہلو ہے تو وہ اخص خواص کے لئے ہے۔“ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت بڑی حد تک بعض صوفیائے کلام کا فیض ہے

گلاب دیکھتے برگزیدہ نفوس کہاں؟ میری جوانی تک تھی۔ شاہ ولایت علی خاں صفی پوری، شاہ سلیمان پھلواروی، حکیم محمد براہیم بریلوی وغیرہ۔ شاہ ولایت علی خاں علیہ الرحمہ فارسی کے زبردست شاعر تھے۔ ان کے چند اشعار سنئے۔  
 یک شب چو شمع جلوہ دہکد نگار ما پر وازد وار گرد بگرد مزار ما  
 سے از کعبہ ہر دوں رقت احرام ہوس ہارا مستانہ دعا گفتم پیران کاپسارا  
 (دوسرے مصرع میں محفل سماح کی پوری تصویر ہے۔ عالم وجد میں ایک شخص رقص و پا کو باں کہہ رہا ہے "مستانہ دعا گفتم" ہاتھوں کی گردش پاؤں کی دھمک سب کچھ آنکھوں میں پھر جاتی ہے)

جام بدست می رود، سرخوش و مست می رود، خازنہ کشیدہ روئے را باز کشادہ موسئے را  
 کیسی حسین تصویر ہے، مست و سرشار!  
 سر صاحب جیسا مستانہ مطلع مولوی روم علیہ الرحمہ کا ہے میری نظر سے نہیں گزرا۔ چڑھتا ہوں اور جھومتا ہوں، جھومتا ہوں اور لڑکھڑاتا ہوں اور سر تمام کے بیٹھ جاتا ہوں۔ اس میں ذرا بھی مہاندہ نہیں شراب میں وہ نشہ کہاں جو اس میں ہے سنئے  
 (بلا سے آپ پہلے سن چکے ہیں) سے

من باتو نمی گفتم کم دہ دوسہ پیمانہ من مستم و تو، مستی انکوں کو برو خانہ؟  
 حاصل یہ ہوا کہ آؤ ہم تم ہمیں سے ناشتہ میں لگے ہیں، باغیچیں ڈال کر سو جائیں۔ نہیں؟ اچھا تو پھر ایک دوسرے کو سنبھالے ہوئے چلیں۔ "لا ہرے" کو معشوق اپنے ہی گھر جانے کو کہے گا۔ وہاں پہونچ کر یہ کہیں گے کہ یا تو اب یہ نہیں نہیں باقی رات بٹا رہتے دو، ورنہ مجھے میرے گھر پہونچاؤ۔ مجھے اتنا ہوش کہاں کہ بغیر سہارے کے جاسکوں کیا شوخی ہے کیا لگاؤ ہے کیا راز و نیاز ہے۔

میں نے مختلف اوقات میں اس زمین میں کئی غزلیں کہیں، ایک قصیدہ بھی کہا مگر "عشق نسبت خاک را با عالم پاک" پاس ادب یہاں درج کرنے سے مانع ہے۔ علیحدہ کاغذ پر ملاحظہ فرمائیے۔ میرے اشعار کی برقرارگی سے مطلع کا حسن اور زیادہ چمکائے گی۔ ایک مطلع داراب بیگ جو یا کا یاد آگیا۔ نعت میں لا جواب ہے:

دستے کہ در پیالہ حسنت شراب ریت، دُر دے کہ اندر تدرج آفتاب ریت  
 (باقی) نیازمند آخر

لے حضرت آثر نے بہت زمانہ جو شاہ ولایت منشی پوری کی فارسی شاعری پر ایک مضمون بھی سپرد قلم فرمایا تھا وہ مضمون ایسا ہے کہ اسے تنقید و تحریف کا شکار کہا جائے۔ میرا حافظہ کہتا ہے کہ یہ مضمون نیز موجود ہے اور اس کا مسودہ میں نے حضرت آثر کے پاس دیکھا تھا ۱۲۔

## فلسفہ مذہب

مولوی مقبول احمد صاحب کی وہ ہنگامہ خیز تصنیف جس نے علماء اسلام کی "کافر ساز" مجالس میں ٹپل ڈال دی تھی اس میں مذہب کی ابتدا ضرورت مذہب، قومیت و اہلیات، مذہب و نبوت، مذہب و تکوین، مذہب و معاد، مذہب و تقریر، مذہب و اخلاق، مذہب و عبادات اور انجام مذہب پر نہایت محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت دو روپیہ۔  
 میجر نگار لکھنؤ

# ابلیس

(ارشاد کا کوئی)

(کافی مذمت اور مختصر اضافے کے بعد عیسیٰ جبران کے ایک فن پاسے کا اخذ و ترجمہ - ارشد)

اُس دیار میں کھانا فاروق کی عظمت مستقیم تھی۔ روحانی اور مذہبی معاملات میں ان کی حیثیت ہادی و رہبر کی تھی۔ ان کے علم کی گہرائی اور معلومات کی وسعت کا شہرہ تھا۔ سزا و جزا، عذاب و ثواب اور عذوب و جنت کے جملہ مسائل میں مولانا کا فرمان سند تھا۔ اگر ایک طرف ان کی انگلیاں شمار سجد میں مصروف رہتیں تو دوسری طرف ان کے دہن مبارک سے خدا اور رسول جیسے الفاظ بھی ہمیشہ ادا ہوتے رہتے اور سنا ہی ساتھ شیطان اور لاعلم کا ورد بھی ہوا کرتا۔ قرآن پاک کے حافظ تھے۔ حدیثیں اذ برتتیں۔ بچا کرتا، اونچا پانچا، گھٹا ہوا، بڑھی ہوئی، دارھی۔ غرض کہ مولانا کا لباس اور ان کا سراپا کیا تھا، شریعت تھی جو مجسم ہو گئی تھی۔ اپنے ہی گھٹل کے لوگوں کی فحش پر منحصر نہیں۔ مولانا کا میدان عمل بڑا وسیع تھا۔ گاؤں گاؤں، ٹکڑے ٹکڑے دورہ کرتے۔ ہاں شہروں سے زیادہ رغبت نہ تھی۔ روحا امراض سے لوگوں کو نجات دلانا اور ابلیس کے خطرناک دام سے ان کو بچانا۔ مولانا کا نصب العین تھا۔ ابلیس سے ان کی بڑی پرانا چلی آرہی تھی۔ اُسٹھے بیٹھے اسے بے نقط سنانے۔ اب اس کا حساب کون کرتا کہ ان کے دہن مبارک سے خدا اور رسول کے الفاظ ادا ہوتے ہیں یا ابلیس لعین کا ذکر زیادہ ہوتا ہے۔ مولانا، ابلیس کے خلاف اپنی ذات سے مستقل ایک محاذ تھے۔ جہاں چلتے سیکڑا سران کی عقیدت میں جھک جاتے، جدھر نکل جاتے عزت و عظمت کے پرچم لہرائے لگتے۔ سیدھے سادے کسان ان کا احترام کرتے ان کی ہدایتوں اور دعاؤں کو سونے چاندی کے عوض خریدنے کو بے چین رہتے۔ ہر فصل کی بہترین پیداوار مولانا کے یہاں پہنچے جا موسم خزاں کی ایک شام کا ذکر ہے۔ مولانا اپنے چھوٹے سے گاؤں کی مسجد سے عصر کی نماز پڑھ کر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں قریب سے کسی کے کراہنے کی ایک دلدادہ آواز سنائی دی۔ مولانا کے قدم رک گئے۔ انھوں نے آنے والی آواز کی طرف نظر دوڑائی۔ پا ہی ایک گدھے میں ایک نیم برہنہ آدمی پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کے سر اور سینے میں گہرے زخموں کے نشان تھے۔ خون کی دھار چھوڑ رہی تھی۔ وہ بے طرح کراہ رہا تھا۔ ”مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ میرے حال پر ترس کھاؤ۔ میں مر رہا ہوں آہ آہ۔“ مولانا گھبرائے گئے اور سوچنے لگے۔ ”یہ شخص ضرور کوئی چور ہے، غالباً اس نے راہگیروں کو لوٹنے کی کوشش کی ہے اور کسی نے اسے بری زخمی کر دیا ہے اگر میں نے اسے بچانے کی کوشش کی اور وہ جانبر نہ ہو سکا تو کہیں میں ہی قتل کے جرم میں نہ بچوں گا۔“ اس خیال کا آنا تھا کہ مولانا آگے بڑھنے لگے۔ یہ دیکھ کر زخمی نے پھر پکارا۔ ”مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ میں مر رہا ہوں۔“ مولانا رک گئے اور کچھ سوچنے لگے۔ پھر اس خیال کے آتے ہی کہ وہ ایک مجروح کی مدد کرنے سے کتراتا ہے میں اُن کو نصیحت سی ہوئے لیکن لیکن دوسرے ہی لمحہ انھوں نے خود کو یوں تقویت دی۔ ”ہو نہ ہو! کوئی پاگل شخص ہے جو اس ویرانے میں مارا پھرتا ہے۔ آف! اس کے زخموں کو دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا ہے۔ ہونہ! کوئی ہو۔ میں کیا کروں۔ میں تو روح کا معالج ہوں۔ گوشہ و ہست کے زخموں کے علاج سے مجھے کیا سروکار۔“ یہ سوچ کر مولانا پھر چل پڑے۔ اس زخمی نے پھر پکارا اور اس قدر دنا بھر میں کہ پتھر بھی ہو تو موسم ہو جائے لیکن مولانا پتھر تو نہ تھے مولانا تھے۔ وہ زخمی کہہ رہا تھا۔ ”میرے پاس آئیے۔ ادھر آ۔ دیکھتے ہیں نہ پاگل ہوں نہ چور۔ آپ کو میں اچھی طرح جانتا ہوں آپ مولانا فاروق ہیں۔ آپ بھی مجھ سے ناواقف نہیں۔ ہم دونو

ایک دوسرے کے گہرے دوست رہ چکے ہیں۔ مجھے اس سنسان عادی میں دم توڑنے نہ دیکھ کر قریب آئے۔ میں بتاؤں کہ میں کون ہوں؟ ”ایں!“ مولانا پناہ نام سن کر سیکٹے میں آگئے۔ کچھ سوچ کر اس زخمی کے قریب آئے۔ رکوع کے انداز میں جھکا۔ اسے غور سے دیکھا تو ان کے سامنے ایک بالکل اجنبی چہرہ تھا۔ بالکل متضاد کیفیات کا آئینہ دار! ذہانت اور جہال کی۔ حسن اور بد صورتی۔ شقاوت اور نزاکت نے ایک انسانی صورت اختیار کر لی تھی۔ مولانا نے خون کو جب تک کر تیزی سے پوچھا ”کون ہو تم؟“ مجروح نے ڈوبتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”مجھ سے نہ ڈرو۔ ہم لوگ بڑے گہرے دوست رہ چکے ہیں۔ مجھے سہارا دے کر اٹھاؤ۔ ندی کنارے بڑے چلو اور اپنی عبا سے میرے زخموں کی مرہم پٹی کر دو۔“ مولانا کو تنگ نظر کا یہ انداز کھٹکا۔ وہ اس کے عادی نہ تھے۔ پوچھا۔ ”بتاؤ تم کون ہو میں تم سے واقف نہیں۔ مجھے تو یاد بھی نہیں کہ میں نے تمہیں کبھی کہیں دیکھا ہے؟“ اس جاں بلب شخص نے عاجز آکر جواب دیا۔ ”تم مجھے جیسی طرح جانتے ہو۔ تم نے مجھے بار بار دیکھا ہے اور تم روز سیکڑوں بار میرا نام لیتے ہو۔ مجھے تم اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہو۔“

”بس بس!“ مولانا چیخے! ”یہ جھوٹ ہے، تم جھوٹے ہو۔ جاں بلب آدمی کو جھوٹ نہیں بون چاہئے۔ میں نے تمہاری گمراہ صورت کبھی بھی نہیں دیکھی۔ شہیک شہیک بتاؤ کہ تم کون ہو ورنہ میں تمہیں یہاں ایڑیاں رگڑ کر مرنے کو چھوڑ دوں گا۔“ یہ سن کر اس مجروح نے اپنے آپ کو حرکت دی۔ بمشکل کھسکتا ہوا مولانا کے قریب آیا اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ اس کے لبوں پر ایک پراسرہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر بہت ہی مطمئن، ہموار اور سنجیدہ لہجہ میں اس نے رک رک کر کہا:

”مولانا! میں ابلیس ہوں!“

”لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔“ مولانا ایک بالشت اچھل کر پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ ان کے چہرے کا رنگ پہلا ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں تھر تھرانے لگے۔ ان کی چیخ فضا میں گونج گئی اور اب جو اپنے ہوش و حواس کو بمشکل قابو میں کر کے انھوں نے غور سے اس زخمی کو دیکھا تو اس کی صورت میں شیطان کا پورا سراپا جلوہ گر تھا۔ انھوں نے غور سے لیکن بلند لہجہ میں کہا: ”لعنت ہے تجھ پر۔ تیرا ہلکا ہوجانا ہی بہتر ہے۔ خوفناک بھیڑیا اگر حیات راہ تو اس کے جرائم تمام بھیڑوں میں پھیل جائیں گے۔“

”سوچ لیجئے۔ اچھی طرح سوچ لیجئے۔“ مولانا عجلت نہ کیجئے اور اس قیمتی وقت کو برباد نہ کیجئے۔ میرے قریب آکر میرے زخموں کو بند کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ میری روح پرواز کر جائے۔“

مولانا نے جواب دیا: ”یہ ہاتھ تمہارے ناپاک جسم سے مس نہیں ہو سکتے۔ تمہارا مرجانا ہی افضل ہے۔ تم نیکی اور انسانیت کے دشمن ہو۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔“

ابلیس ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور بمشکل ایک درخت کا سہارا لیکر کہنے لگا۔ ”مولانا! تم نہیں جانتے کہ تم کہا کہہ رہے ہو تم اس طرح خود اپنی ذات پر جو ظلم کر رہے ہو اس سے تم بے خبر ہو۔ ادھر آؤ۔ غور سے سنو آج میں اس دیرانے سے گزر رہا تھا۔ جب میں یہاں پہنچا تو فرشتوں کی ایک جماعت اتر کر مجھ پر ٹوٹ پڑی اور مجھے بری طرح زخمی کر ڈالا۔ اگر ان میں سے ایک کے پاس بڑی قریب چلی دو دھاری تلوار نہ ہوتی تو میں نے سب کو مار بھیجا ہوتا لیکن اُس تلوار نے مجھے بے بس کر دیا۔ اتنا کہہ کر وہ نرکا اور ایک گہرے زخم پر اپنا کانٹا ہوا ہاتھ رکھ کر سلسلہ کلام جاری رکھا ”وہ مسیح فرشتہ شاید میکائیل تھا۔ اگر میں نے اس گدھے میں دانستہ کر کے خود کو بٹھا ہر مردہ نہ بنا لیا ہوتا تو اس نے مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہوتا۔“

مستوت اور اطمینان کے جذبے سے معمور ہو کر مولانا نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”میکائیل! تیرا بڑا احسان ہے کہ تو نے دنیا کو انسانیت کے اس جنگ دشمن کے وجود سے پاک کر دیا۔“

ابلیس نے ٹوکا ”میری انسان دشمنی تمہاری اُس نفرت سے زیادہ بڑی نہیں جو تم کو اپنی ذات شریف سے ہوتی چاہئے۔ تم میکائیل کو دعائیں دے رہے ہو کبھی تمہاری مدد کو نہیں آیا۔ تم مجھے میرے برس وقت میں گالیاں دے رہے ہو، حالانکہ میں تمہارے سکون اور

مسترت کا ذریعہ تھا اور اب بھی ہوں۔ تم مجھے بد دعائیں دے رہے ہو مجھ پر ظلم کر رہے ہو۔ مجھے اپنی ہر باتوں سے محروم کر رہے ہو حالانکہ میرے ہی وجود کے زیر سایہ تم نہ صرف زندہ ہو بلکہ موع کر رہے ہو! میرے عدم وجود کے لئے تم نے ایک جواز اور اپنے وجود کے لئے ایک بہانہ پیدا کر لیا ہے۔ تم شب و روز اپنے کارناموں کے ثبوت میں میرا حوالہ دیتے ہو۔ کیا میرے فاضی نے تمہارے حال اور مستقبل کے لئے تمہیں میری ضرورت کا احساس نہیں کرایا؟ کیا تم اس قدر کمپا چکے ہو کہ اب اور کمانے کی ضرورت باقی نہیں رہی؟ کیا میرے خطناک وجود کا حوالہ دیکر اب تم کو دنیا والوں سے زبردست گنتے کی امید نہیں رہی؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم کیوں میری موت کے خواہاں ہو۔ کیا تمہاری کھوپڑی میں یہ بات نہیں سماقی کہ میری موت کی ساحت تمہارے افلاس کا اعلان ہوگی۔ اگر میرا نام و نشان مٹ گیا تو پھر تمہارا ہتھیار کیا ہوگا۔ ایک چوتھائی صدی سے تم لوگوں کو میرے دام میں گرفتار ہونے سے خبردار کرتے رہے ہو۔ بہت سے غریبوں نے اپنی محنت کی کمائی سے تمہاری دُعاؤں کو خرید لیا ہے۔ اگر انھی معلوم ہو گیا کہ ان کا شریک دشمن اب دنیا میں موجود نہیں ہے تو پھر وہ تم سے کیا خریدیں گے تمہاری مدنی میرے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ تم مولانا ہو! لیکن یہ موٹی سی بات تمہاری عقل میں نہیں آتی کہ ابلیس ہی کے وجود سے ابلیس کے سب سے بڑے دشمن یعنی تمہارے مذہب کا وجود قائم ہے۔ یہی وہ اذلی اور ابدی مخالفت کا پوشیدہ ہاتھ ہے جو سادے لوگوں کی جیب سے مولانا و چاندی نکال کر مولویوں اور مولاناؤں کی جھولیوں میں ڈال دیتا ہے۔ تم مجھے کیسے مرنے دے سکتے ہو جبکہ تم جانتے ہو کہ تمہاری مسجد، تمہارا ذاتی وقار، تمہارا گھر، تمہاری روزی سب کچھ تجھی سے وابستہ ہے۔ اتنا کہکشاں ابلیس کا اور پھر مزید یقین و اطمینان کے لہجہ میں کہنے لگا:۔

”مولانا! تم جاہل لیکن منور ہو۔ کہو تو میں ایمان و عقیدے کی پوری تاریخ کھول کر تمہیں دکھا دوں کہ ہم دونوں کے وجود کا رشتہ ہے اور میری ذات سے تمہارے شیعہ کا رابطہ ہے۔ خیرا جانے دو۔ تمہاری کھال موٹی ہے۔ تم اگر عقل کے اتنے سمانے دشمن نہ ہوتے تو یہ تو فوفوں کی اتنی بڑی تعداد تمہارے جاں میں کیسے پہنچتی۔ ایک بڑی طویل داستان ہے اور نرم اسے سنکر بھی کیا کرو گے۔ تمہاری مغرب کی ناز کا وقت بھی قریب ہے۔ تمہارے مرید تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ کہا عجب کہ اس وقت بھی جبکہ تم ابلیس کے پاس کھڑے ہو، کوئی خدا کا بندہ ابلیس ہی کے خوف سے تمہارے گھر پر تمہاری جھولی میں کچھ ڈالنے آیا ہو۔ ہاں مگر یہ نہ بھولو کہ ہر جگہ دنیا کے ہر گوشے میں ہر اس شخص کی قسمت میں راوی چین ہی چین لکھا ہے جس نے ابلیس پر لا حول پڑھ کر اور اسی کا سہارا لیکر اپنا کاروبار شروع کیا۔ تم مولویوں اور مولاناؤں ہی پر موقوف نہیں۔ بائبل کے پادری کے آگے جذبہ عبادت سے معمور سیکڑوں سرور و انہ سات بار جھکا کرتے ہیں۔ کیوں؟

جانتے ہو، اس لئے کہ وہ میری مخالفت کا بڑا زبردست علمبردار ہے۔ بیٹو! میں اُسے خدا اور انسان کے مابین ایک سنہری زنجیر کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اس لئے کہ اسے ابلیس کے تمام راز ہائے سریت سے واقف ہونے کا دعویٰ ہے۔ تبت میں ہندوؤں کو چاند اور سورج کا بیٹا کہا جاتا ہے۔ کتنے ہی ممالک ایسے ہیں جہاں میرے خون سے لوگ اپنے معصوم ہال بچوں کو قرآن کر دیتے ہیں۔ روم اور فلسطین میں اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ وہ ابلیس کا سب سے بڑا مخالف ہے، لوگ اس کے ہاتھوں میں اپنی حیات و ممات کا فیصلہ سوچ دیتے ہیں۔ میرے ہی نام کو مذہبیت و ادبیات و منطق و فلسفہ کی تعلیمات کے سلسلہ میں مرکز بنایا جاتا ہے۔ میں نہ ہوتا تو یہ مندر و مسجد کب بنتے۔ نہ یہ سر بفلک عارتیں بنتیں نہ اور نچے محل تعمیر ہوتے۔ میں ہی وہ ہمت و عصاب ہوں جو انسان کو حرکت اور عمل کی طرف مائل کرتا ہے۔ میں ہی وہ ذریعہ ہوں جس سے انسان میں عقل و خیال کی انفرادیت پیدا ہوتی ہے۔ میں وہ ہاتھ ہوں جو انسانوں کے ہاتھوں کو جنبش دیتا ہے۔ میں ابلیس ہوں۔

اذلی اور ابدی! میں ابلیس ہوں جس سے لوگ لڑتے ہیں خود کو زندہ رکھنے کے لئے۔ اگر وہ مجھ سے لڑنا چھوڑ دیں تو ان کے دل، ان کی عقل اور ان کے ضمیر میں پھپھوند لگ جائے۔ ان کی روح کند ہو جائے۔ میں وہ خوفناک اور خضہناک طوفان ہوں جو مردوں کے داغ اور عورتوں کے دل کو مضطرب و پریشان کر دیتا ہے۔ میرے ہی خون سے یا تو وہ ”مقدس مقامات“ کی زیارت کرنے چلے جاتے ہیں جہاں خدا کی عبادت اور میری خدمت کرتے ہیں یا پھر کہیں جا کر دل کھول کر گناہ کرتے ہیں تاکہ ابلیس ہی کا خوش کر سکیں۔ وہ پادری و جرات کی خاموشی میں ابلیس کو اپنے حافیت کردہ سے دور رکھنے کی دعائیں کرتا ہے وہ اُس طوائف کی طرح ہے جو اپنے بستر پر مجھے جلاتی ہے۔

ابلیس ہوں۔ ازلی اور ابدی! مولانا دور نہ جاؤ۔ خود اپنی مثال لے لو۔ خفیت ہو رہے ہو۔ خیر جانے دو۔ دیکھو ان خانقاہوں، درسگاہوں، مسجدوں اور مندروں کی مینا دیں میرے ہی خوف پر قائم ہیں۔ تمہارے اور شراب خانے میں نے ہی حرص و نفسانیت کی مینا دیہر تعمیر کر لے۔ اگر میں نہ رہوں تو دنیا سے خوف اور مسرت، دونوں کا وجود کھٹ ختم ہو جائے گا۔ زندگی بے نور ہو کر رہ جائے گی۔ آرزوں اور امیدوں کے تمام چراغ جو انسانی دلوں میں فروزاں ہیں، بجھ جائیں گے۔ ساری دنیا ایک جامہ اور سرد، تنگستہ و مضحل چیز ہو کر رہ جائے گی ہنسی اور تہقہہ تو ایک طرف کوئی مسکراہٹوں سے بھی آشنا نہ ہو سکے گا۔ تم آجائے کے بچاری، تمہاری ساری پوجا اندھیرے کے دم سے ہے۔ میری موت دنیا کی تمام تابش و ناز کی کو ختم کر دیگی۔ میں ابلیس ہوں۔ ازلی اور ابدی!

میں ظلم، دغا، کد، جھوٹ اور فریب کا محرک ہوں اور کیا ان تمام عناصر کا وجود میرے ساتھ مٹ نہیں جائے گا اور کیا ان کے ساتھ دنیا کی ساری چیزیں ختم نہیں ہو جائے گی؟ اس ویران و کسنان دنیا میں نیکیوں کی خاک اڑا کر سے گی۔ تم نے ایسی زندگی اور اس دنیا کا کبھی تصور بھی کیا ہے؟ پھر تمہارے سجادہ و وسیع پرکس کی نگاہ پرکھ لے گی۔ تمہاری ریاضت و عبادت کی انفرادیت کہاں باقی رہے گی؟ دارمہیوں کے جنگل میں تمہاری اس مٹھنی خانی ریش کا حسن کسے نظر آئے گا؟ نہ کسی کو تمہاری نصیحتوں کی ضرورت باقی رہے گی نہ کوئی تمہاری دعاؤں کا محتاج ہوگا۔ میں ابلیس ہوں۔ ازلی اور ابدی!

میں گناہوں کا ماں باپ ہوں اور اگر گناہوں کا وجود ختم ہو گیا تو سمجھ لو کہ گناہوں سے لڑنے والوں کا وجود بھی ان کے تمام متعلقین و دو حقیقین کے ساتھ فنا ہو گیا۔ میں تمام برائیوں اور آلودگیوں کا دل ہوں۔ کیا میرے دل کی دھڑکنوں کو خاموش کر کے تم انسان کی علمی تنگ و دو کو ختم کرنا پسند کروں گے؟ میں سبب ہوں۔ کیا سبب کو فنا کر کے نتیجہ کو قبول کر سکو گے؟ کیا تمہیں گوارا ہوگا کہ میں اس ویرانے میں جان دیدوں۔ کیا تم اس قدیم رابطے کو ختم کر دینے کے درپے ہو جو میرے اور تمہارے درمیان قائم ہے۔ بولو مولانا! جواب دو۔

”اتنا کھراکھرا ابلیس نے بڑی گہری سانس لی، اپنے بازوؤں کو پھیلا کر سمیٹ لیا اور سر کو آگے کی طرف جھکا کر مولانا کی طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے گویا ہوا۔ ”آف! میں بڑی خشکی اور کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے یہ غلط کیا کہ اپنی رہی رہی طاقت کو بھی ان باتوں میں ضایع کیا جن باتوں کے تم پہلے ہی سے قایل ہو خیر! اب تم جانو اور تمہارا کام۔ جیسی تمہاری مرضی۔ مجھے اس ویرانے میں مرنے کو چھوڑ دو یا مجھے اپنے گھر لے جا کر میرے زخموں کا علاج کرو۔“

مولانا کے بدن میں ایک لرزش سی ہونے لگی۔ انھوں نے اختلاجی کیفیت میں اپنے دونوں ہاتھوں کو منہ شروع کر دیا اور پھر معذرت بھرے ہجے میں کہنے لگے۔ ”نہیں نہیں! ابھی میں ان رازوں سے واقف ہو گیا جن سے آئندہ تمہیں میں واقف نہ تھا۔ میری جہالت کو معاف کر دو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا وجود اس دنیا میں تحریک و تحریک کا باعث ہے اور یہی وہ واحد پیمانہ ہے جس سے خدا نیک اور صالح انسانوں کی تدبیریں متعین کرتا ہے۔ یہی وہ ترازو ہے جس پر رعوں کی میزان ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم مر گئے تو حرص و طمع کی قوتیں مرجائیں گی اور اس کے ساتھ ہی اس مثالی طاقت کا تصور بھی فنا ہو جائے گا جو انسان کو ہوشیار و خبردار اور سر فراز و بلند کرتا ہے۔ تمہیں زندہ رہنا ہے اس لئے اگر تم مر گئے اور انسانوں کو اس کا علم ہو گیا تو ان کے دلوں سے جہنم کا خوف بھی جاتا رہے گا وہ اپنی عبادتیں موقوف کر دیں گے اس لئے کہ دنیا میں گناہ نام کی کسی چیز کا وجود ہی کہاں رہے گا؟ تمہاری زندگی اس لئے لازمی ہے کہ انسانیت کی گناہوں اور برائیوں سے نجات اسی میں ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تمہاری طرف سے اپنی نفرت کو انسان دوستی کی قربانگاہ پہنچاؤں چڑھا دوں گا۔ ابلیس نے اپنی پوری طاقت سے ایک بلند تہقہہ لگاتے ہوئے کہا: ”تم بھی کتنے ذہین ہو مولانا! اور مذہبی معلومات میں تمہارا علم کتنا وسیع اور حیرتناک ہے۔ تم نے اس کلمہ کو پالیا کہ میرا وجود کیوں ضروری ہے۔ جسے خود میں نے اب تک نہیں سمجھا تھا۔ اب ہم دونوں اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے کی ضرورت کو سمجھنے لگے ہیں۔ میرے نزدیک آؤ۔ دیکھو تاریکی بڑھ رہی ہے اور میرے جسم کا آدھا خون اس زمین میں خشک ہو چکا ہے اور ایک تنگستہ و مضحل جسم کے علاوہ میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا اور وہ بھی ختم ہو جائے گا اگر تم نے میری تیمارداری نہ کی۔“

مولانا آگے بڑھے۔ عبا کی آستین سمیٹی اور اپنی پوری طاقت سے ابلیس کو اپنی پیٹھ پر لا دکر اپنے گھر کی طرف بڑھے۔ ان کی داڑھی اور ان کا لباس زخمی کے خون سے رنگین ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بوجھ سے دوسرے ہوئے جاتے تھے لیکن اپنی پوری طاقت سے آگے بڑھے جا رہے تھے۔ اس خانہ اور تاریکی میں لڑتی ہوئی ایک آواز سنائی دی۔ یہ ناز مغرب کی اذان تھی جو ہر لمحہ بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی اور مولانا زبرد ابلیس کے پینے کی دعا مانگ رہے تھے۔

# نیاز فحشوری

(سید حامد حسین ایم۔ اے)

نیاز ادب لطیف کی تحریک سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تحریک ایک جمالیاتی تحریک تھی جس پر دیگر کی تخلیقیت، انگریزی ادب کے جمالیاتی رجحان یونانی صنمات اور کچھ حد تک خیام کی عیش کو شہی کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ اس تحریک کے دو پہلو تھے۔ ایک فکری، دوسرا جمالیاتی اور ان دونوں کے حسین و نادک امتزاج سے اس ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ ادب لطیف سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کی جمالیاتی حس بہت تیز ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کا ذہن منطقی فکر سے بھی آشنا ہے چنانچہ ان کے یہاں حسن و عشق باضابطہ اور اصولی قسم کے اقدار ہیں جن کے ذریعہ وہ زندگی کے رنگ اور اس کیفیت کی تعبیر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تحریک اردو ادب کی روحانی تحریک کا احیا بھی جاسکتی ہے۔ لیکن اس تحریک نے اردو ادب پر اتنے دور رس نتائج نہیں چھوڑے جتنے انگریزی ادب میں دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم اس نے اردو نثر میں تخلیقی رنگ پیدا کرنے میں بڑا اہم نقشہ لیا ہے۔

نیاز اس تحریک کے بڑے مناسب نمائندہ کہے جاسکتے ہیں۔ ان کا تخیل بھی اس تحریک کے جمالیاتی رنگ سے رنگا ہوا ہے اور ان کے تصورات حسن و عشق میں عام زندگی کی نفسیات، اس کی پیچ و خم اور نشیب و فراز نہیں ہیں۔ ان کے یہاں ان دونوں اقدار کا غلبہ ہے۔ حسن اپنی پوری تجلی ریزوں کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے اور عشق پوری شدت کے ساتھ اپنا دار کرتا ہے اور ان کا تصادم بھی نتیجہ میں اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔ عورت ان کے نزدیک حسن کا نام ہے اور حسن سوائے نسائیت کے کچھ نہیں۔ حسن کو عورت سے جدا نہیں کیا جاسکتا اور جب اس عالم کی کسی مادی یا غیر مادی حسین شے کو دیکھ کر کلیجہ ملنے لگتا ہے تو اس میں ایک خاص قسم کی نسائیت محسوس ہوتی ہے، انھوں نے مرد کو عشق کی ناپسندیدگی دی ہے۔ عشق کی دافنگیاں، شوخیاں اور ہلکا مہ خیزیاں اس کے حصہ میں آئی ہیں لیکن انھوں نے اکثر عشق کو حسن کی طرح بے پایاں محسوس نہیں کیا اور مرد کو ناموس حسن کی پاسداری کے لئے مستحکم نہیں پایا ہے وہ چاہے "کہکشاں کا ایک سانحہ" ہو، جہاں نیاز یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ "دنیا میں عورت محبت کرتی ہے صرف اس لئے کہ وہ محبت پر مجبور ہے اور مرد محبت کرتا ہے صرف اس لئے کہ وہ اس کی مسرت ہے پھر یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ مجبور ہی جاتی رہے اور ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ یہ مسرت ناپائیدار ثابت ہو" یا "ایک مصلحت بت تراش" اور "دنیا کا اولین بت ساز" جس میں عورت کی سنگدلی سے مجبور ہو کر پھر پھر میں تبدیل ہو جاتی ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مرد اس دنیا کا مالک نہیں ہوتا جو عورت کی زندگی بیتی ہے۔

نیاز کے یہ تصورات بڑے مستقل ہیں اور ان میں اس نفسیاتی پہلو کی گنجائش نہیں جو حالات کی پیچیدگی سے پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ تصورات جس فضا میں ابھرتے ہیں وہ عموماً بالکل سنجھی جھٹی ہوتی ہے اور اس میں حالات کی رفتار مضبوط نہیں رہتی ہے۔ ان کے کامیاب ترین مضامین زیادہ تر ایسے ہیں جو یا تو قبل از آفرینش عالم کے فوراً بعد یا یونانی دیوتاؤں کے درمیان یا اس دنیا کے آب و گل سے دور کسی جگہ گائے ستارے کی فضا میں جنم لیتے ہیں اور معبودوں کی دنیا نمازی کی محبوب دنیا ہے جسے وہ اپنے تخیل کے اعتبار سے سجاتے ہیں اس کے قوانین طیار کرنے اور اپنے عاجز کے لئے خفا سنوارتے ہیں، وہ وقت اور زمانہ کی گرفت کو اپنے اوپر محسوس نہیں کرتے جو افسانے صحر حاضر کے سماجی ہیں منظر کے ساتھ ابھرتے ہیں ان میں بھی مرکزی جذبات کا دھارا اتنا قوی ہوتا ہے کہ وہ کسی حدود کے پابند نہیں رہتے (مثلاً صدر کے بگڑے)

”تجربہ بن پیا کھو نہ سہائے“ عشق کی وہ پرسوز مثال ہے جو اس شاعر کو بھی جھنجھوڑ دیتا ہے جس کو میدار کرنے میں دولت، شہرت، موسیقی اور حسن و شباب کی دیوایاں بھی ناکام رہی ہیں (ایک شاعر کا انجام) ہندوستانی عورت کا یہی کردار ”ایک مصلحت بت تراش“ کے اختتام پر ابھرتا ہے اور یہی نیا زکے مضمون ”عورت“ کا بڑا ہی موثر نقطہ بتا ہے۔ مگر اس تصور میں تھوڑی سی خصوصیت یا مقامیت پیدا ہو جانے سے اس کی آدرشی نوعیت نہیں ختم ہو جاتی یہ عشق کا ایک اور آئینہ ہے جو عورت کے پیکر میں ابھرتا ہے۔

نیا زکے کردار کسی نہ کسی آئینہ کی علامت ہیں۔ ان کی زندگی میں عام سماجی زندگی دھوپ چھاؤں نہیں ہے بلکہ انکی سیرت نیاز کے کردار حسن کی نورانیت عشق کی شعلہ فشاں یا کسی تصور کی شدت سے معنی پیرا ہوتی ہے ان کی زندگی کا حاصل اپنے آئینہ کی تکمیل ہوتا ہے ”ایک شاعر کی محبت“ اور ”زہرہ کا بچاری“ میں ایسے مرکزی کردار ہیں جن کے تصور نے ایک مخصوص رخ اختیار کر لیا اور ان کے اس تصور سے جدا کرنا ان کے وجود کو ختم کرنا ہے۔ اس طرح عموماً ان کے کرداروں میں ایک *Ar-mamam* کا احساس ہوتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی *Ar-mamam* کا شکار ہوتے ہیں۔ اور ان کے لئے زندگی ویسا ہی روپ اختیار کر لیتی ہے۔ نیا زکے زیادہ تر اپنے کرداروں کے لئے ماحول بنایا ہے۔ ماحول سے کرداروں کو نہیں ابھارا ہے۔ یہ کردار زندگی کی عام کشمکشوں کو لے کر ان افسانوں میں طبع آئے اور ان کی نفسیاتی پیچیدگی ان افسانوں میں بیچ و خم پیدا کرتی ہیں بلکہ ان کی سیرت کا کوئی غالب عنصر پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے جو افسانہ کی ساری فضا پر حاوی ہو جاتا ہے اس کے نتیجہ میں ان کے کرداروں میں کبھی غریبی پیدا ہونا لازمی ہے۔ ان کے یہاں کردار زیادہ تر مکمل جذبات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ بیک وقت دو متضاد جذبات کا تصادم ان کے یہاں نہیں ہوتا خواہ وہ قریب خیال ”ہیسا حقیقی زندگی سے قریب افسانہ ہی کیوں نہ ہو۔

نیا زکے تخلیقی افسانوں میں حزن یہ افسانے طریہ افسانوں سے زیادہ کامیاب اور موثر ہیں۔ ان کے نقوش میں زیادہ دکاویزی اور جاکھ ہے۔ وہ فضا جو شوخ اور چمکدار رنگوں سے تعمیر کی جاتی ہے وہ کردار جو گہرے اور شدید جذبات کے ساتھ تخلیق کئے جاتے ہیں، جب کسی شخص سے ہٹنا ہوتے ہیں تو یہ شکست بھی اتنی ہی گہری اور شدید ہوتی ہے۔ تخلیقی افسانوں میں حزن بھی زیادہ تر اپنے پس منظر سے تاثر حاصل کرتا ہے کیونکہ پس منظر کی رعنائی حزن کی فضا کو اور زیادہ لایاں کر دیتی ہے۔ اسی لئے ”جانب عالم اور ملکہ مہر نگار“ اور ”صدائے شکست“ کا انجام اتنا گہرا نہیں ہے جتنا ”ایک شاعر کی محبت“ یا ”زہرہ کا بچاری“ کا۔

سنگتراشی کا تخیل نیا زکے کا تخیل ایک جا بجا درست سنگتراش کا تخیل ہے۔ لیکن ان کی صورت نگری میں زندگی کی حرکت حرارت اور جوش بھی ہے نیا زکے اپنے فن کے قیون العباد ( *وہم و ہمسنہ* ) کے علاوہ خالق ہیں۔ اپنے تخیل کی تقسیم کے ساتھ ساتھ اس کے گرد ایک رنگین اور چمکدار فضا بھی پیدا کی ہے۔ ان کی خلائق صلا حقیقوں نے نازک سے نازک قصودات اور لطیف سے لطیف تخیلات کو پیرا ہن دیا ہے۔ اتنا ہی سہا اور اتنا ہی باریک جس میں سے ان کا اصل تصور اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ منعکس ہے۔ ”ایک مصور فرشتہ“۔ ”مطر فلک“ اور ”کیو پٹ و ساگی“ حسین تخیلات ہیں جو سمٹ کر ایک تصویر بن گئے ہیں۔ قوس قزحی دھاریاں جو کسی پیکر میں ساگتی ہیں، نیا زکے ایک خالق کی طرح ان کو زندگی دی ہے، ان کو حسین پیکر دیا ہے، جاذب نظر نقوش دے دیے ہیں۔ حسن کی برنائیاں اور عشق کی وارنگیاں رہی ہیں۔ نیا زکے اپنی تخلیق کی جوئی اقلیم پر خود مکر رہے ہیں۔

”کیو پٹ و ساگی“ کی تمہید میں نیا زکے نے کہا ہے کہ انھوں نے لکھتے وقت اپنے حیات کی پابندی کی ہے اور اپنی تحریر کا عام اخلاقیات سے کوئی سروکار نہیں رکھا ہے۔ ان کی تخلیقات سے بھی یہی نمایاں ہے کہ انھوں نے اپنی ”لغزش مستان“ کو افغا کا پیرا ہن دیا ہے اور ان کے تخیل کے جمالیاتی کھیت اور ان کی فکر کی لطیف سرشاری نے ان کے مضامین کی صورت اختیار کی ہے۔ ان کے مضامین نمایاں جذبات کے دھند ہیں ان کے احساسات کا و نور شامل ہے اور انھیں کے ذہن کے نکھار نے ان نقوش کو تابانی اور جلا بخشی ہے۔ ادبیات سے انسانی

زندگی کو جو تعلق حاصل ہے وہ اس کی اخلاقی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا اور اس لئے یہ کہنا کہ حسن اور آرٹ کو محض حسن اور آرٹ کی حیثیت سے دیکھنا چاہئے اور اس کے اخلاقی ہونے کو نظر انداز کر دینا چاہئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مگر خود نیاز کی تخلیقات اس اصول پر پوری نہیں اترتیں۔ ان کا سوائے ایک جہانماتی پہلو کے کوئی افادی پہلو متعین نہیں کیا جاسکتا۔ نیاز نے ان کو زمان و مکان کے حدود سے الگ رکھ کر اور حسن و عشق اور ازدواج کے مسائل پر مطلق طریقے سے بحث کر کے کسی طرح برلے ہوئے مذاق زندگی سے ہم آہنگ نہیں کیا ہے۔ باوجودیکہ ادبیات اور اصول نقد میں انھوں نے اخلاقی تعبیرات کی تغیر پذیری کو مانا ہے۔

**طبیعت کا جوش** نیاز کی طبیعت میں ایک جوش ہے جو خواہ تنقید ہو یا تخلیق ہر صورت میں ساری اصول بندیوں کو توڑتا چلا جاتا ہے۔ نیاز ایک اچھے نظریہ ساز بن سکتے ہیں۔ کم از کم "انتقادات" کے دو آخر کے مضامین "ادبیات اور اصول نقد" اور "فنون ادیبہ و حقیقت نہ بھی" سے یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے مگر ایک عملی نقاد کی حیثیت سے ان کا پہلو کمزور ہے۔ نقاد کی ایک خصوصیت نیاز نے غیر جانبداری بتلائی ہے۔ مگر ان کی اپنی تنقیدیں غیر جانبدارانہ نہیں ہیں۔ بلکہ بعض تنقیدوں میں نیاز کا اپنا تصور اتنا حادی ہو گیا ہے کہ اس ادیب یا شاعر کے جس کی تخلیقات کو وہ زیر بحث لاتے ہیں، بہتر پہلو کیسے نہیں ہو جاتے ہیں کم از کم اصغر احمد جوش پر جو مضامین "انتقادات" میں شامل ہیں وہ ایسے ہی ہیں۔

نیاز کے یہاں ایک چونکا دینے والا انداز ہے جو آپ کو "من ویز داں" میں بھی ملے گا اور "انتقادات" میں بھی وہ دنیا کے فکر میں کسی ایسے انگشت کو زیادہ پسند کرتے ہیں جو تقریباً نیا ہو۔ مومن کو تیر کے علاوہ سارے اردو شعرا پر فوقیت دینا، ایک ایسے دور میں جبکہ غالب کو بلند کیا جا رہا تھا یقیناً ایک چونکا دینے والی بات تھی۔ اسی طرح اردو ادب میں نظام شاہ رامپوری جاوید مرحوم اور آصف الدولہ کا تعارف اپنے موضوع کے لحاظ سے تقریباً نیا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ یہاں نیاز ایک ناقد کی حیثیت سے ان شعرا کی قدر و قیمت جانچتے یا ان کے کلام پر ایک سیر حاصل تنقید کرنے کے بجائے تعارف اور کلام کے انتخابات سے آگے نہیں بڑھتے۔

**تنقیدی انداز** نیاز کی تنقید کا انداز جزوی ہے۔ وہ ایک ایک شعر، ایک ایک مصرعہ اور ایک ایک بندش کو پرکھ کر دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب پر تنقید کرتے ہوئے اسلوب و طرزِ ادا پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے ناقد کو چاہئے کہ پہلے وہ یہ دیکھے کہ شاعر اپنے خیال کو کہاں تک حسین طریقہ سے ادا کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ نیاز اس طرح شاعر کے خیال پر تنقید کرنے سے زیادہ اس کے اظہار کو تنقید کا محتاج سمجھتے ہیں۔ چنانچہ نیاز کی عملی تنقید کا ایک بہت بڑا حصہ مختلف شعراء کے پہلوں، الفاظ کی صحیح بندش اور مناسب استعمال کی جہان میں پر مشتمل ہے۔

نیاز کی تنقید میں گہری انانیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی اپنی شخصیت پروری تنقید پر چھائی رہتی ہے۔ چنانچہ ابتدا سے ہی جو تصور قائم کر لیتے ہیں وہ اس کے زیر اثر اپنی ساری بحث کو جاری رکھتے ہیں۔ لہذا کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض اشعار کو محض اپنے اسی جوشِ قصود کے تحت رد کر دیا ہے اور اس کے نتیجے میں کہیں کہیں ان کا لہجہ متعین نہیں رہا ہے بلکہ ان کے لبوں پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ دوڑ گئی ہے خصوصیت کے ساتھ اصغر کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے اپنے تصوف سے ناپسندیدگی کی بناء پر کہیں کہیں بڑا غیر ہمدردانہ رویہ اختیار کر لیا ہے۔ "لکھنؤ اور لکھنویت پر لکھتے ہوئے انھوں نے ایک بار تحریر کیا تھا "میر سے نزدیک شاعری کے تمام اصناف میں "غزل گوئی" جس قدر بلند چیز ہے کوئی نہیں۔ روح کی گہرائیوں اور قلب کے اعماق سے خبردار کہنے والی چیز اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف غزل ہے اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ غزل کا ارتقا تصوف ہے۔ تصوف سے مراد عہدِ ماضی کی قبر پرست مرید ساز، خرقہ مکروہ سالوس والی درویشی نہیں بلکہ میری مراد وہ علوئے فطرت، وہ عروجِ روح اور وہ استعلاءِ تصور ہے جہاں اذہانِ مادیت سے گزر کر اپنے حیزِ اصلی، نور ربانی اور جلوہ حقیقی سے ہم آغوش ہو جاتا ہے اور تمام امتیازات دنیاوی کو جن میں امتیاز مذہبی بھی شامل ہے محو کر دیتا ہے۔" یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اصغر کی غزل میں تصوف کے یہ مثال نہیں ہیں جو نیاز نے بتلائے ہیں بلکہ نیاز کے جوشِ طبیعت نے اصغر کی شاعری کے تابناک پہلو کو ماننے سے انکار کر دیا اس لئے انھوں نے

روایتی تصوف کا نابینہ تصور کر کے مورد الزام ٹھہرا دیا۔ اس طرح آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نیاز کا جو حش طبیعت عملی تنقید میں کس طرح خود اپنے اصول کوڑا سکتا ہے۔

صحیح نقطہ نظر سے نیاز کا نظریہ مضمون سب سے زیادہ عجیب تھا اور متوازن ہے اور اس مضمون میں انھوں نے اپنے لئے جو طریق عمل تیار کیا ہے اس کو برتا بھی ہے۔ نظریہ اور مومن پر مضامین میں بھی یہ عناصر نظر آتے ہیں مگر نیاز نے اپنے منطقی استدلال سے تنقید میں اتنا فائدہ نہ اٹھا جتنا اٹھا چاہئے تھا۔ ان کی یہ صلاحیت جہاں انھوں نے لکھنؤ اسکول پریکٹس کی ہے وہاں اور ”ادبیات اور اصول نقد“ اور فنون ادیبہ اور حقیقت نگاری“ میں نمایاں ہوئی ہے (باوجودیکہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اشعار کی بندش پریکٹس کرتے ہوئے انھوں نے استدلال سے کام لیا ہے۔ لیکن اس کا استعمال اتنا پھیلا ہوا نہیں جتنا تنقید چاہتی ہے۔ یعنی فن کا مجموعی تجربہ فکار کے رجحانات پریکٹس نگار کے مقام کا تعین وغیرہ۔

نیاز کی تنقید کا اسلوب تحریر بڑا بوزن اور پر وقار ہے۔ نیاز نے اپنی نئی ترکیب کی اختراع کی ہے اور نئی اصطلاحیں وضع کی ہیں ان کی تحریر میں بحیثیت مجموعی ایک عالمانہ سنجیدگی اور منطقیانہ سلجھاؤ کا اندازہ ہوتا ہے نیاز نے اپنی عملی تنقید میں ادب، فن وغیرہ پر گہری فلسفہ لازمی سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اکثر براہ راست اپنے موضوع سے تعلق رکھا ہے۔ نیاز کے انداز میں ایک توانائی اور گہرائی اور چند الفاظ میں سبب تصورات کو گھیر لینے کی صلاحیت ہے۔ ان کی تنقید میں بھی کہیں کہیں ترکیب میں ان کی انشائے لطیف کا اثر جھلک آیا ہے۔ نیاز نے انشائے لطیف کے لئے جو پیرایہ اختیار کیا ہے وہ بیک وقت آبشار کی سی روانی بھی رکھتا ہے۔ اس کا جمال بھی اس کا ور اور ہمواری بھی۔ نیاز نے فکری کوشش میں اپنے جالیاتی رجحان سے ایک نفاست پیدا کی ہے۔ فولاد کو صیقل کر کے آئینہ بنایا ہے اور فلیدس کی شکلوں سے گل بوٹے بنائے ہیں۔ اسی طرح تخیل کے نازک تانے بانے کو ان کی فکر نے پختگی بھی بخشی ہے اور توانائی بھی، جلا بھی در بر نائی بھی۔ عنکبوت کے تاروں کو ریشم کی طرح مضبوط بھی بنایا ہے اور چمک اور چمک بھی دی ہے۔

نیاز کی شخصیت ایک ہمہ گیر شخصیت ہے جس میں اپنے اندر جذب کر لینے کی زبردست صلاحیتیں ہیں۔ انھوں نے قدیم اور جدید علوم سے کسب نور کیا ہے اور اس کی تجلیاں ان کے ادب باروں میں نمایاں ہیں۔ لیکن نیاز کی اپنی حیثیت، نیاز کی اپنی آواز ان سب میں موجود ہے۔ انھوں نے یونانی دیوالا از سرفرد ہی تخلیق کی جو۔ نیاز کی شخصیت ایک پہلو دار شیشہ (Mosaic) کی سی ہے جس نے مری ہوئی شعاعوں کو ایک جاکر کے قوس قزحی رنگوں میں منتشر کر دیا ہے۔

اردو ادب میں نیاز ایک قد آور شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی گراں بہا تصانیف اور ان کی فکری صلاحیتیں موجودہ دور کا عظیم ترین سرمایہ ہیں۔

## قول فیصل

جس میں ملک کے مشہور مفکر و بلند خیال شاعر علی اختر اختر حیدر آبادی نے ثابت کیا ہے کہ انسان لاکھ ترقی کر کے کتنی ہی عقل و فراست سے کام لے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کو خدا کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ فنی حیثیت سے اختر کا بڑا عظیم الشان کا نامہ ہے ثبوت میں آسانی پیش کیا جاسکتا ہے۔ شروع میں حضرت نیاز فقیر کی کا مقدمہ بھی شامل ہے کاغذہ مہر و ندیمز گرد ہوش رنگین۔ قیمت دو روپے۔ نیچر نگار

## ملک خطا کے شہزادے

دنیا میں کیا اندھیر ہو رہا ہے۔ اس کی دردناک داستان آپ کو سننا ہے تو صی احمد بلگرامی فانی بی۔ اے کی زبان سے سنئے اپنی مخصوص تحریر پر اور زور یہاں کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتے کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کو قزح یختم ذکرنا انسانی اختیار سے باہر ہے۔ قیمت بارہ آنے نیچر نگار لکھنؤ

# اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربات

(قیوم نظر)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جہاں ملک میں معاشی، سیاسی اور سماجی ہر قسم کی تبدیلیاں نظر آئے لگیں وہاں اُردو شاعری نے بھی ایک کردار لی۔ اگرچہ یہ کردار وضاحت کے ساتھ اُنیسویں صدی کے آخر بلکہ بیسویں صدی کے آغاز میں نظر آئی، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُردو شاعری کو جدید راستوں پر چلانے کی شعوری کوششیں ۱۸۷۷ء ہی سے شروع ہو چکی تھیں۔ یہ وہ سال ہے جب مولوی اسماعیل میرٹھی نے چند انگریزی نظموں کا اُردو نظم میں ترجمہ شائع کیا۔ اسی سال مولانا محمد حسین آزاد نے بھی ایک نثر کی صورت میں اپنے اس کام کی بنیاد رکھی۔ جس کو انھوں نے بعد میں حالی کی اعانت اور کرنل ہارلڈ کی سرپرستی میں انجام تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اگرچہ حالی اور آزاد کی شنوائیاں، بعد میں حالی کے اپنے دیوان کا مقدمہ، اس بیمار شاعری سے نجات دلانے کا عمدہ اظہار تھا جس کے جنگل میں بعض شعراء پھنسے ہوئے تھے۔ تاہم اس کی گرفت اس قدر مستحکم تھی کہ ابھی بات بنائے نہ جیتی تھی۔

اُردو شاعری کا کثیر سرمایہ غزل کی صورت میں ملتا ہے۔ بلکہ جس قدر غزلیں اُردو میں لکھی گئی ہیں کسی دوسری زبان میں شاید اس قدر اس کا تمام شعری سرمایہ بھی نہ ہو۔ پھر بھی غزل کی محدود وسعت آج بھی ایسی نہیں کہ اس میں کوئی بڑا شاعر اپنی تمام کائنات کا طوطا طور پر پیش کر سکے اور شاید یہی باعث تھا کہ غالب ایسے قادر الکلام شاعر کو بھی ایک صدی پہلے یہ سہنا پڑا ہے

بقدر شوق نہیں ظون تنگنائے غزل کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

جب سہ سید اور ان کے رفقاء نے ادب کی پرانی اقدار کو بلا واسطہ یا بالواسطہ طور پر بدلنا چاہا۔ تو سب سے زیادہ جو صنف ادب معرض بقا میں آئی یا ملے تقاضوں کی چیر دستیوں کا نشانہ بنی وہ غزل تھی۔ چنانچہ جب غزل کی چھان پھٹک ایک نئے انداز سے کی گئی تو اکثر ذہین شعراء کو اس کی تنگ دامانی کا شدید احساس ہوا۔ اس تنگ دامانی میں اس کی ہیئت اور روایات کو خاصا دخل تھا۔ غرض بیسویں صدی کے ربع اول کے آخر تک اگر ایک طوفان غزل معنوب رہی تو اس کے ساتھ ساتھ انگریزی شاعروں سے اُردو شاعری صراحتہ متاثر بھی ہوتی رہی۔ اس ضمن میں اقبال کی کوششیں نہایت کارگر ثابت ہوئیں۔ جن کے سائے میں جوش ملیح آبادی اور ابوالاثر حقیقہ ایسے شعراء بھی اپنے انکار کو نت نئے سانچوں میں ڈھالتے رہے۔ یہ دور کلاسیکیت سے بغاوت اور روایت کی آغوش میں پناہ لینے کا دور تھا۔ چنانچہ اس دور میں شعراء کو اپنی اس انفرادیت کی تلاش تھی، جس کو ان کے آباء نے قواعد و ضوابط کی پابندی الفاظ کی تراش خراش، صنائع بدائع اور خارجی شوقی و طعنداری کے پردوں میں گم کر دیا تھا۔ اسی انفرادیت کو پانے کی لگن نے بعض نچلے شعراء کو نئے راستے سمجھائے اور اگر ایک طرف عظمتِ آندہ ایسے نکتہ نبھوں نے اُردو شاعری کے سینے کو ہیئت کے بعض تھریوں کی ضیائے منور کرنا چاہا تو بعض ذہین فوجہ انوں نے اس ضمن میں شمع و شوق رنگ سے مستعار روشنی حاصل کرنے کو مستحسن خیال کیا۔ اس سلسلہ میں کئی شعراء کے نام گنوائے جاسکتے ہیں۔ لیکن ن۔ م راشد اور اختر شیرانی کے نام شاعری میں ہیئت کی ایک خاص صنعت سے بالخصوص منسلک ہیں۔ ن۔ م راشد کا ذکر تو نظم آزاد کے علمبرداروں میں بھی منظر و حیثیت رکھتا ہے، لیکن جب یہ نام پتھر پتھر کی کے ساتھ آتا ہے تو دھیان ہیئت کے سلسلہ میں اُردو میں سانیٹ کے آغاز کی طرف جاتا ہے۔

ڈاکٹر تصدق حسین خالد کے مطابق اردو میں نظم آزاد کا آغاز غزلیوں سے کیا۔ لیکن اتفاق سے ان کی یہی ہوئی آزاد و نظیر، جب یہیں  
دن۔ م راشد کی آزاد نظمیں چھپ کر لوگوں تک پہنچ چکی تھیں۔ اور اس طرح نظم آزاد کا بانی ن۔ م راشد شمار کیا جانے لگا۔ اسی طرح ایک  
بیان کے مطابق اردو میں پہلا سانیٹ اگرچہ ن۔ م راشد نے لکھا۔ لیکن جو سانیٹ عوام کے سامنے شائع شدہ صورت میں آیا وہ اختر ثیلانی  
ہو گیا۔ اور یوں اردو میں سانیٹ کے آغاز کا سہرا اختر ثیلانی کے سر بندھا۔

دنیا سے شعر میں سانیٹ کی ابتدا پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نظم کی یہ مخصوص شکل ردیف و قافیہ کے چند در چند تجربات کے بعد  
ظہور میں آئی۔ اٹالوی زبان میں ان گنت گائی جانے والی چھوٹی چھوٹی نظموں نے اسے ایک مستقل صورت دی اور اس میں چودہ اور صرف  
چودہ مصرعوں کا ہونا ضروری قرار پایا۔ یہ چودہ مصرعے بھی دو بندوں کی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔ پہلے بند میں آٹھ مصرعوں کا جوٹاؤ  
دوسرے بند کا چھ مصرعوں سے ترتیب پانا ضروری قرار دیا گیا۔ چونکہ یہ ایک شدید نظم کی پابند صنف سخن تھی۔ اس لیے پہلے آٹھ مصرعوں  
میں ردیف و قافیہ کا بھی اس ترتیب سے آٹا لایا می گردانا گیا۔

الف ب ب ب الف الف ب ب الف

لیکن دوسرے بند یعنی اگلے چھ مصرعوں میں اس ترتیب کا ہونا چنداں ضروری نہ تھا۔ زیادہ وضاحت کے لئے اختر ثیلانی کے ایک سانیٹ  
اپہلا بند سنئے جس میں ردیف و قافیہ کی یہی ترتیب ملتی ہے:-

بہار حسن کا تو غنچہ شاداب ہے سلمیٰ  
تجھے فطرت نے اپنے دستِ رنگیں سے سوار ہے  
بہشتِ رنگِ دیو کا تو سراپا ک نظر ارہ ہے  
تری صورت سراسر پیکرِ مہتاب ہے سلمیٰ  
ترا جسم اک ہجومِ ریشم و کم خواب ہے سلمیٰ  
شبستانِ جوانی کا تو اک زندہ ستارہ ہے  
تو اس دنیا میں بحرِ حسنِ فطرت کا کنارہ ہے  
تو اس منسا میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ

اطالوی میں یہ صنف پیرا ترک اور دانتے کے ہاتھوں نہایت خوش اسلوبی سے بنی۔ انگریزی میں پہلے پہل وارث نے ترجمے کی  
صورت میں اس کو پیش کیا اور پھر سانیٹ کہنے کا شوق اس قدر بڑھا کہ سوہوہیں صدی عیسوی کے آخر تک ہر چھوٹا بڑا شاعر اس صنف میں  
پنے خیالات کا اظہار ضروری شمار کرنے لگا۔ لیکن ابتدائی دور میں انگلستان میں ردیف و قافیہ کی جو صورت ظہور میں آئی وہ یوں تھی:-

الف ب، الف ب، ج، د، ج، د

یہ آٹھ مصرعوں کا پہلا بند تھا اور دوسرا بند اس میں اس کی صورت میں رہا۔ مثال کے لئے معین حسن جذبی کا ایک سانیٹ  
جس کا عنوان ”طوائف“ ہے، سنئے۔ اگرچہ اس میں اس ردیف و قافیہ کے التزام سے کسی قدر انحراف کیا گیا ہے جس کا ابھی ذکر آیا ہے،  
لیکن یہ انحراف شاید اسی صنف کے جدید تر تقاضوں کے باعث ہے:-

اپنی فطرت کی بلندی پہ مجھے ناز ہے کب  
ہاں تری بہت تنگاہی سے لگہ ہے مجھ کو  
تو گرا دے گی مجھے اپنی نظر سے در نہ  
تیرے قدموں پہ تو سجدہ بھی روا ہے مجھ کو

تو نے ہر آن بدلتی ہوئی اس دنیا میں  
میری پائندگی غم کو تو دیکھا ہوتا،  
کھانا ہزار ہیں شبنم کے تلوں سے مگر  
تو نے اس دیدہ پر غم کو تو دیکھا ہوتا  
ہائے حلقی ہوئی حسرت چہ تری آنکھوں میں  
کہیں مل جائے محبت کا سہارا تجھ کو  
اپنی پستی کا بھی احساس پھر اتنا احساس  
کہ نہیں میری محبت بھی گوارا تجھ کو  
اور یہ زرد سے زخا یہ اشکوں کی قطار  
مجھ سے بہزار مری عرض و فاسے بہزار

سترہویں صدی عیسوی کے آغاز تک بلکہ الزبتھ کے عہد میں علوم و فنون نے ترقی کی تو سائنٹ بھی شیکسپیر ایسے نابغوں کے ہاتھوں  
بڑھتی چڑھتی رہی۔ بعد میں ملٹن اور ورڈز ورثہ ایسے شعرا نے اس ردیف و قافیہ کے التزام میں اپنی اپنی افتاد طبع کے مطابق تہذیبیاں  
کیں، جو انہی کے نام سے منسوب ہیں۔ اگرچہ اٹھارویں صدی کے اختتام پر سائنٹ پر براقت بھی آیا اور اس سے عوام کی دلچسپی  
کم سے کم تر ہوتی گئی مگر یہ دور عارضی سا تھا اور شعرا نے انیسویں صدی میں اس کو پھر سنبھالا دیا اور انگریزی ادب میں یہ صنف آج بھی  
نامقبول نہیں ہے۔

انگریزی میں سائنٹ کی اس سرسری سی تاریخ کے بعد ہم اردو میں سائنٹ کی طرف پھرتے ہیں۔ اختر شیرانی نے رومانی شاعری کو  
جس نہج پر چلایا۔ اس سے وہ عوام میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور اس کے انداز اور بیان کی مقبولیت نے ایک دبا کی سی صورت  
اختیار کر لی، جس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہوا کہ سائنٹ لکھنا، اور اختر شیرانی کی تقلید میں لکھنا، فیشن میں داخل ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء کے  
چند برس تک اردو میں بے شمار سائنٹ معرض وجود میں آئے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج ان میں سے صرف چند ہی کا نشانہ فائنٹ صدیقی  
ایسے شعرا کے ہاں ملتا ہے۔ اگرچہ ابتدا میں اختر اور رائے نے سائنٹ میں ردیف و قافیہ کا وہی التزام رکھا جو اطالوی سائنٹ کا تھا بلکہ  
بعد میں اختر کی متلون طبیعت نے اس میں کچھ تراجم بھی کیں جن کی نقل دوسرے شعرا سے نہ ہو سکی۔ مثال کے طور پر اس کا یہ سائنٹ  
دیکھئے جس میں اگر ایک طرف ردیف و قافیہ کا التزام شنوی کے انداز پر رکھا ہوا ہے۔ تو دوسری طرف مستزاد نا ایک ٹکڑہ بھی ہر مصرعہ کے  
ساتھ چپکا ہوا ہے جو مستزاد ہی کے مانند اپنے پہلے مصرعہ کے ساتھ ہم قافیہ بھی ہے اور سائنٹ کو ایک اعتبار سے مستزاد کا قالب دے دے ہو  
ہے۔ لیکن یہ ایک الگ بحث ہے۔ سائنٹ سنئے، عنوان ہے ”میتری“

یہ میتری ہے یا کوئی رنگ پریدہ ہے	بوسے چکیدہ ہے
آغوش گل میں یا کوئی نقشِ مہرہ ہے	عکس کشیدہ ہے
اُٹھے تو ایک بوسہ قصیدہ سانسے	پاشیدہ سانسے
بیٹھے تو ایک لذتِ خوابیدہ سانسے	دامن کشیدہ ہے
جوسے صبا میں ہلکا سا طوفانِ رنگ و بو	ہیجانِ رنگ و بو
دوشِ فضا پہ چھوٹا سا نیسانِ رنگ و بو	جو صفت کشیدہ ہے
اک پربہا نقش ہے عشرت کے خواب کا	عہد شباب کا

یا برگ گل پہ لرزش جام شراب کا  
ہلکی سی اک شعاع ہے طور حکیم پر  
رقاصہ بہار کا فرش شمیم پر  
ابھرا ہوا سا عکس ہے رنگیں غبار کا  
یا شاخسار گل پہ عروس بہار کا  
اک فروعوس کی نگہ انفعال ہے  
یا اک شعاع پر تو قوس دہلال ہے  
عکس رمیدہ ہے  
سطح نسیم پر  
رقص پریدہ ہے  
کیف و خمار کا  
حسن رمیدہ ہے  
شرم دھال ہے  
اور نود رمیدہ ہے

اس سائنٹ میں، جو اپنی صنف میں ایک نادر تجربہ ہے، دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک بات اور بھی ملتی ہے اور یہ وہی روایت سے بغاوت کا اعلان ہے۔ سائنٹ کے لئے اب تک یہ ضروری تھا کہ اس کا پہلا بند آٹھ اور دوسرا چھ مصرعوں کا ہو لیکن اختر شیرانی نے اس کیلئے کو بھی بدل دیا اور پہلا بند چھ اور دوسرا آٹھ مصرعوں سے پورا کیا۔ اردو میں سائنٹ کچھ حد تک دھن اور کچھ غزل کی جگہ بندوں کے رد عمل کے سائے میں آتا تھا۔ صحن بھی نہیں اپنی مخصوص ہیئت کے پیش نظر اس کے مضامین میں زیادہ وسعت اور گہرائی کی گنجائش بھی کم ہی تھی۔ چنانچہ جب جدید شعرا کیوں نے اختر اور اس کے ڈھب کی غنائی شاعری کا طعمن توڑا تو شعراء نے محسوس کیا کہ سائنٹ کی ہیئت ان کے جدید شعری تقاضوں کو کم ہی پورا کرتی ہے اور پھر جب اس میں مینا کاری کے لئے اسی کلاسیکیت کے سہارا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کے خلاف بیسویں صدی کے وسط میں اس قدر جدوجہد سے کام لیا گیا تو ان کو یہ نین جھٹ نظر آنے لگا۔ چنانچہ وہ صنف کو نیا رنگ عطا دینا چاہیں بریں پہلے اس قدر بلند تھا کہ ان پر ہی آواز سنائی دیتی تھی، اب اس قدر تیزی اور سرعت سے مدھم مچ گیا جیسے اس کا کوئی نام ہیوا بھی باقی نہ رہا ہو۔ آج اگر پوسٹ مڈرن ظہور و صفا جانندہ صری ایسے بعض جدید شعرا کبھی کبھار زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے ایک آدھا سائنٹ کر لیتے ہیں تو اس کا مطلب نہیں کہ اس میں زندگی کی ابھی کوئی رقی باقی ہے اور اب کچھ اوروں میں کینٹو کے بارے میں — ن۔ م۔ رائے جن کے ساتھ جدید اردو شاعری میں نئی اصناف کو داخل کرنے کے کچھ سلسلے وابستہ ہیں۔ گزشتہ جنگ عظیم میں تھر شام، ایران وغیرہ گئے۔ واپسی پر انھوں نے اپنی ایک طویل نظم سے اردو شاعری کو آشنا کرایا۔ اس نظم کا عنوان ہے — ”ایران میں اجنبی“ — ”ایران میں اجنبی“ کے تحت رائے کے سامنے ایک بہت بڑا موضوع اور ایک نہایت وسیع کینیٹوس تھا۔ ایک نئے ماحول بلکہ ایک نئی دنیا میں ایرانی تہذیب کا ایک فرد تنہا کھڑا تھا۔ اگرچہ وہ کسی قدم بہت تھا۔ لیکن اس کے دل دیدہ دونوں کھلے تھے اور ان میں حالات کا جائزہ لینے، زندگی کو پیش کرنے اور جذبات و احساسات سے ہکتا رہنے کی پوری قوت تھی۔ ظاہر ہے اس قدر طویل سلسلہ کو ایک ہی سانس میں پیش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ رائے نے ایک بار پھر انگریزی کا سہارا لیا۔ اور وہاں کے کینیٹو کی صورت میں اپنے خیالات کو پیش کرنے کا سامان کیا کینٹو کا لفظ اٹھانوی ہے جس کے معانی گیت، نغمہ، گانا، دلکش موسیقی وغیرہ بہت کچھ ہیں۔ لیکن قدیم ایام سے جب شعر مشیر گانے ہی کے لئے ہوتا تھا۔ کینٹو کا مفہوم طویل نظموں کے درمیانی وقفوں ہی کا تھا۔ انگریزی شاعری میں اکثر بڑے شعراء نے طویل نظمیں لکھی ہیں اور ان کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہر حصہ کو ایک کینٹو کہا جاتا ہے۔ رائے نے بھی اپنی نظم ”ایران میں اجنبی“ کو تقریباً تیس حصوں میں تقسیم کرنے کا ڈھانچہ بنایا ہے۔ اس نظم کے بعض کینیٹو عجیب جگہوں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اول تو یہ انظم آداد کے سانچے میں ڈھالے گئے ہیں، دوسرے ہر کینیٹو میں مصرعوں کی تعداد مختلف ہے جو اسی سے لے کر چار سو سے اوپر تک پہنچتی ہے۔ ”ایران میں اجنبی“ ابھی ہمارے سامنے مکمل طور پر نہیں آئی تھی کہ ایک اور شاعر جعفر طائر نے ایسے ہی کینٹو کی صورت میں ایک اور طویل نظم پیش کرنا شروع کی۔ پیرامن کے ”قصہ چہار درویش“ کے انداز پر مختلف درویشوں کی سیروں کا تذکرہ ہے جہاں نہ حال میں مختلف ملکوں کی تہذیب و معاشرت میں ہر لحظہ بدلے ہوئے جدید رجحانات کو دیکھتے ہیں۔ اس نظم میں قدیم و جدید کی دلنشین آمیزش ملتی ہے جو نہ جانے نظم کے ختم ہونے تک بالآخر کس نتیجہ پر پہنچے گی۔ جعفر طائر کی نظم رائے کے برعکس بلند شاعری کا نمونہ ہے۔ جس میں بندوں کی ساخت اور ان کے مصرعوں کی تعداد اکثر یکساں ہے۔ کینٹو کے میدان میں ابھی تک صرف یہی دو ناموں نمونے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اس لئے اس معیار کے بارے میں ابھی کوئی پیشگوئی کرنا قبل از وقت ہے۔ تاہم تناظر در کہا جاسکتا ہے کہ جدید تقاضوں سے ہم آغوشی کے لئے اس قالب میں خاص جان ہے۔ (ماہ نو)

## آوارہ گرد اشعار

(پروفیسر عطاء الرحمن کا کوی)

(۱) اٹھ گیا جہن دو سے کاجنستاں سے عمل نیخ اردی نے کیا فصل خزاں متاصل  
یہ شعر سودا کے مشہور قصیدہ کا مطلع ہے مگر محمد باقر خٹس صاحب نے اپنے ایک مضمون ”غزل اور اس کا مفہوم“ (مطبوعہ نگار  
مئی ۱۹۴۳ء) میں الفاظ کی باہمی ترکیب سے جزالت ثابت کی ہے اور اس کو غزل ہی کا ایک شعر سمجھ کر ذوق سے منسوب کیا ہے۔ ذوق سے  
منسوب کر کے انھوں نے اپنی بد ذوقی کا ثبوت دیا ہے اور اس کو غزل کا شعر سمجھ کر اپنی کور مذاقی کا۔

(۲) دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم بہر ترستے ہی چلے اب ایک پیانے کو ہم  
یہ شعر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ پیرائے تذکروں میں تو نہیں مگر لغت کے تذکروں میں گل رعنا (عبداللہ) اور خندانہ جاوید  
میں یہ شعر عمدۃ الملک امیر خاں انجام کے نام سے۔ ڈاکٹر امزنا تھ جھانے اپنے ایک مضمون مطبوعہ ریاض منبر میں اسے نظیر سے منسوب کیا ہے  
مزید تلاش سے یہ شعر کلیات نظیر مرتبہ آسی میں بھی مندرج ملا اور اگر میل حافظہ غلطی نہیں کرتا تو غالباً یہ شعر کلیات نظیر مرتبہ شہباز میں  
بھی ہے۔

(۳) چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو سوزن تدبیر بھی گو سو برس سیتی رہے  
صاحب گل رعنا نے اس شعر کو عمدۃ الملک امیر خاں انجام سے منسوب کیا ہے (صفحہ ۱۰۸) مگر تذکرہ مسرت افزا (ملوکہ افسوریہ نیورٹن)  
اور مطبوعہ بالاقساط معاصر بیٹن میں یہ شعر بادئی تغیر بعض علی خاں ذکی کے نام سے (تأقیامت سوزن تدبیر گو سیتی رہے) مسرت افزا کی تائید  
تذکرہ کریم الدین سے بھی ہوتی ہے جو داسی کے تذکرہ پر مبنی ہے۔ خم خانہ جاوید نے گل رعنا کا تتبع کیا ہے۔ ذکی انجام کے رفقا میں تھے  
اس لئے تذکرہ نگاروں سے غلطی سرزد ہوئی تو تعجب نہیں۔ دونوں کا کلام مل جل گیا ہے۔ صاحب گل رعنا نے ذکی کے اور اشعار بھی  
انجام سے منسوب کر لئے ہیں۔

(۴) پھول تو دودن بہار جانفزا دکھلائے حسرت ان غنچوں پہ ہے جون کھلے مرجھا گئے  
پروفیسر کلیم الدین اپنے ایک مضمون ”ترقی پسند شاعری“ مطبوعہ معاصر ص ۵۵ میں سردار جعفری کی نظم ”موت“ پر تنقید کرتے  
ہوئے رقمطراز ہیں کہ:-

”..... یہ سب کھوکھلی باتیں ہیں۔ دل پاش پاش ہوتا تو نظم کی دنیا کچھ اور ہوتی۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ ”موت“ کے آخر میں  
غالب کا یہ شعر نقل کیا جاتا ہے:-

پھول تو دودن بہار جانفزا دکھلائے حسرت ان غنچوں پہ ہے جون کھلے مرجھا گئے

اور یہ احساس نہیں ہوتا کہ جو شعریت اس میں ہے وہ علی سردار جعفری کی پوری نظم میں نہیں۔  
مجھے اس سے بحث نہیں کہ جعفری کی نظم ”موت“ فی الجملہ کیسی ہے اور نہ اس سے بحث ہے کہ شعر تذکرہ بالا میں شعریت کس حد تک ہے  
مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ شعر غالب کا نہیں بلکہ ذوق کا ہے اور قدیم ترین سخن میں اس طرح ہے

(۵) کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے  
روشن ہے اس طرح مرے سینے کا داغ ایک اُجڑے ٹکڑے میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

مزا تیر مرتبہ فواب اثر میں یہ شعر تیر سے منسوب کیا گیا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ اگرچہ یہ شعر تیر کے مروجہ دیوان میں نہیں لکھا اور ذریعہ سے ان کو اطلاع ملی ہے کہ یہ شعر تیر کا ہے۔ تذکرہ مسرت افزا میں یہ شعر جرأت کے نام ہے، خیر یہ تذکرہ کیا اب تو کیا نایاب ہے اور عام طور پر لوگ اس سے ناواقف بھی ہیں مگر اس کو کیا کیجئے کہ تذکرہ گلشن ہند (لطف) مطبوعہ میں بھی یہ شعر جرأت کے نام ہے۔ چونکہ رنگ جرأت کا نہیں اس لئے مضمون کی محذوفی نے تیر سے منسوب کر دیا۔ جرأت نے اپنے رنگ سے علیحدہ ہو کر بھی داد سخن دی ہے اور خوب دی ہے اس لئے اس کو جرأت ہی کا شعر سمجھنا چاہئے۔ پہلے مصرعہ میں ”مرے سینے“ کی جگہ ”دل ویران“ ہے جو خوب ہے۔

(۶) آنکھیں کہیں کہ دل ہی نے مجھ کو کیا خراب دل یہ کہے کہ آنکھوں نے مجھ کو ڈبا دیا

بگڑا کسی کا کچھ نہیں اسے درد عشق میں دونوں کی ضد نے خاک میں ہم کو ملا دیا

عام طور پر قطعہ درد ہی کا سمجھا جاتا ہے۔ میری زبان پر بھی درد ہی کا تخلص تھا۔ میری اس غلطی کی تائید حضرت سلیمان ندوی کے شذراتِ باہت معارف اگست ۱۹۲۹ء سے بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے درد ہی سے منسوب کر کے ”دوسرے مصرعے میں“ ”ڈبو دیا“ لکھا ہے جو غلط ہے مگر مصحفی کے ریاض الفضا کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ یہ قطعہ منشی آسمارام ذوق کا ہے۔ تذکرہ مسرت افزا مصنف امرالتمہ راو آبادی (میں بھی ذوق ہی منسوب ہے۔ منشی ذوق بیٹن میں رہتے تھے، فدوی کے شاگرد اور راسخ کے ہم مشق اور ہم استاد۔ اس قطعہ کو درد سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ خدا جانے کیسے درد سے منسوب ہو کر مشہور ہو گیا۔

(۷) کون پر سال ہے حال بسل کا خلق منہ دکھتی ہے قاتل کا

یہ بہت مشہور شعر ہے، اردو غزل کے مصنف نے یہ شعر نظام شاہ رامپوری کا بتایا ہے حالانکہ یہ شعر ہے ان کے استاد شیخ علی بخش تیمار کا۔ تیمار مصحفی کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ نیاز صاحب نے بھی اپنے مضمون ”نظام رامپوری“ مطبوعہ نگار اگست ۱۹۲۷ء میں اس شعر کو تیمار ہی کا اور داد سے مستغنی بتایا ہے۔ تیمار کی اس زمین کا مقطع ہے ے

سانس آہستہ لیجو تیمار ٹوٹ جائے نہ آہ دل کا

خنجانے جاوید میں بھی یہ دونوں مطلعے اور قطعے تیمار ہی کے نام ہیں مگر تعجب ہے کہ صاحب اردو غزل نے استاد کی بلک اطمینان سے شاگرد کے حوالہ کر دی۔

(۸) مجلس وعظ تو تا دیر رہے گی تا ایم یہ ہے میخانہ ابھی بی کے چلے آتے ہیں

میں نے اس شعر پر آوارہ گرد اشعار قسط ۵ (نگار اکتوبر ۱۹۷۲ء) میں روشنی ڈالی تھی اس پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت اس لئے آپڑی کہ ”اردو غزل کے دوران مطالعہ میں یہ بات ظاہر ہوئی کہ یہ شعر مایل کا ہے (ص ۳۱)۔ مایل تخلص کے چند شاعر ہوئے ہیں مگر صاحب اردو غزل کی مراد شاید مرزا عبدالحق بیگ مایل سے ہے جو، کے کلام سے چند اشعار انہوں نے اپنی اس کتاب کے آخر میں انتخاب کئے ہیں مگر یہ شعر نہیں (ص ۵۶)۔ زیر بحث شعر کو بعض لوگوں نے غالب سے بھی منسوب کیا ہے۔ دیوانِ باقر تلمیذ غالب کے دریاچہ میں باقر کے وجدانی صحیح کے حامل ہونے کی تائید میں یہ روایت نقل کی ہے کہ تذکرہ بالا شعر کسی نے غالب تخلص کے ساتھ پڑھا۔ باقر کو تعجب ہوا کہ یہ شعر اور غالب کا۔ خدا کھ کر غالب سے دریافت کیا گیا تو جواب آیا کہ ”اگر یہ شعر میرا ہو تو مجھ پر ایک ہزار لعنت، ورنہ جس نے اس کو بہ غلط میری جانب منسوب کیا ہے اس پر دس ہزار لعنت! مجھ پر کہا شامت آئی تھی کہ پاس ہی میخانہ ہوتے ہوئے مجلس وعظ میں جا کر بیٹھتا۔“ یہ روایت اس لئے بھی مجہول معلوم ہوتی ہے کہ لوگ اکثر اہل اشعار غالب سے منسوب کر کے ان کو سناتے تھے اور اس پر وہ بگڑ کر لعنت ہر ساتے تھے۔ یہی الفاظ انھوں نے کسی اور شعر کے متعلق بھی

کہے تھے، دوسرے یہ کہ متذکرہ بالا اشعار ایسا نہیں جو غالب اس سے پناہ مانگتے اور لعنت ملامت کرتے ان کے ”بھول پاس آگئے“ والے شعر سے تو بھر بھی یہ بلند ہے۔ بہر کیف غالب کا تو یہ شعر ہو ہی نہیں سکتا اب رہا مایل تو اس کی طرف دلی اس لئے مایل نہیں ہوتا کہ حسرت موہانی نے نکات سخن میں اس شعر کو قائم سے منسوب کیا ہے۔ حسرت موہانی کا مطالعہ غزلیات شعرا کے اردو بہت وسیع تھا اس لئے ان کی رائے پر بھروسہ کرنا ہی جھوٹا۔ مرآۃ الشعراء حصہ اول کے مصنف نے بھی اس شعر کو قائم ہی کا بتایا ہے اور حوالہ دیا ہے مکتوبات آزاد کا۔ ان وجوہ کی بنا پر قائم ہی اس شعر کے مصنف ہیں۔

(۹) صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور نکلے جو مسیکرہ سے تو دنیا بدل گئی  
یہ مشہور و معروف شعر گستاخ رامپوری کا ہے۔ اور اس کے اس دیوان میں جس کو حسرت موہانی نے شائع کر لیا تھا موجود ہے۔ مگر یہ بھی ایک عجیب تلمذ ہے کہ یہ شعر گستاخ کے چند اور اشعار کے ساتھ ریاض خیر آبادی کے دیوان میں مجنسہ یا خفیف ترسیم کے ساتھ مندرج ہے۔ نیاز صاحب نے بھی ریاض نمبر میں جو ریاض کے منتخب اشعار چنے ہیں ان میں یہ شعر بھی شامل ہے! اثر رامپوری بدیع آج کل (مئی ۱۹۵۷ء) اطلاع دیتے ہیں کہ چونکہ گستاخ اور ریاض دونوں ہم استاد تھے اس لئے قیاس یہ چاہتا ہے کہ روابط کی بنا پر یہ ناممکن ہے کہ ریاض، گستاخ کے ان اشعار سے ناواقف ہوں۔ میں اس پر یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ چونکہ ریاض کو یہ اشعار پسند ہوں گے اس لئے انھوں نے کہیں ریاض پر شاہک لئے ہوں گے اور ریاض کی وفات کے بعد ان کے دیوان کے مرتب نے غلطی سے ان اشعار کو بھی داخل دیوان کر دیا۔ ریاض کی زندگی ہی میں چونکہ گستاخ کا کلام شائع ہو گیا تھا اس لئے یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ ریاض کو اس کی اطلاع نہ ہو اگر ان کے اشعار ہوتے تو اس کی تردید ہوتی۔ بہر حال یہ شعر گستاخ ہی کا ہے۔ دوسرے اس زمین کے اور اشعار جو غلطی سے دیوان ریاض (ریاض رضواں) میں داخل ہو گئے ہیں یہ ہیں:-

- |       |                                     |   |
|-------|-------------------------------------|---|
| (الف) | کچھ آگے قتل گاہ میں ہم سے اجل گئی،  | جانے سے پہلے جان ہمار سی نکل گئی        |
| (ب)   | کہتی ہے نیم دا یہ چین کی کلی کلی،   | فریاد عندلیب کلیہ مسل گئی،              |
| (ج)   | ساتی کے اٹھے اٹھے ادھر ہاتھ اٹھ گئے | بوتل سے کاگ اڑا تھا کہ رندوں میں جل گئی |
| (د)   | کتنا آخر ہے آمد فصل بہار کا،        | رندوں کی طرح جام کی رنگت بدل گئی        |
| (ہ)   | انگڑائی کے اور بھی سوئے وہ چین سے   | بھولوں کی پنکھیاں جو صبا آ کے جھل گئی   |

نوٹ :- خط کشیدہ کے نیچے کے الفاظ گستاخ کے ہیں۔

## نگار کے پچھلے تین سالانے

سالنامہ ۳۳۷ء جس میں علم ”فراسات التحریر“ کے اصول پیش کئے گئے تھے اور جن کو دیکھ کر آپ ایک شخص کا سواد خط دیکھ کر اس کے  
یکر کٹر کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ صرف ایک کلابی باقی ہے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول  
سالنامہ ۳۳۸ء اس میں ”ڈراما اصحاب کہف“ اڈیٹر کے قلم سے پورا شائع ہوا ہے اور ”خلافت و امامت“ کے مسئلہ پر گتھو کا  
آغاز ہوا ہے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول  
سالنامہ ۳۳۹ء اس میں ”تاریخ اسلامی“ کے عہد خلافت و امامت پر ختم بحث کی گئی ہے جس کی ابتدا و اختتام میں ہوئی تھی۔  
قیمت تین روپیہ علاوہ محصول  
مینجر نگار لکھنؤ

# آبی شمعیں

(وحید الدین خاں متین)

خدا نے بے شمار عالم پیدا کئے ہیں۔ جن کا علم انسان ابھی تک حاصل نہیں کر سکا۔ تاہم اپنی اس کم مائی، بے بضاعتی اور محدود قوت جسمانی و دماغی کے باوجود اس نے بے شمار تجربات اور علوم حاصل کئے ہیں اور آئندہ نسلوں کی رہنمائی اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے معلومات کا بہترین خزانہ جمع کیا ہے جس میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ ماہرین حیوانیات نے روشن جانوروں کے بارے میں بہت سی تحقیقات کی ہیں۔ ان جانوروں کے متعلق عہد قدیم کے لوگ بھی کچھ نہ کچھ ضرور جانتے تھے۔ اسطوئے مردہ مچھلیوں اور گیلی لکڑیوں میں ایک خاص قسم کی روشنی کے وجود کا ذکر کیا ہے۔ اسطوئے بھی بہت پہلے ماہی گیروں نے اس روشنی کا مشاہدہ گرمی کی اکثر راتوں میں کیا ہوگا۔ انھوں نے یہ ضرور دیکھا ہوگا کہ ان کے چبڑوں میں اکثر ایک نہایت دل آویز اور حیرت خیز روشنی نمودار ہو جاتی ہے۔ جس سے سمندر کی ہر بہیت اور خطرناک لہریں منور ہو جاتی ہیں ان کی آنکھوں کو تھوڑی دیر کے لئے یہ دھندلا ہوتا ہوا ناکہ پانی میں آگ لگ گئی ہے۔ گرم مالک سے باشندوں نے اس روشنی کو جھاڑیوں کے آغوش میں اس طرح جھلملاتا دیکھا ہوگا جس طرح بجلی کے تقصروں میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد روشنی پیدا اور پہاں ہوتی رہتی ہے۔ علاوہ بریں اس روشنی کی دلفریب چمک کو دنیا والوں کی نگاہوں نے مردہ مچھلیوں میں دیکھا ہوگا۔ جنہیں ماہی گیر مکھانے کے لئے لٹکا دیتے تھے۔ لیکن مذکورہ بالا مختلف طبقات کے لوگوں میں سے کوئی بھی اس روشنی کا صحیح پتہ نہ لگا سکا تھا۔

عہد قدیم کے بعض حکماء کا خیال تھا کہ یہ روشنی جانوروں میں فاسفورس کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر بعد کے زمانے میں سائنس کی روز افزوں ترقی نے ان کے اس نظریہ کو غلط ثابت کر دیا۔ پروفیسر بچنر (BUCHNER) نے اس امر کا صحیح صحیح پتہ لگا لیا ہے کہ یہ روشنی مچھلیوں میں چمکیلے جراثیم کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو ان کے مختلف اعضا میں گھر کر لیتے ہیں۔ لیکن بعض ماہرین حیوانیات کا یہ خیال تھا کہ یہ روشنی تمام جانوروں میں مٹنے کو جگنو میں بھی محض چمکیلے جراثیم کی وجہ سے ہوتی ہے مگر اس قول میں صداقت نہیں ہے کیونکہ جراثیم اور سبب چوند کی روشنی کی خصوصیات دواہی اور دیگر دشمنہ جانوروں کی روشنی سے ممتاز ہوتی ہیں یہ روشنی روز و شب بغیر کسی دوسرے کی مدد کے چمکتی رہتی ہے برعکس اس کے دوسرے جگندار جانوروں کو چمکنے میں دوسری اشیاء کی مدد حاصل کرنا پڑتی ہے اس قسم کی چمک جگنو اور دیگر جانوروں میں پائی جاتی ہے۔ جگنو کے پیٹ کے نچلے اور پچھلے حصے میں دو پرت ہو۔ آہیں اور ان پر توں میں غلط ہوتے ہیں۔ پروفیسر ڈوبوا۔ اور پروفیسر واروسے نے تجربوں سے ثابت کیا ہے ان کیڑوں میں ایک قسم کا عرق (FERMENT) ہوتا ہے جسے لوسیفیرین (LUCIFERINE) کہتے ہیں۔ اس کا اثر ایک اور مادے پر ہوتا ہے جس کو لوسیفیرین (LUCIFIRINE) کہتے ہیں یہ مادے روشنی کے غلیوں میں پائے جاتے ہیں۔ چمک کی کمی اور بیشی کا انحصار اس ہوا پر ہے جو سانس کی نلیوں کے جال سے گزر کر خون میں اکساؤ پیدا کرتی رہتی ہیں۔ جب لوسیفیرین، لوسیفیرین پر اثر درآز ہوتی ہیں تو ان کے عمل کو سہارا دینے کے لئے آکسیجن کام آتی اور اس طرح جگنو آہ و امد میں چراغ کی طرح منور ہو جاتا ہے۔

دنیا میں تقریباً چالیس جانور اس قسم کے پائے جاتے ہیں ان کے علاوہ بعض نباتات مثلاً پھونڈا اور جراثیم بھی روشن ہوتے ہیں

جراثیم جانوروں کے گوشت میں رہ کر روشنی کا ایک فوارہ پیدا کر دیتے ہیں جو ہمہ وقت اُبلتا رہتا ہے۔ پھوند بیشتر درختوں اور اُن کی شاخوں کو جگمگا دیتی ہے جسے دیکھ کر دیہات کے لوگ بھوت پریت سمجھ لیتے ہیں اور ڈر جاتے ہیں۔ یہی پھوند اکثر پرندوں کے پرؤں میں لگ کر انھیں روشن اور منور کر دیتی ہے جیسا کہ محققین نے آٹو اور بعض اقسام کے بگلوں کے پرؤں میں اس کا مشاہدہ کیا ہے۔

شاید آپ نے بھی کبھی آٹو کے پرؤں کو اندھیرے میں چمکتا دیکھا ہو لیکن ان کا ذکر ہماری بحث سے خارج ہے کیونکہ ان میں روشنی پھوند کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ زیادہ تر روشن جانور سمندروں اور دریاؤں کے رہنے والے ہیں۔ ان کی ایک بڑی تعداد روشن حصّہ کی مالک ہوتی ہے جو جسم کے اوپری حصّہ میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض میں روشنی پھینکے والے تھکے بھی ہوتے ہیں۔ اکثر ان کے ان حصّوں سے رنگین روشنی بھی نکلتی ہے۔

ساحلوں پر زندگی بسر کرنے والی اقوام کے افراد اور سمندری سفر کرنے والے حضرات نے انواع و اقسام کے آبی جانوروں کا مشاہدہ ضرور کیا ہوگا اور مختلف انواع کے بحری دلکش مناظر سے لطف اندوز بھی ہوئے ہوں گے۔

سمندروں اور بڑے بڑے دریاؤں میں سفر کرنے والے اشخاص نے شام کے سہانے اوقات میں دیکھا ہوگا کہ چنگاریاں پھوٹ پھوٹ کر اوپر آتی ہیں اور سطح آب کو جگمگا دیتی ہیں۔ یہ روشنی زیادہ تر ایک خلیہ والے منور جانوروں کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے جو لاکھوں کی تعداد میں سطح آب پر پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض ”رات کی روشنی“ کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں ان کو حیوانات میں ”ناکٹیلیوسا“ (NOCTILUCA) کہتے ہیں۔ تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ ان کا جسم پن کے سر کے برابر ہوتا ہے اور یہ سطح آب پر اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ سمندر دن کے وقت شرخ کلاب کا لہلہاتا ہوا باغ اور رات میں جگمگاتے اور جھلملاتے ہوئے تاروں سے بھرا ہوا آسمان معلوم ہوتا ہے۔ جب یہ کثیر تعداد میں ایک قطار میں جمع ہو جاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہکشاں نے سمندر میں گھر کر لیا ہے اگر آپ ان کو ایک برتن میں جمع کر لیں تو ان کی روشنی سے اپنی گھڑی میں ایک فٹ کے فاصلے سے وقت دیکھ سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا جانوروں کے علاوہ سمندروں میں جیل فش (JELLY FISH) بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے جھنڈ نہایت آہستگی خاموشی، دلکشی اور مسلسل حرکت کے ساتھ سطح آب پر آتے اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کا سلسلہ ایک لامتناہی ڈور کی مانند ہوتا ہے۔ سمندروں کی باڑھ سے بانی جب ساحلی علاقوں میں آتا ہے تو وہ ان جانوروں کو کافی تعداد میں اپنے ساتھ لاتا ہے جو وہاں کے باشندوں کے لئے ایک عجیب و غریب اور دل آویز منظر پیش کرتے ہیں۔ ان جانوروں کے اجسام سے نور کی شعاعیں نکلتی دیکھ کر یہ لوگ چند لمحات کے لئے اپنی تمام تکلیفوں اور فکروں کو بھول جاتے ہیں کیونکہ ان کی تمام حواس قدرت کی اس بے مثل اور لا جواب صنعت کی جانب مبذول ہو جاتی ہے اور وہ اس پر کھینٹ نظر ارہ میں کھو جاتے ہیں۔ ان جانوروں کی شکل چھتری کی مانند ہوتی ہے اور ان کے ہاتھ آٹھ یا اس سے کچھ کم و بیش ہوتے ہیں ان سے یہ اپنے شکار کے پکڑنے کا کام لیتے ہیں۔ ان کا قطر ۱۰ انچ یا اس سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔

کارکنان قضا و قدر نے اینیلڈ (ANNELID) کیچوس کی قسم کے جانور کو اس نور سے سحر از کیا ہے۔ آپ حضرات نے بے سرات کے موسم میں زمین پر ہزاروں کی تعداد میں رینگتے ہوئے کیچوؤں میں بھی اس قسم کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ لیکن جو تک جو اسی نامزدان سے تعلق رکھتی ہے اس روشنی سے محروم ہے۔

اکائی نوڈرمیٹا (ECHINODERMATA) میں بھی چند ایسے جانور موجود ہیں جو درخشندگی کے مالک ہوتے ہیں ان جانوروں کے پانچ بازو ہوتے ہیں جو ایک ہی ہاتھ سے ملحق ہوتے ہیں۔ اس ہاتھ کے نیچے حصّہ میں اُن کا منہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ستارے نما پھلی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ مزید برآں سمندروں میں ایک عجیب قسم کا گھونگا بھی پایا جاتا ہے۔ جسے حیوانات

میں فوٹاس (PHOLAS) کہتے ہیں۔ یہ پرانے زمانہ کے لکڑی کے جہازوں میں سوراخ کو دینا تھا اس وجہ سے اسے "جہاز میں سوراخ لرنے والا" کہتے ہیں۔ اس میں تابندگی پائی جاتی ہے۔

اکثر جینٹا مچھلی میں بھی روشنی کے دو عضو پائے جاتے ہیں جن کی چمک پانی کے اندر اس قدر بھلی معلوم ہوتی ہے کہ دیکھنے والے ان کو درخشندہ ہمیروں "اور آبدار جواہرات" سے تشبیہ دیتے ہیں۔

ابھی تک ہم آپ سے سطح والے جانوروں کا ذکر کر رہے تھے اب ذرا گہرائی میں رہنے والی بعض مچھلیوں کا ذکر سنئے۔ ان میں روشنی کے پیدا ہونے کے دو امکانی اسباب ہو سکتے ہیں اول یہ کہ مچھلیاں خود ہی ایسے مادے پیدا کرتی ہیں جن کے آپس میں ملنے سے چمک پیدا ہوتی ہے اس کی پیدائش کا دوسرا سبب وہ جراثیم ہیں جو ان کے غدودوں میں گھر کر لیتے ہیں اول الذکر خیال بہت عام تھا لیکن پروفیسر بکھنر (BUCHNER) نے نوٹوبلیفران نامی مچھلی پر تجربہ کرتے ہوئے اس کے روشنی والے اعضاء میں روشن جراثیم پائے۔ اس کے علاوہ نیوٹن ہاروی (NEWTON HARVY) نے بھی جزائر بانڈہ کی منور مچھلیوں کے حصوں کے اندر متحرک جراثیم غریبہ سے دیکھے جو ان جراثیم سے مشابہ تھے جو کہ مرده مچھلیوں میں چمک پیدا کر دیتے ہیں۔ ہاروی نے ان پر اور بھی تجربے کئے اس نے ان مچھلیوں کے منور حصوں کو سکھایا اور بعد ازاں ان کو نم کیا تو اس نے ان کے اندر دم روشنی از سر نو دیکھی۔ یہی بات روشن جراثیم پر بھی صادق آتی ہے۔ اس نے دوسرا تجربہ یہ بھی کیا کہ زہر منور جراثیم کی روشنی کو فنا کر دیتا ہے وہی زہر ان مچھلیوں کے اعضاء کی روشنی کو بھی زایل کر دیتا ہے ہر حال ان ماہرین حیوانات نے اوپر دئے ہوئے تجربوں سے یہ قطعی طور پر ثابت کر دیا کہ مچھلیوں میں چمک روشن جراثیم کی وجہ سے ہوتی ہے پروفیسر میک ہارٹ (BURKHART) اور دیگر حکماء نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ روشن مچھلیاں سمندروں میں پانچویں نمبر نا گہرائی تک پائی جاتی ہیں اور یہ دعویٰ حسب ذیل مچھلیوں سے ثابت ہے کیونکہ ان میں سے ایک بھی پانچویں نمبر سے زیادہ گہرے پانی میں نہیں پائی جاتی۔

مچھلیوں میں شارک (SHARK) نام کی ایک مچھلی ہوتی ہے۔ جس کی کئی مختلف نسلیں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثال کے لئے ہم لیما گرس (LAEMARCUS) کو پیش کرتے ہیں۔ اول الذکر میں یہ چمک عموماً اور موخر الذکر میں خصوصاً پائی جاتی ہے اس قسم کی مچھلیاں ہندوستان کے دریاؤں اور چشمیوں میں بھی پائی جاتی ہیں جنہیں "مار پوڈان" (HARPODANI) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب یہ مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں تو ان کا جسم جگمگا اٹھتا ہے، مچھلی کے شکار سے ذوق رکھنے والے حضرات ان مچھلیوں سے ضرور دوچار ہوئے ہوں گے۔ ان کے علاوہ ایسی مچھلیاں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں جن کے جسم کے مختلف حصوں پر روشنی کے اعضاء ہوتے ہیں۔ یہ منور اعضاء بعض مچھلیوں کے جسم کے اگلے پچھلے حصے میں قطار در قطار پائے جاتے ہیں جن سے روشنی کے فوارے نکلنے لگتے رہتے ہیں۔ یہ پانی کو اپنی روشنی سے جگمگا دیتے ہیں، مثال کے طور پر ہم اسکا ہیلڈ مچھلی (SCOPELID) کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے آنکھیں نہیں ہوتیں اگرچہ یہ ان مچھلیوں کے ساتھ رہتی ہیں جو بینا ہوتی ہیں۔ آنکھوں کے بجائے ان کے سر کے اگلے حصہ پر روشنی کا بڑا عضو ہوتا ہے جس سے ہمہ وقت روشنی کی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں۔ جزائر بانڈہ کی مچھلیوں میں بھی روشنی کے بڑے ذخیرے ہوتے ہیں جن کی روشنی تاریک سمندروں کو جگمگا دیتی ہے۔ ان کے علاوہ "پانی روموم" (PYROSOM) مچھلی میں بھی روشنی پائی جاتی ہے۔ یہ جزائر بانڈہ کی مچھلیوں کی مانند مسلسل نہیں چلتی رہتی بلکہ جگنو کی مانند ان میں بھی روشنی تھوڑے تھوڑے وقفے سے پیدا رہتی ہوتی رہتی ہے۔ یہ سمندروں میں ہزاروں کی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ ان کی شکل مکی کی طرح ہوتی ہے۔ ان میں ہمیروں کی مانند چمکدار اعضاء ہوتے ہیں ان اعضاء کے چھوٹے سے چھوٹے خلیے میں بھی گھولنے کی شکل کے روشن ذرات پائے جاتے ہیں۔ ذرات ہمارے دماغ میں ایک خاص قسم کے جراثیم کا تصور پیدا کر دیتے ہیں آپ یہ معلوم کر کے سید متحیر ہوں گے کہ ان کا ہر فرد اس قدر روشنی سیکتا ہے کہ اس کی مدد سے صرف آپ اپنے گھر سے کامان دیکھ سکتے ہیں بلکہ آپ کتاب کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں۔

ان روشن جانوروں اور ان کے اعضاء کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بعد آپ کے دل میں قدرتا یہ سوال پیدا ہوگا کہ یہ جانور اس روشنی سے اپنے کن مقاصد کو پورا کرتے ہیں۔ اس سوال کا جواب دینے میں ماہرین حیوانات نے کسی حد تک کامیابی حاصل کر لی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس روشنی کا کام معین نہیں ہے۔ ان کے اس قول کی تصدیق حسب ذیل تحقیقات سے ہو جاتی ہے۔

(۱) بعض جانور اس روشنی کی مدد سے گہرے سمندروں کی تاریکیوں میں شکار کو اپنی جانب مائل کرتے ہیں لیکن یہ بات صرف ان جانوروں کے لئے مخصوص ہے جن کے روشن اعضاء ان کے منہ کے آس پاس پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ 'اینگلرس' (ANGERS) میں دیکھا گیا ہے۔

(۲) بیشتر جانور اس روشنی سے شمع کا کام لے کر دوسرے جانوروں کو شناخت کرتے اور اپنی راہ معلوم کرتے ہیں یہ خصوصیت ان جانوروں کی ہے جن کے منور اعضاء سمے کے سروں کے ارد گرد پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ قول 'سی پنس' (SEOPENS) جیسے غیر محرک جانوروں پر صادق نہیں آتا۔

(۳) بعض جانور اس روشنی سے اپنے دشمنوں کو دھمکانے اور رقیبوں کو مغرب کرنے کا کام بھی لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی مادہ گوشت سے بچاتے ہیں۔

(۴) یہ روشنی مختلف نوع کی نسلوں کو ممتاز کرنے میں بھی متحد ہوتی ہے اور اسی روشنی کی مدد سے نر اپنی مادہ سے واصل ہونے کا کام لیتا ہے۔ یہ امر نہایت قابل غور ہے کہ ٹوڈ (TOAD) کچھلی صرت اُس زمانہ میں چلتی ہے جب وہ انڈے دیتی ہے۔

التحقیق روشنی اشارہ ہنسی، شعل راہ، رکشش صید، اور تنبیہ کنندہ کا کام کرتی ہے۔ ان منور اعضاء کے مقاصد کے بارے میں سر دست کافی تحقیق نہیں کی جاسکی ہے لیکن ہمارے ماہرین حیوانات اس راز کے منکشف کرنے میں سرگرداں ہیں اور وہ زمانہ نزدیک ہے کہ جب ہم اس امر کی پوری پوری معلومات حاصل کر لیں گے۔

## » نگار کے پچھلے فائل

۳۲ء	=	جولائی تا دسمبر	=	ع ۱۰
۳۳ء	=	جنوری تا دسمبر	=	ع ۱۱
۳۴ء	=	جنوری تا دسمبر	=	ع ۱۲
۳۵ء	=	جنوری تا دسمبر	=	ع ۱۳
۳۶ء	=	جنوری تا دسمبر	=	ع ۱۴
۳۷ء	=	جولائی تا دسمبر	=	ع ۱۵
۳۸ء	=	جنوری تا دسمبر	=	ع ۱۶
۳۹ء	=	جنوری تا دسمبر	=	ع ۱۷
۴۰ء	=	جنوری تا دسمبر	=	ع ۱۸
۴۱ء	=	جنوری تا دسمبر	=	ع ۱۹
۴۲ء	=	جنوری تا دسمبر	=	ع ۲۰
۴۳ء	=	جنوری تا دسمبر	=	ع ۲۱
۴۴ء	=	جنوری تا دسمبر	=	ع ۲۲
۴۵ء	=	جنوری تا دسمبر	=	ع ۲۳

نوٹ:- صرف ایک ایک فائل موجود ہے اور سب سے پہلے جس کا آرڈر ہو چکا اُسی کو دیا جائے گا۔ قیمت مخصوصہ ایک کے علاوہ۔

نیچر نگار لکھنؤ

گاہے گاہے باز خواں —

## مذہب و عقل کی جنگ

زندگی کا صحیح مقصود حصول مسرت ہے اور ذہن انسانی مجبور ہے کہ وہ مسرت کے واقعی اسباب و شرائط معلوم کرے۔ واضح رہے کہ مسرت سے مراد میری صرف کھانا پینا نہیں، محض جسمانی راحت و آسائش نہیں، بلکہ بلند قسم کی وہ مسرت ہے جو ادائے فرائض کے بعد حاصل ہوتی ہے، جو لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے کے بعد محسوس ہوتی ہے جو فطرت کے مطالعہ اور حسنِ خبرد کے احساس سے پیدا ہوتی ہے اور جو آزادی ذہن و ضمیر کی پیداوار ہے۔

لیکن آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو مسرت کی خواہش کو ٹھکراتا ہے جو حریتِ فکر و رائے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جس نے عقل انسانی کو شل کر دینا ہی اپنی مقصود زندگی قرار دے رکھا ہے، یہ گروہ اپنے آپ کو اہلِ مذہب اور روحانیت پرست کہتا ہے، یہ وہ گروہ ہے جو احساساتِ مسرت کو وسوسہ شیطانی کہتا ہے، یہ اس دنیا کی زندگی سے نفرت کرتا ہے اور اس کی تمام خواہشات کا تعلق کسی دوسری دنیا سے ہے۔ جس کا اصطلاحی نام اس نے ”حیات بعد الموت“ رکھا ہے، وہ کہتا ہے کہ خدا نے اس کو اپنی ”سیرتِ کبیلہ“ کے لئے منتخب کر لیا ہے، پیامِ ربانی کے لئے اس کی زبان مخصوص ہے اور صداقت و حقیقت کا نام ہے صرف اس چیز کا جو اس کے دل و دماغ سے پیدا ہو۔

اس جماعت نے ہمیشہ عقل و علم سے دشمنی کی، ذہن انسانی کو اس نے ہمیشہ کند رکھنا چاہا اور اس نے علم و یقین کا اخذ ہمیشہ فخری کرات و مہجرات کو قرار دیا ہے، اس نے دنیا میں صرف نفرت، تعصب اور خوف کی اشاعت کی اس نے مفکرین کو ہمیشہ اپنا دشمن سمجھا، اس نے محنت و عقل سے ہمیشہ جی چہرہ لایا اور اسی کو برگزیدہ قوم سمجھا جس کے لئے عجیب سے من و سلوخی نازل ہو سکتا ہے۔

یہ جماعت اپنا ایک لٹریچر بھی رکھتی ہے، جسے مختلف ناموں سے مختلف قوموں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اس لٹریچر میں وہ سب کچھ ہے، جسے عقل انسانی کبھی تسلیم نہیں کر سکتی، اس میں تخلیق کا نشات کا بھی ذکر ہے اور آفرینشِ انسان کا بھی، اس میں تاریخِ قدیم کے ٹکڑے بھی نظر آتے ہیں اور اخلاق کے درس بھی لیکن بائیسہ محض روایت و داستان ہے جس کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں یا پھر ان ہدایات کا مجموعہ ہے جو محض تعصب و تنگ نظری کی پیداوار ہیں۔

انھوں نے ہمیشہ خدا کا ڈر دکھا کر اپنا اثر قائم کیا، انھوں نے ہمیشہ دنیا کو یہ بھی یقین دلایا کہ اگر ان کی دعائیں شامل حال نہ ہوں تو بلاشک ہند ہو جائے، کھیتیاں برباد ہو جائیں، دنیا بھلا و دباؤ سے فنا ہو جائے اور جب کبھی کوئی مصیبت نوعِ انسانی پر نازل ہوتی تو انھوں نے اس کو اپنی ہی بد دعاؤں کا نتیجہ بتایا، پھر انھوں نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ جب کبھی انھیں اقتدار حاصل ہو، علم کو روندنا لگا۔ عقل با مالی کی گئی آزادی کو مٹا لگیا، مفکرینِ عالم کو قید میں ڈالا گیا، اربابِ فضل و کمال کو ذبح کیا گیا اور خدا کے نام پر وہ سب کچھ کیا گیا جسے شیطان بھی گوارا نہ کر سکتا تھا۔

لیکن مذہب کا ظہور مذہبی کتابوں کی پیداوار، خالقانہ ہول کی تعمیر اور اہلِ خانقاہ کا وجود، کوئی غیر فطری بات نہ تھی، بلکہ عہدِ وحشت کے فاروں سے پیکر موجودہ دور تہذیب تک انسان نے جو تدریجی ترقی کی ہے، اسی کے یہ لازمی مظاہر تھے، دنیا کی تاریخ میں اتفاق کوئی چیز نہیں ہے، اس میں مجرہ و خرقِ عادات کو کوئی دخل حاصل ہے اور نہ فحشی و ماحلت کو۔ پھر شے اور ہر حالت و واقعات سے پیدا

۴، اس لئے اگر ہمارے اسلاف کے دلوں میں مذہب و روحانیت کا خیال پیدا ہوا تو وہ بالکل فطری خیال تھا، کیونکہ ان کی عقل سے زیادہ یہیں تک پہنچ سکتی تھی اور وہ اس کو سچ سمجھ کر پیش کرتے تھے۔

تمام زمانوں میں انسان نے اپنے اور اپنے ماحول کے سمجھنے کی کوشش کی ہے، وہ دیکھتا تھا اور تعجب کرتا تھا کہ پانی کیوں برتا درختوں کا نشوونما کیوں ہوتا ہے، بادل کیونکر معلق فضا میں اڑتے ہیں، ستاروں کی چمک کہاں سے آتی ہے، چاند سورج کو کون اُدھرتا ہے، وہ سوچتا تھا کہ زندگی کے بعد موت کا سکون کیا، بیداری کے بعد نیند کیسی، روشنی کے ساتھ تاریکی کیا معنی، اور کڑک کو دیکھ کر دوسہم جاتا تھا، زلزلوں اور پہاڑوں کی آتش فشاں دیکھ کر وہ لرزہ بر اندام ہو جاتا تھا اور چونکہ وہ ان کے حادثات کے اسباب سے ناواقف تھا، اس لئے وہ سمجھتا تھا کہ تمام حوادث کے پیچھے کوئی عظیم انسان، ذکیات ہستی ضرور ایسی موجود ہے اور ان تمام مناظر و مظاہر کی پیدا کرنے والی ہے اور انہیں کو وہ دیوتا یا دیوی سمجھ کر ان سے ڈرنے لگا اور ان کی پوجا کرنے لگا۔

طلوع صبح کو وہ سمجھنے لگا کہ یہ کوئی نہایت ہی حسین و جمیل دیوی ہے، آفتاب کو اس نے ایک جنگجو عاشق مزاج دیوتا فرض کر لیا، اس نے سانپ یا ناگ سمجھ لیا اور ہوا کو مکنی، جارے کو اس نے ایک ایذا رساں درندے سے تعبیر کیا، اور خزاں کو ایسی دیوی سے نما کے سبب پھول جن کر لیا جاتی ہے۔ الغرض اسی طرح کی سیکڑوں تعبیریں، ہزاروں تفسیریں، اس نے مناظر فطرت اور حوا و طبعی ہنر ذہانت سے پیدا کیں اور ان کو حقیقت جان کر پھیلا کر شروع کیا۔ اقوام عالم کی روایات مذہبی یا "اساطیر الاولیاء" پر غور کیجئے علوم ہو گا کہ ان کی بنیاد یکسر انہیں شاعرانہ تعبیروں اور اسی قسم کے خیالات ضعیفہ پر قائم ہے۔ چنانچہ باغ عدن کی روایت کو دیکھئے وہ دنیا کی ہر قوم میں پائی جاتی ہے کیونکہ جب وہ مصائب سے گھبرا اٹھی تو اپنی تسکین کے لئے اس نے ایک ایسی دنیا کا تخیل پیدا کیا جس میں راحت ہی راست ہے۔

اسی طرح طوفان کی روایت ایشیا و یورپ کے تمام قدیم قوموں میں پائی جاتی ہے، انہوں نے گھونگھے، سیپیاں اور لہروں کے نشانات زوں، وادیوں اور میدانوں میں دیکھ کر خیال کیا کہ کسی وقت ضرور ساری دنیا پر طوفان آیا تھا جس سے سوا چند مقبول بنوں کے کوئی بر نہ ہو سکا تو ریت، انجیل اور کلام جمید کے علاوہ ہندوؤں میں بھی یہ روایت موجود ہے، منو نے ایک بار لگا میں کوئی ظن ڈبو کر پانی لیا۔ میں ایک مچھلی بھی آگئی، مچھلی نے التجا کی کہ مجھے پھر پانی میں چھوڑ دیجئے، منو نے رحم کیا کہ اسے چھوڑ دیا اور مچھلی نے اس احسان کے عوض ان کو بتایا کہ بڑا زبردست طوفان آنے والا ہے، آپ ایک کشتی بنا کر اپنے ساتھیوں کو معہ مویشیوں کے بچھالیجئے۔ میں بروقت پہنچ کر آپ کی لڑوں گی۔ چنانچہ منو نے اس کی تعمیل کی اور جب طوفان آیا تو مچھلی حاضر ہوئی لیکن اب وہ بڑی مچھلی ہو گئی تھی جس کے سر پر ایک سینک نکلا ہوا تھا، منو نے ایک برسی اس کے سینک سے باندھ کر کشتی میں اٹکا دی اور وہ طوفان سے کشتی کو بچا کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر لٹکی طوفان کے ختم ہونے تک منوجی یہیں ٹھہرے رہے ان تمام روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے زندگی اور موت کے سلسلہ میں کس طرح سمجھنے کی کوشش کی اور ان کوششوں میں اس کے کتنے اندیشے، کتنی امیدیں، کتنی مسکراہٹیں اور کتنے آئینوں شامل تھے کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا اولین مذہب "آفتاب پرستی" تھا اور یہ بالکل فطری بات تھی کیونکہ روشنی ہی زندگی ہے اور اسی زندگی میں حرارت قائم رہتی ہے، آفتاب بھی سورج تھا جو رات کے ناگ کو شکست دیکر بھگا دیتا تھا، اگنی بھی سورج تھا جو انسان کے ہر جھوپڑے کی حفاظت کرتا تھا و کوشش بھی سورج ہی تھی کہ ان کی ولادت کے وقت تمام درخت ہر بھرے ہوئے، ہر قلس بھی سورج داتا تھا، جونا (جمن) بھی وہی تھا اور یہ سب کے سب ۵ اکتوبر ہی کے لگ بھگ پیدا ہوئے، سب نے چالیس دن کا روزہ رکھا، سب بڑی موت سے مرے اور پھر زندہ ہوئے اب مسیح کے حالات کا ان روایات سے موازنہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ وہاں بھی سب کچھ یہی ہے، ۲ اکتوبر کو ایک غار میں پیدا ہوئے مہرہ ڈننے بہت سے بچوں کو جس کے دھوکہ میں ہلاک کیا، چالیس دن کا روزہ رکھا، غیر طبعی موت چالیس کا عدد مذہب عالم کی تاریخ میں بہت نظر آتا ہے طوفان سے پہلے چالیس دن باض ہوتی رہی۔ موشی چالیس دن کوہ سینا پر ہے، چالیس سال تک بنی اسرائیل صحرا میں پھرتا رہا۔

سے اور پھر زندہ ہوئے۔ عیسیٰ بھی سورج دہراتے اور یقیناً تمام مذاہب کی ابتدا آفتاب پرستی ہی سے ہوئی چنانچہ اس وقت بھی عبادت کے وقت لوگوں کا آنکھیں بند کر لینا اسی زمانہ کی یاد گاہ ہے کیونکہ وہ سورج کو نہ دیکھ سکتے تھے اور آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔

اس کے علاوہ جب ہم ام سابعہ کی دیگر مذہبی روایات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے مذاہب میں کوئی نئی بات نہیں پائی جاتی، ان کے تمام مراسم و عبادات کا رشتہ عہد قدیم کے مذاہب ہی سے جا کر مل جاتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ عیسائیوں میں پتیمہ یا اصطلاح کی رسم پائی جاتی ہے، لیکن یہ عیسویت سے بہت پہلے کی چیز ہے، ہندوؤں، ہیروین، یونانیوں اور رومیوں میں بھی مقدس پانی کا وجود پایا جاتا تھا۔ صلیب کا خیال بھی نہایت قدیم خیال ہے یہ علامت تھی غیر نالی ہونے کی، زندگی، اگلی کی، قبر انسانی کی، اٹلی کی قدیم آبادی (رومیوں سے بہت پہلے کی) قبروں پر صلیب ہی کا نشان قائم کرتی تھی۔ وسطی امریکہ کے قدیم مہمیں صلیب نشان کثرت سے دریافت ہوئے ہیں بائبل کی سر زمین سے جو اسطوائے ہائیکے دریافت ہوئے ہیں ان پر بھی صلیب کا موجودہ اسطوائے لیت کا خیال بھی بہت پرانا ہے اور قدیم مصر میں پایا جاتا تھا۔

ہم کو سمجھ لینا چاہئے کہ اسطویر معجزات میں بہت فرق ہے اسطویر نام ہے کسی بات کی خیالی تصویر پیش کرنے کا اور معجزہ کہتے ہیں کوئی نہ گھر گھر بیان کر لے کو۔

اگر تم کسی سے کہو کہ دو ہزار سال قبل مردے زندہ ہو گئے تھے وہ غالباً کہے گا ”ہاں ہوا ہوگا“ اگر تم اس سے کہو کہ ایک لاکھ سال بعد تمام بسے زندہ ہو جائیں گے تو وہ کہے گا ”دیکھو کیا ہوتا ہے“ لیکن اگر تم نے خود قبر کے اندر سے کسی مردہ کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا تو وہ ذہین دیوانہ ہو کر کوئی جواب نہ دے گا۔

مذہبی کتابیں اس قسم کے بیانات سے معمور ہیں۔ خدا نے یہودیوں کے لئے قبیلے معجزات سے کام لیا وہ سب کو معلوم ہیں۔ ان کو غلامی، آزاد کرانا بھی معجزوں ہی کے ذریعہ سے ہوا، جب وہ مصر باہر نکلے ہیں تو دن کو بادل اور رات کو روشنی کا ایک ستون آگے آئے رہنمائی لئے ہوتا تھا، دریائے نیل ان کے لئے شوق کیا گیا، من و سلویٰ ان کے لئے آسمان سے نازل کیا گیا، لیکن یہودیوں نے ان میں سے کسی نہ کی پروا نہیں کی اور جب تک کچھ پرانا کر بوج نہیں انھیں چین نہ آیا۔

اسی طرح مسیح نے بہت سے معجزے پیش کئے لیکن بالکل بے نتیجہ، وہی مردے جن کو انھوں نے زندہ کیا، وہی اندھے جن کو انکھیاں بنا لیا، وہی کوڑھی جنھیں چنگا کیا ان پر ایمان نہ لائے، آپ کو معلوم ہے کہ اس کا کیا سبب تھا، صرف یہ کہ معجزے کبھی ظاہر ہی نہیں ہوئے مگر سب داستانیں جو صدیوں بعد گھڑی گئیں۔

پانی کو شراب بنا دینا، سیکڑوں آدمیوں کو صرف ایک روٹی سے سیر کر دینا، اندھے کو مٹی لگا کر بینا بنا دینا، طوفان کو خاموش دینا، پانی پر چلنا، یہ سب باتیں ہیں جنھیں انسان سوچتا تھا، جن کے پورا ہونے کی تمنا تھی، رکھتا تھا اور انھیں کی تکمیل کو سب سے بڑی نعمت سمجھ کر اظہار عظمت و تقدس کے لئے اس نے پیغمبروں سے منسوب کر دیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا جہل و غوغا سے معمور تھی اور اپنی ہر شکل میں مافوق الفطرت ہستی سے امداد کی توقع رکھتی تھی چنانچہ یوں نے ان مفروضہ غیر انسانی ہستیوں کو خوش کرنے کے لئے مندر بنائے، قربانگاہیں طیار کیں، ان کے سامنے ناک رگڑی، قربانیاں بھائیں اور وہ سب کچھ کیا جس سے وہ خود خوش ہو سکتے تھے، لیکن ان آسمانی قوتوں نے ایک نہ سنی، ان میں سے کوئی انسان کی یاد کو نہ پہونچا، طوفان بھی آئے، کھیتیاں بھی برباد ہوئیں۔ دہائیں بھی پھیلیں، جن کو بڑے حال دیکھتا تھا وہ بڑے حال ہی بنے اور نہیں مرنے تھا وہ مر ہی گئے۔

انسان یہ سمجھتا تھا اور اب بھی مذہبی انسان یہی سمجھتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ پیدا ہوا ہے وہ اسی کے لئے ہے، اسی کی ضروریات راکرنے کے لئے کائنات وجود میں آئی۔ چنانچہ وہ ہر چیز پر قابض ہونا چاہتا تھا اور جب ناکام رہتا تھا تو سمجھتا تھا کہ خدا ضرور

اس کی مدد کو گاہ حالانکہ اگر دنیا میں ایک انسان نہ ہوتا تو بھی سورج کا یہی طلوع و غروب ہوتا، یہی بہار و خزاں ہوتی، گلابی طرح کھلتا، انگور کی بھیلیں اسی طرح پھل لاتیں، وہی سمندر کا مد و جزر ہوتا اور وہی رات دن، وہی طوفانی ہوائیں ہوتیں اور وہی رعد و برق۔ جب ایک زمانہ، ایک غیر محدود زمانہ انسان پر ماسی جہل و بے بصری کی حالت میں گزر گیا تو کچھ لوگ سوچنے والے پیدا ہوئے اور انھوں نے ان روایات و معجزات کو شک کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ انھوں نے غور کیا کہ کسوں و کسوں کیوں مقدرہ وقفہ کے بعد ہوتا ہے اور آخر کار انھوں نے اس کی وجہ معلوم کر کے سمجھ لیا کہ اجرام فلکی کی گردش اولاد آدم سے بالکل بے نیاز ہے اور انسان خود بھی مظاہر طبیعی کا ایک معمولی مظہر ہے۔

گلیلیو، کوپرنیکس اور گیلک نے مذہب کی بتائی ہوئی ہیئت کو درہم برہم کر دیا۔ زمین چھٹی چوٹ کے بجائے گول اور ساکن ہونے کے بجائے متحرک ہو گئی، آسمان سجائے ٹھوس ہونے کے خلاف دھنسن بن گیا اور سارا بنا بنا یا کھیل مذہب والوں کا بگڑ گیا۔

نفا ہر ہے کہ مذہب اپنی روایات کی اس تکذیب و توہین کو برداشت نہ کر سکتا تھا وہ تاریکی جو زمانہ معلوم سے داغوں پر مسلط تھی میں آسانی سے دور ہو رہی ہو سکتی تھی۔ آخر کار جہل نے علم کے خلاف ایک محاذ جنگ قائم کیا اور مذہب کے درندہ نے جس کے پچھے بھونٹے خون سے رنگیں رہے ہیں، برٹروڈ (Bruno) کے خلاف اپنا جنگل بڑھایا اور جنھیں اس خطا پر کہ وہ اس کرہ کے علاوہ اور کروں کا بھی قائل تھا۔ اسے کافر و ملحد قرار دیکر سات سال کے قید کر دیا گیا اور کہا گیا کہ اگر وہ اپنے انجمن سے باز آجائے تو رہا کیا جاسکتا ہے لیکن اس نے کہا کہ ایک حق بات سے انکار کیونکر ممکن ہے اور آخر کار پانچ زنجیر سے قصاص کا وہ جس سے گئے اور بہت سی لاکڑیاں جمع کر کے چتا میں آگ لگا دی گئی اور وہ جل کر راکھ ہو گیا، الغرض مذہب نے عقل و علم کو شکست دینے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن جہل کے پاؤں جب ایک بار اکھڑ جاتے ہیں تو عقل سے جیتے ہیں، عقل کی روشنی پھیلتی رہی اور مذہب کی تاریکی مٹتی رہی۔

جاننا زبان علم آئے اور انھوں نے سمندروں، پہاڑوں اور وادیوں میں جانیں دے دیکر وہ باتیں دریافت کیں جو مذہب کی دسترس سے باہر تھیں انھوں نے بخار و برق کی قوت دریافت کر کے انسان کو روح تہنا دیا، لیکن اہل مذہب بدستور دیوتاؤں کے غلام ہی بنے رہے۔ مذہب والے مفروضہ معجزہ سے بیان ہی کرتے رہے اور انھوں نے انھیں پورا کر کے دکھا دیا یعنی انسان کی جن تمناؤں کو دیوتا پورا کر سکتے تھے اسے علم و عقل نے پورا کر دیا۔

سائنس بتاتی ہے کہ تخلیق کوئی چیز ہے نہ فنا کوئی چیز، ایک لامحدود ہستی کا وجود استیلا و عقلی ہے، کائنات کے تمام مظاہر و آثار اسباب و فتوح سے وابستہ ہیں اور اشیا کے اسی فطری رابطہ کو ایک نے نہ سمجھا اور مذہب بن گیا، دوسرے نے سمجھ لیا اور علم کہلا دیا۔

مذہب کا تجربہ انسان نے ہزاروں سال کیا لیکن کوئی آسمانی مدد اسے نہ پہونچی۔ خدا کا رحم حاصل کرنے کے لئے ماؤں نے اپنے بچوں کی قربانیاں پیش کیں لیکن اسے ان پر رحم نہ آیا، برہمنہ وحشی انسان کو لاکھوں کی تعداد میں درندوں نے کھایا، سانپوں نے ڈسا، طوفانوں نے ڈبوتا و لڑکوں نے شہاہ کیا لیکن خدا نے اپنا اصول کار نہ بدلا، انسان نے لاکھوں مند بنائے رات دن اس کی پوجا کی، لیکن ظالموں کا ظلم بڑھتا چلا گیا اور غلاموں کی پیٹھ پر جو کوٹھے پڑا کرتے تھے بدستور پڑتے رہے یہاں تک کہ انسان نے لاکھوں سال کے تلخ تجربات کے بعد سمجھا کہ خدا انسانی معاملات میں دخل نہیں دیتا، اور اس کے نزدیک گھاس کی پتی اور انسان سب برابر ہیں، اس لئے اس کی ترقی کا انحصار صرف اس کی محنت و کاوش اور مہربی عقل پر ہے آخر کار رفتہ رفتہ معجزات کا زمانہ گزر گیا، روایات مذہبی کا دور ختم ہو گیا اہل ادب انسان اس کے لئے طیار نہیں کر وہ مذہب کے بتائے ہوئے اصول نجات پر یقین رکھ کر اپنی دنیا کو تہاہ کرے اور بیوقوف کہلائے۔

قیامت قائم ہے، حشر کا ہنگامہ برپا ہے مسیح اپنے تخت پر جلوہ افروز ہیں کہ ایک روح سامنے آتی ہے۔

مسیح :- "تیرا کیا نام ہے؟"

روح :- ”تیرا کونسی ہے“

مسیح :- ”کیا تو عیسائی تھا؟“

تیرا :- ”نہی“

مسیح :- ”کیا تو نے اوروں کو مسیح بنانے کی کوشش نہیں کی“

تیرا :- ”کی اور پوری طرح کی“

مسیح :- ”کیونکر“

تیرا :- ”میں نے منکرین کو قید کیا، ان پاؤں میں خار دار زنجیریں ڈالیں، ان کی زبانیں کھینچ لیں، ان کی آنکھیں نکلوائیں، تنکھنے

میں کسواکر ان کی رگ رگ توڑ دی اور وہ پھر بھی زندہ رہے تو کھال کھینچ کر زندہ آگ میں ڈلوادیا“

مسیح :- ”خوب کیا، اسے میرے وفادار خادم خوب کیا۔ اچھا جاؤ اور قرب خداوندی میں رہ کر نجات ابدی کی راحتیں حاصل کرو۔“

(دوسری روح حاضر ہوتی ہے)

مسیح :- ”تیرا کیا نام ہے“

روح :- ”برونو“

مسیح :- ”کیا تو مسیحی تھا“

برونو :- ”کچھ حصہ تک مسیحی رہا، لیکن اس کے بعد میں نے خود اپنی عقل سے سچائی کی تلاش شروع کی۔“

مسیح :- ”کیا تو نے لوگوں میں تبلیغ کی“

برونو :- ”کی، لیکن مسیحیت کی نہیں، آزادی فکر و ضمیر کی، اچھا کام کرنے کی بغیر ”طبع ثواب“ اور برے کام سے بچنے کی بلا

”خون عذاب“ میں نے لوگوں کو بتایا کہ انسانیت نام ہے صرف بھلائی کا، ہمدردی کا اور دوسروں کے لئے ایثار و

قربانی کا“

مسیح :- ”یہ تو کیا تو نے انجیل کو جھٹلایا اور معجزات سے انکار کیا، جا، اسفل سافلین میں تیرا ٹھکانا ہے اور وہیں تجھے ابدالاباد

تک دوزخ میں جلنا ہے“

کیا خدا اور مسیح کے اس فیصلے کو دنیا اب بھی قرین انصاف سمجھ سکتی ہے؟ اور کیا معجزہ دکرائے گا اور اب پھر واپس آسکتا ہے؟

اس آئین کا وہ ظالم انسان جس نے سب سے پہلے غیر مسیحی لوگوں کے لئے جسمانی سزاؤں دینے کا حکم قائم کر دیا۔ مسیح نے اس میں پیدا ہوا اور ۳۰ سالہ میں مرا۔

## شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عظیم الشان جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان و تخفیل  
س کی نزاکت بیان، اس کی بلند ہی مضمون اور اس کی انشاء و عالمی سحر جلال کے درجہ تک پہنچتی ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول  
میجرنگار لکھنؤ

# ٹوٹا ہوا رشتہ

## مریاتھو اور پروین

۳۰ جنوری ۱۹۵۷ء کے زمی آواز میں جناب آفسر برٹھی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے ایک موٹلا خاندان کی لڑکی مریاتھو کا تعارف کراتے ہوئے ظاہر کیا تھا کہ :-

”ایم۔ بی۔ مریاتھو ایک مسلمان لڑکی کا نام ہے جس نے حال ہی میں اپنی ایک سہیلی کو کراچی سے طایم زبان کی نظم میں ایک خط لکھا۔ اس خط نے کڑا لے کے ادبی حلقوں میں ایک شور برپا کر رکھا ہے اور طایم زبان کا کوئی اخبار ایسا نہیں ہے جس میں اس لڑکی سے انتہائی ہمدردی کا اظہار نہ کیا گیا ہو اور اس کی ادبی شاعرانہ قوتوں کو نہ سراہا گیا ہو۔“

مریاتھو اب سے تیرہ سال پہلے پادراتی، (الابار) میں ایک موٹلا خاندان میں پیدا ہوئی، مریاتھو کے بچپن ہی میں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا اس کے بعد سے اس کی بوڑھی ان تین بہنیں اور ایک بھائی تنگ دستی اور مصیبت سے بھرا پال رہے ہیں۔

مریاتھو، پادراتی کے سنسکرت کالج کی دوسری جماعت میں پڑھتی تھی اور فرصت کے اوقات میں ایک بیٹری کی فیکٹری میں لیبل لگانے کا کام کرتی تھی، وہاں سے دو چار آنے اسے مل جاتے ان کو وہ علم کی پیاس بجھانے کے لئے استعمال کرتی تھی اور کتابیں اور کاغذ اور قلم وغیرہ خرید لیتی تھی۔

مریاتھو نہایت شوقی اور محنت کے ساتھ سنسکرت اور طایم زبانیں سیکھ رہی تھی، ان زبانوں کے ادب سے اسے بڑی دلچسپی تھی، اسکول میں بھی وہ طایم میں نظمیں اور گیت لکھ کر کرتی تھی مگر سن اپنا دل بھلانے کے لئے۔

بزرگ بہت خراب تھے اور پیٹ پانے کا کوئی مستقل ذریعہ ان کے پاس نہیں تھا، چنانچہ مریاتھو کا بھائی کراچی چلا گیا اور وہاں اس نے ایک ہوش میں ملازمت کر لی کچھ عرصہ بعد پادراتی واپس آگیا اور ماں بہنوں کو ساتھ لے کر کراچی چلا آیا۔ مریاتھو کو دھن چھوڑنے کا بڑا رنج ہوا، اسے اس کا بھی بڑا صدمہ تھا کہ اب اس کی تعلیم جاری نہ رہ سکے گی، اس کی سہیلیاں اس سے چھوٹ جاتی تھیں، مگر سچا یہی کیا کرتی اس کا بس کہا تھا۔

حال ہی میں مریاتھو نے ایک بڑا پروردہ اور حسرت انگیز خط اپنی ایک سہیلی کو لکھا ہے، یہ خط طایم زبان میں ہے اور نظم میں ہے۔

یہ خط شاید ہمیشہ مایہ کی میں رہتا مگر اتفاق ایسا ہوا کہ جس لڑکی کے پاس یہ خط آیا تھا اس کے ایک بزرگ نے اس خط کو دیکھ لیا، ان پر اس خط کے ادبی محاسن اور شاعرانہ خوبیوں اور حسرت انگیز انداز بیان کا اس قدر اثر ہوا کہ انھوں نے اس کو فوراً ”اتر بھوی“ کے ادبیر کے پاس ایک مختصر تمہید کے ساتھ بھیج دیا۔

”اتر بھوی“ کے ادبیریل بورڈ کے نزدیک نیکم ادبی شاعرانہ محاسن سے لبریز تھی، انھوں نے اسے بہت نمایاں طور پر اپنے

اخبار میں جگہ دی اور لڑکی کا مختصر حال بھی شائع کیا۔

”ماتر بھومی“ میں نظم کا شائع ہونا ہی لڑکی کی اعلیٰ شاعرانہ صلاحیتوں کا ثبوت تھا، ”ماتر بھومی“ کے اڈیٹر شری کے بی کیشو منین ہیں جو پچھلے دنوں نکا میں ہندوستان کے ہائی کشر تھے، اس اخبار کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں صرف وہ مضمون شائع ہو سکتے ہیں جو ہر حیثیت سے اعلیٰ پایہ کے ہوں، اس میں کسی مصنف کی ہمت افزائی کے لئے کوئی معمولی مضمون شائع نہیں ہو سکتا۔

نظم کا ”ماتر بھومی“ میں ”ٹوٹا ہوا رشتہ“ کے عنوان سے شائع ہونا تھا کہ لڑکی کے بڑے بھائی کا ایک طوفانِ ابل پڑا اور سارے مالا باریں ایک ادبی ہنگامہ سا برپا ہو گیا، نظم کا ترجمہ یہ ہے:-

- ۱- اپنے چہرے پر مسکراہٹوں کے چھلکے نہ بناؤ، میری سہیلی !
- ۲- غم میری زندگی کا موضوع ہے،
- ۳- مستقبل کے سنسان بیابان میں بڑھنے کی مجھ میں ہمت نہیں،
- ۴- کل جو پہنے میں سونے کے تاروں میں گوندھا کرتی تھی - وہ سب ریزہ ریزہ ہو کر خاک میں مل گئے،
- ۵- پیار اور محبت کے جگمگاتے ہوئے خیالات کیسے بے حقیقت نکلے،
- ۶- بتارے اپنے پچھتے ہوئے گوشوارے لے ہوئے اب مجھے کبھی نہیں ملائیں گے۔
- ۷- آسمان پر سے سفید چھوٹا سا بادل اب مجھے دیکھ کر کبھی نہیں مسکرائے گا۔
- ۸- اب میری آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں ٹپکتی رہیں گی۔
- ۹- میرے دکھ کی سسکیاں جو میرے دل میں گھسی ہوئی ہیں - اب کبھی ٹھنڈی نہیں پڑیں گی۔
- ۱۰- دنیا میں جتنی چیزیں پیاری ہیں وہ سب حقیقت میں دل بہلانے والے پہنچے ہیں،
- ۱۱- پریم کے گیتوں کی تان اب کہاں، میرے کانوں میں خونناک بھیاگ آہ اذیں گونج رہی ہیں۔
- ۱۲- میرے چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی ہے - دنیا کتنے ڈراؤنے بھیدوں سے بھری ہوئی ہے - ایسی دنیا میں جہاں خیالی سائے قص کر رہے ہیں۔

۱۳- میرے محبت کے پہنچنے کس کام کے ہیں۔

۱۴- میری بہن تم ہمیشہ زندہ رہو اور خوش رہو اور مجھے فنا ہو جانے دو مٹ جانے دو۔

نظم کا ترجمہ جو اردو پر درج کیا گیا اصل کا محض ہلکا سا عکس ہے، اصل نظم ناقابلِ ترجمہ لکھنویوں اور لکھنویوں سے لبریز ہے، تانیوں کی جھنگلاؤں اور ترنم و موسیقیت کی دولت سے مالا مال ہے اور جذبات کی صداقت اور بیان کی نزاکت اس کے لفظ لفظ سے پکی پڑتی ہے اور ہندو کی جتنی اور الفاظ کا وہ دست اور بیان کی آن بان میں وہ پختگی ہے کہ کہنے مشق شاعروں میں بھی کم ملتی ہے، تیرہ سال کی لڑکی کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

اب مرزا تقی کے اس خط سے متاثر ہو کر امیٹھی ضلع کلکتہ کی ایک خاتون محترمہ پروردی نے اسے اردو نظم میں منتقل کیا ہے اور یہ کہنا عائد ہے کہ اگر مرزا تقی کی نظم اپنے جذبات و خیالات کے لحاظ سے حکیم نبال میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے تو یہ دیں کی نظم بھی اردو میں قابلِ توجہ نہیں۔

ہاں سن لے پیاری میرا دکھ بھرا نساں  
لیکن مری سہیلی اپنے حسین رخ پر  
فصحت اگر ہو مجھ کو اور یوں کو بھی سنا  
اب مسکراہٹوں کے چھتے نہ تم بنا نا  
روشنی ہوئی خفا ہے برہم کی گئی ہے  
میری کہانیوں میں غم اور شدہ غم  
آرایش جہاں سے وحشت ہے وحشت  
سورج کی روشنی میں طغی ہے مجھ کو ظلمت  
تاریک وادیوں میں سنسان گھاٹیوں میں  
دل کے غم جو ہر مٹی میں مل گئے ہیں  
سوں کے تار سے جو سپینے گوندھتی تھی  
اپنی سنہری کرنوں کے لے کے گوشوارے  
آنکھیں مری بڑھانے سے فائدہ نہ ہوگا  
دہ گادوں کے کنارے ویران سا مرا گھر  
چھوٹے سے چھوٹا ہلکا بادل سفیدی بایل  
آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں گروا کریں گی  
کالی کشائیں غم کی جودل سے اٹھ رہی ہیں  
آنسو ہیں میرے آنسو نہیں ہیں نہیں  
ہے آگ میرے دل کی ٹھنڈی نہ ہوگی ٹھنڈی  
دنیا کی جتنی چیزیں دل کو بھرا رہی تھیں  
آتے ہی ہوش مجھ کو ظاہر ہوئی حقیقت  
اب زندگی کے دھارے پہلو بدل چکے ہیں  
وہ رس میں ڈوبی تائیں وہ درہم بھرے ترائے  
ہر کھیل ہر نائیش ہر رقص ہر تاشا  
وہ پُر فریب دنیا اب بچہ ہے نظر میں  
آئے نہ کام کچھ بھی حب وطن کے پہلے  
میرے مکان سے مجھ کو کوسوں کے فاصلے پر  
تم ہو سہیلیوں میں ہوں یہاں اکیلی  
مٹتی ہوں میں جہاں سے شے دو فکر کیا ہے  
تم خوش رہو اہوش زندہ رہو سہیلی

### فلاسفہ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نواز کے دو علمی مضامین شامل ہیں ۱۔ (۱) چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ (۲) مادین کا مذہب۔  
نہایت مفید کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محضول۔  
فیجر نگار گھنٹو

# باب الاستفسار

## شکست ناروا

(جناب شمر تلہری - سکھر)

حضرت، تسلیم -

آپ نے "نگار" میں ایک مرتبہ "الہ داعلیہ" کے تحت "شکست ناروا" کے عیب کے متعلق کچھ اظہار خیال فرمایا تھا۔ پوچھنا یہ ہے کہ "شکست" کا عیب کسی بحر کے ساتھ مخصوص ہے یا ہر جگہ عیب ناروا ہے۔ تقطیع میں تو یہ لازمی نہیں کہ ایک رکن واحد کے مقابل لفظ واحد ہی آئے۔ لفظ کا ایک حصہ ایک رکن میں دوسرا دوسرے رکن میں اساتذہ نظم کرتے آئے ہیں اور مشکل ہی سے ان کا کوئی شعر اس عیب سے بری قرار دیا جاسکتا ہو۔ مثلاً ایک مشہور استاد کا مصرع ہے :- "وہ عالمگیر جلوہ اور وہ حسن مشترک تیرا"۔ اب اس کی مفاعیلین سے تقطیع کیجئے تو ہر لفظ میں "شکست" کا عیب موجود ہے۔ چونکہ آپ کے قول کو سندان کو ہر کس و نا کس ہر اچھے شاعر پر اعتراض کرتا رہتا ہے جسکی وجہ سے یہاں ہنگامہ کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ لہذا مناسب یہی سمجھا گیا کہ براہ راست آپ ہی سے مزید وضاحت کے لئے استدعا کی جائے۔ امید ہے کہ اپریل ہی کے نگار میں اس پر ضرور اظہار رائے فرمائیں گے۔

(نگار) کسی لفظ کا ایک حصہ ایک رکن میں اور دوسرا حصہ دوسرے رکن میں آئے تو یہ شکست ناروا نہیں ہے۔ یہ تو ہر بحر کی تقطیع میں ہوتا ہے جیسا کہ آپ نے ظاہر کیا، لیکن بعض بحر ایسی ہیں جن میں ہر مصرع کے دو ٹکڑے برابر ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر مصرع میں کوئی لفظ یا فقرہ ایسا ہے جس کا مفہوم ٹکڑے کے بغیر ہی پورا ہو سکتا ہے لیکن تقطیع میں اس کے دو ٹکڑے علیحدہ علیحدہ ہو جاتے ہیں تو اسے "شکست ناروا" کہیں گے مثلاً اقبال کا مشہور شعر ہے :

کبھی اسے حقیقت منظر نظر آ لیا سب مجاز میں

کہ ہزاروں بجڑے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

یہ شعر "کامل ضمن سالم" بحر کا ہے اور چار متفاعیلین پر برابر منقسم ہے۔ اس کی تقطیع یوں ہوگی :-

کبھی اسے حقی	قت منظر	نظر آ لیا	س مجاز میں
متفاعیلین	متفاعیلین	متفاعیلین	متفاعیلین
کہ ہزاروں بج	دے تڑپ رہے	ہیں مری جبین	ن نیاز میں
متفاعیلین	متفاعیلین	متفاعیلین	متفاعیلین

دوسرے مصرعہ میں "تڑپ رہے ہیں" پورا فقرہ ہے لیکن تقطیع کرنے پر یہی مصرع کے دوسرے ٹکڑے میں شامل ہو جاتا ہے اور اسی کو

نہ تاروا کہتے ہیں۔

تیرہ شعر ہے۔

نہ گیا خیال زلف سیم جفا شعاراں ، نہ ہوا کہ صبح ہووے شب تیرہ روز گاراں  
یہ شعر بجز ”رمل مثنیٰ مشکول“ کا ہے :- ”فعلات فاعلاتن فعلات فاعلاتن“ پہلے مصرع میں ”زلف سیم“ ایک مکمل فقرہ ہے  
مثنیٰ میں ”زلف سیم“ کے پہلے ٹکڑے میں چلا جاتا ہے اور سیم دوسرے ٹکڑے میں اور یہ شکست ناروا ہے۔

نہ گیا خیال زلف سیم جفا شعاراں	فعلات فاعلاتن
فعلات فاعلاتن	فعلات فاعلاتن

اسی طرح بحر متقارب مثنیٰ سالم کو دیکھتے ہیں جس میں فعلن چار بار یعنی مصرع کے ہر ٹکڑے میں دو بار آتا ہے۔ اس بحر  
ایک مصرع ہے :-

چوروئے توتا بندہ اختر نباشد

اس کی تقطیع یوں ہوگی :

چوروئے توتا بن	دہ اختر نباشد
فعولن	فعولن

اس میں تابتہ کے دو ٹکڑے ہو گئے ایک ٹکڑا مصرع کے پہلے حصہ میں چلا گیا اور دوسرا دوسرے حصہ میں۔ شکست ناروا ہے  
تیرہ مصرع یوں ہوتا :

کہ روئے توروشن چو اختر نباشد

تیرہ سیم پیدا ہوتا۔

پہلے قابل سنا ہوا کہ ایک بار کسی بادشاہ کے سامنے کسی شاعر نے قصیدہ پڑھا جس کے ایک شعر میں ایسے نے :  
”تاج دولت بر سر ت“ نظم کر دیا تھا۔ بادشاہ مسکریں چہیں ہوا اور کہا کہ شاعر عرض کی نزاکت سے واقع نہیں کیونکہ  
کی تقطیع کرنے سے اس کے دو ٹکڑے یوں ہو جاتے ہیں :- ”اے تلح ذو (مستفعِلن)۔ لت بر سر ت (مستفعِلن) اور  
قلم ہے کہ ”لت بر سر ت“ کس قدر توہین آمیز بات ہے۔

اس قسم کا شکست ناروا جس سے تقطیع کرنے میں ایسے معیوب معنی پیدا ہوں ، واقعی قابل احتراز ہے ، لیکن یوں زیادہ معیوب  
نہیں ، اور اکثر اساتذہ نے اس کا چسماں لیا ظاہر نہیں کیا۔

## توقیت

تاریخ اسلامی ہند کے سلسلہ میں اڈیٹر نگار نے یہ توقیت مرتب  
کی تھی جس میں سلسلے سے ۱۹۵۹ء تک کے تمام اہم تاریخی واقعات  
بقید سنجیدگی بیان کئے گئے ہیں۔ تاریخ کے طلبہ کے لئے بڑی کارآمد  
جیز ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول  
نیچر نگار لکھنؤ

## گہائے جعفری

جناب آگر لکھنؤی کے ڈیڑھ سو اشعار  
یعنی  
جو اڈیٹر نگار نے اپنے تعارفی مقدمہ کے ساتھ بہت اہتمام سے شایع  
کئے تھے اس کی چند جلدیں اتفاق سے رہ گئی ہیں۔ ۸ کے ٹکڑے بجز  
انتخاب ذریعہ پوسٹ مل سکتا ہے۔  
نیچر نگار لکھنؤ

# وادی آشوب

(فضا ابن فضی)

دیکھ! اس نزہتِ ایام کی طغیانی میں،  
 کتنی کلیوں سے گریزاں ہے ابھی بادِ نسیم  
 کتنی صبحوں کو رلاتا ہے غمِ تیرہ شبی  
 لپا گئی صرصرِ غم کتنے چراغوں کا لہو  
 ہیں خزاں کوش ابھی کتنی بہاروں کے نقیب  
 کتنے پیمانہ گلزنگ لہو روستے ہیں  
 کشتیاں کتنی ہیں کیا جانے نذرِ سیلاب  
 کتنے ارباب یقیں ہیں وطن و تھیں کا شکار  
 کتنے اقبال ہیں فیضانِ خودی سے محروم  
 ہیں نظر گاہِ خزاں کتنے سمن زار ہنوز  
 کتنے آئینوں کا ایمان سیہ کاری ہے  
 ہیں ابھی شمر کی تائید میں کتنے شبیر  
 کتنے فرعون ہیں پہنے ہوئے موسیٰ کا لباس  
 دارِ مسجدِ نبوی ہیں ابھی کتنے یہود  
 کھا گئے اپنے برہمن ہی کو کتنے زنا  
 ہائے یہ سوز کدے ان یہ جراثیم خانے  
 زندگی جرمِ ضعیفی کی سزا ہے یارب!  
 ہیں ابھی کتنے چمن معرضِ ویرانی میں  
 کتنے پھولوں کو گوارا دے ہوا لطفِ شمیم  
 کتنے رندوں کو ابھی ہے گلہ و تشنہ لبی  
 لٹ گئے کتنے چمن ٹوٹ گئے کتنے سبب  
 کتنی صبحیں ہیں ابھی بے افق و تیرہ نصیب  
 کس قدر اہل محبت پر ستم ہوتے ہیں  
 کتنے آنسو ہیں لہو، کتنی شرابیں زہرِ آب  
 کتنی آنکھیں ہیں حقیقت کی تجلی کا مزار  
 جہل اندوز و غلط رو ہیں ابھی کتنے علوم  
 کتنے کانٹے ہیں گلابوں کے خریدار ہنوز  
 کتنے اصحابِ بصیرت چہ بنوں طاری ہے  
 حرص کی دھوپ نے کہلا دئے کتنوں کے ضمیر  
 کتنے ناسور ہیں خود اپنے ہی مرہم سے نراس  
 مول بکتے ہیں ابھی کتنے معابد میں سجود  
 خونِ عیسیٰ سے ہیں یاں کتنی صلیبیں گزار  
 جنتِ آدم و حوا ہیں یہی دیرانے؟  
 مجھ کو اس جبرِ مشیت سے گلا ہے یارب!

لو چراغوں کی بڑی دیر سے تھراتی ہے  
 روح اس "وادی آشوب" میں گھبراتی ہے

## حضرت عزیز لکھنوی (غیر مطبوعہ غزل)

دیکھنا کیا تھا، دکھائی دے رہا ہے کیا مجھے  
اب نگاہِ شوق تو نے کر دیا رسوا مجھے  
شب کے سناٹے میں ہزارے پہ تھا دھوکھا مجھے  
موجِ زن تھا بحرِ جہش جب نگاہیں پڑیں  
زخمِ دل بہت شکن ہے، میں دکھاؤں گا مگر  
داہِ ری قسمت کہ محشر بھی نہیں جائے امان  
اب نگاہیں بھی مری دینے لگیں دھوکھا مجھے  
اس نے دیکھا اور اسی انداز سے دیکھا مجھے  
دیکھتا ہے جیسے کوئی دیکھنے والا ہے  
اک سرابِ نیستی تھا ہوشِ جب آ گیا مجھے  
مل تو جائے پہلے کوئی دیکھنے والا مجھے  
پھر نظر آیا وہی ہنگامہ دنیا مجھے  
قصہ عہدِ جوانی پوچھتے کیا ہو عزیز  
آگیا تھا اتفاقاً تائیند کا جھوکا مجھے

## کراچی سے واپسی پر

(ح-۱)

نہ پوچھو کس جہان رنگ و بو سے ہم کے آئے ہیں  
قیامت تھا نظارہ اُس گلستانِ محبت کا  
خدا اُس خطہ گلزار کو پھولا پھولا رکھے  
ہمارے خواب کی رنگینیوں کا پوچھنا کیا ہے  
محبت کرنے والوں کی محبت سے بہت کم تھا  
ٹھہرتے ہی ٹھہرتے یہ دل بیتاب ٹھہرے گا  
جہاں دل سی متاعِ بے بہا ہم کو لے آئے ہیں  
نہم رخسارِ گل سے چشمِ تر ہم دھوکے آئے ہیں  
جہاں ہم نو بہنو تم محبت ہو کے آئے ہیں  
محبت کی فضا میں فرشِ گل برسو کے آئے ہیں  
دمِ رخصت ہم اُن کے آگے ہٹنا دے آئے ہیں  
ابھی کے دن ہوئے جب ہم کراچی ہو کے آئے ہیں

## فضا جالندھری

یہی ہے عالمِ شوق، اور یہی ہیں دیوانے  
سناٹے نکبتِ گل نے کچھ ایسے افسانے  
ناب وہ شمع نہ وہ انجمن نہ پروانے  
فرزاد کی دھوپ ڈھل دوارے پہلے ساتی  
تو کس کو یاد رہیں گے خرد کے افسانے  
چمن سے پھیر کے رخ مسکرائے دیوانے  
بکھی بکھی سی ہے کیوں زندگی خدا جانے  
جھلک رہے ہیں چمن میں گلوں کے پہاڑے  
زمانہ بھر کوئی کمر وٹ بدل رہا ہے نصف  
حرمِ خوشیوں میں سونے پڑے ہیں بتھانے

## موج نسیم

کنول نسیم ایک ہندو قانون ہیں جو تقسیم ہند کے بعد اپنا وطن گجرات چھوڑ کر کاشمی پر چل آئیں۔ ان کو اردو فارسی دونوں میں سماعِ دستِ گاہ حاصل ہے اور ان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت اسکی نزائیت اور لسانی لطافت تھیں ہے جس کا اندازہ قول کی غزل سے پتہ چل سکتا ہے۔ نزاع

گاہ گاہے یوں بھی ہوا ہے ، پھول کھلے دل بیچ اُٹھا ہے  
 اُن سے محبت بات ہے کل کی یوں تو زمانہ بیت گیا ہے  
 کتنی یادیں جاگ اُٹھی ہیں جب بھی کوئی گیت سنا ہے  
 کیسی غزل اور شعر کہاں کے شاید کوئی رُخس رسا ہے  
 کتنی حسین ہے آج یہ دُنیا شاید تم نے یاد کیا ہے  
 رونے کو تو عمر پڑی ہے گیت مگر اک لمحے کا ہے  
 پھول سے کیسے کھل گئے دل میں آپ نے کچھ ارشاد کیا ہے؟  
 تیری ہنسی پر آنچ نہ آئے پلکوں پر اک اشک رکا ہے  
 قصہ غم بھی خوب ہے لیکن کس نے کہا ہے کس نے سنا ہے  
 کل سے کنول کا روتے روتے  
 دیکھو تو کیا حال ہوا ہے

م دھولیوی :-

میرے قریب آ کے جو تم دور ہو گئے  
 جوشِ جنونِ شوق نے سہکا دیا کہاں  
 پایا کچھ اس طرح اُنھیں بابلِ التفات  
 دُنیا یو نہیں بدلتی ہے معلوم ہو گیا  
 لازم تھا کچھ تو انجمنِ ناز کا خیال  
 اللہ سے نزاکتِ انداز ہے رُخی  
 آخر سمجھ میں شیوہ تسلیم آ گیا  
 افسانے دل کے اور بھی مشہور ہو گئے  
 منزل سے رہ نورِ بہت دور ہو گئے  
 ہم آج عرضِ شوق پہ مجبور ہو گئے  
 تم آئے اور دکھ مرے سب دور ہو گئے  
 احق وہ میرے ذکر پہ رنجور ہو گئے  
 اب وہ ستم بھی کرنے سے معذور ہو گئے  
 اب ہم بھی شاکی دل رنجور ہو گئے

## مطبوعات موصولہ

قلق غنایا کی وجہ سے صرف چند کتابوں کا ریویو شائع ہو سکا۔ آئندہ اشاعت میں ذیل کی کتابوں پر تبصرہ شائع ہوگا :-  
 لغات المسعود - ۱۹۵۳ء کا بہترین ادب - بوستان روس - آسٹریلیا کی جھلک - اسلامی روایات - ابوہریرہ -  
 طالع طلاق - بین الاقوامی مذہب کے اصول - ہندوستان پر مسلمانوں کا مستقبل - شاہکار نادر تہ - حیات زرخیز - ذکر حبیب -  
 اسلام اور غیر مسلم - عربین حق -

**گفتنی و ناگفتنی** مجموعہ ہے جناب شورش کا شمیری کی نظموں کا جسے ادارہ مطبوعات چٹان لاہور نے نہایت اہتمام سے جلد شائع کیا ہے۔ ضخامت ۷۷۲ صفحات، تقطیع ۲۱ x ۲۹، کاغذ طباعت وغیرہ بہت صاف و روشن، قیمت چار روپے۔

ابتداء میں جناب غلام رسول تہر کا تعارف ہے اور اس کے بعد خود جناب شورش نے کافی تفصیل کے ساتھ اپنے شعری رجحانات کا جائزہ لیا ہے اور اسی کے ساتھ چند اپنے ہم عصر اور متقدم العہد شعرا کا بھی ذکر کیا ہے جس سے ہمیں شورش کی شاعری کا پس منظر اور اس کی غایت سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

شورش پنجاب کے مشہور انقلابی نوجوان ہیں اور اپنی اس میاکی و آزاد گوئی کی پاداش میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک قید و بزرگی طویل صعوبت برداشت کر چکے ہیں۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد انھوں نے شعر و صحافت کو اپنا فن بنالیا اور جس جوش و خروش کے ساتھ انھوں نے اس کوچہ میں قدم رکھا تھا، اس میں اب تک کوئی کمی نہیں آئی۔

یہ مجموعہ دراصل انھیں نظموں کا ہے جو وقتاً فوقتاً ان کے اخبار چٹان میں شائع ہوتی رہی ہیں اور جن کو دیکھ کر ہم شورش کے شاعر و صحافیانہ مسلک کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اس مجموعہ میں اہم نظمیں شامل ہیں اور ان میں کوئی نظم ایسی نہیں ہے جو مقصد و غایت سے خالی ہو اور شاعرانہ نقطہ نظر سے خاص مقام نہ رکھتی ہو اور اس میں شک نہیں کہ ان دونوں کا توازن شورش کے کلام میں انتہائی حسن و تکمیل کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ شورش کا ایک خاص تہنگ ہے، بلند و مترنم، ایک مخصوص اسلوب ادا ہے، برقع و استوار اور اس نوع کی خطیبانہ شاعری کی مثالیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔

شورش کا جمالیاتی احساس بھی بڑا نازک و لطیف ہے، جس کی متعدد مثالیں ہم کو ان کے کلام میں ملتی ہیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک پڑھے لکھے، ذہین و متفکر انسان کی شاعری معلوم ہوتی ہے، جو فن، زبان و لغت سب پر عبور رکھتا ہے۔

**الہارون** مکتبہ جدید لاہور کے سلسلہ تاریخی و سوانح کی دوسری کتاب ہے جو نہایت نفیس کاغذ پر مجلد ٹائپ کے حروف میں چھاپی گئی ہے۔

یہ کتاب مشہور عباسی خلیفہ "ہارون الرشید" کے سوانح سے تعلق رکھتی ہے اور عملاً اپنے موضوع وجود دور کے مشہور مصنف کی کتاب سے ترجمہ کی گئی ہے۔

یہ کتاب انداز بیان کے لحاظ سے جدید تاریخ نگاری کا اچھا نمونہ ہے اور قدیم رنگ کی بوجھیں تاریخی کتابوں کی طرح ذہن و دماغ پر بار نہیں ہوتی۔

ہارون کا عہد دور عباسی کا زریں عہد تھا اور اس کی متعدد زبانیں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں، اس نے ضرورت تھی کہ اردو میں بھی کوئی ایسی پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی جائے اور مکتبہ جدید نے اچھا کیا کہ عمر ابو النصر کی ہارون کا ترجمہ کر کے اس کے پورا کرنے کی کوشش کی۔ اس کا ترجمہ شیخ محمد احمد صاحب پانی پتی نے کیا ہے اور شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے ایک ایسا اختتامیہ لکھ کر ان تمام پہلوؤں کو واضح و روشن کر دیا ہے جو اصل کتاب میں محفل وغیرہ واضح تھے اور اس طرح کتاب بڑی اہم چیز ہو کر رہ گئی ہے۔

صفحات ۲۰۳ - قیمت پانچ روپیہ -

**ذوق جنوں** | مجموعہ ہے یرو فیہ سرال احمد سرور کی نظموں اور غزلوں کا، سرور صاحب کی ابتدائی ادبی زندگی شعر گوئی ہی سے شروع ہوئی تھی لیکن پھر انھوں نے شاعری ترک کر کے تنقید کی طرف توجہ کی اور عرصہ تک فرایض نقد انجام دئے اخیر میں انھوں نے پھر شاعری کی طرف توجہ کی اور ۱۳۵۷ء سے ۱۳۵۸ء تک جو کچھ زیادہ ایک اچھا خاصہ مجموعہ بن گیا جس کو ادارہ فروغ اردو نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔

ابتداء میں جناب سرور کا ایک دلچسپ مقدمہ بھی شامل ہے جس میں انھوں نے اپنے سوانحی کے ساتھ ادبی امانت شعریہ تنقید کا بھی مفصل تذکرہ کیا ہے۔ سرور ترقی پسند ادیبوں میں سے ہیں لیکن بڑے متوازن و معتدلی خیال کے ادیب ہیں، انھوں نے اپنی نظموں میں سیاست، معاشرت، قومیت و اخلاق وغیرہ بہت سے موضوع پر اظہار خیال کیا ہے لیکن ایسی تمام نظموں کا فنی و منظم بڑی حد تک کلاسل ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں جن جدید موضوعات سے کام لیا ہے۔۔۔۔۔ ان میں کافی شعریت پائی جاتی ہے اور غزلوں میں بھی کلاسیکی پابندی کے ساتھ بہت کچھ ایسی باتیں کہی ہیں جو نئی اور اچھوتی ہیں۔ حصہ نظم نگاری صرف ایک ہی نظم "کسی کی آپ بیتی" ایسی نظر آتی جو روایت، قافیہ و مجرور سے آزاد ہے اور یقیناً خالی رہنے لیا نہیں ہے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ نظم انھوں نے جو خطا کر کے لکھی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو خون لگا کر "شہدائے نظم آزاد" میں بھی شامل ہو سکتے ہیں۔

ان کی غزلوں میں سوز و گداز کم، اپنے نظم کی کیفیت زیادہ ہے، لیکن یہ ضرور سہہ کہ وہ اپنے کلام میں معنی نثر اثر پر اکرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ سرور صاحب ہر چند غزل کے قابل ہیں اور اس سے کافی نطفہ اٹھاتے ہیں، لیکن وہ خود غزل کے شاعر یقیناً نہیں ہیں اور کہیں کہیں انداز بیان، الفاظ و ترکیب کے استعمال میں بھی وہ صحت سے ہٹ گئے ہیں، لیکن اس کی مثالیں بہت کم ہیں، مثلاً ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے :-

اردو کے لئے ہے سرکشت دیکھو

خدا کی ایک صفِ جدیدہ

اس میں جدیدہ صحیح نہیں، جدید ہونا چاہئے۔

ایک اور مصرع ہے :-

نہ چھوٹے گا انھیں بھی انقلاب آہستہ آہستہ

"نہ چھوٹے گا" کے ساتھ "آہستہ آہستہ" کا استعمال مفہوم کے لحاظ سے درست نہیں۔

یہ مجموعہ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ سے پتے میں مل سکتا ہے۔

**حکمت رومی** | ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کی پیشکش ہے جسے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب (ڈائریکٹر ادارہ) نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے مولانا رومی کے ان نظموں کو پیش کیا ہے جو دینی و الہامی وحدت وجود، عالم اسباب، جبر و قدر وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مولانا رومی جس مرتبہ کے مفکر تھے اس سے دنیا واقف ہے لیکن

ان کے افکار کیا تھے اس کا علم صرف خواص کو ہے۔ اردو شاعری کی دنیا میں سب سے پہلے اقبال نے انھیں پیش کیا اور غالباً سب سے آخری بار بھی کیونکہ اقبال کے علاوہ کسی اور شاعر نے اس کی جرأت نہیں کی۔ لیکن چونکہ اقبال نے شاعری ہی کے ذریعہ سے روحی کو پیش کیا تھا جو بجائے خود ایک عقدہ دشوار ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ اردو نثر میں اس موضوع پر کوئی کتاب لکھی جاتی۔ چنانچہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے اس ضرورت کو پورا کیا اور اس خوبی کے ساتھ کہ متوسط ذہن و عقل والے بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے ذوق فلسفہ سے بہر شخص واقف ہے اور انھوں نے اس وقت تک اس مخصوص نقطہ نظر سے ملک و قوم کی بڑی گرفتار خدات انجام دی ہیں۔ جن میں اس کتاب کی تصنیف جدید ترین اضافہ ہے۔

جن مسائل پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے وہ الہیات اور علم کلام کے بڑے دقیق مسائل ہیں اور ان کو قابل فہم انداز سے پیش کرنا آسان نہ تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف نے جس دقت نظر سے کام لے کر کلام روحی سے ان کی راحت کی ہے وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔

یہ کتاب خاص اہتمام سے مجلہ شائع کی گئی ہے اور ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے مل سکتی ہے۔ ضخامت ۲۵۷ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔

**آگ دیپ بجے نا!** مصنف پروفیسر سرت پرکاش سنگر، ضخامت ۹۲ صفحات، قیمت چار روپے۔ ناشر: مکتبہ کردار بھوپال۔ مجموعہ ہے پروفیسر سرت پرکاش سنگر کے بارہ افسانوں کا۔ پروفیسر سنگر نئی پود سے تعلق رکھتے ہیں ان کا اسلوب نگارش کافی دلچسپ ہے جس میں کہیں کہیں طنز و مزاح بھی جھلک آتا ہے، انسانی نفسیات کا مطالعہ جزئیات نگاری کو مناظر قدرت کی عکاسی ان کے افسانوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کے مکالمے بھی کافی جاندار ہیں۔ راہی، شکست، بلیٹ اور تلاطم اس مجموعہ کی اچھی کہانیاں ہیں۔ اس مجموعہ میں کچھ کہانیاں ایسی بھی ہیں جنہیں تکنک کے لحاظ سے ریورٹاز کہنا زیادہ موزوں ہے۔ شکست اور انٹرویو میں حزن اور طبعیہ تکنک بھی کامیاب ہے۔ ان افسانوں میں زبان کی خامیاں ضرور پائی جاتی ہیں لیکن نہ اتنی کہ ان کے محاسن پر غالب آجائیں

**گیت اور چیخ** مجموعہ ہے ہرمنس سنگھ دوست کے بارہ مختصر افسانوں کا جو موجودہ معاشی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں بہت ہی عظیم آبادی نے اپنے حروف اول میں ہرمنس سنگھ کا تعارف کرتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ ان میں ایک کامیاب افسانہ نگار کی صلاحیتیں موجود ہیں اور ان کے افسانوں میں زندگی کی تڑپ بھی موجود ہے اور بہت ہی صاحب کی رائے غلط نہیں ہے۔ دوست ترقی پسند افسانہ نگار ہیں لیکن محض انقلابی نعروں کے نہیں بلکہ سیاسی و معاشی سوجھ بوجھ کے صحیح اقتصادی اصول کے جو خود ان کے ذاتی مطالعہ و تجربہ کا نتیجہ ہیں۔ تکنک، زبان اور جذبات نگاری کے لحاظ سے بھی ان کے افسانوں میں بڑی جان پائی جاتی ہے اور ہم ان کے اس مجموعہ کو گوروادوب میں ایک اچھا اضافہ سمجھتے ہیں۔ ضخامت ۳۴ صفحات۔ قیمت ۱۰ روپے۔ سٹے کا پتہ: امر کتاب گھر جمشید پور۔

**حسرت کی سیاسی زندگی** ایک مختصر سا رسالہ ہے جناب عبدالقوی دستوی کا جس میں انھوں نے حسرت کی سیاسی زندگی پر تبصرہ کیا ہے ہندوستان کے مسلمانوں میں صرف تین بہتیاں ایسی پیدا ہوئیں جنھوں نے سیاست و ادب دونوں میں یکساں توفیق حاصل کیا۔ مولانا محمد علی، مولانا احسان علی، مولانا آزاد لیکن مولانا محمد علی اور مولانا آزاد کا سیاسی رجحان انکی ادبیت پر غالب آگیا اور حسرت پر ادبی رجحان ان کی سیاست پر۔ یہاں تک آج لوگ حسرت کو صرف شاعری حیثیت سے جانتے ہیں اور ان کی سیاسی قربانیوں سے کم واقف ہیں۔ اس لئے ضرورت تھی کہ حسرت کے اس پہلو کو بھی نمایاں کیا جاتا اور اس ضرورت کو عبدالقوی صاحب نے بڑی خوبی کے ساتھ پورا کیا۔ ضخامت ۲۰ صفحات، قیمت ۱۰ روپے، سٹے کا پتہ: رائٹرز امپوریم بولڈنگ فیروز شاہ مہتاروڈ ممبئی۔

# بعض کمیاب کتابیں

(ان کتابوں پر کدیں نہیں دیا جائے گا - قیمتیں علاوہ محصول اک ہیں)

کشتان اصطلاحات الفنون ..... شیخ محمد علی .....	یوسف زلیخا ..... عبدالرحمن جامی .....
جہانگیر نامہ ..... خواجہ ابوالحسن .....	شعوی نلدن ..... ابوالفیض فیضی .....
تاریخ فرشتہ ۲ حصے ..... محمد قاسم فرشتہ .....	شعوی غنیمت ..... محمد اکرم .....
خصائل السعادت تاریخ و نسب نامہ افغانہ ..... .....	شعوی مخزن الاسرار ..... شیخ نظامی گنجوی .....
آئین اکبری مصورہ حصہ اول افضل فیض ..... .....	کلیات اسمعیل ..... اسمعیل اصفہانی .....
تاریخ جہانگیر نامہ نادری مصورہ ..... .....	دیوان ناصر علی سرہندی ..... .....
سکندر نامہ مصورہ ..... مولوی نظامی گنجوی .....	دیوان صاحب ..... محمد علی صاحب .....
وقایع نعمت خان عالی انشائے حسن و عشق ..... .....	کلیات صاحب ..... محمد علی .....
درہ نادریہ ..... مرزا محمد بہدی خاں .....	کلیات سعدی ..... شیخ مصلح الدین سعدی .....
تاریخ گلستان ہند مصورہ ..... درگاہ شاد ..... .....	لیلیٰ مجنوں - نظامی - مولانا نظامی .....
اقبال نامہ بہا لکیری سہ حصہ محمد شرف مستم خاں ..... .....	دیوان عرفی ..... جمال الدین عرفی .....
تاریخ جامع التواریخ ..... فقیر محمد .....	دیوان ہلالی محشی ..... ہلالی .....
سیر المتاخرین سہ حصہ ..... غلام حسین خاں .....	دیوان قصاید عنقری - حکیم ابوالقاسم .....
کارنامہ بیدری - حالات حیدر علی خاں - شیخ سلطان مرزا شاہزادہ محمد سلطان .....	اخلاق محسنی ..... ملا حسین واعظ کاشفی .....
تذکرہ دولت شاہ - دولت شاہ سمرقندی ..... .....	مصطلحات الشعراء محشی خلاصہ بہار غم .....
تذکرہ آثار الکرام و فرشتانی سرو آزاد - غلام علی آزاد ..... .....	اسن التواریخ - تاریخ صوبہ اودھ - فیض رام سہائے تمنا .....
تذکرہ خزینۃ الاصفیاء ..... .....	تاریخ ڈساکہ مصورہ ..... رحمان علی طیش .....
دیوان احمد جام ..... .....	تذکرہ کمالان رامپور ..... احمد علی خاں .....
تاج التواریخ مصورہ ..... .....	تذکرہ شیخ عبدالحی محمد دہلوی - سید احمد قادری .....
تاریخ نادری مصورہ تاریخ حکماء ..... .....	حیات امیر خسرو ..... سعید احمد .....
در بار لکیری آزاد ..... .....	تذکرہ آہ بقاء ..... عبدالرؤف عشرت .....
مقدمہ تاریخ ابن خلدون ترجمہ اردو ..... .....	ہندو شعراء ..... .....
البراکہ ..... عبدالرزاق ..... .....	تذکرۃ الخواتین ..... عبدالباری آسی .....
سیرۃ النعمان - شبلی ..... .....	تذکرہ سخن شعراء شاخ ..... .....
تذکرہ گل رعنا ..... عبدالغنی ..... .....	تذکرہ گلشن ہند ..... مرزا علی لطف .....
کلیات ظہیر ..... حکیم ظہیر خدیابی ..... .....	تذکرہ مخزن نکات ..... قایم .....
قصاید عرفی محشی ..... جمال الدین ..... .....	تذکرہ عقد ثریا ..... مصحفی .....

تذکرہ دستور الفصاحت	یکتا	تذکرہ داغ	مقتاب داغ
تذکرہ چمنستان شعراء	طریق	تذکرہ داغ	گلزار داغ
تذکرہ ہندی	مصطفیٰ	آفتاب داغ	آفتاب داغ
دیوان میر حسن	میر حسن حسن	کلیات جعفر	کلیات جعفر
دیوان رنگین و انشاء	رنگین کلام	مجموعہ قصاید سوس	مجموعہ قصاید سوس
دیوان تاج سخن	جلیل حسن خاں جلیل	کلیات نظیر اکبر آبادی	کلیات نظیر اکبر آبادی
دیوان میر وزیر علی صبا	میر وزیر علی صبا	ثنوی میر حسن	ثنوی میر حسن
دیوان ولی دکنی	ولی دکنی	ثنوی گلزار نسیم	ثنوی گلزار نسیم
دیوان رند	رند	ثنوی زہر عشق	ثنوی زہر عشق
دیوان خواجہ وزیر	خواجہ وزیر	مراتی میر انیس	مراتی میر انیس
دیوان شکر گوت	دیوان نسیم	مراتی میر انیس	مراتی میر انیس
دیوان حمید علی	طباطبائی	مراتی دبیر کامل	مراتی دبیر کامل
منظر عشق دیوان قلق	خواجہ اسد علی قلق	مراتی مونس	مراتی مونس
کلیات تاج	امام بخش تاج	مراتی عشق	مراتی عشق
کلیات تسلیم	تسلیم	درمائی لطافت	درمائی لطافت
کلیات نظیر شہباز	مع سوانح نظیر	نساء عجائب	نساء عجائب
کلیات ساحل خیر آبادی	ساحل خیر آبادی	موازنہ دبیر و انیس	موازنہ دبیر و انیس
کلیات جان صاحب	جان صاحب	آئینہ تاریخ	آئینہ تاریخ
کلیات سودا	مزار فیع سودا	چراغ سخن	چراغ سخن
کلیات حسرت	فضل الحسن موہانی	منیر اللغات	منیر اللغات
کلیات مومن	مومن خاں دہلوی	کرم اللغات	کرم اللغات
کلیات میر	میر تقی میر	تنقیح اللغات	تنقیح اللغات
کمل شرح کلام غالب	مرتبہ عبد الباقی آسی	سفر نامہ حکیم ناصر خسرو	سفر نامہ حکیم ناصر خسرو
مطالعہ الغالب شرح دیوان غالب	شارح مرزا سہار	وقایع سیر و سیاحت	وقایع سیر و سیاحت
مرآۃ الغیب	امیر احمد امیر	بحر الفصاحت	بحر الفصاحت
مجموعہ قصاید ذوق ۲۳	عدد قصاید مع ترجمہ	فردوسی پرچار مقلد	فردوسی پرچار مقلد
منظر معانی دیوان مجروح	میر مجروح حسین	تذکرہ آب بقا	تذکرہ آب بقا
کلمات وجدانی	یکتا	تاریخ حبیب السیر	تاریخ حبیب السیر
دستور الشعراء	(تذکرہ و تانیٹ)	کلیات ظفر چہار دیوان	کلیات ظفر چہار دیوان

**ضروری اعلان :-** جرٹری کی فیس اب ۵ روپے کی ہے اس لئے آئندہ تھکار کا دی پی پیٹ میں سعاد ہوگا۔ پاکستان کے خریدار بھی اپنا چند بے جمع کرالیں۔  
 داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ  
 آئندہ روپیہ وطن آئے میں دی پی پی ہوگا جس میں سالانہ  
 ۵۰ روپے کی قیمت (مع مصارف جرٹری) بھی شامل ہے

**نکار**

اڈیشا نیاز فچوری

جلد ۶۹	فہرست مضامین مئی ۱۹۵۶ء	شمار ۵
۳	ملاحظات	غالب اور تقلید پر
۵	آئینہ کلمنوی (اپنے خطوط کے آئینہ میں) ... نثار احمد فاروقی	۳۰
۱۳	انسان کی تعمیر جدید۔۔۔ آئندہ عالیشانہ (ایم۔ اے۔)	۳۶
۱۹	اردو ادب میں روایت و بغاوت کی اہمیت۔۔۔ محمد علی رضوی ایم اے	۴۴
۲۴	اسلام اور عورت۔۔۔ پروفیسر ملک محمد حسن (الکابریہ پورہ)	۵۰
		۵۴



## ملاحظات

## پاکستان دور ہے پر

تاریخ ہندوادی۔ لیگ اس وقت تک پاکستان ایک ایسے دور قہر و اقتدار سے گزر رہا ہے کہ اگر ہم اسے شخصی آمرانہ حکومت نہیں کہہ سکتے تو آمرانہ ارشاکرشی (ARISTOCRATIC DICTATORSHIP) ضرور کہہ سکتے ہیں، جس کا سرخشا ہمیشہ کسی نہ کسی اشراف کے ہاتھ میں رہا ہے اور جو شخصی استبداد سے زیادہ نامعقول چیز ہے۔ آمرانہ حکومت میں تو کھلم کھلا صرف ایک شخص عوام کے جذبات کو کھلتا ہے اور عوام اچھی طرح جان لیتے ہیں کہ دشمن و غاصب کون ہے، لیکن آمرانہ ارشاکرشی دوستی کے پردہ میں رہنری کرتی ہے اور عوام کو دوست دشمن میں تمیز کرنے کا بھی موقع نہیں دیا جاتا۔

اس وقت تک مسلم لیگ حکومت نے جس طرح عوام کو دھوکا دیا ہے وہ تاریخ پاکستان کی نہایت دردناک داستان ہے، جس کے دہرانے کی ضرورت نہیں، لیکن یہ حالات موجودہ جبکہ وہاں ڈاکٹر خان نے ایک جمہوری محاذ قائم کر کے مسلم لیگ کو کھلا ہوا چیلنج دیا ہے، اس کا ذکر ضروری تھا۔

ڈاکٹر خان ابتدا ہی سے مسلم لیگ کے خلاف تھے اور اسی غمناہ کے ہاداش میں وہ اور ان کے بھائی عبدالغفار خان سالہا سال تک قید و بند کی مصیبت میں مبتلا رہے، لیکن جب مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو طاکر صرف ایک صوبہ بنانے کی تجویز سامنے آئی تو مخالفت کا اندیشہ سب سے زیادہ صوبہ سرحد کی طرف سے تھا اور چونکہ خان برادران کے علاوہ کوئی اور ایسا نہ تھا جو اس مخالفت کو دور کر سکتا، اس لئے انھیں نہ صرف یہ کہ ہاروا گیا بلکہ ڈاکٹر خان کو اس نوزائیدہ صوبہ کا چیف منسٹر بھی بنا دیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ دھری محمد علی کی وزارت غلطی کی ہے پالیسی بہت دانشمندانہ تھی اور یہی پالیسی مغربی پاکستان کو ایک وحدت

بنانے میں کامیاب ہو سکی، لیکن شاید اس کی خبر نہ تھی کہ اس اقدام سے خود مسلم لیگ پر کیا گزر جائے گی؟ ممکن ہے کہ اگر اب مسلم لیگ نے یہ خیال کیا ہو کہ مغربی پاکستان کی چیف منسٹری اتنی بڑی رشوت ہے کہ ڈاکٹر خان کو خود مسلم لیگ کی طرف کھینچ لے گی، یا یہ کہ وہ خود اپنے اندر اتنی قوت رکھتی ہے کہ جب چاہے گی ڈاکٹر خان کو اس عہدہ سے علیحدہ کر سکے گی لیکن کس قدر دلچسپ بات ہے کہ وہ ان دونوں میں سے ایک بات بھی نہ کر سکی۔ ایک طرف ڈاکٹر خان نے مسلم لیگ کے خلاف پہلے ہی پارٹی قائم کر دی اور دوسری طرف خود مسلم لیگ کے ممبران ٹوٹ ٹوٹ کر اس نئی پارٹی میں شامل ہونے لگے۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر خان کا یہ اقدام بڑا دلیرانہ اقدام ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس سے مسلم لیگ میں جو سیلاب و زحمان پیدا ہو گئے وہ ڈاکٹر خان کے قدم کھٹنے دے گا یا نہیں۔

جس حد تک حوام کا تعلق ہے وہ غالباً اس نئی جماعت کا خیر مقدم کریں گے، کیونکہ مسلم لیگ دور سے وہ اتنا چکے ہیں اور اس کی طرف سے کوئی توقع قائم نہیں کر سکتے، لیکن سوال یہ ہے کہ عام انتخاب کے وقت لیگ کا برزخی دور کیونکر گزرے گا۔

اس وقت ایک طرف تو صورت حال یہ ہے کہ سو ممبران اسمبلی، نئی جماعت میں شامل ہو گئے ہیں اور اس طرح ۳۰۶ ممبران جس سے (۹) نئی جماعت سے متعلق ہو گئے ہیں اور ڈاکٹر خان کو اکثریت حاصل ہو گئی ہے۔ دوسری طرف چودھری محمد علی نے باجمہ اس وعدہ کے کہ وہ ڈاکٹر خان کو عام انتخاب تک ان کے عہدہ سے ان کو علیحدہ نہ کریں گے، مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اس رزلویشن کو بھی حلقے سے اتار لیا ہے کہ: ”محان کینٹ کے سات مسلم لیگ ممبران کو جنھوں نے کینٹ سے استعفا نہیں دیا ہے مسلم لیگ سے علیحدہ کر دیا جائے اور ڈاکٹر خان کو وزارت کے عہدہ سے ہٹا دیا جائے۔“

اس کا اثر مرکز کی کینٹ پر کیا پڑے گا؟ یہ سوال بھی اپنی جگہ غور طلب ہے۔ ڈاکٹر خان، چودھری محمد علی کی وزارت کی حمایت کا وعدہ کر چکے ہیں، لیکن جب کہ پیش اسمبلی کے دو ایگ ممبروں میں سے ۲۲ ایگ ممبر ڈاکٹر خان کی جماعت میں شامل ہو گئے ہیں، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت ڈاکٹر خان کی وزارت محمد علی کے رحم و کرم پر موجود ہے یا خود محمد علی کی مرکوز وزارت ڈاکٹر خان کے رحم و کرم پر! مسلم لیگ اس وقت عداوت ہے نشتر، دو لٹانے اور گھرو سے لیکن ان کی بے اطمینانی و بے بسی کا یہ عالم ہے کہ جب محان عداوت نے (چو ڈاکٹر خان کے طرفدار ہو گئے ہیں) سردار نشتر سے یہ پوچھا کہ ڈاکٹر خان کی جگہ وہ کس کو اس عہدہ کا سروراء سمجھتے ہیں تو وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکے، یہاں تک کہ دو لٹانے اور گھرو کا نام بھی نہ لے سکے، شاید ان کا مقصد یہ ہو کہ خود ان کے سوا وہ سروراء اس عہدہ کا مستحق ہو سکتا ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پرورش لیگی اخبار ڈان، ڈاکٹر خان اور ان کی جمہوری پارٹی کو جس اندیشہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر خان اور محان عہد الغفار خاں اسے خرسچون اور بنگان نظر آتے ہیں اور مسلم کا جو مشترکے ہاتھوں ہو گا، ظاہر الغرض پاکستان اس وقت ایک ایسے دور ہے پر گھڑا ہے جس کا ایک راستہ تہلک و خطرناک ہے اور دوسرا منزل مقصود تک پہنچانے والا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان دو میں سے وہ کس راستہ کو اختیار کرے گا۔ اگر آئندہ انتخاب میں ڈاکٹر خان کی نئی پارٹی کو اکثریت حاصل ہو گئی تو امید ہے کہ پاکستان سنبھل جائے گا اور اگر خدا ناکردہ مسلم لیگ کامیاب ہو گئی تو پھر پاکستان کا خدا حافظ ہے۔

مسئلہ پاکستان کشمیر کے مسئلہ کو اب سیکورٹی کو فصل کے نور سے سے طے کرنا چاہتا ہے اور اس فرض کے پیش نظر ایک زبردست ٹیم امریکہ گئی ہے تاکہ وہ مسئلہ کشمیر اس باب میں خود امریکہ کی اعانت و ہمدستی حاصل کر سکے۔ اتفاق سے جو امیر لال نہرو بھی اخیر جون میں سٹراڈن سے ملتے ہوئے امریکہ پہنچے رہے ہیں اس نے ہمیں امید نہیں کہ جب تک نہرو، ایزنہور اور ایڈن کی باہمی گفتگو ختم نہ ہو جائے پاکستان کو امریکہ کی طرف سے کوئی مختتم جواب مل سکے گا اور اگر ہمارے خیال صحیح ثابت ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۹۵۷ء سے پہلے کشمیر کے مسئلہ پر کوئی نتیجہ خیز گفتگو نہ ہو سکے گی اور ہر ترقی پاکستان کے لئے قاتل چیک جسے۔

مزدور کے ہاتھ میں غنیمت دے گئے۔ ادیبانِ اعظم ظریف امن کا پرچار کرتے ہیں اور شائستگی کا ڈھونگ رچاتے ہیں !  
 زبانی تو یہ جیج بیکار کہہ گئے اسے مزدور پہلا جائے اور کسان پہا جاتا ہے اور ملا ؟ سے  
 پھوٹا گئے پہاے لندھ تھا بھرا قرا ! مستی میں اپنی ماں تھا اک شور اور شرابا (تیسر)

بقول شمس:

(چلائے ہیں آزادی کے لئے اور مقصود ہے کھل کھیلنا) بقول ایک گمنام شاعر کے (فاروقی صاحب یہ آپ کے اثر کا قطعہ ہے)  
 شاعر جوش مقابل، ہاتھ میں جام شراب گوشِ مطرب کی فواہِ لب پہ نام انقلاب  
 نفس کے بندے کہاں، تعمیرِ عمر نو کہاں کچھ نہیں ابدِ فریبی کے سوا تعبیرِ خواب !  
 میں آپ کا اس باب میں بھی ہم فواہوں کہ شاعری کا دائرہ کیا بلحاظ موضوع کیا بلحاظ ہیئت محدود نہ کرنا چاہئے۔ ادب  
 برائے زندگی، سرانگہوں پر فخر طیکہ ادب ہو۔ میں نے خود کثرت سے نظمیں بھی کہی ہیں۔ ہلینک دیں اور آزاد نظم کی تکنیک  
 بھی استعمال کی ہے۔ سیاسی نظمیں بھی کہی ہیں۔ مگر شاعری کو مقدم رکھا ہے اور نفرت و گندگی کی پوجا نہیں کی ہے۔  
 (لازمیہ وقت بن) خطرات کو نام کر چکا تھا۔ ایک صفحہ حالی دیکھ کر آپ کی فرمائش کا خیال آیا کہ خط میں اپنے  
 کچھ شعر لکھ بھیجا کر۔ پچھلے خط میں جو غائبا اب تک مل چکا ہوگا، طرزِ مومن و بیدل کے چند اشعار پیش کئے تھے۔ اس مرتبہ  
 آتش کا رنگ ملاحظہ ہو پہلے خود اس کے چند شعر سن لیجئے:-

- ۱۔ پاکدامنی محبوب کا سودا ہے جنھیں
- ۲۔ اسے موج بے لحاظ سمجھ کر مٹاؤ
- ۳۔ کچھ نظر آیا نہ پھر جب تو، نظر آیا مجھے
- ۴۔ کسی نے مول نہ پوچھا دل شکستہ کا
- ۵۔ نلی ہے پاؤں میں ہندی انھوں نے پیہر پہن
- ۶۔ نئید اُن کو کہیں بے قید و ضوابطی ہے
- ۷۔ دریا بھی ہے اسیرِ طلسمِ حباب کا
- ۸۔ جس طرت دیکھا مقام ہو، نظر آیا مجھے
- ۹۔ کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کس کا کرتا
- ۱۰۔ میں تو کیا ہے قدمِ عرش پر نہیں رکھتے

اثر کے اشعار (لکھنوی رنگ)

- ۱۔ نظر سوئے زمیں ہے گوشہِ دامن ہے ہاتھوں میں
- ۲۔ وہ غور بات بات پہ وہ شک بھری نظر
- ۳۔ نظریں آنکھیں اور آنکھ کے جھلکین تکنت کے ساتھ
- ۴۔ کسی کا ہائے یہ کہنا اثر سے وقت و دواع
- ۵۔ قصور ہے کسی کا، ہم ہیں اور غفلت گزینی ہے
- ۶۔ یہ ہے انجامِ خود بینی کہ وہ ہیں اور آئینہ
- ۷۔ سماں وہ یاد ہے؟ عارض پہ جب گیسو کھڑ جائے
- ۸۔ میں تو کہتا تھا صبا غماز ہے آئے نہ دے
- ۹۔ ناظر اُس گلزار کے ہم رہ چکے ہیں ندوں
- ۱۰۔ خلد کہتے ہیں کئے معلوم ہے زاہر مجھے
- ۱۱۔ کیا نہ بھول کے بھی یاد مرنے والوں کو
- ۱۲۔ نثارِ سادگی نازِ حُکم ہوتا ہے
- ۱۳۔ صبا نے چھوڑا وہیں افسانہ گلشن
- ۱۴۔ مجھے کیا میند آئے گی کہ ہدم میں نے دیکھی ہیں
- ۱۵۔ معاذ اللہ کوئی کیا کہے ایسے پیشیاں کو
- ۱۶۔ یارب نہ مجھ سے صاف ہو دل بدگماں کا
- ۱۷۔ گویا یہی جواب تھا میرے سوال کا
- ۱۸۔ جو ہو سکے تو ہمیں دل سے تم بھلا دینا
- ۱۹۔ مشامِ جاں میں مشِ غنچہ خوشبو بھینی بھینی ہے
- ۲۰۔ حیا کو نام رکھتے ہیں ادا پر نکتہ چینی ہے
- ۲۱۔ وہ بل کھاتے، بگڑتے تم، بگڑنے میں سنور جاتے
- ۲۲۔ آج بزمِ گل میں چہرہ چاٹھاتری پوشاک کا
- ۲۳۔ برق کو رقبہ نہیں جس میں خس و خاشاک کا
- ۲۴۔ ہاتھ شیشے کے گلے میں اور سایہ تاک کا
- ۲۵۔ کوئی تو حقِ محبت کبھی ادا کرتے
- ۲۶۔ فغاں تو کر، دم اُلٹتا ہے ہوں جفا کرتے!
- ۲۷۔ جب قصدِ اسیروں نے کیا ترک فغاں کا
- ۲۸۔ وہ آنکھیں بند ہوتے وقتِ خواب آہستہ آہستہ

خدا حافظ۔ اثر

کشمیری محلہ لکھنؤ - ۱۳ نومبر ۱۹۵۷ء - (وقت شب)

پیارے بھائی فاروقی - آپ کے موجودہ خط میں رسالہ احسن کے دو تراشے نکلے مگر بہار غائب! غالباً رکھنا بھول گئے۔ آپ نے تصویر کی فرمائش کی ہے۔ نثر برس کا بوڑھا تصویر کیا کھینچوائے۔ آئینہ دیکھتے تو گھٹن آتی ہے۔ .... مجھے شاعری میں تمہارا محمد ہادی عزیز لکھنوی سے ہے۔ اُن سے خاندانی مراسم تھے اور مجھ سے عمر میں دو چار برس ہی بڑے تھے۔ میرا خاندان نوابی عہد میں دیگر اعزازات کے علاوہ علم و ادب میں بھی ممتاز تھے۔ ”ثقافت کٹرہ“ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ جب کوئی زبان کا مسئلہ پیش ہوتا تھا تو اسی کے افراد حکم قرار پاتے تھے۔ میں کہ تنگ خاندان ہوں اور بیچ و ناکارہ اب صرف اس لئے رہ گیا ہوں کہ اُن کے کمال کو اپنے لئے مایہ افتخار سمجھوں۔ ....

نواب مرزا شوق لکھنوی میرے والد کے قریبی عزیز تھے۔ اُن کے فرزند سلطان مرزا کو میں نے بھی اپنے بچپن میں دیکھا تھا بڑے خوش باش اور زندہ دل تھے۔ والد مرحوم سے اکثر ملنے آتے تھے اور صحبتیں گرم رہتی تھیں۔ خواجہ احمد رفیع دینی صاحب نے غنوی دہر عشق کی شان نزول بالکل غلط بیان کی ہے۔ آپ ہی غور کیجئے کہ ایک سوداگر ہے مگر اتنی استطاعت نہیں رکھتا اور ایسا مفولک حال ہے کہ چینی کے لئے گھر میں آٹا بھی نہیں، دیارات عتبات عافیات کو جانے کے لئے بیوی کو بہن رکھ کر روپیہ فراہم کرتا ہے۔ نواب مرزا صاحب کا ہم مذہب ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ نواب مرزا صاحب بہت خوش حال اور دربار شاہی سے متوسل تھے۔ کئی سو روپیہ ماہوار مشاہیر و دیگر جاہلاد کے کئی گاؤں کے مالک تھے دھندلہ سوداگر کی ادا دہنیں کرتے بلکہ اس کی بیوی کو بہن رکھتے ہیں! کم بخت سوداگر مذہب کا پابند ہے زیارت کے قصد سے حیار ہا ہے مگر اپنی بیوی کو نا محرم کے سپرد کر دیتا ہے! اگر بلائے معلیٰ وغیرہ جانے کے لئے اب تک وقف حسین آباد سے چٹسایا تقسیم ہوتی ہیں، اُس وقت جب لکھنؤ میں بہن برس رہا تھا کوئی ایسے کار خیر میں سوداگر کا کفیل نہیں ہوتا! کوئی بھی ٹھکانے کی بات ہے! اب سلطان مرزا صاحب نے جو واقعات بیان کئے اور میں نے اپنے کانوں سے اُن کی زبانی سنے وہ لگتا ہوں۔ نواب مرزا صاحب کے مکان کی دوکانوں میں ایک مسلمان کھار رہتا تھا اُسے کسی ضرورت سے سفر درپیش ہوا وہ اپنی بیوی کو نواب مرزا صاحب کے سپرد کر گیا تاکہ اس کی عدم موجودگی میں عورت کی کفالت ہوتی رہے۔ عورت گھر میں رہنے اور کام کاج کرنے لگی۔ جوان اور قبول صورت تھی۔ مرزا صاحب کے ایک رشتہ کے بھائی داسالے (صحیح رشتہ دھیان سے آکر گیا ہے) بھی ان کے ساتھ رہتے تھے اُن سے اور اس عورت سے ناہایہ تعلق چڑھ گیا دونوں چوری چھپے ملے لگے۔ کچھ مدت کے بعد اس کے شوہر کا خط آیا کہ وہ فلاں دن گھر پہنچ جائے گا۔ رات کے نواب مرزا صاحب اسٹاپی کرنے آئے اور دیوان خانے کے ایک کمرے میں کچھ کھسکے چورسی تھی۔ یہ سننے لگے۔ وہ عورت یہی تھی کہ اب جینا بیکار ہے ہم کچھ کھانے سو رہے۔ اس کی باتیں اس قدر درد انگیز تھیں کہ مرزا صاحب کے جذبہ شعلی میں پہچان ہوا۔ لکھنے کا سامان کوئی ڈھونڈ نہ ہوا، کونے سے دیوار پر اشعار لکھنا شروع کر دیے۔ اس طرح غنوی زہر شوق غماز ہوا۔ قصہ میں وقار پیدا کرنے کو کھار لی جو رو کو سوداگر کی لڑکی بنا دیا اور اسی رعایت سے دوسرے تغیرات کر دیے۔

لے ملاحظہ ہو: ”مرزا شوق لکھنوی“ اولیٰ و احمد فاروقی - لیکن مصنف محترم نے مجھے بتایا کہ شان نزول کے سلسلہ میں انھوں نے مرزا احسن لکھنوی ایسے مرزا شوق کے ایک مضمون سے ”ادہ کیا تھا جو پتھر لکھنوی میں شائع ہوا تھا۔ انھما صاحب نے اپنی طرف سے کچھ نہیں بڑھایا ہے۔ یوں بھی قبول کی گئی کہ میرے اور مرزا صاحب قہل کے بیا۔ کچھ زیادہ فرق نہیں ہے؟“ ۱۱ شمار

میرے اجداد میں ایک میرزا محمد سمیع حق میرزا بچو تھے۔ ذرہ تخلص کرتے تھے، فارسی زبان کے مستند ماہر مانے جاتے تھے۔ یہ مشہور رباعی انھیں کی ہے۔ (سودا کے ہم عصر تھے)

سرا بگزشت و این دل زار ہاں، گرا بگزشت و این دل زار ہاں  
القصدہ تمام سر و گرم عالم، برا بگزشت و این دل زار ہاں  
اُن کے چھوٹے بھائی میرزا رضا علی خاں آشفہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے اور میر سوز کے شاگرد تھے، میرزا علی لطف کے تذکرہ گلشن ہند میں اُن کے حالات درج ہیں۔

حضرت ساکت ر شعر خوب ہے  
جوابے پاک کھلتے کھلتے یار آہستہ آہستہ  
اس زمین میں (و تبدیل قافیہ) مجھے دلی دکھنی کا یہ شعر بہت پسند ہے۔

عجب اک لطف رکھتا ہے شب خلوتِ نازبے سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ  
آپ کے دونوں مضامین نشر پسند آئے۔ سعادت علی کے متعلق مجھے اس کا عشر عشر بھی علم نہ تھا جو کچھ آپ نے ڈھونڈ نکالا۔ زہر عشق پر جو کچھ عرض کیا اس کا محرک اسی مضمون کا مطالعہ ہوا۔ خواجہ احمد صاحب کا مضمون بہت پیشتر پڑھ چکا تھا۔

ہاں ایک بات اور یاد آئی آپ نے میر کے شعر میں مصرعوں کو مقدم موخر کر دیا تھا۔ شعریں ہیں  
استخراں کانپ کانپ جلتے ہیں، عشق نے آگ وہ لگائی ہے  
اب یاد نہیں کہ طرز مومن و بیدل کے کون کون، اشعار نقل کئے تھے دوبارہ اپنے دواوین و بھاض کی ورق گردانی کر کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ خدا سمجھے ان ٹک والوں سے !

### طرز بیدل

ذرہ ذرہ کسے قافل کا بہار آسودہ ہے، پیکر بسمل یہاں تک خاک و خوں آلودہ ہے  
اس کو بھر فریاد پر مائل نہ کر اوبے و قاف، وہ دل محزون جو مدت سے الم آلودہ ہے  
خاک مجنوں دشت گروہ کی مجھے دعوت ہے، داوی غریب کا ہر ذرہ مرا پیودہ ہے  
مسکراتا ہے سنگر اور نہیں دیتا جواب، جب میں کہتا ہوں کہ گرم دل نک ما سودہ ہے  
(اور بلا سے جو رنگ بیدل نہیں ہے)

اب کسے آواز دیجئے، پیکسی، اسے بے کسی، اک صدفے باز گشتی وہ بھی خواب آلودہ ہے  
چشم تر غماز ہے رنگ پریرہ پردہ در، نالہ ہے گونا شنیدہ آہ لب نکشودہ ہے

۱۔ یہ حضرت ابوالحسن سلکات اردو ہی شاعر و نظام زہوری کا شعر ہے۔ ساکت اردو کے بڑے قاصد و الکلام شاعر تھے۔ بنی بھی لکھتے تھے اور بنی میں "بندی" تخلص کرتے تھے۔ اُن کا شعر ہے "بندی" نے اس زمین میں بھی گل کھلا دئے، سب مردے کہتے تھے اچھی نہیں نہیں۔ اُن کے بہت سے اشعار و نظمیں اس کی زبانوں پر رائج ہیں مگر شمس ہے کہ ساکت نے انتقال سے پہلے اپنا سا الکلام تیل چھڑا کر اپنے سامنے جلا دیا تھا اس لئے اُن کا کوئی مجموعہ منظوم یا قصائد نہ تصنیف کے بعد دوسرے استاد تھے جو پاک اموات سے لکھتے تھے۔ اُن کا شعر میں نے بھی تراجم کو کسی عبارت کے ساتھ لکھ بھیجا تھا۔ شمار ۱۷

میرے مشرب میں ریاکاری سے بدتر کچھ نہیں  
منکر اسرار حق اسے فرقہ جدت پسند  
یوں تو جو انساں ہے وہ معصیت آلودہ ہے  
کفر بھی فرسودہ ہے اور کس قدر فرسودہ ہے!  
رنگ بیدل میں اثر کا بھی تو کچھ فرسودہ ہے

### طرز مومن

جو ابھی خوش ہیں وہ دم بھر میں پشیاں ہوں گے  
اسے جنوں تیری اجازت ہو تو اتنا پڑھوں  
چارہ ساز غم دل جان کے خواہاں ہوں گے  
اب کی ورکار بھلا کتنے گریباں ہوں گے  
کچھ قیامت ہی پہ موقوف نہیں ظاہر ہے  
یہ محض نمونہ ہے۔ داغ کے رنگ کے بھی اشعار ہیں مگر کم:  
بھولتا ہی نہیں وہ ناز سے کہتا تیرا  
آٹھ رہے حشر پہ کیوں میرے سوالوں کا جواب  
زاہد کو فکر جنت و حور و قصور ہے  
میر توڑ کے کلام کا میں نے بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا۔ اُن کے چند پسندیدہ اشعار لکھ بھیجے تو غور کروں کہ میرے کلام میں  
اُن کے رنگ کی جھلک ہے کہ نہیں۔ اگر سادگی، معصوم سادگی نمایاں خصوصیت ہے تو شاید یہ شعر مثال میں پیش کرنا  
غلط نہ ہو کہ فیض تیر ہی کا ہے۔

محبت میں ایسا بھی اک وقت آیا  
پلک اس کی جھپکی توجہ سی سنایا  
آپ کا اثر

کشمیری محلہ لکھنؤ - ۱۴ نومبر ۱۹۵۲ء (وقت شب)

پیارے بھائی فاروقی - آج صبح کو ایک خطرہ درانہ کرچکا ہوں۔ سہ پہر کی ڈاک سے رسالہ بہار اور آپ کا  
خط ملا۔ میں خدا کے فضل و کرم سے اور آپ کی دعا سے اب اچھا ہوں، ادھر کئی مرتبہ خون کا پیشاب آیا۔ مثالے  
میں حدت ہوگئی تھی۔

بھائی صرف آپ کو محبت نہیں۔ میں بھی آپ میں ایک روحانی مواصلت اور یک جہتی پاتا ہوں۔ مدت ہوئی میں نے  
ایک شعر میں اپنی آرزو کا اظہار کیا تھا۔

دفن ہیں سینہ ویراں میں خزانے کیا کیا  
کاش آنکھ اُدھر باد پہنچا کوئی،

میر یقین ہے کہ اس آرزو کی تشکیل آپ کی ذات والا صفات میں ہوئی ہے۔

..... اور شاید آپ ہی میرے اس مقطع کی تردید بھی کریں گے۔  
کیا شخص اثر بھی تھا اب تک نہ کوئی سمجھا  
عاشق تھا کہ شاعر تھا دیوانہ کہ داننا تھا

اس کے ساتھ ڈرنا بھی ہوں۔

یہ شرم، ناکسی ہے کہ رہتا ہے یہ ہر اس  
مجھ کو نہ دیکھ لے کوئی میری نگاہ سے  
ہندیب کے لئے جو مضمون آپ نے لکھا تھا وہ بھیج دیا؟ میں نے ایک طویل مضمون لکھ کر ساتی میں اشاعت کے لئے  
بھیج دیا ہے۔ رنگ مومن میں چند شعر سنئے:-

گرے شب جو حریف غم پہناں ہوگا  
اک ذرا اور چوچالاک ہوا دست جنوں  
بزم کی بزم سلگ اٹھے گی یہ یاد رہے  
جو ترے حسن کے جوہر بھی نمایاں کر دے  
رنگ چہرے کا ذرا دیکھئے آئینے میں  
"صاحب" رنگ میں رنگ ہے بس میری تیرے کا رنگ" ۱۰  
محبت کی تھی پاسداری بہت  
زہے بخت جس کو قناعت ملی  
وہ کہنے کو تو رو میں کچھ کہہ گئے  
اُسے رحم آیا نہ دل کو قرار  
نہا۔ ہے جو رہ جائے ناموس عشق  
نہ دیکھوں اُدھر کس طرح بار بار  
نہ پنپا نہ سال تنہا اثر  
سو ہے سبر کم بے قراری بہت  
ترے در کے یوں تو بھکاری بہت  
ہوئی بعد ازاں شرمساری بہت  
بہت کر چکے آہ و زاری بہت  
کہ حالت ہے اب انتظار ہی بہت  
کہ آنکھیں ہیں کافر کی پیاری بہت  
محبت نے کی آبیاری بہت  
آپ کا اثر

کشمیری محلہ لکھنؤ - ۱۸ نومبر ۱۹۵۳ء (وقت شب)

یار۔ سہیلی خاندن - سنا دیا کہ اس وقت شام کی ڈاک سے آپ کا خط ملا۔ مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ نے میرے  
شعار پر تادانہ نظر ڈالی۔ ۱۱

خاک مجنوں دشت گردی کی مجھے دعوت تھی۔ وادی غربت کا ہر ذرہ مرا پیہ و دوسہ  
پہ کا خیال ہے کہ "وادی غربت" سے "وادی دشت" بہتر ہوتا۔ خطاب خاک مجنوں سے ہے سوال یہ ہے کہ بعد  
نا مجنوں کی خاک میں دشت ہوگی یا آوارگی؟ - میرا شاعرانہ احساس کہتا ہے کہ دورانِ حیات کی دشت دارگی  
میں تبدیل ہو جائے گی۔ یہ بھی نہ سہی جو ربط خاک کو آوارگی سے ہے۔ دشت سے ہرگز نہیں۔ علاوہ بریں "وادی دشت"  
بنے سے دعوت صحراوردی بادیء نجد تک محدود ہو جاتی۔ حالانکہ خاک مجنوں خود صحرائے نجد سے باہر کسی جگہ قابلِ شعر  
مے طاق ہو کر دعوت دشت گردی دے رہی ہے۔ اگر جائے ملاقات صحرائے نجد فرض کیا جائے تو ساری گفتگو ہی  
اطائل ہو جاتی ہے۔ لیکن ہے کہ خاک مجنوں۔ بل شعر کے نائے ویراں میں آتی ہو جو "وادی غربت" کا ہر گوشہ  
جان کر اب اپنے گھر میں بیٹھا ہوا یہ شعر شہر ہے۔ ۱۲

صحرا کوئی نہیں ہے ہمارے مذاق کا بیٹھے ہیں اپنے گھر کو بیاباں کئے ہوئے۔ (آخر ہم بریں دھر)  
نظارہ، آغوش اور سطح کی تذکرہ تائیت نود لکھنؤ میں مختلف فیہ ہے۔ خصوصاً لفظ آغوش کی۔ جلال لکھنوی نے  
سطح تو بلا اختلاف ذکر کیا ہے۔ میں نے بھی جس سے سنا ذکر ہی بولتے سنا۔

۱۳ ایک گھسا پٹا مصرع ہے: "کر جہاں تو کردار گستاخ" میں نے یہ لکھ دیا تھا کہ "وادی غربت" میں غربت ہے اگر "وادی دشت"  
"دشت" کی جگہ "گوشہ" ہوتا تو کیسا رہتا۔ ؟ ۱۴ نثار

جیسا کہ پیشتر عرض کر چکا ہوں مجھے آپ کا وہ خط نہیں ملا جس میں آپ نے میرے استفسار پر اشعار میں "آفاقیت" کا مفہوم واضح کیا تھا۔ آج ہی مجلہ صیب کا اکتوبر نمبر ملا اس میں آپ کا مضمون پڑھا۔ آپ کی عبارت یہ ہے:

"مسائل حیات و کائنات یا آفاقیت دونوں (یعنی تیر و فراق) میں سے ایک کے یہاں بھی نہیں جو چند اشعار اس قسم کے نہیں گئے وہ روایتی ہوں گے یعنی مشاہیر و مطالعہ کی بنیادوں پر نہیں لکھے گئے بلکہ ایک سنی سنائی بات کو نظم میں دہرایا ہے۔"

کیا آپ مثال میں تیر کے علاوہ کسی دوسرے اردو کے شاعر کے چند اشعار درج کرنے کی رحمت کوارا کریں گے جو آپ کے نزدیک آفاقیت کے معیار پر پورے اترتے ہیں اور جن میں سنی سنائی بات کو دہرایا نہیں گیا ہے؟ تاکہ ان کی بدخنی میں تیر کے آفاقی اشعار پر دوبارہ غور کرنے کے بعد مجھے اپنی رائے تبدیل کرنے کا موقع ملے۔

آپ کا اثر

کشمیری محلہ لکھنؤ - ۲۶/۱۲ - ۱۹۵۷ء

پیارے بھائی فاروقی - آپ کا ۲۳ تاریخ کا تحریر کردہ خط ۲۴ کو مل گیا۔ بے حد مسرت ہوئی۔ سلسلہ وار جواب عرض کرتا ہوں:-

۱۔ لذت عفو کا لغتاً معنا ہے کہ خطا پر خطا کرے کوئی میرا ترجمہ یہ تھا کہ ان کا خطا کرتا ہے اور خدا عفو کرتا ہے۔ اس خطا بخشی و خطا پوشی میں عافی کو وہ مرا ملتا ہے کہ اسی لذت اندوڑی و عفو کے لئے نہ کہ بر بنائے لذت گناہ وہ چاہتا ہے کہ خطا پر خطا کرتا رہے اور مستوجب رحمت ہوتا رہے۔ اس کی خواہش نے عمل کی صورت اختیار نہیں کی ہے۔ اس کے برخلاف کثرت عفو کثرت خطا پر ہی تو ہوگی پھر خطا پر خطا کرنے کی خواہش کا موقع کہاں رہا؟ میں نے جس طرح شعر موزوں کیا اس میں یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ ایک خطا بر بنائے لذت معنا ہے اور ایک خطا برائے لذت عفو ہے اور دونوں کی نوعیت میں بڑا فرق ہے۔ کثرت کا لفظ لانے سے یہ پہلو نہیں نکلتا۔ آپ کہتے ہیں کہ "لذت عفو تو عفو کرنے والے کو محسوس ہوتی ہے اور اس کا اثر خطا کار پر کیونکر ہوگا کہ خطا پر خطا کرے"۔ خدا رحیم ہے، کریم ہے، ستار ہے، غفار ہے، مختار کل ہے، بے نیاز ہے، میرے نزدیک اس کی ذات کو لذت سے متصف کرنا درست کیسا جایز نہیں۔ اس کے بعد سوال کا دوسرا حصہ پیدا نہیں ہوتا اور اس خطا پر خطا کرنے کے تقاضے کی توجیہ اوپر کر چکا ہوں۔

۲۔ اب کسے آواز دیجئے، بے کسی اسے بے کسی اک صدائے بازگشتی وہ بھی خواب آلود ہے بازگشت، بازگشت، بازگشتی سب صبیح ہیں۔ فارسی والا کہتا ہے:

بازگشتی کن تو چوں تیر ہوئی در جہاں گری جائے میری از ہمت بازگشتی ست

بازگشت اور بازگردادن ہیں۔ فارسی کا شعر ہے

گر خاک شود عدد و باز رود غافل نہ شوی کہ باز گردی دارد

اردو میں "بازگشتی آواز" نیز "بازگشتی تیر" برابر مستعمل ہے۔ "آواز بازگشت" سے اگر اضافت محاکا لیا جائے تو بازگشتی آواز ہی کہنا پڑے گا جو "بازگشت کی آواز" سے مختصر تر و ضمیم تر ہے۔ فارسی میں (ی) اکثر زاید بھی آتی ہے ایک صورت جواز کی یہ بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے اعتراض ہے کہ اردو کا کوئی شعر "بازگشتی" کے جواز میں یاد نہیں آتا۔ میں نے خود اکثر بازگشتی کی جگہ جہاں ممکن ہو اسے بازگشت ہی استعمال کیا ہے۔ مثلاً

آرہی ہے کان میں اپنی صدائے بازگشت نغمہ امروز شاید ساز فردا ہو گویا



# انسان کی تعمیر جدید

نسہ عایشہ (ایم۔ اے)

ڈاکٹر الکسس کیری (ALEX / SCARREL) فرانس کے مشہور مفکر نے اپنی بے مثل تصنیف MAN, THE UNKNOWN میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر خالص علمی نقطہ نظر سے بحث کر کے بتایا ہے کہ ہمارا جدید تمدن کس قدر غلط راہ پر چل رہا ہے اور انسان کو اس صنعتی تمدن کی پستی سے نکلنے کے لئے مشینوں کی دنیا سے ہٹ کر نہ صرف جسم بلکہ روح کی ترقی کی طرف توجہ کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر موسون کی اس کتاب نے مفکرین عالم کو حیرت میں ڈال دیا ہے اور وہ اس حقیقت پر غور کر رہے ہیں کہ انسان کو اپنی موجودہ مادی زندگی میں کس حد تک جدیدیوں کی ضرورت ہے اور ان کی نوعیت کیا ہونا چاہئے۔ یہ مقالہ ڈاکٹر موسون کے انہیں خیالات پر مبنی ہے جو اس کی مذکورہ بالا کتاب سے اخذ کئے گئے ہیں۔ (عایشہ)

کیا علم انسانی انسان کی تجدید کر سکتا ہے؟ اگر یہ سوال نصف صدی قبل کیا جاتا تو شاید لوگ اس کا مذاق اڑاتے لیکن اب یہ نتیجہ دہائی سے غور کیا جا رہا ہے۔

اس وقت سائنس نے دنیا کو بہت بدل دیا ہے۔ زندگی کے رازوں کو اس حد تک بے نقاب کر دیا ہے، اور ضرورت کے مطابق جسم اور روح کو نئے نئے سانچوں میں ڈھالنے کے اتنے گہرے بتا دئے ہیں کہ انسان بڑی حد تک خود اپنی قسمت کا بن بیٹھا ہے اور اگر وہ چاہے تو بالکل نیا انسان بن سکتا ہے۔

نسل انسانی کے لئے ایک نئے سانچے میں ڈھلنا آسان نہیں۔ اس کے لئے بہت سے دشوار گزار منزلوں سے گزرنا پڑے گا، نقاش کو اسے بے جان پتھر پر کسی مجسمہ کے اندوخال نمایاں کرنے کے لئے ہتھوڑے کی ضرب سے پتھر کو پاش پاش کرنا پڑتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ترقی یافتہ ممالک کے مفکرین مختلف ادوار میں انسان کے تنزل اور بڑی بڑی سلطنتوں کے کا سبب معلوم کرنے کے لئے یچین نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ اس علم سے آگے نہ بڑھ سکے کہ ہر کمال کے لئے زوال ضروری ہے۔ ان میں سے بعض مثلاً A. J. Toynbee وغیرہ ایسے ہیں جو اس کلیہ کے قائل نہیں اور ان کا خیال ہے کہ اگر ہم تاریخ سے لیں اور ان اسباب سے دور رہیں جو ماضی میں تباہی و تنزل کا باعث ہوئے تو یقیناً ہم اپنی تہذیب کو برقرار رکھ سکیں گے۔ پہلی چوتھائی صدی میں امریکہ کی غیر معمولی ترقی کے بعد جب اس کی مالیات و اقتصادیات کی شاندار عمارت گونا گونا شروع ہوئی تھی، اقتصادوں اور سیاست دانوں کو جو امریکہ کو ایک ناقابل زوال حکومت سمجھتے تھے۔ سخت جھٹکا لگا اور گونا گونا شروع شروع میں ہی اس کا یقین نہ آتا تھا لیکن آخر کار انہیں بھی اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا۔

سوال یہ ہے کہ امریکہ کی موجودہ حالت جس کو ہم تباہی سے تعبیر کرتے ہیں اس کے اسباب صرف مالی و اقتصادی ہیں یا کچھ (امریکہ کے ساتھ یورپ کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے) پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے دوران میں سلطنت برطانیہ

کا جھنڈا دنیا کے بہت سے ملکوں پر لہرانے لگا اور متعدد ممالک اس کے غلام بن گئے جس کی وجہ سے ان ملکوں کی اپنی کوئی تہذیب رہی اور نہ کوئی تمدن۔ لیکن دوسری جنگ عظیم ختم ہوتے ہی تاریخ کا ایک نیا ورق پٹا اور استعماری حکومت کی جگہ آزاد جمہوریہ نظام نے لے لی۔ یوریشیا (یورپ و ایشیا) کے سب سے بڑے ملک یعنی روس نے زار کے پنجے سے چھٹے ہی حکومت (جماعت عوام) کے سپرد کر دی اور اسی کے ساتھ بہت سے دوسرے ملکوں کے عوام بھی جاگ اٹھے اور چین نے بھی پہلے اپنے نظام حکومت کو بدل ڈالا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سلطنت برطانیہ کی طاقت گھٹنے لگی، سلطنت کے حدود سمٹنے لگے، وسط ایشیا و جنوبی مشرقی ایشیا کے ممالک کو آزادی بخشنے کے بعد یورپ کی طاقت گھٹ گئی۔ غرض کہ دیکھتے دیکھتے صرف روس و امریکہ دو مقابل فریق میدان میں رہ گئے۔ دونوں اخباروں کی سرخیاں ہم کو سرد جنگ کا پتہ دیتی رہیں اور اب بھی تیسری جنگ عظیم کا روح فرسا خیال ہمارے دیکھنے کھڑا کر دیتا ہے کیونکہ سائنسی ترقی کی وجہ سے امریکہ اور روس دونوں کے پاس ایسے ایسے جنگ جتھیاں موجود ہیں کہ وہ دفعتاً ساری دنیا کو ختم کر سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ تناؤ جو روس و امریکہ کے درمیان پایا جاتا ہے وہ ایک تیسری جنگ کا باعث ہو سکتا ہے لیکن پچھلی دو لڑائیوں کے تلخ تجربوں اور موجودہ سائنسی آلات حرب کے اندیشوں کی وجہ سے اس کا بھی امکان ہے کہ دونوں فریق جتنے الامکان نقطہ جنگ سے دور رہیں۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں اس بات کی بھی کوشش ہو رہی ہے کہ اس قسم کے ہلاکت آرا آلات ضرب قطعاً طیارہ کئے جائیں اور جو طیارہ ہو چکے ہیں ان کو نصاباً کر دیا جائے لیکن اس پر عمل آج تک ممکن نہیں جب تک فریقین کے دل سے برگمانیاں اور برگمانیوں سے پیدا ہونے والی سرگزشتیاں دور نہ ہو جائیں کیونکہ امن و سکون کے لئے دل کا صاف ہونا ہے اور یہ بات ابھی تک پیدا نہیں ہو سکی ہے۔

آج کی دنیا میں رسل و رسائل کی موجودہ ترقیوں کی وجہ سے تمام ممالک کے مسائل یکساں اہمیت اختیار کر چکے ہیں لیکن صورت حال یہ ہے کہ چند مخصوص جماعتوں نے ترقی کی راہوں کو اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے اور انسانیت عمومی طور پر ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ جسے کہ جمہوریہ نظام میں بھی صرف چند مخصوص لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہے اور وہی عوام کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کی تہذیبیں اور ان کی موجودہ حالت ہمارے سامنے ہے، لیکن اب سے دو ہزار سال بلکہ اس سے بھی پہلے بڑی بڑی تہذیبیں وجود میں آچکی ہیں۔ جو علوم و فنون میں اپنا مشن رکھتی تھیں (مثلاً مصر، روم، یونان) مگر آج یہ سب ختم ہو چکی ہیں۔

دلتوں کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان تہذیبوں کے علمبرداروں نے عروج و زوال کے اسباب کو سمجھا یا نہیں اور اگر سمجھا تھا تو زوال سے بچنے کی کوئی کوشش کی یا نہیں۔ لیکن ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت بہت سے ہمارے مفکرین اپنی اپنی جگہ ان کمزوریوں کا احساس کر رہے ہیں جو تہذیب و تمدن کی تباہی کا باعث ہو سکتے ہیں۔

رجائیت پسند لوگ ابتدائے تنزل ہی سے تنزل کے اسباب دور کرنے پر غور کر رہے ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ موجودہ تمدن ممالک کی تباہی کے اسباب خود ان سے متعلق ہیں۔ یاد دہرے ممالک کا طرز عمل ان کے انحطاط کا باعث ہے۔

دنیا کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی زندگی کی تیز رفتاری اور صنعتی اشیاء کے عدم توازن نے ہماری زندگی کے اقدار بدل دئے ہیں اور تبادلہ زر کے پیچیدہ طریقوں نے روپیہ کو موجودہ نظام میں بہت اہم بنا دیا ہے۔

مشرق و مغرب ہر جگہ کیفیت پرکیت اور روح پر مادے کا غلبہ بڑھ رہا ہے۔ برسرِ اقتدار لوگوں کے ہاتھ میں سیاسی و صنعتی

طاقتوں کے علاوہ دوسری جو سب سے بڑی طاقت ہے وہ روپیہ ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو عوام کے سامنے تہذیب و تمدن کا ایک خود ساختہ تصور پیش کرتے ہیں اور چونکہ لوگ زیادہ تر تقلید پسند ہوتے ہیں اس لئے وہ ان کی پیروی میں طرح طرح کے غیر ضروری و غیر اخلاقی و غیر جالیاتی اور تکلیف دہ فیشن اختیار کر لیتے ہیں، حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ کم خود خود کرنے کے بعد اپنی طرز زندگی میں تبدیلی پیدا کریں۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ انسانی سماج نے اپنی ذہنی گمراہی کی وجہ سے ہمیشہ بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں اور اس وقت بھی ان گمراہوں کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک طرف (اسٹیڈی کی کیفیت و کمیت) کے درمیان اور دوسری طرف روح اور جسم کے درمیان حد بندیاں قائم کر دی گئی ہیں جو گلیٹو کے تولیدی نظریے (Gelatine) کی غلط تعبیر کا نتیجہ ہے۔ گلیٹو نے چیزوں کی ابتدا صفات کو جو ابعاد اور وزن پر مشتمل ہیں اور جن کی پیمائش آسانی سے کی جاسکتی ہے ان ثانوی صفات سے الگ کر دیا ہے جو شکل، رنگ اور بو پر مشتمل ہیں اور جن کی پیمائش نہیں کی جاسکتی۔ اس میں شک نہیں کہ کمیت سے تعلق رکھنے والے علوم (ریاضی و ہندسہ وغیرہ) سائنس کے وجود و تعاون کا باعث ہوئے لیکن کیفیت کی طرف سے جو غفلت برقی گئی اس کے نتائج بہت خراب ثابت ہوئے۔ یعنی انسان کی ذہنی کمزوری جو کیفیت سے متعلق ہیں بروئے کار نہ آسکیں اور اخلاقی جذبات ابھرنے سکے کی وجہ سے انسان کا حیوانی عنصر غالب آگیا۔

گلیٹو کے بعد جب ڈیکارٹ نے جسم اور روح کو دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ظاہر کیا تو کمیت و کیفیت اور زیادہ زیادہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئیں اور روح کو مادہ سے الگ کر دینے کی وجہ سے مسائل روحانی نظریہ اندونوگے اور انسان نفس مادی ترقی ہی کو اصل چیز سمجھے لگا۔ اب صحیح راستہ اختیار کرنے کے لئے ہم کو ڈیکارٹ کے مادی نظریہ کو ترک کرنا چاہئے اور مادی مسائل میں از سر نو روح کو بھی جگہ دینی چاہئے۔

سائنس کو محض سائنس کے لئے اختیار نہ کرنا چاہئے بلکہ اس کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ روحانی و جسمانی دونوں فائدے حاصل ہوں اور زندگی میں جذبات کو بھی اتنی ہی اہمیت دی جائے جتنی مادی سائنس کے قوانین کو دیکھتی ہے۔ اس وقت سائنس کا مادی نظریہ ترقی کرتے کرتے آٹم تک پہنچ گیا ہے جس کا مقصد زیادہ تر ہلاکت بار آفات حرب ظہیر کرنا ہے اور سائنس کا یہ مادی نظریہ صدیوں سے متمدد انسان کے ذہن پر اس طرح چھایا ہوا ہے کہ اس سے پچھلے طور پر آزاد ہونا مشکل ہے۔ حالانکہ اس سے آزاد ہوئے بغیر اخلاقی، جالیاتی اور روحانی علوم کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

تاہم یہ احتیاط بھی ضروری ہے کہ کہیں مادی مسائل کو بالکل پس پشت ڈال دینے سے خراب قسم کا روحانی رد عمل نہ پیدا ہو جائے، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ فرانک کے نفسیاتی تجزیہ نے جن کا علم سطحی ہے اور جن کی تعداد بھی زیادہ ہے، سخت نقصان پہنچایا اور اس خدشہ سے بچنے کی صورت صرف یہ ہے کہ ہم تمام مادی و غیر مادی نظریوں سے علیحدہ صرف ان حقائق پر اعتماد کریں جو ذاتیات سے علیحدہ اجتماعی نقطہ نظر سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس میں شک نہیں اس وقت آرٹ اور سائنس کے ماہرین نے بہت ترقی کر لی ہے۔ لیکن ان سب کی معلومات کا ذخیرہ محض فنی تبصروں، کتابوں یا سائنس دانوں کے دماغوں تک محدود ہے۔ کسی ایک شخص ایک جماعت کو ان پر پورا پورا عبور حاصل نہیں۔ ہم کو چاہئے کہ ان تمام مختلف معلومات کو یکجا کریں اور اس کے لئے سائنسدانوں، مفکرین کو مل کر یہ سوچنا چاہئے کہ صحیح طریقہ کار کیا ہو سکتا ہے اور موجودہ اقتصاد، سیاسی، سماجی، دماغی یا جسمانی سرگرمیوں میں سب سے زیادہ اہم کو کنسی سرگرمی ہے، کس علم کو پہلے ترقی دینا چاہئے اور کس علم میں دوسرے علوم کو جذب ہونا چاہئے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے نفسیات اور علم طب کو لینا ہوگا۔

علم تشریح سے لیکر سیاسیات و اقتصادیات تک تمام علوم میں طب ہی ایک ایسا علم ہے جو بہت سی چیزوں پر مادی ہے پھر بھی انسان اس کو پورے طور پر سمجھنے سے قاصر ہے۔ کیونکہ موجودہ علم طب اپنے تنگ نظریوں کی وجہ سے مغلوب ہو گیا ہے۔ حالانکہ وہ بہت زیادہ پر اثر طریقہ پر انسان کی مدد کر سکتا ہے، مثلاً علم طب میں ہومیو پتھی ہی کو لیجئے جس میں نفس و روح کی طرف دھیان دیا جاتا ہے۔ لیکن ایلو پتھی طریقہ علاج کے ماہرین بہت دقت سے اس کی صحت کو تسلیم کرتے ہیں۔

اگر طب کو اس طرح ترقی دی جائے کہ اس میں دوسرے علوم انسانی بھی شامل ہو سکیں تو وہ ایسے افراد پیدا کر سکتا ہے جو نہ صرف جسم اور اس کی ساخت بلکہ کائناتی اور سماجی دنیا کے ساتھ فرد کے تعلقات کو بھی معلوم کر سکیں۔ **علم انسانی کو ترقی دینے والے ادارے** جدید تعمیر انسانیت کے لئے ایسے اداروں کی ضرورت ہے جہاں فطری قوانین کے مطابق جسم و دماغ کی تربیت کی جائے۔ جہاں مختلف تعلیمی نظریہ رکھنے والوں کے تعصبات کا اثر ایک دوسرے پر نہ پڑ سکے۔ اس کے لئے الگ اداروں کی ضرورت نہیں۔ موجودہ اداروں سے کام لیا جاسکتا ہے اور اس مہم کی کامیابی بعض ملکوں میں حکومت پر موقوف ہے اور بعض ملکوں میں خود عوام کے طرز عمل پر۔ گزشتہ زمانہ میں چند افراد کی کوششوں سے مذہب، سائنس اور تعلیم کو ترقی ہوئی۔ نئی تحریکات جو ضرورت کے احساس کا نتیجہ ہوتی ہیں عام طور پر ابتدا میں حکومت ان کی مالی امداد نہیں کرتی۔ لیکن جب وہ ترقی کر لیتی ہیں تو حکومت بھی اس طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔

تعمیر انسانیت کا ادارہ بھی جب ترقی کر لے گا تو حکومت اس کا ساتھ دے گی۔ رفتہ رفتہ اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں بھی اس کام کی اہمیت کو جان لیں گی۔ چنانچہ امریکہ میں اس ضرورت کے لحاظ سے بہت سے تعلیمی ادارے اس پر کام کر رہے ہیں تاہم تعمیر انسانیت کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ان کو ایک مرکزی مشترک حیثیت دینا ہوگی۔ باوجود بہت سی ترقیوں کے انسان سے متعلق ہمارا علم ابھی تک ابتدائی حالت میں ہے اور بہت سے اہم مسائل کا حل ابھی تک نہیں دریافت ہو سکا ہے۔ مگر ان مسائل کا حل ضروری ہے۔ کیونکہ لاکھوں افراد اور تمدن کا مستقبل انہیں مسائل کے حل سے وابستہ ہے۔ لیکن یہ کام بڑا دیر طلب ہے کیونکہ انسانی ترقی کی رفتار بہت سست ہوتی ہے اور اس کے مطالعہ کے لئے سائنسدانوں کو فیصلہ بعد نسل عرصہ تک کام کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔

انسان کی تعمیر کا کام قوانین فطرت کے مطابق ہونا چاہئے۔ اور ماحول کے ذریعہ سے افراد کی ذہنی و جسمانی تربیت ہونی چاہئے۔ فرد کو اس کی ذہنی، اخلاقی اور عملی کمزوری سے بچانا چاہئے۔ جو جدید حالات زندگی کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔ ہمیں سماجی ڈھانچہ اور مادی و دماغی پس منظر دوبارہ بنانا ہوگا لیکن دشواری یہ ہے کہ سماج و فقہا کسی انقلاب کو قبول نہیں کرتا۔ جب کوئی غیر معمولی صورت ذہنیت میں انقلاب پیدا کرنے والی سامنے آتی ہے تو سماج چمکتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ نئے اثرات قبول کرتا ہے۔

یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی ایک چھوٹا گروہ اپنے نظام کی مضبوطی سے افراد کو پابند اخلاق بنا لیتا ہے اور اپنے سوسائٹی کے نقصان دہ اثرات کو دور کر دیتا ہے۔ یہ طریقہ نیا نہیں ہے۔ انہیں کی بدولت انسانیت مختلف ادوار میں زندہ رہی ہے۔ ایسے ہی گروہوں کی برکت تھی کہ قرون وسطیٰ میں سخت ترین عملی اور دماغی تربیت کے پابند قائم رہیں اور ان کے لئے بہت سے لوگوں نے جان کی قربانی بھی دی۔ کسی فرد کی ترقی کی تربیت جسمانی اور تربیت ذہنی دونوں پر منحصر ہے اور ان دونوں باتوں کا اختلاص دقت طلب ضرور ہے، مگر ناممکن نہیں۔

اس لئے ہمیں ان منتخب افراد کو الگ چن لینا ہوگا جو ذہنی و جسمانی طور پر معیاری کہلائے جاسکتے ہوں۔ کیونکہ نہ ہم کمزوروں کی تعداد کو روک سکتے ہیں اور نہ بیمار و ناقص بچوں کو ہلاک کر سکتے ہیں۔ اس لئے کمزور افراد کی تعداد کو کم کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے، وہ یہ کہ طاقتوروں کی تعداد بڑھائی جائے۔ ناقابل لوگوں کو طبعی حالات پر لانے کے متعلق ہماری کوششیں بیکار ہوں گی۔ اعلیٰ درجہ کی قوتیں رکھنے والے بچوں کو عمدہ کر لینا چاہئے اور آئندہ ان کے مزاجوں کے موافق ان کی اعلیٰ تربیت و تعلیم کا انتظام ہونا چاہئے۔ اس طرح ہم اچھے افراد پیدا کر سکیں گے جو آئندہ چکر قوم کی ذہنی دولت ثابت ہوں۔

صحیح انداز اور توانا انسان کی پیدائش کو قائم رکھنے کے لئے نہ صرف نسل انسانی کا علم بلکہ اخلاق و کردار کے صحیح معیار کا ہونا بھی اہم ضروری ہے لیکن انسوس ہے کہ آج کل باوجود علمی ترقیوں کے ہم اس حقیقت سے بے خبر ہیں اور اسی لئے آج متحدہ اقوام میں پیدائش کی شرح میں تواضع ہوتا جا رہا ہے لیکن اخلاقی معیار گنا جاتا ہے یہاں تک کہ عورتوں میں بھی شراب اور تاناکا کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ اور وہ اپنی نزاکت برقرار رکھنے کے لئے سیج و توانا رکھنے والی غذاؤں بھی ترک کر رہی ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ پیہلش و کٹے کے لئے مصنوعی ذرائع استعمال کرتی ہیں جن کا آئندہ نسل پر بڑا خراب اثر پڑتا ہے۔

نسلی برتری کو قائم رکھنے کے لئے شادی سے پہلے میاں بیوی کا طبعی معاینہ ضروری ہے، ہو سکتا ہے اس سلسلہ میں جذباتی قربانیاں کرنا پڑیں۔ لیکن سماجی و انفرادی اصلاح کے لئے اتنا ایثار تو گوارا کرنا ہی پڑے گا۔

**افراد کی تشکیل میں طبعی و کیمیائی اسباب کا اثر** علم انسانی کی بدولت ہم میں کم از کم اتنی اہمیت ضرور پیدا ہوگئی ہے اسے اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالیں۔ فی الحال ہمارے پاس تین طریق کار ہیں۔ پہلا طبعی اور کیمیائی اسباب پر مشتمل ہے جو ہمارے اعصاب و دماغی ساخت میں قطعی تبدیلیاں پیدا کر سکتے ہیں۔ دوسرے کا تعلق ماحول سے ہے یعنی ماحول میں مناسب تبدیلیوں سے انسان کے اندر صحیح جذبات و حرکات کی اہمیت پیدا کی جائے۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ نفسیات کے ذریعہ طبعی میلانات و رجحانات میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ یہ آخری طریقہ پہلے دونوں سے مشکل ہے اور اس کا علم ابھی ابتدائی منازل میں ہے۔

ہمیں پوری طرح نہیں معلوم کہ غذا کا اثر دماغی اور فعلیاتی سرگرمیوں پر کیا ہوتا ہے۔ لیکن غذا کی کثرت و کیفیت سے شعور ضرور متاثر ہوتا ہے اور ممکن ہے کسی دن کوئی سائنسدان معمولی بچوں کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا کرنے کا طریقہ معلوم کرے اور اگر ایسا ہوا تو یہ اس کی بڑی کامیابی سمجھی جائے گی۔ کیونکہ انسان کی برتری محض اس صلاحیت پر موقوف ہے جو طبعی طور پر نہ سازگار حالات کا مقابلہ کرنے میں ہماری مدد کر سکے۔

**دماغی اسباب کی ترقی کے لئے کام میں لایا جاسکتا ہے۔** اس کے دو طریقے ہیں ایک کا تعلق شعوری حرکات سے ہے اور دوسرے طریقہ میں وہ ذرائع داخل ہیں جو غور و فکر و ذہنی یکسوئی سے تعلق رکھتے ہیں۔ انسان کی تعمیر میں دماغی تربیت اہم چیز ہے اور اس کے لئے ہمیں اچھے اساتذہ اور اچھی کتابوں کی ضرورت ہے تاکہ انسان کی سماجی اور اقتصادی دنیا کو خود اس کی ذات کے مطابق بنانا چاہئے نہ کہ اس کو ماحول کا غلام بنا دیا جائے۔

**صحت** دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک قدرتی دوسری مصنوعی۔ علم طب نے انسان کو متعدی بیماریوں سے محفوظ کر دیا ہے۔ لیکن یہ صحت مصنوعی ہے، حالانکہ انسان کو ایک ایسی فطری صحت کی ضرورت ہے جو اسے متعدی اور نسلی تباہی لانے والی بیماریوں سے محفوظ رکھے اور یہ مقصد اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ خود

یہ اندر بغیر دواؤں کی مدد کے دفع امراض کی اہمیت پیدا ہو جائے۔ پچھلے چالیس سال میں زہر مار اور جراثیم کش دوائیں نسولین، ڈرنالین، تھائی راکسن وغیرہ) نیز سنگھیا کے مرکبات، ہارمونز، وٹامن وغیرہ ایسی چیزیں دریافت ہو چکی جو فطری قوتوں کو ہيجان میں لانے کی قدرت رکھتی ہیں اور بلاشبہ کیمیا اور علم طب کی یہ کامیابی بہت اہم ہیں۔ لیکن سب نوعی صحت پیدا کرنے والی ہیں اور حقیقی صحت وہی ہے جو بغیر ان دواؤں کے حاصل ہو سکے یا ہم خود طبعا بغیر ان دواؤں کے امراض کو دفع کر سکیں۔

**خصیت کا نشوونما** موجودہ زندگی میں شخصی خصوصیات کے ابھرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے بلکہ اندھی تقلید نے ہم کو غلط راہوں پر ڈال دیا ہے۔ عورتیں مرد بننے کی کوشش کر رہی ہیں اور مرد عورتوں کا سائنس پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ ابتدا ہی سے مرد کو مرد کے فرائض اور عورت کو عورت کے فرائض جانا چاہئے، اگر ماں، باپ اور اساتذہ بچوں کے کردار کی لیل میں اپنے فرائض اچھی طرح انجام دیں تو یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ آج کل اسکول کی تعلیم امر کی تربیت پر ترجیح دی جا رہی ہے اور اسکول کی تعلیم ہرگز گھریلو تعلیم کا بدل نہیں ہو سکتی۔

موجودہ سوسائٹی کے لئے ضروری ہے کہ وہ شخصیت اور شخصیتوں کے فطری اختلافات کو بھی تسلیم کرے اور اسی فرق کی پرورہ ہر شخص سے جدا جدا کام لے۔ مگر سوسائٹی نے اس وقت سب کا حق مساوی قرار دے کر انفرادی خصوصیات کو ختم کر دیا ہے انسان کو اس وقت چار طبقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، مالدار، عالم، کسان اور اوسط درجہ کے لوگ۔ یہ تقسیم مالی حیثیت کی گئی ہے اور جسمانی دشواری برتری کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہمارا کثرا دی تمدن ایک طرف ذہانت کو بڑھنے دیتا اور دوسری طرف ان لوگوں کو بھی کبل ڈالتا ہے جو جذباتی نرم دل، نازک طبع اور حسن کے پرستار ہوتے ہیں تاکہ ان کے لئے بھی سازگار ماحول پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے بعد جراثیم پیشہ لوگوں کا مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے ساج پر جو جمع بنے ہوئے ہیں۔ اسی سلسلہ میں امن کا خیال ہے کہ قید خانوں و پانگل خانوں پر روپیہ خرچ کر کے ان کو زندہ نہ کی کیا ضرورت ہے؟ اور کیا وہی دولت و محنت جو ان پر صرف کی جا رہی ہے قابل افراد پر صرف کر کے زیادہ فائدہ مند نہ ہوگی؟ ان یہ فیصلہ بے رحمانہ ہے۔ ہم کو چاہئے کہ جرم اور دیوانگی کو تعلیمی و سماجی کوششوں سے روکیں اور جراثیم پیشہ لوگوں کو ایسے اداروں میں رو دیں جہاں وہ سماج کو نقصان پہنچائے بغیر زندگی کے دن پورے کر سکیں۔

**مافی کائنات** اگر انسان علی اور ذہنی توازن قائم رکھنے رکھ سکے تو اس کی دنیا یقیناً بدل سکتی ہے کیونکہ دنیا ہمیشہ اپنے آپ کو ہمارے نظریہ کے مطابق بنالیتی ہے۔ فعلیاتی اور جسمانیاتی احساس ہمارے ذات کے وہ پہلو ہیں ان کی سرگرمیوں کی شدت کے ساتھ کائنات کا حسن بھی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ پھر کہیں نہ ہم اس حسن کو زیادہ دلکش بنائیں گی طرف غور کریں مادی دنیا اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھنے کے باوجود انسان کے لئے تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ حالانکہ ہم مادے کے ابعاد میں دو نہیں ہیں اور مکان و زمان سے بھی آگے بڑھ سکتے ہیں۔

ہم ابھی تک جامد مادہ کی دنیا میں خود ہیں اور اپنی فطری و ذہنی نشوونما کے قوانین کو کوئی وقعت نہیں دے رہے ہیں۔ یہ ری عقل کی کوتاہی اور اپنے آپ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں۔ اسی ناواقفیت نے گزشتہ تمدن تباہ کئے ہیں اور یہی ہمارے موجودہ تمدن کو بھی تباہ کر دے گی اگر ہم نے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے روحانی و اخلاقی خصوصیات سے کام نہ لیا۔

**نیت** تاریخ اسلامی ہند کے سلسلہ میں اڈیٹر نگار نے یہ وقت مرحب کی تھی جس میں اسلام سے مسلمانوں کے تمام اہم تاریخی واقعات بقید سنہ پیری کیا کر دئے گئے ہیں۔ تاریخ کے طلبہ کے لئے بڑی کارآمد چیز ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصل۔ منیجر نگار

# اُردو ادب میں روایت اور بغاوت کی اہمیت

محمد منشی رضوی ایم۔ اے (علیگ)

زندگی کے اور شعبوں کی طرح ادب میں بھی روایت اور بغاوت کی بڑی اہمیت ہے۔ روایت اور بغاوت کی عدم موجودگی میں ادب کا تاریخی تسلسل اور ارتقا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ایسا نہ ہوتا تو عہدِ حاضر کے ادب کو اُس ادب سے کسی معنی میں ممتاز قرار نہ دے سکتے جو انسانی سماج کے بچپن کی یادگار ہے۔ روایت ہی وہ بنیاد ہوتی ہے جس کی مدد سے انسان فن کی اُس بلند سطح پر فخر سے وقفہ میں پہنچ جاتا ہے جہاں تک انسانیت ہزاروں برس میں پہنچی ہے۔ ہر ماضی اپنے فنی اور ادبی خزانہ کی ملکیت اپنے ورثہ کے لئے چھوڑتا ہے وہ اپنے سماجی حالات کے مطابق ڈھالتے ہیں اور اپنے سماجی اور فنی شعور کے نقطہ نظر سے اس میں نئے اضافے کرتے ہیں۔ یہ بات چند مثالوں کی مدد سے اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے۔ چینی کے برتنوں کی جو خوبصورت اور فن کارانہ ڈیزائنیں آج ہمارے سامنے ہیں وہ تنہا ایک دور کی پیداوار نہیں بلکہ کئی ادوار کی ترقیوں اور اضافوں سے گزر کر ہم تک پہنچی ہیں۔ اس دور کے فن کاروں نے اپنے ماضی قریب کے فن کاروں کے طیارے کئے ہوئے مہینے کے برتنوں کو مٹیوں بنا کر تجربے کئے جن کی تھوڑے دنوں میں اپنے حسن اور خوبصورتی اور بعض حالتوں میں افادیت کی وجہ سے مستقل حیثیت بن گئی اسی طرح ماضی قریب کے فن کاروں سے چینی کے برتنوں کی بعض ڈیزائنیں مٹی تھیں جنہیں بنیاد بنا کر اپنے طبعی میلانات اور سماجی حالات کے مطابق انھوں نے نئے نئے اضافے کئے تھے اور انھیں خوبصورتی اور فنکاری کی ایک خاص حد تک لائے تھے اسی طرح ایک لائق تاجی سلسلہ نظر آتا ہے۔ یہی عمل دوسرے فنون میں بھی کارفرما نظر آتا ہے چنانچہ ادیب اور شاعر بھی اپنے پیشروں کی تخلیقات کو بنیاد بنا کر نئے تجربات کرتے ہیں سب سے پہلی بات تو انھیں اپنی روایت سے یہی بنتی ہے کہ وہ اپنے فن کی کلنگ کا علم حاصل کرتے ہیں۔ اپنے سے زیادہ پرانے اور تجربہ کار ادیبوں اور شاعروں سے انھیں ادب اور شاعری کے وہ اصول ملتے ہیں جن پر پورا اترنے کے بعد ہی کوئی تخلیق ادب و شعر کا درجہ حاصل کر سکتی ہے۔ یہیں سے ادب میں روایت کی اہمیت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ادبی تاریخی زمانی اور تمدنی طور پر ادبی تسلسل کا ایک سلسلہ ہے جس میں ہر ایک اپنے سے پہلی دلی نسل کے چھوڑے ہوئے فن اور مواد کو اپنے دور کے سماجی حالات کے مطابق نئے طریقوں پر ڈھالتی ہے اور ایک نئی زندگی اور صورت عطا کرتی ہے۔ ادب کا حال اُس کے ماضی کا خزانہ ہوتا ہے۔ اس حال میں روایت اور بغاوت دونوں کی جنگاویں موجود رہتی ہیں۔ ایک طرف اُس میں ماضی کی روایت کے وہ تمام صحت مند عناصر جذب رہتے ہیں جن کی بنیاد کے بغیر تخلیق وجود میں نہیں آ سکتی تھی دوسری طرف اُس میں وہ نیا پن اور زندگی کے جدید عناصر موجود رہتے ہیں جو نئے اقتصادی و سماجی حالات اور رجحانات کے سبب اُس میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے اگر ادب کا علمی مطالعہ کیا جائے تو ہمیں محسوس ہو گا کہ ہر اچھی اور صحت مند ادبی تخلیق میں جہاں ایک طرف بغاوت کی برہم زنی کارفرما نظر آتی ہے وہیں روایت کی نقش آرائی اپنی جھلکیاں دکھلاتی ہے۔ ادب میں اگر روایت کی بنیاد نہ ہوتی تو ہر تخلیق اتنی ہی غیر زرب اور غیر برقی یافتہ ہوتی جتنی کہ وہ انسانی سماج کے ابتدائی دور میں ہو کر تھی اور عدم بغاوت کی صورت میں بھی ادبی اور فنی ارتقا رک جاتا اور کسی طرح

دست اور ترقی ناممکن سی چیز ہو جاتی۔ ایک معمولی ادیب اور بلند پایہ ادیب میں یہ فرق ہوتا ہے کہ معمولی درجہ کا ادیب روایت ہی پر تکیہ کر لیتا ہے یا صرف بغاوت کو فن کی جان سمجھتا ہے۔ پہلی صورت میں اس کی تخلیقات بڑی غیر متحرک پڑ جاتی ہیں کیونکہ وہ اپنے عہد سے پیچھے رہ جاتی ہیں دوسری صورت میں اُس کا فن اُس دلکشی، حسن اور ترقی اور نظم و ضبط سے محروم رہ جاتا ہے جنہیں وہ اپنے پیشروؤں کے کارناموں سے حاصل کر سکتا تھا اور آسانی سے انداز سے پیدا ہونے والے فن سے ہم آہنگ کر سکتا تھا۔ کوئی ادیب اور شاعر اور فنکار عملی معنوں میں روایت سے بالکل باز ہو کر کوئی بالکل نئی نئی بات وجود میں نہیں لاسکتا اُسے کسی نہ کسی معنی میں اُس مواد سے سہارا لینا ہی پڑتا ہے جو اُس سے تسلسل جھوٹ جاتی ہیں یا جو اُس کے ساج کے یا خود اُس کے تجربہ کا مظہر ہوتا ہے، بہر حال یہ بات بالکل صاف ہے کہ روایت کو ترک کر دینے اور اُسے یکسر نظر انداز کر دینے کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ کوئی شخص روایت م عناصر سے اپنی تخلیق کو بچا سکتا ہے بلکہ ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں شخص نے روایتی عناصر میں سے زیادہ سے عناصر سے اپنا دامن بچایا ہے مثلاً اُس میں جب مستقبل پرستی (Futurism) کی وابستگی سے پھیلی تو لایا کو فنیکی س کے دوسرے ہمنواؤں نے روایت کی اہمیت اور افادیت سے قطعی انکار کر دیا۔ ان لوگوں نے ادبی اصولوں پر ہی کو اس کے ترک کر دیا کہ اُن کے خیال میں ادبی اصول تخلیقی تحریک (Creative Impulse) کو برون کی طرح اکر دیتے ہیں۔ یہی نہیں اُن لوگوں نے پرانی ادبی اور شاعرانہ زبان کو بھی نئی زندگی کی رفتار کے لئے بہت کمزور ورڈ اسٹوکی، ٹپکن اور ٹائٹل کے کارناموں کو نئے دور کی برقی رفتار میں بالکل بے سود اور بے جان سمجھ کر رادیا۔ روایت کی اس پامالی سے ادب اور فنون لطیفہ میں جو انتشار اور بد نظمی پھیلی اُسے جلد ہی محسوس کر سکے یٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹی نے اربو لائی سٹوڈنٹ کو ایک تجربے کے ذریعہ روایت کے صحتمند عناصر کے استراام اور اُن سے اٹکھانے کے سوال پر بہت زور دیا۔ مستقبل پرست نظریاتی طور پر تو روایت کو پوری طرح ترک کر دینے پر تیار ہوئے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ادب اور شاعری کی بعض بنیادی روایتوں سے اُن کا دامن بھی محفوظ نہیں گا۔ روایت سے یکسر بے تعلقی ناممکن ہے۔ کسی نہ کسی صورت میں ہر فنکار کو روایت کا سہارا لینا پڑتا ہے کوئی اُسے غیر شعری پر اپناتا ہے اور کوئی علم اور شعور کے ساتھ۔ انٹلکٹ نے فلسفہ پر تجربہ کرتے ہوئے ہر عہد کے فلسفہ کے بارے میں حقیقت اس اہمیت پر زور دیا ہے۔ تاریخی روایت نے زندگی کے تمام شعبوں میں روایت کی اہمیت اور افادیت پر زور دیا لہذا اس کے نزدیک روایت کی اہمیت کو جدید لاتی طریق کار کی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔ روایت کا تعین پیداوار کے وں اور طبقاتی رشتوں سے ہونا چاہئے ورنہ وہ ایک بے جان اور بعض حالات میں ترقی کی راہ میں مزاحمت پیدا والی چیز بن کر رہ جائے گی اور صحت مند بغاوت کے عناصر سے ہم آہنگ ہو کر نیکر و شکر نہ ہو سکے گی کسی اچھے نظام اور کسی بلند پایہ اور اہم ادبی تخلیق کا لازمی اور بنیادی وصف ہونا چاہئے۔

اُردو ادب بھی ادبیات عالم کی طرح روایت اور بغاوت کا ایک سلسلہ ہے۔ کہیں پرانی صورتوں اور پرانے دیں ہکا سا اضافہ نظر آتا ہے اور کہیں اتنی زبردست تبدیلی نظر آتی ہے کہ روایت کی بنیادیں آنکھوں سے اوجھل نے لگتی ہیں۔ جب ہم جدید لاتی طریق کار کی روشنی میں اُردو ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو روایت اور بغاوت کے نشانات کہیں م اور کہیں نمایاں طور پر ایک دوسرے سے متعلق نظر آتے ہیں۔ اُردو شاعری میں نظریہ اکبر آبادی ایک باغی کی حیثیت رکھتے اس کے بہت سارے اسباب ہیں۔ انھوں نے غزلیں ضرور کہیں مگر زیادہ توجہ ایسی نظموں کی طرف جو اُن سے پہلے اردو شاعری غریباً نہ ہونے کے برابر تھیں۔ انھوں نے اُردو شاعری میں ایسی منظر نگاری کا آغاز کیا جو بے لاگ خارجیت سے بھری ہوئی

ہے۔ اُن کے کلام سے اردو شاعری میں ارضیت کی بنیاد پڑی جس نے آگے چل کر اسے قوت حیات اور سماجی نصب العین عطا کیا۔ اپنے موضوعات کے اعتبار سے انھوں نے ایسی زبان اور ایسے اسالیب اختیار کئے جو بڑے عوامی، سادہ اور ٹھیکہ تھے اور اس دور کے بعض مقدس اور جہیں نقادوں کی نظر میں کوئی قدر و قیمت نہ رکھتے تھے چنانچہ شیفتہ کی نگاہ میں نظیر اکبر آبادی کی شاعری کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ مواد اور مہیت کے بنیادی اور لازمی تعلق سے ناواقف لوگ نظیر کی عظمت اور اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ صرف اُن اسالیب کی اہمیت اور خوبی کو پہچانتے تھے جو اس وقت تک غزل میں استعمال ہوتے چلے گئے تھے اور مشکل یہ تھی کہ اُن کی نگاہ میں حرکت اور ترقی کا صحیح تصور نہیں تھا جس کی وجہ سے پرانے اور بندھے ٹکے اسالیب کو سب کچھ سمجھ بیٹھے تھے اور اُن میں کسی قسم کی تبدیلی اور اضافہ کو گناہ خیال کرتے تھے۔ انھوں نے یہ تو دیکھ لیا کہ نظیر اکبر آبادی کی شاعری روایت سے کتنی ہٹی ہوئی ہے لیکن یہ نہ دیکھ سکے کہ اُس کی بنیاد روایت عظمیٰ میں کس حد تک پیوست ہے اور اس مضبوط اور مستند روایت میں موضوع اور صورت کے اعتبار سے کتنے نئے اور اچھے اور بلند تجربوں کا خون دیا گیا ہے۔ انھیں بغاوت کا علم تو ہو گیا لیکن انھوں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اس بغاوت کے اسباب کیا ہیں اور یہ بغاوت بھی ایک روایت کی بنیاد پر کھڑی ہوئی ہے۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ نظیر نے عوام کی سماجی زندگی اور اُن کے روزمرہ کے اوقات اور احساسات کے اظہار کے لئے جو زبان اور جو انداز بیان اختیار کیا اُس میں بہت سے ٹھیکہ الفاظ، ٹھیکہ محاورے اور ٹھیکہ مثالیں، ٹھیکہ تشبیہ، در استعارے استعمال ہوئے تھے مگر بنیادی طور پر اگر اُن کی زبان پر غور کیا جائے تو ہمیں محسوس ہوگا کہ انھوں نے یہ تمام سہانی اور اسلوبی اضافے ولی دکنی ہی کی زبان کی بنیاد پر کئے تھے۔ انھوں نے اپنی زبان اور انداز بیان کے تمام نقوش اپنے سے پہلے کے شاعروں سے حاصل کئے تھے اور اسی بنیاد پر اپنی شاعری کی نئی، مضبوط اور خوبصورت عمارت کی تعمیر تھی۔ اگر ادب اور شاعری میں ایسی بغاوتوں کا وجود نہ ہوتا تو آج اُس کی حیثیت ایک ایسے راگ کی ہوتی جسے بار بار سن کر طبیعت عاجز آگئی ہو اور پھر سننے کا قطعی جی نہ چاہتا ہو۔ اُس میں وہ تنوع اور رنگارنگی نہ ملتی جس سے آج ساری دنیا کا ادب مالا مال ہے لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اگر ادبی بغاوتوں کی بنیاد ادبی روایتوں پر نہ ہوتی تو اولاً تو وہ وجود میں آہی نہیں سکتی تھیں کیونکہ فلاں میں کسی چیز کی تخلیق ہو ہی نہیں سکتی اور بغرض محال وہ وجود میں آ بھی جائیں تو اپنے زبردست مزاج، انتشار اور ابہام کا شکار بن جاتیں کہ صحیح الدماغ آدمی کی فہم سے باہر ہو جاتیں۔

نظیر کے ساتھ ساتھ غالب کا نام بھی باغیوں کی فہرست میں لیا جاتا ہے لیکن ان کی بغاوت صرف فکر کی بغاوت ہے اور انداز بیان اور اسالیب میں ایسا ہلکا تغیر ہے کہ جو محسوس نہیں ہوتا۔ غالب در باری زندگی سے وابستہ ہونے کے باوجود اپنے لہجہ کے سماجی اور اقتصادی نظام کے کھوکھلے پن کو اچھی طرح محسوس کر رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ انفرادی زندگیوں میں وابہات کی پامالی اور مستقل طور پر ترسنے والی جو کیفیت پائی جاتی ہے اس کے اسباب سماجی نظام ہی میں پوشیدہ ہیں چنانچہ ان کے ترکش میں طنز کے جو تیر تھے ان سے وہ اکثر کام لے لیتے تھے۔ فکر و خیال کی آزادی اور بانگیں نے ان خصوصیات کے لئے میں کہیں دور نہیں جاتا ہے بلکہ تصوف کے اُن عناصر پر نگاہ ڈالنی ہے جس کے اثر سے غالب کے چشیر و شعرا انسانیت کی عظمت اور اہمیت کے گہمت کا چپکے تھے، انسانی آزادی اور روحانی وصف کو اصل حقیقت اور جوہر قرار دے چکے تھے۔ غالب کے یہاں فکر کی جو بغاوت پائی جاتی ہے اُس کی روایتیں تو صوفی شعرا کے یہاں ملتی ہیں لیکن خود غالب کی یہی بغاوت حالی، آزاد در اقبال کے لئے ایک روایت بن کر سامنے آئی جس کو انھوں نے اپنے سماجی حالات اور میلانات کے مطابق ڈھال کر اپنی ادبی خداوتوں کے لئے بنیاد بنایا۔ غالب نے اپنے زمانہ میں غزل کی تنگ دامانی کا شکوہ کیا تھا اور اپنے بیان کے لئے کچھ اور وسعت اصطلاح کیا تھا اُن کے شاگرد حالی نے محمد حسین آزاد کی ہمراہی میں بیان کی اس وسعت کے لئے ادبی بغاوت کا آغاز کر دیا اور

شہسواروں میں مصرع طرح کے بجائے مختلف "موضوعات" پر نظمیں لکھ کر پڑھنے کا رواج شروع ہوا۔ اردو ادب میں یہ سب سے اہم بغاوت تھی کیونکہ حالی، آزاد اور شبلی نے جہاں اصلاحی نظمیں کہنے کا رواج عام کیا وہیں سرسید کی قیادت میں انہی لوگوں کو اپنا ادبی سادہ رواں، سلیس اور علمی نثر لکھنے کی بنیاد بھی پڑی۔ یہ بھی دہنائے ادب کا ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ جس طرح شاعری کی اس بغاوت کی روایت نظیر کے ساتھ ساتھ غالب کے کلام میں ملتی ہے اسی طرح نثر میں جو بغاوت شروع ہوئی اُس کی روایت نے انصاری بھی میرامن کے ساتھ ساتھ غالب کے یہاں ملے ہیں۔ اس چیز سے غالب کی بے پناہ ادبی صلاحیت اور عظمت کا اندازہ ہوتا ہے ابھی اور جس ادبی بغاوت کا ذکر ہوا ہے اس کی اردو شاعری اور اردو نثر دونوں میں بڑی اہمیت ہے۔ اب تک اردو شاعری پر داخلی اور انفرادی جذبات اور احساسات کے اظہار کا عنصر چھایا ہوا تھا اور کبھی کبھی اجتماعی احساسات اور خارجی مناظر کی تصویر کشی کی جو کوششیں ملتی ہیں ان کی حیثیت انفرادی کوششوں سے زیادہ نہ تھی۔ سرسید کی قیادت میں اردو شاعری اور اردو نثر دونوں کی فکر اور اسلوب کا بڑا سرمایہ ہاتھ آیا۔ شاعری میں زندگی کی سماجی رفتار کے ساتھ چلنے کا حوصلہ پیدا ہوا اور سماجی نصیحتیں اور گہرے اور سنجیدہ مقاصد کی آمیزش سے ایک طرح کی گہری سنجیدگی اور نئی قوت حیات آگئی۔ مواد اور صورت دونوں اعتبار سے اُس کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کوششوں نے ایک زبردست اور جاندار تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اسی طرح اردو نثر میں جس پر اب تک عموماً اردو شاعری کا غلبہ تھا اور جس میں نثر کے اپنے فن اور فن سے زیادہ شاعری کا اثر اور حسن کا رفرقا تھا اپنے مقام اور اپنے علم کا شعور پیدا ہوا۔ اردو نثر میں اس تحریک کے اثر سے وہ صلاحیت آئی کہ داستان کوئی سے بہت آگے بڑھ کر تنقیدی اور علمی مضامین، سوانح نگاری، تاریخ اور دوسرے سماجی، نثرانی اور طبی علوم کے اظہار پر قادر ہو گئی۔ اردو زبان میں ابھی بلند اور سنجیدہ نثر کی جو کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی اس ادبی بغاوت کے اثر سے بڑی حد تک وہ جگہ پوری ہو گئی۔ اس تحریک میں جہاں بغاوت کی اہمیت واضح ہوتی ہے وہیں روایت کی اہمیت کا پتہ بھی چلتا ہے۔ بغاوت نے جو برکتیں عطا کیں ان کا ذکر ابھی ابھی ہوا اور روایت کا جہاں تک تعلق ہے صرف اتنا عرض کر دینا غائبانہ کافی ہوگا کہ اگر حالی، شبلی، آزاد، سرسید، ندیم احمد اور ذکاؤ اللہ کے سامنے غالب، نظیر اور انیس کی شاعری اور میرامن اور غالب کے نثری کارناموں کی روایت نہ ہوتی تو ان کی تخلیقات میں جو خوبصورتی، دلکشی اور تنظیم اور اپناؤ ملتا ہے وہ مفقود ہوتا۔ یہ روایت ہی کا طہنیل تھا کہ بغاوت میں بھی تجرباتی پہلو کے باوجود پختگی اور نظم و ضبط کا پتہ چلتا ہے۔ آگے چل کر جب بین الاقوامی اور ملکی حالات نے اقبال کو متاثر کیا اور پریم چند پر اثر ڈالا تو ان لوگوں نے اپنی ادبی تخلیقات کے لئے اپنے پیشروں کی روایت ہی کو سینہ سے لگا لیا۔

اٹھویں صدی کی تیسری دہائی میں جبکہ نئی پیداواری قوتوں کی بنیاد ہندوستان میں مستحکم ہو چکی تھی اور ان کے ساتھ ساتھ نئے پیداواری روابط اچھی طرح نمودار ہو چکے تھے ملک میں بیداری کی ایک نئی لہر دوڑنے لگی۔ یہاں کے عام لوگوں کو مجبوریوں کا شعور ہو چکا تھا اور وہ غلامی کی زنجیریں توڑنے کی فکر میں تین من و دھن سے ملے ہوئے تھے۔ دوسرے ملکوں میں جمہوری تحریکوں اور عوامی طاقتوں کو جو کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں ان کا اثر بھی ہندوستان پر پڑ رہا تھا اور ہر لمحہ یہاں کی سیاسی اور اقتصادی جدوجہد میں شدت اور تیزی بڑھتی جاتی تھی۔ ان حالات کا اثر اردو ادب پر بہت گہرا پڑ رہا تھا۔ اُن کی جھلکیاں اقبال اور جوش کی شاعری اور پریم چند کے افسانوں میں نظر آتی ہیں۔ دونوں کی تخلیقات میں ایک نیا پن اور نئی حس ہوتی ہے مگر دونوں نے اس نئے پن کے باوجود اپنے سماجی حالات اور طبیعتی میلانات کے مطابق اردو ادب کی قدیم روایتوں کے صحت مند عناصر سے اپنے فن کی تخلیق کے لئے مواد حاصل کیا تھا۔ اقبال کے معنوی استاد غالب تھے مگر انھیں نظیر اکبر آبادی اور انیس اور حالی سے بھی فیض اُٹھایا تھا۔ اسی طرح جوش، نظیر اکبر آبادی اور انیس سے بے حد متاثر معلوم ہوتے

ہیں اور پریم چند، میرامن اور نذیر احمد سے۔ بین الاقوامی حالات جب زیادہ پیچیدہ ہو گئے اور فاشزم کے بھیانک دیو سے تمام دنیا کی جمہوری اور عوامی تحریکیں اور قومیں خطرہ میں پڑ گئیں۔ اس وقت ساری دنیا کے جمہوریت پسند اور باشعور ادیبوں کی صفوں میں تنظیم شروع ہوئی کیونکہ اس خطرہ کی موجودگی میں امن، تہذیب اور فنون لطیفہ کا وجود برقرار رہنا ناممکن ہو گیا۔ اسی تنظیم کے تحت لیکن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ۱۹۳۶ء میں ہندوستان میں بھی پڑ گئی، اس تحریک کے تحت اُردو ادب میں دوسری تنظیم بغاوت شروع ہوئی۔ یہ بغاوت پہلی سے زیادہ اہم، شدید اور دور رس تھی۔ اُس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس کے فیض سے ادب کے مادی تصور کی بنیاد پڑی۔ ”ادب کے مادی تصور“ نے ادب اور زندگی کے گہرے تعلق کا احساس پیدا کیا۔ ادب اور سماج میں جو رشتہ ہوتا ہے اس پر علمی روشنی ڈالی۔ ادب اور اقتصادیات میں جو تعلق ہوتا ہے اس کی نوعیت اور ماہیت کا شعور پیدا کیا۔ اُردو ادب میں یہ زبردست انقلاب تھا جس کی وجہ سے اسالیب اور موضوعات میں بہت سے اضافے ہوئے۔ اس تحریک کے ابتدائی دور میں جذباتیت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، چنانچہ بہت سے ترقی پسند فنکاروں نے اس دور میں اپنی اچھی روایتوں سے بھی منہ موڑنے کی کوشش کی تھی، نتیجہ کے طور پر اُن کے فن میں وہ خوبصورتی، دلکشی اور چاؤ نہ پیدا ہو سکا جو انہیں باشعور اور خوشیار ترقی پسند فن کاروں کے یہاں ملتا ہے، جنہوں نے روایت کے صحت مند عناصر کو اپنی فکر میں جذب کر کے اپنے فن کی تخلیق کی تھی۔ اس دور میں جہاں زبردست ذہنی انقلاب نظر آتا ہے وہیں ہیئت اور اسالیب میں بھی بڑا تغیر ملتا ہے۔ مجاز، جذباتی اور کیفی کے یہاں ہیئت میں تبدیلی کا بالکل احساس نہیں ہوتا مگر خیالات کے اعتبار سے بہت نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ فیض، مخدوم، دامتق اور سردار جعفری کے یہاں بعض نظموں میں خیالات اور مواد کے ساتھ ساتھ ہیئت میں بھی تبدیلی نظر آتی ہے۔ مگر یہ سب کے سب غالب، انیس، اقبال، نظیر اکبر آبادی اور جوش وغیرہ سے اپنے طبعی میلانات اور سماجی رجحانات کے مطابق کسی نہ کسی حد تک ضرور مناتے ہیں۔ یہی حال کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس وغیرہ کا ہے ان کی تحریروں میں روایت کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ سب پریم چند سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ آزاد اور معری نظموں کا آغاز بھی ہوا۔ ان اصناف سخن کو اگرچہ ابھی تک مقبولیت نہ حاصل ہو سکی مگر دو چار نظمیں ایسی ضرور آئی ہیں جنہوں نے نقادان سخن کو متاثر کیا ہے اور داد و صول کی ہے بہت سی تجزیوں کے اس انبار میں بھی روایت اور بغاوت کا وہی قدرتی قانون کارفرما نظر آتا ہے یعنی جن شاعروں نے روایت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے اُن کے تجربے زیادہ کارآمد پر اثر اور خوبصورت شکل میں برآمد ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ان۔ م راشد، سردار جعفری، مخدوم، علی جواد زیدی اور دامتق کے نام لئے جاسکتے ہیں اس کے برخلاف میراجی اور تصدق حسین خالد کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

اس مختصر سے ادبی جائزہ سے غالباً اچھی طرح واضح ہو گیا ہو گا کہ ادب کا صحیح ارتقا بغاوت کے ناممکن ہے اور ہر بغاوت کی بنیاد کسی دوسری روایت ہی پر ہوتی ہے کیونکہ ایسا ہونا ناگزیر ہے۔ کوئی ادب خلا میں ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔ ہر فنکار کو اپنے فن کی تخلیق کے سلسلہ میں کسی نہ کسی بنیاد کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ اچھے اور بُرے فن کار اس بنیاد پر نئی تعمیر کرتے ہیں۔ روایت کو آگے بڑھاتے ہیں اُسے نئے امکانات سے روشناس کرا کے ترقی کی راہ پر لگاتے ہیں۔ جو اس بات کو نہیں سمجھتے وہ ادب اور فن کے ارتقا کی رفتار کو روکنا چاہتے ہیں اور روایت پرستی کے طلسم میں گرفتار ہو کر اپنی ادبی تخلیق کو سرد اور بے جان بنا دیتا جاتے ہیں۔ شہیک اسی طرح جو لوگ بغاوت کے زعم میں روایت سے بالکل قطع تعلق کر لینا چاہتے ہیں، وہ علی طور پر اہل قانون ایسا کر نہیں پاتے دوسرے یہ کہ روایت سے صحیح واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے ان کی ادبی تخلیقات میں حسن، نظم و تربیت اور توازن کا کاہتہ محسوس چلتا۔ روایت اور بغاوت کی اس اہمیت کو جدہ لیاقتی طریق کار کی روشنی میں دیکھنا اور اپنی ادبی تخلیقات میں ہمیشہ اس کو یاد رکھنا ہر ادیب کا فرض ہے۔

# اسلام اور عورت

(پروفیسر ڈاکٹر) سعید حسن (الہ آباد یونیورسٹی)

اسلام نے عورتوں کی اصلاح کے لئے کیا کوشش کی اور ان کے کیا حقوق قائم کئے؟ اس کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ظہور اسلام کے وقت عرب و دیگر اقوام کی عورتوں کے حالات پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے۔ یہودیوں میں باپ کے گھر لڑکی کی حیثیت نوکروں کی تھی۔ بچپن میں باپ لڑکی کو فروخت کر سکتا تھا، باپ کی وفات کے بعد بیٹے کو بھی یہی حق حاصل تھا۔ بت پرست عرب، جو اپنے ماحول اور پڑوسی اقوام کے طرز عمل سے متاثر تھے، عورت کو مال و متاع سمجھتے اور شوہر کی وفات کے بعد بیویاں بیٹوں میں ترکے کی طرح تقسیم کی جاتی تھیں۔ سوتیلی ماں اور سوتیلے بیٹے میں ازدواجی رشتہ بھی جایز تھا۔ اسلام نے اس رسم کو نہایت صحیح اور مذموم قرار دیا اور اس قسم کے رشتوں کو نکاح الحقت کے نام سے موسوم کیا۔

یمن کے مخلوط نسل یہودی اور صابیوں میں متعدد شوہر ایک بیوی کی رسم بھی رائج تھی۔ زمانہ جاہلیت میں بعض عرب قبیلوں کو لڑکیوں سے اس قدر نفرت تھی کہ وہ ان کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ قبیلہ کنذہ اور قریش میں خاص طور سے یہ رسم جاری تھی۔ اسلام نے اس سفاکانہ طرز عمل کو سختی سے ممنوع قرار دیا۔ فارس اور روم کی سلطنتوں میں بھی عورت کی اجتماعی زندگی نہایت پست و خوار تھی۔ مسیحی مذہب میں بھی عورت کی چنڈاں وقعت نہ تھی، بلکہ مسیحی مذہبی رہنما عورت کو بہت سی خرابیوں کا سرچشمہ خیال کرتے تھے، اور عورتوں سے ارتباط روحانی زندگی کے منافی تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں عورتیں ترکے سے عموماً محروم قرار دی جاتی تھیں۔ اسلام نے عورتوں کے حقوق مقرر کئے۔ اور ان حقوق کا لحاظ رکھنے کی سخت تاکید کی۔ عورت کے لئے ترکے میں حصہ لازمی قرار دیا۔ چنانچہ عورت، ماں، بیوی اور بیٹی تینوں حالت میں ترکے میں حصہ دار قرار دی گئی اور اس کے مقررہ حصہ کو بغیر کسی بیچ یا عدالت کی مداخلت کے دئے جانے کا حکم دیا گیا۔ عورت کو اس کے ذاتی مال پر شوہر اور بھائی اور باپ کی طرح کئی اختیار دیا گیا۔ چنانچہ وہ اپنے مال کو بغیر کسی کی مداخلت کے خرچ کر سکتی ہے یا جس کو چاہے دے سکتی ہے۔

اجتماعی اور تمدنی زندگی میں عورت کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اسلام نے اجتماعی زندگی میں عورت کو قابل احترام قرار دیا۔ اور اس کو وہی حقوق دیے، جو مردوں کو حاصل تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو عورتوں کے احترام کا اس قدر خیال ہوا کہ وہ آپ کی صاحبزادی کو خاتونِ جنت اور فاطمہ الزہراء کے نام سے یاد کرنے لگے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول سے کہ ”الجنة تحت اقدام امہاتکم“ (جنت تمہاری ماؤں کے پیروں کے نیچے ہے)۔ ان کے رتبہ کو نہایت بلند کر دیا۔ عورتوں کو تعلیم دینے اور تعلیم حاصل کرنے کی ہدایات کی گئیں۔ آپ نے خود امہات المؤمنین کو مسلمان عورتوں کی تعلیم کی ہدایت فرمائی۔ اسلام کی ان ہدایات کا نتیجہ یہ ہوا کہ شروع اسلام میں ایسی عورتیں ہوئیں، جو تعلیمی لحاظ سے ممتاز تھیں، مثلاً حضرت عائشہ، جو تاریخ و فقہ، انساب اور روایت شریعہ میں مشہور تھیں۔ حضرت عائشہ کے متعلق خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: ”خذوا النصف دینکم عن ہذہ الحمیراء“۔ یعنی نصف دین تم اس حمیراء یعنی حضرت عائشہ سے سیکھ لو، حضرت عائشہ کی ہمیشہ اسما بنت ابوبکر رضی اللہ عنہ روایت حدیث میں مشہور تھیں۔ عبداللہ ابن زبیر کی شہادت کے بعد حجاج ابن یوسف اور

حضرت اسامہ سے جو گفتگو ہوئی اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کس قدر فصیح و بلیغ تھیں۔

ابتداءً اسلام ہی سے عورتوں نے سیاسی اختلافات میں بھی حصہ لینا شروع کیا۔ جنگ جمل میں حضرت عائشہ نے فوج کی قیادت کی۔ حضرت علی اور امیر معاویہ کے درمیان دوران جنگ میں عورتوں نے اپنی پر اثر تقاریر سے لوگوں کو جنگ میں شرکت کے لئے براہِ گنجینہ کیا۔ ام الخیر بنت حریف البارقہ۔ زرقاد بنت عدی۔ عکرمہ بنت الاطرش۔ سنان بنت النخعیہ وغیرہ کے خطبات تاریخ میں موجود ہیں۔ عورتوں کو تعلیم دینے کی ہدایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغداد، اٹلس اور مصر کی تاریخوں میں سیکڑوں ایسی مشہور عورتیں پیدا ہوئیں جو علمی استعداد و اہلیت میں کسی طرح میں مردوں سے کم نہ تھیں۔ ایسی عورتوں کے حالات پر متعدد زبانوں میں متعدد تصانیف موجود ہیں۔

امام ابو حنیفہ نے، جن کی زیادہ تر اہل سنت پیروی کرتے ہیں، عورت کے لئے عہدہ قضا بھی جائز قرار دیا۔ چنانچہ اسلام میں ایسی عورتیں بھی ملیں گی، جنہوں نے امور سلطنت میں بھی حصہ لیا۔ اور لوگوں کی فریادوں کو سنا، اور ان کے معاملات کا فیصلہ کیا مثلاً خیزران وغیرہ۔ امام ابو حنیفہ نے جو حق عورتوں کو آٹھویں صدی عیسوی میں دیا، اس کو بہت سی تمدن قومیں بیسویں صدی تک بھی نہ دے سکیں۔

اسلام نے ازدواجی زندگی کے متعلق بھی صریح ہدایت فرمائی۔ اسلام سے قبل بہت سی قوموں میں ازدواجی زندگی کے متعلق صریح ہدایت موجود نہ تھیں، اور اگر موجود تھیں، تو ان کی چنداں پروا نہ کی جاتی تھی۔

بالغ عورت کو اپنی شادی کے معاملہ میں کئی اختیار دیا۔ بالغ عورت کی شادی بغیر اس کی رضا مندی کے کوئی شخص کسی سے نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ بادشاہ کو بھی حق نہیں ہے کہ زبردستی بالغ عورت کی شادی کسی سے کر سکے۔ عورت کے لئے قہر مقرر کیا اور کسی کوئی خاص حد مقرر نہیں کی۔ عورت کا نان نفقہ مرد پر لازم قرار دیا۔ اسلام نے حسب ذیل آیت کے مطابق چند قریبی رشتہ داروں سے ازدواجی رشتہ حرام قرار دیا۔

**تعدد ازواج کی جائزگی** اسلام کے لئے باحیث طعنہ و تشنیع خیال کرتے ہیں۔ قبل اس کے کہ اس پر رائے زنی کی جائے، اس زمانہ کے عرب اور غیر عرب قوموں کی ازدواجی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔ ظہور اسلام سے قبل تعدد ازواج کی رسم عرب اور دوسری قوموں اور مذہبوں میں کسی نہ کسی شکل میں رائج تھی۔ مسیحی سلطنت نے تعدد ازواج کو ممنوع قرار دیا۔ لیکن مسیحیت اس کے انسداد میں کہاں تک کامیاب ہوئی، اس کی شاہد تاریخ ہے۔ اس ممانعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک باضابطہ بیوی کے علاوہ اس کی وہ داشتہ دار عورتیں بھی بیوی کا کام دیتی تھیں۔

فارس کی حالت بھی چنداں بہتر نہ تھی۔ یہاں بھی شادی کے لئے کوئی مقرر طریقہ نہ تھا اور نہ تھا بھی تو اس کی کوئی پروا نہ کرتا تھا۔ قدیم عربوں اور یہودیوں میں عارضی شادی کا طریقہ رائج تھا۔ جس کی اسلام نے اصلاح کی کوشش کی۔ اور تعدد ازواج کو بیک وقت چار تک محدود کیا۔ لیکن کلام مجید میں جہاں ایک، دو، تین، چار سے بیک وقت شادی کی اجازت ہے، وہیں یہ بھی

لے اسے لوگو! تمہارے لئے حرام کی گئیں تمہاری ماٹیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بھتیجیاں، تمہاری بھانجیاں، اور تمہاری خالائیں اور مانیاں اور تمہاری وہ ماٹیں، جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہے اور دو عورتیں جو تمہارے دودھ پچھ کی وجہ سے تمہاری بہنیں ہیں، پتے تم نے انکی حقیقی یا رضاعی ماں کا دودھ پیا ہو، یا انہوں نے تمہاری حقیقی یا رضاعی ماں کا دودھ پیا ہو۔ تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری پردوش ہیں اور ان کی ماں سے تم نے صحبت کی ہو، اگر تم نے ان کی ماں سے صحبت نہیں کی تو شادی میں کوئی گناہ نہیں، اور تمہاری ان بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری نسل سے ہوں، اور اس کی بھی ممانعت ہے کہ دو رضاعی داشتہ کی بیویوں کو ساتھ میں کر دو، لیکن جو پہلے ہو چکا ہے۔ جنگ اندلس کو جتنے

ہے اور رحمت کرنے والا ہے۔

تاکید ہے۔ ”وان نعتم الا تعدوا فواحده“ اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ عدل و کرم کے تصور ایک پر اکتفا کرو۔ لفظ عدل کی اہمیت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ عدل سے مراد کھانے، پینے، لباس وغیرہ کے علاوہ محبت و التفات وغیرہ میں بھی مساوات تھا پھر دیگر جن بات میں مساوات آسان کام نہیں، اس لئے عدل کی مشکلات کو مد نظر رکھتے ہوئے خداوند تعالیٰ فرماتا ہے :-

”لن نستطيع ان تعدوا بين النساء ولو حرصتم فلا تميلوا كل الميل فتذروها كالمعلقة“ تم سے یہ بھی نہ ہو سکے گا کہ تم بیویوں میں برابر کی رکنہ سکو۔ گو تمہارا کتنا ہی جی چاہے، تو تم ایک ہی طرف بالکل نہ جھک جاؤ اور اس کو معلق چھوڑ دو۔ اسلام میں تعدد ازواج کے جواز اور سختی سے عدل کی ہدایت کو مد نظر رکھتے ہوئے بھی یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ تعدد ازواج کا انحصار بہت کچھ وقوع حالات اور مالی پائیدار ہے۔ عورتوں کو خراب نتائج اور مصائب سے بچانے کے لئے بعض اوقات اجتماعی حالات کی بنا پر تعدد ازواج لازمی ہو جاتا ہے۔ یورپ کے بعض مصلحین کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ یورپ میں اخلاقی فواحش اور بدکاریاں بعض وقت محض عورتوں کی بے کسی اور افلاس کی وجہ سے پھیلیں۔ بہر حال اگر آغاز اسلام کے ماحول کو بغور دیکھا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ اگر اس وقت خاص شرائط کے ساتھ تعدد ازواج کو جائز کرنے کے بجائے یک دم ختم کر دیا جاتا، تو اقتصادی معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں کس قدر خلل واقع ہوتا۔

رسول اکرم کے زمانہ میں اور اس کے بعد مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ میں کس قدر لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ ان لڑائیوں میں بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ مسلمانوں کی بقاء نسل اور شہداء کی عورتوں کی کفالت بھی ضروری تھی۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو ان عورتوں کو ان کے مردوں کے شہید ہونے کی وجہ سے کن تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ مردوں کی لڑائی میں شہید ہو جانے کی وجہ سے عورتوں کو شوہر نہیں ملتے تھے، ان حالات میں سوا اخلاقی پستی کے اور کیا ہوتا؟ جن لوگوں نے پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنی کی اخلاقی پستی کی حالت دیکھی ہوگی، ان پر بخوبی واضح ہوگا کہ جنگ کے بعد عورتوں کے لئے لڑائی کے بعد کیا برے نتائج جوتے ہیں۔ اس کے علاوہ فرض کیجئے کہ ایک عورت بیمار اور بالجمہ ہے، اپنے شوہر کو مصلحتاً یا اچھے تعلقات کی وجہ سے چھوڑنا نہیں چاہتی، اور اس کو زندگی کی ضروریات سے بھی محروم نہیں کرنا چاہتی، اس حالت میں کیا چیز بہتر ہوگی۔ بہر حال اسلام نے حالات کے تقاضوں کے مطابق بعض شرائط کے ساتھ تعدد ازواج کو جائز رکھا۔ لیکن فکری ارتقاء اور دنیا کے برستے ہوئے حالات کے تحت تعدد ازواج کی رسم خود بخود ختم ہوتی جاتی ہے۔ اسلامی ممالک میں بھی آج کل تعدد ازواج کی رسم بہت کم ہے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ حالات ختم ہو جائیں گے، جن کی بنا پر تعدد ازواج جائز قرار دیا گیا تھا، تو تعدد ازواج کی رسم بھی ختم ہو جائے گی۔ جہاں موجودہ مہذب ملکوں کی طرح عورتوں کے کمانے وغیرہ کے ذرائع موجود نہ ہوں، وہاں اب بھی تعدد ازواج مفید ثابت ہوگا۔ بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ چونکہ شرعی اجازت ہے، اس لئے حالات تعدد ازواج کا کیسے الحاد کر سکتے ہیں؟ اور تعدد ازواج کی رسم قطعی کیسے نیست و نابود ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قانون میں ٹپک اور گنجائش تو خاص قوانین کی بات ہے۔ یہ تو اسلام کے قوانین کی خوبی ہے کہ وہ مہذب اور غیر مہذب دونوں کے حالات کے مطابق ہیں اور انسانی تمدنی ارتقاء کے لحاظ کو بھی وہ پس پشت نہیں ڈالتے۔ چنانچہ اس نظریے کے مطابق ممکن ہے کہ کہیں ایسے حالات پیدا ہوں کہ وہ تعدد ازواج کی زندگی مصائب کا پیش خیمہ ہو جائے۔ اسلامی قوانین میں بعض شرائط کے ساتھ تعدد ازواج کی اجازت اور اگر ان شرائط کا لحاظ نہ رکھا جائے تو ممانعت ہے۔ ارتقائی مراحل اور ایک غیر مہذب اجتماعی ماحول کو پیش نظر رکھتے ہوئے شارح علیہ السلام نے خاص شرائط کے ساتھ تعدد ازواج کو جائز قرار دیا تھا۔ جہاں تمدنی ترقی اور فکری ارتقاء کی وجہ سے ایسا ماحول ہوگا کہ تعدد ازواج کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، تو تعدد ازواج کے جواز سے لوگ خود بخود غلط فائدہ نہیں اٹھائیں گے آج کل بہت کم مہذب لوگ ہیں جو تعدد ازواج پر عامل ہیں۔ ظاہر ہے، ماحول اور حالات کی بنا پر ایک سے زیادہ بیویاں

ہونا اخلاقی پستی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ حضرت موسیٰ اور حضرت داؤد کے ایک سے زیادہ بیویاں تھیں۔ کون یہ کہہ سکے کی جرات کر سکتا ہے کہ وہ نیک چلن نہ تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تعداد ازواج معیوب نہیں خیال کیا جاتا تھا دوسرا مسئلہ جس پر مخالفین اسلام کو باعث طعنہ و تشنیع قرار دیتے ہیں، وہ مسئلہ طلاق ہے۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو بہت سی قدیم اقوام میں طلاق کی رسم تھی، اور طلاق کے معاملہ کا کئی اختیار مردوں کو تھا، اور عورت کو طلاق حاصل کرنے کا بالکل اختیار نہ تھا۔ یہودیوں میں شوہر اپنی بیوی کو باہم نا اتفاقی کی وجہ سے بہت آسانی سے طلاق دے سکتا تھا اس اختیار کو استعمال کرنے کے لئے کوئی پنجابی یا عدالتی فیصلے کی ضرورت نہ تھی۔ عورت مرد سے طلاق طلب نہیں کر سکتی تھی کچھ عربی کے بعد شقیون نے طلاق کے قواعد کی اصلاح کی طرف توجہ مبذول کی۔ لیکن پہلی قدیم رسم پر سختی سے عامل رہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہودیوں میں پہلی قوانین رائج تھے، جن کے لحاظ سے عورتوں کو طلاق دینا قریب قریب ایسی ہی رائج تھا، جیسا کہ بت پرست عربوں میں۔ افسوس میں بھی اسرائیلیوں کی طرح مرد کو طلاق دینے کا اختیار تھا۔ رومیوں میں بھی طلاق دینے کا اختیار زمانہ قدیم سے رائج تھا۔ چنانچہ ان کے مشہور بارہ الواحی قوانین اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ رومیوں کے متعلق ان کے بعض مداحین کا خیال ہے کہ شہر روم کے قائم ہونے کے بعد ۵۰ برس تک انھوں نے طلاق کے اختیار کو استعمال نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ دھنسی کہ رومیوں کا سلوک عورتوں کے ساتھ دوسری قوموں سے بہتر تھا۔ بلکہ ان کو اختیار تھا کہ معمولی خطا کے ارتکاب پر بھی موت کی سزا دے سکیں۔ چنانچہ ان کو طلاق کی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی۔ اگر عورت "مفادق" علیحدگی کی خواہش ظاہر کرتی، تو محض خواہش کا اظہار جرم قرار دیا جاتا تھا۔

حضرت عیسیٰ کا یہ فرمانا کہ "جس کو خدا نے لایا ہے، اس کو کوئی جدا نہیں کر سکتا"۔ اس بات کا قطعی ثبوت نہیں خیال کیا جا سکتا کہ حضرت عیسیٰ نے طلاق کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ حضرت عیسیٰ کا اس قول سے اخلاقی پستی کا روکنا مقصود تھا۔ شاید حضرت عیسیٰ کو اس وقت یہ خیال نہ گزرا ہو کہ ان کے بعد لوگ طلاق کو مطلقاً ناجائز قرار دیں گے۔ چنانچہ بعض مسیحی اقوام کا طلاق کو جائز کرنا اس کا ثبوت ہے کہ حضرت عیسیٰ کا ان الفاظ سے طلاق ناجائز کرنا مقصود نہ تھا۔ چنانچہ بعد کے بعض مصلحین نے حضرت عیسیٰ کے ان الفاظ سے طلاق ناجائز کرنا مقصود نہ تھا۔ چنانچہ بعد کے بعض مصلحین نے حضرت عیسیٰ کے ان الفاظ کی جو ایک غیر مجرب قوم کے اجتماعی حالات کی بناء پر بیان کئے گئے تھے، اندھی تقلید نہیں کی۔ چنانچہ ان الفاظ کو طلاق کے ناجائز قرار دینے کا اٹل قانون نہیں قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحی سلطنتوں میں بھی طلاق کو جائز قرار دیا گیا۔

ظہور اسلام سے قبل عربوں میں بھی شوہر کو طلاق کے متعلق غیر محدود اختیارات حاصل تھے اور اس زمانہ میں عورتوں کے ساتھ سلوک میں کسی قسم کی انسانیت اور انصاف کا پتہ نہیں چلتا۔ اسلام نے عورت خاص صورتوں میں طلاق کو جائز فرما کر قرار دیا، لیکن طلاق کے متعلق رسول اکرم کا خود مشہور قول ہے: "ابغض الخلال عند اللہ الطلاق" یعنی خدا کے نزدیک حلال چیزوں میں بدترین چیز طلاق ہے، اگر مرد اور عورت میں کوئی جدائی کی خاص وجہ نہ ہو، اور باہمی تعلقات اچھے ہوں تو طلاق ممنوع ہے۔ بلکہ طلاق اس حالت میں تحریم کی حد تک خیال کی جاتی ہے۔ امام ابو حنیفہ نے بغیر معقول سبب کے طلاق کو حرام قرار دیا ہے۔ ان کے قول کے مطابق بغیر کسی معقول سبب کے طلاق نقصان کا باعث ہے اور نقصان کے متعلق رسول اکرم کا قول ہے "لا ضرر ولا ضرار" نقصان اٹھاؤ اور نہ نقصان پہنچاؤ،

نیز یہ حادثہ کی بیوی زینب بنت جحش، زید کو اذیت پہنچاتی تھیں، اور ان کی توہین کرتی تھیں۔ لیکن رسول اکرم، زینب کو زینب کو طلاق دینا پسند نہیں کرتے تھے، اور زید کو مشورہ دیتے تھے کہ: "اسک علیک زوجہ و الحق اللہ" اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھو اور خدا سے ڈرو۔

طلاق کے جواز کے اسباب کے متعلق فقہاء میں اختلاف ہے۔ ابن عابدین کا قول ہے کہ طلاق تحریم کی حد تک ممنوع ہے اور صحت اس حالت میں جائز ہے، جب تباہی اخلاق اور باہمی خصوصیت وغیرہ کی وجہ سے ایک دوسرے کی جدائی ناگزیر ہو جائے۔ نیز شرعی حاجت کے طلاق جائز نہیں۔ ”فان اطلعنکم فلا تبغوا علیہن سبیلاً“ یعنی اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو تم ان کے خلاف نہ دھونڈو۔

لذت نفس کے لئے طلاق دینا نہایت برا خیال کیا گیا ہے۔ چنانچہ رسول اکرم نے ایسے لوگوں پر جو باق کے جواز سے وسوسہ رانی کے لئے فائیدہ اٹھاتے ہیں، لعنت بھیجی ہے ”لعن اللہ الذواقین والذواقات“ یعنی خدا چکینے والے مردوں اور عورتوں پر لعنت بھیجے۔ اس کے علاوہ خداوند تعالیٰ نے اس کی علاوہ خداوند تعالیٰ نے اس کی بھی تاکید کی ہے کہ شوہر اور بیوی نے باہمی اختلافات دوسرے کے سامنے پیش کئے جائیں۔ شاید اس طرح کوئی صلح کا راستہ نکل آئے۔ ”وان خفتم شقاقینہما فابغوا حکمتا من اہلہ و حکمتا من اہلہا ان یریداصلاحاً لعلتوا فیہما“ یعنی اگر اوپر والوں کو دونوں میں بیوی کی کشاکش کا اندیشہ ہو، تو تم لوگ بیچ مرد کے خاندان سے اور ایک بیچ عورت کے خاندان سے بھیجو، اگر ان کو صلح کرانا منظور ہوگا اللہ تعالیٰ میاں بیوی کے درمیان اتفاق کر دے گا۔

طلاق دینے کے لئے ہدایت ہے کہ وقفے کے ساتھ تین مرتبہ طلاق دی جائے، تاکہ اس طرفین کو صلح کا کافی موقع ملے۔ رد و طلاق کے درمیان وقفے میں کوئی صلح کا موقع نہ نکلے، تو تیسری طلاق دیکر باہمی جدائی اختیار کر لے۔ ”الطلاق مرتین اساکم بمعروف او تسریحاً باحسان“۔ یعنی طلاق دو مرتبہ دی جائے، اس کے بعد یا تو اچھے طریقے سے باہم رہیں یا خیر و خوبی سے علحدہ ہو جائیں۔

دے دے طلاق دینے سے جو عورت کو نقصان پہنچتا ہے اس کی تلافی کافی کی گئی ہے، اور ایسے قواعد بنائے گئے ہیں کہ ہاں تک ممکن ہو، طلاق دینے سے باز رکھیں اور مرد و عورت کے تعلقات محض کھیں نہ بن جائیں۔ عورت کا پورا قہر ادا کرنا لازمی قرار دیا گیا، اور اس کی خاص ہدایت کی گئی کہ علیحدگی کے وقت فہم میں سے کچھ کمی نہ کی جائے۔ ان ہدایات میں ظاہراً مصلحت بھی ظہور ہوتی ہے کہ ایک بیوی کو طلاق دینے میں مالی نقصان اور دوسری شادی کرنے میں مزید صرف شاید ایسی صورت پیدا دے جو مرد کو طلاق دینے سے باز رکھے۔

”ان اردتم استبدال زوج مکان زوج و آتیتم احد لہن قسطاً رزقاً تاخذوا منہ شیباً اناخذونہ“ بھٹا ناؤ اٹھا مینا۔ یعنی اگر تم ایک بیوی کے بجائے دوسری کرنا چاہو، اور تم اس کو انبار کا انبار مال دے چکے ہو، تو تم اس سے کچھ واپس مت لو۔ کہا تم اس کو بہتان رکھ کر اور صریح گناہ کے مرتکب ہو کر لیتے ہو؟ عورت کے ساتھ تنگ سلوک اور رعایت کی خاص تاکید کی گئی ہے اور ازدواجی رشتے کے ختم کرنے میں ظلم و تعدی، منافقت کی گنجیم ہے۔ ”عاشروہن بالمعروف فان کرہتموهن فغسی ان نکرہوا شیئاً و یجمل اللہ فیہم کثیراً“ ”مئی عورتوں کے ساتھ خوبی سے سلوک کرو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں۔ ممکن ہے کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو، اور اللہ تعالیٰ اس کے اندر بڑی نفست رکھ دے۔“ چنانچہ مذکورہ بالا حدیث ”الغرض الحلال عند اللہ الطلاق“ اس آیت کی تریدید کرتی ہے طلاق کا اختیار عموماً مرد کو دیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ ازدواجی رشتہ زیادہ تر مرد پر مبنی ہے۔ کیونکہ کفالت اور اولاد پرورش کا مرد ذمہ دار ہے۔ اس لئے غیر ذمہ دار کے ہاتھ میں طلاق کا اختیار دینا ناخوش سے خالی نہ ہوتا۔ لیکن سہی کے ساتھ عورت کو بھی اختیار ہے کہ اگر ضرورت مجبور کرے، تو شوہر سے علیحدگی کا مطالبہ کر سکتی ہے اور نقصان کی تلافی کر دے، جو اس سلسلے میں شوہر کو پہنچے۔ عورت کو یہ بھی اختیار ہے کہ شادی کے وقت شوہر سے علیحدگی کے متعلق

معاہدہ کر کے طلاق کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام نے عورتوں کے ساتھ بد معاہدگی اور بد سلوکی کی نہایت سختی کے ساتھ ممانعت کی ہے، تاکہ لوگ ان کا جہ یا مال وغیرہ نہ چھین لیں۔ ”لا تفضلوا حقن لتذہبوا بعض ما آتیتموھن“ یعنی ان کو مقید نہ کرو، تاکہ جو کچھ دیا ہے، اُس کو چھین نہ لو۔“

یورپ کے مصلحین اور قانون ساز جو اسلام پر اعتراض کرتے ہیں، ان کو پہلے درپے ایسے واقعات پیش آئے کہ وہ طلاق کو قانوناً جائز کرنے پر مجبور ہوئے اور ان کو اسلام میں طلاق جائز کرنے کا راز سمجھ میں آیا۔ چنانچہ یورپ کا ایک مشہور قانون رقمطراز ہے :-

”گو طلاق ایک بُرائی ہے، لیکن سوسائٹی کی بہبودی کے لئے یہ برائی بھی ضروری ہے۔ طلاق کو ایک بُرائی خیال کر کے ممنوع قرار دینا ایسا ہی ہے، جیسے عمل جراحی کو برائی خیال کر کے ممنوع قرار دیا جائے۔ کیونکہ جراح بعض اوقات اعضاء کاٹنے پر مجبور ہوتا ہے۔ طلاق کے جواز میں چنداں نقصان نہیں ہے۔ طلاق کو ازدواجی زندگی کے خراب کرنے کا باعث اور ازدواج کے مقدس تعلقات منقطع ہونے کا سبب خیال کرنا بالکل غلط ہے۔ دراصل زوجین کی باہم اتفاقی ازدواجی زندگی کے بنیاد کے منہدم کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ طلاق صرف اُس نفرت کو ختم کر دیتی ہے، جو زوجین کے درمیان پیدا ہو جاتی ہے اگر یہ نفرت ختم نہ کی جائے، تو ممکن ہے کہ یہ ایسی شکل اختیار کرے جو ساری سوسائٹی کی خرابی کا باعث ہو۔“

- ماخذ :- ۱۔ اسپرٹ آف اسلام - مصنفہ سید امیر علی  
۲۔ مرکز المرأة فی الاسلام - مصنفہ سید امیر علی مترجمہ علی فہمی محمد۔  
۳۔ المرأة العربیة - مصنفہ عبداللہ عفیضی -  
۴۔ تاریخ الاسلام السیاسی - مصنفہ ڈاکٹر البراہیم حسن مصری

## ”نگار“ کے پچھلے تین سالانہ

سالنامہ ۱۳۱۱ء جس میں ”علم فراست التحریر“ کے اصول پیش کئے گئے تھے اور جن کو دیکھ کر آپ ایک شخص کا سواد خط دیکھ کر اس کے کیر کا صیغہ اندازہ کر سکتے ہیں۔ صرف ایک کاپی باقی ہے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۳۱۲ء اس میں ”ڈرامہ اصحاب کہف“ اڈیٹر کے قلم سے پورا شائع ہوا ہے اور ”خلافت و امامت کے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز ہوا ہے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۳۱۳ء اس میں ”تاریخ اسلامی ہند“ کے عہد خلافت و امامت پر ختم بحث کی گئی ہے جس میں ابتداء ۱۳۱۳ء میں ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

# غالب اور تقلید میر

(محمد عظیم فیروز آبادی)

میر اور غالب کے سن ولادت کو مقرر کئے ہوئے ہوتا ہے کہ وہ ایک سو سال کا بعد نظر آتا ہے لیکن دراصل ان کے اعلیٰ فن اور ان کی گرانمایہ شخصیتیں امتداد زمانہ پر غالب آگئی ہیں ناممکن ہے کہ اردو غزل کا دلیر ہوا و تیر و غالب کا نام نہ لیا جائے اور یہ نام کچھ اس طرح بیک وقت ہمارے سامنے آتے ہیں کہ ہمارے ذہن میں فرداودی کا امتیاز باقی نہیں رہتا اور ہم انھیں ہم عصر سمجھنے لگتے ہیں۔ اس تشابہ کی دراصل کچھ وجوہیں بھی ہیں۔ دونوں اردو کے انقلابی شاعر ہیں۔ دونوں نے غزل کو غزل بنایا ہے۔ پھر اگر ہم ان دونوں میں الجھنے لگتے ہیں اور ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے کی کشمکش خواہ مخواہ ہمارے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات ہے۔

اس نقطہ نظر سے اگر مختلف نقادوں کا جائزہ لیجئے تو ایک عجیب غلط فہم نظر آتا ہے کچھ نقاد تیر کو نہ صرف میر کا راہ سبقتے ہیں بلکہ انھیں خدائے سخن ماننے اور یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جہاں تک خیال و معانی کی وسعتوں اور الفاظ و اسالیب کی تراش و تراش کا تعلق ہے تیر پر اس کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ تیر سے ہٹ کر کوئی اور راہ بھی نکالی جاسکتی ہے اسے ان کی عقل قبول ہی نہیں کرتی۔ اسی لئے غالب کی عظمت اور انقلابی شخصیت ان لوگوں کی نظروں میں نہیں چھتی۔ یہ غالب کی غیر معمولی صلاحیت اور اعلیٰ فطانت کو تسلیم کرتے ہیں تو صرف اس حد تک کہ اس نے تیر کی عظمت کو پہچان لیا اور آخر آخر میں اس راہ کو اختیار کر لیا جو تیر نے اسے سمجھائی تھی۔ گویا غالب کی اپنی کوئی شخصیت نہ تھی، اپنا کوئی مزاج اور شعور نہ تھا۔ وہ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ تیر اور غالب کے مزاج میں کوئی فطری مناسبت نہ تھی اور ایک شاعر اپنے پیش رو ہم عصر کی تقلید اسی وقت کرتا ہے جب اسے اپنی اور اس کی افتاد طبع میں ایک ہم آہنگی محسوس ہو اور اس کے دل کے ساتھ اپنے دل کی دھڑکن تیز ہو جائے، غالب اور تیر کے مزاج میں بعد المشرقین ہے۔ اگر ایک میں توکل، استغنا اور خود داری ہے تو دوسرے میں دنیا داری، ایک دائمی تشنگی اور ساری کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لینے کا جذبہ ملتا ہے تیر کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ ایک بار جہاں ناکامی ہو جائے یا جہاں ان کے وقار اور خودی کو ٹھیس پہونچے، اس درنگ دوبارہ رسائی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے برخلاف غالب بار بار ناکام رہنے پر بھی پر امید رہتے ہیں۔ وہ دربان کی ذلت کو بھی اتنی خوشی سے گوارا کر لیتے ہیں گویا یہ تو لازماً عشق ہے اور جسے جان و دل عزیز ہو وہ اس گلی میں جائے کیوں۔ میر فانی العشق ہیں۔ وہ اپنی ساری ہستی، ساری کائنات کو بھی محبوب پر نشانہ کرنے باوجود سوچ سکتے ہیں۔ ”حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا“ اس کے برعکس غالب کے محبوب اور ان کا عشق انکی ہمہ رنگ طبیعت کے مختلف مظاہر ہیں۔

علاوہ ازیں ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ تیر کا رجحان جذباتی اور غالب کا میلان مفکرانہ ہے اور دراصل دیکھئے تو یہیں سے وہ منفرد شخصیتوں، دو مختلف دبستانوں کا سراغ ملتا ہے اور یہیں سے وہ راہ نکلتی ہے جو ایک کو تیر اور دوسرے کو غالب بناتی ہے۔ اس لئے یہاں یہ ضروری ہے کہ ہم کسی قدر تفصیل سے ان دونوں کی شخصیتوں اور ان کے ماحول کا جائزہ لیتے

ہوئے ان کے رنگِ طبیعت کو نمایاں کریں۔

تیر اپنی دکاوتِ حس، غیرتِ مذی، بے نیازی، تسلیم و رضا، سوز و گدازِ قلب، خلوت پسندی اور تنگ مزاجی کے لئے مشہور ہیں۔ اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو ان تمام صفات کا راز ان کی ابتدائی تربیت میں مضمر ہے۔ تیر کے والد ایک صوفی صافی بزرگ تھے جن کے گرد ہمہ وقت مريدوں اور معتقدوں کا جھگڑا لگا رہتا ہے اور بڑے بڑے صاحبِ اقتدار ان کے قرب کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے۔ ظاہر ہے تیر کا بچپن کیسے ناز و نعم اور چاؤ چوچلوں میں گزرتا ہوگا۔ اس کے علاوہ ان کی تربیت ان کے والد کے مرید خاص سید امان اللہ کے سپرد تھی جن کی بے پایاں ارادت و محبت اور جذبہ ہاں نشاری سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ تیر کو اپنے بیٹے تو کیا، اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اتنے اور ایسے ناز برداروں کے ہوتے ہوئے تیر اگر اپنے آپ کو مرکزِ کائنات سمجھنے لگے ہوں تو کیا عجب ہے۔ لیکن یہ بادۂ شباب کی سرسبزیاں زیادہ دیر قائم نہ رہیں اور آنکھ کھلنے یا ہوش مند ہونے سے پیشتر ہی تیر نے اپنے آپ کو دامِ سخت میں گرفتار پایا۔ ابھی ان کی عمر شکل سے دس گیارہ سال کی ہوئی تھی کہ امان اللہ اور پھر ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ گہری فقر و استغنا کے علاوہ اور کونسی بڑی دولت تھی جو تیر کے ہاتھ آتی تیر کی ساری ناز برداری والد یا امان اللہ کے دم تک تھی۔ ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی دنیا نے ان سے آنکھیں پھیر لیں۔ بھائی نے بے مروتی کا اظہار کیا۔ ناچار اگرچہ چھوڑ دئیے آئے یہاں ماموں کے طرزِ عمل نے اور بھی دل ریش کر دیا۔ شیشہٴ قلب جو ضرایعِ عشق سے پیدا ہی شکستہ ہو چکا تھا، اس پر آلام روزگار کی جب بے بے پے ہریں پڑیں تو چور چور ہو کر رہ گیا، تیر ذرا بھی ہوشمند ہوتے یا دنیا داری کا انھیں کچھ بھی سلیقہ ہوتا تو دوڑ دھوپ کہہ کے اپنی حالت کو بہتر بنا سکتے تھے اور انھوں نے جیسا کچھ ان سے بن پڑا کیا بھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تیر کا ضمیر فقر و استغنا سے ظہار ہوا تھا اور پھر بڑھی ہوئی مفلسی نے انھیں اور بھی غیور کر دیا اور جب جب انھیں کوئی مزاحمت پیش آئی یا نا کامیوں سے واسطہ پڑا تو اپنی پوزیشن صاف کرنے یا تنگ و دو کرنے کی بجائے انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کی۔ دکاوتِ حس یا تنگ مزاجی تو گویا ان کی فطرت بن گئی تھی۔ حالانکہ میر یا ان کے والد کے قدر دانوں کی دنیا میں کمی نہ تھی اور دیکھا جائے تو زمانہ نے ان سے مساعدت بھی کی لیکن ان کی بددماغی ہمیشہ آڑے آتی رہی۔ سعادت خاں ذوالفقار جنگ کی معمولی سی فرائش پر انھوں نے اسکی

لے لی تو تیر کے سارے دیوان ہی ان کے دردِ دہم کے مرتعے ہیں لیکن اپنی ایک سلسلِ غزل میں انھوں نے اپنے سوز و دل کو اس طرح ظاہر کیا ہے کہ ان کی مینتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے:

تیر دریا ہے سنے شعرِ زبانی اس کی	اللہ اللہ سے طبیعت کی روانی اس کی
ایک ہے عہد میں اپنے وہ بزرگندہ مزاج	اپنی آنکھوں میں آیا کوئی ثانی اس کی
مینہ تو پوچھا رکھا ہے برتنہ تم نے	اسی انداز سے تھی آتشکِ فشاںی اس کی
بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا	ہر فی خاک میں لکھا سحرِ بیانی اس کی
کر کے تعویذ رکھیں اس کو بہت بھاتی ہے	وہ نظرِ بادل یہ وہ باتِ دہانی اس کی
سرگزشتِ اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا	سو گئے تم نہ سنی آہ کہانی اس کی
مرثیہ دل کے کئی کہہ کے دئے لوگوں کو	شہرِ دلی میں ہے سب یا سِ ثانی اس کی
آپ کی سہی طرح میں لگی پھوٹ بھی	دردِ مہندی میں لکھی ساری جوانی اس کی

اب لکھے اس کے جزائے سوز و غم کچھ حاصل  
حیف صد حیف کہ کچھ قدر نہ جانی اس کی

مصاحبت ترک کر دی۔ راجہ بھگل کشور ایسے تدر دان کے دل کو انھوں نے اپنے ہندار فن سے مجروح کیا۔ نواب آصف الدولہ سے راستہ میں بات کرنے سے انکار کر دیا۔ غرضیکہ ایک نہیں درجنوں واقعات ان کی زندگی میں ایسے ملتے ہیں جن سے ان کی غیرت مندی، قناعت پسندی اور شدت احساس قدم قدم پر ظاہر ہوتی ہے۔

تیر کی طرح غالب کے والد اور چچا کا انتقال ان کے بچپن میں ہو گیا لیکن تیر کے برعکس غالب کے چچا اور والد ان کے لئے سب کچھ نہ تھے۔ ان کے نانا غلام حسین کھیدان اپنے وقت کے بہت بڑے رئیس اور فوجی افسر تھے۔ یہاں غالب کی ابتدائی عمر بڑے ناز و نعم اور رنگ ریلوں میں گزری۔ ان کے مزاج میں رئیسانہ خوب اور اعلیٰ فہمی کا ایک لازوال پندار پیدا ہو گیا اور آگے چل کر انھیں ہزار ہا دقتوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان کے بانگین میں کبھی فرق نہ آیا۔ ملا عبدالسمیع سے انھیں استفادہ کا موقع نہ ملا ہوتا تو کبھی مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی فارسی دانی کے احساس برتری کی تسکین کے لئے کوئی نہ کوئی عبدالسمیع ضرور پیدا کر لیتے خانہ دانی پنشن حاصل کر کے لئے وہ مسلسل تیس سال تک لڑتے رہے۔ اور اس مقدمہ کے دوران میں اکثر ایسے مقامات آئے کہ مرزا کے علاوہ اور کوئی معمولی دل ٹوہ سے کا انسان ہوتا تو وہ اپنے حقوں سے دست بردار ہو جاتا۔ لیکن اس سلسلہ میں انھیں اپنی نتیجائی پر اتنا یقین کامل تھا کہ وہ کلکتہ میں اپنی دو ڈھائی سال کی غریب لوطی کو مطلق خاطر میں نہ لائے اور قرض کا بار ان پر گواروز بروز بڑھتا ہی رہا لیکن اسید اور جدو جہد کا دامن انھوں نے کبھی نہ چھوڑا۔ کلکتہ میں قنبیل کے پرستاروں سے معرکہ ہوا۔ فخر میں تباہ و برباد ہوئے، پکڑے گئے، پنشن بند ہوئی، اعزاز و خطابات سے ہاتھ دھونا پڑا۔ غم جاناں اور خصوصاً غم اولاد کو عمر بھر اس طرح برداشت کیا گویا زندگی میں ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہوتی۔ آمدنی کا ایک در بند ہوا تو انھوں نے دوسرا در تلاش کرنے کی کوشش کی اور بہادر شاہ شجاع الدولہ، نواب رامپور، والی ٹونک نواب وزیر الدولہ، نواب تاج حسین خاں، راجہ شیو دھیمان سنگھ حتیٰ کہ ملکہ وکٹوریہ اور انگریز افسران بھی ان کی زد سے نہ بچے۔ وہ ان کے حضور میں گڑ گڑائے، کبھی ان کی قصیدہ خوانی کی اور کبھی اپنی قصیدہ خوانی سے انھیں مرعوب کرنا چاہا۔ غرض جام حیات سے اپنی تشنگی بجھانے اور اس کے آخری قطرہ تک پچوڑ لینے میں انھوں نے کوئی دار کوئی حربہ اٹھانہ رکھا۔ انھوں نے چہرے لگائے اور زخم بھی کھائے لیکن ہر منزل اور ہر مقام سے اس طرح عہدہ برآ ہوئے کہ ہمیں ان کی حوصلہ مندی اور بے جگری کا قایل ہونا پڑتا ہے۔

تیر کی طرح خود دار غالب بھی تھے لیکن یہ خود داری وہ نہ تھی جو چرچہ اہٹ اور کبیدہ خاطر کی کا نتیجہ ہوتی ہے بلکہ اس میں اپنی عظمت، اپنے شخصی اور شاعرانہ منصب کا احساس شامل تھا۔ اس کے علاوہ وہ اتنے ہوشمند اور دنیا دار بھی تھے کہ وہ کبھی کبھی خود داری کو مصلحت پر قربان کر سکتے تھے۔ پھر غالب کے مزاج میں جو طرافت اور شگفتہ دلی تھی اور جس میں ان کی انفرادیت اور عظمت کا اصلی راز مضمر ہے وہ انھیں تیر کی برادری سے بہت دور لے جاتی ہے تیر اپنے غم سے عمر بھر جانبر نہ ہو سکے اور ان پر گریہ کا عالم مستقل طاری رہا لیکن عشق میں رونے اور رو کر محوش ہونے پر جب انسان سوچ بچار کے حدود میں داخل ہوتا ہے اور اپنی وفا شعاری، محبوب کی بے بسی یا بے رخی، اور زمانہ کی بے رخی پر غور کرتا ہے تو اسے اپنے نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور اسے اعتراض کرنا پڑتا ہے کہ: "تاپ لاتے ہی بنے گی غالب لیکن غالب خود اس منزل سے اس طرح گزرے ہیں جیسے روز ازل ہی میں یہ حقیقت ان پر آشکار ہو چکی تھی، لہذا ہمیں ان کا غم، ان کی مسرت، ان کی گونا گوں دلچسپیاں، حتیٰ کہ ان کا عشق بھی ان کی رنگ رنگ فطرت کے مختلف جلوے معلوم ہوتے ہیں اقبال کو چھوڑ کر ایسا مکمل اور بھرپور انسان ہمیں اردو شاعری میں کوئی نظر نہیں آتا بلکہ اقبال بھی اپنی آخری زندگی میں مومن ہو کر

رہ گئے تھے۔

غالب کی شخصیت کا تجزیہ ان کی بے مثال ذہانت اور انفرادیت کے بغیر ناممکن رہے گا وہ لکیر کے فقیر بنے یا شاہراہ عام کو اختیار کرنے میں اپنی ہنگامحسوس کرتے تھے۔ قدامت کی پیروی سے شکستوں نے کی اور ہر ایک تیز رو کے ساتھ وہ تھوڑی دور یا تھوڑی دیر تک چلے بھی، لیکن یہ پیروی نیا راستہ اور اپنا راستہ تلاش کرنے کی خاطر تھی۔ وہ بہت سے بڑے شاعروں سے متاثر ہوئے لیکن کوئی بڑے سے بڑا شاعر ہمیشہ کے لئے ان کا میر کا دامن بن گیا ہو، یہ بات نہیں۔ ان کا مطالعہ، ان، ان کی تلاش و تحقیق، ان کی تاثر پذیری، مختلف رنگوں سے اپنے آپ کو آشنا کرنے اور اپنے اصلی رنگ کو پانے اور نمایاں کرنے کے لئے تھی، وہ بیدل سے متاثر ہوئے اور ان کی ابتدائی شعاری تمام تر اسی رنگ میں رنگی نظر آتی ہے لیکن جلد ہی انھیں اپنی کوتاہیوں کا احساس ہو گیا اور انھوں نے ظہوری اور نظیری وغیرہ کی روش کو اختیار کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اردو میں وہ ناسخ، ذوق اور تیر سے متاثر ہوئے بلکہ اثر لکھنؤ کی تو یہ رائے ہے کہ فارسی میں جس طرح عرفی، ظہوری اور نظیری نے ان کی دستگیری کی، اردو میں ان کی رہنمائی کے فرائض تیر نے انجام دئے، یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ غالب نے تیر سے اثر قبول کیا ہی نہیں۔ غالب کے متعدد خطوط اور اشعار میں تیر سے متعلق ان کی تاثر پذیری کا کھلا ہوا اعتراف ملتا ہے:

ریختی کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب منتہی میں لگے زمانہ میں کوئی تیر بھی تھا

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد تیر نہیں

لیکن یہ کہنا کہ غالب کو طرز تیر نے بنایا انشا کو چھوڑ کر باقی جتنے شاعر ہیں سب تیر میں سہائے ہوئے ہیں۔ غالب کی صحیح قدر و قیمت اور اس کے منصب سے روگردانی کرنا ہے۔

غالب کے آخری دور میں ان کی زبان میں بڑی نرمی، گھلاوٹ اور سادگی پیدا ہو گئی تھی اس سے بعض نقاد اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ آخر آخر میں انھوں نے تیر کی راہ اختیار کر لی تھی جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں دو مختلف شاعروں میں تقلید اور پیروی کرنے کا امکان اسی وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ ان کے مزاج میں مکمل آہنگی اور مناسبت پائی جائے نہ صرف یہ کہ غالب اور تیر میں کوئی ذہنی یکسانیت نہیں ملتی بلکہ غالب کی طبیعت میں ایک ایسی اذیت ہے جو انھیں بڑی سے بڑی ہستی کے سامنے سرسبز علم کرنے سے باز رکھتی ہے۔ غالب ایسی ذہنیت کا شخص مکن ہے کسی دیوبیکر شخصیت سے متاثر و مرعوب ہو جائے لیکن یہ اصول قطرہ اپنے آپ کو دریائے حوائے کر دے، ناممکن ہے۔ پھر یہ نہ بھولے کہ غالب کے یہاں یہ نرمی اور سادگی ان کے آخری دور کی غزلوں میں ملتی ہے۔ اس وقت ملتی ہے جبکہ ان کے ممکنات شعری پوری طرح ہرگ و بار لاپکے تھے اور وہ ایک صاحب طرز ادیب بن گئے تھے اس وقت اگر وہ کوشش کرتے بھی تو اپنے آپ سے اپنا دامن چھڑا سکتے تھے اور نہ تیر کے رنگ میں کامیاب ہو سکتے تھے اور نہ وہ گہرائی اور گیرائی پیدا کر سکتے جو بصورت موجودہ ان کی غزلوں کی یہ سادگی ان کے اسلوب کا فطری نگہار ہے۔ یہ ان کی ترقی یافتہ صورت ہے تیر کی سادگی اور غالب کی سادگی میں بن فرق ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں ہم ان دونوں کی دو مختلف غزلوں کو سامنے رکھ کر ان کی مشترک خصوصیت — سادگی اور علوات بیان کا جائزہ لیں۔ یہ کام ان کے مختلف اشعار پیش کر کے بھی لیا جاسکتا تھا لیکن متفرق اشعار سے شاعر کی پوری ذہنی فضا اور اس کا رنگ طبیعت صحیح طور پر واضح نہیں ہو پاتا۔

تجرت نے کھویا کھپایا ہمیں ، بہت اس نے ڈھونڈنا پایا ہمیں  
پھرا کرتے ہیں دھوپ میں جلتے ہم ہوا ہے کہے تو کہ سسایا ہمیں  
گہے تر ہیں گاہ خوں بستہ تمھیں ان آنکھوں نے کیا کیا دکھایا ہمیں

مصاحبت ترک کر دی۔ زامہ جمل کشوں کی خاطر میں نقش ونا  
میں بات کرنے سے انکار کر دیا۔ غرضیکہ اسے ہے دل کوئی عشق میں  
پسندی اور شدت احساس قدم قدم۔ دانی سنا کیا نہیں  
تیر کی طرح غالب کے وال بھی کئی دشمنی عشق کی  
کچھ نہ تھے۔ ان کے مانا غلا۔ کوئی دم کل آئے تھے مجلس میں تیر  
بہت اس غزل پر رلا یا ہمیں

کوئی امید بر نہیں آتی، کوئی صورت نظر نہیں آتی  
موت کا ایک دن معین ہے، بوند کیوں رات بھر نہیں آتی  
آجے آتی تھی حال دل پہ ہنسی، اب کسی بات پر نہیں آتی  
بانتا ہوں ثواب طاعت وزیر، پر طبیعت ادھر نہیں آتی  
ہے کچھ ایسی ہی بات جو جب ہوں، در نہ کیا بات کر نہیں آتی  
کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں، میری آواز گر نہیں آتی  
داغ دل گر نظر نہیں آتا، بوجہی اسے چارہ گر نہیں آتی  
ہم دہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی، کچھ بارے خبر نہیں آتی  
مرے ہیں آرزو میں مرنے کی، موت آتی ہے پر نہیں آتی

کچھ کس منہ سے جاؤ گے غالب

شرم تم کو گر نہیں آتی

تیر کی جو غزل ادیر پیش کی گئی ہے وہ بڑی حد تک ان کے حالات و خیالات کی ترجمان ہے اور یہ واضح رہے کہ تیر کی شاعری  
میں جو درد مندی، جو کسک، جو غلغلی، جو سوز و سرور و درد و داغ ملتا ہے، وہ بڑی حد تک ان کے کلام کی مشترک خصوصیت ہے۔  
ان کے اشعار اسلوب، بیان یا خیال کی بلندی اور پستی کے حاصل ہو سکتے ہیں لیکن شروع سے آخر تک ان کی فرما دہی کے میں کوئی  
تبدیلی نہیں آتی۔ لیکن اس کے برعکس ہم نے غالب کی ایسی غزل خاص طور پر منتخب کی ہے جہاں وہ تیر کے بہت قریب ہو کر  
گزرے ہیں۔ اس کے علاوہ غالب کی غزلیات ذیل میں بھی سادگی پائی جاتی ہے۔

درد سنت کش دوا نہ ہوا، میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا  
جو رہے باز آئے پر باز آئیں کیا، کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلاؤں کیا  
کوئی دن گر زندگانی اور ہے، اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے  
دل نادان سمجھے ہوا کیا ہے، آخر اس درد کی دوا کیا ہے  
ابن مریم ہوا کرے کوئی، میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

لیکن ان تمام غزلوں میں غالب کی شوخی، ان کی ظرافت، ان کی زندہ دلی، ان کی دلکش فارسی ترکیبیں، ان کا مخصوص  
انداز بیان اس قدر نمایاں رہتا ہے کہ وہ شخص جس نے ان کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے، پہلی ہی نظر میں انھیں شناخت کرے گا  
اور ان تک اس غزل کا تعلق ہے، وہ میرے قریب ہوتے ہوئے، رہتی غالب ہی کی غزل ہے۔ نظم ہو، غزل ہو، افسانہ ہو  
یا کوئی مصنف سخن، اس میں صرف انداز بیان ہی مصنف کی چغلی نہیں کھاتا بلکہ شاعر یا ادیب کی پوری ہستی اپنے تمام لوازمات

کے ساتھ اس میں جلوہ گر رہتی ہے اور وہ جنہیں قدرت نے دیدہ بینا بخشا ہے یا جن میں درون پرودہ دیکھنے کی صلاحیت ہے وہ کسی ظاہری صفت کو دیکھ کر آسانی سے دھوکا نہیں کھا سکتے۔

تیسرے عمر بھر ایک شرابی کی کیفیت طاری رہی عشق نے جو چرکہ ان کے دل پر لگا یا تنہا جزا سوراخ کے قلب میں پیدا ہو گیا تھا وہ زخم بظاہر بھر گیا۔ لیکن دراصل اس پھوڑے کا رخ اندر کی طرف ہو گیا اور اس کی ٹیس اور جلن نے انہیں زندگی بھر بے قرار رکھا اور ان کے یہاں جو درد، کرب اور اضطراب ملتا ہے وہ کسی گزشتہ تجربہ کا اظہار نہیں بلکہ ایک ایسے شخص کی چیخ بیکار ہے جو ہنوز اس دہریں مبتلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اتنی بے پناہ تاثیر ملتی ہے کہ ہم ہزار تیر کا ہجہ اور ان کی سادگی اختیار کر لیں ہمیں ذوق کے الفاظ میں اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔ — ہوا، پر نہ ہوا تیر کا انداز نصیب

پھر غالب ایسا بے جھجک حقیقت شناس کہ جس نے اپنے عہد میں سب سے پہلے مغربی نظام کی خدیموں اور مغلیہ سلطنت کی زوال آمادگی کو محسوس کر لیا تھا اور جسے اپنے انداز بیان پر اس قدر اعتماد و افتخار تھا کہ اپنے معاصرین کی نکتہ چینیوں کو نظر انداز کر کے بیابان دہل کہتا تھا: نہ سہی گریمرے اشعار میں معنی نہ سہی، تیسری سادگی اور عداوت پر اس قدر فریفتہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے طرز بیان سے دست بردار ہو جائے۔ خصوصاً اس کا جذبہ امانیت اور اس کی جدت پسندی اسے ایسا کرنے کی کب اجازت دے سکتی تھی۔

پھر سوال یہ ہے کہ اگر غالب نے تیسری تعلیم نہیں کی تو ان کی آخری عمر کے کلام کی اس قدر سادہ اور سہلی منتیں ہونے کی کیا وجہ ہے۔ اس کا جواب حیران کن میں پیشتر عرض کر چکا ہوں یہ ہے کہ غالب کے کلام میں یہ سادگی اور سلاست ان کی بتدریج ارتقا کا نتیجہ ہے ہر ادیب یا شاعر کو ابتدا میں قدرت بیان حاصل نہیں ہوتی اور اسے اپنے فانی تعمیر کو ادا کرنے کے لئے عموماً نانا نوس الفاظ و تراکیب کا سہارا لینا پڑتا ہے لیکن جیسے جیسے اس کا مشق و مزاوت بڑھتی جاتی ہے، اپنے مفہوم کو آسان ترین الفاظ میں ادا کرنے کی صلاحیت اس میں پیدا ہوتی جاتی ہے۔ ان کے طور پر اگر نیا زنجوڑی یا رشید احمد صدیقی کے آج سے تیس سال پہلے کے مضامین دیکھئے یا مولانا آزاد کے تذکرہ کا، ادبی غبار خاطر سے موازنہ کیجئے تو پہلی نظر میں یہ شناخت کرنا مشکل ہو جائے گا کہ یہ وہی ادق نگار سجاد، نہاں یا رشید ہیں، جو عربی، فارسی کے ثقیل الفاظ استعمال کیے بغیر تسکین نامک تھی۔ ان حضرات کے یہاں یہ بدلی دیکھ کر اگر کوئی شخص یہ اصرار کرے کہ ان میں یہ سلاست اور سادگی ڈاکٹر عبدالحق کے سادہ طرز بیان کو دیکھ کر پیدا ہوئی ہے تو بالکل ہرگز اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

(علفہ ادب فیروز آباد میں پڑھا گیا)

لے	بتاں کے عشق نے غاد خراب کر ڈالا	وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا
	وہ دل کہ شام و سحر صبح پکا پھوڑا تھا	وہ دل کہ جس سے ہمیشہ جگر نگار رہا
	تام عمر گئی اس پہ ماتھ رکھے ہمیں	وہ دردناک علی الرغم بے قرار رہا
	بہا تو خون ہو آنکھوں کی راہ چنکلا	رہا تو سینہ سوزاں میں داغدار رہا
	ستم میں غم میں سر انجام اس کا کیا کہئے	ہزاروں حسرتیں تھیں تپہ جی کو مار رہا
	سو اس کو ہم سے فراموش کاریوں نے لگے	کہ اس سے تلوہ خواں ہی نہ یادگار رہا

# غالب اور اقبال

(فرمان فتحپوری)

میں نے دسمبر ۱۹۵۷ء کے 'پتھر' میں 'غالب اور اقبال' کے عنوان سے دونوں شاعروں کے مشترک موضوعات پر بحث کرتے ہوئے ان کے ذوقی مناسبت اور فنی فرق پر گفتگو کی تھی۔ اور بحث کے آغاز میں اس بات کا اعتراف کیا گیا تھا کہ:-

"غالب، اقبال دونوں اردو کے مایہ ناز فنکار، دونوں اردو ادب فارسی کے عظیم المرتبت سماع، دونوں اپنے اپنے اسلوب کے موجد اپنے زبان کے خلاق اور ابداع و اختراع کے لئے پہلے کوئی کے مالک ہیں۔"

اسی کے ساتھ ڈاکٹر خلیفہ عبدالکیم کی اس رائے کی تائید کی گئی تھی کہ:- "اقبال کے یہاں رومی بھی ہیں، نعتیہ بھی، کانت بھی اور برگساں بھی، کارل مارکس بھی ہیں اور رینین بھی، بیدل بھی ہیں اور غالب بھی۔ لیکن اقبال کے اندر ان سب کی حیثیت جوں کی توں باقی نہیں رہی۔ اس نے اپنے تصورات کا قائلین بننے ہوئے کچھ رنگین دھانچے اور خاکے ان لوگوں سے لئے ہیں لیکن اس کے مکمل قائلین کا نقشہ کسی دوسرے نقشہ کی دو پہلوئیں نہیں ہے۔"

میں نے غالب اور اقبال کے ذہنی اشتراک کا جائزہ لیتے ہوئے ان حقایق کی طرف بھی اشارے کئے تھے جو ان کی شخصیت کو باہم جمناقت ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں۔ لیکن بعض حضرات نے اس کو صرف اقبال کی تنقیص سمجھا اور ایک صاحب نے مارچ ۱۹۵۸ء کے 'پتھر' میں اپنی ناپسندی کا اظہار بھی کر دیا۔ چونکہ انھوں نے میرے مضمون سے یہ غلط نتیجہ اخذ کیا تھا کہ میں غالب کو اقبال پر ترجیح دیتا ہوں اس لئے انھوں نے اشتقاقاً غالب کی تنقیص کو اپنا مدعا قرار دیا اور اس طرح وہ اصول نقد سے بالکل ہٹ گئے، چنانچہ انھوں نے اس سلسلہ میں ایک سفر سے زائد غالب کے اپنے اشعار پیش کئے ہیں جن میں غالب نے فارسی اساتذہ سے استفادہ کیا ہے حالانکہ اگر اس سے کسی شاعر کی نااہلیت یا کمزوری ثابت کی جاسکتی ہے تو یہ کمزوری و نااہلیت اقبال میں بہ نسبت غالب کے زیادہ نمایاں نظر آئے گی۔

فاضل معترض کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ہمارے مضمون میں خیالی یگانگت مفقود ہے۔ صرف متضاد و متباہن خیالات کو جمع کر کے اقبال کی تنقیص اور غالب کی بے جا تعریف کی گئی ہے۔ فاضل ناقد نے میرے مضمون کے جن جملوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے ان کی فہرست یہ ہے:

- (۱) غالب شاعری میں فلسفہ کی ایک سفت یعنی موضوع کی کیفیت و ہمہ گیری کو ملحوظ رکھتے تھے ان کے یہاں انسان کے عام فطری تقاضوں، خواہشوں، دلوں، مایوسیوں اور تجزوں کی عکاسی ہے، زندگی کے مختلف حقیقی اور دائمی پہلوؤں کی تشریح سے انسانی محسوسات کے نفسیاتی تجربے ہیں۔۔۔۔۔ غالب کے یہاں فلسفہ ہمیشہ فن سے مغلوب رہتا ہے۔
- (۲) اقبال کے یہاں ایک متبعین و مخصوص فلسفہ حیات ملتا ہے جو عقلی اور لگداز ہونے کے باوجود بڑی حد تک فطری اور جامع

۱۔ پتھر دسمبر ۱۹۵۷ء - ۲۔ رومی، نعتیہ اور اقبال از خلیفہ عبدالکیم۔

اقبال اقتضائے بشری اور انسانی نفسیات کو اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں اور ایسا بزدان شکار و کمند آور رجائیت کا سبق دیتے ہیں جو زندگی کے عملی میدان میں اس قدر کارآمد نہیں جس قدر وہ نظری طور پر معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کے یہاں فلسفہ فن پر غالب آ جاتا ہے۔

(۳) غالب اور اقبال کے ان چند مماثل پہلوؤں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں میں بڑی حد تک فکری یکسانیت و قسیمی مناسبت ہے۔

(۴) غالب اور اقبال دونوں بالکل متضاد ماحول کے ترجمان ہیں۔

(۵) اقبال کے خیالات، افکار اگر غالب سے ماخوذ نہیں تو ان کے معنوی فیض سے یکسر خالی بھی نہیں۔

(۶) جس طرح اقبال نے دوسرے حکماء اور علماء سے استفادہ کیا ہے وہاں خود اردو کے ایک شاعر سے بہت کچھ لیا ہے۔

(۷) اردو شاعری میں اقبال کے یہاں غالب کی روح کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

(۸) یہ کہنا کہ اقبال کی شاعری میں غالب کی روح کام کر رہی ہے یا یہ کہ اقبال کی صورت میں غالب نے دوبارہ جنم لیا ہے کسی طرح درست نہیں۔

(۹) ایک گونہ اشتراک کے باوجود ہم انھیں ایک دوسرے کی بازگشت نہیں کہہ سکتے۔

یہ عبارتیں اور جملے بارہ چودہ صفحہ کے طویل مضمون کے مختلف حصوں سے لیکر شعوری طور پر تضاد کو نمایاں کرنے کی غرض سے باکے کئے گئے ہیں ورنہ اگر تو کسی قسم کا تناقص نظر آتا مشکل ہے۔ چونکہ ان فقرات کو اپنے سیاق و سباق سے منقطع کر دیا گیا ہے اسلئے ماہران میں اس قسم کی بے ربطی اور ناہمواری محسوس ہوتی ہے پھر بھی اگر ان کے معنوی رشتوں پر غور کریں تو نہ ان میں کسی قسم کا مادہ ہے اور نہ ان میں اقبال کی تنقیص کا کوئی پہلو نکلتا ہے۔ یوں تو نہ غالب کا سارا کلام نقص سے پاک ہے نہ اقبال کا لیکن راقصود چونکہ صرف مماثل پہلوؤں کا موازنہ تھا اس لئے صرف مترادف اشعار کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی گئی تھی اور مجموعی اے کے حیوب و محاسن سے دانستہ چشم پوشی کی گئی تھی۔ غالب کی طرح اقبال کے یہاں بھی بہت سے کمزور پہلو اور گھٹیا شعر ملتے لیکن ہم نے صرف اقبال کے ان پہلوؤں سے بحث کی تھی جو ان کی شاعری کے خاص جوہر ہیں اور حوالے میں صرف ایسے اشعار لکئے گئے تھے جو قبول عام حاصل کر چکے تھے۔ ہم نے کہیں ایک جگہ بھی اقبال کی شاعری کا کوئی عام پہلو یا شعر پیش نہیں کیا سی طرح ان کے شاعرانہ مرتبہ کے منافی ہوا ہے اقبال کی دانستہ تنقیص سے تعبیر کیا جاسکے۔ ان حقائق کے باوجود اس مومن کو اقبال کی تنقیص خیال کرتا صرف اس تنگ نظری، کورانہ تقلید، عقیدہ مندانہ جذباتیت اور شخصیت پرستی کا نتیجہ ہو سکتا جس کا اقبال خود بڑا دشمن ہے۔ بہر حال چونکہ یہ حصہ اصل مضمون سے خاص تعلق رکھتا ہے، اس لئے فاضل ناقد کے معترضہ اسات پر تفصیلی بحث ضروری ہے۔ حسب ضرورت دوسرے معروف اہل قلم کی آراء سے مدد لی جائے گی اور اس سلسلہ میں صرف بڑے نقادوں کے حوالے دئے جائیں گے جو اقبال کے پرستاروں میں ہیں یا جن کی رائے میں اختلاف کی گنجائش کم ہے۔ برقی پسند جن کی آراء سے دانستہ گریز کیا جائے گا اس لئے نہیں کہ ان کی آراء اور غور و اعتناء نہیں بلکہ اس لئے کہ شاید اقبال کے متعلق ان کی بعض لوگوں کے لئے اس لئے قابل قبول نہ ہوں کہ وہ ایک خاص مکتبہ فکر سے متعلق ہیں۔

۲ = ان میں ہم نے غالب اور اقبال کے فنی فرق کو نمایاں کرنے میں جن حقائق کا اظہار کیا ہے ان کے احادے میں ہم کوئی ایک محسوس کرتے۔ غالب کی شاعری اقبال کے مقابلہ میں انسانی سے یقینی طور پر قریب تر ہے۔ غالب نے زندگی کی نشاط خیزی پر غور و تأمل کر کے اپنے رجائی پہلو کو حضرت انسانی اور اقتضائے بشری کے عین مطابق بنا دیا ہے، اس کے برعکس اقبال ایک تو زندگی کے پہلو کو ضرورت سے زیادہ نظر انداز کر جاتے ہیں اور ایسی بزدان گیر رجائیت کا سبق دیتے ہیں جو زندگی کے عملی میدان میں اس قدر

کام نہیں دیتی جتنا کہ نظری طور پر معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے چونکہ ان کا فلسفہ حیات بڑی حد تک صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے اس لئے ان کے پیغام میں لچک کے ساتھ ایک قسم کا جمود بھی موجود ہے۔ جو لچک جدید علم نفسیات سے واقف ہیں انھیں اندازہ ہوگا کہ غالب ذہن انسانی کی گہریں جس فن کاری سے کھولتا ہے وہ اقبال کے یہاں کیاب ہیں، غالب کی نفسیاتی ذہن بینی کے متعلق ہم ایک ایسے شخص کی رائے کا اقتباس دے رہے ہیں جس کے یہاں نفسیاتی تنقید کا عنصر سب سے زیادہ غالب ہے اور جس کی ناقدانہ رائے عام طور پر متوازن اور مستحسن شمار کی جاتی ہیں۔ شیخ محمد اکرام، آثار غالب، میں رقمطراز ہیں:-

”کلام غالب میں منہا میں کے نقطہ نظر سے اس دور کی اہم ترین خصوصیت نفسیات انسانی کے متعلق شاعر کی معلومات میں جو دیوان غالب کے صفحہ صفر پر ظاہر ہوتی ہیں۔ مرزا فقط قلم و محبت ہی کے راز دار نہ تھے بلکہ محبت کے علاوہ قلب انسانی کی ذاتی تمام کیفیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ ان کا ذہنی اور ذاتی تجربہ بہت وسیع تھا۔ وہ رندی اور درویش، خوشی اور افسردگی، بے قراری اور تسلیم و رضا، ان سب منزلوں سے گزر چکے تھے اور اپنی ذہنی مشاہدات پر اس طرح ٹھنڈے دل سے اور جذبات و احساسات کو قابو میں رکھ کر غور کرتے ہیں جس طرح ایک سائنس دان اپنے کیمیائی تجربات کو دیکھتا ہے۔ لیکن مرزا کا علم نفسیات اپنے مشاہدہ نفس تک محدود نہ تھا وہ بڑے مردم میں اور مردم شناس تھے۔“

آل احمد سرور جو اقبال کے کلام کے دلدادہ بھی ہیں اور جنھوں نے اقبال کے معترضین کو اکثر معقول جوابات دئے ہیں۔ رقمطراز ہیں:-

”غالب کی بس خصوصیت پر زور ضروری ہے وہ غالب کی نفسیاتی گہرائی ہے۔ اور اس کی غرائز طبعی ہے ان دونوں میں اندرونی شہت ہی ہے۔ اگر اہم نے شبیہ لکھا ہے کہ نفسیاتی ذہن بینی کی وجہ سے غالب غالب ہوئے۔ غالب نے مناظر قدرت کی تصویریں نہیں کھینچیں انھوں نے سب و شام، رات گرمی، جاڑا، برسات، ربیعہ، بذر، ہولی، دیوانی کی کیفیات کو نظم نہیں کیا انھوں نے قلب کے اندر گھس کر جذبہ کی گہرائیوں کو ٹھولا اور جذبات انسانی کی پردہ دہی کی۔“

پروفیسر عزیز احمد بن سے ترقی پسند ناقدین صرف اس لئے ٹالاں ہیں کہ وہ اقبال کے اس قدر مزاج کیوں ہیں، غالب کی شاعری کے نفسیاتی پہلو کے متعلق لکھتے ہیں:

”ان کے حکیمانہ اشعار ان کا قصور، امن کی موعظت ان کا طنز ان کے مذاق ہر چیز میں ایک ذوق نو، ایک جوش حرکت اور حیات کی جھلک ہے۔ وہ ایک طرح کے شاعر آخر الزماں ہیں جن پر ہزار سال کی تاریخی اردو شاعری کا خاتمہ ہوتا ہے اور جن سے ایک نئے گہرے باطنی رمز یا حقیقت اساس ادب کا آغاز ہوتا ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ غالب نے زندگی کے جن گونا گوں پہلوؤں اور نفسیات انسانی کے جن بے شمار گوشوں کو شعر کے پردے میں اُجاگر کیا ہے وہی ان کی شاعری میں آفاقی ادب کے آثار پیدا کر دیتے ہیں غالب کے کلام کے اس ہمہ گیر نفسیاتی پہلو کو داغ کی لذت پرستارانہ عشقیہ شاعری کے مترادف بنا کر صرف علم نفسیات سے ناواقفیت کا اور ناقدانہ بصیرت کی کمی کا نتیجہ ہے، غالب کے رسم و راہ سے بچ کر چلنے کا یہ مفہوم ہے کہ وہ اختراع و تخلیق کا دلدادہ تھا اور مشاہدات و تجربات سے ہمیشہ نفسیاتی نتائج اخذ کرنا تھا نہ کہ ان کا مفہوم یہ ہے کہ ”وہ نفسیاتی حقایق نے نا آشنا اور داغ کے رنگ کا شاعر تھا۔“

جہاں تک اقبال کے متعین اور منضبط فلسفہ حیات کا سوال ہے وہ یقینی قابل قدر ہے۔ انھوں نے اردو شاعری میں نہ صرف نئے موضوعات اور جدید افکار کو داخل کیا بلکہ ہر خیال کو ایک فلسفہ میں ڈھال دیا جس سے زندگی کے سماجی مسائل کے حل میں کسی حد تک مدد ملتی ہے لیکن کسی دوسرے شاعر کو صرف اس بناء پر کہ نہیں شمار کیا جاسکتا کہ اُس کے یہاں اقبال جیسا مروجہ پیغام حیات یا

یا تسلسل فکر نہیں ملتا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”فلسفہ زندگی کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مرزا کی شاعری میں کوئی پیغام نہیں ملتا۔ کیا شیکسپیر کی شاعری میں حیرت انگیز شعراء عالم ہے کوئی پیغام ملتا ہے۔ ایک نہیں کئی کئی۔ یہی حال مرزا کی شاعری کا ہے خیال کی جدت، تخیل کی بلندی اور بیان کا لطف جو مرزا کے یہاں پایا جاتا ہے وہ اردو کے کسی شاعر میں نظر نہیں آتا۔ میں ایسے صاحبوں کو جانتا ہوں جنہیں مرزا کے مختصر دہائیوں میں وہ پیغام ملے ہیں جو کسی دوسرے کے کلام میں کہا مذہب و اخلاق کی کتابوں میں بھی نہیں ملے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر کبھی مرزا نہ ہوتے تو حاتی اور آفتاب بھی نہ ہوتے۔ مرزا کا اردو شاعری پر عجیب و غریب اثر پڑا ہے اور رہے گا۔ کیا یہ بغیر کسی پیغام کے ممکن ہے؟

علاوہ بریں اس حقیقت سے کون انکار کرے گا کہ آفتاب کی شاعری کا نصب العین جیسا کہ خود انھوں نے اپنے بعض خطبات و اشعار میں جگہ جگہ واضح کیا ہے، اسلامی اقدار کو دوبارہ بروئے کار لانا اور مسلمانوں میں ایک تازہ اسلامی روح بھونکتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے یہاں زندگی کے آفاقی تصورات بھی اکثر جگہ مل جاتے ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے چونکہ ان کے اصل مخاطب بڑی حد تک صرف مسلمان اور ان کے موضوعات و تصورات زیادہ تر اسلامی ہیں اس لئے ان کا شاعرانہ پیغام اس وقت تک عالمگیر قبول عام حاصل نہیں کر سکتا تا وقتیکہ سارا زمانہ مشرق و اسلام نہ جو جائے اور یہی وجہ ہے کہ آفتاب کے فلسفہ حیات کو چنگا رہنے پر کبھی جادہ کہنے کی بڑی گنجائش ہے۔ ترقی پسند ناقدین کی آراء سے قطع نظر ایک ممتاز و غیر جانبدار نقاد نیا ز فقہوری کی رائے دیکھئے :-

”مرد مومن سے مراد آفتاب کی کوئی ایسی معیاری ہستی نہیں جس کا تعلق ساری کائنات سے ہو بلکہ ان کی مراد صرف مسلمان ہے۔ اور جس کی تعمیر میں چار عناصر، تہا، جباری، قدوسی و جبروت نظر آتے ہیں یعنی چار میں تین عنصر جلالی ہیں اور ایک جمالی۔ آفتاب کی شاعری یا فلسفہ کا یہی وہ پہلو ہے جس نے آفتاب کو اسلامی شاعر کے حدود سے آگے بڑھ کر کائناتی یا کائناتی شاعر بننے سے باز رکھا اور جس کو ہیبت، اخسوس کی شکاہ سے دیکھا جائے گا“

آفتاب کے نکتہ چینیوں کے زبردست محاسب آل احمد سرور، آفتاب کے متعلق رقمطراز ہیں :-

”آفتاب کا مذہب ہر شخص کو معلوم ہے۔ وہ صرف مسلمان ہے۔ وہ اسلام کے تمام ارکان، قوت ایمانی، اخوت و مساوات، اور محبت و صلہ سے بلندی کے قابل ہیں اسلام کے مشاہیر کا ذکر بڑی محبت سے کرتے ہیں غرض ان کی شاعری اسلامی تصورات کی تفسیر ہے۔ اس میں مسلمانوں کے لئے ایک مکمل نظام عمل موجود ہے۔۔۔۔۔ آفتاب واقعی جتنا جدید فلسفہ سے واقف ہیں اتنا جدید سائنس اور جدید سوسائٹی سے واقف نہیں تھے۔ وہ ہمارے ہندوستان کے بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے والوں میں سب سے زیادہ بیدار ذہن رکھتے تھے اور اپنی بڑی ہوئی مذہبیت کی وجہ سے بعض اوقات سطحی مذہبیت کی حمایت میں وہ مذہب کی انقلابی روح کو نظر انداز کر دیتے ہیں وہ شخص پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں اور شخص جس ادارہ یا خیال کی ترجمانی کرتا ہے اُسے کبھی کبھی نظر انداز کر جاتے ہیں“

لی احمد سرور کی ایک رائے ہم یہاں اور نقل کرتے ہیں جو غالب اور آفتاب کے فلسفاتی اور فلسفیانہ دونوں فرقوں کو ایک ساتھ سمجھنے میں مدد دے گی :-

”غالب کے ساتھ ہمارے ذہن کی دنیا وسیع ہوتی ہے روزمرہ کے حقائق کچھ اور نظر آتے ہیں ان کی شاعرانہ منطق کا جادو گرد و پیش کو ایک نئے اور نئے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ غالب نے کسی مخصوص فلسفہ حیات کی ترجمانی اس وجہ سے نہ کی کہ اتنا رفیع و وسیع ذہن کسی ایک گوشہ کا پابند نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ شیکسپیر اور گوٹے کے ساتھ ہیں انھیں اپنی بلندی اتنی بلند ہے کہ آفتاب اور فلسفہ کی بلندی بھی گواہ نہیں“

لے تنقیدات عبدالحق ۔۔۔ آفتاب کی شاعری از نیا ز فقہوری نگار سلسلہ ۔۔۔ صفحہ ۱۱۷ اور پڑانے چیرغ، آل احمد سرور



”اسرار خودی میں مغربی مفکرین میں سے تین کا اثر نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ اساس خودی کا خیال جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے اٹالوی مفکر قنٹے سے ماخوذ ہے۔ استحکام خودی و سخت کوشی کا فلسفہ نطشے کا ہے لیکن حقیقتِ وقت و سیلانِ حیات کے متعلق جو اشعار یا نظمیں ہیں وہ یہودی فلسفی برگساں سے ماخوذ ہیں۔۔۔۔۔ زمانہ حال میں پہلے نطشے نے اور اس کے بعد اقبال نے افلاطونی فلسفہ حیات پر حملہ کیا ہے اقبال نے جو اسرار خودی میں افلاطون کو گوسفند قدیم قرار دیا ہے اس تلخ تنقید کا ماخذ نطشے ہی کا وہ زبردست وار ہے جو اس نے افلاطون کی عقلیت پر کیا تھا۔“

ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں :-

”اس کی محفل میں نیتن، نطشے، مائتائی، برگساں، کارل مارکس، مصطفیٰ کمال اور جمال الدین افغانی پہلو پہلو بیٹھے نظر آتے ہیں۔“

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں :-

”اقبال کو رومی کی جس ادائے زیادہ متاثر کیا اس کا تعلق زیادہ تربذبات کے جوش و خروش اور رومی کے اس لب و لہجہ سے ہے

بہ زیر کنگرہ کبر با شش مردانہ

فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزدان گیر رومی

رومی کی مراد یہ ہے کہ انسان کامل وہی ہے جو اپنے اندر ملکوتی صفات پیدا کرے۔ پیغمبروں کی سی عبادانہ زندگی اختیار کرے اور خدا کی حقیقتِ خلاق کو سامنے رکھ کر خود بھی خلاقانہ راہیں اختیار کرے۔ اقبال نے رومی کی اس تعبیر کو اس قدر پسند کیا کہ وہ خود بھی یزدان بہ گند آوے اس ہمیت مردانہ کہہ اٹھے۔“

خلیفہ عبدالحمید دوسری جاگ لکھتے ہیں :-

”عارفِ رومی کو اقبال اپنا مرشد سمجھتا ہے جاوید نامہ میں افلاک اور مادائے افلاک کی سیر میں حقایق اور واردات کی اسنیت

اقبال پر اسی مرشد کے بتانے سے کھلتی ہے۔“

آل احمد سرور جو اقبال کے پرستاروں میں ہیں لکھتے ہیں :-

”اقبال نے اپنا فلسفہ زندگی نطشے سے اخذ کیا ہے وہ مرثضہ کے قابل میں فرق صرف یہ ہے کہ نطشے کا فوف البشر اقبال کے یہاں

خیر البشر ہو گیا ہے اقبال کے یہاں البیس کا تصور بھی ملحق اور گوتے سے ماخذ ہے۔“

یہ ہیں شواہد و راتعات جن سے اقبال نے بالواسطہ یا بے واسطہ استفادہ کیا ہے اور اس استفادہ کا ہر جگہ آغوشوں نے خندہ پیشانی سے اعتراف بھی کیا ہے، اب اگر ہم نے ان مانندات میں غالب کی شاعری کو بھی شامل کر کے یہ کہہ لیا کہ اقبال کے خیالات و افکار غالب سے ماخوذ نہیں تو ان کے معنوی فیض سے یکسر خالی بھی نہیں اور جس طرح اقبال نے دوسرے علماء و حکماء سے استفادہ کیا ہے اسی طرح اردو کے ایک شاعر سے بہت کچھ لیا ہے۔ تو اس میں کون سی ناقدانہ بے راہ روی ہو گئی جس سے اقبال کی تنقید کا پہلو پیدا ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اقبال کے ان مانندات سے انکار کرتے ہیں وہ اقبال کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے اقبال نے سب سے استفادہ کیا ہے اور اس کی شخصیت کی عظمت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ وہ ان سب کے معنوی فیض کا جاگ بند اعتراف کرتا ہے۔ اوپر کے اقتباسات کی روشنی میں باضابطہ معائنہ کا یہ خیال کر :-

”ہمارے اکثر فوجان اور بعض بزرگ بھی اس خط میں مبتلا ہیں کہ وہ اقبال کے ماخذ برگساں نطشے، کارل مارکس یا دوسرے

لے رومی، نطشے اور اقبال۔ یہ روح اقبال۔ یہ نگار ۱۹۵۷ء۔۔۔۔۔ رومی، نطشے اور اقبال۔ خدا نے اور پیر نے چراغ

مشرقی و اسلامی حکماء و فیریم کو ثابت کریں۔

ذہنی تنگ نظری اور عقیدت مندانہ شخصیت پرستی کا مضحکہ خیز ثبوت ہے۔ اقبال خود بانگ درا سے لیکر جاوید نامہ تک غالب کے معنوی فیض کا اعتراف کرتے ہیں اور جنہوں نے غالب اور اقبال کے کلام کا بلاستیاب مطالعہ کیا ہے انہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ اقبال داغ کے شاعر دہرائے نام تھے اگر ان کی شاعری میں کسی اردو شاعر کا اثر نظر آتا ہے تو وہ غالب کا۔ ابو ظفر عبدالواحد لکھتے ہیں :-

... " اقبال کو کوہنے کو داغ سے تمہارا لیکن ذہنی اور معنوی حیثیت سے وہ غالب کے شاعر تھے۔ "

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا یہ قول کہ :- " اگر غالب نہ ہوتے تو حالی اور اقبال بھی نہ ہوتے۔ " پہلے لکھا جا چکا ہے۔ عبدالقادر سروری جنہوں نے اس موضوع پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے اور اقبال کے کلام سے غالب کے معنوی فیض کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں :-

" بہر حال اقبال نے ارشد وغیرہ کی صحبت سے استفادہ کیا۔ داغ سے اصلاح لی مگر غالب سے معنوی فیض حاصل کیا اور :-

آخری اثر ان کی طبیعت کے عین مطابق تھا اس لئے دیر پا ثابت ہوا اور آخر تک کسی کسی صورت میں ظاہر ہوتا رہا۔ "

آل احمد سرور جو اقبال کے بڑے مداح ہیں نہ صرف ان کے افکار بلکہ اسلوب کو بھی غالب سے متاثر بتاتے ہیں۔ لکھتے ہیں :-

" اقبال اسلوب کے لحاظ سے حالی کی بجائے غالب کی طرف مائل ہیں۔ "

۸ - ۹ = خالص فنی نقطہ نگاہ سے اقبال کے اردو کلام میں غالب کی شاعری کی ارتقائی روح مفقود ہے اس لئے کم از کم ان کے اردو شاعری کے متعلق سر عبدالقادر کی رائے درست نہیں معلوم ہوتی۔ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اقبال کی اردو شاعری کا اسلوب اور فنی ترنچ اس کی فارسی شاعری کے مقابلہ میں ڈھیلہ و سست اور کمزور ہے اردو شاعری میں ان کے افکار میں بھی وہ ربط و تسلسل نہیں ملتا جو ان کی فارسی شاعری میں طرہ امتیاز ہے اس کے برعکس فن پر غالب کی گرفت بڑی سخت ہے اس کے اسلوب میں اقبال کے اردو کلام کی طرح کہیں کوئی ڈھیلہ پن نظر نہیں آتا اور فن سے عہدہ براری کا ہی فن غالب کے کلام میں وہ شاعرانہ اثر اور جادو بھر دیتا ہے جو اقبال کے اردو کلام میں باقی ہمہ حکمت و فلسفہ کیاب ہے۔ شیخ محمد اکرام، غالب و اقبال پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" علامہ اقبال کے متعلق سر عبدالقادر کی رائے جس ادب و احترام کی مستحق ہے وہ ظاہر ہے لیکن ہمارے خیال میں

انہوں نے سطحی مشابہت پر زور دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان ظاہری مشابہتوں سے غالب اور اقبال کی شخصیتیں بالکل مختلف

ہیں اور ان کی نسبت یہ کہنا کہ وہ دو قابلوں میں ایک روح تھے، صحیح نہیں ہے۔ "

ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں :-

" اقبال کی شاعری سے انکار کہنا کفر ہے اور نہ ہمیں چنداں اس سے اختلاف ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اقبال

کا بس قدر کلام انہوں نے اپنے دعوؤں کے ثبوت میں پیش کیا ہے وہ سب کا سب فارسی ہے۔ "

واقعہ یہ ہے کہ اگر اقبال کی فارسی شاعری کو زیر بحث نہ لایا جائے اور صرف انہیں اردو کے کلام سے پرکھا جائے تو وہ

فنی چنگی اور اسلوب کی دلکشی میں غالب کی اردو شاعری کے ساتھ دور تک نہیں چل سکتے۔ اس سے کہے انکار ہو سکتا ہے کہ غالب دور انہماک کا آلودہ ہے اور اقبال عہد بیداری کا لیکن اپنی ذہنی ساخت کے مطابق غالب کے دو چار شعر پیش کر کے اسے قنوطی ثابت

ایک اقبال کا ذہنی ارتقا۔ یہ جدید اردو شاعری۔ یہ نئے اور پرانے داغ۔ یہ آثار غالب۔ یہ تعقیدات عبدالحق

نہیں کیا جاسکتا۔ فاضل ناقد کا یہ خیال کہ غالب صرف ”بیٹھے رہے تصور جانائے ہوئے“ کا مبلغ ہے اور کسی ’طوفان‘ سے آشنا نہیں خود اپنی نارسائی فکر کی دلیل ہے اور جو لوگ غالب جیسے رجائی نگار کو یاس و قنوط کا علم بردار سمجھتے ہیں وہ خود اپنی فراسپند نفسیات طبیعی کو جموٹی تسلی دیتے ہیں ورنہ بقول آمل ائمنڈ سٹور ۱۔

”غالب کی حیات جاوداں ہے وہ اس برادری میں شامل ہیں جس کی عمر میں موت کا اثر نہیں جوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ساری زندگی میں ایک ترقی پذیری ملتی ہے وہ ترقی جو ہمیں اقبال کے یہاں نظر آتی ہے۔ یہ ترقی محض شکل پسندی سے سادگی تک یا محکم سے فطری اسلوب تک محدود نہیں۔ ایک ذہنی نشوونما، ایک روز افزوں عارفانہ اور حکیمانہ نظر ایک دلکش و انفرادی شخصیت کی تکمیل سے عبارت ہے۔ بروفسر عزیز احمد غالب کے متعلق لکھتے ہیں :-

”اس میں شک نہیں کہ غالب کے کلام میں رجائیت زیادہ نہیں ہے لیکن غالب کا زمانہ ہی یا سبب و قنوط کا تھا۔ ہر طرف ادوار و زوال و تباہی تھی لیکن غالب میں مریضانہ قنوطیت بہت کم ہے یہ سخت سے سخت مصیبت کے وقت بھی وہ اپنی قابل تعریف خودداری کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ان کے یہاں حکیمانہ ذوق ناچیز حیات کی جھلک نظر آتی ہے جو اندرونی اور داخلی طور پر مستقبل کی طرف نکلنے آئے والے دور کی طرف اشارہ کرتی ہے“

ڈاکٹر شوکت سبزواری کی رائے کا اقتباس شاید اس موضوع کے لئے قطعی وضاحت کا کام دے گا۔

”غالب کی شاعری میں فکری عنصر غالب ہے ان کا یہ فکری عنصر ان کے کلام میں جھلکتا ہے ان کی شخصیت فعلی ہے۔ انفعال غالب کے یہاں ’زبونی ہمت‘ ہے۔ غالب خود میں ہیں خود پسند ہیں۔ آزاد ہیں خود بینی سے عزت نفس، خود پسندی سے غیرت اور آزادی سے خودداری پیدا ہوتی ہے۔۔۔۔۔ غالب کے کلام میں وہ تمام جوہر ہیں جو انسان کی عظمت اور اس کی فطرت کے بے پایاں امکانات کے حامل ہیں۔۔۔

دیوان غالب کے مرتع چغتائی میں خود اقبال نے غالب کی شاعری پر تفصیلی تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :-

”غالب آج بھی زندگی کا سب سے بڑا عکاس ہے“

ان تنقیدی حقائق کے باوجود اگر کوئی شخص اپنی نارسائی فکر کی بدولت غالب کے کلام کی داؤد دستان کے ”غالب کو ستائش و صلہ کی تمنا“ کبھی نہ رہی ان کی فنی عظمت میں کسی سیاسی مصلحت یا مذہبی عقیدت کو کبھی دخل نہیں رہا انھیں اپنے فن کی توانائی اور سازگی پر اعتماد تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ زمانہ کی ناآشنائی و ناقدانہ دانی کے باوجود صرف اپنے دم خم کے سہارے آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس ذہنی مماثلت و فنکارانہ امتیازات کے باوجود نہ ہم اقبال کو غالب کا مقلد سمجھتے ہیں اور نہ نقال اور جس طرح اپنی اس رائے کی تائید میں بحث کے شروع میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا قول نقل کیا تھا اسی طرح ہم سرور صاحب کی اس رائے کی تائید کرتے ہوئے کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔

”اقبال (وہ ان فضاؤں میں پرواز کرتے ہیں جہاں انسان اس کی انسانیت، اس کی قدر و قیمت، بندگی اور خدا کی جبر اختیار عشق و عقل، جیسے مسائل کی تشریح و تفسیر کی جاتی ہے۔ ان کا تکمیل گوئے، روحی، ششیکپیر، طعن اور غالب سب کی پہنچائی کر سکتا ہے۔ ان اشخاص کی برادری میں وہ شاگرد کی حیثیت سے نہیں برابر والے کی حیثیت سے رونق افروز ہیں“

۱۔ نئے اور پرانے چراغ  
۲۔ غالب کی شخصیت  
۳۔ نئے ادب پرانے چراغ

# ثنوی

اور

## (مومن کی جذبات نگاری)

(وحید الدین خاں متین فنچوری)

فنون لطیفہ میں شاعری کا درجہ بہت بلند ہے اور اس میں بھی غزل کے بعد بہترین صنف سخن ثنوی ہے۔ ثنوی بہانہ شاعری ہے اور اسی لئے اس میں نقاشی، مصوری اور جذبات نگاری کے لئے بڑا وسیع امکان پایا جاتا ہے۔ اس صنف میں میر حسن کو خاص شہرت حاصل ہے لیکن اس وقت ہمارا موضوع مومن کی ثنوی نگاری ہے اور اسی پر مختصراً اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں۔ مومن نے خالص عشقیہ رنگ میں چھ ثنویاں کہی ہیں جن کے نام تاریخی ہیں۔ (۱) شکایت ستم۔ (۲) قصہ غم۔ (۳) قول غمیں۔ (۴) تفت آتشیں۔ (۵) حنین منوم۔ (۶) آہ و زاری مظلوم۔ ان میں مومن اپنے ذاتی جذبات محبت کو نظم کیا ہے اسی لئے ان کے پڑھنے سے حقیقی زندگی کے واقعات، احساسات اور جذبات ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ دل کی دلی ہوئی چوٹیں از سر نو ابھر آتی ہیں اور یہ داخلی رنگ مومن کا حصہ ہے۔

ثنوی قصہ غم کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:-

اب عشق ہوا مہرباں پھر بے تاب ہے جانِ ناتواں پھر  
پھر دل کو تیش سی ہو رہی ہے سینے میں خلش سی ہو رہی ہے  
پھر پہنچے ہے اب پیامِ الم کا پھر آنے لگا سلامِ غم کا  
پھر داغ کہن ہے تازہ و تر پھر زخمِ جلگہ ہنسے ہے گلِ پیر  
پھر چشم ہے خوں فشاں و خونبار پھر چہرہ بنا ہے زعفرانِ زار  
پھر دیدار تر ہے دقتِ داماں پھر ہاتھ ہے لیلِ گریباں  
پھر آتے ہیں وہ ہی عشق سے پیہم پھر ہے وہی بخود ہی کا عالم

یہ تمہید پڑھنے کے بعد انگریزی کا مشہور شاعر "KEATS" ہمارے سامنے آ جاتا ہے، یہ دونوں شاعر فنون لطیفہ کے دلدادہ تھے دونوں نے جو کچھ کہا ہے ہماری اسی دنیا کو سامنے رکھ کر کہا ہے اور اسی لئے ان کا کلام دل پر اثر کرتا ہے۔ مومن اور "KEATS" نے اپنے رنگین، شیریں، دلنشیں اور لطیف الفاظ میں ماضی کی حسین یادوں کو اس طرح دہرایا ہے کہ پڑھنے والا اپنے ماضی کی ہر کیف وادیوں میں پہنچ جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مومن ۱۵ سال کی عمر میں ناگاہ کوٹھے سے گریز اس جہان "آب و گل سے" سے منہ موڑ گیا اور "KEATS" دق میں مبتلا ہو کر عین شباب کے عالم میں اپنی زندگی کے ۲۶ ویں سال مر گیا۔ یہی وجہ ہے کہ "KEATS" کی شاعری میں اتنی پختگی، گہرائی اور گیرائی نہیں پائی جاتی جتنی مومن کے کلام میں موجود ہے۔ چند اشعار ثنوی تفت آتشیں کے ملاحظہ ہوں:-



اپنے تجربے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور چند ہی دنوں میں آئین نو اپنا گروہ بنا لیا۔

مومن کی مثنویاں بلاغت و سلاست کا سرچشمہ ہیں۔ ان میں ہلاکی روانی، رنگینی، دلنشینی اور دلیر نیری پائی جاتی ہے۔ وہ جب اپنے دل جذبات، کیفیات اور حسیات کا اظہار کرتے ہیں تو قصص اور مبالغہ سے کام نہیں لیتے۔ ان کے مبالغہ سے یہ حقیقت براہِ ظن نقاب ہو جاتی ہے کہ جب مومن اپنے جذبات، وارداتِ قلبی، کیفیات اور حسیات کو نظم کرتے ہیں تو بے ساختہ سلیس اور بلیغ الفاظ ان کی زبان سے نکلنے لگتے ہیں۔ مومن کی جذبات نگاری میں وہ سحر کاریاں پنہاں ہیں جو اردو ادب میں خال خال شعرا کو نصیب ہوئی ہیں۔ البتہ بیان میں کہیں کہیں سوجھ بوجھ ضرور آگیا ہے۔ خال خال اشعار سے عریانی بھی جھلکتی ہے، جس سے بقول شمس العلام امداد امام اثر کو بے گروہ کی پو آتی ہے۔ مگر یہ وہ کوچہ ہے جس کی خاک چھاننا شعرا و اردو کا عام مذاق بن چکا تھا۔

مومن کے عزیز ترین شاگرد خواب مصطفیٰ خاں شیفہ اپنی ”گلشن بیجار“ میں رقم طراز ہیں: ”نام ائمہ الفاظہ بیگم عرف صاحب جی بتقریب مراد ابا مومن خاں کا رخ افتاد ما ہے چند کار باور دو دو اورد۔ مثنوی قول غمیں نام کہ از مصنفات خاں معرب الیہ است شرح نسخ حسن و جمال ہماں موزوں قد است“ مثنویوں کی سادگی اور روانی، زبان کی سلاست و بلاغت صاف نگاری کر رہی ہیں کہ مومن نے آپ بیتی لکھی ہے۔ اس بات کا خارجی ثبوت کہ مومن کی محبوبہ کا نام صاحب جی تھا اور ذہنی حقیقت میں مثنوی قول غمیں کی ہیر و من ہے ”گلشن بے خار“ کی مذکورہ بالا عبارت سے مل جاتا ہے۔

مومن کی مثنویاں حقیقت نگاری کی وجہ سے خاص داخل رنگ رکھتی ہیں اور جا بجا مومن کی اپنی دلچسپیوں اور مشاغل کی حقیقی تصویریں آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ مثنوی قول غمیں میں مومن حکیم کے لباس میں جلوہ گر ہوتے ہیں اور صاحب جی کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہی دنیا اور مانی ہا کی خبر نہیں رہتی اور دل ہاتھ سے جاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

میں نے اس نبض پر جو ہاتھ دھرا ہاتھ سے میرے مراد دل ہی چلا  
اس کو جو ہاتھ لگایا میں نے دل سے بس ہاتھ اٹھایا میں نے  
آفت تازہ جو جان پر آئی، یہ غزل اپنی زباں پر آئی،

ایک دوسری جگہ مومن اختر شناس کے روپ میں نظر آتے ہیں۔

کہاں ہے بد رسیمادہ ترجم کہ ہول میں راز دان سیر انجم  
نہیں کیا تم نے احکام آزمائے انھیں باتوں نے تو یہ دن دکھائے  
یہ سب کچھ سچ پر اتنا بھی کہیں گے کہ جیتے ہیں تو اک دن مل رہیں گے  
سلیماں ہدم بلفیس ہوگا، قرآن زہرہ و برہیں ہوگا،  
ابھی سے گر جفا کم ہو تو اچھا زیادہ ربط باہم ہو تو اچھا

مثنوی نقشہ غم میں مومن خاں ہمیں مسکراتا شگفتہ، شراب فوجوانی میں مدہوش، نشاط و شادمانی سے سرشار نظر آتا ہے۔ دنیا سے سروکار ہے، دین سے مطلب ہے۔ ایک آوارہ دہرہ گرد ہے۔

تھا نام تو مومن اور دین کفر جان محو بتاں و دلشیں کفر  
ربط اُس کو بتاں نازیں سے دنیا سے نہ کام کچھ نہ دیں سے  
مدہوش شراب فوجوانی سرشار نشاط و شادمانی  
ہر دم اُسے شاد شاد دیکھا سرست سے مراد دیکھا  
جول غنچہ سدا کھلے ہے جانا ہر وقت ہر آن مسکراتا

دیوانوں سے شوق بے نہایت      اشعار کا ذوق بے نہایت  
ہر پیر و جواں سے آشنائی      سارے ہی جہاں سے آشنائی

مومن جب جذبات کا بیان کرتا ہے تو خود بھی وجد کرتا ہے۔ اُس نے فطرت انسانی اور کائنات کا وسیع مشاہدہ کیا ہے وہ نازک سے نازک مضامین کو آسان اور مناسب الفاظ میں ادا کر دینے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ اُس کے یہاں الفاظ کا طعم ہے اور تخیل و الفاظ کا حسین سنگم۔ مومن نے لفظی ہم پیر بھییر سے ایک خوش رنگ فصاحت کی ہے جس میں جا بجا معنی آفرینی کے سیارے گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ ان ٹنویوں میں اکثر موقعوں پر جذبات نگاری کے وہ کمال دکھائے ہیں کہ جن کی نظیریں عبدالباری آسی لکھنوی "موازنہ مومن و غالب" میں لکھتے ہیں۔ "مومن نے باستانائے بعض سب عشقیہ لکھی ہیں اور اس طرز میں گویا وہ خود ہی موجد اور خود ہی خاتم ہیں۔ ان کی ٹنویاں حسن و عشق کے واقعات کے آئینے ہیں جن میں دونوں تصویروں کا بال بال نظر آتا ہے۔ ان ٹنویوں کے بعض بعض مناظر میر تقی اور میر حسن کی ٹنویوں سے ملتے جلتے ہیں۔ مگر اسل یہ ہے لغوہ فراق کا بیان ہو عودہ اشتیاق اور وصال کا اس میں وہ آپ اپنی نظیر ہیں۔ کیونکہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب وہ زار دات ہیں جو خستہ جانان عشق پر گزرتی رہتی ہیں اور یہی سبب ہے کہ جو لطف ان کے بیان میں ملتا ہے وہ دوسروں کے بیان میں نہیں ملتا۔"

منوی قول عمین

کیا نہ ڈھب سے ملاقات ہوئی      کہ نہ کچھ بولی نہ کچھ بات ہوئی،  
دل کے حسرت زدگان بیکس      دور بیٹھے ہوئے روتے رہے بس  
خونفشاں لب پہ وہ آہیں باہم      حسرت آلودہ لگا ہیں باہم  
گرچہ ہرگز بھی نہ تھی تاب کلام      پھر یہ بولی کہ زرا جی کو مقام  
کہ یہ کیا حال ہے کیوں روتے ہو      مفت کس واسطے جی کھوتے ہو  
اب تم اوروں سے لگا لیجو جی      نہ ہوئے ہم تو کوئی اور سہمی  
ہاں اٹھ کر فکر ہو تو ہم کو ہو      رنج و اندوہ ہو جو ہم کو ہو  
کہ بری آہ ہمار سی خوشے      ہم میں اک مہر و وفا کی بوٹ  
خیر رہنا ہوا اب تک اپنا      اب وطن تم کو مبارک اپنا  
تم رہو خوش کسی جانان سے ساتھ      ہم چلے حسرت و حراماں کے ساتھ  
کام دل رنج و بلا کو سونپا      تم کو لو ہم نے خدا کو سونپا  
کہہ کے یہ اٹھ کئی جی کھدتی ہوئی      ہچکیاں لیتی ہوئی روتی ہوئی  
ہم بھی روتے ہوئے اپنے گھر آئے      بادل مضطرب و مضطرب آئے

ٹنوی شکایت ستم میں کئی دل بھریاں اور فراق دوست میں مضطرب و بہقرار رہنے کے بعد مہربان سے اتفاق مومن کی ملتا ہوا جاتی ہے۔ مومن سے آنکھیں چار ہونے پر مہربان پر جو گزرتی ہے اُسے وہ اپنے کمال مصوری و جذبات نگاری سے اس طرح بیان کرتا ہے۔

کئی دن بعد ایک شب تنہا      اتفاقاً ملی وہ مہربان  
بس مجھے دیکھتے ہی رونے لگی      سلب گو ہر شمار ہونے لگی  
گریہ رہ رہ کے بار بار آیا      جھوم جھوم ابرو نو بہار آیا

بہ ہر دم وہ نالہ غم کش  
نفس گرم کا فلق دمساز  
رخسار جس کا نہ ہو سکے دم کش  
غیرت برق شعلہ آواز  
چاہے وہ چپ رہوں پہرہ نہ سکے  
جی میں دل کی کہو پہ کہہ نہ سکے  
جوش میں درد دل کہا کب جائے  
یوہں بر باد حرف مطلب جائے  
مثنوی قصہ غم میں انتظار کی بے چینی و بے قراری کی تصویر اس طرح مینچی ہے :-

گر کوئی گھڑی کی لگ گئی دیر  
بے فائدہ بے قرار رہنا  
یہ فکر کہ کس لئے ہوئی دیر  
دوسو اس سے دل ہی دل میں کہنا  
کیوں آئے نہیں وہ کیا سبب ہے  
بیکس کی طرف نگاہ کھڑا  
جو تیری رضا ہو خیر الہی  
وہ دیدہ منتظر سوئے در  
بیتاب وہ گشت صحن خانہ  
بے طاقتیوں کا زور جاں پر  
یا قادر و یا قوی زباں پر

کہاں یہ حال ہے کہ مومن کے بغیر جی نا محال ہے ایک ایک پل کا ٹنڈا دشوار ہے وہ سانس آیا تو اس کی جان میں جان  
آئی۔ ساری سنجیدگی کھو کر وہ مومن کا دل ٹوٹتی ہے اور حقیقت کی گہرائی تک پہنچنے کی انتہائی کوشش کرتی ہے  
اس کے اندر مدولی ہوئی عورت جاگ اٹھتی ہے ۔

میں آیا تو تن میں بان آئی  
کس لطف سے منہ کو دیکھ رہنا  
کیوں دیر لگی تمہیں کہاں تھے  
تشریف شریف جلد لائے  
اب دور طرف نہ دل تھارا  
دل آ نہیں اب یہاں ذرا جی  
اب میری نہیں ہے راہ دل میں  
میں ایک بنا مومن نام کی بیتابی

مثنوی قلم غم میں ایک بنا مومن نام کی بیتابی  
کیا کہوں آہ یہ قسمت اپنی  
اس کو پرواہ ہی نہ ہو کچھ نہ ہمار  
کچھ نہ واقف غم جاں سے ہو میر  
جی سدا بس کے لئے بھر آئے  
کہہ گئے یہ بات جو ہیں رونے لگا  
پھر تو اشک آنکھوں میں وہ بولائی  
کہہ دوں میں بھی اگر اپنا احوال  
دیکھا تو نظر میں آن آئی  
کس ناز سے غصہ ہو کے کہنا  
جاؤ وہیں اب تک جہاں تھے  
ہاں کا ہے کو اب بھی آپ آئے  
آنا ہے یہاں کا ناگوار را  
بیزار یہاں سے ہو گیا جی  
ہے اور کس کی چاہ دل میں  
جس کے پیچھے ہو یہ حالت اپنی  
فکر دہاں نہ خیال آزار  
بے خبر درد نہاں سے ہو میر  
درد دل اس کو نہ باور آئے  
اور ہی حال میرا ہونے لگا  
یہ سخن روئے زباں پر لائی  
پھر کہو آپ کا ہو کیا احوال

مومن کی مثنویاں واراداتِ محبت، کیفیاتِ عشق اور نفسیاتِ محبت سے لہریں ہیں اس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے  
یہی وجہ ہے کہ اس کے اشعار دل میں اتر جاتے ہیں اور قلب پر انسا علی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

**مثنوی لف آتشیں**  
عالم حیرت رخ نے دکھایا  
آئینہ نے آئینہ بنا یا  
کہنے نہ پائے رخ سے ہم  
حیرت دل سے کھوئے گئے ہم  
دل میں رہے صد حرفِ تکلف  
کھل نہ سکا کچھ شوقِ نہفتہ  
کیا کہوں حالتِ جانِ حزیں کی  
بات تو سمجھو بات نہیں کی  
دیر تلک بیہوش پڑے تھے  
دُٹھے تو خاموش کھڑے تھے

**مثنوی حنینِ مغموم**  
اڑ گیا رملِ امید چارہ ہر  
ناامیدی کی بر آئی آرزو  
سر آٹھا با خاطر مایوس نے  
پاؤں پھیلائے کفِ افسوس نے  
چشم سے ٹپکے شریکِ لالہ گوں  
فوجِ حراماں نے کیا حسرت کاغذوں  
شورو افغان نے آٹھا سر پہ گھر  
سہر نفس نکلائے محنتِ جگہ  
ہو گئی دل سوز آہ آتشیں  
آسمان رس نالہ کر سی نشیں  
دوسری جگہ سے

**مثنوی آہِ وزاریِ مظلوم**  
پھر فغان کرتا ہوں جی گہرائے ہے  
کیا کروں رہ رہ کے حسرت آئے ہے  
دل نہ ٹھہرا تھا کہ مضطر ہو گیا  
جی نہ سمجھا تھا کہ بدتر ہو گیا  
اے نسیم صبح گر جائے اُدھر  
تو یہ کہہ بنا کہ اسے بیداد گھر  
کب تلک ابس بے نیاز کی کب تلک  
کب تلک دشمنِ فوازی کب تلک  
کب تلک بے جرم پر جو رو جفا  
بے سہب آرزو کی کیوں بیوفا  
کب تلک ترک دلا سا کب تلک  
کب تلک یہ ناند ہچا کب تلک  
تیری بیزاری سے جی بیزار ہے  
سخت کوشی نیم جاں پہ بار ہے  
تفائلِ حال سے میرے نہ کر تو  
خیالِ امتحاں سے در گزر تو  
تری صورت نے میرے دل لیا ہے  
تیری تصویر نے حیراں کیا ہے  
دوسری جگہ سے

کیا آخر سفرِ بیچارگی سے  
ہوا ویرانہ گھر آوارگی سے  
چلا منزلِ بمنزلِ خاک آڑاتا  
ہوا پر خاک کے تودے لگاتا  
سراسیمہ پہ نیشاںِ حالِ بیدل  
نہ ہمارا نہ سامان و نہ منزل  
ذریعہ سایہ وقفہ دو پہر کہ  
نہ حد و انتہا عزم و سفر کہ

ان چہ عشقیہ مثنویوں کے علاوہ مومن کی چار مثنویاں اور بھی ہیں جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے: ۱۔ (۷) مثنویِ ناتمام (۸) غنوی دیگر۔ (۹) مثنوی دیگر۔ (۱۰) مثنویِ جہادیہ۔ لیکن ان کا تعلق بیاںِ حسن و عشق سے نہیں ہے۔

# موج نسیم

## (نسائی جذبات و نسائی لب و لہجہ)

(کنول نسیم کنجاہی)

ہوا کی لہروں پہ بہتا بہتا کہیں سے اک گیت آگیا ہے  
 تڑپ اٹھی یاد پھر کسی کی کسی کا غم پھر سسک رہا ہے  
 وہ جا چکا ہیں گھر سے دل کی دھڑکنوں کا وہی ہے عالم  
 کچھ آہٹیں بھی بکھر رہی ہیں سکوت بھی مسکرا رہا ہے  
 وہ مجھ سے کل تک کھنپے ہوئے تھے اور آج یہ دفعتاً محبت  
 کبھی کبھی انقلاب دنیا میں چپکے چپکے بھی آگیا ہے  
 ترے حضور آج نعمتِ آخریں کا انعام چاہتی ہوں  
 وہ ایک آنسو جو آج پلکوں پہ تیری آگر ٹھہر گیا ہے  
 میں سینہ کائنات کے زخم گن رہی ہوں جن پرستو  
 بھاگ فصل بہار آئی، بھاگ کہ موسم بدل گیا ہے  
 وہ لذت انگیز کپکپی سی، وہ کیف آمیز سنسناہٹ  
 نہ پوچھ کیفیتِ دل و جاں، کسی کا جب سامنا ہوا ہے  
 زمیں سے تا آسمان یہ کیسے چراغ سے جگمگا اٹھے ہیں  
 ہماری آغوش آلودہ میں یہ کون چپکے سے آگیا ہے  
 حجاب آمیز فرصتوں میں، وہ کشمکش کے حسین لمحے  
 کبھی جو یاد آگئے ہیں دل پر شفق کا بادل برس پڑا ہے  
 یہ تہنساں ہیں کہ میری صدر رنگ آرزوئیں ہیں بالِ نشان  
 یہ فصل گل ہے کہ میرا عہدِ نشا و نستہ بھر آگیا ہے  
 چھڑک رہا ہے یہ کون خوشبو، یہ کون کرنیں کھیرتا ہے  
 چمن میں چپکے ہی چپکے آکر یہ کون جاو و جگا رہا ہے  
 میں اپنے خون جگر سے بھی اب نہ کوئی مشعل جلا سکوں گی  
 رہ محبت میں مجھ پہ لوگو اب ایسا ہی وقت آگیا ہے  
 یہ پہروں خاموش لیٹے رہنا، کسی کی سننا نہ اپنی کہنا  
 کنول کو کیا ہو گیا ہے لوگو، کوئی بتاؤ کہ بات کیا ہے

## سموم و صبا

(فضا ابن فیضی)

سموم :- وہ ہوا قافلہ گرم مرا راہ سیار  
نکبت و رنگ سے لہریں سبو ٹوٹ گئے  
سرو آزاد نہیں، شبنم آوارہ نہیں  
ڈال دی میں نے مناظر کی بہشتوں پہ نقاب  
نسبت خاص رہی پھول سے انگاروں کو  
یہ شگوفوں کے جنازے یہ گلابوں کے کفن  
وہ سبزے کی طراوت نہ وہ لالے کا جمال  
میری ہر سانس یہاں تخم خزاں بوقی ہے

جم گیا کتنے نظر تاب شگوفوں پہ غبار  
میرے آہنگ سے مضرب نمو ٹوٹ گئے  
اب کوئی چیز یہاں جنتِ نظارہ نہیں  
کب سے ہے لوحِ کمالِ دادی نسرین و گلاب  
کھا گئی میری نظر کتنے سمن زاروں کو  
اب نہیں پیش نظر "فتنہ نسرین و سمن"  
نہ رہے اب وہ دل آویز چمن کے خط و خال  
باغ میں نرگس بیدار ہو روتی ہے

خمرِ برقی ہوں میں آگ کا انبار ہوں میں

اشہبِ مرغِ مفاہات کی رفتار ہوں میں

صبا :- سن لیا میں نے کہ ایامِ محزاں آئے ہیں  
یہ فنا ریز تبسم یہ ستم خیز کرم  
آتش افروز ہے صحنِ چمنستان تجھ سے  
تو ستم کار ہے ہستی کے خمستانوں میں  
گیسوئے حسن پریشاں ہیں مرے شانوں پر  
زندگی ہے مری پانزیب کی جھنکار دل میں  
برق سی پھول کے احوال پہ لہراتی ہے  
دیکھ ! یہ میری طرہناک فضاؤں کا سکون

تو نے موجوں میں کچھ آتشکدے سلگائے ہیں  
شبنم و رنگ کی جانب یہ تباہی کے قدم  
پھول کی گوشت ہے گہوارہ شبنم مجھ سے  
نکبت افشاں ہوں میں فطرت کے حیا بانوں میں  
ہے گماں ابر کرم کا مرے پیالوں پر  
آنکھ کھولی ہے کلی نے مرے گہواروں میں  
تیرے کردار پہ پھر مجھ کو ہنسی آتی ہے  
بچنے والی ہے تری آتشِ میتاب جنوں

رائگاں کو ششیں تخریب تیری جائے گی

پھر مرے لطف سے یہ خاک نموبائے گی

# نفحاتِ عمیر

(عنبرِ جنائی)

لب ہے خاموش کو اک بار کیا تجھ سے کلام آئنگہ پریم ہے کہ دیکھا ہے تجھے ایک نگاہ  
دل فسرده ہے کہ پایا متبسم تجھ کو، روح بے چین ہے کہ دوست کوئی اس کا گناہ؟

یہ کیفیت کہ دل کا تڑپنا کہوں ہے حسرت کہوں جسے کہ تمنا کہوں ہے  
جب تو نہیں تو تیری جدائی کا غم سہی! کوئی تو ہو کہ غم سے اپنا کہوں ہے!

ثباتِ حسن نہیں ہے، بقائے حسن نہیں، بجز زوال کے کچھ ارتقائے حسن نہیں  
ہوائے ناز و غرورِ جمال سب فنا فی، نصیبِ عشق میں پھر بھی وفائے حسن نہیں

تیری ہی یاد ہے بالقصد ہو یا بے ارادہ ہو تصور تیرا ساقی ہے اگر ہر سانس بادہ ہو  
اگر میری سب آوازیں سمٹ آئیں فضاؤں سے یقین ہے اُن میں تیرا نام ہی سب سے زیادہ ہو

اک اعتمادِ خاص سے میں سوچتا رہا ٹھٹھکا ہوں یوں بھی اور کہ تو ساتھ ساتھ تھا  
الزام دے کے تجھ کو مگر مطمئن نہیں اپنی تباہیوں میں بڑا میرا ہاتھ تھا

پندارِ احتساب، نہ تکلیں رہبری مجھ کو زباں پہ ناز، نہ زعمِ سخنوری  
تنقیر پر ہے رنج، نہ تحسین پر غرور احساسِ کمتری ہے، نہ دعوائے برتری

## کلام ارشد (بھوپال کا ایک اور خوش گو نوجوان شاعر)

رشد صدیقی  
باب ۱۔

بھنگ گیا ہوں میں راہِ غمِ محبت میں پکار اے غمِ دوراں ذرا پکار مجھے  
کون دیتا ہے تصور میں تسلی مجھ کو تم تو ہو مجھ سے بہت دور تھیں کیا معلوم  
آغاز سے پہلے ہی اکثر انجام سے دل گھبراتے آتا ہے زباں پر نامِ سحر اور شام سے دل گھبراتا ہے  
یہ طلعتِ نوریہ رنگِ شفق، پختہ گل یہ حسنِ سحر سحر تو دل کش ہے لیکن انجام سے دل گھبراتا ہے  
اچھا ہی ہوا وہ پہلے پردہ سے نہ سراپا لے ارشد اک چاند کیسے بھی چھپ جاتا یہ لاکھوں اک کیا کر  
اٹھی ہے جب نظر تو برق بن کر بھنگی ہے جب تو شبنم ہو گئی ہے  
جو کی توبہ تو ساغر سے چھلک کر مرے حصے کی خود کم ہو گئی ہے  
دل کو خبر ہوئی نہ تمھیں کو خبر ہوئی آتا ہے یوں بھی نام تمھارا زبان پر  
پھولوں کے چھلکے جاموں سے تاروں کی نزاراں شمولیگ جس رنگ میں چاہا تم نے مجھے اے جان تمنا دیکھ لیا  
آہلِ جبرائست منصور کچھ سہیں لیکن سوال یہ ہے کہ وارور سن پہ کیا گزری  
ہمیں تو ہیں کہ جو برق و شرر سے کھیلے ہیں ہمیں سے پوچھ رہے ہو چین پہ کیا گزری  
پہونچ کے منزلِ مقصد پہ یہ بھی پوچھیں گے کوشش روی میں دلِ راہزن پہ کیا گزری  
بہت اداس ہیں ستمیں غریب جانے کی وہ جالے آج تری انجمن پہ کیا گزری  
خوابِ خراں چلے آ رہے ہیں وہ دامنِ سچیتے دکھا ہو چھکائے شبِ غم سے کہہ دو وہ پاؤں گزرتے ہیں غلوں کی وجہ لائے پٹے  
محبت میں اچھے برسے سب زمانے گزرتے کو بوں تو گزرتے ہیں لیکن غم و بگیسی کا وہ عالم دہو چھو کہ جب آس بند تھی ہی دل ٹوٹ چلے  
تھے ایسے بھی ٹکڑے مری داستان میں نہیں خود وہ اپنا ہی انسان تھے وہ حدِ مگر حاصل داستان تھا جہاں ان کی آنکھوں میں آنسو بھر  
اسیروں کا بہاروں سے بہت گہرا تعلق ہے جن میں برق کو نہ لگی نفس میں روشنی ہو گی  
داغِ رخصت ہی مجھ کو کافی تھا تم یہ آنکھوں میں اشک کیوں بھر لائے  
میں بدستِ غمِ فرقت کی داد دیتا ہوں تری لطیفِ ندامت کی داد دیتا ہوں  
تم رہے عشق میں قلندرِ مہر ساتھ نہ دو سلسلہ غم کا خدا جانے کہاں تک پہونچے  
جنونِ عشق میں وہ منزل میں بھی گزری ہیں جہاں نظر کو نظر کے سلام آئے ہیں  
اٹھی ہے بزم میں یوں تو ہرک پہ ان کی نظر گھر پیام پہلے ہی نام آئے ہیں  
نفس سے پھول نظر آ رہے ہیں جوشیلا ہزار بار مرے آشاں سے گزرے ہیں  
غمِ حیات کی تلخی رہی نہ جن میں شریک وہ لمحے عشق میں کچھ بائیکاٹ سے گزرے ہیں  
سکون مانگا ہے گھبرا کے شورشِ غم سے یہ لغزشیں بھی ہوئی ہیں کبھی کبھی ہم سے  
تباہیاں مری قسمت سہی گمراہ دوست شکایتیں ہیں ترے انتہات پیہم سے  
انھیں ملی ہے مرے کارواں کی راہبری جو دو قدم بھی مرے ساتھ چل نہیں سکتے

## مطبوعات موصولہ

**لطائف السعادت** | یہ ایک کتاب ہے انشاء اللہ خاں کی جس میں انھوں نے نواب اودھ سعادت علی خاں کے لطائف جمع کر دئے تھے۔ یہ تصنیف نایاب تھی اور صرف برٹش میوزیم میں اس کا ایک نسخہ موجود تھا ڈاکٹر آمنہ خاتون نے اس مخطوطہ کا فوٹو گراف حاصل کر کے اس کا ترجمہ شائع کیا ہے جو نہ صرف ترجمہ ہے بلکہ ایک مستقل تفسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اصل کتاب بیت مختصر ہے لیکن فاضل مصنف نے اپنے حواشی و ملحقات سے اس کو ایک مفید تذکرہ کی حیثیت دیدی ہے جس میں مستحقی، رنگین، قتیل، خان آرزو وغیرہ کے بہت سے وہ پہلو روشنی میں آ جاتے ہیں جن کو بعض تذکرہ نگاروں نے تاریک بنادیا تھا۔

”آمنہ خاتون“ اس کتاب کو ایڈٹ کرنے سے پہلے ”تحقیقی نوادر“ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے چکی تھیں، لیکن چونکہ انھیں ادب سے خاص مناسبت ہے اس لئے انھوں نے اپنی تحقیق کا سلسلہ جاری رکھا اور ”لطائف السعادت“ پر کام شروع کر دیا۔ یہ کام اس میں شک نہیں کافی محنت و سلیقہ چاہتا تھا اور ملک کو محنوں ہونا چاہئے کہ اردو کی ایک نایاب کتاب ان کی کوشش سے ہمارے سامنے آگئی۔

اس کتاب کے لطائف فارسی میں ہیں لیکن فاضل خاتون نے ان کا ترجمہ اردو میں بھی کر دیا۔ آمنہ خاتون نے ہمارے کالج میسور سے ایم۔ اے کیا تھا لیکن ڈاکٹریٹ کی ڈگری علی گڑھ سے حاصل کی۔

یہ کتاب پانچ روپیہ میں نمبر ۳۳۹۳ فٹ عید گاہ میسور سے مل سکتی ہے۔

**۱۹۵۴ء کا بہترین ادب** | مکتبہ اردو لاہور ہر سال ”بہترین ادب“ کے عنوان سے ایک انتخاب کتابی صورت میں شائع کرتا ہے جو یقیناً بڑی مفید چیز ہے۔ چنانچہ اس سال بھی اس نے ۱۹۵۴ء کے ادب کا جائزہ لے کر ایک انتخاب اسی قسم کا شائع کیا ہے، جس میں مقالے، لطائف، فسانے، ڈرامے، غزلیں اور گیت سبھی کچھ شامل ہے۔ یہ انتخاب تین مختلف ادیبوں نے کیا ہے۔ مقالے کے تحت چھ مضامین انتخاب کے گئے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین

مضمون تخلیق شعریہ، عشرت رحمانی کا اردو ڈرامہ کی تاریخ پر اور مجنوں گو رکھپوری کا نئی پڑائی قدروں پر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ افسانوں میں غلام عباس، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور جیلانی بانو کے افسانے خوب ہیں، ڈرامے دو ہیں اور دونوں اچھے۔ گیت دو ہیں اور دونوں میری سمجھ میں نہیں آئے، غزلوں کا انتخاب بھی بُرا نہیں، لیکن رباعیوں کے سلسلے میں صرف فراق کی وہ رباعیاں لی گئی ہیں جو یقیناً انتخاب کے قابل نہ تھیں انھوں نے اس رنگ کی اس سے بہتر رباعیاں بھی ہیں۔

نظم کا حصہ تقریباً ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے جن میں سے اکثر نظموں کے متعلق نہیں سمجھ سکا کہ ان کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مجموعہ کا یہی حصہ زیادہ کمزور ہے۔

یہ انتخاب ۵۰۰ صفحات کو محیط ہے اور چھ روپیہ میں مکتبہ اردو لاہور سے مل سکتا ہے۔

**اسلامی روایات** تالیف ہے جناب محمد حفیظ اللہ صاحب کی جسے مسلم اکاڈمی پھلواڑی شریف پٹنہ نے شایع کیا ہے اس میں قابل مؤلف نے رسول اللہ، خلفاء راشدین، خلفاء بنی امیہ و بنی عباس اور بعض سلاطین کے ایسے واقعات و روایات کو یکجا کر دیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اکابر اسلام کا انشلاق گنتا بلند تھا اور دیانت و امانت، صبر و استقلال، اخوت و مساوات عدلی و حق پسندی کا اسلام میں کیا معیار تھا۔ ایسی کتابیں یقیناً بچوں کے لئے بہت مفید ہیں اور ضرورت ہے کہ ابتدا ہی سے ان کے سامنے ایسا سبق آموز لٹریچر پیش کیا جائے۔

صفحہ ۱۶۸ صفحات - قیمت ۲۰/- - لٹنے کا پتہ مسلم اکاڈمی پھلواڑی شریف

**ابو ہریرہ** روایت احادیث میں ابو ہریرہ کو جتنی اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، کیونکہ ان سے زیادہ کسی نے احادیث کی روایت نہیں کی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے پانچ ہزار سے زیادہ حدیثیں روایت کیں اور عقل انسانی سے باور نہیں کر سکتی کہ تنہا ایک شخص کی اتنی احادیث تمام و کمال رطب و یابس سے پاک ہوں۔ علی الخصوص ایسی صورت میں جبکہ راوی اپنے اخلاق و کردار کے لحاظ سے بھی کوئی خصوصی بلند درجہ نہ رکھتا ہو اور اس کی روایات بھی ایسی ہوں جو درایتاً ناقابل قبول ہوں لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ رکھ کر حقیقت ہے کہ بہت سی احادیث ان کے نام سے غلط منسوب کر دی گئی ہیں اور ان کی صحت کی ذمہ داری ان پر عاید نہیں ہوتی۔ اس کتاب میں جو ترجمہ ہے آقا عبدالحسین شرف الدین مومنی۔ تصنیف کا اسی موضوع پر گفتگو کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں جن عقلی و تاریخی دلائل سے کام لیا گیا ہے وہ اپنی جگہ فی وزن رکھتی ہیں۔

کتاب چونکہ ایک شیعہ عالم کی لکھی ہوئی ہے، اس لئے ابو ہریرہ کے باب میں اس کی سخت تنقید ہونا ہی چاہئے تھے لیکن اس سلسلہ میں بعض صحابہ کا ذکر جس انداز میں کیا گیا ہے اس سے عصبیت و غلو کی بوضوح آتی ہے جو یقیناً عالمہ نان کے خلاف ہے۔ اچھا ہوتا اگر ہم اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس نہ کرتے کہ یہ کسی غالی شیعہ عالم کی لکھی ہوئی ہے جیسے مولوی محمد باقر نقوی نے کیا ہے۔ صفحات ۳۰۴، ۳۰۵ صفحات - قیمت ۲۰/- - لٹنے کا پتہ: منیجر اصلاح کجھو (بہار)

**ہستان روس** منظوم ترجمہ ہے بعض مشہور روسی نظموں کا جسے ڈاکٹر پریم لال شرفانے اصل زبان سے اردو میں پیش کر دی ہے۔ چونکہ ڈاکٹر شرفانے خود روسی زبان باقاعدہ حاصل کی ہے اس لئے صحت کے لحاظ سے ان ترجموں کوئی حرج نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ روسی نظموں کا انتخاب انھوں نے کس اصول کو سامنے رکھ کر کیا ہے ہم شرفا صاحب کی یہ کوشش قابل تعریف ہے کہ انھوں نے اردو میں ایک ایسی زبان کے ادب پاروں کے منتقل کرنے کا آغاز کیا ہے جسے انسانی اور جدید انقلابی ادب کے لحاظ سے کافی ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مفہوم کے لحاظ سے یہ ترجمہ اصلی زبان کی پوری ترجمانی کرتا ہو، لیکن اردو شاعری کے لحاظ سے کافی ترقی کا محتاج ہے۔ اگر یہ ترجمہ نشر میں کیا جاتا تو زیادہ مناسب ما۔ صفحات ۱۶۸ - قیمت چار روپیہ - لٹنے کا پتہ ۱ - مکتبہ قصر اردو - اردو بازار دہلی۔

**ماہکار فاروقیہ** برہان پور کی مسجد جامع بڑی اہم تاریخی عمارت ہے۔ یہ عمارت مغلیہ دور کی ہے جب عبدالرحیم خانقاہان اس مسجد کے حالات عبدالباقی تھانوی نے مآثر رحیمی میں تفصیل کے ساتھ درج کی ہیں، لیکن اس رسالہ کے مؤلف جناب جاوید برہانپوری نے دوسرے ذرائع سے بھی اس کی تعمیری خصوصیات کا لبر بڑی وضاحت کے ساتھ کیا ہے اور اس طرح اس کتاب نے ایک مفید گائیڈ کی صورت اختیار کر لی ہے۔

قیمت ۵/- - صفحات ۳۲ - لٹنے کا پتہ ۱ -

**حیات زرخش** کتاب زاہدہ خاتون شروانی کے سوانح حیات پر مشتمل ہے جسے ان کی ماموں زاد بہن انیسہ آفرین بیگم شروانی نے مرتب کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب زاہدہ خاتون کی اردو فارسی نظمیں زرخش کے نام سے ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوا کرتی تھیں اور اہل علم و ادب انھیں بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔

یہ کتاب زیادہ تر خود نوشت سوانح کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے اس لئے وہ ایک حیثیت سے آٹوبیوگرافی بھی ہے۔ اس میں زاہدہ کے حالات بچپن سے لیکر رحلت تک کے تمام و کمال درج ہیں اور ان کی علمی خدمات کا ذکر بھی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ زاہدہ ہمارے ملک کی نہایت قابل خاتون تھیں اور فارسی میں ان کا شاعرانہ ذوق بڑا پاکیزہ تھا۔ ان کا مجموعہ کلام ”فردوسِ نخل“ عرصہ ہوا کہ غریب نسواں لاہور نے شائع کیا تھا جسے ملک نے بہت پسند کیا۔

یہ کتاب ۲۵ صفحات کو محیط ہے اور تین روپیہ میں مسعود منیر لٹریچر ہاؤس سے مل سکتی ہے۔

**دین حق** علامہ شرف الدین موسوی عراق عرب کے نہایت مشہور شیعہ عالم ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار یہ مصر گئے تو وہاں کے کسی سنی عالم سے شیعہ سنی اختلافات پر تبادلہ خیالات ہوا اور پھر بعد کو مراسلت کے ذریعہ سے یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا اور یہ کتاب انھیں مراسلات کا مجموعہ ہے جسے عربی زبان سے مولوی سید محمد باقر نقوی نے اردو میں منتقل کیا ہے۔

اس میں شک نہیں یہ سلسلہ مراسلات بڑی دلچسپ چیز ہے جس میں تمام اختلافی مسائل پر فریقین نے کھلے دل سے اظہار خیال کیا ہے اور اخیر میں یہ سلسلہ مراسلت اس طرح ختم ہوتا ہے کہ سنی عالم، شیعہ عقاید اختیار کر لیتا ہے۔

یہ کتاب دراصل سنی شیعہ مناظرہ سے تعلق رکھتی ہے جسے ”مراسلات“ کی صورت میں شائع کیا گیا ہے کیونکہ کسی جگہ مقرر کے سنی عالم کا نام ظاہر نہیں کیا گیا۔ اور سنی عالم کی تحریریں کوئی عالمانہ رنگ رکھتی ہیں بلکہ ایک عامی شخص کی معلوم ہوتی ہیں۔

اس کتاب میں جن اختلافی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے وہ نئے نہیں ہیں، اس سے قبل بار بار ان پر مباحثہ ہو چکا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہا ہے گا، کیونکہ ان تمام اختلافات کی بنیاد روایات پر قائم ہے اور روایات کی صحت و عدم صحت جانچنے کے لئے نہ سنی علماء و روایت سے کام لیتے ہیں نہ شیعہ علماء۔ صفحات ۳۶۸۔ قیمت ۳۰ روپے۔ مکتبہ کا پتہ: دفتر اصلاح کچھوا (دہلی)

**طریقہ طلاق** رسالہ ہے ڈاکٹر عزیز احمد قریشی کا جسے بین الاقوامی روحانی کانفرنس سری نگر نے شائع کیا ہے۔ یہ رسالہ دراصل مجموعہ ہے آٹھ خطبات کا جو ڈاکٹر صاحب موصوف نے سری نگر میں دئے تھے۔

مسلمانوں میں نکاح و طلاق کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے جس پر بعض غیر مسلم جماعتوں کی طرف سے اعتراضات بھی کئے جاتے ہیں، اس لئے ضرورت تھی کہ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر واضح روشنی ڈالی جاتی اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب نے اس ضرورت کو بہ درجہ اہم قرار کیا، اس رسالہ میں نکاح، طلاق، خلع، لعان، ایلا، نہار وغیرہ تمام مسائل پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے اور بہت سی گفتگوں کو اس طرح سلجھا دیا گیا ہے کہ ہر شخص بہ آسانی خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ قیمت ۸ روپے۔ مکتبہ اخبار روشنی، سری نگر۔

**بین الاقوامی مذہب کے اصول** یہ کتاب بھی ڈاکٹر عزیز احمد قریشی کی تصنیف ہے جو دراصل اس مجلس مناظرہ سے تعلق رکھتی ہے جو بین الاقوامی روحانی پارلیمنٹ کے پانچویں سیشن منعقدہ سری نگر میں ہوا تھا اور جس میں اسلام کی نمایندگی ڈاکٹر صاحب نے کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں نہایت قابلیت کے ساتھ ثابت کیا کہ دنیا کو ہمیشہ ایک عالمگیر مذہب کی ضرورت رہی ہے اور اس ضرورت کو صرف اسلام ہی پورا کر سکتا ہے۔ اس تقریر کا وہ حصہ اخلاق اور روحانیت سے تعلق رکھتا ہے بہت دلچسپ ہے اور اس کے مطالعہ کے بعد ایک شخص اسلام کے صحیح اصول و مقاصد روحانیت کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ قیمت ۷ روپے۔ مکتبہ اخبار روشنی، سری نگر۔

# ”نگار“ کا آئندہ سالنامہ ۱۹۵۶ء

## (اصنافِ سخن نمبر)

ہر آنے والے سال کے ساتھ ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ نگار کا مخصوص نمبر کس موضوع کے لئے وقف کیا جائے جو پڑھنے والوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ہو اور جس کی ترتیب میں اردو کے اہم لکھنے والے حصہ لے سکیں۔ چنانچہ موجودہ انتظامیہ دور کے پیش نظر یہ مناسب سمجھا گیا کہ ۱۹۵۶ء کا پہلا شمارہ اردو شاعری کے تمام اہم اصنافِ سخن کی تعریف، تجزیہ، تشریح اور تاریخ کے لئے وقف ہو۔

یہ سالنامہ طلبہ، اساتذہ اور تمام شائقینِ ادب اردو کے لئے ایک نہایت مفید دائرۃ المعارف قسم کی چیز ہوگا، جس کی اہمیت کا اندازہ آپ کو ذیل کے عنوانات سے بخوبی ہو سکتا ہے:-

صنف غزل:- (۱) غزل کی ماہیت اور ہیئت - (۲) اردو غزل دلی سے غالب تک - (۳) اردو غزل غالب سے عہدِ حاضر تک - (۴) دہلی اور لکھنؤ کا دبستانِ غزل - (۵) غزل کا مستقبل۔  
صنف قصیدہ:- (۱) قصیدہ کی تاریخی و روایتی حیثیت - (۲) قصیدہ کا ارتقائی دور - (۳) ذوق، سوز، غالب و مومن کی قصیدہ نگاری۔

صنف ثنوی:- (۱) ثنوی کی روایتی و بنیادی خصوصیات - (۲) دکن کی ثنویاں - (۳) ثنوی تاریخی نقطہ نظر سے (۴) لکھنؤ، دہلی کی مشہور ثنویاں۔

صنف مرثیہ:- (۱) مرثیہ کے عناصر ترکیبی - (۲) دکن اور مرثیہ نگاری - (۳) مرثیہ انیس تک - (۴) مرثیہ نویس کے بعد (۵) انیس و دہائی - (۶) واقعہ کربلا کے علاوہ دوسرے حرائق۔

صنف رباعی و قطعات:- (۱) رباعی پر تاریخی نظر - (۲) اردو کے مشہور رباعی نگار - (۳) قطعہ نگاری کا سرسری جائزہ صنف ہجو و مزاح نگاری:- (۱) ہجو نگاری (تاریخی جائزہ) - (۲) سودا و حیثیت ہجو نگار - (۳) مزاحیہ و نظریاتی شاعری صنف ریختی:- (۱) اردو ریختی پر ایک نظر۔

صنف نظم نگاری:- (۱) اردو کی ابتدائی نظمیں - (۲) جدید نظم نگاری کا پس منظر - (۳) اخلاقی و اصلاحی نظمیں - (۴) روحانی نظمیں - (۵) سیاسی و انقلابی نظمیں - (۶) آزاد نظم - (۷) فلمی نظمیں اور گیت۔

پروفیسر فراق - پروفیسر مجنوں - پروفیسر سرور - پروفیسر احتشام حسین - پروفیسر ڈاکٹر اعجاز حسین -  
پروفیسر ڈاکٹر محمد عقیل - پروفیسر ڈاکٹر ضیاء احمد بدایونی - ڈاکٹر گیان چند - مولانا اختر علی تھری - حضرت آثر لکھنوی -  
پروفیسر ڈاکٹر مسعود حسین خاں - پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن - پروفیسر ڈاکٹر صفدر حسین کے خطوط مل گئے ہیں اور ان حضرات نے اذراہِ کرم لکھنا شروع کر دیا ہے۔

منیجر نگار

# چند ضروری اعلانات

”نگار“ کی آئندہ اشاعت جولائی سے

”کلام غالب“ کے زیر عنوان اڈیٹر نگار کے قلم سے ایک مستقل کتاب کا آغاز ہوگا، جس میں پہلے غالب کے اردو کلام کی شرح و تفسیر پیش کی جائے گی اور اس کے بعد فارسی کلام کی۔ اس میں بتایا جائے گا کہ غالب کے سمجھنے میں اس وقت تک کس حد تک افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے اور دنیائے شاعری میں غالب کا صحیح موقف کیا ہے۔ اس اشاعت میں بعض اور نہایت اہم مضامین شایع ہو رہے ہیں مثلاً:۔ حالی و شبلی کی سوانح نگاری کا تقابلی مطالعہ، مکتوبات نیاز پر ایک مفصل تبصرہ۔ غالب کا طرز سخن گوئی۔ یاد پاستین۔ وغیرہ وغیرہ۔

## پاکستان کے خریدار

اپنا سالانہ چندہ شے ذیل کے پتہ پر ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں اور رسید ڈاک خانہ ہمارے پاس جلد از جا بھیج دیں تاکہ پریچ کی روانگی میں تاخیر نہ ہو۔ پاکستان کے بعض خریدار کا چندہ جون یا اس سے قبل ختم ہو چکا ہے اور ان کے جولائی کا پریچ اسی وقت روانہ ہوگا جب ان کا چندہ وصول ہو جائے گا۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی۔ ۱۰۵۔ گارڈن ویسٹ کراچی

”نگار“ کی مطابعات بھی آپ کو اس پتہ سے ذریعہ دی۔ پی مل سکتی ہیں۔

چند سالانہ ذریعہ منی آرڈر روانہ کرنے میں آپ کو ۹ کا فائدہ ہے کیونکہ رجسٹری کی فیس بڑھ جانے کی وجہ سے ”نگار“ کا سالانہ دی۔ پی اب شے میں روانہ ہوگا اور آپ کو شے ادا کرنا پڑیں گے۔ جو حضرات سالانہ ذریعہ طلب فرمائیں وہ ۸ روپہ روانہ فرمائیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

## بعض کیاب کتابیں

(ان کتابوں پر کبشن نہیں دیا جائے گا قیمتیں علاوہ محصول لگا کر ہیں)

کشاف اصطلاحات الفنون ... شیخ محمد علی ... ع	تذکرہ مخزن نکات ... قائم ... ع
جہانگیر نامہ ... خواجہ ابوالحسن ... ع	تذکرہ دستور الفصاحت ... یکتا ... ع
آئین اکبری مصورہ حصہ ... ابوالفضل فیض ... ع	تذکرہ چشتان شعراء ... شفیق ... ع
سکندر نامہ مصورہ ... مولوی نظامی فوجی ... ع	تذکرہ ہندی ... مصطفیٰ ... ع
وقایع نعمت خان عالی انشاء حسن و عشق ... ع	دیوان میر حسن ... میر حسن حسن ... ع
درہ نادورہ ... مرزا محمد مهدی خاں ... ع	دیوان شکر ... دیوان نسیم دہلوی ... محمد صفر علی خاں ... ع
تاریخ گلستان ہند مصورہ ... درگا پر شاد ... ع	کلیات ناسخ ... امام بخش ناسخ ... ع
تاریخ جامع المتواریخ ... فقیر محمد ... ع	کلیات تسلیم ... ع
اقبال نامہ جہانگیری سہ حصہ محمد شریف معتد خاں ... ع	کلیات سودا ... مرزا رفیع سودا ... ع
سیر المتاخرین سہ حصہ ... غلام حسین خاں ... ع	کلیات حسرت ... فضل الحسن موہانی ... ع
تذکرہ دولت شاہ ... دولت شاہ سمرقندی ... ع	کلیات مومن ... مومن خاں دہلوی ... ع
در بار اکبری ... آزاد ... ع	کلیات میر ... میر تقی میر ... ع
تذکرہ گل رعنا ... عبدالغنی ... ع	کامل شرح کلام غالب ... مرتبہ عبدالباری آسی ... ع
کلیات ظہیر ... حکیم ظہیر فاریابی ... ع	مرآۃ الغیب ... امیر احمد امیر ... ع
قصاید عرفی محشی ... جمال الدین ... ع	منظر معانی دیوان مخروم ... میر محمد حسین ... ع
کلیات اسماعیل ... اسماعیل اصفہانی ... ع	دستور الشعراء (تذکرہ و تانیث) ... ع
کلیات سعدی ... شیخ مصلح الدین سعدی ... ع	کلیات جعفر زلی ... مرتبہ محمد فرحت اللہ ... ع
دیوان عرفی ... جمال الدین عرفی ... ع	کلیات نظیر اکبر آبادی ... مرتبہ عبدالباری آسی ... ع
دیوان ہلالی محشی ... ہلالی ... ع	مرآۃ میرانیس ... جلد اول و دوم و سوم و چہارم ... میرانیس ... ع
دیوان قصاید منہری ... حکیم ابوالقاسم ... ع	مرآۃ میرانیس ... جلد ششم ... مرتبہ میر عبدالحمید ... ع
تذکرہ کمالان رام پور ... احمد علی خاں ... ع	مرآۃ دبیر کامل ... ع
تذکرہ آب بقا ... عبدالرؤف عشرت ... ع	مرآۃ مونس ... ع
ہندو شعراء ... ع	کریم اللغات ... ع
تذکرۃ الخواتین ... عبدالباری آسی ... ع	تنقیح اللغات ... ضامن علی جلال لغت قلمی ... ع
تذکرہ سخن شعرا نساخ ... ع	فردوسی پر چار مقالے ... محمود شیرانی ... ع
تذکرہ گلشن ہند ... مرزا علی لطف ... ع	تاریخ حبیب السیر ... غیاث الدین بن ہمام الدین ... ع

پاکستان میں یہ کتابیں صرف اس صورت سے پہنچ سکتی ہیں کہ پوری قیمت مع محصول لگا کر ذرا بٹک ڈرافٹ پہلے وصول ہو جائے۔

مبجہ شکار لکھنؤ

دہنہی طرن کا مصلیٰ نشان علامت ہے اس  
آٹھ روپیہ نو آنے میں دی ہوگا۔ سالانہ شہدے

انگریزی کے آپ کا چندہ جن میں ختم ہو گیا اور جلائی کا ننگار  
کے مصارف جبرطی کے لئے اس کے علاوہ ہوں گے

ننگار

ادویٹر: نیاز فتحپوری

شمار	فہرست مضامین جون ۱۹۵۶ء	جلد ۶۹
۳۹	روایت و درایت ..... وقار احمد رضوی	۴
۴۲	علی گڑھ کے دورانیوں کی ایک عجیب شخصیت ..... سید محمود فاروقی	۶
۴۸	دنیا کا سب سے زیادہ خود ناک کھیل ..... ۱۳	۱۳
۵۱	منظومات :- فضا ابن فیضی - سیر بھوبالی - عزیزی - ۱۴	۱۴
۵۲	ہلال صدیقی - غنی اعظمی ..... ۲۵	۲۵
۵۴	مطبوعات موصولہ ..... ۳۱	۳۱

## ملاحظات

### پاکستان کا موجودہ دور کشمکش

پاکستان میں مسلم لیگ اور ریلیگن پارٹی کی باہمی کشمکش اندیشہ ناک بھی ہے اور امید افزا بھی۔ اندیشہ اس بات کا کہ اگر آئندہ انتخاب میں مسلم لیگ کو اکثریت حاصل ہوگئی تو پچھلا آٹھ سال کا ناکام دور اقتدار ہمہ قایم ہو جائے گا اور امید اس بات کی کہ اگر ریلیگن پارٹی نے مسلم لیگ کو شکست دیدی تو ممکن ہے یہ نیا تجربہ کچھ نئی برکتیں بھی اپنے ساتھ لائے اور پاکستان کوئی صحیح راہ عمل کر سکے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ پچھلے سال کی تاریخ پاکستان، اقتدار مسلم لیگ کی داستان ہے اور اس اقتدار نے کوئی یادگار ایسی قائم نہیں کی کہ ملک اس پر فخر کر سکے یا اہل ملک کو اس کے ختم ہونے پر افسوس ہو، اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس حقیقت کے پیش نظر ہاں کے عوام کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہو اور وہ سمجھ کر کہ اس وقت تک جو راہ انہوں نے اختیار کی تھی صحیح نہ تھی، وہ کوئی دوسری راہ اختیار کریں، لیکن اگر وہ بدستور اسی روایت پر قائم رہے جو ایک شکست خوردہ مذہبی ذہنیت کی آخریں متوکلاں جاسے پناہ ہے تو یقیناً ریلیگن پارٹی ناکام رہے گی۔ اور یہ ناکامی پاکستان کی وہ ناکامی ہوگی جس کی تلافی شاید تقسیم ازل کے میں کی بات بھی نہیں۔

رہلیگن پارٹی، ڈاکٹر خان صاحب کی پارٹی ہے، جن کی قومی خدمات سے شاید ان کے حریف کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کا شہرہ ہے کہ جس وقت مغربی پاکستان کو ایک وحدت میں تبہ ملی کرنے کا خیال پیدا ہوا تو اس پوجہ کو سنبھالنے کے لئے افراد مسلم لیگ میں گسیٹو کا نام سامنے آیا حالانکہ وہ سات سال سے حکومت کرتے چلے آ رہے تھے بلکہ ڈاکٹر خان کا نام سامنے آتا جو سات سال سے قہر و ہند

کی زندگی گزار رہے تھے۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کے سمجھنے کے لئے قیام پاکستان کے بعد وہاں کے سیاسی پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ تقسیم ہند کے بعد سب سے پہلا سیاسی رد عمل وہاں یہ ہوا کہ نہ صرف مشرقی و مغربی پاکستان بلکہ خود مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں میں حصول اقتدار کے لئے کشمکش شروع ہو گئی اور چونکہ ذہنی، ثقافتی و اقتصادی حیثیت سے پنجاب اپنے آپ کو ”شریک غالب“ سمجھتا تھا، اس لئے رفتہ رفتہ وہ آگے بڑھنے لگا اور صوبہ سرحد و سندھ میں اس کے خلاف وہی ریشہ دو انیاں ہونے لگیں جو احساس کمتری کی بنا پر ہر جگہ ہوا کرتی ہیں۔ اس بد مزگی کو دور کرنے کا یہ طریقہ سوچا گیا کہ صوبائی تقسیم ہی کو ختم کر دیا جائے اور پورے مغربی پاکستان کو ایک صوبہ قرار دیکر اسے ایک جغرافی وحدت بنا دیا جائے۔ لیکن اس جغرافی وحدت کے ساتھ ذہنی وحدت کا بھی سوال سامنے تھا اور اس کے لئے ضروری تھا کہ ذہنی طور پر ”صوبہ سرحد“ کو بھی پنجاب کی سطح پر لے آیا جائے۔ چنانچہ اس مصلحت کے پیش نظر صوبہ سرحد کے سب سے زیادہ زخم خوردہ لیکن بہت بڑے فرزند ڈاکٹر خان کو قید سے نکال کر نئے صوبہ کی عنوان حکومت ان کے ہاتھ میں دیدی گئی پھر چونکہ وہ کانگریسی اصول کے آدمی ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کی متعین کی ہوئی راہیں اختیار نہ کر سکتے تھے اور ان کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ کوئی ایسی جماعت پیدا کریں جو اصول کانگریس و صحیح جہت سے قریب ہو اور اسی لئے انھوں نے مسلم لیگ کے خلاف ایک نئی جماعت رینکن پارٹی کے نام سے قیام کی اور اس تلخ گھونٹ کو مرکزی حکومت اور جودھری محمد علی نے بھی حلق سے اُتار لیا، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ڈاکٹر خان صاحب کو ہٹا دیا گیا اور کسی مسلم لیگی کو یہ خدمت سپرد کی گئی تو صوبہ سرحد کی بخت ونشانی تحریک ایک حقیقت ہو کر رہ جائے گی اور اندرونی کشمکش سخت خطرناک صورت اختیار کرے گی۔

اس کے بعد جب دستور بن گیا اور آئینی مراحل سامنے آئے تو پھر وہی اکثریت و اقلیت کا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا اور مسلم لیگ نے تمام قومی مصالح کو نظر انداز کر کے اسمبلی میں پھر اپنی اکثریت کے وزن پر ڈاکٹر خان کی سیادت سے نکلنے کی کوشش شروع کی اور اگر کاسٹنگ ووٹ ان کے خلاف نہ ہوتا تو وہ یقیناً کامیاب ہو جاتی پھر نہ تو بظاہر ڈاکٹر خان صاحب کامیاب ہو گئے ہیں، لیکن کاسٹنگ ووٹ کی کامیابی و اصل کوئی کامیابی نہیں ہے اور ایک بہت بڑے موثر حزب مخالف کا مقابلہ جس سے سر بر ہونا آسان نہیں اور جب دوسری فیصلہ کن منزل عام انتخاب کی (غالباً جون میں) آئے گی تو کون کہہ سکتا ہے نتیجہ کیا ہوگا۔ جو سکتا ہے کہ رینکن پارٹی پھر تنکے کا سہارا لیکر ڈوبنے سے بچ جائے یا تنکے کو بھی اپنے ساتھ لیکر ڈوب جائے۔ مشرقی پاکستان کی سیاست اس سے بھی زیادہ تشویشناک ہے، کیونکہ وہاں کے اقتصادی بحران نے تمام نظام کو دہیم بن کر رکھا ہے اور عوام میں حکومت کی طرف سے بدگمانیاں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں یہاں تک کہ وہاں کی ”بینی حکومت معطل ہو گئی اور گورنر راج قائم ہو گیا ہے جو یقیناً شنگون نیک نہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ مشرقی بنگال کی ذہنیت اور مغربی پاکستان سے اسکی بے تعلقی و بیزاری نے جو پید بھی کچھ کم خطرہ نہ تھی، اب زیادہ اندیشہ ناک صورت اختیار کر چکی ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کس نوع کی اتار کی صورت اختیار کرے۔ آج کل دنیا میں کوئی حکومت کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک عوام اور جمہور کے جذبات اس کے ساتھ نہ ہوں، پھر اگر عوام کسی ایک ہی ذہن و خیال کے ہوں تو دشواری زیادہ نہیں ہوتی، لیکن جب خود ملک کے اندر متضاد خیال کی جماعتیں ایک دوسرے سے متصادم ہوں تو اس دشوار اگر منزل سے گزرنا حکومت کے لئے سخت دشوار ہو جاتا ہے اور حکومت پاکستان آج کل اسی غار زار سے گزر رہی ہے۔

بعض کا خیال ہے اور یہ خیال بالکل بے بنیاد نہیں کہ وہ وقت دور نہیں جب مشرقی بنگال پاکستان سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر دے گا اور وہاں ایک اشتراکی قسم کی حکومت قائم ہوگی۔ اگر ایسا ہوا تو بات بہت دور پہنچ جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ یہ اختلاف بین الاقوامی نزاع کی صورت اختیار کرے جس سے نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان کو بھی اپنا دامن چھڑانا دشوار ہو جائے۔

اب سے کئی سال جب میں کراچی گیا ہوا تھا تو وہاں کے بعض سنجیدہ اہل رائے سے گفتگو کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ پاکستان مشرقی بنگال کی طرف سے بہت غیر مطمئن ہے یہاں تک کہ بعض ذمہ دار حضرات نے تو صاف صاف یہ بھی کہہ دیا کہ اگر ہم مشرقی پاکستان سے دست بردار ہو کر اپنی حالت کو سنبھال سکیں تو بھی یہ سودا گراں نہ ہوگا۔

سالنامہ ۷۷ء :- ”اصناف سخن نمبر“ کا اشتہار صفحہ (۱) پر ملاحظہ ہو

# اثر لکھنوی

(اپنے خطوط کے آئینے میں)

(سلسلہء سابق)

(نثار احمد فاروقی)

کشمیری محلہ لکھنؤ - ۲۹ نومبر ۱۹۵۵ء

پیارے بھائی فاروقی - میں نے تیر کا مطالعہ کیا ہے، دقت نظر سے کیا ہے اور بار بار کیا ہے۔ میں اس کی تفہیم اور اسلوب ادا کا گرویدہ ہوں۔ معتقد ہوں۔ میں نے اس کے کلام کی خصوصیات کو دریافت کرنا چاہا ہے مگر خود شعر کہتے وقت اس کے مطالب کو اپنے اشعار میں ”دہرانے“ یا توڑ مڑوڑ کر اپنانے کی الجھن لگتی رہی کہ شش نہیں کی۔ پُر خلوس مطالعہ اور پسند کا یہ فیض ہے کہ کبھی کبھی میرے کلام میں اس کے رنگ کی جھلک آ جاتی ہے۔ غزل کے تنگ دائرے میں بہت کم مطلب کے اعتبار سے کہیں کہیں توارہ ہو گیا ہو مگر میرے ذہن میں ایسا کوئی شعر نہیں۔ اپنا ایک مقطع نقل کرنا شاید بے محل نہ ہو:-

میں تیر کا دم بھرتا ہوں اثر میں اس کے کلام کا شیدا ہوں ہاں شعر تو تم کہہ چلتے وہ بول بنانا مشکل ہے اصطلاح موسیقی میں بول بنانا اسی کو کہتے ہیں کہ معنی اصول فن میں کمال دکھانے کے بعد اپنے دل سے سامعہ نواز راہیں نکالتے ہیں۔ اس غزل کے چند اشعار سنئے۔ اس میں بھی بول بننے ہیں یعنی تیر کی اس خصوصیت کو میں نے سمجھا احمد اپنا ہے اور اس کے مطالب کو دہرانا۔ لاواشد!

جب دل کو موسوسے رہتے تھے اب ہاتھ لگانا مشکل ہے  
دیکھو تو ادھر کو شش تو کرو کیا ایسا نشانا مشکل ہے  
کب اشک بہانا مشکل ہے اور کب پی جانا مشکل ہے  
انصاف یہ ہے اس جہر پہ کبھی یوں دل کا بھانا مشکل ہے  
رونے میں کبھی طوفان تھے اب دواشک بہانا مشکل ہے

آغازِ محبت کی لذتِ انجم میں پانا مشکل ہے  
طائر ہے نہ صید و حشی ہے، دل ہے البتہ تڑپتا دل  
جو عشق کے فن میں ماہر ہیں ان سے پوچھو تم کیا جانو  
کہنے کو تو ہم آزار کشیدہ کہتے آس کو کیا کھچے  
موسم اور وقت کی باتیں ہیں، راتیں ہیں نہ وہ برساتیں ہیں  
اندازِ بیان تیر کا ہے مگر خیالات میرے ہیں۔ ایک دو شعر اور سنئے:

ڈوبتے دل کی آس نہ توڑو، بار کے تم کو پکارا ہے

پاول میں چھالے، راہ میں کانٹے، آنکھ تلے اندھیا راہ ہے

جیسے کچھ اعتبار ہے اپنا

عشق سے لوگ منع کرتے ہیں

تنقید میں بھی کسی نظر نے کا پابند نہیں۔ زیر نظر کلام کا مطالعہ کرتا ہوں۔ میرا ذوق کیا بلحاظ مطالب، کیا بلحاظ طرزِ ادا محاسن و معائب دریافت کرنے میں رہنمائی کرتا ہے۔ میں نے تنقید پر نہ معلوم کتنی کتابیں پڑھی ہیں اور اب بھی پڑھتا رہتا ہوں۔ مگر مقصود اپنی معلومات میں اضافہ کرنا ہوتا ہے نہ کہ تقلید۔ آپ نے میرے تنقیدی مضامین پڑھے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ نے محسوس کیا ہوگا

کہ کسی میں کوئی خاص ڈھڑا اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ میں خاص طور پر یہ دیکھتا ہوں کہ شاعر کا احساس موضوع کتنا گہرا اور حقیقت سے دست و گریبان ہے اور شاعر اپنے تاثرات کے اظہار میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کے تاثر کی سامع تک اُسی قوت سے تبلیغ ہوئی کہ نہیں۔ اس ضمن میں اُس کی زبان سے واقفیت اور ذخیرۃ الفاظ کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ناقص تبلیغ کا سبب یا تو زبان و بیان کی خامی ہوتی ہے یا سلی اور نامکمل تاثر ہوتا ہے۔ میری تنقید میں میرے ذاتی ذوق شعری کو بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔ مثلاً تیر کا مشہور قطعہ ہے:

کل پاؤں ایک کاسہ سر پر جو آگیا،  
کیسرہ استخوان شکستوں سے چور تھا  
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر  
میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

نظیر اکبر آبادی نے اسی خیال کو آٹھ نو اشعار میں نظم کیا ہے۔ ایک صاحب نے تیر سے موازنے کے لئے نظیر کے قطعہ کا اس طرح اختصار کیا:

ایک دن ایک استخوان اوپر پڑا میرا پاؤں  
کیا کہوں غفلت میں کیا کیا مجھ کو اس دم دھماں تھے  
پاؤں پڑتے ہی طرغ اس استخوان نے آہ کی  
اور کہا غافل کبھی ہم بھی تو صاحب جان تھے  
ایسی بے دردی سے ہم پر پاؤں مت رکھ لے نظیر  
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

اب میری تنقید ملاحظہ فرمائیے: ایک مغرور و متکبر انسان کے کاسہ سر میں چرچر ہونے پر بھی اُس کے بچے کا تیکھا بین چودھراں حیات میں تھا قائم رکھنا اور شکستوں کو چین چین کی یادگار بنا کر اس کی زبان سے درسِ حیرت دینا، تختہ پل کی وہ سحر کاریاں ہیں جس کی نظیر شاید ہی دنیا کی کسی زبان کی شاعری میں ملے۔ یہ کاسہ سر چپکے جانے پر نظیر کے پیش کردہ کاسہ سر کی طرح آہ نہیں کرتا بلکہ ڈانٹ کر کہتا ہے کہ ”دیکھ کے چل راہ بے خبر“ اور صرت اس اظہار سے کہ ”میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا“ اپنی پامالیوں کو حیرت کا مرتع بنا دیتا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ کے استفسارات کا آپ کے حسبِ منشا جواب دینے سے معذور ہوں۔  
آپ کا اثر

کشمیری محلہ لکھنؤ - ۲۵ دسمبر ۱۹۵۲ء  
پیارے بھائی فاروقی - میں اپنے پچھلے خط کے جواب کا منتظر رہا اور اسی طرح شاید آپ اپنے خط کے جواب کے منتظر ہیں۔ میرے صبر کا پیادہ چھلک گیا۔ ذہن قسمت کہ آپ کو یہ مطلق پسند آتا ہے جس طرف نکل جاؤ جھڑکیاں ہیں تہمت ہے عشقِ خاناں دیراں سب تری بدولت ہے  
آپ کا اثر

کشمیری محلہ لکھنؤ - ۵ جنوری ۱۹۵۳ء  
پیارے بھائی فاروقی - ۱۳ دسمبر کا خط اور یکم جنوری کا پوسٹ کارڈ مل کر شام کو ایک ساتھ ملے۔ تمہارے لئے دل سے دعاؤں میں۔ اترستان کا انتخاب بہاراں کے آخر میں شامل ہے۔ صفحہ ۳۵۳ - ۳۵۴۔ اصل دیوان ۱۳۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔ ڈھونڈو لگا اگر کوئی کوئی لکھی تو روانہ کر دوں گا ورنہ شامل بہاراں انتخاب پر قناعت کرنا ہوگی۔ تازہ غیر مطبوعہ دیوان کے لئے کوئی اچھا سا کام تجویز کر دیجئے۔ میرے ذہن میں اب تک نو بہاراں اور چہرستان آئے ہیں۔  
آپ کا اثر

کشمیری محلہ لکھنؤ - ۴ جنوری ۱۹۵۳ء  
پیارے بھائی فاروقی - پوسٹ کارڈ ملا۔ خط برابر پہنچ رہا ہوں۔ تعجب ہے کہ آپ کو نہیں ملے۔ جو شعر آپ کو پسند آیا وہ جو نا اہل کا

نہیں اثر شاں کا ہے جس کا انتخاب صفحہ ۲۵۲ سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس شعر کے پس منظر میں ایک عجیب و غریب واقعہ ہے جس کی طرف مقطع میں اشارہ ہے۔

شعر آخر کہ ہے عطیہ خاص آثر اعجازِ تیر کا دل تھا

اب اس کی تفصیل سنئے: غالباً ۱۹۵۱ء کا ذکر ہے۔ میر تقی میر کا پھر میں بہ عمدہ انگریزوں کے پاس پہل بورڈ تھا۔ ایک مشاعرہ ہونے والا تھا۔ جس میں شرکت کے لئے کھینکے متعدد شعراء کرام تشریف لائے تھے۔ میرے غریب خانہ میں فروکش تھے اس وقت جو نام یاد آتے ہیں وہ یہ ہیں:- عزیز، محشر، جوش ملیح آبادی، ذکی، شفیق (منصو صاحب) تھے آغا شتر۔ مشاعرہ دوسرے دن تھا۔ شب کی صحبت میں شعر خوانی کے ساتھ ساتھ مختلف اساتذہ متقدمین کے کلام پر بھی بحث ہوئی۔ میں نے تیر کے متعلق بعض ایسے خیالات کا اظہار کیا اور مثال میں ایسے اشعار پیش کئے کہ چاہرین محفوظ ہوئے اور اعتراض کیا کہ اُس کی شاعری کے ان پہلوؤں پر ہماری نظر نہ تھی۔ میرے عزیز دوست جوش ملیح آبادی نے تو یہاں تک غلو کیا کہ عشرہ محرم کی طرح ”عشرہ میر“ منعقد ہونا چاہئے جس میں آثر، تیر کے اشعار پڑھیں اور ہم سب اُن کے گرد حلقہ باندھ کر ماتم کریں۔ یہ پر لطف صحبت رات کے ایک یا دو بجے ختم ہوئی جب صبح کو میری آنکھ کھلی تو زبان پر بلا قصد و ارادہ یہ شعر جاری ہوا۔

رات کو ایسی ہلک دل میں اُٹھی اک گرہ رہ گئی جہاں دل تھا

خیال ہوا کہ شب کی صحبت میں جو اشعار تیر کے پڑھے تھے انہیں میں کا ایک ہے۔ غور کیا تو ایسا نہ تھا۔ بنظر احتیاط تیر کے دوا میں کی ورق گردانی کی۔ شعر کیسا اس زمین میں اُن کی غزل ہی نہیں۔ اتفاق ہوا کہ چونکہ میں نے صدق اور خلوص کے ساتھ میر صاحب کی مدح سرائی کی تھی اور اُن کے کلام کے نکات و لطایف بیان کئے اس کے صلہ میں اُن کی روح پرفتوح نے یہ شعر مرحمت کیا ہے۔ بعد ازل غزل پوری کی اور مقطع میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ میرے لئے شعر میں ایک درس بھی ہے۔ میر صاحب کا معرفت اور متفق ہونے کے باوصف میری خدمت پر طبیعت کہتی تھی کہ جب وزن پھا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو رات، صبح، کل اور اسی قبیل کے بھرتی کے الفاظ خواہ مخواہ ٹھونس دیتے ہیں۔ شعر مندرجہ سے لفظ ”رات“ نکال دیجئے سارا طلسم ٹوٹ جائے گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ امید ہے کہ دو دن ادھر جو خط میں نے روانہ کیا تھا اب آپ کو مل گیا ہو آپ کا آثر

کشمیری محلہ لکھنؤ۔ ۱۲ جنوری ۱۹۵۲ء

پیارے بھائی غازی - اب میں سمجھا کہ شاعری میں آفاقیت سے آپ کی مراد کیا ہے۔ بلا سبالغہ تیر کے سیکڑوں اشعار پیش کروں گا فی الحال غالب کا نقل کر رہا یہ مطلع کیجئے۔ جو حسن اتفاق سے (آپ یقیناً سوہ اتفاق کہیں گے) تیر کے ایک مطلع کا دست لگ رہے ہے

غالب ۵ باز بچے اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب دروز تماشا مرے آگے  
تیر ۵ ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز شب تماشا دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

غالب نے شیخ علی حشر کے ایک مطلع میں ایک ردیف کو بیکار قرار دیا تھا۔ اُن کے مطلع میں خیر سے دونوں ردیفیں بیجا رہیں۔  
”دنیا باز بچے اطفال ہے۔ روز و شب تماشا ہوتا ہے۔“ مطلب پورا ہی نہیں ہو گیا بلکہ ”مرے آگے“ کا ٹکڑا قول کی آفاقیت میں بارج تھا وہ نکل گیا۔ تیر کا مطلع ان تمام اسقام سے پاک ہے۔ غور کرنے کے بعد اپنی رائے سے مطلع کیجئے۔ غالب کا دوسرا شعر ہے۔  
کاشکے ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصتِ روانی کی  
شعر کی خوبی میں کوئی شک نہیں۔ تیر کا مقطع سنئے۔

جب سے ناموس جنوں گردن بندھا ہے تیر جیب جاںِ دانت زنجیرتا واماں ہوا

غالب کے شعر کا حاصل یہ ہے کہ کشاکش ہائے ہستی سے آزادی ممکن نہیں۔ موج ہائے پائل مارتی ہے تو زنجیر اور زیادہ الجھتی ہے اور وہ زنجیر خود موج کی روانی یا سہی ہے۔ (میرے نزدیک سہی آزادی سے جہد آزادی کہنا کہیں بہتر ہوتا۔ سہی محض کوشش ہے اور جہد کوشش ہے اور جہد کوشش بسیار یا تنگ و ڈوسہ۔ خیر اسے جہاد معترضہ تصور کیجئے) میر کہتا ہے کہ خود جاں و البستہ زنجیر ہے، لہذا ہاتھ پاؤں مارنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ بہر حال میں ناموس عشق کی نگہداشت لازم ہے آزادی تو اس وقت تک تھی کہ:

”طائر جاں قفسِ تن میں گرفتار نہ تھا“ (پورا شعر تیر کا یہ ہے۔

صد گستاں تہ یک بال تھے اُس کے جب تک طائر جاں قفسِ تن میں گرفتار نہ تھا)

آپ کا نقل کردہ تیسرا شعر غالب کا یہ ہے۔

نہ ہو گا یک بہا ہاں ماندگی سے ذوق کم میرا حبابِ موجِ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

اس کی شرح ”چٹان پین“ یا ”تنہیدی مضامین“ میں کر چکا ہوں۔ تیسرا شعر مقابلہ میں سنئے۔

ہاں جیسے شمعِ بنم اقامت نہ کر خیال، ہم ”دل کباب“ پر دوسے میں سرگرم راہ ہیں

وہی بظاہر اقامت گرد پر وہ طبعی منزل جو غالب کے شعر کا خلاصہ ہے۔ وہی تیسرے شعر کا ہے ہاں خلعت، اور شمع کے ساتھ شکوہ الفاظ ہے۔ یہاں حقیقت کے دست بردست ندرت ادا ہے آپ غالب کے اشعار لکھتے جاتیے، میں جواب میں تیسرے اشعار پیش کرتا ہوں اور فیصلہ کا انحصار آپ پر رہے گا۔ ”ان“ اور ”آند“ آپ آفاقیت کے معاملہ میں بھی میری طبعی تیسرے تائیل ہو جائیں گے۔ اس کے بعد تیسرے فاضل اشعار جن میں آفاقیت ہے درج کر کے آپ سے استدعا کروں گا کہ ان کے جواب میں غالب کے اشعار ڈھونڈ سکتے۔ اقبال اور تیسرے کا کوئی موازنہ نہیں، ایک قوی یا قلی شاعر۔ ایک غزل گو۔

آپ کا آخر

”آفاقیت“ کے تصور پر میں نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان کا اعادہ قدرے تفصیل سے اسی مقالہ میں اس موقع پر ہو گا جہاں حضرت اش کی تنقیدوں پر تبصرہ کیا جائے گا۔ حضرت اش نے غالب کے شعر ”باز بچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے الخ“ کو تیسرے ایک شعر ”ہوتا ہے یاں جو ان میں ہر وہ زو شب تاشا“ کا حسن اتفاق سے دستِ نگر بتایا تھا۔ مگر میں اب بھی یہ کہتا ہوں کہ تیسرے مذکورہ شعر غالب کے شعر کے سامنے بالکل تہی نظر آ رہا ہے۔ کیا بلحاظ حسن ادا، کیا باعتبار مطالب اور کیا بہ حیثیت تخیل و تفکر۔ شاعر کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ نظم میں (اور ہر ہی صدمہ) بات شریعہ بھی صادق آتی ہے جس قسم کے خیال کا اظہار یا اعادہ کرنا چاہتا ہے اسی کی حیثیت و مرتبت اور قدر و قیمت کے معیار و اعتبار سے الفاظ بھی لائے۔ اگرچہ کسی زبان میں دو مترادف الفاظ مشکل ہی سے مل سکتے ہیں۔ ان میں کوئی نہ کوئی لطیف فرق ضرور ہوتا ہے۔ اور وہ فرق وہاں کھلتا ہے جہاں لفظ چاروں چل چوکس بٹھ جائے۔ اُلفت، محبت، عشق، اُنس اور جنوں ان سب الفاظ کو سمجھنے کے لئے ہم ایک جذبے سے تعبیر کرتے ہیں لیکن کسی شعر میں عشق کھپ جاتا ہے کہیں جنوں مزادے جاتا ہے اور کہیں اُلفت۔ تیسرے ”درد، سودا، غالب، مومن، آتش، ناتج، مصحفی، انشا“ اور اس فہرِس میں ہر اُس شاعر کو بڑھا لیجئے جو کسی اسکول کا نایندہ ہے یا جس کا اپنا طرز و اسلوب ہے ان اشعار کو اور ان کے کلام کو ہم جس معیار سے ممتاز و تمیز کر کے دیکھتے وہ طرز ہے کہ ایک بات کو کس نے کن الفاظ میں کہا؟ جہاں تک تیسرے کلام کا تعلق ہے میں نے خود اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ”... تیسرے۔۔۔ الفاظ کے مزاج کو بچپنا تھا، الفاظ سے بھر اور بھر سے موسیقی پیدا کرتا ہے۔ الفاظ کے مزاج اور آہنگ سے اشعار میں ندرت اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔“ (تیسرے کا آرٹ، نیا دور لکھو جلد ۱، شمارہ ۱۱) لیکن کم از کم زیر بحث شعر کے موازنہ میں یہ بات نامنی پڑے گی کہ غالب کا شعر حادی ہے اور تیسرے جو کچھ کہا ہے وہ سب کچھ غالب نے ”باز بچہ اطفال“ کہہ کر ادا کر دیا ہے۔ حضرت اش نے فرماتے ہیں کہ تیسرے شعر میں حیرت و استعجاب ہے جو غالب

کے شعرے مستفاد نہیں ہوتا میں نے عرض کیا کہ "بازیچہ اطفال" صرت اپنی بے وقعتی سے ہی نہیں بلکہ بے سرو پائی، بے معرئی، وقتی صورت کون و خساد کی حیرت انگیز عجلہ صورت اور اُن تمام صفات و تاثرات کی قربانی کرتا ہے جو دنیا سے منسوب کی جا سکتی ہیں۔ تیر نے کہا ہے "لڑو دنیا میں روز دنیا تماشا ہوتا ہے، یعنی آج کچھ کل کچھ، ابھی کچھ تو ابھی کچھ! کیا یہ پہلو "بازیچہ اطفال" میں مضمر نہیں ہے۔؟ تیر نے لکھا "دیکھا جو خوب" تو ہے دنیا عجب تماشا!۔۔۔ غالب نے غور سے دیکھنے کا ذکر ہی نہیں کیا، غور سے اُس چیز کو دیکھا جانتے کہ جس کی وقعت اور قیمت ہو۔ غالب کی نظروں نے ہنگامہ عالم کو جب بازیچہ اطفال سمجھ لیا تو پھر اُس کا نوش ہی نہیں کیا۔! حضرت اشرفی نے ہیں کہ غالب کی دونوں ردیفیں بیکار اور بھرتی کی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ دونوں بیکار آمد ہیں اور شعر کی عظمت کو ردیف ہی بڑھا رہی ہے اور دوسرے مضمون بقیہ تو ایک طفل نوکتب بھی کہہ سکتا تھا۔ غالب کے پہلے مصرع میں "مرے آگے" بمعنی "مرے نزدیک" صرت ہوتا ہے اور دوسرے مصرع میں "مرے سامنے" کے معنوں میں۔ اور ہم اس ردیف کو چھوڑ کر صرت اتنے خیال کو کہ "دنیا روز و شب تماشا ہے روز و شب تماشا ہوتا ہے" کوئی بہتر شاعرانہ خیال تسلیم نہیں کر سکتے۔ برعکاس اس کے اگر تیر صاحب اپنے شعر کا صرت پہلا مصرع کہتے اور دوسرا موزوں ہی نہ کرتے تب بھی اُن کا مطلب ادا ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے مضمون "میر کا آرٹ" میں جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے، تیر اور غالب کی فنی حیثیت و مرئیت اور نظریات شعری کے بارے میں ان نکالات کا اظہار کیا تھا۔

".... کچھ ناقذوں نے تیر و غالب کا موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ بے سود رہی کیونکہ موازنہ کے لئے مطابقت شرط ہے۔ غالب صاحب فکر ہیں، تیر صاحب نظر۔ غالب ایک مفکر ہیں تیر محض مشاہد، غالب داغ سے زیادہ کام لیتے ہیں، تیر دل سے۔ تیر کا "عشق" جس آگ میں "بے خطر" کو دھڑاتا ہے وہاں غالب کی عقل محو تماشا ہے لب بام نظر آتی ہے۔۔۔۔۔۔ غالب اور تیر کے بنیادی تصورات میں بھی بہت فرق ہے۔ تیر کو تصون کی عملی تعلیم ملی جس نے اُس کے دل کی کھڑکیوں کو کھولا یا غالب نے فلسفہ اور تصون کو کتابوں میں تلاش کیا اُن کے ذہن کو بیداری اور روشنی ملی۔۔۔۔۔۔"

جہاں تک اردو شاعری میں آفاقیت کا تعلق ہے وہ پوری طرح کہیں بھی جلوہ گر نہیں ہوئی مگر لاریب کہ تیر کی شاعری میں جو محسوس و مدرکات ہیں وہ آفاقی جذبات اور صداقت و حقیقت سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر بھی اگر فکر و نظر کے معیار سے دیکھا جائے تو غالب تیر سے بہت اونچے نظر آئیں گے۔ غالب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے پاؤں سائیکا لوجی (نفیسیات عامہ) کے نکات کو اشعار کی صورت میں نہایت کامیاب انداز سے پیش کیا اور اُن سے پہلے کسی شاعر کے کلام میں یہ وصف انشاء کا معدوم کا درجہ رکھتا ہی مثلاً اُن کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:-

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی

آج ہی گھر میں پور یا نہ ہوا

جمع کرتے موکیوں رقیبوں کو

اک تماشا ہوا بھلا نہ ہوا

سے غیر چہرہ ہے نے یوں ترے خط کو کہ اگر

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

سے خط لکھیں گے گرجہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

چند شعور و ادبی میں لکھے گئے ہیں اگر اُن کے دیوان کو سامنے رکھ کر ایسے اشعار کا انتخاب کیا جائے تو بڑی مقبول تعداد میں نکلیں گے۔

دوسرا شعر حضرت اُتار نے تیر کا نقل کیا ہے،

جب سے ناموس جنوں گردن بندھا ہے تب سے تیر

حبیب جاں والیستہ تو بخیلہ تا داواں ہوا

اور اسے بجااً مطالب اور باعتبار حسن ادا غالب کے شعر پر جزوی ترجیح دی ہے۔ لیکن یہاں بھی فرق فکر اور نظریا احساس اور ادراک کا ہے۔ تیر نے حبیب جاں کو دایستہ زنجیر بتایا ہے۔ اس شعر کا پورا رچاؤ صرت اُس کے ذہن و احساس پر تو ہو سکتا ہے جو

عادی جنوں سے گزرا ہوا ایک عامی کیا وہ عالم بھی جو ان لطیف احساسات سے محروم ہو شعر کا پورا طعن نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن غالب نے ایک برہمی مثال دی ہے اور انھوں نے جس بات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ صرف انسان ہی نہیں، حیوانات، جمادات، نباتات اور ان تمام اشیا پر صادق آسکتی ہے جن میں فساد کی صلاحیت موجود ہے جو بن کر بگڑ جانے والی ہیں۔ غالب کہتا ہے کہ زندگی کے جمیل گوشے اور کچھ عرصوں سے آزادی کی کوشش کرتا اور چھٹکارے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا بے سود ہے۔ موجوں کی فحش روائی، محمدیوں کے لئے زنجیروں کی پٹی، رنجش میں اتنا ہی روائی میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ موج کی روائی میں اور اضافہ ہوتا ہے (موج آب کی روائی زنجیر موج کا اگھٹنا اور ان کی سعی و کوشش بالکل عام مشاہدے اور ادراک سے تعلق رکھتی ہے۔ تیر کے فرمودہ کے بالکل برعکس، جو ایک انفرادی احساس ہے۔

حضرت اترنے فرمایا کہ ”سعی“ کی جگہ ”جہد“ کہنا زیادہ موزوں ہوتا کیونکہ اس سے کوشش بیماریا کے معنی پیدا ہو جاتے۔ میں عرض کروں گا کہ جہد کہنے سے شعر بالکل بے جان ہو جاتا۔ جب مطلق کوشش کرتا ہی بے سود ہے تو کوشش بیمار بھی بے کار ہوئی۔ پہلے مصرعے میں اندازہ بیان سے ہی یہ مطلب نکالا گیا ہے کہ زندگی یا وجود کی کشاکش اور حرکت رہائی ہو ہی نہیں سکتی جو کوشش کرے گا وہ بھی اٹھی پڑ جائے گی! لہذا سعی کہنے سے بھی وہی مطلب ادا ہو گیا جو جہد کہنے سے ہوتا۔

حضرت اترنے غالب کے تیسرے شعر کے مقابلہ میں تیسرا جو شعر پیش فرمایا ہے وہ بھی میرے مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں دیکھا جائے تو غالب کے شعر سے لگا نہیں کھاتا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تیسرا شعر دل میں چٹکی لیتا ہے اور ندرت ادا کے لحاظ سے غالب کے شعر پر عادی ہے۔

قافی بڑا یونی کے شعر حضرت اترنے جو اعتراض وارد کیا ہے میں اُس سے بھی متفق نہیں ہوں۔ قافی کے اس شعر کے جو معنی قریب ہیں وہ اتنے صاف ہیں کہ کوئی افلاق محسوس نہیں ہوتا۔ شعر کا مطلب میری ناقص عقل میں یہ آیا ہے کہ ”میرا ہمت موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ تو مجھے نہیں بھولا ہے۔ یعنی اگر تو مجھے بھول گیا ہوتا تو میری ہمت بھی نہ ہوتی کیونکہ میرے وجود کے باقی رکھنے کے لئے مجھے سبیل کی ضرورت ہے آئی کا تو ہمتا کرنے والا تو ہی ہے، اگر میں زندہ ہوں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ جینے کے وسائل میسر ہیں، اور جینے کے وسائل میسر ہیں تو گویا میں تجھے یاد ہوں۔“ قافی کا شعر تصوفانہ رنگ میں ہے۔ ناسخ نے مجاز میں خوب کہا ہے، لیکن اس کا قافی کے مذکورہ شعر سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

میرے ان ہی اختلافی خیالات کے بعد حضرت اترنے ذیل کا کتب لکھا:-

کشمیری محلہ گھنٹو - ۲۰ جنوری ۱۹۵۲ء

پیارے بھائی فاروقی - ۱۸ جنوری کا خط کل شام کو ملا۔ ناسازی مزاج کی خبر سے افسوس ہوا۔ خدا کہے درد سر کی تکلیف دور ہو گئی ہو۔ جانی بڑا در تیر اور غالب کا موازنہ ہمیں کسی منزل تک پہنچانا نظر نہیں آتا بلکہ ناگوار صورت پیدا ہونے کا اندیشہ ہے تیر کہتا ہے ”دیکھا جو عجب تو ہے دنیا عجب تماشائے آپ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ جب غور سے دیکھا تو وہ تاشا بھی کچھ عجب تاشا ہے حالانکہ جو کچھ غالب نے ”بازچہ اطفال ہے دنیا میرے آگے میں کہا تیرے“ ”دنیا عجب تاشا“ میں کہنا۔ عجب تاشا میں حیرت ہے، استعجاب ہے، تغیرات کے اہم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ ”بازچہ اطفال کہنے سے دنیا محض بچوں کا ہے معنی گھروں کا ہو کر رہ گئی۔ مرے آگے کے فکر نے خلیل کے علاوہ ہر شخص کو بلا کسی استثناء کے طفل کتب بنادیا جو غالب کے سامنے اپنے طفلانہ کتب دکھا رہا ہے۔ بحث آفاقیت یا عالمگیر حقایق سے شروع ہوئی تھی مگر رقت و جزالت و مضمون آفرینی میں گھر گئی۔ آپ تیر کی بزرگی کے بھی قائل ہیں مگر اس کے کلام میں مفکر کا دل نہیں جھلکتا۔ کیا آج تک کوئی ایسا صاحب عظمت و بلند مرتبت شاعر ہوا ہے جو مفکر نہ ہو؟ کیا جو شاعر مفکر نہ ہو وہ ایسے شعر کہہ سکتا ہے؟

بہر فردوس ہو آدم کو الم کا ہے کو،  
ہیں مشب خاک لیکن جو کچھ ہیں تیر ہم ہیں  
ہمت اپنی ہی تھی یہ تیر کہ جوں مرغ خیال  
دل نے ہم کو مثال آئینہ  
مت سہیں ہمیں جانو پہرنا ہے فلک برسوں  
پتے کو اس جہن کے نہیں دیکھتے ہیں گرم  
ہر قطعہ پر جہن کے ملک غور سے نظر کر  
ہسر ہے اپنے طور پر جوں بحر جوش میں  
مرگ اک ماندگی کا وقف ہے  
ہم جانتے تھے تازہ بنائے جہاں کو یک  
یہ دو ہی صورتیں ہیں یا منعکس ہے عالم  
آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ  
صد گلستاں تہ یک بال تھے اسکے جب تک  
غم فراق ہے دنبال گردنیش وصال  
ہر جزوہ دست و بغل آئینے ہیں فروش  
اُس آفتاب حسن کے ہم داغ شرم ہیں  
سراپا آرزو ہونے بندہ کر دیا ہم کو  
یہ تو ہم کا کارخانہ ہے  
آئینہ ہو کے صورت معنی سے ہے لبالب  
مری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک  
اگرچہ فتنہ ہوں سب میں تم جہاں میں تیر  
لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر  
دہم جس کو محیط سمجھا ہے

دقت اولاد ہے وہ بلغ تو غم کا ہے کو  
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا  
ہم پر افشانی میں گزرے سر عالم سے بھی  
ایک عالم کو روشناس کیا  
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں  
جو محرم روش ہیں کچھ اس بدگماں کے لوگ  
بگڑیں ہزار شکلیں، تب پھول یہ بنائے  
گرداب کیسا، موج کہاں ہے، حباب کیا؟  
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر  
یہ منزل خراب ہوئی ہے کبھو کی طرح  
یا عالم آئینہ ہے اس یار خود نکا  
آئینہ تھا تو مگر قابل دیدار نہ تھا  
طائر جال قفس تن میں گرفتار نہ تھا  
فقط مزا ہی نہیں عشق میں بلا بھی ہے  
کس کا ہے راز بکریں یارب کہ ہے یہ جوش  
اتنے ظہور پر بھی جو منہ کو چھپا رہے  
وگرنہ ہم خدا تھے گرد دل بے دعا ہوتے  
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا  
راز نہاں حق میں کیا خود نمایاں ہیں  
میں نقش پاکی طرح پائمال اپنا ہوں  
برنگ سے عرق افعال اپنا ہوں  
میں در نہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں  
دیکھتے تو سراب ہے وہ بھی

اور نہ معلوم کیا کیا۔ روا روی میں جو اشعار یاد آئے درج کر دئے۔ کلام غالب کی طرح کلام میر کا بالامتیاع مطالعہ کیجئے۔ پھر کوئی رائے قائم کیجئے۔

مصحفی کا ایک قلمی دیوان میرے پاس ہے اور جہاں تک علم ہے غیر مطبوعہ ہے۔ آپ کے ملاحظہ کے لئے لیتا آؤں گا۔ رسالہ تحریک ملی میں کچھ دن ہوئے ایک مضمون بھیج چکا ہوں۔ عجب اتفاق ہے کہ اس میں مصحفی کے بھی بعض اشعار پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ شائع ہو تو پڑھئے۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔

آپ کا اثر

(باقی)

# قدیم تذکرے

پہلے شاعر پیدا ہوا اس کے بعد مشاعرے وجود میں آئے اور پھر اہل مشاعرہ نے بیاضوں میں اپنی اپنی پسند کے اشعار لکھنا شروع کیے بعض لکھنے والوں نے منتخب اشعار کے ساتھ ساتھ شاعر کا نام بھی لکھ دیا اس کے کچھ حالات بھی درج کر دئے اور اس طرح تذکرہ نگاری کی ابتدا ہوئی۔

یہ بیاض نویسی کب شروع ہوئی اس کی کوئی تاریخ متعین نہیں کی جاسکتی اور نہ یہ پتہ چل سکتا ہے کہ اس وقت تک کتنی بیاضیں لکھی گئیں۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ ان بیاضوں میں شاعر کے متعلق جو کچھ لکھا جاتا تھا اس کی زبان فارسی ہوتی تھی۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ اردو شاعری کے رواج کے بعد بھی تصنیف و تالیف کی زبان عرصہ تک فارسی ہی رہی اور دوسرا یہ کہ فارسی شعرا کے تذکرے پہلے سے موجود تھے اور ان کو سامنے رکھ کر اردو شعراء کا تذکرہ لکھنا زیادہ آسان تھا۔

اردو شاعری کی ابتدا یوں تو جہانگیر کے ہی عہد میں ہو چکی تھی اور شاہجہاں کے زمانہ میں وہ ابتدائی دور سے گزیر کر زبان و اسلوب بیان دونوں جہتوں سے اپنی جگہ الگ پیدا کر چکی تھی لیکن اس وقت کے شعراء قریب قریب سرزمینِ دکن سے تعلق رکھتے تھے۔

اورنگ زیب کے زمانہ میں بھی زیادہ تر دکنی شاعروں کے نام سامنے آتے ہیں جن میں سب سے زیادہ نمایاں دکنی کا نام ہے اور جسے اردو شاعری کا ابوالکبار سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں اکبر آباد اور شاہجہاں آباد دونوں جگہ فارسی شاعری ہی کا رواج تھا۔ اس کے بعد جب ۱۰۳۵ھ میں عہدِ محمد شاہ دکنی کا دیوان دہلی پہنچا تو گلوں کو اردو شاعری کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب اردو شاعری ہمارے تھی صرف دکنی شاعری سے۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ اس زمانہ میں دکن نے شاعر تو بہت پیدا کئے لیکن تذکرہ نویس کوئی پیدا نہ کیا۔ صرف دو تذکرے شعراء دکن کے مرتب کئے گئے۔ لیکن وہ بھی اس وقت جب دہلی میں شاعری کے ساتھ ساتھ تذکرہ نویسی کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ جیسا کہ جس نے ابھی ظاہر کیا ہے یہ تو بالکل یقینی ہے کہ اردو شاعروں کے تذکرے فارسی میں لکھنا شروع کئے گئے لیکن سب سے پہلا تذکرہ کب اور کس نے لکھا اس کا صحیح علم ہم کو حاصل نہیں لیکن میر کے بیان کو صحیح باور کیا جائے تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ میر کے نکات الشعراء سے پہلے شعراء اردو کے حالات میں کوئی کتاب تحریر میں نہیں آئی۔ بالکل یہی بات قائم چاند پوری نے بھی اپنے تذکرہ مخزنِ نکات کے متعلق لکھی ہے لیکن قائم کا بیان صحیح نہیں کیونکہ اس کا تذکرہ ۱۰۶۵ھ میں لکھا گیا جب کہ میر کا تذکرہ نکات الشعراء اس سے تین سال قبل ۱۰۶۵ھ میں مرتب ہو چکا تھا ہاں میر کا بیان البتہ غور طلب ہے۔

دعائی کا خیال ہے کہ میر کے تذکرہ سے پہلے کئی تذکرے موجود تھے اور اس کا تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ محمد شاہ اور احمد شاہ کے عہد کے چند تذکروں کا ذکر کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً تذکرہ سید امام الدین جو عہدِ محمد شاہ میں لکھا گیا دوسرا تذکرہ خان آرزو کا اور تیسرا سودا کا لیکن چونکہ یہ تذکرے ناپید ہیں اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ میر کی نگاہ سے گزرے ہوں لیکن اس کا ذکر انھوں نے نہیں کیا۔ افضل بیگ اور ملک آبادی کے تخطہ الشعراء اور خواجہ حمید اور ملک آبادی کے تذکرہ گلشنِ گفتار کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ یہ میر کے شعراء سے قبل لکھے گئے تھے لیکن اول تو یہ تذکرے بہت ناقص ہیں اور ان میں صرف شعراء دکن کا ذکر کیا گیا ہے دوسرے یہ کہ ان کا سن تحریر



چند کے رہنے والے تھے اور لاد ڈکار داس کے زمانہ میں بنارس کے چھن مجھڑیٹ تھے انھوں نے تذکرہ لکھنے میں بڑے اہتمام سے کام لیا۔ شعراء کے تفصیلی حالات ان کے زمانہ کی تعیین تاریخ وفات کی تحقیق، خطوط کے اقتباسات وغیرہ دے کر اپنے تذکرہ کو سوانحی رنگ سے دیا جو اس سے پہلے بالکل نہ پایا جاتا تھا۔ انھوں نے فارسی شعراء کے بھی دو تذکرے صحیفہ ابراہیم اور خلاصۃ الکلام کے نام سے ترتیب کئے گلشن ہند اسی تذکرہ کا ترجمہ ہے اور بقول دتاسی پہلا تذکرہ ہے جو اردو میں لکھا گیا ورنہ اس سے قبل تمام تذکروں کی زبان فارسی تھی یہ ترجمہ علی لطف نے گلزارِ ایش کی فرمائش پر کیا۔ اور فورٹ ولیم کالج کے ادبی آثار سے تعلق رکھتا ہے۔

تذکرہ نگاری کے اسی دور میں دہلی نے بعض بہت اچھے تذکرہ نویس پیدا کئے جن میں امام بخش صہبائی کا نام بہت نمایاں نظر آتا ہے دہلی کالج میں فارسی کے استاد تھے اور فارسی زبان کے بڑے مستند فاضل سمجھے جاتے تھے انھوں نے مستندہ میں دلی، سودا، میر، بڑاٹ، حسن، نصیر، مہمون، ناسخ، مول چند، ذوق اور مومن کے کلام کا انتخاب شایع کیا جس کا نام ”خلاصہ دوادین شعراء مشہور“ زبان اردو تھا۔ انھوں نے صرف کلام کا انتخاب نہیں کیا بلکہ ہر شاعر کے حالات بھی درج کئے اور ابتدا میں ایک مقدمہ بھی شامل کیا جس میں اردو شاعری پر انتقادی نظر ڈالی گئی تھی۔

اسی زمانہ میں ایک تذکرہ گلستان سخن کے نام سے شایع ہوا جو صہبائی اور قادر بخش صابر کی متحدہ کوشش کا نتیجہ بتایا جاتا ہے اس تذکرہ کا نام ”آثار المعاصرین“ ہے اور گلستان سخن اس کا تاریخی نام ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۸۵ھ میں لکھا گیا تھا۔ اس میں زیادہ تر شعراء دہلی ہی کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ابتدا میں ایک مقدمہ کے ذریعہ سے اردو زبان کی تحقیقی اور اردو شاعری کی تاریخی ترقی پر گفتگو کی گئی ہے۔

اس دور کا اہم ترین تذکرہ گارسن دتاس کی تصنیف ہے جسے ادبی تاریخ اور معجم الشعراء کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ یہ تذکرہ تین جلدوں میں صہبائی کے تذکرہ سے پانچ سال قبل ۱۲۸۳ھ میں شایع ہوا تھا۔ چونکہ دتاسی کا مقصد شاعروں کی ایک مکمل فہرست مرتب کرنا تھا اسلئے اس کی کتاب میں اردو ہندی کے تین ہزار شاعروں کے نام نظر آتے ہیں۔ ہر چند ان میں اکثر ایسے شعراء کا بھی نام نظر آتا ہے جو ذکر کے قابل نہیں تاہم اس کا یہ کارنامہ بڑا قابلِ قدر ہے۔ اس کتاب کا بہترین حصہ اس کا مقدمہ ہے جس میں اس نے اردو زبان کی تحقیق اور اردو ہندی شاعری کے اقسام پر مفصل بحث کی ہے اور یہ حیثیت مجموعی اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے۔ جس میں ادبی تاریخ، تذکرۃ الشعراء کا انتخاب کلام و ترجمہ کے علاوہ ان تذکروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو اس سے قبل شایع ہو چکے تھے۔ یا اس کی نگاہ سے گزر چکے تھے اور جن کی تعداد اس نے ۱۱۲ ظاہر کی ہے گویا یہ ایک وقت شعراء کا بھی تذکرہ ہے اور تذکروں کا تذکرہ بھی۔

اس کی اشاعت کے نو سال بعد اس کی بنیاد پر مولوی کریم الدین نے فیلن کی دوسرے ایک تذکرہ ”طبقات الشعراء“ کے نام سے لکھا اسکی ذہیت دتاسی سے مختلف ہے۔ دتاسی کا تذکرہ تو ایک معجم یا ڈکشنری کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن کریم الدین کا تذکرہ ایک تاریخی تصنیف ہے جس میں مختلف ادوار و طبقات قائم کر کے سنہ وار شعراء کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ایک بسیط مقدمہ لکھ کر اردو اور ہندو کی ابتدا اس کی تاریخی رتی ہندی اردو شاعری کی خصوصیات پر اتنی تفصیلی بحث کی ہے کہ اردو زبان اور اردو شاعری کی تاریخ کہا جائے تو مناسب نہ ہوگا۔

دتاسی اور کریم الدین کے ان تذکروں کے بعد تذکرہ نگاری کا رنگ بہت بدل گیا اور بعد کے مصنفین نے اسی رنگ میں لکھنا شروع کیا۔ چنانچہ سنو دگشا اور عبدالحی صفادہ یونی کا شمیم سخن بالکل طبقات الشعراء کا چرہ ہے اس کے بعد درگا پرشاد دہلوی ۱۲۸۵ھ میں۔ نیزۃ العلوم کے نام سے جو تذکرہ شعراء دکن کا لکھا وہ بھی اس انداز کا نیم تاریخی تذکرہ ہے۔ اس نے ایک تذکرہ شاعر عورتوں کا بھی گلشن ناز کے نام سے لکھا جو اپنے مخصوص موضوع کے لحاظ سے بالکل پہلا تذکرہ تھا لیکن اس کے بعد فصیح الدین میرٹھی نے شاعر عورتوں کا جو تذکرہ ہارسٹان ناز کے نام سے لکھا وہ زیادہ مکمل چیز ہے۔

سلسلہ بیان میں اب ہم آزاد کی آبِ حیات تک پہنچ گئے ہیں جو دوسرے دور کی آخری اور تیسرے دور کی پہلی کڑی ہے جب کہ

من ویزدان - مذہبی استفسارات وجوابات - جماعتان - نگارستان - شہوانیات - مکتوبات نیاز تین حصے  
انتقادات - ماہ واعلیہ - حسن کی عباریاں - شہاب کی سرگزشت - فلاسفۂ قدیم - ذاکرت نماز - فرستاید نقاہت جانیکہ

لکھنؤ عا۔ حیدر آباد علی گڑھ لاہور ممبئی

تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف چالیس روپیہ میں مل سکتی ہیں ۔  
**نیچرنگار لکھنؤ**

## ”نگار“ کے پچھلے فائل

عشر	=	جولائی تا دسمبر	=	۳۲
عشر	=	(سالنامہ ہندی شاعری)	=	۳۳
عشر	=	(سالنامہ اصحابِ کتب و خلافت نمبر)	=	۳۴
عشر	=	(سالنامہ مصحفی نمبر)	=	۳۵
عشر	=	(سالنامہ لفظیہ نمبر)	=	۳۶
عشر	=	جولائی تا دسمبر	=	۳۷
عشر	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۸
عشر	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۹
عشر	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۰
عشر	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۱
عشر	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۲
عشر	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۳
عشر	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۴
عشر	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۵
عشر	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۶
عشر	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۷
عشر	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۸
عشر	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۹
عشر	=	جنوری تا دسمبر	=	۵۰

نوٹ: صرف ایک ایک فائل موجود ہے اور سب سے پہلے جس کا آرڈر دیوئے گا اسی کو دیا جائے گا قیمت مخصوص ہر ایک کے علاوہ -

میں ہر کار لکھو

# عرش کی شاعری

(عبدالحی خاں سیور راوی)

عرش ملیانی کی پیش نظر شاعری کا عرصہ پچیس برس کا ہے جو ہندوستان کی سیاسی کشمکش کا دور ہے ابھی اس کے درون کی دردناک آہیں سنی جا رہی تھیں کہ مسند کے انعام و اکرام کی بارش میں مسند کی بجلیاں ترپنے لگیں۔ مسلم لیگ منظم ہو گئی۔ فرقہ واری سیاست نے ہندوستانی قومی کانگریس کے کس بل نکال دئے اور اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ ہندوستانی ثقافت و وطن پرستی اور جغرافیائی محدود کی تنگنائے سے نکل عالمگیر اور بین الاقوامی قدروں سے آشنا ہونے لگی اور پھر مسند کی صبح تک پہنچتے پہنچتے فرقہ واریت، صوبائیت اور اشتراکیت کی کتنی ہولناک راتوں سے گزرنا پڑا۔ ہندوستان آزاد ہوا لیکن وطن کی مردہ لاش پر کھڑے ہو کر مذہب اور دھرم کے دیوانوں نے خون کی ہولی کھیلی۔ رشوت، چور بازاری اور اقمیاد پروری سے وطن دوستوں کی تجوریاں بھرنے لگیں۔ غریب درخشاں عوام نے یہ محسوس بھی نہ کیا کہ ہندوستان آزاد ہو گیا اور ان کے معاشی نظام میں کسی تبدیلی کا امکان ہے۔ بالآخر جمہوریت آئی اور معاشی اور ثقافتی اقدار میں کسی قدر تبدیلیاں ہوئیں اور غیر مذہبی جمہوری حکومت کی آرزوؤں کے گہوارے میں قومی تعمیر، معاشی ترمیم اور علمی و ادبی سرپرستی کے منصوبے جھولنے لگے۔

عرش ہندوستان کے اسی عہد کے نمائندہ ہیں ان کی شاعری قومی اور ملی احساسات کی ترجمان ہے اور انسان دوستی کی آئینہ دار۔ وہ قوم پرست، وطن پرست، اشتراکی اور انسان سبھی کچھ ہیں اور اپنی طرز شاعری کی بنا پر اقبال اور جوش کا مجموعہ ہیں۔ ان کے کلام سے سرسری طور پر یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نہ تو وہ کسی نظام فکر کے بانی ہیں اور نہ ان کا تعلق کسی پیغمبر کی امت سے ہے۔ وہ صرف انسان ہیں۔ ہندوستانی ثقافت و تہذیب کے امین اور انسانیت کے داعی۔ زندگی کی جدلیاتی قدروں کا بھی احساس ہے اور عدم تشدد کا گہیاں دھیان بھی کرتے ہیں۔ زندگی کے مختلف مسائل پر اظہار رائے کرتے ہیں اور اپنے پاکیزہ تغزل، شستہ زبان اور مشق کی بنا پر اس عہد کے شعرا میں ممتاز ہیں۔

کوئی آٹھ برس ہوئے واحد علی ہاشمی صاحب ہتیم واحد لاٹھیری گورکھپور سے ان کی تعریف سنی۔ اخبارات و رسائل سے ان کے کلام کو چننا شروع کیا۔ اور پھر حسن اتفاق سے ایک دوست نے ان کا مجموعہ کلام ”ہفت رنگ“ بھی پیش کیا۔ اس طرح ان کے پڑھنے اور سمجھنے میں آسانی ہو گئی۔ ”ہفت رنگ“ میں ان کی تصویر دیکھ کر ناسخ لکھنوی کا تصور پیدا ہوا۔ دیباچے میں جناب جوش ملیح آبادی اور پنڈت کیفی آنجنائی کی تحریروں دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ ان دونوں حضرات نے یا تو ”رسم نقاب کشائی“ کی مختصر ترین رسم ادا کی ہے یا عرش کے والد جناب جوش ملیح آبادی کا نام لے کر ان کا ”نسب نامہ“ طیار کیا ہے۔ مجھے اس خیال سے ہمیشہ بے اطمینانی رہی ہے کہ کسی شاعر کا تعارف اس کے باپ دادوں کی شعری صلاحیتوں کی بنیاد پر کیوں کیا جاتا ہے۔ شاعری بڑھتی اور لوہار کی صنعت نہیں کہ باپ کی شہ پاکر کسب معاش کا ذریعہ بن جائے۔ یہ تو کوئی اور شے ہے جو اپنے مقدس نصیب ہوتا ہو اگر یہ نہ ہوتا تو ہر عالی فکر شاعر کے شاعر بیٹوں کا ایک طویل سلسلہ ہوتا۔ بہر حال یہ جملہ معترضہ ہے۔ عرش ملیانی نے ہفت رنگ کے ”در مدح خود گویم“ کے باب میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث کو ہی لایعنی قرار دیا ہے ان کا خیال ہے کہ

اظہار مطالب میں شاعر لاکھ مختار و آزاد سہی لیکن ماحول و وراثت سے متاثر ہونا اس کے لئے ضروری ہے اور اسی لئے اُن کا نقشہ ہے کہ زندگی کے مسائل سے کسی ادب یا ادیب کو مغرب ہی نہیں۔ عرشِ زبان و بیان کی تمام پابندیوں کے بقول جوش استقلال و اصرار کے ساتھ تقابل ہیں۔ اپنے کو عظمتِ اولادِ آدم اور انسان کی عام محبت کا نقیب بتایا ہے اور یہ سب کچھ اس اظہارِ حالی کے ساتھ کہ: ”مجھے شہرت کے دروازے پر دروازہ گری کے ڈھنگ سیکھنے کی کوشش کے باوجود نہیں آئے۔ اپنی تعریف پر دوسروں کو آمادہ کرنا تو کجا کبھی ایسے الفاظ سن کر بھی مسرت حاصل نہ کی۔“

اس بہان پر اب بابِ نظر کو قصہ بھی آئے گا، افسوس بھی ہوگا اور غالباً بعض کو جرت حاصل ہو۔ لیکن عرش کی یہ خاکساری اُن کی روحانیت اور روایتِ ہندی کی بنا پر ہے۔ وہ جس ماحول کے پروردہ ہیں اُس میں ایک تہذیبِ مٹ چکی ہے مگر اُس کے نشانات باقی ہیں۔ روایتی اور فرسودہ ذہنیت پر ضربِ آخر پڑ چکی ہے۔ نئے رجحانات اور میلانات تیزی سے پیدا ہو رہے ہیں قدامت پرستی تو بڑی چیز ہے قدامتِ ہندی کو سر اٹھانے میں شرمِ محسوس ہوتی ہے، مگر عرش کھل کر نہیں کہتے کہ وہ کیا ہیں؟ اِس طرف یا اُس طرف؟ اُن کے اس جھجک اور شرم میں اُن کے دل کے چور سے کہیں زیادہ اُن کا وہ اخلاص بھی شامل ہے جس کا تعلق روایت اور خدا سے بھی ہے اور بدلے ہوئے انسانوں کی زندگی سے بھی۔ مگر وہ بدل رہے ہیں۔ دھیرے دھیرے، ہندوستان کے بہتیرے دانشمندوں کی طرح۔ وہ ایک جست میں اتنے بڑے فاصلہ کو طے بھی نہیں کر سکتے۔ وہ ترقی پسند نہیں کہلاتے لیکن اُن کے یہاں ترقی پسندی اور اشتراکیت دونوں کی پذیرائی ہو سکتی ہے۔ اسی لئے ادب و شعر کے متعلق اُن کے خیالات نئے ہیں اُن کے یہاں زندگی کے آثار ہیں۔ امن اور اخوت کا پیغام ہے۔ لیکن وہ کسی خاص طبقہ یا گروہ سے متعلق نہیں، اُنکی ترقی پسندی نیکِ خلعت ہو کر بھی نیک نام نہیں۔ اُن کی طبیعت حقیرۂ نیاز کی طرح ہے جو قدامت سے اجتہادِ ثواب، نئی اہل توانا قدروں کا احترام لازم اور اشتراکیت پر کمال ایمان لاتا لگا، سمجھتے ہیں۔ عرش نئی پود کے شعرا کے لئے سہارا بھی ہیں خطرہ بھی۔ خطرہ اُن کی روایتیں ہیں۔ ان سب کے باوجود وہ انسان دوست ہیں اور اُن کی انسان دوستی اور امن پسندی، توڑ پھوڑ، تشدد، پیکار اور لوٹ مار سے مبرا ہے۔ اُن کا یہ مقام اُن کی تدریجی ترقی کا نتیجہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایسے لوگ جو روایتوں سے دھیرے دھیرے اپنی صلاحیتوں کو آزاد کر آئے بڑھتے ہیں بڑے ہی دیانتدار اور مخلص ہوتے ہیں۔ عرش کی شاعری پر اُن کے اچھے یا بُرے خیالات کا بھرپور عکس ہے اور یہی وہ شے ہے جو فن کار اور نو تو گرافر کے فرق کو واضح کرتی ہے۔

عرش کے مجموعہ کلام کو اول تا آخر پڑھ جائیے اُن کے یہاں تغزل ہر مقام پر نمایاں ملے گا۔ غزل جسے مجنوں کے خیال کے مطابق حمد گری اور وسعت کے آداب سیکھنا چاہئے، عرش کے یہاں بطور تجزیہ ملے گی۔ انھوں نے اس کامیاب تغزل کا استفادہ غالباً اقبال سے کیا ہوگا۔ اس خیال کی تصدیق حسب ذیل چند اشعار سے ہو سکتی ہے۔

چل دہر میں اسے مردِ خود آگاہِ سنبھل کر      سو جرم کا اک جرم ہے ناکردہ گنا ہی  
دل جس کا پُر انوار ہے انوارِ خودی سے      ہے اُس کے لئے بیچِ مقدر کی نکاحی  
سننے میں غلاموں کا خدا جاگ اُٹھا ہے      ہے لرزہ بر اندام ہر اک مسندِ شاہی  
خونِ مزدور ہے ارزاں ابھی پانی کی طرح      بہرِ سرمایہ ہے یہ مفت کی سوغات ابھی  
چمن کے حق میں خرابی ہے ہستی گچھیں،      کبوتر دیں کے لئے موتِ پنجِ شاہی

ان اشعار کے الفاظ اور تیور اقبال کا ہی پتہ دیتے ہیں۔ لیکن اقبال اور عرش کے خیالات میں نمایاں فرق ہے۔ اقبال عالمگیرِ اسلامی اخوت کے نقیب تھے۔ اُن کے یہاں سب سے بڑی ”چنگیزی“ یہ تھی کہ وہ مسلمان تھے۔ وہ ”خیرِ اربعِ غاب“ بھی تھے اور ”رِضا غزال تا تاری“ بھی۔ لیکن عرش کے یہاں انسانی اخوت، عدم تشدد اور امن ہی امن کی گرم بازار سی ہے۔

عرش کے یہاں اقبال کے مخصوص الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔ عرش کا ”انوارِ خودی“ کے مقابلہ میں ”مقدّر کی کم نگاہی“ کو ”ج“ کہنا اقبال ہی کی جدت ہے اور خودی اور تقدیر کے مسئلہ میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کی باریک نگاہ ہی پر اقلیدس کی حقیقتوں کی طرح عرش کی خوش نظری ٹھیک ٹھیک منطبق ہو گئی ہے۔

عرش کی نظم ”بازمانہ مسازہ“ خوب ہے لیکن یہاں بھی اقبال کے پیرہن کی خوشبو آتی ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل بند ملاحظہ ہوا۔  
گوئی مفسر حاضر تجھے بتا بھی سکا ، زمانہ کہتا ہے تہذیب جس کو ہے کیا شے  
یہ وقت ہے کہ زمانہ پہ آشکار کھریں وہ رازِ خاص کہ حامل ہیں جسکے یہ رگ و پے

اماں پذیر نہ ماہی شدہ ، بہ کام نہنگ

سکون نہ یافت جہاں از فساد و فتنہ و جنگ

عرش کی شاعری کی قوس قزح میں وطنیت اور قومیت کا رنگ تمام رنگوں پر غالب ہے۔ اربابِ نظر اسے طبعِ شاعر کی روانی کہیں بامحدود زمانہ کا تقاضا کہ سنگسار کے بعد کی نظموں میں یہ دبا دیا احساس شدید ہو گیا ہے۔ اور سنگسار کے بعد کی نظموں کا جوش و ولولہ دراصل اس ناخوابت اندیش سیاست کی تصویر ہے جس کے ماتھے پر خود پسینہ آگیا۔ غزلیں بھی ان جذبات سے بے نیاز نہیں۔ سنگسار کی نظم ”انقلاب“ کے چند اشعار ملتے ہیں۔

آستانِ دیو استبداد پر جھک نہیں سکتی جبین انقلاب

ہے شہیدانِ وطن کی یادیں خون سے تر آستین انقلاب

ہے غلاموں کا خدا عزمِ بلند دینِ مظلوموں کا دین انقلاب

پھر سنگسار کی نظم ”اشرف المخلوق“ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

یہ حرب کے آلات یہ سامانِ فنا کے یہ فتنے قیامت کے یہ طوفانِ بلا کے

بڑھتی ہوئی چڑھتی ہوئی یلغار تو دیکھو فتنے کی ذرا گری بازار تو دیکھو ،

اے اپنی وطن اپنے وطن کے ہوا میں تم خاتم ہے اگر اس کی محبت تو نگیں تم

اٹھو کہ اب ایسے ہیں تو سونا نہیں اچھا طوفان میں یوں جی کا ڈونا نہیں اچھا

مکن ہے اس ”بڑھتی ہوئی چڑھتی ہوئی یلغار“ میں جوشِ ملیح آبادی کے انقلابی نعروں کی فضا محسوس ہو۔ عرش نے اقبال سے استفادہ کیا ہے اور جوش سے بھی۔ اور اس کی ضرورت بھی تھی۔ جوش نے ہماری شاعری کو کم از کم انقلابی تکنیک عطا کی ہے۔ جس طرح اقبال نے ”فکر و نظر“ کا انقلاب دیا تھا۔ عرش اقبال، جوش، اور دوسرے درجے کے بہتیرے رن باندھنے والے شعراء کی لہری سے عرش نے اپنا کنڈن رنگ خوب چمکایا ہے۔ یہ خلاصہ موقع نہ ہو گا کہ ان کی نظم ”نیور دیکھ زمانے کے“ چند اشعار پیش کئے جائیں :-

زہرے ڈنک چلاتے ہیں دنیا پر دنیا والے

گوری قوموں کی چاندی ہے معتبہ مقدّر کالے

تو کیوں ہے علی سے بیگانہ اسے کیون خودی کے متوالے

نیور تو دیکھ زمانے کے

اور جب یہ بدلے ہوئے نیور سنگسار کی مسکراہٹ بن گئے تو اس منزل پر بھی عرش کی شاعری نے تقلید کے خلاف بغاوت کی، مذہب کی چہرہ دستیوں کے خلاف آواز اٹھائی اور آزاد ہندوستان کی ترقی و بہبود کے جذبہ سے معمور ہوتی رہی۔ اس کے مثال میں ان کی دو نظمیں ”جشنِ آزادی سنگسار“ اور ”رشتہ کا بازار“ پیش کی جاسکتی ہیں۔

برقِ رفتار پہ اپنی رشک کرتا تھا جہاں سوئے آزادی ہمارا قافلہ تھا تیز گام  
سیکھنا ہے لیکن اب میخانہ تعمیر میں جنبشِ بغضِ تمنا و حرام دورِ حرام  
آگے چل کر یہ نظم و عظیم جاتی ہے۔

عیش کے سامان بھی ہوں اور فرض کا احساس بھی جشن بھی ہو غم زدوں کی ناز برداری بھی ہو  
داخلِ آداب سے فوشی ہو ساقی کا ادب مستمایا ہوں مستیوں کے ساتھ ہنسی بھی ہو  
حال کی خاطر خرد کو شہی ہے مستحسن مگر بہر مستقبل جنوں ذوقِ بیداری بھی ہو  
اسی طرح "رشتہ کا بازار" میں ایک تعمیری جذبہ کار فرما ہے۔

بیدارم کے لوگ بھی کچھ رشتہ کے حوالے ہیں جتنے اچلے کپڑے ہیں اتنے ہی دل کا لے ہیں  
دھرم کی باتیں رہنے دو حسنِ عمل کا ذکر کرو قوم کی عزت لٹتی ہے کچھ اس کی بھی فکر کرو  
اسی سلسلے کی ایک نظم "جہل کی رات" ہے یہ وہ وقت تھا کہ جب کہ شمس کی سرتوں کا جاوہر ملک کے گوشے پر طاری  
تھا۔ ہندوستانِ غلامی کی ایک اُبھیا تک تاریک رات طے کر چکا تھا۔ لیکن عرشِ شکستہ کو رات کہتے ہیں کیونکہ سیاحتِ وقت کو ان  
تاریکیوں سے نبرد آزما ہوتا تھا۔ یہ نظم بڑی ہی مکمل اور حسین ہے۔ ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے:-

عقل کی صبح کہاں جہل کی ہے رات ابھی ذہن انسان میں ہیں فرسودہ خیالات ابھی  
پائے عالم میں ہے زنجیرِ قدامت اب تک گردنِ دہر میں ہے طوقِ روایات ابھی  
طاقتِ جستِ عمل سے ہیں ابھی دل محروم زینۂ عہدہ کشائی ہے مناجات ابھی  
دل میں انسان کے ہے وحشتِ اشراق ہنوز ثبت اذہان پہ ہے مہرِ کرامات ابھی  
رہبرِ راہِ تعقل کا خدا حافظ ہے راہ میں وہم کے لاکھوں ہیں مقامات ابھی  
ابھی ممنوع ہے دارائی شرح و تفسیر ناز فرا ہیں اشارات و کنایات ابھی  
خندہ و دلکش و گلستہ رنگیں کے عوض خنجر و تیغ سے ہوتی ہے مدارات ابھی

اس نظم میں وہ چیز جسے "روحِ عصر" کہتے ہیں محسوس کی جاسکتی ہے۔ اشارات کے پردوں میں دردناک ہنگامی تاثرات چھپے  
ہوئے ہیں۔ اسی بنا پر یہ نظم عروج پر پہنچ کر طنزیت ہو جاتی ہے۔ یہ طنز ایسا نہیں جسے آپ منفی پہلو قرار دے کر گزر جائیں۔  
آپ اس کے زہر کو پینے پر مجبور ہوں گے۔ مثلاً:-

آشیاں امن کا اب تک نہیں مسجد و بشر آستانِ جنگ کا ہے قبلہ حاجات ابھی  
گرہِ زینت کے ہیں عقدہ کشا ناخن مرگ خدمتِ امن میں داخل ہیں فسادات ابھی  
عرش کیوں خواب سے بیدار ہوا جاتا ہے بند کر آئکھ کہ باقی ہے یہاں رات ابھی

اس طرح سلسلے کے بعد عرش کی شاعری ایک ایسی منزل پر پہنچ گئی ہے جہاں ان کا طائر خیال نئی فضاؤں  
میں پرواز کر کے نیا آشیانہ ڈھونڈھتا ہے۔ ان کے خیالات وسیع ہوتے ہیں اور اسی تجسس اور بے ہنگامی میں وہ ابھی تک  
مصرود ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ ان دنوں سرتا سر محمد، امن دوست، انقلابی اور اشتراکی سب کچھ نظر آتے ہیں  
اس سلسلہ کی نظموں میں "غم ماحول" سلسلے کی "کم طرف دنیا" اور "جب آدمی وحشی بن گیا" اور  
"اے پیرِ خرابات!" قابلِ ذکر ہیں۔

فردِ غیاں نہ ہو گی روشنی کب تک بصیرت کی رہیں گے داغِ دل بن کر جہالت کے نشان کب تک

ہنسی کب تک اٹسے کی عصمت اولاد آدم کی  
جو دھرم پہیتی دیکھ چکے "ایاں" پہ جو گزری دیکھ چکے  
رہے گی آدمیت ایک جنس رائگاں کب تک (غم کا احوال)  
اس "دام" "رحیم" کی دنیا میں انسان کا جینا مشکل ہے  
(کلم طرون دنیا)

قتل و غارت کے ہزار و داغ لے کر وحشتیں،  
یوں کبھی مذہب کی قدروں کو نہ انساں چھوڑتا  
آج سنتے ہیں کہ پھر عصمت بدماں ہو گئیں  
اے خوشادہ خود بلائے جان انساں ہو گئیں  
وہ خطائیں ہی بنائے بزم امکان ہو گئیں  
(حب آدمی وحشی بن گیا)

خردی و بزرگی کی یہاں جنگ نہیں ہے  
پستی و بلندی کا کہیں رنگ نہیں ہے  
ہر دل ہے کشادہ کوئی دل تنگ نہیں ہے  
جھگڑوں کی بنا سنل نہیں رنگ نہیں ہے

عرش نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان کی غزلیں جس خوبی سے نئی شاعری اور نئے خیالات سے متاثر ہوئی ہیں اس کی مثال موجودہ  
در میں صرف چند شعرا کے یہاں ملے گی۔ عرش کی غزلیں ان تمام کمزوریوں سے پاک ہیں جسے روایتی شعراء بڑے فخر سے مقصود شاعری  
بجھ کر سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ دوران کار تشبیہیں، بعید از قیاس استعارے، دقیق تمیحات کی روایتیں اور دل میں کراہیت پیدا  
کرنے والے عاشق معشوق کے جو بچکے، مادرائیت، غیر طبعی اور بے کار خیالات، عرش کی غزلوں میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔ یہ ممکن  
اک انھوں نے "عاشق" کا بھی ذکر کیا ہو۔ لیکن دشواری کے تذکروں کو بھی لے بیٹھے لیکن ان سب کے باوجود ان کی غزلوں کا مزاج  
لے نہیں پایا۔ ان کی غزلوں میں روحانیت اور مادیت کا خوبصورت امتزاج ہے۔ فکر کے دوش پر انھیں اگر عرش کا جلوہ نظر آتا ہے  
انسان کی بے پناہ قوتوں اور حکمتوں کے سامنے فرش بھی ہوجاتے ہیں۔ غزلوں کے معاملہ میں ان کا تعلق فارسی اور اردو کے کسی  
خصوص شاعر سے نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ غزل کی نئی روش بندی کا اثر ان پر بھی ہے۔ انھیں حسرت کہہ لیجئے یا فراق، لیکن ان دونوں  
کلام سے ان کا کلام آسانی سے پہچان جا سکتا ہے۔ دوسری اصناف شاعری کی طرح ان کو غزل پر بھی قابو ہے اور یہ اعتراف بھی کرتے ہیں

اگر چاہوں تو درے میں ضیا خورشید کی بھردوں  
اگر چاہوں تو قطرے کو سمندر کر دکھاؤں میں  
اگر چاہوں حزن کو آب میں رنگ کر کہر دوں  
اگر چاہوں بکولا بن کے صحرا کو آڑا لاؤں  
زہیں کو عرش کہدوں عرش کو تخت الثری کہدوں

انھوں نے یہ اعتراف سسٹم میں کیا ہے۔ اس دور کی غزلوں میں حسن و عشق کے جذبات پاکیزگی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں  
دریقیناً اس وقت تک اردو غزل کو حسرت، فانی اور اصغر حبیہ مجدد دل چکے تھے۔ عرش کے یہاں ان شعرا کے اثرات اور نشانات قلمی ہیں

لے نہ ڈوبے کہیں خوش فہمی اور اک تجھے  
حسرت خواہ میرے مصائب کی داستاں  
کسی کے عیب کا دنیا میں وہ چہا نہیں کرتے  
سجدے غور عشق کی قیمت گھٹا گئے  
حیرت سے مجھ کو کون و مکان دیکھتے رہے

یہ سسٹم کی غزلوں کا رنگ ہے۔ ان غزلوں میں خوف خدا بھی ہے اور خوف انسان بھی۔ واعظ سے نفرت بھی اور مذہب

عشق سے حقیقت بھی۔ لیکن زبان کی صفائی اور بیان کی پختگی کے ساتھ اخلاص و سوز مندی بھی ہے۔ یہی خلوص و سوز مندی تو اصل شاعری اور صحیح آرٹ ہے۔

بعد میں سیاسی اور قومی خیالات کا نشہ اُن کی غزلوں پر سرد بن کر چھا گیا۔ وہ جیوں جیوں دنیا کے "مکروہات" سے قریب تر ہوئے اُن کا نشہ تیز ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اُن کی بھی آنکھیں ٹہنے ہو گئیں۔ یہ آنکھوں کا سُرخ ہونا بُری بات ہے۔ یہ کسی بھی شاعر کی شاعری کو جلیبہ کا اشتہار بنا سکتا ہے اور اگر ایسا ہو تو شاعر اور ادیب کی شکست و ریخت کی قوتیں فروغ پاتی ہیں۔ یہ بات کہاں سے نکل آئی۔ میں عرش کی سلسلہ کی غزلیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ہے قناعت جو ایک جلد سے پر  
شوق ابھی تنگ دست ہے شاید  
ہاں ار اُٹھا پردے کو لے پردہ نشیں اور  
مجھ سا نہیں کوئی ترے جلوں کا امیں اور  
کافی نہیں مجھ کو یہ نگاہ غلط انداز  
ہاں اور بڑھا حوصلہ قلب حزبن اور  
ہم مرتبہ عرش کوئی ان میں نہ ہوگا  
ہوں گے درجائوں کے بہت خاک نشیں اور  
نورِ خرد کی عنایت کے صدقے  
جنوں تیز ہوتا گیا زندگی کا  
زبان سے کچھ کہو صاحب مگر معلوم ہے ہم کو  
تمہارے دل کی سب باتیں ہمارے دل کی باتیں ہیں  
"صاحب" کتنا واضح اشارہ ہے۔ یہ سلسلہ کی بات ہے لیکن سلسلہ میں تو وہ اور تیز ہو گئے اور ایسا محسوس ہوا جیسے غزل  
جسے وہ پردہ کی بہو بنائے ہوئے تھے امور خانہ داری سے تنگ آکر بے شرم ہو کر تیز تیز آنکھیں دکھا رہی ہو۔

مطمئن ہے کیوں رہائی پر روایت کے اسیر  
بھانڈ کر دیوارِ زنداں کو اسے ڈھانا بھی ہے  
پھر کوئی بڑسوز نعرہ عصر حاضر کے نقیب  
گرم ہو کر آج اپنی دل کو گرمانا بھی ہے  
مُربھی ہے اک تال بھی اک سم بھی اک گانا بھی ہے  
زندگی عنوانِ افسانہ بھی، افسانہ بھی ہے  
یہ انسان کی ہے چارگی ہائے تو بہ  
دعاؤں کے باقی ہیں اب تک سہارے  
غنیمت ہے یہ ماحصل زندگی کا،  
دلے دلربائے، غمے غمکارے  
ہم آغوش طوفاں تو ہونا ہے اک دن  
سنجھل کر چلیں کیوں کنارے کنارے  
غرض اُن کی نظمیں کی طرح غزلوں میں بھی اُن کے تخلیقی شعور کے ارتقائی سلسلے ملتے ہیں۔ اور محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے یہاں  
انقلاب دے پاؤں داخل ہوا ہے۔ ٹیڑیوں کی طرح دن دھاڑے نہیں۔ چنانچہ اُن کا انقلاب اپنے گرد و پیش کا جائزہ بھی لیتا ہے اور  
مقصد کی خبر بھی رکھتا ہے۔ اُن کے گرد و پیش متوسط طبقہ کی روایتیں اور مذہب و اخلاق کی بندشیں ہیں اور اسی لئے۔

اس انتہائے ترکِ محبت کے باوجود  
ہم نے لیا ہے نام تمہارا کبھی کبھی  
عرش نے قلبی واردات اور حسی کیفیات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اشعار کے پردوں میں رومان پرور نغاروں اور نغمہ بار فضاؤں کا  
دلکشی نے بھی تاک جھانک کی ہے۔ "آدمِ شباب" اُن کی وہ رومانی نظم ہے جس میں عنوانِ شباب کے سادہ و رنگین جذبات پیش کئے  
گئے ہیں لیکن "کلفتن" کی منظر کشی میں اُن کے جوان کے دل کے تاریک جھنجھٹا اُٹھتے ہیں۔

اک قص کے عالم میں کس بھی مُسن بھی  
یا جو کڑی بھرتے تھے مہرن اور چکارے  
وہ چومنا اڑا اڑ کے برن سیم تنوں کا  
پانی کی یہ چھینٹیں تھیں کہ سیاب کے پارے  
لیکن نظم کی انتہا سوز و حسرت پر ہوتی ہے۔  
دل نہنس دیا اک کافرہ کی یاد میں رو کر

جب وہ نہیں جذبات کو پھر کون اُٹھارے

”کھتر“ کے بجائے ”کافرو“ صحت مند اقدام ہے۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ذوق و شوق فطری اور بالکل فطری ہے۔ اسی طرح ”تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں“ میں انہوں نے شوق و بے تابی کے نشاۃ انگیز مناظر پیش کئے ہیں اور آخر میں خاتمہ سماج کی قدامت پسندی پر ہوتا ہے۔

وہ ناگاہِ فرقت پہ مجبور ہوتا      فریبِ مقدر کی وہ چہرہ دستی  
خمار سے عیش اور اعرادی      وہ مرگِ تمنا وہ انجامِ مستی  
رسومِ گہن کی ستم آفرینی      زمانے کا جوہرِ قدامت پرستی  
تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

عرش کی سماجی نظموں میں ”سہاگن بیوہ“ کی رقت انگیزی بڑا نادر اور اچھوتا موضوع ہے۔ ”بیوہ“ ہندوستان کی سماجی اور جہنمی روایتوں میں سب سے زیادہ مکروہ اور ذلیل روایت ہے۔ شعراء ہند کی ایک بڑی تعداد نے ”بیوہ“ کو موضوع شاعری بنایا ہے۔ لیکن سہاگن بیوہ ایک مخصوص مشاہدہ کی چیز ہے۔ ممکن ہے عرش کا اشارہ مسلم تہذیب کی طرف ہو جس میں کثرتِ ازدواج کو سنت اور دین کی محافظت بھی حاصل ہے اور ایک بیوی کو اپنی تمام مہر و محبت کی آماجگاہ بنا کر دوسری بیوی کے کینہ و نشاط سے رشتہ ازدواج کو آلودہ کرنا عام سی بات ہے۔ اخلاق و مذہب کے علمبردار ایسے مظالم کو عین منشاءِ خداوندی قرار دے کر خاموش ہو جاتے ہیں لیکن پہلی بیوی اپنی وفا طہاریوں کے باوجود اس درونِ ناگِ منظر کی تاب نہیں لاسکتی۔ عرش نے موطوع کو جس سچائی کے ساتھ پہلی بیوی کے ماضی و حال کے آئینے میں پیش کیا ہے اس سے ایک ملاحظہ نغمہ کا صحیح لطف ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

کیوں وفاؤں کو گردوں آلودہ فریاد میں      دوسری شادی پہ دیلی ہوں مبارکباد میں  
مجھ کو بھی ماں باپ سے روتی ہوئی لائے تھے آپ      گرم گرم انگوروں سے نہہ دھوتی ہوئے لائے تھے آپ  
گرم گرم اشکوں کی مالالے کر عروس کا جدا ہونا ہندوستانی سماج کی تصویر ہے :-  
میں نے بھی کچھ سوچ کر چھوڑا تھا گھر ماں باپ کا      میں نے بھی دل دے کے پایا تھا سہارا آپ کا  
رتبگہ وہ اور امانوں کے طوفانِ یاد ہیں      مجھ کو پہلی رات کے وہ عہد و پیاں یاد ہیں  
اے مرے محبوب میری چشمِ گریاں کی قسم      دردِ دل کی حسرتوں کے جوشِ طوفان کی قسم  
کچھ کہو گیا آپ کو بھی وہ زمانہ یاد ہے      عشق کی رنگینیوں کا وہ فسانہ یاد ہے  
اور آخر میں یہ دعائیں بھی ہندوستانی بیوی کی وفا شعار بیوی کی آئینہ دار ہیں :-

آپ کو حاصلِ کدہن کی ناز برداری رہے      اُس کے پرہیز آپ ہوں وہ آپ کی چاری رہے  
آپ کی آنکھیں ہوں عشرت کے نظاروں کے لئے      آپ کا باغِ محبت ہو بہاروں کے لئے  
”ساقی، شراب اور شباب“ سے مدہوش چند راجاں بھی عرش کے احساسِ شعر و نغمہ کو آجا کر کرتی ہیں۔ ان میں سراسر کینہ و بے خودی بھی ہے اور فکر و عمل کی دعوت بھی۔ شیراز کی محفلوں کا ادب بھی ہے اور ہند کے میخانوں کا اجتہاد بھی۔ نمنا دو راجاں پیش کی جاتی ہیں :-

ساقی نے کہا غیرتِ ناہید ہوں میں      سے بول اٹھی جلوہ امید ہوں میں  
ساغر سے چھلک کر جو زمین تک پہنچی      ہر ذرہ پکار اٹھا کھورشید ہوں میں

ساتی نے کہا دور مئے ناب شروع  
بھاگیں مری محفل سے سجود و رکوع  
گل کردو ذرا شمع سبر سے خانہ  
ہوتا ہے مرے جام سے خورشید طلوع

عرش نے عوامی گیتوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور ان کے ہفت رنگ کی آخری کرن بھی صنف ہے۔ انھوں نے قصیدہ، مرثیہ، جو اور تاریخ کہنے کی جسارت نہیں کی لیکن یہ گیت لکھ کر اس نئی صنف شاعری کا تجربہ کیا ہے۔ نئے شعرا ان دنوں تیزی سے گیت لکھ رہے ہیں اور گیت کے لئے نہ تو کوئی باقاعدہ تکنیک اور نہ کوئی اچھا تجربہ۔ عام طور پر گیتوں میں ہندی کے چند ناظم الفاظ کو ملتی پھرتی اردو کے ساتھ شامل کر دیا جاتا ہے۔ غروب آفتاب پر پینکھٹ پر حسینوں کا ہجوم یا سادوں کی جھڑی میں پریتم کی یاد کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ عرش نے کسی نئے موضوع کا انکشاف نہیں کیا ہے۔ اور ان کا تجربہ بھی کامیاب نہیں ہے۔ ان کے تمام گیتوں میں ”جیوں دیپن دیپن“ اور ”ہمارا دیش“ بہرہ ادا کامیاب ہیں۔ ”ہمارا دیش“ اچھا گیت ہے اور اس قابل ہے کہ اسے داخل نصاب کیا جائے، خصوصیت ساتھ ہندو مسلم اتحاد کا یہ انداز لائق تحسین ہے۔

رجنی، راشد، سلنے، موہن  
مل کر گائیں گیت یہ پیارا

دیش ہمارا سب سے نیا  
سب سے پیارا دیش ہمارا

مندرجہ بالا چند سطور میں عرش مسیانی کی شاعری کا جو اجمالی جائزہ لیا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عرش اپنے دور کے ایک بہترین نمائندہ ہیں۔ انھوں نے استفادہ اور اختراع، روایت اور بغاوت، اتباع اور اجتہاد کے ملے جلے اقدام کی بنا پر اپنی شاعری کو اس قدر صحت مند اور توانا بنایا ہے کہ اسے اردو کے ہر گردہ اور طبقہ میں مقبولیت حاصل ہوگی۔ عرش پنجابی پنڈت ہر اور اس لحاظ سے جناب فراق صاحب کی طرح ان کی شاعری بھی بدنام ”فرقہ داری زبان“ اردو کی آبرو ہے۔ ان کا کلام فن کا راز ہے۔ زبان صاف اور شستہ ہے اور خیالات پر زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا اثر ہے وہ اپنی روایتوں اور کمزوریوں کے باوجود آنے والے تمام ادوار میں عزت و احترام سے یاد کئے جائیں گے۔ دیے تو عیوب سے یکسر پاک ہونا منشاء انسانیّت کے خلاف ہے اور اردو کے کس دور کا وہ کون اچھا شاعر ہے جس کے یہاں بُرے اشعار اور بُرے خیالات قطعی مفقود ہیں۔ بقول عرش

عیب سازوں سے ہیں افسردہ ہنرمند اب تک

نقص بازوں سے ہیں آزرده کمالات ابھی

## ہنگار کے پچھلے تین سالنامے

سالنامہ ۱۳۳۷ء جس میں علم ”فرست التحریر“ کے اصول پیش کئے گئے تھے اور جن کو دیکھ کر آپ ایک شخص کا سو بخدا دیکھ کر اس کے کیڑے کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ حزن ایک کاپی باقی ہے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۳۳۸ء اس میں ”ڈرامہ اصحاب کھٹ“ مڈیر کے قلم سے پورا شائع ہوا ہے اور ”خلافت و امامت“ کے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز ہوا ہے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۳۳۹ء اس میں ”تاریخ اسلامی“ کے عہد خلافت و امامت پر ختم بحث کی گئی ہے جس کی ابتدا و اختتام میں ہوتی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

منیجر ہنگار لکھنؤ

# قانون تجارت

## کیپر کے اصول ثلاثہ

### نیوٹن کا نظریہ کشش اجرام

(نیاز فچوری)

یہ ہر شخص کا تجربہ ہے کہ جب وہ کسی پتھر کے ٹکڑے کو اوپر سے چھوڑتا ہے تو وہ سیدھا زمین پر گر جاتا ہے اور اس واقعہ سے اسے کوئی حیرت بھی نہیں ہوتی، لیکن اگر ہمارے سامنے مقناطیس کے ذریعہ سے کوئی لوہے کا ٹکڑا کھینچ لیا جائے، یعنی لوہے کوئی آہنی چیز کسی پارہ مقناطیس سے آکر متصل ہو جائے تو ہم اس کو نگاہ عجب سے دیکھیں گے، درحالیکہ وہ قانون فطرت جو ایک وزنی چیز کو زمین کی طرف کھینچ لاتا ہے۔ اسی قدر دلچسپ ہے جس قدر کشش مقناطیس کے اصول۔

جس طرح مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے اسی طرح زمین بھی تمام اشیاء کو اپنی طرف کھینچتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ مقناطیس کا یہ عمل بہت کم اشیاء پر ہوتا ہے اور زمین کی کشش بہت عام، وسیع اور عالمگیر ہے۔

تم اپنے ہاتھ میں سیسے کا ایک ٹکڑا اور زمین کی طرف اسے چھوڑ دو تو سب سے پہلے تم یہ محسوس کرو گے کہ سیسے کے ٹکڑے کو زمین تک پہنچنے میں کچھ وقت صرف ہوا۔

اب تم دوسرے ہاتھ میں اس ٹکڑے سے زیادہ وزنی ٹکڑا اور دونوں کو ایک ساتھ چھوڑ دو تو دونوں زمین پر ساتھ ہی ساتھ گریں گے۔ حالانکہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ زیادہ وزنی چیز زیادہ تیزی کے ساتھ زمین کی طرف آئے گی اور ہلکی چیز کم تیزی کے ساتھ۔ یہ غلط ہے۔ تم ہر وقت تجربہ کر سکتے ہو کہ جب دو مختلف وزن کی چیزوں کو ایک ساتھ چھوڑا جائے گا تو وہ ساتھ ہی ساتھ زمین پر گریں گی۔ یہاں تک کہ اگر تم ایک ہاتھ میں بوتل کا کاگ لو جو بہت ہلکا ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں سنگ مرمر کا ٹکڑا یا لوہے کا ٹکڑا اور دونوں کو ایک ساتھ چھوڑ دو تو یہ دونوں زمین تک ایک ہی ساتھ پہنچیں گے۔

اگر تم ایک ہاتھ میں پر لوگے اور دوسرے ہاتھ میں لوہے کا ٹکڑا تو پر کو زمین تک پہنچنے میں زیادہ دیر لگے گی لیکن اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ پر کو ہوا آسانی کے ساتھ روک سکتی ہے اور وہ ہوا میں تیرتا ہوا زمین کی طرف آتا ہے۔ برخلاف ایک وزنی چیز کے کہ ہوا اس کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوتی اور وہ دفعۃً زمین پر آجاتی ہے لیکن اگر تم اس پر کو کسی پیسے کے اوپر رکھو اور پھر پیسے کو نزدیک کر کے چھوڑ دو تو یہ بھی ساتھ ہی ساتھ آئے گا کیونکہ اس صورت میں پیسے کے وزن یا ثقل نے پر کے لئے راستہ صاف کر دیا اور ہوا اس کی مزاحم نہیں ہوئی۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ایک چیز کا ہلکا یا بھاری ہونا غیر معتبر ہے اور ایک متعین بلندی سے جب مختلف وزن کی چیزیں زمین کی طرف چھوڑی جائیں گی تو وہ ایک ہی ساتھ اور ایک ہی وقت میں زمین پر گریں گی۔

مختلف طریقوں سے اس کا تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ زمین تک آنے میں ایک چیز فی سکندہ ۱۰ فٹ کا فاصلہ طے کرتی ہے یہاں تک کہ ایک بوتل کا کاگ اور اس سے بھی زیادہ ہلکی چیز ۱۰ فٹ کی بلندی سے صرف ایک سکندہ میں زمین تک پہنچے جائے گی یہ اصول اس قدر عام اور مستحکم ہے کہ دنیا کے جس حصہ میں یہ عمل کرو گے نتیجہ ایک ٹھیکہ کا البتہ مختلف مقامات میں تجربہ کرنے سے خفیف سا

رقی ضرور محسوس ہوگا، لیکن اس کے اسباب کچھ اور ہیں جن کا بیان کرنا یہاں ضروری نہیں اور جو کثرت نقل کے اصول پر مشتمل نہیں ہوتے۔ اب اس نظر کو پیش نظر رکھ کر یہ دیکھنا چاہئے کہ سطح زمین سے اوپر بلندی میں کس حد تک یہ حقیقت باقی رہتی ہے۔ اس فرض کے لئے اگر کوئی شخص پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جائے تو معلوم ہوگا کہ وہاں ایک وزن کو نیچے تک آنے میں بہ نسبت سطح زمین کے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ ہر چند یہ فرق بہت کم ہوگا تاہم اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اسی طرح اگر ہم اور بلندی پر چڑھ جائیں تو وہاں بھی جائے گا، لیکن بعد زمین کے ساتھ ساتھ اس میں کمی ضرور ہوتی جائے گی۔

ہم غبارہ میں میٹھ کر پانچ چھ میل سے زیادہ بلند نہیں جاسکتے، لیکن فرض کریں کہ ایک شخص ڈھائی لاکھ میل زمین سے بلند ہو جائے اور وہاں سے وہ کسی وزنی چیز کو نیچے کی طرف چھوڑے تو وہ اول نظر میں محسوس کرے گا کہ وہ چیز معلق ہو کر ایک جگہ قائم ہو گئی ہے اور یوں کہ یہ نظریہ کہ قانون تجاذب اس قدر بلندی پر بھی اپنا کام کر رہا ہے غلط ثابت ہوتا ہوا نظر آئے گا۔ مگر تقویری دیر میں معلوم ہوگا کہ وہ چیز نہایت آہستہ آہستہ نیچے کی طرف جارہی ہے اور جس قدر نیچے ہوتی جاتی ہے اس کی سرعت رفتار بڑھتی جارہی ہے۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ڈھائی لاکھ میل کی بلندی سے یہ تجربہ کرنا ناممکن ہے، اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ واقعی ہاں قانون تجاذب پایا جاتا ہے یا نہیں، لیکن یہ اعتراض غلط ہے کیونکہ اتنی ہی دور اس کا تجربہ اب بھی ہو رہا ہے اور ایک چیز اتنی ہی دور سے زمین کی طرف کھینچی جاتی رہی ہے اور وہ چیز چاند ہے۔ پھر چونکہ ہم اس کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ چاند زمین کی طرف فی سال دو گیس رفتار سے کھینچ رہا ہے، اس لئے ہم زمین کی قوت کشش کو بھی اچھی طرح معلوم کر سکتے ہیں۔ یہی تھی وہ حقیقت جس نے نیوٹن کو بتا دیا کہ اگر کوئی چیز دو لاکھ آتالیس ہزار میل کی بلندی سے بھی (جو بلندی چاند کی ہے) چھوڑی جائے گی تو زمین اُسے اپنی طرف کھینچ لے گی۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ زمین کی قوت کشش خاصہ لگے لحاظ سے کس قدر کم ہوتی جاتی ہے اس کے متعلق ماہرین سمیٹ نے متعدد تجربے کیے اور آخر کار اس نتیجہ پر پہنچے کہ زمین سے اوپر ہم جس قدر بلند ہوتے جائیں گے اسی نسبت سے ریاضی کے ایک متعین اصول کے تحت وزن بھی کم ہوتا جائے گا، جو عبارت ہے زمین کے جذب مرکزی سے۔ اس کو اس طرح سمجھنا چاہئے کہ اگر کوئی چیز چار پونڈ وزن کی مرکز زمین سے چار ہزار میل بلند پہنچ جائے گی تو اس کا وزن صرف ایک پونڈ رہ جائے گا۔

اس تجربہ کے ماتحت جب ریاضی سے ردی گئی تو حسب ذیل اصول قرار پائے :-

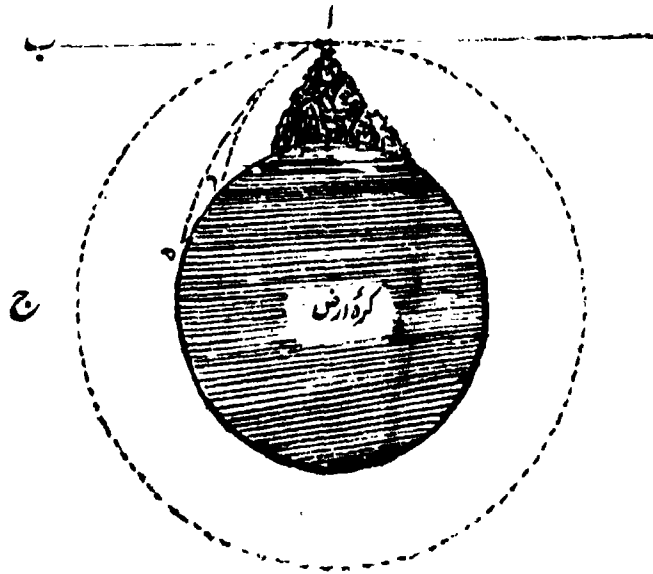
## وزن ÷ (فاصلہ + نصف قطر زمین) ÷ ۲ = قطر زمین

یعنی جو فاصلہ مرکز زمین سے اس چیز تک ہے اس کو نصف قطر زمین سے تقسیم کرنے کے بعد جو خارج قسمت حاصل ہو اور پھر اسے ربع سے وزن کو تقسیم کیا جائے تو جو نتیجہ حاصل ہوگا وہی وزن ایک چیز کا ہوگا۔ چنانچہ اس پر قیاس کر کے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ اگر کسی چار پونڈ وزن کی چیز آٹھ ہزار میل تک پہنچا دی جائے گی تو اس کا وزن صرف ۱/۱۶ پونڈ رہ جائے گا اور اگر چاند کی سطح تک پہنچ جائے گی جو تقریباً دو لاکھ چالیس ہزار میل مرکز زمین سے دور ہے تو اس کا وزن صرف ۱/۱۶ پونڈ رہ جائے گا۔

یہ ایک نہایت عام فہم اور معمولی صورت جذب زمین کے سمجھنے کی ہے۔ درحقیقت یہ مسئلہ بہت مشکل ہے علی الخصوص اس وقت جبکہ تجاذب کے اصول تمام اجرام فلکی سے وابستہ ہیں اور فضائے بسیط میں کھیلے ہوئے تمام گروے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ زمین چاند کو اور سورج زمین کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ چاند کیوں نہیں زمین پر ٹوٹ پڑتا اور زمین کیوں نہیں سورج سے ٹکرا جاتی۔ اسی طرح اگر تمام اجرام فلکی ایک دوسرے کو کھینچ رہے ہوں تو کیوں آج کل ہم تصادم نہیں ہو جاتا، لیکن یہ ادنیٰ تاہم معلوم ہو سکتا ہے کہ اگر تمام اجرام سماوی ساکن ہوتے تو باہم تصادم ہو جاتا، مگر چونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے محور پر نہایت سرعت کے ساتھ گردش کر رہا ہے یعنی خود اس کے اجزاء اپنے مرکز کی طرف کھینچ رہے ہیں

اسکے دوسرے اجرام کی کشش کی ممانعت ہوتی رہتی ہے۔  
 فزول کی صورت سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے۔

(1)



اگر ایک توپ معمولی قوت کے ساتھ مقام (۱) سے جو پہاڑ کی چوٹی ہے (ب) کی طرف سرکی جائے تو گولہ فوراً ایک خمیر راست اختیار کر کے (د) کے اوپر گرے گا۔ اگر زیادہ قوت سے کام لیا جائے گا تو وہ اور آگے بڑھ کر مقام (ه) پر گرے گا لیکن اگر کوئی نہایت قوی توپ بنائی جائے ہوگی سکند دس پندرہ میل کی رفتار سے گولے کو کھینک سکے گا تو وہ ا-ج کا راستہ اختیار کرے گا۔ ۔۔۔۔۔

اور اس کی سطح رفتار زمین سے اس قدر بلند رہے گی جتنی سر ہونے کے وقت قائم ہوئی تھی جب گولہ نقطہ ج پر پہنچے گا تو اس کی رفتار اب بھی قائم رہے گی اور وہ دائرۃً زمین کے دوسرے تیسرے اور تیسرے ربع کو طے کر کے آخر کار اسی نقطہ پر پہنچے جانے کا، جہاں سے وہ روانہ ہوا تھا۔ اگر پہاڑ کی چوٹی جہاں سے وہ گولا رواں ہوا تھا محض کردی جائے تو یہی وہ برابر معلق حالت میں گردش کرتا رہے گا۔

اب خیال کو اور زیادہ وسیع کرو اور سمجھو کہ اگر ایک ٹوپ اتنی بڑی بنائی جائے جو دو ہزار میل قطر کے گولے کو تین ہزار فٹ فی سکند کی رفتار سے پھینک سکے اور دس لاکھ میل سطح زمین سے بلند کسی مقام سے سر کیا جائے تو یہ گولہ نکل کر صرف چار ہفتے میں ساری زمین کا چکر لگا سکے گا اور پھر ہمیشہ اسی طرح گھومتا رہے گا۔

ایک شخص اس کو صرف وہم و گمان خیال کرے گا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ایک گولا آنتا ہی بڑا زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے، جسے چاند کہتے ہیں۔ پھر جس طرح چاند زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے اسی طرح زمین کے گرد گھوم رہی ہے اور اجرام فلکی کا باہمی تجانبہ متگرد سے محفوظ رکھتا ہے اس میں شک نہیں کہ اگر آج زمین ساکن ہو جائے یا چاند سے اس کی گردش سلب ہو جائے تو چاند زمین

سے اور زمین آفتاب سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں اسی طرح اور اجرام فلکی اپنی گردش ترک کر دیں تو وہ بھی آپس میں ٹکرو جائیں اور سارا نظام عالم دہم دہم ہو جائے۔

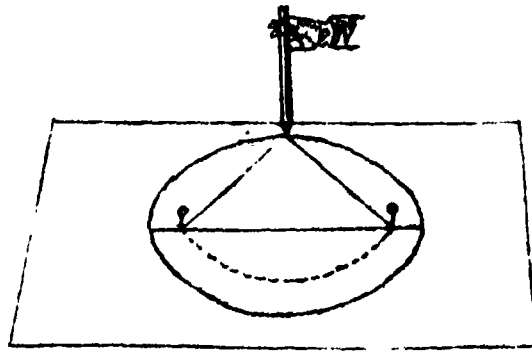
اس سے ثابت ہوا کہ اصل چیز جو باعث کشش ہے اور جو منجذب ہونے کے ساتھ ہی قوت ممانعت بھی اپنے اندر رکھتی ہے وہ اجرام فلکی کی گردش ہے، اس لئے ہم بتانا چاہتے ہیں کہ گردش کا مفہوم کیا ہے۔

گردش دو قسم کی ہوتی ہے ایک گردش محوری کہلاتی ہے اور دوسری گردش دوری۔ گردش محوری سے تو کوئی گڑہ خالی نہیں ہے ورنہ وہ قائم نہیں رہ سکتا۔ البتہ گردش دوری ان ہی اجرام میں ہے جنہیں ہم سیارہ کہتے ہیں اور جو ہمارے نظام شمسی میں علاوہ اقمرد اور مہم دارستاروں کے اس وقت تک صرف نو دریافت ہوئے ہیں۔ ہم ان سیاروں کی گردش سے یہاں بحث کرنا نہیں چاہتے کہ اس کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے، البتہ اصول تجاذب کے سلسلہ میں یہ بتانا ضروری ہے کہ ان سیاروں کی گردش دوری (C R B i T) کس صورت سے ہوتی ہے۔

ہمارے معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب کے گرد سیاروں کی گردش بالکل دائرہ کی صورت میں ہوتی ہوگی اور اس سے قبل یہی یقین کیا جاتا تھا لیکن سب سے پہلے کپلر نے اس کی تردید کی اور دنیا نے ہیئت میں اپنے اکتشاف سے بڑا زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ سیاروں کی گردش دائرہ کی طرح ہوتی ہے لیکن ان سے مکمل دائرہ نہیں بنتا بلکہ بیحد یا انڈے کی شکل کا ایک دائرہ بنتا ہے جسے انگریزی میں الپٹکل (ELLIPSE) اور عربی میں بیضی یا بیضادی کہتے ہیں۔

کافذ کے ایک تختہ پر الگ الگ کچھ فصل سے دو آبہیں گاڑ دو اور موٹے تار کے ایک حلقہ ان کے گرد ڈال دو اس کے بعد پینسل یا قلم کی نوک سے تار کے کوتان کر آپہنوں کے چاروں طرف ایک دائرہ کھینچو تو ایسی شکل بن جائے گی۔

(۲)



پھر جس طرح ایک دائرہ چھوٹا بڑا بن سکتا ہے اسی طرح آپہنوں کے قرب و بعد اور تار کے کھینچنا بڑا کرنے سے مختلف ناپ کے ایسی دائرے بن جائیں گے۔

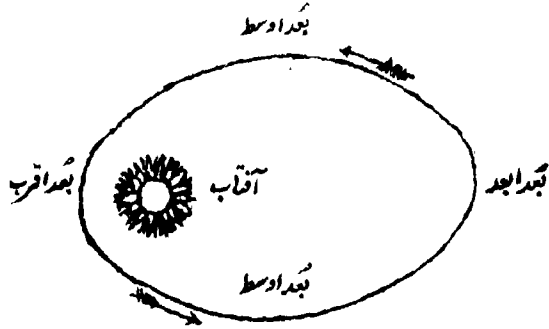
ریاضی کے نقطہ نظر سے ان دونوں مقامات کو جہاں آپہنیں نصب کی گئی تھیں فوسائی (FOCI) اور عربی میں فرتین کہتے ہیں اور ان ہی دونوں نقطوں میں سے کسی جگہ آفتاب کا ہونا ضروری ہے۔

چنانچہ اسی اصول کی بنا پر کپلر نے پہلا قاعدہ یہ مقرر کیا کہ :-

ہر سیارہ آفتاب کے گرد اہلیجی دائرہ بناتا ہے اور آفتاب کا دونوں محترقین میں سے کسی ایک محترق پر ہونا ضروری ہے۔

جب یہ متعین ہو گیا کہ تمام سیارے آفتاب کے گرد اہلیجی دائرے بناتے ہیں تو اب دیکھنا چاہئے کہ وہ اپنی گردش کس طرح پوری کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر سیارہ ایک مدت معینہ کے اندر اپنی گردش پوری کر لیتا ہے لیکن یہ خیال کرنا کہ وہ ایک ہی رفتار سے چلتا ہے درست نہیں۔ مثلاً زمین ۳۶۵ دن میں آفتاب کے گرد اپنی گردش پوری کر لیتی ہے، لیکن یہ سمجھنا کہ وہ ہر وقت اور ہر جگہ ۱۱ میل فی سکند کی رفتار سے گزرتی ہوگی غلط ہے۔

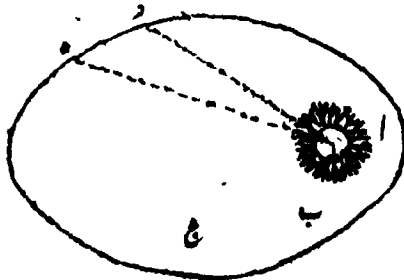
اگر گردش بالکل دائرہ کی صورت میں ہوتی تو سیارہ کی رفتار یقیناً ہر وقت ایک ہی رہتی کیونکہ آفتاب میں مرکز پر واقع ہوتا اور اس کی کشش محیط یعنی دائرے کے ہر نقطہ پر یکساں ہوتی، لیکن چونکہ سیارے اہلیجی دائرے بناتے ہیں اور آفتاب محیط سے دور و نزدیک ہوتا رہتا ہے، اس لئے اسی لحاظ سے سیارہ کی رفتار بھی بیک وقت ہوتی رہتی ہے۔



(۳)

اس شکل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اہلیجی دائرہ بنانے کی صورت میں سیارہ آفتاب سے بہت قریب ہو کر گزرتا ہے، ایک بہت بعید ہو کر اور دو نقطے ایسے ہیں جنہیں ہم بعد اوسط کہہ سکتے ہیں۔ پھر چونکہ آفتاب کے بعد و قرب کو کشش میں بڑا دخل ہے، اس لئے ظاہر ہے بعد البعد میں سیارہ کی رفتار بہت کم بعد اوسط، متوسط اور بعد اقرب میں بہت زیادہ ہوگی۔ یہ مسئلہ ریاضی کی مدد سے بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

(۴)



شکل مذکورہ بالا میں ایک سیارہ کی گردش اہلیجی دکھائی گئی ہے جس میں (۱) مقام آفتاب ہے۔ محیط میں سے ب۔ ج اور د۔ ہ کے سلسلے آئے اور ان سے مرکز آفتاب تک ایک خط کھینچ دیا گیا ہے فرض کرو کہ ا۔ ب۔ ج کا رنگ ا۔ د۔ ہ کے برابر ہے۔

سیارہ ان دونوں فاصلوں کو ایک ہی وقت میں طے کرے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ قوس ب۔ ج جو قریب آفتاب کے ہے قوس د۔ و سے بڑا اس لئے کپکپڑ کا دوسرا قاعدہ یہ قرار پایا کہ:-

ہر سیارہ آفتاب کے گرد اس طرح حرکت کرتا ہے کہ اگر اس سے ایک خط مستقیم آفتاب تک کھینچا جائے تو وہ خط برابر اوقات میں برابر رقبوں سے گزرے گا۔

ان دونوں قاعدوں کے ساتھ کپکپڑ نے ایک تیسرا قاعدہ اور قائم کیا جس سے دو مختلف سیاروں کی گردش کا مقابلہ کیا جاسکتا۔ لیکن اس کے سمجھنے سے قبل یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ بعد اوسط کسے کہتے ہیں۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اہلیجی گردش میں سیارہ کا فاصلہ آ سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور شکل غریبہ میں بعد اوسط کی جگہ بھی بتا دی گئی ہے یعنی وہ بعد مدار کے تمام مختلف فاصلوں کا اوسط ہو۔ بعد اوسط اور ب۔ اقرب کو جمع کر کے نصف کر دینے سے بعد اوسط معلوم ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ہر سیارہ مدت معینہ کے اندر اپنی گردش پوری کر لیتا ہے۔

جب یہ دونوں باتیں ذہن نشین ہو جائیں گی تو کپکپڑ کا تیسرا قاعدہ سمجھ میں آجائے گا جس کے ذریعہ سے مختلف سیاروں کے بعد اوسط اور مدت گردش کی نسبت باہمی معلوم ہو سکتی ہے وہ قاعدہ یہ ہے کہ:-

دو سیاروں کی مدت گردش کا مربع ان کے ابعاد اوسط کے کعب کی نسبت سے ہوتا ہے۔

چونکہ کپکپڑ کو معلوم تھا کہ ہر سیارہ کی مدت گردش مختلف ہے اور اسی کے ساتھ وہ اس سے بھی آگاہ تھا کہ جس قدر بعد اوسط ہوگا اسی قدر مدت گردش زیادہ ہوگی اس لئے اس نے یہ نسبت سمجھ لی۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ مدت گردش بعد اوسط کی نسبت سے ہوگی کیونکہ اس صورت میں اگر کسی سیارے کا بعد اوسط دو چند ہوتا تو مدت گردش بھی دو چند قرار پاتی، حالانکہ بعض دور کے سیارے ایسے جو سہ چند مدت میں اپنی گردش پوری کرتے ہیں، ذیل کی مثال سے یہ قاعدہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا۔

فرض کرو کہ زمین کا بعد اوسط ایک ہے اور مدت گردش ۳۶۵ و ۴/۳، اسی طرح زہرہ کا بعد اوسط ۰.۷۲ و ۵/۱۰ اور مدت گردش ۴۲ و ۲/۴ ہے۔ اس لئے ۳۶۵ و ۳ کے مربع میں وہی نسبت ہوگی جو ان دونوں کے ابعاد اوسط کے کعب میں ہے۔ اگر زہرہ کی مدت گردش نہ معلوم ہوتی یا اس کا بعد اوسط غیر معلوم ہوتا تو بھی وہ دریافت ہو سکتا تھا اور اسی طرح ہر سیارہ کی مدت گردش اور اس کا بعد اوسط معلوم کیا جاسکتا ہے۔

یہ تین کپکپڑ کے وہ تین اصول جنہوں نے نظام شمسی کو ایک منضبط صورت میں پیش کیا، کپکپڑ یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ ایسا کیوں ہو ہے اور گردش اجرام کے متعلق جو تین اصول اس نے قائم کئے ہیں وہ کس سبب کے تحت منضبط ہوتے ہیں اس مسئلہ پر سب سے پہلے نیوٹن نے توجہ کی اور اس نے ثابت کیا کہ یہ سب کچھ اجرام کے باہمی تجاذب و کشش کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔

اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی کرہ، جو فضا میں معلق ہے اور اس پر کسی دوسرے کرہ کا کوئی اثر نہیں ہے تو وہ قوت سے حرکت دے جانے کے بعد فضا کے کائنات میں چل پڑے گا، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنا راستہ کس طرح متعین کرے گا۔ جس وقت پتھر پھینکا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ فضا میں وہ ہمیشہ ایک منحنی خط بناتا ہے، اس لئے ہم اس کرہ کے متعلق بھی خیال کر سکتے ہیں کہ وہ اپنا مدار منحنی خط پر قائم کرے گا، لیکن یہ خیال غلط ہوگا کیونکہ زمین پر جو پتھر ہم پھینکتے ہیں اس پر خارجی قوتیں اپنا اثر ڈالتی ہیں برخلاف فضا کے سبب کے کہ وہاں اوپر نیچے، پست و بلند کا کوئی مفہوم نہیں ہے اس لئے جب ہم یہ تسلیم کریں گے کہ کوئی قوت کشش کرہ متحرک پر کام کر رہی ہے تو ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ خط مستقیم میں حرکت کر رہا ہے۔ لیکن چونکہ ان کی حرکت دائرہ دار ثابت ہو چکی ہے، اس لئے یہ بھی پڑے گا کہ کوئی قوت ایسی موجود ہے جو انھیں خط مستقیم سے منحرف کر کے انحناء کی طرف مائل کئے ہوئے ہے اور یہی وہ قوت ہے جسے جذبہ کشش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

# بکچہ "ذوق جنوں" کے بارے میں

(نظریہ صدیقی)

شاعری عموماً ادبی زندگی کا نقطہ آغاز ہوا کرتا ہے۔ آبل احمد سرور کی بھی ادبی زندگی شاعری ہی سے شروع ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں ان کا پہلا مجموعہ کلام "سلسبیل" کے نام سے شائع ہوا تھا لیکن اس کے بعد سے وہ "کوشش کر کے نشر کی طرف متوجہ" ہو گئے اور اس انہماک کے ساتھ متوجہ ہوئے کہ لوگ انھیں شاعر کی حیثیت سے بالکل ہی بھول گئے۔ لیکن سرور نے شاعری سے اپنا رشتہ بالکل منقطع نہیں کیا۔ ۱۹۴۶ء تک منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے کبھی کبھی شعر بھی لکھتے رہے۔ ۱۹۴۶ء کے بعد سے ان کی شاعری ان کی ادبی سرگرمیوں کا ایک باقاعدہ جزو بن گئی۔ چنانچہ نومبر ۱۹۵۵ء میں ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ "ذوق جنوں" کے نام سے شائع ہوا۔ اگر اس مجموعے کو "شاعری کی طرف سرور کی واپسی" سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس واپسی کے محرکات میں سے ایک کی طرف خود سرور نے یوں اشارہ کیا ہے:-

تھپک تھپک کے سلاپا جو تم نے ذوق سخن  
سرور اس کو کسی کی نظر جگا ہی گئی

سرور کے "ذوق سخن" کو بیدار کرنے میں "کسی کی نظر" کا جو حصہ ہے اس کا اعتراف ان کے ایک اور شعر میں بھی ملتا ہے:-

تیری ہی نگاہوں کا تصور تھا کہ ہم نے  
رعنائی افکار کے اعجاز دکھائے

یہاں لفظ "افکار" خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ جس شاعری کی محرک "کسی کی نظر" ہو اس سے قدرتی طور پر یہی توقع ہوتی ہے کہ وہ جذبات کی شاعری ہوگی اور اس کا خاص موضوع حسن و عشق ہوگا۔ لیکن سرور کی شاعری کا بنیادی سراد *Ready-made* جذبہ "نہیں" فکر ہے۔ "کسی کی نظر" نے ان کے دل کے تاروں کو چھڑنے سے زیادہ ان کے ذہن کی لہروں میں جنبش پیدا کی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ دوسرے شاعروں کے برعکس سرور کی شاعری میں رومان کی حقیقت کی طرف، یا غم جاناں سے غم دوراں کی طرف، تدریجی ارتقا نہیں ملتا بلکہ ان کے یہاں شروع ہی سے یہ دونوں عناصر یعنی رومان اور حقیقت یا غم جاناں اور غم دوراں ایک دوسرے میں مدغم نظر آتے ہیں۔ اس امتزاج کی طرف خود سرور نے یوں اشارہ کیا ہے کہ

دہر کے کرب کا آئینہ میں اشعار مرے

اور اس آئینے میں عکس نگہ ناز بھی ہے

"دہر کے کرب" کے معنی ساری دنیا کے دکھ درد کے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ سرور کی شاعری ساری دنیا کے دکھ درد کی آئینہ دار ہے۔ وہ چونکہ صرف بیدار مغز شاعر ہی نہیں بلکہ بالغ نظر نقاد بھی ہیں اس لئے وہ موجودہ عہد اور موجودہ نسل کے ذہن اور مزاج سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس ذہن کی پیچیدگی اور اس مزاج کی تنگی کا انھیں بھرپور احساس ہے۔ وہ اس پیچیدگی اور تنگی کے اسباب کو بھی سمجھتے ہیں۔ پچھلی دو عظیم جنگوں نے دنیا کو اس موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جہاں نور و ظلمت کی کشمکش، خواب و حقایق کے تصادم، یقین و شک کی آویزش اور ماضی و حال کے تضاد میں بڑی شدت پیدا ہو گئی ہے۔ موجودہ انسان جس قدر ارتقا کی

منزلیں ملے کر وہ اتنا ہی ذہنی سکون سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ ادبی آسائش کے لوازمات جس قدر بڑھتے جا رہے ہیں روحانی تشنگی اتنا ہی کم ہوتا جا رہا ہے۔ آج کا انسان جس قدر امن کے خواب دیکھتا ہے اتنے ہی جنگ کے باطل اس کے سر پر منڈلا رہے ہیں۔ بظاہر وہ جس قدر جوش و خروش کا پیکر نظر آتا ہے حقیقت میں اس پر اتنی ہی بے دلی اور بے حسنی طاری رہا کرتی ہے۔ اسے ہر شیرینی میں تلخی اور ہر شہد میں زہر محسوس ہونے لگا ہے۔ نہ اس کے قدم مضبوط زمین پر ہیں نہ اس کا دل صحیح جگہ پر۔ نہ اس کی دماغی آسائشیں ہیں اور نہ اس کی منزلیں روشن۔ برق و بخارات کے عہد نے زندگی کی ساری قدروں کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا ہے۔ اب نہ حسن میں پہلا سا تقدس ہے اور نہ عشق میں پہلی سی سپرگی اب محبت کی دیوانگی میں بھی فرزانگی کا انداز پیدا ہو گیا ہے اور عاشق پرستار سے زیادہ طلبگار بن گیا ہے۔ بچھلی نسل کے لوگوں کو اپنے شباب میں ساری دنیا جوان نظر آتی تھی۔ موجودہ نسل کا انسان اپنے شباب میں اپنے آپ کو بھی جوان محسوس نہیں کر پاتا۔ اسے نہ توجہ نہ فطرت سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے اور نہ آغوش محبوب میں زندگی کی سختیوں اور تنگیوں سے پناہ ملتی ہے۔ وہ تاریک دنیا ہونے کے باوجود ایک اذیت ناک تنہائی میں مبتلا رہا کرتا ہے۔ ایک بے نام سی افحش اسے کھائے جاتی ہے اور ایک مبہم سی غلش اس کی روح کو نا آسودہ رکھتی ہے۔ سرور نے موجودہ نسل کی زندگی کے ان سارے خدوخال کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی نظموں میں۔ ”جب اور اب“۔ ”بیزاری“ ”غلش“ ”اندھیرا اور اُجالا“ ”کل اور آج“ خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ لیکن ان نظموں میں شاعر نے موجودہ انسان کی زندگی کے صرف منفی رخ کو پیش نہیں کیا بلکہ اس کے مثبت پہلوؤں کی طرف بھی اشارے کئے ہیں۔ مثلاً

شانوں پہ اپنے ہم جو اٹھائے ہوئے ہیں بار اس بار سے جھکے ہوئے ہیں ناتواں نہیں  
وہ سرو پر سکون زمانہ گزر گیا انسانیت کی چیخ ہے اپنی فغاں نہیں  
لیکن نئی بہار میں اپنا لہو بھی ہے ہم عرصہ حیات پہ بار گراں نہیں  
کچھ کھوسے ہیں زلیلت میں کچھ پار ہے ہیں ہم

(جب اور اب)

انسان کیجئے تو یہ سودا گراں نہیں  
کر نہیں پا مال بھی ہو جائیں تو برباد نہیں نقش مٹ مٹ کے سنورتا نظر آتا ہے مجھے  
آج دیوان ہیں کہتے ہی گلستاں پھر بھی دشت میں بھول کھانا بھی آتا ہے مجھے  
جاننا ہوں کہ بڑا سخت گنہگار ہوں میں

(اندھیرا اور اُجالا)

اس اندھیرے میں اُجالے کا پرستار ہوں میں

دادیوں میں سروہ پھول جنیں کس کے لئے ہم ہمارے کی بندگی کے طلبگار ہیں آج

گر نہیں خورشید کی گل اپنے قدم چمیں گی کیا اندھیرے سے یونہی ہر پرہیزگار ہیں آج (کل اور آج)

یہ اور اس قسم کے دوسرے اشعار سے ظاہر ہے کہ سرور انسانیت کی بقا اور انسان کے ارتقاء سے نہ خود مایوس ہیں اور نہ دوسروں کو مایوس ہونے دینا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ رجائیت ان کے صالح اور صحت مند شعور تہذیب و تمدن کی تاریخ کے مطالعہ اور انسان کی تعمیری قوتوں پر یقین و اعتماد کی آئینہ دار ہے۔

سرور کی شاعری جدید انسان کی ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی زیادہ جدید ہندوستان کی ترجمان ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے مجموعہ کلام کو ”دادی گنگا وجن“ کے نام معنون کیا ہے۔ جدید ہندوستان سے میری مراد تقسیم کے بعد کے ہندوستان سے ہے، یوں تو ”ذوق جنوں“ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۱۹ء تک کے کلام پر مشتمل ہے لیکن اس کی زیادہ تر نظمیں اور غزلیں ۱۹۲۷ء کے بعد کی ہیں ان نظموں اور غزلوں میں ہندوستان کی سیاست، حکومت، معاشرہ

مذہب، تعلیم اور تہذیب سے متعلق وہ تمام رجحانات اور مسائل آگئے ہیں جو آج ہر جوش مند اور حساس ہندوستانی کے سینے کا زخم بن رہے ہیں۔ برطانوی ہندوستان کے باشندے جن توقعات کے ساتھ آزادی کے منظر سے آزادی ملنے پر وہ توقعات مایوسیوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ اسی لئے یہ آزادی بڑے شبہ کی نظر سے دیکھی گئی اور لوگوں کو اس بہار پر خزاں کا گمان ہوتا رہا۔ سرور کے یہاں بھی آزادی کی طرف سے اتنا فتنہ نظر آتا ہے۔

ہلک ہلک کے چلی باد صبح آزادی خزاں کا راج مگر پھر بھی اس چمن میں رہا  
سیاہی ایک گئی اور دوسری آئی کوئی نہ کوئی اندھیرا ہی انجمن میں رہا  
دھواں دھواں ہوئیں شمعیں ملے تو داغ خزاں کا رقص بہاروں کی انجمن میں رہا

ان اشعار میں نام نہاد آزادی کا تم ہی نہیں بلکہ آگ اور خون کے اس سیلاب کی طرف اشارہ بھی ہے جو اسی "باد صبح" (یعنی آزادی) کا کھردہ تھا۔ سنگدل اور شقاوت، بربریت اور ہیبت کے اس طوفان نے کچھ عرصہ کے لئے زندگی، انسانیت اور تہذیب کی شمعیں بجھا دیں اور لوگوں کے دلوں کو داغ دار کر دیا۔ دلوں ہی کو نہیں بلکہ ہندوستان کی تاریخ کو بھی۔ اس زمانہ میں ایک سوال یہ پیدا ہوا کہ اس بربادی اور پامالی کا اصل ذمہ دار کون ہے۔ "ترقی پسندوں" نے فتنہ و فساد اور کشت و خون ساری ذمہ داری سامراجی قوتوں کے سر منڈھ دی۔ لیکن یہ توجیہ سب لوگوں کو مطمئن نہ کر سکی۔ جب خواجہ احمد عباس نے کہا اس قتل و غارتگری میں ہماری اپنی وحشت کو بھی کچھ کم دخل نہیں تو وہ ترقی پسندوں کے حلقہ میں بہت معتوب ہوئے اور جتنے قرار دیئے گئے۔ اس کے بعد کسی ترقی پسند کو خواجہ احمد عباس کی رائے سے اتفاق کرنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن میں دیکھتا ہوں سرور ترقی پسند ہونے کے باوجود حقیقتوں کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھنے کی تاب رکھتے ہیں۔ چنانچہ انھیں اس بات کا اعتراف ہے کہ

اپنے نگار خانہ میں مستوں نے کیا کیا دنیا پہ کیسے فاش کر دیں گھر کی بات ہے

بربادی چمن میں ہمارا بھی ہاتھ ہے اس راز سے بتاؤ کسے آشنا کریں

"بربادی چمن" میں اپنوں کے ہاتھ کو دیکھتے تو "ترقی پسند" بھی ہیں۔ مگر وہ اپنوں کے ہاتھ کو صرف آڑ کا رکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اس آڑ کا راز سے کام لینے والے اغیار تھے۔ اس لئے فتنہ و فساد کی ساری ذمہ داری اغیار ہی پر عائد ہونا ہے۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ تہذیب و تمدن کی ہزاروں منزلیں ملے کر لینے کے باوجود انسان ابھی تک پورے طور پر انسان نہیں بنا ہے۔ اس میں وحشت اور بربریت کے جراثیم آج بھی موجود ہیں جو ذرا سا بھی اشتعال پا کر انسانوں کو ڈس لیتے ہیں۔ ان جراثیم کو اشتعال دینے والے کے جرم سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن جب تک وہ جراثیم انسان کے اندر موجود ہیں انسان کو بھی معصوم نہیں مانا جاسکتا۔ سرور کی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کو معصوم مانتے یا منوانے سے گریز نہیں کرتے۔

تخریب میں تعمیر ہے، تعمیر میں تخریب انسان ہے کوئی پیکر معصوم نہیں ہے

لیکن انسان کی خواہش حیرت کو تسلیم کرنے کے معنی اسے حیوان محض مانتے کے نہیں ہیں۔ اور نہ اس حیوانیت کے چٹائی غلبے کی بنا پر انسانی ارتقاء سے انکار کرنا کوئی معنی رکھتا ہے۔ سرور نے صحیح کہا ہے کہ

رفار زمانہ خطا معکوس نہیں ہے بیدار ہے جو ذہن وہ مایوس نہیں ہے

اسی نقطہ نظر کا نتیجہ ہے کہ سرور نے فتنہ و فساد کے تاریک ترین دور میں بھی نہ صرف اپنے آپ کو بدحواسی اور ہیزاری سے بچا لیا بلکہ دوسروں میں بھی زندگی، انسانیت اور تہذیب کے امٹ ہونے کا یقین بیدار کرتے رہے۔ ان کے اندر یہ اعتقاد

بھی کارفرما ہے کہ جس طرح کل کے شیطان آج انسان بن چکے ہیں اسی طرح آج کے شیطان کل ضرور انسان بن جائیں گے۔ تعصب اور تنگ نظری کا دور دورہ ہمیشہ قائم رہنے والا نہیں ہے۔

زندگی ہے تو دلوں میں دوستیں بھی آئیں گی اسے سرور اپنے وطن میں آج آسائش تو ہے

آزادی کے بعد کے ہندوستان کی تاریخ صرف انسانوں کی حیوانیت اور رہبروں کی رہزنی کی تاریخ نہیں بلکہ اور بھی کئی رجحانات کی تاریخ ہے۔ ان رجحانات کی نمائندگی کے اعتبار سے سرور کی نظموں میں ”برابری بھی نہ ہو اور برابری بھی رہے“ ”آہ بیچاروں کے اعصاب پہ ہندی ہے سوار“ اور ”سوی وفا“ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ”برابری بھی نہ ہو اور برابری بھی رہے“ میں ہندوستان کو ترقی اور رحمت، محبت اور نفرت، تعصب اور رواداری، چڑانے اصولوں اور نئے تقاضوں کے دور ہے پر دکھایا گیا ہے اس لحاظ سے یہ نظم جدید ہندوستان کا نہ صرف اچھا تجزیہ ہے بلکہ اس کی کچھ تصویر بھی۔ چونکہ یہ نظم مختصر ہے اس لئے اسے یہاں تمام و کمال نقل کرنا بے جا نہ ہوگا۔

وہ خود ہی توڑتے ہیں رشتہ محبت کو  
جبیں پہ گرد کدورت نظر میں فشر ہوں  
پرانے لیتوں کی آواز تا فلک جائے  
حقیقتیں جو بہت تلخ ہیں تو کیا غم ہے  
خود اپنے قتل پہ راضی نہ ہوں جو دیوانے  
یہ جان و دل سے ہو جہود ریت کی شیدائی  
شریک بزم ہوں سب جام جہنم تک پہنچے  
کچھ اور سخت ہوں عہد عشق کے بند جن  
سیاہ رات کی زلفیں سنوارنے والے  
ہیں بادلوں کی ستاروں سے شوخیاں کیا کیا  
یہ چاہتے ہیں مگر جذب باہمی بھی رہے  
دلوں میں امن و اخوت کی چاندنی بھی رہے  
نئے ترانوں کی لہکیں ہوا بھی بھی رہے  
نگاہ لطف کی ہلکی سی چاشنی بھی رہے  
ستم کے ساتھ کچھ افسوس دہری بھی رہے  
اقلیت میں کچھ احساس کتری بھی رہے  
برابری بھی نہ ہو اور برابری بھی رہے  
نئے زمانہ سے پونھیں سی دوستی بھی رہے  
یہ کہہ رہے ہیں کہ ہاں دن کی روشنی بھی رہے  
کہ ساتھ نور کے ظلمت کی ساتری بھی رہے

”آہ بیچاروں کے اعصاب پہ ہندی ہے سوار“ ہندی کے ان خامیوں پر طنز ہے جو سرور کے الفاظ میں ”ہندوستان کی دوسری اہم زبانوں کے حقوق کو نظر انداز کرتے ہیں اور ”ہندی“ ہندو اور ہندوستان ”کا نعرہ لگاتے ہیں“ ”ہندی، ہندو ہندوستان کا نعرہ ایک غلط اور مفر رجحان ہے لیکن جدید ہندوستان کا ایک ایسا رجحان ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ سچ پوچھئے تو یہ ایک قسم کا مرکب رجحان ہے۔ یعنی اس رجحان کے پیچھے اور کئی رجحانات کارفرما ہیں۔ اس رجحان میں غیر صحت مندانہ افسی پرستی، زمانے کی رفتار سے بے نیازی، انسانیت کے نئے مطالبات سے انحراف، ہندوستان کی صدر رنگ تہذیب کو اپنانے سے انکار، ایک ہندو مت شعریے محرومی، مذہب اور وطن کا محدود تصور ان تمام چیزوں کو دخل ہے۔ اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

دشت و کہسار میں کب ان کو جال تک و تاز  
نہ کسی طور کی حسرت نہ ستاروں کی امنگ  
دور حاضر میں وہی عہد کہن کی باتیں  
کس قدر چاؤ سے یہ دل میں بٹھالیتے ہیں  
فکر روشن ہے نہ پر سوز خلش ہے کوئی  
دل کے پینے کے انھیں کون سکھائے انداز  
اپنے ہی صحن میں دوڑاتے ہیں اپنے بھوار  
ان کی پرواز کو کافی ہے چمن کی دیوار  
نئے میدان میں لائے ہیں پرفانی قوار  
وقت کی گرد کے دھند لائے ہوئے نقش و نگار  
چمن شعر میں لائے ہیں لغت کے انبار  
سب کے حصے کی چڑھا جائیں یہی ہے اصرار

روح آدم میں تلاطم ہے نئے طوفان کا یہ مناتے ہیں ابھی ریت پہ بیٹھے تیار  
ہند کے جلوہ صدر رنگ سے یہ نفرت ہے ان کی مغل میں نہیں توس قزح کے اذکار  
عصر نو کا وہ جلو خانہ سجائیں کیونکر محو رکھتے ہیں جنہیں اب بھی شکستہ آثار  
مرحبا حسن ساعت کہ گراں ہوتے ہیں میر و غالب کے سبک نرم رسیلے اشعار  
اپنے ہی دیں کے لیکھک ہیں کہیں کیا ان کو آہ بیچاروں کے اعصاب پہ ہندی ہے سوار  
”سعی وفا“ کا موضوع وہ مسئلہ ہے جس سے آزادی ملنے کے بعد ہندوستان کی سب سے اقلیت یعنی مسلمانوں کو دوچار ہوتا پڑا۔ وہ مسئلہ ریاستی وفاداری کا تھا۔ مسلمانوں کی وفاداری شب کی نظر سے دیکھی جا رہی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے ذہن میں اس قسم کے خیالات راہ پانے لگے کہ

حرم کے کارنامے دیر میں مقبول کیا ہوں گے بتوں کے سامنے ذکر خدا کرنے سے کیا حاصل  
سمجھ کر گرد رہ وہ جھاڑ دیں گے اپنے دام سے دل و جان ان کے قدموں پر خدا کرنے سے کیا حاصل  
جہاں نفرت کی آندھی ہو تعصب کی ہوائیں بھا اک ایسے دشت میں خمیہ بپا کرنے سے کیا حاصل  
لیکن یہ نظم ہندوستانی مسلمانوں کے صرف سیاسی اضطراب کی آئینہ دار نہیں بلکہ اس میں زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ ہندوستان کی تہذیب و تمدن کی چمن ہندی میں ان کا جو حصہ رہا ہے وہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور آج بھی وہ اس باغ کو سینچنے میں جو غول جگر صرف کر رہے ہیں وہ رائیگاں نہیں جاسکتا ہے  
یہ اوجھے باغبان کو سبزہ بیکانہ ٹھیرائیں عروس وادی گنگ و جمن کچھ اور کہتی ہے  
بہاریں میری صدیوں کی چمن ہندی کا مال ہیں لب تاریخ کو میرے فسانے یاد ہیں اب بھی  
یہ صدیوں کی حنا بندی کبھی تو رنگ لائے گی بہاروں میں مری سعی وفا بھی جگمگائے گی

سرور کی شاعری میں جدید ہندوستان کی ترجمانی ہی نہیں بلکہ ان قدروں کا واضح تصور بھی ملتا ہے جس پر وہ جدید ہندوستان کی بنیادوں کو استوار دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اس عقیدہ کا حکم کھلا اظہار کر دیا ہے کہ موجودہ نظام دنگی کی قبا اس حد تک پوشیدہ ہو چکی ہے کہ یہاں وہاں رفو کرینے سے کام نہیں چل سکتا۔ اب اس قبا کو بالکل آثار چھینکنے کی ضرورت ہے جب تک معاشرے کی از سر نو تنظیم نہ ہوگی، جب تک آزادی، سیاست اور حکومت کے محدود اور ناقص تصورات نہ بدلیں گے، جب تک قومیت بین الاقوامیت کے سرحدوں کو نہ چھو لے گی، جب تک انسانیت، شیخ و برہمن کی کشمکش سے بالاتر نہ ہوگی، جب تک عوام کو ان کے حقوق نہ ملیں گے، جب تک لوگوں کی اقتصادی ضروریات کی فراہمی کا مناسب انتظام نہ ہوگا، جب تک علم و فن کی برکتیں عام نہ ہوں گی جب تک لوگوں کو ماضی پرستی کی بجائے ماضی شناسی ملے آئے گی، جب تک ملک کے جوانوں میں علم کی بچی نشانی نہ پیدا ہوگی، جب تک انھیں ہندوستانی تہذیب کے جلوہ صدر رنگ کا احساس نہ ہوگا، جب تک شعر و ادب کے جدید میلانات کے ساتھ ساتھ قدیم روایات کا شعور نہ پیدا ہوگا، جب تک ذہنی توازن، بے تعصبی، رواداری، امن پسندی، اخوت، انسانیت اور تہذیب لوگوں کی افتاد طبیعت کے اجزائے ترکیبی نہ بن جائیں گے اس وقت تک جدید ہندوستان صحیح معنی میں جدید ہندوستان نہ بن سکے گا۔ تو یہ ہے سرور کے ذہن میں جدید ہندوستان کا تصور جو ان کی نظموں اور غزلوں میں نمایاں ہے۔ اس تصور کے مستحسن اور مبارک ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے لیکن میرے نزدیک اس اب میں جو بات سب سے زیادہ مستحسن اور مبارک ہے وہ یہ ہے کہ سرور نے جدید ہندوستان کا تصور پیش کرتے ہوئے چند قدروں پر اصرار کیا ہے، کسی مخصوص نظام زندگی کی نہیں میر خیال ہے کہ ادیبوں اور شاعروں کو انسانیت کی نجات انسانی قدروں میں تلاش کرنا چاہئے، کسی مخصوص سیاسی اور

اقتصادی نظام میں نہیں۔ اس لئے کہ اچھے سے اچھا سیاسی یا اقتصادی نظام ایک نہ ایک دن خدایاں پڑے مہمات سے گزرنے والی فلاح و بہبود کے وسیع تصور پر مبنی ہیں۔

میں نے اس مضمون کے شروع میں کہا ہے کہ سرور کی شاعری رومان سے حقیقت کی طرف یا غمِ حلاوت سے غمِ دوراں کی طرف ارتقا نہیں بلکہ ان دونوں عناصر کا امتزاج ہے۔ خود سرور کا بھی دعویٰ ہے کہ ان کے اشعار دہرے کرپ کا آئینہ بھی ہیں اور نگہِ ناز کا عکس بھی۔ لیکن یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ سرور کی شاعری میں نگہِ ناز کا عکس نسبتاً بہت کم ہے۔ اتنا کم کہ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ انھوں نے رومانی یا عشقیہ شاعری کی ہی نہیں تو غلط نہ ہوگا۔ سرور حقیقت کے پرستار ہونے کے باوجود خواب سے بیزار نہیں۔ انھوں نے اس خیال کو مختلف پیرایوں میں دہرایا ہے کہ خوابوں سے توسیعِ حقایق میں مدد ملتی ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ خوابوں کی دنیا میں رہنا پسند نہیں کرتے۔ وہ حقایق کو رومان کے سنہرے غلاف میں پیش کرنے کے قابل نہیں۔ چنانچہ ان کے یہاں بھی رومانی نظم نہیں ملتی۔ جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے وہاں بھی انھوں نے حیات و کائنات کی ترجمانی میں فراق کی بجائے اقبال کے طریقِ اظہار کو ترجیح دی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کے یہاں حسن و عشق کی شاعری بالکل نہیں ملتی۔ ضرور ہے کہ سرور حسن و عشق کی دنیا سے بہت سرسری گزر گئے ہیں۔ وہ حسن کے پرستار کم اور اداس شناس زیادہ ہیں۔ ان کی شاعری میں فردِ حسن اور غیرتِ عشق کی کشمکش کا اظہار کئی جگہ ملتا ہے لیکن جسم کی آبیغ کہیں نہیں ملتی۔ ان کے یہاں اگر دردِ محرومی نہیں ہے تو احساسِ سرشاری بھی نہیں ہے۔ انھیں نہ تو عشق کے طوفان و مسکون کا تجربہ ہے اور نہ عشق کے غم و مسرت کا عرفان۔ اسی لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے یہاں حسن و عشق سے مستثنیٰ اشعار تو ملتے ہیں لیکن عشقیہ شاعری نہیں ملتی۔ واقعہ یہ ہے کہ حسن و عشق سرور کی غزلوں کا بنیادی موضوع ہیں بھی نہیں۔ ان کی غزلوں میں وہ افکار و خیالات زیادہ ہیں جن کا تعلق زندگی کے اجتماعی پہلوؤں سے ہے۔ اگرچہ ان کی غزلوں میں کئی جگہ نظمیت پیدا ہو گئی ہے تاہم اچھے اشعار خاصی تعداد میں ملاتے ہیں۔ چند اشعار دیکھتے چلے :-

کبھی ایسا بھی محبت میں جنوں ہوتا ہے	نکدہ لطف سے درد اور فزوں ہوتا ہے
کچھ کیا ایسے گرفتار محبت کا علاج	نہ سکوں ہوتا ہے جس کو نہ جنوں ہوتا ہے
لطف کا تیرے ملا ہے وہ سہارا ہم کو	اب تو ہر درد ہے کچھ اور گوارا ہم کو
یک گود ربطِ پنہاں اس میں بھی ہیں نایاں	تم گرچہ کر رہے ہو بائیں ادھر ادھر کی
کم ہو متاعِ جاں بھی جس کی نظر کی قیمت	کس طرح اس کو چاہے ہستی ہی کیا بشر کی
آرزوئے بن میں بھی کیا کیا بسائیں مبتیاں	بے دلی نے بستیوں کو بھی اڑا بن کیا
جب بات نہ پوچھی تری بیگانہ نظر نے	یوں مٹ گئے دنیا کے بھی کام آنے کے ہم
کسی نگاہ کا دل نے فریب کھایا تھا	یہ واردات بھی کیا یادگار گزری ہے
جی کا جنمِ رازِ لعلِ مسلسل کا خیال	کس خروابی سے ہر اک شب کو سوچ رہا ہے
تیرے دل میں نہ جگہ پائی تو پھر کیا حاصل	اک زمانے کی نگاہوں میں جو گھر ہم نے کیا
غورِ حسن سے وہ بے نیازی اب نہیں بھتی	ٹھہرا ہے جذبِ الفت کس قد نازک مقام آیا
چھاؤں میں زلفوں کی بھی مجھائے گا کون قرار	یہ بھی کیا کم ہے کہ ان کے دل میں گنجائش ہو
تھکنا عشق جسے خاک میں ملاتا ہے	اسی کی خاک سے پھر پھول بھی کھلتا ہے
ہر تمنا کو وہ اک زخم بنا دیتے ہیں	ہم ہر اک زخم سے سو پھول کھلا دیتے ہیں

آج دیں داروں میں مذکور ہمارا کیا تھا  
روہ حیات بڑے پیچ و خم سے گزری ہے  
کہیں بوسیدہ قبا میں بھی رنو ہوتا ہے  
خوابوں سے یوں تو روز بھلتے رہے ہیں ہم  
کس سے بار حیات اٹھا ہے  
خوابوں کی یہ غلش تو بڑا کام کر گئی  
کوہ کن ان میں بھی کرتا ہے تعلق پیدا  
جو قدم چھوٹک چھوٹک دھرتے تھے  
لگاؤ لاکھ سہی پر لگن نہیں ملتی  
تجہ سے طوفاں کے تقاضے کبھی اتنے تو نہ تھے  
اپنے ہی گھر کی خیر منائی تمام عمر  
یہ فسانہ نہ کہیں گوشش صنم تک پہنچے  
کسی طرف کوئی سیدھا سا راستہ نہ گیا  
جو بھی ٹانگا ہے اُدھر جائے تو پھر کیا کیجئے  
کتنی حقیقتوں کو بدلتے رہے ہیں ہم  
کیا ہوا ہم اگر سنبھل نہ سکے  
سادہ حقیقتوں میں بھی کچھ رنگ بھر گئی  
جوتے شیر اور سہی سنگ گراں اور سہی  
ایسے سبکے کہ پھر سنبھل نہ سکے  
ہوس تو عام ہے تہذیب عاشقی کم ہے  
تیری دلدار رہی ساحل کبھی ایسی تو نہ تھی  
ہم سے سرور نگر دو عالم نہ ہو سکی

ترقی پسند شاعروں میں سرور جعفری کے بعد اقبال کا گہرا اثر سرور کے یہاں نظر آتا ہے۔ یہ اثر کہیں ان کی فکر میں جلوہ گر ہے کہیں کے فن میں۔ کہیں اسلوب میں۔ کہیں آہنگ میں۔ سرور کے مجموعہ کلام کا نام تک اقبال کے اثر کا غماز ہے۔ اقبال کی طرح ان کے ان بھی لفظ ”جنون“ جدوجہد اور حوصلے کی علامت ہے۔ ان کی شاعری میں ذوق جنوں، ذوق یقیں، ذوق سفر، خون جگر، شکل پسندی، زوہرستی، گریہ سحری، آہ نیم شبی، متاع قلب و نظر، قدیم وجدید کے تسلسل اور خودی و بنخودی کے امتزاج پر جو اصرار ہے اور اشتہار پوزیٹو کوہ کنی کو، عقل کے جذبہ خود کام پر عشق کی دولت بیدار کو، ہوش و خرد پر جذب و جنوں کو، عشرت ساحل پر لذت طوفاں کو، بنت شہبستان پر محشر نیستان کو، منزل پر سفر کو اور اندیشہ چالاک پر خون جگر کو جو ترجیح حاصل ہے وہ اقبال کے فیضان کا نتیجہ ہے۔ اعلیٰ میں سرور کا اسلوب تنقید اور انداز تلقین تک اقبال کے اسلوب تنقید اور انداز تلقین سے مشابہ ہے۔ سرور کے نظریہ حیات بھی اقبال کی چھاپ موجود ہے۔ اقبال کی طرح ان کے نزدیک بھی زندگی کشش سے عبارت ہے۔ اقبال کا اثر سرور کے متفرق اشعار میں نہیں بلکہ بعض نظموں اور کئی غزلوں میں شروع سے آخر تک نمایاں ہے۔ اقبال کے نقش قدیم پر چلنے کے معنی فکر و فن کی صحت مند راز اور صالح روایات کو اپنانے کے ہیں۔ لیکن اقبال کی زبان، آواز اور لب و لہجہ میں بولنے کی کوشش اپنی انفرادیت کے حق میں معنی رکھتی ہے اس بات پر ضرور نظر رکھنی چاہئے۔ خصوصاً اس لئے کہ انفرادیت کی تعمیر و تحفظ کے سلسلے میں خود اقبال یہاں تک گئے ہیں کہ:-

مثل آئینہ مشو محو جمال دگراں

از دل و دیدہ فرو شوئے خیال دگراں

اردو شاعری کے مستقبل کو غزل کی بجائے نظم سے وابستہ ماننے کے باوجود سرور نے نظمیں کم کہی ہیں اور غزلیں زیادہ۔ میرے دیک ان کی نظمیں میں ”جب اور اب“، ”غلش“، ”اندھیرا اور اجالا“، ”کل اور آج“، ”جنت، شیطان اور آدم“، ”برابری بھی نہ ہو اور برابری بھی رہے“، ”نئے علی گڑھ سے خطاب“، ”مقبول میں ابھی بیٹھے ہیں مجاور کہتے“، ”میر مغال کی ایڑیاں سسی ونا“، ”دیوانی“، ”ایک قنوطی دوست سے“، ”یلائے شعر اور نگار زلیمت“، ”آہ بے چاروں کے اعصاب پہ ہندی ہے کوا“، ”لانی ہاؤس“، ”نئے انسان کا نقشہ“، ”ماتم کیوں“، ”سکوت یا موت“، ”کیسے“، ”کسی کی آپ بیتی“، ”زعموں کی کائنات“، ”روداد اسیری“ اور ”شام اودھ“۔ اہم نظمیں ہیں۔ ان میں فنی اعتبار سے مجھے ”سسی ونا“ اور ”برابری بھی نہ ہو اور برابری بھی ہے“ سب سے زیادہ پسند آئیں۔ آخر الذکر نظم میں شاعر کی اخلاقی جرأت، صاف گوئی اور تلخ نوائی نے مجھے خصوصیت کے ساتھ متاثر کیا

سرور اپنی نظموں میں مسلسل خیالات پیش کرنے کی بہ نسبت بلیغ اشاروں اور لطیف کنایوں سے زیادہ کام لیتے ہیں جس کی بنا پر ان کی نظموں میں جا بجا تفرل کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ بات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جہاں غزلوں میں نظم کی کیفیت کا پیدا ہو جاتا ہے غزلوں کا بڑا عیب ہے وہاں نظموں میں تفرل کی کیفیت کا پیدا ہو جانا نظموں کا بڑا حسن ہے۔ میرا خیال ہے کہ فنی اعتبار سے ”سسی ونا“ سرور کی سب سے خوبصورت اور کامیاب نظم ہے۔ جیسا کہ سرور نے خود لکھا ہے وہ شاعری میں کلاسیکل طرز کے زیادہ دلدادہ ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے ایک نظم معرا اور دو آزاد نظمیں بھی کہی ہیں۔ لیکن ان نظموں میں وہ ابہام نہیں جو میراجی اور ان کے گردہ کے دوسرے شاعروں کی مشترکہ خصوصیت ہے۔ دراصل یہ فرق سرور اور میراجی کا نہیں بلکہ ترقی پسند شاعروں اور میراجی کے پیروں کا فرق ہے۔ سردار جعفری اور دوسرے ترقی پسند شاعروں کی بھی معرا اور آزاد نظموں میں ابہام اور دو راز کا راز اشاریت سے شعوری گریز ملتا ہے۔ کیونکہ ان کا خدشہ عوام سے ہے۔ سرور کی نظموں میں کہیں کہیں تعمیری حسن کی کمی لگتی ہے۔ بعض اوقات وہ جوش کی طرح ایک بات ایک مرتبہ کہہ کر مطمئن نہیں ہوتے اور اسے غیر ضروری طور پر دہرا دیتے ہیں۔ یہاں جوش کا نام لینے سے میرا مطلب یہ نہیں کہ ان کے یہاں یہ خامی جوش کے اثر کا نتیجہ ہے۔ ویسے ان کے یہاں جوش کا تھوڑا اثر ضرور ہے۔ ان کی نظم ”لئے انسان کا نغمہ“ جوش کے انداز بیان کی یاد دلاتی ہے۔

سرور کی غزلوں میں جا بجا نظم کی کیفیت ضرور پیدا ہو گئی ہے لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں خشکی اور بے کیفی نہیں پائی جاتی۔ انھوں نے غزل میں زندگی کے مسائل کو سمونے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن اس باب میں غزل کے آداب و روایات سے بغاوت ہو گئی نہیں تھی۔ ان کی غزلوں کی ایک بڑی خوبی ہمواری ہے اور یہ ہمواری اس لئے اور بھی قابلِ تعریف ہے کہ سرور کی زیادہ تر غزلیں مشکل زمینوں میں ہیں۔

سرور کا انداز بیان واضح شگفتہ اور دل آویز ہے۔ لیکن ابھی ان کے یہاں تلوار کی وہ تیزی نہیں آنے پائی جس پر وہ اپنے ”نقدی مضامین میں اصرار کرتے ہیں اور جسے وہ ہر شاعر کے یہاں تلاش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں فارسی الفاظ اور تراکیب کا عمل و دل زیادہ ہے جس سے ان کی شاعری میں بڑی خوش آہنگی پیدا ہو گئی ہے۔ کہیں کہیں انھوں نے ہندی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ لیکن وہ الفاظ ان کی شاعری کی فضا سے ہم آہنگ نہیں۔ مثلاً:-

وطن میں اپنے چاہئے سرور شوق باشعور  
نفس کی کوئی نہیں مگر نظر کا کال ہے

یہاں لفظ کال کی وجہ سے کس قدر بے سراہن پیدا ہو گیا ہے۔ سرور زبان پر خاصی قدرت رکھتے ہیں اور ان کے بیان میں بڑی روانی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے ”ذوق جنوں“ کے ابتدائی صفحات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:- ”میں عام طور پر صحت زبان کا خیال رکھتا ہوں اور ادبی مزاج کا قابل نہیں۔ لیکن کہیں کہیں لطافت کا تقاضا ہوتا ہے یا بات کہنی ضرور ہوتی ہے تو قواعد کے حصار کا اتنا خیال نہیں رکھتا۔“ سرور کی شاعری ان کے اس بیان کی تصدیق کرتی ہے۔ ان کی شاعری کا دامن ادبی مزاجیت کے داخلوں سے یقیناً پاک ہے۔ ویسے ان کے یہاں بعض فنی اور معنوی کوتاہیاں ضرور ملتی ہیں۔ لیکن تھوڑی بہت لغزشوں سے کون بچا ہے۔ ان کی شاعری کی شگفتگی و شادابی، تازگی و ترقی سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ابھی اس میں وہ رجاؤ اور گھلاوٹ محسوس نہیں ہوتی جو شاعری کو ساحری بنا دیتی ہے۔

پھر بھی ”ذوق جنوں“ کے مطالعہ کے بعد یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اگر سرور صرف تنقید نگاری پر اکتفا کریں تو بہتر میرے خیال میں ابھی ان کے شاعرانہ امکانات کی تکمیل باقی ہے اور اس تکمیل سے بڑی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

# روایت و درایت

(وقار احمد رضوی)

روایت اور زندگی میں وہی نسبت ہے جو حکمت و گل میں - زندگی کی تعمیر کے لئے روایت کا وجود خود زندگی کی پابندی سے عبارت ہوتا ہے۔ روایت - نظم حیات اور احساس زندگی کی ہمیشہ سے معاون رہی ہے۔ روایت نے ہمیشہ زندگی کا ساتھ دیا ہے۔ زندگی کی زلفت پہچاں جب بھی برہم ہوئی ہے، جب بھی انسانیت نے بہمیت کی بندگی کی ہے اور جب بھی تمام عالم انسانیت، جبر و مستبدان، درایت و ادراک کے منظم سے نیم جان ہوئی ہے، انسانی زندگی کی تاریخ گواہ ہے کہ اس وقت روایت نے بھٹکی ہوئی انسانیت کی رہنمائی کی ہے۔

روایت اور درایت کا کائناتی تصور ہمیشہ ایک دوسرے سے متضاد رہا ہے اور نتیجہ میں روایت ہی نے ہمیشہ درایت پر حق پائی ہے۔ اس لئے کہ فطرت کو نیہ کا واجبی نظام ہمیشہ اس بات کا متقاضی رہا ہے کہ روایت غالب رہے۔ ورنہ اگر اس کائنات پر کبھی بھی درایت چوری طرح حکمران ہو جاتی تو آج یہ زمین و آسمان فرعون و نمرود کی تاجدار سی کا کلمہ پڑھتے نظر آتے۔ آج تک دنیا میں کتنے ہی نمرود پیدا ہوئے اور کتنی ہی بار انہوں نے درایت کے نام پر اس کائنات کی آفاقی کو خیریدنا چاہا۔ لیکن انسانی تاریخ بن کائنات کا کوئی بھی حصہ ایسا نظر نہیں آتا، جہاں برسوں صرف درایت نے حکمرانی کی ہو۔ یونان کی عقلی بیداری کا وہ دور جس میں سقراط اور ارسطو دنیا کو فلسفہ و حکمت، درایت و عقل کی تعلیم دے رہے تھے، روایت پسند رکھنے حکماء کو بھی پیدا لئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور آج بھی یورپ میں بظاہر جاہلوں طوف درایت کی اورنگ نشینی نظر آتی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہاں نے عوام اور خواص کے ضمیر آج بھی عیسائی مسیح کی تعلیمات و نفعات کی آواز باز گشت آیا کرتی ہے۔ معبدوں کی گنبدیں آج بھی انجیل ل کی صداؤں سے گونجا کرتی ہیں۔ گرجوں کے کلس آفتاب عبودیت کی صنیا پاشیوں سے آج بھی جگمگا کر رہے ہیں اور صلیبی شیخت کی کلاہ کج عقیدت کی بارگاہ میں آج بھی خم ہو جاتی ہے۔

فرعون کی فرعونیت، نمرود کی جوس آفاقی اور آذر کی خارا تراشی نے کتنے ہی ایسے شیش محل جنم دئے جن کے شیشے شش پاش ہو گئے، روایت کی ضرب خارا ئی سے اور فرعون کی بغاوت نے موسیٰ رحمت کی آغوش میں آسودگی اور آذر کی ت گمری نے ابراہیم کی خارا گدازی سے لذت شکستگی پائی۔ نگار نو کی شیشہ جانی نے سنگ و خارا کے دلوں کو شگاف اندام بنا دیا۔ رباط کی روح فاتر سیرہ محض "شیشہ دل" بن کے رہ گئی۔ شیشے ٹوٹنے لگے اور ساقی نے شگاہوں کے جام و مہو منہا لے۔ در بھر عرب کے ایک یتیم فرزند محترم کے ضمیر کو روایت نے اتنی زبردست قوت بخشی کہ اُس کی ایک آواز نے قیصر و کسریٰ کے ہانوں کو ہلا ڈالا۔ اور جب عرب کے حق پسندوں کا یہ گروہ روایت کی مہربانی میں آگے کی طرف کوچ کر رہا تھا تو عجیب شان لکھوٹی روایت کے جاہ و جلال کے سامنے اپنی زندگی کا آخری سانس لے رہی تھی۔ براہی کاروان محمدی پیشوائی میں آہنی دم کے ساتھ گام بہ گام اپنی منزل مقصود کی طرف قدم بڑھا رہا تھا اور نمرود و آذر کی خاک نشین عظمت، عرب کے ریگستانوں و خاک آلود چورہی تھی۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو دنیا کے تمام مذاہب، آسمانی یا مذہبی کتب ہیں، ریشیون، نبیوں اور پیغمبروں کا وجود صرف ایک لفظ ”روایت“ کی تفسیر نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب روایت ہے اور روایت کا براہ راست تعلق انسانی سے ہے اس کے برعکس درایت کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے۔ اس لئے روایت دل ہے اور درایت عقل۔ دل مرکز جمال ہوتا اور عقل مہر اجلال۔ اور یہ مانی ہوئی چیز ہے کہ جلال کی بہ نسبت جمال ایک پانچواں حقیقت ہے ایک حادثہ ہے تو دوسری حدوث و نبوت کی اس جنگ میں ظاہر ہے جو کامیابی ایک ثابت حقیقت کو حاصل ہو سکتی وہ حقیقت حادثہ کو کہاں؟ بابل و آرمینیا کی پرانی تہذیب کی موت، عرب پانڈہ کی تباہی اس لئے واقع ہوئی کہ انھوں نے اپنی روایت کا تحفظ نہیں اور ایک ”حقیقت حادثہ“ ہی کو حاصل زندگی سمجھ بیٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ ”مذہب“ نے انسانوں کے دلوں پر حکومت ا سکھایا۔ دنیا کی تاریخ میں کسی شہنشاہیت یا حکومت کی ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی جس نے انسانوں کے ضمیروں پر حکم کی ہو۔ شاید اسی وجہ سے ان کی ”عظمتیں“ فنا کی گرفت میں آئے بغیر رہ سکیں۔ قیصر و کسریٰ کا وہ جاہ و جلال اب باقی ہے جس کے سامنے عرب و عجم کے سر جھک جاتے تھے۔ لیکن محمد کی تعلیمات کے ماننے والے کائنات کی اس عربی و بسیط سطح پر آج بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اور یہ صرف اس لئے کہ محمد نے دماغ کے ساتھ ساتھ دل پر بھی حکومت کرنے کے طریقہ سکھائے۔ اور فرقان مجید نے درایت کو ضمنی حیثیت دے کر روایت کو اپنانے کی تعلیم دی۔ تقریباً یہی حال دوسرے مذاہب کا بھی ہے۔ گوتم بدھ اور عیسیٰ مسیح اگرچہ آج دنیا میں نہیں لیکن ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے والے باوجود عقل کی ترقی کے، آج بھی دنیا میں موجود ہیں۔ اور یہی روایت کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

روایت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ کچھ لوگ اس کو بہت ہی محدود معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ روایت کا مفہوم صرف یہی نہیں ہے کہ کچھ بڑے اصولوں کی عظمت تسلیم کرنے کے بعد ان کی انہما دھند تقلید کی جائے۔ بلکہ روایت یا تقلید کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اسلاف کے تجربات زندگی اور مشاہدات کی روشنی میں اپنی جدید آزمودہ کار حیات ناقام کے او پریشاں کی ترتیب و تہذیب کی جائے تاکہ اس کے ذریعہ مصحف دیست کی صحیح ترتیب عمل میں آسکے اور دل صد آرزو ضبط حیات اور جمعیت دل و سکون خاطر حاصل کر سکے۔ کیونکہ روایت فطرت ہے کہ وہ ضبط ملت و مذہب کرتی ہے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جمعیت اسی کی بدولت آتی ہے۔ اس لئے کہ روایت نے ہمیشہ زندگی کو زندہ کے طریقے، ملت و مذہب کو ضبط و نظم کے اصول سکھائے ہیں۔

راہ آبارو کہ اس جمعیت است

معنی تقلید ضبط ملت است

تقلید اور روایت تقریباً ایک ہی چیز ہیں۔ دور جدید میں تقلید کا مفہوم کچھ کریمہ سا ہو گیا ہے۔ مذہب و روحانیت، شریعت و طریقت کے ماننے والوں کو یہ نئی تہذیب کے دلدادہ بڑی بڑی لگا ہوں سے دیکھ کر کہا کرتے ہیں کہ یہ پرانی روایات کے پرستار، پرانی لکیر کے فقیر اور اپنے آبا و اجداد کے راستوں پر چلنے والے آج کے نئے ماحول کا تعمیر کیا کر سکتے ہیں۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو کہنے والے خود ایک حیثیت سے مقلد اور روایت پرست ہیں کیا مارکس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے والے مارکس کے مقلد نہیں؟ کیا فرانز کے نظریے جنس کی پیروی کرنے والے روایت پرست اور رجعت پسند نہیں؟ اگر مارکس کے نظریات کے ماننے والوں اور کین و اسٹالین کی آواز پر بلند کہنے والوں کو مقلد یا روایت پرست نہیں کہا جاسکتا۔ اگر وہ انفرادی نظریات زندگی کی تقلید کرنے کے باوجود مقلد ہنر اور خرد مند تسلیم کئے جاسکتے ہیں تو مذہب کے ماننے والوں، محمد یا کسی بھی مصلح انسان کے بتائے ہوئے اصول

ہر چلنے والوں کو بھی مقلد کہہ کر ان کی پشت پر رجعت پسندی اور روایت پرستی کا یہل نہیں لگایا جاسکتا اس لئے کہ جس طرح مارکس کے ملنے والوں کو مارکس کے مذہب پر ایمان لانے کا حق حاصل ہے اسی طرح مذہب و شریعت کے پیروں کو بھی اپنے مذہب و دین کی صداقت و عظمت تسلیم کرنے کا حق حاصل ہے۔ روایت اس لئے محبوب ہے کہ اس نے جب بھی انسانی زندگی کی عنان اپنے ہاتھ میں لی ہے اس نے دنیا کو امن، صلح، روح اور شائستگی کی تعلیم دی ہے اور روایت جب بھی ہر سر اقتدار آئی ہے اس نے دنیا سے سکون و اطمینان ختم کیا ہے۔ آج دنیا اس لئے پریشان ہے کہ یہ عہد روایت پسندی کا دور ہے۔ آج کے دور میں عقل و دانش کی فراوانی ہے۔ انسانی ادراک و خرد اپنی انتہائی ارتقاء کی منزل پر پہنچ چکی ہے۔ آج انسان اپنے عقل کی طاقت کے بھروسے پر خود اپنی انسانی نسل کو کچلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آج صرف وہ ملک و قوم اور وہ جماعت زندہ رہ سکتی ہے جس کے پاس ایٹم بم ہو، جس کے پاس ہائیڈروجن بم ہو یا سیم و زر سے بھرے ہوئے ایوان و قصر فلک ہوس ہوں۔ اور یہی روایت یا عقل کے ارتقاء کی انتہائی پستی ہے۔ ایٹم کی تخلیق جہاں دنیا سے عقل و خرد کے لئے قابل صد تحسین ہے وہاں وہ روایت کے دامن پر ایک ایسا بدنما داغ ہے جس کو آسانی سے مٹایا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ روایت نے انسانی نسل کو نیست و نابود کرنے کے طریقے سکھائے ہیں۔ نسل آدم کے کشت و خون کے یہ حوصلہ و درندگی، حیوانیت یا بہمیت تو کہے جاسکتے ہیں لیکن اس کو کسی بھی صورت سے انسانیت یا انسانی زندگی کی معراج نہیں کہا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج پھر یہ نیا انسان اب سے سائنکڑوں برس پہلے انسانوں کی تعلیمات کی طرف اپنا رخ موڑ رہا ہے۔ آج پوری دنیا امن کی پیاسی ہے سب ملک، سب قومیں، امن کی آواز کو بلند کر رہی ہیں اور یہ ”امن“ کا پیغام وہی ہے جو آج سے سائنکڑوں برس پہلے خدا کے بھیجے ہوئے برگزیدہ بندوں نے روایت اور روح کے نام پر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔

اور اگر غور سے دیکھا جائے تو روایت فطرت کا تقاضا ہے۔ فطرت چاہتی ہے کہ کائنات کی ہر چیز روایت پرست ہو۔ یہ آسمان کے چاند، ستارے ہزاروں اور کروڑوں برس گزر جانے کے بعد آج بھی رات کی تاریکیوں میں خدا کی مخلوق پر نور کی بارش کرتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ فطرت آج تک ان کو روایت پرستی کی تعلیم دیتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کروڑوں برس گزر جانے کے بعد آج بھی ان کا جوہر قابل چمک رہا ہے ورنہ انسان کی طرح اگر انھوں نے بھی اپنی روایت سے بغاوت کی ہوتی تو شاید آج اس نادان انسان کی طرح یہ چاند، ستارے بھی اپنی عظمت کو کھو بیٹھتے۔

(نگار) جناب رضوی نے روایت و روایت کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا وہ اس حد تک تو یقیناً درست ہے کہ روایت کا انسانی زندگی پر بڑا اثر پڑتا ہے لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ روایات نے ہمیشہ تعمیری خدمت انجام دی ہے اور تخریب کا ان سے کوئی تعلق نہیں یا یہ کہ انسان روایت سے بالکل بے نیاز ہو کر انسان بنایا بن سکتا ہے، اذروئے عقل و تاریخ دونوں طرح غلط ہے۔ خیر تو ایک سنجیدہ بحث ہے اور رضوی صاحب کا مضمون غالباً اس بحث کا متقاضی نہیں۔ ایک مکلفندہ مسئلہ ہے کہ بات ہے اور اسی نقطہ نظر سے اسے دیکھنا چاہئے، چنانچہ رضوی صاحب کا یہ مضمون پڑھ کر غرائی کا یہ شعر بے اختیار میرے سامنے آگیا :-

عد ذات تو بہ ادراک نہ شاید دانست

دیں سخن نیز اندر ادراک من ست

ادراک کی کمزوری عرقی بھی تسلیم کرتا ہے، لیکن لطف یہ ہے کہ اس کمزوری کا علم اسے ادراک ہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے بالکل اسی طرح رضوی صاحب روایت کو روایت پر مرجع قرار دیتے ہیں لیکن استدلال، ثبوت میں وہ بھی روایت سے کام لیتے ہیں۔

ملکہ بے بدون و ہرگز مستان زبستان!

# علی گڑھ کے دورِ اولیٰ کی ایک عجیب شخصیت

شاعر و ادیب محمد داؤد عباسی مرحوم بی۔ اے (مدینہ)

(سبط محمود فاروقی)

۲۰ رمضان ۱۳۱۵ مطابق ۱۹ فروری ۱۹۹۷ء میں قصبہ احمد پور ضلع مراد آباد (پنجاب) کے ایک عباسی گھرانے میں ولادت ہوئی۔  
۱۲ نومبر ۱۳۱۵ء کو پندرہ سال کی عمر میں علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم میں جو اُس زمانہ میں نیا نیا قائم ہوا تھا۔ بغرض اکتسابِ علم داخل ہوئے۔ ۱۳۹۹ء میں  
ایف۔ اے اور ۱۳۹۹ء میں بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ ان کے خاص مضامین فلسفہ اور ادبیات فارسی تھے۔ دو سال تک علی گڑھ کالج  
اسکول میں ٹیچر رہے۔ پھر ۱۳۹۳ء سے سرکاری ملازمت میں منسلک ہو کر علی گڑھ سے باہر چند مقامات پر متین رہے۔ تحصیلداری پر تقرر ہوا  
تھا کہ ۱۴ جون ۱۳۹۴ء کو تقریباً چالیس کی عمر میں بعارضہ تپ محرقہ بمقام فتح آباد ضلع آگرہ انتقال کیا۔

داؤد مرحوم کو شاعری اور سخن سرائی کا خاص ذوق و مہمت تھی۔ انہی کے طور پر عطا ہوا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں صاحب نے جو داؤد مرحوم  
کے زمانہ میں علی گڑھ میں جو نیر طالب علم تھے ایک موقع پر لکھا تھا کہ:-

”محمد داؤد مرحوم کو جو راقم الحروف کے زمانہ طالب علمی میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ایک تلمیذ رشید تھے، مبداً و فیاض سے سخن سرائی  
کا ایک خاص ذوق مرحمت ہوا تھا۔ شعر فی البدیہہ کہتے تھے اور خرافت تو مرحوم کا خاص حصہ تھی، اتفاق ایسا ہوا کہ کاندھلہ ضلع مظفرنگر  
(پنجاب) سے جتنے لوگ علی گڑھ آئے سب کے سب امام شعرانی کی ضد واقع ہوئے تھے اور قدرت نے ان کے جسم کو تو نہیں لیکن سروں کو  
ضرور فکر مفرض سے فارغ الہال کر رکھا تھا۔ اس پر مرحوم کو ذیل کی اچھوتی پھینکی سو جھگڑی جو اسی وقت کالج کے ہیرے فکیرے کی  
زبان پر تھی:-

”آتا ہے کاندھلہ سے جولا تا ہے سرچ گنج ”قاروں نے راستے میں ٹھایا خزانہ کیا“

صاحب ”تذکرہ خندہ گل“ ان کے ذکر میں لکھتے ہیں:- ”قدیم و جدید دونوں رنگوں میں شعر کہتے تھے۔ طبیعت میں چونکہ شوخی کا  
ادہ زیادہ تھا اس لئے کہیں کہیں وہ ایک ہلکی سی طرافت اختیار کر لیتا ہے۔“

شوخی طبیعت کے ساتھ وہ نہایت سنجیدہ اور متین، نیک نہاد و نیک صفات تھے۔ مدۃ العمر علی گڑھ میں رہے مگر اپنی وضع  
قطع میں تبدیل نہیں کی۔ مولانا محمد علی مرحوم نے ۱۳۹۷ء میں داؤد مرحوم کے کلام پر جو تقریظ لکھی تھی اس میں ان کی وضع قطع کے  
بارے میں لکھتے ہیں:-

”۱۳۹۷ء کی گرمیوں میں جب میری عمر ساڑھے گیارہ برس کی تھی میں اپنے بھائی مولانا شوکت علی کے ساتھ... علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم

لے مولانا محمد علی مرحوم نے یہ تقریظ اس وقت لکھی تھی جب وہ انگلستان کے سفر پر بغرض علاج جا رہے تھے اور پی ایچ ڈی اپنی کے جہاز کی ڈیک پر  
بیٹھ کر تحریر کی تھی اور داؤد مرحوم کے چھوٹے بھائی محمود احمد صاحب عباسی کو بھیجی تھی جو اب تک ان کے پاس موجود ہے۔

میں پڑھنے آیا۔۔۔۔۔ اس ”نیچر گروہ“ میں تقریباً سب ہی طلبہ کی ایک ہی سی وضع قطع تھی۔ شیروانی، اچکن، ترکی ٹوٹی، ڈھیلا باجامہ، قمیص، جُرتاب، یہی سب کا لباس تھا۔۔۔ لیکن ہمارے پاس والی بارک کے بیچ والے کمرے میں۔۔۔ ایک دراز قامت مگر خاصے ڈبے پتلے صاحب رہا کرتے تھے جو خاص ہندوستانی پُرانی وضع کی اچکن پہننا کرتے تھے، جن کی ٹوٹی ان کے وطن اور وطن کی ساخت کی کشتی نما ہوتی تھی جن کا جوہ دہلی کا سلیم شاہی وضع کا مگر سادہ ہوتا تھا اور جن کے بال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح لانسے تھے اور اگرچہ ”بردوش“ نہ سہی ”تابنا گوش“ ضرور آتے تھے تاکہ ان لانسے بالوں کے باعث اچکن پر تیل و فیرو کا دھبہ نہ پڑ جائے وہ گردن میں سپید خاصے کارہ مال اسی طرح ضرور باندھا کرتے تھے جس طرح سر سید علیہ الرحمۃ اپنے گلے کی رسولی کو چھانے کے لئے استعمال فرمایا کرتے تھے۔ یہ وضع قطع اُس زمانے کے بزرگوں کی اُس وقت تک باقی تھی۔ لیکن علی گڑھ جیسے ”نیچر گروہ“ کے کسی طالب علم کا اس وضع قطع کو برقرار رکھنا اُس زمانہ میں اس سے بھی زیادہ نمایاں تھا جس طرح آج کسی یورپین لیڈی کا بڑے بال رکھنا، نیچا سایہ پہننا اور سینہ و گردن بازوؤں اور باہوں کا ڈھاپنا نمایاں ہوگا۔ اس لئے میری نظر بھی آتے ہی ان بزرگ پر پڑی اور اگر انھیں کسی اور طرح کا امتیاز نہ بھی حاصل ہوتا تب بھی میں ضرور اپنے بھائیوں سے پوچھتا کہ یہ اس عجیب و غریب وضع قطع کے بزرگ کون ہیں۔ لیکن محمد داؤد صاحب کو کون نہیں جانتا تھا۔ علی گڑھ میں اُس وقت سب سے زیادہ ممتاز اور ہرول و مزاج جماعت تھی، اُس کے سردار یہی پُرانی وضع قطع کے بزرگ تھے۔ ان کے کمرے پر بیسیوں ممتاز ترین طلبہ کا مجمع رہا کرتا تھا۔

مولانا حالی مرحوم کی مشہور غزل ہے

اُن کے جاتے ہی یہ کیا بھگئی گھر کی صورت : وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

مقطع ہے

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے ہماں دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

داؤد مرحوم نے مولانا کے مقطع کی جو تفسیر کی ہے اُس کے بارے میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم لکھتے ہیں :-

”باوجود پوری سنجیدگی کے داؤد مرحوم کی طبیعت نہایت شگفتہ تھی اور مولانا حالی کی ایک مشہور غزل کے مقطع پر جو تفسیر انھوں نے لکھی تھی، اُس نے تو مولانا حالی تک کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ داؤد میری ساری غزل نے لیں، صرون میرا مخلص مقطع سے نکال ڈالیں تو میں غمخ و اور میرا خدا خوش، مگر تفسیریں بھی ہلا کی تھی، ایک ہی مصرعہ نے مولانا مرحوم کے شہرہ ستیلا ناس کر دیا۔

سنئے سے گبر کرے قصد کسی کام کا دل میں انساں پیپے یہ دیکھے وہ اس کام کے ہے بھی شایاں

سن کے لوگوں سے کہ وہ آئے تھے داؤد کے ہاں ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے ہماں

دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت“

اس کے بعد ان کا ایک اور لطیفہ مولانا مرحوم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :-

”کالی میں ایک عرصہ تک ہر ”نسل“ میں ایک طالب علم کو ”بوم“ کا لقب عطا ہوتا تھا۔ اس ”نسل“ کے ”بوم“ کو مولانا شبلی

کی صحبت میں رہنے کا عشق تھا، جب کالی کا گروپ کھینچ لگا تو ”بوم“ صاحب فوراً مولانا شبلی کی کرسی کے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے جب گروپ کھینچ کر آیا داؤد صاحب نے اسی وقت لکھ دیا :-

آج کالی میں بچے رہی ہے دھوم طلبہ کا ہے ہر طرف سے ہجوم

بول آٹھی روح سعدی مرحوم ”کس نہ آید بزم سا بوم

اللا مولانا شبلی مخدوم“

داؤد مرحوم کے خاندان میں ایک مہر بزرگ علی حسین عباسی تھے، دمہ کے مریض، گھٹا منی کھنکار، باغ و تنوک، ہر دم واسطہ۔

اپنے اکلوتے فرزند ابن حسن عباسی طبعی کلکٹر کے پاس ان کے مقام تعیناتی پر رہنے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ لوگوں نے وفات کی تاریخیں کہیں، داؤد مرحوم اپنے ایک دوست مولانا طفیل احمد (علیگ) مرحوم کو خط مرقومہ ۲۰ رمضان میں لکھتے ہیں کہ ”جو تاریخیں ہوئی ہیں وہ ان مرحوم کے حسب حال نہ تھیں، مجھ کو حسب حال لکھنی چاہئے، چنانچہ مادہ تاریخ ایسا ہی نکالا ہے۔ سنئے۔“

مر گئے ہیں بڑے میاں جب سے دل میں اٹھتی ہے ان کے غم سے ہو کر  
تھے بڑے نیک بخت اور دیندار کرتے رہتے تھے سب سے نیک سلوک  
جتنی ہونے میں نہیں ان کے دوست دشمن کسی کے دل میں شکوک  
سب نے لکھی ہیں ان کی تاریخیں ہو گئی ایک فقط مجھ ہی سے جو کہ  
اس لئے آج میں نے بھی اپنی شاعری کی گھڑی کو دی ہے کو کہ  
جب سے دشمن ہو گئی ہے بھول گیا کس کو کہتے ہیں پیاس کیسی بھوک

لے برعایت روزہ ماہ رمضان

بولا ہاتھ کہ ہو گئے بے گھر  
آج کھانسی، کھٹکار، بلغم، تھوک

۱۸۹۹ء

شعر گوئی ان کو ایک دہری عطیہ تھا، نہ کسی سے تلمذ حاصل تھا اور نہ کسی سے کبھی اصلاح لی۔ بایں ہمہ مختلف اصناف میں بقا ضائع طبع آزمائی کی ہے۔ ایک مثنوی لکھی تھی جس کے بارے میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم لکھتے ہیں:-  
شعر نے جس نفس کے لئے (یعنی خود ان کے اپنے لئے) اتنی کم عمر میں بقول غالب خود خواہش کی ہو کہ ”گرد و فن او“ وہ بھلا  
داؤد صاحب پر کس طرح عاشق نہ ہوتا جبکہ اسے اسی زمانہ میں معلوم ہو گیا تھا کہ داؤد صاحب کا بھی یہی فن تھا۔ میں نے سنا تھا  
کہ چودھری ممتاز حسین صاحب کو آج کل کے کلکٹر سید زین الدین صاحب کے ساتھ خاص آلفت تھی مگر سید زین الدین صاحب  
جس طرح ۱۹۲۱ء میں نان کو آپ بیڑوں پر ظلم کرنے میں مشہور تھے اسی طرح اس زمانہ میں چودھری صاحب پر یہاں تک ظلم  
فرمایا کرتے تھے کہ بھارے چودھری صاحب نے خود کشی کی ٹھان لی تھی۔ اس قصہ کو داؤد صاحب نے ایک مثنوی کی شکل میں منظوم  
کیا تھا اور ۱۸۹۹ء سے مجھے اس کا ایک شعر یاد ہے جس میں سید زین الدین صاحب کا اپنی کوٹھی سے یہ سننے ہی گھبرا کر باہر نکل گیا  
بھان کیا گیا ہے

نہ ہوا سرد تھی نہ سر پر چھپاؤں اس پہ طرہ یہ تھا کہ لنگے پاؤں

”اس مثنوی کو ہمیں بھلا کون کیوں دکھاتا لیکن کسی نہ کسی کی زبانی میں نے یہ شعر سن لیا تھا اور گویا بیٹس کے باعث  
حافظ اب بالکل برباد ہو گیا ہے لیکن الحمد للہ بچپن کے سنے سنائے شعرا پر تک یاد ہیں۔ جب میرے عزیز دوست محمد واحد  
عباسی نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ اپنے مرحوم بڑے بھائی کی اس مثنوی کو وہ پھر شائع کریں گے اور تقریظ لکھنے کی مجھ سے فرمائش کر کے  
مجھے وہ مثنوی دکھائی تو میں نے سب سے پہلے اسی شعر کی تلاش کی اور عجیب مسرت ہوئی جب اس کو اسی طرح مثنوی میں اسی موقع  
پر جس کا میں نے اپنے حافظہ سے ذکر کیا ہے، پایا۔“

لے پانی پت ضائع کرنال کے رہنے والے تھے ۱۸۹۹ء میں علی گڑھ سے الین۔ لے کیے نائب تحصیلدار بنے پھر تحصیلدار ہو کر ریٹائر ہوئے عرصہ ہوا انتقال کیا ہے علی گڑھ  
سے ایم۔ اے کی سند حاصل کرنے کے بعد ریڈ راست ڈپٹی کلکٹری پر تقرر ہوا، پھر کلکٹر ہوئے۔ ریٹائر ہو کر کچھ عرصہ ایک ریاست میں وزیر مال رہے وہی کا بچپن  
عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔ تھے یعنی انگریزی حکومت سے عدم تعاون کرنے والے۔ یہ تقریظ مولانا نے ۱۸۹۹ء میں لکھی تھی۔

اس ثمنوی کے ابتدائی چند شعر تہجد کے سننے سے

قلم دو زباں دکھا جو ہر  
دقت آیا ہے خوش بیانی کا  
غزل مضمون رنگ دکھلائیں  
لب پہ تمسین بار بار آئے  
ہر ورق رشک سنبھلتاں ہو  
بحر مضمون میں ہو تلام آج  
کس طرف ہیں سخن کے زمرہ نیاز  
عوضہ نظم کھیرتا ہوں میں  
گوہر و ذکر کی کان ہے سیسہ  
تجھے جو مضمون ازل سے سرسبتہ  
توسن فکر ہو جو گرم غناں  
پھر کے اک پل میں چار سو آئے

علی گڑھ کالج چھوڑنے کے بعد جب یہ سب حضرات اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے تو سید زین الدین مرحوم نے اپنے ایک خط میں اس کا شکوہ کیا تھا کہ اب چارے دوستوں نے دریافت حال کے لئے خط بھیجے بھی ترک کر دئے ہیں۔ داؤد مرحوم نے جس منظوم قطعہ میں اس کا جواب دیا تھا وہ یہاں درج کرتا ہوں

تم نے لکھا تھا مجھے خط میں بڑی حسرت  
یعنی جو روز کی آخر میں ہوئی تھی حالت  
کم زیادہ ہے وہی حال تھا را کہ تم  
لا کہ کوشش کرو اب کوئی نہیں ملے گا  
جو دھری کر گیا، سچ ہے، جو کچھ کرنا تھا  
اب نہ وہ دم ہے کسی میں نہ ہے وہ جوش و خروش  
یعنی خود تم کو ہے افسوس کہ اب تم میں کچھ  
اب نہیں وہ کہ جسے چاہا اُسے بھونک دیا  
مل گیا کر کوئی بیچارہ تو دل ایشہ لیا  
ہو گئے غلم میں جب طاق ستم میں استاد  
تو بیکار صعب عشاق سے لکلا آگے  
اس نے وزن ہی میں کر دی قیامت بربا

اور حقیقت میں وہ بھی بات بھی حسرت والی  
اور جس قسم کی تھی اُس کی پریشاں حال  
جس طرف دیکھتے ہو پاتے ہو میداں خالی  
محض بے سود، کرو کیسی ہی دیکھا بھالی  
اس کی بہت تھی قوی، حوصلے اس کے مالی  
اور ادھر تم پہ بھی ہے چھائی ہوئی لنگائی  
نہ رہی بات وہ لوگوں کو بھانے والی  
گویا اک آگ تھی جب جی میں ہوا دھکائی  
صبر و ہمت کی جو کچھ جمع تھی سب رکھوائی  
خوب ان باتوں میں جب مشق بہم پہنچائی  
اک ادول العزم، جری، پانپتی کھرنائی  
ہو گئی دھوم زمانہ میں وہ لہجہ ڈالی

۱۔ اس زمانہ میں ایک ناول ”روز فرڈیننڈ“ انگریزی کا شایع ہوا تھا۔ روز مہر دین کا نام تھا۔ اسے چودھری ممتاز حسین مرحوم جن کو ان سے معاشقہ تھا۔ اسے اس زمانہ میں داؤد مرحوم علی گڑھ کالجیٹ اسکول میں بھیجے تھے۔

اس کے تیر ہی کچھ ایسے تھے کہ دیکھتے نہ تھے  
اس کی اُلفت کے ہوئے لوگوں میں چرچے کیا کیا  
تم بھی مشہور جہاں ہو گئے اسکے باعث  
اس زمانہ کے گزر جانے کا اب رنج فضول  
اب کوئی اور اسی قسم کی سوچو تدبیر  
شغل کچھ چاہئے اچھا نہیں رہنا خالی  
ہم بتائیں تمہیں، اب اس پہ عمل کرنے لگو  
”تمہہ چوں پیر شود پیشہ کند دلائی“

صاحب ”غنیاء“ نے داؤد مرحوم کا منتخب کلام درج کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ”قدیم اور جدید دونوں شاہراہوں کے مالک تھے۔ ان کے اشعار سے خصوصاً ”مرثیہ یوسف خاں“ سے ان کی غیر معمولی لیاقت، معاملہ بندی اور مضمون پند فکر کا رنگ مترشح ہوتا ہے، حق یہ ہے کہ یہ مرثیہ اپنے رنگ میں فرد ہے۔ مولانا حالی کے اکثر اشعار کو تضمین کیا ہے۔ بلا کے ذکی اور ذہین تھے۔ ان کے کلام سے ان کی شوخی، طبیعت داری اور ذکاوت ٹپکتی ہے۔ اگر زندگی وفا کرتی تو کیا عجب کہ اس فن میں بھی نام و نمود حاصل کرتے؟“

اب چند شعر قدیم طرز کے بھی ملاحظہ ہوں۔ ۱۸۹۳ء میں ایک مشاعرہ بڑے اہتمام سے مراد آباد میں ہوا تھا۔ مصروف طرح تھا ”ہاتھ ملتا ہوا بالیں سے سیما اٹھا“ داؤد مرحوم خود تو شریک مشاعرہ نہ ہوئے، لوگوں کے اصرار سے طرخی غزل بھی جو ان کے بڑے بھائی محمد ایوب صاحب مرحوم نے پڑھی۔ اس کے بعض شعر سنئے۔

جب اپنے سیر چمن وہ گل رینا اٹھا  
پائے بوسی کے لئے خواب سے سبزہ اٹھا  
بزم سے غیر کے اٹھ جانے کی تشویش فضول  
اس کا اب ذکر ہی کیا، جو کوئی اٹھا اٹھا  
جب دم نزع مجھے پاؤں رگڑتے دیکھا  
”ہاتھ ملتا ہوا بالیں سے سیما اٹھا“  
میں نے جب وادی غربت میں دکھا اپنا قدم  
خار، پاؤسی کی خاطر، بہ تمنا اٹھا

### قطعہ

پے تسلیم درختوں نے جھکا میں شاخیں  
میری تعلیم کو جنگل میں بگورہ اٹھا  
پیش کش خاک نے اکسیر کی، زردروں نے  
کچھ نہ کچھ لے کے ہراک ساکن جھرا اٹھا  
طب و عیش کا سامان کیا تھا مہارسی  
کیا کہیں ابر ہی تقدیر سے ہکا اٹھا  
شوق دیدار نے فرقت میں سزا دی اچھی  
سینکڑوں بار میں بے صبری سے بیٹھا اٹھا

ان کا مختصر کلام زیادہ تر اخلاقی نظموں پر مشتمل ہے، ان میں سے ایک طویل نظم کو جس میں سو سے زائد شعر ہیں ان کے دوست اور رفیق خان بہادر حاجی محمد حبیب اللہ خاں صاحب لی۔ اے (علیگ) سابق کلکٹر یو۔ پی نے ۱۸۹۷ء میں طبع کر دیا تھا اور دوبارہ میں لکھا تھا کہ ”یہ نظم ایسی اعلیٰ درجہ کی نفیس اور دلکش ہے کہ حد سے اعلیٰ گرامر کے طالب علموں کی نظمیں تو درکنار ان کی نظموں میں جو اس طرز مدید میں (مولانا حالی کی نظموں کو مستثنیٰ کر کے) لکھی گئی ہیں بے مثل واثانی ہے۔“ بخوبی طوالت ان نظموں میں سے کسی نظم کو نمونہ درج نہیں کر سکتا۔ مولانا حالی مرحوم کے متعدد اشعار کو تضمین کیا، جس میں سے ایک تضمین کو مولانا محمد علی صاحب نے اپنی تقریر میں درج کیا ہے جو اوپر گزر چکی۔ ایک وہ تضمین اور ملاحظہ ہوں :-

مولانا حالی کا شعر ہے

نظر آتا ہے یہ پہلے ہی سے حالی انجم یار کی میں بھی کہوں ہے یہ عنایت کیسی  
اس کی تضمین سنئے :-

اب تو داؤد کبھی لیں گے نہیں عشق کا نام سائے آئیں تو حضرت کو کروں چمک کے سلام  
میں نے اول ہی کہا تھا کہ یہ ہے مکر تمام نظر آتا تھا یہ پہلے ہی سے حالی انجم  
یار کی میں بھی کہوں ہے یہ عنایت کیسی ؟

شعر حالی سے

رو نایا ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے درنہ یاں طعن رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا  
تضمین داؤد سے

کل جو عدو نے بزم میں کیں بد زبانیاں وہ آپ جانتے ہی ہیں، میں کیا کروں بیاں  
اس سے تو مجھ کو کچھ بھی شکایت نہیں پہاں رو نایا ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے درنہ یاں  
طعن رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

آخر میں یہ بات بھی لکھ دینی ضرور ہے کہ لاہور کے رسالہ ”الطرا“ ماہ نومبر ۱۹۵۷ء میں نثار احمد فاروقی کا جو مضمون داؤد صاحب  
مرحوم کے چھوٹے بھائی کے متعلق بعنوان ”گڈ ریزی کے لال - محمود احمد عباسی“ شائع ہوا ہے اس میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب  
کی کسی تحریر کے فقرے نقل کئے گئے ہیں جن میں مولانا موصوفوں فرماتے ہیں کہ :-

”علی گڑھ کا ایک طالب علم داؤد نامی تھا۔ شاعری سے اسے طبعی مناسبت تھی، اس نے (مولانا حالی کی) غزل کی تضمین کی  
اور مقطع کی تضمین کچھ ایسی چپاں واقع ہوئی گویا مقطع حالی کا نہیں رہا داؤد کا ہو گیا۔۔۔۔۔ خواجہ (حالی) صاحب نے اصرار  
کر کے داؤد کو بلوایا اور مجبور کیا کہ پوری تضمین سنائے۔ پھر تعریف کر کے اس کا دل بڑھایا اور دیوان حالی درجہ اول کا چھپا ہوا بطور  
صلہ کے عطا فرمایا اور کہا ”یہی نسخہ ہے جو میں نے اپنے لئے رکھا تھا لیکن اس کا مستحق اپنے سے زیادہ نہیں سمجھتا ہوں۔ انصاف  
ہے اس طالب علم کا فوجانی میں انتقال ہو گیا۔“

مولانا آزاد کو داؤد مرحوم کے حالات کی اطلاع صحیح نہیں لی۔ تضمین کا واقعہ ۱۸۹۲ء کا ہے جب داؤد طالب علم نہیں بلکہ  
کالجیٹ اسکول میں ٹیچر تھے اور اس کے ایک عرصہ کے بعد جب وہ سرکاری ملازمت میں منتقل اور صاحب اولاد تھے بعد تقریباً  
چالیس فوٹ ہوئے، ان کے بارے میں یہ کہنا کہ ”اس طالب علم کا فوجانی میں انتقال ہو گیا“ صحیح نہیں ہے۔ (ساقی)

## قول فیصل

جس میں ملک کے مشہور مفکر و بلند خیال شاعر علی اختر خیر آبادی نے ثابت کیا ہے کہ انسان لاکھ ترقی کرے کتنی  
ہی عقل و فراست سے کام لے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کو خدا کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے، فنی حیثیت سے اختر کا  
بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ ثبوت میں آسانی پیش کیا جاسکتا ہے۔ شروع میں حضرت نیاز فتح پوری کا مقدمہ بھی شامل ہے۔  
کاغذ ۲ پونڈ دبیز گرد پوش رنگین - قیمت دو روپیہ -  
منیجر نگار لکھنؤ

# دنیا کا سب سے زیادہ خطرناک کھیل

ماوی ترقیوں کے ساتھ ایک دوسرے سے بازی لے جانے (مسابقت) اور نام و نمود کا جذبہ بھی دنیا میں بڑھتا جا رہا ہے اسوقت یہ جذبہ زندگی کے علمی و عملی دونوں پہلوؤں میں عام ہے اور اس پر نہ صرف دولت بلکہ جان دینے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ اس سے قبل تفریحی مشاغل میں سب سے زیادہ دلچسپی ٹھوڑے دوڑ سے لی جاتی تھی، لیکن اب جانوروں سے گزر کر متحرک مشینوں تک پہنچ گئی ہے اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ توجہ موٹروں کی دوڑنے حاصل کر لی ہے، جو دنیا کا سب سے (دادہ خطرناک اور قیمتی کھیل سمجھا جاتا ہے اور جس کثرت سے لوگ اس کا تماشہ کرتے ہیں دنیا کے کسی کھیل کا نہیں کرتے۔

سلور اسٹون کی بین الاقوامی دوڑ میں عموماً ایک لاکھ سے زیادہ تماشائیوں کا ہجوم ہوتا ہے اور جب پچھلے دن میں لی مان (فرانس) اس تفریح کا مرکز تھا تو ڈھائی لاکھ انسانوں نے اس میں حصہ لیا اور ۸۰ جانیں ضائع ہوئیں۔ جرمنی میں بمقام نربرگنگ اس میں ۵ لاکھ انسانوں نے اس میں حصہ لیا اور اپنی کی ایک ہزار میل کی دوڑ دیکھنے ۵ لاکھ تماشائی جمع ہوئے۔

مغربی یورپ میں گرانڈ پریکس کی دوڑ ہوتی ہے اور جو شخص ان میں سے نو دوڑ بیٹنے کے ساتھ ہی انڈیا پوس اور ہیوسٹرس کی دوڑ میں بھی اولی آئے وہ دنیا کا چھپن قرار پاتا ہے۔

گرانڈ پریکس کی دوڑ عموماً ۳۰۰ میل کی ہوتی ہے اور یہ راستہ شہر سے باہر گاؤں کے اونچے نیچے حصوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ نربرگنگ کی دوڑ ۴۸ میل کی ہوتی ہے اور اس کا راستہ بہت زیادہ اونچا نیچا، ٹیڑھا مسٹرھا ہوتا ہے۔ ان دوڑوں میں جو موٹر شریک ہوتی ہے اس کا وزن ۱۱ ہنڈر ڈویٹ (تقریباً ۴۰۰ من) سے زیادہ نہیں ہوتا اور اس پر کوئی اور دلدلی چیز نہیں رکھی جاتا۔ موٹر میں خاص طور پر بہت مضبوط بنائی جاتی ہیں۔ ان کے ٹائر بھی خاص قسم کے ہوتے ہیں اور ان کی قیمت بھی معمولی ٹائروں سے دو چند ہوتی ہے۔ ہر موٹر کے ساتھ دو چوڑے ٹائر کے ہوتے ہیں، کیونکہ میکنز کے کوہستانی راستوں میں سٹائیر۔۷ میل میں تارنا ہو جاتا ہے۔ ان کے بریک کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ وہ گرم نہ ہونے پائے پھر بھی اس کی پکینگ جلی جاتی ہے، لمبی دوڑ میں جلد جلد بریک لگاتا پڑتا ہے اور اس کی رگڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ جس بریک کو معمولاً ایک سال میں خراب ہونا چاہئے وہ تین میل کے اندر گھس جاتا ہے اور بریک ہی خاص چیز ہے جس کے بغیر کوئی ڈرائیور کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ہر چند بعض ایسے ماہر دیکھے گئے ہیں جو سارا دوڑ بغیر بریک استعمال کئے محض گیر کی مدد سے ختم کر دیتے ہیں۔

ان کے پلگ معمولی گاڑیوں کے پلگ سے سہ چند زیادہ قیمتی ہوتے ہیں اور اتنی ہی جلد گھس جاتے ہیں۔ پٹرول ان کا خاص قسم کا ہوتا ہے جس میں متعدد کیمیاوی قیمتی اجزاء شامل کئے جاتے ہیں اور ۸ میل میں ایک گیلن صرف ہو جاتا ہے۔ موٹر چلانے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اگر کوئی ڈرائیور اپنی گاڑی کی قوت کا صحیح اندازہ کے بغیر چلاتا ہے تو ۲۵ میل کے اندر ہی اندر وہ بیکار ہو جاتی ہے چنانچہ وٹیس کی دوڑ میں ایک بار ۲۲ گاڑیوں میں سے صرف چار گاڑیاں منزل تک پہنچیں۔

دوڑ کا منظر ڈاؤنکلس منظر ہوتا ہے۔ موٹر انجنوں کا شور لاؤڈ اسپیکروں کی چیخ پکار مختلف ملکوں کی جھنڈیوں کا

قطار اندر قطار لہرانا، تماشائیوں کا ہجوم، یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑا کارنوال آگیا ہے۔ لیکن کے میدان میں ۲۴ گھنٹوں کے اندر وہاں کے تماشائیوں نے ۳۰ لاکھ ڈالر صرف کر دیے۔ یہاں دس رستراں تھے، اور تیس ابدارخانے جہاں کھانے پینے کے علاوہ رقص و سرود کا بھی انتظام تھا۔ ۲۰ ہزار موٹریں تماشائیوں کی تحقیر اور سو جہاز ہوائی اڈے پر۔ خیموں اور چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یہاں ایک ہزار پولیس کے سپاہی، گیارہ عارضی ہسپتال، ۴۰ ڈاکٹر اور دس امبولنس گاڑیاں ہر وقت طیارہ رہتی تھیں۔

دوڑ شروع ہونے سے قبل لوگوں میں بڑا ہیجان ہوتا ہے۔ میکاٹک موٹروں کی دیکھ بھال میں لگے ہوتے ہیں اور ڈرائور اپنا آخری سنگریٹ پینے میں۔ اس کے بعد میکاٹک موٹروں کو ڈھکیل کر آگے بڑھاتے ہیں اور ڈرائور ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ اپنی اپنی متعین جگہوں پر ایک قطار میں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ ڈرائور قسموں سے اپنے آپ کو سیٹ کے ساتھ کس لیتے ہیں۔ اس کے بعد کلچ پر پاؤں رکھ کر ڈرائور طیارہ چلا جاتے ہیں، انجن اشارٹ کیا جاتا ہے اور جھنڈی کرنے کے ساتھ ہی وہ ٹوپ کے گولہ کی طرح چل پڑتی ہیں اور ایک سکند کے اندر ہی پہلی ہی اسپینڈ میں سو میل فی گھنٹہ کی رفتار پر لپکتی ہیں۔ ان موٹروں میں پانچ گز ہوتے ہیں اور ہر گز کی تبدیلی سے رفتار بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ کئی سو میل تک پہنچ جاتی ہے۔ اول اول تو تمام موٹریں گولہ ہو جاتی ہیں لیکن پھر یکے بعد دیگرے آگے پیچھے ہو کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ دوڑ میں سب سے خطرناک مقامات جہاں اکثر موٹریں الٹ جاتی ہیں، راستے کے موڑ ہیں اور انھیں سے سلامت گزر جانا حاصل کامیابی ہے۔ ان کی رفتار بے پناہ ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ۳۵ سکند میں ۳۰ گیلن پٹرول صرف کر دیتی ہیں۔

اس دوڑ میں شریک ہونے والے ڈرائور برسوں پہلے اس کی طیاریاں کرتے ہیں اور درزش کی قسم کا کوئی مشغلہ ایسا نہیں ہے جس کی انتہائی مشق نہ کرتے ہوں، کیونکہ چند منٹ کی دوڑ میں ان کے اعصاب و دماغ پر اتنا سخت اثر ہوتا ہے کہ جب تک وہ پہلے سے اپنے آپ کو طیارہ نہ کر لیں اس کی برداشت کر ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ ۳۰۰ میل کی ایک دوڑ میں جو چند منٹوں میں ختم ہو جاتی ہے، کم از کم ہر ڈرائور کا وزن دس پونڈ کم ہو جاتا ہے۔

## دنیا آئندہ ۲۵ سال میں

تاریخ انسانی کی وسعت کے لحاظ سے صدیاں بھی چند سکند کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن اس قلیل وقفہ میں تاریخ نے جانے کتنے اوراق الٹ دیئے ہیں اور دنیا کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ پچھلی صدی میں انسان نے جو ترقیاں کی ہیں وہ قبل قریب صدیوں کے لحاظ سے بہت نمایاں ہیں۔ بجلی پر قابو پالینا، جراثیم کی دریافت، نئے محذرات (سن کرنے والی ادویہ) کا اکتشاف، بڑے پیمانہ پر صنعت و حرفت کی تشکیلات، برقیاروں (ELECTRONICS) کی وسیع اور آتم کا تجزیہ، تمام باتیں اسی صدی کی ہیں اور نہایت تیزی کے ساتھ ہمارے سامنے آ رہی ہیں، لیکن یہ خیال کرنا کہ اس کے بعد زمانہ شاید سائنس لینے کے لئے کچھ عرصہ تک ٹھہر جائے گا صحیح نہ ہوگا، بلکہ برقیاروں اور آتم کا تجزیہ نے حالات اتنے بدل دیئے ہیں اور ترقی کا اتنا زبردست سیلاب سامنے ہے کہ آئندہ ۲۵ سال میں شاید انسان کو سائنس لینے کی بھی فرصت نہ ملے اور دنیا صدیوں کی علمی و صنعتی و حرفتی ترقیوں کو آئندہ ایک ربع صدی میں اپنے اندر سمیٹ لے۔

پہلے انسان صرف تصور سے کام لے کر طرح طرح کی آرزوئیں پیدا کرتا تھا اور ان کو ناممکن سمجھ کر خاموش ہو جاتا تھا، لیکن آج سائنس کی ترقی اور خصوصیت کے ساتھ آتم (جو ہر فرد) پر قابو پالینے کے بعد ہماری مشکل ترین تمنائیں بھی ناممکن الحصول نہیں ہیں

یہاں تک کہ دوسرے سیاروں تک پہنچ جانا بھی اب محال نہیں رہا۔

جب سلسلہ میں امریکہ کے ریڈیو کارپوریشن کی ہم ویں برسی منائی گئی تو اس کے صدر ڈیوڈ سمرنن نے سائنس دانوں سے کہا میں چاہتا ہوں کہ جب آئندہ سلسلہ میں پچاسویں برسی منائی جائے تو آپ تین تحفے مجھے دیں ایک ٹیلی ویژن کا برا "TAPE - RECORDER" دوسرے ہوا کو برقیاروں سے ٹھنڈا کر دینے والا آلہ، اور تیسرے لاڈلہ اسپیکر کی طرح روشنی کو بھی ٹھنڈا دینے کا کوئی خاص طریقہ۔ یہ سنکر سائنس دان مسکرائے لیکن دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ ٹیپ ریکارڈر تو انھوں نے تیار کر لیا اور باقی دو چیزیں بھی غالباً سلسلہ تک ہمارے سامنے آجائیں گی، کیونکہ وہ روشنی کو ۲۰ گنا بڑھانے میں تو کامیاب ہو گئے ہیں اور جب وہ اس کو سونگن کر لیں گے تو پھر دوکانوں، مکانوں کو روشن کرنے کا طریقہ بالکل بدل جائے گا، نہ بجلی کے تاروں کی ضرورت ہوگی نہ کپڑے کے قمقموں کی اور ہم تاریکی میں رہا آسانی دیکھ سکیں گے۔ الغرض آٹمی قوت کی دریافت نے ایک بڑا عجیب علم کے سلسلے سے ہٹا دیا ہے اور یقین کیا جاتا ہے کہ سلسلہ تک دنیا کا تمام موجودہ صنعتی نظام بالکل بدل جائے گا۔ جہاز، طیارے، انجن، موٹر کار سب آٹمی قوت سے چلنے لگیں گے سبھاپ اور بجلی کے انجن ختم ہو جائیں گے، اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک ڈاک اور مال و اسباب وغیرہ آٹماٹا اسی قوت سے منتقل کیا جاسکے گا ہوائی جہازوں کے پرے کے پرے بغیر ہوا بازوں کے فضا میں ہر جگہ اڑتے نظر آئیں گے اور خشکی کے تمام راستے فضائی راستوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس وقت تک سبھاپ اور بجلی سے قوت حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی مشینوں، عمارتوں، ایندھن کے ذخیروں اور تاروں کی ضرورت ہوتی تھی، لیکن اب ان کی کوئی ضرورت نہ ہوگی اور صرف ایک چھوٹے سے بکس کے اندر بند کی ہوئی آٹمی قوت سے سب کچھ ہو سکے گا۔ اسی کے سرائدہ آفتاب، پانی اور ہوا کے اندر چھپے ہوئے چھپے ذخائر قوت پائے جاتے ہیں، ان پر بھی انسان کی دسترس ہو جائیگی اور اس طرح انسان کی ترقی کا وہ دور شروع ہوگا جس کا صحیح تصور بھی اس وقت مشکل ہے۔ سمندر کے پانی کو شیریں بنا کر ریگستانوں کو گنوار بنادیا جائے گا اور سمندر کی نہروں سے حمام پوشیدہ کیمیائی و غذائی عناصر حاصل کر کے دنیا کو مالامال کر دیا جائے گا۔

امراض کی تشخیص و علاج اور سرجری میں آٹمی قوت سے کام لیا جانا شروع ہو گیا ہے لیکن سلسلہ تک اس میں اتنی ترقی ہو جائیگی کہ سرطان اور دق وغیرہ ایسے تمام ناممکن امراض، معمولی بیماریوں کی طرح علاج پذیر ہو جائیں گے اور انسانی عمر کے اوسط میں دس پندرہ سال کا اضافہ ہو جائے گا۔

یہ دور ایسی مشینوں کا ہے جو از خود تمام کام کریں اور انسانوں کی ضرورت نہ ہو اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اب لوگوں کو اپنے اعصاب سے نہیں بلکہ دماغ سے زیادہ کام لیذا ہوگا۔ کام کا ہفتہ مختصر ہو جائے گا اور فرصت و فراخ کی وجہ سے جمالیاتی فنون پر زیادہ متوجہ ہونے کا موقع ملے گا۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت بھی صنعت و حرفت کی ترقیاں اس حد تک پہنچ چکی ہیں کہ مصنوعات کی کثرت نے ان کی کھیت کا اہم سوال پیدا کر دیا ہے اور آئندہ مزید ترقیوں کے ساتھ یہ سوال اور زیادہ پیچیدہ ہو جائے گا اور شاید یہی وہ وقت ہوگا جب دنیا کی بازار میں لین دین کے مسئلہ پر ڈالر اور روپیہ کو سامنے رکھ کر غور نہ کیا جائے گا بلکہ دنیا کی مختلف آبادیوں کے پیش نظر اس کو طے کیا جائے گا، جو ممکن ہے کسی وقت ساری دنیا میں صرف ایک حکومت کے قیام کا باعث ہو جائے اور اس طرح جنگ کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ لیکن اگر تقسیمیت سے آٹمی قوت سے کام لینے کا رجحان بدل گیا اور امن و سکون کی راہوں کی جگہ بغض و عناد اور اختلافات و تصادم کی راہیں اختیار کی گئیں تو پھر جس طرح اس وقت ہم ساری دنیا میں کسی ایک صلح کو شش حکومت کا خواب دیکھ رہے ہیں، اسی طرح اس وقت ہم یہ سوچیں گے کہ اس دنیا کو جسے خود ہم نے اپنے ہاتھوں جھلس کر رکھ دیا ہے، وہ بارہ کیونکر آباد کیا جاسکتا ہے اور چند نفوس جو باقی رہ گئے ہیں وہ کرہ ارض کی ۲۰ ہزار میل کی مساحت میں کس گوشہ میں رہنا پسند کریں گے۔

## خمیازہ

(فضا ابن فضی)

ثبات دامن کی تازہ دشتی کھلائی جاتی ہے  
دہی چسنگیز کی تاریخ پھر دہرائی جاتی ہے

بجھادی وقت نے کتنے سمن زاروں کی برنائی  
چمکتی ہے مٹی کی دو پہر فخمیز بھولوں پر  
خزاں ہے فتنہ ساماں موسم گل کے لمبا سوں میں  
وضو کرتے ہیں اپنے ہی جگر کے خون سے لالے  
ابھی آنکھیں نہیں کھولیں جال صبح کا ہی نے  
ازل سے مبتلا ہیں رفعتیں آزار پستی میں  
یقین کی شمع کشتہ ، آگہی کا سوز افسردہ  
اُبلتے ہیں نشاط کفر کے نشے ایاغوں سے  
غبار کس میرسی ہے ابھی کتنی جبینوں پر ،  
سلگ اٹھے ہیں سوز جہل سے دامن نگاہوں کے  
تمدن کی خدائی ، ملتوں کی قہر سامانی ،  
عروس گل نے کانٹے نذر میں پائے بہاروں سے

ستاروں کا لہو ہے صبح کے زحسار کا غازہ

نہ جانے کس قدر نا سوز ہیں مرہم کا خمیازہ

# انتخاب کلام

(ابو محمد سحر بھوپالی)

اک نظارہ اک قسم اک اشارہ ایک بات — بے وہ لمحے کہ جن کو جاوداں سمجھا کے  
غلط ہے غیر پہتہ ہنسی اڑانے کی — خود اپنے حال پہ ہم مسکرائے ہیں کیا کیا  
گمانِ محض سقا امید ہو کہ نومیدی — فریب اہل تمنائے کھائے ہیں کیا کیا  
جو رستم پر ہنسنے والے لطف و کرم پر رونہ سکیں گے — میں جو سنا دوں اپنا فسانہ اس کی گلی میں کوئی نہ جلائے  
دل وہ سحر کیا دل ہے کہ جس میں رہ گئی مسرتِ ناکامی کی — کتنی ہے ظالم وہ بھی تمنا ہو کہ جو پوری خون رلائے  
ایک بے نام سی اُلجھن ہے دل و جان پہ محیط — ایک گمنام سا احساسِ زیاں آج بھی ہے  
ترکِ اُلفت میں بھی اُلفت کے نشان باقی ہیں — قافلہ کٹ کے تری سمت رواں آج بھی ہے  
آپ نے سعیِ کرم کی آپ گھبرا ئیں نہیں — میری آنکھیں تو دُور شوق سے نم ہو گئیں  
وہ بہارِ صد بہاراں سامنے کیا آگیا — فکر کی رنگینیاں گو یا مجسم ہو گئیں  
کہاں یہ پھوش کہ کچھ اہتمام ہم کرتے — یہ بام و در ترے آنے سے جھمکائے ہیں  
جگہ ملی نہ کہیں جہن کو شکستکاری کی — وہ تہری بزم میں آئے تو مسکرائے ہیں  
بس اک نگاہِ ناز کے اٹھنے کی دیر تھی — ہم انجمن میں بھول گئے انجمن کی بات

## حدیثِ میکدہ

(عزیز)

یہ دولت و جاہ و کامرانی - کیا ہے — پیغامِ بہار و گلفشانی - کیا ہے  
ہو عمرِ خضر بھی گر میسر تو عزیز — بے بادہ و جام - زندگانی - کیا ہے  
انکار سے دل نے کب فراغت پائی — اک ساعتِ نیک سو مصیبت لائی  
کوثر کی امید کس بھروسے پہ عزیز — دُنیا میں - شراب کب میسر آئی  
ہر چیز و ہاں کی - اختیار ہی ہوگی — حوروں کے جلو میں - بادہ خواری ہوگی  
جس نئے کو - حرام کہہ رہا ہے - واعظ — جنت میں - اُسی کی نہر جاری ہوگی  
ہر چیز یہاں کی - اک خیمالی گزری — کیا غم - جو حیات - لا اُ بالی گزری  
اُس - ساعۃِ زندگی پہ حسرتِ عجز — بو صحبتِ میکدہ سے خالی گزری  
جذبات میں - التہاب - آجاتا ہے — سنے کو لگے - شہاب آجاتا ہے  
سافر کو لبوں سے جب لگتا ہوں عزیز — رگ رگ میں - اک انقلاب آجاتا ہے

## نوائے درد

(عبدالرشید پال صدیقی)

کہ میری صبح غربت بھی مثالِ شامِ اداس آئی  
مری دیرانیوں نے بخش دہی پھولوں کو رعنائی  
مری تقدیر یارب کھینچ کر مجھ کو کہاں لائی  
حکومت کا تمنائی نہ میں دولت کا سودائی  
وطن جب چھوڑ کر دیکھا تو غربت کی سزا لائی  
نہ اس کی موجِ ساحل تک کبھی پہنچی نہ ٹکرائی  
سمندر کی ہے پایابی نہ دریا کی ہے گہرائی  
کبھی میرے جنوں پر تنگ صحرا کی بھی پہنائی  
چمن بندی ہے صحرا کی جنوں کی کار فرمائی  
جنوں کہتا ہے باقی ہے ابھی کچھ دشتِ پیلائی  
فضائے درد افزا ہے نہ آثارِ مسیمائی

فضائے جانفرا کا ذکر مجھ سے تو نہ کر بھوم  
یہ گلکاری چمن کی میرے خوں کی لالہ زاری ہے  
نگاہیں جس طرف اٹھتی ہیں اک حسرت برتی ہے  
مجھے اسے کاش دم بھر بھی سکونِ قلب مل جاتا  
میں سنتا تھا کبھی غربت بھی راسِ آبی پڑا ہی کو  
یہاں کے بحر میں پایا نہ میں نے لولوئے لالہ  
الہی کیا سمجھ کر آہ میں نے کی تھی غوا صی  
کبھی میرے جنوں نے ایک ذرہ کو بہت جانا  
خرد میں حوصلہ کب تھا بنائے گلستاں کرتی  
اشارہ عقل کرتی ہے چمن پر تو قناعت کر  
غضب ہے میں کہاں اپنا دل درد آشنا لایا

## بادہ گساراں!

(غنی اعظمی)

عارض پر گلگوئےِ مستی  
آنکھ میں رنگِ بادہِ مستی  
گریہ مینا، خندہِ مستی  
آگئی لودہ فصلِ بہاراں  
بادہ گساراں! بادہ گساراں!  
بادل اتنا جھوم کے برسا  
ڈوب گئے میخانہ و مینا  
مستی ارزاں، نشہ سستا  
آگئی لودہ فصلِ بہاراں  
بادہ گساراں! بادہ گساراں!

ساحلِ دریا، صحنِ گلستاں  
لالہ و نسرن، سبزہ دریاں  
جمع ہوئے تفریح کے سامان  
آگئی لودہ فصلِ بہاراں  
بادہ گساراں! بادہ گساراں!  
چاندنی شب، دریا کا کنار  
مست و رواں برسات کا دھارا  
کس نے مجھ مستی میں میکا را  
آگئی لودہ فصلِ بہاراں  
بادہ گساراں! بادہ گساراں!

## مطبوعات موصولہ

**آسٹریلیا کی جھلک** سفرنامہ ہے تاج سلطانہ بیگم حیدر آبادی کا جو اپنے شوہر میر یاسین علی خاں انجینیر کے ساتھ آسٹریلیا گئی تھیں۔ یورپ کے سفر نامے تو اکثر دیکھنے میں آئے، لیکن آسٹریلیا کا یہ غالباً سب سے پہلا سیاحت نامہ جو اردو میں شائع ہوا ہے تاج سلطانہ اس سے قبل کئی بار یورپ کا سفر کر چکی ہیں اور ان فراموش سے بخوبی آگاہ ہیں جو سیاحت نگار پر عاید ہوتے ہیں، چنانچہ اس سیاحت میں انھوں نے تاریخی، آثاری، تجارتی، صنعتی و سماجی تمام پہلوؤں کو اسنے رکھ کر اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں۔ زبان و انداز بیان بھی کافی دلکش ہے۔ چونکہ آسٹریلیا کے متعلق ہماری معلومات کم ہیں اس لئے اس کتاب کی اشاعت یقیناً افادہ سے خالی نہیں اور وہ حضرات جو اس نوع کے معلوماتی تصانیف سے دلچسپی لیتے ہیں ان کے اس میں دلچسپی کا کافی سامان موجود ہے۔

ضمانت ۴، ۲ صفحات - قیمت دو روپیہ آٹھ آنے - ملنے کا پتہ :- الہ دینی پک ایجنسی حیدر آباد۔

**ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل** مجموعہ مضامین ہے جناب سیف فیض برالدین طیب جی کا جسے رائٹرس امپوریم بمبئی نے شائع کیا ہے۔ فاضل مصنف برالدین طیب جی کے اخلاقیات میں سے ہیں، انھوں نے ممبئی میں انجمن اسلام کا ادارہ قائم کر کے بڑی گرانقدر خدمات ملک و قوم کی انجام دیں۔ خود فاضل مصنف بھی مشہور اعلیٰ دال، مقنن اور پرجوش تعلیمی و سماجی کارکن ہیں، انھوں نے ان مضامین میں مسلمانوں کے اقتصادی، تہذیبی اور سیاسی مسئلوں پر نہایت غائر نگاہ ڈالی ہے اور یہ بھی ظاہر کیا ہے مسلمان ان عظیم مقاصد کو کیونکر حاصل کر سکتے ہیں، اخیر میں انھوں نے وجودہ کانگریس حکومت کی ضرورت و افادیت پر بھی اظہار خیال کیا ہے جو بہت سنجیدگی سے منطقی کا نتیجہ ہے ضمانت ۵۶ صفحات قیمت ۵ روپیہ اور غیر مسلم احمد حفیظ اللہ صاحب صوبہ بہار کے مشہور مصنف و اہل قلم ہیں جو اسلامی موضوعات پر اکثر و بیشتر مفید نکتے لکھتے رہتے ہیں۔

اس کتاب میں انھوں نے نہایت صحیح تاریخی واقعات جمع کر کے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ حد درجہ روادارانہ سلوک کیا ہے۔ اس کتاب میں عہد نبوی سے لیکر سلطانین ہند کی تاریخ تک کا جائزہ لے کر اسلامی مصلحت پسندی و امن کو پیش کردہ روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلہ میں بہت سے غیر مسلم اکابر علم و ادب کی رائیں بھی پیش کر دی ہیں۔ یہ کتاب اپنے مقصد کے لحاظ سے نہایت مفید اور ترتیب کے لحاظ سے بڑی مکی تصنیف ہے۔ ضمانت ۲۵۶ صفحات - قیمت ۵ روپیہ - ملنے کا پتہ :- مسلم اکاڈمی پھلواری خرمین پٹنہ۔

**حیات امیر خسرو** تالیف ہے خان بہادر نقی محمد خاں خوجہ کی جسے ادارہ الشجاع نے کراچی سے شائع کیا ہے۔ ضمانت ۱۲۲ صفحات - سائز کتابی، طباعت کتابت معمولی - قیمت دو روپیہ بارہ آنے - ملنے کا پتہ :- ٹائٹس پریس - صدر کراچی۔

امیر خسرو ہر زمین ہند کے ایسے جامع کمالات فرزند تھے کہ ان کا مثل کوئی دوسرا پیدا نہ ہو سکا۔ وہ نہ صرف فارسی و ہندی

کے بہ مثل شاعر تھے، بلکہ موسیقی میں بھی بہت بڑے نایک کام کر رہے تھے اور متعدد راگوں اور سازوں کے موجد و مخترع تھے۔ اور اس کتاب کے مولف نے زیادہ تر ان کی اسی خصوصیت پر زیادہ شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔ خسرو کی موسیقی دانی کا ذکر یوں تو مختلف کتابوں میں ملتا ہے، لیکن اس میں بہت زیادہ تفصیل و وضاحت سے کام لیا گیا ہے، غالباً اس لئے کہ خان بہادر صاحب کو خود بھی اس فن سے کافی شغف حاصل ہے۔

یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے پہلے تین ابواب میں ان کی ولادت و تعلیم، کسبِ شہرت و عروج اور سلسلہ بیعت و یگانگی کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں ان کی ہندی شاعری اور پہیلیوں کا ذکر ہے، پانچویں چھٹے باب میں فارسی شاعری و تصانیف خسرو پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور ساتواں باب جو زیادہ طویل ہے خسرو کی موسیقی کے لئے وقف ہے۔

**شکستہ کنگورے** | جناب حیات اللہ انصاری کے آٹھ افسانوں کا مجموعہ ہے جسے آزاد کتاب گھر دہلی نے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔

دورِ حاضر کا ترقی پسند دور آردو نظم و نثر دونوں کے لئے بڑا انقلابی دور ہے۔ اس دور کی ابتدا اب سے ۲۵ سال پہلے ہوئی اور ہمارے ملک کے جن ادیبوں نے اس میں حصہ لیا ان میں حیات اللہ انصاری کا نام بھی ہمیں سرفہرست نظر آتا ہے۔ حیات اللہ صاحب نظم کی طرف تو نہیں گئے، لیکن اپنی فسانہ نگاری سے ضرور انھوں نے بڑا ذہنی انقلاب پیدا کیا فسانہ نگاری کا یہ دور اس سے قبل کے رومانی دور کا ردِ عمل تھا، جسے خواب کے بعد بیداری کا دور کہنا چاہئے اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان مجسموڑ جھنجھوڑ کر چٹکانے والوں میں حیات اللہ صاحب کے ہاتھ نے بھی بڑا کام کیا ہے۔

اس دور کے فسانہ نگاروں کی فہرست کافی طویل ہے، لیکن مقصدیت کے پیش نظر صحیح راہِ عمل متعین کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے اور انصاری صاحب بھی انھیں چند افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔

جدید فسانہ نگاری کا نصب العین مسایلِ حیات کی گتھیوں کو سلجھانا ہے اور ہمارے ذہن و خیال میں تبدیلی پیدا کرنے کا صحیح معاشرہ کا احساس پیدا کرنا ہے۔ پھر جب تک تقسیم ہند نہ ہوئی تھی یہ مقصد محض ایک نظر ہی کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن جب تقسیم کے بعد ملک میں خونریزی شروع ہوئی اور انسان بالکل درندہ بن گیا تو اس مقصد نے فرضیہ کی شکل اختیار کر لی اور اس فرض کی ادائی میں حیات اللہ صاحب نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ چنانچہ اس مجموعہ کے اکثر افسانے اسی تلخ حقیقت کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ حیات اللہ صاحب اس میں بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ پلاٹ، ٹھنک، لب و لہجہ اور اندازِ بیان، الغرض ہر حیثیت سے یہ افسانے قدرِ اول کی چیز ہیں اور ہمیں امید ہے کہ لوگ ان افسانوں کی ظاہری خصوصیات سے زیادہ ان کی روح کی قدر کریں گے۔ یہ مجموعہ دو روپیہ بارہ آنے میں آزاد کتاب گھر دہلی سے مل سکتا ہے۔

**اقبال** | پروفیسر مجنوں نے اپنی معلمانہ زندگی کے دور میں اقبال پر دو کتابیں جن محیالات کا اظہار طلبہ پر کیا تھا، انھیں کو آزاد کتاب گھر دہلی نے اس نام سے کتابی صورت میں شائع کیا تھا اور اب نظر ثانی کے بعد اس کا دوسرا ڈیشن شائع کیا گیا ہے۔

اس کے پہلے ڈیشن پر ہم اپنی مفصل رائے ظاہر کر چکے ہیں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ اقبال و کلامِ اقبال کے متعلق یہ پہلی معتدل رائے ہے جو افراط و تفریط سے ہٹ کر پوری دیانت کے ساتھ ظاہر کی گئی ہے۔

پروفیسر مجنوں، ہمارے قدرِ اول کے نقادوں میں، اپنی بیباک اور بے لاگ رائے کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے ہیں اور اقبال کے باب میں بھی انھوں نے اپنی اس خصوصیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

کلام اقبال اور پیام اقبال دو بالکل جداگانہ چیزیں ہیں اور ہم ان دونوں کو ملا کر کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے کیونکہ جس حد تک اقبال کی شاعری کا تعلق ہے وہ یقیناً بڑا دلکش نغمہ ہے اور اقبال کے پیام ہی سے ہٹ کر اس سے نطفہ اٹھانا چاہئے، لیکن لوگ ایسا نہیں کرتے اور یہ سمجھ کر کہ اس کا پیام ہی اصل چیز ہے، اس کی شاعری کے محاسن کو بھی اسی نظر سے جانچتے ہیں اور شاعر اقبال اور پیام اقبال دونوں کے فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہم اس سے قبل متعدد بار ظاہر کر چکے ہیں کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ اقبال کی شاعری و پیری دونوں میں یقیناً کافی تبدیلیاں پیدا ہوئیں، لیکن فرق یہ ہے کہ ان کی شاعری تدریجاً آگے بڑھتی رہی اور پیری گھٹتی رہی، یہاں تک کہ اخیر میں وہ شاعر تو بہت بڑے ہو گئے، لیکن ان کی شانِ پیری گھٹ کر صرف ایک مخصوص قوم و ملت کی چیز ہو کر رہ گئی۔

پروفیسر مجنوں نے اس کتاب میں اسی حقیقت کو زیادہ شرح و بسط کے ساتھ ظاہر کیا ہے اور وہ حضرات جو اقبال کے نغمہ لا آہوتی نہیں بلکہ "سرود شاعری" کے صحیح اقدار کو جاننا چاہتے ہیں، ان کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ضخامت ۲۰ صفحات۔

رضا علی وحشت | اسی صفحات کا مختصر سا رسالہ ہے جن میں جناب اختر قادری نے حضرت وحشت کے حالات کے ساتھ انتخاب کلام بھی پیش کیا ہے۔

حالات کے سلسلہ میں وحشت کی شاعری پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے اور غنیمت ہے لیکن انتخاب کلام میں یقیناً وحشت کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ اس میں شک نہیں انتخاب کا مسئلہ بڑا مشکل مسئلہ ہے اور ہر شخص اپنے ذوق کو سامنے رکھ کر انتخاب کرتا ہے۔ اور ان کی اسی حیثیت کو سامنے رکھ کر یہ خدمت انجام دینا جائے تھی۔ ضرورت ہے کہ جناب وحشت کی زندگی اور ان کی شاعرانہ خدمات پر کوئی مبسوط کتاب لکھی جائے اور یہ مطالبہ ہم سب سے پہلے انجمن ترقی اردو پاکستان سے کرتے ہیں، جہاں آجکل حضرت وحشت مقیم ہیں۔ لیکن جناب اختر قادری نے شاید اپنے ذوق کا بھی لحاظ نہیں کیا اور بجائے متفوق اشعار کے زیادہ تر غزلوں کا انتخاب کیا ہے اور وہ بھی اتنا کم کہ وحشت کی شاعرانہ اہمیت اس سے ظاہر ہونے کی جگہ اور کم ہو جاتی ہے۔ وحشت کی حیثیت ایک بڑے استاد کی حیثیت ہے۔ یہ رسالہ پھر میں مکتبہ ادب جدید ڈھاکہ سے مل سکتا ہے۔

## ملکِ خطا کے شہزادے

دنیا میں کیا اندھیر ہو رہا ہے اس کی دردناک داستان اگر آپ کو سننا ہے تو وصی احمد بلگرامی قاتی بی۔ اے کی زبان سے سنئے جو اپنی مخصوص تحریر اور زورِ بیان کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتے اس کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کو شروع کر کے ختم نہ کرنا انسانی اختیار سے باہر ہے۔ قیمت بارہ آنے۔

### گلابائے جعفری

جناب آثر لکھنوی کے ڈیڑھ سو اشعار جو آڈیو ریکارڈ نے اپنے تعارفی مقدمہ کے ساتھ بہت اہتمام سے شائع کئے گئے تھے اس کی چند جلدیں اتفاق سے رو گئی ہیں۔

کے ٹکٹ سننے پر انتخاب ذریعہ پوسٹ مل سکتا ہے

میجر نگار لکھنؤ

### توقیت

تاریخ اسلامی ہند کے سلسلہ میں آڈیو ریکارڈ نے توقیت عرب کی تھی جس میں سلطنت سے سلطنت تک کے تمام اہم تاریخی واقعات بقیہ سہجری لکھا کر دئے گئے ہیں۔ تاریخ کے طلبہ کے لئے بڑی کار آمد چیز ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

# نگار کا آئندہ سالنامہ ۱۹۵۷ء

## (اصنافِ سخن نمبر)

ہر آنے والے سال کے ساتھ ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ نگار کا مخصوص نمبر کس موضوع کے لئے وقف کیا جائے جو پڑھنے والوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ہو اور جس کی ترتیب میں اردو کے اہم لکھنے والے حصہ لے سکیں، چنانچہ موجودہ انتقادی دور کے پیش نظر یہ مناسب سمجھا گیا کہ ۱۹۵۷ء کا پہلا شمارہ اردو شاعری کے تمام اہم اصنافِ سخن کی تعریف، تجزیہ، تشریح اور تاریخ کے لئے وقف ہو۔

یہ سالنامہ طلبہ، اساتذہ اور تمام شائقینِ ادبِ اردو کے لئے ایک نہایت مفید دائرۃ المعارف قسم کی چیز ہوگا، جس کی اہمیت کا اندازہ آپ کو ذیل کے عنوانات سے بخوبی ہو سکتا ہے :-

صنف غزل :- (۱) غزل کی ماہیت اور ہیئت - (۲) اردو غزلِ دلی سے غالب تک - (۳) اردو غزلِ غالب سے عہدِ حاضر تک - (۴) دہلی اور لکھنؤ کا دبستانِ غزل - (۵) غزل کا مستقبل -

صنف قصیدہ :- (۱) قصیدہ کی تاریخی و روایتی حیثیت - (۲) قصیدہ کا ارتقائی دور - (ذوق، سودا، غالب و مومن کی قصیدہ نگاری -

صنف مثنوی :- (۱) مثنوی کی روایتی و بنیادی خصوصیات - (۲) دکن کی مثنویاں - (۳) مثنوی تاریخی نقطہ نظر سے - (۴) لکھنؤ، دہلی کی مشہور مثنویاں -

صنف مرثیہ :- (۱) مرثیہ کے عناصر ترکیبی - (۲) دکن اور مرثیہ نگاری - (۳) مرثیہ انیس تک - (۴) مرثیہ انیس کے بعد - (۵) انیس و دیگر - (۶) واقعہ کربلا کے علاوہ دوسرے مراثی -

صنف رباعی و قطعات :- (۱) رباعی پر تاریخی نظر - (۲) اردو کے مشہور رباعی نگار - (۳) قطعہ نگاری کا سرسری جائزہ - صنف ہجو و مزاح نگاری :- (۱) ہجو نگاری (تاریخی جائزہ) - (۲) سودا، حیثیت ہجو نگار - (۳) مزاحیہ و طنزیہ شاعری -

صنف ریختی :- (۱) اردو ریختی پر ایک نظر -

صنف نظم نگاری :- (۱) اردو کی ابتدائی نظمیں - (۲) جدید نظم نگاری کا پس منظر - (۳) اخلاقی و اصلاحی نظمیں - (۴) ردائی نظمیں -

(۵) سیاسی و انقلابی نظمیں - (۶) آزاد نظم - (۷) غنمی نظمیں اور گیت - (۸) واسوخت -

پروفیسر فراق - پروفیسر محسن - پروفیسر سرور - پروفیسر احتشام حسین - پروفیسر ڈاکٹر اعجاز حسین - پروفیسر ڈاکٹر محمد قسطل  
پروفیسر ڈاکٹر ضیاء احمد بڑا پوری - ڈاکٹر گمان چند - مولانا اختر علی تھری - حضرت اثر لکھنوی - پروفیسر ڈاکٹر مسعود حسین خان -  
پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن - پروفیسر ڈاکٹر صفدر حسین - سید گلین کاظمی اور دیگر حضرات کے خطوط مل گئے ہیں -

منیجر نگار

# چند ضروری اعلانات

## ”نگار“ کی اشاعت جولائی سے

”مشکلات غالبہ“ کے زیر عنوان اڈیٹر نگار کے قلم سے ایک مستقل کتاب کا آغاز ہو رہا ہے، جس میں پہلے غالب کے اردو کلام کی شرح و تفسیر پیش کی جائے گی اور اس کے بعد فارسی کلام کی۔ اس میں بتایا جائے گا کہ غالب کے سمجھنے میں اس وقت تک کس حد تک انفراد و تفریط سے کام لیا گیا ہے اور دنیا کے شاعری میں غالب کا صحیح موقف کیا ہے۔ امید ہے کہ دسمبر ۱۹۵۷ء تک یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا اور اس کے بعد فارسی کلام کی شرح و تفسیر شروع کی جائے گی۔

## پاکستان کے خریدار

اپنا سالانہ چندہ آٹھ روپیہ آٹھ آنے ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں اور رسید ڈاک خانہ ہمارے پاس جلد از جلد بھیجیں تاکہ پرچہ کی روانگی میں تاخیر نہ ہو۔ پاکستان کے بعض خریدار کا چندہ جون یا اس سے قبل ختم ہو چکا ہے اور ان کے نام جولائی ۱۹۵۷ء پر یہ اسی وقت روانہ ہو گا جب ان کا چندہ وصول ہو جائے گا۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۱۰۵ - گارڈن ولیٹ - کراچی  
”نگار“ کی مطبوعات بھی آپ کو اس پتہ سے ذریعہ دی جانی سکتی ہیں

چند سالانہ ذریعہ منی آرڈر روانہ کرنے میں آپ کو ۸ روپیہ ۸۰ پائیہ کی کمی ہو سکتی ہے کیونکہ جرہری کی فیس بڑھ جانے کی وجہ سے ”نگار“ کا سالانہ دی جانی اپنی جگہ پر روانہ ہو گا اور آپ کو ۱۱ روپیہ ۱۰ پائیہ کی کمی ہو سکتی ہے۔ جو حضرات سالانہ ذریعہ جرہری طلب فرمائیں وہ ۸ روپیہ ۸۰ پائیہ روانہ فرمائیں۔ فیچر نگار

## فہرست میموریل مقابلہ مضمون نگاری

عنوانات :- (۱) اردو کے جدید تنقیدی میلانات - (۲) اردو ادب اور قومی رجحانات زندگی کی ترجمانی - (۳) اردو زبان کا مستقبل  
شرائط :- (۱) مضمون نگار کسی یونیورسٹی یا ڈگری کالج کا باقاعدہ طالب علم ہو۔ اپنے طالب علم ہونے کا سرٹیفکیٹ اسے اپنی یونیورسٹی کے وائس چانسلر یا ڈگری کالج کے پرنسپل کے دستخط سے بھیجنا ہوگا۔ (۲) عنوانات بالا میں سے کسی ایک پر ۲۰۰۰ سے ۲۵۰۰ الفاظ کی مضمون لکھنا ہوگا اور کم از کم چھ ہزار الفاظ پر مشتمل ہو۔ مضمون غیر مطبوعہ ہو اور خاص طور پر اس انعامی مقابلہ کے لئے لکھا گیا ہو۔ (۳) مضمون کی تین نقلیں صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی کے پاس زیادہ سے زیادہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۷ء تک بھیجی جائیں۔ (۴) جج صاحبان کو اختیار ہوگا کہ مقالات کے معیاری نہ ہونے کی صورت میں ہذا انعام دینے یا انعام میں تخفیف کر دینے کی سفارش کریں۔

عبدالعظیم رحیم پور۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نوٹ :- انعام ایک سو پچیس روپے ہے۔ نتائج دسمبر ۱۹۵۷ء تک شائع ہوں گے۔

# بعض کمیاب کتابیں

(ان کتابوں پر کمیشن نہیں دیا جائے گا۔ قیمتیں علاوہ محصول ڈاک ہیں)

تذکرہ مخزن نکات ..... قائم	کشتان اصطلاحات الفنون ..... شیخ محمد علی
تذکرہ دستور الفصاحت ..... یکتا	جہانگیر نامہ ..... خواجہ ابوالحسن
تذکرہ چغتایان شعراء ..... شفیق	آئین اکبری مصور رسم مصفح ..... ابوالفضل فیض
تذکرہ ہندی ..... مصحفی	سکندر نامہ مصور ..... مولوی نظامی گنجوی
دیوان میر حسن ..... میر حسن حسن	ذیل نعمت خان عالی انشائے حسن و عشق ..... ع
دیوان شاکر گن ..... دیوان نسیم دہلوی ..... محمد صفر علی خاں	درہ نامہ ..... مرزا محمد مهدی خاں
کلیات ناسخ ..... امام بخش ناسخ	تاریخ گلستان ہند مصور ..... درگا پرشاد
کلیات تسلیم ..... ع	تاریخ جامع التواریخ ..... فقیر محمد
کلیات سودا ..... مرزا رفیع سودا	اقبال نامہ جہانگیری سر حصہ ..... محمد شریف معتمد خاں
کلیات حسرت ..... فضل الحسن موہانی	سیر المتاخرین سر حصہ ..... غلام حسین خاں
کلیات مومن ..... مومن خاں دہلوی	تذکرہ دولت شاہ ..... دولت شاہ سمرقندی
کلیات میر ..... میر تقی میر	در بار اکبری ..... آزاد
کمل شرح کلام غالب ..... مرتبہ عبدالباری آسی	تذکرہ گل رعنا ..... عبدالغنی
مراۃ الغیب ..... امیر احمد امیر	کلیات ظہیر ..... حکیم ظہیر فارابی
منظر معانی دیوان مجروح ..... میر ہندی حسین	قصاید عرفی عثمی ..... جمال الدین
دستور الشعراء (تذکرہ نانیٹ) ..... ع	کلیات اسماعیل ..... اسماعیل اصفہانی
کلیات جعفر زلی ..... مرتبہ محمد فرحت اللہ	کلیات سعدی ..... شیخ مصلح الدین سعدی
کلیات نظیر اکبر آبادی ..... مرتبہ عبدالباری آسی	دیوان عرفی ..... جمال الدین عرفی
مراثی انیس ..... جلد اول و دوم و سوم و چہارم ..... میر انیس	دیوان ہلالی محشی ..... ہلالی
مراثی میر انیس ..... جلد ششم ..... مرتبہ میر عبدالحسین	دیوان قصاید حصری ..... حکیم ابوالقاسم
مراثی دبیر کمال ..... ع	تذکرہ کاظمی نام پور ..... احمد علی خاں
مراثی مونس ..... ع	تذکرہ آب بقا ..... عبدالرؤف عشرت
کرم اللغات ..... ع	چند شعراء ..... ع
شیخ اللغات ..... ضامن علی جلال لغت قلمی	تذکرہ الخاقین ..... عبدالباری آسی
فردوسی پرچارمقالے ..... محمد و شرافتی	تذکرہ سخن شعراء نساخ ..... ع
تاریخ حبیب المیر ..... غیاث الدین بن جام الدین	تذکرہ گلشن ہند ..... مرزا علی لطیف

پاکستان میں کتنی ہی صورت میں پہنچ سکتی ہیں کہ پوری قیمت مع محصول ڈاک ذریعہ بینک ڈرافٹ پہلے وصول ہو جائے۔

نیمبر نگار لکھنؤ

امریکی کہ آپ کا چندہ جولائی میں ختم ہو گیا اور گنت کتب کے مصارف زہری کے لئے اس کے علاوہ ہوں گے

نگار

دہنی طرک کا صلیبی نشان علامت ہے اس آٹھ روپیہ نو آنے میں دی گئی ہے

Jamia Millia

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۷۰ فہرست مضامین جولائی ۱۹۵۶ء شمار ۱

۴۴	مولانا شبلی علی گڑھ سے پہلے اور بعد۔۔۔ مفتون احمد۔۔۔۔۔	۴	ملاحظات۔۔۔۔۔
۴۷	انتخاب کلام صادق۔۔۔۔۔	۶	آثر کعبی (بہ خلوٹ کے آئینے میں)۔۔۔۔۔
۵۰	منظومات: نضال ابن رضی، آثر بھوپالی، شفقت کاظمی، تہذیب جعفری	۱۶	حالی اور شبلی۔۔۔۔۔
۵۳	بشرفاز، راز، شفا کو دیاری، قطر شاہ جہانپوری	۳۲	ایک عجیب غریب تاریخی جرم۔۔۔۔۔
	مشکلات غالب۔۔۔۔۔	۳۷	تدین جدید کی دردناک داستان۔۔۔۔۔

## ملاحظات

### نئی سیاسی چالیں

اسٹائن کے زمانہ تک سرزمین روس ایک مہمہ تھا جس کے سمجھنے کی جتنی کوشش کی جاتی تھی اتنا ہی زیادہ ناقابل فہم ہوتا جاتا تھا اور اس کے آہنی پردوں کے پیچھے دنیا کو خدا جانے کیا کیا نظر آتا تھا، لیکن اب کہ روس ارض ممنوع نہیں رہا اور نئی حکومت نے تمام پچھلے عجایب دور کر کے ساری دنیا کو حالات کے مطالعہ کا صلہ عام دیدیا ہے تو امریکہ جس کو کبھی روس کے اس قدر دشمن تھا ہو جانے کی توقع نہ تھی، اب اندیشہ میں مبتلا کر دیا ہے کہ:۔۔۔

”ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں“ اور اس کا اندیشہ غالباً غلط نہیں۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ روس اور امریکہ کا نظریاتی اختلاف کبھی دور نہیں ہو سکتا اور اعتقادی حیثیت سے دونوں میں ہمیشہ تطہین کا فرق قائم رہے گا، لیکن جنگ سے قطع نظر اب سوال یہ ہے کہ دنیا ان دونوں نظریوں میں سے کس طرف زیادہ مایل کی جا سکتی ہے اور عوام کی ذہنیت کس کے قبول کرنے میں زیادہ آمادہ ہے اور روس نے امریکہ کو کھلا ہوا چیلنج دیدیا ہے کہ اگر کامیابی کا انحصار ہی محبت نظر ہے تو وہ اس باب میں بھی اس کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہے اور امریکہ کے اس مکر دوستی کو جس سے وہ دوسری جنگ عظیم کے بعد گھم لینا چاہتا ہے، شاید اس سے بہتر طریقہ پر اختیار کر سکتا ہے۔

روائی ختم ہونے کے بعد امریکہ نے اپنی دولت کی قوت سے جن جن ملکوں کو خریدنا چاہا ان کی تعداد اس میں شک نہیں اس کی مادی قریبوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے اور اس کی ناکامی اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ اٹلانٹک کو چھوڑ کر بحرِ روم اور بحرِ اگلی میں بھی اس کا اقتدار قائم نہ ہوا اور مشرق وسطیٰ کے مسائل کو بھی وہ خاطر خواہ طے نہ کر سکا۔ اس میں شک نہیں کہ بغداد پیکٹ امریکہ ملک کی سب سے بڑی ڈھال تھی، لیکن مصر اور سعودی عرب کے اس پیکٹ میں خریک نہ ہونے سے اس میں اتنا خلا پیدا ہو گیا ہے کہ اسے

ض دولت سے پھر نہیں کیا جاسکتا کہ دیانت اخلاق سے اور اس کا فقدان اسرائیلی حکومت کے مسئلہ میں امریکن ہلاک کی طرف سے بل ہی ظاہر ہو چکا ہے۔

ظاہر ہے کہ روس اس فرصت کو ہاتھ سے نہ دے سکتا تھا، چنانچہ اس نے فوراً مقررہ سعودی عرب کی طرف دوسری طرف بڑھایا، ہاں تک کہ آخر کار مقررہ اس کی اسلو فراہم کرنے کی پیشکش کو قبول کر لیا۔ بغداد پیکٹ میں علاوہ عرب کی بعض عربی ریاستوں کے، پاکستان، ایران بھی شریک ہیں، لیکن ان کی شرکت کا اثر مشرق وسطیٰ کے مسائل پر اتنا نہیں پڑتا جتنا روس کی ایشیائی سرحد پر اور اس حقیقت کے نظر پاکستان و ایران کو بھی بغداد پیکٹ میں شریک کیا گیا تھا لیکن افسوس ہے کہ اس کی تعمیل بھی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک دوستانہ اس پالیسی کا ہمنوا نہ ہو اور اس کا قطعی کوئی امکان نہیں۔

روس کی جدید پالیسی نے جو تمام ضرورت مند ممالک کی غیر مشروط اقتصادی و صنعتی امداد سے تعلق رکھتی ہے، امریکن ہلاک کی بہت سی بددوں کو خاک میں ملا دیا ہے، یہاں تک کہ وہ قویں بھی جو اپنی تجارت اسی میں سمجھتی تھیں کہ امریکہ یا برطانیہ کا دام پکڑے رہیں، اب وچ رہی ہیں کہ وہ کب تک غصیہ وں کی دست نگر رہیں گی اور ان میں بھی ایک مستقل بقاء ذاتی کا احساس ہو چلا ہے۔

چند دن کی بات ہے کہ پاکستان میں روس اور چین کا نام لیا جانا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا، لیکن آج یہ ہم سن رہے ہیں کہ پاکستان کے براعظم چین جانے والے ہیں اور روس سے بھی اقتصادی و صنعتی معاہدے کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ بالکل ہی صورتہ ایران کی ہے اب سے قبل اسکا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہاں کا فرمانروا روس کی سرزمین میں قدم رکھتا کبھی گوارا کرے گا، لیکن یہ ظلم بھی ہو کر ہا اور امریکن ہلاک اسے دیکھتا رہا۔ اس دوران میں روس نے ایشیا وینڈپ کے مختلف ممالک کے ساتھ اپنی دوستی کا جال جس تیزی سے پھیلا رہا ہے وہ کوئی معمولی بات نہیں اور اسی لئے ڈیلیزے اختیار کر آٹھا کہ روس کی موجودہ پالیسی، اسٹالن کی پالیسی سے یادہ خطرناک ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ روس کی موجودہ پالیسی کوئی جمہوری پالیسی نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ بلقان اور خروشیو پوت کے بعد کوئی دوسرا نشان پیدا ہو کر موجودہ نقشہ بگاڑ کر رکھ دے، لیکن دنیا کی عام موجودہ ذہنیت کو دیکھتے ہوئے یہ اندیشہ بہت کم ہے کہ روس بھڑکے وں واپس جائے گا، اور اگر کسی وقت غلطی اس نے کی تو پھر اس کا زندہ رہنا مشکل ہے کیونکہ دشمن کو دشمن رکھ کر تو زندہ رہا جاسکتا ہے بلکہ دوستوں کو دشمن بنا کر جینا بہت مشکل ہے۔

**کرنل ناصر اور مصر** کرنل ناصر کا مصلحت مقرر کا صدر منتخب ہو جانا خوشی کی بات ہے، لیکن تعجب کی نہیں۔ خوشی اس بات کی کہ وہاں کی عسکری حکومت کی مدت چار سال مقرر کی گئی تھی اور وہ اسی ميعاد کے اندر ختم ہو گئی اور تعجب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کرنل ناصر کے مقابلہ میں کسی اور جماعت کو انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت ہی نہ تھی اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں کرنل ناصر کے سوا کسی دوسرے کا انتخاب ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ انفرادی حیثیت سے لوگوں کو مقابلہ کی اجازت ضرور تھی، لیکن یہ تک کوئی جماعت کسی فرد کی پشت پر نہ ہو کا میابی محال ہے۔ اس لئے مصر میں جو کچھ ہوا وہ کوئی جمہوری رائے شماری نہ تھی بلکہ صرف عوام کا ووٹ تھا جو کرنل ناصر نے حاصل کیا۔ فرق اگر ہوا تو صرف اس قدر کہ حکومت پہلے کرنل ناصر کے ہاتھ میں تھی اور اب پریذیڈنٹ صر کے ہاتھ میں ہے۔

شخصی حکومت کی لعنت سے آزاد ہونے کے بعد بھی نہ ترویز پر برطانوی قبضہ کا پھندا جو مصر کے گلے میں پڑا ہوا تھا اس سے ہر چند مصر کو ہائی مل گئی ہے، لیکن وہاں کی اقتصادی حالت اتنی خراب ہے کہ جب تک اس کو درست نہ کر لیا جائے، مصر اپنی بیرونی پالیسی کو متاثر بھی نہیں سکتا اور اس کے لئے بڑا زمانہ درکار ہے۔ تاہم یہ امر قابل اطمینان ہے کہ اقتصادی طوفان میں گھرنے کے بعد بھی وہ پہلے کے سہارا لینے اور اپنی قومی خود داری کو ہاتھ سے دینے کے لئے آمادہ نہیں۔

میں اُس زمانہ میں الہ آباد ڈومین کا ڈائریکشنل کنٹریکٹر تھا اور۔۔۔ صاحب سے اکثر ملاقات ہوتی تھی یہ مضمون بھی اُن کو سنایا تھا۔ جلد اہل

میری دریافت کو اپنا کھمر سا ادب نگار میں چھاپ دیا مگر اپنا نام ظاہر کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ محض ”نقاد“ لکھا! خدا حافظ - آخر اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں انشاء کے بارے میں کچھ کہنا مناسب سمجھوں گا۔ شیخ مصطفیٰ اور انشاء دونوں ہم عصر تھے اور ان کے معرکوں سے اردو دنیا اچھی طرح واقف ہے۔ لیکن یہ حقیقت بڑی تلخ ہے کہ تاریخ میں آج تک مصطفیٰ کے ساتھ انعام نہیں کیا گیا۔ شیخ مصطفیٰ کو اگر اردو شاعری کا سچا کہا جائے تو ہرگز مبالغہ نہیں ہے۔

انشاء، رنگین اور ان کے ساتھیوں کی بدولت اردو شاعری کی مٹی پلید ہوئی، خارجیت اور ریکی کا زور بڑھا کنگھی، سرمد، انگہا، چولی اور جہن کا نام اردو شاعری رہ گیا، اگر وہ سیلاب بڑھتا رہتا تو آج اردو شاعری دو کوڑی کے مول بھی پہنچی ہوتی شیخ مصطفیٰ نے اس دو میں شاعری کی روایات اور آداب و اظہار کی نگہداشت کی، اور ان کی ذات نے ایک پورے ادارے کا کام کیا۔ اگر مصطفیٰ نہ ہوتے تو مومن، داغ، غائب، انیس، حسرت موہانی اور جگر مراد آبادی تک جتنے نام بھی اردو کے زندہ جاوید شاعروں کی فہرست میں آتے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی نہ ہوتا۔ رنگین و انشاء کی ریکی جتنی، جعفر زئی کی ڈکلیات ہوتیں، جان صاحب کا کلیات ہوتا اور چرکین کا دیوان!“

میں نے آخر لکھنوی کا مذکورہ مضمون نہیں پڑھا ہے لیکن سرت اتنی بات کی روشنی میں جو انھوں نے اس مکتوب میں ارشاد فرمائی ہے یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اس مضمون پر ایک مضمون غائب مولوی محمد کبھی تنہا کا شائع ہوا تھا اس کے اوراق ہمیں اب دستیاب ہوئے ہیں انھوں نے جتنی ایمانداری، بے خوفی اور اعتدال کے ساتھ انشاء کے کلام کا جائزہ لیا ہے وہ اردو کی تاریخ میں پہلی ایمانداری کو شمش ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک وقت وہ آئے گا جب اردو کا تاریخ نگار انشاء کو ”فن شاعری“ کا بہترین دشمن اور مصطفیٰ کو اس کا بہترین دوست قرار دے گا، جس نے ”تین اور بھائے کی شاعری“ کا سیلاب اپنے بوڑھے اور ناتواں دل و دماغ سے روکا اور سیکڑوں شاگردوں کے ذریعہ اس پودے کو ”انشائیہ“ و ”رنگینیت“ کی آگ میں جھلنے سے بچا دیا۔ محمد کبھی تنہا کے مذکورہ مضمون کے یہ اقتباس ملاحظہ ہوں :-

”... آپ کا (انشاء) کلام حرام کا تمام جو غزلیات کے نام سے درج ہے رکات اور صفحات کے آخری درجے پر ہے۔ اگر ہم اس کو دیوان غزلیات کہیں تو اس میں ہرگز مبالغہ نہ سمجھنا چاہئے۔ کاش سیروح پر دیوان غزلیات لکھا ہوتا۔۔۔۔۔ انھوں نے ہمارے تذکرہ نویسوں نے آپ کے کلام کے متعلق جو رائے ظاہر کرنی چاہئے تھی اس سے دریغ کیا، اور آپ کی شخصیت سے مرعوب ہو کر صاف صاف جو کہنا تھا نہ کہا۔۔۔۔۔ آپ کے خیالات عشق مجازی کے کیا معنی بلکہ بواہوسی کے لئے بھی باعث شرم ہیں۔۔۔۔۔ آپ کے دیوان میں تقریباً چار ہزار اشعار ہیں اور ہم کو مشکل تمام بہتر اشعار ایسے دستیاب ہوئے ہیں جو خف دہیک نہیں ہیں اگرچہ وہ بھی اعلیٰ اشعار میں شمار نہیں کئے جاسکتے۔۔۔۔۔ مختصراً کوئی شاعر تک ایسا نہیں کرنا جس کا تجرید کلام اس قدر سبک، اس قدر دلیک اور اس قدر نفوذ جیسا کہ سید انشاء کا ہے۔ شاعری ایسے شاعر سے پناہ مانگتی ہے اور اردو شاعری

تو سید انشاء کے نام سے کاہنتی ہے۔۔۔۔۔ جناب مصطفیٰ نے اگرچہ سید انشاء کی بیجو میں کہا ہے لیکن ہرگز اس میں مبالغہ نہیں اور بالکل سچ کہا ہے: ”م“ واقعہ کہ شاعر نہیں تو، بھانڈے بھر دے۔۔۔۔۔ اس پر آشوب زمانہ میں اگر کسی شاعر نے تہم روایات کو قائم رکھا اور مسلک شاعری پر استقلال اور بہت مروانہ کے ساتھ کام لیا تو وہ صرف مصطفیٰ ہے۔ ورنہ اردو شاعری جو کچھ ہمیں نظر آتی ہے وہ بھی لکڑی کو بھانڈے کی شکل نہ ہو سکتی۔۔۔۔۔“

اس کے بعد نا ضل مضمون نگار نے کلیات کا جائزہ لے کر بتایا ہے کہ انشاء کے ہاں مترکات پر مشورہ تھے ہیں، زبان کی مکرر خالص غلطیاں

الفاظ بے حد فقیر، غریب اور نامافوس استعمال کرتے ہیں۔ روایت قافئے بے حد فقیر اور غیر عمد استعمال کئے ہیں اور کسی قافیہ پر مضمون آفرینی نہیں ملتی۔ اور آخر میں وہ ۷۲ اشعار درج ہیں جو بالکل تمام پورے دیوان غزلیات سے نکالے جانے کے بعد میں رکنا ابتذال، سخیافت اور سو قیقت نہیں ہے۔

یہاں انشاء مصحفی کا موازنہ و مقابلہ بحث و تمحیص کا موقع نہیں تھا۔ لیکن یہ مرن اس واسطے عرض کیا گیا کہ میرزا مطالعہ سے لوگوں کی خوش فہمیاں حضرت انشا کے بارے میں دیکھ کر کیا ہوں۔ حالانکہ وہ اردو شاعری میں موجود کہلاتا تو بڑی دوران کار ہمارے شاعری کی صالح روایات کا مخرب ہے! بدلتے نہیں! بدل کب چھٹیں گے کہ کوئی مصحفی نام کے ایک شاعر کو بھی پہچانیں۔ جو دہائی لکھنؤ اسکول کا مورث اعلیٰ ہے اور جسے 'موجد' ہی نہیں بلکہ 'مخ' کہنا چاہئے!

کشمیری محلہ - لکھنؤ - ۲ فروری ۱۹۵۴ء

پیارے بھائی زخار دتی - ۳۰ جنوری کا محبت نامہ کل شام کو کھر دتی سے واپسی پر وصول ہوا۔ کل الہ آباد جا رہا ہوں۔ دو تین دن بعد پٹنا ہو۔ ہندوستانی اکیڈمی کی سلور جوبلی کے موقع پر میری صدارت میں مشاعرہ ہونے والا ہے۔ "اگر اہل شیدا ہے پریشاں مجھ سے" مجھے آپ سے پورا اتفاق ہے کہ مطلع سست ہے۔ قلمزد کردیا۔ گل کے دامن! صد پارہ گریباں ہونا گل کی شکستگی سے مراد ہے۔ بہاراں میں صفحہ ۲۰ پر مطلع ہے اُس میں یہ خیال واضح ہے کہ اسے جنوں اب وہ ہوائیں ترنہ گلشن میں نہیں گل کے مانند گریباں مرے دامن میں نہیں اس غزل کے چار شعرا در ہیں جو بہاراں میں درج ہونے سے رہ گئے:

دل کے جھانلوں کو تپکے نہیں دیکھا ہے ابھی	برق آوارہ ہے جب تک مرے خرم میں نہیں
تن بدن بھونک دیا اور دھواں تک نہ اٹھا	جو تپش داغ جگر میں ہے وہ گھٹن میں نہیں
للاؤ الحمد کہ تکیس سے ہے پاک ضمیر	نفس کی باد فروشی مرے گلشن میں نہیں
خضر کیا؟ موقلم عشق سے تصویر حال	کوئی استاد کسی کا اقراس فن میں نہیں

اب پھر زیر نظر غزل لیجئے:- "جلوہ گرتو جو ہوا خلوت اندیشہ میں" الخ۔ اندیشہ خلوت کے علاوہ سوچ بچار، فکر، تصور بھی۔ غالب نے اندیشہ اس معنی میں متواتر استعمال کیا ہے مثلاً:-  
 عرض کیجئے جو ہر اندیشہ کی گری کہساں  
 کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرایہ صبا  
 "جلوہ گرتو جو ہوا خلوت اندیشہ میں" ایسی خلوت جس میں محبوب کے تصور کے سوا کسی کا دخل نہیں اور یہ تصور جلوت کی صورت کرتا ہے۔

"موج سے موج کے ٹکرائے کے عالم کے سوا" میں تسلیم کرتا ہوں کہ خضر کی بندش چست نہیں۔ بیاض سے خالصہ کر دیا۔ لی کی محاورہ ہے، اترانا، غور کرنا۔

میں قسم کرتا ہوں کہ میری نظر میں آپ کی دلت کی جڑی دھت ہے۔ اسی طرح میرے اشعار کو پرکھتے اور مجھے مطلع کرتے رہئے۔ ناخفر کیسا، میں آپ کا احسان مند ہوں۔۔۔۔۔

لے شمار ہے نوا، ذرا جعفر علی خاں، کامرہن و منوی ہے کہ انھوں نے میرے بعض شہادت کے خطوط کو طیب خاں کو افریاد اور بعض میں کی قہ انفرادی ہے کہ اسے "پرکھنا" سمجھا۔ کوئی صاحب یہ بہرگز خیال نہ فرمائیں کہ میں اپنی ملیت کا ثابت کا سکھ بھانے کو حضرت آئمہ علیہ السلام کے مکتوب نقل کر رہا ہوں۔ ماسک کہنگہ میں میری حیثیت پر گواہ کی بھی نہیں۔ جہاں تک "قابلیت" کا تعلق ہے اُس کا بھارتی نہیں بلکہ میری جہالت ہے۔ "پتکے" کے غیر ضمیمہ ہر شے کو کہتے ہیں! دیکھتے جائیے۔

اکشمیری محلہ - لکھنؤ - ۶ فروری ۱۹۵۳ء

پیارے بھائی فاروقی - آپ کی غزل بڑے شوق سے پڑھی، ماشا اللہ خوب ہے۔ "شائیں" قافیہ معمولہ بڑے حسن سے نظم ہوا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اشعار خاص طور پر پسند آئے۔

کیا جانے ہوا کیا جو ربط باہمی تھا نکبت میں اور نگوں میں، بچوں میں اور صبا میں  
خول نشہ آرزو میں لائی ہیں رنگ کیا کیا کچھ "تالش" شوق میں کچھ سرنی جنا میں  
مطلع میں لفظ "قیمت" کچھ چپتا نہیں اس کی جگہ "تلمی" کیسا ہو؟ کتنی لگا دیش ہیں... اس شعر میں ردیف کی مکرار ہے جو  
معیوب ہے۔ اگر مصرع کے دونوں ٹکڑے مقدم و مؤخر کر دیجئے تو یہ عیب نکل جائے۔ "ان کم نگاہیوں میں کتنی لگا دیش ہیں۔"  
"کچھ آرتی ہے منزل کچھ بڑھ رہے ہیں ردو۔" آرتی ہے کی جگہ "گھٹ رہی ہے" کیسا ہو؟  
تیر وادی کا مقطع ہے۔

لوہو میں شور ہو رہے دامن و جیب تیر پھرا ہوا ہے دیدہ نو بار بے طبع

ناسخ لکھنوی کہتا ہے

نم سے برسات ہیں اس درجہ ہوا جو شرب ہو گئی بادہ گلاؤں سے شراب و گھٹ  
..... خدا حافظ آپ کا اثر

۶ فروری

پیارے بھائی فاروقی - گل صبح کو ایک خط روانہ کر چکا تھا۔ شام کو آپ کا ۱۵ فروری کا تحریر کردہ خط ملا۔ پچھلے خط میں  
اگر آباد نہ جانے کی وجہ لکھ دی تھی۔ بہر دوئی کے مشاعرے میں قابل ذکر موجودگی حضرت جگر مراد آبادی کی تھی۔ وہی بار بار کی سنی ہوئی غزل  
"بھول کھلے ہیں گلشن گلشن" پڑھے تھے۔ خدا کرے کہ آپ مجھ سے گستاخ اور بے حد گستاخ ہو جائیں تاکہ میرے اشعار کو پرکھتے اور انکے معائب  
سے مجھے آگاہ کرتے رہیں۔ ایسے دوست قسمت ہی سے ملتے ہیں۔ آپ تپکتے کو مصدر کیوں کہتے ہیں؟ اس میں علامت مصدری "ا" کہاں ہے؟  
یہ تو تپکنا سے فعل حال ہے۔ "تپکتے نہیں دیکھا ہے ابھی" یعنی تپکتے وقت یا تپکنے کی حالت میں نہیں دیکھا ہے۔ دوسری صورت یہ ممکن ہے:-  
"دل کے چھالوں کا تپکنا نہیں دیکھا ہے ابھی"۔ یہ ایک عام بات ہوتی، وہ تخصیص پیدا نہ ہوتی جو "تپکتے نہیں دیکھا" میں ہے۔ اگر کچھ اور  
شبہ ہے تو اس کی وضاحت کیجئے۔

دل کے چھالوں کو تپکتے نہیں دیکھا ہے ابھی برق آوارہ ہے جب تک مرے فرمیں میں نہیں

اس سے پہلے پہلا مصرع میرے ذہن میں نہیں آتا۔ دل کے آبلے فرمیں ہیں۔ ادھر برق میں تڑپ ہے، ادھر آبلوں میں تپک ہے۔ اس میں  
چمک ہے ان میں "آب" ہے۔ برق، فرمیں پر گرتی ہے۔ اس "فرمیں آبلہ" پر گرنے تو اس کو تاراج کرنے کے  
بجائے خود اس "آبلہ زاد قش" میں امیر ہو کر رہ جائے۔ ان آبلوں کی تپک ہیں اس کی تپیدگی جذب یا سلب ہو جائے۔ میں کی ہو رہے۔  
ادھر ادھر ماری ماری (آوارہ) نہ پھرے۔ اس سے زیادہ جاندار کوئی مصرع سوچئے اور مجھے مطلع کیجئے۔ اگر اس سے زیادہ معنی خیز ہوا  
تو اظہار تشکر کے ساتھ قبول کر لوں گا۔ آپ کو جو اشعار پسند آئے مجھے ہنر ہو گئے۔ آپ کو وہ غزل پسند آئی جس کی ردیف "اب تک" ہے۔

میں شعر یہ تھا ہے	اتنا اثر تو دے دے یارب مری دعا میں،	کچھ اور وہ بڑھا دین قیمت مری، جفا میں
میں شعر یہ تھا ہے	کتنی لگا دیش ہیں ان کم نگاہیوں میں،	کیا ہے حجابوں میں اس پردہ حیا میں!
میں شعر یہ تھا ہے	کچھ آرتی ہے منزل کچھ بڑھ رہے ہیں ردو	ہر سانس اک قدم ہے اس جادہ فنا میں

بہاراں کے صفحہ ۲۶۹ پر ایک غزل ہے جس کی روایت ”کب تک“ ہے۔ اُس کا یہ شعر مجھے بہت پسند ہے۔  
 کھلا کس سے ہو ضبط شوق ان رنگیں اشاعت پر نہ ملتا شمع سے پروانہ آتش بجاں کب تک  
 اس غزل میں ایک شعر بعد کو اضافہ ہوا ہے۔

بدل جائیں گی شعلوں میں یہی تپتی ہوئی روہیں  
 اُٹھے گا آتش خاموش سے خالی دھواں کب تک  
 شاید حالات حاضرہ پر منطبق ہوتا ہے پسند آئے تو حاشے پر لکھ لیجئے۔

اب میں انشاء اللہ ۲۰۱۳ء کے بجائے ۲۰۱۲ء کی کو دہائی پہنچے جاؤں گا۔ اُسی شب کو ریڈیو کا مشاعرہ ہے اور مجھے بھی مدعو کیا ہے مشاعرے میں پڑھنے کے لئے کوئی غزل انتخاب کر رکھئے۔ کل یہاں بھی بارش ہوئی اور سردی سہرچک گئی۔ نہ معلوم کیوں آنکھوں کے مضمون کا ایک شعر یاد آگیا خالص ہندی ماہنامہ ستانی زبان میں ہے۔  
 اُمرت بھری آنکھوں میں نہ بھر آنکھ کی پتیلی  
 نہ دھسا ہے کہ گارے پانگھٹ پہ کھڑی ہے  
 مطلع بھی یاد آگیا ہے

نہینے پہ ملامت ہے تو رونے پہ ہنسی ہے  
 کس شوخ ستھکا رہے آنکھ اپنی ٹہری ہے

ساتی میں جو مضمون شائع ہوا ہے اُس میں فراق کے بعض اشعار کی اصلاحیں ملاحظہ فرمائیے:-

شعر فراق ہے	جو ہونٹوں تک ترے محو و رہتی ہے سحر ہوتے	افق پر دور تک وہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے
اصلاح آخر ہے	سحر ہوتے جو ہونٹوں پر ترے رہ رہ کے آتی ہے	افق پر دور تک وہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے
شعر فراق ہے	یہ نغمے اپنے آپ اُٹھتے ہیں سازِ قلب سے جس دم	رنگِ غم کو شعاعِ غیب کوئی چھوڑی جاتی ہے
اصلاح ہے	اُبل پڑتے ہیں نغمے فاختانہ ساز سے دل کے	رنگِ غم کو شعاعِ غیب جس دم گدگداتی ہے
شعر فراق ہے	ہزاروں رنگ پیدا کئے ہزاروں رازِ پنہاں کے	چمن کھل جاتے ہیں وہ آنکھ جب مسکراتی ہے
اصلاح ہے	ہزار اندھ ہزار اسرارِ پنہاں و مہوید اسکے	چمن کھل جاتے ہیں جب آنکھ تیری مسکراتی ہے
شعر فراق ہے	تو یاد آئے ترا جو دستم بالکل نہ یاد آئے	قصود میں یہ معصومی بڑی مشکل سے آتی ہے
اصلاح ہے	” ” ”	محبت میں ” ” ”
شعر فراق ہے	دونوں میں آرزو کی کائناتیں جاگ اُٹھتی ہیں	نگاہِ ناز کی پہلی کرن جب گمنما تھی ہے
اصلاح ہے	تکا کرتی ہیں کیا کیا پیار سے ترسی تمنا تیں	نگاہِ ناز کی پہلی کرن جب رسمِ ساتی ہے
شعر فراق ہے	ازل کی صبح سے ہم کو ہم آہنگی ہے فطرت سے	دلِ شاعر جو بیچے نبضِ فطرت ڈوب جاتی ہے
اصلاح ہے	ازل سے ہم میں اور فطرت میں باہم ہے ہم آہنگی	دلِ شاعر جو ڈوبے نبضِ فطرت چھوٹ جاتی ہے
شعر فراق ہے	محبت آنکھ جھپکاتی ہے پائیں غم کی بھاری ہیں	بہت جاگا ہوں اے شامِ فراق اب نیند آتی ہے
اصلاح ہے	محبت آنکھ جھپکاتی ہے پائیں غم کی بھاری ہیں	بہت جاگا ہوں اے صبحِ فراق اب نیند آتی ہے

ابھی نہ معلوم اور کتنی اصلاحیں ہیں۔ صحت وہ اشعار لے ہیں جو فراق صاحب کے مایہ ناز سمجھ کر پیش کئے گئے تھے اور اس دعوے کے ساتھ کہ ان کی نظیر کسی شاعرِ ماہی کے کلام میں نہیں ملتی۔

۱۲ فروری ۲۰۱۳ء

پیارے سبائی فاروقی - شدید انتظار کے بعد آپ کا خط ملا۔ سلسلہ جواب عرض کرتا ہوں۔ ”اتنا آخر تو دیر سے یوں ہی تھا“

اس کا مصرع ثانی یوں کیسا ہو؟ "تو تلواد میں نکلیں بہاد آشنائی"۔ آگے آپ جانیں اور آپ کا کام جانے۔ میرا مطلع سنا کر وہ شراب کے منہ چھپاتا ہے۔ دل خراب کی بتیا بیاں بڑھاتا ہے۔ سنا کر یقیناً ہے جان ٹکڑا ہے۔ اس کی جگہ "میں جانتا تھا کہ شراب کے منہ چھپاتا ہے"۔ ہو سکتا ہے مگر شعر بجا بجا سا ہی رہتا ہے بیاض میں قلمزد کرد یا بھی حشر قمر سے مطلع کا بھی ہوا ہے۔

آگے زبیت کبھی اُس پر آئینہ نہ ہوا خیال عیش دو روزہ جسے لہجاتا ہے میں آپ کا ہم نوا نہیں ہو سکتا۔ آئینہ نہ ہوا کی جگہ آئینہ ہو جائے کہنے سے شعر کی آفاقیت فنا ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں ایسے شخص سے بہرہ دہی اور اس کی اصلاح کا خیال ہے سود ہے، شعر سن کر خود ہی چمکے تو دوسری بات ہے۔ دوبارہ غور فرمائیے۔

تپکتے کو آپ نے مصدر لکھا تھا۔ اس سے میں نے عرض کیا کہ مصدر نہیں فعل ہے۔ تعجب ہے کہ دہلی میں یہ لفظ لکھ نہیں دیکھتی۔ میں درج ہے اور اس ڈکشنری کی بنیاد دہلی کی زبان ہے۔ صاحب فرنگ آصفیہ اس کی ترتیب میں شریک کار تھے۔ فیلن کی عبارت یہ ہے۔

تپک = *throb and palpitation*۔ تپنا کا مضبوط دھوپ یا گرمی تک محدود ہے یا پھر مجازاً ہے مدفعہ

آگے، پیچ و تاب کھانا ہے۔ فیلن میں اس کے یہ معنی دئے ہیں :- *To be heated, To glow*۔

تپنا = رنگ سے مخصوص ہے، فیلن :- *To glow, to be flushed in the face*۔

کھونا = ہانی یا مزاج سے مخصوص ہے، بقول فیلن :- *To boil, to over-boil, to burn mentally*۔

چلچلاؤ = صحت دھوپ کی تیزی کے لئے آتا ہے۔ فیلن میں یہ لفظ درج نہیں۔ لفظ لغات میں ہے۔

چلچلائی دھوپ = جلتی ہوئی دھوپ، بہت تیز دھوپ۔

چلچلاؤ = چیل کا بولنا، بے فائدہ شور و غوغا کرنا۔

ظاہر ہے کہ چالوں یا آجوں کے ساتھ تپکتا کے سوا یہ کوئی لفظ موضوع نہیں۔ میں آپ سے متفق نہیں کہ تپکتا ٹھٹھا ہوا لفظ ہے۔ اضطراب والہ تپک کے اظہار کو اس سے بہتر آپ کے نقل کردہ الفاظ میں کوئی لفظ نہیں۔ جلال لکھنوی کا شعر ہے :-

جھیر کر خود ہی ٹلاتا ہے ہو آخر کار فیشتر آبدہ دل کی تپک ہوتی ہے

عزیز لکھنوی :- رہ رہ کے میرے دل کا چھالا تپک رہا ہے بجلی چمک رہی ہے کوندا لپک رہا ہے

ہاں ایک اور لفظ تپک ہے۔ پھوٹے کی ٹپس اور کھولنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ۲۳ کو دہلی میں غالب ڈس منایا جا رہا ہے حمیدہ سلطان صاحب نے مجھ سے بھی مدعو کیا ہے۔ مجھ نہیں کہ ۲۳ کے بجائے ۲۴ صبح کو دہلی پہنچے جاؤں۔

نریش کمار شاد صاحب کا شعر خوب ہے :-

دھڑکی گوش بر آواز ہوئی ہے جب سے ہر نفس پر تری آہٹ کا گماں رہتا ہے

بہاراں کے بعد کی ایک غزل میں میرا شعر ہے :-

درا تو بھی توسن، پیچ ہے کہ میرے کان پیچے ہیں قدم کی اُن کے آہٹ ہم نشین معلوم ہوتی ہے

مگر یہ حقیقت ہے کہ شاد صاحب کا شعر بہت بلند ہے۔ غہوم کچھ مٹا جلتا تھا اس سے اپنا شعر درج کر دیا۔ بہاراں کے صفحہ ۱۱۱

دلی غزل کا آپ نے حوالہ دیا ہے۔ اسے بھائی اس میں چند شعر بعد کو موزوں ہو گئے تھے سنئے اور اگر کوئی پسند آئے تو بہاراں میں اضافہ کر لیجئے؛

ایسی بھی کر نہیں پھوٹیں عرفاں کی سرزمین سے خود میں نے اپنے سجدے پھر جن لئے جہیں سے

لے شریک یا س جو مزگاں پہ خمر تھراتا ہے فسادِ ستم آشنا مٹاتا ہے

اسے کاش ایک سجدہ یوں ہوا جیسے سے  
اس آستان کا سجدہ اور بعد اذن سجدہ  
اسرار ماسوا کے آئینہ ہوں تو کیوں کر  
آنکھیں لڑا لڑا کے یہ کون مسکرایا  
مجھے شراب چھلکے لبریز سا لگیں سے  
شرائے کیوں نہ رنگ روئے سحر جیسے سے  
سمجھے گئے ابھی تک خود ہی نہ جب ہمیں سے  
کیوں نے منہ چھپایا شبنم کی آستیں سے

آپ کو یہ شعر پسند آیا ہے

تھا سر نشین بزم سے کچھ دن اُدھر کی بات ہے آج ایک جام کے لئے ترسا کیا، نہیں لا  
یہ بحر میری ایجاد ہے۔ اُردو یا فارسی میں کوئی غزل اس بحر میں موجود نہیں۔

آج آئے کہنے سے تقابل کی اہمیت اور ستانے کے دل شکن دیاس انگیز ستائی کی طنز جو اشارہ ہے ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ  
جس کو اور دوسری جگہ آئے کہنے سے تو یہ صورت بہتر ہے: "نسانا جسے تھا آج آئے"۔ یوں بھی مصرع پچھٹا ہوتا، میں مجبور ہوں۔  
اختلاف ناگزیر ہے۔ اسی طرح یہ ترسیم طبیعت قبول نہیں کرتی کہ ہے  
جنہیں شرم عصیاں نے جائز نہ رکھا وہ سجدے ورق بن کے ٹپکے جیسے سے  
میں جائز نہ رکھا کی جگہ ادا نہ کر پائی ہو۔ جواز سجدہ میں تامل ہونا ادائے سجدہ میں تامل ہونا یا معذوری سے بہتر اور  
قوی تر اسلوب بیان ہے۔

آپ نے صفحہ ۱۱۰ سے شروع ہونے والی غزل ریڑیوں کے مشاعرے میں پڑھنے کے لئے (بالفضل مشروط) تجویز کی ہے۔ اس میں بھی ایک  
شعر کا اضافہ ہے۔

ہوش کی نامحرمی مشہور ہے عشق کا محسوس بناؤں کس طرح

۱۲ فروری ۱۹۵۲ء

ہمارے بھائی فاروقی - بغیر تاریخ کا خط لا۔ پچھلے خطوط کے جوابات دے چکا ہوں امید ہے کہ ملے ہوں گے۔ آپ کی غزل پڑھی۔  
جی خوش ہو گیا۔ پوری غزل مرصع ہے۔ اور ان اشعار کا جواب بھی نہیں:

جلوہ فردا جو ہے مصروف آرائش ابھی چہرہ امروز سے ظاہر ہے اُس کا بانگیں  
فرط غم سے ابھر میں اک آہ بھری تھی کبھی آج تک ہر سانس میں محسوس ہوتی ہے جلیں  
آپ کا اثر

کستری محمد - لکھنؤ - ۲۹ نومبر ۱۹۵۲ء

پیارے نثار - ۲۶ نومبر کا خط لا۔ مسرت ہوئی۔ تیر اس قابل ہے کہ اُس کا اسماعیل نظر سے مطالعہ کیا جائے اور نشاط روح و داغ  
کا وسیلہ بنایا جائے۔ میں نے اُس کا یہ شعر ایک مرتبہ رات بھر گنگنا یا ہے۔ قصور ایک مادی پیکر کی ہے۔ مگر ایک ایسے مادی پیکر کی گویا ایک تانبہ  
ستارہ مجسم ہو گیا۔ سنو اور اپنے تاثرات بیان کر دے

لپٹے کر وٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے شرم سے سرور گر بیاں صبح کے تارے ہوئے

غالب کا یہ شاہ پارہ بھی نہایت قابل قدر ہے

نیز اُس کی ہے داغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہی جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

لے مجھے یاد پڑتا ہے کہ دو سو مصرعے یوں ہے:- "زری زلفیں میں کے بازو پر پریشاں ہو گئیں۔ دیوان غالب (ظہار طبع) میں بھی یوں ہی ہے۔" شکر

اس میں سکون ہے۔ تیر کے شعر میں تڑپ ہے۔ غالب کو اپنے اود تیر کے درمیان حد فاصل بنا کر اپنا بھی ایک شعر سنانے کو دل چاہتا ہے۔ معلوم پہلے نہیں لکھ چکا ہوں کہ نہیں۔

اُس کا عالم؟ اُس کا عالم اتم نے دیکھا ہے کبھی؟ وہ ستارہ جو "حرفِ افشاں" سراپا ہو گیا!  
تیر کے بعض اشعار پر اپنے تاثرات قلمبند کر دو، یہی مضمون ہو جائے گا۔ اُس پر کتنا ہی لکھتے چلے جاؤ، معلوم ہو گا کہ کچھ نہیں لکھا۔ ادھر مرض کی تکلیف پھر بڑھ گئی تھی۔ اب اچھا ہوں۔ زیادہ دعا۔  
کشمیری محلہ۔ لکھنؤ۔ ۱۷ مئی ۱۹۵۵ء

عزیزی سلمہ - تمہارا خط ملا۔ میں تم سے خفا نہیں بلکہ تمہارے خط کا منتظر تھا۔۔۔ تمہارے استفسارات کا جواب مرسل ہے کسی رسالہ میں تمہارا مکالمہ دل و دماغ و ضمیر کے متعلق پڑھا تھا۔ بہت پسند آیا۔ کش اُس میں وہ جملہ نہ ہوتا جو خالق پر ہے۔ میرے مرض نے مستقل و دورت اختیار کر لی ہے۔ صرف اتنا ہے کہ تکلیف کبھی کم ہو جاتی ہے کبھی بڑھ جاتی ہے۔ خدا کرے تم خیریت سے ہو۔  
مذرمہ مکتوب میں استفسارات کا اشارہ ہے، میں نے اپنے ایک زیر ترتیب مضمون کے لئے بعض الفاظ کے اطلاق پر بحث کرنے کو ان کا صحیح اطلاق حضرت آثر سے معلوم کیا تھا ان میں سے بعض الفاظ یہ ہیں:- موقع - موقعہ - ٹھہرنا، ٹھہرنا - دہری، دہری - ہندستان، ہندوستان - پردا - پردہ - وغیرہ - حضرت آثر نے ان میں پہلے اطلاق کو صحیح بتایا۔ پردا، مزا، وغیرہ الفاظ کے لئے یہ حکم ہوا کہ بغیر عطف و اضافت کے پردا و پردہ - یہی حال مزا کا ہے غالباً اور الفاظ بھی ملیں۔

کشمیری محلہ۔ لکھنؤ۔ ۲۵ مئی ۱۹۵۵ء

پیارے نثار - تمہارا کارڈ اور لفافہ دونوں ایک ساتھ ملے۔۔۔ میں نے تمہارا مضمون پڑھ لیا ہے۔ خوب ہے کہیں کہیں بعض الفاظ کی رد و بدل کر دی ہے۔ تیر کا شاعری میں سید سعادت علی احمد وہی کا شاگرد ہونا ایک پادہ ہوا افسانہ ہے۔ ذکر تیر میں صفحہ ۶۷ پر جس نے یہ مرغی قائم کی ہے "ریختے میں، سید سعادت علی کی شاگردی" غلط قائم کی ہے۔ متن کتاب سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا۔ یہ خود علی کے معنی شاگرد شدن نہ اردو میں ہیں نہ فارسی میں۔ اصل عبارت یہ ہے:-

"بعد از چندے با سعادت علی نام سیدے کہ از امر وہ بود بر خور دم۔ آن عزیز مرا تکلیف موزوں کردن ریختہ کہ شعریت بطور شعر فارسی بزیان آوردے معنی بادشاہ ہندوستان و دراز وقت رواج داشت کرد۔ خود کشی کردم و مشق خود بر تیر رساندم کہ موزونان شہرا مستند شدم، شعر من در تمام شہر دیر و بگوش خورد و بزرگ رسید۔"

بر خور دم کے معنی ہیں ملاقات ہوئی، شناسائی ہوئی اور صحبت موافق آئی اور ان کے کہنے سے میں نے اشعار ریختہ کہنا شروع کیا۔ اسی صفحہ ۷۷ کی آخری سطریں بر خور د پھر صرف ہوا ہے۔ جلد یہ ہے:- "نتم و دیدم آدمیانہ بر خور و با خود نفیم کرد" وہی صحبت کا موافق مزاج ہوتا یہاں بھی ہوا ہے۔ بہار گج میں بر خور دن کے جو معنی صبح ہیں وہ بھی میری تائید کرتے ہیں۔

بر خور دن ہا کہے۔ ملاقات کردن و دو چار شدن و پیوستن و رسیدن ہوتے۔۔۔۔۔ میرزا صاحب سے

جہاں تازہ می شود لب روح پروردت ہر کس کہ بر خور د بتو از عمر بر خور د  
ہر کس دعا کند با جابت قرین شود در ہر کجا بیکدگر احباب بر خور د  
اگر بوی خوش گرام بر خور د شود کہ شعلہ نیز بتعظیم خار بر خور د

میرزا ایک مکالمہ جس کے کردار سب Abstract noun تھے۔ "ضمیمہ دار گما" کے عنوان سے رسالہ ساقی کراچی، اپریل ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا ہے۔ خاتمہ کا جملہ یہ تھا:- "میری ایک افلاکی موت کا ذکر ہے!"

(۲) صائب کے پہلے شعر میں) ہر بمعنی پھیل ہے اور بر خوردن از چیزے کے معنی ہیں پھیل کھانا یعنی فائدہ اٹھانا۔ منتفع ہونا۔ تیر کی عبارت میں بر خوردن از چیزے کا مفہوم نہیں ہے۔ بلکہ بر خوردن ایکے ہے۔ صائب کے شعر زیر نظر میں دونوں محاورے آگے ہیں۔ اس طرح اُس کے آخری شعر میں جو پشت پر (آگے) درج ہے۔ دونوں محاورے آگے ہیں۔ بر خوردن بمعنی منتفع شدن فارسی کے اس مشہور شعر میں بھی ہے :-  
خوشا روزے و خرم روزگارے      کہ یارے بر خورد از وصل یارے

میں بھی ہے :- خوشا روزے و خرم روز گارے      گر یارے بر خورد از وصل یارے  
 وڑے      از تو تا دوریم از ما دور می گردد حیات      با تو چون بر می خوریم از زندگی بر می خوریم  
 محسن تاثیرے      بر خورد امروز گرم با من ،      این فیض زلفش و نیشش بود

میر صاحب نے اپنے تذکرے نکات الشعراء میں انھیں سعادت علی کا حال رقم کہا ہے۔ کہیں شاگردی کا شائبہ بھی نہیں۔ عبارت یہ ہے:-  
 ”میاں سعادت علی از سادات امروزہ بود۔ مردے سلیم الطبع ، کم سخن ، تواضع ، سعادت تخلص می کرد۔ فی الجملہ چاشنی درویشی داشت۔  
 شعرا و خالی از لطف نیست۔ بانیچہ ربط بسیار داشت۔“

وہی "برخوردوم" یہاں "بازندہ ربط بسیار داشت" ہے۔ کیا شاگرد اپنے استاد کے متعلق ایسی ہی عبارت لکھے گا۔ الغرض تیسرے شاگرد کی شاعرانہ سعادتمندی اور وہی افسانہ ایست و افسوں۔ اس کی کوئی شہادت موجود نہیں اور اس کی بنیاد برخوردوم کے صحیح معنی نہ سمجھنا ہے۔۔۔۔۔ تمہارے چچا صاحب نے تیرے ایک شعر کے متعلق بعض استفسارات کئے تھے جن کا میں نے جواب دیا تھا۔ اسی مراسلت کا ذکر انھوں نے کیا ہوگا۔

منہدم مکتوب میں سید سعادت علی کا ذکر آیا ہے ان نذر گوؤار کے بارے میں اشارتاً پہلے لکھ چکا ہوں۔ برغور دکن کے معنی فی الواقعہ صحیح نہ سمجھے گئے اور میری طرح دوسرے ترجمہ نگاروں کو بھی دھوکا کھانا پڑا۔ اور میر کی اس عبارت کے شاہد ہونے پر بھی مولانا قسماً علی عرشی، جناب قاضی عبدالودود، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی جیسے مستند ناقدوں اور محققوں کی رائے بھی حضرت اثر کی تائید میں ہے کہ تیسرے خان آرزو کی بدسلوکیوں کو منہ چڑانے کے لئے سید سعادت علی اور میر جعفر عظیم آبادی کو ایسے ہی گھڑ لیا ہے جیسے غالب نے "ہے استاد" کی کجیجی سے بچنے کو لاہور احمد کی تخلیق کر لی تھی۔ ان حضرات کے سامنے میری ناقص رائے کیا وقعت رکھے گی! مگر دینی زبان سے اتنا عرض کر دیا کہ "آں عزیز مرا تکلیف موزوں کردان ریختہ۔۔۔۔۔ کرد" کا مطلب اب بھی باقی رہ گیا "تکلیف موزوں کردان" کے معنی بھی اردو فارسی میں محض ترغیب دینے کے نہیں آتے۔ اور میں پوچھوں گا کہ کیا سید سعادت علی کی شاگردی کوئی ایسا ہی بدعا و باغ ہے جسے تیسرے دامن سے ضرور دھویا جائے؟ میری رائے ابھی تک یہی ہے کہ خان آرزو ریختہ کے کچھ بہت اچھے شاعر نہیں تھے، ہاں فارسی کے زبردست عالم اور شاعر تھے۔ تیسرے خان آرزو سے ضرور سیکھی ہے اور عین ممکن ہے کہ اپنا فارسی کلام جو انھوں نے ابتدا میں راجہ دان کے پیش نظر کہا تھا، خان آرزو کے سامنے ہی اصلاح کے لئے پیش کیا ہو ان کا فارسی کلام ڈاکٹر ابوالعین صدیقی کی دریافت سے کسی رسالہ میں چھپا تھا۔ بعد کو ڈاکٹر خواجہ احمد صاحب فاروقی کی معرکہ آرا تصنیف "میر تقی میر" (صفحہ ۴۰-۴۱) سے معلوم ہوا کہ میرنگہ رامپور کے تیسر نمبر (۱۸۶۸) میں جناب عزیز لکھنوی نے میر کے فارسی کلام سے معارف کرایا تھا۔ بہر کیف یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ لیکن یہ ہمیشہ ہوتی آئی ہے کہ ابتدائے مشق و موزونی کے زمانہ میں اگر کسی کتر آدمی سے استفادہ کیا ہو تو بلند مرتبہ ہونے کے بعد اس شخص کو چھپایا جاتا ہے۔ خود میاں مصطفیٰ اپنے استاد کا نام نہیں بتاتے۔ حد ہے کہ لکھنؤ میں بیٹھ کر محض اس ڈرسے کہ لوگ مجھے اہل زبان نہ سمجھیں گے خود کو امروہہ کا نہیں کہتے آئیں بائیں شائیں کرتے تھے۔ عبدالقادر رامپوری سے کہہ دیا کہ میں تم گڑھ کا باشندہ ہوں جو دہلی کے قریب ہے، اشعار میں، "دلی کہیں ہیں جس کو دانہ من مصطفیٰ" میں رہنے والا ہوں اسی اُجڑے دیار کا" باندھ دیا۔ کسی سے اگر پور متصل دہلی کہہ دیا۔ وہ یہی نفسیاتی کمزوری ہے کہ میاں آقا ("سلا سخن" کے مطبوعہ نسخوں میں آقا کی لکھا گیا ہے لیکن نقلی نسخوں میں ہر جگہ آقا لے گا) بے چارے کون سے ایسے بڑے استاد تھے کہ مصطفیٰ ان سے ورثہ تمذناظر کر کے سرخ رو ہو جاتے اور

فی و کھنڈ کے مقابلہ میں اوروہ زبان کی سذکب تھا کہ اُسے اپنا وطن کہکمر سر افتخار بلند کر لیتے !  
تمام تذکروں میں سعادت کا مختصر ترجمہ ملتا ہے اور ہر جگہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے ”اقربان و اشغال میں امتیاز تمام رکھتے تھے۔ اُن کے  
رزن و اشغال میں ایذا غیر تھوڑی تھی، آبرو، ناجی، یک رنگ، ضاحک، آرزو، ان استادوں کی ٹولی تھی اور اُن میں سعادت کو عزت  
انظر سے دیکھا جاتا تھا، اُن کے کلام کو رواج زمانہ کے مطابق ایہام کے رنگ میں بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ آج اگر ذہنوں سے سعادت کا نام  
رہو گیا، اور اُن کی شاعری صفحہ ہستی سے ختم ہو گئی کہ اُس میں زوہ جاوید ہو جانے کے آثار نہ تھے اور زمانے کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہ تھی  
لیا اس کا یہ مطلب بھی ہو گا کہ وہ اپنے دور میں بھی گئے گزرے رہے ہوں گے ؟

## اعتبارات

کسی شہر میں ایک بادشاہ تھا بڑا صاحب اقتدار اور غیر معمولی عقل و فراست رکھنے والا۔ اس شہر کے وسط میں ایک کنواں  
تھا جس کے صاف و شہر میں پانی سے شاہ و وزیر اور تمام شہر والے فائدہ اُٹھاتے تھے کیونکہ وہاں صرف یہی ایک کنواں تھا۔  
ایک رات ساری بستی سو رہی تھی کہ کوئی ساحرہ چپکے سے آئی اور کنویں کے اندر سات قطرے کسی دوا کے ڈال کر بولی کہ ”جو شخص  
اس کنویں کا پانی پئے گا دیوانہ ہو جائے گا۔“ صبح ہوئی سب نے حسب معمول اس کنویں کا پانی پیا اور ساحرہ کے قول کے مطابق  
سب دیوانے ہو گئے۔ لیکن بادشاہ اور اس کے وزیر نے پانی نہ پیا۔  
جب یہ خبر شہر والوں کو معلوم ہوئی تو وہ ہر ہر گلی میں دیوانہ دار پھریں گے کہ ”ہمارا بادشاہ اور وزیر دیوانے  
ہیں ان میں اب حکومت کی اہلیت باقی نہیں رہی، اس لئے ہمیں چاہئے کہ ان کو معزول کر دیں۔“  
شام کو جب یہ خبر بادشاہ کے کانوں تک پہنچی تو اس نے حکم دیا کہ اُس کنویں کا پانی لایا جائے۔ چنانچہ ایک کاسہ زر میں وہ  
پانی لایا گیا۔ بادشاہ نے پانی لے کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور جو پانی بچا تھا وہ وزیر کو پلا دیا۔  
شہر کی تمام آبادی مسرور ہے کہ ہمارا بادشاہ رہ راست پر آگیا اور اب وہ ہم پر حکومت کرنے کا اہل ہے۔

گزشتہ رات میں نے قدیم خیال کے دو عالم دیکھے جن میں سے ہر ایک دوسرے کی تحقیر کرتا تھا۔ ان میں سے پہلا کافر تھا اور  
دوسرا مومن۔

ایک بار یہ دونوں شہر میں جمع ہوئے اور اپنے اپنے انصار کے سامنے خدا کے وجود و عدم وجود پر جنگ کرنے لگے۔ جب  
مسلح گھنٹوں تک لڑتے رہنے کے بعد وہ تھک گئے تو ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی راہ لی۔

اسی دن شام کو وہ کافر ہیکل میں گیا اور قرآن نگاہ کے سامنے اپنی دیوی کے حضور میں اپنے تمام گناہوں سے تائب ہو کر  
مومن ہو گیا۔

اسی وقت اس مومن عالم نے اپنی کتاب مقدس کی غلط تعلیم پیش کر کے لوگوں کو یہ یقین دلایا کہ اس کا مذہب ہر درجہ  
”تنگ نظر ہے اور کافرو زندقہ میں ہو گیا۔“

# حالی اور شبلی

(سوانح نگار کی حیثیت سے)

(ڈاکٹر سید شاہ علی)

اردو میں باقاعدہ سوانح نگاری کا آغاز مغربی خیالات کے اثر کا نتیجہ ہے، جس کے علمبردار اردو کے دو بہترین ادیب حالی اور شبلی ہیں۔ حالی اور شبلی کے سوانحی تصانیف کے دیباچہ میں ان مغربی اثرات کے شاہد ہیں۔ خصوصاً اس نئی ڈگر کا سہرا مولانا حالی کے سر ہے۔ بطور پرفیسر سرگودھا انھوں نے سب سے پہلے جدید اردو سوانح نگاری کو تذکرہ کی روش سے آزاد کیا۔ ان کی حمایت سعدی کا دیباچہ گوڑا اردو سوانح نگاری کا منشور (Manifesto) ہے۔ اس میں انھوں نے یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں کے یہاں سوانح نگاری کی ابتداء و ارتقاء اور ازمائے وسطیٰ میں عیسائیوں کے اولیا و شہداء اور مجتہدین کے تذکروں کی طرف اشارہ کر کے ستر سوئس صدی سے انگلستان میں اسکا ابتدا اور ترقی اور انیسویں صدی میں کئی کئی جلدوں میں مشامیر کی حیات اور کارناموں پر روشنی ڈالتے اور سوانح نگاری کے بھی نام پر کی طرح لٹیف کی شکل اختیار کر لینے کا ذکر کیا ہے۔ مشرقی سوانح نگاری میں حالی نے سواراجال اور حدیث کے اوروں کے حال میں درایت پر عمل نہ ہونے، نیز عربی فارسی میں سوانح نگاری کی شخصیتوں مثلاً سلاطین، وزراء، امراء وغیرہ کے کسی اہل کمال کی کوئی مستقل سوانح عمری نہ ہونے کا اعتراف کیا ہے اور پھر سوانح نگاری کے اخلاقی فائدوں اور اس کے علم الاخلاق سے مقابلہ وغیرہ کے بعد اس کی یاد نگاری خصوصاً پر زور دیا ہے۔ شبلی نے بھی اسی انداز پر اپنی تصانیف خصوصاً دیباچوں میں اشارے کئے ہیں اور حالی کے اشارات کی مزید صراحت اور وضاحت کی کوشش کی ہے اور اپنے زمانہ کے اثرات کو اجاگر کیا ہے چنانچہ ان دونوں مصنفوں کے یہاں اپنے زمانہ کے برے اور بھلے دونوں طرح کے اثرات اور رجحانات پائے جاتے ہیں جن پر آگے چل کر خود کہا جائے گا۔ ہم یکے بعد دیگرے حالی اور شبلی کی تصانیف کا جائزہ لیں گے اور دیکھیں گے کہ یہ تصانیف کہاں تک سوانحی معیار پر پوری اُمتی ہیں۔

جہاں تک حالی کے موضوعات کا تعلق ہے، حالی کے تینوں موضوعات اہم اور مشہور شخصیتیں ہیں جن میں سے دو ادیب اور شاعر ہیں اور ایک مصلح، دوم عصر ہیں اور ایک قدیم۔ اردو کو مستقل اور باقاعدہ سوانح عمریوں سے روشناس کرائے ہوئے شاید حالی کو بہت کم قویا نہیں ہوتی کہ وہ کسی غیر مشہور شخصیت کو اپنا موضوع بنائے، گو حالی کی سیرت و کردار کے مد نظر یہ زیادہ قرین قیاس اور مناسب ہوتا کہ وہ اپنا موضوع طرح کے ایک بزرگ دل اور عافیت پسند انسان کی داستان حیات قلم بند کرتے۔ لیکن حالی سے شاید اس کی توقع قبل از وقت تھی بلکہ اہم اور غیر اہم موضوع کے مسئلہ کو زمانہ حال ہی میں خاطر خواہ اہمیت حاصل ہوئی ہے اور آج بھی یہ ایک حد تک معرض بحث میں ایسویں صدی میں باشتنائے چند مغرب کو بھی اس کی نوعیت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ وہاں کی کچھلی سوانح عمریاں جانسن کی حیات ساموئل (Samuel) اور کلاہل کی حیات اسٹرلنگ (Sterling) ممکن ہے ایک دوست کی دوسرے دوست کو نذر عقیدت کا نمونہ ہوں یا ذاتی پسند کا نتیجہ۔ اور لیکن والدوں کے ذہن میں خود بھی اس کا واضح احساس و شعور نہ ہو کہ وہ ایک بالکل نئی شاہدہ کی طرح

یہ تنقید کیا ہے، از ازل احمد سرور مضمون یادگار حالی۔

ڈیکل رہے ہیں۔ یہ رجحان وہاں قومی سوانحی ڈکشنری (Dictionary of National Biography) کی اشاعت کے بعد خاص کر قومی اور نمایاں ہوا اور اس ڈکشنری کے کم مشہور موضوعات کی روز افزوں مقبولیت نے اسے اور تقویت بخشی، گو اس ڈکشنری میں بھی ان کے انتخاب میں کسی نہ کسی شعبہ میں امتیاز کو مد نظر رکھا گیا ہے۔

غیر اہم موضوعات پر طبع آزمائی تو دور کی چیز ہے، اہم شخصیتوں کو اپنا موضوع تصنیف بناتے ہوئے بھی حافی کو معذرت کرنی پڑی ہے۔ چنانچہ حیات سعدی کے دیباچے میں انھوں نے سوانح نگاری کے فوائد اور اچھے اثرات گنائے ہیں اور دوسرے ملکوں کی مثالیں پیش کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح وہاں اپنے مشاہیر کے سوانح حیات سے ترقی کا سبق لیا گیا۔ اس ضمن میں انھوں نے مشہور جرمن مصنف عیسائیت مارٹن لوتھر اور امریکی سائنس دان بن جابر فرانکلن کا نام بھی لیا ہے۔ یادگار غالب میں انھیں اس کا احساں ہوا ہے کہ ان کے موضوع کی حیات میں سوانح شاعری کے کوئی مہتمم بالشان واقعہ نہیں ہوا ہے کہ ان کے موضوع کی حیات میں سوانح شاعری کے کوئی مہتمم بالشان واقعہ نہیں ہوا ہے جو براہ راست قوم و ملک کے لئے کارآمد ہو سکے، البتہ مخالف حالات میں اس کی زندہ دلی اور شگفتگی، اپنی پڑمردہ سوسائٹی کے لئے مفید نظر آتی ہے اور اس عالی فطرت انسان کے کارناموں کی چھان بین اور نادر افکار سے استفادہ قوم کے لئے ضروری معلوم ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی ایک اندیشہ ان کے دل میں گھسکتا رہا ہے اور خاتمے پر انھوں نے اس امتیاز کا سہارا لیا ہے کہ اگرچہ افادی نقطہ نظر سے اس سوانح عمری کو اس عہد کی ضروریات میں شمار نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کی تصنیف پر ان کو عقیدت کی اس اندھی اور بہری دیوی نے مجبور کیا ہے جس کی زبردستی اور حکومت کے آگے مدد ملتی اندیشی کے پرہیز ہیں۔۔۔۔۔ اور یہ کتاب ان کے مرزا سے تعلق بدشعور یا معتقدانہ جوش عصبیت یا ایقان گمانی مرزا کا نتیجہ ہے اور اتنے سائے طبیعت کی وجہ سے لکھی گئی ہے۔ حافی کے سوانحی شعور اور تصور کی یہ عمدہ مثال ہے کہ انھوں نے حیات جاوید کے مسئلے میں کسی عذر کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ اس کے برعکس وہ اسے سرسید کا احسان مانتے ہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بیش بہا نمونہ قوم کے لئے چھوڑا۔ بلکہ اس کی شکایت کرتے ہیں کہ ملک کے اخباروں نے ”حیات جاوید“ کی اشاعت کی قدر نہیں کی اور اس کا فوٹس نہیں لیا۔ البتہ ان کے تینوں موضوعات میں ان کا ذہنی نقطہ نظر معلوم ہوتا ہے۔

حافی کے موضوع ان تینوں شرائط کو بھی پورے کرتے ہیں، جن کو سرسڈنی لی (Sis Smylee) نے اصطلاحی المبیہ کی تعریف سے سوانحی موضوع کے لئے اپنا اٹھا تھا، یعنی عظمت، سنجیدگی اور تکمیل۔ حافی کے تینوں سوانحی موضوعوں کی عظمت پر ان کی زندگی کے بعد بھی کوئی حرج نہیں آیا۔ اپنے اپنے دائرہ عمل میں ان کی استعداد، سنجیدہ کوششوں کے متعلق بھی کسی کو کوئی شبہ نہیں ہے۔ یہ ہے کہ اس کے بغیر حقیقی اور پائدار عظمت حاصل بھی نہیں ہوتی۔ تکمیل کے متعلق یہ کہ تاریخ تصنیف تک سعدی کی وفات کو صدیاں بیت چکی تھیں، غالب کے انتہا ال کو بھی ربع صدی گزر چکی تھی، سرسید کی سوانح عمری البتہ ان کی حیات ہی میں شروع کی گئی تھی لیکن اس کے ختم ہونے کے تین سال قبل وہ بھی موت سے ہم کنار ہو چکے تھے۔ لہذا تینوں موضوعات کے معاملہ میں سوانح نگار کو ٹھنڈے دل اور ہارچی نقطہ نظر سے ان کے حالات کا مطالعہ کرنے اور ان کو جانچنے کا موقع ملا تھا۔

اُردو کے پہلے سوانح نگار کا سوانحی مواد بھی اول درجہ کا ہے۔ ظاہر ہے کہ صدیوں بعد ”سعدی“ کے خطوط خود نوشتہ حالات یا انکی گفتگو کا یہ جلا نامحال تھا، خصوصاً اس حال میں کہ فارسی میں بھی سعدی کی کوئی مستقل سوانح عمری موجود نہ تھی، حافی نے ان کی شہرت و مقبولیت کے مد نظر ان کی حیات قلم بند کرنے کا ارادہ تو کر لیا مگر مواد کی کمی اور انھیں سخت مایوسی ہوئی۔ یہ انھیں کی ہمت اور صلاحیت تھی کہ ان حالات میں سیرت کی تدوین کو نا ممکن سمجھ کر بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور مختلف جگہوں سے خوشہ چینی کر کے ایک ایسی

عہدہ سوانح عمری مرتب کی کہ مولانا شبلی جیسے کڑے نقاد کو بھی بے ساختہ داد دینی پڑی کہ یہ ایک دلچسپ محققانہ اور بے مثل سوانح عمری ہے۔  
 کو متعدد فارسی تاریخی اور تذکروں سے اکثر باتوں کا سراغ لگانے اور حکایات سعدی کی مختلف اشاعتوں کے دیباچوں اور سرگور آؤلی،  
 انگریزی تذکرہ شعرائے ایران (اس میں بھی سعدی کے حال میں بے قدرے تفادوت عام طور پر مروجہ نقل و حکایات اور تصنیفات کی اچھا  
 تعریف کے سوا ان کی واقعی خوبیوں اور عظمت کا ذکر نہ تھا) کے ناتمام اور غیر مستند حالات اور روایات کی درایت، صحیح اور معقول باتوں،  
 اخذ و انتخاب کے علاوہ بعض حالات خود شیخ کے کلام سے استنباط کرنے پڑے۔ کبلی کے سے ذہین مصنف کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ ”جب تک  
 کافی مواد تحریری نہ ہو میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں۔ ان کی دقیقہ رس اور نکتہ منجہ طبعہ  
 ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے، جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور یہ کمال اجتہاد کی دلیل ہے۔“

یادگار غالب میں حالی نے اپنی ذاتی واقفیت اور غالب کے دوستوں اور رشتہ داروں وغیرہ کی معلومات سے ان کے حالات اور اخلا  
 و عادات کا سراغ لگا ہے علاوہ ان کی تصانیف کو اکٹھا کر کے ان سے بھی ان کے حالات اخذ کئے ہیں۔ ان کی تاریخ ولادت، خاندان،  
 اصل و گور، سلسلہ نسب، بچپن، عفتوان، شباب، شادی وغیرہ کا حال انھیں تحریروں اور خطوں سے نقل کیا ہے۔ خصوصاً ان کے گویا  
 بدلتے ہوئے اور مکالموں سے بھرے ہوئے اور دیگر نجی خطوط، ان کے لطائف و ظرائف، چٹکوں اور گفتگو کی قسم کے خود نوشتہ مواد کے استعنا  
 سے وہ کام لیا ہے کہ یادگار غالب کو ان کی اور اردو ادب کی مقبول ترین تصنیفات کی صف اول میں جگہ مل گئی ہے۔ چونکہ غالب کے کلام نظم  
 میں بھی داخلیت کا عنصر غالب تھا، حالی نے ان کی تصنیفات سے اقتباسات کے علاوہ ان کے کلام کے انتخاب اور اس کی تشریح سے ان  
 کردار کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے اشعار ان کی دلی کیفیات کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کی بعض خصوصیات مثلاً نفوذ  
 اور عظمت و امتیاز کے احساس بتدل عامیانہ اور سوقیانہ الفاظ اور باتوں سے نفرت دنیا سے بے زاری انہائے زان کی شکایت کو بار بار  
 جھلکاتے ہیں۔

چونکہ حالی اور سرسید کا طویل ساتھ رہا اور ان کی معلومات کے ذرائع بھی وسیع تھے، حیات جاوید میں انھوں نے یادگار غالب سے ہم  
 وسیع تھے، حیات جاوید میں انھوں نے یادگار غالب سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر اپنے سوانحی مواد کے اخذ کی تقسیم کی ہے۔ چنانچہ ان کے  
 خاندان، بچپن، تعلیم و تربیت اور قدر کے پہلے کے حالات بعض رشتہ داروں، غلام نبی خاں کے فریشتی رسالے، سیرت فریدیہ اور خود سرسید  
 کی اول تاخراستہ مدد سے اور قدر کے بعد کے حالات جو زیادہ نمایاں ہیں اس سے زیادہ مفصل اور مستند ذرائع سے مثلاً علی گڑھ گزٹ  
 تہذیب الاخلاق، سرسید کی تصانیف، خطوط، سرکاری رپورٹوں، انگریزی اخباروں، ان کے دوست احباب اور مدیران سلطنت کا  
 تحریروں اور بعض دیگر معتبر مقامات سے، بڑی محنت سے جمع کئے ہیں۔ اپنے تینوں موضوعوں میں حالی سب سے زیادہ انھیں سے واقف  
 ہذا مواد کی کوئی کمی نہ تھی، البتہ مناسب اور متعلقہ مواد کا اخذ اور انتخاب ضروری تھا، جس کا ذکر آگے آئے گا۔

اب رہی یہ بحث کہ حالی نے اپنی سوانح عمریوں کے ”بیان“ میں کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے؟ جہاں تک حمایت سعدی  
 ۱۸۸۱ء کا تعلق ہے، ایک حد تک خالص سوانح عمری کا نمونہ ہے اور اس کی بہت سی شرائط پوری کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک  
 ادیب کی حیات اس میں آسانیاں پیدا کرتی ہے۔ دونوں کو اخلاقیات سے دلچسپی تھی اگرچہ سعدی کی تعلیمات زمان و مکان کی قید سے  
 آزاد ہیں اور ان کا طریقہ سائنسی ہے۔ وہ حکایات منطقی دلائل وغیرہ سے کام لیتے ہیں اور حالی کے یہاں سرسید کے اثر کی وجہ سے درود  
 اور دلی سوزش کا احساس ہوتا ہے اور سعدی کے پیرو مشد شاید ان پر اس قدر مادی نہیں تھے جس قدر کہ حالی پر سرسید۔ سعدی کے نا  
 بیان نمایاں گہرائی تھے اور باوجود سلاطین اسلام کی علم و ادب کی سرپرستی کے (جس سے حالی محروم تھے) ان میں عیاشی بھی پیدا ہوئی

تھی۔ حالی کے عہد میں مسلمان حکومت تھے صرف اخلاقی پستی دونوں میں مشترک تھی۔ سعدی دنیا دار تھے اور دنیا سے متمتع ہونے کی تلقین کرتے تھے۔ اس زمانے کے رجحان کے مطابق ان کی تصانیف میں رکاکت پائی جاتی تھی، جس کی رومی کی غنوی سعدی (جسے ۶ ہجرت قرآن در زبان پہلوئی ہانگیا ہے) اور فی مافی میں بھی مثالیں ملتی ہیں۔ حالی کے نئے دروغ مصلحت آمیز کا مشورہ ناقابل عمل ہوتا) سعدی اور حالی دونوں ادیب اور شاعر تھے اور نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ دونوں کی تصانیف کی ضخامت بھی عموماً ایک سی تھی اور دونوں کی شہرت کا دائرہ کار بھی ان کی چھوٹی چھوٹی لیکن عقل و نصیحت اور معلومات کی کان تصانیف پر تھا۔ دونوں کے خیالات و کردار میں کافی حد تک مشابہت پائی جاتی تھی۔ دونوں میں بلند خیالی، دنیا سے بے پروائی، مشاہدہ حیات، طالب علمانہ جذبہ، ذوق سلیم اور میانہ روی وغیرہ کا اثر تھا۔ دونوں کا زمانے کی نبض پر ہاتھ تھا اور دونوں نظم و نثر میں جدید رجحانات کے نقیب تھے۔ دونوں کا طرز اسلوب سلیس و سادہ اور رواں تھا۔ گو سعدی کے ہاں شعریت و فن زیادہ ہے اور حالی کے یہاں ناصحانہ انداز غالب ہے۔ دونوں کے یہاں اختصار، معنویت اور چھوٹے چھوٹے لے ملتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ حالی فارسی شاعری کے دلدادہ تھے۔ نہیں معلوم یہ حالی کی فارسی شاعری سے انتہائی دلچسپی کی وجہ سے تھا یا ان کی فطرت و طبع کے باعث کہ حالی خود کچھ حد تک سعدی کے سانچے میں ڈھل گئے تھے۔ اگر بعض روایتوں پر اعتقاد کیا جائے تو دونوں کی زندگی، علاق و عادات اور کارناموں کے علاوہ ان کی افتاد طبع، ذہل ڈول، قد قامت بلکہ متاثرانہ زندگی تک میں مشابہت نظر آئے گی، لیکن یہ روایتیں بے درایت ہیں۔ یہ روایتیں صحیح ہوتیں تو حالی کے لئے حیات سعدی کو اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنانا غیر سہی ہوتی اور اندر سے مرے کے نظریے کے مطابق وہ اپنے تجربات و محسوسات کی مدد سے بغیر زیادہ اندیشے کے قیاس کو کام میں لاسکتے تھے۔ بر حال حالی اپنی اخلاقی تصانیف کی وجہ سے "سعدی ہند" کہلائے۔ لہذا سعدی کی سوانح عمری لکھنے کا ان سے زیادہ کس کو حق پہنچتا تھا؟ موضوع اور سوانح نگار میں شاذ و مناسبت واقع ہوئی تھی۔ اگر مواد بھی کافی ہوتا تو دنیا کو ایک بہترین سوانح عمری مل جاتی۔ یوں بھی سعدی کی موجودہ سوانح عمریوں میں حالی کی حیات سعدی بہترین سمجھی جاتی ہے۔ پر فیض سرسورد کا خیال ہے کہ ان کا موضوع کا انتخاب عموماً مذہبی، اخلاقی اور قومی نقطہ نظر سے ہوتا تھا اور حالی شخص پرست نہیں اصول پرست تھے، کیونکہ ان کے ماحول پر بھی رنگ چھایا ہوا تھا۔ ہماری رائے اس انتخاب میں ان کی ذاتی پسند ادبی شغف، خیالات اور یادگاری جذبے کا بھی اسی قدر اثر ہے۔ خاص مذہبی یا اخلاقی پہلو نظر ملتا تو بہت سے اثر، ادبیا اور ادبیا اور انبیا موجود تھے، جن کو شہسوار اور مترن نے اپنا موضوع بنایا۔ یہ چیز قابل داد ہے کہ باوجود مغرب سے متاثر ہونے کے سطورام چندریا ہندی اور بلگانی سوانح نگاروں کی طرح انھوں نے مغربی مشاہیر کو اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ ان کی حقیقت پسندی نے اپنے ہمسایہ ملک کے جس سے ہماری زبان اور تہذیب کا گہرا تعلق ہے ایک نامور فرد کو اس اعزاز کے لئے انتخاب کیا۔

یہ البتہ سچ ہے کہ حالی نے جا بجا اخلاقی طریقے پر بھی عمل کیا ہے مثلاً دیباچے میں علم اخلاق اور سوانح نگاری کا موازنہ اور مقابلہ کر کے سوانح نگاری کا موازنہ اور مقابلہ کر کے سوانح نگاری کی برتری اور افادیت دکھائی ہے اور حیات سعدی سے شعر کے لئے بصیرت اور نصیحت حاصل ہونے کا بھی ذکر آیا ہے اور سعدی کے اقوال کی طرح طرح سے تاملیں کرنے کی کوشش کی ہے۔ تصنیفات پر تنقید میں بھی اصلاحی اور اخلاقی نقطہ نظر پر زور دیا ہے مثلاً ہزل گوئی اور غزل وغیرہ کی بحث چھیڑی ہے۔ بہواؤں، بیہودیوں وغیرہ سے متعلق سعدی کے اقوال کو مذہبی پیمانے سے ناپنے کی کوشش کی ہے) اس کے علاوہ ذوال اسلام اور اس کے احباب، شخصی اور قومی آزادی وغیرہ کی بحث میں تاریخی اور سماجی طریق کی جھلک دکھائی ہے جو غلط ہے۔ جہلی اور اگتسابی اثرات کی بحث اور سعدی کے ماحول اور اس کی شخصیت میں معاون عناصر اور فطری صلاحیتوں کے تجزیے پر سامنی طریقہ کار کا رجحان بھی ملتا ہے۔ مگر اس طرح کے مختلف اور سرسری رجحان سے شاید ہی کوئی تصنیف محفوظ ہو! چنانچہ ان کے الگ الگ گلے بنانے شکل ہیں۔ کسی حد تک ان مختلف عناصر کے امتزاج کی بھی ضرورت ہے لیکن سچ ہے کہ مجموعی طور پر حالی نے ایک نئی طریقہ کار پر





کی جانب تھیں، حالی نے ایک مختصر سیرت لکھنے پر اکتفا کی، غالب کی حیات کو ضمنی حیثیت دی اور ان کے کارناموں اور ملک شاعری کی وضاحت پر زیادہ توجہ صرف کی اور بحیثیت سوانح نگار اپنے فراموش کو چوری طرح ادا نہیں کیا۔ حالی نے خود کو ان چار چیزوں تک محدود رکھا ہے۔ جبکہ پہلے میں مرزا کا عجیب و غریب ملک ظاہر ہوتا تھا یعنی نظم و نثر، ظرافت و بذلتی، عشق بازی اور رند شری اور حب الہی بیت ابدہ ہمدی کے کہ ان سے مرزا کی شاعری پر جو توجہ تو ہر دے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے مرتفع ہونے میں مدد ملے گی، لیکن ان میں بھی سوا اول الذکر کے کسی کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔

اس کی ہمیں بغاوت ہے وہ معلوم ہوتی ہے کہ غالب کی عظمت ان کے زمانہ میں عام طور پر مسلم نہ تھی اور نہ ان کے طرز حیات کو لوگ پسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ غالب کی زندگی گویا مذہب اور سماج کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ حالی نے اس معاملہ میں "ابنائے زمان کی فہم" کو مد نظر رکھا ہے اور پیغمبر اسلام کے اس قول پر عمل کیا ہے، "کہ ہر شخص سے اس کی سمجھ کے مطابق بات کیا کرو" حالی کا یہ بھی خیال تھا کہ ابھی نستعلیق سوانح عمری لکھنے کا وقت نہیں آیا۔ حیات حادید کے دیباچے میں انھوں نے اپنی پہلی دو سوانح عمریوں میں اپنے موضوعات کے چھوڑوں کو ٹھیس نہ لگنے دینے اور طبع سازی کا جو ذکر کیا ہے وہ شاید زیادہ تر یادگار غالب ہی سے متعلق ہے اور مشرقی ذہنیت کا غماز ہے۔ چنانچہ 'حالی' نے غالب کے سرسری واقعات نقل کر دئے ہیں جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے رقابت کے موقعوں سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ ورنہ کم سے کم ان کو غالب کی حیات کے بدیہی پہلوؤں پر حرور روشنی ڈالنی چاہئے تھی۔

'حالی' کے اپنے آپ کو زیادہ تر غالب کے ملک شاعری تک محدود کر لینے کی مزید شہادت غالب کے ان اقوال کی نقل سے بھی ملتی ہے جو دیباچے اور متن کتاب میں نظر آتے ہیں اور شاید ایک حد تک ان کا مقصد تصنیف بھی ہیں۔ "حیف کہ ابنائے روزگار حسن گفتار مرانشا غنڈ، مرا خود دل بر آں می سوزد کہ کامیاب شناسائی فرو ایزدی نگشتند و از این نایش ہائے نظر فروز کہ در نظم و نثر بکار بردہ ام سرگراں گزشتند" اور اس خیال کو اردو میں اس طرح ظاہر کیا ہے "میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا کہ ان بادوں برسوں میں اس نے کس قدر معنی کے دروازے مجھ پر کھولے ہیں اور میری فکر کو کس درجے کی بلندی بخشی ہے۔ انصاف کو لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہ سمجھا، اور زیادہ تر افسوس ہے کہ انسان فرو اندی کی شناخت سے محروم رہے۔ اور میری نظم و نثر کے کمرشوں کو آکھ اٹھا کر نہ دیکھا گویا نظیری جنت آرام گاہ کا مقلع میرے حسب حال ہے۔"

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چہ مسیح

باز پس رفتی و کس قدر تو شناخت دریغ

حالی نے بھی اس کا تا سہ کیا ہے۔ حالی سے پہلے آزاد نے آپ حیات میں اپنے استاد ذوق کے کلام کی خوبصورتی کو واضح کرنے کی کوشش کی تھی، حالانکہ ذوق کو غالب سے کوئی نسبت نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یادگار غالب کی تصنیف کی تحریک میں ابجیات کو بھی دخل ہے چنانچہ صریح طریقہ بیان بلکہ طرز تحریر سے بھی اس کا اثر صاف نمایاں ہے وہی 'آب حیات کے سے لطائف و ظرائف' وہی 'نگشتند انداز بیان یادگار غالب میں بھی موجود ہے۔ یادگار غالب کا نام بھی موجود ہے۔ یادگار غالب کا نام بھی اس بات کا شاہد ہے کہ حالی نے متاخرین کے لئے اپنے استاد کی حیات نہیں بلکہ یادگار چھوڑی چاہئے۔

اس تہجد کے بعد یادگار کے سوانح پہلو (جو کچھ بھی وہ ہے) کی طرف توجہ مناسب ہوگی۔ مولانا حالی نے جن چار پہلوؤں میں مرزا کے عجیب و غریب ملک کے اظہار کا ذکر کیا ہے وہ شاید کلام کے پہلے میں کیونکہ انھوں نے غالب کی زندگی میں ان کے مظاہرہ بالکل کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے مثلاً غالب کی حیات معاشرہ کا کھلے بندوں احترام ان کے خطوط اور کلام سے صاف ظاہر ہے۔ اپنے جوائز محبوب کے مزے کے علاوہ جسے اپنے کلیات میں شامل کیا ہے غالب نے خود کہا ہے۔ "ننگ پیری ہے جوانی میری"۔ حالی نے غالب کے جو خط حاتم علی تھر کے نام طرز تحریر کی مثال کے طور پر نقل کئے ہیں ان سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب (مغل بچوں کی رعایت بقول



جس سے ان کی ذہنی اور نفسیاتی رجحانات کی بدرجہ تبدیلیوں اور ارتقا کا پتہ چل سکتا۔ غالب کے مختلف اشخاص سے غلوں و موصی کے اظہار اور ان کی ہرز یا عہدہ التعمد کی شاگردی کے ذکر میں بھی تضاد پایا جاتا ہے، جس کی وضاحت حالی کے لئے آسان تھی۔ کلام کی ترتیب بھی تائین نہیں کی گئی ہے اور غالب کی آکرہ کی زندگی کے متعلق بھی سوا ایک مراسلے سے اقتباس کے کچھ نہیں لکھا ہے۔ لیکن حالی کا تعارف غالب سے اس وقت، راستہ جبکہ غالب کی زندگی کی شام تھی اور باتوان کی سنجیدگی اور متانت نے یادگار کی بدراز وقت تصنیف نے انہیں خود غالب یادگیر واقف کاروں سے، تنفسار کا موقع نہیں دیا۔ پھر بھی سوانح نگار کو ذہنی پابندیوں اور رکاوٹوں سے آزاد ہونا چاہئے عمر کا اس کی عقیدت یا پسندیدگی موضوع کے ساتھ تعلقات میں اسے غلط احساس خود داری سے آزاد کر دیتی ہے، ورنہ جس چیز کو وہ خود نگار کے اردوں کو کیا سمجھا جاسکتا ہے۔ حالی نے کہیں کہیں اپنی انصاف پسندی کا بھی مظاہر کیا ہے۔ مثلاً برہان قاطع کی پہلی اشاعت کی غامبیوں فارسی آمیز کرد و اشعار کی کوتاہیوں، تقریظوں وغیرہ کی اُلجھی ہوئی اظہار پیچیدہ زبان وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن غالب کی مناظروں اور مجاہدوں میں زیادتی کا ذکر نہیں ہے، علاوہ بریں غالب کی غذا، لباس، انفرادیت وغیرہ قسم کی سوالات اور جزئیات بھی پیش کی ہیں لیکن بہت کم ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سب باتیں کسی اصول کے تحت نہیں بلکہ اتفاقاً یا سہانے طور پر پیش کی جا رہی ہیں یا ہم کسی درخسین کے شریک دسترخوان ہیں جس سے بجائے بھوک مٹنے کے اشتہا میں اور اضافہ ہوتا ہے، ہر سال غالب کا یہ تذکرہ حالی کے رفاقت کے موقعوں اور گہرے تعلقات کے مدنظر سرسری اور سطحی ہے اس کا ذمہ دار کسی حد تک ان کا باواسطہ طریقہ ہے جس میں مختلف عنوانوں کے تحت بعض اپنی دانست میں ممنوع باتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ مثلاً وہی غالب کی عشق بازی اور رند مشربی کا ذکر طرہ تحریر کی مثالوں میں خاص ۵۵ اور ۱۰۰ پر ان کے خطوط کے اقتباسات جن میں اپنے ”قلندری و آزادگی و ایشار و کرم کے دواعیوں“ لیکن خود نگار کا ہوا ہوئے، اور بقائے عام اور شہرت دوام، پیغمبری و شاعری اور دنیا کے کمالات سے موہوم ہونے کا ذکر ہے جس سے غالب کی عظمت و وسعت خیالی کا احساس ہوتا ہے۔ فنی ہر گو پال تفتی کے نام لکھتے ہیں ”تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بڑی سہانہ علم اور نظریاتی کے شعور کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زینت مبرک کرنے کو تھوڑی سی راحت دے کر رہے، باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا مسلمانوں میں نہیں بنا تو کیا؟ دنیا میں نام آدر ہوئے تو کیا اور گناہ جئے تو کیا۔ کچھ معاش ہو کچھ صحت جسمانی باقی سب وہم ہے، اسے بار حالی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پائے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں، عالم میرنگی میں گزر جاؤں جس سنائے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دئے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں سیراب ہے، ہستی نہیں ہزار ہے۔ ہر تم دونوں دچھے خاصے شاعر ہیں مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہوتے ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم تم کو ہوگا“

(یادگار غالب ص ۱۰۰)

بقائے عام اور شہرت دوام، حرص و ہوس اور زندگی کی موہوم چیزوں کے بارے میں غلط فہمیوں کے کھوکھلے پن کی اس سے زیادہ پردہ دہی اور مذمت کیا جوسکتی ہے اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ عظمت انسانوں کے خیالات ہمیشہ ایک سہ پہا ہیں یہ بنیادی باتیں زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں۔ غالب کے یہ خیالات صرف اپنی ناکامی کی تلخی یا شاعرانہ خیال آزائی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ کافی حد تک شاعر و احساس اور بلند خیالی کے شاہد ہیں۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں: ”قلندری و آزادگی و ایشار و کرم کے جو دواع میرے خالق نے مجھ میں بھر دئے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ لامٹی باتہ میں لوں اور اس میں تسلیم اور ایک نین کا کوٹا مع سوت کی رسی کے ٹکڑوں اور پزیدہ پاجندوں۔ کبھی خیراڑ جانتا، کبھی مقصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف کا پیر، کبھی دستاردار، کبھی عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں ہوں اس شہر میں تو مسجد کا کھانا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور خلق کا مردود، بوڑھا، ناتوان، بیمار، نگہت میں گرفتار، میرے معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو،

(ص ۸۸ یادگار غالب)

وہ جو کسی کو جھپک مانتے نہ دیکھ سکے اور خود مدبر جھپک مانگے وہ میں ہوں۔

ان الفاظ میں شخصیت کی جو بے پناہ وسعت و رفعت کا ثبوت ملتا ہے وہ دنیا میں شاذ ہے۔ یہ محض غالب کی خیالی آرائی نہیں ہے بلکہ اپنے دوست کے چھینٹ کے فرض کی پسند کر کے اپنا نامیدہ کا چند نذر کرنا اور خلعت بیچ کر جبرائیل کو انعام دینا اس کے شاہد ہیں۔ کچھ حد تک یہ بھی ہے کہ آزاد خیال غالب اور مشرقی تہذیب و تمدن کے نمونہ حالی کے جذبات و خیالات اور اقدار حیات میں بھی تقریباً وہی فرق اور بعد ہے جو غالب اور ان کی ہم عصری میں تھا۔ یہاں حیات سعدی کی طرح اپنے جذبات کا اظہار یا حیات جاوید کی طرح اپنے موضوع کی وکالت نہیں مقصود ہے بلکہ اپنے شاعر کی استاد کو منوانا ہے جس میں شخصیت کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا کیونکہ شخصیت مورد احترام بن سکتی تھی اور اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ حالی کو باوجود کلام کی تاریخی ترتیب نہ ہونے کے اپنے مقصد میں پوری، بلکہ ان کی توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ حالی خود غالب کی شاعری کے مستقبل سے یابوس ہے، لیکن آج کی غالب کی مقبولیت اور ان کی عظمت کا (۶ شہرت شعری گیتی بعد من خواہد شدن) سنگ بنیاد انھیں کا رکھا ہوا ہے۔ آج غالب کی متعدد سوانح عمریوں اور شریوں، یادگار غالب ہی کی مرہون منت ہیں۔

حالی سے غالب کے نفسیاتی تجزیے کی توقع یہاں ہے، اور نہ غالب کو محب قوم و ملک نہ ہونے کا الزام دیا جاسکتا ہے۔ یہ سب بعد کی چیزیں ہیں۔ غالب کی قومی ہمدردی زیادہ سے زیادہ غدر میں مسلمانوں کی مظلومی اور اس سے خود اپنے متاثر ہونے پر تعجب کے اظہار تک محدود ہے، جو ممکن ہے انفرادی اور اجتماعی مظلومی اور اس سے خود اپنے متاثر ہونے پر تعجب کے اظہار تک محدود ہے، جو ممکن ہے انفرادی اور اجتماعی مظلومی اور بے بسی کے احساس کے تحت اپنی ہی ہمدردی کے مترادف ہو لیکن آج کے سوانح نگار بھی باوجود مغربی علوم سے بہتر واقفیت کے غالبیات میں کوئی خاص اضافہ نہ کر سکے ہیں اور بقول اکرام ”غالب کے متعلق بہترین کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو انگریزی سے تقریباً تقریباً نا بلند تھا یعنی حالی“۔ لیکن وہ کیا چیز ہے جس نے یادگار غالب کو باوجود اس کے کہ وہ حیات اور تصانیف کے نمونے پر ہے اور اس کا سوانحی حصہ ایک طویل دیباچہ کی طرح ایک چوتھائی حصہ سے کم (۹۶ صفحے) ہے اور اس میں بھی اختلاقی طریقے پر عمل کر کے غالب کے ان مسائل حیات کو جو آج معرکہ آرا بنے ہوئے ہیں (ملاحظہ ہو قتیل اور غالب اور قاضی عبدالودود کے مضامین وغیرہ) واضح نہیں کیا گیا ہے، حالی کی اور اردو ادب کی ایک مقبول ترین تصنیف بنا رکھا ہے۔ یہ زیادہ تر غالب کی دلکش شخصیت اور اس سے زیادہ ان کے خود نوشتہ مواد کی عمدگی ہے، جو یادگار غالب کی دلچسپی، مقبولیت اور کشش کا باعث ہے۔ ادیبوں کی حیات کی خوبی یہ ہے کہ ان کا خود نوشتہ مواد بھی ادبی حیثیت رکھتا ہے اور سوانح نگار سے عموماً صرف انتخاب و ترتیب کی صلاحیت چاہتا ہے۔ اولیت کی وجہ سے اس میں مختصر ہی سہی وہ تمام سوانحی مواد آگیا ہے جو ان کی خود نوشتہ تحریروں اور گفتگو سے اخذ کیا جاسکتا تھا چنانچہ غالب سے متعلق ہر نئی تصنیف کو اس مناسبت سے مقبولیت حاصل ہوگی جس مناسبت سے اس میں غالب کی رنگارنگ شخصیت کے بارے میں نئے مواد یا معلومات کو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسے نئے مواد کی مقدار کیا ہوگی۔ بقول مولانا شبلی عزمی،

بھلا تر دو بے جا ہے اس میں کیا حاصل

اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

وہ معاملہ ہے بھی وہ ہے کہ باوجود محدود چند اعتراضات کے غلام رسول قمر کو اپنی تصنیف میں نہایت فراخ دلی سے یادگار غالب ہی سے اقتباسات دینے پڑے۔ اکرام اپنے اس فیصلہ میں حق بجانب ہیں کہ ”گوڈاکٹر لطیف کے بقول یادگار غالب میں بہت سی خامیاں ہیں، لیکن ابھی تک کوئی تبصرہ ایسا نہیں شائع ہوا جس میں اس سے کم خامیاں ہوں“ اور یہ کہ ”یادگار غالب، غالب کی سب سے محفوظ

سوانح عمری ہے۔ اگر حیات جاوید کی غیر ضروری تفصیل قاری کی طبیعت پر گراں گزرتی ہے تو یادگار غالب کی شہد و شراب کی خست اسکی نقشہ لبی کو اور بڑھادیتی ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ غالب کے سوانح نگار نے جو اپنے موضوع کو اس طرح جانتا تھا جس طرح شکسپیر مرگ کو، یعنی جس سے اس کے کردار کا کوئی پہلو چھپا نہ تھا (اپنے موضوع کے معلوم لطائف و ظرائف کو بھی قلم بند نہ کر کے) اپنے رفاقت کے سنہری موقع سے فائدہ نہ اٹھا کر اور مشرقی رکھ رکھاؤ اور تہذیب و فضاست اور اپنی طبعی متانت و سنجیدگی کی وجہ سے اپنے موضوع کے حالات پر تالا لگا دیا اور اس کی کلید سے دنیا کو محروم کر دیا اور ایک ہو بہو تصویر کی بجائے ”اہل دطن کے لئے مفید نصیحتیں“ (خاتمہ) اخذ کرنے کی طرف مایل ہوا۔

اپنے موضوع اور اس کے خواہ نوشتہ سوانحی مواد کی عمدگی اور شگفتگی نے (اور شاید آب حیات کے نمونے نے) حاتی کے انداز بیان پر بھی اسی طرح اپنا اثر دکھایا ہے۔ جس طرح آب حیات ہیں حاتی کے نوشتہ موتن کے حالات کو، آزاد کے موئے قلم کے اثر نے انھیں کے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ جس کے علاوہ حاتی کی غالب سے عقیدت، ان کا خلوص، ان کا ذوق سلیم، ان کا اعتدال و انصاف (لطیف و چنوری کے برعکس) اور مہمان روی، کسی حد تک ان کے زیادہ اختصار، ان کی سخن فہمی اور غالب کے کلام کی لفظی و معنوی، ظاہری اور باطنی خوبیوں کی وضاحت (غالب کے صحیح مقام کا تعین) اور سب سے بڑھ کر خود حاتی کی نیک اور خوش صفات شخصیت نے بھی جو ان کی تحریروں سے نمایاں ہے، (اگرچہ خود کو ہمیشہ پس منظر میں رکھا، چنانچہ اپنی غازی تعقین کے ذکر میں بھی وہ انکسار) غالب، یادگار غالب اور خود حاتی کو جاوداں کر دیا ہے۔

۱۸۹۳ء تا ۱۹۱۹ء حاتی کو اردو کا اولین اور بہترین سوانح نگار اور حیات جاوید کو ان کی کامل ترین سوانح عمری حیات جاوید قرار دیا گیا ہے۔ اس تصنیف کی بنا پر حاتی کو باسول اور مورے سے تشبیہ دی گئی ہے، اور اس میں کوئی فرق نہیں کہ سرسید کی رفاقت، سوانحی مواد کی فراوانی، برسوں سے ان کی سوانح عمری لکھنے کی نیت اور سعی (حاتی نے اسی وقت سرسید کو ایک سوال نامہ مرتب کر کے دکھایا تھا جب کہ سرسید کو کالج کی بنیاد رکھے کچھ ہی دن ہوئے تھے اور لوگوں کو پوری طرح ان کی عظمت کا احساس نہیں ہوا تھا بقول حاتی وہ پہلی رات کے چاند کی طرح تھے کہ کسی نے دیکھا تو کسی نے نہیں) ہر چیز انھیں اس کا استحقاق اور موقع عطا کرتی تھی کہ اسے ایک لازوال شاہکار کی شکل دیں۔ اردو کے ایک عظیم ترین ادیب کو ہندوستان کے ایک عظیم ترین انسان کی سوانح عمری لکھنے کا موقع حاصل ہوا تھا۔ حاتی کو کم سے کم پچیس سال تک سرسید کی دوستی اور رفاقت کا شرف حاصل رہا۔ انھوں نے سرسید کو نہایت قریب سے دیکھا، ان کے کاموں میں ہاتھ بٹایا، ملازمت کی مجبوریوں کی وجہ سے، سرسید کے حوزہ قرین دوست محسن الملک کو بھی ان کی سیرت و کردار اور کارناموں کے اتنے قریبی مطالعہ کا موقع نہیں ملا ہوگا جتنا حاتی کو۔ حاتی ایک ادیب ہونے کی وجہ سے سرسید کو کج حیثیت علمی انسان کے بے حد پسند کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حاتی اپنی طبعی شرافت و رواداری اور فراخ دلی کی بنا پر دوسروں کی عظمت کا کھیلے دل سے اعتراف کرتے تھے اور ان کا انکسار اور ان کا طالب علمانہ جذبہ ہمیشہ ان کے دل و دماغ کے پٹ کھلے رکھنے کا باعث ہوا تھا۔

حاتی اس سے پہلے دو سوانح عمریاں لکھ چکے تھے جو ملک و قوم میں مقبول ہو چکی تھیں ان تصانیف کے دیباچوں میں فن سوانح نگاری کو اردو ادب سے متعارف کرانے کی کوشش بھی کی تھی۔ آب حیات کی مقبولیت بھی ان کو تذکروں کی ”قدیم روش“ کی طرف مایل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ حیات جاوید کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے بعد ان کے سوانحی شعور میں بھی کافی ترقی ہوئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے حیات جاوید کے دیباچہ میں اس کا صاف اعلان کیا ہے کہ ان کی کچھلی دو سوانحی تصانیف کے برعکس وہ اس میں اپنے موضوع کا کھرا کھوٹا شوق بجا کر دیکھیں گے کیونکہ ان کا موضوع خود اس رحمان کا بانی ہے (حاتی نے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ سرسید کی مختلف الجس حیثیتوں کے مد نظر سوانح نگار کو بھی ایسا ہی جامع حیثیات پر مبنی تھا

جیسے کہ سرسید تھے۔ ہم فن سوانح نگار کے زیر عنوان پہلے باب میں اس سے اختلاف کر چکے ہیں) ایک جگہ سرسید کی کزوریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”انسان کے منتہائے کمال کی دلیل عیبوں سے پاک ہونا نہیں عیبوں کا کم ہونا ہے اور باوجود بے شمار خوبیوں کے اور حیرت انگیز اوصاف کے سرسید میں اس قسم کی کزوریوں کا پایا جانا ان کی اعلیٰ درجہ اخلاقی تفضیلت اور کاملیت پر دال ہے۔“ انھیں نجی خطوط اور تقریروں کی اہمیت کا بھی احساس ہے، اس کے برائے یوٹ خطوط جو وہ اپنے محرم اور ہم راز دوستوں کو لکھتا ہے اور پبلک تقریریں جنہیں سوچنے اور غور کرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ ان سے اس کے دل کی فنی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اور اس کے ذاتی خیالات روز روشن کی طرح سب پر عیاں ہو جاتے ہیں۔ وہ حتی الامکان خود نوشتہ طریقہ پر بھی عمل کرتے ہیں۔ وہ اپنے موضوع کے کچھوں کو دیکھنے سے ڈھکنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے۔ موروثی و انفسانی، نسبی اور خانہ ذاتی تفصیلات کی بحث کی ممانعت کرتے ہیں اور اسے انسان کی شخصیت کو سمجھنے میں مددگار و معاون بتاتے ہیں۔ مغربی طریقہ سوانح نگاری کے انداز پر وہ سرسید کی حیات اور شخصیت میں ان کی تربیت، سیاست، مذہب، شادی، بیوی کی وفات وغیرہ مختلف اثرات کا پتہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سرسید کی جسانی اور دماغی قابلیت کو دو اجنبی خاندانوں میں پیوند ازدواج کا نتیجہ بتاتے ہیں جو ان کی عمرانی علوم سے واقفیت کا ثبوت ہے۔ یہ سب کچھ ہے لیکن حیات جاوید میں کچھ ایسی خامیاں بھی ہیں، جنہوں نے اسے سوانح نگاری کا ایک کامل نمونہ ہونے سے محروم کر رکھا ہے۔

یہ سچ ہے کہ سرسید کی شخصیت کی عظمت ان کی طویل اور پر از واقعات زندگی، مواد کی فراوانی اور کسی باقاعدہ سوانح عمری کی عدم موجودگی کے مد نظر، سرسید کی ایک مفصل اور جامع سوانح عمری کی ضرورت تھی لیکن حالی کا طبعی اعتدال اس کی ضخامت کے معاملے میں کام نہ آسکا۔ حالی نے مولوی سراج الدین کی سرسید کی سوانح عمری کے مواد کو اپنی تصنیف میں شامل کر لیا تھا۔ کرنل گراہم کی نگلی ہوئی سوانح عمری سے بھی استفادہ کیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرسید کی عظمت حالی کی ہمصری، دوستی رفاقت اور بلند مواد کی فراوانی ہی ان کی سب سے بڑی دشواری کا باعث ہوئی (جس کی طرٹ انھوں نے خود اپنے دیباچے میں اشارہ کیا ہے) اور ان کی قوت امتیاز و انتخاب کو اپنی رو میں بہا لے گئی۔ حالی نے اپنے سوانحی مواد کو کتابی شکل دینے میں سات سال صرف کئے تھے اور سرسید کی وفات کے بعد بھی تین سال تک اس میں لگے رہے تھے، لیکن ان کی سرسید سے عقیدت ان کی موت کے بعد بجائے کم ہونے کے اور زیادہ ہو گئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے صرف سرسید کی سیرت نگاری کا کام اپنے ذمہ لے لیا تھا بلکہ اس جامع حیثیات شخص کے کارناموں کی توضیح و تشریح کا مشن بھی اپنے آپ پر عاید کر لیا تھا جو ممکن ہے کرنل گراہم کی سوانح عمری نے اثر کا نتیجہ ہو، کیونکہ اس میں بھی سرسید کے کردار اور کارناموں سے بحث کی گئی۔ گویا ”حیات جاوید حقیقی معنوں میں سراج الدین احمد، کرنل گراہم اور خود حالی کی مختلف کوششوں مجموعی امتزاج تھی۔“ حالی نے انیسویں صدی کے حیات اور زمانے اور حیات اور تصانیف کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے نصف صدی سے زیادہ اسلامی تمدن کی تاریخ (اور مسلمانوں کے احیا اور اصلاح کی کوششوں کی روداد) کو بھی اپنی تصنیف میں شامل کر لیا۔ سرسید کی حیات کے قوم اور ملک کی حیات سے منسلک ہونے کی وجہ سے فرد اور سماج کے اصول کے مد نظر، یہ پس نظر کچھ ہے جانہ تھا، لیکن جس تفصیل اور جامعیت کے ساتھ حالی نے اس کام کو پورا کرنا چاہا اور جس طرح تمام جزئیات و تفصیلات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی، اس نے ان کے عز پر مقصد ہی کو قوت کر دیا، یعنی غلط فہمیوں کے ازالے نے انھوں نے جو زحمت اٹھائی تھی وہ کتاب کی ضخامت کی وجہ سے شرمندہ معنی نہیں ہوئی۔ حالی کی ادبی صلاحیتوں اور بختہ کاری کو دیکھتے ہوئے ان کے لئے اپنے سوانحی مواد کو سیکھنا محال نہ تھا (گو بقیل عید راشد اس کے لئے ایک ادبی حلقہ کی ضرورت تھی) لیکن سوانح عمری کی دو حصوں میں توسیع جو غیر ضروری احادیث کا باعث ہوئی اور ان کی اپنے دوست اور راہبر کی ہر چیز کسی تشریح اور صفائی میں سرگرمی اس کے آڑے آئی۔ اس سے انکار نہیں ہے کہ ایک طویل سوانح عمری میں اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ کوئی قابل ذکر بات چھوٹے نہ پائے۔ اگر حالی انتخاب واقعات میں اصلاحی پہلو

نظر کرتے اور دوسرے اپنے تہصرے، بحث اور اظہار رائے کی بجائے وہ صرف بیان حقائق پر اکتفا کرتے تو شاید اتنی طوالت نہ ہوتی۔ لیکن چیز سرسید کے کارناموں اور خدمات کے حوالے بہ انتہائی اثر کی وجہ سے تھی، جو اس شخصیت کی اشاعت پر اپنے بیٹے کے نام خط سے بھی جھلکتی ہے۔ "خدا کا شکر ہے کہ یہ فرض ادا ہو گیا اور یہ کہنے کی کسی کو گنجائش نہ رہی کہ جس نے قوم کی ایسی خدمات کیں، قوم میں کسی کو اس کی ٹون گھسنے کی توفیق نہ ہوئی"۔ اگر قومی خدمات ہی کے مد نظر سوانح عمری لکھی جانی تھی تو یہ فطری تھا کہ ان قومی خدمات کی بھی وضاحت، جاتی لیکن یہ کام واقعی ایک شخص کا نہیں بلکہ ایک شخص ہی کا ہو سکتا تھا اور حوالے کے لئے اس قسم کے ملحوظات مناسب نہ تھے۔

ایک عذر حوالے کی طرف سے یہ پیش کیا جاسکتا ہے کہ ان کا تعارف سرسید سے اس وقت ہوا تھا جب کہ سرسید کی حیات کی دہر ڈھل چکی تھی اور ان کی شخصیت کے ڈھلنے کا زمانہ گزر چکا تھا۔ حوالے کا سرسید کی زندگی کے آخری حصے پر اور دینا مناسب ہی تھا کیونکہ وہی ان کے براہ راست مشاہدے میں آیا تھا۔ انگریزی ادب میں اس کی ایک روشن مثال ہمیں باسول کی حیات اسٹن سے اس کی عمر کے آخری حصہ میں ہوا تھا۔ روزناموں اور دیگر نامی شواہد اور دستاویزات کی بنا پر باسول کے جانشین کے تعلقات اور اس کی صحبت کی ميعاد دونوں اور گھنٹوں میں معین کی جاسکتی ہے، افسوس ہے کہ ہم حوالے کے متعلق اس تفصیل اور بین پر عمل نہیں کر سکتے) چنانچہ جانشین کی پچھتر سالہ حیات میں سے باسول صرف اکیس سالہ زندگی سے براہ راست واقف تھا اور ۷ عرصہ میں بھی صرف ۲۶ دن جانشین کی صحبت میں رہا گویا وہ بھی جانشین کی بچہ دو تہائی حیات سے ناواقف تھا۔ حیات جانشین کے بارہ ۱۲۵ صفحات میں سے ایک سو اسی صفحات اپنے تعارف کے بعد کے یعنی جانشین کی زندگی کے بچہ ایک تہائی حصہ کے لئے اور صرف ۲۵ صفحے ابتدائی دو تہائی زمانہ حیات کے لئے وقف ہیں۔ لیکن اس نے خود نوشتہ اور دیگر مواد کا ایسا فن کارانہ استعمال کیا ہے کہ قاری کو اس کی صناعت کا بالکل علم نہیں ہو پاتا اور انداز بیان میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا۔ اسی طرح ایک اور مشہور ترین سوانح نگار ڈیوڈ سٹراي نے اس کے برعکس اپنی حیات و کثرت کا بچہ دو تہائی حصہ و کثرت کے کردار کی تعمیر کے متعلق اور ایک تہائی بچہ اس کے بعد کے عہد کے لئے استعمال کیا ہے۔ یہ طریقے فی نفسہ برے یا بھلے نہیں ہیں۔ حالات و واقعات اور معلومات اور سوانح نگاری کی دلچسپی اور صناعتی انگو میں کرتی ہے لیکن سوانح نگار کو اس چیز کا خیال رکھنا چاہئے کہ اپنے موضوع کی پوری شخصیت قاری کی نظر کے سامنے آجائے۔ مآتی نے بھی سرسید کی خدمت کے بعد کی زندگی پر زیادہ زور دیا ہے، جس کے متعلق ان کی اپنی ذاتی معلومات کے علاوہ انھیں مستند واد بھی ملا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حوالے نے بھی اسی طرح سرسید کی مکمل شخصیت کا مرقع ہماری نگاہوں کے سامنے پیش کر دیا ہے؟

اس سلسلہ میں نقاد مختلف الجھال ہیں مثلاً مولانا شہزی اور مولانا ابوالکلام آزاد حیات جاوید کو "کتاب المناقب" اور حوالے، سوانح نگاری کو مدلل دماغی اور مدحت طرازی سمجھتے ہیں ڈاکٹر عبدالرشید کا خیال ہے کہ سرسید ان کی سوانح عمری میں ایک انسان سے زیادہ ایک مصلح نظر آتے ہیں۔ پروفیسر سرور کا خیال ہے کہ حوالے نے حیات سے زیادہ کارناموں پر توجہ دی ہے۔ جہانگیر دل اللہ کے الزامات کا تعلق ہے، ایک حقیقت ہے کہ حوالے کی سیرت و کردار اور علمی و عملی حیات اس الزام کی مجسم تردید ہے۔ اس پر حوالے اور شبلی کے طریقہ کار کے موازنے کے سلسلے میں تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی لیکن یہاں صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ جس طرح ایک آپ بیتی نگار کی اپنی داشت میں اپنے آپ پر کڑی سے کڑی تنقید بھی عموماً اوروں کو خود پسندی نہیں تو کم از کم فزع دلی، رعایت

۱۔ حیات جاوید ص ۵۲۵۔ ۲۔ ص ۵۲۵۔ ۳۔ ص ۵۲۵۔ ۴۔ ص ۵۲۵۔ ۵۔ ص ۵۲۵۔ ۶۔ ص ۵۲۵۔ ۷۔ ص ۵۲۵۔ ۸۔ ص ۵۲۵۔ ۹۔ ص ۵۲۵۔ ۱۰۔ ص ۵۲۵۔ ۱۱۔ ص ۵۲۵۔ ۱۲۔ ص ۵۲۵۔ ۱۳۔ ص ۵۲۵۔ ۱۴۔ ص ۵۲۵۔ ۱۵۔ ص ۵۲۵۔ ۱۶۔ ص ۵۲۵۔ ۱۷۔ ص ۵۲۵۔ ۱۸۔ ص ۵۲۵۔ ۱۹۔ ص ۵۲۵۔ ۲۰۔ ص ۵۲۵۔ ۲۱۔ ص ۵۲۵۔ ۲۲۔ ص ۵۲۵۔ ۲۳۔ ص ۵۲۵۔ ۲۴۔ ص ۵۲۵۔ ۲۵۔ ص ۵۲۵۔ ۲۶۔ ص ۵۲۵۔ ۲۷۔ ص ۵۲۵۔ ۲۸۔ ص ۵۲۵۔ ۲۹۔ ص ۵۲۵۔ ۳۰۔ ص ۵۲۵۔ ۳۱۔ ص ۵۲۵۔ ۳۲۔ ص ۵۲۵۔ ۳۳۔ ص ۵۲۵۔ ۳۴۔ ص ۵۲۵۔ ۳۵۔ ص ۵۲۵۔ ۳۶۔ ص ۵۲۵۔ ۳۷۔ ص ۵۲۵۔ ۳۸۔ ص ۵۲۵۔ ۳۹۔ ص ۵۲۵۔ ۴۰۔ ص ۵۲۵۔ ۴۱۔ ص ۵۲۵۔ ۴۲۔ ص ۵۲۵۔ ۴۳۔ ص ۵۲۵۔ ۴۴۔ ص ۵۲۵۔ ۴۵۔ ص ۵۲۵۔ ۴۶۔ ص ۵۲۵۔ ۴۷۔ ص ۵۲۵۔ ۴۸۔ ص ۵۲۵۔ ۴۹۔ ص ۵۲۵۔ ۵۰۔ ص ۵۲۵۔ ۵۱۔ ص ۵۲۵۔ ۵۲۔ ص ۵۲۵۔ ۵۳۔ ص ۵۲۵۔ ۵۴۔ ص ۵۲۵۔ ۵۵۔ ص ۵۲۵۔ ۵۶۔ ص ۵۲۵۔ ۵۷۔ ص ۵۲۵۔ ۵۸۔ ص ۵۲۵۔ ۵۹۔ ص ۵۲۵۔ ۶۰۔ ص ۵۲۵۔ ۶۱۔ ص ۵۲۵۔ ۶۲۔ ص ۵۲۵۔ ۶۳۔ ص ۵۲۵۔ ۶۴۔ ص ۵۲۵۔ ۶۵۔ ص ۵۲۵۔ ۶۶۔ ص ۵۲۵۔ ۶۷۔ ص ۵۲۵۔ ۶۸۔ ص ۵۲۵۔ ۶۹۔ ص ۵۲۵۔ ۷۰۔ ص ۵۲۵۔ ۷۱۔ ص ۵۲۵۔ ۷۲۔ ص ۵۲۵۔ ۷۳۔ ص ۵۲۵۔ ۷۴۔ ص ۵۲۵۔ ۷۵۔ ص ۵۲۵۔ ۷۶۔ ص ۵۲۵۔ ۷۷۔ ص ۵۲۵۔ ۷۸۔ ص ۵۲۵۔ ۷۹۔ ص ۵۲۵۔ ۸۰۔ ص ۵۲۵۔ ۸۱۔ ص ۵۲۵۔ ۸۲۔ ص ۵۲۵۔ ۸۳۔ ص ۵۲۵۔ ۸۴۔ ص ۵۲۵۔ ۸۵۔ ص ۵۲۵۔ ۸۶۔ ص ۵۲۵۔ ۸۷۔ ص ۵۲۵۔ ۸۸۔ ص ۵۲۵۔ ۸۹۔ ص ۵۲۵۔ ۹۰۔ ص ۵۲۵۔ ۹۱۔ ص ۵۲۵۔ ۹۲۔ ص ۵۲۵۔ ۹۳۔ ص ۵۲۵۔ ۹۴۔ ص ۵۲۵۔ ۹۵۔ ص ۵۲۵۔ ۹۶۔ ص ۵۲۵۔ ۹۷۔ ص ۵۲۵۔ ۹۸۔ ص ۵۲۵۔ ۹۹۔ ص ۵۲۵۔ ۱۰۰۔ ص ۵۲۵۔ ۱۰۱۔ ص ۵۲۵۔ ۱۰۲۔ ص ۵۲۵۔ ۱۰۳۔ ص ۵۲۵۔ ۱۰۴۔ ص ۵۲۵۔ ۱۰۵۔ ص ۵۲۵۔ ۱۰۶۔ ص ۵۲۵۔ ۱۰۷۔ ص ۵۲۵۔ ۱۰۸۔ ص ۵۲۵۔ ۱۰۹۔ ص ۵۲۵۔ ۱۱۰۔ ص ۵۲۵۔ ۱۱۱۔ ص ۵۲۵۔ ۱۱۲۔ ص ۵۲۵۔ ۱۱۳۔ ص ۵۲۵۔ ۱۱۴۔ ص ۵۲۵۔ ۱۱۵۔ ص ۵۲۵۔ ۱۱۶۔ ص ۵۲۵۔ ۱۱۷۔ ص ۵۲۵۔ ۱۱۸۔ ص ۵۲۵۔ ۱۱۹۔ ص ۵۲۵۔ ۱۲۰۔ ص ۵۲۵۔ ۱۲۱۔ ص ۵۲۵۔ ۱۲۲۔ ص ۵۲۵۔ ۱۲۳۔ ص ۵۲۵۔ ۱۲۴۔ ص ۵۲۵۔ ۱۲۵۔ ص ۵۲۵۔ ۱۲۶۔ ص ۵۲۵۔ ۱۲۷۔ ص ۵۲۵۔ ۱۲۸۔ ص ۵۲۵۔ ۱۲۹۔ ص ۵۲۵۔ ۱۳۰۔ ص ۵۲۵۔ ۱۳۱۔ ص ۵۲۵۔ ۱۳۲۔ ص ۵۲۵۔ ۱۳۳۔ ص ۵۲۵۔ ۱۳۴۔ ص ۵۲۵۔ ۱۳۵۔ ص ۵۲۵۔ ۱۳۶۔ ص ۵۲۵۔ ۱۳۷۔ ص ۵۲۵۔ ۱۳۸۔ ص ۵۲۵۔ ۱۳۹۔ ص ۵۲۵۔ ۱۴۰۔ ص ۵۲۵۔ ۱۴۱۔ ص ۵۲۵۔ ۱۴۲۔ ص ۵۲۵۔ ۱۴۳۔ ص ۵۲۵۔ ۱۴۴۔ ص ۵۲۵۔ ۱۴۵۔ ص ۵۲۵۔ ۱۴۶۔ ص ۵۲۵۔ ۱۴۷۔ ص ۵۲۵۔ ۱۴۸۔ ص ۵۲۵۔ ۱۴۹۔ ص ۵۲۵۔ ۱۵۰۔ ص ۵۲۵۔ ۱۵۱۔ ص ۵۲۵۔ ۱۵۲۔ ص ۵۲۵۔ ۱۵۳۔ ص ۵۲۵۔ ۱۵۴۔ ص ۵۲۵۔ ۱۵۵۔ ص ۵۲۵۔ ۱۵۶۔ ص ۵۲۵۔ ۱۵۷۔ ص ۵۲۵۔ ۱۵۸۔ ص ۵۲۵۔ ۱۵۹۔ ص ۵۲۵۔ ۱۶۰۔ ص ۵۲۵۔ ۱۶۱۔ ص ۵۲۵۔ ۱۶۲۔ ص ۵۲۵۔ ۱۶۳۔ ص ۵۲۵۔ ۱۶۴۔ ص ۵۲۵۔ ۱۶۵۔ ص ۵۲۵۔ ۱۶۶۔ ص ۵۲۵۔ ۱۶۷۔ ص ۵۲۵۔ ۱۶۸۔ ص ۵۲۵۔ ۱۶۹۔ ص ۵۲۵۔ ۱۷۰۔ ص ۵۲۵۔ ۱۷۱۔ ص ۵۲۵۔ ۱۷۲۔ ص ۵۲۵۔ ۱۷۳۔ ص ۵۲۵۔ ۱۷۴۔ ص ۵۲۵۔ ۱۷۵۔ ص ۵۲۵۔ ۱۷۶۔ ص ۵۲۵۔ ۱۷۷۔ ص ۵۲۵۔ ۱۷۸۔ ص ۵۲۵۔ ۱۷۹۔ ص ۵۲۵۔ ۱۸۰۔ ص ۵۲۵۔ ۱۸۱۔ ص ۵۲۵۔ ۱۸۲۔ ص ۵۲۵۔ ۱۸۳۔ ص ۵۲۵۔ ۱۸۴۔ ص ۵۲۵۔ ۱۸۵۔ ص ۵۲۵۔ ۱۸۶۔ ص ۵۲۵۔ ۱۸۷۔ ص ۵۲۵۔ ۱۸۸۔ ص ۵۲۵۔ ۱۸۹۔ ص ۵۲۵۔ ۱۹۰۔ ص ۵۲۵۔ ۱۹۱۔ ص ۵۲۵۔ ۱۹۲۔ ص ۵۲۵۔ ۱۹۳۔ ص ۵۲۵۔ ۱۹۴۔ ص ۵۲۵۔ ۱۹۵۔ ص ۵۲۵۔ ۱۹۶۔ ص ۵۲۵۔ ۱۹۷۔ ص ۵۲۵۔ ۱۹۸۔ ص ۵۲۵۔ ۱۹۹۔ ص ۵۲۵۔ ۲۰۰۔ ص ۵۲۵۔ ۲۰۱۔ ص ۵۲۵۔ ۲۰۲۔ ص ۵۲۵۔ ۲۰۳۔ ص ۵۲۵۔ ۲۰۴۔ ص ۵۲۵۔ ۲۰۵۔ ص ۵۲۵۔ ۲۰۶۔ ص ۵۲۵۔ ۲۰۷۔ ص ۵۲۵۔ ۲۰۸۔ ص ۵۲۵۔ ۲۰۹۔ ص ۵۲۵۔ ۲۱۰۔ ص ۵۲۵۔ ۲۱۱۔ ص ۵۲۵۔ ۲۱۲۔ ص ۵۲۵۔ ۲۱۳۔ ص ۵۲۵۔ ۲۱۴۔ ص ۵۲۵۔ ۲۱۵۔ ص ۵۲۵۔ ۲۱۶۔ ص ۵۲۵۔ ۲۱۷۔ ص ۵۲۵۔ ۲۱۸۔ ص ۵۲۵۔ ۲۱۹۔ ص ۵۲۵۔ ۲۲۰۔ ص ۵۲۵۔ ۲۲۱۔ ص ۵۲۵۔ ۲۲۲۔ ص ۵۲۵۔ ۲۲۳۔ ص ۵۲۵۔ ۲۲۴۔ ص ۵۲۵۔ ۲۲۵۔ ص ۵۲۵۔ ۲۲۶۔ ص ۵۲۵۔ ۲۲۷۔ ص ۵۲۵۔ ۲۲۸۔ ص ۵۲۵۔ ۲۲۹۔ ص ۵۲۵۔ ۲۳۰۔ ص ۵۲۵۔ ۲۳۱۔ ص ۵۲۵۔ ۲۳۲۔ ص ۵۲۵۔ ۲۳۳۔ ص ۵۲۵۔ ۲۳۴۔ ص ۵۲۵۔ ۲۳۵۔ ص ۵۲۵۔ ۲۳۶۔ ص ۵۲۵۔ ۲۳۷۔ ص ۵۲۵۔ ۲۳۸۔ ص ۵۲۵۔ ۲۳۹۔ ص ۵۲۵۔ ۲۴۰۔ ص ۵۲۵۔ ۲۴۱۔ ص ۵۲۵۔ ۲۴۲۔ ص ۵۲۵۔ ۲۴۳۔ ص ۵۲۵۔ ۲۴۴۔ ص ۵۲۵۔ ۲۴۵۔ ص ۵۲۵۔ ۲۴۶۔ ص ۵۲۵۔ ۲۴۷۔ ص ۵۲۵۔ ۲۴۸۔ ص ۵۲۵۔ ۲۴۹۔ ص ۵۲۵۔ ۲۵۰۔ ص ۵۲۵۔ ۲۵۱۔ ص ۵۲۵۔ ۲۵۲۔ ص ۵۲۵۔ ۲۵۳۔ ص ۵۲۵۔ ۲۵۴۔ ص ۵۲۵۔ ۲۵۵۔ ص ۵۲۵۔ ۲۵۶۔ ص ۵۲۵۔ ۲۵۷۔ ص ۵۲۵۔ ۲۵۸۔ ص ۵۲۵۔ ۲۵۹۔ ص ۵۲۵۔ ۲۶۰۔ ص ۵۲۵۔ ۲۶۱۔ ص ۵۲۵۔ ۲۶۲۔ ص ۵۲۵۔ ۲۶۳۔ ص ۵۲۵۔ ۲۶۴۔ ص ۵۲۵۔ ۲۶۵۔ ص ۵۲۵۔ ۲۶۶۔ ص ۵۲۵۔ ۲۶۷۔ ص ۵۲۵۔ ۲۶۸۔ ص ۵۲۵۔ ۲۶۹۔ ص ۵۲۵۔ ۲۷۰۔ ص ۵۲۵۔ ۲۷۱۔ ص ۵۲۵۔ ۲۷۲۔ ص ۵۲۵۔ ۲۷۳۔ ص ۵۲۵۔ ۲۷۴۔ ص ۵۲۵۔ ۲۷۵۔ ص ۵۲۵۔ ۲۷۶۔ ص ۵۲۵۔ ۲۷۷۔ ص ۵۲۵۔ ۲۷۸۔ ص ۵۲۵۔ ۲۷۹۔ ص ۵۲۵۔ ۲۸۰۔ ص ۵۲۵۔ ۲۸۱۔ ص ۵۲۵۔ ۲۸۲۔ ص ۵۲۵۔ ۲۸۳۔ ص ۵۲۵۔ ۲۸۴۔ ص ۵۲۵۔ ۲۸۵۔ ص ۵۲۵۔ ۲۸۶۔ ص ۵۲۵۔ ۲۸۷۔ ص ۵۲۵۔ ۲۸۸۔ ص ۵۲۵۔ ۲۸۹۔ ص ۵۲۵۔ ۲۹۰۔ ص ۵۲۵۔ ۲۹۱۔ ص ۵۲۵۔ ۲۹۲۔ ص ۵۲۵۔ ۲۹۳۔ ص ۵۲۵۔ ۲۹۴۔ ص ۵۲۵۔ ۲۹۵۔ ص ۵۲۵۔ ۲۹۶۔ ص ۵۲۵۔ ۲۹۷۔ ص ۵۲۵۔ ۲۹۸۔ ص ۵۲۵۔ ۲۹۹۔ ص ۵۲۵۔ ۳۰۰۔ ص ۵۲۵۔ ۳۰۱۔ ص ۵۲۵۔ ۳۰۲۔ ص ۵۲۵۔ ۳۰۳۔ ص ۵۲۵۔ ۳۰۴۔ ص ۵۲۵۔ ۳۰۵۔ ص ۵۲۵۔ ۳۰۶۔ ص ۵۲۵۔ ۳۰۷۔ ص ۵۲۵۔ ۳۰۸۔ ص ۵۲۵۔ ۳۰۹۔ ص ۵۲۵۔ ۳۱۰۔ ص ۵۲۵۔ ۳۱۱۔ ص ۵۲۵۔ ۳۱۲۔ ص ۵۲۵۔ ۳۱۳۔ ص ۵۲۵۔ ۳۱۴۔ ص ۵۲۵۔ ۳۱۵۔ ص ۵۲۵۔ ۳۱۶۔ ص ۵۲۵۔ ۳۱۷۔ ص ۵۲۵۔ ۳۱۸۔ ص ۵۲۵۔ ۳۱۹۔ ص ۵۲۵۔ ۳۲۰۔ ص ۵۲۵۔ ۳۲۱۔ ص ۵۲۵۔ ۳۲۲۔ ص ۵۲۵۔ ۳۲۳۔ ص ۵۲۵۔ ۳۲۴۔ ص ۵۲۵۔ ۳۲۵۔ ص ۵۲۵۔ ۳۲۶۔ ص ۵۲۵۔ ۳۲۷۔ ص ۵۲۵۔ ۳۲۸۔ ص ۵۲۵۔ ۳۲۹۔ ص ۵۲۵۔ ۳۳۰۔ ص ۵۲۵۔ ۳۳۱۔ ص ۵۲۵۔ ۳۳۲۔ ص ۵۲۵۔ ۳۳۳۔ ص ۵۲۵۔ ۳۳۴۔ ص ۵۲۵۔ ۳۳۵۔ ص ۵۲۵۔ ۳۳۶۔ ص ۵۲۵۔ ۳۳۷۔ ص ۵۲۵۔ ۳۳۸۔ ص ۵۲۵۔ ۳۳۹۔ ص ۵۲۵۔ ۳۴۰۔ ص ۵۲۵۔ ۳۴۱۔ ص ۵۲۵۔ ۳۴۲۔ ص ۵۲۵۔ ۳۴۳۔ ص ۵۲۵۔ ۳۴۴۔ ص ۵۲۵۔ ۳۴۵۔ ص ۵۲۵۔ ۳۴۶۔ ص ۵۲۵۔ ۳۴۷۔ ص ۵۲۵۔ ۳۴۸۔ ص ۵۲۵۔ ۳۴۹۔ ص ۵۲۵۔ ۳۵۰۔ ص ۵۲۵۔ ۳۵۱۔ ص ۵۲۵۔ ۳۵۲۔ ص ۵۲۵۔ ۳۵۳۔ ص ۵۲۵۔ ۳۵۴۔ ص ۵۲۵۔ ۳۵۵۔ ص ۵۲۵۔ ۳۵۶۔ ص ۵۲۵۔ ۳۵۷۔ ص ۵۲۵۔ ۳۵۸۔ ص ۵۲۵۔ ۳۵۹۔ ص ۵۲۵۔ ۳۶۰۔ ص ۵۲۵۔ ۳۶۱۔ ص ۵۲۵۔ ۳۶۲۔ ص ۵۲۵۔ ۳۶۳۔ ص ۵۲۵۔ ۳۶۴۔ ص ۵۲۵۔ ۳۶۵۔ ص ۵۲۵۔ ۳۶۶۔ ص ۵۲۵۔ ۳۶۷۔ ص ۵۲۵۔ ۳۶۸۔ ص ۵۲۵۔ ۳۶۹۔ ص ۵۲۵۔ ۳۷۰۔ ص ۵۲۵۔ ۳۷۱۔ ص ۵۲۵۔ ۳۷۲۔ ص ۵۲۵۔ ۳۷۳۔ ص ۵۲۵۔ ۳۷۴۔ ص ۵۲۵۔ ۳۷۵۔ ص ۵۲۵۔ ۳۷۶۔ ص ۵۲۵۔ ۳۷۷۔ ص ۵۲۵۔ ۳۷۸۔ ص ۵۲۵۔ ۳۷۹۔ ص ۵۲۵۔ ۳۸۰۔ ص ۵۲۵۔ ۳۸۱۔ ص ۵۲۵۔ ۳۸۲۔ ص ۵۲۵۔ ۳۸۳۔ ص ۵۲۵۔ ۳۸۴۔ ص ۵۲۵۔ ۳۸۵۔ ص ۵۲۵۔ ۳۸۶۔ ص ۵۲۵۔ ۳۸۷۔ ص ۵۲۵۔ ۳۸۸۔ ص ۵۲۵۔ ۳۸۹۔ ص ۵۲۵۔ ۳۹۰۔ ص ۵۲۵۔ ۳۹۱۔ ص ۵۲۵۔ ۳۹۲۔ ص ۵۲۵۔ ۳۹۳۔ ص ۵۲۵۔ ۳۹۴۔ ص ۵۲۵۔ ۳۹۵۔ ص ۵۲۵۔ ۳۹۶۔ ص ۵۲۵۔ ۳۹۷۔ ص ۵۲۵۔ ۳۹۸۔ ص ۵۲۵۔ ۳۹۹۔ ص ۵۲۵۔ ۴۰۰۔ ص ۵۲۵۔ ۴۰۱۔ ص ۵۲۵۔ ۴۰۲۔ ص ۵۲۵۔ ۴۰۳۔ ص ۵۲۵۔ ۴۰۴۔ ص ۵۲۵۔ ۴۰۵۔ ص ۵۲۵۔ ۴۰۶۔ ص ۵۲۵۔ ۴۰۷۔ ص ۵۲۵۔ ۴۰۸۔ ص ۵۲۵۔ ۴۰۹۔ ص ۵۲۵۔ ۴۱۰۔ ص ۵۲۵۔ ۴۱۱۔ ص ۵۲۵۔ ۴۱۲۔ ص ۵۲۵۔ ۴۱۳۔ ص ۵۲۵۔ ۴۱۴۔ ص ۵۲۵۔ ۴۱۵۔ ص ۵۲۵۔ ۴۱۶۔ ص ۵۲۵۔ ۴۱۷۔ ص ۵۲۵۔ ۴۱۸۔ ص ۵۲۵۔ ۴۱۹۔ ص ۵۲۵۔ ۴۲۰۔ ص ۵۲۵۔ ۴۲۱۔ ص ۵۲۵۔ ۴۲۲۔ ص ۵۲۵۔ ۴۲۳۔ ص ۵۲۵۔ ۴۲۴۔ ص ۵۲۵۔ ۴۲۵۔ ص ۵۲۵۔ ۴۲۶۔ ص ۵۲۵۔ ۴۲۷۔ ص ۵۲۵۔ ۴۲۸۔ ص ۵۲۵۔ ۴۲۹۔ ص ۵۲۵۔ ۴۳۰۔ ص ۵۲۵۔ ۴۳۱۔ ص ۵۲۵۔ ۴۳۲۔ ص ۵۲۵۔ ۴۳۳۔ ص ۵۲۵۔ ۴۳۴۔ ص ۵۲۵۔ ۴۳۵۔ ص ۵۲۵۔ ۴۳۶۔ ص ۵۲۵۔ ۴۳۷۔ ص ۵۲۵۔ ۴۳۸۔ ص ۵۲۵۔ ۴۳۹۔ ص ۵۲۵۔ ۴۴۰۔ ص ۵۲۵۔ ۴۴۱۔ ص ۵۲۵۔ ۴۴۲۔ ص ۵۲۵۔ ۴۴۳۔ ص ۵۲۵۔ ۴۴۴۔ ص ۵۲۵۔ ۴۴۵۔ ص ۵۲۵۔ ۴۴۶۔ ص ۵۲۵۔ ۴۴۷۔ ص ۵۲۵۔ ۴۴۸۔ ص ۵۲۵۔ ۴۴۹۔ ص ۵۲۵۔ ۴۵۰۔ ص ۵۲۵۔ ۴۵۱۔ ص ۵۲۵۔ ۴۵۲۔ ص ۵۲۵۔ ۴۵۳۔ ص ۵۲۵۔ ۴۵۴۔ ص ۵۲۵۔ ۴۵۵۔ ص ۵۲۵۔ ۴۵۶۔ ص ۵۲۵۔ ۴۵۷۔ ص ۵۲۵۔ ۴۵۸۔ ص ۵۲۵۔ ۴۵۹۔ ص ۵۲۵۔ ۴۶۰۔ ص ۵۲۵۔ ۴۶۱۔ ص ۵۲۵۔ ۴۶۲۔ ص ۵۲۵۔ ۴۶۳۔ ص ۵۲۵۔ ۴۶۴۔ ص ۵۲۵۔ ۴۶۵۔ ص ۵۲۵۔ ۴۶۶۔ ص ۵۲۵۔ ۴۶۷۔ ص ۵۲۵۔ ۴۶۸۔ ص ۵۲۵۔ ۴۶۹۔ ص ۵۲۵۔ ۴۷۰۔ ص ۵۲۵۔ ۴۷۱۔ ص ۵۲۵۔ ۴۷۲۔ ص ۵۲۵۔ ۴۷۳۔ ص ۵۲۵۔ ۴۷۴۔ ص ۵۲۵۔ ۴۷۵۔ ص ۵۲۵۔ ۴۷۶۔ ص ۵۲۵۔ ۴۷۷۔ ص ۵۲۵۔ ۴۷۸۔ ص ۵۲۵۔ ۴۷۹۔ ص ۵۲۵۔ ۴۸۰۔ ص ۵۲۵۔ ۴۸۱۔ ص ۵۲۵۔ ۴۸۲۔ ص ۵۲۵۔ ۴۸۳۔ ص ۵۲۵۔ ۴۸۴۔ ص ۵۲۵۔ ۴۸۵۔ ص ۵۲۵۔ ۴۸۶۔ ص ۵۲۵۔ ۴۸۷۔ ص ۵۲۵۔ ۴۸۸۔ ص ۵۲۵۔ ۴۸۹۔ ص ۵۲۵۔ ۴۹۰۔ ص ۵۲۵۔ ۴۹۱۔ ص ۵۲۵۔ ۴۹۲۔ ص ۵۲۵۔ ۴۹۳۔ ص ۵۲۵۔ ۴۹۴۔ ص ۵۲۵۔ ۴۹۵۔ ص ۵۲۵۔ ۴۹۶۔ ص ۵۲۵۔ ۴۹۷۔ ص ۵۲۵۔ ۴۹۸۔ ص ۵۲۵۔ ۴۹۹۔ ص ۵۲۵۔ ۵۰۰۔ ص ۵۲۵۔ ۵۰۱۔ ص ۵۲۵۔ ۵۰۲۔ ص ۵۲۵۔ ۵۰۳۔ ص ۵۲۵۔ ۵۰۴۔ ص ۵۲۵۔ ۵۰۵۔ ص ۵۲۵۔ ۵۰۶۔ ص ۵۲۵۔ ۵۰۷۔ ص ۵۲۵۔ ۵۰۸۔ ص ۵۲۵۔ ۵۰۹۔ ص ۵۲۵۔ ۵۱۰۔ ص ۵۲۵۔ ۵۱۱۔ ص ۵۲۵۔ ۵۱۲۔ ص ۵۲۵۔ ۵۱۳۔ ص ۵۲۵۔ ۵۱۴۔ ص ۵۲۵۔ ۵۱۵۔ ص ۵۲۵۔ ۵۱۶۔ ص ۵۲۵۔ ۵۱۷۔ ص ۵۲۵۔ ۵۱۸۔ ص ۵۲۵۔ ۵۱۹۔ ص ۵۲۵۔ ۵۲۰۔ ص ۵۲۵۔ ۵۲۱۔ ص ۵۲۵۔ ۵۲۲۔ ص ۵۲۵۔ ۵۲۳۔ ص ۵۲۵۔ ۵۲۴۔ ص ۵۲۵۔ ۵۲۵۔ ص ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ص ۵۲۵۔ ۵۲۷۔ ص ۵۲۵۔ ۵۲۸۔ ص ۵۲۵۔ ۵۲۹۔ ص ۵۲۵۔ ۵۳۰۔ ص ۵۲۵۔ ۵۳۱۔ ص ۵۲۵۔ ۵۳۲۔ ص ۵۲۵۔ ۵۳۳۔ ص ۵۲۵۔ ۵۳۴۔ ص ۵۲۵۔ ۵۳۵۔ ص ۵۲۵۔ ۵۳۶۔ ص ۵۲۵۔ ۵۳۷۔ ص ۵۲۵۔ ۵۳۸۔ ص ۵۲۵۔ ۵۳۹۔ ص ۵۲۵۔ ۵۴۰۔ ص ۵۲۵۔ ۵۴۱۔ ص ۵۲۵۔ ۵۴۲۔ ص ۵۲۵۔ ۵۴۳۔ ص ۵۲۵۔ ۵۴۴۔ ص ۵۲۵۔ ۵۴۵۔ ص ۵۲۵۔ ۵۴۶۔ ص ۵۲۵۔ ۵۴۷۔ ص ۵۲۵۔ ۵۴۸۔ ص ۵۲۵۔ ۵۴۹۔ ص ۵۲۵۔ ۵۵۰۔ ص ۵۲۵۔ ۵۵۱۔ ص ۵۲۵۔ ۵۵۲۔ ص ۵۲۵۔ ۵۵۳۔ ص ۵۲۵۔ ۵۵۴۔ ص ۵۲۵۔ ۵۵۵۔ ص ۵۲۵۔ ۵۵۶۔ ص ۵۲۵۔ ۵۵۷۔ ص ۵۲۵۔ ۵۵۸۔ ص ۵۲۵۔ ۵۵۹۔ ص ۵۲۵۔ ۵۶۰۔ ص ۵۲۵۔ ۵۶۱۔ ص ۵۲۵۔ ۵۶۲۔ ص ۵۲۵۔ ۵۶۳۔ ص ۵۲۵۔ ۵۶۴۔ ص ۵۲۵۔ ۵۶۵۔ ص ۵۲۵۔ ۵۶۶۔ ص ۵۲۵۔ ۵۶۷۔ ص ۵۲۵۔ ۵۶۸۔ ص ۵۲۵۔ ۵۶۹۔ ص ۵۲۵۔ ۵۷۰۔ ص ۵۲۵۔ ۵۷۱۔ ص ۵۲۵۔ ۵۷۲۔ ص ۵۲۵۔ ۵۷۳۔ ص ۵۲۵۔ ۵۷۴۔ ص ۵۲۵۔ ۵۷۵۔ ص ۵۲۵۔ ۵۷۶۔ ص ۵۲۵۔ ۵۷۷۔ ص ۵۲۵۔ ۵۷۸۔ ص ۵۲۵۔ ۵۷۹۔ ص ۵۲۵۔ ۵۸۰۔ ص ۵۲۵۔ ۵۸۱۔ ص ۵۲۵۔ ۵۸۲۔ ص ۵۲۵۔ ۵۸۳۔ ص ۵۲۵۔ ۵۸۴۔ ص ۵۲۵۔ ۵۸۵۔ ص ۵۲۵۔ ۵۸۶۔ ص ۵۲۵۔ ۵۸۷۔ ص ۵۲۵۔ ۵۸۸۔ ص ۵۲۵۔ ۵۸۹۔ ص ۵۲۵۔ ۵۹۰۔ ص ۵۲۵۔ ۵۹۱۔ ص ۵۲۵۔ ۵۹۲۔ ص ۵۲۵۔ ۵۹۳۔ ص ۵۲۵۔ ۵۹۴۔ ص ۵۲۵۔ ۵۹۵۔ ص ۵۲۵۔ ۵۹۶۔ ص ۵۲۵۔ ۵۹۷۔ ص ۵۲۵۔ ۵۹۸۔ ص ۵۲۵۔ ۵۹۹۔ ص ۵۲۵۔ ۶۰۰۔ ص ۵۲۵۔ ۶۰۱۔ ص ۵۲۵۔ ۶۰۲۔ ص ۵۲۵۔ ۶۰۳۔ ص ۵۲۵۔ ۶۰۴۔ ص ۵۲۵۔ ۶۰۵۔ ص ۵۲۵۔ ۶۰۶۔ ص ۵۲۵۔ ۶۰۷۔ ص ۵۲۵۔ ۶۰۸۔ ص ۵۲۵۔ ۶۰۹۔ ص ۵۲۵۔ ۶۱۰۔ ص ۵۲۵۔ ۶۱۱۔ ص ۵۲۵۔ ۶۱۲۔ ص ۵۲۵۔ ۶۱۳۔ ص ۵۲۵۔ ۶۱۴۔ ص ۵۲۵۔ ۶۱۵۔ ص ۵۲۵۔ ۶۱۶۔ ص ۵۲۵۔ ۶۱۷۔ ص ۵۲۵۔ ۶۱۸۔ ص ۵۲۵۔ ۶۱۹۔ ص ۵۲۵۔ ۶۲۰۔ ص ۵۲۵۔ ۶۲۱۔ ص ۵۲۵۔ ۶۲۲۔ ص ۵۲۵۔ ۶۲۳۔ ص ۵۲۵۔ ۶۲۴۔ ص ۵۲۵۔ ۶۲۵۔ ص ۵۲۵۔ ۶۲۶۔ ص ۵۲۵۔ ۶۲۷۔ ص ۵۲۵۔ ۶۲۸۔ ص ۵۲۵۔ ۶۲۹۔ ص ۵۲۵۔ ۶۳۰۔ ص ۵۲۵۔ ۶۳۱۔ ص ۵۲۵۔ ۶۳۲۔ ص ۵۲۵۔ ۶۳۳۔ ص ۵۲۵۔ ۶۳۴۔ ص ۵۲۵۔ ۶۳۵۔ ص ۵۲۵۔ ۶۳۶۔ ص ۵۲۵۔ ۶۳۷۔ ص ۵۲۵۔ ۶۳۸۔ ص ۵۲۵۔ ۶۳۹۔ ص ۵۲۵۔ ۶۴۰۔ ص ۵۲۵۔ ۶۴۱۔ ص ۵۲۵۔ ۶۴۲۔ ص ۵۲۵۔ ۶۴۳۔ ص ۵۲۵۔ ۶۴۴۔ ص ۵۲۵۔ ۶۴۵۔ ص ۵۲۵۔ ۶۴۶۔ ص ۵۲۵۔ ۶۴۷۔ ص ۵۲۵۔ ۶۴۸۔ ص ۵۲۵۔ ۶۴۹۔ ص ۵۲۵۔ ۶۵۰۔ ص ۵۲۵۔ ۶۵۱۔ ص ۵۲۵۔ ۶۵۲۔ ص ۵۲۵۔ ۶۵۳۔ ص ۵۲۵۔ ۶۵۴۔ ص ۵۲۵۔ ۶۵۵۔ ص ۵۲۵۔ ۶۵۶۔ ص ۵۲۵۔ ۶۵۷۔ ص ۵۲۵۔ ۶۵۸۔ ص ۵۲۵۔ ۶۵۹۔ ص ۵۲۵۔ ۶۶۰۔ ص ۵۲۵۔ ۶۶۱۔ ص ۵۲۵۔ ۶۶۲۔ ص ۵۲

نظر اندازی اور پہلوہی کے مترادف نظر آتی ہے اسی طرح ایک دوست کی ناقدرانہ نظر اور دل کو اور خصوصاً اس کے اختلاف رکھنے والوں کو حمایت پر مبنی محسوس ہو سکتی ہے۔ یوں بھی سوانح نگاری کا یہ اصل اصول ہے کہ سوانح نگار کو اپنے موضوع کے ساتھ ایک ناقد و درست کی سی ہمدردی کا اظہار کرنا چاہئے اور جہاں کہیں ممکن ہو اوروں کے اس کے بارے میں بے جا شک و شبہ کی گنجائش کے پہلو کو بھی مد نظر رکھنا چاہئے۔ چنانچہ حالی نے بھی کہیں کہیں وہی زبان سے سرسید کی وکالت کی کوشش کی ہے۔ مثلاً علی گڑھ کالج کے نشان تہہ بال و صلیب کے امتزاج کو سرسید کی دور اندیشی، آئین اکبری کی تصحیح و اشاعت کو قوم پر ایک احسان، ان کی غیر مکمل تعلیم کو ایک حسن الخلاق ان کی جسمانی قابلیتوں، مذہبیت اور نیک اخلاق کو عظمت کے لئے لاہری (بہت سے لادھرب اور بد اخلاق شخص بھی با عظمت گزرے ہیں) ان کی ملی سیاست سے قوم کو حلقہ کی کی تاکید کو ایک خار دار جھاڑی سے پہلوہی کی تعین کے حامل وغیرہ قرار دیا ہے جس سے لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ ٹرسٹی بل کے معاملہ کی، جس کی خود حالی، محسن الملک اور وقار الملک کے ساتھ مل کر اخبار کے لئے ایک بیان تحریر کرنے کی حد تک مخالفت کر چکے تھے، اپنی معلومات اور سمجھ کے مطابق تاویل اور صفائی کی کوشش، ان کے مخالفین کو بدبینی کا ملزم قرار دینا غیر کے معاملہ میں سرسید کی نیک حلالی کا یہ ذکر، ان کے کارناموں میں ترتیب دکھانے کی سعی، اور دیا چہ میں نکتہ چینی کے ارادے کے ساتھ ہی اپنے اس یقین اور اوروں کو یقین دلانے کی خواہش کا اظہار کر سید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا۔ اور یہ اقرار کہ ان کے بہت سے احسانات میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ بھی ہے کہ وہ ہمارے لئے ایک بے مثل اور بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے، ایک ایسے اخلاقی طریقہ کا نمونہ پیش کرتا ہے، جس میں موضوع سوانح کی حیات مدحیہ پھولوں سے سجادی جاتی ہے اور اس کے پودوں اور گہریوں کی کاشت چھانٹ اور روشنی کی درستی سے ان کی بدنامی، نشیب و فراز اور پیچیدگی کو خوش حالی ہمواری اور راستی سے بدلا جاتا ہے، تاکہ خندہ ہائے بیجا کا دماغ نہ رکھنے والوں کی پرسکون نگاشت میں کوئی خلل نہ پڑ سکے۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سرسید کی آخری دونوں غیر مطبوع اور لوگوں کی غلط فہمیوں اور جہی گوئیوں کے مد نظر اگر وہ اکثر کالب و لہجہ اختیار نہ کرتے اور اپنی طرف سے ان انوائیوں کی اصلاح، ازالے اور تردید کی کوشش نہ کرتے تو کیا اس الوداعی گرد و خبار کو ان کی پوری زندگی پر چھا جانے اور اس کے اثر و مقصد کو دھندلا کرنے دیتے؟ حالی نے یہ محسوس کر کے کہ ابھی تنقیدی سوانح نگاری کا وقت نہیں آیا، نا سمجھ ناظرین کی دہمبری کے لئے سرسید کی مجبور یوں اور دشواریوں کا بھی ذکر کر دیا اور گویا 'جنت' کے قول کے مطابق موت کے بعد ساری بحث و تکرار ختم کر دی۔

لیکن حالی کی اخلاقی جرأت اور انصاف پسندی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کالب و لہجہ نرم ہوتا ہے ان کی طبیعت شرافت، فرائضی اعتدال اور میاد رومی ان کو کسی کے ساتھ سختی برتنے کی اجازت نہیں دیتی۔ چنانچہ اگر کسی کی نمائش میں سرسید کی سبکی کالج میں مذہبی تعلیم کے ناکافی انتظام اور سوا مسلمان طلباء کی تعداد کے معاملے کے علی گڑھ کالج کے دوسرے کالجوں سے کسی بات میں بھرتہ ہونے، سرسید کے کالج کے سلسلہ میں کام کرنے والوں کا ایک حلقہ نہ پیدا کر سکنے، سرسید کے تعلیم نسواں اور مذہب سے متعلق خیالات سے اختلاف اور اس کے باوجود ان کے اجتہاد کی اہمیت کا اقرار، ان کے اوصاف کے اوسط درجہ ہونے اور ان کو محنت اور جفا کشی سے جلا دینے، وقت کی رگنی کے سوا کوئی راگ نہ جانے، ٹرسٹی بل وغیرہ کے معاملہ میں خود رانی، ضد، ہمت اور ڈسپلین طبعیت کے مظاہرے وغیرہ کا صاف اعتراف کیا ہے۔

البتہ انھوں نے سرسید کے سچی حالات و کوائف اور ذاتی پہلو کو بے نقاب کرنے سے بہت حد تک پہلوہی کی ہے اور چونکہ خود بھی مشرقی تہذیب و تمدن کا نمونہ تھے اس معاملہ میں مشرقی ذہنیت اور رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ کیا ہے۔ چنانچہ سرسید کے حلقوں شباب کی انرشوں کا ذکر ایک آدھ جملے میں، کہہ کر کہ رومی کے کسی زاہد کی زندگی کی رگینی کے متعلق اس قول کی کہ ۶ کاش کر دے و گزاشتے کے مصداق اور سرسید کے اس قول کے مطابق ظہیں کہ "اپنے عیبوں کو ڈھانکے رکھو، ختم کر دیا ہے۔ علاوہ بریں سرسید کی مقابلانہ زندگی، بیوی کی وفات، بچوں کی تربیت، ان کے مشغلوں، ان کی زندہ دلی کی مثالوں (جن میں سے بعض بیان نہیں کی جاسکتیں) وغیرہ کی تفصیل

سے بھی، جناب کہا ہے۔ اوجہ سرسید کی خواہش کے دشنام بھرا خط نہیں شایع کیا ہے۔ جتنی کہ سرسید کے بہت سے لطائف و ظرائف کو بھی اس پر کہ ان کے لئے ایک مستقل رسالہ چاہئے، قلم انداز کر دیا ہے حالانکہ رسول کے بہرپس جرنل *A Journal of the Times* کی طرح اگر اسے الگ شایع کرتے تب بھی برا نہ تھا۔ حالی کا چھوٹی چیزیات کی اہمیت کو ظاہر کرنا یا تو بہرہ داری کی غیر شعوری کوشش ہے یا فن سوانح نگاری کے متعلق غلط فہمی کا نتیجہ ہے مثلاً یہ کہ ”یوگرافر اگر بالفرض اپنے ہیرو کی تمام جزئی و کلی حیثیات پر بحث نہ کر سکے تو کم از کم اس کی نمایاں اور مسلم خصوصیتوں کو دکھائے بغیر اپنے فرض سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا“ یا یہ کہ ”گرنیک شخص کی زندگی ایسے مہتم ہاشان و اہمیت سے ہمراہ ہوتی ہے کہ انھیں سمیٹنا یوگرافر کی طاقت سے باہر ہے چہ جائے کہ اس کے لطائف و احوال جمع کرنا“ باب اول میں چیزیات کی بحث میں ہم کہ چکے ہیں کہ بڑے نہیں چھوٹے کام انسان کی شخصیت کے مظہر ہوتے ہیں اور ایک شخص کا بڑے کاموں میں طرز عمل اس کے چھوٹے کاموں میں طرز عمل پر منحصر ہوتا ہے۔ لہذا یہاں لطائف و ظرائف کی اہمیت کا اعادہ بھی غیر ضروری ہے۔

حالی نے سرسید کے کچھ تعلیم و تربیت وغیرہ پر چھوٹی چھوٹی حکایات کے ذریعہ روشنی ڈالی ہے۔ بنارس کی مسجد کی تعمیر (سرسید کے نام کا کتبہ) علی گڑھ کالج کے نام (درسہ احمدیہ) اور کتبہ، نوڈرز ڈسے کی بجائے سرسید کی فونڈیشن ڈسے کی تجویز وغیرہ حیدرہ و اہمیت سے سرسید کا اپنی ناموری سے انکار باسول کے طریقے پر سرسید کے، سچائی، محبت، دوستی رازداری وغیرہ کے متعلق خیالات کا باوجود اظہار (محسن الملک اور دوسروں کے نام خطوط اور دیگر تحریروں میں) وغیرہ سے سرسید کی خصوصیات کا منظر بیان ملتا ہے۔ اس کے علاوہ آخر میں سرسید کی تصنیف و تالیف، قوت و تقریر (پبلک سپیکنگ) رفاہی مشن کی کوششوں، شائستگی و عادات و دیگرہ کے باقاعدہ عنوانوں کی تفصیل ”حیات جاوید“ کے بہترین اور دلچسپ ترین حصوں میں شمار ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسے اجزاء جزئیات و تفصیلات کی ”حیات جاوید“ میں کمی بلکہ یہ مجموعی طور پر خود سرسید کے اپنے متعلق اقوال کی ترجمانی نہیں کر سکی ہے مثلاً ”جب زندگی فرہاد سے بڑھ کر تھی، جب زاہد تھے تو نہایت اکھڑتے، جب صوفی تھے تو ”لحمی“ سے بڑھتے۔ اب خاکسار ہیں اور اپنی قوم کے غم خواہش و میری لائف میں سوا اس کے کہ نہ کہیں میں غریب کپڑاں گھیلیں، لنگوٹے اڑائے، کبوتر پائے، ناچ گھرے دیکھے، اور بڑے ہو کر پیری، افراد رہے دین کہلائے اور رکھا ہی کیا ہے“ ظاہر ہے کہ باوجود ہر چیز میں شدت اور انتہا ہندی کے حیات جاوید میں سرسید زندہ معلوم ہوتے ہیں نہ فرہاد نہ گھڈیوں، لنگوٹوں اور کبوتروں سے اپنی کاکوئی تعلق معلوم ہوتا ہے نہ ناچ گھڑوں سے واسطہ البتہ بہت حد تک پیری، کافر رہے دین وغیرہ کے القاب سے لطف قوم کے بخوار لگتے ہیں۔

سرسید کے تقریر، تقریری اور تعمیری کارناموں کی تفصیل کو حیات جاوید میں دیگر تمام مباحث سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ مثلاً لائل محمد نواز انڈیا، اسباب بغاوت ہند، تبیین الکلام (تفسیر تورات و انجیل) تفسیر القرآن، خطبات احمدیہ وغیرہ وغیرہ کے انتقادات، خلاصے، خصوصیات، موازنے، تبصرے اور مقابلے اور ان کی اسی قبیل کی کتابوں کے مباحث کے تفصیلی تجزیے اخبارات اور مشاہیر کی رائے وغیرہ کے مطالعے کے دوران میں قاری کو یہ شک ہو سکتا ہے کہ زیر نظر کتاب کا نام ”حیات جاوید“ ہے یا تصانیف جاوید۔ حالی کو خود بھی آخر میں اس کا احساس ہوا ہے کہ اس قسم کی مزید بحث نامناسب ہوگی۔ ۵۲ صفحے تفسیر کی مذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ اگرچہ ہمارا ارادہ جیسا کہ دریا ہے میں اسرار کیا گیا ہے۔ اس تفسیر کی مذکورہ بالا خصوصیات پر مفصل بحث کرنے کا تھا۔ لیکن چونکہ بحث طولانی ہے۔ جس کی ایک بائید گرافی متحمل نہیں ہو سکتی، اس کے سوا عام ناظرین کو اس مضمون سے چنداں دلچسپی بھی نہیں معلوم ہوتی، اس لئے جو کچھ اس کے متعلق ہم نے لکھا ہے یا آئندہ لکھیں گے اس کو کسی باوقفت میگزین کے متعدد نمبروں میں دو دو تین تین شایع کیا جائے گا۔ حالی کے حیات جاوید میں شامل کردہ بہت سے مباحث پر یہ چیز صادق آتی ہے حقیقت

ہے کہ حاتی نے تفسیر کے بعض مباحث کا خلاصہ جو لکھا ہے اس کے ایک پیراگراف کی بجائے ایک ایک جملہ کافی تھا۔ لیکن وحید الدین سلیم سے طویل بحث کہ بھی ادھوری سمجھتے ہیں کیونکہ اس میں سرسید کی مذہبی روشن خیالی پر نکتہ چینی کے موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا یہ رہی صانیع (تقریروں کا خلاصہ بھی ہے) کی تفصیل جس کے متعلق بھی اگر یہ کہا جائے کہ بحیثیت ادیب چونکہ حاتی کا خاص میدان ہے اس لئے ان کا جی لپٹایا ہوگا، تو غلط ہوگا، کیونکہ حاتی اصول پرست انسان ہیں اور وہ اپنے آپ کو اور اپنے رجحانات کو اجتماعی مفاد کے تحت رکھتے ہیں اور ہر چیز پر افادی نظر ڈالتے ہیں لیکن اسی قسم کی تفصیل ہمیں سرسید کی تعلیمی کوششوں (پانچواں باب) علی گڑھ لے اور پور ڈنگ کے خصوصیات ریاضت، وقت کی پابندی وغیرہ کے حکمران قوم کی اطاعت کے لئے ضروری ہونے کا مفصلہ خیر ذکر، سلم کانفرنسوں، کونسل کی خدمات (مثلاً ایجوکیشن کمیشن کے سامنے شہادت) وغیرہ کی روداد میں بھی ملتی ہے۔ کارناموں کے بیان میں ل کی کھال نکالنے والی یہ تفصیل اور ذاتی حالات میں وہ ایجاز و اختصار اور سرسری سے اشارے، قاری کے احساس تناسب پر گراں زد تھے ہیں اور وہ ہیرو کی ذاتی اور شخصی طور پر بہتر واقفیت کی تمنا دل میں لئے رہ جاتا ہے۔ اسی طرح حاتی کا غیر ضروری حجاب بھی قاری کے بار خاطر ہوتا ہے اور وہ مصنف کے عمومی اعتدال اور میانہ روی کے مد نظر اپنے موضوع کی پودہ داری کے معاملہ میں اس انتہا پسندی اور غیر پسندیدہ نظروں سے دیکھتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور خامی جو حاتی کے یہاں ہمیں نظر آتی ہے اور جس نے کتاب کے حجم کے اضافے میں مدد دی ہے وہ انکی خطوط کے اندراج کی عادت ہے۔ سوانح نگاری میں عموماً خطوط کی نقل کی نہیں بلکہ خطوط کے استعمال کی ضرورت ہے۔ حاتی نے سرسید کے نجی اور عام حالات و کردار اور کارناموں دونوں کے معاملے میں، نہایت فراخ دلی سے خطوط کو نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ اختصار کی تحریروں، مشاہیر کی تقریروں اور مختلف تصانیف سے طویل اقتباسات وغیرہ کو بلا کم و کاست پیش کر دیا ہے۔ اس میں حتی الامکان انٹ چھانٹ، امتیاز اور احتراز کی ضرورت تھی اسی قسم کی کمی، سرسید کے متعلق غلط فہمی اور کتاب کی اشاعت میں تاخیر ناشیروں، تہ فروشنوں اور پڑھنے والوں کی بے اعتنائی کا باعث ہوئی ورنہ مہات جابوید اور الفاروق ادبی اور قومی دونوں لحاظ سے ناقابلِ راموش کتابیں تھیں۔

جہاں تک حاتی کے اسلوب کا تعلق ہے، اس میں حیات جاوید میں وہ شادابی اور شگفتگی نہ سہی جو یادگار غالب میں ہے اور اس میں سرسید کی شخصیت کے اصلاحی اور معنوی رنگ کی جھلک سہی، جس سے گریز مشکل ہے اور کہیں کہیں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی بجا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن عربی سے متاثر اور صاف و سادہ روسی نشر سے مشابہ، حاتی کی نشر کی چٹنگی، پاکیزگی، سلاست روانی سادگی، سنجیدہ تانت، وضاحت و طبع سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ فنی، اصطلاحی، فلسفیانہ یا جذباتی کوئی پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ بھی ان کی تحریر میں ان خصوصیات میں سد راہ نہیں بن سکتا۔ جس جدید نشر کی بنیاد سرسید نے رکھی تھی، حاتی نے اسے مستحکم کر دیا۔ آج کی اور مستقبل کی زبان حاتی ہی اعظم ہے، نئے لکھنے والوں اور ترقی پسندوں نے اسی کو اپنا پایا ہے (آج جدید نشر نگاروں میں آزاد، نظیر احمد اور شبلی کا مفاد نہ وہ اور ہی دلی نظر آتا ہے) انھوں نے کہ کتاب کی ضخامت اور زمانے کی بخت ہندی نے زبان، ادب اور تمدن کے اس خزانے سے لوگوں کو محروم کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ حاتی کی اپنی مختصر آپ بیتی بھی ملتی ہے جو اگرچہ بظاہر ایک چھوٹی چیز ہے لیکن اپنی نوعیت کے لحاظ سے کلام نام ہے اور ایک دھماکے جیسے بعد میں اسماعیل میرٹھی اور صالحہ عابد حسین جیسے لوگوں نے گوشت پوست سے آراستہ کیا۔ مولانا حاتی کا آب حیات کے لئے لئے ہوئے مومن خاں مومن کے حالات کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے۔

(باقی)

سے بھی اجتناب کیا ہے۔ اور دستبرد کی خواہ

اس ہے کہ ان کے لئے ایک مستقل رسالہ چاہئے

کی طرح اگر اسے الگ شائع کرتے تب بھی ہرگز

یا فن سوانح نگاری کے متعلق غلط فہمی کا نتیجہ ہے

اس کی نمایاں اور مسلم خصوصیتوں کو دکھائے

سے بھری ہوتی ہے کہ انھیں سمیٹنا ہو گا اگر

# عجیب و غریب نئی خبر

(۱)

اڈمونڈ کی عمر ۳۴ سال کی تھی جب اس نے ڈاکٹری کی اعلیٰ سند حاصل کی۔ چونکہ یہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اس لئے انھیں اس کی کامیابی پر بڑی مسرت ہوئی اور اس کے باپ نے جو اقلیت میں ڈاکٹر تھا اپنے بیٹے کے لئے پیرس کے قیام کو مناسب سمجھا۔ چونکہ اڈمونڈ حسن سیرت کے علاوہ حسن صورت کے لحاظ سے بھی اپنے اندر خاص کشش رکھتا تھا، اس لئے وہ یہاں بہت جلد مشہور ہو گیا اور پیرس کے اعلیٰ اعلیٰ خاندانوں میں اس کی رسائی ہو گئی۔

اس کو پیرس میں اپنا کام شروع کئے ہوئے ابھی تین مہینے گزرے تھے کہ اس کا ایک دوست جو زائد طالب علمی کا رفیق تھا، ایک دفعہ اڈمونڈ کے پاس آیا اور بولا کہ ”میں آج کی رات ایک نہایت اہم ضرورت سے پیرس چھوڑ رہا ہوں۔ میں بڑا ممنون ہوں گا اگر آپ میری غیبت میں میرے ایک مریض کا علاج جاری رکھیں، چونکہ وہ بہت غریب ہے اس لئے مجھے معلوم ہے کہ میرے بعد مشکل ہے کہ وہ کوئی طبی مشورہ حاصل کر سکتا ہے۔ اس کا نام ویسے یاد ہے۔ اور اپنی بیوی کی اعانت سے تصویریں بنا کر یہ مشکل بقدر کفایت حاصل کر سکتا ہے۔“

اڈمونڈ نے پورے جدت مسرت کے ساتھ اس خدمت کو قبول کر لیا۔ اور اسی وقت وہ باور مصور کے مکان پر پہنچا، لیکن چھتھی سے وہ حالت نزع میں تھا اور قبل اس کے کہ اڈمونڈ اس کے لئے کوئی دوا تجویز کرنا اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی بیوی کو قدر کا جیناب و دلچسپ ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ وہ دنیا میں اپنے تئیں چھوٹے بچوں کی پرورش کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دی گئی تھی، لیکن اس کے اضطراب کا یہ بھی ایک خاص سبب تھا کہ وہ غریب مرنے والے کی تجویز و تکفین بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اڈمونڈ نے یہ حالات معلوم کر کے اس کو تسکین دی اور اپنے پاس سے تمام ضروری مسامحت ادا کر کے آئندہ بھی اعانت کا وعدہ کیا چونکہ اس قسم کی ہمدردی دوستی و محبت کے تمام درجہ دفعہ طے کرا رہی ہے، اس لئے ان دونوں میں فوراً خلوص پیدا ہو گیا اور رفتہ رفتہ اڈمونڈ کو اس سے محبت ہو گئی، کیونکہ سزاوین (باور مصور کی بیوی) حقیقتاً صورت کے لحاظ سے عدد درجہ دلکش ہستی تھی اور ایک انسان کے لئے مشکل تھا کہ اس کے دائرہ جذبہ کشش سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔

اڈمونڈ کی اس حیات معاشرہ کو تین سال کا زمانہ گزر گیا اور اس مدت میں مخفی محبت کی جتنی لذتیں حاصل کی جا سکتی ہیں ان دونوں نے حاصل کیں۔ آخر کار ایک دن آیا کہ سزاوین کے نگاہ سے پردہ اٹھا اور اس نے محسوس کیا کہ اب اڈمونڈ اس سے بیزار ہو گیا اور اس کی اعانت و محبت سے وہ بالکل محروم ہو گئی ہے۔

اس فتنہ کے زایل ہونے کے بعد اڈمونڈ نے پھر اپنے پیشہ کی طرف توجہ کی اور پورے انہماک کے ساتھ کسب جاہ و فہرت میں مصروف ہو گیا چونکہ اڈمونڈ میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو ایک طبیب یا ڈاکٹر کو بام شہرت پر پہنچا دیتی ہیں، اس لئے وہ اپنے مقصد میں بہت جلد کامیاب ہو گیا اور اس کے والدین کو اس کی شادی کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔

ایک دن یہ بازار سے گزر رہا تھا کہ اس نے ایک نہایت ہی شگفتہ حسن رکھنے والی فوجوان لڑکی کو گارڈ میں سوار دیکھا جسے جانتے پہچانتے تھا اس نے بھی اپنا سمت سفر بدل کر اسی کے پیچھے پیچھے جانا شروع کیا، حتیٰ کہ وہ ایک جگہ اتر کر مکان میں داخل ہو گئی۔ اب اس کے لئے معلوم

لڑا چڑھاؤں و خوار نہ تھا کہ یہ کس خاندان کی لڑکی تھی اور اس کے کیا حالات ہیں، اس لئے اس نے یہ تمام باتیں معلوم کر کے اپنی ماں کو اطلاع دی اور آخر کار اڈمونڈ کی آمد و رفت وہاں شروع ہو گئی۔ چونکہ یہ سارے پیرس میں خاص شہرت رکھتا تھا اور علاوہ ان ظاہری کے اس کے دو متضاد ہونے کا خیال بھی کوئی اوسے متضاد شہرت نہ تھا، اس لئے وہ لڑکی اس کی طرف بہت جلد مائل ہو گئی اور اس نے شادی کا مسئلہ پیش کر دیا، چونکہ پیرس میں لڑکی کے والدین اول اول انہماک رضا مندی سے انکار کر دیتے ہیں تاکہ اس طرح ان دونوں میں اور زیادہ محبت بڑھ جائے اس لئے لڑکی کی ماں نے پہلے تو انکار کر لیا۔ لیکن جب لڑکی اس صدمہ سے سخت بیمار ہو گئی اور چارہ کار و دوا نظر نہ آیا تو اس کی شادی اڈمونڈ سے کر دی گئی۔

نظاہر اڈمونڈ کو ہر شخص دو متضاد افسانہ سمجھتا تھا اور اس کی شہرت اور پیشہ کی کامیابی کا نتیجہ بھی ہونا چاہئے تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی مالی حالت بہت خراب تھی اور تھا۔ بازی کی حادث نے جو بلا و مغرب کی تمام بلند سوسائٹیوں میں بکثرت رائج ہے اُسے سخت تباہ کر رکھا تھا لیکن بظاہر وہ اپنی گزری کو کسی پر غماز نہ ہونے دیتا تھا اور ہر شخص سے اُسے کامیاب و باعرا و خیال کرتا تھا۔ شادی کے دو سرے سال اس کے لڑکی پیدا ہوئی۔ اور اسی زمانہ میں جب کہ تہنیت پیش کرنے والے احباب آتے جاتے دیکھتے تھے اس کے ایک دوست نے منسورہ دیا کہ ”تم اپنی لڑکی کی زندگی کا بیکہ کیوں نہیں کرتے، سالانہ تھوڑی سی رقم ادا کرنی پڑی گی اور بارہ سال کے بعد یکمشت تم کو معقول رقم مل جائے گی جس کو تم اس کی تعلیم پر صرف کر سکتے ہو۔“

اڈمونڈ نے اس رائے کو پسند کر کے اسی وقت جیکبسنی کے ایک کارکن کو بلا کر تمام مراحل طے کرتے تھے اور پھر سستور اپنی بظاہر خوش حال اور باطن تباہ زندگی کے مصائب میں گرفتار ہو گیا۔ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے آلام و مصائب کس حد تک پہنچ جاتے تھے اسی اثنا میں اس کی ساس جو اپنی بیٹی سے ملنے آئی تھی دفعۃً بیمار ہو کر نہ مر جاتی۔ چونکہ یہ بالدار عورت تھی اس لئے اس کا ماما نیکہ اس کی بیٹی کو ملا اور اس طرح کچھ دنوں کے لئے اڈمونڈ کی فکر دل میں بہت کچھ کمی پیدا ہو گئی۔

(۲)

پیرس کے اس حصہ میں جو صرف غریبوں کے رہنے کے لئے مخصوص ہے، ایک فقیر و بیدار مکان میں سراوین اپنی پریشان زندگی بسر کر رہی ہے۔ اب اس کا سن ۴۰ سال سے متجاوز ہو چکا ہے اور تصویر کشی کے ذریعہ سے صرف اس قدر حاصل کر سکتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح حیات باقی رہے۔ اس لئے وہ اپنے بچوں کی تعلیم کا بھی انتظام نہیں کر سکتی۔

اسی حال میں کئی سال بسر ہو گئے اور اڈمونڈ۔ اُس اڈمونڈ کے حال سے جس کی محبت میں اس نے اپنی پوری زندگی کے تین سال حد درجہ لطف و مسرت کے ساتھ بسر کئے تھے، وہ بالکل بے خبر رہی، اس میں شک نہیں کہ سراوین کو اب بھی اس سے محبت تھی اور وہ اب بھی اس کی بے انتہائیاں اور بے پرواہیاں عقیدہ کر دینے کے لئے طیار تھی۔ لیکن اڈمونڈ نے جو ایک بار اس کی طرف سے نہ مڑا تو پھر خبر کی کر وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

ایک دن جب کہ وہ سخت حالت یاس میں بھی ہوئی آگ کے پاس بیٹھی بیٹھی اپنے آپ کو گرم کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ دفعۃً کسی شخص نے دروازہ کھٹکٹا دیا۔ سراوین اٹھی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہاء نہ رہی جب نے اڈمونڈ کو اپنے سامنے دیکھا۔ بجلی کی طرح تمام گزشتہ واقعات اس کے دماغ سے گزر گئے اور اس نے محسوس کیا کہ وہ اب بھی اسی شدت کے ساتھ اڈمونڈ سے محبت کرتی ہے۔ اڈمونڈ نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے اور بولا کہ۔

”اے سراوین اب گزشتہ دو محبت کی یاد مجھے نہ دلاؤ کیونکہ میری شادی ہو چکی ہے۔ البتہ میں اس پر بہت نادم ہوں کہ اتنے عرصہ تک میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکا۔ بہر حال اب میں اس غفلت کی تلافی کرنے کے آمادہ ہوں۔“

سراوین نے جواب دیا کہ ”مجھے اپنی پروا نہیں ہے۔ کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کر رہی ہوں، لیکن مجھے اپنے بچوں کی تعلیم

لا بڑی فکر ہے جس کا انتظام مجھ سے نہیں ہو سکتا، علاوہ اس کے بڑی لڑکی طویل علالت نے بھی مجھے سخت سچپن کر رکھا ہے۔  
 اڈمونڈ۔ ”کہاں ہے۔ بلاؤ۔“

سراوین اٹھی اور اپنے ایک پڑوسی کے مکان سے اُسے بلا لائی۔ اڈمونڈ نے نہایت غور سے اُسے دیکھ کر کہا کہ اس کی حالت اچھی ہے اور صرف غذا میں ذرا احتیاط کی ضرورت ہے، سو تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں سارا انتظام کروں گا اور ہاں تمھاری بہن میڈم ریڈر کا یہ حال ہے، کیا تم سے ملاقات نہیں ہوتی؟“

سراوین۔ ”نہیں، کبھی کبھی آتی ہے، لیکن چونکہ اس کا حال مجھ سے زیادہ خراب ہے اس لئے وہ میری مدد کیا کر سکتی ہے۔“  
 اس کے بعد تھوڑی دیر تک دونوں طرف سکوت طاری رہا اور پھر اڈمونڈ نے اپنی کرسی قریب کر کے کہا ”اے سراوین، ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی ہے، جس سے نہ صرف تمھارا بلکہ تمھاری اولاد کا مستقبل بھی امید افزا ہو جائے گا، لیکن قبل اس کے کہ میں وہ تدبیر بیان کروں، مجھے عہد کرو کہ کسی سے اس کا ذکر نہ کرو گی ورنہ میرے تمھارے دونوں کے لئے مشکلات پیش آجائیں گی۔“  
 سراوین۔ ”کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ میں نے تمھارے کسی راز کو ظاہر کر دیا ہو۔“

اڈمونڈ۔ ”اس کا مجھے یقین ہے، لیکن احتیاطاً میں پھر کہتا ہوں کہ یہ تدبیر کسی انسان پر ظاہر نہ ہونی چاہئے۔“  
 یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باہر دروازہ سے نکل کر اس نے ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کرنے کے بعد اندر سے بند کر لیا اور سراوین کے قریب آکر بولا کہ ”سب سے پہلے تو ہمیں یہ کرنا چاہئے کہ تمھاری زندگی کا بیمہ کر دیا جائے، چونکہ تمھاری عمر چالیس سے زائد نہیں ہے اور صحت بھی اچھی ہے اس لئے کمپنی بڑی رقم کا بیمہ کرنے پر تیار ہو جائے گی۔“

سراوین حیرت زدہ ہو کر بولی کہ ”میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے، سالانہ قسط کیونکر ادا کر سکوں گی۔ اور اگر میرے اہلکار میں ہوتا تو میں پانچ ہزار فرانک کا بیمہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتی۔“

اڈمونڈ۔ ”پانچ ہزار! میں تو پانچ لاکھ فرانک کا بیمہ کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ میری حالت فی الحال اچھی ہے اس لئے دو چار قسطیں ادا کروں گا اور اس کے بعد ادا کرنے کی فوجت نہ آئے گی۔“

سراوین یہ سن کر ایک حیرتناک قسم کے ساتھ مسکرائی۔ اڈمونڈ نے کہا ”میرا اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ تم جلد مر جاؤ گی اور اس لئے قسطوں کے ادا کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ کیونکہ تم ماشاء اللہ ابھی صحیح و توانا ہو اور مجھے یقین ہے تم اپنی عمر طبعی کو پہنچو گی۔“  
 یہ سن کر سراوین اور زیادہ متحیر ہوئی کہ پھر قسطوں کے روانہ کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے اور اس لئے وہ اب سراپا استفہام بنی اڈمونڈ نے کہا کہ ”اس کی تدبیر یہ ہے کہ ایک یا دو قسطوں کے بعد تم اپنے تئیں کسی سخت مرض میں مبتلا ہونا ظاہر کرو گی اور حسب قاعدہ تمھیں بیمہ کمپنی کو اس کی اطلاع کرنی ضروری ہوگی۔ جب کمپنی دیکھے گی کہ تمھاری جان خطرہ میں ہے تو وہ فوراً مفاہمت کی کوشش کرے گی اور تمھاری زندگی بھر چار پانچ ہزار فرانک سالانہ پر یہ معاملہ طے ہو جائے گا۔“ یہ میرا ذمہ ہے کہ بظاہر تم سخت مرض میں مبتلا نظر آتی رہو اور فی الحال تمھیں کوئی آزار نہ ہو۔“

اس میں شک نہیں کہ اگر سراوین طبعاً شریف النفس ہوتی تو اس کمزور قریب کو کسی گوارانہ کرتی لیکن حقیقت یہ ہے افلاس اچھے سے اچھے اخلاق کے انسان میں ردی خصایل پیدا کر دیتا ہے اور آخر کار سراوین نے بھی اس پر رضا مندی ظاہر کر دی۔

(سو)

چند دن میں بیمہ کی کارروائی مکمل ہو گئی اور ڈاکٹر اڈمونڈ نے اپنی ضمانت پیش کر دی کہ... گئی کی سالانہ قسط ادا ہوتی رہے گی اس کے بعد اڈمونڈ نے وہ تدبیر شروع کیں جن سے صرف وہی واقعہ تھا چنانچہ وہ ایک مشہور وکیل کے پاس گیا اور یہاں کہا کہ ا۔  
 ”جس زمانہ میں سراوین سے میرے تعلقات تھے، اس وقت میں وقتاً فوقتاً اس کو قرض دیتا رہتا تھا، یہاں تک کہ قرض کی مقدار بڑھ

بڑھ گئی اور اب اس کے ادا ہونے کی صورت یہی تھی کہ اس کی زندگی کا بقیہ کرا کے اس رقم کو قابل وصول بنائے۔ چنانچہ سرائین اس پر راضی ہو گئی ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو، ورنہ میری بیوی کو سخت ناگوار ہوگا، وکیل نے پوچھا کہ ”قرض کی مقدار کتنی ہے۔“ اڈمونڈ نے بجائے ۵ لاکھ فرانک کے صرف ایک لاکھ فرانک بتایا۔ ہر چند وکیل کو اس پر بھی سخت حیرت ہوئی، لیکن اس نے ایک دستاویز کا مسودہ مرتب کر دیا اور ڈاکٹر نے اپنے گھر جا کر اسے صاف کر کے دی ۵ لاکھ فرانک کی رقم درج کی اور سرائین سے اس پر دستخط لے لئے۔ اسی کے ساتھ اس نے ایک وصیت نامہ بھی اس سے لکھوایا کہ تیسرے بعد میرے تمام مطالبات جو بقیہ کمپنی پر عاید ہوں گے ان کا مالک ڈاکٹر اڈمونڈ ہوگا اور وہی میری اولاد کا ولی ہوگا۔“

(۴)

چار چھینے گزر گئے اور سرائین لطف و مسرت کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگی، کیونکہ اڈمونڈ اس کے مصارف کے لئے بھی ہر ماہ معقول رقم دیا کرتا تھا۔ ایک دن اڈمونڈ آیا اور بولا کہ ”آج میری بیوی راضی ہو گئی اس لئے مجھے فرصت مل گئی کہ تم سے قرارداد کے متعلق مریض بننے کی درخواست کر لوں۔“ سرائین - ”لیکن میں حیرت میں ہوں کہ کس بیماری کا بہانہ کروں، جب کہ میں آج معمول سے زیادہ مسرور و مطمئن ہوں۔“ اڈمونڈ - ”میری رائے میں تمہیں ظاہر کرنا چاہئے کہ تم زینہ سے گر پڑی ہو اور تمہیں کوئی سخت عصبی صدمہ پہنچا ہے۔“ آخر کار رات کو تمام پڑوسیوں نے زینہ پر کسی چیز کے گرنے کی آواز سنی اور صبح کو سب نے جان لیا کہ سرائین پھسل گئی اور اس کے سخت چوٹ آئی ہے۔ چنانچہ ایک ڈاکٹر بلا لایا گیا اور اس نے علاج شروع کیا۔ جب سرائین کی بہن کو خبر معلوم ہوئی تو وہ بھی عبادت کے لئے آئی اور اُس سے سرائین نے سارا حال بیان کر کے عہد لے لیا کہ کسی پر ظاہر نہ کرے گی۔

(۵)

جب ایک چھینے گزر گیا سرائین کی بیماری کو ہو گیا تو اڈمونڈ آیا اور بولا کہ ”اب وقت آیا ہے کہ بیکمپنی کو اطلاع دیجائے لیکن خرابی یہ ہے کہ جب کمپنی اپنا ڈاکٹر معائنہ کے لئے بھیجے گی اور انہیں صبح و توانا پائے گی تو نتیجہ نہ نکلے گا، اس لئے میں تمہیں ایسی دوا دیتا ہوں جس سے تم عارضی طور پر بیمار پڑ جاؤ گا ۲۴ گھنٹہ کے بعد پھر اچھی ہو جاؤ گی لیکن یہ ضرور ہے کہ تمہیں اس طرح تھوڑی سی تکلیف برداشت کرنی پڑے گی۔“ سرائین اس پر راضی ہو گئی اور دوا اپنے کے بعد بیکمپنی کو اپنی علالت کی اطلاع دی دوائے اپنا اثر کرنا شروع کیا اور وہ انتظار کرنے لگی کہ کمپنی کا کوئی ڈاکٹر آتا ہوگا۔ لیکن وہ اس سے واقف نہ تھی کہ کمپنی کبھی اپنا ڈاکٹر نہیں بھیجتی کہ مبادا وہ شخص جس کی زندگی کا بقیہ کیا گیا ہے پرانے دو شخصہ میں قصداً اپنی جان دیدے۔ اس لئے وہ انتظار ہی کرتی رہی اور اس کی حالت خراب ہوتی گئی۔ اسی درمیان میں اڈمونڈ کی ایک تحریر پہنچی کہ ”میں آ رہا ہوں اور شام تمہارے ہی پاس بسر کروں گا۔“ اس تحریر کو پڑھ کر سرائین بہت مسرور ہوئی اور اپنی تکلیفوں کو زیادہ صبر و ضبط سے برداشت کرنے لگی۔

آخر کار شام کو ۱۰ بجے اڈمونڈ آیا اور رات کے دس بجے تک وہیں رہا لیکن سرائین کی حالت بد سے بدتر ہو گئی تھی صبح کو پڑوسیوں نے اسی ڈاکٹر کو پھر بلا یا جس کا علاج پہلے شروع کیا تھا، لیکن جب وہ آیا تو اس سے کسی نے کہا کہ ”مریضہ نے تمہاری دوا نہیں کی، اس لئے وہ برہم ہو کر چلا گیا۔“

شام کو پھر اڈمونڈ گھبرا ہوا آیا۔ اور دوا کی دوسری خوراک دیکر بولا کہ ”میں ٹھہر نہیں سکتا کیونکہ مجھے ایک خاص ضرورت رکھنا چاہیے۔“ اس خوراک کے بعد سرائین کی حالت بہت ردی ہو گئی اور مجبوراً ایک اور ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا گیا اس نے ہیضہ شروع کیا اور دوائے اپنے کے لئے دی۔ سرائین مسکرائی اور اپنی بڑی لڑکی سے بولی کہ ”اس ڈاکٹر کی دوا مجھے اچھا نہیں کر سکتی۔“ تم نافع فکر کرتی ہو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو جب دوسرے دن صبح کو ڈاکٹر دوبارہ آیا تو سرائین حالت نزع میں تھی اور اسی کے سامنے اس نے جان دیدی۔

شام کو اڈمونڈ نے کمپنی کو اطلاع دی کہ ”سرائین کا انتقال ہو گیا ہے اور وصیت کے ذریعہ سے اپنے تمام مطالبات کا مالک

مجھے بتا گئی ہے۔" کہنی نے اڈمونڈ کے دعوے اور سراوین کے وصیت نامہ کو صحیح تسلیم کر لیا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ روپیہ ادا کر کے پولیس کے پاس ایک گناہ گرام قریب اس مضمون کی پہونچی کر "سراوین کی موت ایک ماہ پہ اور پولیس کو اس کی تحقیق کرنی چاہئے۔" جب چودہ دن گزر گئے اور میں ہزار گنی کی رقم جو اڈمونڈ کو ملنی چاہئے تھی نہیں ملی تو یہ سخت برہم ہوا اور کہنی سے اس تاخیر کا سبب دریافت کیا۔ لیکن دوسرے دن صبح کو جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا ہوا کھا رہا تھا دروازہ کی گھنٹی بجی اور خادمہ ایک کارڈ لیکر آئی۔ اڈمونڈ نے اس کارڈ کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی خفیہ پولیس کا افسر ہے چنانچہ اپنی بیوی سے یہ کہتے ہوئے کہ "میں ابھی عدالت میں واپس آتا ہوں" باہر گیا اور بغیر کسی خوف و ہراس کے اظہار کے اس سے گفتگو شروع کی۔

خفیہ پولیس کے افسر نے کہا کہ "ہمارے حکم کو اطلاع ملی ہے کہ سراوین کی موت ایک ماہ پہ اس نے اس کی لاش قبر سے نکال دی گئی اور معائنہ سے معلوم ہوا کہ یہ کچھ نہایت زہر کے ذریعہ سے جسے ڈیجی ٹیس کہتے ہیں اس کی موت وقوع میں آئی ہے چنانچہ اس کے کافذات غیر ذمہ دیکھے گئے تو معلوم ہوا کہ اس نے اپنی زندگی کا بچہ بڑی رقم پر کرایا تھا۔ کہنی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ساری رقم آپ کو ادا کی جاتی ہے اس نے میں آپ سے دریافت کرنے آیا ہوں کہ سراوین ایسی مفلس عورت کیونکر اتنی بڑی رقم پر اپنی زندگی کا بچہ کرسکی، جب کہ وہ کسی طرح ایک نسط بھی ادا نہ کر سکتی تھی۔"

اڈمونڈ نے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ تمام باتوں کا جواب دیا اور سراوین کی تحریریں نکال کر اس پر ثابت کر دیا کہ وہ اسکی مقروض تھی۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی کہا کہ میرا مقرض تو اس کے اوپر صرف بیس ہزار فرانک ہے، جو مجھ کو ملے گا باقی اس کی وصیت کے مطابق اس کی اولاد کی تعلیم پر صرف ہوگا۔ پولیس افسر ذہنت ہو گیا لیکن جب وہ پھر اپنی بیوی کے پاس گیا اور وہاں کھڑکیوں سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ خفیہ پولیس اس کے مکان کی نگراں کر رہی ہے، اور وہ حراست میں ہے، اب چونکہ ذہنت یہاں تک پہونچ گئی تھی اور اُسے آنے میں دیر بھی زیادہ نہ تھی اس نے اُس کو مجبوراً اپنی بیوی سے سارا حال ظاہر کرنا پڑا، مگر اس نے وہ خاص باتیں جو اُسے مجرم بنانے والی تھیں، اپنی بیوی پر ظاہر کیں اور پولیس افسر کو ان سے آگاہ کیا۔

(۲)

دوسرے دن اڈمونڈ باضابطہ حراست میں لے لیا گیا اور سارے پیرس میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی، اڈمونڈ کا خسر جگہ پیرس کا نہایت مشہور وکیل تھا اور اڈمونڈ خود بھی اپنے ظاہری اخلاق کی بدولت شہر کی کافی بددی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس نے جب مقدمہ عدالت گاہ میں پیش ہوا تو ہر شخص اڈمونڈ کی طرف سے پیروی کرنے کے لئے آمادہ تھا اور پیرس کے بہترین وکلاء اس کے ساتھ تھے۔ سرکاری وکیل نے جو ثبوت پیش کیا اس میں سب سے اہم سراوین کی بہن کا بیان تھا جس کو سارا حال معلوم تھا اور اس کے بعد ڈاکٹر کی شہادت تھی جس کو سراوین کی لاش میں ڈیجی ٹیس کے ذرات دستیاب ہوئے تھے۔

جس وقت سرکاری وکیل نے اڈمونڈ کے خلاف اپنی گفتگو شروع کی تو اس نے دوران بحث میں یہ بھی ظاہر کیا کہ اڈمونڈ کی ساس بھی غالباً اس ہذیبہ کا شکار ہوئی۔ لیکن چونکہ وہ اس کو ثابت نہیں کر سکتا تھا اس لئے اس پر زیادہ گفتگو نہیں کی اور صرف سراوین کے واقعات نقل پر پوری روشنی ڈال کر اڈمونڈ کو اہل ثبوت کیا۔

اڈمونڈ کے خسر نے صفائی میں اڈمونڈ کی گزشتہ زندگی اور اس کی پاکیزہ اخلاق کی متعدد مثالیں پیش کر کے اپنی حقیت بیان سے بچنے کے خیال کو بالکل اپنے معاف کر لیا۔ لیکن فیصلہ کے وقت جوری سے ملنے لگئی تو انھوں نے اُسے سراوین کے قتل کا دھمک قرار دیا اور مزید موت اس کے لئے جوڑ دی گئی۔ لیکن اڈمونڈ کی عجیب و غریب فطرت اپنی گھیل کے ساتھ اس وقت ظاہر ہوئی جب نصاب کے وقت اسے سب کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ لوگ شاہد رہیں اور میرے تمام اعزاء اور اصحاب کو یہ خبر پہونچا دیں کہ میں بالکل بے قصور ہوں اور عدالت کی غلطی پر میری قیوتی چڑھائی جاتی ہے۔

# تمدن جدید کی درون کا داستان

## تہذیب شائستگی کے صحیح خط و خال

اب سے ۳۱ سال قبل میں نے مغرب کے تمدن جدید پر ایک سرسری تبصرہ کیا تھا، جس کو آج غلط ہو جانا چاہئے تھا لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ وہ آج بھی حزن و حزن سمجھے ہے۔ یہ میری فراموشی نہیں بلکہ ہند انسان کی "دائمتہ نفس" ہے وہ ہند انسان جس نے یورپ میں جنم لیا اور آہستہ آہستہ ساری دنیا پر پھیل گیا۔

نیاز

لوگ کہتے ہیں کہ زمانہ بیسویں صدی میں بہت ترقی کر رہا ہے۔ پچھلے اکتشافات نے انسان کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ علمی تصنیفات نے نئی دنیا پیدا کر دی ہے۔ فلکی مشاہدات نے پردہ غیب چاک کر دیا ہے۔ کیمیاوی ایجادوں نے اتنی آسانیاں پیدا کر دی ہیں کہ جن باخود بادشاہ بھی قادر نہ تھے آج معمولی درجہ کے لوگوں کے اقتدار سے باہر نہیں۔ ہم سمندر میں سفر کریں تو باد و مخالف کی پروا نہیں۔ ہوائی سیہ تو باد و باران کے طوفان مزاحم نہیں۔ گھر بیٹھے سارے جہان کی خبریں پڑھتے ہیں۔ تار اور ٹیلی فون سے ملک ملک کے حالات اپنے کانوں اور آنکھوں دیکھتے ہیں۔ بجلی کی قوت ہمارے لئے روشنی کرتی، کھانا پکاتی، پانی ٹھنڈا کرتی ہے، جو تاسات کرتی، گھر میں جھاڑو دیتی، کپ پہناتی، پنکھا جھلکتی ہے۔ یہ باتیں پہلے کہاں حاصل تھیں، ان باتوں سے قطع نظر دیکھو کہ جو آرام، جو مسرت، جو لطف ہمیں آج حاصل اس کا عشر عشر بھی کبھی دنیا کو حاصل ہوا؟ بیار ہوں تو دنیا کے اچھے سے اچھے ڈاکٹروں کا مشورہ حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسی دوائیں مل رہی ہیں جن سے فشوں میں فایرہ ہوتا ہے، غدد بدولالینے سے مرہم لگائی جاتی اور جراثیم قوت آتی ہڈی ٹوٹ جائے تو جانوروں کی ہڈی کا چوڑا جاتا ہے، آنکھیں خراب ہو جائیں تو مصنوعی آنکھیں کام دینے لگتی ہیں۔ موسمی تغیرات ہمارے ہاتھ میں آ رہے ہیں، بارش کا ہوتا ہوا ہمارے اختیار میں آتا جاتا ہے، فضا کے کبروائی ذرات ہمارے کام کرنے کے لئے طیارہ ہیں، آفتاب کی حرارت ہماری غلام بنتی جا رہی۔ کیرٹس کوڑوں کے تھلک جڑائیم ہماری فوج کا کام دینے کے لئے ترتیب دے رہے ہیں، قحط کا نشانہ مٹا جا رہا ہے، ادی خارجہ کے لئے نئے طریقے نکالے جا رہے ہیں، حفاظت و دفاع ذات اور عزت نفس کے بہترین سامان پیدا ہو رہے ہیں، اب جنگوں میں ہمارا تنفس بھی مضبوط نہیں ہوگا، گھر بیٹھے دوائیاں ہو کر ہیں اور جس کے پاس علم و دانش کی قوت زیادہ ہوگی وہی جیتے گا۔ کیا باتیں کو پہلے حاصل تھیں؟

فزع انسان پہلے غلام تھی کوئی شخص آزاد و خود مختار نہ تھا، کسی پر انسانوں کی حکومت تھی کوئی اپنے دایرہ کا غلام تھا اور اس کے مجبورانہ قہرات حکمران تھے، لیکن اب علم کی روشنی، فلسفہ کی بصیرت اور اقلیت کے احیاء نے ان تمام باتوں کا خاتمہ کر دیا ہے، کسی پر کوئی غلام کر سکتا ہے، نہ کوئی اپنی مرضی کے غلام کام کرنے پر مجبور کر سکتا ہے اور نہ اپنی محنت سے مستفید ہونے پر مجبور کر سکتا ہے، دنیا میں آزادی خیالی پھیل رہی ہے، نظریں وسیع ہو رہی ہیں، لوگ معاملہ فہم ہوتے جا رہے ہیں اور وسیع الحیالی، تمام بندشوں کو توڑ رہی ہے، اب ہر طرف آزادی و فارغ السالی ہے، جمہوری اور دستوری حکومتیں اپنی فیوض و برکات سے دیا

قائدہ پہنچا رہی ہیں، جو قومیں حکومت کی صلاحیت نہ رکھتی تھیں وہ حکومت کے لئے طیارہ چور ہی ہیں اور ہر شخص ایک ایسی زندگی بسر کرنے کا عادی ہو تا جا رہا ہے جو قدیم لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی اور جو شاید مستقبل میں بھی حاصل نہ ہو۔

انسانی ترقی میں سب سے پہلی چیز اجتماعی نظام کی تکمیل اور اس کے اصول و قواعد کا سعادت پر مبنی ہونا ہے لیکن دنیا نے اس میں ایک اونچے ترقی نہیں کی ہے اجتماعی نظام جن بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے وہ اتنے پورے اور پھس پھسے ہیں کہ رات دن ان میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں اور اپنے سامنے ساری دنیا کو مضطرب و بے چین رکھتے ہیں۔ پہلے زمانہ میں اجتماع انسانی اخلاقی بنیادوں پر قائم تھا جو سیاسی بنیادوں سے زیادہ مضبوط تھیں، اس لئے ان میں اتنے تغیرات نہیں ہوتے تھے لیکن ترقی یافتہ زمانہ نے اب اخلاق کی جگہ سیاست پر اب اس کی بنیاد قائم کی ہے جو بہت زامہ ضعیف و کمزور ہے۔

یوں تو موجودہ زمانہ کا پورا انتظام تمدن اتنا ناقص ہے کہ اس سے ہرگز توقع نہیں ہو سکتی کہ دنیا اس پر عمل پیرا ہو کر ترقی کر سکے، کیوں کہ وہ ہمیں ظلم و ستم، خود غرضی، بددیانتی، طمع و حرص، اسراف، غائبی اور کذب و فریب کی طرف لے جا رہا ہے اور کوئی شخص دوسرے کے قول و فعل پر کبھی اعتماد نہیں کر سکتا اور جب باہم اعتماد نہ ہو تو ترقی کا ہونا معلوم۔ یورپ جو عہد حاضر کی ترقی کا نمایاں ترین جلا نگاہ ہے، اپنی اس غائبی اور جھوٹی زندگی سے گھبرا گیا ہے، اجتماعی زندگی کے رازدار کو شش کر رہے ہیں کہ ایک نیا نظام تمدن بتائیں، موسائیاں اپنی کھلی حالت پر افسوس کر رہی ہیں اور ہر زبان یہی کہتی ہے کہ جلد سے جلد اس کو توڑ دینا چاہئے۔ تم ایک یورپین کو اس کے گھر میں دیکھو، جہاں وہ اپنے بیوی بچوں سے ملتا ہے۔ پھر کاروباری زندگی میں اس کا مطالعہ کرو اور پھر اس وقت کی حالت پر جب وہ موت کے بستر پر اڑیاں رگڑتا ہو، تم دیکھو کہ گھر میں اس کے لئے کوئی راحت و مسرت نہیں، ناجائز آزادی نے یورپ کی عورت کو اتنا بگاڑ دیا ہے کہ اب ایک شوہر ایک منٹ کے لئے بھی اپنے گھر میں آرام نہیں پاسکتا۔ بیماری میں بیوی میاں سے دور رہتی ہے، مصیبت میں وہ اس کی شریک نہیں، مرضی کے خلاف بات ہو تو وہ لڑنے کے لئے طیار، خرچ میں کمی ہو جائے تو طلاق پر آمادہ اور اگر شوہر اس کو کسی دوست سے نہ ملے دے تو اس کی جان کی دشمن۔ پھر بیٹوں کے ساتھ ایک باپ کا سلوک دیکھو، ماتائی کی جگہ پتھر کی سل ہوئی، حیا میں نہمک ہونے کی وجہ سے چھوٹی سی عمر میں اس کو عہدہ کر دیں گے، نہ دکھ بیماری سے غرض نہ راحت و آرام سے، یہی حال دوستوں و عزیزوں کا ہے، اور یہی حال کاروبار کا، غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں ایک یورپین مرد یا ایک یورپین عورت باہم پر سکون زندگی بسر کرتا ہو، عدالتوں میں رات دن طلاق کے مقدمات پیش ہوتے ہیں، آئے دن خود کشیوں کی اطلاعیں شائع ہوتی ہیں اور خود کشی کے روز روز نئے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ دس ہزار لاکھ کی آبادی کے شہر میں ہزار ڈیڑھ ہزار طلاقیں اور چار پانچ سو خود کشیاں جو جانی معمولی سی بات ہیں، غرض یورپ نے جس نظام پر اپنے تمدن کی بنیاد رکھی ہے وہ اتنا ناقص اور اسدوم مسکوم ہے کہ اس سے ترقی اور فلاح کا امید رکھنی حاق ہے، اسی نظام تمدن کا یہ نتیجہ ہے کہ آج یورپ کی آبادی کا عنصر غالب نہایت سخت کرب و غم میں مبتلا ہے، اس کی ذمہ داریاں مصیبتوں سے بھرپور ہے نہ گھر میں اس کے لئے چین ہے نہ باہر آرام، نہ عورت کے لئے مسرت ہے نہ مرد کے لئے راحت، ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ناجائز اولاد محتاج خانوں اور یتیم خانوں میں ملتی ہے، سیکڑوں امراض فحشہ میں مبتلا ہو کر جاہل دیتے ہیں، اسی کے ساتھ یہ میلان بھی خطرناک سرحدت کے ساتھ بڑھ رہا ہے کہ قواعد و تناسل کا سلسلہ بند ہو جائے، اسقاط حمل کی روزنی دوائیں ایجاد ہوتی ہیں اور عدم استقرار حمل کی دوائیں تو ہرگز دوا فرودشوں کے ہاں کہتی ہیں۔ اس سے زیادہ یہ ہے کہ مائیں خود اپنے ہاتھ سے اپنی اولاد کو ہلاک کر دیتی ہیں، کوئی زہر دے کر سلا دیتی ہے اور کوئی سمندر میں ڈال دیتی ہے، صرف ایک شہر میں جس کی آبادی ۸ لاکھ ہے ایک برس میں چار ہزار اسقاط کی وارداتیں پیش آئیں، دو ہزار بچے یتیم خانوں میں داخل ہوئے۔ دس ہزار شیشیاں عدم استقرار حمل کی دواؤں کی فروخت ہوئیں اور دوسو بچوں کی زندگیاں ان کی ماؤں کے ہاتھوں ضائع ہوئیں۔

اب ان باتوں کو وحشی قوموں کے میلان و خیر کشی سے ملاؤ اور بتاؤ کہ دنیا نے کیا ترقی کی ہے؟ تلوار کے پھل اور ہلاکت کی ریشمیں ٹھنڈی

کونہ دیکھو بلکہ یہ دیکھو کہ دونوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

پھر جب اجتماع بشری اپنی تمام قوتیں صرف کرنے کے بعد بھی مادی زندگی میں مطلق و شاد کام نہ رہے تو ایسا تمدن قطعاً ترقی یافتہ تمدن ہی ہے اور یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ زمانہ ترقی کر رہا ہے، کیونکہ اگر زمانہ ترقی کرتا تو عہد وحشت کی یہ رسمیں صورت بدل بدل کر نمودار ہوتیں۔

خانگی زندگی سے ہٹ کر سوسائٹی کے نظام کو دیکھو، اس راہ میں ایک انجے جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں زہریلے کانٹے نہ بچھے، گوشہ گوشہ میں قاتل ہوں گے، قدم قدم پر ڈاکو ہوں گے اور نقصان پہنچانے والے بھائی بند ہوں گے یا دوست احباب چوری، قتل و غریب کی وارداتیں روز ہوتی رہتی ہیں اور اس کو خیر بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ ایسی باتیں ہیں جو خواہ وہ کتنی ہی عمدگی سے جائیں قابل نفرت ہیں۔

یورپ کو اپنی عقلیت پر بڑا ناز ہے کہ اس نے اخلاق اور اخلاقی احساس کو مٹا دیا۔ اول تو یورپ کا مذہب ایک ایسا مذہب تھا جس میں سرست سے ترقی کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی اور وہ فطرت انسانی کے اس کام کا علاج کرنے سے بالکل عاجز تھا، تاہم وہ سیاست اقتصادی اغراض سے زیادہ مضبوط زیادہ پائیدار اور زیادہ مستقل چیز تھی، لیکن یورپ نے اس کی عمارت کو بھی گرا دیا اور اس کی جگہ بت و وطنیت کی بنیاد قائم کی، لیکن ارباب نہم واقف ہیں کہ قومی اور وطنی احساس نے اجتماعی زندگی کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، اتنا مان نہ مذہب نے کبھی پہنچایا اور نہ کسی وحشی قوم کی تاریخ میں اس کی نظیر ملتی ہے۔

اب یورپ میں ایک اور خیالی گھوندا طیارہ چل رہا ہے اس کا نام حق انتخاب حکومت اور کفالت عامہ ہے، لفظی حیثیت سے یہ دونوں ل بہت دل خوش کن ہیں، لیکن اندرونی حیثیت سے ان کی حقیقت اتنی دل خراش ہے کہ شاید زہر کی بھی اس کے سامنے کوئی اصلیت ہی ہے، یہاں یہ بات واضح ہو جانی چاہئے کہ یورپ کا فلسفہ سیاست قول و فعل کے لحاظ سے ایک نہیں ہے، اس کے لفظ عمل کے مفہوم جدا اور عمل کی صورتیں لفظوں سے علحدہ ہیں۔ حق انتخاب حکومت کا یہ مفہوم ہے کہ دنیا کی ہر قوم کو اختیار ہے کہ اپنے اوپر اپنی مرضی کے وفق جو طرز حکومت چاہے انتخاب کرے، لیکن عملی معنی یہ ہیں کہ زبردست کو بروقت یہ حق حاصل ہے کہ کور کے لئے جس طرز حکومت کو ہے مقرر کر دے اور جس طرح چاہے اپنے اغراض کے لئے اس پر ظلم و ستم کرے، اسی طرح کفالت عامہ کے لفظی معنی یہ ہیں کہ سوسائٹی ہر فرد کو اپنے فرائض کا احساس کر کے انسانی فلاح و بہبود کی جدوجہد کرنی چاہئے، لیکن اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ قومی جماعتوں کی ملی مفاہمت، حیات اجتماعی کے لئے یہ دونوں چیزیں سخت جہلک ثابت ہوئی ہیں، حق انتخاب حکومت سوسائٹی کے امن و امان کا گھونٹ رہا ہے اور کفالت عامہ قوموں کو جنگوں کی دعوت دے رہی ہے، موجودہ زمانہ میں دنیا کے گوشہ گوشہ پر مادی کشمکش رہی ہے اور دن بدن نزاعیں بڑھتی جاتی ہیں ایسی کسی زمانہ میں نہیں ہوئی تھیں، دنیا نے یہ حیثیت مجموعی اس سے پہلے نہ کبھی ایسی نہیں دیکھیں، نہ پریشانیوں اٹھائیں اور نہ اس طرح اقتصادی قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔

اس نظام تمدن نے سب سے بڑی بڑائی جو پیدا کی ہے وہ یہ ہے کہ انسان انسانوں کا خون پیٹتے ہیں، ان میں دوستی ہے نہ محبت، ہمدردی ہے نہ غم گساری، ہر شخص اپنی اغراض کا بندہ ہے، اپنی حرصوں کا غلام ہے اور اپنے فائدہ کے لئے دین، مذہب، شرافت و مائیت، اخوت و برادری کو پامال کر دینے پر آمادہ، آج کل انسانی سوسائٹی کی جیسی بری حالت ہے اور جس طرح ایک انسان دوسرے مان کا گلہ گھونٹے ڈالتا ہے اور وہ جتنا بدعہد بدطینت اور سفاک ہو گیا ہے ایسا کبھی نہیں تھا، یہ عام بات ہے کہ ایک کے گھر میں آگ لگے، اور سوتاماشائی جمع ہو جاتے ہیں، لیکن جن ملکوں پر مغربی تہذیب کا اثر زیادہ ہے وہاں دوست احباب آگ جھانے کے نام سے گھر اچھی اچھی چیزیں لوٹنے کو آچھاتے ہیں اور جب انسانی فطرت کی وحشت و حیوانیت اور اجتماع بشری کی پستی و ذہونیت کا عالم ہو تو یہ کہنا کہ ماح انسانی ترقی کر رہا ہے، کس قدر بے بصری ہے، اگر ترقی اسی بد اخلاقی کا نام ہے تو بتاؤ تنزل کو کہاں ڈھونڈیں بعد زوال اخلاق کا دنیا بس گوشہ میں بہتہ لگائیں؟ جب تک فطرت اجتماعی کے نظام عمل کی یہ اہتری قائم ہے، جب تک انسان اتنا خود غرض ہے اور جب تک

نہا سبر کے فائدہ دل کو اپنے ہی لئے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس وقت نہ دنیا ترقی کر سکتی ہے نہ امن کی فضا پیدا ہو سکتی ہے نہ باہمی اعتبار پایا جاسکتا ہے اور نہ دنیا کے اخلاق میں نیکی کا میلان۔ خود غرضی حیوانی فطرت کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا خاصہ ہے۔ یہ ہے اس وقت تک دنیا ہمیشہ معرکہ کارزار رہی رہے گی اور جو قومیں ترقی میں صرت مہلکی جاہلیں وہ باہمی کشمکش اور کشت و خون میں اپنی رہیں گی۔

افرض موجودہ حالات میں یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ دنیا ترقی کر رہی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا نے جو کچھ حاصل کیا تھا اس کے طاق عالمہ کا جو کچھ اندر خستہ تھا اسے بھی کھوپکی ہے اور وحشت و حیوانیت میں اتنا ڈوب گئی ہے کہ اب اس کے کٹے کوئی دوسری چیز نہیں ہے کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں انسان کیمیاوی اکتشافات کی ان ہندویں پر پہنچ گیا ہے جن ہندیوں کا اس سے پہلے خیال ہی نہ تھا ان طرح اور دعوے بنیاد ہیں، اسی طرح یہ دعویٰ بھی بنیاد ہے۔ موجودہ کیمیاوی عہد کی پیداوار میں وہ کونسی نئی چیز ہے کشتان اسی دور میں ہوا ہے؟ ریل، موٹر، ہوائی جہاز، تار، ٹیلیفون، لاسکی، ان میں سے کونسی چیز ہے جو بالکل نئی ہے جو نئی ہے اور جسے اس سے پہلے کے دماغ نہیں سوچ چکے ہیں؟ کلدان، مصر، آشور، فینور، چین، ایران، ہندوستان، یمن، در پھر عہد اسلامی کی تاریخیں اٹھا کر دیکھو ان میں سے ہر چیز کا نشا و نما پاؤ گے، ہر خیال کی بنیاد وہاں ملے گی۔

دعویٰ کیا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں انسان کی دسترس ان کمالات تک ہو گئی ہے جو انسان کی قدرت سے باہر تھے، لیکن تاریخ کی اس کا بھی مطالعہ کرتی ہے، موت و زہیت کا مسئلہ انسانی اختیار سے اب بھی اسی طرح باہر ہے جس طرح ابتدائے آفرینش میں تھا، حادثات اب بھی اسی طرح پیش آتے رہتے ہیں جس طرح اب سے پہلے آتے تھے اور انسان اب بھی اسی طرح بیمار پڑتا ہے جس طرح ہم میں بیمار پڑتا تھا۔ علاج پہلے بھی ہوتا تھا اب بھی ہوتا ہے دوائیں پہلے بھی استعمال ہوتی تھیں۔ اب بھی ہوتی ہیں، عمل جراحی پہلے نہ تھا اور اسی طرح اب بھی ہوتا ہے۔ کیل فورینا کے علاقہ میں ایک گڑھے سے حال میں ایک انسانی ڈھانچہ نکلا ہے جس کے متعلق خیال نہ ہے کہ کم از کم ۲۰ ہزار برس قبل کا ہے، ڈاکٹروں کا بیان ہے کہ اس کا سر ٹوٹ گیا تھا، آپریشن کے نشانات اس کے منہ پر موجود ہیں معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اب آپریشن کیا جاتا ہے اسی طرح وحشی قومیں بھی آپریشن کرتی تھیں، یہی حال دواؤں کا ہے، کوئی نئی دوا ہمیں پیدا نہیں ہوئی ہے، تمام دوائیں پہلے کی دریافت کی چھٹی ہیں، اب صرف ان کی صورتیں بدل گئی ہیں ورنہ ان کی اصلیت میں فرق نہیں آیا ہے بلکہ اگر زیادہ حق بیانی سے کام لیا جائے تو بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ دنیا نے اس حیثیت سے بھی تنزل کیا پڑائے لوگوں کو جو دوائیں معلوم تھیں اور اب بھی وحشی قوموں کو جو دوائیں معلوم ہیں، جن جڑی بوٹیوں پر انھیں اطلاع ہے یافتہ فضا میں سامن لینے والے بڑے سے بڑے ڈاکٹروں کو بھی ان کی خبر نہیں ہے، ان کی دواؤں کا یہ حال ہے کہ اور اذیاد و مرض کا ہوتی ہیں، ان کے استعمال سے نظام عصی کمزور ہو جاتا ہے، ہمیشہ نئے نئے روگ لگتے رہتے ہیں اور قلب و روح کو اب گھن لگ جاتا ہے، مرتے مرتے پیچھا نہیں چھوڑتا حالانکہ اس عہد ترقی سے پہلے نہ بیماروں کا اتنا زور تھا نہ دوائیں اتنی ناقص تھیں اور نہ طبیب اتنے اناہے ہزار ڈاکٹروں میں ایک ڈاکٹر بھی ایسا نہیں ہے جو مرض کو پہچان لے، حالانکہ وہ زمانہ جس کو عہد وحشت و جہالت کہا جاتا ہے سو میں، طبیب ایسے رکھتا تھا جو مرض کی تخلیق سے پہلے چہرہ کے رنگ سے جان پتے تھے، کہ فلاں مرض ہونے والا ہے اور اسی وقت سے کبھی س تمام شروع کر دیتے تھے۔

پھر بتاؤ کہ جب دنیا نے اس میں بھی ترقی نہیں کی تو کس بات میں ترقی کی ہے؟ پورے اور فرسٹ نکل کو نہ دیکھو، بلکہ یہ دیکھو کہ پہلے یہ تھا جو اب ہو گیا ہے؟

در عیان ترقی کا دعویٰ ہے کہ اجتماع انسانی جو سیاسی آزادی اس زمانہ میں حاصل کی ہے اور جو قانونی عضو بندی اب ہو گئی ہے اس سے پہلے اس کا وجود بھی نہیں تھا، لیکن اس حالت میں جبکہ مغربی طاقتوں مغربی رنگوں میں کٹ رہا ہے، جبکہ مغربی قومیں دنیا کو غلام

ہٹانے کے درپے ہیں جبکہ امریکہ میں ریڈ انڈین نسل کا علاقہ قتل عام کیا جاتا ہے جبکہ چین اور ہندوستانی حقوق شہریت سے محروم کیے جاتے ہیں اور جبکہ قومی کارکنوں کو ہلاک کر دینا ضروری اقتصاد ہے اور نسل و رنگ کے ساتھ تہذیب و آئین کا بدل جانے والا زمانہ انسانیت ہے تو اس دعوے کی بنیادیں گھوکھلی نظر آتی ہیں۔ اس سیاسی عضو بندی اور جمہوریت و آزادی کے زمانہ میں ایک قوم دوسری قوم پر ظلم کرتی ہے جس طرح آزادی و انصاف کے علمبردار دوسری قوموں کا خون چوستے ہیں اور جس طرح گوراکھ کو مارے ڈالتا ہے، اس طرح گزشتہ زمانہ کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا تھا۔

بلاشبہ قانون کا اصول بہت دکانیز ہوتا ہے، جمہوریت کا نظام نہایت اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن جب قبول کو فعل سے اور الفاظ کو عمل سے تطبیق دیکھائی ہے، تو با وضاحت اس کے کہ قانون کو اتنا چمکدار بنایا ہے کہ وہ آسانی سے مظالم کے ساتھ مل جاتا ہے، لیکن پھر بھی عمل میں جو تناقض رہ جاتا ہے وہ اتنا عظیم الشان ہوتا ہے کہ الفاظ سلفے والے علمی وحشت و درندگی کا تصور نہیں کر سکتے اس عہد آئین و حریت کا جب سے آغاز ہوا ہے اس وقت سے آپ تک کی تاریخ اپنے اندر اتنے مظالم رکھتی ہے کہ دہشتہ زمانہ کی پوری بارہ صدیاں بھی اتنے مظالم بھی پیش نہیں کر سکتیں وہ سیاسی ہمدردی و تجارتی سفارشی، وہ اقتدار پسندانہ وحشت جس نے ساری دنیا کو ہلاک و برباد کر دیا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں تھی، پہلے دشمن، دشمن بن کر سامنے آتا تھا، پہلے ظالم ظلم کے نام سے اپنی قوت دکھاتا تھا، پہلے لڑنے والا ہتھیار چھین کر نہیں لڑتا تھا لیکن اب دوست بن کر گلا دبا جاتا ہے، اب عدالت و انصاف کے نام سے ظلم کئے جاتے ہیں، اب ہتھیار چھین کر اور دھوکہ دے کر ملے کئے جاتے ہیں اور محض اس لئے کہ دوسری قومیں اکٹھے نہ پائیں اور مخالف قوموں کی حمایت نہ بن سکیں، پھر کون گناہ ہے؟ وہ جو سترہ زیادہ آزادی کے دعویدار ہیں، وہ جو بنی نوع انسان کی ہمدردی کے رعب میں وہ جو دنیا بھر میں اصلاح و ترقی کے ناشتر ہیں وہ جو امن و انتظام، ادارہ و قانون کے پیغمبر ہیں۔

پھر بتاؤ کیا یہی اخلاق و انسانیت کی ترقی ہے، جس نے یہ صورتیں اختیار کی ہیں؟ کیا یہی وہ نقطہ عروج ہے جس پر پہنچنا مغز اور اس کے ہواخا ہوں کے لئے باعث اتہاج و مسرت ہے؟ یہ باتیں اگر خوشی تو ہیں مگر قابل اعتراض نہیں ہیں، لیکن انسانوں و انسانیت کے فرشتوں کا انسانیت کے فرشتوں کا ایسا کرنا حد درجہ سزاوار لعنت و نکوش ہے، ہمیں معلوم ہے کہ ان عیاروں نے ایسی سوسائٹیاں بنائی ہیں، جن کا مقصد جانوروں پر ظلم کا السداد ہے لیکن کیا وہ انسانوں پر بھی ظلم سے باز آئے ہیں؟ وہ ایک فیاضانہ سلوک کر کے اپنے دوسرے مظالم کو چھپاتا چاہتے ہیں، وہ جو جانوروں پر رحم کر کے انسانوں پر ظلم کا ہاتھ دراز سے دراز تر کرنا چاہتے ہیں وہ یہ تو کہتے ہیں کہ گھوڑے کو ایذا نہ دو لیکن خود انسان کو ایذا دینے میں دریغ نہیں کرتے، جن لوگوں کے اخلاقی عیاری کا یہ حال ہو، جو لوگ اس درجہ بے پناہ سفاک ہوں، ان کی حکومت و اقتدار میں عدل و انصاف کا کیا ذکر، پھر ہم جانتے ہیں کہ جانوروں پر یہ رحم کیوں ہے؟ اور اس کی نوعیت کیا ہے؟ وہ جانور بے تکلف ذبح کر ڈالے جاتے ہیں جو غذا کا کام دیتے ہیں اور ان پر رحم کی تلقین کی جاتی ہے جو خدمت کرتے ہیں، یعنی دوسرے لفظوں میں موجودہ عہد حق و انصاف کے اعمال اجتماعی جن بنیادوں پر قائم ہیں، وہ خود غرض، سفاک و بے ایمانی اور خود بینی کی چٹانیں ہیں۔

پس جب بنیاد ہی اتنی خراب ہو تو عمارت کیسے اچھی ہو سکتی ہے، ایسی ناقص اور ناکارہ اجتماعی زندگی کی ترقی پر استدلال کر اور یہ کہنا کہ موجودہ زمانہ میں دنیائے عظیم الشان ترقی کی ہے، محض کذب و افتراء ہے، کیونکہ اس حیثیت سے دنیا اور گر گئی ہے۔

ان پیغمبران ترقی کو بھی دعویٰ ہے کہ اس زمانہ میں دنیائے جملہ ترقی حاصل کی ہے جو نئی نئی باتیں دریافت ہوئی ہیں، قومی حکومتوں نے علوم و فنون کی جو سرپرستی کی ہے اور جمہوریتوں کے طفیل میں حیات اجتماعی میں سعادت کا نام سے بہرہ اندوز ہو گئی ہے، اس سے پہلے کے لوگ نہ ایسی زندگی کا تصور کر سکتے تھے، نہ ان کے خواب میں بھی ایسی فضا کا خیال آیا تھا، لیکن جس طرح اور دعوے ہے بنیادیں اسی طرح یہ دعویٰ بھی بے بنیاد ہے، اس عہد کی ساری ترقی کا دار و مدار پچھلوں کے اصولوں، ان کی دریافتوں اور

موشکافیوں پر ہے، علمی حیثیت سے موجودہ زمانہ نے صرف اتنی ترقی کی ہے کہ پہلی باتوں کو نئے انداز میں بیان کر دیا ہے اپنی طرف سے کوئی نئی بات پیش نہیں کی، کششِ نقص، مسئلہ ارتقاء، انتخابِ طبیعی جو اس عہد کی پیداوار میں سب سے بلند درجہ رکھے جاتے ہیں۔ یہ سب نظریات آج سے ایک ہزار برس پہلے قائم ہو چکے تھے۔ پھر سوال یہ ہے کہ امتیاز کے قابل کون ہے، وہ جو دماغ میں ہو یا وہ جو انتقال ہو رہی حکومتِ عامہ کی علمی سرپرستی سودہ بھی صرف فنونِ ہنلکہ تک محدود ہے، علوم کی جو سرپرستی آج سے ایک ہزار برس پہلے کی جاتی تھی وہ تقریباً معدوم ہے، کیونکہ اب علوم کی سرپرستی اس نے نہیں کی جاتی کہ اس سے کوئی دماغی تربیت حاصل کی جائے، یا اس سے مقصود عادات و اطوار و خیالات کی اصلاح ہو، بلکہ علوم صرف نفسانی اغراض کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں اور ایک قوم دوسری قوم سے مسابقت کی جو کوشش کرتی ہے اس کے اندر بھی یہ جذبہ کام کرتا ہے کہ وہ دوسری قوم کو شکست دیدے، اس کے لئے یونیورسٹیاں قائم ہوتی ہیں اسی کے لئے بیل، ڈاک، تلوار، جہاز وغیرہ میں نئی نئی ایجادیں کی جاتی ہیں، اسلحہ طیارے کئے جاتے ہیں، ڈائنامائٹ، گولہ بارود، ذہنی ٹیسٹ توپیں اور ہندو قیں بنائی جاتی ہیں اور حکومتیں لاکھوں روپے کے اٹھامات دیتی ہیں، اس سے غرض صرف اتنی ہوتی ہے کہ ان آلات کے ذریعہ سے اپنی تجارت کے لئے ایک نیا بازار پیدا کیا جائے اور دوسری قوم ان چیزوں کو دیکھ کر اتنی ڈر جائے کہ کوئی مزاحمت نہ کرے اور ان کے طمع کے لئے راستہ صاف کر دے۔

عام خیال ہے کہ اجتماعی ترقی کے لئے جمہوری حکومت بہترین معاون ہے اور وہ اپنی اصلی شکل میں صرف اسی عہد میں تکمیل کو پہنچی ہے لیکن اولیٰ تو موجودہ عہدِ حریتِ جمہوریت کے نام ہی سے نا آشنا ہے، کیونکہ وہ جمہوریت کے نام سے جو چیز پیش کرتا ہے وہ جمہوریت نہیں بلکہ مستقبلِ قویٰ حکومت ہے جو اپنے سوا کسی کو انسان سمجھتی ہے۔ ان کے نزدیک دنیا میں کسی اور کو زندگی کا حق حاصل ہے، دوسرے اجتماعی فرائض کے نقطہ نظر سے جمہوری حکومت اور شخصی سلطنت میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے، ایک جگہ ذمہ دار صرف ایک ذات ہوتی ہے، دوسری جگہ ذمہ دار باقی تقسیم ہو جاتی ہیں اور مختلف لوگ مقتدر ہوتے ہیں اور اس سے حکومت کی اصلیت میں کوئی فرق نہیں آتا، جو قوت شخصی حکومت میں کام کرتی ہے، وہی جمہوری میں بھی کام کرتی ہے، جس طرح وہ خونریزی کی اجازت دیتی ہے، اسی طرح یہ اپنے نفع کے لئے خون بہانے میں تامل نہیں کرتی، وہاں صرف ایک شخص کی مرضی سے خون بہتا ہے یہاں قوم کے متعدد افراد کی مرضی شامل ہے۔ بہر حال دنیا نے کسی حیثیت سے کوئی ایسی ترقی نہیں کی جس پر موجودہ عہدِ حاضر کھلے اور جسے ہم ترقی کہہ سکیں۔

## رعایتی سلطان

من ویزدان — مذہبی استفسارات و جوابات — جامستان — نگارستان — شہوانیات — مکتوبات — نیازتین — حقہ۔  
 انتقامیات — مالد و اعلیہ — حسن کی عیاریاں — شہاب کی سرگزشت — فلاسفہ قدیم — ذاکرات نیاز — فراموش الید۔  
 نقاب اٹھ جانے کے بعد۔  
 میزان

تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر موصوفیٰ صرف چالیس روپے میں مل سکتی ہیں۔

میجر نگار لکھنؤ

## مولانا شبلی علی گڑھ سے پہلے اور بعد

(مفتون احمد)

فروری ۱۸۸۷ء کی شروع کی تاریخیں تھیں۔ مولانا شبلی اعظم گڑھ کے محلہ گرمی ٹولہ میں اپنے دو منزلہ مکان۔ علی گڑھ سے پہلے باہر نکلے اور چوک کی طرف چل دئے۔ آج صبح سے فضا کھرے میں لپٹی ہوئی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا۔ بڑا سرد ہوا چل رہی تھی۔ رات ضرور کہیں زلزلہ باری ہوئی تھی۔ سڑک پر اکاؤٹ گائیے گزر رہے تھے۔ مرلی گھوڑے اور گندی دھوتیوں اور بڑھی ہوئی دائرہ میوں والے یکے بان سچ کی یکساں آواز دیں کے ساتھ کچھریوں کی طرف ریگتے جارہے تھے۔ بعض جگہ ہنتر چھا لئے ہوئے سڑکوں کی صفائی کر رہے تھے۔ ان ہنتروں کو جہاں دیکھے ایک ہی وضع، ایک ہی لباس، ایک ہی رنگ، ایک ہی نیا کے میں گئے۔ چاہے وہ بڑی کے میدانوں میں ہوں یا ہنگال کی دلدلوں میں یا سندھ کے ریگستانوں میں، ان کے مرتبے اور شکل وہ میں ایک خط ناک مشابہت ملے گی، گویا انسانی بول و براز نے ان کے جسم اور روح تک کو ایک ہی لڑی میں پردہ دیا تھا۔ شبلی نے افسانہ کس کر گئے میں لپیٹ لیا۔ کچھریوں کی طرف جاتے ہوئے جھولتے ہوئے ڈنگاٹے ہوئے کیوں کو دیکھ کر ان کے دل میں کراہت پیدا انھوں نے ۱۸۸۹ء میں وکالت کا امتحان دیا تھا اور فیل ہو گئے تھے، جبکہ ان کے چھوٹے بھائی جہدی نے کسی کتاب کو شروع سے تک پڑھے بغیر کامیابی حاصل کر لی تھی۔ خیر اگلے سال مولانا بھی جوں توں کو کے پاس ہو گئے مگر دل وکالت کرنے میں خاک نہ لگا اور ادھر جہدی امتحان پاس کر کے اب بیرسٹری کی تعلیم کے لئے ولایت تک جانے کی سوچ رہے تھے، اور ضلع کے کلکٹر نے یس کو خوش ہوا شبلی کے والد سے کہا تھا:-

”دیل شیخ صاحب، ہمیں امد ہے کہ جب آپ کا بیٹا ولایت سے تعلیم پاکر واپس آئے گا تو وہ مسلمانوں کی خدمت کے ساتھ گورنمنٹ کا بھی ایک لائل سروٹ ثابت ہوگا“

”ادھر، لائل سروٹ، شبلی نے سوچا، اگر بڑوں کو خوش رکھنے کا کیا اچھا نسخہ سرسید نے ایجاد کیا تھا۔ مگر اسی لائلوں کی بدولت تو والد کی گورنمنٹ میں اتنی عزت تھی کہ کسی کی مجال نہ تھی کہ جوں بھی کر جائے۔ خدا کا کتنا بڑا احسان تھا۔

”اسے مولوی شبلی، ادھر تو آؤ، تمہارے لئے نئی نئی کتابیں منگائی ہیں“ کسی نے آواز دی۔ مولانا شبلی سوچنے لگے۔ کیا مضامین۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کتب فروش سے گپ شپ کر لی جائے۔ مگر پھر انھیں یاد آیا کہ ان کو ایک ضروری کام ہے، چنانچہ جواب دہ نہیں بھی آج ہمیں فرصت نہیں“

اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ گھنٹوں اس کتب فروش کے یہاں بیٹھ کر اردو کے دیوان اور مختلف کتابیں اٹھتے پڑھتے لیکن آج جیسا کہ انھوں نے کہا، ان کو فرصت نہیں تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چھاؤنی کی طرف چل دئے جہاں ان کے والد اور سوتیلی والدہ رہا کرتھیں۔ آج انھوں نے بال ترشوائے تھے اور داڑھی بھی اور ایک نئی صدری اور دھلا ہوا انگرکھا پہن رکھا تھا۔ یکایک مشن اس کا گھنٹہ ٹن ٹن بجنے لگا اور لڑکے ایک ساتھ مل کر گانے لگے۔ ”گاڈ سیو دی کنگ“۔ شبلی کو اس گھنٹے سے اللہ مارے کا میر تھا۔ اس گھنٹے کی ضرب اس بات کا اعلان تھی کہ ہندوستانیوں کی ایک نسل انگریزی زبان اور تہذیب میں رنگی جا رہی تھی۔ یہ نہیں کہ انھیں انگریزی زبان سے کوئی دشمنی تھی لیکن خود انھیں اس انگریزی نے کیا فائدہ پہنچا تھا۔ خود تو وہ عربی فارسی اور اردو کے ماہر تھے۔

راتے میں ایک داروغہ صاحب مل گئے۔ کہنے لگے "کہو بھئی مولوی مولوی شبلی۔ آج کل کیا کر رہے ہو۔ بھئی کچھ نہ کچھ نوکر بنا جائے۔ بے کار سے بے گار بھئی۔ تمہاری وکالت کا کیا حال ہے؟"

اور شبلی نے سوچا۔ وکالت میرے بس کی نہیں ہے۔ میں جھوٹ بول کر اپنے موکلوں سے ایک کے چار نہیں وصول کر سکتا۔ اور داروغہ۔ کیا وہ نہیں سمجھتے کہ اس کا چہرہ کیوں سرخ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی تونہ کیوں پھولتی جا رہی ہے۔ اس کی کلائیوں پر۔ پچاس روپے کی گھڑی کہاں سے آئی ہے۔ رشوت کا مال۔ چلا ہے مجھے نصیحت کرنے۔ تمہاری وکالت کا کیا حال ہے۔ میاں کوئی نئی بات کہو۔ کچھ عرصہ کی گفتگو چھوڑو۔ کچھ گھر کا حال احوال بیان کرو۔ انگریزوں سے سبق سیکھو میاں۔ نوکری ہی سب کچھ نہیں ہے۔ نوکری ہی سب کچھ نہیں ہے۔ گھر شبلی دیکھ رہے تھے کہ ان کے شہر میں نوکروں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی، اور دیہات کے کسان باقی اور کلکتہ بھاگے جا رہے تھے، جہاں انھیں نوکری مل جاتی تھی۔

ہاں نوکری تو کہیں تلاش کرنا تھی۔

یہ بات ان کے دماغ سے دن بھر محو ہو سکی، اس پر طرہ یہ کہ ایک ہندو وکیل صاحب نے تولیے دی بڑا لگنے "بھئی معاف کر دو مولوی شبلی۔ تم میرے دوست شیخ جی کے بیٹے ہو۔ یوں بے کاروں کی طرح تمہیں گھومتا ہوا دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے۔ اب میرے بچے کو۔ بی۔ اس پاس کر کے کلکتہ پہنچے کیا اور ریوے میں ٹکٹ چیکر ہو گیا۔ پچاس روپے کما رہا ہے۔ میں گھر بھیجتا ہے۔ ابھی ہم بہن کی شادی بڑے ارمانوں سے اُس نے کی ہے۔ اور بیوی بچوں کے نام سے توکان پر ہاتھ دھرتا ہے۔ نا۔ بابا، یہ جنجال مجھ سے اٹھے گا۔ خیر اگر وہ بیوی بچے نہیں چاہتا تو نہ چاہے مگر چار پیسے کما تو لیتا ہے۔ دُنیا میں چار پیسے ضروری ہیں، بیوی بچے ضروری نہیں عزت ضروری ہے۔ تسکین ضروری نہیں ہے۔ ہمارے رشتی منی جنکوں میں رہا کرتے تھے تو کیا ان کے لئے حرمیں آجاتی تھیں۔ بھئی سچا، تو ہے کہ مسلمان ہیں ہی تعلیم میں پیچھے۔ اب تم نے عربی، فارسی پڑھی ہے۔ کیا وقعت ہے تمہاری۔ پڑھیں فارسی سیکھیں تیل۔ وہ مشکل ہے۔ چہ بھئی یوں کام نہیں چلے گا۔"

شبلی کے دل میں ہندو وکیل کا یہ جملہ کانٹے کی طرح چھینے لگا۔ تم میرے دوست شیخ جی کے بیٹے ہو۔ یوں بے کاروں کی طرح تمہیں گھومتا ہوا دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے۔ یہ سہائش باوجود کوشش کے سینے سے نہ نکل سکی اور کھٹکتی رہی، اور ان کا جی چاہا کہ وہ ابھی گھر جا اپنی تمام اردو غزلیں اور فارسی غزلیں پھاڑ کر بھینک دیں۔

اب چھاؤنی قریب آگئی تھی۔ اس کے آس پاس یگوں، بگھیوں اور بالکیوں کا ایک میلا سالگ رہا تھا۔ وہ موکل تھے جو شبلی والد کے پاس اپنے قدموں کے سلسلہ میں دور دور سے آتے تھے۔ ہر روز یہی حالت ہوتی تھی۔ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب برآمدہ میں بیٹھے ہوئے موکلوں اور گواہوں کو کچھ سمجھا رہے تھے ان کا ہاتھ اچھا اور جو کورتھا، دائرہ گھنی، ناک ستواں اور رنگ گندمی سمجھیں بھی بڑی گھنی تھیں، شبلی کو دیکھتے ہی بہت سے لوگوں نے راستہ دیدیا۔ معان کے والد کی نگاہ ان پر پڑی۔

"افاہ، مولوی شبلی صاحب ہیں۔ آئیے ہم آپ کے لئے کچھ رکھتے ہیں۔"

شبلی خانوشش رہے۔

"ہم آپ کے لئے کچھ رکھتے ہیں۔ دراز میر سے ایک کاغذ نکال کر کہا۔

شبلی نے چاہا کہ لپک کر کاغذ لے لیں پر ہمت نہ پڑی۔ وہ منتظر رہے۔

اس میں گھسا تھا۔ "آپ کی درخواست کے حوالے سے آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ آپ کا تقرر اس کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے کر دیا گیا ہے۔"

دستخط۔ پرنسپل محمدن اینگلو انڈین کالج، علی گڑھ

کاغذ شبلی کے ہاتھ سے جھوٹ کر گر پڑا۔

ان کے بچا زاد بھائی شیخ عثمان احمد مرحوم متوفی ۸ اگست ۱۹۱۵ء کی زبانی :-

لکڑھ میں

۱۸۵۵ء کے موسم سرما میں مجھ کو بھائی مولانا شبلی مرحوم کے یہاں علی گڑھ جانے اور رہنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اُس وقت شہر رہتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا نوکر مولوی غفور صاحب اور دو ایک طالب علم بھی فروکش تھے۔ ان کا اپنا کمرہ نہایت صاف ستھرا اور مختصر باب پر مشتمل تھا۔ اس مکان کا نقشہ انھوں نے ایک خط میں اس طرح کھینچا تھا۔

”میں جس مکان میں رہتا ہوں، شہر کے کنارے پر ہے۔ یہ مکان ایک مختصر سا گزشتہ قطع مکان ہے۔ دکن کی طرف ایک خوشنما عمارت دار وٹا سا دالان ہے۔ اس میں خاص میں رہتا ہوں۔ ایک جانب پینگ ہے اور زمین پر صاف اور پاکیزہ چاندنی کا فرش کھینچا ہوا ہے۔ دیوار در مقام کے دائیں جانب ٹرکی کا نماز اور سامنے ایک رنگین اور ہلکا سا ڈسک رکھا ہوا ہے۔ دیوار میں ٹیپ جڑا گیا ہے جو شب کو دیر تک شن رہتا ہے۔ اسی دالان کے متصل ایک جانب ایک حجرہ ہے جس میں مولوی عبدالغفور صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ اسی دالان کے مقابل بیری جانب ایک گول کمرہ ہے جو عزیز سیاحت کی سکونت کی جگہ ہے، اور جو کرسیوں اور میز سے آراستہ ہے۔ کمرہ کے متصل جو حجرہ ہے وہ عزیز سیاحت کے رہنے کی جگہ ہے۔

میرے مکان سے متصل خواجہ محمد یوسف کا مکان ہے اور وہیں ایک مشہور شاعر جو سارے شہر کے استاد اور واقعی سخن سنج اور وہیں رہتے ہیں۔ مجھ سے اکثر ملتے ہیں۔ قیس خلص کرتے ہیں۔ خواجہ محمد یوسف سے لطف کی ملاقات ہوتی ہے۔ مولوی سمیع آندر خاں سے بھی ملتا رہتا ہوں اور بفضیلہ عمدہ طور سے ملتے ہیں۔ میرا کریمین صاحب منصف سے تو خوب چھنتی ہے۔ میرے سی اشعار بھی انھوں نے سنے اور داد دی۔ درمہ کے لڑکے بھی میری جماعت کے مہذب اور سخن فہم ہیں۔

خیر صاحب میں نے دروازے پر دستک دی۔ ملازم نے آکر دروازہ کھولا اور اندر لے گیا۔ بھائی شبلی مرحوم نے دیکھتے ہی مجھے پکارا :-  
”وہاں عثمان“ میں چھٹیوں میں گھر گیا ہوا تھا اور اب وہیں سے آ رہا تھا، اس لئے گھر کے حالات تفصیل سے بیان کئے۔ بولے کہ ”میں چاہتا ہوں میرے عزیز کم از کم سال میں ایک بار میرے یہاں آیا جایا کریں۔ میں نے بارہا عزیز سمیع اور چچا صاحب قبلہ کو لکھا مگر کسی نے ہامی نہیں بھری۔ ماری اچکن کہاں ہے۔ چلو سید صاحب سے مل آئیں“ میں نے کہا اچکن گھر چھوڑ آیا۔ یہ سن کر ملازم کو آواز دی اور اپنی اچکن منڈا کر لے پہنائی۔ اچکن میرے جسم پر تنگ آتی تھی۔ آستینیں پھینسی پھینسی تھیں۔ دیکھ کر مسکرائے اور اپنی صحت کا رونا روئے لگے۔ قبض رہتا ہے می کبھی بخار بھی آجاتا ہے۔ علی گڑھ کا طیرا !

ہم لوگ سرسید کے در دولت پر حاضر ہوئے۔ وہ اس وقت اپنی کوٹھی موجودہ انگلش ہاؤس میں مقیم تھے۔ بھائی مرحوم دیر تک ان کے پہلے رہے اور ان کے کتب خانے میں مختلف کتابیں دیکھتے رہے۔ کسی بات پر ان میں اور سرسید میں بحث چل پڑی۔ ہاں یاد آئے۔ اسی وقت ایک سائل دروازے پر بھیک مانگے آیا تھا، سید صاحب نے اسے دھتکار دیا۔ بھائی شبلی نے ٹوکا اور بحث چل پڑی۔ بعد ازاں ہم نے سید صاحب کے احمہ کھانا کھایا اور رخصت ہوئے۔

سید محمود سے بھی ملاقات ہوئی اور آرنلڈ سے بھی۔ آرنلڈ سے مولانا فرنچ سیکھتے تھے اور آرنلڈ ان سے عربی۔ سید محمود اُس زمانہ میں عجمی کے پروفیسر تھے اور مولانا کے بڑے مستعد۔ مولانا بھی ان کی قابلیتوں کے نہایت معترف تھے۔ کہتے تھے کہ ”سید محمود آج کل کالج میں روزانہ دو گھنٹے ہاتے ہیں۔ ایف اے اور بی اے کے لڑکوں کا بیان ہے کہ ہم نے آج تک ایسی تعلیم نہیں دیکھی۔ ان کی کثرت معلومات، طرز ادب کے مطالعہ اور محبت تحقیق پر سب کو حیرت ہے۔“

سرسید کے متعلق باتیں شروع ہوئیں تو ہم نے کہیں نے احمد علی صاحب سے سید صاحب کے لئے سر کے کی فرمائش کی تھی مگر بڑا خدا نے سنی ان سنی دی۔ سید صاحب کا بھوپڑا اکرم رہتا ہے۔ میرے علاج کے لئے انھوں نے میرا دبی جانا تجویز کیا ہے۔ سید حامد (سرسید کے بڑے لڑکے) میرے ساتھ ہیں گے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں تال بھی لے جانا چاہتے ہیں۔ تم سید صاحب کے لئے ”مصطلحات الشعراء“ تلاش کر کے بھجودو۔ ان کی تائید ہے۔

نیشنل اسکول اعظم گڑھ کی بابت میں نے عرض کیا کہ اس کی حالت دیگر گوں ہے۔ فرمایا کہ ہاں، مدرسہ خواہوں پر چھوڑا کرتے ہیں۔ انٹرنس ہوس مدرسہ قیسری یا چھتھی جاعت کو بھی معقول طریقے سے انگریزی نہیں پڑھا سکتا، اس نے موجودہ حالت سے کیا تسکین ہو سکتی ہے۔ جو لڑکے مدرسے میں نئے داخل ہوں ان کا نام و نسب مجھے معلوم ہونا چاہئے۔ نیز یہ کہ ان کی فیس داخل ہوتی ہے یا نہیں۔

اپنے عزیزوں کی باتیں ہوئیں تو میں نے محسوس کیا کہ مولانا کو اپنے والد کے مہبہ کی بڑی فکر تھی جو انھوں نے اپنی دوسری بیوی کے نام لکھ دیا تھا۔ پھر بڑے کہ جہدی (مولانا شبلی کے چھوٹے بھائی) نے ولایت سے لیڈیوں کے نانچ وغیرہ کے بارے میں والد صاحب کو خطوط لکھے ہیں اور والد قبلہ ان کو سناتے پھرتے ہیں۔ مولانا نے بھائی جہدی کا ایک خط مجھے دکھایا جو انھوں نے ۳۰ مارچ ۱۸۸۵ء کو ولایت جاتے ہوئے ممبئی سے لکھا تھا، اور ممبئی کی دلکشی کی طرف اشارہ کیا تھا اور ان کے شوہر کے حسن اخلاق کی تعریف کے بعد یہ بھی لکھا تھا کہ ”یہ لیڈی صاحبہ مجھ کو اسی قدر یا شاید زیادہ بھلی معلوم ہوئیں جس قدر آپ کو لیڈی بلنٹ صاحبہ۔ یہ لیڈی بلنٹ صاحبہ کون تھیں اس کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔ لیکن جب میں نے حیات جاوید پڑھی تو اس میں ایک جگہ کسی بلنٹ صاحب اور ان کی بیگم کا ذکر ملا جو پارلیمنٹ کے ممبر تھے، علی گڑھ کالج کا معائنہ کرنے آئے تھے، اور کالج میں ان کے ڈنر کا شاندار انتظام کیا گیا تھا۔ ممکن ہے یہ وہی لیڈی بلنٹ صاحبہ ہوں اور مولانا اس موقع پر ان کے اخلاق سے متاثر ہو گئے ہوں۔

سید پیر کو اسٹریٹی ہال میں عظیم الشان جلسہ تھا، لکھنؤ نے اپنی تصنیف کردہ دو کتابیں دارالعلوم کیٹی کو بھیجی تھیں۔ اس کے شکریہ کا یہ جلسہ تھا۔ ہم نے بھی شرکت کی اور خوشی میں حصہ لیا۔  
شام کو میر اکبر حسین اکبر آبادی تشریف لائے، اور کہا کہ کبھی شبلی صاحب مشاعرے میں نہیں چلو گے اور اسی وقت یہ اشعار کہے اور مولانا کو اپنے مکان پر رکھا گیا۔

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبل، ہے صاف یہ بات بھائی شبلی

حاضر ہے جو کچھ کہ دال دیا، کبھو اس کو پلاؤ قلبا

اس میں لطف یہ تھا کہ بھائی مرحوم کے نام شبلی کے ساتھ دوسرا قافیہ بند تھا۔ تھا اکبر نے اسی کمال کو کر دکھایا۔ اسی زمانہ میں داغ اور حاتی کی دہلی میں خوب معرکہ آرائیاں ہو رہی تھیں۔ دو تین غزلیں اخباروں میں بھی چھپی تھیں۔ مولانا شبلی کو بھی اسی وجہ سے شعور شاعری کا شوق زیادہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس مشاعرے میں جو غزل پڑھی اس کی لمبائی اور اشعار کی طرف سے خاطر خواہ داد دی۔ میں اس غزل کے چند اشعار یہاں درج کرتا ہوں:

تیس دن کے لئے ترک مئے و ساقی کروں

واعظ سادہ کو رندوں میں تو راضی کروں

پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال

ورنہ حاسد تری خاطر سے میں یہ بھی کروں

اے نکیہ بن قیامت ہی پر رکھو پرستش

میں ذرا عمر گزشتہ کی تلافی کروں

کچھ تو ہو چارہ غم بات تو یکسو ہو جائے

تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کروں

اور پھر کس کو پسند آئے گا براء دل

غم سے مانا بھی کہ اس گھر کو میں خالی کروں

فرض دیر تک محفل شاعرہ گرم رہی۔ غزلیں گڑھ کے طلباء میں اس وقت بہت سے ایسے تھے جو بڑا بلند ادبی ذوق رکھتے تھے اور گزشتہ

چل کر ان میں سے چند بڑے پائے کے ادیب اور شاعر بن گئے۔

راتے میں میں نے عرض کی کہ آپ نے تو اعظم گڑھ کی طرف رخ کرنا ہی چھوڑ دیا۔ کہنے لگے کیا بتاؤں، تجربہ کر چکا ہوں۔ بہتر آزاد مایا

لیکن اعظم گڑھ میری قسمت میں نہیں ہے۔ وہاں میں چھ ماہ سے زیادہ نہیں ٹک سکتا۔ دلچسپی کا کوئی سامان نہیں۔ اگر کوئی ہوتا بتاؤ۔

میں نے اس آخری فقرے کی معنی خیزی پر توجہ نہ کی اور دوسری باتوں میں مشغول ہو گیا۔

## انتخاب کلام صادق

صادق ایک نوجوان شاعر ہیں جو کسی وقت بہار و بنگال کی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اب ڈھاکہ کی "مروم کش" اور "سمت آزاد" فضا میں مددِ سوز گوارا زندگی بسر کر رہے ہیں۔  
چھینٹا اور کچھ نہ دینا زمانہ کا دستور ہے، لیکن جب وہ شاعر اس کا سکون چھینٹتا ہے تو کچھ دے بھی جاتا ہے۔ صادق کی شاعری اس کا یہی عطیہ ہے اور عطیہ بھی کیسا!

شمع کشتند و زخورشید فشانم دادند  
نیاز

کسی عالم میں اُن کو کہ گئے تھے بے وفا ہم بھی گھر اب تک یہ عالم ہے پشیمانی نہیں جاتی  
کرتا ہے جب بھی کوئی نشیمن کا تذکرہ آتا ہے چاروں سمت نظریں دھواں مجھے  
اب تک ہے مجھ کو آخری منزل کا انتظار اب تک وہ ہیں ہوں چوڑے تم جہاں مجھے  
اب وقتِ رخصت ان آنکھوں میں ہائے وہ آنسو اور اس پہ کوشش ناکام مسکرائے کی  
اک تبسم کی کیا حقیقت ہے گھر اس کی سزا بہت بکھ ہے  
ہم وہ ہیں کہ ہنس دیتے تھے کانٹوں کی جھین پر اب دل پہ گراں بار ہے پھولوں کی ہنسی بھی  
کچھ فطرتاً ایسی ہے طبیعت مری صادق ہنستا ہوں تو آجاتی ہے آنکھوں میں نمی بھی  
نہ پوچھ کیسے گزرتی ہے زندگی اسے دوست بڑی طویل کہانی ہے بھر کبھی دے دوست  
نہ جانے کیوں تری قربت کے بھی حسیں لمحات گراں گزر گئے دل پر کبھی کبھی اسے دوست  
سیرِ نصیب نہ مجھ سا بھی ہو زمانے میں ترے بغیر گزرتی ہے چاندنی اسے دوست  
ہر چند غم اٹھانے کو جی چاہتا نہیں، لیکن آنکھیں بھلانے کو جی چاہتا نہیں  
اب چاہے دل کی پھونک ہی دے شمع آرزو لیکن اسے بھگانے کو جی چاہتا نہیں  
ڈرتا ہوں حال کہتے کہ ہوگا آنکھیں بھی غم اور ان سے کچھ چھپانے کو جی چاہتا نہیں  
صادق کبھی یہ بات تھی وجہ سکون گھر اب حال بھی سنانے کو جی چاہتا نہیں،  
سے اُن کے نزدیک رہ کے بھی اکثر میں نے محسوس کی ہے تنہائی  
ان سے تو کہ رہا ہوں ساحلِ بحال لیکن طوفان وہ اٹھا ہے خود میں بھی ڈر رہا ہوں  
غمِ محبت کو دل نے سمجھا تھا سہل جیسے غمِ زمانہ گھر اٹھایا یہ بوجھ میں نے تو جب تک گیا زندگی کا شانہ

ہم اپنی رو داد کیا سنائیں کچھ اس میں ہیں واقعات ایسے  
 نظر ہے ہر دم کی مجھ پر لبوں پہ اک طنز یہ تبسم  
 کسی کے جانے کے بعد صادق کچھ ایسا محسوس ہوا جو  
 اگر کوئی دوسرا سنا تا ہمیں سمجھے اسے فساد  
 شکست تسلیم کی ہے اس نے مگر یہ انداز فاقانہ  
 کہ ایک مرکز پہ جیسے آکر ٹھہر گئی گردش زمانہ

اب کچھ عجیب طرح بسر ہو رہی ہے زینت  
 جیسے کہ اب نہیں ہے ترا انتظار بھی  
 ہم کو تو عشق میں بھی ہے دشوار زندگی  
 جتنے ہیں کیسے لوگ محبت کے بغیر  
 یاد کسی کو کر لیا چپکے سے دل میں ردائے  
 اس کے سوا اب اور کیا رہ گیا اختیار میں  
 آکھیا سمجھ سکوں گے مرے دل کی دلدل  
 تم کو بھی کاش ہوتی محبت کسی کے ساتھ  
 بڑھایا ہاتھ تو کانٹوں میں جا پھنسا دامن  
 پسند کی تھی گلستان میں اک کلی میں نے !

یہ اور بات ہے دن کس طرح کیے لیکن  
 ترے بغیر گزار سی تو زندگی میں نے  
 یاد بس رہ گیا انخسار محبت ہم کو  
 اور یہ بھول گئے کیسے ہوا تھا آغوا  
 عقل پھر دینے لگی ہے درس ترک میکشی  
 ایک ساغر اور ساقی مجھ کو ہوش آنے لگا  
 کون تھا آتا جسے میری نقامت کا خیال  
 تھام کر دل رہ گیا جب کارواں جانے لگا  
 اچھا ہوا کہ توڑ دیا تم نے دل میرا  
 اب فکر احتیاط سے فرصت ملی مجھے  
 سہارا ڈھونڈتا ہوں زندگی کا  
 اگر تم مسکرا دو مہربانی

اکثر ترے تابندہ تصور کے سہارے  
 چھو آیا ہوں میں چرب پہ چاند اور ستارے  
 اب جی یہ چاہتا ہے میں سب سے بے نیاز  
 اب کوئی ہم سے بولے نہ بولیں کسی سے ہم  
 ہونٹوں تک آتے آتے ساغر چھلک گئے ہیں  
 آیا خیال جب بھی اوروں کی تشنگی کا  
 نہ پھر کچھ ہو سکے گا چل پڑی کشتی جو دھماکے پر  
 اب اس کو سوچ تو تم ساتھ میرے ڈوبنا ہوگا

طال ہوگا قریب ساحل اگر یہ طوفان کی زد میں آئے  
 جو میری کشتی کو ڈوبنا ہے تو بیچ دریا میں ڈوب جائے  
 تیری توجہ بھی ہے انھیں پر جو اپنی رواد کہ رہے ہیں  
 مگر ہیں ایسے بھی انجمن میں جو جب ہیں زخم جگر چھپائے  
 تلاش مقصد میں جب چلے تھے تو ہمسفر تھے بہت ہلکے  
 حیات کی منزلوں میں لیکن ہیں اب اکیلے لئے لئے

یہ تند تند موجیں یہ نیز تیز دھارا  
 ڈھونڈو گے تو انھیں میں مل جائے گا کنار  
 اب اس کو کوئی سمجھے بے وفائی یا کہ مجبوری  
 بہر صورت کسی کو بھول جانے کا ارادہ ہے  
 کسی کا دل دکھا کر جیتنا بھی جیت ہے کوئی  
 محبت میں اب ان سے ہار جانے کا ارادہ ہے  
 یقیناً پھر کوئی طوفان آنے والا ہے صادق  
 کہ پھر آج اپنے دل میں مسکرنے کا ارادہ ہے

ترے آگے اپنی ہستی کا رہے کیونکر خیال  
 دو نہیں محفل میں تیری جوتری محفل میں ہے  
 ہر قدم پر اب یہی محسوس ہوتا ہے مجھے  
 جیسے کوئی کہ رہا ہے تیری منزل دور ہے  
 گلہ ہوتا ہے اپنی تشنگی کا بھی ساتھی  
 مگر دیکھایا ہے اکثر چھلک جاتے ہیں پیانے  
 نہ ہے بول نہ تبسم نہ ہے نظر میں پیام  
 وہ آگئے ہیں مگر انتظار باقی ہے  
 آئی ہے جب بہار تو تم ہو گئے ہو دور  
 کھینچنے لگے ہیں پھول تو مڑھ گیا ہے دل  
 یوں خوش ہے کھوکھلے زینت کی دلچسپیاں تمام  
 گویا جو چیز چاہئے تھی پا گیا ہے دل

بہار آگئی اور گل مسکرائے مگر جی کو آنا تھا اب تک نہ آئے  
 محبت کی تشریح ممکن نہیں ہے محبت سمجھ میں اگر آجھی جائے  
 انقلابات جہاں کا انتہائی ظلم ہے یہ تری معصوم آنکھیں اور غم میرے لئے  
 بے درد سہی بے مہر سہی سب کچھ وہ سہی صادق لیکن جب ان سے نظر مل جاتی ہے بے ساختہ پیار آجاتا ہے  
 تقدیر کسی کو بھی نہ وہ وقت دکھائے ہر سانس جب اک بوجھ ہو اور موت نہ آئے  
 بڑھ گئی جب شدت غم اور میں گھبرا گیا ان کے ہونٹوں پر اک ہلکا سا تبسم آگیا  
 ہم نے سمجھا تھا بہت آسان ہے راہ وفا چل پڑے دو گام تو دیکھا پسینہ لگ گیا  
 کون سی منزل میں لے آئی ہے گردشِ وقت کی اب تو پورے کارواں کا کارواں گھبرا گیا  
 حسن سے خود عشق ہی نے مان لی آخر ترکست ان جیسے آنکھوں میں آنسو مجھ سے کب دیکھا گیا  
 گر گزرتے ہیں وہی آتا ہے جو دل میں خیال اتنی فرصت ہی کہاں سوچیں کہ کیا کرتے ہیں ہم  
 اب بگڑ کر بھی دیکھ لیں ان سے شاید اس طرح بات بن آئے  
 سادگی کہئے یا اسے قسمت ہم نے اکثر فریب ہی کھائے  
 دل سے جب بھونے کی کوشش کی اور شدت سے آپ یاد آئے  
 میں ہوں دیوانہ خیر دیوانہ اور ناسمج جو تعجب کو سمجھائے ؟  
 ان کو کیا دیکھا بس اتنا ہوش ہے سامنے بجلی سی اک لہر لگئی  
 برق چمکی تھی روشنی کے لئے لگ گئی آگ آسٹھیاں کو  
 کیا ڈھونڈتے ہو راہ طلب میں نقوش یا ایسے بھی کچھ مٹے ہیں کہ جن کا نشان نہیں  
 دردِ صافی دونوں میں اک کیف سا پاتا ہوں میں جو بھی دیر تا ہے ساتی نہیں کے پی جاتا ہوں میں  
 گلستاں کا رنگ بدلا ہے بہار آنے کے بعد اپنا عالم ہے وہی جو تھا ترے جانے کے بعد  
 اب کہاں وہ لذت غم اب کہاں وہ دردِ دل ہم نے سب کچھ کھو دیا ہے آپ کو پانے کے بعد  
 ہم کہیں تھے دل کہیں تھا اور نگاہیں کہیں ایک سناٹے کا عالم تھا ترے جانے کے بعد  
 نہ جانے اس پہ بھی کیوں تری آرزو ہے مجھے یہ جانتا ہوں کہ میں تجھ کو پا نہیں سکتا  
 دیکھتے ہوں انھیں مجبور یوں کو عشق کہیں انھیں بھلانے کی کوشش تو کی بھلا نہ سکا  
 برق بلا سے اتنا ہوتا ہے قرب اس کو جتنی بلند یوں پر ہوتا ہے آسٹھیاں نہ  
 دنیا کی آنکھیں اب اُسے لگیں ہیں مجھ پر ہلکی سی ایک کر دٹ اسے گردشِ زمانہ  
 بات یہ اور ہے کچھ کہنے نہ دے پاس وفا آپ کے جو سے تکلیف مگر ہوتی ہے  
 اتفاقاً ذکر جب آیا ترا عالم نہ پوچھ ہم تو سمجھے تھے بھلا بیٹھے ہیں تجھ کو دل سے ہم  
 جب ان سے نظر ملتی ہے بن جاتا ہوں تصویر جیسے کبھی پہلے انھیں دیکھا ہی نہیں ہے  
 آئے ہیں زندگی میں وہ لمحات بھی کبھی جب سوچنا پڑا ہے خدا ہے بھی یا نہیں !  
 جو چاہتے ہو تو تم پھر لو نظر اپنی ہنوز دل پہ مجھے اختیار باقی ہے  
 گر نہ مجھ سے نہ کر گردشِ حیات ابھی کچھ اور طاقت صبر و قرار باقی ہے

# خونِ سحر

(فضا بن فیضی)

وسیم نادرک افکن یہ بہارِ زخمِ ریزہ اٹھ رہا ہے کن سمن زاروں سے شور و سنہر  
 دیر سے بزمِ تمدن کی ہیں شمعیں دودِ خیز  
 جھلکاتے ہیں ستارے چاندنی راتیں ملول آئینے ملتے ہیں اپنے چہرہ زیبا و دھول  
 یہ افق کی وسعتوں سے "ظلمت" تو کا نزل  
 تیرگی افروز ہے آئینہ خانوں کا جمال، مہر و شبنم میں کہاں باقی وہ روحِ اتصال  
 ہفتاب زرفشاں کو کھا گیا رنجِ زوال  
 کتنے کھلائے ہیں لالے، بجھ گئے کتنے چراغ، پی کے اپنا ہی ہوا آسودہ مس کتنے اباغ  
 کیا خبر تجھ کو ابھی کتنے جگر ہیں داغ داغ  
 کن سویروں پر نہ ابھری غلستوں کے پیچ و خم کن چراغوں پر نہ فرمایا ہواؤں نے کرم  
 کن سفینوں پر نہ توڑے ناخدا ئی نے ستم  
 شمع کے آگے بڑھی ہے اس کے پروانے کی خاک یہ جہاں آب و گل ہے کس قدر آشوبناک  
 پرزے پرزے ہیں گریہاں اور قبا میں چاک چاک  
 آگ میں اپنی ہی خود یہ زندگی جلتی ہوئی یہ سکون و آشتی کی دو پہر ڈھلتی ہوئی  
 رات کی غلمتِ شفق کی گود میں پلتی ہوئی  
 دیکھ! کھلائے وہ تھہرائے بہارِ دنوار خون روتی ہے چمن میں نرگس مستی طراز  
 کتنے قنروں سے ہے دیریں تاک کی محرابِ ناز  
 بی جلی ہے کتنے جلوؤں کا ہوتا ایک رات زہر سے سرسبز ہیں کتنے فشاں زارِ حیات  
 دل نگار و خاک بر سر ہے "عروسِ کائنات"  
 تاکجا! احوال کی یہ سرگرا نی تاکجا! ہر نفس آمادہ نشترِ فشاں تاکجا!  
 پھول کے ہونٹوں کا نٹوں کی کہانی تاکجا!  
 ہے تپش آمادہ پر سوز پر مافوں کی خاک مدق بن کر جاگئے کو ہے جہاں سوزناک  
 ہیں سزاوارِ رنو پھر تیرے پیرا ہن کے چاک

تابشِ انجم نظارہ سوز ہے افلاک سے پھوٹنے والی ہیں کرنیں پھر زمینِ خاک سے

## ختر بھوپالی :

رہا جو اہل درد سے تو اتنا واسطہ رہا      وہ خود مگر کبھی کبھی ادھر بھی دیکھتا رہا  
 سحر ہوئی تو حاصل یہ تھا شبِ امید کا      جو اعتبار تھا گیا جو انتظار صحت رہا  
 عجیب مرے تھے وہ وہ حیات کے جہاں      نہ دل سا راہزن رہا نہ غم سا رہنما رہا  
 میں سوچتا ہوں تیرے ساتھ زندگی میں کیا تھا      میں دیکھتا ہوں تجھ سے چھٹ کے زندگی میں کیا رہا  
 قصائے رنگ رنگ میں جہاں جہد و جنگ میں  
 کہاں کہاں غریب دل تمھیں پکارتا رہا

## شفقت کاظمی (بطرز حسرت)

متاعِ جاں کو تیرے نام پر نثار کیا      خوش نصیب کہ یہ فرض بھی اُتار آئے  
 کہیں پتہ دلِ گم کردہ راہ کا نہ ملا      رہ طلب میں، بہت دور تک پکار آئے  
 اُن کے آگے کہاں مجال کہ ہم      اپنی محرومیوں کی بات کریں  
 انتہا اپنی خواہشوں کی نہیں      مجھ پہ کب تک وہ التفات کریں  
 جن کو ہے فکرِ آسماں بندی      کیوں وہ پردائے برق و باد کریں  
 شکرِ تقدیر کے سوا شفقت      اور کیا ہم سے نامراد کریں

## دیکم جعفری :

وہ چل رہے ہیں گھرِ عالم ہے اُن کی بد حالستیوں کا      کہ جیسے ہر ایک رہگذر پر کھلے ہوئے ہوں شراب خانے  
 نہ کام آئیں یہ احتیاطیں نہ ٹوٹے رشتے محبتوں کے      تیری ملاقات کو ہمیشہ نکل ہی آتے ہیں کچھ بہانے  
 کہا گیا تھا نذیم ہم سے بہار آئے گی جشن ہوگا      مگر کچھ ایسی بہار آئی اُجڑ گئے ہیں سب اُشیانے  
 بھڑک نہ جائے بغاوت کی آگ بھڑوں میں      جبہینِ خوق جھکاتے ہوئے لڑتے ہیں  
 ترے زمانِ محبت میں ہم پہ کیا گزری      یہ روئیداد سناتے ہوئے لڑتے ہیں

## بشنواز :

سمجھ کر سنگ راہ شوق ٹھکراتا ہوں منزل کو  
بھنوان وگر پھر تم نے بتایم کر لیا ہم سے  
بعد پردانوں کے ہوئی گئیں شمعیں خاموش  
لذت سوز نہاں ، حاصلِ پیماں وفا  
کمال آگہی کہتے اسے یا گم رہی کہتے  
وہ اک گہرا تعلق جس کو ترک دوستی کہتے  
کون کرتا ہے شہیدانِ وفا کا نام  
اب بھی مسرور ہوں میں تیرے تغافل کی قسم

## راز :

خرد کا ذکر نہ کر چپ کہی یہ سبکی ہے  
ہزار شکر کہ دل خون ہو گیا آخر  
کہا نہ راز کی خود داریوں نے رخ بھی ادھر  
جنوں نے اس کو دکھایا ہے راستہ ساقی  
کھنکھاتی ہیں ہے رنگ تھی خناساقی  
ہوا تھا داؤدِ جنت تو بار بار ساقی

## شفا گویاری :

بڑی جانسوزیوں سے درد کے آئینے ڈھلتے ہیں  
روِ آفت میں ایسے راہِ دہی ہم نے دیکھے ہیں  
نظامِ عالم اسکاں کی ہجائی میں بنیادیں  
اندھیرے مسکراتے ہیں شفا جن کے اُجالوں پر  
گھٹل کر سینکڑوں آنچوں سے دو آنسو نکلتے ہیں  
جو دہیر کو بھی اپنی رہبری میں لیکے چلتے ہیں  
تڑپ کر غم کے مارے جب بھی کروٹ بدلتے ہیں  
جہاں میں کچھ چراغِ زندگی ایسے بھی جلتے ہیں

## نظر شاہجہاں پوری :

تاریک اس قدر تو نہ تھی میری شامِ غم  
اے انتہائے شوق تکلم ترے اشار  
گزارتا ہوں بہر حال زندگی اے دست  
سمجھ میں آئے سکا زندگی کا رازِ نظیر  
لٹا پڑا ہے جہاں زندگی کو  
روادو ہے مختصر زندگی کی  
اُسی کے لئے اے نظر گشتاں ہے  
لوٹے گئے کہاں مہ و انجم کے قافلے  
آنکھوں نے داستان بھی لب نہیں ملے  
اختیار ہے یا جبر ہے خدا جانے  
ساز ہے کہ فقط سوز ہے خدا جانے  
مقامِ وفا چند ایسے بھی آئے  
بہت کچھ کہا اور کچھ کہہ نہ پائے  
حوادث کو جو آستانہ بنائے

# مشکلات غالب

غالب کے یہاں ہم کو اتنے مختلف رنگ کے اشعار نظر آتے ہیں کہ اگر ہم اس کے دیوان کو زنجیر فرض کر لیں تو اس میں ہمیں کوئی کڑی کسی رنگ کی نظر آئے گی اور کوئی کڑی کسی رنگ کی۔

اس کے یہاں تصون و حکمت بھی ہے اور وعظ و نصیحت بھی۔ خالص عاشقانہ رنگ بھی ہے اور زندانہ شوخی و بے باکی بھی۔ بلند معنی آفرینی بھی ہے اور سطحی نقاشی بھی۔ گویا وہ ایک گلدستہ ہے مختلف رنگ کے پھولوں کا جس میں ہر شخص کو اپنے اپنے ذوق و پسند کا پھول ملتا ہے اور غالباً یہی سبب اس کے قبول عام کا ہے۔

غالب کا نام سنتے ہی اس کی مشکل پسندی و دقیق نگاری ہمارے سامنے آجاتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ قطعاً عام راہ سے ہٹ کر اپنی راہ الگ پیدا کرنے والا بڑا مشکل پسند انسان تھا اور بہان کے نئے زاوئے تلاش کرنے کے لئے اس کا خیال ہمیشہ واضح کی پیچیدہ راہوں سے گزرنا پسند کرتا تھا یہاں تک کہ وہ اپنے سپہل و سادہ اشعار میں بھی کوئی نہ کوئی گہرہ ضرور چھوڑ جاتا تھا چہ جائیکہ حکمت و تصون کے دقیق اشعار کہ انھیں تو معنوی نزاکت اور قدرتِ تخیل کے لحاظ سے مشکل ہونا ہی چاہئے تھا۔

یہی وجہ تھی کہ مولانا حالی کو بھی یادگار غالب ہیں اس کے بعض مشکل اشعار کی شرح کرنا پڑی اور اس کے بعد یہ سلسلہ ختم نہ ہوا یہاں تک کہ کلام غالب کی متعدد شرحیں وجود میں آگئیں۔

اس میں شک نہیں کہ شارحین غالب نے اپنے اپنے ذوق کے لحاظ سے کافی ثروت نکال لی ہے، لیکن بعض نے لفظی و لغوی تحقیق پر ضرورت سے زیادہ زور دیا، بعض نے اس عقیدہ کی بنا پر کہ غالب کے کلام میں کسی خامی کا پایا جانا ممکن ہی نہیں اس کے بعض بے معنی اشعار میں بھی کھینچ مان کی کوئی نہ کوئی مفہوم پیدا کرنے کی کوشش۔ بعض شارحین ایسے بھی ہیں جن کو غالب کا ہر شعر حکمت و فلسفہ نظر آیا اور اس کی شرح و تفسیر میں وہ غالب سے زیادہ ناقابلِ فہم ہو کر رہ گئے اور بعض نے اس خصوصیت کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ بعض شرحوں میں بہت اختصار و اجمال پایا جاتا ہے اور بعض میں بہت زیادہ تطویل و اطباب، الغرض اتنی شرحوں کی موجودگی کے باوجود ایک معتدل قسم کی شرح کی ضرورت یقیناً باقی تھی اور بعض احباب نے مجھ سے ایسی شرح لکھنے کی بار بار خواہش بھی کی، لیکن میں اس کے لئے وقت نہ نکال سکا۔

اس دوران میں اکثر طلبہ میرے پاس آئے اور انھوں نے غالب کے بعض اشعار کا مفہوم مجھ سے دریافت کیا تو مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ان کے ساتھ نہ جو مفہوم ان کو بتایا ہے وہ بہت اُلجھا ہوا ہے اور جس دو یا دو کا طریقہ سے انھیں سمجھایا گیا ہے وہ یقیناً طلبہ کے ذہن و دماغ کے لئے مناسب نہیں، اس لئے مجھے اس کے لئے وقت نکالنا پڑا اور وہ کام جو عرصہ سے ملتوی ہوتا چلا آ رہا تھا اس کی ابتدا اس عہد سے ہو رہی ہے اور میں کوشش کروں گا کہ ختم سال تک یہ کام انجام کو پہنچ جائے۔

میرا طبع نظریہ ہے کہ غیر ضروری مباحث میں اُلجھے بغیر بہت سادہ الفاظ میں شعر کا مفہوم واضح بیان کر دیا جائے اور صرف ان اشعار کو لیا جائے جن میں واقعی کوئی اشکال پایا جاتا ہے۔

انہی میں ایک انتخاب بھی پیش کروں گا جس سے معلوم ہو سکے گا کہ غالب نے کس رنگ میں کتنے اچھے شعر کہے ہیں۔

۱۔ نقش فریادی ہے کس کی شوقی تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر سپیکر تصویر کا

نقش = نگار خانہ عالم یا تمام وہ اشیاء جو کائنات میں ہم کو نظر آتی ہیں۔

شوقی تحریر = شوقی نقش، کہانی نقاش کی کپچ  
کاغذی پیرہن = لباس لباس سے مراد ہے ہستی ناپایدار (اس میں رعایت اس قدیم رسم کی بھی ہے کہ فریادی کاغذ کا لباس پہن کر حاکم سے فریاد کرنے جاتا تھا)

کس کی = سوئے نہیں ہے بلکہ حیرت و استعجاب کے محل پر استعمال ہوا ہے۔

مفہوم = ہے کہ، اس نگار خانہ عالم کا ہر نقش یعنی کائنات کی ہر چیز نقاش ازل یعنی قدرت کے حضور میں زبانِ حال سے اپنی ناستواری و فنا پذیری کی فریاد کر رہی ہے۔

یہ شعر حمد کا ہے اور مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کائنات کے تمام مظاہر و آثار اور موجودات عالم فنا پذیر ہیں اور خدا کے سوا کسی کو ثبات نہیں۔

۲۔ کاو کاو سخت جانہاے تنہائی نہ پوچھ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

کاو کاو = کھودنا۔ کاوش۔ غیر معمولی محنت۔

سخت جانی = انتہائی تکلیف دہیل جانے کی اہلیت۔

جوئے شیر لانا = اشارہ ہے فریاد کے قطعہ کی طنز جسے شیر نے پہاڑ کھود کر جوئے شیر (دودھ کی نہر) لانے کا حکم دیا تھا۔

مفہوم = ہے کہ ہم جس انتہائی کاوش و تکلیف سے تنہائی کی رشتیں بسر کرتے ہیں وہ پہاڑ کھود کر جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

کاو کاو اور سخت جانی = صبح اور جوئے شیر میں جو مناسبت پائی جاتی ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ شعر عاشقانہ رنگ کا ہے اور غالب کی ندرت بیان کا پاکیزہ نمونہ۔

۳۔ دم شمشیر = تلوار کی دھار ہے۔ دم سانس کو بھی کہتے ہیں۔

مفہوم = ہے کہ: "میرے شوقی شہادت کے جذبہ بے اختیار کو دیکھئے کہ قاتل کی تلوار بھی قتل کے لئے بے اختیار ہو گئی اور اس کا دم باہر آ گیا۔"

"دم باہر آنا" اس معنی میں اردو کا محاورہ نہیں اور محض غالب کی اختراع ہے۔ اس شعر کی بنیاد لفظ دم پر قائم ہے کیونکہ دم سانس کو بھی کہتے ہیں اور دم شمشیر تلوار کی دھار کو بھی۔ اس قسم کی رعایت لفظی رکھنے والی شاعر عہدِ ناسخ کی یادگار ہے اور رباب ذوق اسے پسند نہیں کرتے۔

۴۔ انگوں و ام شنیدن جس قدر چاہے بچائے دعا علقا ہے اپنے عالمِ تحریر کا

انگوں = ہاتھ۔ ام شنیدن = شنیدنی۔ بچائے = بچا دے۔ دعا علقا = اپنے عالمِ تحریر کا

حال میں غائب نہیں سمجھ سکتی، اسی طرح فہم و ادراک کے حال میں میرے اشعار کا مفہوم بھی نہیں سمجھ سکتا۔  
اسی مضمون کا ایک اور شعر غائب کا یہ ہے :-

گر خاموشی سے فائدہ اخفائے حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے  
اس قسم کے اشعار تغزل سے باہر سمجھے جاتے ہیں جن میں ندرت بیان اور لفظی سنا محی کے سلاوہ کوئی خوبی نہیں پائی جاتی۔

۵۔ بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا۔ موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا  
آتش زیر پا = بقرار، بیتاب۔ موئے آتش دیدہ = وہ بال جسے آگ دکھا دیکھائے یعنی بہت کمزور یا جلا ہوا۔  
مفہوم یہ ہے کہ ”چونکہ میں اسیری میں بھی آتش زیر پا ہوں اس لئے میری زنجیر کا حلقہ موئے آتش دیدہ ہو کر رہ گیا ہے۔  
اس شعر کی بنیاد بھی لفظ آتش پر قائم ہے اور اگر آتش زیر پا کی جگہ اس کا مترادف لفظ ”بقرار“ رکھ دیا جائے تو شعر مہمل ہو کر بچا  
یہ شعر بھی نا پسندیدہ رعایت لفظی و رہام کا نمونہ ہے اور تغزل سے باہر۔ لفظ حلقہ، ”ہر حلقہ“ کی جگہ استعمال کیا گیا ہے جو نقص سے  
خالی نہیں۔ اس غزل کے تمام اشعار میں (سوا دوسرے کے) لفاظی اور خشک ندرت بیان کے سوا کچھ نہیں۔

## غزل (۲)

۱۔ جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار صحرائے تنگی چشم حصور مست،  
تنگی = تنگی۔ حصور = حاسد۔ تنگی چشم = بخل۔ بروئے کار آکا = سامنے میدان میں آنا۔  
یعنی قیس (مجنون) کے سوا کوئی اور صحرائے اس کے مقابلہ کے لئے نہ آیا، یعنی وہی ایک میدان عشق کا مرد تھا۔ اس کی توجیہ  
غالب نے یہ کی کہ صحرائے حاسد کی طرح تنگ تھا اور تنگی چشم میں کسی دوسرے کی گنجائش نہ تھی۔  
اس شعر کی بنیاد بھی لفظ تنگی پر قائم ہے اور اس سے فائدہ اٹھا کر معمولی بات کو گہما گہما کر بیان کیا گیا ہے۔ اس میں بھی  
صرف لفظوں کا کھیل ہے اور کچھ نہیں۔

۲۔ آشفگی نے نقش سویدا کیا درست ظاہر ہوا کہ داغ کا سراپا دودھ تھا  
آشفگی = پریشانی، پریشاں خاطر۔ نقش سویدا = دل کا سیاہ داغ یا نقطہ۔ دودھ = دھواں۔  
نقش درست کرنا = نقش پیدا کرنا۔  
مفہوم یہ ہے کہ: ہمارا داغ دل محض ہماری پریشاں خاطر کا نتیجہ ہے، یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ داغ کا سراپا  
محض دودھ (دھواں) ہے، جس کی آشفگی ظاہر ہے۔  
معنا یہ کہ جب تک آشفگی پیدا نہ ہو داغ دل میں نہیں آسکتا۔ یہ شعر ندرت بیان کا اچھا نمونہ ہے۔

۳۔ تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا  
یہ شعر بھی غالب کے ان اشعار میں سے ہے جو بامعنی سادہ ہونے کے مشکل ہی سے بغیر کسی تاویل کے سمجھ میں آسکتے ہیں،  
اس میں سب سے زیادہ الجھن ”زیاں و سود“ کے ذکر نے پیدا کر دی ہے، کیونکہ کسی سے معاملہ ہوتا ”باہم عہد و بیان کی گفت و شنید“ کا

## غزل (۱)

۱۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا  
نقش = نگار خاند عالم یا تمام وہ اشیاء جو کائنات میں ہم کو نظر آتی ہیں۔

شوخی تحریر = شوخی نقش، یعنی نقاش کی کپڑے  
کاغذ کی پیرہن = لباس لباس سے مراد ہے ہستی ناپایدار (اس میں رعایت اس قدیم رسم کی بھی ہے کہ فریادی کاغذ کا لباس پہن کر حاکم سے فریاد کرتے جاتا تھا)

کس کی = سوالیہ نہیں۔ بلکہ حیرت و استعجاب کے فعل پر استعمال ہوا ہے۔  
مفہوم = ہے کہ ۱۔ اس نگار خاند عالم کا ہر نقش یعنی کائنات کی ہر چیز نقاش ازل یعنی قدرت کے حضور میں زبانِ حال سے اپنی ناستواری و فنا پذیری کی فریاد کر رہی ہے۔  
۲۔ شعر حمد کا ہے اور مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کائنات کے تمام مظاہر و آثار اور موجودات عالم فنا پذیر ہیں اور خدا کے سوا کسی کوشیات نہیں۔

۲۔ کاو کاو سخت جان نہائی نہ پوچھ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا  
کاو کاو = کھودنا۔ کاوش۔ غیر معمولی محنت۔  
سخت جانی = انتہائی تکلیف جھیل جانے کی اہلیت۔

جوئے شیر لانا = اشارہ ہے فریاد کے قصہ کی طعن جسے شیر نے پہاڑ کھود کر جوئے شیر (دودھ کی نہر) لانے لائے کا حکم دیا تھا۔  
مفہوم = ہے کہ ہم جس انتہائی کاوش و تکلیف سے تنہائی کی رتیں بسر کرتے ہیں وہ پہاڑ کھود کر جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔  
کاو کاو اور سخت جانی — صبح اور جوئے شیر میں جو مناسبت پائی جاتی ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ شعر عاشقانہ رنگ کا ہے اور غالب کی ندرت بیان کا پاکیزہ نمونہ۔

۳۔ دم شمشیر = تلوار کی دھار۔ دم سانس کو بھی کہتے ہیں۔  
مقبوم = ہے کہ ۱۔ "میرے شوقی شہادت کے جذبہ بے اختیار کو دیکھئے کہ قاتل کی تلوار بھی قتل کے لئے بے اختیار ہونے لگی اور اس کا دم باہر آگیا۔

۲۔ "دم باہر آنا" اس معنی میں اردو کا محاورہ نہیں اور محض غالب کی اختراع ہے۔ اس شعر کی بنیاد لفظ دم پر قائم ہے کیونکہ دم سانس کو بھی کہتے ہیں اور دم شمشیر تلوار کی دھار کو بھی۔ اس قسم کی رعایت لفظی رکھنے والی شاعرانہ تعبیر و تالیف کی یادگار ہے اور رباب ذوق اسے پسند نہیں کرتے۔

۴۔ آگے دم شنیدن جس قدر چاہے بچائے مدعا عفا ہے اپنے عالمِ تحریر کا  
مقبوم = ہے کہ ۱۔ "میرے اشعار سمجھنے کی تفسیر ہی کو شمشیر کیوں نہ کی جائے لیکن ان کا سمجھنا محال ہے، یعنی جس طرح

ہال میں عطا نہیں بخش سکتی، اسی طرح فہم و ادراک کے جال میں میرے اشعار کا مفہوم بھی نہیں بچیں سکتا۔  
اسی مضمون کا ایک اور شعر غالب کا یہ ہے :-

گر خامشی سے فایرہ اخفائے حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے  
اس قسم کے اشعار تغزل سے باہر سمجھے جاتے ہیں جن میں ندرت بیان اور لفظی سناعی کے علاوہ کوئی خوبی نہیں پائی جاتی۔

۵۔ بسکہ ہوں غالب امیری میں بھی آتش زیریا مومے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا  
آتش زیر پا = بقیار، بیتاب - مومے آتش دیدہ = وہ بال جسے آگ دکھا دیکھائے یعنی بہت کمزور یا جلا ہوا۔  
مفہوم یہ ہے کہ: ”چونکہ میں امیری میں بھی آتش زیر پا ہوں اس لئے میری زنجیر کا حلقہ مومے آتش دیدہ ہو کر رہ گیا ہے۔“  
اس شعر کی بنیاد بھی لفظ آتش پر قائم ہے اور اگر آتش زیر پا کی جگہ اس کا مترادف لفظ ”بقیار“ رکھ دیا جائے تو شعر مہل ہو کر پھلے  
یہ شعر بھی ناپسندیدہ رعایت لفظی و اربہام کا نمونہ ہے اور تغزل سے باہر۔ لفظ حلقہ، ”ہر حلقہ“ کی جگہ استعمال کیا گیا ہے جو نقص سے  
خالی نہیں۔ اس غزل کے تمام اشعار میں (سوا دوسرے کے) لفاظی اور خشک ندرت بیان کے سوا کچھ نہیں۔

## غزل (۲)

۱۔ جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار صحرائے تنگی چشم حُود ست،  
تنگی = تنگی - حُود = حاسد - تنگی چشم = بخل - بروئے کار آنا = سامنے میدان میں آنا۔  
یعنی قیس (مجنون) کے سوا کوئی اور صحرا میں اسکے مقابلہ کے لئے نہ آیا، یعنی وہی ایک میدان عشق کا مرد تھا۔ اسکی توجیہ  
غالب نے یہ کی کہ صحرائے حاسد کی طرح تنگ تھا اور تنگی چشم میں کسی دوسرے کی گنجائش نہ تھی۔  
اس شعر کی بنیاد بھی لفظ تنگی پر قائم ہے اور اس سے فایرہ اٹھا کر معمولی بات کو گھما پھرا کر بیان کیا گیا ہے۔ اس میں بھی  
صرف لفظوں کا گھیل ہے اور کچھ نہیں۔

۲۔ آشفگی نے نقش سویدا کیا درست ظاہر ہوا کہ داغ کا سراپا یہ دودھ تھا  
آشفگی = پریشانی، پریشاں خاطر - نقش سویدا = دل کا سیاہ داغ یا نقطہ - دودھ = دھواں -  
نقش درست کرنا = نقش پیدا کرنا۔  
مفہوم یہ ہے کہ: ہمارا داغ دل محض ہماری پریشاں خاطر کا نتیجہ ہے، یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ داغ کا سراپا یہ  
محض دودھ (دھواں) ہے، جس کی آشفگی ظاہر ہے۔  
مدعا یہ کہ جب تک آشفگی پیدا نہ ہو داغ دل میں نہیں آسکتا۔ یہ شعر ندرت بیان کا اچھا نمونہ ہے۔

۳۔ تماغواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا  
یہ شعر بھی غالب کے ان اشعار میں سے ہے جو بادیہ سادہ ہونے کے شکل ہی سے بغیر کسی تاویل کے سمجھ میں آسکتے ہیں،  
اس میں سب سے زیادہ اچھن ”زیاں دسود“ کے ذکر نے پیدا کر دی ہے، کیونکہ کسی سے معاملہ ہوتا، باہم عہد و پیمان کی گفت و شنید کا

مفہوم رکھتا ہے اور اگر تجھ سے خطاب "محبوب" کی طرف ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ ہم خواب میں تجھ سے معاملہ تحت اور عہد وفا لینے پر جھگڑ رہے تھے کہ آگے کھل گئی اور یہ سارا طلسم ہم پر ہم ہو گیا، لیکن یہ مفہوم قرار دینے کے بعد "نہ زیاں تھا نہ سود تھا" کہتا درست نہیں ہو سکتا، کیونکہ آگے کھلنے کے بعد جو افسوس ہوا ہوگا وہ یقیناً زیاں کی صورت ہے۔

اگر خطاب خدا سے ہے تو مفہوم یہ ہوگا کہ: "کار و بار حیات سے رابطہ خداوندی کے سمجھنے کی کوشش محض خواب و خیال ثابت ہوئی، اور جب ہم نے اس کو محسوس کیا تو ہماری بے علمی برستور ویسی ہی رہی جیسے پہلے تھی اور اس سے نہ ہم کو کوئی فائدہ پہنچا نہ نقصان۔"

۴۔ لیتا ہوں کتبہ نسیم دل میں سبق ہنوز لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود سہتا، کتبہ عشق یا کتبہ غم دل میں اب بھی ایک ہمدی طالب علم کی حیثیت رکھتا ہوں اور جس طرح ابتدائی تعلیم میں رفت گیا اور بود تھا سمجھا جاتا ہے اسی طرح میں اب بھی اسی "رفت و بود" کا سبق لے رہا ہوں، یعنی یہ کہ دل جو کسی وقت اپنا تھا، چلا گیا اور دوسرے کا ہو گیا، حالانکہ اس منزل سے گزر کر مجھے دل کے جانے کا احساس بھی نہ ہونا چاہئے تھا۔

۵۔ ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی میں ورنہ ہر لباس میں تنگ وجود تھا تنگ وجود ہونا = وجود کے لئے باعث شرم ہونا۔ مفہوم یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے ہر رنگ میں وجود کے لئے باعث شرم تھا اور کسی لباس سے میرے عیوب چھپ نہ سکتے تھے، اس لئے اچھا ہوا کہ میں مر گیا اور کفن نے داغ عیوب کو ڈھانپ لیا۔

۶۔ تیشہ سے بغیر مرنا مکا کو بہن اسد سرگشتہ خار = متوالا رسوم و قیود = دنیاوی پابندیاں۔ مفہوم یہ ہے کہ: کو بہن (فریاد) رسوم ظاہری کا پابند تھا کہ اس کو مر جانے کے لئے سر پر تیشہ مارنے کی ضرورت ہوئی، چاری محبت فرادے سے زیادہ بلند ہے جو جان دینے کے لئے ان ظاہری اسباب کی محتاج نہیں۔

## غزل (۳)

۱۔ کہتے ہوئے دیں گے ہم دل اگر بڑا پایا دل کہاں کہ گم کیجئے، ہم نے مدعا پایا ہم نے مدعا پایا = ہم تمہارا مطلب سمجھ گئے یعنی دل ہمارے پاس کہاں وہ تو تمہارے ہی پاس ہے اور ازراہ شوخی یہ کہتے ہو کہ اگر بڑا پایا تو نہ دیں گے۔

۲۔ عشق سے طبیعت نے زینت کا مزا پایا درد کی دوا پائی درد دہے دوا پایا درد کی دوا پائی یعنی درد زندگی کی دوا پائی۔ مدعا یہ کہ جب تک محبت نہ کی تھی، زندگی درد تھی، اب اسکی جگہ درد محبت نے لیا اسکی کوئی دوا نہیں۔

۳۔ سادگی و پیرکاری، بیخودی و ہشامی حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا حسن کی ظاہری سادگی دے پر دانی پر نہ جاؤ کہ وہ دراصل چاہنے والوں کا امتحان ہے کہ عشاق کہیں اپنی حد سے آگے تو نہیں بڑھ جاتے۔

## ”نگار“ کا آئندہ سالنامہ ۱۹۵۷ء (اصنافِ سخن نمبر)

ہر آنے والے سال کے ساتھ ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ نگار کا مخصوص نمبر کس موضوع کے لئے وقف کیا جائے جو پڑھنے والوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ہو اور جس کی ترتیب میں اردو کے اہم کھٹنے والے حصہ لے سکیں، چنانچہ موجودہ انتقادی دور کے پیش نظر مناسب سمجھا گیا کہ ۱۹۵۷ء کا پہلا شمارہ اردو شاعری کے تمام اہم اصنافِ سخن کی تعریف، تجزیہ، تشریح اور تاریخ کے لئے وقف ہو۔ یہ سالنامہ طلبہ، اساتذہ اور تمام شائقینِ ادب اردو کے لئے ایک نہایت مفید دائرۃ المعارف قسم کی چیز ہوگا جس کی اہمیت کا نوازہ آپ کو ذیل کے عنوانات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

صنف غزل :- (۱) غزل کی ماہیت اور ہیئت - (۲) اردو غزل ولی سے غالب تک - (۳) اردو غزل غالب سے عہدِ حاضر تک  
(۴) دہلی اور کھنؤ کا دبستانِ تغزل - (۵) غزل کا مستقبل  
صنف قصیدہ :- (۱) قصیدہ کی تاریخی و روایتی حیثیت - (۲) قصیدہ کا ارتقائی دور - ذوق، سودا، غالب و مومن کی قصیدہ نگاری -

صنف مثنوی :- (۱) مثنوی کی روایتی و بنیادی خصوصیات - (۲) دکن کی مثنویاں - (۳) مثنوی کی تاریخی نقطہ نظر سے لکھنؤ، دہلی کی مشہور مثنویاں -

صنف مرثیہ :- (۱) مرثیہ کے عناصر ترکیبی - (۲) دکن اور مرثیہ نگاری - (۳) مرثیہ انیس تک - (۴) مرثیہ انیس کے بعد (۵) انیس و دہائی - (۶) واقعہ کربلا کے علاوہ دوسرے مراثی -

صنف رباعی و قطعات :- (۱) رباعی پر تاریخی نظر - (۲) اردو کے مشہور رباعی نگار - (۳) قطعہ نگاری کا سرسری جائزہ -

صنف ہجو و مزاح نگاری :- (۱) ہجو نگاری کی تاریخی جائزہ - (۲) سودا پر حیثیت ہجو نگار - (۳) مزاحیہ و طعنائی شاعری - صنف رباعی :- (۱) اردو رباعی پر ایک نظر -

صنف نظم نگاری :- (۱) اردو کی ابتدائی نظمیں - (۲) جدید نظم نگاری کا پس منظر - (۳) انشائی و اسلامی نظمیں - (۴) رومانی نظمیں - (۵) سیاسی و انقلابی نظمیں - (۶) آزاد نظم - (۷) فلمی نظمیں اور گیت - (۸) واسوخت -

منیجر نگار

## پاکستان کے خریدار

اپنا سالانہ چندہ آٹھ روپیہ آٹھ آنے ذیل کے پتہ پر ذریعہ مئی آرڈر روانہ فرمائیں اور رسید ڈاک خانہ ہمارے پاس جلد از جلد بھیج دیں تاکہ ہم چھ کی روٹنگی میں تاحیر و ہوا پاکستان کے خریدار کا چندہ جون یا اس سے قبل ختم ہو چکا ہے اور ان کے نام چھ لائی کا پرچہ اسی وقت روانہ ہوگا جب ان کا چندہ وصول ہو جائے گا۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۱۰۵ - گارڈن ویسٹ - گولڑہا

”نگار“ کی مطبوعات بھی آپ کو اس پتہ سے ذریعہ دی جانی سکتی ہیں۔

## بعض کمیاب کتابیں

ہے تو مضموم کتابوں پر کیش نہیں دیا جائے گا۔ قیمتیں علاوہ محصول اک (پا)

ہم نے اس کے لئے ایک نیا

۱	تذکرہ مخزنِ نکات	تایم	تذکرہ مخزنِ نکات	تایم
۲	تذکرہ دستورالقصاحت	یکتا	تذکرہ دستورالقصاحت	یکتا
۳	تذکرہ چستان شعراء	شفیق	تذکرہ چستان شعراء	شفیق
۴	تذکرہ ہندی	مصطفیٰ	تذکرہ ہندی	مصطفیٰ
۵	دیوان میر حسن	میر حسن حسن	دیوان میر حسن	میر حسن حسن
۶	دیوان شکرین	دیوان نسیم دہلوی	دیوان شکرین	محمد منور علی خاں
۷	کلیات ناسخ	امام بخش ناسخ	کلیات ناسخ	علاء
۸	کلیات تسلیم		کلیات تسلیم	علاء
۹	کلیات سودا	مرزا رفیع سودا	کلیات سودا	علاء
۱۰	کلیات حسرت	فضل الحسن موہانی	کلیات حسرت	علاء
۱۱	کلیات مومن	مومن خاں دہلوی	کلیات مومن	علاء
۱۲	کلیات میر	میر تقی میر	کلیات میر	علاء
۱۳	کامل شرح کلام غالب	مرتبہ عبدالباری آسی	کامل شرح کلام غالب	علاء
۱۴	مرآۃ الغیب	امیر احمد امیر	مرآۃ الغیب	علاء
۱۵	منظر معانی دیوان مجروح	میر محمد حسین	منظر معانی دیوان مجروح	علاء
۱۶	دستور الشعراء (تذکرہ و تائیت)		دستور الشعراء (تذکرہ و تائیت)	علاء
۱۷	کلیات جعفر ڈل	مرتبہ محمد فرحت اللہ	کلیات جعفر ڈل	علاء
۱۸	کلیات نظیر اکبر آبادی	مرتبہ عبدالباری آسی	کلیات نظیر اکبر آبادی	علاء
۱۹	مرآۃ انیس	جلد اول و دوم و سوم و چہارم	مرآۃ انیس	علاء
۲۰	مرآۃ میر انیس	جلد ششم	مرآۃ میر انیس	علاء
۲۱	مرآۃ دبیر کمال		مرآۃ دبیر کمال	علاء
۲۲	مرآۃ مولس		مرآۃ مولس	علاء
۲۳	کرم الکلمات		کرم الکلمات	علاء
۲۴	تنقیح الکلمات	ضامن علی جلال لغت قلمی	تنقیح الکلمات	علاء
۲۵	فردوسی پرچار مقالے	محمد شیرانی	فردوسی پرچار مقالے	علاء
۲۶	تاریخ جہانگیر	غلام الدین بن ہمام الدین	تاریخ جہانگیر	علاء

منیجر انکار لکھنو

کی کہ آپ کا چندہ اگست میں ختم ہو گیا اور ستمبر کا "شکار" کے مصارف جبری کے لئے ۸ اس کے علاوہ ہوں گے

شکار

داہنی طرف کا مصلیٰ نشان علامت ہے اس امر آئندہ رو بہ رو آنے میں دی ہنی ہو گا۔ سالانہ شکار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۷۰

فہرست مضامین اگست ۱۹۵۶ء

شمار ۲

۳۶	دلی کی علمی و ادبی مرکزیت	۳	ملاحظات
۳۷	منظومات :- ساقی جاوید - احسان درویشگلی - سعادت ظفر - مظفر حیدری	۶	حالی اور شتی (سوانح شکار کی حیثیت سے) - ڈاکٹر سید شاہ علی
۳۸	شفیق جونپوری - میتین دیاری - عزیز گیلادی - شائق الم	۱۶	کتوبات نیاز - پروفیسر ارشد کاکوی
۳۵	مطبوعات موصولہ	۲۶	کوثر چاند پوری کے ناول - سید حامد حسین ایم۔ اے۔
۳۹	مشکلات غالب	۳۰	اودھ کے تفریحی مشغلوں میں ڈرامائی عناصر - سید سجاد حسن رضوی دیوبند

## ملاحظات

**آئندہ انتخاب اور مسلمان**  
 آئندہ سال ہندوستان میں انتخاب حکومت کا سال ہے اور اس میں شک نہیں پڑے  
 محرکہ کا سال ہے۔ انتخاب کی ہم ہر جمہوری سلطنت میں بڑی محرکہ کی چیز ہوتی ہے  
 لیکن ہندوستان میں اس کی اہمیت اس لئے اور زیادہ ہے کہ آزادی کے بعد کا انتخاب کا یہ دوسرا ہی موقع ہے اور پچھلے پانچ سال کے  
 اندر ہندوستان کی سیاست جن منزلوں سے گزر رہی ہے اس کے پیش نظر حوام کے فکر و خیال میں اب تک کیسوی پیدا نہیں ہوئی ہے اور  
 حزب مخالف کی تمام جماعتیں اس ذہنی تذبذب سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گی۔  
 اگر ہندوستان میں ہندوؤں کے سوا کوئی اور آبادی نہ ہوتی تو بھی ان میں جماعتی اختلافات پائے جاتے اور اقتدار حاصل کرنے  
 کے لئے ناخن و چنگال کی پوری قوت سے کام لیا جاتا، لیکن اس صورت میں کہ یہاں ایک بہت بڑی اقلیت مسلمانوں کی بھی پائی جاتی ہے  
 مسئلہ کی نوعیت بہت بدل جاتی ہے اور اسی کے ساتھ انتخاب کی اہمیت بھی۔  
 چونکہ ہندوستان میں کسی جماعت کو جدا گانہ ناپیدگی حال نہیں ہے اور ہر انفرادی رائے کا اثر ہر جماعت پر پڑتا ہے، اسلئے انتخابی  
 ہم میں جب ہندوؤں کو مسلم ووٹ حاصل کرنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے تو وہ بہت سے ایسے عہد و بیان کرنے پر بھی اتر آتے ہیں، جن کو  
 وہ پورا کر ہی نہیں سکتے، اگر کر سکتے ہیں تو ان کا مذہبی ضمیر ان کے ایثار و کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کا احساس مسلمانوں کو پہلے تو نہیں  
 لیکن پچھلے انتخاب کے بعد پیدا ہوا اور جو مکتا ہے کہ اس احساس کے ذمہ اثر وہ آئندہ انتخاب میں ہندوؤں سے سودا کرنے میں زیادہ  
 احتیاط سے کام لیں اور ہندو ممبران ان کے ساتھ پہلے سے زیادہ ہمدردی و رواداری کا اظہار کریں، لیکن یہ دونوں باتیں متوجہ ثابت  
 نہیں ہو سکتیں اور ضرورت ہے کہ مسلمان آئندہ انتخاب میں اس مسئلہ پر محض جذبات سے کام نہ لیں بلکہ زیادہ فلسفیانہ نقطہ نظر سے فکر کریں

مسلمانوں کو کانگریس حکومت سے اور جوشکاہیتیں بھی ہوں، لیکن ان میں دو شکایتیں خاص ہیں، ایک یہ کہ زبان کے مسئلہ میں انکی اپنی و فطری رجحانات کو ملحوظ نہیں کیا گیا اور دوسرے یہ کہ کانگریس عمال نے اکثر مواقع پر مذہبی عصبیت سے کام لے کر حق و انصاف کو اپنی پشت ڈال دیا۔ اور آئندہ انتخاب میں جو غیر کانگریسی جماعتیں مسلم ووٹ حاصل کرنا چاہیں گی وہ اسی دھکیتی ہوئی رنگ کو بکٹریں گی اور یقین دلائیں گی کہ اگر وہ برسر اقتدار آئیں تو مسلمانوں کی یہ دونوں شکایتیں دور ہو جائیں گی۔

پھر ہو سکتا ہے کہ مسلمان اپنے کچھ تلخ تجربات کے پیش نظر نفسیاتی طور پر وہ اس قسم کے مواعید کا یقین کر لیں اور کسی غیر کانگریسی امید کے حق میں رائے دیں، جیسا کہ حال ہی میں مسلم جماعت کے سرکاری افسانوی صاحب کے بیان سے مترشح ہوتا ہے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا یہ اقدام کبھی مفید نہ ہوگا بلکہ اس میں ضرر کا زیادہ اندیشہ ہے۔

مسلمانوں کو اس بار میں صرف ایک چیز اپنے سامنے رکھنا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ کم سے کم نقصان ان کو کس جماعت سے پہنچ سکتا ہے (مسوال فیہ کہ نہیں)۔ مسلمانوں کو اس نقطہ نظر سے سوچنا تو بالکل ترک کر دینا چاہئے کہ وہ ہندوستان میں کسی وقت بھی اپنے لئے وہ سنا پڑا کر نہیں لے جو برہمنی سے پاکستان میں بھی اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکی۔ البتہ انھیں یہ ضرور سوچنا ہے کہ وہ ہندوستان کے آزاد شہری ہونے کی حیثیت سے اپنے تمام جائز حقوق کیونکر حاصل کر سکتے ہیں اور اس کا تعلق ووٹ سے نہیں بلکہ کیسے خود اعتمادی سے ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ انتخاب کے جنگ میں مسلمان اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دیں گے اور صرف اس شخص کی طرف جھک جائیں گے جو زیادہ بلند آواز سے اپنے آزاد خیال ہونے کا اعلان کرے گا۔ حالانکہ عملاً اس سے قبل وہ کبھی اپنے آپ کو آزاد خیال ثابت نہیں کر سکا۔

حال ہی کی بات ہے کہ لکھنؤ کے ایک نہایت سربرآوردہ لیڈر نے جو پرجا پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں، ایک بڑا مدوہانہ بیان اردو زبان کے متعلق شائع کر دیا اور حکومت پر سخت نکتہ چینی کی کہ ابتدائی مدارس میں اردو تعلیم کا انتظام نہ کر کے اس نے حدود و انتظامی سے کام لیا ہے۔ اس بیان کا اثر یہاں کے مسلمانوں پر ہوا اور ممکن ہے کہ آئندہ انتخاب کے وقت وہ اپنے اس بیان کی وجہ سے مسلمانوں کے ووٹ حاصل کر سکیں، لیکن جس حد تک خود ان صاحب کے عمل کا تعلق ہے اس کا حال یہ ہے کہ خود ان کے قائم کردہ مدرسہ میں کتاب کیسی اردو کا ایک لفظ بھی سننے میں نہیں آتا اور کوئی ایک استاد بھی ان کے یہاں ایسا نہیں جو اردو کی ابتدائی تعلیم دے سکے۔

اس سے مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ مسلمانوں کو محض ان ہمدردانہ تقریروں اور وعدوں پر بھروسہ نہ کر لینا چاہئے بلکہ اپنی جگہ غور کرنا چاہئے کہ موجودہ سیاسی پارٹیوں میں سے کس پارٹی کا ساتھ دے کر وہ زیادہ نقصان سے بچ سکتے ہیں۔

اس مسئلہ کو اب دوسرے زاویہ نگاہ سے دیکھئے، یعنی فرض کر لیجئے کہ آئندہ انتخاب میں کانگریس جماعت ہار جاتی ہے اور اسکی جگہ کوئی دوسری پارٹی لے لیتی ہے، تو کیا آپ یقین کرتے ہیں کہ وہ کانگریسی عہد کے اصول و ضوابط کو یک قلم محو کر دے گی، نظم و نسق کا جو ڈھانچہ بن چکا ہے اسے توڑ پھوڑ کر کوئی دوسرا ڈھانچہ طیار کرے گی، کیا وہ تمام ابتدائی و ثانوی مدارس میں اردو تعلیم کا انتظام کر دے گی، کیا مسلمانوں کو وہ زیادہ ملازمتیں دے سکے گی، کیا وہ ذبیحہ گاہ کی اجازت دیے گی کیا مسلمانوں کی معاشی بد حالی دور کرنے کے لئے کوئی خاص قدم اٹھائے گی، کیا وہ ہندو عوام کی اس ذہنیت کو بدل دے گی کہ ہندو مسلمان وہ ملحد قومیں ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ نہ کر نہیں رہ سکتیں۔ اور کیجئے کہ ہندوستان کی کوئی سیاسی پارٹی یہاں تک کہ اکثریت پسند جماعت بھی ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی اور مسلمانوں کو جوشکاہیتیں موجودہ دور کانگریس سے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ دستور قائم رہیں گی بلکہ ان میں اور اضافہ ہو جائے گا۔

کانگریس کی پہلی آٹھ سال کی حکومت میں ہم اس کے مزاج سے کچھ نہ کچھ واقف ہو گئے ہیں، موجودہ اختلافات کے جبریں وقت

بننا پر کچھ اخلاقی دباؤ بھی اس پر ڈال سکتے ہیں، لیکن کسی دوسری پارٹی سے تو ہم یہ توقع بھی نہیں رکھ سکتے۔ اس کو اپنے طرہ و  
بار کی آرائش سے کب فرصت ملے گی کہ وہ آپ کی عریانی کی طرف توجہ کرے، وہ اپنے کاشانوں کی آرائش کرے گی یا آپ کی جھوٹوں  
رہادی کا ماتم!

دوسرے پہلو سے خود کیجئے تو یہ بات ماننی پڑے گی کہ اس وقت ہندوستان کے تمام وہ افراد جو اپنی ذہنی و ملی حیثیت سے قدر  
کی حیثیت رکھتے ہیں، کانگریس ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسری پارٹیوں کے افراد اس اعتبار سے زیادہ وزن نہیں رکھتے،  
لئے کانگریس سے معاملہ کرنا ایسے لوگوں سے معاملہ کرنا ہے جو زیادہ عرصہ تک نامعقول نہیں رہ سکتے اور دوسری جماعتوں سے  
ملہ رکھنا ایسے افراد سے معاملہ کرنا ہے جن کی معقولیت کا ہمیں کوئی عملی تجربہ نہیں اور جن کی مزاج دانی کے لئے بھی ہم کو کافی  
درکار ہوگا۔

اس لئے کانگریس کا ساتھ دینا ایک ایسے تھیلے میں ہاتھ ڈالنا ہے جس میں اگر دس سانپ ہیں تو چار چھ پھلیاں بھی ہیں لیکن  
سری پارٹیوں میں شریک ہونا ایسے تھیلے میں ہاتھ ڈالنا ہے جس میں سانپ ہی سانپ ہیں اور پھیلی ایک بھی نہیں یا صرف ایک دو۔  
میری یہ نہایت مخلصانہ اور بہت سوچی سمجھی رائے ہے کہ مسلمانوں کو آئندہ انتخاب میں صرف کانگریس کا ساتھ دینا چاہئے اور  
تمام حقوق اسی سے لڑ جھگڑ کر حاصل کرنا چاہئے۔ مسلم جماعت آئندہ انتخاب میں جس قسم کا سودا کرنے کا مشورہ مسلمانوں کو دے  
ہے وہ کیسے زبان ہی زبان ہے اور اگر اس پر عمل کیا گیا تو اس کے معنی خود کشی کے سوا کچھ نہ ہوں گے۔  
جس حد تک ہندوستان کا سوال ہے، مسئلہ کشمیر فیصلہ کن حد تک پہنچ گیا ہے لیکن پاکستان چونکہ اس  
مسئلہ کشمیر فیصلہ کو ماننے کے لئے طیار نہیں۔ اس لئے اب اسی کو کوئی قدم اٹھانا ہے اور ہمیں دیکھنا ہے کہ وہ قدم  
ہوتا ہے۔

اس سے قبل جتنی خبریں اس باب میں آ رہی تھیں، ان سے صرف پاکستانی عوام کے مزاج کا اتار چڑھاؤ تو معلوم ہو جاتا تھا لیکن  
ملت کی طرف سے کوئی اعلان ایسا نہ ہوا تھا جس سے ہم یہ سمجھ سکتے کہ وہ خود کیا کرنا چاہتا ہے، لیکن اب اس نے تقریباً طے کر لیا ہے  
کہ اس مسئلہ کو پھر سیکورٹی کونسل میں لے جائے گا اور یہ خبر بڑی حد تک اطمینان بخش ہے، کیونکہ اس سے قبل بعض پاکستانی اخباروں  
جو نعرہ جہاد بلند کیا جاتا تھا وہ غالباً ختم ہو جائے گا اور وہاں کی فضا میں پھر وہی سکون انتظار پیدا ہو جائے گا۔ جس کی  
غایت کا اندازہ نہ وہ کر سکتے ہیں نہ ہم۔

ڈاکٹر خان نے ایک بار کسی شخص کے سوال پر کہا تھا کہ، ”کشمیر کا مسئلہ اہل کشمیر کا مسئلہ ہے اور اگر وہ موجودہ حالت سے مطمئن  
ہیں تو انھیں کو اس کے خلاف احتجاج کا حق پہنچتا ہے۔“ ڈاکٹر خان کا یہ جواب نہایت معقول تھا، لیکن چونکہ بالکل ذاتی و  
راہی جواب تھا، اس لئے حکومت پاکستان اس کی پابندی نہیں ہو سکتی تھی، اور اس نے بالکل اپنے ملک کا مسئلہ قرار دے کر پھر  
وجہ شروع کر دی۔

ہم سعی و کوشش کے خلاف نہیں ہیں، لیکن یہ ضرور چاہتے ہیں کہ ہندوستان و پاکستان کے باہمی سیاسی و اقتصادی تعلقات  
اس کا اثر بالکل نہ پڑے۔ سیکورٹی کونسل اس کا جو فیصلہ بھی کرے گی وہ فریقین کو تسلیم کرنا پڑے گا، لیکن اس فیصلہ کے  
ظار میں اور تمام مسائل کو ملتوی رکھنا کسی طرح مناسب نہیں، خاص کر ایسی صورت میں جبکہ سیکورٹی کونسل کے فیصلہ  
کا موجودہ نسل کیا شاید آئندہ نسل بھی جینے کی توقع نہیں کر سکتی۔ اور میرا یہ شعر بے اختیار سامنے آ جاتا ہے:-

تیرے ایفا وعدہ تک نہ ہے  
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

# حالی اور شبلی

## سوانح نگار کی حیثیت سے (بہ سلسلہء ماسبق)

(ڈاکٹر سید شاہ علی)

شبلی کی سوانحی تصانیف مولانا شبلی کی سوانح عمریوں کے موضوع عموماً تاریخی اور مذہبی ہیں مثلاً ماموں تاریخی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ خلیفۃ المسلمین ہونے کی وجہ سے برائے نام سہی، مذہبی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ اور فاروق اعظم کی حیثیت زیادہ مذہبی ہے لیکن ان کے عہد کی غیر ملکی فتوحات اور ان کے انتظامات کی وجہ سے وہ دنیا کی مشہور ترین تاریخی شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں پیغمبر اسلام کی شخصیت کو تقریباً تمام تر مذہبی ہے لیکن مسلمان ان کو جامع حیثیات و صفات تصور کرتے ہیں ابوحنیفہ، امام غزالی اور مولانا روم کی شہرت بھی مذہبی رہنما فلسفی اور عالم کی حیثیت سے ہے۔ جہانگیر اور قوزک جہانگیری، عالمگیر اور شاہ جہاں سوانح زیب النساء بیگم (ایک انگریزی مضمون کے جواب میں حیات و کردار کے صحیح حالات میں) اور حیات سعدی وغیرہ مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بیان خسرو (سلسلہ خسرویہ علی گڑھ) اور شعراء عجم ادبی تنقید سے متعلق ہیں۔ مولانا حالی کی طرح ان کے موضوع بھی نامور ہوں اور مسلمانوں تک محدود ہیں۔ ممکن ہے ان کا سلسلہ نامور ہیرودز آئن اسلام، حالی کی حیات سعدی کے اثر کا نتیجہ ہو۔ اپنے ہم عصروں میں سے شاید کوئی ان کی نگاہوں میں اس حد تک نہیں اچھا سکا کہ وہ اس کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ کرتے چنانچہ ایک ہم عصر کی زندگی جو دشواریاں پیش کرتی ہے ان سے انھیں دوچار ہونا نہیں پڑا۔

شبلی کی سوانحی تصانیف کا مواد پچھلی تصانیف کا مہیون منت ہے لہذا حسن انتخاب و ترتیب سے قطع نظر، مواد کی فراوانی اور خوبی اور زیادہ تر ان کے مآخذ کی خوبی اور عمدگی پر منحصر ہے۔ چنانچہ شبلی کی مختلف تصانیف سے یہ بات ظاہر ہے۔ البتہ شبلی کی سعی و محنت کا اندازہ ان کے موضوعات کی تصنیفات کے مطالعہ اور ان پر تبصرے سے ہوتا ہے۔ شبلی نے حتی الامکان خطوط، ذرائع اور دیگر تحریروں اور دستاویزوں کو استعمال کیا ہے۔ اور ان سے اقتباسات بھی دئے ہیں۔ عموماً قدیم موضوعات پر طبع آزمائی کے سلسلہ میں مواد کا دہیا کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور ایسی سوانح عمریوں میں کامیابی مصنف کی تلاش و تحقیق اور انتخاب و ترتیب پر موقوف ہوتی ہے۔ لہذا ایک معاصرانہ سوانح عمری کے معیار سے اس قسم کی نوعمری یا تجربی سوانح عمریوں کو نہیں جانچا جاسکتا۔

(۱۸۸۵ء تا ۱۸۹۰ء) شبلی کا سوانحی طریقہ تاریخی طریقہ سے بہت متاثر ہے۔ علاوہ بری شبلی کے ذہن میں سوانح عمری اور تاریخ الماموں کا فرق بھی واضح نہیں معلوم ہوتا۔ چنانچہ جہاں الماموں کے ذہن میں برسرہدے مشرقی تاریخ نویسی کی خامیوں اور ان کی اصلاح کے طریقوں کی طرف اشارہ کیا ہے، وہاں شبلی نے اپنی قہید میں ہندوستانی اور مشرقی تاریخوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک حد تک اسلامی حکومتوں کی ایک نہایت مفصل اور متوسط تاریخ لکھنے کے خیال، لیکن تمام حاذقوں کے استقصاء کو یکے بعد دیگرے واپس ہیرودز آئن اسلام (یعنی نامور فرمانروایان اسلام) کے نام سے منتخب ناموروں کے حالات اس ترتیب اور جامعیت سے کہ

۱۱ میں تاریخ کے ساتھ لایا گیا مذاق بھی ہو، لکھنے کے ارادے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور اس ضمن میں عربی تاریخوں سے استفادے جن سے برہنہ اسباب و علل کے سلسلے یا تاریخی نتیجوں کے استنباط نہ ہو سکے اور یورپ میں فن تاریخ کی ترقی اور دقیقہ بینی اور اس کے اصول و روح میں فلسفیانہ گفتگوں کے اضافے وغیرہ کا اعتراف بھی کیا ہے (و واضح رہے کہ حیات سعدی کے دیباچے میں حالی نے اس طرح کی بحث فن تاریخ نویسی نہیں بلکہ سوانح نگاری کے بارے میں کی ہے) نیز دوسرے حصے کی تمہید میں بھی شبلی نے المامون کے لئے بار بار تاریخ لفظ استعمال کیا ہے (مثلاً ہماری تاریخ کا پہلا حصہ) اور بحیثیت مورخ اپنے فرائض اور تاریخ کے عناصر وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن پہلے حصہ کی تمہید میں جو ذیلی عنوانات گنائے ہیں، ان میں تاریخی اور سوانحی کو گڈمڈ کر دیا ہے جس میں تاریخ کا بلکہ بھاری ہے، چنانچہ المامون، متن میں بھی مامون کے ذاتی حالات مثلاً ولادت، تعلیم و تربیت، ولی عہدی، وفات، فضل و کمال، علمی مجلسوں، اہل علم کی قدر، طلاق و عادات مذہب وغیرہ کے عہد سوانحی بیانات، بعد کی تصانیف مثلاً "یادگار غالب" اور تاریخی حالات مثلاً اجمالی تاریخ خلافت، لگوں، بغاوتوں، درباریوں وغیرہ کے نام بنام مفصل حالات دربار کبریٰ کی یاد دلاتے ہیں جو اس سے متاثر ہوئی ہوگی۔ کم از کم یادگار غالب، کی زبان اور طرز بیان کی تسکینگی جس اپنے موضوع کے اثر کے علاوہ شبلی کی المامون کا بھی اثر ہوگا، جس طرح آزاد کی بہ حیات کی زبان نے شبلی کے طرز تحریر کو متاثر کیا ہوگا۔ مصنفین پر اپنے ماحول اور ہم عصروں کا اس طرح کا اثر فطری ہے۔ البتہ شبلی، تاریخی اور سوانحی عناصر کے ان عجیب مجموعوں کی دو حصوں میں تقسیم بظاہر حالی ہی کی تقلید میں ہے۔ جہاں تک اصل کتاب کا تعلق ہے بعض نے جیسے عنوانات مثلاً امن و امان، عدل و انصاف، ذوق علمی، رصد خانہ وغیرہ میں، جن کو مامون کے کارناموں سے متعلق سمجھنا چاہئے، جس حد تک ذاتی حالات کا ذکر ہے بہت خوب ہے اور ان میں مامون کی شخصیت، قابلیت، ذہانت، اخلاق و عادات و دار، علم و صفو وغیرہ کے تفصیلی ذکر، لطائف و ظرائف اور دلچسپ واقعات وغیرہ کی مدد سے اس کے واضح نقوش اور قد و خال پیش کرنے کی کوشش کا احساس ہوتا ہے۔ اسی طرح مامون اور امین کے کردار کا تضاد بھی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ البتہ ہارون کے تھیل کے راکہ کے قتل سے آلودہ ہونے کے باعث عباسی خلفاء میں مامون کو اس پر ترجیح دینے کی وجہ سے شبلی کی مامون کو اپنے بھائی بن امام رضا اور طاہر (سب سالار) کی موت کے لئے سیاسی مجبوریوں کو حذر بتا کر بری الذمہ کرنے اور اسے واقعی ہیرو ثابت کرنے کی کوشش کا اظہار ہوتا ہے جو ان کی بعد میں حیات حادید کی تنقید سے مطابقت نہیں رکھتا۔ پھر بھی بقول عبداللہ جمعی طبر المامون مد عربی یا انگریزی تصانیف مثلاً عصر المامونی (تین جلدوں میں) اور میور Henry Muir Henry اور Leathbridge کی تصانیف سے بہتر ہے۔ شبلی کی تقریباً تمام تصانیف کی خصوصیت ہے کہ وہ جہاں تک اپنے موضوع کا تعلق ہے، اوروں کے مقابل نذر تعمیر پیش کرتی ہیں۔

سیرت النعمان (۹۰-۹۱) یہ بھی دو حصوں میں منقسم ہے اور حیات اور تصانیف کی طرز پر ہے۔ ذاتی حالات کا بیان کتاب کے تقریباً ایک چوتھائی حصے پر مشتمل ہے اور بقیہ حصہ تصانیف پر تبصرے کے لئے مخصوص ہے گو معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اس قدر حصہ دراز کے بعد کسی کی سوانح عمری کی ترتیب کی کوشش اور قدیم تصانیف سے کام لے کر انتخاب اور روایات کی جدید روشنی میں درایت ایک مشکل امر ہے۔ موضوع اور سوانح نگار دونوں کی ذہنیت، شبلی کی بعض تصانیف کی طرح اس میں بھی راس آئی ہے اور جہاں تک سوانح نگار کے فن اور اہتمام کا تعلق ہے انھوں نے اپنی طرف سے فی الامکان سعی کی ہے۔ لیکن جدید سوانحی استفسارات کے جواب میں وہ اپنی طرف سے مواد کی ایجاد تو نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ شبلی نے جہاں اس میں نام و نسب، ولادت سن رشد، تعلیم و تربیت، وفات اور آخر میں اولاد، اخلاق و عادات، ذہانت و طباعی خدمت پسندی

نہایت وفاداری کے ذاتی حالات کے بیان سے، جس میں مؤخر الذکر کمالات کے سلسلہ میں، روایات لطائف و حکایات اور دلچسپ واقعات، جودت طبع، حاضر جاتی، وقت کے ضبط و انضباط وغیرہ کی مثالوں سے ان کی شخصیت و کردار اور قابلیت و صلاحیت پر بہت عمدہ روشنی ڈالی ہے، وہاں ان حالات کے اختصار کی تلافی کی کوشش، حصہ اول کے ابتدا ہی میں امام ابو حنیفہ کے تابعی ہونے نہ ہونے کے مسئلہ پر طویل بحث اور حصہ دوم میں تصانیف سے انتکابات و اقتضابات امام کے تفقہ فی الدین اور اجتہاد مسائن پر قبضہ کے علاوہ سلسلہ تصانیف و فقہ کے رواج، تدوین، قبول و اشاعت اور اسباب، اسلامی فقہ کے رومن لاسے ماخوذ ہونے نہ ہونے کی بحث، تاریخ، مجتہدین صحابہ امام کے اساتذہ و تلامذہ کے حالات و کردار اور تصانیف وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ سیرت النعمان، الفاروق اور سیرت النبی میں فقہ، حدیث اور رجال کی بحث گویا ایک ہی شے کی مختلف ارتقائی شکلیں ہیں۔ زبان و بیان اپنے موضوع بحث کے مناسب ہے، شبلی اور حالی جیسے مسلم ادیبوں کا اس معاملہ میں کہنا ہی کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ امام کے حالات زندگی کسی معنوں میں جامع نہیں کہے جاسکتے اور شبلی کے انتخاب و ترتیب کا انحصار بھی ان کی بعض اور تصانیف کی طرح مطلوبہ مواد کی دستیابی اور عدم دستیابی پر ہے، جس کے اثر سے آزادی، سوانح نگار کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ ہر طرح کے سوانحی مواد کی فراوانی نہ ہو، ورنہ بجائے سوانحی مواد کو تشکیں دینے اور ڈھانسنے کے اپنے آپ کو سوانحی مواد کے تحت کرنا یا سوانح عمری کا ارادہ ترک کرنا پڑتا ہے۔ طوالت اور اختصار اہم اور غیر اہم، عام اور نجی جزئیات، فنی اور تاریخی ترتیب اور صحیح اور غلط سوانحی طریقوں کی بحث منھکا نیز ہو کے رہ جاتی ہے اور ان کا اطلاق ایسی احساس تناسب سے عاری اور بے شکل سوانحی تصانیف پر کسی طرح نہیں ہوسکتا۔ جدید تصانیف اور تصانیف میں بھی اس طرح کے مختصر حالات زندگی کی شمولیت، دیباچوں میں ضروری سمجھی جاتی ہے۔

۹۸-۹۹-۱۰۱ اس کے سرورق پر حضرت عمر کی مفصل سوانح عمری ہونے کے اعلان کے باوجود، دیباچے میں تاریخ، الفاروق اور انشا پر داری کے فرق اور عربی تاریخ کے ارتقا کے بیان کے علاوہ حصہ دوم کی ابتدا میں بھی "اسم واقعات کو فلسفہ تاریخی کی نگاہ سے دیکھنے" اور نکتہ سنج سورخ کے دل میں "مختلف سوالات کے پیدا ہونے" تاریخ عالم پر نظر وغیرہ کا ذکر ہے۔ الفاروق کا دیباچہ سیرت النبی کے طویل اور مفصل دیباچے کا پیش خیمہ اور داغ بیل معلوم ہوتا ہے۔ دونوں کے مقابلے سے شبلی کی معلومات میں ترقی و اضافے کا اندازہ ہوتا ہے۔

موضوع کی اہمیت، مواد کی فراوانی اور اردو میں حضرت عمر کی کسی سوانح عمری کی عدم موجودگی کے مد نظر الفاروق کچھ زیادہ طویل نہیں ہے باوجود ایک قدیم موضوع کے شبلی نے سرسید کی تقلید میں ترکی اور مشرقی وسطیٰ کا سفر کر کے جو بہت سی معلومات فراہم کیں، ان میں شاید ان کو بہت سی جاندار اور بولتی ہوئی جزئیات اور تفصیلات مل گئیں جن سے کتاب کی دلچسپی اور فادیت میں اضافہ ہو گیا (شبلی کو بھی مواد کی کثرت سے دستیابی کا اعتراض ہے) اس کی طرز ذاتی حالات کے سلسلہ میں اشارہ کیا جائے گا۔ شبلی کی ذہانت، قابلیت اور صلاحیت، تاریخ سے دلچسپی، شدید مذہبیت اور اسلامی و قوی کے احساس اور ہمیر و پرستی کے رجحان کے مدافعت حضرت عمر کے سے با عظمت تاریخی موضوع کی سوانح نگاری کے استحقاق کے علاوہ انھیں اس کے ذریعہ اپنے جذبات و غمازات کے نشو و نما کا بھی موقع مل گیا۔ کتاب کی تاریخی ترتیب اس کے شگفتہ انداز بیان اور مصنف کے جوش و انہماک اور ولولہ کی وجہ سے قاری کو اس کے جوش و انہماک اور ولولہ کی وجہ سے قاری کو اس کے مطالعہ میں لطف آتا ہے بلاشبہ یہ مولانا شبلی کی اور اردو ادب و تاریخ کی بہترین تصانیف میں شمار کی جاسکتی ہے۔ شبلی خود بھی اس کو اپنی بہترین تصنیف خیال کرتے تھے، بلکہ اس موضوع پر عربی میں بھی کوئی اس ہائے کتاب نہ تھی۔ شبلی بھی خود اس سے آگاہ تھے کہ مقرر کے ایک نامور مصنف کی مشہور تصنیف سیرۃ الفاروق

الفاروق کے بعد کسی کوئی بھی الفاروق کی عمر عشر بھی نہ تھی۔ سوانح نگار اور موضوع کا اس طرح کا ساتھ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے جیسا کہ جاوید کے بعد جامعیت و تکمیل وغیرہ کے لحاظ سے اردو کی نو تعمیر اور تجدیدی سوانح عمریوں میں اگر کسی کتاب کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ الفاروق ہے۔ اس کی زبان و بیان سے شبلی پر اپنے پیش روؤں کا اثر ظاہر ہے۔

البتہ اس کی دو حصوں میں تقسیم متعدد مباحث کے بار بار بلکہ بے کار اعادے کا باعث ہوتی ہے۔ حصہ اول کے دیباچے میں شبلی لکھتے ہیں: ”پہلے حصہ میں تمہید کے علاوہ حضرت عمر کی ولادت سے وفات تک کے واقعات اور فتوحات ملی کے حالات اور دوسرے حصے میں ان کے ملی اور مذہبی انتظامات، علمی کمالات اور ذاتی اخلاق و عادات کی تفصیل ہے۔ اور یہی دوسرا حصہ مصنف کی سعی و محنت کا تماشا گاہ ہے۔“ شبلی کا یہ خیال صحیح ہے۔ حصہ اول میں متعلق و غیر متعلق بیان واقعات یعنی نام و نسب و سن و رشد، قبو، اور ہجرت کے ذاتی حالات کے بعد آنحضرت کی وفات تک کے غزوات اور ان سے متعلق واقعات و مسائل میں غیر ضروری تفصیل پائی جاتی ہے۔ اسی طرح حضرت عمر پر شیعہ مصنفین کے اعتراضات کے منظر سقیفہ بنی ساعدہ اور ابوبکر کی خلافت اور فتوحات کے زیر عنوان فارس، عراق اور شام کے ساتھ آنحضرت کے زمانہ کی چھپر چھاڑ سے لے کر جس میں غزوہ موتہ و تبوک کا بھی ذکر آگیا ہے، حضرت عمر کے بعد تک کے تعلقات و حالات اور حضرت عمر کے زمانہ میں ان ممالک کی فتوحات کا اس تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ اگر حضرت عمر خلیفہ کی بجائے سپہ سالار افواج ہوتے تب بھی اسے روا نہ رکھا جاسکتا۔ ضمناً حضرت عمر سے تعلق ظاہر کرنے کے لئے کہیں کہیں ان کے کسی افسر کے انتخاب و تقرر اور احکام وغیرہ کی تعریف کر دی گئی ہے، جس کا اعادہ حصہ دوم میں بار بار ہوا ہے۔ جنگوں کی تفصیلات مولانا شمس کے تاریخی ناولوں کی یاد دلاتی ہیں جن کا سلسلہ کوئی دس سال قبل دہلازمین شروع ہو چکا تھا۔ ممکن ہے ان کی مقبولیت نے شبلی کو متاثر کیا ہو۔ خصوصاً جنگ قادسیہ، یرموک وغیرہ کا بیان اس تفصیل سے شاید کسی ایک باقاعدہ تاریخ میں بھی مشکل سے ملتا ہو۔ البتہ تاریخی ناولوں میں ایسی تفصیلات پائی جاتی ہیں۔

حصہ دوم میں فاروق اعظم کی فتوحات کی وسعت کا دیگر مشہور فاتحین مثل سکندر و جنگیز خاں وغیرہ کے کارناموں سے موازنہ و مقابلہ اور مزید، نظام حکومت کے زیر عنوان، جمہوری اور شخصی سلطنت کے موازنہ اور مقابلہ۔ مجلس شوریٰ، اصول مساوات وغیرہ خصایص، موبجات و اضلاع کی تقسیم اور ان کا انتظام، مختلف شعبوں مثلاً محاصل، عدالت، فوجداری، پولیس، بیت المال، نظارت نافعہ (پبلک ورکس) رفاہ عام، شہروں کی آبادی، صیغہ فوج اور اس کا روحی، ایرانی اور فرانسیسی فوجی نظام سے مقابلہ، صیغہ مذہبی (اسلام و شاعت اور تعمیر مساجد) زمینوں کے حقوق، غلامی کے رواج کو کم کرنے وغیرہ کی تفصیلی بحث ہے جو میں اکثر چیزوں کو زمانہ حاضر کے دائروں پر ترجیح دینے یا کم از کم ان کے برابر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو بعض نقادوں کے نزدیک ان کی خوش عقیدتی اور انتہا پسندی کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ ایک حد تک ڈاکٹر عبداللہ کا یہ عذر معقول معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ کے اقتضا اور مناسب قدیم اصطلاحات کی عدم موجودگی کے منظر جدید اصطلاحات کے استعمال پر مجبور تھے لیکن بیان حقائق میں انھوں نے کوئی مبالغہ نہیں کیا ہے۔ سیاست و تدبیر اور عدل و انصاف کے عنوانات کے تحت ضروری تفصیلات کے علاوہ عمدہ لطائف و ظرائف اور واقعات حکمت و تدبیر اور ذاتی حالات لکھے ہیں جو بے حد دلچسپ ہیں اور حضرت عمر کی شخصیت پر خوب روشنی ڈالتے ہیں اسی طرح امامت و اجتہاد کی یہ بحث بھی تفصیلی، مستند اور دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ اس میں احادیث کی تفسیر، روایت و درایت، فقہ کے اصول و مسائل اور حضرت عمر کے ان کامیاب ہونے اور ان کے زیر تربیت فقہ کا ذکر ہے۔ حسن، نفل، غنیمت، فتنہ اور فک کی بحث بھی حیرت انگیز اور نامناسب ہونے کی حد تک طویل اور مفصل ہے لیکن ممکن ہے اس کا مقصد حضرت عمر کے متعلق شدید غلط فہمیوں کا جو صدیوں سے معرکہ آوار رہی ہیں ازالہ ہو۔ البتہ ذاتی حالات اور اخلاق و عادات (مزاج کی سختی کا اعتراف بھی) کا بیان، سوانحی، معلومات افزا اور دلچسپ ہے اور قدیم طریقے پر آخیریں ملتی ہے۔ ان کی مختلف قابلیتوں کے ذکر میں

خلا خطابت، تحریر، شاعرانہ ذوق، علم الانساب، خبرانی سے واقفیت، ذہانت و طباعی، حکیمانہ مقولے، اسباب رائے، مکتبہ شعیب، غور سے مذہبی زندگی (غاز، روزہ، حج وغیرہ) بے تعصبی، علمی صحبتیں، ارباب صحبت، اہل کمال کی قدردانی (شاعری، پہلوئی، بہادری وغیرہ) متعلقین رسول کا پاس، اخلاق و عادات (وضع، زندہ دلی، مزاج کی سختی، آل و اولاد کے ساتھ محبت وغیرہ) مسکن، وسائل مدائن (تجارت، جاگیر، مشاہیر، زراعت) غذا، لباس، سادگی اور بے تکلفی، حلیہ، اولیات، ازواج و اولاد وغیرہ کے مطالعے سے اس کا روزہ ہوتا ہے کہ شبلی کو خوش قسمتی سے علم رجال کی بدولت ایک قدیم موضوع کے متعلق کس قدر عمدہ مواد ملا ہے۔ اس سے علم الرجال کی ترقی کا بھی انوارہ لگایا جاسکتا ہے۔ "مخاتے میں جس کی مثال ان کے پیش رو حالی کی تصانیف میں بھی ملتی ہے، حضرت عمرؓ کا دنیا کے ناموروں۔ جو اوصاف، حکمرانی، حسن تدبیر عدل و انصاف، آئین سازی، قناعت اور علمی حیثیت میں موازنہ اور مقابلہ کر کے ان کی جامعیت اور برتری دکھائی ہے (جس پر اردو کی طرف سے اعتراضات کئے گئے ہیں) اور اس کی حمایت میں شاہ ولی اللہؒ کی تحریروں سے بہت عمدہ اقتباس دیا ہے حق یہ ہے کہ دوسرے جتنے کو دیکھتے ہوئے خاتمہ ہر شبلی کا یہ دعویٰ "حضرت عمرؓ کے سوانح اور حالات" تفصیل کے ساتھ اور اس صحت کے ساتھ لکھے جاسکے ہیں جو تصنیف کی صحت کی اخیر حد ہے اور (تمہید میں) یہ کہ "دیہی" دوسرے حصہ تصنیف کی سعی و محنت کا ماثم گواہ ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے حصہ کی جزئیات نگاری، تلاش و تدقیق، حسن انتخاب، ترتیب، کثرت معلومات اور شگفتہ زبان، و انداز بیان و انداز بیان وغیرہ نہایت قابل داد ہے۔ خصوصاً اقباس، فقہ، پولیس، خمس، بیت المال، مختلف انشائی شعبوں کی جابجاء انہوں پر بحث، ان کے اقوال و افعال اور لطایف و واقعات خطوط و قرائین وغیرہ کی شمولیت نہایت قابل تعریف ہے، گو حضرت عمرؓ کے تاریخ اسلام سے تعلق اور کتاب کے "لابت اینڈ ورک" کی طرز پر ہونے کے باعث بعض مباحث سوانح عمری سے زیادہ تاریخی کی تعریف میں آتے ہیں۔ کتاب کا عربی، فارسی، انگریزی، گجراتی وغیرہ زبانوں میں ترجمہ اس کی عمدگی کا مزید ثبوت ہے۔

**غزالی** کے بیان کے سلسلہ میں بھی ہم انھیں مسائل سے دوچار ہوتے ہیں، جن پر سیرت النبیؐ کے بیان پر تبصرے میں غور کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ ہمیں مولانا شبلی کی مجبوریوں اور کوششوں کے بے قاعدہ جائزے کے کوئی اور چارہ کار نظر نہیں آتا۔ ذکر و ابتداء میں آپکا ہے کہ شبلی کا اپنے موضوعات کا انتخاب مذہبی اور تاریخی نقطہ نظر سے ہے۔ لہذا ان کی اپنی مذہبی اور تاریخی دیکھپیموں کی وجہ سے انھیں اس میں آسانی بھی ہے۔ سوانحی مواد کے حصول کے متعلق بھی ابتداء میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ قدیم سوانحی تصانیف کی عمدگی اور خوبی پر موقوف ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا نے اپنی اس تصنیف کو دو حصوں میں تقسیم تو کر دیا ہے لیکن ذاتی حالات پر مشتمل حصہ اول کی ضمیمہ صرف چالیس صفحات کی ہے یعنی تصنیف کے حجم (صفحہ ۲۷۲) کا ۱۱ حصہ ہے۔ چنانچہ اس طلب ہے کہ آیا اس وقت غزالی پر حیثیت سوانح عمری بحث کی جاسکتی ہے۔ دوسرے حصہ میں جو تقریباً سو اردو صفحات کے ہیں ان کی تصنیفات اور اصلاح و اشاعت علم وغیرہ کا ناموں کا ذکر ہے۔ مولانا نے شاید اسی لئے اپنا مقصد علم کلام کی سوانح عمری کی تدوین قرار دیا ہے، جس کی تقسیم انھوں نے چار حصوں میں کی ہے۔ اسکا ایک حصہ ائمہ کلام کی سوانح عمریوں کے لئے وقف ہے۔ لیکن یہ سوانح عمری بھی زیادہ تر علم کلام کے اثر "ہستم" باشند مسائل" (ص ۳) کی بحثوں کا شکانے کے لئے کھوشیوں کا کام دیتی ہیں۔

مولانا کی سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ الفاروق اور سیرت النبیؐ کے برعکس ان کو اپنی دوسری تصانیف کے لئے عمدہ مآخذ نہیں مل سکے ہیں۔ چنانچہ امام غزالیؒ کی بھی کوئی مستقل سوانح عمری نہیں مل سکی ہے بلکہ انھیں رجال اور تراجم کی کتابوں سے جن میں اوروں کے ساتھ غزالی کا بھی ذکر ہے، یکام چلانا پڑا ہے۔ مولانا حالیؒ حیات سعدیؒ کے دیا ہے میں اس چیز کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ رجال و تراجم میں کسی اہل کمال کی کوئی مستقل سوانح عمری نہیں ہے۔ اس قسم کی اجتماعی سوانح عمریوں میں خوش قسمتی سے "شبلی" کو یہ عمدہ کتابیں مل گئیں۔ ایک کے مصنف عبدالغفار فارسی ہیں جو غزالیؒ کے ہم عصر ہیں اور اسی وجہ سے ان کے رقم کردہ "غزالی" کے ذاتی حالات مستند اور دلچسپ ہیں۔ دوسری تصنیف اپنی جامعیت کے لحاظ سے قابل قدر ہے اور اسی مناسبت سے غزالیؒ کے متعلق بھی سب سے زیادہ معلومات فراہم کرتی ہے۔ شبلی نے ایک

جس پر مبنی کر کے (Research) کی تصنیف الغزالی سے استفادہ نہ کر سکتے کا انہوں نے کہا ہے۔

چونکہ مولانا کی نظر سوانح نگاری سے زیادہ تاریخ پر مبنی ہے، باوجود اس کے کہ امام کی ولادت اور تعلیم و تربیت کا حال قلم بند کیا ہے، اس میں عاجی اس زمانہ کی تعلیم و تدریس، ملکی حالت و سلطنت و وزارت کا ذکر بھی شرح و بسط کے ساتھ کیا ہے، جس کا حجم ذاتی حالات سے زیادہ ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ذاتی حالات کی مقدار کیا ہوگی۔ شبلی نے گویا اس میں حیات، تصانیف اور زمانہ تینوں کو شامل کر دیا ہے۔ غزالی کے حصول علم کے بعد مسند درس نظامیہ کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی عظمت کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں، ترک تعلقات دنیا اور عورت و سیاست کی تفصیلات میں متضاد بیانات بھی پائے جاتے ہیں مثلاً صغیر ۳، اور صفحہ ۳ پر ان کی تصوف سے دلچسپی کی ابتدا کی تاریخ میں برسوں کا اختلاف ہے۔ اسی طرح صفحہ ۲۵۰ پر ان کی درباروں سے بے تعلقی کی خصوصیت کے ذکر کے (جو پہلے کیا تھا) خلاف بیان ملتا ہے۔ مولانا نے ذاتی حالات کے بیان میں امام کے خطوط اور تصانیف سے مدد لینے کی کوشش تو کی ہے اور آخر میں وفات اولاد اور تلامذہ کا ذکر بھی کیا ہے، لیکن ازدواج، عادات و اخلاق، سیرت و کردار پر روشنی نہیں ڈالی۔ بعد از قیاس روایات ترک کی ہیں لیکن کہیں کہیں مبالغہ آمیز نظریات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

دوسرے حصہ میں ان کی تصنیفات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ ان کے اصول و مسائل اور اصلاح و تنظیم کے کارناموں کو ان کی تصانیف سے اخذ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں امام پر اعتراضات کے جوابات بھی دئے ہیں۔ دوسرے حصے سے امام کی تصنیفات اور کارناموں کا اچھا اندازہ ہوتا ہے، لیکن اصل چیز شخصیت ہے اور کارناموں کی اہمیت اس مناسبت سے ہے کہ وہ کس حد تک شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک سوانح عمری کو شخصیت سے الگ، ایک علمی، فنی، تحقیقی اور تنقیدی مقالہ بنا دینا سوانح نگاری کے فرائض سے عہدہ بردار ہوتا نہیں ہے۔ جان سٹورٹ مل، گبن یالارڈ بالڈین نے اپنی آپ بیتیوں میں بھی اپنی تصانیف پر اس قدر روشنی نہیں ڈالی ہے مولانا کی زبان اور طرز بیان البتہ بے حد شگفتہ اور دلچسپ ہے۔

۱۹۰۲ء کے بیان کردہ حالات پر بھی طوالت و اختصار، فن سوانح نگار اور موضوع سے دلچسپی ترتیب وغیرہ سوانح مولانا روم سے متعلق وہی سب باتیں صادق آتی ہیں جو سیرت النبی اور الغزالی پر تبصرے میں مذکور ہوئی ہیں لیکن اس میں باوجود ذاتی حالات کی مجموعی صفات کے ۱/۵ (صفحہ ۲۷) نسبتاً زیادہ اطمینان بخشتا ہے، اس کے علاوہ شبلی کا سوانحی شعور بھی اس میں زیادہ ترقی یافتہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ان کی زبان و بیان میں بھی اختصار بخشنی اور سنجیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔

اس کی وجہ کچھ تو مولانا روم کی اپنے زمانے میں کافی مقبولیت، معلوم ہوتی ہے، جس کے سبب سے لوگوں نے ان کے حالات کی طرف زیادہ اہتمام کیا ہوگا اور دوسرے پہلو کے مذکورہ تاخیر میں سے ایک مولانا روم کی ان کی صحبت سے ایک مدت تک فیضیاب، ان کے ایک مرتبہ خاص سب سالار کی لکھی ہوئی مستقل، مستند، مفصل اور واضح سوانح عمری ہے۔ مولانا شبلی نے اسی کو اپنا اس مانڈ بنا یا ہے۔ مگر اس کی عام شکایت بھی کی ہے کہ تاخیر کے قدیم ذائق کے ہونے کی وجہ سے ضروری اور بیکار آمد باتیں کم ملی ہیں۔ اس کے باوجود شبلی نے جو معلومات اخذ کی ہیں وہ روشن، واضح، دلچسپ اور پسندیدہ ہیں۔ مولانا روم کے نام و نسب، ولادت (مختصر) تعلیم و تربیت (قدرے مفصل)، اساتذہ اور مدرسوں شادی اولاد اور وفات کے علاوہ ان کے تصوف کی ابتدا اور ارتقاء، ان کے معاصرین، ارباب صحبت اور اخلاق و عادات کا بیان سب سالار کی کتاب سے لطائف و واقعات کی مدد سے اس خوبی سے لکھا ہے کہ ان کی سیرت اور افتاد طبع کے مختلف نقوش، اور پہلوئیاں عمدگی سے نمایاں ہوتے ہیں۔

سلاطین روم کے مولانا روم سے تعلق کی وجہ سے ان کے مختصر ذکر کے لئے عذر خواہی، شمس تبریزی کی مولانا روم سے ملاقات اور مولانا روم کی ہلاکتوں کے بھائی بیچو غدار کے حملے کے دوران میں گمراہی، متصل دس دس بیس بیس دن قانون سماجی کاشمی سے بے اعتنائی وغیرہ کی درایت

مولانا کی اولاد اور جانشینوں کے مختصر ذکر کے بعد مزید تفصیل کو سوانح نگار کے فرائض سے خارج بتا دیا، مولانا کے اخلاق و عادات کے تفصیل نہ ملے، چنانچہ بالترتیب نہ لکھ سکے کی معذرت وغیرہ سے، پچھلی تصانیف کے خلاف، اس میں زیادہ حزم و احتیاط اور سوانحی شعور کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح باوجود ایک زمانہ میں حالی کی معنی آفرینی کے مدح ہونے کے، خود مولانا کے کلام سے ان کی حماوت اور سیرت کے متعلق نتائج استنباط کرنے سے گریز کیا ہے (لیکن بقول عبداللہ اسلامی مفکرین کی جدید ترین سائنسی نظریات سے آگہی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں)۔ البتہ جہاں کہیں مولانا روم نے اپنے حالات کی طرف خود صریح اشارے کئے ہیں، ان سے فائدہ اٹھایا ہے مثلاً شمس تبریزی کی ناراضی، گم شدگی اور تلاش کے واقعے سے متعلق اشعار بلکہ ان کے صاحبزادے سلطان کی مولانا روم کے حالات میں منہوی سے بھی حسب ضرورت اشعار نقل کئے ہیں زبان اور طرز بیان حسب معمول خوب ہے۔

**سیرت النبی** فائسی، جرمن، فرانسیسی، انگریزی کسی اسلامی یا اسلام سے متعلق زبان یا ملک میں نہیں ہے۔ شبلی کی حیات میں اس کی تکمیل نہ ہو سکی تھی۔ سیرت کی چھ جلدوں میں سے پہلی دو جلدیں مولانا شبلی کی لکھی ہوئی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا نے اپنے وسیع تصنیفی تجربے، ذہانت اور جوش کو اس کی تصنیف میں بڑے التزام اور سپردگی کے ساتھ صرف کیا ہے جیسا کہ اس قطع سے ظاہر ہے۔

عجم کی مدح کی عنایاں کی داستان لکھی مجھ چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا  
گداز لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم خدا کا شکریہ یوں خاتمہ یا بخیر ہونا تھا

لیکن باوجود سرسید کے اثر کے اور مشنریوں کے غلط فہمی پر مبنی فہمی اعتراضات کے مد نظر ہونے کے، شبلی اپنے مذہبی جذبے پر پوری طرح قابو نہیں پاسکے اور عشق رسول کے زیر اثر مذہبی اور اخلاقی سرگرمی کا شکار ہو گئے چنانچہ جلد اول کے دیباچے میں نفوس انسانی کے اخلاق کی تربیت اور اصلاح و تکمیل کو عالم کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض اور سب سے زیادہ مقدس خدمت اور اس کے حصول کا سب سے زیادہ عملی طریقہ فضائل و اخلاق کے ایک پیکر مجسم کی پیش کشی کو جو خود ہمہ تن آئینہ عمل ہو قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس تکمیل کے لئے ایک ایسی مثال، جس میں جامعیت کہنی یعنی جس میں علم و عمل دونوں موجود ہوں اور کارنامہ زندگی کی مکمل تصویر، یعنی اقوال و افعال، وضع قطع، شکل و شہادت، رفتار و گفتار، مذاق طبیعت، انداز گفتگو، طرز زندگی، طریق معاشرت، کھانے پینے، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے ہونے جاتے، ہنسنے بولنے، کی ایک ایک اور محفوظ رو گئی ہے بالفاظ دیگر فرض کامل اور استقصائے واقعات کی مثال صرف پیغمبر اسلام کی ذات میں مل سکتی ہے۔ لہذا آپ کی سوانح عمری کی ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی نہیں بلکہ ایک علمی، اخلاقی، تمدنی اور ادبی ضرورت بلکہ مجموعہ ضروریات دینی و دنیوی ہے۔ علاوہ بریں شبلی کو اگلے زمانہ کے لوگوں سے اس بات میں اتفاق نہیں ہے کہ سیرت کی ضرورت صرف تاریخی اور حقائق نگار کی حیثیت سے ہے بلکہ ان کا خیال ہے کہ اقرار نبوت کے جزو مذہب ہونے کی وجہ سے، حامل وحی اور سفیر الہی کے حالات، اخلاق اور حالات کے متعلق جاننے کی ضرورت ہے۔ شبلی یہاں مذہبی عنصر کو شامل کر دیتے ہیں اور یورپی مورخین کی غلط بیانی اور مغربی تسلیم یافتہوں کی غلط فہمی کو کہ پیغمبر صرف ایک مصلح ہے اور نہ ایک اخلاق اس کا لازم نہیں، رفع کرنا چاہتے ہیں۔

اس اخلاقی نقطہ نظر کے علاوہ جو طریق سوانح نگاری پر اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتا، ایک اور بحث طوالت اور اختصار کی ہے۔ ظاہر ہے کہ سوانح مذہبی جذبے کے جو پیغمبر اسلام کے حالات اور واقعات و محضرات کے ساتھ ساتھ ان کی ساری اسلامی عبادات و عقاید وغیرہ کے واسطے کا متقاضی ہے، کوئی اصول سوانح نگاری ان متعدد دشیم جلدوں کو یکجا نہیں مہمکتا۔ یوں کہنے کو فرضی ہو گیا کہ ایک دلی کے حالات

واقعات تقریباً ایک ہزار صفحات میں لکھے گئے ہیں، لیکن وہ سیرت نہیں افسانہ ہے، عظیم سے عظیم تر حیات کا بیان بھی ایک مختصر ہے جو کچھ میں آ سکتا ہے، دراصل ایک لکھنے والے کا سوانحی جذبے کے علاوہ اخلاقی یا کوئی اور مقصد نہ ہو۔ ہم اپنی بحث کو ابتدائی دو جلدوں تک محدود رکھتے ہوئے بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس میں ضرورت سے زیادہ شرح و بسط سے کام لیا گیا ہے، اور جیسا کہ جزئیات کی بحث میں معلوم ہوگا، ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ضروری ذاتی اور سوانحی حالات سے زیادہ انحصار دیگر عنوانات کے تحت عمل میں لائی گئی ہے۔ اس کے خاطر خواہ اندازے کے لئے ہمیں مصنف کے خاکے پر نظر کرنی چاہئے، جس پر عمل کرنے کا ان کے جانشین سید سلیمان ندوی نے دعویٰ کیا ہو اور جس کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ ظاہری مطابقت کے باوجود حقیقت میں اس کی تعمیل و تکمیل نہیں کی گئی ہے، ان کے یہاں نہ وہ روشن خیالی ہے، نہ وہ احساس تناسب اور طرز عمل اور نہ وہ روح پائی جاتی ہے۔ بہر حال ان کے پروگرام سے مطابقت کے باوجود وہ جلدیں سوانح عمری کی تعریف میں نہیں آ سکتی تھیں، جس کا ذکر بعد میں سوانح نگاری کے باب میں آئے گا۔

کہا جاتا ہے کہ شبلی اپنے ذاتی بیانیوں، تفتیشوں اور مجلس گفتگو میں جس تجزیہ کا ذکر کرتے تھے وہ وہی ہے جو انھوں نے اپنے مکتوبات میں ظاہر کی ہے۔ لکھتے ہیں ”چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مباحث سیرت میں آجائیں یعنی تمام مہات مسائل پر ربوہ، قرآن مجید پر پوری نظر، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسانی کلیہ کو پڑھنا اور نام دائر المعارف، انبیاء موزوں ہوگا گو کہا ہے، اور ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا۔ نیز سیرت کی جلد اول کے مقدمہ میں ابتدائی حصوں کا عنوان ”مصبیہ نبوت“ رکھا تھا۔ سیماں ندوی نے پانچویں جلد کے دیباچے میں یہ ظاہر کیا ہے کہ اس سلسلہ کا مقصد ان دو سوالوں کا جواب تھا کہ اسلام کا پیغمبر کون تھا اور وہ کیا لایا تھا اور ابتدائی تین جلدیں پہلے سوال کا جواب تھیں اور باقی جلدیں دوسرے کا۔ حالت یہ ہے کہ پہلی دو جلدوں سے قطع نظر جن میں ولادت سے وفات تک کے حالات اور اخلاق و شبلی وغیرہ کا بیان ہے تیسری جلد میں دلائل و تجربات کا ذکر (واضح رہے کہ شبلی نے فوق فطری بیانات سے حتی الامکان گریز کیا ہے) اور اس پر فلسفیانہ بحث ہے جو سوانحی جذبے کے مقابل خیر بدست ہے۔ بعد کے حصوں میں چوتھی جلد میں عقاید پانچویں میں عبادات و عبادات قلبی، تہمتی میں اخلاق و معاملات کی تفصیلات مثلاً فلسفہ اخلاق، اخلاقی تعلیمات، فضائل و ذایل اور اسلامی عادات وغیرہ کی بحث ہے۔ یہ دیکھی ہے کہ تعمیل کی کوئی بھی دسوت اور پرداز ان چیزوں کو سوانح عمری کے دائرے میں نہیں لاسکتی۔ خدا جانے یہ سیرت کے روایتی معنی ہیں یا خیالی، لفظی معنی ہیں تو یہ ”مانی نہیں ہے۔ اس سے قدیم عربی سوانح نگاری کے فن سیر در حال کے ناقص اور سطحی ہونے کا بھی کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال موضوع کی عظمت و اہمیت کبھی تصانیف کی موجودگی اور مواد کی مقدار اور نوعیت کوئی چیز بھی اس کی متقاضی نہیں ہے کہ اسے اتنی طوالت دی جائے۔ استدعا کا مطلب طوالت نہیں ہے، بلکہ تصنیف کی نوعیت ہے۔ جامعیت کا مفہوم متعلق و غیر متعلق کا احاطہ اور تفصیل نہیں ہے سیرت اور تعلیمات دو الگ چیزیں ہیں۔ سوانح عمری کے دو لازمی اجزاء کردار اور کارنامے میں بھی، کارنامے کی اہمیت وہیں تک ہے جہاں تک وہ کردار پر روشنی ڈال سکے اور اس میں بھی انتہائی اختصار کی ضرورت ہے۔ باب اول میں پلوٹارک کا وہ قول نقل کیا جا چکا ہے جو وہ سیرت کے تذکرے کی ابتدا میں لکھتا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ سیرت کی تاریخ نہیں سوانح عمری کہہ رہا ہے۔ لہذا اسے جنگی تفصیلات سے نہیں بلکہ ذاتی حالات سے کام ہے۔ جدید سوانح نگاری تو زمانے کی اختصار کی طرف رجحان کی بنیاد ہے اور ساری طویل تصانیف اور خصوصاً ایسی طویل سوانح عمری کی جگہ مستقبل میں ہموکا طاق نمایاں ہی ہو سکتی ہے، سوانح عمری کی مقبولیت کا باعث اس کی دل کشی ہے جب طوالت کی پوریت و اکٹاہٹ کی وجہ سے نا اہل کو افسانے سے باز رہنا پڑی تو طویل سوانح عمری کب مختصر سے جید ہو سکتی ہیں؟

باوجود اس ضخامت کے قاری کو وہ تمام سوانحی معلومات و دیانت نہیں کی گئی ہیں جو اس کا طبیعت پس چاہتا ہے، یا اس کا ذہنی قابلیت ہی سہی، خواہاں ہے۔ اس سلسلے میں شبلی کے بیانات متضاد ہیں۔ اس جلد اول کے دیباچے میں جہاں وہ یہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں



کی تحریریں کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ جس کے بجائے ان کے اخلاقی نکات کا خلاصہ کافی تھا۔ چنانچہ علمی مباحث سے قطع نظر جس قسم کے سوانحی جزئیات کی ضرورت تھی ان کے سوانحی جزئیات کی ضرورت تھی ان کے انتخاب اور پیش کشی کی کمی ظاہر ہے۔

دوسرے حصہ میں نسبتاً سوانحی حالات زیادہ ہیں، گو ابتدا میں عرب کی قبل از اسلام حالت پیغمبر کی امن کی کوششوں، اسلام کی مساعی، وفود عرب، تاسیس حکومت، الہی، ملکی و مذہبی انتظامات، عقاید، عبادات، معاملات، وراثت، وصیت، نکاح، طلاق، حلال و حرام وغیرہ مسئلوں کی تفصیلی بحث کو شامل کر دیا ہے۔ مؤرخ الذکر مسائل کی بحث میں سرسید کی تقلید ظاہر ہے لیکن آخر میں حجۃ الوداع، وفات، ترک، شمایل، اخلاق و عادات، ازواج و اولاد کا بھی بیان ہے۔ شمایل، معمولات اور اخلاق کا بیان حدت احباب وغیرہ کے بیانات کی مدد سے بہت عمدہ اور دلچسپ ہے۔ لیکن ایک بات اتنی مرتبہ دہرائی گئی ہے کہ اس کا سارا سارا ذکر کرنا ہو جاتا ہے۔ حیوانات پر رحم، ظرافت وغیرہ کی مثالوں سے پیغمبر کی طبیعت پر دلچسپ روشنی پڑتی ہے۔ گری بی عایشہ سے خصوصی محبت کے اظہار کے طریقوں، ازواج رسول کی بے اعتنائیوں اور مسود ادبیوں، جس سے ایک مرتبہ پیغمبر نے دل برداشتہ ہو کر عارضی طور پر ترک تعلق کر لیا تھا اور حضرت عمر کو دخل دینا پڑا تھا اور غیر ضروری دینی تکلیفوں وغیرہ پر روشنی نہیں ڈالی۔

کتاب کی دو حصوں میں تقسیم سے بھی سوانحی مواد کی کمی اور مختلف بحثوں کے ذریعے اسے کھینچنا کر وسعت دینے کی کوشش ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ پہلے حصے میں ۶۰ سالہ حالات کا بیان ہے اور ان میں بھی ذاتی حالات کا فقدان ہے۔ دوسرے حصہ میں آخری تین سو حالات ہیں۔ درآں حالے کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں سیرت کے متعارف نگار نے ہجرت کے پہلے کے حالات کو مستند اور بعد کے حالات کو مشکوک ظاہر کیا ہے جس سے اتفاق بھی ضروری نہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب تک پیغمبر اسلام کی ایسی سوانح عمری جس میں افسانوی تجزیے اور تنقید کی کوشش کی گئی ہو نہیں لکھی گئی ہے، جس کے لئے بڑی ہی روشن خیالی، قابلیت و صلاحیت اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے، جن میں اول الذکر کے لحاظ سے شبلی ناموزوں تھے جن غیر مسلموں نے (مثلاً ایچ جی، وینز اور ڈیل کی محمد صلوات اللہ علیہ) اس قسم کی سعی کی ہے تو وہ جلد ہی کی بجائے بے دردی اور انصاف کی بجائے عداوت اور ترس کے ہیں سالانہ انھوں نے اپنے مذہبی رہنماؤں مثلاً حضرت عیسیٰ کے تقدس کو دھکا پہونچنے نہیں دیا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیگر مذہبی رہنماؤں کی سوانح عمریوں کے مدنظر شبلی کی تصنیف بدھیا بہتر ہے۔ یہ کہ قبل از وقت اور مشکوک ہے کہ مذہبی تشدد کبھی مذکورہ بالا قسم کی سیرتوں کو رد کرنے کا یا نہیں۔ موجودہ سیرتوں میں شاید شبلی کی سیرت النبی کی دو جلدوں کو اور دوں پر ترجیح حاصل ہے۔ زبان و بیان شبلی کی آخری تصنیف ہونے کی وجہ سے سوانح کامل پر ہے۔

باوجود نقد الادب سے متعلق ہونے اور خصوصاً ان کے ہاشیوں کے تشدّد اور تشدد کے مدنظر شبلی کا موازنہ انیس و دہرہ کے اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ یہ انیس کے حالات و کلام پر متعدد کتابوں کی اشاعت کا باعث ہوا۔ (باقی)

## قول فیصل

جس میں ملک کے مشہور مفکر و بلند خیال شاعر ملی اختر حمید آبادی نے ثابت کیا ہے کہ انسان لا کہ ترقی کرے کتنی ہی عقل و فراست سے کام لے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کو خدا کے سامنے سر جھکا نا ہی پڑتا ہے۔ فنی حیثیت سے اختر کا یہ بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے، نبوت میں آسانی پیش کیا جاسکتا ہے۔ ضرورت میں صحت نما زخمی بھی کامیاب ہو جاتا ہے۔ کاغذہ اپوزیٹو ویز گرد پوش رنگین۔ قیمت دو روپے۔ منیجر کار لکھنؤ

# مکتوباتِ نیاز

(پروفیسر ارشد کا کوئی)

فرانسیسی زبان میں *Belle* کسی حسین و جمیل عورت کو کہتے ہیں اور *Belles lettres* ان کے یہاں "صنعتِ ادب" میں ان تحریروں کو کہتے ہیں جو جمالیات و ادبیات بلکہ انتقادات جیسے اہم موضوعات سے متعلق ہوتے ہوئے بھی لکھے جھکے، سادہ شگفتہ، نازک اور شاعرانہ انداز بیان کے حامل ہوں۔ گویا "ادبِ لطیف" سمجھے۔ فرانسیسی ادب کی اس صنعت کے پیشِ نظر اگر اردو ادب کے سرائے کو یکجا کیا جائے تو "مکتوباتِ نیاز" کو سرفہرست رکھنا ہوگا بلکہ ہمارے یہاں اس نوع کی چیز اگر نمایاں نہیں تو کیا ضرور ہوگی، اصغر گوٹروی مرحوم کی تعریف کے مطابق ادبِ لطیف اس طرزِ انشا کا نام ہے جو وسعتِ علم، احساسِ شریعت اور حکیمانہ نزاکتِ خیال کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ اس تعریف کے پیشِ نظر ایک موجودہ نقاد کا یہ فرمانا کہ تعریفِ اس ادب کا کوئی افادی پہلو متعین نہیں کرتی اور اسی لئے ان تینوں عناصر کے امتزاج سے جس ادب کی تخلیق عمل میں آئی وہ ایک رواں اور صریح جمالیاتی تقاضوں کو پورا کرنے والا ادب تھا محض نظر ہے۔ اصغر گوٹروی مرحوم کی تعریف بذاتِ خود ادبِ لطیف کی افادیت کی مدح ہے۔ وسعتِ علم، احساسِ شریعت اور حکیمانہ نزاکتِ خیال سے ترتیب پانے والا ادب غیر افادی کیسے ہو سکتا ہے اللہ جانے مقالہ نگار نے "افادیت" کن معنوں میں استعمال کیا ہے۔ کیا ان معنوں میں کہ ایک حسین، تردتِ آزادہ، شگفتہ پھول کی الادیت اس وقت تک مستند نہیں جب تک اس پھول کی ترکاری پاک کردہ سترخان پر نہ آجائے۔ کیا روح کی شگفتگی، طبیعت کی بالیدگی اور فکر کی تازگی انسانی زندگی کے حق میں مفید نہیں؟ ادب برائے ادب اور ادب برائے حیات کا ڈھونگہ رچائے والے دجائے اس نکتہ کو کیوں نظر انداز کر جاتے ہیں کہ ادب برائے حیات بھی خالص ادب (*Pure literature*) ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ ادب ہو۔ ادب برائے ادب کے ممتاز انگریز علمبردار آسکر وائلڈ (*Oscar Wilde*) کا افسانہ "گلاب" اس کی بہترین مثال ہے۔ گل و ابل کی کہانی ہے لیکن سماج اور رسم و رواج نیز انسانی فطرت کے نامطبوع رخ کی اس میں کتنی بے اثر تیرہ تصویر ہے۔ بات کا رخ دوسری سمت نکلا جاتا ہے مجھے کہنا یہ تھا کہ خیال کی بیشتر تحریریں ادبِ لطیف کے ذیل میں آتی ہے اور ان کے نام و نسبت "علم، احساسِ شریعت، اور نزاکتِ خیال" کے ساتھ بڑی تیز بصیرت (*Sharp insight*) بھی ہے اور ان بات سے ایک زمانہ تک نیٹواری طرزِ انشا مراد لی جاتی رہی اور اس کی غلط تقلید ایک وبا کی طرح پھیلی۔ اس میں الفاظِ محکم ہوتے تھے اور لکیریں زیادہ۔ محاورے کے حلقہ میں یہ روش زیادہ مقبول ہوئی لیکن جلد ہی یہ پیر نصنع انداز ختم ہو گیا کیونکہ تاثیر محض ترقی میں آہ لینے اور لکیریں کھینچنے سے نہیں آتی۔ کچھ لوگ ادبِ لطیف صرف اس طرزِ انشا کو کہتے ہیں جو خلیقی مرحوم کا حصہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ادبستان "ادبِ لطیف کا بڑا دلکش نمونہ ہے لیکن ادبِ لطیف فقط اُسی طرزِ انشا کا نام نہیں۔ ادبِ لطیف اس طرزِ انشا کا نام ہے جو اچھے شعر کی طرح دل میں اتر جائے۔ جس میں دامنِ دل تمام لینے کی صلاحیت ہو اور جس طرح کسی اچھے شعر کے

دل میں اُترنے کے اسباب محدود و معین نہیں اسی طرح ادب لطیف کو مواد و متن کے اعتبار سے محدود و معین کرنا مناسب نہیں۔

نیاں کی ادبی شخصیت کا بظاہر سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ شاعر نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ شاعر اور مرثیہ شاعر ہیں۔

ان کا مزاج جو کبیر شاعرانہ ہے ان کی ادبیات و انتقادات میں ہر جگہ کار فرما ہے۔ اکثر حضرات شاعر پیدا نہیں ہوتے لیکن ساری عمر شعر کہتے رہتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو شاعر ہی پیدا ہوتے ہیں لیکن شعر کہی نہیں کہتے۔ نیاں کا تعلق ایسی جماعت سے ہے (ہر چند وہ کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے)۔ ان کی انشا پر دازی ہی ان کی شاعری ہے۔ وہ شاعری نہیں جو نثر میں کی جاتی ہے بلکہ وہ شاعری جو انسان کی جمالیاتی حسیں اور اس کے ذوق لطیف کا بے اختیار مظاہرہ ہوتی ہے۔ نیاں کی انشا پر دازی میں اکثر اسی لطیف و کیف کا احساس ہوتا ہے جو ایک لطیف سے لطیف شعر کو سن کر ہو سکتا ہے۔ اسے نہ سچولے کے لطافت عرفیہ ”کیسے کہا“ سے پیدا ہوتی ہے بلکہ ”کیا کہا“ کو بھی اس میں برابر کا دخل ہے، خصوصاً ادب لطیف میں جہاں فکر کی تازگی کو اتنا ہی دخل ہے جتنا فن کی شگفتگی کو۔ سہاگن کی پہچان مانگ کا سینہ دور ہے لیکن یہ سینہ دور اُنچے، بکھرے، مدکے سوکے بالوں میں سہاگن بیوہ کا تصور پیدا کرتا ہے۔ ممکن ہے کوئی بہت سخت گیر نقاد یہ کہہ کر چو کہ ان کی تحریریں عموماً شعر اور ان کے افسانوں میں چونکہ ایک مخصوص ماحول ہوتا ہے اور ان کا پس منظر زیادہ تر ماہی سے تعلق رکھتا ہے اور وہاں ایک خاص طبقہ کے افراد کو دُعا ہوتے ہیں اس لئے وہاں حسن و جمالیات کی فضا ان کی انشا پر دازی کو شاعرانہ اسلوب دے دیتی ہے۔ ان دونوں باتوں کی پہلیت مسلم لیکن اس کے باوجود ان کے یہ تو پوچھا ہی جاسکتا ہے کہ ”مکتوبات نیاں“ کے متعلق کیا ارشاد ہے جہاں زندگی اور ادب اپنی تمام صدراتگی و تنوع کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ جہاں مذہبی، سیاسی، علمی، معاشی غرض کہ ہر قسم کی بحث موجود ہے لیکن بیان میں کہیں گہرائی نہیں۔ بحث تو بحث مگر اس میں بھی نیاں کا لب و لہجہ اپنی خصوصیت دکھائی برقرار رکھتا ہے۔ شگفتگی و تازگی انشا پر دازی و پیر کیفی نیاں کی تحریروں میں عموماً اور ان کے مکاتیب میں خصوصاً جاری و ساری ہے۔ ان کی انشا پر دازی کا جو ہر انتقادات، ملاحظات اور مذاکرات میں بھی جلوہ پاش ہے لیکن مکتوبات کا تو عالم ہی کچھ اور ہے ۶ صد جلوہ رو برو ہے جو مژگان اُٹھائے

نیاں کی تحریر کا ایک بڑا گریہ ہے کہ وہ الفاظ کے صحیح محل استعمال پر قادر ہیں اس سے ہوتا ہے کہ کم سے کم الفاظ زیادہ سے زیادہ مفہوم ادا کرتے ہیں۔ اپنے جملہ کی تشریح اور اپنے خیال کی وضاحت کے لئے وہ کوئی دوسرا تیسرا جملہ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور وہی جملہ بھر پور مکمل اور اُٹل ہوتا ہے۔ انسان کی نفسیات ایک شین ہے اور الفاظ اس کے مجر زے۔ ہر پُر زہ کی صحیح جگہ اور اس کے طریق استعمال سے واقعہ ہوئے بغیر اس مشین سے صاف ستھری تخلیقات کی توقع نہیں ہو سکتی۔ نیاں لفظ و معنی کے رشتہ کو جو جسم و جان کا رشتہ ہے اچھی طرح جانتے ہیں۔ خود بقول ان کے زبان کی ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ جذبات کو ان کے حقیقی رنگ میں ظاہر کرنے کی اہلیت اس میں پیدا ہو جائے۔ چنانچہ نیاں کے یہاں الفاظ بین طور پر جذبات کے نقش کا صحیح رنگ نظر آتے ہیں۔ تحریر میں زور اور اثر اسی طرح آتا ہے کہ الفاظ جاندار محسوس ہونے لگیں۔ نیاں کی طبیعت میں فطری جوش ہے اور یہی جوش و کیف ان کی تحریر میں نمایاں ہے۔

مکتوبات نیاں کی طنز آنے سے پہلے ”مذاکرات نیاں“ کی ایک مثال دیکھئے۔ ڈائری لکھی جا رہی ہے۔ مختلف شاعروں سے ملنے اور ان کا کلام ان کی زبانی سننے کا حال بیان ہو رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ نقد و سیر کا حق بھی ادا کر رہے ہیں۔ کسی صاحب کا ذکر آتا ہے اور یوں آتا ہے:-

..... خود ان کی زبانی ان کا کلام سننے کا فریضہ حاصل نہیں ہوا اور نہ میں اس کے لئے بیتاب تھا۔۔۔۔۔

شاعری میں شوخی اور طنز کے مضامین عموماً باندھے جاتے ہیں۔ دیکھئے اس جملہ میں یہ دونوں عناصر کس حسیں سے یکجا ہو گئے ہیں۔ جملہ کا پہلا اور دوسرا حصہ بظاہر کتنا متضاد ہے لیکن وحدت مفہوم ظاہر ہے اور بالآخر یہ جملہ الفاظ کے اندر اندر نیاں نے کس قدر مفہوم کو

Vol 1 کی ایک مثال دے بغیر نہ رہوں گی۔ کسی کی موت کے بعد ایک شخص نے واقعہ

He was a sturdy patriot,  
a talented writer, a loyal friend,  
a good father and a husband -  
provided he is really dead

مذکورہ بالا اقتباس کا آخری حصہ جس طرح پوری بات کو موڑ کر رکھ دیتا ہے اس کی تفصیل لاحقہ ہے۔ **Paradox** **Epigram** نیا کی خاص چیز ہے۔ لیکن یہ چیز ان کے یہاں آسکر وائلڈ، برنارڈ شا یا چسٹرٹن وغیرہ کی تقلید سے نہیں آئی۔ یہ صنعتیں **original thinkers** کی طبیعتوں کا اشتراک ہوتی ہیں تقلید سے اور سب کچھ سہی انفرادیت کو پیا ہونے سے رہی۔

مکتوب نگاری کی اہمیت کہا جاتا ہے اور صحیح کہا جاتا ہے کہ شعروں کے انتخاب کی طرح اس سے بھی دل کا معاملہ کھلتا ہے اور مکتوب نگار کی رسوائی ہوتی ہے لیکن یہ کہنا کہ مکتوب نگاری صرف معاملاتِ دل کا اظہار ہے، غلط ہے۔ معاملاتِ دل کا اظہار محض دو ایک افراد کی چیز ہوتے ہوئے بھی عام دلچسپی کا سبب بنتا ہے جیسا کسی شاعر کے اس قطعہ سے ظاہر ہے۔

وقت و دماغ بوسے محم صاحب نے دئے اُچھلیں کودیں ہزار ہا ناز کئے  
بلوے جو نائے اس طرح سر راہ عاشق کے لئے تھے نصف نصف ہم سب کیلئے

اس لئے ظاہر ہے کہ مکتوب اگر محض اپنے معاملاتِ دل کا اظہار ہو جب بھی اس کی دلچسپی ہمہ گیر ہے لیکن مکتوب نگاری کو محض معاملاتِ دل کا اظہار سمجھنا غلط ہے، نسو شا مکتوباتِ نیاز کے سلسلہ میں جہاں شعروادب، منطق و فلسفہ، حیات و کائنات، خدا و رسول، قرآن و حدیث، مختلف و متضاد موضوعات پر مکتوب نگار کے خیالات کا اظہار ہے، لیکن زبان و بیان، لہجہ و لہجہ سب کچھ بے پناہ صدیقی و نیرنگی کا حامل ہے۔ مجموعی طور پر مکتوب نگار سب سے سچے اور بہت ہی دلچسپ دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ناممکن نہیں کہ تنقید و تبصرہ میں کسی نیا کی مصلحت اندیشیوں سے کام لینا پڑا ہو اور یہاں وہاں انھوں نے خود کو کبھی مارے باندھے رکھا ہو اور کہیں گمٹ پڑے گئے ہوں لیکن مکتوب نگار کا اظہار کی ایسی کوئی مصیبت دامن گیر نہ ہو گئی، محض تا وہی ہے جو دل میں ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر شادانی پرائیویٹ خطوط میں مسلمانوں کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں اور قلم کی زبان صحیح معنی میں دل کی ترجمان بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر شادانی نے شہنشاہی کا حوالہ دیا ہے کہ تعلیم نسواں، پردہ، موسیقی اور بعض دیگر معاشرتی مسائل کے متعلق انھوں نے عطیہ بیگم اور زہرا بیگم کے نام اپنے پرائیویٹ خطوط میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ ان کی کسی دوسری تصنیف میں نہیں اور اس کا سبب پہلے لایف کی مجبوریوں اور مصلحتیں ہیں جو مکتوب نگار کی حقیقت سے ان پر عاید نہیں ہوتیں۔

یوں تو ہر خطیب اور ادیب کا **audience** ہوتا ہے۔ ناول نگار، افسانہ نگار، شاعر، سبھوں کے پیش نظر کچھ لوگ ہوتے ہیں جو ان کی تحریر میں ان کے افراد و کردار سے ملے ہیں، ان کے احساسات و جذبات میں شریک ہوتے ہیں لیکن جن لوگوں کا **audience** سے بہت ہی قریب کا (**immediate**) رشتہ ہوتا ہے وہ مقرر اور مکتوب نگار کا ہے۔ ان دونوں میں کڑی آزمائش مکتوب نگار کی ہے۔ ایک مقرر اپنے سامعین پر مسلط ہونے کے لئے بہت ہی باخبر (**conscious**) رہتا ہے۔

وہ ایک جملہ ہے گا۔ پھر اپنے سامعین کو کوئے گا۔ وہ ان کو بڑی چالاکی سے آزماتا جاتا ہے۔ ان سے ان کا یقین و اعتراف چھیننے کو اپنے پاس بہت سارے حربے ہوتے ہیں اور مواقع بھی اس کے برخلاف مکتوب نگار کے پیش نظر اس کا صرف ایک *audience* ہوتا ہے اور یہی وحدت اس کی سب سے بڑی آزمائش ہے۔ سینکڑوں انفاس کے درمیان اُسے خطیب کی طرح خود کو کوئے دئے رکھنے کی ضرورت نہیں۔ مکتوب نگار اپنے خیالات کو منوانے پر آئے گا تو اسے استدلال (*argument*) سے کام لینا ہوگا ستانی (*Reason*) سے نہیں۔ قلم اور دوات سے کھن و گئے یا اشارہ و داد ممکن نہیں۔ اگر وہ کسی چیز کا اعتراف کرتا ہے تو اسے بالکل یا کم از کم قریب ترین صداقت سے کام لینا ہوتا ہے کیونکہ اس کا ہر لفظ اس کے مکتوب الیہ کی نگاہ انتقاد سے گزرے گا غصہ وہ اس کا دوست ہو یا دشمن۔ اس لئے مکاتیب میں صداقت کا زیادہ سے زیادہ امکان ہے اور اسی لئے لکھنے والے کی شخصیت کا صحیح مطالعہ جس قدر مکاتیب سے ممکن ہے اور کسی طرح ممکن نہیں۔ مکتوب نگار کے ساتھ ہی ساتھ آپ کے ذہن میں یہ بات آئی ہوگی کہ ڈائری لکھنے والے کی بابت کیا خیال ہے جس کی شخصیت مکتوب نگار سے زیادہ معتبر ہے۔ اس باب میں میری رائے شاید قابل قبول ہو۔ ایک مقرر سینکڑوں ہزاروں انفاس کے درمیان رہتا ہے۔ مکتوب نگار کے پیش نظر صرف ایک شخص ہوتا ہے لیکن ڈائری لکھنے والا تو بالکل ہی آزاد ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جو کسی آئینہ خانہ میں داخل ہو اور اپنے ہی سراپا کے سامنے طرح طرح سے چہنہ لطف ہے کہ وہ صداقت سے اپنا وہ رشتہ بھی کاٹ دیتا ہے جو اور کچھ نہ سہی تو کسی غلط فہمی ہی کا سبب بن سکے۔ چونکہ وہ اپنا (*audience*) آپ ہوتا ہے اس لئے وہ اس خلوت میں خود فریبی کے امکانات زیادہ سے زیادہ پاتا ہے تنہائی میں اسے چھپنے اور چھپانے کے زیادہ مواقع ہیں (عجیب بات ہے)۔ تکلف اور قصص کی اجارت ہے۔ سرمہ و غناہ کا استعمال اور آرائش خم کا کل تنہائی میں جس سکون و اطمینان کے ساتھ ممکن ہے، کسی کے سامنے ممکن نہیں۔ آپ کو کیا علم کہ جو ادا و تمہیم آپ کے پیش نظر ہے تنہائی میں کس مشق و ریاض کے بعد ان میں یہ ہلاکت آفرینی آئی ہے۔ آرائش و زیبائش کے وقت کوئی آجائے یا کسی کا خیال ہی آجائے تو وہ اطمینان کہاں؟ اور پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ ڈائری کا کوئی اپنا وجود بھی ہے؟ جہاں تک یادداشت کا تعلق ہے اس کی عام افادیت معلوم؟ اگر کسی خاص شخص یا فن پارے کی بابت اظہار رائے ہے تو وہ مکتوب میں بھی ممکن ہے جہاں تک اپنی خامیوں اور کمزوریوں، بے اعتدالیوں اور خطاؤں کے اعتراف کا تعلق ہے اول تو ہندوستان و پاکستان کا کوئی فرد اس کے اظہار و اعتراف کا حق ادا کرنے سے رہا۔ جہاں کسی کا منہ چم لینے کا اظہار ممکن نہیں، کسی کو دل دینے کے اعتراف کا یا راہیں وہاں ڈائری لکھنے اس کی اہمیت کیا؟ اور پھر ڈائری میں کوئی شخص یہ سب باتیں چھوڑ کیوں جائے۔ کون چاہے گا کہ اس کی موت کے بعد لوگ اسے برے ناموں سے یاد کریں۔ اس لئے ڈائری محض ڈھونگ ہے۔ دلداری و جان بازی کے جو واقعات سامنے آئے ہیں وہ مکاتیب ہی کے ذریعہ آئے ہیں اس لئے مکاتیب ہی کو سچے دستاویز جمنے کی حیثیت حاصل ہے، غالب کے خطوط کا راز اس میں نہیں ہے کہ وہ غالب کے ہیں اور ان کی حیثیت تبرکات کی ہے بلکہ وہ اس لئے اہم ہیں کہ غالب نے اپنی زندگی کی ان میں نقاب کشائی کی ہے اور ایسی سادگی و بے تکلفی سے جو ان کی شخصیت کا جزو تھی وہ اس لئے اہم ہیں کہ ان کے بغیر غالب کی شخصیت کا مکمل نقش نہیں بنتا وہ اس لئے اہم ہیں کہ ان میں ان کی خوبیاں، ان کی خامیاں، ان کا جھوٹ، ان کا سچ، ان کی توانائیاں، ان کی کمزوریاں، ان کی پسند، ان کی ناپسندیدگی، ان کی ہوشیاری، ان کی بے خودی، ان کی پارسائی، ان کی رندی، ان کا مزاج، ان کا اخلاق، ان کی طبیعت، ان کی فطرت، ان کی سپردگی، ان کا کس بل، ان کی پوشاک، ان کی غذا، ان کی فطرت، ان کی نفرت، غرض کہ ان کی زندگی کا ہر پہلو بے نقاب ہے۔ وہ اس لئے اہم ہیں کہ ان میں غالب کے عہد کی سماجی اور سیاسی تاریخ ملتی ہے اور سب بڑھکر وہ اس لئے اہم ہیں کہ انھوں نے اردو نثر کی رو اور رفتار کو بدلنے میں حصہ لیا ہے۔

مکاتیب کے بارہ میں ایک بات عام طور پر کہی جاتی ہے اور بعض لوگ تو اسے معیار قرار دیتے ہیں کہ مکتوب نگار خط لکھتے وقت

سوچے کہ آج یا کل اس کا یہ خط شایع ہوگا یعنی یہ کہ خطوط اشاعت کی غرض سے نہ لکھے جائیں۔ مکتوبات نیاز کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ خاص طور پر اشاعت ہی کی غرض سے لکھے گئے ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس غرض و غایت کے باوجود ان کے تیب میں وہی بے تکلفی و سادگی اور سہولت و سہجائی کا عالم ہے یا نہیں جو ہونا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ جو خط اشاعت غرض سے لکھے جائیں وہ اشاعت کے قابل نہیں ہوتے یعنی یہ کہ کتب کی حیثیت سے ان کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ مکتوب نگار میں زبان و بیان کے نکتے پیدا کرنے کے لیے گامیکن نیاز کے ساتھ یہ صورت حال نہیں۔ ان کی تحریر میں بے ساختگی اور بے غمی ابھی موجود ہے۔ وہ کہہ گزرنے کے قابل ہیں اور ان کی تحریریں کو شش و آہستہ بہت دور ہوتی ہیں خط لکھنا اور اس طرح ناکہ یہ خط خط کی حیثیت سے شایع ہوگا اور بھی مشکل کام ہے۔

نیاز کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے علم و ادب اور تنقید و تحقیق کا حق ادا کرتے ہوئے بھی اپنے خطوط کی زبان کو بوجھل نہیں کیا۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

”پھر اوجود اس کے کہ قدیم رنگ مجھے پسند نہیں کل شعر اسی میں ملتے ہیں اور جدید شاعری میں باوصف ندرتوں کے بہت کم ایسے شعر نظر آتے ہیں جن کو ہر لحاظ سے مکمل کہا جائے۔“

میں نے یہ اقتباس اس لئے دیا کہ دیکھئے کس سادگی سے نیاز نے بڑی بات بیان کر دی۔ اب ایک اقتباس خاص ان کے رنگ کا ہے۔

”میرا شرب تغزل کے باب میں ذرا قدامت پسند واقع ہوا ہے اور تصوف و فلسفہ طرازی دونوں میری سمجھ سے باہر ہے اس لئے فارسی میں سعدی اب بھی میرا محبوب ہے اور اردو میں میر و درد پر جان دیتا ہوں۔“

بغا ہر سپیدی سادی صاف بات نظر آتی ہے لیکن نہیں غور کیجئے کہ نیاز نے ان سطروں میں کتنے بڑے مردہ خیال کی گردن ماری۔ عام طور پر فارسی میں سعدی اور اردو میں درد و تصوف ہی کے لئے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ نیاز فلسفہ و تصوف دونوں سے بے اور جان دیتے ہیں تو میر و سعدی پر۔ دیکھا آپ نے کتنا زبردست انتقاد ہی نہیں ہے۔ درد، سعدی، فلسفہ، تصوف تمام ان کو کس حسن و اختصار سے سمیٹ لیا ہے۔ نیاز کے گوشہ اظہار میں بلا کی انفرادیت ہے۔ تغزل و تصوف، قدامت و جدت، شعر و نثر۔ نیاز نے ہر موضوع پر لکھا ہے اور ان کے خطوط کی بعض تحریریں اس ضمن میں اس قدر ہیں کہ بڑے بڑے

مالوں پر بھاری ہیں۔ دوسرے نفاذ خصوصاً ڈاکٹر عبادت بریلوی جس بات کو دو صفحات میں بیان کریں گے نیاز اسے دس پانچ لروں میں کہیں گے۔ ان کے مکاتیب میں بڑے کام کے ادبی و انتقادی نکات مل جاتے ہیں اور اس کثرت سے کہ ان کی انتقادی بصیرت کے مقالوں کے مطالعہ کے بغیر بھی اس سے واضح ہو جاتی ہے۔ یہی حال ان کے مذہبی معتقدات کا ہے۔ ان کی مذہبی اسپرٹ کے مکاتیب میں اسی تندہ و تیزی کے ساتھ موجود ہے جس کے لئے وہ بدنام یا نیکنام ہیں۔ ہر چند کہ اقبال کے مکاتیب کا بیشتر مجموعہ علمی ہے اور مکاتیب نیاز بھی علمی اور ادبی موضوعات سے خالی نہیں لیکن دونوں کا فرق ظاہر ہے۔ یہ دونوں کی شخصیت فرق ہے۔ اقبال کے بعض خطوط ضرورت کے تحت لکھے گئے اور زیادہ تر جواباً لکھے گئے۔ بعض خطوط فرین ناگوار کی ادائیگی کے ذیل میں تھے اور بعض مکتوبات محض اخلاقی تقاضے کی تکمیل کے خیال سے لکھے گئے لیکن نیاز کے مکاتیب محض خطوط کا جواب نہیں بلکہ خطوط بھی ہیں۔ وہ غالب کی طرح ”ستم زدہ ذوق فرسا“ ہوں یا نہ ہوں انہوں نے خط جی سے لکھا ہے، دلی سے لکھا ہے، فرض اور اخلاق تکمیل کے خیال سے نہیں۔ نیاز کی شخصیت میں بے اصولیاں نہ سہی یہ ضرور ہے کہ فرض و اخلاق کی تکمیل کا خیال ان کے یہاں بڑی اہمیت میں رکھتا ہے۔ میں اور بہت سارے لوگ تجربات سے جانتے ہیں اور ان کی شخصیت کے اس رخ پر روشنی ڈالنا ان کے شخصیت نگار کا کام ہے میرا نہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان کے مکاتیب کی نوعیت سرتاسر وہی ہے جو شاعر کے کلام کی نوعیت



اس قدر سے طویل اقتباس سے ظاہر یہ کرنا تھا کہ نیاز کے آگے مناسبت کس کا نام ہے۔ اس کے مطاببات کیا ہیں اور وہ کون سے جلوہ ہائے زیر نقاب ہیں جو نیاز کو بے نقاب کرتے ہیں۔ نیاز کے نزدیک عورت بجائے خود معبود کی حیثیت رکھتی ہے۔ عورت حسن کا دوسرا نام ہے اور حسن مناسبت کے سوا کچھ نہیں۔ اب یہی محبت تو بقول نیاز عورت محبت پر مجبور ہے اور مرد کے لئے محبت مسرت کا درجہ رکھتی ہے۔ مجبوری ختم نہیں ہوتی اور مسرت پائیدار نہیں ہوتی۔ کسی قدر ترمیم کے ساتھ میں نے نیاز کے یہ الفاظ یہاں لکھے ہیں۔ ان میں نیاز اور عورت کا رشتہ بالکل واضح ہے اور اس رشتہ کی جلوہ پاشیاں ان کے مکتوبات میں پوری طرح موجود ہیں۔ اب ان کے دوسرے معتقدات کو دیکھئے :-

”کل ایک صاحب تشریف لائے کسی بزرگ کی تعریف کرنے لگے کہ دنیا سے کس قدر بے تعلقانہ زندگی بسر کر رہے ہیں اور طاعت دن ایک گوشہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کیا کرتے ہیں، میں نے کہا اگر یہ اچھی بات ہے تو سب کو کرنا چاہئے اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ساری دنیا میں اُن کو بولنے لگے۔ سپر یہ ظلم تو چنگیز دہاکو نے بھی نہیں کیا تھا۔“

نیاز کی تحریر اس وقت اور دو آتشہ ہو جاتی ہے جب وہ تنملا کر کچھ اُکھٹے ہیں۔ موسم گرما کا ذکر ہے :-  
 ”..... آپ کو خند ہے کہ ایسی موسم میں میرا حال ہوجیئیں گے جب مجھے اپنی ذات سے بسی نفرت ہو جاتی ہے۔  
 .... سوچتا ہوں کہ لندا اگر بغیر سورج کے کرۂ زمین کو پیدا نہیں کر سکتا تھا تو کیا یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خط استوا سے دور کسی مقام پر سمجھے پیدا کرتا۔“

ایک خاص عالم کی تحریر ملاحظہ ہو۔ خط میں القاب ”آرام جاں“ کا ہے جو سرتاسر طنز ہے۔ دس پانچ اپنے انداز کے مجھے لکھنے کے بعد لکھتے ہیں :-

”اچھا تو سنو، میں نے بھی ایک فیصلہ کیا ہے اور وہ یہ کہ تمہیں کسی نہ کسی طرح یہ یقین دلا ہی دوں کہ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ پورا ہو گیا۔ کل شام کو ایسی سخت آندھی آئی کہ میرے مکان کی چھتیں گر پڑیں۔ دیوار و در سرنگوں ہو گئے اس کے بعد دفعتاً ایک گوشہ سے شعلہ بلند ہوا اور میری ایک ایک ہڈی کو خاکستر کر گیا۔ میں گھر سے باہر نکل کر سبھاگا تو لوگوں نے پتھر مارنا شروع کئے۔ میں گھر کر ایک کنویں میں کود پڑا اور وہیں ختم ہو گیا۔ تمہیں خوش کرنے کے لئے اس سے زیادہ میرے امکان ہیں نہ تھا۔“

یہ تحریر نیاز ہی کی ہو سکتی تھی۔ اس سے زیادہ اس کی تعریف ممکن نہیں۔ ان سطور سے نیاز کے نظریہ کی ایک جھلک ملتی ہے :-  
 ”کیا عرض کروں کتنی مسرت بھٹی ہے یہ سُن کر کہ اقبال میاں دلایت سے کامیاب واپس آئے۔ .... ملازمت چاہے کیسی ہی جو بہر حال چاکری ہے اور انسانی خود داری کے منافی۔ اس لئے اس کا تو کوئی سوال ہی نہیں رہی پریکٹس، سو اس کے لئے ایک بار پوری طرح غور کر کے جگہ مقرر کر لینا چاہئے اور پھر یہ عہدہ کو وہاں سے قدم نہیں اٹھانا۔“

شعر گوئی اور شعر فہمی کے متعلق بھی نیاز کے خیالات بس انھیں کے خیالات ہیں :-

”میں سمجھتا ہوں کہ شعر فہمی کا سلیقہ ترک شعر گوئی کے لہد ہی پیدا ہوتا ہے۔ ایک شاعر جب تک وہ شاعر ہے بندہ غریب ہے اور اس کے سامنے جادہ و منزل کا سوال ہی نہیں۔ دوسرے دیکھتے ہیں اور نہتے ہیں لیکن جب وہ یہ مشغلہ ترک کرنے کے بعد خود تماشائی بن جاتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ جہ وہ شاعری سمجھتا تھا اس میں کتنی غیر شاعرانہ باتیں ہیں۔“

یہ خیال بظاہر عجیب و غریب ہے لیکن کم از کم نیاز کے سلسلہ میں تو شذیہ بھی معلوم ہوا تھا۔  
خالص شاعرانہ انداز کی ایک دلپذیر تصویر دیکھئے۔ ایک محترمہ سے خطاب ہے:

”آپ کو شاید یاد نہ ہوگا لیکن میں وہ ساعت کبھی نہیں بھول سکتا جب آپ میرے سامنے نگاہ جھکائے ایک بھول  
سے گھیل رہی تھیں اور میں خوش تھا کہ — آج میں نے اپنا دل — خون کیا ہوا دیکھا تم کیا ہوا پاپا!“

یہ بات غور کرنے کی ہے کہ نیاز کے مکاتیب میں اشعار کا حوالہ بے ساختہ ہے یا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس بے ساختگی سے نیاز کوئی  
مصرع دہراتے ہیں، کسی شعر کا حوالہ دیتے ہیں یا نثر ہی میں کسی شعر سے کام لیتے ہیں وہ بے ساختگی کسی کے یہاں نہیں ملتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ  
وہ اقتباس بالکل اسی موقع کی چیز ہے۔ یوں سمجھئے کہ نیاز کے یہاں حوالوں کا استعمال بھی ”خلاقانہ“ ہے۔ ابوالکلام آزاد کے مکاتیب میں  
اردو، فارسی، عربی کے اشعار کا حوالہ کثرت سے رہتا ہے لیکن آزاد کے یہاں یہ کوشش نمایاں ہو جاتی ہے کہ ان کو آگے چل کر فلاں شعر  
پیش کرنا ہے اور اسی انداز سے وہ اپنے مفہوم اور اپنی تحریر کو موٹے چلے جاتے ہیں۔ دوسری خاصی ابوالکلام آزاد کے حوالوں میں یہ ہے  
کہ وہ جس شعر کو پیش کرتے ہیں اُس کا مطلب پہلے نثر میں بیان کر دیتے ہیں اور پھر وہ شعر لکھ دیتے ہیں۔ یہ چیز بڑی گراں گزرتی ہے کیونکہ اسکی  
ضرورت باقی نہیں رہتی۔ موقع کے لحاظ سے مناسب شعر کا حوالہ دے دینا کافی ہے۔ نیاز کے یہاں یہی حسن ہے۔ وہ کبھی تو پورا شعر کبھی  
صرف ایک مصرع اور کبھی مصرع کا صرف ٹکڑا استعمال کرتے ہیں یعنی اپنے مفہوم کا احاطہ کرنے والے حصہ سے زیادہ وہ قبول نہیں کرتے بلکہ  
اس کے ابوالکلام آزاد شعر کی تشریح فرمائیں گے پھر شعر بھی نقل کر دیں گے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ کہیں کہیں آزاد کی اسٹائل عالمانہ ہو جاتی  
ہے اور نیاز کے یہاں صرف ادیبانہ۔ یا دو دشگفتہ طرازی و نغز گوئی کے ابوالکلام آزاد کے مکاتیب سے ایک عالم ہی کی شخصیت سامنے  
آتی ہے اور نیاز کے خطوط میں ایک ادیب کا پرتو ہے۔

غالب کے خطوط کا ایک کمال یہ ہے کہ انھوں نے القاب و آداب کے مروجہ طریقوں کو ختم اور کم کر دیا۔ نیاز کے یہاں آپ دیکھیں گے  
کہ القاب یا تو سر سے ہوتے ہی نہیں اور اگر ہوتے ہیں تو ایسے ”چوکے“ کہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ القاب و آداب سے مکتوب کی فضائیں  
ایک شکست کی شان آ جاتی ہے اور جہاں شکست کا موقع نہ ہو وہاں القاب و آداب کی کیا ضرورت۔ نیاز کے خط عموماً یوں شروع ہوتے ہیں:

(۱) ”آپ نے دیکھی اپنے دوست کی طاقت! میں نہ کہتا تھا کہ چھوٹ کے آدمی سے کبھی عقل کی توقع نہ رکھئے۔“

(۲) ”سنئے صاحب! جیتے جی موت کی باتیں مجھے پسند نہیں، مرنے پر حق سہی! جب تک آپ جی رہے ہیں

اس ”واویلا“ سے فائدہ بھی کیا؟“

(۳) ”ناشوار اللہ کیا کہنا!“

دنیا ادھر کی ادھر ہو گئی اور آپ ابھی تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ سورج ڈھلا یا نہیں!“

(۴) ”تم سب باتیں کرو لیکن خدا کے لئے میرے سامنے سیاست نہ بگھانا کرو۔“

وہ کبھی ”القاب و آداب“ لکھتے بھی ہیں تو محترم، صدیقی، کرمی، سے آگے نہیں بڑھتے اور جہاں آپ بندہ فواد، قبلہ،  
قبلہ مستندانی، قبلہ روحانیوں جیسے القاب ان کے مکاتیب میں دیکھیں تو سمجھ لیجئے کہ معاملہ نازک ہے اور اس القاب میں لکھنے  
ہی نا آزمودہ فخریوں کی کاٹ ہے۔ دو تین مثالیں یہ ہیں:-

(۱) ”مولویت و ادبیت معقول! ان دونوں کا اجتماع آج تک کبھی ہوا ہے کہ اب ہوگا۔“

(۲) ”مذہباً وہ بدوش تو مل سکتا ہے لیکن زاہر خرابات نشین کا میرا آنا دشوار ہے۔“

(۳) ”خدا پر بھروسہ کر کے ہاتھ پاؤں ڈال دینا خود خدا کو بھی پسند نہیں۔“

اس قسم کے بہتر سے چلوں پر نیاز کی مخصوص چھاپ ہے اور وہ اپنے جلوں سے پہچانے جاسکتے ہیں اور یہ اتنی بڑی بات ہے جس کی

داد بھی بے داد ہے۔ نیاز کے مکاتیب میں شوقی و رنگینی بھی ہے اور وطنی و وطن بھی، بزرگی و ہوشمندی بھی ہے اور سچ و دھوکا بھی لیکن مختلف اور متنوع کیفیات کے اظہار کے باوجود ان کے لب و لہجہ میں جو سنجیدہ دلکشی یا دلکش سنجیدگی ہے وہی نیاز کی انفرادیت ہے۔

نیاز کا رد واری ہونے کی حد تک علمی آدمی ہیں اور شاعر و ادیب ہونے کے باوجود عمل کی دنیا میں انکی حیثیت *Mechanic* کی ہے "سودوزیاں" کو ان کی زندگی میں اہمیت حاصل ہے۔ ان میں خود داری ان کی حد تک موجود ہے۔ وہ رندی و مہرستی کی حالت تو کرتے ہیں اور "وقارِ مصیبت" کا احترام بھی۔ آسکر وائلڈ کے اس نسخہ پر بھی ان کا ایمان ہے کہ "جانی کے گناہ کرنے لگو جانی خود بخود لوٹ آئے گی"۔ وہ کسی کو مشورہ بھی دیتے ہیں کہ ناز و روزہ کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی کوئی گناہ بھی کر لیجئے کیونکہ زندگی کا احساس گناہ کے بعد بڑھ جاتا ہے۔ ان سب کے باوجود نیاز کی زندگی میں بلائی مصیبت جیسی ہے اور اس باب میں بڑے حزم و اعتدال سے کام لیتے ہیں۔ نظر آتے ہیں اور دامن بھی رکھ کر جانے ہی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ نیاز کا مذاق خاصہ ہندی مذاق ہے۔ عشق و محبت اور شہ و شاعر کے سلسلہ میں ان کی تحریریں میرے اس خیال کی تائید کرتی ہیں اور اس سلسلہ میں نیاز کے مکاتیب سب سے زیادہ معاون ہو سکتے ہیں۔

ایک انگریز مصنف کارل سپیکر نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ انسانوں نے کیا کارنامے انجام دئے ہیں اس کا ریکارڈ تو بہر حال لگتا ہے لیکن ان واقعات کے روغا کرنے میں دلی جذبات اور دماغی کیفیات کا کتنا حصہ ہے اس کا علم خطوط کے ذریعہ ہو سکتا ہے جبکہ اور جہتوں کے پیچیدہ و پوشیدہ رازوں کو خطوط ہی میں کھلنے کا موقع ملتا ہے اور تو تعریف کی ایک تعریف تو ڈاکٹر جاسن کا یہ جملہ ہے انسان کے خطوط میں اس کی روح عیاں ہو جاتی ہے۔ شبلی کے خطوط منظر عام پر نہ آئے ہوتے تو ہمیں کیسے معلوم ہو سکتا کہ ان کے فارسی کلام کا بے پناہ رس اور غضب کا بانگین کہاں سے آیا۔ اس گلدان میں کس گھستاں کے پھول ہیں۔ اس شفق میں کس کی دنگ کا سینہ دور ہے۔ الفاظ میں یہ چمک دمک کس کے تبسم کا پرتو ہے اور یہ کس کی بے اعتدیاں ہیں جو مولانا کے لئے میرے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتی ہیں لیکن رونا تو اس کا ہے کہ ہمارے یہاں اس لطیف ترین باکیزہ جذبے کو خطرے کی گھنٹی اور اس کے اظہار کو قرب قیامت کے آثار سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے کون کہے کہ "عشق توفیق ہے گناہ نہیں" روحانی خیال کو گناہ ٹھہرانے والے جس گناہ کا ازبک کرتے کرتے ہیں ان کی بحثائش کس طرح ہو گی یہ وہ جانیں۔ ہم آدمی کو فرشتہ بنانے کے درپے تو ہوتے ہیں لیکن اتنا نہیں جانتے کہ انسان فرشتہ بن جانے کے بعد انسان نہیں رہتا۔ بقول حالی :-

فرشتے سے مشکل ہے انسان بننا

مگر اس میں ہوتی ہے محنت زیادہ

حالی ہی کو نیچے۔ حالی کے بارہ ہیں ایک عام خیال یہ ہے کہ مولانا نرسے خشک اور سنجیدہ مولوی تھے۔ ان کے مکاتیب کا مطالعہ اس عام خیال کی حمایت کرنے سے قاصر ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب حالی کو اور نگ آبادلاتے ہیں۔ حالی جانا چاہتے ہیں لیکن ضعف ماننے ہے۔ لکھتے ہیں :-

.... میرا بھی بے اختتامی چاہتا ہے کہ چند روز وہاں آکر رہوں مگر پیرانہ سالی میں اس قدر دور و دراز کی

مسافت پر کسی دوست کے پاس جا کر رہنا تو اس کو بیار واری کی تکلیف دینی ہے یا اس پر تجہیز و تکفین کا بار

ڈالنا ہے۔۔۔۔۔

میرا مولوی عبدالحق ہی دہی جانے کا پروگرام بناتے ہیں اور حالی کو مطلع کرتے ہیں۔ اب حالی کا جواب سنئے :-

".... آپ نے بہت جلد تشریف لائے کا وعدہ کیا ہے مگر میں اپنی حالت کے لحاظ سے یہ شہر چھوڑتا ہوں۔

نہا ہی جانے سحر ہوا نہ ہو، جیسی دمیں شہ فراق کئی احتمال رکھتی ہے

”میں اپنی طرف سے اس وقت تک زندہ رہنے کے لئے پوری کوشش کروں گا۔“

سچ بتائیے کہ اگر مکتوب نگاری کی رسم اور رسم میں حقیقت نگاری کا رواج نہ ہوتا تو حالی کی طبیعت کا یہ رخ اس طرح کب سامنے آتا۔ اسی طرح حالی کے بعض مکاتیب سے اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ جن کا مزاج بے حد تیز تھا ان کا سلوک کتنا نرم و دھیمہ، منصفانہ اور پیارا تھا اور ان کی وفات کے بعد ان پر کیا کچھ ہوتی۔

میرا مقصد یہ نہیں کہ حالی، شبلی، یا دیگر مشاہیر ادب کے مکاتیب کے ساتھ موازنہ کروں۔ ایسا کرنا کسی طرح مستحسن نہیں ہو گا۔ نیاز بنیادی طور پر افشا پر داز ہیں۔ ایسے افشا پر داز نہیں جن کی افشا شاعری کا سہارا لے کر تکلف اور تسنع اور شوخی و رنگینی کے حدود میں داخل ہوتی ہے بلکہ یہ وہ افشا ہے جو اس شاعرانہ فکر و احساس کی پروردہ ہے جس کی خصوصیت سادگی و رعنائی اور تاثیر و صداقت ہے۔ شاد کے مکاتیب شاد کی شخصی حیثیت کو *منذہرہ* کرتے ہیں۔ حالی کے خطوط حالی کی پاکیزہ سرفرازی کے عکاس ہیں وحشت کے مکاتیب ان کی خاکساری و انکساری کے نمائندہ ہیں۔ شبلی کے نامہ ہائے شوق اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ انسان تھے اور ان کے پہلو میں دل اور دل میں جذب و شوق بلکہ ہوا و ہوس کی ہر تھی۔ غالب کے خطوط ایک دور کی تاریخ اور خود غالب کی زندگی کا فوٹو ہیں۔ اقبال کے مکاتیب محض علمی دستاویز ہیں لیکن نیاز کے مکاتیب میں یہ تمام چیزیں ایک جگہ جمع ہیں اور ان کے مطالعہ کے بعد ان کی شخصیت کے بہت سارے پہلو اور ان کے عقیدہ و نظریہ کے تمام گوشے سامنے آ جاتے ہیں۔

حامد حسین صاحب کی یہ رائے بڑی بھرپور ہے کہ نیاز کی شخصیت ایک پہلو دار شیشہ (*Prism*) کی سی ہے جس نے بکھری ہوئی شعاعوں کو ایک جا کر کے قوس قزحی رنگوں میں منتشر کر دیا ہے۔ میں اس پر صریح اضافہ کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ تمام بکھری ہوئی شعاعیں ان کے مکتوبات میں بھی جلوہ پاش ہیں اور اس حد تک کہ ان کی روشنی میں نیاز کی شخصیت پوری طرح تاباں و درخشاں ہے۔

## نگار کے پچھلے فائل

۳۲	=	جولائی تا دسمبر	=	۳۲	=	ع ۱
۳۳	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۳	=	ع ۲
۳۴	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۴	=	ع ۳
۳۵	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۵	=	ع ۴
۳۶	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۶	=	ع ۵
۳۷	=	جولائی تا دسمبر	=	۳۷	=	ع ۶
۳۸	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۸	=	ع ۷
۳۹	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۹	=	ع ۸
۴۰	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۰	=	ع ۹
۴۱	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۱	=	ع ۱۰
۴۲	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۲	=	ع ۱۱
۴۳	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۳	=	ع ۱۲

نوٹ:- ہر ایک ایک فائل موجود ہے اور سب سے پہلے جس کا آرڈر ہے پہلے پہنچے گا اسی کو دیا جائے گا۔ قیمت محصول ڈاک کے علاوہ ہے۔

# کوثر چاند پوری کے ناول

(سید حامد حسین ایم۔ اے)

کوثر چاند پوری کی ادبی زندگی دو دہائیوں سے کہیں زیادہ ہے۔ باوجودیکہ پچھلے بیس سال اردو ادب کی تاریخ میں بڑے انقلاب انگیز رہنمائی کے تصور میں فرق آیا، سماجی شعور بیدار ہوا، ادبی اقدار بدلیں، فن میں نئے تجربے کئے گئے، مگر ادبی دھارے کی اس تندروی میں بھی کوثر صاحب نے اپنے کھلے ہوئے شعور کے ساتھ عصری تحریکات کے صوت مدد عناصر کا ساتھ دیا اور ان کے پس منظر سے اپنی تخلیقات کو ابھارا۔ اس کا فن مرعوبیت کی پیداوار نہیں کہا جاسکتا کیونکہ جس وقت ہمارا ادب اس تجربات کی اور عبوری دور سے گزر رہا تھا اس وقت کوثر صاحب کا فنکارانہ شعور بلوغ حاصل کر چکا تھا۔ چنانچہ بدلتی ہوئی سماجی اور اس کے ساتھ ہی ادبی اقدار کا شعور ان کے یہاں جذباتی عصبیت کی بجائے واضح فکری حقیقت بن کر آیا۔ انھوں نے اپنے عصر کی مخصوص تحریکات کا ساتھ ضرور دیا مگر ایک سنبھلا ہوا انداز اور ایک فکری متانت کا بجا ان کی تخلیقات سے نمایاں رہی ہے۔

ان دو دہائیوں کا ابتدائی دور، دو نثر کی تاریخ میں افسانہ دور کہا جاسکتا ہے اور کوثر صاحب نے بھی اس زمانہ میں بے شک افسانے لکھے۔ مگر دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد جب بازار میں ایک بار سپر ناولوں کی نگہداشت پیدا ہوئی تو کوثر صاحب نے بھی افسانوں کے ساتھ ساتھ ناولوں کی بھی تخلیق شروع کی جنگ کی سسنی خیزی نے قارئین کے ذاق میں ایک تندی پیدا کر دی تھی چنانچہ جنگ کے بعد محض سماجی، اصلاحی اور نفس پاتی ناولوں کے لئے بازار میں تنہا نہ پیدا ہو سکی جتنی جنسی اپیل سے بھرپور، واقعاتی اچانک پن پر مبنی اور ذہنی تجسس کو آسودہ کرنے والے ناولوں کے لئے پیدا ہوئی۔ لہذا اس دوران میں اردو کے اچھے اور سب سے ناول بازار میں بہت کم آئے اور اس کے لئے دوسرے اسباب کے ساتھ ایک بڑا سبب ناشرین کا میسر نہ آنا بھی رہا۔ اثر کی نگاہ اپنے خیر یاوہ کے فوق پر رہتی ہے اور عموماً وہ ایسی چیز ہی قبول کرنا چاہتا ہے جس کی بازار میں کھپت ہو سکے۔ چنانچہ اس دور میں اشاعت کے نقطہ نظر سے خصوصیت کے ساتھ اردو کا ناول نگار اتنا آزاد نہ رہ سکا جتنا اردو افسانہ نگار نظر پاتی اعتبار سے بلند سطح مواد رکھنے کے باوجود ناول نگار کو اس پر مجبور ہونا پڑا کہ وہ ہنگامی ادبی تقاضوں کو پورا کرے۔ کوثر صاحب کے ناولوں سے بھی جا بجا ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں ناشرین نے ان تقاضوں کی جانب جھکنے پڑا ہے۔

کوثر صاحب کے اب تک پانچ ناول بازار میں آچکے ہیں۔ ”دیرانہ“ (۱۹۵۷ء) ”سب کی بیوی“ (۱۹۵۷ء) ”الطوا“ (۱۹۵۷ء)۔ ”تور و زنجیریں“ (۱۹۵۷ء) اور ”پیا سی جوانی“ (۱۹۵۵ء)۔ آخر الذکر چار ناولوں کی جنسی اپیل کافی نمایاں ہے ”سب کی بیوی“ اور ”پیا سی جوانی“ کا موضوع ہی جنسی نفسیات ہے۔ لیکن اس کے باوجود کوثر صاحب کا فکرمعنی ادبی فحاشی کی جانب نہیں جھکا ہے۔ علامات اور اشارات سے انھوں نے بڑے نازک مواقع پر کام نکال لیا ہے۔ نظریاتی طور پر دو فریڈ کے جنسی غلبہ کے تصور کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔ ”تور و زنجیریں“ نہ صرف جاگیر دارانہ نظام کی بیڑیوں سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کو پیش کرتا ہے بلکہ ذہن اور جذبات کو غیر سخت منہ تحریکات سے آزاد کرانے میں بھی مددگار ہوتا ہے۔ امرت جنگ آزادی کا ہیرو ہی نہیں ہے وہ اپنے جنسی جذبہ سے جنگ کرتا اور اس بد فتنے حاصل کرتا بھی جانتا



اخلاق، ازدواج، جنس اور حریت پر سمجھے ہوئے انداز سے بحث کرتے ہیں۔ ”سب کی بیوی“ اور ”پیاسی جوانی“ میں باوجود یکہ شعور کا عمل منفی ہے تاہم شیدا، رابعہ اور انجم اپنے جذبہ کو سمجھتی ہیں اور ان کا یہ احساس انھیں ایک باغیانہ رد عمل پر مجبور کرتا ہے مگر دائیں کی یہ شعوری وضاحت ناول نگار کی اپنی فکر کی توانائی کا عکس ہے۔ ناول نگار نے تصورات کے دھندلکوں اور جذبات کے دھورے سے رومان اور تخیل (مصلحت) کی تخلیق نہیں کرنا چاہی ہے بلکہ ذہنی اٹھان اور جذباتی ارتقا پر نگاہ رکھتے ہوئے مختلف مراحل کو ملحوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔

کوثر صاحب انسانیت کی بلند اقدار پر اعتماد رکھتے ہیں اور ان ناولوں میں اپنے عصر کے تاریک پہلوؤں کی تصویر کشی کے باوجود انھوں نے روشن پہلوؤں کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ خارجی بندشیں اور حادثات انسان کو پست بننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مگر انسان کے سینے میں چلنے والا اپنی کاجراغ ان طوفانوں میں بھی نہیں بجھتا۔ کوثر صاحب کے چار ناولوں میں ان کا کوئی نہ کوئی نسوانی کردار ضرور طوائف بننے پر مجبور ہوتا ہے۔ مگر یہ مجبوری بھی اس کے پندار اور عفت کردار کو نہیں چھین پاتی۔ ”ٹوڑ دو زنجیریں“ میں حبیب زوالی آمادہ جاگیر دارانہ نظام کی ساری بے اعتدالیوں کا ناپیدہ ہے لیکن کوثر صاحب اس کی فطرت کی کمزوریاں خارجی ماحول کی کمزوریوں سے متعلق سمجھتے ہیں اور ان کی اصلاح کی توقع رکھتے ہیں۔

کوثر صاحب کے کردار ایک منفرد شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ مگر عموماً ان کے نسوانی کردار مردانہ کرداروں سے زیادہ توانا نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ ”ٹوڑ دو زنجیریں“ میں بعض مواقع سکینہ کا کردار ناصر کی شخصیت سے زیادہ بھرپور اثر چھوڑتا ہے۔ ”سب کی بیوی“ اور ”پیاسی جوانی“ میں تو ناول نگار نے تقریباً ساری کوششیں شیدا، رابعہ اور انجم کے کرداروں کو اُبھارنے میں صرف کی ہے۔ یہ کردار زیادہ تر متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں ”ٹوڑ دو زنجیریں“ اور ”اغوا“ میں اگر کوئی نچلے طبقہ سے تعلق رکھنے والا کردار نظر بھی آجاتا ہے تو اس کی سیرت بڑی سرسری ہے۔

کوثر صاحب کے مرکزی کردار عموماً نوجوان ہیں اور ان کے ہمدرد خیال کی جنسی کشش کو انھوں نے خصوصیت کے ساتھ نمایاں بنا کر پیش کیا ہے کہیں کہیں ان میں ہمیں لذتیت کا بھی شبہ ہونے لگتا ہے اور کہیں کہیں ان نقش و نگار میں ٹکراؤ کا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ کردار نوجوان ہیں، ان کی جوانی اور شباب کا پرچار اگر کہیں کہیں ناول کی متانت پر بھاری لگنے لگتا ہے۔ کوثر صاحب کے ناولوں کی فضا رومانی اور جذباتی ہوتے ہوئے بھی واقعتاً ایسی نہیں ہے اور جب ہم اس کا احساس کر لیتے ہیں کہ وہ مسئلہ کچھ اور ہے جو کوثر صاحب کی ناول کا ایک زیریں تاثر بن کر آیا ہے تو گداز لمس، گرم سانسوں اور دہکتے ہوئے رخساروں کی اتنی فراوانی ہمیں کچھ زیادہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زندگی کی حرارت اور حرکت کو ظاہر کرنے کے لئے اس قسم کے مواقع کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، تاہم ہم یہ ضرور امید کرتے ہیں کہ ناول نگار ان کو زیادہ جامعیت اور زیادہ گہری اشاریت سے پیش کرے۔ کوثر صاحب کے ناولوں کے اس پہلو کا ایک جواز تجارتی مصلحت سمجھا جاسکتا ہے لیکن جب ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ مجموعی حیثیت سے کوثر صاحب اپنے ناولوں کے ذریعہ جنس کا کوئی مریضانہ یا ترغیب آمیز پہلو پیش نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں یہ منتشر رومانی لمحات یقیناً اس مقصد سے مطابقت رکھتے ہوئے نہیں معلوم ہوتے۔

کوثر صاحب کے ناولوں میں ان کے افسانوں کی دبی دبی چاشنی اور ہلکی ہلکی شعریت جا بجا جھلک آتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے اپنی انسانی اشاریت سے بھی حقیقت نگاری کو خوشگوار بنانے میں مدد حاصل کی ہے۔ ”ٹوڑ دو زنجیریں“ کے دوسرے صفحہ پر یہ مصرع نظر آتی ہیں۔

”سو کھے گھونٹے ہوئے پپے پھر چینی لگے، چرخ چوں، چرخ چوں!۔ ایسا لگتا جیسے وہ فریاد کر رہے ہوں اور  
رو رو کر کہہ رہے ہوں تم نے گاڑی میں لگا کر ہمیں گھونٹے پر مجبور کر دیا ہے مگر کبھی کبھی ہمیں تیل کی بھی ضرورت

ہوتی ہے۔ تم یہ ضرورت پوری نہیں کرتے اور ہمیں یوں ہی گھمائے جاتے ہو، ہر وقت، ہر لمحہ۔ آخر تک ہم اس طرح گھومتے رہیں گے۔ ایک وقت آئے گا کہ ہم چلتے چلتے رک جائیں گے اور اس وقت تمہاری یہ پوری گاڑی بیکار ہو جائے گی۔ اتنا جبر نہ کرو اور ہمیں اتنا نہ ستاؤ کہ ہم ٹھہر کر اس بلیقہ ہونی گاڑی کو بھی کھڑا کر دیں۔ اس اشاریت میں مسلم گڑھ میں سر اٹھانے والی ساری بغاوت سمٹ آئی ہے۔ جنسی مراحل کا اظہار کرتے ہوئے بھی انھوں نے اس رمزیت سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔

کوثر صاحب کی افسانہ نگاری ان کی ناولوں کے خاتمہ پر خصوصیت کے ساتھ اثر انداز نظر آتی ہے۔ باوجودیکہ ان کا ناول اختتام کی جانب تدریجی ارتقاؤ کرتا ہے تاہم اس کا نقطہ عروج اکثر غیر متوقع ہوتا ہے۔ خاتمہ کا یہ اچانک بین بعض اوقات ناول کی بعض کڑیوں کو منتشر کر دیا کرتا ہے اور قاری کو ایک بار پھر شروع سے ناول کا جائزہ لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ "سب کی بیوی" کا اختتام نہ صرف چونکا دینے والا ہے بلکہ تھوڑی دیر کے لئے ایک ذہنی پیچیدگی پیدا کرنے کا سبب بھی بنتا ہے۔ "اغوا" اور "توڑ دو تھوڑی" میں نقطہ عروج پر پہنچنے کے بعد قاری ایک بار پھر ناول کا پورا جائزہ لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس طرح ناول کی حرکت ابتدا سے اختتام کی طرف ہونے کی بجائے اختتام سے ابتدا کی جانب ہوتی ہے۔ یہ صورت "اغوا" میں زیادہ نمایاں ہے اور اس کا سبب وہ بنیادی مغرضہ ہے جس کو ذہن میں رکھ کر ناول نگار ساری کڑیاں طیار کرتا ہے۔ اختتام کے اس اچانک پن کو پیدا کرنے کے لئے کہیں کہیں ناول نگار کو چند ضمنی کردار اور واقعات کے چند غیر اہم دھارے بھی پیدا کرنے پڑے ہیں۔ "پیا سی جوانی" میں نصرت بیگ کا کردار محض اس لئے وضع کیا گیا ہے کہ آخر میں رابعہ کو اس سے وابستہ کر دیا جائے۔ یوں ناول کے ڈھانچے میں اس کردار کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کوثر صاحب کے ناولوں کا داخلی پہلو کافی نمایاں ہے اور اسی لئے ہم ان کی ناولوں کی اندرونی رو کو واضح طور پر حرکت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں مگر اختتام پر اسی داخلیت پر خارجی تعجب خیزی طاری ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

کوثر صاحب نے آج کی "مقبول ناول" کی تکنیک کو ایک سنجیدہ اور متین رنگ دیا ہے۔ ماحول کی ساری پیچیدگیوں کے باوجود ان ناولوں سے اعلیٰ انسانی اقدار پوری توانائی کے ساتھ ابھرتی ہیں اور زندگی کے صحت مند عناصر کو نمایاں بنا کر پیش کرتی ہیں۔ کوثر صاحب کے اندر کے بچہ کار فکرنے انھیں محض مجرور حقایق نہیں بننے دیا ہے بلکہ انھیں زندگی کے تجربات میں جذب کر کے ناول کا موضوع بنایا ہے کوثر صاحب کے یہ ناول اسی لئے آج کے دوسرے ناولوں میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔

## رعایتی اعلان

من ویزداں — مذہبی استفسار و جوابات — نگارستان — جہانستان — شہوانیات — مکتوبات نیازتین حصے —  
 انتقادات — اہل و اعلیہ — حسن کی عماریاں — شہاب کی سرگزشت — فدا سلفہ قدیم — مذاکرات نیاز — فراست الہد —  
 نقاب اٹھ جانے کے بعد

میزان  
 عتیقہ

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر مدد محمول صرف چالیس روپیہ میں مل سکتی ہیں۔  
 منیجر ننگار لکھنؤ

# اودھ کے تفریحی مشغلوں

میں

## ڈرامائی عناصر

(ڈرامے کے عہد زوال میں)

(سید مسعود حسن رضوی ادیب)

آج سے صدیوں پہلے ڈرامے نے ہندوستان میں جتنی ترقی کی تھی اتنا ہی اس کو تنزل بھی ہوا۔ یہاں تک کہ اب سے ڈیڑھ دو سو برس پہلے ڈراما اپنا دھار بالکل کھو چکا تھا اور ایکٹنگ کا فن بالکل ذلیل سمجھا جانے لگا تھا۔ راجاؤں کا کیا ذکر، سماج کے اونچے طبقوں میں سے کسی کو بھی ڈرامے کی طرف کوئی توجہ نہیں رہتی تھی۔ البتہ عوام کی مذہبی عقیدت کی بدولت چند مذہبی ناٹک باقی رہ گئے تھے جن کے فدیہ سے راجا رام چند رجی اور شرعی کرشن جہا راج کی زندگی کے بعض واقعات ایلیج پر پیش کئے جاتے تھے اور جو رام لیلا اور کرشن لیلا کے نام سے موسوم تھے۔ ان کے لئے کہیں کوئی مخصوص عمارت نہ تھی، کوئی باقاعدہ اسٹیج نہ تھا۔ یہ کھلمیدانوں میں، سڑکوں پر، بازاروں میں دکھائے جاتے تھے۔

رام لیلا کے لئے سال میں چند دن مخصوص تھے، جن میں وہ ایک سالانہ یادگار کے طور پر جگہ جگہ دکھائی جاتی تھی۔ اس ناٹک میں مشاق اور ہنرور ایکٹر کام نہیں کرتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے رام، لکھمن اور سیتا کی شبیہیں بنائے جاتے اور یہ ایک ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا یعنی رام لیلا کو صرف مذہبی حیثیت حاصل تھی، ڈرامے کی حیثیت سے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور آج بھی اس کی یہی حالت ہے۔

کرشن لیلا کی حالت کسی قدر مختلف تھی۔ اس کے لئے کوئی زمانہ مقرر نہ تھا۔ وہ بالعموم ان میلوں میں دکھائی جاتی تھی جو سال کے مختلف حصوں میں ہوتے رہتے ہیں، کرشن لیلا ”رہس“ کے نام سے مشہور ہو گئی تھی اور اس کو کھیٹنے والے ”رہس دھاری“ کہلاتے تھے۔ رہس دھاریوں کی باقاعدہ منڈلیاں یعنی جتے یا گروہ تھے۔ میلوں کے علاوہ بھی یہ منڈلیاں لوگوں کے یہاں اُجرت پر رہس کھینچنے جانا کرتی تھیں۔ ان منڈلیوں میں ایکٹنگ کی کچھ برسی بھلی تعلیم بھی ہوتی تھی مگر استاد خود بھی اس فن سے بخوبی واقف نہ ہوتے تھے تو ان کے شاگردوں سے کیا توقع کی جاسکتی تھی۔ رہس منڈلیوں میں کام کرنے والے ادنیٰ درجے کے ان پڑھ لڑکے اور ان کے استاد بھی بالعموم جاہل ہوتے تھے۔ غرض کہ رہس کی ڈرامائی حیثیت رام لیلا سے کچھ بہتر ہونے کے باوجود بہت پست تھی۔

دنیا کی ہر چیز بدلتی رہتی ہے مگر مذہبی عقیدت میں تبدیلی بہت مشکل سے اور بہت دیر میں ہوتی ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب اور سب طرح کے ناٹک فنا ہو گئے اس وقت بھی ان مذہبی ناٹکوں کا وجود باقی رہا لیکن مذہبی عقیدت بھی ایک ہی چیز کی تکرار سے آخر کار اکتا ہی جاتی ہے۔ اس لئے رہس منڈلیوں نے یہ طریقہ نکالا کہ شروع میں کرشن کی لیلاؤں میں سے کوئی لیلا مثلاً متھیارا لیلا، ڈاڑھی لیلا



ہے آب حیات - ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوچتا۔ کئی دن اس تاریک گھر میں اس نے گزار دیے۔ آخر اکتا گیا۔ دل اُلجھنے لگا۔ دم گھٹنے لگا۔ جینے سے یاس ہو گئی۔ سمجھا کہ بس یہی درہ اس کا مقبرہ ہے۔ ایک دن چپٹے معلوم ہوا جگنو سا چمک گیا اور پھر نظر سے اوجھل ہو گیا۔ اب اُس نے آگے بڑھ کر، آنکھیں مل کر نظر جا کر جو دیکھا تو جگنو نہیں۔ یہ تو کوئی نا اطلح کر رہا ہے۔ چلو ایک سیدہ تول گئی۔ یہ اسی رنج پر چلا۔ بوں جوں آگے بڑھتا ہے سنا رہا ہوتا جاتا ہے۔ گمان ہوا کہ تارہ نہیں، یہ تو آفتاب نکل رہا ہے۔ اور آگے بڑھتا تو ذل کھلا کہ آفتاب نہیں، درے کا دوسرا نکاس ہے۔

زبیران اللہ محکم صاحب سحر بیانی اس کو کہتے ہیں۔ یہ مضمون وجد کرنے کے قابل ہے، کیا تخیل ہے، کیا حسن بیان، آفریں صد آفریں "اب محکم صاحب رزم کے میدان میں آتر آئے۔ مہیب آواز سے وہ نعرے لگے کہ..... پھر جز تو اس طرح ڈانٹ کر بڑھ۔"..... اس داستان کی ایک تخیل اور مجھے یاد آگئی۔ لڑائی میں تیروں کا مینہ برسنا تھا کہ زمین کے روٹے کھڑے ہو گئے۔"

داستان گوئی کے فن نے لکھنؤ میں بہت ترقی کی۔ میں نے اپنے لڑکپن میں یہاں داستان کہنے اور سننے کا شوق بہت عام پایا۔ لیکن اس وقت بھی کوئی ایسا داستان گو موجود نہ تھا جو فی البدیہہ داستان کہتا ہو یا اپنی تصنیف کی ہوئی داستان بیان کرتا ہو۔ آخری باکمال داستان گو، جن پر اس فن کا خاتمہ ہو گیا، دہلی کے میر باقر علی مرحوم تھے۔ خوش قسمتی سے میں نے ایک مرتبہ ان کو فرنگی محل لکھنؤ میں داستان کہتے سنا۔ خداوند افاقے دربار میں خواجہ عمر کی ایک عیاری انہوں نے اس طرح بیان کی اور لہجے کی تبدیلیوں اور اعضا کی جنبشوں سے یوں کام لیا کہ ساری محفل ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ گئی۔ ان کی زبان کی پاکیزگی اور بیان کی دلنشی تعریف سے مستغنی ہے۔ صرف دو پارے نقرے یاد رہ گئے ہیں سنئے۔ "بندر برس کر کھل گیا۔ جیتوں کا پانی ماہی پشت کا جال بناتا ہوا پرنالوں سے بہہ رہا ہے؟ رات کا وقت ہے۔" بادل پھٹ چکے ہیں مطلع صاف ہو گیا ہے۔ وہ نیلا نیلا آسمان، جھپکے جھپکے تارے، دھلی دھلی چاندنی، کیسا سہانا سماں ہے۔ اب اس کا کوئی ماہر شاید ہندوستان میں کہیں باقی نہیں ہے۔

بھارتی نقالیوں میں چھوٹے چھوٹے ہنسائے والے ڈرامے ہوتے ہیں جن کو انگریزی میں فارس (FARCE) اور ہندی میں برہمن (BRHMAN) کہتے ہیں۔ اکثر نقلوں میں صرف ایک یا دو تین ڈرامائی سین ہوتے ہیں۔ لکھنؤ میں میاؤں میں، بازاروں میں، جشنوں میں اور خوشی کی تمام تقریروں میں بھانڈوں ضرور ہوتے تھے جو اپنی مضحک نقلوں سے حاضرین کا دل خوش کرتے تھے۔ بھانڈوں کا یہ قول مشہور ہے کہ "نفل ویران جہاں بھانڈا باشد"۔ شاہی محفلیں بھی بھانڈوں سے خالی نہ ہوتی تھیں۔ اکتوبر ۱۸۵۳ء میں جنرل پیٹ لکھنؤ آئے۔ اودھ کے بادشاہ غازی الدین حیدر کے یہاں ان کی دعوت ہوئی، اس وقت تفریح کے جو سامان جہاں کئے گئے ان میں بھانڈے بھی تھے۔ "بہ نقل ہائے عجائب و غرائب نقالان عشرت پرداز، لب ہائے تاشائیاں بہ خندہ باز"۔ اسی بادشاہ نے دسمبر ۱۸۵۷ء میں نوراً بھانڈ کو خواب کی ایک چپکن عنایت کی۔ جولائی ۱۸۵۷ء میں نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے انتقال کے بعد فریدون بخت میرزا مناجان تخت نشین ہوئے تو "جو جو حاضر تھے ان کی نذریں گزریں، باقی صبح پر موتوں رہیں۔ افتدوائے نوراً بھانڈ کا بیٹا ناچنے لگا۔ ہر ایک محو تاشا ہوا۔ محمد علی شاہ بادشاہ اودھ جب حسین آباد کی عمارتیں بنوا چکے تو جلاوطنی کے سامنے والے میدان میں روز سہ پہر کو بازار لگے لگی۔ اس میں "ایک جاقصہ خواں ہمزہ وافر (کذا) کی داستان، نقال (بھانڈ) جدا نیغہ کھونٹے مسخران کرتے ہیں۔ ہر ایک پیٹ کے واسطے ظاہر اپنا فن کرتے ہیں۔"

بھانڈ تو بڑا بہت ناچ کا نا بھی سیکھ لیتے تھے مگر ان کا اصل کام نقالی تھا۔ وہ عوام کو خوش کرنے کے لئے بیہودہ بلکہ نفلیں بھی کرتے تھے۔ لیکن بیشتر شے لکھے ہوتے تھے اور پاک و صاف زندگی بسر کرتے تھے۔ واجد علی شاہ اس فرستے کے متعلق لکھتے ہیں۔ "..... وہ فرقہ بھانڈ اور نقال مشہور ہوا۔ ہر چند اس فرستے کو سوائے نقل کو اصل کر کے دکھانے کے لئے

تسریں مطلق تمیز نہیں ہوتی مگر البتہ جو کام ان کا ہے یعنی نقل غائی وہ انھیں پر ختم ہے اور اس فرستے کو راقم نے چشم خود دیکھا ہے کہ ایسے پابند صوم و صلوة ہوتے ہیں کہ سبحان اللہ - ہزار روپے کی تحصیل سامنے دھر دو اور فرمایش کرو کہ نماز فوت ہونے دو اگر نقل کئے جاؤ گے ہزار روپیہ یہ تمہارا ہے۔ کبھی قبول نہ کریں گے پر نماز وقت پر بجالائیں گے۔“

بھانڈ جہاں عوام کو ہنسانے کے لئے ادنیٰ درجے کی ظرافت سے کام لیتے تھے۔ وہاں اہل علم کی محفلوں میں ایسی نقلیں بھی کرتے تھے جن کے لئے کافی علمی استعداد کی ضرورت ہوتی تھی۔ مثلاً اس طرح کی دو نقلیں یہاں لکھی جاتی ہیں۔ ایک نقل کو بھائی سمجھنے کے لئے دو باتوں کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ بانی محفل کہنے ہی بڑے مرتبے کا آدمی کیوں نہ ہو اگر اس میں کوئی کمزوری موجود ہے یا محفل کے انتظام میں کوئی کمی رہ گئی ہے تو بھانڈ ان چیزوں کو اپنی نقل کا موضوع ضرور بناتے تھے۔ دوسری یہ کہ اگلے زمانہ میں بڑے سے بڑے کے ذی علم لوگ کچھ طالب علموں کو درس دیتے تھے مگر اس کا کوئی معاوضہ نہ لیتے تھے۔ ان دونوں باتوں کو نظر میں رکھئے اور بھانڈوں کی ایک نقل سنئے:-

فرنگی محل لکھنؤ کے ایک عالم، اودھ کی شاہی زمانے میں کسی بہت بڑے عہدے پر فائز تھے۔ وہ عربی کی ایک بہت بلند پایہ اور مشکل کتاب کا درس دینے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مگر عام اصول کے خلاف بلا معاوضہ درس نہ دیتے تھے، بلکہ فی سبق ایک اشرفی لیتے تھے۔ اس لئے صرف احرار کے لڑکے ان کی تعلیم سے مستفید ہو سکتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے یا ان کے کسی عزیز کے یہاں کوئی قریب ہوئی اور بھانڈ لائے گئے۔ انھوں نے پہلی ہی نقل یہ کی کہ مسند بچھائی گئی، گاؤ تکیہ لگا یا گیا اور ایک بھانڈ انھیں عالم صاحب کی وضع قطع بنا کر آیا اور مسند پر گاؤ سے لگ کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر کے بعد ایک نوجوان طالب علم بغل میں ایک کتاب دبائے حاضر ہوا اور ان مصنوعی عالم کو سلام کر کے سامنے مودب بیٹھ گیا۔ عالم صاحب نے آنے کا سبب پوچھا۔ اس نے عرض کیا کہ میں فلاں کتاب پڑھنا چاہتا ہوں۔ اگر حضور اپنے فیض تعلیم سے مستفیض فرمائیں تو میں تمام عمر حضور کا احسان مند رہوں گا۔ عالم صاحب نے پُر غرور انداز میں فرمایا کہ یہ تو ہو سکتا ہے مگر تم کو فی سبق دو اشرفیاں دینا ہوں گی۔ طالب علم کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی اور بولا حضور نے یہ کیا فرمایا بھلا کوئی بڑا آدمی پڑھانے کی اجازت لیتا ہے۔ عالم صاحب نے کہا کیوں نہیں آخر مولوی فلاں صاحب لیتے ہیں کہ نہیں۔ طالب علم بولا جی ہاں وہ ایک دنیا سے نرالی بات کرتے ہیں مگر وہ بھی فی سبق ایک اشرفی لیتے ہیں اور آپ نے تو فی سبق دو اشرفی معاوضہ قرار دیا ہے۔ عالم صاحب نے فرمایا کہ بھئی میرا ایک سبق ان کے دو سبقوں کے برابر ہوتا ہے۔ اس لئے میں ان سے دو معاوضہ بھی لیتا ہوں کچھ دیر اسی طرح بھاؤ گاؤ ہونے کے بعد معاملہ طے ہو گیا۔ طالب علم نے دو اشرفیاں نذر کر کے کتاب کھولی اور ایک مشکل مقام نکال کر پڑھنا شروع کیا۔ عالم صاحب نے اس کے مطالب بیان کرنے میں ایسی ایسی موٹا گافیاں کیں اور ایسے ایسے علمی نکات بیان کئے کہ سب اہل علم حیرت آمیز دلچسپی سے یہ درس و تدریس کا منظر دیکھنے میں محو ہو گئے اور وہ اصلی عالم اپنا لب و لہجہ اور اپنے الفاظ و فقرات سننے سنتے اس قدر متعجب ہوئے کہ آخر ضبط نہ کر سکے۔ اٹھ کر نقلی عالم کے پاس آئے اور پوچھا کہ تو نے یہ کتاب کس سے پڑھی اور تجھ کو اس کا پڑھنا کہاں سے آگیا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور عرض کیا کہ فلاں زمانہ میں ایک نواب زادہ حضور سے پڑھنے آیا کرتا تھا وہ یہی خادم تھا بھلا حضور ایک بھانڈے کے لڑکے کو کیا پڑھاتے اس لئے مجبوراً غلام کو نواب زادہ بننا پڑا۔

سے میرے لوگوں تک بعض نہایت معزز و محترم ذی علم و صاحب ثروت بزرگ اس طریقے پر عامل تھے اور میں نے دس گیارہ برس کے سن میں ایسے دو بزرگوں کی تعلیم سے فیض پایا ہے۔ آٹاؤ میں چودھری سید محمد راہ صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ تعلقدار آٹاؤ سے جامع عباسی کے بعض حصے پڑھے اور نیوٹنی خلیق آٹاؤ میں مولوی محمد حسن صاحب مرحوم صدر اعلیٰ سے عربی کی ایک ابتدائی کتاب پڑھی۔ ادیب

اب دوسری نقل بیان کرنے سے پہلے یہ تمہید سن لیجئے کہ میر محمد باقر داماد ایران میں ایک بہت بڑے عالم اور فلسفی مگر بے میں  
ن کی کتاب افق المبین فلسفہ کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل ہے اور اس کے مطالب کا سمجھنا بڑے بڑے فاضلوں کے بس  
لی بات نہیں ہے۔ اس تمہید کے بعد نقل سنئے :-

ایک محفل میں اہل علم کا مجمع تھا۔ بھانڈوں نے یہ نقل کی کہ ایک شخص میر باقر داماد بن گیا اور مر گیا۔ جنازہ قبر میں اتارا  
گیا۔ منکر نکیر آئے اور حسب معمول سوال کیا "من ربک؟" یعنی تیرا رب کون ہے۔ میت نے جواب دیا :- "ہو الا سطقس  
فوق الاسطقات" یعنی وہ ایک عنصر ہے تمام عناصر سے بالاتر۔ اس جواب کا مطلب فرشتوں کی سمجھ میں نہیں آیا۔ انھوں نے  
ایک دوسرے کا منہ دیکھا اور پھر وہی سوال کیا۔ میت نے پھر وہی جواب دیا۔ فرشتوں کی سمجھ میں پھر کچھ نہ آیا۔ خیال ہوا کہ شاید  
یہ ہمارا سوال نہیں سمجھتا۔ اس مرتبہ بہت آہستگی میں کہا کہ حضرت ہمارے سوال کو سمجھ کر اس کا جواب دیجئے۔ ہم پوچھتے ہیں "من ربک"  
میت نے کہا کہ اسی سوال کا تو ہم جواب دیتے ہیں کہ "ہو الا سطقس فوق الاسطقات"۔ فرشتوں نے کہا کہ حضرت یہ بات تو  
ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ ذرا آسان لفظوں میں کہئے۔ میت نے کہا کہ اس سے زیادہ آسان الفاظ اور کیا ہوں گے۔ اب فرشتوں  
نے عاجز آکر یہ طے کیا کہ جلو اللہ میاں کے پاس چل کر اپنی پیشکش آسان کریں۔ ایک بھانڈو فوراً اللہ میاں بن گیا۔ منکر نکیر آئے  
اور اللہ میاں سے عرض کیا کہ جب سے دنیا قائم ہوئی ہے ہم بے شمار قبروں میں جا کر یہ سوال پوچھ چکے ہیں کہ "من ربک" اور اس کے  
جسے جواب دئے گئے ہیں وہ سب ہماری سمجھ میں آگئے۔ آج ایک ایسے شخص سے سابقہ پڑ گیا ہے جس کا جواب کسی طرح ہماری سمجھ میں  
نہیں آتا۔ اللہ میاں نے کہا کہ ذرا وہ جواب میں بھی سنوں۔ فرشتوں نے کہا وہ کہتا ہے "ہو الا سطقس فوق الاسطقات"  
اللہ میاں بولے آہہ معلوم ہوتا ہے تم میر باقر داماد کی قبر میں چلے گئے۔ "اور افق المبین چیز نافرستہ کہ من ہم نہ فہمیم"۔ یہ سن کر  
ساری محفل بے اختیار ہنسنے لگی۔

بہروئے طرح طرح کے روپ بھر کے نقل کو اصل کر دکھانے میں بڑا کمال رکھتے تھے۔ یہ فن بھی ہندوستان میں بہت مدت سے  
چلا آ رہا ہے۔ علاء الدین قادر بدایونی نے شہنشاہ ہمایوں کے عہد کا ایک آنکھوں دیکھا واقعہ یوں بیان کیا ہے۔ ۹۸۵ھ میں ایک دن  
مشہور ایرانی شاعر حیدر قونی کا بیٹا ابن حمید جو بڑا ڈرپوک تھا، ہمایوں کے دربار میں حاضر تھا، اور جہاز پر بیٹھنے سے جتنا خون  
اس کو معلوم ہوا تھا اس کی کیفیت بیان کر رہا تھا۔ اس وقت بھی خون کے آثار اس پر طاری تھے۔ میں نے پوچھا کہ تم تو شاید  
جج کے لئے سفر کر کے کچھ تائے ہو گے۔ وہ بولا ہاں، بادشاہ نے فرمایا یہ کبے کے سفر سے کیا پشیمان ہوئے ہوں گے، ہاں جہان پر  
بیٹھ کر کچھ تائے ہوں گے۔ اسی اثنا میں بادشاہ کے اشارے سے "مفتد شیریں کار" متھے خاں، ایسے شخص کی صورت بنا کے جو کتے  
کے کاٹنے سے پاگل ہو گیا ہو، کتے کی طرح بھونکتا ہوا آیا اور ابن حمید کو بکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ اس طرح بدحواس ہو کر بھاگا کہ پکڑی کہیں لگی  
اور جوتا کہیں گیا۔ آخر ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ سب لوگ بہت ہنسے۔ جب اسکو حقیقت حال معلوم ہوئی تو وہ بہت شرمندہ ہوا اور بادشاہ  
نے اس کو تسلی دی۔

ادوہ کے آخری بادشاہ واحد علی شاہ نے اپنی ولیعهدی کے زمانہ میں ایک بہروئے کا ذکر یوں کیا ہے کہ ایک دن میرے چند مصاحب  
حاضر تھے اور دلچسپ حکایتوں اور رنگین لطیفوں سے میرا دل خوش کر رہے تھے۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ ان کی وفاداری کا امتحان کر لوں  
جنانچہ میرے ایمان سے ایک بہرو ہمایا ایک زخمی آدمی کی صورت بن کر جسم سے خون بہتا ہوا، لنگی تلوار ہاتھ میں لئے دوڑنے سے اُترا  
اور مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے بہت اضطراب ظاہر کیا۔ یہ دیکھ کر ایک مصاحب نے اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک نے جھپٹ کر  
اس کی کمر بٹائی اور چاہا کہ اسی کی تلوار سے اس کا کام تمام کر دیں۔ وہ فریاد کرنے لگا کہ میں بہرو ہمایا ہوں۔ میں نے بھی ان لوگوں کو  
روکا۔ اس طرح اس کی جان بچی مگر چوٹ بہت آگئی۔ میں نے بہروئے کو انعام دیکر نوکر رکھ لیا اور مصاحبوں کو اپنے بچانے سے روک دیا

اور ایک ایک تلوار، ڈھال، ہندوق اور سات فیر کا ہنچہ مرحمت کر کے مصاحبان خاص اور جوانان پہرہ خطاب دیا اور اپنے پلنگے پہرے کی خدمت سہر دکر کے ان کو عزت بخشی۔

میں نے بہرہ یوں کو طرح طرح کے روپ بھرتے دیکھا ہے مگر ایک بالکمال بہرہ پئے کے تین روپ ذکر کے قابل ہیں۔ ایک سوہرہ کی پر اتم بڑھیا کا روپ، چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی، گردن ہتی ہوئی، ہاتھوں میں ریشہ، پیر لڑکھڑاتے ہوئے، آواز میں تھوڑا ایک ٹھٹھا ٹیکتی جلی آ رہی ہے۔ دوسرے ادھ انگلی کا روپ۔ سر سے پیر تک آدھا جسم مرد کا آدھا عورت کا، ایک چادر اس انداز سے اوڑھے ہوئے کہ ایک ذرا سی جنبش میں وہ ایک طرف ہٹ گئی اور ایک مردانے لباس میں کھڑا ہوا نظر آیا اور پھر ذرا جنبش میں وہ چادر دوسری طرف ہٹ گئی اور ایک خوبصورت عورت زنانی پوشاک پہنے ہوئے زیور دل سے آراستہ نظر کے سامنے آئے تیسرا نکتہ سپاہی کا روپ۔ اگلے زمانہ کا ایک شمشیر باز ڈھال تلوار لگائے من منی آواز سے بولتا ہوا ایک لڑائی کا حال بیان کر رہا تھا جس میں حریف کی تلوار نے اس کی ناک صاف کر دی تھی۔ معلوم نہیں اچھی بھلی ناک کو اس نے کیونکر غائب کر دیا۔

بعض بہرہ پئے جانوروں کا روپ بھرنے کی مشق کرتے تھے ایک معتبر راوی نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ ایک رئیس کے یہاں چند آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک بڑا سا لنگور دم اٹھا کر اچھلتا کودتا سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب لنگور نے کھڑے ہو کر سلام کیا اور انعام مانگا تب یہ حقیقت کھلی کہ وہ بہرہ پیا تھا۔ سب لوگ اس کے کمال کے قابل ہو گئے۔ اور سب نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اُس کو انعام دیا۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اونچے طبقوں کے تفریحی سامان میں داستان گوئی، نقالی اور بہرہ پئی تین چیزیں ایسی تھیں جن میں ڈرامائی عناصر کم و بیش پائے جاتے تھے۔ داستان گو زیادہ تر صرف بچے کی تبدیلی سے اور کبھی کبھی جسم کی جنبش سے بھی کام لیتے تھے۔ زیادہ حرکت کرنا، اٹھنا بیٹھنا، چلنا، پھرنا داستان گو کے فن سے باہر تھا۔ نقال سب طرح کی حرکتیں کرتے تھے۔ اُن کا فن کسی واقعے کو بیان کرنا نہیں بلکہ اُس کو کر کے دکھانا تھا۔ بہرہ پئیوں کا کام صرف ہمیں بدلنا تھا، کسی واقعہ کو پیش کرنا نہ صرف داستان گو نہ اپنے چہرے کو بدلتے تھے نہ لباس کو۔ نقال حسب ضرورت اپنے لباس میں تھوڑی سی تبدیلی کر لیتے تھے اور چہرے کو کبھی کبھی رنگ لیتے تھے اور کبھی مصنوعی داڑھی مونچھیں بھی لگا لیتے تھے۔ بہرہ پئے جس کا ہمیں بناتے تھے اُس کی پوری نقل اُن کرتے تھے۔ لباس، چہرہ، آواز، چال سب اسی کی سی بنا لیتے تھے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ داستان گو اگر کسی عورت کو پیش کرے گا صرف اپنی آوازیں نرمی اور نزاکت پیدا کرے گا۔ نقال اس موقع پر صرف دوپٹا اوڑھ لینا کافی سمجھے گا اور بہرہ پیا اسی مقصد کے لیے داڑھی مونچھیں صاف کر دے گا، چہرے پر غار، دانتوں میں مٹی، آنکھوں میں سرمہ لگائے گا، سر سے پیر تک زنانی پوشاک پہنے گا، اور ہر طرح کے زیور سے اپنے کو آراستہ کر کے بالکل ایک عورت بن جائے گا۔ ایک بات اور ہے۔ داستان گو اور بہرہ پئے اپنا اپنا کام انفرادی طور پر انجام دیتے ہیں، لیکن نقالوں کی پوری سنگت ہوتی ہے اور کئی کئی آدمی مل کر کسی واقعے کو پیش کرتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ڈرامے اور ایکٹنگ کی حیثیت سے نقالی کو داستان گوئی اور بہرہ پئی پر فوقیت حاصل تھی مگر نقال صرف بہت چھوٹے چھوٹے محض منہ ہنسانے والے واقعات دکھاتے تھے۔ کوئی مسلسل واقعہ جس کا آغاز، ارتقا اور انجام نگاہوں کے سامنے آجائے، پیش نہیں کرتے تھے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو ہمیں ڈرامائی حیثیت بہت بہت ہونے کے باوجود نقالی سے بہتر تھی۔

(نیا دور)

مرثیہ نگاری اور میر انیس سے بالکل نئے زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت عام - منیجر شکار

# دلی کی علمی و ادبی مرکزیت

(نیاز فختوری)

دہلی، ہندوستان کے ان چند مخصوص شہروں میں سے ہے جن کا نام لیتے ہی نہ صرف وہاں کے سیاسی انقلابات اور خونریز معرکے اڑیوں کی طویل داستان بلکہ اس کے مرکزِ علم و ادب ہونے کی بھی مسلسل تاریخ ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔

ہرش کے انتقال کے بعد جب ہندوستان میں تفریق و انتشار کا دور شروع ہوا تو حالت یہ تھی کہ تمام راجپوتی قبائل ایک دوسرے سے دست و گریباں نظر آتے تھے اور اس افراتفری نے ملک کی اجتماعی وحدت کا شیرازہ بالکل منتشر کر دیا تھا، لیکن اس سے ایک علمی فائدہ ضرور ہوا، وہ یہ کہ راجپوتانہ کی تمام ریاستوں میں رزمیہ شاعری کی بنیاد پڑ گئی اور اس طرح پراکرت شاعری کا رواج ہندوستان میں عام ہو گیا۔ چنانچہ اس وقت دہلی میں بھی جو رائے پتھور پتھوری راج کی راجدھانی تھی ایک رزمیہ نظم نگار چند بروائی پیدا ہوا جس نے ایک لاکھ اشعار کی تاریخی رزمیہ نظم لکھ کر شہرت و دام حاصل کی اور پرتھوی راج کے دربار سے ملک اشعار کا خطاب حاصل کیا۔ اس عہد کے دوسرے مشہور شاعروں میں بنیاداس، پٹنہا اور کد کے علاوہ دو مسلمان شاعر قطب علی اور اکرم فیض کے نام بھی ہمارے سامنے آتے ہیں جو اس عہد کی پراکرت میں شعر کہتے تھے اور بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب وسط ایشیا کے ترکوں کا سیلاب، افغانستان و فارس تک پہنچ کر تیزی سے آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا اور اس کی پرشور لہر ہر جا لہے سے ٹکرانے کے لئے بیتاب تھیں۔ علاؤ الدین جو اسوز کا ایک بھتیجہ غیاث الدین بن سام، غزنی و ہرات پر قابض ہو چکا تھا اور دوسرا بھتیجہ شہاب الدین محمد غوری شمالی ہند کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پرتھوی راج کے لئے یہ بالکل پہلا موقع تھا کہ وہ کسی غیر ملکی فوج کے مقابلہ میں صفت آ رہا ہو، لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور محمد غوری کے پہلے حملہ کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ اس وقت اگر راجپوتی قبائل یکدل ہو کر ہندوستان کی برائیت پر آمادہ ہو جاتے تو شاید محمد غوری کو دور بارہ حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوتی، لیکن چونکہ قدرت کو یہاں کی تاریخ کا ورق اُلٹنا تھا اس لئے محمد غوری اپنے دوسرے حملہ میں بمقام تھانیسرا کامیاب ہو گیا اور پرتھوی راج مارا گیا۔ چونکہ محمد غوری کو اور ہمیں بھی سر کرنا تھیں، اس لئے وہ اپنے غلام قطب الدین ایبک کو یہاں کا حاکم مقرر کر کے واپس چلا گیا اور جب سنہ ۱۲۰۲ء میں محمد غوری کا انتقال ہوا تو ایبک نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اس طرح سب سے پہلے شمالی ہند میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی جس کا پایہ تخت دہلی تھا اور یہ سلسلہ برابر ساڑھے چھ سو سال تک قائم رہا اور خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ثانی کے مقید ہونے کے بعد سنہ ۱۸۵۷ء میں جا کر ختم ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی اس طویل حکومت کی تاریخ کو بہت مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ مسلمانوں نے دہلی کی خدمت میں ہمیشہ نمایاں حصہ لیا اور قوم و ملت کا امتیاز کبھی ان کے پیش نظر نہیں رہا۔ قطب الدین ایبک بڑا علم و درایت کا شخص تھا اور دہلی اسی کے زمانہ میں علم و ادب کا مرکز بن گئی تھی وہ علم و فضل کا اتنا بڑا قد و شناس تھا اور اس نے علماء و فضلاء، شعراء و ادبا کی داد و دہش میں اتنی بیدریغ دولت صرف کی کہ اس کا نام ہی ”لکشمی“ پڑ گیا۔ اس کے بعد جب شمس الدین التمش کا زمانہ آیا تو دلی کی علمی و ادبی مرکزیت میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا، کیونکہ اس وقت بہت سے ادیب و شاعر جنگیں غازی غزنہ سے جان بچا کر دہلی آئے تھے۔ اس وقت دہلی کی اس علمی مرکزیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قاضی حمید الدین ناگوری، علامہ دکن

عالم جمال الدین ابے زبردست عالم اور امیر روحانی ایسے زبردست شاعر دہلی میں موجود تھے اور علم و فضل کا دنیا پر چاہاں ہو گیا تھا اگر آؤ امتش کو ایک بہت بڑی درگاہ تعمیر کرنا پڑی جہاں دور دور سے طلبہ آتے تھے اور ان کو تعلیمی وظائف دئے جاتے تھے۔ امتش کی فزادہ عالم تھا کہ اس نے اپنے سکول پر ناگری رسم خط میں بھی اپنا نام لکھوایا اور شیو کے پیل کی تصویر بھی ان پر نقش کرائی۔

اس کے بعد جب غیاث الدین بہن کا عہد شروع ہوا تو دہلی کی علمی و ادبی مرکزیت اور زیادہ مستحکم ہو گئی۔ چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے کہ ”دنیا کے منتخب اہل فضل و کمال اور مہر مند اتنی تعداد میں یہاں جمع ہو گئے تھے کہ اس کی نظیر کہیں اور ملنا ممکن نہیں۔“

بہن کا دربار علماء و فضلا کا مرکز تھا اور اباب فضل و کمال ہر وقت اس کے پاس جمع رہتے تھے۔ شاعروں میں امیر خسرو، خواجہ اور صوفیہ کرام میں شیخ عثمان، شیخ صدر الدین، شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی ایسے اولیاء کرام اسی کے دربار سے وابستہ تھے اور اہل دہلی اور مستفید ہوتے تھے۔

اس کے بعد جب غلیوں کا دور آیا اور جلال الدین فیروز شاہ نے نئی دہلی کی بنیاد قائم کی تو اس کی علمی و ادبی مرکزیت میں اور ہو گیا۔ چنانچہ امیر خسرو، تاج الدین عراقی، خواجہ حسن، مویہ جاجری، امیر اسلم کلجی ایسے اکابر علم و ادب اسی عہد کے درخشندہ جواہر جن کے علم و فضل کے سرچشموں سے دلی سیراب ہو رہی تھی۔ فیروز شاہ کی ادب نوازی کا یہ عالم تھا کہ جب جلال الدین نائب رمانے ہجو میں ایک مثنوی غلجی نامہ کے نام سے لکھی اور وہ اس مجرم کی پاداش میں پابہ جلاں سامنے لایا گیا تو فیروز شاہ نے سزا دینے کی بجائے اس میں ایک گاؤں کا اضافہ اور کر دیا۔

فیروز شاہ کے عہد علاؤ الدین غلجی کا عہد علمی و ادبی ترقی کے لحاظ سے اور زیادہ درخشاں عہد ثابت ہوا۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ: ”جتنے ماہرین فن، بزرگان دین، علماء کرام اور شعرا و عظام اس عہد میں یہاں جمع ہو گئے وہ کسی اور عہد کو نصیب نہیں ہوئے۔“

صوفیہ کرام و علماء عظام میں شیخ نظام الدین اولیاء، شیخ علاؤ الدین صابر، شیخ رکن الدین، شیخ صدر الدین، شیخ نسیم و اس شیخ حمید الدین ملتانی۔ فن قرأت کے ماہرین میں مولانا ناشاطی، مولانا کریم، مولانا شہاب الدین اور طبقہ مشعرا میں صدر الدین علی، فخر الدین، مولانا عارف، شہاب الدین اور امیر خسرو وغیرہ اسی دربار سے وابستہ تھے۔ اسی طرح دوسرے علوم و فنون کے بھی سیکرٹ اس وقت دلی میں موجود تھے جن سے یہاں کے عوام مستفید ہوتے رہتے تھے۔

غلجیوں کے بعد تغلق دور میں سلطان فیروز شاہ کا عہد بڑا زبردست دور اصلاح و ترقی تھا اور علم و ہنر کے چہرے دلی کے ایم ذرہ سے اہل رہتے تھے۔ اس کے عہد میں تیس صد سے قائم ہوئے جن میں سے ایک فتح خاں کے مقبرہ کے پاس تھا جسے قدم شریف کہتے ہیں اور لاہوری دروازہ سے ڈیڑھ میل جانب جنوب واقع تھا، دوسرا مدرسہ فیروز آباد میں تھا جہاں سیکرٹوں علماء اور ہزاروں طلبہ تعلیم و تعام مصروف رہتے تھے جن کو ۳۶ لاکھ تنگہ سالانہ وظائف کی صورت میں دیا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ مصنفین و مؤلفین کی بھی ایک بڑی جماعت ہر وقت تصنیف و تالیف میں مصروف رہتی تھی۔

مولانا جلال الدین مدرسہ کے پرنسپل، مولانا عالم مصنف فتاویٰ تاتارخانی، مولانا خواجہ جلی، مولانا احمد تھانوی وغیرہ سیکرٹ اکابر علم و فضل اسی شعبہ تصنیف و تالیف سے تعلق رکھتے تھے۔

فیروز شاہ کی علم دوستی کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب اس نے ٹکڑے ٹکڑے کیا تو دہان کے مندر سے اسے ۱۳۰۰ قلم کی مین اور اس نے انتخاب کر کے متعدد کتابوں کا ترجمہ فارسی میں لایا۔

فیروز شاہ، تغلق خاندان کا آخری بااقتبال فرزند تھا جس کے بعد حکومت و سلطنت میں گمراہی پیدا ہونے لگی اور امن و علوم و فنون کی ترقی کے لئے ضروری ہے، درہم برہم ہو گیا۔

تعلق خاندان کے بعد سید خاندان کی حکومت تقریباً ۴۰ سال تک رہی، لیکن غیر مطمئن حالت میں، کیونکہ تیسویں تاخت کے باوجود آگے بڑھنے کے لیے آگے تھے اور اسی کے ساتھ اندر دینی اطمینان و سکون بھی ختم ہوتا جا رہا تھا۔

جب ۱۷۷۷ء میں بہاول لودی نے سید خاندان کے آخری حکمران کو مقید کر کے دلی پر قبضہ کیا تو حکومت صرف شہر دلی تک محدود تھی۔ اس نے اپنے ۳۸ سال کے دور حکومت میں نہ صرف یہ کہا کہ باغیوں اور سرکشوں کو زیر کر کے حکومت کو وسیع کر لیا بلکہ دلی کی علمی و ادبی مرکزیت باقی رکھنے کے لئے متعدد مدارس قائم کئے۔ اس کے بعد جب سکندر لودی تخت نشین ہوا تو اس نے بھی اہل فضل و کمال قدر شناسی میں کوئی کمی نہ کی اور اس کا دربار علما و فضلا کا مرکز بن گیا۔ چنانچہ مولانا شیخ عہد اللہ، شیخ عزیز اللہ اور شیخ احمد دہلوی وغیرہ عہد کے اکابر علم و ادب میں سے تھے۔

سکندر لودی کے عہد میں تصانیف بھی بہ کثرت ہوئیں، چنانچہ سنسکرت کی نہایت مشہور فن طلب کی کتاب "ارکھیا ویدک" کا یہ بھی طلب سکندر لودی کے نام سے اسی زمانہ میں ہوا اور متعدد فنی و صنعتی کارخانے بھی اسی عہد میں قائم ہوئے۔ لودیوں کے عہد مغلوں کا عہد شروع ہوا جس کی بنیاد تیسویں دہائی اور آگے اس پر ایک مستحکم تعمیر قائم کی۔ اگر کابائے حقیت رہے، اور جہانگیر زیادہ تر لاہور رہتا تھا اس لئے اس زمانہ میں دہلی کی اہمیت کم ہو گئی، لیکن جب شاہجہاں نے پھر دلی کو اپنا تخت بنایا تو پھر اس کا عروج شروع ہوا۔

عہد مغلیہ میں نسبت علم کے ادب کو زیادہ ترقی ہوئی جس کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ فارسی زبان سے ہٹ کر زیادہ تر زبان کو سامنے رکھا گیا اور اس طرح ہندو مسلمانوں میں لسانی اخوت و اتحاد پیدا ہونے لگا، چنانچہ عہد اکبری میں اگر ایک طرف راجہ رنل اور راجہ مان سنگھ فارسی کی مہارت رکھتے تھے تو دوسری طرف خانقاہوں ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔

عہد مغلیہ میں فارسی شعرا کی جتنی قدر کی گئی اس کا حال سب کو معلوم ہے، لیکن شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ہندی شاعری کی شناسی بھی کم نہیں کی گئی۔ اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ مغل بادشاہوں کی سرپرستی ہی کی وجہ سے ہندی لٹریچر نے ترقی کی طرف قدم اٹھایا۔ تلسی داس، سور داس، گنگا پرشاد، کران، زہری سہاسے وغیرہ متعدد ہندی شعراء دربار اکبری سے وابستہ تھے۔ ان کی قدر دانی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار خانقاہوں نے گنگا پرشاد کو جو گنگا کوئی کے نام سے مشہور تھا صرف ایک دوہہ پر ۳۶ لاکھ پیہ انعام دیا۔

عہد اکبری سے قبل ہندی شاعری فن کے لحاظ سے غیر مروجہ حالت میں تھی اور عروض وغیرہ سے بے نیاز تھی، لیکن لکبر کے زمانہ میں اس کا یہ نقص بھی دور ہو گیا اور متعدد دکن میں اس فن پر کھلی گئیں۔

عہد اکبری میں جو صورت ہندی لٹریچر کی ترقی کی قائم ہو گئی تھی وہ آگے کے بعد بھی باقی رہی، اور جہانگیر و شاہجہاں نے ہندی شاعری قدر دانی میں نمایاں حصہ لیا۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب نے بھی جسے شعر و شاعری سے زیادہ لگاؤ نہ تھا، اور اس کے بعد بہادر شاہ کے عہد تک تمام مغل بادشاہوں نے ہندی شعرا کی بڑی قدر کی، جن کی فہرست بہت طویل ہے۔

ہر چند اورنگ زیب کے بعد بہادر شاہ ظفر تک ۵۰ سال کا زمانہ مغل حکومت کے زوال کا زمانہ تھا اور دلی کی وہ علمی و ادبی موسمیات باقی نہ رہی تھیں جو غلیبوں اور تغلقوں کے زمانہ میں پائی جاتی تھیں، تاہم ادبی سرگرمیاں برصغور جاری رہیں اور چند شاہجہاں، زمانہ میں اردو کی بنیاد پر مبنی تھی اور اس میں بہت سے الفاظ برج بھاشا کے استعمال ہوتے تھے، اس لئے وہ قدر دانیوں جو ہندی ماعروں کی کی جاتی تھیں ان میں اب اردو زبان کی شاعری بھی شریک ہو گئی۔

در بارہ شاعری کا رواج اس سے پہلے دکن میں ہو چکا تھا لیکن دلی میں اس کا تعارف سب سے پہلے دلی دکنی کے ذریعہ ہوا۔ بہادر شاہ دلی کے زمانہ میں یہاں آئے تھے۔ اس کے بعد شاہ عالم کے زمانہ سے دلی نے پھر ادبی مرکز کی حیثیت اختیار کر لی لیکن اس کا

تعلق زیادہ تر شعرو شاعری سے تھا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب شاہ مبارک آباد، شاہ عالم، سہو، قدو، تیر، سوز، میرزا مظہر، قائم اور افسوس ایسے اساتذہ شعرو ادب پیدا ہوئے اور انھوں نے بہت تھوڑے زمانہ میں اردو شاعری کو ایک فرض منزل تک پہنچا دیا۔

سراج الدین بہادر شاہ ظفر کا زمانہ اردو شاعری کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ ظفر کو اوایل عمر ہی میں شاعری سے بڑی دلچسپی تھی اور حکیم ثناء اللہ فراق، قدمت اللہ قاسم، میر تقی الدین منت وغیرہ کو قلعہ کے مشاعروں میں دعوت دی جاتی تھی۔ جب ظفر حرکت میں آئے تو وہ ذوق اور عام ہو گیا اور دلی اردو ادب کا مرکز بن گئی۔ ہر چند بعض اساتذہ مثلاً تیر، مصطفیٰ، انشاؤ وغیرہ لکھنؤ چلے گئے تھے لیکن شاہ نصیر، ذوق، مومن، غالب اور ان کے بہت سے شاگرد اب بھی یہیں موجود تھے اور ان کی وجہ سے یہاں کے ادبی مجالس اور محافل شعرو سخن کی رونق بدستور قائم رہی۔

شعرا کے علاوہ شاہ عالم سے لیکر چند ظفر تک دلی نے بعض اکابر علم و ادب بھی ایسے پیدا کئے جن کے نقوش کبھی فنا نہیں ہو سکتے مثلاً شیخ عبدالحق محدث دہلوی جن کی ذات سے ہندوستان میں اشاعت حدیث عام ہوئی۔ مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی کی بصیرت یکسر اجتہاد نہ رہی رکعت تھی، مولانا سید اسماعیل شہید جو علم و فضل اور جوش عمل میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے، مولانا شاہ رفیع الدین، مولانا شاہ عبدالعزیز جو علوم فقہ و علوم قرآنی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ یہ وہ مقدس ہستیاں تھیں جن کی عظیم علمی خدمات کو زمانہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

بہادر شاہ ظفر کے عہد میں بعض اور اکابر علم و ادب بھی پیدا ہوئے جن سے ہماری موجودہ نسل واقف ہے اور جن کے کارناموں سے ہم اب تک مستفید ہو رہے ہیں۔ مثلاً محمد حسین آزاد، مولانا حالی، سر سید، ڈپٹی نذیر احمد، ذکا و اللہ خاں وغیرہ لیکن یہ حضرات دلی کے بزم ادب کے آخری چراغ تھے جن کے گل ہونے کے بعد دلی پر تاریکی چھا گئی اور وہ بساط علم و ادب جو ساڑھے چھ سو سال قبل یہاں بکھائی گئی تھی ہمیشہ کے لئے اٹک دی گئی۔

(آل انڈیا ریڈیو)

## گلابائے جعفری

یعنی

جناب اثر لکھنوی کے ڈیڑھ سو اشعار

جو ڈیڑھ ٹکڑے اپنے تعارفی مقدمہ کے ساتھ بہت اہتمام سے شائع کئے تھے اس کی چند جلدیں اتفاق سے رہ گئی ہیں۔ ان کے ٹکٹ ملنے پر انتخاب ذریعہ پوسٹ مل سکتا ہے۔

## فلسفہ مذہب

مولوی مقبول احمد صاحب کی وہ ہنگامہ خیز تصنیف جس نے علماء اسلام کی "کافر ساز" مجالس میں ہلچل ڈال دی تھی اس میں مذہب کی ابتدا و ضرورت، مذہب، قومیت، قومیت و اہلیات، مذہب و نبوت، مذہب و حکومت، مذہب و معاد، مذہب و تقریر، مذہب و اخلاق، مذہب و عبادات اور انجام مذاہب پر نہایت محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت تین روپیہ

## توقیت

تاریخ اسلامی ہند کے سلسلہ میں ڈیڑھ ٹکڑے یہ توقیت مرتب کی تھی جس میں اسلام کے ترقی و ترقی کے تمام اہم تاریخی واقعات عقیدہ ہجری یکجا کردئے گئے ہیں۔ تاریخ کے طلب کے لئے بڑی کارآمد چیز ہے قیمت عدد

## ملک خطا کے شہزائے

دسی احمد بکرامی کا وہ مشہور مقالہ جس میں انھوں نے اپنے مخصوص انداز بیان میں مسئلہ خمریہ مولانا شبلی مرحوم کی تحریروں پر اعتراض کیا تھا اور ڈیڑھ ٹکڑے اس بدترہ کیا تھا قیمت ۱۲

## جایزہ

ساتھی جاوید - بی۔ اے

نقشِ اسے ژند بھی دھندلے خطِ انجیل بھی  
لا درِ ریحان و گل کی مسندوں پر بھی دھواں  
کو ریا بھی آتشیں سیلاب میں سو ڈان بھی  
سلگ سلگ ساتھ دھکا دھکا سا ادب  
یہ جہالت کی سیاہی یہ سیاست کا دھواں  
جم نہیں سکتے زمین پر آفتابوں کے قدم  
ارتقاء علم و ادراک و خرد کے باوجود  
ہر طون خونیں لہو لے ہر طون نارِ جہیم  
خونچکاں نیزوں کی نوکیں خونچکاں تیغوں کے خم  
یہ مسلسل شب کہ جس کی ہو نہیں سکتی سحر  
معبودوں کے یہ درندے ہیکلوں کے یہ وحوش  
یہ قیامت ہے قیامت پر مرا ایمان ہے  
زلزلوں پر زلزلے طوفاں پہ طوفاں آئیں گے  
ایک، خونیں آگ بھڑکے گی جہاں جل جائے گا  
ظلمتِ آلودہ یہ ماتھے خوں آلودہ یہ ہاتھ  
یہ دعائیں یہ عقیدے کام آسکتے نہیں  
غفلتِ یزداں کو تم یوں دے نہیں سکتے فریب  
رگزارِ رز و شب کی ٹھوکریں کھاؤ گے تم  
ہر رگ ہستی سے فاسد خوں نکالا جائے گا  
سر پہنہ میری و شاہی کے نکلیں گے جلوس  
وقت گی خوں رنگ تیغیں جب ادھر مڑ جائیں گی  
قیصر و تیمور و نادر کے بہت سکے چلے  
برق گر نے ہی کو ہے اب آگ جلنے ہی کو ہے  
شہرِ یاری سینہ گیتی کا اک ناصور ہے  
مصر کے شاہی محل خوں رنگ طغیانی میں ہیں  
خیر خواہ دستِ شاہی صرغ کا سر ہے ابھی  
صبح سے پہلے ہی پہلے ایک طوفاں دیکھنا  
اے جلالِ نادری کچھ دیر میں باقی ہے تو

صبح کی مشعل بھی ٹھنڈی شام کی قندیل بھی  
طوقش و الجیریا کی سرحدوں پر بھی دھواں  
کو نفشاں ہے دہریں تہذیب بھی ایمان بھی  
جانے کس منزل پہ ہے یہ کاروانِ رز و شب  
سائنس بھی لینے کو ڈرتے ہیں نجوم و کہکشاں  
معبود و دیرو کلیسا کے چراغوں کی قسم  
بخت گیتی میں اندھرا قسمت انساں میں دود  
سرحد کشن کو اب چھو بھی نہیں سکتی نسیم  
کھل نہیں سکتیں زبانیں چل نہیں سکتے قلم  
آدمی کس مجبور تار یک میں ہے کیا خبر  
اسے چراغ و مٹ نہیں سکتے کبھی شب کے نقوش  
یہ سیاہی یہ ہو سب سے بڑی پہچان ہے  
جادوئوں کی زد میں آکر رز و شب رک جائیں گے  
یہ دکھتا سرنخِ سیارہ کہیں ٹکرائے گا  
دے نہیں سکتے اسلئے امتحاں گا ہوں میں ساتھ  
رحمتوں کے یہ قصیدے کام آسکتے نہیں  
ارتقاعِ عقل سے دیکھو یہ ذہنوں کے نشیب  
وقت کے شہتیر سے بچ کر کہاں جاؤ گے تم  
ہر جہاں پر ابھی تیزاب ڈالا جائے گا  
بے حنا ہو جائے گا اسے حسن ہر دستِ عروس  
جانے کتنے ہٹکروں کی گردنیں اڑ جائیں گی  
وقت کاٹے گا اسی مقتل میں اب انکے گلے  
شہرِ یاری کا جنازہ اب نکلنے کو ہی ہے  
وقت اپنے حکم کی تعمیل پر مجبور ہے  
اپنے جابر بادشاہ کی داستانِ خوانی میں ہیں  
وقت ایسے جابروں کے خوں کا پیاسا ہے ابھی  
جل اٹھیں گے یک بہ یک یہ قصر و ایوان دیکھنا  
صورتِ شمع سحر یک دو نفس باقی ہے تو

# مشکلاتِ غالب

## غزل (۴)

۳۔ میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارگاہ میری آہ آتشیں سے بالِ غنقا جل گیا  
جب میں حالتِ عدم میں تھا تو اس وقت میری آتشِ نفسی کا یہ عالم تھا کہ میری آہ سے غنقا کے پر جل جاتے تھے۔  
(غنقا ایک فرضی طاہر ہے)، لیکن اب تو میں دُنیا سے عدم سے بھی بہت دور آگئے نکل گیا ہوں، اس لئے اب اس عالم کا  
ذکر نہ کرو جسے میں چھوڑ چکا ہوں۔  
مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ مرتبہ ”فنائیت“ نام صرف معدوم ہو جانے کا نہیں بلکہ اس سے بھی آگے گزر جانے کا ہے صوفیہ  
کے یہاں درجہ ”ترک ترک“ بھی قریب قریب یہی مفہوم رکھتا ہے۔

۴۔ عرض کیجئے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرانِ جلا  
اندیشہ بمعنی فکر و خیال استعمال کیا گیا ہے۔ مدعا یہ کہ میں اپنے فکر و خیال کی گرمی کا حال کہا بیان کروں۔ اس کی حرارت  
کا تو یہ عالم ہے کہ میں نے صحرانِ محض تصور ہی کیا تھا کہ اس میں آگ لگ گئی۔ مبالغہ ہے لیکن بہت گوارا۔

## غزل (۵)

۱۔ شوق، ہر رنگ، رقیبِ سرو سامان نکلا قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا  
ہر رنگ یعنی ہر رنگ، ہر طرح۔ شوق بمعنی عشق استعمال کیا گیا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ عشق خواہ کسی رنگ میں سامنے  
آئے وہ ساز و سامان سے معرِ نظر آئے گا، حد یہ ہے کہ جب قیس (مجنون) کی تصویر کھینچی جاتی تھی تو وہ بھی عریاں و برہنہ (ساز و  
سامان سے بے نیاز) کھینچی جاتی ہے۔

۲۔ زخم نے داؤ نہ دی تنگی دل کی یارب تیر بھی سینہ بسمل سے پر افشاں نکلا  
”تنگی دل“ کے اظہار میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ یعنی میری تنگی دل (رنج و ملال) کا یہ عالم ہے کہ تیر بھی اس کے  
اندر سے نکلا تو اپنے پروں سمیت نہ نکل سکا اور انھیں دل ہی میں چھوڑ گیا۔ حالانکہ میں چاہتا تھا کہ تیر تنگی دل کی داد دیتا اور  
زخم کو وسیع کر دیتا۔ مدعا یہ کہ میں ایسا دل تنگ (رنجیدہ و ملول) ہوں کہ محبوب کا تیر کھانے کے بعد بھی میری دل تنگی نہیں باقی  
محض لفظ تنگی پر اس شعر کی بنیاد قائم ہے، اگر اس کو نکال دیجئے تو شعر بے معنی ہو جائے۔

دل حسرت زدہ تھا ایدہ لذت درد' کام یاروں کا بقدر لب و دندان نکلا،  
 نایدہ = دسترخوان - "بقدر لب و دندان" یعنی محض اس حد تک کہ صرف لب و دندان لذت حاصل کر سکیں۔  
 مدعا یہ ظاہر کرتا ہے کہ میرا دل حسرت زدہ تو لذت درد کا ایک گھلا ہوا وسیع دسترخوان تھا جس سے کافی لذت درد حاصل  
 جاسکتی تھی، لیکن لوگوں نے اس سے صرف بقدر لب و دندان (یعنی بہت کم) فائدہ اٹھایا۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے مقصود یہ ظاہر  
 رہا ہو کہ میرے کلام کو جس نظر غایب سے دیکھنا چاہئے تھا لوگوں نے نہیں دیکھا اور اس کے محاسن کو پوری طرح نہیں سمجھا۔

۵۔ اسے نو آموز فنا ہمت دشوار پسند سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا  
 "ہمت دشوار پسند" سے خطاب ہے، لیکن کیسی ہمت دشوار پسند جو نو آموز فنا بھی ہے۔ "ہمت دشوار پسند" سے مراد وہ  
 ست و حوصلہ ہے جو دشواریوں سے گزرنا پسند کرے۔ نو آموز فنا = یعنی فنا کی منزل کا تجربہ نہ رکھ کر اول اول اس سے  
 زرنے والا۔

غالب اپنی ہمت دشوار پسند کو جو نو آموز بھی ہے خطاب کر کے کہتا ہے کہ تو بآد جو نو آموز ہونے کے اپنی دشوار پسندیوں  
 بدولت منزل فنا کی دشواریوں سے بھی بے آسانی گزر گئی، اب بتا میں کروں اور تیرے لئے فنا سے زیادہ اور کونسی مشکل منزل  
 ہونڈھ سکا لوں کہ تیری دشوار پسندی کے حوصلے پورے ہوں۔

۶۔ دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا، سوطوں نکلا  
 لفظ "پھر" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی گریہ کیا گیا تھا، لیکن کوئی قطرہ اشک دل میں رہ گیا تھا اور اب اس  
 لرہ نے ایسا زور باندھا کہ طوفان بپا کر دیا۔

## غزل (۶)

۱۔ دھکی میں مر گیا جو بابِ نبرد بخت عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد بخت  
 بابِ نبرد = مقابلہ کرنے کا اہل۔ نبرد پیشہ = جنگ و مقابلہ کا شائق مدعا یہ ظاہر کرتا ہے کہ میدانِ محبت میں انھیں  
 لڑوں کو آنا چاہئے جو سختیاں برداشت کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ جو اس کے اہل نہیں ابتدائی دشواریوں ہی میں ہمت ہار جاتے ہیں  
 لاصحہ یہ کہ عشق کرنا ہر شخص کا کام نہیں اس کے لئے بڑا کلیجہ چاہئے۔

۱۔ تھا زندگی میں مرگ کا گھٹکا لگا ہوا اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا  
 زندگی میں بھی ہر وقت موت کے گھٹکے سے میرا رنگ زرد رہتا تھا۔ یعنی کار و احوال میں مجھے کبھی خوشی حاصل نہیں  
 ہوئی کیونکہ میں سمجھتا تھا یہ تمام اسباب زندگی فنا ہونے والے ہیں اور جس چیز کو بقا نہ ہو اس پر خوش ہونا کیا؟

۲۔ تالیفِ نثر لے دے وفا کر رہا تھا میں مجموعہ خیالی، ابھی فرد فرود تھا  
 فرد فرود = منتشر، بے رابطہ۔ یعنی اس وقت بھی جب محبت کے متعلق میرے خیالات اوراق پر نیاں کی جھلکت رکتے تھے اور

میں اس کی حقیقت سے پوری طرح آشنا تھا، پس جذبہ دفا کا قایل تھا، اس لئے اب کہیں اس ابتدائی منزل سے گزرجیا ہوں، میری دفا دلی اور خوں سے تسلیم و رضا کی جنگی لاکیا کہنا۔

## غزل (۷)

۱- شہار بسمہ، مرغوب پیشہ مشکل پسند آیا تماشائے بیک کف جردن صد دل پسند آیا  
بسمہ = تسبیح کو کہتے ہیں جس میں عموماً سودا لے ہوتے ہیں۔ میرے محبوب کو تسبیح ہاتھ میں لے رہنا اس لئے پسند آتا ہے کہ اس طرح گویا ایک ہی وقت میں سودا اڑانے کا سماں اُس کے سامنے آجاتا ہے۔ غیر دلچسپ خیال آرائی کے سوا اس شعر میں کچھ نہیں۔

۲- فیض بیدنی، نامیدی جاوید آساں ہے کشائش کو ہمارا عقدہ مشکل پسند آیا  
فیض بیدنی = حسرت و مایوسی کے بدولت۔ نامیدی جاوید = ہمیشہ کی ناکامی۔ ہماری زندگی بڑا عقدہ مشکل تھی، لیکن ہماری مایوسی نے زندگی کی تمام ناکامیوں کو آسانی سے جھیل کر اس گتھی کو آسانی سے سلجھا دیا اور کشائش کو ہمارا عقدہ مشکل ہی لئے پسند آیا کہ اس عقدہ کے حل کرنے میں اسے کسی کاوش سے کام لینا نہیں پڑا اور خود ہماری فطرت ہی نے اس کو حل کر لیا۔

۳- ہوئے سیر گل آئینہ بے جہری متاقل کہ اندازِ بخون غلطیدن بسمل پسند آیا  
متاقل کا سیر گل کی خواہش کرنا، اس کی بے جہری کا ثبوت ہے کیونکہ اس سیر سے اس کو محض اس لئے دلچسپی ہے کہ جب وہ پھول کو دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ کوئی بسمل اپنے خون میں لوٹ رہا ہے۔

۴- جراحتِ تحفہ، الماسِ افرواں، داغِ جگریدہ مبارکبادِ اسدِ غمخوارِ جانِ درد مند آیا  
تحفہ، افرواں اور ہدیہ کا ایک مفہوم ہے۔  
”غمخوارِ جانِ درد مند“ سے مراد محبوب ہے۔ مدعا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسے اسدِ مبارک ہو کہ تمہارا محبوب جو تمہاری غمخواری کے لئے آیا ہے وہ اپنے ساتھ جراحت، الماس اور داغِ جگر کے وہ تحفے بھی لایا ہے جو تمہیں بہت مرغوب ہیں۔ یعنی وہ آیا تو تھا غمخواری کے لئے لیکن پہلے سے زیادہ اسبابِ درد مندی دے گیا۔  
اگر غمخوار سے مراد ناقص ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کی نصیحتوں سے میری درد مندیاں اور بڑھ گئیں۔

## غزل (۸)

۲- سبزہ خط سے ترا کا کل کر کشش نہ دبا یہ زرد بھی حریفِ دمِ افسی نہ ہوا  
سبزہ خط کو زرد سے تشبیہ دی ہے اور کا کل کو افسی سے، یعنی تیرا سبزہ خط نمودار ہونے کے بعد بھی تیرے کا کل کی زہر افشائیاں کم نہ ہوئیں۔ مشہور ہے کہ زرد کے سامنے بیکار اور اندھا ہو جاتا ہے۔ لیکن کا کل کا افسی اتنا سخت افسی ہے کہ تیرے زرد خط کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ مدعا یہ کہ سبزہ خط بچنے کے بعد بھی تیری زلف و کا کل کے حسن کا عالم وہی ہے۔

(۷) مر گیا صدمہ یک جنبش لب سے غالب ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا  
اس شعر میں غالب نے اپنی انتہائی ناتوانی کا اظہار کیا ہے۔ کہتا ہے کہ محبوب عیسیٰ نفس میرے اندر نئی زندگی چھوٹنے آیا تھا  
لیکن یہاں ناتوانی کا یہ عالم تھا کہ اس نے انسون زندگی پڑھنے کے لئے لبوں کو جنبش ہی دی تھی کہ میں اس جنبش کے صدمہ سے بچا۔  
مدعا یہ کہ میرا حال دماغ دو اونوں سے گزر گیا تھا اور کوئی صورت میری جانبری کی باقی نہ رہی تھی۔

## غزل (۹)

۱- ستائشگر۔ ہے زاہد اس قدر جس باغ رضوان کا وہ ایک گلدستہ ہے ہم بخودوں کے طاق نسیاں  
اس شعر میں زاہد کے تصور جنت پر طنز کیا گیا ہے کہ زاہد جس چیز کو جنت سے تعبیر کرتا ہے وہ ہماری نظر میں ایک گلدستہ سے زیادہ  
نہیں اور گلدستہ بھی وہ جسے ہم طاق نسیاں کے سپرد کر چکے ہیں اور جس کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔  
مدعا یہ کہ ہماری منزل عمل طبع جنت سے بہت بلند ہے اور ہمارا فلسفہ زندگی یہ نہیں کہ کسی لالچ یا غرض سے کوئی اچھا کام کریں۔

۲- بیاں کیا کیجے بیداد کا و شہائے مژگان کا کہ ہر یک قطرہ خون دانہ ہے تسبیح مرجان کا  
مژگان باری کی کاوش ستم کا حال کہا بیان کیا جائے جبکہ اس نے ہمارے ہر قطرہ خون کو تسبیح مرجان کا دانہ بنا کر رکھ دیا ہے  
(مرجان سرنج ہوتا ہے)  
اس میں لفظ کاوش سے فائدہ اٹھا کر قطرہ خون کو دانہ تسبیح ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ تسبیح کے دانے بھی سوراخ کر کے بنائے جاتے ہیں  
یہ شعر بھی محض الفاظ کا کھیل ہے اور آگوار ندرت بیان کے سوا کچھ نہیں۔

۳- نہ آئی سطوت قاتل بھی مانع سب نالوں کی لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا  
سطوت = رعب - دانتوں میں تنکا لینا، اظہار عجز و خرو باگی کو کہتے ہیں۔  
میں قاتل کے سامنے اظہار عجز کے طور پر دانتوں میں تنکا لیا کر گیا، لیکن ہوا یہ کہ تنکا ریشہ نیستاں بن گیا یعنی بالہری کی طرح  
اس سے نالے پیدا ہونے لگے اور قاتل کا رعب بھی مجھے اس سے باز نہ رکھ سکا۔

۶- مری تعمیر میں مضمحلے اک صورت خرابی کی ہیوئی برق خرمین کا ہے خون گرم، دہقان کا  
مضمحل = پوشیدہ - ہیوئی = اصل مادہ - خون گرم = محنت - میں اپنی تباہی کا گلدکس سے کروں جبکہ خود  
میری ساخت و تعمیر میں خرابی کی صورت پوشیدہ ہے جس طرح دہقان کہ اگر وہ محنت کرے خرمین جمع نہ کرے تو کیوں بجلی گرے یعنی  
جس طرح کسان کی محنت بجلی پیدا ہونے کا سبب ہے اسی طرح خود میرا دھرمیری تباہی کا باعث ہے۔

۱۲- نظر میں ہے ہماری جادہ راہ فنا غالب کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزاء پریشاں کا  
جادہ، اس لکیر یا نشان کو کہتے ہیں جو راہگیروں کے نقش قدم سے راستہ میں پیدا ہو جاتا ہے۔ شیرازہ اس تاگہ کو کہتے ہیں  
جس سے کسی کتاب کے اوراق کو یکجا ہسلک کر دیا جاتا ہے۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہماری نگاہ میں اصل چیز راہ فنا کا جادہ ہے کیونکہ

آخر کار اسی سے شیرازہ عالم کے تمام اجزاء پریشاں منسلک ہو جاتے ہیں۔ یعنی زندگی محض پریشانی و آشفستگی و اختلافات کا نام ہے اور مرتے دم تک ان سے مفر نہیں۔ لیکن مرنے کے بعد یہ سب الجھنیں ختم ہو جاتی ہیں اور عالم کے تمام اجزاء پریشاں ایک ہو جاتے ہیں، جادہ اور شیرازہ میں فی الجملہ ظاہری مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔

## غزل (۱۲)

۱۔ محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا  
محرم = آشنا، واقف - نوا ہائے راز = عالم غیب کی صدا میں - اس شعر کی بنیاد لفظ حجاب پر قائم ہے جس کے معنی پردہ کے بھی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ علائق دنیا کے حجابات حقیقت کے سمجھنے سے انسان کو باز رکھتے ہیں، لیکن غالب کہتا ہے کہ یہ سب غلط ہے، اگر انسان کے کان، نوا ہائے راز اور عالم غیب کی صدا سے آشنا ہوں تو یہ حجابات بھی پردہ ساز کا کام دینے لگیں اور ان سے سردی نئے پیدا ہونے لگیں۔

۲۔ رنگ شکستہ صبح بہارِ نظارہ ہے یہ دقت ہے شگفتگی گلابائے ناز کا  
رنگ شکستہ = اڑا ہوا رنگ - جب چہرہ کا رنگ اڑتا ہے تو اس میں سفیدی سی جھلک آتی ہے اور اسی لئے رنگ شکستہ کو صبح سے تشبیہ دی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ میرے اڑے ہوئے رنگ کا نظارہ معشوق کے لئے گویا صبح کا نظارہ ہے جب عام طور پر پھول کھلتے ہیں، اس لئے میری رنگ شکستہ کی صبح کو دیکھ کر، محبوب کے گلابائے ناز کو بھی کھلنا چاہئے، یعنی میری شکستگی رنگ کو لطف محبوب کا باعث ہونا چاہئے۔

۵۔ ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے ہر گوشہ بساط ہے سر شیشہ باز کا  
شیشہ باز = وہ شعبہ باز جو سر پر شیشہ رکھ کر قص کرے، مفہوم یہ ہے کہ شیشہ جس میں شراب بھری ہے، جوشِ بادہ سے اچھل رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بساط سے خانہ کا ہر گوشہ گوشہ شیشہ باز کا سر ہے جس پر شیشہ اچھل رہا ہے۔  
شعر لطف سے خالی ہے اور تعبیر و استعارہ کے لحاظ سے بھی قابلِ تعریف نہیں۔

## غزل (۱۳)

۳۔ گرجے ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھلاؤں فریب آستین میں دشنہ پتہاں ہاتھ میں نشتر کھلا  
دیوانہ کی دیوانگی دور کرنے کے لئے نشتر سے قصد کھوئی جاتی ہے۔ غالب کہتا ہے کہ ہر چند میں دیوانہ ہوں اور دوست بظاہر ہاتھ میں نشتر لے کر آیا ہے تاکہ وہ قصد کھول کر میری دیوانگی دور کرے، لیکن میں اس فریب میں نہیں آسکتا، کیونکہ وہ آستین کے اندر دشنہ (خنجر) بھی چھپائے ہوئے ہے اور اس کا مقصد قصد لے کر میری دیوانگی دور کرنا نہیں بلکہ دشنہ سے مجھے ہلاک کر دینا ہے۔

۵۔ ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خباں خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

کہا جاتا ہے کہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے حسن عمل کی جزا میں بہشت کا دروازہ قبر میں کھل جاتا ہے۔ اس روایت کو سامنے رکھ کر غالب کہتا ہے کہ میں تو صرف خیال حسن یا رلیک گور میں گیا تھا پھر بھی خلد کا دروازہ کھل گیا۔ معلوم ہوتا ہے خیال حسن ہی میرا حسن عمل تھا جس کی جزا مجھے یہ ملی ہے۔ ایک لطیف سنی یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ خیال حسن ہی بجائے خود خلد آفریں ہے

(۸) کیوں اندھیری ہے شبِ غم۔ ہے بلاؤں کا نزول آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدہ اختر کھلا  
پہلے مصرعہ کا پہلا ٹکڑا سوال ہے کہ ”شبِ غم اتنی تاریک کیوں ہے“ خود ہی اس کا جواب دیتا ہے کہ شبِ غم میں آسمان سے بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور یہ تاشہ دیکھنے کے لئے دیدہ اختر اوپر ہی کی طرف مائل ہے اور تاریکی دور کرنے کے لئے زمین کا رخ نہیں کرتا۔ یہ شعر دو راز کا تفحیل کے سوا کچھ نہیں۔

(۹) کہا رہوں غربت میں خوش جب ہو حادث کا یہ حال نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ ہر اکثر کھلا  
کسی وقت دستور تھا کہ موت یا کسی حادثہ کی خبر جب کسی خط میں درج ہوتی تھی، تو اسے بند کرتے تھے بلکہ کھلا ہوا بھیجتے تھے، غالب نے اسی رسم کی طعن اشارہ کرتے ہوئے اپنے مصائب کا اظہار کیا ہے۔

## غزل (۱۳)

یہ غزل مسلسل ہے جس میں غالب نے ایک طرف اپنے عالمِ فراق کی بیباکی و اضطراب اور فرطِ گریہ و اشکباری کا حال ظاہر کیا ہے اور دوسری طرف محبوب کے عیش و نشاط اور استغناء کا!

(۱) شب کہ برقِ سوز دل زہرہ ابر آب تھا شعلہ جوالہ ہر یک حلقہ اگر داب تھا  
زہرہ ابر آب تھا = ابر کا پتہ پانی ہو گیا تھا۔  
رات میرے سوزِ دل کی برقِ پاشی کا یہ عالم تھا کہ ابر کا پتہ بھی پانی ہو گیا تھا اور اس میں جو سمندر پڑتے تھے وہ بھڑکتے ہوئے شعلے نظر آتے تھے۔ اس شعر میں صحتِ اضطراب کو الگوارِ مبالغہ کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے جس میں محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور ثبوت کوئی نہیں۔

۲۔ دامنِ کرم کو عذرِ بارش تھا عنانِ گیرِ خرام گریہ سے یاں پہنچے بالمش کھن سیلاب تھا  
عنانِ گیرِ خرام = مانعِ خرام = تمکھ کی روٹی۔  
دامنِ نہ آنے کے لئے یہ عذر تھا کہ بارش ہو رہی ہے اور یہاں آنسوؤں نے وہ طوفانِ آب برپا کر رکھا تھا کہ تمکھ کی روٹی گویا کھن سیلاب ہو کر رہ گئی تھی۔

۳۔ دامنِ خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال یاں ہجومِ اشک میں تاری نگہ نایاب تھا  
تاری نگہ کا نایاب ہونا = کچھ نظر نہ آنا۔  
دامنِ محبوب کی خود آرائی کا یہ رنگ تھا کہ بالوں میں موتی پروئے جا رہے تھے اور یہاں فرطِ گریہ سے تاری نگہ بھی کم ہو گیا تھا۔ موتی پرونے کی رعایت سے تاری نگہ استعمال کیا گیا ہے۔

۴۔ جلوہ گل نے کیا تھا داں چراغاں آب جو یاں رواں مرگاہ چہم ترے خون ناب تھا  
وہ باغ میں مصروف میر تھے اور سرخ سرخ پھولوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ ان کے عکس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ آبجو چراغاں ہو رہا ہے  
اور یہاں ہم محبوب سے دور خون کے آنسو رو رہے تھے۔

۵۔ یاں سر پر شور بخوابی سے تھا دیوار جو ، داں وہ فرق ناز مجو ماہش کخواب تھا  
دیوار جو = دیوار ڈھونڈھنے والا۔  
یہاں بخوابی میں بار بار یہی چاہتا تھا کہ سر دیوار سے ٹکرائے اور وہاں محبوب کے سکون و بے خبری کا یہ عالم کہ کخواب کے تکبیر پر سر رکھے  
ہوئے اطمینان سے سو رہا تھا۔

۶۔ یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بخودی جلوہ گل داں بساط صحبت احباب تھا  
یہاں یہ عالم تھا کہ ہر ہر سانس سے بزم بخودی کی شمع روشن ہوتی تھی اور وہاں اغیار کی صحبت سے لطف اٹھانے کے لئے فرش گل  
بچھا ہوا تھا۔  
۷۔ فرش سے تاعرش داں طوفان موج رنگ کا یاں زمیں سے آسمان تک سوختن کا باب تھا  
ہاں زمیں سے آسمان تک لطف و نشاط کا طوفان برپا تھا اور یہاں محض جلنا ہی جلنا۔

## غزل (۱۵)

۱۔ نالہ دل میں شب ، انداز اثر نایاب تھا تھا سپند بزم وصل غیر ، گو بیتاب تھا  
رات میرا دل تڑپ تڑپ کرنا لے کر رہا تھا ، لیکن ان میں کوئی اثر نہ تھا ، گویا میرا اضطراب ، دانہ سپند کا سا اضطراب تھا اور  
اس سے مقصود وصل غیر کو نظر بد سے بچانا تھا۔

۲۔ مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے خانہ عاشق مگر ساز صدائے آپ تھا  
مقدم سیلاب = سیلاب کی آمد۔ نشاط آہنگ = مسرور۔ ساز صدائے آپ = جلتنگ جس میں چینی کے پیالوں کے  
اند پرانی بھر کر لکڑی کی طرح سے آواز پیدا کی جاتی ہے۔  
سیلاب کی وجہ سے میرے گھر کی تباہی چھ میرا دل اس درجہ مسرور تھا کہ جو آواز گھر کے درو دیوار سے پیدا ہو رہی تھی وہ اسے جلتنگ  
کا سا لطف دے رہی تھی۔

۳۔ نازش ایام خاکستر نشینی کس کہوں ، پہلوئے اندیشہ وقف بستر شہاب تھا  
اندیشہ = خیال۔ منجباب = ایک قسم کا قیمتی سمور۔  
خاکساری اور خاک نشینی کے زمانہ میں جو ناز استغناء مجھ حاصل تھا اس کا ذکر کیا کروں ، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا بستر خاک  
نہیں بلکہ بستر شہاب پر زندگی بسر کر رہا ہوں۔

۴۔ کچھ نہ کی اپنے جنون مار سائے ورنہ یاں، ذرہ ذرہ روکش عورشید عالم تاب سقا  
کچھ نہ کی، اب ”کچھ نہ کیا“ کہیں گے۔ روکش و مقابل۔  
اپنے ناقص جنون نے کچھ نہ کیا، ورنہ اگر ہم جنون کامل کی منزل تک پہنچ جاتے تو صحر کا ذرہ ذرہ سورج کا مقابلہ کرتا۔

۶۔ یاد کرو وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا انتظار صید میں اک دیدہ بخواب سقا  
محبوب سے کہا ہے وہ زمانہ یاد کرو جب نثار کی جستجو میں تمہارے دام (جال) کا ہر حلقہ (پھندا) دیدہ بخواب کی طرح کھلا  
رہتا تھا لیکن اب وہ دور انتظار ختم ہو گیا، کیونکہ تیرے دام میں اب صید ہی صید نظر آتے ہیں۔  
۶۔ میں نے رو کا رات غالب کو دگر نہ دیکھتے اس کے سیل گریم میں گردوں کف سیلاب تھا  
کثرت اشکباری کا اظہار مہالذ کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اگر میں رات غالب کو رونے سے باز نہ رکھتا تو اتنا عظیم سیلاب برپا ہو جاتا  
کہ آسمان اس سیلاب کا کف نظر آنے لگتا۔

### غزل (۱۶)

۱۔ ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب خون جگر و دلایت مرثکان یار سقا  
ودلایت و امانت۔ حاتی نے دینا پڑا، کا مفہوم ”دینا پڑے گا“ ظاہر کیا ہے۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔  
مدعا یہ ظاہر کرتا ہے کہ خون جگر صرف مرثکان یار کی امانت تھا اور اسی کے لئے یہ خون بہانا چاہئے تھا، لیکن ایسا نہیں ہوا  
اور میں نے دنیا کے اور بہت سے غموں میں بھی خون کے آنسو بہائے، اس لئے مرثکان یار نے اس امانت کا حساب مجھ سے لیا تو  
مجھ پھر از سر نو خون کے آنسو بہانے پڑے اور امانت کی کمی کو پورا کیا۔

۲۔ اب میں ہوں اور تمام یک شہر آرزو، توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار سقا  
تمثال دار = عکس پیدا کرنے والا۔  
تو نے دل توڑ کر ہزاروں آرزؤں کا خون کر دیا، کیونکہ میرا دل یک شہر آرزو تھا اور اب اس کے ٹوٹنے سے میں تمام پر باد شدہ  
آرزؤں کا تمام گسار بننا ہوا ہوں۔

### غزل (۱۷)

۴۔ جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے جو ہر آئینہ بھی، چاہے ہے مرثکان ہوتا  
از بسکہ = چونکہ  
تہا جلوہ جانتا ہے کہ اس کو ہر وقت سب دیکھتے ہی رہیں اور تیرے اس تقاضائے جلوہ کا نتیجہ یہ ہے کہ جو ہر آئینہ بھی، مرثکان  
ہونے کی تمنا کرتا ہے۔  
جو ہر آئینہ کو مرثکان دوست ہے تشبیہ دی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ دیکھنا مرثکان کا کام ہے یا نگاہ کا، اگر یہ کہا جاتا کہ جو ہر آئینہ  
بھی تارنگہ بننا چاہتا ہے تو زیادہ موزوں ہوتا۔

## سوز دروں (دوستوں کی پسند و نصیحت سے متاثر ہو کر)

(احسان درہنگوی)

تمہاری پسند و نصیحت کا شکریہ اے دوست      قدم قدم پہ ہدایت کا شکریہ اے دوست  
حیات بخش شکایت کا شکریہ اے دوست      تمہارے ناز و محبت کا شکریہ اے دوست

خلوص دل کی یہ شدت ہے قدر کے قابل

یہ اضطراب و محبت ہے قدر کے قابل

جو ہو سکے تو مری الجھنوں پہ غور کرو      نصیحتوں کے سوا کچھ علاج اور کرو

چلے نہ کام عنایات سے تو جو رکرو      ہوں ننگ بزم مجھے کیوں شریک دور کرو

سمجھنا سوزِ دروں کا مزاج مشکل ہے

یہ وہ مرض ہے کجس کا علاج مشکل ہے

یہ بھلی بھلی جو ہوتی ہے گفتگو میسری      سمجھ لو یہ کہ ہے گمراہ آرزو میسری

تباہ ہو گئی دنیا سے رنگ و بو میسری      میں ختم ہو گیا ناحق ہے جتو میسری

گلدے کیا جو محبت کا پھول کھل نہ سکا

کہ ایک قطرہ شبِ بنم بھی اس کو ل نہ سکا

گزر رہی ہے جو دل پر تمہیں نہیں معلوم      کہ اضطراب ہے موجود اور خوشی معدوم

تخیلات کی دنیا ہے نور سے محروم      بھٹک رہا ہے اندھیرے میں جذبہ معصوم

سرِ نیاز ہے اور زانوئے تفکر ہے

نگاہِ یاس میں اک عالمِ خیر ہے

خرد نے ترک کیا فرضِ پاسبانی کا      دلِ غریب پہ حملہ ہے نا توانی کا

ہے تیز گام بہت قافلہ جوائی کا      پتنگ نہ دوں میں کہیں بوجھِ زندگانی کا

فریبِ خوردہ نظر پہچ و تاب کھاتی ہے

تخیلات کی دیوار گرتی جاتی ہے

جو ہو سراب کی ماری وہ تشنگی ہوں میں      جو ہو شباب کا ماتم وہ زندگی ہوں میں

جو دل بھی جس کا مخالف وہ آدمی ہوں میں      لٹا چکی ہے جو نغمہ وہ بانسری ہوں میں

جو لٹ گیا ہے سرِ راہ وہ مسافر ہوں

جو اک نگاہ میں خود تک گیا وہ تاجر ہوں

رموزِ عشق و وفا کیا ہے یہ نہ سمجھاؤ      حقیقتوں کو نہ یوں بے نقاب دکھلاؤ

نہ کر سکو اگر انصافِ رحم ہی کھاؤ      خود اپنی آنکھ سے پردے خودی کے سرکاؤ

ہماری آنکھ سے دیکھو ہماری حالت کو

جو ہو سکے تو بدل دو مزاجِ فطرت کو

# ارتقاء

سعادت نظیر

رہ حیات میں صدیوں سے گامزن ہے بشر نقوش پاہں ضیا پاشش تاہ حد نظر  
کہیں صبا ہے تو نگہت کہیں، کہیں مصر ہزار رنگ سے روحِ عمل ہے گرم سفر  
بقا کی جہد سے قائم نظامِ امکاں ہے

اس ارتقا سے عبارت حیاتِ انساں ہے  
ہر ایک جلوہ نو ہے بہ قدرِ ذوقِ نظر چمک رہے ہیں تمناؤں کے نجوم و قمر  
قدم قدم پہ نیا کیفیت ہے، نیا منظر امیدِ منزلِ نو ہے نویدِ فتح و طفر

ہر ایک موڑ پہ تحریکِ سعی پیہم ہے  
تمسک کہاں کی؟ عجب تازگی کا عالم ہے

رو طلب ہیں کہیں شعلے ہیں، کہیں شبنم مسرتوں سے بدلتی ہے کائناتِ الم  
ہر ایک ذرہ میں ہے آفتاب کا عالم وہاں ہے نقشِ تمدن، جہاں گیا آدم  
بہارِ ڈوب کے رنگینوں میں آنے لگی  
کلی کلی میں، وہ جوشِ نمو بڑھانے لگی

دک رہی ہے بندی پہ حوصلوں کی جبین رکاوٹیں نہیں تعمیر و ارتقا میں کہیں  
زیں سے تاہ فلک ہیں تصرفاتِ حسیں فنا کا جلوہ کہ زندگی میں کام نہیں  
رگوں میں خون بہ عنوانِ نو مچلتا ہے،  
ہوائے تند سے دل کا چراغ جلتا ہے

چھپایا شرم سے منہ اپنا نامرادی نے ستارے توڑے ہیں کتنے جنوں نہادی نے  
نکالیں راہیں نئی "بوسہ جہادی" نے بدل دی رسمِ کہن قوتِ ارادی نے  
تلاشِ منزلِ مقصودِ زندگانی ہے  
یہ ارتقا کا عمل ہے کہ جاودانی ہے

# انتظار

(منظر حیدری)

ظہور آدم اول سے آج تک لے دوست نہ جانے کتنے تمدن ظہور میں آئے  
 نہ جانے کتنے مذاہب کی داغ بیل پڑی نہ جانے کتنے عقیدوں کے پھول مرجھائے  
 وہ آفتاب و مظاہر پرستیوں کا ظہور وہ آب و آتش و آہن کے پونجے کا رواج  
 وہ بتکدوں میں ہر اک بت کو پے پے بچرے وہ خون و وہم کی دنیا، وہ سہا سہا کالج  
 وہ جلوہ پاشی حسین اصول افلاطون وہ اقتدار ارسطو و فکر جالینوس  
 وہ دیر روشن زرتشت کا حبیب دھواں وہ ارض بابل و روم میں کاہنوں کا جلوں  
 قدیم چین کا وہ دور فکری فکوشش وہ ضبط خواہش انسان وہ رنج و غم و قلق  
 وہ عہد رفتہ گوتم کے فلسفے کا عروج، شجر کا سایہ ہیں وہ راز زندگی کا سبق  
 دیار ہند کی وہ پرہیزگار تہذیبیں کرشن و رادھا کے رقص حسین کا وہ منظر  
 تہاگ کا وہ زمانہ وہ دور روحانی وہ رام بان، وہ راون کا سر پہرہ لشکر  
 وہ ارض نین و یوسف کی سرزمین جمیل وہ ملکہ کلیلیو پترا کی عشق گاہ قدیم  
 وہ سحر خیز ابو اہول کے جلال کا ملک فراعنہ کا وہ مسکن وہ رزم گاہ کلیم  
 وہ دور عیسیٰ مریم و عہد دار و صلیب تصور احدیت کی وہ تین میں تقسیم  
 نوید زہد کی تہ میں وہ زندگی سے فرار وہ ترک لذت دنیا، وہ عیش کی تحریم  
 وہ اس کا رد عمل دور مذہبی تعذیب پھر اس کے بعد سکوں کا وہ جہاں نوازی پیام  
 عرب کی خاک سے یعنی وہ اک نبی کا ظہور وہ جگمگاتا ہوا چاند سا رخ اسلام  
 پھر اس کے بعد تفکر کے وہ اصول جدید وہ مغربی علماء کے وسیع تر افکار  
 وہ ڈار وین کا اصول ظہور انسانی وہ ہٹ کے روح سے بس مادہ پر دار و مدار  
 وہ نیشے کے اصول خودی و خود بینی وہ برج فکر میں فوق البشر کی انگریزائی  
 وہ ذہن و فکر کے پردوں پر پر تو ہیں اصول مارکس کی وہ دلفریب گیرائی  
 غرض جو کل تھا وہی غلطشار آج بھی ہے عمل کی ہے کہیں اور ر کی خود سری ہو کہیں  
 بنام امن و مائیں تھرپے ہیں آٹم کے لرز رہا ہے دھاکوں سے آج قلب میں  
 مگر میں اب بھی نہیں نا امید مستقبل، خدا ہے معنی مجھے اعتبار آج بھی ہے  
 اسی زمیں ہے اسی آسماں کے سائے ہیں لئے بشر کا مجھے انتظار آج بھی ہے

## شفیق جونپوری :

جب آزادی نہیں نفوں کی مرغانِ خوش الحان کو  
تیری آنکھوں کی مستی دشمنِ ایماں سہی لیکن  
بکارِ خوشتن ایسے بھی تھے ہشیارِ دوانے  
نشین کے خس و خاشاک سے واقف نہیں تھیں  
پرستارِ گلشن میں خزاں بدنام تھی پہلے  
تمہیں اپنا غورِ جامہ زیبی بھول جائے گا  
ابھی دیکھا کہاں تم نے شفیقِ پاک داماں کو

## متین نیازی :

سوزشِ عشق نے تسکین کہاں پائی ہے  
دیکھنا یہ ہے کہ ساحل پہ گزرتی ہے کیا  
دل بیتاب کو تم اشک بہا لینے دو  
آئے تھے ہے نیازِ تری بارگاہ میں  
موجوں کا سکوں دیکھنے والو یہ نہ سمجھو  
غبارِ صحرا کی ہے پھر دامنِ رسوا کو طلب  
آپ کیوں زحمتِ تبلیغ و فاکرتے ہیں  
جب ان کی برہمی میں کچھ کمی معلوم ہوتی جو  
اک ایسا وقت بھی آتا ہے بربادِ محبت پر

شمع کی گود میں پروانے کو میند آئی ہے  
کشتی منجھار سے بچ کر تو ٹھل آئی ہے  
ضبطِ گریہ میں متین اور بھی رسوائی ہے  
جانتے ہیں اک ہجوم تمنائے ہوئے  
ساحل کے قریب اب کوئی طوفان نہیں ہے  
گلشنِ دہریں شاید ہے بہارِ آنے کو  
زندگی آپ محبت کی سزا ہوتی ہے  
مجھے یہ زندگی بے کیف سی معلوم ہوتی ہے  
کہ جب خود اپنی ہستی اجنبی معلوم ہوتی ہے

## عظیم آبادی :

ہاں نسیم خوشگوار - آتی رہے  
جو کلی مرچھا چکی - مرجھا چکی  
آن کی مرضی ہے یہی اسے دردِ دل  
کٹ گئی ناسازگاری میں عزتِ

نکبتِ گیسوئے یار - آتی رہے  
اب گلستاں میں بہار - آتی رہے  
اک صدائے بے قرار - آتی رہے  
اب نوید سازگار آتی رہے

## شارق ایم - لے :

شبِ الم جو تری یاد کے چرخِ جلے  
تمام لطف تھا آزادیوں سے وابستہ  
دوسرے منزلِ جاتاں آدھریں دار و رس

ہم اپنے آپ سے تادیر روئے دل کے گلے  
اب اس کے بعد شہین ہزار بار جلے  
غمِ حیات بتا اب کوئی کدھر کو چلے

## مطبوعات موصولہ

**تذکرہ شوق** | ناقدانہ تبصرہ ہے جناب عطاء اللہ پالوی کا نواب مرزا شوق لکھنوی کی تنویوں پر جسے مکتبہ جدید لاہور نے خاص اہتمام سے مجلد شائع کیا ہے۔ ضخامت ۳۹۲ صفحات قیمت چھ روپیہ۔

نواب مرزا شوق کا نام لیتے ہی دو چیزیں بے اختیار ہمارے سامنے آ جاتی ہیں ایک ان کی تنوی زہر عشق اور دوسری ان کی بدنام عریاں نگاری۔ زہر عشق نے عوام کے دلوں تک پہنچ کر شہرت دوام حاصل کی اور عریاں نگاری کا ذکر صرف خواص تک رہا اور بہت کم لوگوں نے اسے جانا۔ جناب پالوی کی اس تصنیف کا تعلق زیادہ تر خواص ہی سے ہے اور مرزا شوق کی عریاں نگاری کی طرف سے جو معذرت انھوں نے پیش کی ہے، اس کا خطاب بھی زیادہ تر انھیں مقدس ہستیوں سے ہیں جو ادب کو اخلاق کا پابند دیکھنا چاہتے ہیں۔

فاضل مصنف نے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جس چیز کو شوق کی عریاں نگاری کہا جاتا ہے وہ اس عہد کا مقبول رنگ تھا جس میں خرابات نشین اور خانقاہ نشین دونوں یکساں رنگے ہوئے تھے اور اس کا ثبوت انھوں نے اس زمانہ کے شعرا کے کلام سے دیا ہے جو اپنی جگہ اٹل ہے۔

یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے پہلے حصہ میں شوق کے ذاتی حالات، تنویات شوق کی تعداد، ان کے ماخذ اور عریانیت وغیرہ پر گفتگو کی ہے جو ۲۲۱ صفحات کو محیط ہے۔ دوسرے حصہ میں ان کی پانچوں تنویوں اور خصوصیت کے ساتھ زہر عشق پر بڑا تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے، جو ۱۱۱ صفحات پر حاوی ہے۔

پالوی صاحب بڑے مشاق اہل قلم ہیں اور ریسرچ کا خاص ذوق رکھتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے عریانی کی معذرت میں بہت سے اکابر شعر و ادب کی تحریروں کے علاوہ خود قرآن کی بھی بعض آیات پیش کرنے میں تامل نہیں کیا۔

اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں پالوی صاحب نے جس کاوش سے کام لیا ہے وہ قابل تحسین ہے اور اس میں شک نہیں کہ کتاب لکھ کر انھوں نے نہ صرف مرزا شوق بلکہ ان لوگوں پر بھی احسان کیا ہے جو عریاں نگاری کی کوئی منطقی یا تاریخی دلیل اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ انتخاب کلام ہے مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی کے کلام کا جسے پروفیسر سید شاہ محمد عطاء اللہ خان عطا کا کوئی نے بہت حیرت زار اہتمام سے شائع کیا ہے اور ایک روپیہ بارہ آنے میں ایوان آرڈر پرنٹ سے مل سکتا ہے۔

ابتداء میں یہ سلسلہ پیش لفظ خود پروفیسر عطاء نے اپنے خیالات مختصر طور پر ظاہر کئے ہیں، اس کے بعد ڈیڑھ نگر کے وہ تاثرات جو وقتاً فوقتاً نگر میں شائع ہوتے رہے ہیں یکجا کر دئے ہیں۔ اسی کے ساتھ سید سلیمان ندوی کا ایک تاریخی مضمون، بیدل کے عظیم آباء ہونے کے متعلق شامل کیا گیا ہے اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا ایک مقالہ جس میں بیدل و اقبال کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے اس کے بعد انتخاب شروع ہوتا ہے، بیدل کی غزلوں، رباعیوں اور قطعات کا جو تقریباً ۱۰۰ صفحات کو محیط ہے۔ انتخاب کے متعلق اس زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ وہ ایک "بیدل شناس" شخص کا مرتب کیا ہوا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ صرف آسان اور قریباً فہم اشعار ہی کو لیا جائے۔ ہر چند بیدل کے لاکھوں اشعار کو دیکھتے ہوئے انتخاب سمندر کے مقابلہ میں صرف قطرہ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن چونکہ بیدل کے ہاں ہر قطرہ سمندر کی وسعت رکھتا ہے، اس لئے یہ انتخاب بھی بہت کچھ ہے۔

اس زمانہ میں جبکہ فارسی کا ذوق بالکل مفقود ہو چکا ہے، بتدلی کی حق توجہ کرنا بسا غنیمت ہے اور ہمیں امید ہے کہ وہ حضرات جو اس رنگ شاعری کے قدر شناس ہیں اس کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

**ساقی نامہ** مجموعہ ہے پروفیسر سید شاہ عطاء الرحمن عطا کا کوئی کی رباعیات، قطعات اور مختلف اشعار کا جن میں سب کی ردیف ساقی ہے اور ساقی ہی سے خطاب کیا گیا ہے۔ اسی لئے اس کا نام ساقی نامہ رکھا ہے۔ اردو شاعری میں

ساقی بڑا اہم Symach ہے جس کی وساطت سے مجاز و حقیقت کے بہت سے راز ظاہر کئے جاتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ پروفیسر عطاء نے اس Symach سے کام لینے میں بڑی وسعت نظر سے کام لیا ہے۔ پہلے حصہ ”سبوچ“ میں صرف رباعیاں درج ہیں اور دوسرے حصہ ”ساغودینا“ میں غزلوں کا انتخاب ہے، لیکن ان سب میں ساقی ہی سے خطاب ہے، جو غالباً عالم حقیقت ہی کو ساقی ہوگا، لیکن انداز بیان باوجود اظہار حسرت و محرومی کے اتنا ”کار آگاہ“ ہے کہ اس سے زندانِ بادِ غم پر بھی پورا تسلط آٹھا سکتے ہیں۔ یہ دوسرا ڈیویشن ہے جسے ایوانِ اردو پرنٹ نے شائع کیا ہے۔ قیمت ۹ روپے ۶۰ پونے

**کتاب قیامت** مولوی سید محفوظ الحق علمی کی تصنیف ہے جسے بہائی جماعت کی محفل روحانی نے دوسری مرتبہ بہائی ہال کراچی سے نہایت پسندیدہ طباعت و کتابت کے ساتھ شائع کیا ہے جو حضرت بہائی جماعت کی تاریخ اور اس کے عقاید سے واقف ہیں، ان سے شاید یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہ ہوگی کہ اس کتاب کے مولف مولوی محفوظ الحق علمی پڑے دانشور القیدہ بہائی ہیں اور انھوں نے اس وقت تک بڑی دایمانہ خدمت اس مسلک کی انجام دی ہے۔

اس کتاب پر تبصرہ کرنے کے سلسلہ میں ہم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس مذہب کے اصول و عقاید پر ناقذانہ نگاہ ڈالیں، لیکن جس حد تک اس کتاب کے موضوع کا تعلق ہے، ہم کو یہ جستجو کرنی پڑے گی کہ قیامت و متعلقات قیامت کا جو مفہوم بہائی مسلک رکھتا ہے، قرآن و احادیث سے وہ کس حد تک قرین عقل و قیاس ہے۔

بہائی مسلک ہو یا قادیانی، دونوں غریب بڑی مصیبت میں مبتلا ہیں، ایک طرف وہ اپنے آپ کو قرآن و محمد کا ماننے والا بھی کہتے ہیں اور دوسری طرف وہ اس پرانے قرآن اور پرانے رسول سے ہٹ کر ایک نئے قرآن اور نئے رسول کی ضرورت بھی محسوس کرتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انھیں اپنے اور اپنے مسلک کو باقی رکھنے کے لئے بڑے پاؤں پھیلنے پڑتے ہیں۔

اگر وہ احادیث صحت یہ کہہ دیں کہ قرآن و محمد اپنے زمانہ کے لئے ٹھیک تھے، لیکن اب وہ بیکار ہیں اور اسوقت دنیا کو دوسرا قرآن و محمد کی ضرورت ہے تو شاید ان کی دشواریاں بہت کم ہو جائیں، کیونکہ اس طرح کھلم کھلا وہ رسول بن جائیں گے اور اپنی تصانیف کو الہامات ربانی کہہ سکیں گے، نہ انھیں تاویل قرآن کی ضرورت ہوگی نہ احادیث نبوی کی طرف اعتناء کرنے کی۔

یہ کتاب بالکل اس منترزل ذہنیت کا نتیجہ ہے جس میں قیامت، بعثت، موت و حیات، دوزخ و جنت وغیرہ کے الفاظ تو وہ اپنے قرآن میں مرقوم ہیں، لیکن ان کا مفہوم نہایت عجیب و غریب پیش کیا ہے، مثلاً قیامت کے معنی انھوں نے بعثت پیغمبر کے لئے ہیں۔ قبر کے معنی جہالت کے قرار دئے ہیں، پہلے صراط سے مراد نئے پیغمبر کا ظہور ملا دیا ہے وغیرہ وغیرہ

اسی طرح زمین کا مفہوم علم و معرفت کی زمین، اور آسمان کا مفہوم زمین کا آسمان متعین کیا ہے اور قیامت کبریٰ سے خدا کا ظہور عظیم و عظیم و عظیم اگر وہ ان قرآنی الفاظ و اصطلاحات کا ٹھکانہ کرتے ہوئے ان کی جگہ دوسرے الفاظ وضع کرتے اور ان کا مفہوم وہ اپنی مرضی کے مطابق جو چاہتے متعین کرتے تو مضائقہ نہ تھا، لیکن قرآن کے الفاظ و آیات کی ایسی تاویل کرنا جو عرفی لغت و اصطلاح سے کوئی تعلق نہ رکھتی ہے، نہایت عجیب بات ہے۔

یہ کتاب دراصل الراح بہاؤ اللہ کی تفسیر ہے اور اسی حد تک اسے محدود رکھنا چاہئے تھا، لیکن یہ کوشش کہ قرآن کا مفہوم بھی کہیں ”ان کر الراح سے منطبق کر دیا جائے۔ نہ صرف یہ کہ سچی بات کام ہے بلکہ اس سے بہاؤ اللہ کا احساس گہری بھی ظاہر ہوتا ہے۔

جو ایک مجدد دین یا مصلح ملک و ملت کے لئے کیسی باعثِ خیر نہیں ہو سکتا۔

ہم پہائی مسلک کے بلند اخلاقی اصول کے قابل ہیں اور ان کے جذبہٴ انسانیت پرستی کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ اس کے لئے کوئی شخص اپنے آپ کو پیغمبر و رسول بھی کہے اور اپنے اقوال کو ایلاماتِ ربانی بھی قرار دے۔ یہ کتاب تا مگر اسی قسم کی باتوں سے معمور ہے جن کو پیغمبرِ پہائی ہوئے کوئی شخص قبول نہیں کر سکتا اس لئے تبلیغی حیثیت بھی وہ کوئی قیمت نہیں رکھتی اس کی ضخامت ۳۳۲ صفحات ہے اور قیمت غالباً کچھ نہیں۔

**ہومیو پیتھک مدرٹکنجیوں کا استعمال** رسالہ "ہومیو پیتھک دنیا" کا خاص نمبر ہے جو پھر میں ہنی میں لیباریٹر پوسٹ بکس ۳۳۳ کلکتہ سے مل سکتا ہے۔

"ہومیو پیتھک دنیا" بڑا مقبول و مشہور رسالہ ہے جو کئی سال سے کامیابی کے ساتھ جاری ہے اس رسالہ کے ایڈیٹر ہمارے شہر کے مشہور ہومیو پیتھک ڈاکٹر امر پکاش "اورا" ہیں جو اپنی ذہانت و صداقت کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ رسالہ "ہومیو پیتھک دنیا" کی اشاعت کے سلسلہ میں وہ کبھی کبھی اس کے خاص نمبر بھی شائع کرتے رہتے ہیں جو اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت مفید ہوتے ہیں۔ اس سال انھوں نے یہ خاص نمبر شائع کیا ہے جس میں ہومیو پیتھک دواؤں کے مدرٹکنجیوں (جو شائدوں) کا استعمال بتایا گیا ہے اور ۱۶ دواؤں پر مشتمل ہے۔

ہومیو پیتھک مدرٹکنجیوں کا استعمال خارجی و داخلی دونوں طرح ہوتا ہے، لیکن اس وقت تک اردو میں کوئی کتاب اس موضوع پر شائع نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا ملک کو ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے کافی تحقیق و تجربہ کے بعد ایسی مفید کتاب پیش کی جس سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

**مکاتیب و حشت** علامہ رضا علی وحشت کے مکاتیب کا مجموعہ ہے جسے شمس الدین صاحب عازم نے بزمِ شاکری نمبر ۱۷۷ شمس الہدیٰ روڈ کلکتہ سے شائع کیا ہے۔ ضخامت ۱۴۰ صفحات۔ قیمت پھر۔ کاغذ و طباعت پسندیدہ۔

جناب وحشت اُس دور کے استاد سخن ہیں جب ایک شاعر مشکل ہی سے اساتذہ کی صف میں آسکتا تھا اس وقت تک اپنی شاعری سے انھوں نے ملک و زبان کی بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب تک ان کا یہ فیضان جاری ہے۔

اس مجموعہ میں ان کے بعض وہ خطوط جمع کر دئے گئے ہیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے احباب و تلامذہ کو لکھے تھے۔ ان مکاتیب کے پڑھنے سے نہ صرف حضرت وحشت کی استادانہ حیثیت واضح ہوتی ہے بلکہ ان کے اس بلند اخلاق پر بھی روشنی پڑتی ہے جس کی مثالیں اب ہم کو خال ہی خال نظر آتی ہیں۔

**سلاطین ہند کی علم پروری** تصنیف ہے جناب محمد حفیظ اللہ صاحب کی جسے مسنم اکاڈمی پھولواری شریف (پٹنہ) نے شائع کیا ہے۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات۔ قیمت پھر۔

یہ کتاب مختصر ہے لیکن بہت مفید و دلچسپ۔ اس میں ہندوستان کے تمام مسلم حکمرانوں کی علمی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ابتدا میں مختصر سا مقدمہ بھی شامل ہے جسے اس کتاب کا خلاصہ کہنا چاہئے اور بہت سے غیر مسنم مفکرین کی ان قریبوں کا اقتدار بھی شامل کر دیا گیا ہے جن سے مسلم فرمانرواؤں کی علم دوستی اور اخلاقی رواداری پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ مسلم اکاڈمی عرصہ سے اس قسم کی مفید کتابیں شائع کر رہی ہے۔

**شاہنامہ ہند** تصنیف ہے جناب سر سرب کا بری گپادی کی جسے تلک پک ڈپو رانچی نے خاص اہتمام سے مجلد شائع کیا ہے۔ ضخامت ۱۵۰ صفحات۔ قیمت قسم اول للہ پھر قسم دوم للہ۔

پہلی جلد ہے منظم تاریخ ہند کی جس میں محمد قاسم کے حملہ سندھ سے لیکر شہاب الدین خوری تک کے واقعات درج ہیں اسوقت تک نہ میں تو ہندوستان کی تاریخیں بہت ہی گنتی ہیں، لیکن نظم میں اس کی جرأت کرنا آسان نہ تھا۔ اس کے فاضل مصنف نے اس میں شک نہیں بڑا کام اپنے سر لیا ہے اور اس پہلی جلد کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اس کا آغاز کیا ہے اور فکر اس کی باقی جلدیں بھی شایع ہو گئیں تو ہمارے ادب میں بڑا مفید اضافہ ثابت ہوگی، جناب سرسری کی قوت شعر گوئی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ تاریخ کے خشک واقعات بیان کرنے میں بھی انھوں نے فنی محاسن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

**اردو ہندی ڈکشنری** انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ نے نہایت نفیس کاغذ پر مجلد شایع کی ہے ضخامت ۲۸، صفحات - قیمت ۵۰/-

اس میں دس ہزار سے زیادہ اردو فارسی کے مفرد مرکب الفاظ کے ہندی مترادفات پیش کئے گئے ہیں اور تلفظ و معنی کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے رومن رسم خط سے بھی کام لیا گیا ہے اور ہندی کے نامانوس مترادفات کے ساتھ ساتھ عام فہم ہندی الفاظ بھی دیدئے گئے ہیں۔ ہر لفظ کے ساتھ تذکرہ و تائید کی بھی تعیین کر دی گئی ہے اور یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ فلاں لفظ کس زبان کا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس وقت تک جتنی ڈکشنریاں اردو ہندی کی شایع ہوئی ہیں۔ یہ ڈکشنری اپنی وضاحت اور بعض دوسری خصوصیات کے لحاظ سے ان سب میں امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ ایک کئی البتہ ہم کو اس میں محسوس ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اردو کے بہت سے ایسے الفاظ جو عام بول چال میں رائج ہیں، ان میں نہیں پائے جاتے اور عربی فارسی کے بہت سے غیر ضروری الفاظ لئے گئے ہیں۔ اس لئے یہ ڈکشنری اہل قلم کے لئے تو بیشک مفید ہو سکتی ہے لیکن عوام کے لئے نہیں اور شاید اسی لئے اس کی قیمت اتنی زیادہ رکھی گئی ہے۔

## ”نگار“ کے پچھلے تین سالنامے

سالنامہ ۳۱ء جس میں علم ”فرست التحریر“ کے اصول پیش کئے گئے تھے اور جن کو دیکھ کر آپ ایک شخص کا سواد خط دیکھ کر اس کے لکھ کر کا صرف صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ سوٹ ایک کاپی باقی ہے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۳۲ء اس میں ”ڈراما اسباب کھٹ“ اڈیٹر کے قلم سے پورا شایع ہوا ہے اور ”خلافت و امامت“ کے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز ہوا ہے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۳۸ء اس میں ”تاریخ اسلامی“ کے عہد خلافت و امامت پر مضمون بحث کی گئی ہے جس کی ابتدا و اختتام ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

## فلاسفہ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیا ز کے دو علمی مضامین شامل ہیں :- (۱) چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ

(۲) اور جن کا مذہب - نہایت مفید کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول -

منیجر نگار لکھنؤ

## نگار کا آئندہ سالنامہ ۱۹۵۶ء

### (اصناف سخن نمبر)

ہر آنے والے سال کے ساتھ ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ نگار کا مخصوص نمبر کس موضوع کیلئے وقف کیا جائے جو پڑھنے والوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ہو اور جس کی ترتیب میں اردو کے اہم لکھنے والے حصہ لے سکیں، چنانچہ موجودہ انتہائی دور کے پیش نظر مناسب سمجھا گیا کہ ۱۹۵۶ء کا پہلا شمارہ اردو شاعری کے تمام اہم اصناف سخن کی تعریف، تجزیہ، تشریح اور تاریخ کیلئے وقف ہو۔ یہ سالنامہ طلبہ، اساتذہ اور تمام شائقین ادب اردو کے لئے ایک نہایت مفید دائرۃ المعارف قسم کی چیز ہوگا جس کی اہمیت کا اندازہ آپ کو ذیل کے عنوانات سے بخوبی ہو سکتا ہے:

صنف غزل :- (۱) غزل کی ماہیت اور ہیئت - (۲) اردو غزل ولی سے غالب تک - (۳) اردو غزل غالب سے عہد حاضر تک (۴) دہلی اور لکھنؤ کا دبستان غزل - (۵) غزل کا مستقبل  
صنف قصیدہ :- (۱) قصیدہ کی تاریخی و روایتی حیثیت - (۲) قصیدہ کا ارتقائی دور - ذوق، سودا، غالب و مومن کی قصیدہ نگاری -

صنف ثنوی :- (۱) ثنوی کی روایتی و بنیادی خصوصیات - (۲) دکن کی ثنویاں - (۳) ثنوی تاریخی نقطہ نظر سے - (۴) لکھنؤ، دہلی کی مشہور ثنویاں -

صنف مرثیہ :- (۱) مرثیہ کے عناصر ترکیبی - (۲) دکن اور مرثیہ نگاری - (۳) مرثیہ انیس تک - (۴) مرثیہ انیس کے بعد (۵) انیس و دتیر - (۶) واقعہ اکبر کا علاوہ دوسرے مرثیہ -

صنف رباعی و قطعات :- (۱) رباعی پر تاریخی نظر - (۲) اردو کے مشہور رباعی نگار - (۳) قطعہ نگاری کا سرسری جائزہ - صنف ہجو و مزاح نگاری :- (۱) ہجو نگاری تاریخی جائزہ - (۲) سودا، حیثیت، ہجو نگار - (۳) مزاحیہ و ظریفانہ شاعری -

صنف ریختی :- (۱) اردو ریختی پر ایک نظر - صنف نظم نگاری :- (۱) اردو کی ابتدائی نظمیں - (۲) جدید نظم نگاری کا پس منظر - (۳) اخلاقی و اصلاحی نظمیں - (۴) رومانی نظمیں - (۵) سیاسی و انقلابی نظمیں - (۶) آزاد نظم - (۷) انظمی نظمیں اور گیت - (۸) واسوخت - (۹) میجر نگار لکھنؤ

### پاکستان کے خریدار

اپنا سالانہ چندہ آٹھ روپیہ آٹھ آنے ذیل کے پتہ پر ذریعہ منی آرڈر واد فرمائیں اور رسید ڈاک خانہ ہمارے پاس جلد از جلد بھیجیں تاکہ پرچہ کی فراہمی میں تاخیر نہ ہو پاکستان کے خریدار کا چندہ جون یا اس سے قبل ختم ہو چکا ہے اور ان کے نام جولائی کا پرچہ اسی وقت روانہ ہوگا۔ ان کا چندہ وصول ہو جائے گا۔

ڈاکٹر شمس العباس ہاشمی - ۱۰۵ - گارڈن ویسٹ - کراچی

نگار کی مطبوعات بھی آپ کو اس پتہ سے ذریعہ دی جانی سکتی ہیں

# بعض کمیاب کتابیں

(ان کتابوں پر کمیشن نہیں دیا جائے گا۔ قیمتیں علاوہ محصول ڈاک ہیں)

تذکرہ مخزن نکات	تایم	ع	کشاف اصطلاحات الفنون	شیخ محمد علی	ع
تذکرہ دستور الفصاحت	کیا	ع	جہانگیر نامہ	خواجہ ابوالحسن	ع
تذکرہ چہستان شعراء	شفیق	ع	آئین اکبری مصورہ حصہ	ابوالفضل فیض	ع
تذکرہ ہندی	مصطفیٰ	ع	سکندر نامہ مصورہ	مولوی نظامی کجوی	ع
دیوان میر حسن	میر حسن حسن	ع	وقائع نعمت خان عالی انشائے حسن و عشق		ع
دیوان شکر	دیوان نسیم دہلوی	ع	ورہ نادرہ	مرزا محمد مہدی خاں	ع
کلیات ناسخ	امام بخش ناسخ	ع	تاریخ گلستان ہند مصورہ	درگا پرشاد	ع
کلیات تسلیم		ع	تاریخ جامع التواریخ	فقیر محمد	ع
کلیات سودا	مرزا رفیع سودا	ع	اقبال نامہ جہانگیری سہ حصہ	محمد فرید معتد خاں	ع
کلیات مسرت	فضل الحسن حسرت	ع	سیر المتأخرین سہ حصہ	غلام حسین خاں	ع
کلیات مومن	مومن خاں دہلوی	ع	تذکرہ دولت شاہ	دولت شاہ سمرقندی	ع
کلیات میر	میر تقی میر	ع	در بار اکبری	آزاد	ع
کامل شرح کلام غالب	مرتبہ عبدالباری آسی	ع	تذکرہ گل رعنا	عبد الغنی	ع
مرآۃ الغیب	امیر احمد امیر	ع	کلیات ظہیر	حکیم ظہیر نانی	ع
منظر معانی دیوان مجروح	میر محمد حسین	ع	قصاید عرفی محشی	جمال الدین	ع
دستور الشعراء (تذکرہ تانیث)		ع	کلیات اسماعیل	اسماعیل اسفہانی	ع
کلیات جعفر زئی	مرتبہ محمد فرحت اللہ	ع	کلیات سعدی	شیخ مسلح الدین سعدی	ع
کلیات نظیر اکبر آبادی	مرتبہ عبدالباری آسی	ع	دیوان عرفی	جمال الدین عرفی	ع
مرآۃ انیس	ہند اول و دوم و سوم و چہارم	ع	دیوان ہلالی محشی	ہلالی	ع
مرآۃ میر انیس	جلد ششم	ع	دیوان قصاید غفری	حکیم ابوالقاسم	ع
مرآۃ دبیر کامل		ع	تذکرہ کالان رامپور	احمد علی خاں	ع
مرآۃ مونس		ع	تذکرہ آب بقا	عبدالرؤف عشرت	ع
کریم اللغات		ع	ہند و شعراء		ع
نتیجۃ اللغات	ضامن علی جلال لغت قلمی	ع	تذکرہ الخواتین	عبدالباری آسی	ع
فردوسی پرچار مقالے	محمود شیرانی	ع	تذکرہ سخن شعراء نساخ		ع
تاریخ صبیح السیر	غیاث الدین بن ہمام الدین	ع	تذکرہ گلشن ہند	مرزا علی لغات	ع

پاکستان میں یہ کتابیں صرف اس صورت میں پہنچ سکتی ہیں کہ پوری قیمت مع محصول ڈاک ذریعہ بینک ڈرافٹ پہلے وصول ہو جائے۔

منہج نیکار لکھنؤ

داعی طوفان کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی  
آئندہ روپیہ فوآنے میں دی ہوگا۔ سالنامہ ۱۹۵۶ء

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۷۰	فہرست مضامین ستمبر ۱۹۵۶ء	شمار ۳
۳	ملاحظات	۳۳
۶	حالی اور شبلی	۳۴
۱۴	قاضی عبدالغفار	۳۵
۲۴	ہمارا پڑوسی	۳۶
۲۹	زندگی آج	۳۷
۳۱	نہرویز کا تاریخی و سیاسی پس منظر	۳۸
	فسانہ آزاد	۳۹
	عرش مسیانی اور اردو شاعری	۴۰
	مشکلات غالب	۴۱
	دنیا کی مسلم حکومتوں کا جائزہ	۴۲
	منظومات: پروفسر شورش، فضل ابن فیضی، سائق جاوید	۴۳
	عقیدہ جنتی، پیش برقی، باقی محمدی	۴۴

## ملاحظات

نہرویز کی نزاع مصر کے لئے ایک بڑا خطرہ ہے  
نہرویز کے باب میں لندن کانفرنس اور اس کی گفت و شنید کا حال سب کو معلوم ہو چکا ہے اس لئے اس کے اظہار کی

ضرورت نہیں۔ لیکن آئندہ کیا ہونے والا ہے اس پر ضرور غور کرنے کو بھی چاہتا ہے۔  
آدھر کرنل ناصر کی یہ ضد کہ وہ نہرویز پر بین الاقوامی اقتدار قائم نہ ہونے دیں گے اور آدھر فرانس و برطانیہ کی یہ ہمت کہ ہم اس کو  
بین الاقوامی بنا کر چھوڑیں گے، یقیناً بڑی ادیشہ ناک بات ہے اور اس کشاکش کا لازمی نتیجہ جنگ ہے، لیکن چونکہ برطانیہ و فرانس بھی اپنی  
جگہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اگر یہ بڑی الجھ گئی تو اس کا سلجھنا آسان نہیں اور کرنل ناصر بھی بخوبی جانتے ہیں کہ برطانیہ و فرانس  
ایسی زبردست حکومتوں سے ٹکر لینا تباہی کو دعوت دینا ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ اخیر میں کرنل ناصر کو جھکنا پڑے اور وہ بعض خصوص  
فرانس کے ساتھ بین الاقوامی اقتدار کو گواہ کر لیں۔ لیکن اگر کرنل ناصر نے "تحت یا تختہ" قسم کا فیصلہ کر لیا تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کی بڑی  
غلطی ہوگی۔ ممکن ہے عرب ریاستیں ایک حد تک ان کا ساتھ دیں اور ہو سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں نہرویز ہی تباہ ہو جائے اور عرب و عراق  
کے پڑوسی چشموں سے بھی کچھ عرصہ کے لئے امریکہ و برطانیہ محروم ہو جائیں، لیکن نتیجہ اس کا مصر اور مشرق وسطیٰ کی تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔  
کیونکہ مصر اور عرب ریاستوں کا کیا ذکر ہے اگر کوئی اور بڑی قوت بھی مصر کے ساتھ ہو جائے تو سمجھیے برطانیہ و فرانس کو نہرویز کی تباہی  
بعض حشرات کا خیال ہے کہ سوویت حکومت نے اپنا بیڑا اسی غرض سے پہلے پہل بسجھایا تھا کہ بصورت جنگ وہ مصر کی مدد کرے گا

اور اسلحہ کے ذریعہ سے اس کا مصر کی مدد کرنا بھی اسی طرز سے تھا، لیکن یہ خیال واہمہ سے زیادہ نہیں اور اس کے کئی اسباب ہیں ایک یہ کہ سو سو ویٹ یونین اور مشرقی یورپ کے ممالک کی اقتصادی حالت خراب ہے اور وہ کبھی جنگ کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتے، دوسرے یہ کہ خود سو سو ویٹ یونین کی رائے عامہ یہی ہے کہ نہر سوئز کو بین الاقوامی ملکیت قرار دیا جائے۔ اس کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ وہ افلا ڈائن ہیر کی تعمیر جس پر روس نے کافی وقت اور روپیہ صرف کیا ہے بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے، اگر نہر سوئز میں آزادانہ آمد و رفت کا سلسلہ منقطع ہو جائے اور اسی لئے ٹھیک اس وقت جبکہ لندن کا نفرنس منعقد ہونے جا رہی تھی، ماسکو ریڈیو سے اپنی تقریر نشر کرتے ہوئے بولڈانو نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ”مصر کو یہ بات فراموش نہ کرنا چاہئے کہ سوئز کی بین الاقوامی اہمیت بدستور قائم ہے اور اسے کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“ بولڈانو کی یہ آواز صرف اس کی اپنی آواز نہ تھی، بلکہ پوری جمہوریت روس کی آواز تھی، سوئٹ حکومت کی آواز تھی، اب اس کے ساتھ اگر گپ سٹریٹیلو کی ان تجاویز پر غور کریں گے جو اس نے لندن کا نفرنس میں پیش کی تھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس نے یہ کبھی نہیں کہا کہ سوئز کی بین الاقوامی جو ریش کو ختم کر کے تمام اختیارات مصر کو دیدینا چاہئے بلکہ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ کا نفرنس زیادہ وسیع پیمانہ پر ہوتا کہ وہ بھی کسی طرح فرانس و برطانیہ کے دوش بدوش اپنے قدم نہر سوئز میں جماسکے۔ ہندوستان، افغانیہ، اٹلی، لیبیا نے جو کچھ کہا وہ انتہائی خلوص سے کہا اور یقیناً ان کا منشا یہ ہے کہ مصر کی خود مختارانہ حیثیت کو کوئی صدمہ نہ پہونچے، لیکن روس کی ایسی اس مسئلہ میں بڑی خطرناک ہے۔ اس نے ایک طرف تو اپنا بیڑہ سواصل عرب پر بھیجا عرب ریاستوں اور مصر کو یہ سمجھنے کا موقع دیا کہ بصورت جنگ وہ ان کی مدد کرے گا (حالانکہ اس کا مقصود اس کے سوا کچھ نہیں کہ اگر مشرق وسطیٰ میں جنگ چھڑ جائے تو وہ برطانیہ و فرانس کا ساتھ دیکر اپنی سرحد کے تحفظ کا بہانہ کر کے کسی کسی حصہ پر قابض ہو جائے) اور دوسری طرف ایک وسیع تر کا نفرنس کا مطالبہ پیش کر دیتا کہ بین الاقوامی اقتدار قائم ہو جائے کی صورت میں وہ بھی کوئی نمایاں حیثیت اس میں حاصل کر سکے۔

اس کے علاوہ ایک بہت بڑا اندرونی خطرہ مصر کے لئے اور بھی ہے۔ کرنل ناصر کی موجودہ حکومت خواہ کتنی ہی جمہوری وضع کی کہوں نہ ہو لیکن یہ ہر حال ”عسکری حکومت“ اور عسکری حکومت کا جلد یا بدیر ختم ہونا ضروری ہے، چنانچہ مصر کی ایک بہت بڑی جماعت وقت کی منظر ہے کہ اسے ادنیٰ بہانہ ملک میں ہرجاں پیدا کرنے کا مل جائے اور وہ اسے ہٹا کر جمہوریت کو لے آئے جس کے طرفدار ملک میں بہت زیادہ ہیں۔ یہی وہ اندیشہ تھا جس کے پیش نظر کرنل ناصر نے جنرل نجیب کو قاتلہ سے بہت دور کسی ریگستانی مقام میں بھیج دیا کہ مصری عوام سے وہ کوئی تعلق نہ رکھ سکیں۔ کرنل ناصر کے قتل کے خلاف سرف ایک نجیب ہی کی جماعت نہیں ہے بلکہ وہاں کے تمام جاگیردار اور زمیندار بھی جنگی زمینیں چھین چھین کر کاشتکاروں کو دی جا رہی ہیں، کرنل ناصر سے خوش نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ مصر کی ”اخوان المسلمین“ جماعت کو پیچھے ہے کرنل ناصر نے صفحہ میں منتشر کر کے اس کے بہت سے کارکنوں کو قتل کر دیا تھا، اس جماعت کے ممبر اب بھی بڑی تعداد میں مصر اور عرب ریاستوں کے اندر پائے جاتے ہیں اور خفیہ لشکر گاہ سے جنرل نجیب کے خلاف پروپاگنڈا کرتے رہتے ہیں۔ الفرض جس حد تک اندرونی سیاست کا تعلق ہے کرنل ناصر کی حکومت بہت متزلزل حالت میں ہے اسی کے ساتھ ایک اور بڑا خطرہ مصر کی اقتصادی تباہی ہے جس سے وہاں کا ہر شخص متاثر ہے اور اب کہ برطانیہ و فرانس نے اس کا اسٹریٹجک سرمایہ ضبط کر کے اس کی تجارتی ساکھ بھی ختم کر دی ہے، اسکی اقتصادی حالت بہت زیادہ خراب ہو جائے گی۔ اگر یہ کہا جائے کہ روس یا کوئی اور ملک مالی مدد کر کے اس خطرہ سے مصر کو باہر نکال لائے گا تو یہ بھی حسن ظن سے زیادہ نہیں، کیونکہ اسوان بند کی تعمیر کے لئے امریکہ و برطانیہ کے انکار کے بعد ہی کرنل ناصر کا نہر سوئز کو قومی ملکیت قرار دیکر کہنا کہ اس کی آمدنی سے اسوان بند تعمیر کرے گا، ایسا لایعنی دعویٰ ہے جسے شاید خود مصر کی آبادی بھی تسلیم نہیں کر سکتی، چہ جائیکہ روس یا دوسرے ممالک جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ مصر محض اپنی روٹی سے اس قرض کو ادا نہیں کر سکتا۔

ان حالات کو سامنے رکھ کر کبھی اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ کرنل ناصر اپنی ضد پر قائم رہ سکے گا اور اگر اس نے اس پر اصرار کیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یا تو خود مصر کے اندر انقلاب پیدا ہو جائے گا اور کرنل ناصر کا وہی حشر ہوگا جو ایمان میں مصدق کا ہوا

یا اگر جنگ شروع ہوگئی تو مصر ایک ہفتہ کے اندر تباہ و برباد ہو جائے گا اور پھر کرنل ناصر کی قیمت کا فیصلہ اس کی سر زمین میں اس کے خلاف ہو کر رہے گا۔

ہو سکتا ہے کہ یہ جنگ مسلمانوں کے نقطہ نظر سے جہاد کی صورت اختیار کرے اور کچھ عرصہ تک گوریلا قسم کی لڑائی جاری رہے جیسا کہ اس وقت الجزائر میں دیکھی جاتی ہے، لیکن اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ جنگ کی عمر کچھ بڑھ جائے اور دنیا کی سیاسیات میں کچھ عرصہ کے لئے ہیمہانی کیفیت پیدا ہو جائے۔ لیکن مصر کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہونچے گا۔

آج ۲۹ اگست تک کی خبر یہ ہے کہ کرنل ناصر اس مشن سے گفتگو کرنے کے لئے راضی ہو گئے ہیں جو لندن کانفرنس کا فیصلہ لے کر ان کے پاس آ رہا ہے اور یہ خبر کافی امید افزا ہے، ورنہ اس سے قبل تو کرنل ناصر اس کے لئے بھی طیارہ نہ تھے کہ وہ اس مشن کو مصر میں قدم رکھنے کی اجازت دیں۔ اس مشن سے ملنے کے بعد کرنل ناصر کوئی ختم جواب نہ دیں گے اور وہ خود اپنی طرف سے ایک اور کانفرنس طلب کرنے کا خیال ظاہر کریں گے جو دنیا کے اکثر ممالک کے نمائندوں پر مشتمل ہو، لیکن برطانیہ و فرانس غالباً اس پر راضی نہ ہوں گے اور وہ مصر کو بندرہ یا بیس دین کا نوٹس دیدیں گے کہ اس مدت کے اندر وہ بین الاقوامی فیصلہ ماننے کے لئے طیارہ ہو جائے اور اس معاہدہ کے ختم ہونے کے بعد بغیر الٹی میٹم دئے وہ عسکری قوت سے نہر سوئز پر قابض ہونے کی کارروائی شروع کر دیں گے اور یہ کارروائی ایک وقت اتنی فوری ہوگی کہ مصر اور ممالک عرب کو کچھ کہنے سننے کا بھی موقع نہ ملے گا۔

اس اقدام میں برطانیہ صرف دو باتوں کو اپنے سامنے رکھے گا، ایک یہ کہ مصر نہر سوئز تباہ نہ کر سکے اور دوسرے یہ کہ سعودی عرب عراق، کویت وغیرہ کے پٹرول کی چشموں کی بائپ لائن محفوظ رہے، اور اس فرض کے لئے وہ ہر ممکن تدبیر سے کام لے گا، خواہ عرب ممالک اسے پسند کریں یا نہ کریں اور اس باب میں اسرائیل اور ترکی سے اسے کافی مدد ملے گی۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ برطانیہ کا یہ اقدام صرف انگلستان بلکہ تمام مغربی ممالک کی استعماری قوت کو ہیضہ کے لئے ختم کر دے گا۔ خدا کرے ایسا ہو، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ سبھی اس جھگڑے میں مشرق وسطیٰ - برطانیہ، فرانس اور روس کے درمیان تقسیم نہ ہو جائے اور نہر سوئز کے ساتھ درہ دانیال پر بھی بین الاقوامی اقتدار قائم ہو جائے۔

امریکہ بظاہر اس وقت خیر جارحانہ پہلوئے ہوئے ہے، لیکن صرف اسی وقت تک جب تک کرنل ناصر کو زیادہ سے زیادہ دبا یا جاسکتا ہے، لیکن اگر مصر نے بالکل دو ٹوک جواب دیدیا اور کسی حیثیت سے نہر سوئز پر بین الاقوامی اقتدار تسلیم کرنے کے لئے طیارہ نہ ہوا تو ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلا ہم جو اسکندریہ اور قاہرہ پر گرے وہ امریکہ ہی کا ہو۔

بصورت جنگ بغداد پیکٹ کے ممبروں کی کیا پالیسی ہوگی؟ اس پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ پاکستان، ایران دونوں کی ہمدردیاں برطانیہ کے ساتھ ہوں گی اور ترکی کو تو غالباً فوجی مدد بھی دینا پڑے۔

ہندوستان کی نیت بالکل صاف ہے اسے جو کچھ کہنا تھا وہ علانیہ کہ چکا ہے اور اگر خدا نخواستہ جنگ شروع ہوگئی جیتنا عالمگیر نہ ہوگی تو بنڈوئنگ کانفرنس کا ممبر ہونے کی بنا پر وہ اخلاقی حیثیت سے مصر کی ہر ممکن امداد کرے گا لیکن عملی حیثیت سے وہ اپنی خیر جانہداری پر آخر وقت تک قائم رہے گا۔

ان حالات کے پیش نظر ہمیں امید ہے کہ کرنل ناصر بین الاقوامی اقتدار کو کسی نہ کسی صورت سے ماننے کے لئے طیارہ ہو جائیں گے، لیکن اگر خدا نخواستہ ان کے نئے خون نے اس کی اجازت نہ دی، تو پھر (حاکم بدین) مصر کی بربادی ایک کھٹا ہوا منطقی نتیجہ ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔

# حالی اور شبلی

## سوانح نگار کی حیثیت سے

(بہ سلسلہ ماسبق)

(ڈاکٹر سید شاہ علی)

**حالی اور شبلی** - باقاعدہ سوانح نگاری کا آغاز حالی سے ہوتا ہے ان کے بعد شبلی کا نمبر آتا ہے۔ یہ دو مصنف اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود اردو سوانح نگاری کے امام اور ان کی تمام تصانیف اردو ادب کا ایک قیمتی حصہ، اور دوسری زبانوں کے ادب کے مقابل اردو ادب کی سر بلندی کا باعث ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ فاضل سوانح عمری کے معیار پر کہاں تک پوری اترتی ہیں۔ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے یہ نقوش اولین کی حیثیت رکھنے کے علاوہ، اس کی مصنف سوانح نگاری کا بھی اولین اور بہترین سرمایہ ہیں۔

**حالی کو شبلی پر سبقت** - صرف زمانے کے لحاظ سے، بلکہ ان کی تصانیف کے اعلیٰ معیار کی بنا پر بھی ہے، جس کا اعتراف شبلی کے ایک عزیز ترین اور وفادار دوست ہمدی حسن کو بھی ہے جس کا ذکر آئے گا۔ حالی کو یہ بھی شرف حاصل ہے کہ انہوں نے صرف سوانح عمری بلکہ مختصر سہی (طبی رنگ کی وہ ہے) اپنی آپ بیتی لکھ کر خود نوشت سوانح عمری کی بھی بنیاد رکھی جس کی شہرہ، پریم چند، عسکری وغیرہ نے تقلید کی۔ ایک اور اہم وجہ اس برتری کی جس پر بادی النظر میں غور نہیں کیا جاتا، یہ بھی ہے کہ حالی کی جلد تین سوانح عمریوں میں سے دو اپنی ہم عصر اور عزیز ترین شخصیتوں سے وابستہ ہیں لیکن شبلی کی تمام سوانح عمریاں زمانہ ماقبل کے افراد کی ہیں۔ جن سے متعلق معلومات ذاتی تعلق و تجربے پر مبنی نہیں بلکہ دستاویز تحریری مواد تک محدود ہیں۔ ایک ہم عصر اور آشنا شخص ہی کسی کی کامیاب سوانح عمری لکھنے کا حق ادا کر سکتا ہے۔ اگر اس میں مشکلات بھی زیادہ ہیں۔ لیکن یہاں سوانح نگاری دراصل سوانح نگاری کہلانے کی مستحق ہے۔ وافر مواد کی موجودگی بھی، ایک اجنبی مصنف کو اپنے موضوع کی شخصیت میں وہ درک اور بصیرت ہم نہیں پہنچاتی جو شخصیت کے مشاہدے سے حاصل ہوتی ہے، چہ بائیکہ صدیوں بعد لکھی ہوئی سوانح عمریاں، جن کا مواد ایشیائی قیود، پابندیوں اور حد بندیوں کی چھلنی سے چھن کر نکلا ہے۔ قدیم وضع مشرقی تصانیف سے جدید مغربی انداز کی سوانح عمریوں کی تالیف مشکل چیز ہے۔ نہ یہاں وہ ناپے موجود، نہ نجی خطوط، نہ دوست احباب کی ذاتی معلومات اور نہ کوئی اور ذاتی تحریرات و دستاویزات۔ علاوہ بریں شبلی کے موضوع زیادہ تر ایک وسیع اہمیت کے مالک ہیں اور شبلی کا ان سے تعلق ایک مذہبی جوش اور جذبے کا نتیجہ ہے، جو سوانح نگاری کے افسر سمجھا جاتا ہے، جس کی شہادت ان کی دیگر تصانیف سے بھی ملتی ہے، گو اصلاح کی ضرورت کے نقطہ نظر سے اسے کچھ زیادہ قابل اعتراض نہ سمجھا جائے۔ ایک اور خوش قسمتی حالی کی یہ ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کے موضوع کی موت بھی واقع ہوئی جس کے بغیر انسانی حیات اور صوری اور اس سے متعلق رائے غیر متوازن سمجھی جاتی ہے۔ بہر حال حالی کو شبلی کے مقابل میں یہ تمام فائدے حاصل تھے

۱۔ انادات ہمدی مطبوعہ ابراہیم پریس حیدر آباد ص ۳۶۷ تا ۳۶۹ -

۲۔ حالی کی تصانیف میں ان کے استاد مولانا عبد الرحمن کی سوانح عمری بھی غنی جاسکتی ہے۔

لیکن شبلی نے عالی پر چند سخت اعتراض کئے ہیں۔ بحیثیت ایک پیش رو کے عالی کے شبلی پر اثرات اور اُنے شبلی کے عالی پر اعتراضات وغیرہ پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک سرسری سا جائزہ ان حالات کا لیا جائے جن کے تحت عالی اور پھر شبلی نے میدانِ سوانح نگاری میں قدم رکھا۔

سوانح نگاری کے آغاز کی بحث میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ سوائے صوفیائے کرام کے ملفوظات کے، دکنی ادب کی نیم سوانحی اور نیم افسانوی یا سہاسی و مذہبی شہنویوں، شاعروں کے بے سرو پا تذکروں اور ایک آدھ نام نہاد تالیفات یا ترجمے کے اردو سوانح نگاری بلکہ اردو ادب کی کائنات میں بھی شاید ہی کچھ تھا۔ یوں تو اردو کی ہر صنف ادب سرسید کے زیر قیادت مغربی ادب سے متاثر ہوئی ہے، لیکن بعض اہمنا مثلاً مضمون نگاری، سوانح نگاری، تاریخ وغیرہ کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ خاص طور پر اس کی مرہون منت ہیں۔ حالی کی حیات سعدی کے دیباچے سے بھی کچھ اشارات اس باب کے آغاز میں نقل کئے جا چکے ہیں، جن سے صاف ظاہر ہے کہ حالی کے مد نظر مشرقی نہیں مغربی انداز سوانح نگاری تھا، کیونکہ عربی فارسی میں کسی اہل کمال کی کوئی مستقل سوانح عمری مشکل سے ملتی تھی۔ اس کے علاوہ اگرچہ مولانا حالی نے بیہ دیوں، یونانیوں، رومیوں اور عیسائیوں کی سوانح عمریوں اور پلوٹارک اور سترھویں صدی میں انگریزی سوانح نگاری کی خاص ترقی کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کی تان جن پر ٹوٹتی ہے وہ وکٹوریائی عہد کی "حیات اور زمانہ" اور "حیات اور تصانیف" کی طرز کی ضخیم کئی جلدوں کی سوانح عمریاں ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں حال کی بیہ گرائی میں اکثر مورخانہ تدقیق کی جاتی ہے اور واقعات سے منطقی طور پر نتائج استخراج کئے جاتے ہیں۔ مصنف کے کلام پر غور کیا جاتا ہے، اور اس کے عیب اور خوبیاں صاف طور پر ظاہر کی جاتی ہیں۔ "اکثر ایک شخص کی لائف کئی ضخیم جلدوں میں لکھی جاتی ہے۔"

حالی سے (جن کی معلومات تراجم اور سنی سنائی باتوں تک محدود تھیں) یہ توقع کرنا کہ وہ پلوٹارک 'باسول' اور لاک ہارٹ کے شاہکاروں کے مطالعہ سے اپنے لئے شاہ راہ عمل معین کرتے، بے جا ہے۔ علاوہ بریں ہر عہد کے لوگوں کی طرح ان کا جدید ترین انگریزی رجحانات سے متاثر ہونا بھی فطری ہے خصوصاً جب کہ سرسید اور ان کا پورا حلقہ مغربی تہذیب و ترقی پر ایمان بالغیب لاپچکا تھا اور اس سے اس قدر مرعوب تھا کہ بات بات پر اس کا کلمہ پڑھتا تھا ان جدید ترین رجحانات پر تنقیدی نظر خیال (بغیر کسی اپنے سرمائے کے) ایک خیال خام ہوتا۔ شبلی کی اس طرح کی خفیت سی باغیانہ کوشش میں لغزشیں ہماری رائے کو اور تقوین بخشی ہیں۔ جب نمود انگلستان میں یہ طریقہ وکٹوریائی عہد کی طرح نصف صدی سے زیادہ بہار پر تھا، اور یہ صرف بیسویں صدی کے اوایل میں تھا، جو نقاد اسے اپنی تنقید اور تجربے کے تحت لایکے، تو پھر اسے حالی اور شبلی سے ہر کس طرح اس کے بغض توقع قائم کر سکتے تھے۔ جب ہم اس طریقے کا جائزہ لے لیں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ حالی کا ذوق سلیم اور اس کی سلامتی و تسلی جو وہ بدی طرح اس رویہ پر نہیں لگے اور کچھ نہ کچھ سوانح نگاری پر قرار رکھی لیکن زیادہ تر انداز وہی رہا۔ یہ اردو ادب کی پرستش تھی کہ اردو کے بہترین ادیبوں کو تنقید کے لئے سوانح نگاری کے بہترین نمونے مل سکے اور ان کے زمانہ میں اس سوانحی طریقہ کو عروج و اقتدار حاصل تھا جسے فن تنقید نے بعد میں مذموم قرار دیا۔

انیسویں صدی کے وکٹوریائی سوانح نگار اپنے موضوعات پر سچائی کی بجائے عزت و وقعت کی چادر اور چھانے کے قابل تھے۔ یہ طریقہ 'باسول' کے سوانحی جذبے کے برخلاف تھا، جو کسی مرتب کی کامیابی کے لئے روشنی اور سائے دونوں کے امتزاج کو ضروری سمجھتا تھا اور اپنے پیر و مرشد جانسن کی بوالعجبیوں، عجیب و غریب نظریوں، بے ہنگم اور بے ڈھب مادوں اور دیگر لغزشوں کا بھی اسی جوش و خروش سے ذکر کرتا تھا جیسے اس کی خوبیوں کا۔ وکٹوریائی عہد کے سوانح نگاروں نے اس کی تقلید صرف اس حد تک کی، کہ مختلف دستاویزات، اصلاحات اور مرتبہ جات کو بے ہنگم طور پر یکجا کر دیا۔ ان کے اس عزت کے ڈھونگ نے حقیقی سوانح نگاری کے سونے خشک کر دئے۔

مرٹر اسٹراچی (Strachey) اپنی ایک تصنیف کے پیش لفظ میں جسے سوانح نگاری کا مینی فیسٹو (Manifesto) ۱۱ گمایا ہے، وکٹوریائی عہد کی سوانح عمریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ان دو ضخیم جلدوں کو جن سے مرادوں کی یادگار منانا ہمارا دوسرا مقصد ہے اور ان کے بے انتہم مواد کے ذخیرہ، سجدے طرز ادا، ناگوار اندازِ مدح، انتخاب، ترتیب اور بے تکلفی کے انھوں نے ناگقدان کو کوئی نہیں جانتا۔ ان سے ہم ایسے ہی آشنا ہیں، جیسے ان کے مرتب کرنے والوں کے مانتی جلوس سے، جس کی بے کیف وحشیانہ اور مردنی سی چھائی ہوئی فضا کا عکس، ان کی تصانیف سے بھی جھلکتا ہے۔ برٹل لکھتا ہے، میں کبھی اس نئی تلی اور ہواور سوانح عمری کا بغیر کرپ واضطراب کے احساس کے خیال ہی نہیں کر سکتا۔ ان میں سے ہر ایک میں آپ کو پیدائش، ولادت، اسکول کے دن یونیورسٹی کی ابتدائی جدوجہد پیشے کے انتخاب، شادی، غیر ملکی سفر کے وہی عامیانہ اور آشنا عنوانات ملیں گے، حتیٰ کہ آپ کی تھکی ہوئی نگاہ ایک نامناسب خوشی کے ساتھ بیماری موت اور خصال کے وہی ہی آشنا الفاظ پر جا رہے گی۔ یہ وکٹوریائی عہد کی سوانح عمریاں ایک دوسرے سے حیرت خیز مشابہت رکھتی تھیں، گویا ان کے عنوانات الجبرانی طرز اظہار اور نشانات ۱، ب، ج، د، ۵، ۶ کے نمونے تھے (ملکہ وکٹوریہ کی زیر نگیزی لکھی ہوئی)۔

۱۱ "The life of Prince consort" اس کی ایک زندہ مثال ہے) بدلے ہوئے انسانی کردار اور حیات کے لامحدود تنوع اور تشبہ و افراد کو انھوں نے روٹی اور سبزی کاغذ کے پیرہن میں قید کر دیا تھا۔ عہد وکٹوریہ کے سنجیدہ فلک سچائی سے متفرق تھے، شرابی، خروٹ (Froward) کی حیات کا لالچ پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہے "وکٹوریائی پبلک ایسی ہیرو پرستی کو نہیں سمجھ سکتی تھی، جو ہیرو کی خاموشی کی پردہ دری کرے اور اس سادہ حقیقت سے منکر تھی کہ فرد کا جذبہ پرستش اس کا دل نوعیت کا تھا کہ وہ اپنی شہید کی ایک جلی سی کلیر کی نظر اندازی کے تصور سے بھی گھبرا اٹھتا تھا۔" وکٹوریائی سوانح عمری کا لب و لہجہ بے حد سنجیدہ، خشک اور بے رونق، شکل میکانیکی اور سنت اور اسلوب غیر ضروری طوالت اور صراحت کا حامل تھا، جو اصول سوانح نگاری کے خلاف تھا۔ انیسویں صدی کی سوانح عمریوں میں غالی تاریخی مواد کی بھرمار ہے۔ وہ ہائرمعاصر تدریس ہیں یا ضخیم سیاسی اشتہار (مغفلت) یہ رجحان ان کے عنوان "حیات اور زمانے" سے بھی واضح ہے۔ زمانے کے کسی بھی مناسب بیان میں فرو کی اہمیت کا فراموش ہو جانا لازمی ہے۔ الہی کے متعلق گلاس (Gould) نے کہا تھا کہ یہ تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں نہ سوانح نگاری سے Madden میسن کی حیات منقش اور بہت حد تک مورے کی حیات لکھنے والوں، بھی اس کے نمونے ہیں۔ تعمیری مقصد سے مطالب لا تعداد دستی سوانح عمریاں شایع کرتے رہتے تھے اور مرحوم کے دوست رشتہ دار اس کی وفات کے کچھ ہی عرصے بعد یا حیات میں ہی فروغ یا انس کے جذبے سے متاثر ہو گئے، اس کی یادداشتیں یا یادگاری مجسمے شایع کر دیتے تھے، گو شہرت عام اور بقائے دوام کا اسے کوئی حق پہنچتا ہو یا نہ ہو، یہ کافی ہوتا تھا کہ وہ اس کے معاصرین کی نظر میں ایک عارضی جگہ قائم ہو حقیقت یہ ہے کہ سوانح نگاری ہمیشہ سے اپنے زمانے کی روح کی ترجمانی کرتی رہی ہے، اور اس معاملے میں کوئی صنف ادب اس سے زیادہ محاسن نہیں رہی ہے یعنی کسی اور صنف ادب پر نگاری کی ضرورت واقعتاً نے اتنا نمایاں اور فوری اثر نہیں ڈالا ہے۔ چنانچہ سوانح نگاری کی ایجاد انسان کی یادگاری جبلت کی تسکین کے لئے ہوئی تھی۔ اس خواہش کے تحت خاندانوں نے کتبے، نوے اور مرثیے، قبائل نے رزمیہ داستانیں اور کارنامے اور مذاہب نے تذکرۃ الانبیاء و اولیاء لکھوائے۔ مختصر لاکر نے اس میں اضافی اور فرقہ جاتی مقصد شامل کر لیا۔ فن سوانح نگاری کے

Eminent Victorians By Lytton Strachey "Preface"

Eminent Victorian-Preface.

Norfolkister Dicta By Augustine Bural P.N.12

Polhamy - Miniature P.192,199.

مرت دراز تک ایک آزاد فی تسلیم نہ کئے جانے کی وجہ سے اس میں متواتر تشبہ و فرادہ پیدا ہوئے ان کا باعث انسانی شخصیت میں عوامی دلچسپی اور نفسیات کا ذوق تھا اور یہ بھی ذہنیت کی پیداوار تھا۔ ان عہدوں میں جب کہ قاری خدا اور حیات بعد ممات پر یقین رکھتا ہے، اس کی مرکزی دلچسپی ابدی حقایق سے ہے نہ کہ دنیاوی حقایق سے۔ ایسی حالت میں سوانح نگاری قیاسی، اخلاقی، معنوی یا صرف سطحی بن کے رہ جاتی ہے فور و فکر، شک اور عدم یقین کے دور میں انسانی اطوار سے دلچسپی ہوتی ہے اور سوانح نگاری استقرائی، تنقیدی، بے لاگ اور واقعیت پسند بن جاتی ہے۔ اگر سوانح نگاری قابل شناخت طور پر آزاد اور دوسرے اصناف ادب سے الگ ہوتی تو عوامی مذاق سے آزاد ہوتی اور جاندار بھی، لیکن وہ اب تک دوسرے منادات مثلاً تاریخ، افسانہ اور سائنس میں گھری ہوئی ہے۔ انیسویں صدی میں تو دنیا بھر میں مذہب پر سائنس کے صلہ میں لوگوں کے ذہن میں انتشار پیدا کر دیا تھا۔ لوگ کچھ مدت تک چکر لڑی بھول گئے تھے اور وضاحت اور خود اعتمادی کی بجائے حالات کے ازسرنو جائزے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے لیکن روشنی نظر آنے تک ان کے خیالات و تصورات کا تتر بتر رہنا فطری تھا اور رجعت پسندی بھی بار بار مختلف طریقوں سے اپنا سر اٹھاتی تھی۔ ہر نئی اہم تحریک، تحریک، تحریک اور تعمیر کی قوتوں کو بروئے کار لاتی ہے۔ چنانچہ سوانح نگاری کے صحیح تصور کے دوبارہ قایم ہونے سے پہلے فن سوانح نگاری کو بھی اسی انتشار کے عالم سے گزرنا پڑا۔ انیسویں صدی کے سوانح نگار اپنے فرض کے تصور کے ناقابل ہو گئے اور انھوں نے مذکورہ بالا تمام سوانحی مقاصد کو غلامیاد کیا تھا جن کے جدھر سینگ سمائے چل کھڑے ہوئے۔ بعض نے جن کی آنکھیں یادگاری جذبے نے چند عیادہ تھیں مرثیہ، اعتقاد نامے اور دلکش داستانیں مرتب کیں۔ بعض نے مذہب کے زیر اثر پیچھے مڑنے کی بجائے اخلاقی نمونے پیش کئے۔ جو تاریخ کی طرف مایل ہوئے انھوں نے ”حیات اور زمانہ“ کا طریقہ اپنایا جنہیں افسانوں نے لچایا انھوں نے تخلیقی تصانیف لکھیں۔

حالی اور شبلی کی تصانیف میں وہ تنوع نہیں اور ان کے موضوع اس اعتراض کی زد میں نہیں آتے لیکن ان کا سوانحی مواد اور بہان اس سے بچ نہیں سکتا۔ چنانچہ حالی اور شبلی دونوں کے ہاں اخلاقی عنصر پایا جاتا ہے۔ دونوں ایک ہی وادی کے مسافر اور ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ شبلی نے اس میں سوا اس کے کوئی جدت نہیں پیدا کی کہ کار لایں کی طرز پر تاریخی رجحان کو شامل کر لیا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ممکن ہے کہ ان دونوں کی انگریزی زبان اور ادب سے نامکمل واقفیت ہی ان کی بے راہ روی کے آڑے آئی ہو اور انھیں ۶

”جلدیم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی“ کے برعکس اس کے غیر مرغوب بہاد میں پوری طرح بہ جانے سے روکا ہو۔ چنانچہ زبا وجود ان کی دو حصوں میں تقسیم کے) حیات سعدی اور یادگار غالب کا ہلکا پھلکا اور دلکش انداز بیان اپنی مثال آپ ہے۔ حیات جاوید ضخامت کی وجہ سے انیسویں صدی کے بعض مسائل و نقائص کو جھلکا رہا ہے مثلاً غیر ضروری تصریح و طوالت تشبہ ترتیب مواد، بندھے بندھائے عذوان وغیرہ۔ اور حالی کو مورے سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت میں انیسویں صدی کے نپے تلے فارمولہ حیات جاوید پر اتنا زیادہ اثر نہیں ہے جتنا دیکھتا تھا بلکہ بہت سے نکات میں، ممکن ہے ان کے ذوق تسلیم کی وجہ سے ہو، اس بہترین انگریزی سوانح نگار، باسول کے اثرات کی جھلک بھی اس میں اسی طرح نمایاں ہے جس طرح شبلی کے یہاں کار لایں کی۔ باسول کے مقابل اگر کوئی سوانح نگار اردو کی طرف سے پیش کیا جاسکتا ہے تو وہ حالی اور صرف حالی ہیں اور حیات جانسن کی فکر کی کوئی اردو سوانح عمری اردو میں موجود ہو تو وہ حیات جاوید ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ کچھ حد تک باسول اور حالی دونوں سوانح نگاروں اور ان کے ہمروؤں جانسن اور سرسید کی شخصیتوں اور ان کے مائل تعلقات ہوں۔ بہر حال باسول اور حالی کا سرسری مقابلہ بعض دلچسپ نکات پیش کرتا ہے۔

یعنی اس سلسلہ میں سب سے پہلی مشابہت جو ہم کو باسول اور حالی کی زندگی میں نظر آئی ہے وہ یہ کہ دونوں کا تعارف اپنے موضوعات کے خاص دوست اور چیلے تھے۔ دونوں کے موضوع ان سے عمر اور عظمت میں بڑے تھے۔ دونوں اپنی اپنی زندگی کی چھوٹی چھوٹی پریشانیوں میں مبتلا ہونے کے باوجود حیات انسانی سے حد درجہ دلچسپی رکھتے تھے۔ دونوں کا حافظہ اور مشاہدہ تیز اور قوی تھا۔ ایک سوانح نگار کے لئے بڑے ضروری اوصاف ہیں۔ دونوں خود پسندی سے عاری اور سادہ مزاج تھے۔ چنانچہ باوجود اپنے اپنے موضوعات سے گہرے

تعلقات کے دونوں نے خود کو پس منظر میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ باسول نے پھر بھی فن کاری کے ساتھ کچھ حد تک اپنے جانسن کے تعلقات کی جھلک قاری کو دکھائی ہے۔ لیکن حالی کا غیر ضروری حجاب تو ہمیں قابل اعتراض معلوم ہوتا ہے۔ دونوں نے کوئی بہت ہی غیر معمولی دل برداشتہ نہیں پایا تھا، یا جاہر قابل میں شمار نہیں ہوتے تھے، مگر دونوں بے حد محنتی اور صبر و سکون کے مالک تھے چنانچہ دونوں نے تقریباً اسی قدر دت ان سوانح عربوں کی تیاری یا تصنیف میں صحت کی ہے اور دونوں تصانیف کی ضخامت بھی تقریباً ایک سی ہے۔ دونوں ردائ اور عمدہ نمونہ لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے (گو باسول حالی کی طرح مسلم ادیب نہ تھا اور حیات جانسن اور پیروڈس جرنل *A Journal of the Tour to Hindostan*) کے سوا اس کی کوئی تصنیف قابل ذکر نہیں ہے) دونوں سے پہلے خطوط، دستاویزات، لطائف و ظرائف گفتگو وغیرہ کا استعمال اپنی اپنی زبانوں میں رواج پا چکا تھا، لیکن دونوں کی خوبی یہی ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ ان سب طریقوں کے امتزاج سے کام لے کر اپنے موضوعات کی شخصیتوں کے بہترین مرتبہ چھوڑے، گو حالی کے یہاں ذاتی حالات و جزئیات کی وہ فراوانی نہیں پائی جاتی ہے جو باسول کے یہاں ہے مثلاً باسول کی عبوری پابوش، اس کے بے قاعدہ تکیے، اس کی گرد آلود ٹوپی، اس کے ناخن تراشنے کا طریقہ، اس کی چائے دانی اور بلی، سنتروں کے چمکوں کا اکٹھا کرنا، بے طور کھانا وغیرہ۔ لیکن سرسید کے ابتدائی حالات (تعلیم و تربیت وغیرہ) میں چھوٹی چھوٹی جزئیات سے، ان کے بچپن اور ماحول کی تصویر کشی، اور ان کی تصنیف و تالیف، طرز تحریر، تقریر، اور ذرا مشین وغیرہ کے بیانات میں حالی نے کافی دلچسپی پیدا کر دی ہے اور مجموعی طور پر بقول ڈاکٹر عبد القدوس گویا حیات جاوید کے ادراک میں ہمیں سرسید اپنی عظیم و جیم ہزرگانہ شخصیت سمیت کبھی چھینکوں پر تکتے اور کبھی بحث میں آجکتے نظر آتے ہیں۔ اگر اس کے باوجود شیخ چاند مرحوم کے الفاظ میں حیات جاوید کو وہ شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو اس کے ہیرو اور مصنف دونوں کے شایان ہے، تو اس میں دونوں کے مصلع و ناصح ہونے کو بھی دخل ہے۔

لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ باوجود مواد کی بے انتہا فراوانی کے باسول نے اپنی کتاب کو باب فصل یا حصوں میں تقسیم کے بغیر بھی حیات جانسن کے مختلف ابدار موتوں کو کامیابی کے ساتھ ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں خود اعتمادی ہے اور اسے شعوری طور پر اپنے فن اور ذرائعیت سے کام لے کر حیات جانسن کو فہم دیا ہے، اور اسے خود اس کی تصنیف کے بہترین ہونے کا احساس ہے حالی صاحب یہاں رہ گئے ہیں ان کے یہاں ان چیزوں کی کمی ہے اور آئیسویں صدی کے طریقوں کے مدنظر انھوں نے اپنی تصنیف کو دو حصوں میں تقسیم کر کے حیات، کارناموں اور ان پر تبصرے کے علاوہ اس زمانہ کے حالات، فہم، معاشرت و سیاست، سوسائٹی، ماحول، معاصرین، خیالات، و رجحانات وغیرہ پر حادی اور جامع بحث کی ہے جس کی کئی باتوں کا اس قسم کی تقسیم کی وجہ سے بار بار اعادہ بھی ہوا ہے۔ حالی کو کچھ تو بلند سوانحی مواد کو سمیٹنے میں اپنی ناکامی کا احساس ہے اور کچھ یہ ان کا طبعی انکسار ہے۔ خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اپنی کمزوریوں اور لغزشوں اور اس سلسلہ میں کسی کی مدد حاصل نہ ہو سکنے کی وجہ سے اس عجیب و غریب شخص کی ہیوگرافی لکھنے کا حق ادا نہ کر سکے ہیں اور یہ امید کرتے ہیں کہ اس داغ میں پر اور لوگ عمارتیں اٹھائیں گے۔ ہم دیکھتے رہے ہیں کہ یہ امید یا دگار غالب کی طرح اس کے بارے میں بھی کبھی پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ یادگار غالب کی طرح اس میں جلد لطائف و ظرائف کو قلم بند نہ کر سکنے، تصانیف کے اقتباسات، جگہ جگہ موعظت سے کام لینے وغیرہ کی طعن حیات جاوید پر تبصرے کے دوران میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ البتہ ان کی ایک حد تک ضروری خاندانی اور موروثی واکتسابی خصوصیات کا مختصر بیان باسول سے جدید تر اور قابل تعریف چیز ہے۔

بہر حال حالی نے اپنی سلامت روی کو بہت حد تک اپنی تصانیف میں بھی برقرار رکھا ہے اور باوجود چند تشکیلی خامیوں کے جو

غلط تقلید کا نتیجہ تھیں، سوانح نگاری کی اصل روح کو زیادہ صد منہ نہیں پہنچایا ہے کیونکہ دانپے انگسار اور زمانہ کے انداز کے مد نظر انھوں نے ہزار اعتبار پیش کئے ہوں) ان کی تصانیف کا محرک جذبہ بنیادی طور پر سوانحی یعنی ان کی ذاتی پسند پر مبنی تھا۔

اب ہم شیلی کی طرف توجہ کریں گے۔ شیلی کے ہاں بھی تقریباً وہ تمام اثرات پائے جاتے ہیں جو حالی کے یہاں ہیں یعنی وہی دو مقصد میں تقسیم، وہی حیات سے کارناموں پر زیادہ تفصیلی بحث، وہی تشریحی اور توضیحی انداز بیان۔ البتہ وہ کارلائل سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر عبداللہ کے شیلی کے اپنے شاگردوں کے ذریعہ انگریزی ادب سے استفادے اور مصر (Egypt) میں کارلائل کے ہیرو اور ہیروئشپ کے ترجمے کے مطالعے کے بیان میں قیاس کو دخل ہو، لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں کہ وہ بالکل مغربی خیالات اور کارلائل سے متاثر نہیں ہوئے۔ حالی کی طرح شیلی نے بھی جگہ جگہ اپنے سوانحی شعور کا مظاہرہ کیا ہے جس سے ان کا لایل سے متاثر ہونا نظر آتا ہے چنانچہ المامون کی تمہید میں ان کا اسلامی تاریخ کی تصنیف کے ادارے کا "ریل ہیرو و آئن اسلام کے سلسلہ میں" (تاریخ اور لائف کے امتزاج کے) مہمل ہونے کا ذکر آچکا ہے جو کارلائل کے اس نظریے کا کہ "کسی ملک کی تاریخ اس کے مشاہیر کی تاریخ ہے" (یا تاریخ عالم مشاہیر عالم کی تاریخ کا نام ہے) کا ترجمانی کرتا ہے۔ اسی طرح شیلی نے الفاروق کے دیباچے میں تاریخ کی تعریف ایک بڑے مصنف کے (جس کا نام نہیں دیا ہے) حوالے سے نقل کیا ہے جو یہ ہے "فطرت کے واقعات نے انسان کے حالات میں جو تغیرات پیدا کئے اور انسان نے عالم فطرت پر جو اثر ڈالا ہے، ان دونوں کے مجموعے کا نام تاریخ ہے" جو دراصل تاریخ پر صادق نہیں آتی۔ سیرت النبی کے دیباچے میں جبکہ ان کے سوانحی شعور نے کچھ ترقی کی ہے، لکھتے ہیں "علوم و فنون کی صفت میں سیرت (ہیروگرافی) کا ایک خاص درجہ ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے حالات زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لئے دلیل راہ ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہشیں رکھتا ہے، کیا کیا منصوبے باندھتا ہے، اپنے چھوٹے سے دائرہ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے، کیونکہ ترقی کے زبوں پر چڑھتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے، کیا کیا منصوبے باندھتا ہے، اپنے چھوٹے سے دائرہ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے، کیونکہ ترقی کے زبوں پر چڑھتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے، کیا کیا مزاحمتیں اٹھاتا ہے، تھک کر بیٹھ جاتا ہے، استقامت ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے۔ فرض سخی و عمل جدوجہد، ہمت و فیرت کی جو عجیب و غریب نیرنگیاں سکندر اعظم کے کارنامہ زندگی میں موجود ہیں بعینہ یہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصہ حیات میں بھی نظر آتا ہے۔ کارلائل کے مندرجہ ذیل چند اشارات سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ چند سوالات کو بطور ایک سوانح عمری کی کسوٹی کے پیش کرتا ہے۔ لکھتا ہے "کسی انسان کی مخصوص پوزیشن کے مد نظر، دنیا اور انسانی حیات کا اس کے ذہن پر کیا نقش مرتب ہوا؟ خارجی حالات نے اس میں کیا تبدیلی پیدا کی اور اس نے ان پر کیا اثر ڈالا؟ کس سخی و قوت کے ساتھ اس نے ان پر حکومت کی اور کس مقاومت کے ساتھ ان سے ہریمت اٹھائی۔ الغرض سماج کا اس پر اور اس کا سماج پر کیا ادب کس طرح اثر مترتب ہوا؟ ہمیں یقین ہے کہ وہ جو کسی فرد کے متعلق ان سوالات کا جواب دے گا ایک مکمل سوانح عمری کا نمونہ پیش کرے گا۔

کارلائل کا یہ قول پہلے باب کی مونسوع کی بحث میں نقل کیا جا چکا ہے "کہ ایک چھوٹے سے چھوٹے انسان کی سچی مرتع کشی اور اس کی زندگی کے سفر کی داستان ایک بیڑے سے بیڑے انسان کی دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے"۔ کارلائل کی حیات سٹرنگ گویا اس کا نمونہ ہے اور شیلی کا مذکورہ بالا قول کارلائل کے اسی قول کی وضاحت کرتا ہے۔ لیکن شیلی نے اس پر عمل نہیں کیا۔ اس کے علاوہ سوا ایک ہم عصر اور معروف شخص کے کسی کم نام آدمی کے متعلق سوانحی مواد نہ ملتا مشکل ہے لیکن شیلی کی نظر میں شاید ان کی مشابہت اور انتہا پسندی کی وجہ سے کوئی

۱۔ مکتوبات حالی ص ۳۴ خط بنام مولانا عبدالحق۔ مے شیلی کا نظریہ تاریخ از ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، روالہ ترقی شکر، اسلام آباد

۲۔ E. E. Schlegel on Carlyle's Essay.

۳۔ مکتبہ شیلی جلد اول ص ۱۱

گم نام تو کیا نام در بھی نہیں تھا۔ اگر کار لایل اور شبلی کا موازنہ کیا جائے گا کہ کار لایل میں بھی مثالیت اور انتہا پسندی کی صفات موجود تھیں تو اس نے بھی معاصرین کو اس طرح کم چکا ہی سے نہ دیکھا۔ ممکن ہے اسی باعث شبلی اور کار لایل دونوں کی ازدواجی زندگی بھی ان کے حسب خواہش میسر نہ ہو سکی اور ان کو حسب دل خواہ شریک حیات نہ مل سکی۔ یہی خصوصیات شاید دونوں کی ہیرو پرستی کا باعث بھی تھیں۔ تاریخ کے علاوہ سیاست میں بھی دونوں انتہائی نظریوں کے حامل تھے۔ دونوں کی انفرادیت بہت قوی اور نمایاں تھی۔ دونوں بڑے سلیب کے ادیب اور مورخ تھے۔ دونوں کی تحریروں میں فلسفیانہ تحقیق و ترقق، منطقیانہ استدلال اور جوش بیان پایا جاتا ہے۔ دونوں نے غیر ملکی سیر و سفر سے بھی فائدہ اٹھایا تھا۔ قدیم و جدید کا امتزاج ہونے کے علاوہ وہ اپنے آزاد اور مستقل نظریے حیات بھی رکھتے تھے۔ شبلی کا بظاہر ”ہیروز آون اسلام“ کے سلسلے کا ۱۱م بھی شاید کار لایل کے ہیرو اینڈ ہیرو در شب کے سلسلے کا مرہون منت ہے، جس کے کرنی ترجمہ کے مطالعہ کا انھوں نے رد کیا ہے۔ جیسے سر سید کا تہذیب الاخلاق کیٹلر اور سیکلر کے، اور سجاد حسین کا ”اودھر پنج“ لندن پنج کے نمونے پر تھا۔ کار لایل کی سوانح عمری بھی اس کے نظریے پر پوری طرح عمل کرتی ہے، جسے شبلی نے اپنانے کی کوشش کی تھی۔ مثلاً اسکی حیات ’فریڈرک اعظم‘ عہد و کثوریہ میں شخصیت کا احساس پیدا کرنے میں عظیم اثر کا باعث ہونے کے باوجود ”حیات اور زمانے“ کی طرز کی تصنیف ہے اور ایک فرد کے مطالعہ سے زیادہ ایک فرد ہیں، اور اس کے ذریعے تاریخ کے مطالعہ کی مثال ہے۔ البتہ دونوں نے اپنے کلیوں میں بین الاقوامی شہرت کے ناموروں کی سوانح عمریوں کی تصنیف کی تحریک پیدا کی بلکہ غیر ملکی سوانح نگاری کو روشناس کر کے اس سے دلچسپی پیدا کی۔ جہاں تک غیر ملکی موضوع کا تعلق ہے اردو میں حالی نے حیات سعدی لکھ کر اس کی ابتدا کر دی تھی۔ اپنے موضوع کی نوعیت کی وجہ ان کو غیر ملکی سوانح نگاری سے استفادے کا اتنا موقع نہیں مل سکا تھا جتنا شبلی کو۔ گو حالی اور سر سید دونوں اسلاف کے کارناموں کے بیان کے ذریعہ نئی پود میں عمل اور ترقی کی تحریک پیدا کرنا چاہتے تھے جو خود بھی مذہبی اور اخلاقی (غیر سوانحی) جذبہ کے زیر اثر تھا۔ لیکن وہ شبلی کی طرح ماضی کے احیاء کے حق میں نہ تھے۔

شبلی کو یہ آسانی تھی کہ ان کے سامنے حالی کی مثال، نمونے اور تجربات موجود تھے۔ حالی کی طرح یہ دشواری دہی کو عربی فارسی اور مغربی سیرتوں، تذکروں اور سوانح عمریوں کے درمیان اپنے لئے وسیع راہ عمل معین کرنا پڑتی۔ حیات سعدی کا دیباچہ گویا اردو سوانح نگاری کا دستور العمل ہے۔ اس میں مشرقی سیرت نگاری اور اس کی روایت، روایت اور مغربی سوانح نگاری اور اس کے طریقوں کے متعلق نہایت عمدہ اشارات ملتے ہیں، جن کو شبلی نے بعد میں وسعت دی ہے۔ شبلی کے یہاں موضوعات کا تنوع بھی حالی سے زیادہ پایا جاتا ہے یعنی حالی کے موضوع صرف ادبی اور سیاسی ہیں اور شبلی کے علمی، ادبی، مذہبی اور تاریخی۔ لیکن باوجود سوانح عمری میں موضوع کے انسانی اور نفسیاتی پہلو کی اہمیت کے احساس کے اپنے مذہبی موضوعوں کے تقدس کا اثر ان پر غالب نظر آتا ہے۔ نہ صرف سوانح عمریوں کی شکل اور ہیئت بلکہ اس کے مواد اور بیان کے معاملہ میں بھی شبلی کے ہاں حالی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ جس طرح شبلی کے مختلف تصانیف مثلاً موازنہ انیس و تیس، شعرا، بیانیہ خسرو اور دیگر تصانیف کے موضوعات و عنوانات بھی ’آزاد‘ اور ’حالی‘ کی تصانیف مثلاً ’آب حیات‘، ’سخن دان فارس‘، ’مقدمہ شعر و شاعری‘ اور ’یادگار‘ غالب وغیرہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان کا طرز تحریر بھی آزاد کے شگفتہ اور جاندار اور حالی کے سنجیدہ مدلل اور واضح پیرایہ بیان کو جھلکا تا ہے۔ انسان پر اس کے ماحول کا عمل اور رد عمل فطری ہے۔ متاخرین کو متقدمین کے تجربے سے استفادے کا بڑا فائدہ حاصل ہے۔ لیکن شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ دار المصنفین کی بنیاد اور مصنفین کے ایک حلقہ اور سلسلے کو چھوڑ جاتا ہے۔

لیکن شبلی نے حاتی کے طریقہ سوانح نگاری میں کوئی خاص اور نمایاں جدت یا ترقی نہیں دی اور بجائے اس کے کہ اس نقاشی اور  
کی خدمات کا فروغ دلی سے اعتراف کرتے ان پر سخت اعتراض کئے ہیں۔ شبلی کے ان اعتراضات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ بظاہر  
یہ حاتی کے موضوعات یا مواد سے نہیں بلکہ ان کے طریقہ بیان سے متعلق ہیں، لیکن نظر غور سے دیکھنے پر پتہ چلے گا کہ درحقیقت یہ حاتی کے  
موضوع اور ایک خاص موضوع یعنی سرسید سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے اس خیال کے ثبوت میں دلائل پیش کرنے سے پہلے بعض نقاد  
کے خیالات کا خلاصہ قلم بند کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ہم شبلی کے ایک عزیز ترین دوست اور معتقد لیکن منصف مزاج  
نقاد جہدی حسن کے ایک بہترین مضمون حاتی و شبلی کے معاصرانہ چشمک کے جس میں انھوں نے شبلی کے اعتراضات کا حقائق کی روشنی  
میں تجزیہ کیا ہے اور جو اس قابل ہے کہ پورے کا پورا نقل کیا جائے، صرف اہم نکات نقل کریں گے۔ شبلی نے اپنی تصانیف مثلاً سوانح مولانا  
روم اور موازنہ انیس و دہیر میں اور دوسروں کی تصانیف مثلاً مناقب عمر بن عبد العزیز اور آثار جمعی کے تبصروں میں ”اردو کی اعلیٰ، اعلیٰ  
سوانح عمریوں“ کے الفاظ میں اشارت و کنایات سے اور دوسروں کو خطوط میں صاف صاف حیات جاوید کا نام لے کر اسے بے جا ترجیح  
فربہ دی، خیانت اور خداعی، غلامانہ شخص پرستی اور مدلل دارجی کا نمونہ اور کتاب المناقب قرار دیا ہے، کیونکہ ان کی رائے میں مولانا حاتی  
نے اس میں سرسید کی ایک رخی تصویر دکھائی ہے اور باوجود دعوت تنقید کے اگر کہیں خفیف الفاظ میں کسی عیب کی طرف اشارہ کیا بھی ہے تو  
اس کا مقصد اپنی تنقید اور نکتہ پسنی کا اظہار کر کے محاسن کو تقویت دینا ہے۔ شبلی نے اس سلسلہ میں مغربی طریقہ سوانح نگاری کے متعلق بھی  
متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کہیں تو حاتی کے اس خیانت و خداعی کے طریقے کو یورپ سے اخذ بتاتے ہیں اور کہیں اس کی وجہ سے موجودہ  
یورپ کے مذاق اور علمی ترقیوں کی بربادی کا اندیشہ ظاہر کرتے ہیں۔ جہدی نے بجا طور پر یہ سوال کیا ہے کہ یہ طریقہ دراصل حاتی کی ایجاد ہے یا  
شبلی کی تصانیف بھی اس دائرے میں آجاتی ہیں، اس کے علاوہ کیا مغربی زبان کی کسی سوانح عمری میں، مولانا کی توقعات کے مطابق، ایسے  
مستقل ابواب، جن میں ”یکے از اقوام جہانم پیشہ“ یا ”باب الاشرار“ کے عنوان سے کسی شخص کے حفظ عیب کا خاکہ اڑایا گیا ہو، ملتے ہیں؟  
خود مولانا شبلی کی تصانیف موازنہ انیس و دہیر، شعرا، حکایات خسرو، المامون، سیرت النعمان، الفاروق اور الغزالی میں انسانی  
کمزوریاں کسی حد تک اچھا کر دکھائی گئی ہیں۔ اگر نہیں تو شیش محل میں بیٹھ کر اوروں پر پتھر پھینکا، ایک خوش ادائی سہی کیا دانا کی بھی ہے  
اور کیا یہ علم النفس کی حق تلفی نہیں ہے جو ایک نکتہ سنج مورخ کے قلم سے ہو سکتی ہے۔ بہر حال یہ کہا جاسکتا ہے کہ حیات جاوید کے لئے حاتی  
کی طرف سے کسی اعتذار (اپولوجی) کی بالکل ضرورت نہیں۔ ایک شریف نے ایک شریف تر انسان کی ہمدردانہ سرگزشت لکھی اور آشنائے حق  
ہو کر لکھی اور یہی اونچے سے اونچا معیار تحریر ہے جو ایمان بالغیب کی حیثیت سے یورپ کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے۔ یہ قطعی ہے کہ حیات جاوید  
کا رئیس الذکر فرشتہ نہیں تھا انسان تھا، لیکن اس کے اخلاقی اوصاف، اس کی اضطراری لغزشوں پر جنھیں انسانی کمزوری سمجھے غالب تھے  
یہی ماہ الامتیاز ہے جس کی بنا پر سوانح نگار کسی بڑے سے بڑے شخص کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ سرسید کی کمزوریاں جن کی بے نقابی  
پر شبلی کو اس قدر اصرار ہے اور جن کے اظہار میں حاتی نے صرف بے دردی سے کام نہیں لیا، دراصل سرسید کی زندگی کے وہ عناصر ہیں، جن کے  
بغیر انسانی اخلاق کی تکمیل ناممکن ہے۔ لیکن اس قسم کی انسانی تعرجات کا بے ضرورت پھیلانا اور تنقیص پہلو کا اس طرح نمایاں کرنا کہ اصلی  
محسن دب جائیں بالکل ایسا ہی ہوگا جس طرح ”ندو“ کے آخری مناقشات کو شبلی کی ادبی زندگی سے وابستہ کیا جائے جس پر مولانا کا سوانح نگار  
کبھی راضی نہیں ہوگا اور اسے شبلی کی ”علیٰ غصیت“ سے دراصل کوئی تعلق نہیں ہے۔ شبلی کے دوست، صبیح الرحمن شروانی نے بھی ایک سخت  
بیروں لکھ کر بزم خود اپنے آہنی قلم سے حیات جاوید کے فاسد مادے کو دور کرنے کی کوشش کی تھی جسے شبلی نے بہت ہند کیا تھا۔ صالحہ  
حیات حسین نے لکھا ہے ”جہاں تک مدلل دارجی کا سوال ہے حاتی کی تمام ادبی زندگی اور سیرت کی دانلی شہادت اس کے خلاف ہے۔ حاتی نے  
علیٰ دنیا اور علیٰ زندگی دونوں میں عمر بھر دیانت داری، انصاف پسندی اور صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اس لئے یہ قرین قیاس نہیں

معلوم ہوتا کہ انہوں نے سرسید کے لئے جو کچھ لکھا اس میں حقیقت کی طرف پوری توجہ نہیں کی۔

مولانا عبدالحق لکھتے ہیں: ”علامہ موصوف کو کسی نامور شخص کی (بشرطیکہ وہ کسی ہم عصر کو اس قابل سمجھیں) سوانح عمری لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا اور انہیں اس سے زیادہ دشواری پیش آئی جو ہماری زبان میں بہتر سے بہتر سوانح عمری لکھنے والے کو پیش آئی ہے۔ انہوں نے اب تک انہیں قدمائے گرام کے حالات پر قلم اٹھایا ہے۔ جنہیں لوگ ایک زمانہ سے پوجتے آئے ہیں اور جن کی تنقید دھمکتہ چینی کتب کے حوالے تک محدود ہے۔ تاہم (بے ادبی معاف) کیا علامہ موصوف تالیفات اس ”پرفریب“ طریقے سے پاک و صاف ہیں۔ اور اس سوچے میں پڑھاتے ہیں کہ ایک سچی ادیب سچی تہذیب کا نمونہ کیوں نہیں ہے۔

ہماری ناچیز رائے میں شبلی کی یہ تنقید حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک کی مثال ہے نہ حالی کے شریفانہ کردار پر کوئی اعتراض ہے نہ معاصر سوانح عمری کی تصنیف کی دوافعالوں سے ناواقفیت کے باعث ہے، بلکہ سرسید سے رشک و رقابت اور ہم چشمی بلکہ دعویٰ برتری (یعنی حالی سے نہیں سرسید سے چشمک) کا نتیجہ ہے۔ شبلی نے حالی کی حیات سعدی کو ایک دلچسپ، محققانہ اور بے مثل سوانح عمری قرار دیا ہے، حالانکہ ان کی ذہانت جلد یا بدیر اس کی محققانہ نوعیت کو سمجھ چکی ہوگی۔ چنانچہ سوانح مولانا روم میں انہوں نے خود حالی کے حیات سعدی کے اس طریقے سے احتراز کیا ہے۔ یادگار غالب کو اردو کی ایک بہترین سوانح عمری بتاتا ہے اور غالب کی رنگین شخصیت کے صفحہ قرطاس پر پیش کیے جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ حالانکہ حالی نے اپنی پہلی سوانح عربوں کے ایک طرف ہونے کا اعتراف خود حیات جاوید کے دیباچے میں کیا ہے لیکن شبلی نے حیات جاوید پر کم از کم نصف درجن مرتبہ سخت سے سخت الفاظ میں اعتراض کئے ہیں جن کے فضول ہونے کا ثبوت ہمدی نے پیش کر دیا ہے۔ محمد حسین آزاد کی سخندان فارس پر شبلی کی تنقید میں یہ تثنیٰ نہیں ہے اور نہ شبلی کی کسی اور معاصر تصنیف تنقید کا یہ لب و لہجہ ہے۔ بذا اگر ہم سرسید اور شبلی کے تعلقات کا جائزہ لیں تو یہ چیز واضح ہو جائے گی کہ ان کی حیات جاوید پر تنقید کا اصل باعث ان کی سرسید سے کدہ ہمدی لکھتے ہیں: ”سرسید نے ہمیشہ معاصرین ادب کی حوصلہ افزائی کی، ان کی بااثر شخصیت خاموش نصرت کے ساتھ دوسروں کی قلب اہمیت کتنی رہتی تھی۔ شبلی نے ”مولویت“ علی گڑھ پہنچ کر چھوڑی۔ ان کے خیالات کی کایا پلٹ مذاق تصنیف اور وسیع الفطری غرض یہ جو کچھ ہوئے سرسید کے دامن تربیت کا اثر تھا۔ جس کے ثبوت میں شبلی کے اس خط کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے جس میں انہوں نے سرسید کی اپنے فنون کتب خانے کے استعمال کی عام اجازت اور تاریخ و جغرافیہ کی جرمنی میں طبع شدہ نایاب عربی کتابوں (جس سے سرسید کے لوگ اور دیگر مشاہیر محروم تھے) کی خصوصاً سرسید کے اپنے صرف خاص سے کرواتے ہوئے کتب کی تاریخ کے متوجہ سے استفادے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن شبلی نے اپنے مضمون ”سرسید کی کوشش تعلیم“ میں ۱۸۸۷ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے کو سرسید کے اسے غلطی مان لینے کے باوجود انہیں اعتراضات اور دلائل کو بھر سیدنے پیش کئے تھے، دہرایا ہے۔ اس کے باوجود سرسید نے الماحول کی دوسری اشاعت کا جس خلوص سے دیباچہ لکھا وہ ان کی شرافت اور لبک دلی کا پتہ دیتا ہے اور الفاروق کی تصنیف میں سراج الدین احمد کی شبلی سے سبقت نے جانے کی کوشش کی ذمہ سرسید نے جن الفاظ میں کی وہ ان کی فخرزدگی کا مزید ثبوت ہے۔ سلیمان ندوی کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ شبلی کے لئے شمس العلماء کے خطاب کی تحریک بھی سرسید نے کی تھی سرسید بقول ہمدی علم کلام کی جدید باتوں میں سے ہیں اور سرسید کی ساری تصانیف ان کی قلم کی آواز بازگشت کی مترادف ہیں، شبلی نے الکلام لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہ آیا۔ حیات جاوید کے سلسلے میں گو وہ ایک حد تک صحیح ہی کیوں نہ ہوں اعتراضات کا بار بار آخر انطاہد کیا معنی رکھتا ہے؟ اس اصرار سے ہمیں شبلی کی نیت پر شبہ ہوتا ہے۔ ہمدی نے بھی اسے محسوس کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ”وہ دلچسپ سوال ابھی باقی ہے کہ حالی کے ہمرو کے ساتھ شبلی کو اس قدر ”چشمک“ کیوں ہے۔ کیا یہ جامع بینشیاں شخصیت شبلی کے ناموران اسلام کا چمک چمکا کرنے والی ہے؟ یا جس طرح ایک خوبصورت عورت دوسری پر کاؤ آتش کو نہیں دیکھ سکتی دراصل بندہ رشک اس کی تہیں؟

ملک کے ایک بہت بڑے فاضل کی رائے کے مطابق سرسید کے بعد اگر اردو میں کوئی قلم اٹھا سکتا ہے تو وہ حاتی ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ حاتی نے سرسید کی صرف کثیر الاوراق لائف ہی نہیں لکھ دی بلکہ یہ اردو لٹریچر میں ایسا اضافہ ہے جو حاتی کی ذات پر ختم ہو گیا، ہمدی بھی اپنی قریب بہ پہونچ کر لوٹ گئے ہیں۔ ان کے اس شک کا جواب ہمیں شبلی کے ایک اور خاص دوست مولانا شریف کے شبلی کی وفات پر دہلی میں منعقد ہونے والے جلسے سے مل جائے گا۔ شریف لکھتے ہیں کہ ”سرسید کی بدولت عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کے باوجود شبلی، سرسید کی فوج کے ایک نامی پہلوان بنے رہے ہیں اپنی سبکی محسوس کرنے لگے تھے۔ انھیں خود قیادت کی جوس تھی اور اسی لئے علی گڑھ سے علیحدگی اختیار کی اور علماء کے سرتاج بن کر سرسید سے زیادہ فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ باوجود شرر کے روکنے کے نہ مانے اور ضد سے سرسید کو ان کے قدر شناسوں کی نظر میں گرانے کی سعی کرتے رہے۔ بالآخر ندوے سے انھیں جو انعام ملا وہ ظاہر ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن شرر کے اس واضح اشارے کو کسی نے زیادہ اہمیت نہیں دی کیونکہ سرسید اور شبلی کی شخصیت کا فرق روز روشن کی طرح عیاں تھا۔ مولانا شبلی کو بھی شاید کبھی بالاعلان اس دعویٰ کی جھڑپ نہیں ہوئی۔ ہمدی بھی اسے بھی جنھوں نے شبلی کی تعریف میں اپنے کئی مضامین لکھیں ان کے میں سوچ میں رہ گئے۔ مولانا آزاد نے اپنے بزرگ دوست کی تنقید پر ایمان لا کر عالم الغیب کے سے اعتماد اور قطعیت کے ساتھ جہری۔ غالب کے تبصرے کے سلسلہ میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ خواجہ مرحوم سوانح نگاری کو محض مرحمت طراوت سمجھتے تھے۔ اس لئے پسند نہیں کرتے تھے کہ ناگوار واقعات کو اُسبھرنے دیا جائے۔ حیات باقیہ میں انھوں نے ہر جگہ ایسا ہی کیا ہے۔ اور جس قدر خاک ڈال سکتے تھے ڈال گئے۔ پروفیسر سرور نے بھی اسے مولانا آزاد کی حسب معمول انتہا پسندی اور قطعیت کا ثبوت قرار دیا ہے۔ پروفیسر سرور، شرر کے خیال کی صحت کے امکان کو تسلیم کرتے ہوئے بھی شبلی کے سرسید سے اختلاف کو اختلاف دہشتاں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اگر کام صاحب بھی سرسید کی طاق سے شبلی کا دل صاف نہ ہونے اور ان کی علی گڑھ تحریک کی مخالفت کا اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن شبلی کا دل صاف نہ ہونے اور ان کی علی گڑھ تحریک کی مخالفت کا اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن شبلی کے اس راز، رمز اور کنائے کو کسی نے سمجھا تو وہ ان کے شاگرد خاص اور جانشین سلیمان ندوی تھے، جنھوں نے ایک طرف تو عبدالرزاق کانبوری کو مولانا شبلی کے متعلق نچی حالات کے بیان کرنے سے روکا اور خود عطیہ بیگم فیضی کے اور ندوے کے معاملات کی تاویل و تفسیر کی اور دوسری طرف ’حیات شبلی میں شبلی کی اپنی اور انسانی تفصیلات کو حیات باقیہ سے زیادہ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا جن کی صداقت کے بارے میں بعض نقادوں کو دیانت دارانہ اختلاف ہے۔ ندوہ کو علی گڑھ کے مقابل رکھا، شبلی کے کارناموں کو سرسید کے کارناموں سے زیادہ چمکانے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ حیات جاوید کی نفاخت کو بھی مات کر دیا۔ سلیمان ندوی کے بقول شبلی کی سرسید کی سوانح عمری لکھنے پہلو تھی (ص ۲۸۳ حیات شبلی) اور تذیر احمد کے سوانح نگار افتخار عالم کو اپنی سوانح عمری لکھنے کی اجازت دینے سے انکار اور اسی کے ہاتھوں کو آلودہ برائیاں شبلی کے غلط احساس برتری کا ثبوت ہے۔ لیکن ان نقادوں کی فوج دار، نقادان سخن میں سے جو علم و ادب کی طرف سے حاتی پر جرح زن تھے کسی نے ان کے متعلق کچھ نہ کہا۔

آخر اس ہم چشمی اور برابر کی دعویٰ اور رشک و رقابت اور چننا کی جو بظاہر مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے وہ کیا تھی؟ ہمدی نے لکھا ہے ”یہ غور طلب ہے کہ غالب کی طرح شبلی کی اخراط خود داری معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں قیاض نہیں، اور الکلام کی مثال پیش کی ہے۔ مولانا عبدالحق، شبلی کو ”اکل کھڑے تنگ مزاج“ کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ ممکن ہے مولانا شبلی کی ماں باپ کی شفقت و محبت سے محرومی اپنی شخصیت کے متعلق اس غیر متوازن رائے اور طبیعتی رشک کا باعث ہوئی ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی زندگی میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں مثلاً اپنے بھائی ہمدی کی بیرسٹری کا خیال ان کو بے چین کرتا رہا۔ والد سوتیلی ماں، لڑکی کسی سے ان کے تعلقات مخلصانہ نہیں تھے۔ عطیہ فیضی کا حال ہی میں شبلی سے تعلقات کے سلسلہ میں احتجاج، شبلی کے ابو الکلام آزاد سے لگے شک و شبہ۔

ہندی جن کی دعوت کی منظوری کے لئے بیگم ہندی کے بے پردہ ہونے کی شرط وغیرہ۔ بہر حال وہ حالی کے خلوص و محبت کی دولت سے محروم تھے اور ان کی زندگی میں خود پسندی اور خود کا ادھ سرائیت کی چکا تھا۔ لیکن ہے ان کی زندگی کی مختلف محرومیاں اور ان کی غیر معمولی ترقی کی خواہش وغیرہ بھی اس کا باعث ہوں۔

شبلی کی سرسید سے ملاقات کے وقت ان کی عمر تقریباً چوبیس سال تھی۔ دل میں ترقی کا جوش اور ولولے تھے۔ سرسید سے ملاقات کے وقت حالی کی عمر شاید چالیس سال کے قریب تھی۔ حالی ان طوفانوں اور چٹانوں سے واقف تھے، جن سے سرسید نے تنہا ٹکری تھی اور ان سے اپنے تعلقات کے زمانے میں نہایت جوش اور عقیدت کے ساتھ نہ صرف ان کا مختلف کاموں میں ساتھ دیا تھا بلکہ خلوت و جلوت میں ان کے ساتھ رہے اور ان کو سرسید کو پرکھنے کا خوب موقع ملا تھا۔ ان کے مقاصد، صفات اور نقطہ نظر کا وہ صحیح طور پر اندازہ لگا سکتے تھے۔ شبلی کی سرسید سے دشمناس ہونے تک بہت حد تک یہ طوفان تھم چکا تھا۔ وہ ان تھپڑوں کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے جو مسلمانوں کو غرور اور اس کے بعد کے ایام میں کھانے پڑے تھے۔ مولانا عبدالحق کو اس سے اختلاف ہوا۔ آپ کے مطابق ”حالی کی گاہ گاہ ملاقات چلی تھی، لیکن شبلی برسوں سرسید کے ساتھ رہے“ اس لحاظ سے تو دیدہ بینا کا معاملہ جس کا ثبوت ان کی ثنوی سے ملتا ہے۔ وہ اس کس بہرہ سے بے بس اور بے جا۔ گی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے جس نے سرسید سے لائل محمد نرائی اور اسباب بغاوت ہندی کی سی سرد گرم کتا ہیں لکھوائی تھیں۔ مسلمانوں کو سرسید کی کوششوں کی بدولت اپنے بڑے بھائی کی کھیر پہنچ گئی تھی۔ وہ قومی اور تعمیری کاموں کی اہمیت کو محسوس کرنے اور اس میں امداد دینے لگے تھے۔ راہ عمل متعین ہو چکی تھی۔ سرسید اور ان کے حلقے کے افراد و نذیر احمد کی وسیع النظری، فرضدلی اور ہمت اخرائی نے شبلی کو شہرت و عورت سے قبل اندر وقت دو چار کر دیا اور وہ اپنی قیادت کے خواب دیکھنے لگے۔ اس کے علاوہ علماء و شرو ع ہی سے مغربی تعلیم یافتوں کے مقابل اپنے آپ کو قیادت کا زیادہ مستحق سمجھتے رہے۔ سرسید اور جناح دونوں کو ان کا مقابلہ کرنا پڑا ہے بلکہ غیر ملکوں مثلاً ترکی، افغانستان، ہندوستان، ایران وغیرہ کا بھی یہی حال ہے۔ شبلی، سرسید کے دست و بازو اور ان کے اکھاڑے کے پہلوان بنے رہنے پر قانع نہ ہوئے اور ندرہ کے بانیوں کے ساتھ مل کر سرسید کے تجربات سے فائدہ اٹھانے اور ان کے طریقوں پر عمل کر کے اسے ترقی دینے لگے لیکن شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ حیات جاوید کے اس سخت مقرر کی حیات میں نجی اور پہلک دونوں طرح کے طوفان آئیں اور بھری کمروریوں کا احساس دلائیں۔ سرسید کی عملی صلاحیتوں، لگے خلوص ہمدردی اور قومی خدمت کے جذبے سے وہ محروم تھے۔ ان کا جوش احتجاجی یا عشقیہ نظمیں لکھنے تک محدود تھا جو سرکار کی جبین پر ایک ساتھ سرد ہو جاتا تھا۔ ان کو وکالت کے پیشہ میں کامیابی نہ ہو سکی تھی۔ وہ سیاست کیا لڑتے، لیکن ان کو اپنی عویہوں اور خامیوں کا بیج علم نہ تھا۔ سرسید کے قوم کے لئے انگلستان سے سفر کے مقابل مشرق وسطیٰ کے سفر، سرسید کے تھنے اور خطاب کے مقابل، سلطان ترکی کا متعدد اس سفر میں خطابات احمدیہ کی تصنیف کے مقابل الفاروق پیش کر چکے تھے۔ چنانچہ ان کا اپنے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا بعید از قیاس و حیا جس کی سزا انھیں بعد میں بھگتنی پڑی۔ ان کی اپنی دورنگی زندگی کے باوجود حیات جاوید پر تلے تنقید اوروں کی حیات شبلی بد تلخ تر تنقید کی شکل میں ظاہر ہوئی اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ وہ شاید اپنے آپ کو سرسید سے زیادہ جامع صفات اور مسلمانانہ ہند کا ہیرو بننے کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے۔

چنانچہ ان کی تنقید حیات جاوید یا حالی پر نہیں بلکہ سرسید پر تھی۔ وہ ان کی عظمت کے دلی سے قایل نہ تھے۔ سرسید کی وفات اور لوگوں کے اصرار پر ان کی ادبی خدمات کا بہت عمدہ تذکرہ کیا تھا، جو ممکن ہے ایک عارضی اور اضطراری جذبے کا نتیجہ ہو لیکن اس میں اپنے الگ راستہ دکھانے کا ذکر تھا۔ اس کے علاوہ اس سے سرسید کا جامع صفات ہونا ثابت نہ ہوتا تھا۔ حالی اور شبلی کے ذاتی تعلقات اور حالی کی فرشتہ پرست زندگی کے مد نظر ان سے کیا کہہ ہو سکتی تھی۔ البتہ کیشیت سرسید کے سوانح نگار اور بحیثیت ”مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم“ والے مضمون کا حاتمہ حاتمہ میں جواب لکھنے والے کے اور سرسید کی معمولی تعلیم، بلکہ ان جسامت قالمیتوں کو عظمت کے لئے لازمی بنانے والے اور سرسید کی حمایت کرنے والے کے، وہ بھی اس چٹک کی زد میں آئے تھے اور شبلی کی نظر میں چھوٹی امت میں شمار ہوئے تھے۔ (اردو)

# قاضی عبدالغفار

(ناظر انصاری)

پیدائش :- مراد آباد - ۱۸۸۸ء

وفات :- علی گڑھ - ۱۷ جنوری ۱۹۵۶ء

تصانیف :- آثار جمال الدین افغانی - آثار ابوالکلام آزاد - لیٹی کے خطوط - جہنم کی ڈائری - تین پیسے کی چوکری - نقش فرنگ - سیب کا درخت - اُسے کہا عجیب

**نامور صحافی** جب ہندوستان میں سیاسی بیداری کے لئے سرگردہ قومی رہنماؤں نے عملی طور پر جدوجہد شروع کی - قومی آزادی کا قاعدہ طور پر آغاز ہوا، ہندوستان کی سیاست میں ایک نئے دور نے جنم لیا - علی برادران نے تحریک خلافت جاری کر کے ملک کے ایک - سرے سے دو سرے سرے تک عوام کے ذہنوں کو بیدار کر دیا - مولانا محمد علی نے دہلی سے اخبار ہندو اور کامریہ جاری کیا، یہیں سے قاضی صاحب کی صحافی زندگی شروع ہوتی ہے - وہ مولانا محمد علی کے ادارتی شعبے میں شریک ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں نائب میر کے عہدے پر فائز ہو گئے - ہوائی کا عالم، دل میں جوش و ولہ اور پھر اس نوخیز دور میں مولانا محمد علی جیسے جید صحافی کی رہنمائی، پشت پناہی اور الطاف و عنایات نے قاضی صاحب کے جہر کو جلا بخشی - اُن کے اوصاف چمک اُٹھے گویا سونے پر سہاگے کا کام ہوا - مولانا محمد علی کی عدم موجودگی میں ہمدرد کے ادارے بھی آپ ہی رقم فرماتے تھے - آپ کو ادارتی فریض کی انجام دہی کے لئے شب و روز کئی کئی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا -

قاضی صاحب بہت ہی کم عمری میں مضمون نگار بن گئے تھے - ہمدرد کے ادارتی فریض اور مطالعے نے آپ کے افکار کو مزید پختگی عطا کی - آپ تحریک خلافت میں نمایاں طور پر حصہ گیر ہوئے اردو کے معدودے چند ہی ادیب ایسے ہیں جنہوں نے اپنی ابتدائی ادبی زندگی میں عملی طور پر اور ذاتی شوق کی بنا پر سیاست میں حصہ لیا ہو -

تحریک خلافت کا عروج سامراج کی نگاہوں میں کشاکش - حاکموں کی زمینیں حرام ہو گئیں، انگریزوں نے مولانا محمد علی کو نظر بند کر دیا - مجبوراً قاضی صاحب دہلی سے کلکتہ تشریف لے گئے - اور وہاں سے روزنامہ جمہور کا اجرا فرمایا - روزنامہ جمہور ہند کا بیباک نقیب تھا -

قدرت نے قاضی صاحب کی فطرت میں حق گوئی و بیباکی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اس لئے وہ بقول علامہ اقبال ع

میں زہرِ بلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

پر زندگی کی آخری سانس تک عمل پیرا رہے - مولانا محمد علی کی قیادت و رہنمائی میں انھیں ہمدرد کے ادارتی شعبے میں کام کرنے اور تجربات حاصل کرنا ذریعہ موقعہ اس سے پہلے ہی حاصل ہو چکا تھا اور وہ مشکلات و تجربات کی بھٹی میں گدھ بن کر نکل آئے تھے - اس لئے جمہور کے ادارے نہایت گراں پایہ ہوتے تھے - ہر لفظ میں حق و صداقت اور قومی آزادی کی جہد مسلسل کی وہ آگ پنہاں رہتی تھی جو اپنے قارئین کے رگ و پے میں آتش سماں بن کر دوڑ جاتی تھی - قاضی صاحب اپنے نظریوں کو بہانہ دہل عوام کے روبرو پیش کرتے تھے - اس بیباکی و حق گوئی کے باعث "جمہور" بڑی شہرت حاصل کی - انگریزی حکومت یہ کیونکر گوارا کرتی - اول تو موصوف کا نا طعہ بند کرنے کے لئے ضمانتیں طلب کی گئیں - پھر پریس ضبط، باگم حکومت کا عتاب پوری سفاکی پر اُتر آیا - اور آپ کو نظر بند کر دیا گیا - اس طرح جمہور کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا -

نظر بندی سے رہائی پانکر قاضی صاحب دہلی تشریف لے آئے۔ تمناؤں کا طوفان تھمتا ہی نہ تھا۔ دل میں اُمتنگیں، جگر میں حوصلہ اور قلم میں مادہ تھا۔ عوام منزلِ نوکی جانب قدم بڑھانے پر مجبور کر رہے تھے۔ آپ نے پھر نئے سرے سے زندگی کی شیرازہ بندی کی اور دہلی سے اخبار ”صباح“ جاری فرمایا۔ پھر اُسی بیباکی سے مقالات لکھنا شروع کئے۔ پھر حکومت کا عتاب نازل ہوا۔ جسے خندہ پیشانی سے برداشت فرمایا۔ ضمانتیں طلب کی گئیں اور انھیں ضبط کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پورے ہندوستان میں علی برادران کی سیاست کا طوطی بول رہا تھا اور ان کے حکمت و تدبیر کا اہوا مانا جا رہا تھا۔ تحریکِ خلافت پورے شباب پر تھی۔ آپ نے اس تحریک میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا اور وہ فخرِ خلافت کے ہمراہ لندن تشریف لے گئے۔ آپ کو مسلم قائدین مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجل خاں، ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کی معیت میں کام کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ دو تین بار یورپ تشریف لے گئے۔ یورپ کی ان سیاحتوں کے تاثرات کو کتابی صورت میں قلم فرمایا۔ جس کا نام نقشِ فرنگ ہے۔

”صبح“ کے بعد آسمانِ دلخیز میں حیاتِ آجمل لکھی۔ پھر مراد آباد پہنچے۔ وہاں صدر بلند یہ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ لیکن چند ہی روز کے بعد حیدر آباد تشریف لے گئے۔ وہاں سے ”پیام“ جاری فرمایا۔ یہ بھی نہایت مبہاک اور بلند بانگ جریدہ تھا۔ یہ روزنامہ اپنی نفاست، تنوع اور حکمتِ عملی کے لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس اخبار نے عوام ہی نہیں نواس کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ہر طبقے میں مقبولیت کے باعث پھیل جانے لگا۔ قاضی صاحب نے اس میں اپنے قلم کے وہ جوہر دکھائے کہ دنیا بھر کے صحافی وادب میں اس نے ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔ قیام حیدر آباد کے زمانہ میں مملکتِ آصفیہ کے دارالہمام سرمرزا اسماعیل صاحب نے آپ کو ڈائریکٹر آن: ٹی (ناظمِ حکمرانِ اطلاعات) کے عہدہ جلیل پر فائز کر دیا تھا۔

ہمہ گیر شخصیت عوامِ چٹان کی طرح مضبوط و مستحکم تھے۔ وہ کارِ نازِ حیات میں ایک بلند و سدِ سپاہی کی طرح خبر و آزار رہے ہیں۔ چنانچہ ”ابو الکلام آزاد“ کے دیباچے میں خود اپنے متعلق فرماتے ہیں:-

ساتھ برس میری زندگی جس مسلسل نشیب و فراز، گزری اور کی حالت یہ رہی کہ اگر شام کو "نشیب" ہے تو صبح کو "فراز" اور صبح کو "فراز" ہے تو شام کو "نشیب"۔ اس نے میری زندگی میں میرے ارادوں کا عمل و فعل بہت کم ہمارا لگاؤ کی پیٹ تحلیل اور مقاصد کے مسلسل انہدام کا یہ سلسلہ کبھی رکا ہی نہیں۔ اور اس حالت میں جب صورت یہ تھی کہ ۶

نے ہمارے باگ پرستہ شہنشاہت رکاب میں

میں خود اپنے ادھورے عواجم سے لڑتا رہا ہوں۔ اس کی مثال میرے کتبہ ہیں۔ میری کتابیں (بہم) میری طرف بہت سے نشیب و فراز سے گزری ہیں۔

ایک نوع سے فاضل صاحب نہایت خوش قسمت بھی وقت ہوا۔ یہ تھیں جنہوستان نے اپنے تئیں مقتدر اور سرکردہ قارئین کے ساتھ رہنے اور اپنے بیش قیمت لمحات کو فراموش گزارنے کا نامور موقع ملا تھا۔ وہ ہندوستان کی ریاست سے ہمیشہ علمی تلو پروردانہ رہے۔ مولانا محمد علی کی قیادت و رہنمائی میں ہمدرد کے اداسہ میں صیافت کا فن حاصل کیا۔ انھیں سے خواجہ ابی دین کی جوہر نے جلا پائی۔ فاضل اہل مولانا ابوالکلام آزاد کی قرابت و رقابت میں آپ کے علم و فضل نے معراج ارتقا حاصل کی۔ آپ کے کلم نے مولانا موصوف سے رنگین بیانی کا بے بہا درس پایا۔ سقوطِ حمید آباد کے بعد آپ دلی تشریف لے آئے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ایما سے کل ہند انجمن ترقی اردو کے مستند خصوصی بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کا عہدہ سنبھالا اپنی مسلسل عداوت اور گرافٹی طبع کے باوجود اپنے فریض نہایت حسن و خوبی سے انجام دیتے رہے۔ انجمن ترقی اردو نے اتر پردیش میں جو دھنسی جہم شروع کی تھی اپنی صحت کی خیرابی کے باوجود اس میں بہت کام کیا۔ اس لئے آپ کی زبردست تمنا تھی کہ اتر پردیش میں اردو علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لی جائے۔

وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ہر ایک وقت ایک ٹرڈر اور جہیز صوفائی، ایک صاحب طرز، نقاش، دانا، کامیاب ادیب، مسلم نقاد،

ناول نگار، افسانہ نویس اور ڈرامہ نگار تھے۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دی ہیں۔ وہ صرف ناقابل فراموش ہی نہیں بلکہ ہمارے لئے ایک سبق آموز بھی ہیں۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں چند ہی ایسی ہستیاں پیدا ہوئی ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کا کچھ زبان و ادب کی خدمت میں صرف کیا۔

اردو ادب کے اس عظیم المرتبت رکن کی رہنمائی اور قیادت میں نئے انکار و خیالات اور انقلابی تحلیلات اور نئی تحریکات نے جنم لیا۔ اس لئے آپ کو ترقی پسند ادب کے ہر اول دستے کا پیر کارواں کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ آپ کے روشن افکار نے ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے سے قبل انقلابی خیالات کو اردو ادب میں رائج کیا تھا۔ آپ کی تخلیقات ترقی پسند حضرات خصوصاً افسانہ نویسوں کے لئے مشعل راہ بن گئیں۔

آپ نے صرف ترقی پسندوں کی حمایت کی بلکہ ان کی حوصلہ افزائی میں بھی پیش پیش رہے اور یہ چیز آپ کے اکثر مقالات و خطبات سے ظاہر ہوتی ہے۔

قاضی صاحب کا ادبی شہریت و عظمت کی اساس آپ کی مشہور و معروف تصنیف ”لیلیٰ کے خطوط“ کے مندرجہ شہرہ آفاق پہلوؤں کے ہونے کے بعد ہی بڑی ہے۔ اردو ادب میں اپنے طرز کی منفرد تصنیف ہے۔ ”لیلیٰ کے خطوط“ سب سے پہلے لاہور کے مشہور و مقبول ماہنامہ ”نیرنگ خیال“ میں اقساط شائع ہوتے تھے۔ اس کے مالک میر جناب حکیم یوسف حسن صاحب نے اسے کتابی صورت میں شائع کروایا تھا۔ اگرچہ ناول نہیں ہے لیکن ناول کی مدین ضرور شمار کی جاسکتی ہے۔ فنی اعتبار سے اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ نوخیز اہل قلم حضرات کے لئے قاضی صاحب کے طرز تحریر نے رہنمائی کا کام کیا۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو قدردانوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اردو ادب میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ آپ کے طرز بیان اور لیلیٰ کی زبان نے اردو دنیا میں دھوم مچادی۔ اردو والے اس سے بے حد متاثر ہوئے لیلیٰ کے خطوط اردو کی اُن معدودے چند کتب میں سے ہے جنہیں عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب آج سے ۲۵ سال قبل لکھی گئی تھی لیکن آج بھی اُسی شوق و اہماک سے پڑھ جاتی ہے۔

لیلیٰ کے خطوط اپنے دور کے سماجی نظام اور قوانین کے خلاف ایک زبردست احتجاج کا ثبوت جیتا کرتی ہے اُس میں کردار ارتقائی منازل سے گزرتا ہے۔ اُس کا اُچار اور پھیلاؤ منزل بہ منزل ہوتا جاتا ہے۔ منزل اول میں اُس کی انفرادیت اُس کے لئے کی فکر میں غم ہو جاتی ہے۔

منزل دوم میں ایک خواہمیدہ عورت انگریزی لیتی ہوئی بیدار ہوتی ہے۔ اور زندگی کی ہر ساحت کو خوشگوار و شادمان بنانے کے حسین خواب دیکھتی ہے۔ اُس کے دل میں صحت مند تئناؤں اور شاداب و حیات بخش خواہشوں کا احساس بیدار ہوتا ہے۔ وہ چند ذہنی الجھنوں اور کشاکشوں میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ وہ کون سے کہاں سے آئی ہے یا لائی گئی ہے اور اُس کی منزل مقصود کیا ہے۔

تیسری منزل میں وہ اپنے آپ کو خود غرض اور متکار انسانوں میں محصور پاتی ہے اور بالکل پہلی مرتبہ اُس کے دل میں یہ تمنا بیدار ہوتی ہے کہ وہ کسی ایک کی ہو کر رہے اور اپنی ذاتی دور کی جیسی آوارگی سے باز آکر ایک صحیح اور بہتر راستے پر آ جاتی ہے۔

لیلیٰ کے خطوط میں قاضی صاحب ایک روحانوی ادیب کی شکل میں اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں۔ آپ کی اس روحانوی طرز تحریر کا دھن اور جوش خطابت بہت اُبھرا ہوا ملتا ہے۔ مرد و عورت کی رفاقت، جنسی کشش اور عشق و محبت کا فلسفہ انھوں نے اپنے مقام سے بیان فرمایا ہے۔ اُس میں نہ صرف روایت ہے۔ بلکہ توانائی، صحت مندی اور تعمیر پسندی کا عناصر غالب ہے۔ آپ کے نزدیک زندگی میں جبر کو دخل دینا مہلک ہے۔ وہ سماج کے ٹھیکیداروں کو اپنے فرائض پاد دلاتے ہیں اور اُن کے دلوں میں قدمہ داری کا خوشگوار احساس پیدا کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں اور زندگی کو ایک نئے زاویے سے بیان کرتے ہوئے نئے شعور کو ابھارتے ہیں۔ لیلیٰ کے خطوط اپنے وقت کے انسانی قوانین کی مخالفت کرنے والی ایک زبردست احتجاجی تصنیف ہے۔ مرد و زن کے تعلقات کو معاشرہ محنت پر مستحکم بناتی ہے۔ سماجی قوانین کی

دو ارسل جو دونوں کی دھڑکنوں میں سدا رہا اور بغاوت کا درس دیتی ہے۔

یہ کتاب بتاتی ہے کہ قاضی صاحب کی نظر کس قدر گہری اور ذہن کتنا بیدار تھا اور دونوں سے وہ کس قدر اہم خدمات لیتے تھے۔

پہلی کے چند باب غیباۃ اور انقلابی خیالات ملاحظہ فرمائیے :-

(۱) آپ نے کیوں اپنے مافی الضمیر کو الفاظ کے پردے میں چھپایا۔ شرانے کا کوئی محل نہیں۔ یہی تو کہ آپ ”رسم و راہ“ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے صاف یوں کیوں نہ کہا کہ آپ بھی میرے حسن کے خریدار ہیں، آپ نے شب کے دسترخوان پر میری شرکت اپنے لئے باعث مسرت بتائی ہے آپ نے کیوں نہ فرمایا کہ آپ کی پہنزل دسترخوان کی حدود سے آگے ہے۔ کیا نہیں ہے؟ بندہ نواز کسی دوکان پر جائے تو استعارہ اور اشارہ سے قطع نظر کر کے گاہک کی طرح سودا کیجئے۔

(۲) قسمت بُری سہی پ طبیعت بُری نہیں، میری زندگی ناپاک ہے مگر اس عشوہ فروشی کے بازار میں آنے سے پہلے مجھے علم و تہذیب و شرافت کی اتنی دولت حاصل ہو چکی تھی جتنی کہ عام طور پر شاید اچھے گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو بھی حاصل نہ ہوتی ہو۔ اس بیان کو خود فریسی اور ہند پر محمول نہ کرنا۔ جو اہر اصلی کچھ میرے بھی پاس تھا۔ فطرتِ انہی نے مجھے بھی میرا حصہ دیا تھا۔ مگر میرے قلب کو میری زندگی کو تلخ کام کر دیا ہے میں دل ہی دل میں اپنے وجود سے شرمایا کرتی ہوں۔ مگر اس مکروہ دنیا اور مکروہ تر دنیا والوں نے جہاں پھینک دیا جس گندگی میں ڈال دیا اُس میں مبتلا ہوا۔

(۳) کہہ رہے ایک خوب صورت آنکھ بنایا لوگوں نے اُس کو جام صہبا بنایا یا کہہ رہے ایک جام صہبا بنایا لوگوں نے اُسے آنکھ سمجھ کر مسجد کی دیوار پر رکھ دیا۔ تو پھر کیا اُس مٹی کی حقیقت بدل گئی جام میں چاہے شراب بھر دو چاہے زہم۔ عورت کو بیوا بنادو یا گھر کی ملک جو چاہے بنادو۔ مردوں نے جیسا چاہا عورت کو ویسا بنادیا۔ بازاروں میں بٹھا دیا۔ برباد کر دیا۔ ہیرے کی چمک تم نے چھپین لی۔ اور جو سنگریزہ بچا اُس کو مٹی میں ملا دیا۔ موتی کی آپ تم اڑا لے گئے۔ اور جو باقی بچ رہا اُس کو ہوا میں اڑا دیا۔ اب رہا کیا ہے کہ تم عشق و عاشقی کی داستان لے کر آئے ہو۔

(۴) حقیقت یہ ہے کہ مرد اپنے ضمیر کو خوب دھوکے دینا جانتا ہے وہ اپنے گناہ کا نفس کے مکروہ چہرے کو خوشنارنگ و روشن سے چھپا لیتا ہے۔ اپنی ہوس کو عشق کہتا ہے اس عشق کی تمہیں کھانا ہے اور اپنے دل و دماغ کو زہر دستی ایک تند شراب پلا کر بخند کر لیتا ہے۔

(۵) عطائے توبہ نکاتے تو، میری یہی عرض کرتی ہوں کہ ”نوا گراں خور وہ گزند را چہ خیر“ تمہاری منتخب لغات میں انہی کس کا ہم ہے۔ تم نہ جانتے ہو تو میں بتاؤں۔ ایک انہی میرے پاس بھی ہے۔ ایک انہی میری رگ جاں سے بھی لپٹا ہوا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ تمہارا انہی تمہارا نفسِ بلیغ ہے جو تمہیں کھائے جاتا ہے اور میرا انہی مجھ سے دلوں دقت کھانے کو مانگتا ہے۔ تم مجھے ”نور وہ گزند“ کہتے ہو شرم تو نہ آتی ہوئی۔ کم نظر نظر آتا۔ کاش کہ تو جانتا کہ میرا انہی تیرے انہی سے بہت زیادہ زہریلا ہے۔ میں چاہتی تو اس ”بہ زہر شائبہ گل انہی“ کا یوں جواب دیتی کہ

تو اسے کہو تو باجم حرم حبہ میدانی

تپیدن دل مرغان رشہ بر بار

(۶) جب ضرورت ہوئی، اپنی نفس پر اشد اور اُس کے رسول کی دلیل لائے۔ روقی مہرورقی، بیمار، اولاد کی کثرت تمہارے خیال میں گویا اشد پر تمہارا ایک احسان ہے، کہتے ہو امتِ محمدی کا بڑھانا ہر مسلمان مرد کا فرض ہے۔ گویا نعوذ باللہ خدا تم سے یہ توجہ رکھتا ہے کہ تم کاٹے، ٹکڑے کر لو، جس قدر بچے پیدا کر سکو کئے جاؤ۔ مرنے دو اگر تمہاری بیویاں بچے پیدا کرتے کرتے مر جائیں۔ بچوں کے پیدا کرنے میں کوئی ایسی رکاوٹ گوارا نہ کرو جو تمہارے تعیش میں حاص ہے۔

(۷) اگر مجاہد پیدا نہیں کر سکتے، اگر آزاد شہری پیدا نہیں کر سکتے تو کچھ بدوا نہیں جو ہے کے بچے پیدا کرو۔ اندھے پیدا کرو۔ جذامی پیدا کرو

غلام پیدا کرو۔

(۸) جب ازدواجی زندگی کی بوجھل گاڑی نہیں چل سکتی اور مرد کی ہوسناکی کے مظلوم شکار دم دیدیتے ہیں تو مرد کس قدر روتا اور چلاتا ہے۔ ہائے میرا گھر تباہ ہو گیا۔ چند روز تو اس قدر خنچتا چلاتا ہے کہ گویا عنقریب وہ بھی مرحوم کی قبر میں گھر بننے لگا۔ لیکن دو ہی مہینے کے بعد عقد ثانی کی گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔ کیا کروں، روٹی پانی کی تکلیف ہے دوسرے نکاح پر مجبور ہوں۔ نہ کروں تو کیا کروں۔ بچے بے آرام ہونگے، میں تنہائی میرے لئے عذاب جان ہے۔ حالانکہ ان عذرات کے پردے میں نفس کا ایک شدید تقاضہ رہوش ہوتا ہے۔ جو ستر اسی برس کے بوڑھوں کو بھی عقد ثانی پر آسانی آادہ کر لیتا ہے۔

مردوں کے لئے تو عقد ثانی اس قدر ضروری ہے مگر ”شرقا“ کے گھروں میں بیوہ کی شادی کا سوال اب تک بہت معیوب ہے۔ یہ سب پیش پا افتادہ حقایق ہیں۔ تم نے کبھی غور نہ کیا ہوگا، میں خوب جان گئی ہوں مرد کی مکاریوں کو۔

(۹) جب تک زندگی کے تلخ تجربے مرد کی حقیقت کو اُس کے سامنے بے نقاب نہ کر دیں سو سائٹی اور مذہب نے جس کے ٹھیکیدار صرت مرد ہیں۔ عورت کو اس قدر گھیر لیا ہے اور بے دست و پا کر دیا ہے کہ نکاح عورت کی شکست اور مرد کی فیصلہ کن فتح بن جاتی ہے۔

لیٹی کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری، قاضی صاحب کا ایک تاریخی اور ادبی کارنامہ ہے۔ اُن کی لیلیٰ، مرزا رسوا کی ”امراؤ جان ادا“ سے بہت مختلف ہے۔ ہماری سو سائٹی میں عورت کی کیا حیثیت ہے اس حقیقت کو اُنھوں نے نہایت جرأت سے بیباکانہ انداز میں بیان فرمایا ہے۔ جاگیر دارانہ اور سرمایہ پرست سو سائٹی کی گندگی کو صاف طور پر طنز پر پیرائے میں ظاہر کرتے ہیں۔ آپ سے پہلے ناول نگاروں نے حسن و عشق کو ادراکی اور افلاکی چیز کے روپ میں ظاہر کیا تھا۔ مگر آپ نے دونوں کو فضا سے ارضی سے انوس کہا ہے۔ طوائف کی زندگی کو نہایت جرأت آمیزی سے بیان فرماتے ہیں۔ اس کتاب کو ایک تاریخی حیثیت اس لحاظ سے بھی دی جاسکتی ہے کہ اُس کے تصنیفی دور میں اس قسم کے بے باکانہ خیالات کا اظہار ”گناہ گیارہ“ کی حیثیت رکھتا تھا۔

مجنوں کی ڈائری لیٹی کا دوسرا رخ ہے۔ وہ بھی اسی طرز پر لکھی گئی ہے۔ مجنوں بھی اپنے دور کے سماجی قوانین کی جبری پابندی کی فلاح ورزی پر آمادہ ہو جاتا ہے اور بغاوت برپا کرتا ہے۔

چنانچہ مجنوں کی ڈائری سے اُس کے انقلابی اور باغیانہ خیالات کا اظہار ہوا ہوتا ہے :-

”اللہ بچائے عورت کے چلتروں سے کیسی شکر چڑھی ہوئی گویاں ہیں، اندر کر دے، باہر سے میٹھی، بٹیوں کے پٹے، نرم ہاتھوں کے اندر چپے ہوئے، خوب دیکھ لیا ان سب کو۔ سندر بائی نے کیسا کیسا بچھا۔ ناکوں چتے چبوا دئے، روپے بھی دو خوشامی بھی کر دے، گالیاں بھی سنو۔ برتیاں بھی کھاؤ۔ اپنی ناک بھی کٹھاؤ۔ روتے روتے مر جاؤ۔ مگر شہر میں چوٹ نہیں لگتی۔ خدا ہی بچائے ان جادو گر نیوں سے۔“

اب ذرا ان بی لیلیٰ کے بھی رنگ دیکھتے ہیں، بات ہی نہیں کرتیں میٹھی ہیں میرے پاس مگر بولتی نہیں بچاری۔ کیا میں ان ترکیدوں کو نہیں باقتا۔ کمان زید کی طرح کھینچیں اور تیر لٹکے بکرے سینے پر۔ ان کو بھی دیکھنا ہے۔ ابھی خدا نو گر قتا رہیں۔ مگر اپنے فن کے سب امتحان پاس کر کے آجی ہو گئی۔ ان قہر دں کے مردوں کا صحیح حال تو صرف دوزخ کے فرشتوں ہی کو معلوم رہتا ہے۔ خیر چیز بری نہیں۔ رات دس پانچ اور بھی اس طرح نشان باندھے ہوئے تھے۔ بڑا ہی حریف ہوتا ہے جسے مرد کہتے ہیں، عورت کے معاملہ میں کبھی بس نہیں کہہ سکتا۔ جو مل جائے، جہاں مل جائے کچھ نہیں تو آکھ ہی سینک لگا۔ اور ہے بھی کہ دنیا میں آخر عورت کے وجود کی اس کے سوا اور غرض ہی کیا ہے۔ ”طلب“ مرد کی ہے اور وہ ”مطلوب“ ہیں۔ باغوں کے پھول بھی تو اسی لئے دامن میں بھرے جاتے ہیں کہ وہ حسین ہیں اور معتبر۔ اُن کی فروغ بکسر ”مطلوب“ ہے۔

قوت کے تقاضوں کو قانونی باندھ سکتا ہے مذہب - وہ تو ہمیشہ آزاد ہی رہے اور آزاد ہی رہیں گے۔ مرد، عورت  
رہے گا اور عورت، عورت ہی۔

۲۵ فروری ۱۹۷۹ء

میں نے کہا :- ”آپ کے حسن کے چرچے ہیں“  
منہ بنا کر سہیلی نے کہا :- ”حسن کو آپ کیا جانیں۔ آپ لوگ تو اپنی ہوس کو جانتے ہیں۔ دوسروں کے حسن  
سے واقف نہیں۔ آپ حسن کو کھال کے اوپر دیکھتے ہیں اور ہوتا ہے کھال کے نیچے۔“

۱۲ مارچ ۱۹۷۹ء

”کچھ بھی ہو، عورت تو ذہین اور دلچسپ ہے۔ ایسی سلجھی ہوئی باتیں کرتی ہے کہ میں تو حیران رہ گیا۔ پھر اس کا حسن  
اور اس کی فطرت۔ میں نے بتایا ہو کر یہاں تک کہہ دیا کہ روز شام کو تشریف لایا کیجئے۔ مگر کیا صاف جواب دیا ہے عالم نے  
کہنے لگی :- ”جی ہاں! روز آپ کی خدمت میں آجا یا کروں تو میری جان کھانے والے دس پانچے اور جو ہیں وہ  
کہاں جا کر سر پھوٹیں گے۔ میں جا کر ادھر کھڑا ہوں۔ سرائے کی بھٹیاری ہوں۔ جو مسافر آئے اس کے لئے بستر بچاتی  
ہوں۔ کھانا پکاتی ہوں۔ میں اپنی سرائے چھوڑ کر کہیں باہر جا بیٹھوں تو میرے مسافر کیا کریں۔ اگر آپ میرے حال پر  
مہربان ہیں تو کبھی کبھی آجا یا کروں گی۔“  
حسن نہیں کر باتیں کرتی ہے۔ مگر اس کی ہنسی میں ایک اور جھلک ہے جیسے درد کی جیسے بیمار سمجھتا ہے۔

۱۱ مارچ ۱۹۷۹ء

”مولا انیسواں صاحب، خدا جانتا کہاں ت (ہر بلائے کنز آساں آید) نازل ہوئے۔ پند و نصائح کا پٹارا  
کھل گیا۔ یہ گناہ، وہ گناہ۔ پیغمبر وہ کبیرہ۔ دوزخ اور فرشتے اور منکر نکیر۔ بچے لگے :- ”میاں اب تو شعور کی  
عمر تک پہنچ گئے ہو۔ اب ذرا اپنے ضمیر سے محاسب کیا کرو۔ گناہ کی زندگی کا فتنہ شروع میں تو بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ مگر  
آخر میں تباہ کار ہو جاتا ہے۔“  
پھر دے جانے کتنی آیتیں اور حدیثیں بیان کر ڈالیں۔ میں تو گناہ کا نام سنتے سنتے تھک گیا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے  
کہ گویا انسان کی زندگی میں گناہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔  
گناہ ! گناہ !! گناہ !!!

میں نے آخر میں کہا، ”حضرت آپ اپنے مذہب کا پٹارا میرے سامنے کھولے نہیں۔ تو بازی لگتی چھوٹی ہے۔ میں آپ کا ڈھکوسلوں کا قائل نہیں“

۱۱ مارچ ۱۹۷۹ء

”میں نے کچھ کہا۔ اور اس اور اس مرد کو کہہ دیا :- ”تم کو یہ زبیا نہیں۔ تم تو دنیا میں بیٹے ہنسائے کے لئے بھیج گئی ہو  
اب میں آگے کو انہوں سے کہا ملو۔“ میں نے لکھا :- ”میرا بیٹا ہنسائے ہے۔ مگر میری طرف نہیں ہے۔ میں ہمیشہ  
گناہ ہے اور خوشنویسی۔ ہوس بلکہ غلہ لہی ہوتی ہے اور گناہ قبیحہ رہتا ہے۔“

مجھے تو مذہب سے شکوہ ہے۔ کہ اُس نے مردوں کو حورِ قنوں پر مسلط کر دیا۔ یہ تم نے سچ کہا کہ خوف کی بنیاد پر جو تنظیم کی جاتی ہے۔ وہ انسانوں کی انسانیت کو مجھل اور مجبور بنادیتی ہے۔ وہ نماز، نماز کیا ہے۔ جو دونوں کے درمیان جنت کے مردوں کی امید پر پڑھی جائے۔ لوگ مذہب کی پابندی زیادہ تر دوسروں کو دکھانے اور محبوب کرنے کا طامع اور بدنامی کے خوف سے کرتے ہیں، سب یا تو بزدل، جھوٹے اور مجھل ہیں یا مکار اور دُنیا ساز۔

”آؤ! ہم تم اپنے ضمیر اور اپنی عقل سے محاسبہ کریں۔ میں تمہیں بتاؤں کہ میں کیوں اپنے کو تم سے بہتر اور بہتر سمجھتی ہوں۔ تم مکار اور بزدل ہو۔ میں مکار ہوں نہ بزدل۔ میرے اندر تم سے بہت کچھ مجہولیت ہے۔ میں ایک گندہ پیشہ کرتی ہوں۔ لیکن اپنی گندگی کو چھپاتی نہیں۔ نہ اس کو پاکیزہ بنا کر دکھاتی ہوں۔ تم عیاشی کرتے ہو، تم دنیا والوں سے ڈر کر مکاریاں اور حیلہ بازی کرتے ہو۔ میں کھلم کھلا اپنے گھٹیا کردار کا اعلاں عام کے ساتھ سن فروشی کرتی ہوں، مگر تم جب مجھے اپنے گھر بلاتے ہو تو رات کی تاریکی میں بنگار گاہی کے اندر، برقعہ اور ماکر پھر مجھے لے کر بیٹھتے ہو تو گھر کے دروازے بند کر کے۔ تمہارے دل میں دنیا والوں کا خوف اور رسم و رواج کی غلامی موجود ہے۔ میں اس سے آزاد ہوں۔ اگر میرے تمہارے تعلقات مذہب کی اصطلاح میں گناہ بھی ہیں تو تمہارا گناہ میرے گناہ سے بدرجہا بدتر ہے۔ اس لئے کہ اس میں بڑا حصہ مکار اور خریب ہے۔“

۱۸ اپریل ۱۹۲۹ء

سوچ کے طلوع کی خبر ہوئی: غروب کی۔ ہم سے بڑا بادشاہ کون؟۔ وقت بے حساب فرسٹ بے شمار۔ نگر صوفی اتنی کہ دن میں چار دفعہ بھوک لگتی ہے۔ آفتاب نکلے یا غروب ہو جائے ہمارے گھر جا کر ہے۔ اپنے وقت پر آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ ہمیں کچھ خبر نہیں کہاں سے آیا اور کہاں گیا۔

جوانی! جوانی! جوانی!!!

میں تو کہتا ہوں آدمی جہان ہو کر مر جائے۔ جس دن محسوس ہو کہ عمر کا نصف اعضاء میں پیدا ہونے لگا کچھ کھا کر سو رہے دُنیا کو ضرورت ہے نہ تو جوانوں کی۔ بڑھے تو مار گیتی کے سینے پر خواہ مخواہ پتھر کی طرح رکھے رہتے ہیں۔

لیٹی اور جنوں کے باغیانہ اقوال سے: بات پانچ بیویاں کو پہنچ جاتی ہے کہ قاضی صاحب کے منتخب کردار جو سائٹی کے رجسٹر پر تانہ قوانین کے طعن اور اپنے ترقی پسندانہ جذبات کی حمایت میں سواج سے لپکا کر لیا گیا ہے۔ اور اسے خود دار واقع ہونے کی اپنی تباہی کو محسوس کرنے کے بعد وہ اُسے رعب ہونا پسند نہیں کرتے۔

قاضی صاحب کے روانوی طرزِ تحریر کے متعلق اردو کے مشہور نقاد جناب ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے اپنے ایک مقالہ ”اردو ادب میں لادنی تحریک“ میں بڑی گراں قدر اور پیش قیمت رائے ظاہر فرمائی ہے فرماتے ہیں:-

”عبدالعقار کے یہاں روانوی طرزِ نگارش کا تمام سراہ اپنے پورے شباب پر ملتا ہے۔ اُن میں جذباتی و فوس ہے۔ اور خوبصورتی ہے۔ اور شدید تاثرات ہیں، زندگی سے بیزاری اور بے رغبتی ہے۔ سرمستی اور رنگینی ہے۔ لیکن اُن کے اختتامیہ حصوں میں بڑا توازن اور عقلیت ملتی ہے۔ اور یہ اُس دور کی روانیت میں ایک اضافے سے کم نہیں ہے۔“

حیاتِ اعلیٰ، آثارِ جمال الدین افغانی اور آثارِ ابوالکلام آزاد کی طرح لیٹی کے خطوط اردو ادب کا غیر فانی سراہ ہے۔

سے اس کتاب نے نو آموز معنفین کے لئے نئی طرز نگارش کی شاہراہیں کھول دیں۔ چنانچہ اس کے بعد ہمیں رسائل کے صفحات پر ”ادب و لطیف“ کے اکثر نادر نمونے نظر آتے ہیں۔

**بحیثیت نقاد** قاضی صاحب ایک باشعور فن کار تھے، اُن کے دل و دماغ میں گویا آگہی کا آتشکدہ بھڑکتا رہتا تھا جس سے شعلوں سے وہ اپنے مطالب و مقالات میں معنویات کی گرمی بھردیتے تھے۔ اُن کے عظیم ادب کا سرچشمہ جس سے تصور سے رواں دواں ہے وہ اُن کی ادبی عظمت کو اجاگر کرتا ہے۔ اُن کے نقد و ادب کا سرچشمہ شعرو ادب کی سر زمین کو سرسبز شادو بناتا ہے اور مقلدین کے لئے نئے ترقی یافتہ مسائل کی آبیاری کرتا ہے۔ اردو شعرو ادب کی ذہنیت کو بدلنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ ادیبوں کے قوائے عمل کو ایک مستحکم توانائی اور نشاط نو بخشتا ہے۔ آپ کے اسلوب تنقید نے شعرو ادب کا مزاج بدلنے میں ایک حکیمانہ کام کیا ہے۔ آپ کی تنقید کا چمک بہت پختہ اور بہت گہرا ہے۔ آپ شدت احساس سے شعری موضوعات میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرتے ہیں۔ ”غزل“ پر تبصرہ کرتے ہوئے شاعر اور شعر کے لئے کتنی معقول رائے پیش کر رہے ہیں۔

”شعر شاعر کی شخصیت سے جدا نہیں ہوتا۔ اور اگر ہو تو شعر شاعر سے اور شاعر شعر سے بہت دور ہو جاتا ہے۔ وہ بطن میں ایسا تصنع پیدا ہو جاتا ہے جو ادب ذوق کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔“

اس طرح مجروح کی انفرادیت کے متعلق فرماتے ہیں :-

”اس انفرادیت کے اکثر پُرسپ پہلو مجروح کی شخصیت میں نمایاں ہیں، لیکن اُن کے کلام کا حسن = ہے کہ جب اُن کی انفرادیت کوئی دعویٰ کرتی ہے تو وہ سخی اور گھینڈ کی آلودگی سے پاک ہوتا ہے مثلاً :-

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل اگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضمول کہاں میں جے چھوٹا گمراہ جاوداں بنتا گیا

آپ کی تنقید کی یہی منفرد خصوصیت تھی کہ آپ فن کی کسوٹی پر موضوع اور ہیئت کو برکھنے کا ادماک رکھتے تھے۔ آپ کی فکری اور ذکاوت ادب کے جواہر پاروں کو جانچ لیتی تھی۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کے متعلق اپنے بیش قیمت خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں

”شاعر اگر ہندوستان جیسے محکوم اور سیاسی حیثیت سے مغلوب ملک میں پیدا ہوا ہوتا تو اُس کا مقام = صرن شعرو ادب بلکہ فکر و نظر کی بین الاقوامی محفلوں میں بھی اپنے زمانہ کے بڑے سے بڑے شعراء و مفکرین اور فلسفہ حیات کے قادیہ میں کی صفت اوز میں ہوتا“

پھر آپ اقبال کے شیدائیوں سے یوں خطاب فرماتے ہیں :-

”اگر اقبال کے شیدائی، شاعر مشرق کے افکار سے کچھ بھی حاصل نہ کریں لیکن وہ صرن اُن کے ”نرم دم گفتگو گرم دم جستجو“

ہی کے فلسفے سے بہرہ مند ہو سکیں تو میں کہوں گا کہ اقبال کا خوب جگر ہمارے ملک کی بجز سر زمین پر ضایع نہیں ہوا“

ان خیالات کا اظہار آپ نے ۱۹۳۷ء میں بزم اقبال حیدر آباد کے ایک جلسہ میں ایک مقالے کے ذریعہ کیا تھا۔

قاضی صاحب کے تنقیدی مضامین اور اردو محالہ شعرو ادب کے خطبات و خطابات غیر مطبوعہ ہیں یا مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ انگوٹن کی شیرازہ بندی کر کے انھیں کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا تو اردو ادب کی بجز مفید کار آمد اور ٹھوس خدمت ہو چند مقالات اور خطبات راقم الحروف کے پاس بھی محفوظ ہیں۔

**اسلوب نگارش** میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ قاضی صاحب بہت ہی کم عمری میں مضمون نگار بن گئے تھے۔ خانقاہ سترہ اشعارہ رسائل میں آپ کی مضمون نگاری کا آغاز ہوا تھا اور ۱۹۳۷ء میں ہمدرد کے ادارتی شعبے میں شریک ہو کر اپنے کلک گہرا

جنس دی تھی۔ اخبارات کی ادارت اور پختہ ادیبوں کی صحبت میں آپ بہت جلد ایک صاحب طرز اور منفرد ادیب بن گئے۔ اپنے لکھنے کے ڈھنگ کو کسی مرض کے دورے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ لکھتے بیٹھتے ہیں تو لکھتے ہی پلے جاتے ہیں۔ اور نہیں لکھتے تو مہینوں کچھ نہیں لکھتے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:-  
”میری لکھائی کا ڈھنگ ایسا ہے جیسے کسی مرض کا دورا پڑے۔ جب لکھنے کا دورا پڑتا ہے تو لکھتے چلا جاتا ہوں سوچ،

شام، دوپہر۔ اور نہیں لکھتا تو مہینوں ایسے گزرتے ہیں قلم کو کاغذ سے دشمنی ہو جاتی ہے۔ اس دورے کی کیفیت تو ایسی ہوتی ہے جیسے شرابی کا نشہ۔ لیکن جب وہ وقت گزر جاتا ہے تو بیسے بادل برس کر کھل جاتے۔“

آپ کے فن کی مقبولیت کا راز آپ کی شخصیت میں پوشیدہ ہے۔ آپ کے فن کا تجزیہ کرتے وقت ہمیں یہ بھولنا چاہئے کہ مشکلات اور انقلابات ہی نے آپ کے فن میں پختگی اور گہرائی پیدا کی ہے۔

اُردو کے افسانے میں آپ کا کردار نہایت مضبوط و ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی تخلیقات عالیہ اُردو ادب کے گیسوئے پریشاں سنوارنے کے لئے شانے کا کام کرتی ہیں، آپ نے ادب سیرت افسانہ ڈرامہ اور تنقید کا ایک عظیم ورثہ ہمارے لئے چھوڑا ہے جو ادبی شاہراہ میں منارہ فوری حیثیت رکھتا ہے۔ جو نہ صرف ہماری رہنمائی کر رہا ہے بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی نئی شاہراہیں روشن و منور کر کے دکھائے گا۔ ادبی دُنیا میں آپ کی انفرادیت ہمیشہ یادگار رہے گی۔ اور آپ کی پختہ ادبی روایات جن کی روشنی میں ترقی پسند ادیبوں اور افسانہ نگاروں کا جیش رواں دواں آگے بڑھتا رہا ہمیشہ برقرار رہے گی اور آپ کا ادب ہمیشہ سربلند رہے گا۔

آپ کا قلم آسان اور مشکل ہر موضوع پر اسب صبار رفتار کی طرح تیز دوڑتا ہے۔ اخبارات کے ادارے اگر ایک ہی نشست میں قلمبند کرتے ہیں تو افسانہ بھی ایک ہی نشست میں ختم کر دیتے ہیں۔ اسی طرح باخداوہ اور شگفتہ ترجمہ کرنے پر بھی آپ کا قلم حاوی ہے اور تنقید و سیرت نگاری جیسے مشکل موضوعات پر شگفتگی کے سچول بکھیرتا ہوا گزر جاتا ہے۔

چنانچہ سیرت نگاری کے مشکل موضوع کا اعتراف فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”کتنا مشکل کام ہے کسی بڑی شخصیت کی خصوصیات کا صحیح اندازہ کرنا اور اس سے بھی زیادہ مشکل ہے اس اندیشہ کو

دل سے نکالنا کہ میں ہم غلط اندازہ تو نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے جب ان اوراق کو لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو اس

تردد کو دل سے نہ نکال سکا۔ اس تردد کا اثر میری تحریر میں موجود ہے۔ ان اوراق کا مسودہ لکھ لینے کے بعد بھی

میں نے کتنی دفعہ سوچا اسے میز کی دھادھی میں پڑا رہنے دوں۔ یہ لکھت لکھائی تو تھی اس شوق نے کہ یہ دیکھوں

اس مشکل موضوع پر کچھ لکھا بھی جاسکتا ہے یا نہیں۔ لیکن اب جو کچھ لکھ چکا تو مجھے معلوم نہیں کہ کتنا میں

درست لکھا اور کتنا نادرست میں ساری عمر اخبار نویس کرتا رہا اس لئے جانتا ہوں کہ اخبار نویس اگر سب سے

زیادہ کسی سے ڈرتا ہے تو اپنے ہی قبیلے سے ڈرتا ہے۔ اپنی ہی کسوٹی پر اپنی منہس کو رکھ دینا آسان کام نہیں۔“

آپ کی مشہور زمانہ تصنیف لیلیٰ کے خطوط کا اسلوب نگارش اتنا دلچسپ اور مہیا ہے کہ جس نے آپ کو اپنے رنگ کا ایک منفرد اور صاحب

طرز ادیب بنا دیا۔ آپ کے اس اسلوب نگارش نے فوجیہ قلم کاروں کے لئے نئی طرز نگارش کی شاہراہیں متعین کر دیں۔ اور درس و تدریس کے لئے

رباب کھول دئے۔

قاضی صاحب نے اپنے گراں قدر لکچر زندگی میں جو ہمیشہ قیمت تخلیقات عالیہ رقم فرمائیں اس مختصر مقالے میں ان کی بہت سادہ اور بہت

قلیل عکاسی کی گئی ہے اور اس شخصیت عظمیٰ کی چند ہی جھلکیاں پیش کی گئی ہیں۔ اس اہمال کو تفصیل سے بیان کرنے کے لئے ایک ضخیم تصنیف

درکار ہے جو کل ہند انجمن ترقی اُردو (علی گڑھ) منظر عام پر پیش کر سکتی ہے۔

آثار ابوالکلام آزاد :- علامہ مہتمم حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح حیات ہے۔ سچ تو یہ ہے

تصانیف پر طائرانہ نظر کہ قاضی صاحب نے اس میں سوانح نگاری کے فن کو معیار پر پہنچا دیا ہے اس گراں قدر تصنیف کے متعلق فرماتے ہیں



## ہمارا پڑوسی - چاند

ہمالیہ سے زیادہ بلند پہاڑوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ۔ ہزاروں عظیم الشان چٹانوں کی عجیب و غریب مہیب شکلیں۔ نہایت گہرا سناٹا۔ آواز کیسر معدوم۔ دھوپ کے سرخ پرتوں کی انقباضی (ULTRAVIOLET) شعاعوں کی وجہ سے پانی کا جوش کھانکھار آتا تھا بھاپ میں تبدیل ہو جاتا۔ اور دھوپ سے ہٹ کر سایہ میں درجہ حرارت کا صفر سے بھی ۲۰۰ درجے نیچے گر جاتا اور ہر چیز کا چشم زدن میں منجمد ہو جاتا۔ یہ ہے وہ چاند جس کو ہم روز دیکھتے ہیں لیکن اس کی ان طبیعی خصوصیات سے واقف نہیں۔ چاند ہمارا پڑوسی کرہ ہے جو ہم سے بہت قریب یعنی صرف ۲ لاکھ ۴۰ ہزار میل کی دوری پر واقع ہے، لیکن وہ ہم سے کس قدر مختلف ہے۔

ہم زمین کے رہنے والے سب سے زیادہ جس چیز سے واقف ہیں اور جس سے ہم ہر وقت فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں، ہوا ہے، لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ ہمارے اس پڑوسی کرہ میں ہوا کا بالکل وجود نہیں۔ اس کے معنی بہت کچھ ہیں۔ ایک یہ کہ وہاں کوئی موسم نہیں ہے اور ہوا کا بہاؤ نہ ہونے کی وجہ سے دھوپ اور سایہ کے درجہ حرارت و برودت میں وہاں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اگر آپ کسی ایسے برتن کو جس میں دو خانے علیحدہ علیحدہ بنے ہیں، پانی سے بھر دیں اور اسے اس طرح رکھ دیں کہ ایک سرخ یا خانہ دھوپ کی طرف ہو اور دوسرا سایہ کی طرف، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ دھوپ کی طرف کا پانی فوراً جوش کھانکھار بن جائے گا اور سایہ کی طرف کا پانی برتن کی طرف کا پانی برف کی طرح منجمد ہو جائے گا۔ کیونکہ چاند میں جو حصہ آفتاب کی کرنوں کے سامنے ہے وہاں کا درجہ حرارت، نقطہ غلابان (BOILING POINT) سے بھی ۲۰۰ درجہ زیادہ ہے اور جو حصہ سایہ میں ہے وہ نقطہ انجماد سے بھی ۲۰۰ درجہ کم ہے۔

دوسرے یہ کہ ہوا نہ ہونے کی وجہ سے وہاں کوئی آواز بھی ہم تک نہیں آ سکتی۔ آواز نام ہے ان ہتترانات یا مرتعش لہروں کا جنہیں ہوا ہمارے کان یا اعصاب سماعت تک پہنچاتی ہے اور چونکہ وہاں ہوا نہیں ہے اس لئے وہاں کوئی مفہوم آواز کا بھی نہیں ہے اور اگر آپ کے سامنے آٹم بم بھی پھٹے تو آپ اس کی آواز نہیں سکتے، اس کے معنی یہ ہیں کہ چاند کی فضا ایک مہیبت ناک سناٹے سے زیادہ کچھ نہیں پھر جس طرح ہماری سماعت ہوا سے متعلق ہے، اسی طرح ہماری بصارت پر بھی اسکا اثر ہوتا ہے۔ مثلاً آپ زمین پر کس دور کی چیز کو دیکھتے ہیں تو وہ دھندلی نظر آتی ہے کیونکہ ہوا خاک کے ذرات فضا میں منتشر کر دیتی ہے اور ہماری نگاہ کے سامنے ایک پردہ سا پیدا ہو جاتا ہے، لیکن چاند میں ہوا نہ ہونے کی وجہ سے خاک کے ذرات منتشر نہیں ہو سکتے۔ اس لئے وہاں بہت دور کی چیز بھی صاف نظر آ سکتی ہے جیسے کہ ایک پہاڑ جو ۱۵۰۰ میل کی دوری پر واقع ہے وہ آپ کو اس قدر صاف نظر آئے گا گویا آپ اس کے دامن میں کھڑے ہیں اور اسے چوم سکتے ہیں۔

آپ وہاں کسی کافذ کے ٹکڑے کو دیا سلائی روشن کر کے جلاں چاہیں تو اس پر کوئی اثر نہ ہوگا کیونکہ ہوا اور آکسیجن نہ ہونے کی وجہ سے وہاں شعل پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ اس کافذ کے ٹکڑے کو کسی بلند جگہ سے نیچے کی طرف چھوڑیں گے تو وہ نیچے کی طرف آئے گا نہ در لیکن اٹتا پٹتا آگے گا بلکہ سیدھا گرے گا کیونکہ اٹنے پٹنے کے لئے وہاں ہوا موجود نہیں ہے۔

اگر آپ زمین پر باس یا کسی اور لکڑی کی مدد سے اوپر کی طرف جست لگائیں تو میں تیس فٹ سے زیادہ اوپر نہیں جا سکتے، اسی طرح اگر آپ کسی گیند کو پوری قوت سے اوپر کی طرف پھینکیں تو وہ ۲۰۰ فٹ سے زیادہ اونچا نہیں جا سکتا، کیونکہ زمین کی کشش نہ آپ کو زیادہ جست کرنے دیتی ہے نہ گیند کو زیادہ اوپر جانے کی اجازت دیتی ہے، لیکن اگر چاند کی سطح پر جا کر آپ قریب قریب ۲۰۰ فٹ اوپر اچک سکتے ہیں اور گیند کو

بھی ہزار بارہ سو فٹ اونچا مچھلینگ سکتے ہیں، کیونکہ وہاں کی کشش بہ نسبت زمین کے بہت کم ہے۔ یعنی ان دونوں کی کشش میں ایک اور چھٹکی نسبت وہاں چوانہ ہونے کی وجہ سے ایک بات اور بھی بہت عجیب پائی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ وہاں جڑیں اور عفونت پیدا کرنے والے کیمیاوی ذرات فضا میں منتشر نہیں ہو سکتے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کوئی چیز مڑ نہیں سکتی، اگر آپ کسی پڑیا کو مار کر وہاں ڈال دیں تو وہ سورج کی گرمی سے خشک تو ہو جائے گی، لیکن سڑے گئے گی نہیں اور اس کے پردہ بال وغیرہ سب جمل کے قول اپنی اصلی حالت میں باقی رہیں گے۔

چاند کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ زمین ہی کا ایک ٹکڑا ہے جو کسی وقت اس سے جدا ہو کر اس کے گرد گردش کرنے لگا، لیکن اب جدید نظریہ یہ ہے کہ جب اور جس طرح زمین وجود میں آئی، اسی طرح چاند بھی اس کے وجود میں آیا۔ زمین اور نظام شمسی کے دوسرے سیاروں یا کرویوں کی تخلیق کی یہ صورت ہوئی کہ سورج کے ابتدائی دور میں اس کے چاروں طرف کی فضا میں گیس اور خاک کا ایک گرم و مشتعل بادل چکر کھا رہا تھا جس میں رفتہ رفتہ چاروں طرف کے اندر ہوا، مادے کھینچ کھینچ کر ملتے رہے اور جب اس میں ٹکافت پیدا ہوا تو گردش کی بنا پر اس کے بہت سے ٹکڑے ہو گئے جو رفتہ رفتہ ٹکڑے ہوتے گئے۔ انہیں ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا چاند بھی ہے جو زمین کے ساتھ ہی پیدا ہوا، لیکن چونکہ یہ ٹکڑا چھوٹا ہے اس لئے اس میں کشش بھی کم ہے اور زمین کے طبعی حالات سے اس کے حالات مختلف ہیں۔

اگر آپ کسی قوی دور بین سے چاند کو دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ اس کی سطح ایک عظیم الشان سلسلہ ہے۔ نہایت عمیق و وسیع غاروں کا جس کے اندر ہمارے بڑے بڑے شہر لندن اور نیویارک سما سکتے ہیں اور ان غاروں کے چاروں طرف ہمالیہ سے بھی اونچے پہاڑ پائے جاتے ہیں۔ پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ چاند کے یہ بڑے بڑے غار کوہ آتش فشاں کے دہانے ہیں لیکن اب ماہرین فلکیات یہ کہتے ہیں کہ جس وقت چاند کا مادہ نیم رقیق حالت میں تھا اس وقت منجمد مادہ کی بڑی بڑی چٹانیں فضا سے آ کر اس میں گرتی تھیں اور ان کے گرنے سے چاند کا گڑھا مادہ اُچھلتا تھا۔ یہی مادہ پہاڑوں میں تبدیل ہو گیا اور چاند میں غار پیدا ہو گئے۔ یہی صورت زمین میں بھی پیدا ہوئی۔ لیکن چونکہ یہاں ہوا تھی، موسم تبدیل ہوتے رہتے تھے اس لئے یہاں منجمد مادہ کے جو ٹکڑے گرے وہ فنا بھی ہوتے رہے اور زیادہ بڑے غار اور بلند پہاڑ بن سکے۔

پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ چاند کی سطح پر سمندر بھی ہیں کیونکہ جب ہم دور بین سے دیکھتے ہیں تو پہاڑوں کی وادیاں کچھ ایسی نظر آتی ہیں جیسے یہ پانی سے لبریز ہوں، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ چاند کی جو سطح

صاف نظر آتی ہے وہ پانی نہیں ہے بلکہ صرف خاک ہے۔ اس خاک کے جمع ہو جانے کے دو سبب ہیں ایک یہ کہ جو ٹکڑے شہاب ثاقب کے وہاں گرتے رہتے ہیں وہ درجہ حرارت کے غیر معمولی طور پر گھٹنے پڑنے کی وجہ سے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں اور پہاڑوں کی چٹانیں پھٹ پھٹ کر خاک میں تبدیل ہوتی جاتی ہیں۔ وہاں کے درجہ حرارت کے گھٹنے پڑنے سے یہ حال ہے کہ خسوف کے وقت (جب زمین اس کے اور سورج کے درمیان حایل ہو جاتی) تو وہاں کا ٹمپریچر ۲۷۰ درجے کم ہو جاتا ہے اور جب خورشید غم ہوتا ہے تو فوراً ۲۷۰ درجے بڑھ جاتا ہے۔ چاند کا صرف ایک رخ ہم کو نظر آتا ہے، دوسرے رخ کا حال بالکل معلوم نہیں اس کا سبب یہ ہے کہ چاند ہم کو گھٹنے میں اپنی محوری گردش پوری کر لیتا ہے اور اس کا جو رخ کل شام کو ہمیں نظر آتا تھا وہی آج بھی نظر آتا ہے، لیکن اس کی روشنی۔ بہت یہ ضرور معلوم ہو سکتا ہے کہ جس چیز کو ہم چاندنی کہتے ہیں، وہ سورج کی شعاعوں کا انعکاس ہے جو چاند کے پہاڑوں سے ٹکرا کر ہماری طرف مڑتی ہیں اور اتنی روشنی پیدا کر دیتی ہیں، درجہ انکسار چاند کے پہاڑوں کو قریب سے دیکھیں تو غالباً وہ اتنے روشن نظر آئیں گے جتنے چاند اور زمین میں ایک بڑا تعلق درو جزر و مد کا بھٹانا کا بھی ہے جس سے چاند بھی متاثر ہوتا ہے اور زمین بھی۔ جب پورے چاند کا عکس زمین پر پڑتا ہے تو ہمارے سمندر میں اور بڑی بڑی جھیلیوں کا پانی اس کی طرف کھینچتا ہے جس سے سمندروں میں موج پیدا ہو جاتی ہے اور یہ موج ہمارے مسموں بہت اثر انداز ہوتا ہے، لیکن لطف یہ ہے کہ اس کا اثر خود چاند پر بھی پڑتا ہے، یعنی جب ہمارے سمندروں کا پانی اس کی طرف کھینچتا ہے تو چاند کی رفتار گردش بڑھ کر ہو جاتی ہے اور گریہ کی سالانہ نصف سکنڈ سے زیادہ نہیں ہوتی، پھر بھی اگر اس زمانہ سے اس کا حساب لگائے جب چاند پیدا ہوا تھا تو چاند کی رفتار گردش بڑھ کر ہو جاتی ہے اور اگر مستقبل کا خیال کیجئے تو یہ اتنا بڑے کا ایک وقت وہ اتنے کا جب چاند کی گردش اتنی کم ہو جائے گی کہ زمین سے اس سے اپنی طرف کھینچنے کی اور وہاں کے پہاڑوں کے کچھ حصے زمینوں کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر آئیں گے اور جو بچے رہیں گے وہ زمین کے گرد طواف کرنے لگیں اور ہمارے گریہ کے گرد متعدد چاندوں کے ویسے ہی حصے قائم ہو جائیں گے، جیسے سیارہ زحل کے گرد نظر آتے ہیں۔

# زندگی اب کے دس سال بعد

مذہبی یا روحانی پیشین گوئیوں سے تاریخ کے صفحات سب سے پرے ہیں اور اب تک بعض حضرات ان کی تصدیق کے لئے مختلف تاویلوں کے کام لیتے رہتے ہیں، مثلاً واعظین کلیسا کہ وہ آج بھی انجیل کی آیتوں سے قوموں کے عروج و زوال اور مستقبل کے انقلابات کی تاریخ متعین کرتے رہتے ہیں جن سے علمی دنیا بے خبر نہ گزر جاتی ہے، لیکن یہ کہنا کہ پیشین گوئیوں کا زمانہ ختم ہو گیا ہے درست نہیں۔ اس کی نوعیت البتہ بدل گئی ہے، یعنی اگر پہلے یہ چیز صرف روحانی و مذہبی حیثیت رکھتی تھی تو اب اس نے علمی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ اس وقت امریکہ کا سب سے بڑا پیش گوئیاں کرنے والا وہ ہے جو وہاں کا سب سے بڑا ماہر اقتصادیات ہے اور جس نے اس کو ایک علمی فن کی حیثیت دیدی ہے۔

اس کا نام لیوچرن (LEOCHERNE) ہے۔ یہ امریکہ کے ایک بہت بڑے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا ڈائریکٹر ہے اور ماضی و حال کا مطالعہ کر کے آئندہ ظاہر ہونے والے واقعات کے بابت پیش گوئی کرنے میں یدِ بطون رکھتا ہے۔ اس تحقیق پر ۶۰ سالہ ڈاکٹر صرف کرتا ہے اور مستقبل کے بابت تمام سوالات کا جواب علمی نقطہ نظر سے دیتا رہتا ہے۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جو پیش گوئیاں اس نے کی تھیں ان میں سے ۴۰ فی صدی بالکل درست نکلیں، ۳۰ فی صدی کا ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور صرف ۱۰ فی صدی غلط ثابت ہوئیں۔

اکتوبر ۱۹۵۵ء میں رسالہ کارونٹ (CORONET) کے ایڈیٹر نے اس سے سوال کیا کہ آئندہ دس سال میں ہماری زندگی و معاشرت کا کیا رنگ ہوگا۔ اس نے جو جواب اس کا دیا ہے، ہر چیز ان کا تعلق زیادہ تر امریکہ و اہل امریکہ سے ہے، لیکن ان کا جو اثر دوسرے ملکوں پر پڑ سکتا ہے وہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔

اس کی پیش گوئی کے بعض دلچسپ حصے ملاحظہ ہوں:-

**معیار زندگی** معیار زندگی دس سال کے بعد اتنا بدل جائے گا کہ کافی محال اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اگر تم کسی کا رخاں یا دفتر میں ملازم ہو تو تمہارے ایام کارکردگی ہفتہ میں صرف چار دن رہ جائیں گے اور روز اور ہفتہ دن کی تعطیل کے علاوہ اور تمام ایام تعطیل کی تعیین اس طرح کی جائے گی کہ وہ سب کے سب دو شعبہ (پیر) کے دن پڑیں گے۔

تم "شمسی" مکانوں میں رہنے لگو گے یعنی ایسے مکان جن میں گرمی اور روشنی دونوں کا انتظام کرنوں کے ذریعہ سے ہوگا اور بجلی کی قوت سے کوئی تعلق نہ رہے گا۔ مکانوں کو ٹھنڈا کرنے، غذا اور پانی کو سرد رکھنے (REFREGERATION) کا کام بھی شمسی قوت سے لیا جائے گا۔

تعمیر مکان کا طریقہ بھی بالکل بدل جائے گا اور ہر شخص نے بنائے مکانات فوراً حاصل کر سکے گا۔ دیواریں، چیت، سانپان وغیرہ سب صندوقوں میں بند ملیں گی اور آپ جہاں چاہیں انھیں نصب کر سکیں گے، یہ مکان زیادہ تر بلا شگ کے ہوں گے جن میں کھانا کھانے، پکانے اور رہنے کے الگ الگ کمرے کی جگہ ایک ہی کمرہ ہوگا، جسے حسب ضرورت کھانا پکانے، کھانا کھانے اور سونے کے کمرے میں تبدیل کیا جاسکے گا موسم اور شہر کے لحاظ سے اس کی کھڑکیاں دروازے از خود کھلتے بند ہوتے رہیں گے اور جراثیم یا کیرے کو ٹھکے اندر نہ آسکیں گے تم پرانے اور نہانے کے لئے بلا شگ کا عوض بھی اپنے مکان کے اندر رکھ سکو گے، ہر قسم کی بے ہمت غذا میں بلا شگ کے شفاف ڈبوں میں ہر جگہ لئے گلیں گی اور پکے ہوئے گوشت کے ڈبے بھی عام ہوجائیں گے۔

**عمل و اجرت عمل** اگر تھاری قوت کار کردگی اتنی ہی رہی جتنی اب ہے تو بھی تھاری آمدنی ۲۰ فی صدی بڑھ جائے گی اور بہت سے کاخانے مقہورہ سالانہ معاوضہ کی گارنٹی لے لیں گے۔ بڑھاپے کی پیشین اور بیکاری کے زمانہ کا معاوضہ بھی ایک تہائی بڑھ جائے گا چونکہ کیمیاوی، برقی اور فضائی صنعت بہت بڑھ جائے گی اس لئے لوگوں کو زیادہ تر شہر سے باہر ہی کام کرنا پڑے گا، بہت سے کام جو اس وقت ہاتھ اور دماغ سے کئے جاتے ہیں وہ مشینوں سے ہونے لگیں گے، یہاں تک کہ دفاتروں میں بھی بہت سی پیچیدہ مشینیں آجائیں گے جن سے کام لینے کے لئے باقاعدہ ٹریننگ حاصل کرنا پڑے گی۔

تمام کام کرنے والوں کی یونین بن جائیں گی اور کمپنی کے ڈائریکٹروں کی جگہ یونین کے لیڈر ہی طبقہ اعمال کے تمام مسائل کا تصفیہ کیا کریں گے اور مزدوروں کی طبی امداد ان کے بچوں کی پرورش اور غذائی آسائشوں کی فراہمی یونین ہی کے ذریعہ سے ہوا کرے گی۔

**شخصی دولت** ایکسٹریکٹس کے ساتھ ٹیکس بھی ۲۵ فی صدی زیادہ ادا کرنا پڑے گا۔ ضرورت کی تمام اشیاء اقساط پر ملنے لگیں گے اور ایک مثبت نقد قیمت ادا کرنے کا دستور بہت کم ہو جائے گا۔

**اسباب نقل و حرکت** اس وقت امریکہ میں پھیپوں والی گاڑیاں ۵۹۰۰۰۰۰ ہیں لیکن دس سال کے اندر ان کی تعداد ۱۸۰۰۰۰۰ ہو جائے گی۔ موٹریں کو کڑے سے بھی چیلنے لگیں گی، ایک شہر کے لئے اور دوسری شہر سے باہر کے لئے شہر کی موٹریں لمبائی میں پانچ فٹ کم کر دی جائیں اور بلا شک سے اس طرح حلیار کی جائیں گی تاکہ تصادم سے ان کو کوئی صدمہ نہ پہونچے۔ ۶۰ گھوڑوں کی قوت کے انجن موٹر کے پچھلے حصہ میں رکھے جائیں گے اور بند گاڑیوں کی چھت چند منٹ میں علوہ ہو سکے گی۔

شہر سے باہر چلنے والی موٹریں ۲۰ فٹ لمبی ہوں گی لیکن ان کے انجنوں کا وزن موجودہ انجنوں سے نصف ہوگا اور مٹی کے تیل سے بھی چل سکیں گی۔

بین الاقوامی سیاحت بہت بڑھ جائے گی اور ہوائی جہازوں کی رفتار اتنی تیز ہو جائے گی کہ ایک شخص نیو یارک سے لندن تک پانچ گھنٹے میں پہونچ سکے گا۔ زادہ فاصلہ طے کرنے کے لئے جیٹ (JET) ہوائی جہاز استعمال ہوں گے۔ ہوائی جہاز اتنے بڑے بننے لگیں گے کہ ایک قوت اس میں ۲۰۰۰ مسافر سفر کر سکیں گے۔ ان کی رفتار ۱۲۰۰ میل فی گھنٹہ ہوگی اور تین گھنٹے میں وہ واشنگٹن سے پیرس پہونچ جائیں گے۔ اس سے چھوٹے جہاز ۱۰۰ مسافروں والے ۶۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کریں گے۔

ٹیلی ویژن سٹ ریگین تصویروں کے عام ہو جائیں گے اور ایک ڈالر روزانہ قسط ادا کرنے پر ہر شخص اسے خرید سکے گا۔ ریڈیو سٹ چھوٹے سائز کے عام ہو جائیں گے اور تم کلائی کی گھڑی کے سائز کا سٹ ہر دوکان سے ۲۵ ڈالر میں خرید سکوں گے۔

مردوں کی عمر دل کا اوسط ۷۰ سال کا ہو جائے گا اور عورتوں کی عمر کا اوسط ۷۵ سال - ۸۰ اور ۹۰ سال تک مرد اچھی صحت کے نظر آئیں گے بہتر غذا، مناسب ورزش اور ترقی یافتہ آلات حفظان صحت کی وجہ سے لوگوں کے قد بڑھ جائیں گے، لیکن جسمانی صحت کے باوجود اعصاب و دماغ سے زیادہ کام لینے کی وجہ سے شیق نفس، نہفت قلب، سوڈیم وغیرہ کی شکایتیں بھی بڑھ جائیں گی۔

خاندانوں کے افراد میں اضافہ ہو جائے گا کیونکہ شادی کی عمریں گھٹ کر ۱۹، ۲۰ سال ہو جائیں گی اور آبادی تقریباً ۱۹ کروڑ ہو جائے گی اکثر کا رخائے شمع قوت سے چلنے لگیں گے اور درختوں کو ہارمون کے انجکشن کے ذریعہ بہت جلد تناور کیا جاسکے گا۔ کوید ایندھن کے طور پر بہت کم استعمال ہوگا اور اس سے بہت سی نئی دوائیں بننے لگیں گی۔

آئندہ دس سال کے اندر مصنوعی چاند ہماری زمین کے گرد گردش کرنے لگے گا اور ۵۰ سال تک چاند کے سفر کا عملی تجربہ شروع ہو جائے گا۔

# نہر سوئز کا تاریخی و سیاسی پس منظر

کنزل ناصر کا نہر سوئز کو مصری ملکیت قرار دینا بظاہر بہت معمولی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن دنیا کی تاریخ کا ہمیں تو مصر کی تاریخ کا یقیناً یہ اتنا اہم واقعہ ہے کہ سترہویں صدی میں تقریباً تین ہزار سال سے اس کا انتظار کر رہی تھی اور قدرت اسے برابر طمانی چلی آتی تھی۔

آج ہزاروں سال کی غلامانہ زندگی گزارنے کے بعد مصر آزاد مملکت ہے اور اتنی طویل مدت اسیری ختم کرنے پر وہ اس وقت جتنی بھی خوشی کر رہا ہے، لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری طرف بھی واقعہ مصر کی حکمت اور ایوان فرانس میں زلزلہ ڈال دیتا ہے تو صید و صیاد کے ان دو متضاد مناظر کو دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔

پچھلے تاریخ اور باق پر نظر ڈالنے تو معلوم ہوگا کہ مصر کی تاریخ غلامی اب سے تقریباً تین ہزار سال پہلے شروع ہوتی ہے جب دلاوت مصر سے ۵۲۵ سال قبل عساکر فارس نے عہد فراغہ کی سلطنت و جبروت ختم کر کے اول اول دہائی عجمی پریم لہرایا۔ اس کے بعد کیا ہوا اور کن کی قوموں نے مصر کو زندہ اور پال کیا؟ ۹ داستان بہت طویل ہے، مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ دنیا کی کوئی اُبھرتی ہوئی طاقت ایسی نہ تھی جس نے صحرانوردی کی ہو اور مصر کو اس کے سامنے اپنا سر نہ جھکا دینا پڑا ہو۔

ہل فارس کے بعد یہاں یونان، روم اور بازنطینی والے آئے، ان کے بعد عرب، فاطمین، ملوک اور ترکوں کا دور آیا اور اخیر میں فرانس کے بعد برطانیہ کے اقتدار کا، لیکن ان میں کوئی حکومت ایسی نہ تھی جس نے اصل مقصد یہاں کے غلامین (کاشتکاروں) کا خون چوسنا نہ رہا ہو۔ خیر، حکومت کے عہد میں بھی یہی ہالی رہا، لیکن جب ایشیا پیدا ہوا، ہوا اور تاریخ بدل اور استعماریت کے منارے یکے بعد دیگرے منہدم ہونے لگے تو مصر نے بھی دلیرانہ قدم اٹھا کر عہد استبداد کی آخری یادگار شاہنشاہی کو ختم کر کے وہاں قومی و جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالی اور جب ۲۲ جولائی ۱۹۲۲ء کو حسب معاہدہ انگریزی فتح بھی نہر سوئز سے سٹ گئی اور غلامی کا یہ آخری طوق بھی اس کی گردن سے نکل گیا تو اس نے اپنا جائز اقتدار قائم کرنے کے لئے سوئز کو بھی قومی ملکیت قرار دینے کا اعلان کر دیا۔

مصر کا یہ اقدام اس حال میں کہ نہر سوئز اس کی ملکیت ہے، کسی طرح ناجائز نہیں قرار دیا جاسکتا، لیکن اس نے برطانیہ و فرانس دونوں کو اس درجہ مشتعل کر دیا کہ انھوں نے بحری، بری اور فضائی تمام طریقہ شروع کر دیں اور جبروت کا کوئی مظاہرہ ایسا نہ تھا، جس سے انھوں نے کام نہ لیا ہو۔

برطانیہ و فرانس کا یہ طرز عمل کس حد تک جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟ اس کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ شروع سے اس وقت تک نہر سوئز کی پوری تاریخ کا مطالعہ کیا جائے۔

نہر سوئز ایک ایسی نہر ہے جس کے ذریعے سے بحرِ روم اور بحرِ سرخ (RED SEA) دونوں کو ملا دیا گیا ہے۔ لیکن نہر سوئز کو دو سمندروں کو ملا دینے کا خیال کوئی نیا خیال نہ تھا۔ اب سے چار ہزار سال قبل فرعون مصر نے بھی ایسی ہی ایک نہر تعمیر کرائی تھی جس کو نہر فرعون کہتے تھے اور پورے ایک ہزار سال تک بحرِ سرخ اور دریائے نیل کے درمیان جہازوں کی آمد و رفت اسی نہر کے ذریعے سے ہوتی رہی۔

پانچویں صدی قبل مسیح میں دوسرے فرعون جس کا نام نیچو تھا ایک لاکھ بیس ہزار غلاموں کی مدد سے اس کو دوبارہ تعمیر کرایا

لیکن اس اندیشہ سے کہ مبادا دوسری قومیں اسی راستہ سے خود اس پر حملہ کر دیں، یہ خیال اس نے ترک کر دیا۔ اس کے بعد اہل فارس کے دور حکومت میں پھر ہنر جاری کی گئی جس سے اہل رومہ کی حکومت نے بھی اپنے زمانہ میں اس سے فائدہ اٹھایا۔ لیکن جب مسلمانوں نے مصر کو فتح کیا تو یہ نہر بند ہو چکی تھی اور انھوں نے اس کے اجراء کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

اس کے بعد صدیاں گزر گئیں اور کسی کے ذہن میں یہ بات نہ آئی کہ اگر نہر کے ذریعہ سے بحرِ روم اور بحرِ سرخ کو ایک دوسرے سے ملا دیا جائے تو اس سے کتنے اہم نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔

اب سے پورے ایک سو سال پہلے جب برطانیہ کی استعماری قوت انتہائی عروج پر تھی اور ایشیا میں ہندوستان تاج برطانیہ کا درخشاں ترین الماس سمجھا جاتا تھا تو فرانس اس کا دیرینہ حریف اس اقتدار کو بڑے رشک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اس فکر میں تھا کہ برطانیہ کے دوش بدوش وہ بھی اپنے اثرات ایشیا میں کسی طرح قائم کر سکے۔ وہ زمانہ تھا جب تمام مغربی ممالک کے جہاز افریقہ کا چکر لگا کر جہینوں میں بحر الکاہل اور بحر ہند تک پہنچتے تھے، اس لئے فرانس نے سوچا کہ اگر بحر روم اور بحر سرخ کا درمیانی خشک حصہ جیسا نایاد تھا کاٹ کر دو ذی سمندروں کو ملا دیا جائے تو نہایت آسانی سے بہت کم وقت میں بحر ہند تک پہنچ سکتے ہیں اور اگر یہ راستہ اس نے منہاں کر دیا تو وہ ایشیا میں برطانیہ کے ساتھ ساتھ اپنا اقتدار بھی قائم کر سکتا ہے۔

فرانس نے یہ سوچ کر ترکی و مصر سے گفتگو شروع کی اور خلافت توقع اس میں وہ بہت جلد کامیاب ہو گیا، یعنی چند دن کی گفتگو کے بعد ہی سلطان ترکی نے ایک فرمان کے ذریعہ سے فرانس کو اجازت دیدی کہ وہ پورٹ سعید اور سویز کے درمیان نہر سوئز کھود کر نیا بحری راستہ قائم کر سکتا ہے۔ اس وقت مصر میں خدیو خاندان کی حکومت تھی جسے ترکی کا نایزہ مقرر سمجھا جاتا تھا اس نے ظاہر ہے کہ اس فرمان کے بعد اسے کیا عذر ہو سکتا تھا، اس نے بھی رضامندی ظاہر کر دی اور آخر کار ۱۸۵۵ء میں فرانس نے ایک کمپنی قائم کر کے نہر سوئز کی تعمیر شروع کی اس میں شک نہیں یہ کام آسان نہ تھا اور اس کی تکمیل میں بہت سی دشواریاں حائل تھیں لیکن فرڈیننڈ ڈی لیسسپس (FERDINAND DELESSEPS) کے بے پناہ عزم نے (جو اس کمپنی کا روح و روانہ تھا) اور خود خدیو مصر کے

( FERDINAND DELESSEPS ) کے بے پناہ عزم نے ( جو اس کمپنی کا روح و رواں تھا ) اور خود بخود مصروفیت نے ان تمام دشواریوں کا مقابلہ کیا اور کام چل نکلا۔ یہاں ایش زمین کے تمام ابتدائی مہمکارین خود غدیوں نے ادا کئے اور جب کمپنی کا قیام ہو کر تو میں اس کی رجسٹری ہو گئی تو اس کے بہت سے حصے بھی خرید لئے۔

جب کال بارہ سال کے بعد ۱۸۶۹ء میں نہر سوئز طیار ہو گئی تو اس کی ( ~~FERDINAND DELESSEPS~~ ) اور صدر فرانس، انتہائی مسرت میں بے اختیارانہ یہ فقرہ کہہ اٹھا کہ ”اگر فرانس“ مقرر میں اپنے قدم جما سکا تو وہ ایشیا میں برطانوی اقتدار پر بھی کاوی ضرب لگا سکتا۔ تو برطانیہ کی آنکھ کھلی۔

اس سے قبل برطانیہ اس سے بے خبر نہ تھا کہ فرانس کس فکر میں لگا ہوا ہے لیکن وہ اس کو صرف خواب پریشانی سمجھا جاتا تھا۔ جابج نے جو اس وقت اس نہر میں کام کر رہا تھا اپنی حکومت کو لکھا بھی کہ اگر اس نہر کی تکمیل کے بعد فرانس نے مصر پر اپنا اقتدار قائم کر لیا تو دونوں کی تجارت اس کے ہاتھ میں چلی جائے گی، لیکن لارڈ پالمرسٹن نے جو اس وقت برطانیہ کا وزیر اعظم تھا اس پر کوئی توجہ نہ کی اور ہمیشہ قہقہہ نہ مٹاؤ نہ کرتا رہا۔

جب تمہارے کہ پہلے سال کا زمانہ گزر گیا اور ڈسٹر ایبل برطانیہ کا وزیر اعظم ہوا تو اس نے اس تلخ حقیقت کو پوری طرح محسوس کیا اور  
ترکیہوں سے کام لے کر مشرق میں اس نے خبر پورا سماجیل کو (جو اس وقت بالکل دیوانہ تھا) ہموار کر کے اس کے ۱۹۶۶ء جیسے نمبر میں  
اور اس طرح نکلیں نہر کے بعد پہلے سال کے اندر ہی اندر برطانیہ، سوئٹزرلینڈ، سربیا، یوگوسلاویہ اور ہنگری سے بڑا حصہ دار بن گیا۔

یہ تھا نہر تو زکی داستان کا وہ حصہ جو اس کی تعمیر سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کا زیادہ اہم حصہ وہ ہے جو سیاسی معاہدات سے متعلق ہے۔ کیونکہ اس کو سمجھنے بغیر موجودہ نزاع پر ہم کوئی صحیح رائے زنی نہیں کر سکتے۔

سب سے پہلا معاہدہ وہ ہے جو ۱۸۵۶ء میں قیام کمپنی کے وقت مقرر اور کمپنی کے درمیان ۹۹ سال کے لئے ہوا تھا۔ اس معاہدہ کی رو سے کمپنی مصری کمپنی قرار دی گئی اور مصر ہی میں اس کی رجسٹری ہوئی۔ اس معاہدہ میں یہ بھی طے پایا کہ کمپنی کا ڈائریکٹر مصری حکومت مقرر کرے گی اور ملک کے دفاعی اغراض کے لئے مقرر ہر وقت ہر سوئیز پر قبضہ کر سکے گا اور ۹۹ سال کی مدت اجارہ ختم ہونے پر کمپنی کی ملکیت مصر کے حق میں منتقل ہو جائے گی۔ جب ۱۸۶۵ء میں برطانیہ بھی اس کا حصہ دار ہو گیا تو اس کے تیرہ سال بعد ۱۸۸۲ء میں برطانیہ، جرمنی، آسٹریا، اسپین، اٹلی، روس و ترکی سب نے ملکر طے کیا کہ ہر سوئیز کو بالکل نیوٹرل رکھا جائے اور امن و جنگ دونوں زمانوں میں کسی ملک کے جہاز کو گزرنے سے روکا نہ جائے چنانچہ ۱۸۸۹ء میں جب اٹلی اور ترکی کے درمیان جنگ ہوئی تو دونوں ملکوں کے جہاز اس نہر سے گزرتے تھے۔

اس کے بعد ۱۹۱۴ء میں برطانیہ نے مصر کی خود مختاری کو تسلیم کر لیا اور ۱۹۲۳ء میں انڈس معاہدہ اسپین، ترکی نے مصر سے اپنے تمام حقوق کی دست برداری اختیار کر لی۔

اس کے بعد ۱۹۳۷ء کے معاہدہ کی رو سے برطانیہ نے تسلیم کیا کہ سوئیز مصر ہی کی ملکیت ہے لیکن اس وقت تک کہ مصر کی عسکری قوت سوئیز کی حفاظت کے قابل نہ ہو، برطانوی فوج اس علاقہ میں رہے گی تاکہ جہازوں کی آزادانہ آمد و رفت میں کوئی حرج نہ پیدا ہو۔ لیکن یہ نگرانی کسی صورت سے ۲۰ سال سے متجاوز نہ ہوگی، چنانچہ اس معاہدہ کی رو سے ۱۹۵۶ء میں برطانوی افواج ہر سوئیز سے ہٹ گئیں اور شرط یہ قرار پائی کہ اگر کسی وقت لڑائی چھڑکے تو برطانیہ سوئیز کی حفاظت کے لئے اپنی فوج یہاں بکھرتی ہے۔  
اب ان تمام معاہدات کو سامنے رکھ کر خود کچھ تو معلوم ہو گا کہ قیام کمپنی سے بکر اس وقت تک بعد ہر سوئیز معاہدہ کی ملکیت تسلیم کی گئی، کیونکہ مصر ہی کی ایازت حاصل کر کے ہر سوئیز کھودی گئی، مصر ہی نے اپنے مصارف سے اس معاہدہ کی سہاٹی کیا اور مصر ہی کے ۶۵ ہزار روپے دے کر اس نے خون پسینہ ایک کر کے اسے تعمیر کیا اور مصر ہی میں کمپنی کی رجسٹری ہوئی۔ لیکن باوجود ان حقوق کے کل ستہ سال تک برطانیہ سوئیز کا فائدہ اٹھانے اور سوئیز کے بعد بھی کمپنی نے ایک ہیہ مصر کو نہیں دیا۔ جب ۱۹۵۶ء میں مصر نے احتجاج کیا تو یہ مشکل تمام تین لاکھ پونڈ سالانہ ایشیائی بینک کو بھجوانے کا اقرار کیا اور ۱۹۵۹ء میں دوبارہ زور دینے پر اس راہیٹی کی مقدار میں صرف سات فی صدی کا اضافہ کیا۔

لیکن اب کہ ۱۹۵۶ء میں برطانوی افواج وہاں سے ہٹ جاتی ہیں اور مصر اس وعدہ کے ساتھ کہ وہ ہر سوئیز کے موجودہ نظام کو برقرار رکھے گا اور تمام ملکوں کے جہازوں کو آمد و رفت کی وہی آسانی حاصل رہے گی جس سے قبل پائی جاتی تھی۔ ہر سوئیز کو مصری قوم کی ملکیت قرار دیا اعلان کر دیتا ہے تو برطانیہ و فرانس دفعتاً چارٹ پا ہو جاتے ہیں اور عندہ پیش کرتے ہیں کہ سوئیز سوئیز کی زیر نگرانی (غیر انہماک) رکھنے کا اہل نہیں ہے، ایک بین الاقوامی نگرانی کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

اس باب میں برطانیہ کا یہ بیان بڑی دلچسپ چیز ہے، کیونکہ جس اہمیت کو وہ مصر سے منسوب کرتا ہے، اس کا مظاہرہ مصری حکومت نہیں ہوا لیکن خود اس کی طرف سے کئی بار ہو چکا ہے۔ جن حضرات نے کبھی دونوں لڑائیوں کے درمیان کا مطالعہ کیا ہے۔ ان سے پتہ چلے گا کہ سوئیز کی جنگ میں خود برطانیہ ہی نے اپنے حریف کے جہازوں کے لئے ہر سوئیز کا دروازہ بند کر دیا تھا اور دوسری جنگ عظیم کے وقت سوئیز کے ذریعہ ہر سوئیز نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ اگر جرمنی، برطانیہ پر غالب آتا نظر آئے تو سوئیز یہ گزرنے سے روکا جائے گا۔  
ملک و فریق کے جہازوں کو سوئیز سے آزادانہ گزرنے کے حقوق حاصل تھے اور یہ سہولت تھا کہ اب دو سوئیز کے درمیان فساد آنا کا خطرہ خیر ماں بھاری کے باب میں مصر پر ہفتا ہو چکیا جاسکتا۔

چھائی جاتی ہے یہ دیکھو تو سلیم کس

## فسانہ آزاد

اردو ادب میں بعض مصنف ایسے ہیں جن کا نام لیتے ہی ان کی کسی خاص تصنیف کا نام بھی ہے اختیار ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً رجب علی بیگ کے نام کے ساتھ فسانہ عجائب، شرر کے نام کے ساتھ فردوس بریں، رسوا کے نام کے ساتھ امراؤ جان ادا، حکیم محمد علی کے نام کے ساتھ جھوٹا عہدہ اور نذر احمد کے نام کے ساتھ مرآت العروس کی طرف تو فوراً ہی منتقل ہوتا ہے۔ بالکل یہی حال رتن ناتھ سرشار کا ہے کہ ممکن نہیں ان کا نام لیتے ہی فسانہ آزاد اگلے نہ آئے۔

”فسانہ آزاد“ اردو ادب کی ان چند کتابوں میں سے ہیں، جن پر زمانہ کا اثر تو ہوا ہے لیکن اتنا نہیں اور جن کو بھلاتے بھلاتے بھی کافی عرصہ لگ جائے گا۔ سرشار نے فسانہ آزاد کے علاوہ اور بھی متعدد قصے لکھے ہیں مثلاً بی کہان، ہشو، خدائی فوجدار، کرم دم، لیکن جو شہرت فسانہ آزاد کو حاصل ہوئی وہ سرشار کی دوسری کتابوں کو میسر نہ آئی۔ اب سے ۵۰، ۶۰ سال قبل اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ شاید ہی کوئی اردو دانشمند ایسا ہو جس نے اس کو نہ پڑھا ہو، یا یاروں کی محفل میں اس کو نہ سنا ہو۔ مطبع نو لکھنؤ کی شہرت کو جن کتابوں نے چار چاند لگائے ان میں سے ایک فسانہ آزاد بھی تھی۔

”فسانہ آزاد“ کوئی ایسی تصنیف نہیں جسے پہلے مرتب کر لیا گیا ہو اور پھر بعد میں اس کی اشاعت ہوئی ہو، بلکہ یہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے اودھ اخبار میں شائع ہوئی اور وہ بھی اس شان کے ساتھ کہ خود سرشار کے ذہن میں بھی کوئی متعین خاکہ اس کا پیچھے سے موجود نہ تھا۔ منشی نو لکھنؤ بڑے ذہین اور سوجھ بوجھ کے آدمی تھے۔ وہ اودھ اخبار کو دلچسپ بنانے کی مختلف صورتیں سوچتے رہتے تھے اور چونکہ اس وقت اول کے پڑھنے کا نیا نیا ذوق لوگوں میں پیدا ہوا تھا اس لئے انہوں نے عوام کی توجہ حاصل کرنے کے لئے اودھ اخبار میں بھی ایک ناول بالاقساط شائع کرنے کا ارادہ کیا اور یہ خدمت رتن ناتھ سرشار کے سپرد کی، سرشار نے فسانہ آزاد کے نام سے ابتدا کی لیکن صورت یہ تھی کہ انہوں نے انگریزی ناول کی پیروی میں ایک ہیرو اور ایک ہیروئن کو مقرر کر لئے لیکن کوئی پلاٹ ذہن میں نہ تھا اور انھیں خود معلوم نہ تھا کہ وہ اپنے قصہ میں کہاں کہاں کیا موڑ پیدا کریں گے۔ ہوتا یہ تھا کہ اودھ اخبار کی تاریخ اشاعت قریب آئی اور ان سے کہا گیا کہ فسانہ کا اگلا ٹکڑا لکھ دیجئے اور جو ان کی مجھ میں آیا لکھ دیا۔ وہ یہ تو جانتے تھے کہ انھیں اس فسانہ کو بڑھاتے رہنا ہے لیکن وہ اسے کیونکر بڑھائیں اس کے لئے ان کے سامنے داستانوں کا نمونہ موجود ہی تھا اسی کو سامنے رکھا اور چل نکلے لیکن داستان سے اپنے آپ کو غورہ رکھنے کے لئے یہ ضرور کیا کہ اس سے سحر و ساحری و طلسم کشائی کا عنصر اڑا کر اپنے ہی زمانہ کی رنگین معاشرت کو سامنے رکھا اور لندھو ایس میردان کی جگہ لکھنؤ ہی کے ایک فوجدار کو دی۔ اور وہ اس سے زیادہ کرمی کیا سکتے تھے۔ انہوں نے ناول کا نام تو سنا تھا مگر وہ اس سے بالکل ناواقف تھے مگر ناول ادب میں ناول کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں، پلاٹ کیا چیز ہے، تیز نگاری کی کیا اصول ہیں، کرداروں کو کیونکر آگے بڑھایا جاتا ہے مختلف کرداروں کو کسی ایک مرکز سے کیونکر وابستہ رکھا جاتا ہے اور پھر اخیر میں نتیجہ پر کیونکر پہنچتے ہیں۔

فسانہ آزاد شروع میں لکھا گیا یعنی واحد علی شاہ کی حکومت ختم ہونے کے ایک چوتھائی صدی بعد اور یہ وہ زمانہ تھا جب خود یہاں کی ناول نگار پیدا ہو چکے تھے۔ شرر اس میدان میں آچکے تھے۔ ہردوئی کے حکیم محمد علی کے ناول بھی ماہنامہ مرقع عالم میں بالاقساط شائع ہوتے رہتے تھے اور مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا تو اپنی ایک منتقل جگہ پیدا کر چکی تھی۔ سرشار کی نعت ان میں سے کسی سے لگا نہ کھاتی تھی۔ شرر ایک متین اور سنجیدہ شخص تھے اور اپنے ناولوں میں بھی انہوں نے ایک سنجیدہ قسم کے تاریکی ناول نگاری کی حیثیت قائم کرنا تھی گویا وہ اردو کے

جرمی نیران تھے، حکیم محمد علی کے ناولوں میں رعایت لفظی و ابہام کا نسخا رنگ زیادہ پایا جاتا تھا جو اس وقت بہت مقبول تھا لیکن وہ سرشار کے مقابلہ میں زیادہ مشہور نہ ہو سکے، رسوا کی امراؤ جان ادا میں جو رنگ جھلکتا تھا وہی سرشار کا تھا لیکن مرزا رسوا کا ناول واقعیت کی جانب تھا اور سرشار کو شاید کوئی ذاتی تجربہ اس قسم کی نگین محبت کا میسر نہ آیا تھا، تاہم وہ اس وقت کی لکھنؤی رنگ کی معاشرت میں پوری طرح رچے ہوئے تھے اور یہاں کا کوئی لکھنڈ ٹاپن ایسا نہ تھا جس سے وہ واقف نہ ہوں، جیسا کہ ہم نے ابھی غا ہر کیا، جانا عالم کو شیا برج سردھارے ۲۵ سال پہلے تھے مگر یہاں ابھی چھائی تھی کچھ کچھ دھوپ دیوار گلستاں پڑا اور باد جو دوبار ختم ہو جانے کے لئے یا سمن باقی تھی۔ لکھنؤ گٹر چکا تھا لیکن اس کے اس بگاڑ میں بھی لاکھوں بناؤ تھے۔ گھر گھر محاسن لطیف و نشاط کا قیام کے گوشہ گوشہ میں زندان بادہ کش کا ازدحام ہر پرہیزگار سے حسن دنوں کی جلوہ فروشی اور ہر ہر گلی میں عشق کی تیش اندوزی، ہر شام شب عیش کے اسباب کی وہ افراط گو یا صبح تک زندہ رہنا نہیں اور ہر صبح آئینہ شام کے لئے وہ اہتمام گویا کبھی مرزا نہیں، گدا سے لیکر امیر تک سب کی آنکھوں میں سرسوں پھولی ہوئی اور جدھر دیکھتے ریشمی پردوں کی اوٹ میں حمیری ریشمی پر حسن و شباب کی مدھوشیوں کا وہ عالم جیسے اس رات کی کبھی صبح نہیں ہوتا تھی۔ رقص و سرود کی محفلیں، شعر و سخن کے ہنگامے، میلوں ٹھیلوں کا اہتمام، بڑیا بازی اور کنکوسے بازی کے جھگڑے، بات بات میں ظرافت و بذلہ نمی، لطیف گوئی، فقرے بازی، ضلع جگت، چھتی، انونیوں کی لچھوڑا باتیں، داستان گوئیوں کی من ترانیاں، جاہلانی اور چکن کی چٹکنیں، پیچی کے کام کی تازگی دہلی ٹوپیاں، شانوں پر معطر و مال، آنکھوں میں سرمہ اور ہونٹ پاں سے ہر وقت لال، یہ تھا لکھنؤ اور وہاں کی معاشرت جب سرشار نے فضاء آزاد لکھا۔ پھر یہی نہیں کہ وہ اس مینا بازار میں صرت تماشائی کی حیثیت رکھتے تھے، بلکہ شام کو چمک میں کھوسے سے کھوا ان کا بھی چھلکتا تھا، ساتوں کی دوکان پر وہ بھی خوشبودار خمیرہ کا لطف اٹھاتے تھے اور جب کوٹھوں سے نغمہ و سرود کی آوازیں بلند ہوتی تھیں تو وہ بھی بے چین ہو کر اوپر چڑھ جاتے تھے۔ اودھ نیچے کا دفتر ان کا اڈا تھا اور مرزا سجاد حسین، ترہیون ناتھ پھر، اکبر الہ آبادی اور نواب محمد آزاد ان کے یاران طریقت ہیں سے تھے جن کی معیت میں وہ لکھنؤ کی معطر و رنگین زندگی بسر کر رہے تھے۔ الغرض یہ تھا وہ لکھنؤ جس کی تصویر سرشار نے فضاء آزاد میں کھینچی ہے اور اس قدر تکمیل کے ساتھ کہ اس کا کوئی پہلو باقی نہ رہے جانے نہیں دیا۔ اس وقت کی کونسی صحبت تھی جس کا ذکر فضاء آزاد میں نہیں، کونسی تفریح تھی جس کی تفصیل اس میں موجود نہیں اور محافل عیش و نشاط کی وہ کونسی انگڑائی تھی جو اس میں نہ پائی جاتی ہو، فضاء آزاد اور اصل ایک ناول نہیں، ساڑھے تین ہزار صفحات کا مرتبہ ہے، جس میں ایک خاص عہد کی لکھنؤی تہذیب و تمدن کی تصویریں سرشار نے کھینچ کر رکھی ہیں۔ پھر یہ نہیں کہ سرشار نے محض تفنن لکھا ہو۔ بلکہ اس کا ایک خاص مقصود بھی ہے اور باوصف ان تمام باتوں سے لطف لینے کے کچھ بیزار ہی بھی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس بچہ دی کے ساتھ ان میں ہنسیاری بھی کچھ نہ کچھ پائی جاتی تھی۔ اور وہ ایسا محسوس کرتے تھے کہ جس معاشرت کو وہ پیش کر رہے ہیں وہ درحقیقت خطا کی یادگار ہے اور جس زندگی کی تصویر انھوں نے کھینچی ہے وہ روح سے کیسے خالی ہے۔ فضاء آزاد بڑھنے کے بعد کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شخص سوئے ہوئے جو تک پڑا ہے اور وہ اپنے ساتھیوں کو بھی چونکا نا جانتا ہے، لیکن جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر نہیں بلکہ لمبے سہلا سہلا کر، منہ پر گلاب چھڑک چھڑک کر جس کا سب سے پہلا ثبوت ہمیر و ہیر و حق کا کیر کر رہے۔ اس زمانہ میں کسی خاتون کا شادی کی یہ شرط تو وہ نہ کہ سنگترا پیلے کوئی کار نمایاں کر کے دکھائے اور اپنی قوم کی طرف سے دشمن سے جنگ کرے، بالکل نئی بات تھی، کیونکہ اس زمانہ میں لکھنؤی بیگمات کے اندر یہ جس پیرا ہی نہ ہوئی تھی اور نہ کسی لکھنؤی امیر زادہ سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ حرم کی عیش و خوش زندگی کو چھوڑ کر میدان جنگ کی سختیاں جھیلنے کے لئے طیار ہو جائے گا۔ سرشار میں چونکہ اس وقت مغربی اثرات سے قوم پروری کا جذبہ پیدا ہو چلا تھا اور اسی کے ساتھ یہ بھی ان کا دل چاہتا تھا کہ ہندوستانی عورتوں کو علاوہ گھر و محلہ زندگی کے باہر کی دنیا سے بھی دلچسپی لینا چاہئے، اس لئے انھوں نے اپنے ہمیر و اور ہیروئن کی بنیاد اسی جذبہ پر قائم کی۔ لیکن انھوں نے کہ اس مقصد و غایت تک پہنچنے میں بہت سی غیر متعلق اور بے جوڑ باتوں کا بھی اضافہ کر دیا جس سے اصل مقصود فوت ہو گیا۔ فضاء آزاد کا وہ حصہ جو آزاد کے سفر و سیر سے تعلق رکھتا ہے، اس کا سب سے زیادہ ناگوار حصہ ہے، کیونکہ سرشار نے یورپ سے واقف تھے نہ وہاں کے اظہار و خصایل سے نہ وہاں کی معاشرت و اخلاق سے، اور انھوں نے اسے بالکل لکھنؤ پر قیاس کر کے وہاں کا نقشہ کھینچا ہے جو بالکل ناموزون و نامتنا

ہے۔ یہاں تک کہ وہ وہاں کی دو معزز خواتین کو بھی آزاد کے عشق میں مبتلا دکھاتے ہیں اور گھسیٹ کر لکھنؤ لے آتے ہیں، ہر چند اس سلسلہ میں آزاد کا بلند کیرئیر دکھانے کی انھوں نے پوری کوشش کی ہے، اور حسن آواز سے جو عہد وفا آزاد نے قائم کیا تھا اس کے نباہنے میں ہر ممکن طریقہ سے کام لیا ہے، لیکن یہ تمام سلسلہ بالکل غیر فطری اور بہت ٹانگ سے تعلق رکھتا ہے۔ علاوہ اس کے جن حالات و واقعات سے دوران سفر و سیاحت سے روشناس کرایا گیا ہے، وہ بھی بہت سطحی اور گھٹیا درجہ کے ہیں، البتہ فسانہ آزاد کا وہ حصہ جو لکھنؤ اور یہاں کی معاشرت سے تعلق رکھتا ہے یقیناً اپنے اندر بڑی معلومات رکھتا ہے اور وہی فسانہ آزاد کی شہرت و مقبولیت کا باعث ہے۔ اس حصہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کی معاشرت کا بچہ نہ کرنے میں معمولی سی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا اور زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر سرشار نے تیز روشنی نہ ڈالی ہو۔ کوئی کہیں تماشہ ایسا نہیں جس کا ذکر انھوں نے پیش نہ کیا ہو اور یہاں کی سیگمات کے مشاغل زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کی تصویر انھوں نے نہ کینچی ہو۔ فسانہ آزاد کی ایک اور خصوصیت جسے کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ جس کی قیمت شاید امتداد زمانے کے ساتھ اور بڑھتی جائے گی، افس کی زبان ہے۔ زبان دراصل نام اس کا نہیں ہے جو ہم کتابوں میں استعمال کرتے ہیں بلکہ یہ وہ ہے جسے ہماری عہد تیں اور بچے ہر وقت استعمال کرتے ہیں اور جس میں لغات کم اور محاورے زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر اس سے انکار ممکن نہیں کہ لکھنؤ کی وہ زبان جو کسی وقت وہاں کی بے تکلف صحبتوں میں بولی جاتی تھی، وہ زبان جسے یہاں کی سیگمات کسی وقت استعمال کرتی تھیں اور وہ محاورہ و روزمرہ جو ادب کی جان ہے اب تقریباً ختم ہو چکا ہے اور اس کا جاننے والا شاید ہی کوئی رہ گیا ہو۔ لیکن فسانہ آزاد اس دولت سے مالا مال ہے، اس میں ہمیں ہر طبقہ، ہر واسطی، ہر رسم و تقریب، ہر صحبت و مجلس کی وہی نکسالی زبان ملے گی جو دہلی سے اُجڑ کر لکھنؤ آئی اور پھر لکھنؤ نے اپنی مشاطگی سے اسے سنوارا۔ اس حیثیت سے فسانہ آزاد بڑی قیمتی چیز ہے اور اس کی ہمیشہ قدر کی جائے گی۔

فسانہ آزاد کی دوسری خصوصیت جس نے اسے اس قدر مقبول بنایا اس کا ظریفانہ لب و لہجہ ہے جسے خوشی کے عجیب و غریب کیرکڑے پیدا کیا گیا ہے اور فسانہ کے تار و پود میں اس طرح اسے پینا ہے کہ اگر آپ اسے غلطہ کر دیں تو سارا رشتہ درہم برہم ہو جائے۔ خوشی کے کیرکڑے میں صحت ظرافت و ہذرت ہی نہیں ہے بلکہ ہلکی سی تنقید بھی ہے، ایک قسم کا PARADOX بھی ہے جو بظاہر جمل معلوم ہوتا ہے، لیکن دراصل اس کے ذریعہ سے لکھنؤ کی معاشرت کے چوچلوں اور وہاں کی سطحی زندگی پر طنز بھی کیا گیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک عجیب بھی ہے اور وہ یہ کہ خوشی کو اس میں بالکل ایک دوسرے ہیر و کی سی اہمیت دیدی گئی ہے، یہاں تک کہ اگر ہم فسانہ آزاد سے آزاد کیرکڑ کو غلطہ کر دیں تو بھی اس کی دلچسپی میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔

اب رہا یہ سوال کہ فسانہ آزاد کو ہم کس نہف ادب میں شامل کریں، سو اس کی تعین دشوار ہے، اگر ہم اسے داستان کہیں تو بھی ٹھیک نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ داستانوں کی ٹانگ سے اس کی ٹانگ علیحدہ ہے، اگر ہم اسے سیاحت نامہ کہیں تو بھی درست نہ ہوگا، کیونکہ سیاحت نامہ کی واقعاتی خصوصیات اس میں بائیں نہیں پائی جاتیں، لہذا ہم اسے ناول کہیں تو بھی ٹھیک نہیں کیونکہ ناول کی خصوصیات سے بھی وہ خالی ہے۔ رہ گیا فسانہ سو فسانہ کی سی رنگارنگ دلچسپیاں بھی اس میں نہیں پائی جاتیں ہاں اسے اگر ہم ایک قسم کی ڈائری یا مذاکرات کہیں تو البتہ اس کی ایک حیثیت متعین ہو سکتی ہے اور یہ شاید اس کی وہ حیثیت ہوگی جو اس سے قبل اردو کی کسی اور ادبی تصنیف نے حاصل نہیں کی۔ (ریڈیو۔ لکھنؤ)

## قول فیصل

جس میں ایک کے مشہور مفکر و بلند خیال شاعر علی اختر اختر حیدر آبادی نے ثابت کیا ہے کہ انسان لاکھ ترقی کر کے کتنی ہی عقل و فطرت کا کام لے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کو خدا کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ فنی حیثیت سے اختر کا یہ بڑا عظیم انشان کا نامہ ہے، ثبوت میں آسانی پیش کیا جاسکتا ہے شروع میں حضرت نیاز فتح پوری کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ کاغذ پورٹو دیر گزردوش رنگیں۔ قیمت دو روپیہ۔ - نیچر نگار لکھنؤ

# عرش ملیانی اور اردو شاعری

برفیسٹر شیر حسن ایم۔ اے

بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی ہر شعبہ حیات میں اس تیزی سے انقلابات آئے کہ انسان سرائی کی حد تک متغیر ہو گیا۔ امتداد وقت ساتھ ساتھ تغیر و تبدل کی لہریں اور بھی تیز اور شدید ہوتی گئیں۔ فطری طور پر دنیا کے ادب بھی ان غیر معمولی رنگینیوں سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکی۔ چونکہ ہندوستان کی سرزمین مغربی ممالک کے مقابلہ میں اس اچانک تبدیلی کے لئے اچھی طرح طیارہ نہ تھی لہذا یہاں کی زندگی کے ہر پہلو اس کا رد عمل خاطر خواہ نہ ہو سکا۔ لوگوں میں احساس تعمیر سے زیادہ جذبہ تخریب نمایاں ہونے لگا، مصالحت کی جگہ مکہ چینیوں نے لے لی۔ بساط بچنے کے قبل ہی پرانی بساط اٹھائی جانے لگی۔ نئے خیالات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے بغیر انھیں اپنا لیا گیا اور پرانے تصورات کی اہمیت غور و فکر یک قلم نظر انداز کی جانے لگی۔ نتیجہ کے طور پر تعمیری گوشوں میں بھی انتشار عدم تسلسل اور پراگندگی کی کیفیتیں غالب رہیں، اردو ادب ہی اس سے مستثنا نہیں رہا۔ خصوصاً اردو شاعری کی انگ ”انقلابی اتھوں“ سے اجاڑنے کی بانسابطہ کوشش کی گئی۔ لیکن خوش قسمتی سے ان کے ساتھ ساتھ ایک کاروان خیال ایسا بھی تھا جو اس برے وقت میں ہمیشہ ادب کی رہنمائی اور مینظت کرتا رہا۔ اسی کاروان خیال کے ثابت قدم مسافر عرش ملیانی بھی ہیں۔ عرش کی شاعری کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ”مواد“ اور ”ہیئت“ کی اہمیت کو سمجھ لینا ضروری ہے ایک ادیب یا شاعر کو مواد کے انتخاب میں پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ وہ اپنی تخلیق کے لئے قدرت کا ملکہ کے کسی بھی عنصر کو منتخب کر سکتا ہے لیکن ہیئت کے متعلق اسے سوچنا پڑے گا اس لئے کہ ہیئت ایک مخصوص تکنیک کی باندی ہوتی ہے۔ اس مخصوص تکنیک کا اپنا ایک معیار حسن بھی ہے جو صنف ادب کے اختلاف کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ تجربات کا تنوع، خیالات کی تفریق یا نقطہ نظر کا امتیاز آرٹ کے لئے نقصان دہ نہیں ہر تکنیک کا تغیر و تبدل اس کے حسن کے لئے مصراہت ہو جاتا ہے۔ تکنیک میں بھی نئے نئے تجربے کئے جاتے ہیں لیکن ان تجربات کی کامیابی اس فن کے نئے نہیں جب تک کہ نئے تجربات ادبی حسن (توکلہ ص ۷۷) کے امین نہ بن جائیں۔ طرز خیال میں انقلاب پیدا کر دینا مشکل میں لیکن اسلوب (ص ۷۷) میں یک پیرا کرنا یہی نہیں کہ ایک کٹھن مرحلہ ہے بلکہ ایک بڑی ذمہ داری کا بھی کام ہے۔

عام طور سے ادیب کے بنیادی خیالات اس کے دور کے بنیادی خیالات ہوتے ہیں۔ یہی بنیادی خیالات مختلف دماغوں میں مختلف نوعیت اختیار لیتے ہیں، کہیں ان کا رد عمل ہلکا اور دھیمہ ہوتا ہے اور کہیں تیز اور شدید۔ لیکن رد عمل کا اختلاف بنیادی خیالات کا اختلاف نہیں سمجھا جاسکتا، عرش ملیانی کے بنیادی تصورات بھی انھیں کے زمانہ کے بنیادی تصورات ہیں۔ مزدور کو دیکھ کر ان کا بھی دل کڑھتا ہے۔ سرمایہ دار کی ستم آگیزوں پر نہیں بھی غصہ آتا ہے۔ اپنے دیس میں یہ بھی سچی جمہوریت چاہتے ہیں۔ لیکن نہ تو وہ مزدور کی غربت دیکھ کر ”انقلاب زندہ باد“ پتھتے لگتے ہیں نہ جب سرمایہ دار پر غصہ آتا ہے تو فوج کھسوت پر آتر آتے ہیں۔ عرش کا مزاج ایک سلجھا ہوا مزاج ہے، ان کا انداز تفکر بے شعوری شہید نہیں۔ وہ زمانہ کے تیور اور اس کی جڑھتوں کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں، اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہیں اور اس کے تعلق جو بھی فیصلہ کرتے ہیں اس خلوص و متانت اور خود اعتمادی کے ساتھ کرتے ہیں کہ ہر بات دل میں گھر کر جاتی ہے۔ ان کے تجربات یوں میں فخر سے نہیں لگاتے پھرتے، ان میں ایک وزن ہے۔ ان کے شکوے میں بھی رکھ رکھاؤ ہے۔ تجربے کا یہی وزن اور انداز بیان کا رکھ رکھاؤ ان کے جذبات کی صداقت کا بھی ضامن ہے۔ ان کے مجموعہ کلام ”مفت رنگ“ میں نظم ”جہل کی رات“ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عقل کی صبح کہاں جہل کی ہے رات ابھی  
فہم انسان میں بھی فرسودہ خیالات ابھی

ان کی دو معزز خواتین کو بھی آزاد نہ اب تک،  
 گردن پہر میں ہے طوقِ روایات ابھی  
 ان کے انھوں نے پوری کوشش نہیں ابھی دل محروم  
 زینۂ عقدہ کشائی ہے مناجات ابھی  
 یہ تمام سلسلہ بالکل فوجد ہے وحشت اشراق ہنوز  
 قبت اذہان پہ ہے ہر کرامات ابھی  
 روح احساس پہ ہے گرد تک مایہ ہنوز  
 دوش انکار پہ ہے زلف خرافات ابھی  
 عرش کیوں خواب سے بیدار ہوا جاتا ہے  
 بند کر آئینہ کہ باقی ہے یہاں رات ابھی

یہاں ہمیں نقطہ تجربات میں وزن اور بیان میں رکھ رکھاؤ ہی نہیں ملتا بلکہ جذبات کی صداقت اور طرز خیال کے اچھوتے پن کا احساس ہوتا ہے، عرش عام شاعروں کی طرح جذباتی نہیں۔ ان کی طبیعت میں ٹھہراؤ ہے، ان کے احساسات و جذبات ان کے فہم اور ادراک کے پابند ہیں۔ کٹھن کٹھن راستے پر بھی ان کا پائے استقلال نہیں ڈھنگا تا۔ ان کے اشعار میں ہوش و حواس اور عقل و فراست عنصر نمایاں ہیں۔ خصوصاً ان کی نظمیں، ان کی ذہنی بلندی اور فکری تقدس کی عینی جاگتی مثالیں ہیں۔ جذبات کا ٹھہراؤ، مزاج کی متانہ اور تجربے کی پاکیزگی عرش کو اپنے دیگر ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔ جگر مراد آبادی، فوج ناروی قسم کے شاعروں میں بھی ہمیں زیادہ جگہ نہیں ملتی۔ لیکن پھر بھی ان کے کلام کا بیشتر حصہ پر تصنع معلوم ہوتا ہے، محض اس لئے عرش کی طرح ان کے جذبات میں ٹھہراؤ تو ہے گرمی نہیں، مزاج میں متانت بھی ہے مگر ذہانت نہیں، فکر و نظر میں اکثر پاکیزگی بھی ہوتی ہے لیکن گہرائی نہیں۔ جگر نے اس طرف کچھ ترقی ہے لیکن دیکھا دیکھی ترقی اب تک ان کی شاعری کا مزاج نہیں بن سکی ہے زیادہ نقالی ہی نقالی ہے۔ جگر تو خیر مشاعرے کے لئے بھی ہیں ناروی تو اس قابل بھی نہیں۔ عرش کو ہم ان عیوب سے پاک پاتے ہیں۔ ان کی یہ بڑی خوبی ہے کہ جگر اور فوج ناروی کی طرح وہ اپنے تجربے کو شعر نہیں "بنا" دیتے۔ عام طور سے بناوٹ اور تصنع (artificiality) ان کے یہاں نہیں ملتا۔ اگر کہیں ان تجربات میں سو فیصدی انوکھا پن نہیں ہوتا تو سو فیصدی روکھا پن بھی نہیں ہوتا۔ ان کے کلام میں اعتدال کا احساس ملتا ہے۔

جیسا کہ میں اوپر کہ چکا ہوں عرش کا نقطہ خیال بھی اپنے عہد سے پورے طور پر متاثر ہے۔ لیکن ان کا اسلوب وہی پُرانا ہے۔ ان کے سلسلہ میں عرش قدامت پرست کہے جاسکتے ہیں لیکن ان کی یہ قدامت پرستی کہیں بھی ان کے حسن شاعری کا گلا گھونٹتے ہوئے نہیں آتی، وہ نئے خیالات کو پُرانا جامہ پہنانے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ آل احمد سرور کے الفاظ میں: "نئی شراب کو پُرانی بوتل میں ڈال کر ایک نیا نشہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام "ہفت رنگ" یا "چنگ و آہنگ" میں کہیں بیجا ترک بھڑک نہیں ملتی۔ ان الفاظ کشتیاں نظر آتی ہیں، خیالات میں کوئی خاص ندرت طرازی بھی نہیں ملتی اور نہ بیان میں کوئی نمایاں جدت پسندی نظر آتی ہے۔ ان شاعری کی اصل روح ان کے انداز فکر کی متانت و سنجیدگی اور طرز ادا کا بھولا پن ہے۔ عرش کی انفرادیت کی تشکیل اور شاید نگینا انھیں خصوصیتوں میں ہوتی ہے۔

دور حاضر کے شاعروں میں فیض احمد فیض ہی ایک ایسا شاعر ہے جس نے نظم کی تکنیک میں کامیاب تجربے کئے ہیں۔ اس کے تجربے کی یہی اٹھائے کا لیبائی اس کی شاعری کی مزاج ہے۔ مرن تکنیک ہر کامیاب نہیں بلکہ ہمیں اس کے تصورات میں بھی ایک نمایاں ملتا۔ دوسرے شاعروں نے بھی نئے تجربے کئے ہیں۔ لیکن یہ تجربے زیادہ تر جمالی سخن کا خون اپنی گردن پر لئے ہوئے ہیں۔ عرش نے کہا اس راہ پر چلنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ وہ تو اپنے بنے بنائے راستے پر بھی بہت سی سہیلیں کر چلتے ہیں۔ ان کی آہستہ روی اور عقل ان کے "تنہا روی" کہی جذباتیت اور جلد بازی کی شکار نہیں ہوتی، فہم اور سعی و کوشش کا احساس ان کے کلام میں نمایاں تر ہے۔ ان شاعری کا یہ کمال سمجھا جاتا ہے کہ اس میں "احساس تکمیل" (SENSE OF PERFECTION) پایا جائے۔ انگریزی نگینا آزاد ہوں یا جہت مجموعہ نظموں کی طرح "نہ ابتدا کی جبر ہے نہ انتہا معلوم" قسم کا نہیں ہوتا۔ شاعروں کی تخلیق کے سلسلہ میں بڑی عمر کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایک موزوں مصرع کے لئے آسے برسوں کو کاوش کرتی پڑتی ہے۔ ہمارے شاعروں کی ذہنیت بالکل اس کے برعکس

جو کچھ ایک بار کہہ دیا کہہ دیا۔ نظر ثانی بھی مشکل ہی سے ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ عرش کی نظموں میں ہمیں "احساس تکمیل" پورا پورا ملتا ہے ان کا کلام پراگندگی اور انتشار سے عاری ہے۔ "ہفت رنگ" میں نظم "بازمانہ ساز" اور "چنگ و آہنگ" میں نظم "دیہاتی دوشیزہ" پر غور فرمایا جائے۔

عرش کے کلام میں رومانیت کی بھی چھاؤں ملتی ہے۔ لیکن ان کی رومانیت سستے قسم کی رومانیت نہیں اس میں خلوص و ہمدردی اور احساس سپردگی ہوتا ہے۔ ان کی رومانیت کا نراج کم و بیش وہی ہے جو اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے نصف ابتدائی حصہ میں انگریزی شاعروں کی رومانیت کا نراج تھا۔ اس لئے کہ ہمیں عرش کی نظموں میں بھی رومان کے ساتھ فطرت پرستی کا امتزاج ملتا ہے جو اُس وقت انگریزی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی، چنانچہ عرش کی نظم "دیہاتی دوشیزہ" تو کم و بیش درڈ سورتھ *Wordsworth* کی نظم *Solitary Reaper* سے طرز خیال اور تکنیک دونوں میں مماثل ہے۔ درڈ سورتھ بھی عرش کی طرح ایک دیہاتی دوشیزہ کی "سادگیِ حسن" اور اُس کی معصومیت دیکھ کر متاثر ہوتا ہے۔ عرش بھی ایک دیہاتی دوشیزہ کی اُسی "سادگیِ حسن" اور معصومیت سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ درڈ سورتھ کی دوشیزہ کھیت میں کٹتی کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے اور عرش کی "دوشیزہ" پنکٹ سے پانی لاتے ہوئے نظر آتی ہے۔ لیکن دونوں شاعر کے تاثرات کی فوجیت ایک ہی ہے۔ دونوں کے دل مذموم جذبات سے پاک ہیں۔ ان کی رومانیت اور فطرت پرستی بظاہر داخلی اور انفرادی معلوم ہوتی ہے لیکن ذرا سا گہرائی میں جانے کے بعد ہمیں یہی ذاتی تجربہ عالمگیر معلوم ہونے لگتا ہے۔

عرش نے گیت بھی لکھے ہیں لیکن مجموعی طور پر وہ اس صنف میں کامیاب نہیں، محض تعلقِ طبع کے لئے اس میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔ ان کی لغت البتہ قابلِ توجہ ہے۔ بیسویں صدی میں اول تو کوئی اس صنفِ سخن کی طرف دھیان ہی نہیں دیتا۔ اگر کہیں نعتیہ کلام ملتا بھی ہے تو اُس میں شاہانہ حسن ایک سرے ہی سے مفقود ہوتا ہے۔ تاثر عقیدہ تمدنی اور مولویانہ جذبات غالباً ملے ہیں۔ عرش کی نعت میں ہمیں انتہائی عقیدت اور احساس سپردگی کے ساتھ ساتھ ذوقِ سخنِ سنجی کا بھی پتہ ملتا ہے۔ ان کی نعت میں شاعری کے تمام محاسن موجود ہیں بلکہ میں تو کہوں گا کہ اکثر اوقات نظموں اور غزلوں سے زیادہ ان کی نعت میں حسنِ آفرینیاں ملتی ہیں۔ اس سلسلے کے بھی چند اشعار بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔

عادل جلوۂ ازل پیکرِ نور ذات تو	شانِ پیمبری سے ہے سرورِ کائنات تو
فیضِ عظیم سے ترے قلب و جگر کی دستیں	مومن حق پرست کا حوصلہٴ نجات تو
شانِ بشر کا مہتاب، خالقِ دہر کا حبیب	مردِ خدا پرست کا آئینہٴ حیات تو
رخِ مصطفیٰ کا جمال اللہ اللہ	زباں کا وہ حسن مقال اللہ اللہ
جہاں کے لئے مشدہٴ عمیدِ عرفان	عرب کی فضا کا ہلال اللہ اللہ
اُتر آئے خود عرش و کرسی کے جلوے	نبوت کا اوج کمال اللہ اللہ

(از مجموعہ کلام "آہنگِ حجاز")

غزل کے میدان میں عرش کا جوہر اور بھی کھلتا ہے۔ یہاں ہمیں صرف شانیت اور خجندگی ہی نہیں بلکہ خیال کی شگفتگی اور بے باق کی گھلاوٹ بھی ملتی ہے ان کی غزلوں میں شعریت اور "غنائیت" بدرجہ اتم موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:-

عشقِ بے باق کے سہارا کبھی کبھی	اپنے خدا کو ہم نے پکارا کبھی کبھی
آمودہٴ خاطر ہی نہیں مطلعِ نظر	غم بھی کیا ہے ہم نے گوارا کبھی کبھی
ستہارِ روی نے رکھی جاسے جنوں کی لاج	گو اہلِ کارواں نے پکارا کبھی کبھی

ان کے اشعار میں فلسفیانہ رنگ اور خود اعتمادی کی بھی جھلک نمایاں ہے دیکھئے:-

ہے۔ یہاں تک کہ وہ وہاں کی دو معزز خواتین کو بھی آ  
تہ کا بند کر کر دکھانے کی انھوں نے پوری کوشش  
کی، لیکن یہ تمام سلسلہ بالکل

میرت سے بھرپور کون دیکھتے رہے  
کیا کوئی اسے اپنی محفل تم میں دیوانہ بھی ہے  
غالب کی عرش پر غائب سے بھی متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھئے مندرجہ ذیل اشعار کس طرح غالب کی یاد تازہ کر رہے ہیں  
وہ آشیاں کے پاس ہے میں آشیاں سے دور  
اچھا ہوا یہ پھول کھلا گلستاں سے دور  
میں آشیاں میں رہ کے بھی ہوں آشیاں سے دور  
خرد کی منزلیں ملے کر گیا آشفٹ سر ہو کر  
چلا ہوں ان کے در تک آپ اپنا نامبر ہو کر  
آتا ہے رشک مجھ کو قفس میں بھی برق پر  
دل نذر ذوق چشم تماشا نہیں ہوا  
اک اور ہی جہن ہے تصور میں رات دن  
کمال بہت دل پر جنوں میں اشک ہے مجھ کو  
مجال گفتگو پاؤں میں شاید اس بہانے سے  
کسی نے کسی شعر میں غالب کا انداز خیال نہ ہو مگر اسلوب بیان کے تیور صاف طور پر "غالبیت" لئے ہوئے ہیں۔  
جیسے کہ میں متعدد بار کہ چکا ہوں عرش کے کلام میں پرواز تخیل نہیں اور نہ وہ اوج فکر و نظر ہے جو غالب کا طرز امتیاز تھا لیکن کہیں  
کبھی عرش اپنے شعر کے انوکھے پن میں محض غالب ہی سے نہیں بلکہ اس زمانہ کے فیض و اندیش سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ ان کی نظم "پُرانا جوتا"  
میں صحتِ نوجوان اور زورِ بانی کی مثال اس سے اچھی آپ کو شاید کہیں نہ مل سکے۔ ایک پُرانا جوتا عام توجہ کیا کسی توجہ کا مستحق نہیں ہوتا،  
لیکن عرش کی شاعری کا غلبہ ہے، لیکن عرش نے اس پُرانے جوتے سے جو مصروف لیا ہے وہ شاید چاند ستاروں سے بھی نہیں لیا جاسکتا تھا۔  
اس کی شاعری کی شاعری کا غلبہ اسباب سمجھنا ہوں۔

دعوتیں بند لاہور سے:-

جیسے مڑتا ہوا اک مفلس و بیکس مزدور  
میرے ہمراہ تھا ہر ایک بے بند دیوار  
میں  
لام کرتے ہوئے خاموشی غم سا ماں میں  
گوشتِ مٹی میں اک سمت پُرانا جوتا  
یہ وہ جوتا ہے کہ جب دور پہ تھا اس کا شہاب  
ایک آواز سے ڈھکاتے تھے ماتحت مرے

نکار۔ تجربہ و شعور

کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ چار سہ نالوں نے دل کے  
مردی کا رسیا کٹھن اور ذوق دل کے اور اب بربادی دل کے بعد وہ یادگار بھی باقی نہ رہی۔  
اگر نالہ کے بعد کٹھن بھی محو ہو گیا ہے۔

غزل (۱۹) اور (۲۰) صاف ہیں

غزل (۲۱)

مردہ کی

مردہ کی

اثر ہر شخص صرف کا

## رعایتی اعلان

من ویزداں — مذہبی استفسارات و جوابات — نگارستان — جالستان — شہوانیات  
مکتوبات نیازتین حصے — انتقادات — ماہ و اعلیہ — حسن کی عیاریاں — شہاب کی مسکونہ  
فلاسفہ قدیم — مذاکرات نیاز — فراست الید — نقاب اٹھ جانے کے بعد

میزان  
طبع

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف چالیس روپے میں مل سکتی ہیں  
منیجر نگار لکھنؤ

اس کی تعبیر پوچھنے والے زندگی زندگی ہے خواب نہیں  
محبت سوز بھی ہے ساز بھی ہے خموشی بھی ہے یہ آواز بھی ہے  
ترانہ ہائے ساز زندگی میں اک آواز شکست ساز بھی ہے  
خموشی پر بھروسہ کرنے والے خموشی درد کی عمارت بھی ہے  
عرش کی غزلوں میں ہمیں تیر کا سوز و گداز بھی ملتا ہے لیکن اس سوز و گداز کے تاثرات بے قراری دل کے مریوں منت نہیں  
بلکہ وہی انداز بیان کے بھولاپن کے مشکو بہ ہیں۔ چندا شعار ملاحظہ کیا جائے :-

ہم کو قفس سے کس رہائی تو مل گیا، اڑنے کے واسطے ہیں مگر بال و پر کہاں  
رہبر تو کیا نشان کسی رہزن کا بھی نہیں گم گشتی گئی ہے مجھے چھوڑ کر کہاں  
نالہ خلوت عشق تو نغمہ خلوت دل، میں ہم نوا جہاں میں کسی کا نہ ہو سکا

مگر تیر کی طرح عرش تو ملی نہیں کشمکش حیات سے نہ تو وہ گھبراتے ہیں اور نہ اس سے ہار مانتے ہیں۔ وہ مایوسیوں کے اندھیروں میں  
بھی درس و عمل کی فہم جلانے کے عادی ہیں۔ ملاحظہ ہو "چنگ و آہنگ" میں ان کی نظم "بڑے چلو"۔

عرش بھی اقبال کی طرح خرد کی حد بندیوں سے نالاں نظر آتے ہیں اور جنوں کی وسعت سامانیوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو :-  
جنوں پسند طبیعت سکوں پذیر رہی نہ اس آئی کبھی شورش خرد و مجھ کو  
طے کر گیا جنوں مرا اک جست میں انصیں حیرت سے مجھ کو کون و مکاں دیکھتے رہے  
عقل والے تو اٹھا سکتے نہیں بار جنوں کیا کوئی اس اہل محفل تم میں دیوانہ بھی ہے

اقبال ہی پر منحصر نہیں عرش، غالب سے بھی متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھئے مندرجہ ذیل اشعار کس طرح غالب کی یاد آ رہے ہیں

آتا ہے رشک مجھ کو قفس میں بھی برق پر وہ آشیاں کے پاس ہے میں آشیاں سے دور  
دل نذر ذوق چشم تماشا نہیں ہوا اچھا ہوا یہ پھول کھلا گلستاں سے دور  
اک اور ہی چمن ہے تصور میں رات دن میں آشیاں میں رہ کے بھی ہوں آشیاں سے دور  
کمالی بہت دل پر جنوں میں اشک ہے مجھ کو خرد کی منزل میں طے کر گیا آشفہ سر ہو کر  
مجال گفتگو پاؤں میں شاید اس بہانے سے چلا ہوں ان کے در تک آپ اپنا نامد بہر ہو کر

مکن ہے کسی شعر میں غالب کا انداز خیال نہ ہو مگر اسلوب بیان کے تیور صاف طور پر "قابلیت" لئے ہوئے ہیں۔

جیسا کہ میں متعدد بار کہ چکا ہوں عرش کے کلام میں پرواز تخیل نہیں اور نہ وہ اوج فکر و نظر ہے جو غالب کا طرز امتیاز تھا لیکن کہیں  
کہیں تو عرش اپنے تجربہ کے انوکھے پن میں محض غالب ہی سے نہیں بلکہ اس زمانہ کے فیض احمد فیض سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ ان کی نظم "پڑانا جوتا"  
پڑھئے۔ درست نبو اور ثروت بینی کی مثال اس سے اچھی آپ کو شاید کہیں نہ مل سکے۔ ایک پڑانا جوتا عام توجہ کیا کسی توجہ کا مستحق نہیں ہوتا،  
کوئی اس کے متعلق خواب بھی نہیں دیکھتا، لیکن عرش نے اس پڑانے جوتے سے جو مصروف لیا ہے وہ شاید چاند ستاروں سے بھی نہیں لیا جاسکتا تھا۔  
میں اس نظم کو عرش کی شاعری کا فخر اسباب سمجھتا ہوں۔

دو تین ہند ملاحظہ فرمائیے :-

گوشت و صحن میں اک سمت پڑانا جوتا، جیسے مڑتا ہوا اک مفلس و بیکس مزدور  
یہ وہ جوتا ہے کہ جب زور پہ جتا اس کا شہاب میرے ہمراہ تھا ہر ایک بلند ایوان میں  
ایک آواز سے ڈر جاتے تھے ماتحت مرے لام کرتے ہوئے خاموشی غم سا مان میں

جوئے گلشن کے دلاویز کنارے کیا کیا، اس نے دیکھے ہیں مرے ساتھ نظارے کیا کیا  
 ہے اگر کہنہ نظام ایک چرانا جوتا، نظم نو بھی تو کسی روز پڑا ہوگا  
 آج تقدیر سے ہے دوست زمانہ جس کا اس کا دشمن بھی تو اک روز زمانا ہوگا  
 الغرض نقشہ نگار نے یہ سنوڑا ہے جہاں اک نہ اک جوتا شب و روز اترتا ہے یہاں

مختصر کہ عرش کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت اس کے تجربات کا تنوع بھی ہے جو زمانہ حال کے کم شعراء میں پایا جاتا ہے۔ ادیب یا شاعر  
 کے تجربات کا تنوع یا جذبات کی نیزنگیاں اکثر اس کی تخلیق کے لئے سفر ثابت ہوجاتی ہیں۔ لیکن عرش کا ظن سخن بہت کشادہ ہے۔ ان کی قلمرو  
 (Keshri) ان کو بے راہ رو نہیں کر دیتی، نہ ان کی انفرادیت پر کوئی حریف آنے دیتی ہے۔ ان کی شخصیت ان کے کلام  
 سے اس طرح ہم آہنگ ہے کہ کہیں بھی ان کے پاس سخن میں لغزش نہیں ہوتی۔

عرش کی شاعری متقی فوق سخن کی شاعری ہے۔ ان کے احساس کی ہمہ گیری جذبات کا دھماکہ، انداز بیان کی سبک آہنگی، تجرید  
 صدفقت اور سب سے بڑھ کر ان کی شخصیت کا خلوص، ان کے کلام کی پابندگی اور بقا کی ضمانت ہے۔ ان کی روایتی شاعری ان کے رنگ کے پختہ  
 والوں کے لئے مزہ جافرا ہے اور شاید دیدہ کی اندیشوں کے واسطے مشعل راہ بھی۔

## رعایتی اعلان

من ویزداں — مذہبی استفسارات و جوابات — نگارستان — جالستان — شہوانیات  
 مکتوبات نیازتین حصے — انتقادات — ماہ و ماہیہ — حسن کی عیاریاں — شہاب کی سرگزشت  
 خلافت قدیم — مذاکرات نیاز — فراست الید — نقاب اٹھ جانے کے بعد

میرزا  
 علی

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف چالیس روپے میں مل سکتی ہیں  
 میجر نگار لکھنؤ

# شکلات غالب

## غزل (۱۸)

۱- شب، خار شوق ساقی، رتخیز اندازہ تھا، نامحیط بادہ صورت خانہ خمیازہ تھا  
شوق سانی، شوق آمد ساقی - رتخیز اندازہ = قیامت کے آمد۔  
محیط بادہ = خط ساغر یا خود ساغر مراد ہے۔  
مفہوم یہ ہے کہ رات ساقی کی آمد کا انتظار تھا اور اس کے نہ آنے سے ہم پر غمار کی کیفیت طاری تھی، لیکن یہ اس قیامت کی کیفیت تھی  
مسلل انگڑائیوں کی وجہ سے (جولازی نتیجہ ہیں غمار کا) خط ساغر یا خط شیشہ تک (یعنی تمام بزم بادہ میں) گویا جگہ مہ قیامت کی تصویر کھینچی  
ہوئی تھی۔ انگڑائیوں میں چونکہ ایک صورت ہنگامہ و تلاطم کی پائی جاتی ہے، اس لئے اسے "رتخیز اندازہ" کہا گیا۔  
غالب کا یہ شعر دروازہ کار تخیل کے سوا کچھ نہیں، اور اگر دونوں مصرعوں کی روایت کو تھا کی جگہ بود کرد و اجائے تو فارسی کا شعر ہو جاتا ہے۔

۲- یک قدم وحشت سے درس و فتر امکاں گھلا جادہ اجزاء دو عالم وحشت کا شیرازہ تھا  
وقفہ امکاں - عالم موجودات و ممکنات - جادہ = راستہ۔  
اس شعر میں وحشت و جنوں کی اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ جب تک ہم نے وحشت و جنوں میں قدم نہ رکھا تھا، ہم عالم امکاں کی حقیقت  
سے ناواقف تھے، لیکن اس وحشت میں قدم رکھتے ہی معلوم ہوا کہ راہ جنوں تو ایک ایسا شیرازہ ہے جس سے یہ دونوں عالم کے اجزاء و ارباب  
ہو جاتے ہیں۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ بقا و فنا کی حقیقت کا صحیح علم عقل و ہوش سے نہیں بلکہ وحشت و جنوں ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

۳- انجہ وحشت خزاں مہاں لیلیٰ کون ہے، خانہ مجنونی صحرانورد، بے دروازہ ست  
"صحرانوردہ مجنوں کی صفت ہے۔ وحشت خزاں = وحشت و جنوں کی حالت میں چل پڑنا۔  
مفہوم یہ ہے کہ مجنوں کا ٹھکانہ صحرانورد تھا جہاں نہ کوئی دروازہ ہے نہ کوئی اور روک ٹوک، پھر کیا دم تھی کہ لیلیٰ و جادہ صحرانورد ہو گیا  
اسی خیال کو غالب نے دوسری جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے۔ "گو میں نے کی تھی تو بہ ساقی کو کیا ہوا تھا"

۴- پوچھ مت رسوائی انداز استغناء حسن دست مرہون جنا، رخسار رہن خانہ تھا  
حسن کے استغناء کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اسباب آرائش سے بے نیاز ہے، اس لئے اس کے ہاتھوں میں جہدی اور رخسار پر گلگونہ لگا۔  
ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسباب آرائش سے بے نیاز نہیں ہے اور یہ کن کی انتہائی رسوائی ہے۔

۵- نالہ دل نے دئے اوراقِ لختِ دل بہاد یادگارِ نالہ اک دیوانی بے شیرازہ تھا

فارسی میں "چیزے بہاؤ دادن" تباہ و برباد کر دینے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ ہمارے نالوں نے دل کے ہنرے برباد و منتشر کر دیے، حالانکہ نالہ کی یادگار یہی منتشر و راق دل تھے اور اب بربادی دل کے بعد وہ یادگار بھی باقی نہ رہی۔ دوسرے مصرعہ میں یادگار نالہ کے بعد لفظ یہی محذوف ہے۔

## غزل (۱۹) اور (۲۰) صاف ہیں

### غزل (۲۱)

اس غزل کے اکثر اشعار موت کے رنگ کے ہیں۔

(۱) ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا نہ ہو مرنے تو جینے کا مزہ کیا  
نشاط کار = کام کرنے کا عرصہ۔

کار و بار عالم کی رونق صرف اس حقیقت پر منحصر ہے کہ دنیا بابر نہیں ہے اور ہر شخص کو مرنا ہے، اسی خیال کے زیر اثر ہر شخص صرف دکھ رہتا ہے اور اگر موت کا کھٹکا نہ ہو تو پھر یہ تمام ہنگامہ دنیا ختم ہو جائے اور جینے کا کوئی لطف باقی نہ رہے۔

۲۔ تجاہل پیشگی سے دعا کیا، کہاں تک لے سرائے ناز "کیا کیا"؟  
تجاہل پیشگی = جان بوجھ کر انجان بننا۔

یہ جو تم میری ہر بات پر انجان شخص کی طرح "کیا کیا" کہا کرتے ہو (گو یا کچھ جانتے ہی نہیں) تو اس سے آخر تمہارا کیا مطلب ہے۔  
بانتا ہوں کہ تم میرے حال سے خوب واقف ہو اور تمہارا یہ بار بار کا سوال تجاہل عارفانہ کے سوا کچھ نہیں۔

۳۔ نواز شہنائے بیجا دیکھتا ہوں، شکایتہائے رنگیں کا گلہ کیا  
دشمن ہر آپ کی بیجا نواز شہنائیں دیکھ کر اگر میں شکایتیں کرتا ہوں تو آپ کو اس کا گلہ کیوں ہے؟ شکایتوں کو رنگیں اس نے کہا تھا  
کہ ان کا تعلق محبوب وغیرہ کے ربط و تعلق سے ہے۔

۴۔ نگاہ ہے محابا چاہتا ہوں، تنہا فلہائے تمکین آزا کیا  
میں چاہوں کہ تم مجھ سے بالکل بے محاب اور بے تکلف ہو کر ملو لیکن تم تعافل سے کام لیتے ہو جو میرے لئے سخت صبر آزما ہے۔

۵۔ فروغ شعلہ خس یک نفس ہے ہوس کو پاس ناموس و ناکیا  
خس = تنکا، گھاس پھوس۔

اہل ہوس کی محبت بالکل ایسی ہی ہے جیسے خس میں آگ لگا دی جائے اور وہ دم کے دم میں سبڑک کر ختم ہو جائے، اس لئے ایسی ایدار محبت کرنے والے سے دنیا کی امید رکھنا عبث ہے۔

۶۔

نفس موجی محیط بیخودی ہے      تغافلہائے ساقی کا گدہ کب

ہماری ہر سانس خود دریائے بیخودی کی موج ہے اور ہماری بیخودی کا سبب خود ہمارے اندر ہی موجود ہے اس لئے ساقی کے تغافل کی شکایت بیکار ہے، کیونکہ اس کے تغافل سے ہماری بیخودی میں تو کوئی کمی بڑھ نہیں سکتی۔

۷۔

دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے      غم آوار گہائے صبا کب

غالب کا یہ شعر بادیہ سادہ ہونے کے اُلجھا ہوا ہے۔ عطر محض خوشبو کو کہتے ہیں اس لئے عطر پیراہن کے معنی ”خوشبوئے لباس“ کے ہوتے۔ دماغ نہ ہونا، یعنی ہواشت نہ ہوسکنا۔ سوال یہ ہے کہ یہاں کس کا پیراہن مراد ہے، اپنا یا محبوب کا! بعض حضرات نے خود غالب کا لباس مراد کیا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہاں لباس یا مراد ہے۔ اور غالب یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگر صبا کی آوارگی پیراہن محبوب کی خوشبو کو دھڑلے پھرتی ہے اور ہم تک نہیں پہنچاتی تو ہم کو اس کا غم کیوں ہو، جبکہ خود ہم میں اس خوشبو سے لطف اٹھانے کی تاب نہیں۔

۸۔

دل ہر قطرہ ہے سائزِ انا البحر      ہم آس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

جس طرح پانی کے ہر قطرہ کا (اس لحاظ سے کہ وہ سمندر ہی کا ایک جزو ہے) یہ دعویٰ کرنا کہ ”میں سمندر ہوں“ بیجا نہیں ہے، اسی طرح اگر ہم بھی یہ دعویٰ کریں کہ ہم وہی (یعنی خدا) ہیں تو غلط نہ ہوگا کیونکہ ہم بھی اسی کا ایک جزو ہیں۔

اس غزل کے باقی پانچ اشعار سناں ہیں۔

### غزل (۲۳)

۱۔

استم ہم : وہ جنوں جلاں گدائے بے سرو پا ہیں      کہ بے سرو پچہ مشکان آہو پشتِ خار اپنا

”جنوں جلاں گدا“ اور بے سرو پا، دونوں صفتیں گدا کی ہیں، یعنی ایک بے سرو پا قسم کا جنوں زدہ صحرا فور و گدا۔ ”پشتِ خار“ پیٹھ کھانے والا آکر، کو بے یا کسی اور دھات کا بنا ہوا آکر جس کے سر پر پیٹھ کھانے کے لئے پنجر بنا دیتے ہیں اور جیسے فقراء الکرا اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ ہم ایسے جنوں زدہ فقیر ہیں کہ سحر کے سوا ہمارا کہیں ٹھکانا نہیں اور بے سرو پا بنی جا بے سامانی کا یہ عالم ہے کہ ہمارے پاس پشتِ خار تک نہیں اور اس کا کام ہم پنجر مشکان آہو سے لیتے ہیں۔ یعنی کثرتِ سحر اور دی سے، غزالان صحرا بھی ہم سے اس درجہ آشنا ہو گئے ہیں کہ وہ اپنی ہلکوں سے ہماری پیٹھ تک کھجوا دیتے ہیں۔

### غزل (۲۴)

۱۔

پئے نذرِ کرمِ تحفہ ہے شرمِ نارسانی کا      بخولِ غلطیدہ صد رنگِ دعویٰ پارسانی کا

ہماری شرمِ نارسانی الطافِ خداوندی حاصل کرنے کے لئے شرم ایک ہی تحفہ رکھتی ہے اور وہ تحفہ صرف اس دعویٰ پارسانی کا جو سوسو طرح سے خولِ آلود (تباہ و برباد) ہو چکا ہے۔

یعنی خدا کے حضور میں ہم اعتراف گناہ کے سوا کوئی معذرت پیش نہیں کر سکتے اور ہماری یہی معذرت ممکن ہے عفو و درگزر کا سبب ہو سکے۔

۲۔ نہ ہوجن تماشا دوست رسوا بے وفائی کا بہرہ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پار سالی کا  
حسن تماشا دوست = وہ حسن جو نمود و نمائش پسند کرتا ہے۔ رسوا بے وفائی کا = اپنی بے وفائی کی وجہ سے بدنام۔  
محض اس لئے کہ حسن "تماشا دوست" ہے اور اس نے ساری دنیا کو دعوتِ نظارہ دیدی ہے، اس پر لازم ہو فائی قائم کرنا درست نہیں، بلکہ اس طرح تو سیکڑوں تماشاٹیوں کی ٹھکانا ہے جو اس کے سامنے جھک جانے پر مجبور ہیں، اس کے دعوائے پار سالی پر اور زیادہ ہر توفیق ثابت کرتی ہیں۔

۳۔ زکوٰۃ حسن دے لے جلوہ بندیش کہ ہر آسا چراغِ خانہ درویش ہو کا سہ گدائی کا  
حسن محبوب سے درخواست کرتا ہے کہ ہمیں بھی اپنے جلوہ کی زکوٰۃ مرحمت کرنا کہ اس کی روشنی سے ہمارا کاسہ گدائی چراغِ خانہ کا کام دے۔ مدعا یہ کہ ہمارے تاریک دل کو بھی اپنے جلوہ سے روشن بنا دے۔

۴۔ نہ مارا جان کر بے جرم قاتل، تیری گھر دن پر رہا اندھ خون بیگنہ حق آشنائی کا  
اس شعر میں پہلے مصرع کے آخری ٹکڑے کو دوسرے مصرع کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ غالب اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ میں تیرے پاس اس لئے گیا تھا کہ تو مجھے قتل کر دے، لیکن تو نے (یہ سمجھ کر کہ میں بے جرم ہوں اور بے جرم کو قتل کرنا اس کا خون اپنی گردن پر لینا ہے) مجھے قتل نہیں کیا۔ حالانکہ اس صورت میں تو نے مجھے قتل نہ کر کے حق دوستی کا خون اپنی گردن پر لیا۔ کیونکہ حق دوستی یہی تھا کہ تو مجھے قتل کر دیتا۔ یہ شعر غالب نے مومن کے رنگ میں لکھا ہے اور پاکیزگی بیان کے لحاظ سے اس کے بہترین اشعار میں شمار کیا جاتا ہے۔

۵۔ تمنائے زباں محو سپاس ہے زبانی ہے مٹا جس سے تقاضہ شکوہ بے دست و پائی کا  
زبان کی تمنائے تقاضہ یہ تھا کہ محبوب سے اپنی بے دست و پائی کا شکوہ کیا جائے، لیکن جب اپنی بے زبانی (مجبوری و بیچارگی) نے اس کی اجازت نہ دی تو محبوب کو خود نرم آگیا، اس لئے ہم کو دراصل اپنی بے زبانی کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جو حصولِ مدد کی باعث ہوئی۔

۶۔ وہی اک بات ہے جو یاں نفس وال کہبت گل ہے چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوازی کا  
مدعا یہ کہ میرا نفس (سائنس یا نوا) اور نہ کہبت گل دونوں ایک ہی سے ہیں کیونکہ چمن میں بہار آتے ہی پھولوں کی خوشبو اور میری خوشنواؤں دونوں ساتھ ساتھ شروع ہو جاتی ہیں۔

۷۔ دہان ہر بخت پیغامہ جو زنجیر رسوائی عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا  
پیغامہ جو = طعنہ زن۔ اس شعر کے سمجھنے کے لئے پہلے دو باتیں ذہن نشین کر لیجئے ایک یہ کہ زنجیر کی کڑی دہن کی شکل سے مشابہ ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ دہن معشوق کو شعرا و اس کی نگلی ظاہر کرنے کے لئے معدوم کہتے ہیں۔ شعر کا مضموم یہ ہے کہ دنیا میں کوئی دہن شکوہ ایسا نہیں جو تیری بے وفائی پر طعنہ زن نہ ہو، اور اس طرح اس زنجیر رسوائی کا چرچا عدم تک پہنچ گیا ہے۔ دیکھو کہ دہن معشوق معدوم ہے۔  
جہاں معشوقوں کی دہن سے نکلے گی وہ دنیا کے عدم ہی سے تعلق رکھے گی۔ غالب کا شعر بھی ناگوار تکلف و دہانہ کا تحفیل کا نمونہ ہے۔

## غزل (۲۵)

۱۔ گزرنہ اندوہ شبِ فرقت بیاں ہو جائے بے تکلف دلِ مہرِ دباں ہو جائے گا  
دوسرے مصرعے میں مہرِ دباں کو مقدم اور داغِ مہ کو مؤخر کر دیجئے تو مطلب صاف ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر شبِ فرقت کی تکلیف میں  
بیان نہ کی تو بھی میری یہ خاموشی (مہرِ دباں) داغِ مہ کی طرح سب پر آشکارا ہو جائے گی۔ مہر اور داغ کی مشابہت ظاہر ہے۔

۲۔ زہرہ گر ایسا ہی شامِ بھر میں ہوتا ہے آبِ پر تو بہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا  
اگر شامِ بھر کی تکلیف میں پتہ نہ ملے پانی ہو جاتا ہے تو عجب نہیں کہ پر تو بہتاب (چاندنی) بھی آبِ آب ہو جائے اور میرا گھر اس  
سیلاب میں ڈوب جائے۔  
مدعا یہ کہ چاندنی رات میں بھر و جدائی کا احساس بہت زیادہ ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔

۶۔ گر نگاہِ گرمِ فراتی رہی تسلیمِ ضبط، شعلہٴ خس میں جیسے، خونِ رگ میں نہاں ہو جائیگا  
منہوم یہ ہے کہ اگر تیری نگاہِ گرم (نظرِ عتاب) اسی طرح مجھے ضبطِ محبت پر مجبور کرتی رہی تو میرا خونِ میری رگوں میں داخل  
اسی طرح نہاں (خشک) ہو جائے گا جیسے خس میں شعلہٴ پنہاں رہتا ہے۔ خس میں شعلہ کا پنہاں رہنا اس لئے تصور کیا گیا کہ خس  
میں جل جانے کی اہلیت ہر پہ اتم لائی جاتی ہے۔

## غزل (۲۶)

۶۔ کیا وہ غرود کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا  
جس طرح غرود کی خدائی سے غرود کو کوئی فائدہ نہ پہونچا اسی طرح میری بندگی سے بھی میرا بھلا نہ ہوا، گویا میری بندگی اور  
غرود کی خدائی دونوں ایک سی چیز تھیں۔ اس شعر کا حسن یہ ہے کہ اس میں بندگی کی تعبیر خدائی سے کی گئی ہے۔

۸۔ زخمِ گرِ دہ گیا ہو نہ تھا، کامِ گرِ رک گیا ادا نہ ہوا  
پہلا مصرعہ کہ اس طرح پڑھے جیسے کسی واقعہ کا اظہار کیا گیا ہے اور دوسرے مصرعہ کو حیرت و استعجاب کے لہجہ میں۔  
منہوم یہ ہے کہ ۱۔ جب ہمارا کوئی کام رکنا تو وہ رکا ہی رہا (ادا نہ ہوا) برضات اس کے ہمارے زخم کا یہ حال ہے کہ دہنے کے بعد بھی  
اس سے لہو رستا رہا، حالانکہ ہوتا ہے چاہئے تھا کہ جس طرح لہو نہیں رکا، کام بھی نہ رکنا چاہئے تھا۔ مدعا یہ کہ میری بد نصیبی کسی  
بات میں کامیاب ہونے نہیں دیتی اور ہر بات کا آخر اٹا ہوتا ہے۔

## غزل (۲۷)

۱۔ گد ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا، گھر میں محو ہوا اضطرابِ دریا کا

اس شعر میں شوق کی تعبیر اضطراب دریا سے کی گئی ہے اور دل کی گہری -  
مفہوم یہ ہے کہ میرے شوقی محبت کی شدت و وسعت کا یہ عالم ہے کہ وہ دل ایسی چیز میں بھی (جو وسعت و جہاں اپنے اندر  
رکھتا ہے) نہیں سما سکتا تھا، لیکن مجبوراً اسے دل کے اندر ہی سما پڑا۔ گویا یوں سمجھئے کہ ایک دریا کا اضطراب تھا جو ایک گہرے اندر بند ہو گیا

۳ - خنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی دوام کلفت خاطر ہے عیش و نسیا کا  
اگر بہار ایسی ہی ٹاپا پیدار آنے جانے والی چیز ہے تو اس کی حشمت خنائے پائے خزاں سے زیادہ نہیں یعنی جس طرح منہدی کا رنگ  
چند دن کے بعد غائب ہو جاتا ہے اسی طرح بہار کی رنگینی بھی ختم ہو جاتی ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا کا کوئی عیش پائیدار نہیں اور  
اس کا نتیجہ ہمیشہ رنج و ملال ہی ہو کرتا ہے۔

۴ - نہ کہہ کر گریہ بہ مقدار حسرت دل ہے مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا  
”جمع و خرچ دریا“ سے مراد دریا کا مسلسل بہاؤ ہے۔  
ناصح یا بہم سے خطاب ہے کہ میری گریہ و زاری جو تو دیکھ رہا ہے وہ میری حسرت کے لحاظ سے بہت کم ہے، کیونکہ میرا دل تو یہ  
چاہتا ہے کہ آنسوؤں کے دریا جاری کر دے اور پھر بھی بس نہ کرے۔

## غزل (۲۸)

۱ - قطرے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا خط جام سے سراسر مشتہ گوہر ہوا  
اس شعر میں غالب نے ”نفس پروری“ کا استعمال سانس روک کر دم بخود رہ جانے کے مفہوم میں کیا ہے، جو خود غالب کی خزانہ  
”خط جام“ سے مراد وہ خط ہے جو ایک خاص اندازہ یا ناپ ظاہر کرنے کے لئے جام کے چاروں طرف نقش کر دیا جائے۔  
مفہوم یہ ہے کہ جب محبوب نے جام شراب اپنے ہونٹوں سے لگا تو شراب کے قطرے اس کے چہرہ کا عکس پڑنے سے اس قدر حیرت زدہ  
ہوئے کہ خط جام پر وہ جھک رہ گئے اور اس طرح خط جام گویا موتیوں کا بار ہو کر رہ گیا۔

۲ - اعتبار عشق کی فاخ خرابی دیکھنا، خیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا  
میرے عشق پر محبوب کو اس قدر اعتماد و یقین ہے کہ جب خیر آہ کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میں نے ہی آہ کی ہوگی اور مجھ پر خفا  
ہوتا ہے۔ پھر جب حالت یہ ہو تو میری تباہی و فاخ خرابی کی حد و پائیاں کیا ہو سکتی ہے۔ یہ شعر مومن کے رنگ کا ہے۔

## غزل (۲۹)

۲ - اہل بنیش نے بہیت کردہ شوخی ناز جوہر آئینہ کو طوطی بسمل ہاندھا  
”بہیت کردہ“ سے مراد یہاں آئینہ ہے۔  
مفہوم یہ ہے کہ جب وہ شوخی و ناز کے ساتھ آئینہ دیکھتا ہے تو جوہر آئینہ بھی طوطی بسمل کی طرح ترپنے لگتا ہے۔

فلاد کے آئینوں میں صقل کرنے سے سبزی مایل نشانات پیدا ہو جاتے ہیں، جنہیں ”جوہر آئینہ“ کہتے ہیں۔ جوہر کی سبزی اور قوطپ کے لحاظ سے اس کو ”طوطی پس“ کہا گیا ہے۔

۳۔ یاس و امید نے یک عہدہ میداں مانجا عجز بہمت نے طلسم دل سایل باندھا  
عہدہ = جنگ۔ اس شعر میں دوسرے مصرعہ کو پہلے پڑھئے اور پہلے مصرعہ کو اس کے بعد، کیونکہ پہلے مصرعہ میں جو کچھ ظاہر کیا گیا ہے وہ نتیجہ ہے دوسرے مصرعہ کے واقعہ سے۔  
مفہوم = ہے کہ میری کم ہمتی نے دل امیدوار کے اندر ایک ایسا طلسم قائم کر دیا ہے جہاں یاس و امید میں ہر وقت جنگ ہوتی رہتی ہے اور کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔  
طلسم کے ساتھ جنگ کا خیال ان داستانوں سے لیا گیا ہے جن میں طلسم بند و طلسم کشا کے درمیان ہمیشہ جنگ دکھائی گئی ہے۔

(غزل ۳۰ - ۳۱ - ۳۲ صافات ہیں)

### غزل (۳۳)

۱۔ یک ذرہ زمین نہیں بیکار باغ کا، یاں جادہ بھی فقیلہ ہے لالہ کے داغ کا  
جادہ = راستہ، نگہ یہاں باغ کی روش مراد ہے۔ فقیلہ = چراغ کی بتی۔  
مفہوم = ہے کہ باغ کا کوئی حقہ بیکار نہیں، یہاں تک کہ باغ کی روش بھی (جو پھولوں سے خالی ہوتی ہے) لالہ کے چراغوں کے لئے فقیلہ کا کام دیتی ہے۔ اس دعویٰ کا ثبوت یہ ہے کہ لالہ کے دھڑت عموماً روش کے کنارے ہی نصب کئے جاتے ہیں اور یہ ہیں اچھے معلوم ہوتے ہیں،

۲۔ بے سے کسے ہے طاقت آشوب آگہی کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایام کا  
پہلے مصرعہ میں ”آشوب آگہی“ کی ترکیب غور طلب ہے اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ اسے مقلوب ترکیب اضافی مانا جائے (یعنی آگہی آشوب) دوسری یہ کہ اسے معمولی اضافی ترکیب جان کر خود آگہی کو آشوب قرار دیا جائے۔  
ہر چند لفظ طاقت کے ساتھ پہلی ترکیب زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے، لیکن غالب کے پیش نظر دوسری ترکیب بھی جس طرح اُسے خود آگہی کو آشوب کی ہنگامہ قرار دیا ہے۔

لفظ طاقت کے معنی سون قوت کے ہیں اس لئے صحیح مفہوم تک پہنچنے کے لئے طاقت کے بعد کوئی لفظ بمعنی برداشت یا تحمل محذوف ماننا پڑے گا اور فارسی میں اس قسم کے محذوفات سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً طاقت جہاں برداشت، خانہ جہاں گھر، کراس میں طاقت کے بعد لفظ میزبانی یا پذیرائی محذوف ہے۔

شعر کا مفہوم = ہے کہ: ”ہوش و آگہی کا ہنگامہ اتنا بڑا ہنگامہ ہے کہ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ شراب پی لیا کر“ ہوش و آگہی کو کتم کر دیا جائے۔

فارسی میں خط کشیدن، مشا دینے یا محو کر دینے کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ غالب نے خط کے ساتھ لفظ لایا (جام شراب) کا اضافہ کر کے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ اس مشا دینے کی صورت کیا ہو سکتی ہے۔

عجز و قصل سے خود اپنی بے حاصلگی مراد ہے جو ہنگامہ ہوش و آگہی کو برداشت نہیں کر سکتی۔

۶۔ بے خون دل ہے چشم میں موج نگہ غبار یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا  
میکدہ سے مراد آنکھ ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ آج کل میری آنکھوں سے غولیں دل نہیں بہتا تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ موج نگہ خشک ہو کر غبار ہو گئی ہے  
گویا میکدہ میں شراب نہ ہونے کی وجہ سے خاک سی اڑ رہی ہے۔

۷۔ باغ شگفتہ تیرا، بساط نشاط دل ابر بہار خلد کس کے دماغ کا  
پہلے مصرعہ کے محذوفات کو سامنے رکھنے کے بعد مفہوم یہ ہوگا کہ میرے نشاط دل کا سبب تیرے ہی حسن کا باغ شگفتہ ہو سکتا  
ہے۔ محض موسم بہار میں شراب نوشی سے مجھے سرور و نشاط حاصل نہیں ہو سکتا۔

### غزل (۳۴)

۱۔ وہ مری چین چین سے غم پنہاں سمجھا رازِ مکتوب یہ بے ربطی عنوان سمجھا  
مفہوم یہ ہے کہ جس طرح خط کے عنوان سے بے ربطی تحریر کا پتہ چل جاتا ہے، اسی طرح اسے میری چین پیشانی دیکھ کر میرے  
غم پنہاں کا حال معلوم ہو گیا۔  
اس شعر میں چین چین کی بے ربطی عنوان سے اور غم پنہاں کی رازِ مکتوب سے تعبیر کی گئی ہے۔

۲۔ یک الف نہیں صیقل آئینہ ہنوز چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا  
نولادی آئینہ میں جب صیقل کی جاتی ہے تو اس میں الف کی طرح لکیریں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ جب سے  
میں نے گریباں کو گریباں سمجھا اس وقت سے اسے چاک کرنا شروع کر دیا، اور وہی گریباں چاک اب بھی موجود ہے، گویا یہ سمجھ لو کہ  
آئینہ میں جو وقت صیقل ایک لکیر پیدا ہو گئی تھی وہی اب بھی باقی ہے۔  
چاک کی صورت بھی الف کی سی ہوتی ہے اور صیقل کی لکیر کی بھی۔

۵۔ عجز سے اپنے یہ بانا کہ وہ بد خو ہوگا نبضِ خس سے تپش شعلہ سوزاں سمجھا  
نبضِ خس سے مراد خس ہے۔ جس طرح خس (تنکے) کو دیکھ کر اس کے جل جانے کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسی طرح  
میں اپنی بیچارگی کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ محبوب یقیناً برہم ہوگا، یعنی جس طرح خس کی قسمت میں آگ سے جل جانا لکھا ہے،  
اسی طرح ہر بنائے عجز محبوب کی برہمی سے میرا تباہ و برباد ہو جانا بھی مقسم ہو چکا ہے۔

# دنیا کی مسلم حکومتوں کا سرسری جائزہ

## (مسلمانوں کی کل آبادی ۳۵ کروڑ ہے)

- لبنان** ————— آبادی ۴ لاکھ — ۴۰ فی صدی مسلم  
عرب لیگ کا ممبر - سوویت ماہرین فن کے زیر ہدایت تعمیری منصوبہ بندیاں
- ترکی** ————— آبادی ۲ کروڑ دس لاکھ - ۹۸ فی صدی مسلم  
بغداد پیکٹ اور NATO کا ممبر - اقتصادی مشکلات -  
جزیرہ قبرص (CYPRUS) کے مسئلہ میں یونان سے کشیدگی
- شام** ————— آبادی ۳۲ لاکھ ۲۰ ہزار - ۸۶ فی صدی مسلم  
عرب لیگ کا ممبر - سوویت بلاک کی امداد - بحرہ قلی کے مسئلہ میں اسرائیلی حکومت سے جنگ کا خطرہ -
- عراق** ————— آبادی ۳۸ لاکھ ۲۰ ہزار - ۹۶ فی صدی مسلم  
بغداد پیکٹ کا ممبر - مغربی بلاک کا حامی
- ایران** ————— آبادی ۲ کروڑ ۳ لاکھ - ۹۰ فی صدی مسلم  
بغداد پیکٹ کا ممبر - مغربی بلاک کا ممبر
- افغانستان** ————— آبادی ۱ کروڑ ۴ لاکھ - ۹۸ فی صدی مسلم  
چار شکافی پروگرام میں ۱۰ کروڑ ڈالر کی سوویت امداد کا امکان - پختونستان کے مسئلہ میں پاکستان سے اختلاف -
- پاکستان** ————— آبادی ۷ کروڑ ۵۸ لاکھ ۵۰ ہزار - ۸۶ فی صدی مسلم  
بغداد پیکٹ اور SEATO کا ممبر - اسلامی جمہوریت - کشمیر کے مسئلہ میں ہندوستان سے نزاع -
- ملايا** ————— آبادی ۵۸ لاکھ - ۶۰ فی صدی مسلم  
سافٹ گورنمنٹ کے لئے جدوجہد - ۸ سال سے کمیونٹس آبادی سے برسرِ پیکار -
- مراکش** ————— آبادی ۹۲ لاکھ - ۹۲ فی صدی مسلم  
اسپینی مراکش تک بے چینی حصول آزادی کے لئے
- الجزایر** ————— آبادی ۹۵ لاکھ - ۸۹ فی صدی مسلم  
جمہوریت کے لئے فرانس سے برسرِ پیکار -
- مصر** ————— آبادی ۲ کروڑ ۲۵ لاکھ - ۹۱ فی صدی مسلم  
عرب لیگ کا ممبر - سوویت بلاک سے فراہمی اسلحہ - شام اور سعودی عرب سے بہت گہرے تعلقات -

سوڈان	آبادی، ۸۹ لاکھ ۱۷ ہزار - ۸۴ فی صدی مسلم
یمن	عرب لیگ کا ممبر - اقتصادی تباہی آبادی، ۸۴ لاکھ - ۹۸ فی صدی مسلم
یوردن	عرب لیگ کا ممبر - سوویٹ ماہرین فن سے گفت و شنید آبادی، ۱۵ لاکھ - ۹۳ فی صدی مسلم
سعودی عرب	عرب لیگ کا ممبر - برطانیہ کا مخالف آبادی، ۶۰ لاکھ - ۹۸ فی صدی مسلم
انڈونیشیا	عرب لیگ کا ممبر - برمی کے پٹرو لی جیموں کے مسئلہ میں برطانیہ سے نزاع آبادی، ۷۰ کروڑ ۸۰ لاکھ - ۹۴ فی صدی مسلم
	جمہوری پارلیمانی حکومت - مغربی بلاک کے خلاف

## چند نایاب دواوین

جلد توجہ فرمائیے

کلیات امیر اللہ تسلیم ————— کلیات مومن

کلیات میاں نظام الدین شاہ راسپوری ————— صنمخانہ عشق امیر مینائی

کلیات قلق ————— دیوان خواجہ درد

کلیات آتش ————— دیوان کلیم (ابوطالب)

صرف ایک ایک جلد موجود ہے۔ ان کی مجموعی قیمت علاوہ محصول ڈاک ۷۷ روپیہ ہے۔ تمام دواوین ایک ساتھ طلب کرنے پر محصول ڈاک معاف۔

فیہر نگار لکھنؤ

# جشن عید

(پروفیسر شہزاد)

پی تاروں کے اشک اسے شب تار  
شب کی زنجیر صبح دم ٹوٹی،  
آفتاب سحر کی تابانی،  
اٹھ کے سورج نے اپنے پر تولے  
ہیکلوں پر ہے بارشیں انوار  
شب گئی صبح کے دریچے کھلے  
جلوہ گستر وزیر و شاہ ہوئے  
مُکراتا ہے فترِ دارائی،  
تنگ کلیوں کے گوشہ گیر اٹھے  
وہ پلا دیکھ شہریوں کا ہجوم،  
کوچہ گرد و گداگر و قلاشش،  
سود خوار و وکیل و ساہوکار  
شیخ سنعان و مولوی ضرغام  
دزد و دلاک و واعظ و غسال  
کفش دوز و کفن بروختار  
گورکن، کوتوال، بردہ فروش  
رند و رقصا ص و فاجر و فکار،  
قصہ خوان و قلندر و قتال  
نانی، کلچہ فروش، کن میلے  
خاق حشت و مفکر و مزدور  
رہزن و رشوقی و تریاکی،

وہ اٹھانا چتا سحر کا غبار  
وہ درو بام سے کرن پھوٹی  
چومتی ہے افق کی پیشانی،  
قصر گویا ہوئے محل بولے  
جگمگاتے ہیں مسجدوں کے منار  
مسجد و خانقہ کرن پہ سنے،  
گرم نظارہ بجلاہ ہوئے  
خوابگی لے رہی ہے انگڑائی  
آنکھ ملے ہوئے فقیر اٹھے،  
جیسے اک شب میں صد ہزار نجوم  
منعم و میر و عاشق و دہاشش  
مفتی شہر و لوطی بازار،  
رہبر قوم و پیشوائے انام،  
نقش بند و نقب زن و قوال  
مے فروش و مجاور و عطار  
مولوی و موذن و مے نوش  
مخیر و مجرم و جریدہ نگار  
فالگیر و نجومی و نقال،  
پکڑیاں چاک، پیرہن میلے،  
چندہ باز و "جہاں پناہ" و "منصور"  
نفس کوئین آدم جنالی،

کوئی نمرود، کوئی اہل کتاب  
شمر و بوجہل و کوئی و شامی  
ابن صباح و بانی و شداد  
جعفر و صادق و نظام دکن  
سینہ پیکانِ غم سے برمایا  
دل میں ٹوٹے ہوئے ہزاروں تیر  
عارف و صوفی و امام چلے،  
وہ چلا زار وہ چلا غفور  
پیر و مرشد چلے، مرید چلے  
کس کو معلوم کون کون چلا  
کوئی فاروق کوئی ابن سعود  
غم کے ناسور قہقہوں کا غرور  
لیکن اے ذوالجلال والا کرام  
ایک کے زیر دام بدرمنیر،  
ایک ایوانِ رحیم خندہ زنی  
ایک تن پر ہو ریشمی پوشاک  
ایک گھر جشن، ایک گھر گھرام  
ہے کہیں کسوتوں کی تابانی،  
اک شبستاں میں ماہتاب کا روپ  
کتنے سینوں میں قہقہوں کے مزار  
ہو کے پیکانِ عید سے بسل،  
۵۰ ہوا جب بھی سنسناتی ہے  
اے خدا ! اے خدائے مجرب و برا !

اور کوئی مسیحہ کذاب،  
بودر و بایزید بسطامی،  
ابن محبم، عبید ابن زیاد  
جا گئے لاشے بولتے مدفن،  
سردی روح الامین کا سایہ  
پاؤں میں جشنِ عید کی زنجیر  
اٹھ کے آقا چلے غلام چلے  
وہ جھکی احترام کو جہور،  
حر چلا حضرت یزید چلے،  
اک رنسن اور شہر بھر کا گلا،  
پڑھتا جاتا ہے ہر قدم پہ درود  
سب "مسادات" کی شراب میں چورا  
کیا "مسادات" ہے اسی کا نام  
ایک صدیوں کی رات کا نچیر،  
ایک گھر سوگوار بے کفنی،  
ایک سیٹا ہوا اپنے جیب کے چاک  
ایک گھر صبح اور اک گھر شام  
اور کہیں رون جشنِ عریانی  
اور اک گھر میں چلچلاتی دھوپ  
کتنے دل اک خدنگ سے ہیں نگار  
خون روتے ہیں کتنی ماؤں کے دل  
کتنے سینوں کو چیر جاتی ہے  
اس چھری سے کسی کو ذبح نہ کرا

زندگانی کا نہر کافی ہے  
آدمی قابلِ معافی ہے !!

## ساحت فردوس میں

(فضا ابن فیضی)

کی مرے حال زبوں پر یہ عنایت تو نے  
 دل کو فرحت تو نگاہوں کو سکون بخش دیا  
 آرزو میری فراداد، ترے احسان بہت  
 چشم ساغر مجھے کرتی ہے اشارے کیا کیا  
 جیسے میرے ہی لئے ہے تری جنت کی بہار  
 یہیں قصر یہ غلمان یہ حوریں یہ محل  
 بوجہ کے لئے بت حسن و جوانی کے یہاں  
 حوریں گل گشت میں مصروف ہیں کھولے ہوئے بال  
 چشم فہلا کی یہ صہبا، لب لعلیں کا یہ رس  
 یہ مہکتی ہوئی زلفوں کے گھیرے سائے  
 نظر افروز ہے یوں عارض گل رنگ کی صنو  
 یہ نظر گاہ بہار طرب و حجلہ رنگ  
 یہ ہر اک کام پہ یا قوت و زمر کے نعل  
 ان یہ بلور کے ساغر میں نبید تسنیم  
 آئینوں میں چمکتی ہوئی صہبائے طہور  
 نقشہ رنگ ہے عنوان جو اس افسانے کا  
 نخل طوبیٰ کی ہر اک شاخ ہے اک تانہ عزال  
 جوش تقدیس کی صہبا میں ہیں ڈوبے ہوئے ہوش  
 جامہ داں ہے طرب و کیف کی یہ صبح حسین  
 مسکراتی ہوئی یہ رات یہ چستے ہوئے دن  
 کیوں یہ ایس موسم رنگیں بھی طبیعت ہواداں  
 گونگا ہوں میں محبت کے ہیں روشن فانوس  
 روح کیوں اس نئے ماحول میں گھبراتی ہے  
 کیوں مجھے عالم ناسوت کی یاد آتی ہے

سیر فردوس کی دی مجھ کو اجازت تو نے  
 روح افسردہ کو انداز جنوں بخش دیا  
 غلہ میں میرے پہلے کے ہیں سالن بہت  
 میری آنکھوں میں ہیں پاکیزہ نظارے کیا کیا  
 یہ ترنم یہ تبسم یہ جوانی یہ کھسار  
 کتنا رنگیں ہے یہ تیرا صحنستان ازل  
 کتنے موضوع ہیں دلچسپ کہانی کے یہاں  
 گرمی حسن و جوانی سے یہ تپتے ہوئے گال  
 عطر پیرا ہن و رنگ بدن و بوئے نفس  
 دیکھ لے رات تو اس کو بھی پسینہ آئے  
 جیسے آئینے میں پڑتا ہو شفق کا پر تو  
 یہ نوا خانہ لاہوت یہ مستی یہ ترنگ  
 مسکراتے ہوئے تسنیم کی بہروں میں کنول  
 یہ ارم خانہ صدر رنگ یہ فردوس نعیم  
 نغمہ طائر خوش رنگ و جمال رخ حور  
 قطرہ قطرہ شفق آلود ہے پیمانے کا  
 نغمہ قدس سے لبریز ہے یہ ساوہ ازل  
 ہائے یہ قفل مینا ہے کہ آواز سروش  
 یہ تمناؤں کی وادی یہ امنگوں کی زمیں  
 قیرا ہرینس یہاں عام ہے یارب! لیکن  
 کیوں مرے دل کو نہیں عیش کا مطلق احساس  
 کیوں طبیعت نہیں اس بزم سے آخرافوس

# تقلیسِ محبت

(ساقی جاوید - بی۔ اے)

یہ عقیدوں کے دھندلے یہ روایات کے جال  
نغمہ و رقص کی ہر سمت سلگتی ہوئی آگ  
حسن کا عکس، جوائی کا حنائی پر تو  
رنگ و نکہت میں کلہاڑا حرم کچھ بھی ہیں  
داسیاں اپنے خداؤں کے حضور آتی ہیں  
ہم انہر اپنے بتوں کے ہیں بچاری اب بھی  
ہم نے ان ماہ جبینوں کو خدا کیوں نہ کہا  
ان میں گفتار بھی ہے شوخی رفتار بھی ہے  
جب کہیں کوئی پرستش کا سوال آتا ہے  
کاٹنے کی ایسی ہی اک دیں میں ہم رہتے ہوں  
ہیروستی کو جہاں لوگ خدا کہتے ہوں

عنبر حینائی :-

اب تو رہ حیات میں اٹھنے نہیں قدم  
غم بھی بقدرِ ظن تھا، مئے بھی بقدرِ غم  
خود ان سے وضع ترکِ محبت نہ ہو سکی  
اتنا تری جدائی کا صدمہ کبھی نہ تھا  
لیکن ہمیں کو جو سدا میکشی نہ تھا  
قسمت کا کوئی فیصلہ بھی آخری نہ تھا

عیش برنی :-

نہ جانے کون سی منزل پہ آگیا ہوں میں  
خدا کو ڈھونڈ رہا ہوں خدا نہیں ملتا  
وہیں نہ منزل مقصود ہو جہاں اے عیش  
نشانِ منزل مقصود کا نہیں ملتا

### مغیث الدین فریدی :-

ہے بے باکی میں بھی رسم حیا کا اہتمام اب تک  
یہیں صیاد نے لٹا، یہیں بجلی گری، لیکن  
نکا ہوں سے دیا کرتے ہیں وہ میرا سلام اب تک  
وہی ہے میری نظروں میں چین کا احترام اب تک  
نکل جاتا ہے منہ سے بے ارادہ اُن کا نام اب تک

### لقیس قادری سونگیری :-

دل غم دوراں سے تھا یکسر اداس  
سکرائے جب وہ عرضِ شوق پر  
اور پھر تم بھی مجھے یاد آ گئے  
دیدہ پر غم میں آنسو آ گئے

### برزخمی چریا کوٹی :-

سجا رہا ہوں محبت کی انجمن دل میں  
جو لاکھ اُن کے چھپائے نہ چھپ سکی برزمی  
تری نگاہ میں کیا بات ڈھونڈ رہی میں نے  
وہ بات اُن کی نگاہوں میں دیکھ لی میں نے

### باقر مہدی :-

دردِ دل آج بھی ہے جوشِ وفا آج بھی ہے  
حسنِ پابند حیا عشقِ اسیرِ آلام  
زخم کھانے کا محبت میں مزا آج بھی ہے  
زندگی جرمِ محبت کی سزا آج بھی ہے  
تم سے بچنے کے مجھ کو سہارا تو مل گیا  
یہ اور بات ہے کہ میں کچھ شادماں نہیں  
غمِ جہاں سے الگ درِ عشق رہ نہ سکا  
تمہیں بھی ساتھ لئے اپنی کاٹنات چلی  
تیرے کوپے میں نہ رکھیں گے قدم آج کے بعد  
دیکھیں گزرتے گی کہاں شامِ الم آج کے بعد  
ٹوٹ جانے کو ہے وہ رشتہ نہاں اسے دل  
کس کی کھائیں گے محبت میں قسم آج کے بعد  
کبھی یہ سوچ کے رونے کو مل سکے تسکین  
مگر جو رونے پر آئے تو پھر ہنسنا نہ گیا  
سنایا کرتے تھے دل کو حکایتِ دوراں  
کسی سے حالِ دل زار پھر کہا نہ گیا  
سمجھ میں آنے لگا جب فسادِ ہستی  
نکل گیا ہے بہت دور قافِ دل کا  
پلٹ کے اب نہ کہیں لکھنؤ سے گزرے گا  
ٹوٹا دل کیسے جڑے گا سچی قسمیں نہ کھائیں آپ  
کون بھلا یہ کہتا ہے خود آکے ہم کو منائیں آپ  
راہِ وفا پر چلتے چلتے اپنی غفلت بھول گئے تھے  
چھوڑی ہم نے رسمِ پریش اب نہ کر م فرمائیں آپ

(اصنافِ سخن نمبر)

۱۔ اردو کی ابتدائی نظمیں - (۲) جدید نظم نگاری کا پس منظر - (۳) اخلاقی و اصلاحی نظمیں - (۴) روحانی نظمیں  
۵۔ سیاسی و انقلابی نظمیں - (۶) آزاد نظم - (۷) غلطی نظمیں اور گیت - (۸) واسوخت -  
مینجر نگار لکھنؤ

پاکستان کے خریدار

الان چندہ آٹھ روپیہ آٹھ آنے قبل کے پتہ پر ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں اور رسید ڈاک خانہ ہمارے پاس جلد از جلد بھیج دیں تاکہ پرچہ کی روانگی میں تاخیر نہ ہو کے خریدار کا چندہ جمن ٹاس سے قبل ختم ہو چکا ہے اور ان کے نام حوالہ کی کا پرچہ اسی وقت روانہ ہو گا جب ان کا چندہ وصول ہو جائے گا۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۱۰۵ - گارڈن ویسٹ - کراچی

تجارت کی مضبوط حالت بھی آپ کو اس چہرے سے فریاد دے۔ پیلی ہو سکتی ہیں



کہ آپ کا چندہ اکتوبر میں ختم ہو گیا اور نومبر کا "نکار" کے مسافت رجسٹری کے لئے اس کے علاوہ ہوں گے

نکار

دہلی طرک کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی آئندہ روپیہ نو آنے میں مدد پائی ہوگا۔ سالانہ شہر

ادبیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۷۰	فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۵۶ء	شمار ۴
ملاحظات - ۷	ادبیٹر - ۳	باب لا منتفسار - ۳۵
بدیہہ کوئی کا تعلق اوزان و بحر سے - ۶	ادبیٹر - ۶	منظومات - ۱
وحشت کاکتوی - ۱۳	نظیری صدیقی - ۱۳	نظر - شائق ام - ۱۶
مطالعہ کائنات - ۳۲	ادبیٹر - ۳۲	آتش پربا بگڑھی شہقت کاظمی - ۳۲
مشکلات غالب - ۳۷	ادبیٹر - ۳۷	مطبوعات موصولہ - ۳۷

## ملاحظات

کتاب "مذہبی رہنما" اور مسلمانوں کا طرز عمل  
امریکہ کے ایک مصنف نے "RELIGIOUS LEADERS" (مذہبی رہنما) کے نام سے عرصہ ہوا ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس نے بعض دیگر اکابر مذہب کے ساتھ رسول اللہؐ کا بھی ذکر کیا تھا، لیکن ایسے نامناسب الفاظ میں جو صحافی اخلاق اور تاریخی دیانت سب کے منافی تھا۔ یہ کتاب چھپتی رہی اور شائع ہوتی رہی، لیکن کسی نے اس طعنہ کو نہ نہیں کی، غالباً اس لئے کہ وہ کوئی ایسی اہم تصنیف نہ تھی اور اس کا مصنف بھی کسی خاص شہرت کا مالک نہ تھا۔ اس کے بعد اسی کتاب کو مجبوری کے ایک ادارہ نے شائع کیا اور یہاں بھی وہ فروخت ہوتی رہی اور مسلمان بالکل بے خبر ہو کر اس کتاب میں رسول اللہؐ کا ذکر کن بولچال میں کہا گیا ہے۔ اتفاق سے یہ کتاب کا پتہ پور کے ایک صحافی کی نگاہ سے گزری اور اس نے سب سے پہلی مرتبہ اس کی قابل اعتراض عبارت کو شائع کر کے، مسلمانوں کو اس کے خلاف احتجاج کرنے پر آمادہ کیا اور رفتہ رفتہ یہ تحریک تمام ملک میں پھیل گئی یہاں تک کہ بعض مقامات پر کشت و خون اور فرقہ وارانہ فسادات تک اس کا سلسلہ پہنچ گیا۔

اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کے مصنف نے جو کچھ لکھا وہ غلط تھا، بُرا تھا اور نامعقول، لیکن مسلمانوں نے یہ سلسلہ احتجاج جو کچھ کیا کیا وہ اس سے زیادہ غلط، اس سے زیادہ بُرا اور نامعقول تھا۔

اول تو مسلمانوں کو اس طعنہ متوجہ ہونا ہی نہ چاہئے تھا، کیونکہ رسول اللہؐ کی ذات اور ان کا اخلاق اب اس قدر واضح روشنی میں آگیا ہے کہ اس کے خلاف کسی کا کچھ کہنا چاند پر خاک ڈالنا ہے اور چاند پر خاک ڈالنے والے پر ہم غصہ نہیں کرتے بلکہ دیوانہ

سمجھ کر اس کے پاس سے جیتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اسلام کی بلند تعلیم ”اذا مرّوا باللعثم واکراما“ پر عمل نہ کر سکتے تھے تو پھر یہ مسئلہ خالص علمی نقطہ نظر سے دیکھنے کی چیز تھی اور مذہب سے اس کو بالکل علیحدہ رکھنا چاہئے تھا، کیونکہ بشرط مذہب میں یہ بات کہیں شامل نہیں ہے کہ اگر تم خدا و رسول کو برا کہنے والے سے نہ الجھو گے تو تم اسلام سے خارج ہو جاؤ گے۔ علاوہ اس کے خود رسول اللہؐ اور صحابہ کرام کا اسوہ حسنہ ہمارے سامنے ہے کہ انھوں نے اس نوع کی بدزبانی کرنے والوں کا جواب کبھی فحشہ و برہمی سے نہیں دیا بلکہ ہمیشہ نرمی و ملاحظت سے کام لیا اور ان کو اپنے اخلاق کی متانت و سنجیدگی سے اتنا متاثر کیا کہ آخر کار وہ خود ان کا گرویدہ ہو گئے، خیر تو انسانیت کا وہ بلند مرتبہ تھا جو انھیں کے ساتھ ختم ہو گیا۔ — ایک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے — لیکن یوں بھی اس نوع کے ذہنی اختلافات کی صورت میں ہم کو ”جادہم بالالتی ہی احسن“ کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے تھا اور اس کی صورت یہ تھی کہ سب سے پہلے ہمیں مصنف سے پوچھنا چاہئے تھا کہ اس نے رسول اللہؐ اور بعض اہل بیت المؤمنین کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا تاریخی فاخر کیا ہے، ظاہر ہے کہ وہ کوئی صحیح تاریخی حوالہ دے سکتا اور آخر میں اسے اپنی غلطی تسلیم کرنا پڑتی۔ اس طرح ایک بنیادی غلطی ہمیشہ کے لئے دور ہو جاتی اور اس کتاب کی تصحیح ہو جاتی، لیکن حیرت ہے کہ ان علماء نے بھی جن کا پیشہ ہی مناظرہ و تبلیغ ہے اس کو ضرور ہی نہیں سمجھا اور وہ بھی عام ذہنیت کی رو میں بہہ گئے۔

مسلمانوں کا اس کتاب پر اعتراض کرنا بالکل حق ہے۔ جانب تھا اور نفسیاتی نقطہ نظر سے جذبات میں بیجاں بھی پیدا ہو جانا چاہئے تھا اور حکومت سے بھی ضرور مطالبہ کرنا چاہئے تھا کہ وہ اس دل آزار کتاب کی اشاعت کو ممنوع قرار دے، لیکن یہ تمام باتیں متانت و سنجیدگی سے ہونا چاہئے تھیں اور اس سلسلہ میں ایسے جذبات سے کام نہ لینا چاہئے تھا جو سنجیدگی و متانت سے دور ہیں۔

اس میں شک نہیں ایک جماعت کو اپنے حقوق کے لئے احتجاج و مظاہرہ کا پورا حق حاصل ہے، لیکن یہ بات مجھ پر بہت گراں گزرتی ہے کہ اس سلسلہ میں بازاری قسم کی حامیانہ ذہنیت کا اظہار کیا جائے یا اسے سیاسی کار بر آری کا ذریعہ قرار دیا جائے۔ ایک قوم کے لئے اس سے دیا وہ شرمناک بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ کوئی مطالبہ کرے اور پورا نہ ہو، اس لئے جو قومیں اصول سے کام کرتی ہیں وہ جیسے پھولے نہیں پھوڑتیں اور صرف وہی بات کہتی ہیں جن کے پورے ہونے کا امکان ہو اور جب وہ پوری ہو جاتی ہے تو خاموش ہو جاتی ہیں۔

یقیناً برطانیہ کی حکومت نے اس مسئلہ میں تساہل و تاخیر سے کام لیا اور ناعاقبت اندیشی سے بھی (جس کا اظہار پنڈت جیوئے بھی کیا ہے)۔ اگر وہ ابتدا ہی میں رواداری اور ہمدردی سے کام لیتی تو یہ جھگڑا بڑھنے نہ پاتا، لیکن اس کے بعد جب حکومت نے بھی مصفاہ اس کو تسلیم کر لیا تھا کہ کتاب واقعی قابل اعتراض ہے اور مسرت فحش کی طرف سے بھی لاعلمی و معذرت کا اظہار ہو چکا تھا تو پھر اس مسئلہ کو اسی بگاڑ ختم کر دیا چاہئے تھا۔ خاص کر ایسی صورت میں جبکہ یہ کتاب دوسرے صدیوں میں قابل ضبطی قرار پا چکی تھی اور ناشرین نے بھی اس کی فروخت و اشاعت کو روک دیا تھا۔

میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ مسلمان ایسے معمولی مسائل میں تو آسمان زمین سر پہ اٹھاتے ہیں اور ان کے علماء و اکابر بھی قرون اولیٰ کے مجاہد بن جلتے ہیں، لیکن زندگی کے ان مسائل میں جن پر قوم کی حیات و ممالک کا انحصار ہے وہ یکسر مام و بے حس نظر آتے ہیں۔

مسلمان اپنی روز کی زندگی میں خدا جانے کتنی باتیں ایسی کرتے ہیں جن کو ہم بجا طور پر خدا و رسول کی توہین کہہ سکتے ہیں لیکن ان کے خلاف وہ کوئی جہاد و بغض نہیں کیا جاتا۔ وہ دوسروں کا حق غصب کرتے ہیں، شراب پیتے ہیں، جوا کھیلتے ہیں، اسی طرح کے سیکڑوں اعمال شنیعہ کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں، لیکن کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی وہ ان باتوں پر احتساب کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے لیکن اگر کوئی شخص رسول اللہؐ کے حلقہ کوئی بات ای کے عقاید کے خلاف لکھ دے تو آپ سے باہر ہو جاتے ہیں، اگر آج مسجد کی ایک اینٹ کو بھی کوئی مسخ

ہو چکا ہے گو وہ حصہ سے بیتاب چھباتے ہیں، لیکن خدا اپنے افعال و کردار سے وہ ایک مسجد کیا خود بنیاد حرم کو کھوکھلا کرنے سے بھی احتراز نہیں کرتے۔ اگر کوئی شخص قرآن پاک کو بچاؤ کر پھینک دینے کا ارادہ کرے تو وہ اس کو کسی طرح برداشت نہ کر سکیں گے، لیکن خود اپنے عمل سے وہ ہر وقت قرآن کے اوراق چاک کرتے رہتے ہیں اس کی خبر انھیں نہیں۔

اسلام کا تنہا مقصد دنیا سے مادی و روحانی شرک و بت پرستی کو مٹانا تھا، لیکن آج مسلمان ہی سب سے بڑا مشرک کافر نظر آتا ہے۔ وہ مسجد میں خدا کی نہیں محراب و منبر کی پرستش کرتا ہے، وہ قرآنی تعلیم کی نہیں بلکہ اس کے اوراق و حروف کی پوجا کرتا ہے اور اس طرح جو بتکدے اس نے اپنے دل کے اندر قائم کر رکھے ہیں ان کے حجاز میں وہ خدا و رسول ہی کے احکام و اقوال سے امتثال کرتا ہے۔  
دائے گرد رہیں امروز بود فردائے !

**شہر سوئز** شہر سوئز کا مسئلہ اس وقت سلامتی کونسل کے سامنے ہے اور امید ہے کہ جلد اس کا نتیجہ نکل آئے گا، کیونکہ یہ مسئلہ کو رہا یا کشمیر کا نہیں بلکہ ایسی قوموں کے مفاد کا ہے، جن پر سلامتی کونسل کی بنیاد قائم ہے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کونسل کا فیصلہ کیا ہوگا اور اس فیصلہ کے نفاذ کے لئے کیا صورتیں اختیار کی جائیں گی، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس نزاع کا بھارتی دور ختم ہو چکا ہے اور برطانیہ و فرانس کو یقین ہو گیا ہے کہ فوجی قوت سے اس کا حل دشوار ہے اس لئے نہیں کہ ان کی عسکری پوزیشن مقرر کے مقابلہ میں کمزور ہے بلکہ صرف اس لئے کہ برطانوی عوام جنگ کے سخت مخالف ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس کے نتائج زیادہ مضرت رساں ثابت ہوں گے۔

عرب ریاستوں کا اتحاد اور ہندوستان و چین کی مخالفت بھی اس مسئلہ پر کافی اثر انداز ہوئی ہے اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ "ایشیائی اقوام کے اتحاد کی یہ پہلی اخلاقی کامیابی ہے جس نے ایک طرف مشرقی ممالک کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا اور دوسری طرف بغداد سپیکٹ کی بنیاد کو متزلزل کیا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اسی کے ساتھ "شہر سوئز استعمال کرنے والوں کی کانفرنس" بھی منعقد ہو رہی ہے اور یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس مسئلہ کو سلامتی کونسل میں لے جانے کے بعد اس کا مقصود نا جائز دباؤ ڈالنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

برطانیہ، فرانس و امریکہ نے اس مسئلہ میں اب تقریباً اقتصادی دباؤ ڈالنے کی بھی تدبیریں شروع کر دی ہیں اور یہ معاشی جنگ یقیناً مقرر کے لئے تشویش کی بات ہوگی۔ کیونکہ اس باب میں عرب ریاستیں شاید عرصہ تک تھرکا ساتھ نہ دے سکیں اور ہو سکتا ہے کہ تھرکا اقتصادی بحران ناقابل برداشت حد سے گزر کر کسی اندرونی انقلاب کا سبب بن جائے۔

**پاکستان اور سہروردی کا دور وزارت** جن حالات میں سہروردی نے پاکستان کی عنایت حکومت اپنے ہاتھ میں لی ہے، وہ اس میں شک نہیں بڑے جہزناک ہیں انھوں نے ۱۲ ستمبر کو اپنی

پہلی تقریر پاکستان سے نشر کی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ جس عظیم فحہ داری کو اپنے سر پہ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ان کو کتنی دشواریوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ سب سے اہم مسئلہ مشرقی پاکستان کی اقتصادی تباہی کا ہے جس کے دور کرنے کی اس وقت تک کوئی کوشش نہیں کی گئی اور آئندہ مستقبل قریب میں اسکی توقع کی جا سکتی ہے۔ ایک بعد دوسری دلچسپی والی گتھی مغربی پاکستان کی مختلف سیاسی پارٹیوں کا اختلاف ہے اور وہ سہروردی ہوں یا کوئی اور ایک لمحہ کے بھی یقین نہیں کر سکتا کہ وہ کب تک برسرِ اقتدار رہ سکتا ہے۔ سہروردی خود ریپبلکن پارٹی کے نمونہ کرم ہیں اور دعویٰ کیا کہ ان کا اثر اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو ان کے بھروسہ پر سہروردی کو آگے بڑھا سکتی مسلم لیگ اپنا اقتدار بجا بھرا کر چلی ہے، لیکن کوئی کچھ نہیں کر سکتا کہ آئندہ انتخاب کے وقت تک وہاں کیا انقلاب رونما ہو اور کس پارٹی کو اکثریت حاصل ہو جائے۔ انھوں نے اس وقت پاکستان کی اندرونی و بیرونی سیاست معدومہ انوشناک ہے اور بظاہر اس دلدل سے چھٹنا مشکل نظر آتا ہے۔

# برجہ گوی کا تعلق اوزان و بحر سے

شاعر پیدا ہوتا ہے، یہ یقیناً درست ہے، لیکن یہ ضرور نہیں کہ جو شخص شاعر پیدا ہوا ہے اس کی "شعریت" اشعار ہی کے ذریعہ سے ظاہر ہو، وہ گفتگو سے بھی ظاہر ہو سکتی ہے اور اس نثری تحریروں سے بھی۔ اس لئے شعر کہنے کے لئے محض شاعر پیدا ہونا کافی نہیں بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے اوزان موسیقی کے ادراک کی بھی جس کا ہر فطری شاعر میں پایا جانا ضروری نہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص شعر تو موزوں پڑھ سکتا ہے، لیکن شعر کہ نہیں سکتا اور ایک شخص شعر کہتا ہے لیکن ناموزوں۔ فنون لطیفہ میں شعر و موسیقی کا کٹھنہیت کے ساتھ میں نے اسلئے کیا کہ شاعرانہ براہمت کا تعلق زیادہ تر موسیقی ہی کے اوزان سے ہے۔

شاعرانہ براہمت سے میری مراد فطری اہمیت یا ذہانت ہے جو شعر کہنے کے لئے غور و تامل کی محتاج نہیں ہوتی، بلکہ فی الفور کسی خیال کو موزوں الفاظ میں ظاہر کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے اور یہ ممکن نہیں جب تک اوزان موسیقی اس کا ساتھ نہ دیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص بے اختیار کوئی مصرع موزوں کر دیتا ہے، لیکن دوسرا مصرع وہ ہفتوں تک غور کرنے کے بعد بھی نہیں کہہ سکتا۔ اس صورت میں اس کی شاعرانہ براہمت پہلے مصرع تک تو مسلم ہے، لیکن دوسرے مصرع میں اس کی اہمیت ظاہر نہیں ہوتی بعض ایسے شاعر بھی دیکھے گئے ہیں جو نہایت ادنیٰ تامل کے بعد بلا تکلف شعر موزوں کرتے چلے جاتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جن کو ایک شعر کہنے کے لئے گھنٹوں درکار ہوتے ہیں۔ شاعر بہر حال دونوں ہیں، لیکن دونوں کی داغی راہیں بالکل جدا ہیں۔ شاعری میں "برجہ گوی" وہی فن سمجھا جاتا ہے جس کا تعلق اکتساب سے بہت کم ہے اور دلہائے شاعری میں (خواہ وہ کسی ملک و قوم کی ہو) ایسے شعراء بہت کم نظر آتے ہیں۔

اس فن میں مشق کا بہت کم دخل ہے، لیکن مطالعہ کی وسعت یقیناً لازم ہے، کیونکہ فی البدیہہ شعر موزوں کرنے کے لئے داغ میں کثیر الفاظ کا محفوظ رہنا ضروری ہے اور اسی کے ساتھ ذہن و فکر کی غیر معمولی رسائی کیونکہ سوچنے یا غور کرنے کا یہاں کام نہیں۔ اس کے لئے تو ایک "ذہنی آسا" ذہن کی ضرورت ہے جو آنا قانا اپنے داغ کے ذخیرہ الفاظ سے موزوں الفاظ چن کر مخصوص وزن میں پیش کر سکے۔ اور اس کے لئے صرف ملکہ شعری نہیں بلکہ اوزان موسیقی کے احساس کی بھی ضرورت ہے جو یقیناً بالکل فطری و دیعت ہے۔ اس کو میں نے فطری وہ دیعت اس لئے کہا کہ جس طرح بعض حضرات شعر تو موزوں کہہ لیتے ہیں لیکن موزوں پڑھ نہیں سکتے، اسی طرح موسیقی کے بعض ماہر بھی ایسے دیکھے جاتے ہیں جو لحن و صولت کے لحاظ سے تو وہ یقیناً استاد ہیں، لیکن "تالی اور رسم" کی طرف سے (جو اوزان موسیقی کی قطعاً ہے) بالکل گورے ہوتے ہیں۔

مغربی لٹریچر بھی اس نوع کی براہمت سے خالی نہیں جسے ان کی زبان میں *Report and Epigram* کہتے ہیں اور ڈرائیڈی کے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ لیکن ایشیا میں سب سے زیادہ شہرت اس فن میں عربی زبان نے حاصل کی، اس کے بعد فارسی نے اور پھر اردو نے۔

ہندی شاعری کا وہ پہلا دور جو رزمیہ شاعری سے تعلق رکھتا ہے برجہ گوی کے اعتبار سے بڑا کامیاب دور تھا، کیونکہ اس زمانہ کے بھٹ، چارن، سیوگ (اور پنجولی) جو مختلف راجپوت گھرانوں کے برجہ خواہ شاعروں کے لقب تھے) زیادہ تر برجہ شاعری ہیں،

کرتے تھے اس کے بعد بھی تلمسی داس، سور داس، کبیر داس اور ان کے گھرانے کی شاعری میں برجہ کوئی کافی ثبوت ملتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ امر غور طلب ہے کہ ہندیہ گوئی کی مثالیں ایک زبان میں کیوں زیادہ اور دوسری زبان میں کیوں کم ملتی ہیں۔

اس سے قبل ابھی عرض کر چکا ہوں کہ ہندیہ گوئی کا ایک پہلو اکتسابی ہے جو وسعت مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا بالکل وہی و فطری جو اوزان موسیقی کے صحیح ذوق سے متعلق ہے اور انھیں دو باتوں پر غور کرنے سے شاید ہم کو اس امر کا سراغ مل سکتا ہے کہ عربی کی شاعری میں بہ نسبت فارسی کے اور فارسی شاعری میں بہ نسبت اردو کے ہندیہ گوئی کیوں زیادہ نظر آتی ہے۔ (بحث کا یہ پہلو کہ بعض زبانوں کی شاعری میں کیوں یہ چیز نہیں پائی جاتی ہمارے موضوع سے خارج ہے)

شعریں موسیقی کا جو حصہ شامل ہے اس کا تعلق لحن و صوت سے نہیں بلکہ ”آہنگ“ سے ہے۔ آہنگ سے مہربی مراد وہ وقت ہے اور پیمانے ہیں جو شعر کی صوتی تقسیم میں توازن پیدا کرنے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں انھیں کو ہندی موسیقی میں تال، سم اور عربی میں ایقاع کہتے ہیں۔ شاعری میں بحر کی تعیین بھی اسی تال سم یا ایقاع کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے، اور یہ تعیین مختلف ملکوں میں وہاں کے لب و لہجہ، انداز گفتگو، الفاظ کی ساخت، ذہنی ماحول اور لحن و زبان کی ساخت کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ اگر کسی زبان کے اوزان شاعری میں ان باتوں کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے تو وہاں کی شاعری بھی آسان ہے، وہاں کی عروض بھی مشکل نہیں اور وہاں ہندیہ گوئی بھی زیادہ پائی جاسکتی ہے۔ اگر ہندوؤں نے جب تک لاطینی زبان کی عروض میں شاعری کی وہ کامیاب نہیں ہوئے لیکن جب انھوں نے اپنے ملی اوزان شاعری اختیار کئے تو ان کی شاعری نے زیادہ ترقی کی اور ان میں ہندیہ گوئی کی اہمیت بھی پیدا ہو گئی۔

عربی میں ایک خاص فن جسے ”محاضرات“ کہتے ہیں اسی شاعرانہ بلاغت سے متعلق ہے اور اس کی شاعری میں ہندیہ گوئی کی مثالیں ہم کو بہت ملتی ہیں جس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس کی عروض اور اس کے اوزان شاعری وہاں کے بالکل فطری اوزان ہیں اور اگر اس کی مثالیں ہم کو فارسی، اردو میں کم ملتی ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے اوزان غیر ملی و غیر فطری ہیں۔ اگر ہمارے شعراء ہندی شاعری کے اوزان (چندس) اختیار کرتے تو ان میں ہندیہ گوئی کا فلک بہ آسانی پیدا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ بعض نیچے درجے کی ہندو قومیں کھڈ کے جگمگ میں رات رات بھر فی البدیہہ شاعری کیا کرتی ہیں لیکن اردو شاعر کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔

فارسی شعراء نے بھی عربوں کے زیر اثر اپنے ملی اوزان کو ترک کر کے بہت سے عربی اوزان اختیار کر لئے اور اسی لئے ان میں بھی ہندیہ گوئی زیادہ رواج نہ پاسکی اور جو مثالیں فارسی ادب میں پائی جاتی ہیں، ان کا تعلق زیادہ تر ملی اوزان ہی سے ہے جنہیں اوزان خسروانی کہتے تھے۔

اردو میں جو اوزان شعرا رائج ہوئے وہ زیادہ تر فارسی سے لئے گئے، تیسرے یہاں البتہ ہم کو ایسے اوزان ملتے ہیں جو ہندی چندس سے قریب تر ہیں۔

ہندی اوزان سے اردو کی قریب تر بحر متدارک ہے جس کی تقطیع ”فعلن فعلن“ کی تکرار سے کی جاتی ہے۔ مثلاً تیسرے شعر ہے:-

پتہ پتہ پوتا پوتا ہمارا جانے ہے، جانے نہ جانے گل ہی بجائے بلغ تو سارا جانے ہے

اس میں ردیف کو چھوڑ کر باقی تمام ارکان کیلئے سات مرتبہ فعلن آئے گا۔ تیسرے یہاں اس وزن کی غزلیں کثرت سے ملتی ہیں۔ ہم نے اس بحر کو ہندی کی بحروں سے اس لئے قریب تر قرار دیا ہے کہ ہندی میں زیادہ تر اسی وزن میں شاعری کی جاتی ہے۔

ہندی کے ابتدائی دور رزم نگاری میں (مثلاً ۱۶۷۷ء تک) بھی جو دور چارن کے نام سے موسوم ہے، اس وزن میں شاعری کی جاتی تھی۔ مثلاً اس وقت کی ماڑواڑی زبان کی رزمیہ نظم کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

دھوم کنور ماریاں ماؤ ناہر ریپاڑ،  
گو آسل سیندھلا ساگ سو دودھ کھاڑ

(دھرم نے کور کو مار ڈالا تو راؤ تاپڑ ناراض ہو گیا اس نے دھرم کی اسل ذات ستیلا میں آباد ہو گئی اور اسی وقت سے دونوں میں جھگڑا ہو گیا)  
اس شعر کی آپ قلعن کریں گے تو وہی قلعن قلعن کے وزن پر ہوگی۔

اسی طرح رام بن، مہا بھارت، آلھا اودل ان سب کے اشعار اسی وزن کے نظر آئیں گے اور بڑے بڑے ہندی شعرا و مشق بہاری لال، تلسی داس، سور داس، کبیر داس، رحیم خان ناں وغیرہ کے دوہوں کا بھی یہی وزن ہے، ان کے بعض اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

برن باس شکمار تا سب بدھ رہی سائے  
بکھری گئی گلاب کی گات نہ جانی جائے  
لاج نہ لاگت آپ کو دورے آہو ساتھ  
دھک دھک ایسے پریم کو کیا کہوں میں ناتھ  
پریم جھپایا ناچھے جا گھٹ پر گھٹ ہوئے  
جو پے گھر بولے نہیں، نین دیت ہیں روئے  
پیابن ناگن کاری رات

(بہاری لال)

(تلسی داس)

(کبیر داس)

کبھو جامنی ہوت جو بھنپا، ڈس الٹی ہو جات  
جستہ سیرت مشتر نہیں لاگت۔ گات سکھا فوجات  
سور داس برون آس بیا کل مری مری لرس کھات  
بار بار درجن گھر جھگڑت سٹا ٹھہ  
جوں جوں انگیا سیوت، سو سو گا ٹھہ  
رحمن انگیا نیل کی رت میں بھٹھ ریتک  
منو کسوئی جیم پر دئی ہم کی لیک

(سور داس)

(خان ناں)

(خان ناں)

اسی طرح پدا کر، رستیس، دھرم داس، درو دت، بھکاری داس، متی رام اور ملک محمد جالسی وغیرہ سب کے دوہے پدا، سور دھا، بکت وغیرہ اسی وزن میں نظر آتے ہیں اور دسی لے اگر ہندی شاعری میں دسیہ گوئی کی مثالیں ہم کو زیادہ ملتی ہیں تو عجیب ذکر ناچاہئے، کیونکہ ان کے یہاں وزن شعری خود انھیں کے ملک کا تھا اور جن سے ان کا دماغ، ان کی زبان اور ہن کا لپ لپہ پوری طرح آشپاش تھا۔

اُردو میں پریمیہ گوئی کی مثالیں ہم کو بہت کم ملتی ہیں اور جو ملتی بھی ہیں وہ کسی مخصوص بحر و وزن سے مخصوص نہیں اور زیادہ محدود ہیں، اس کی بعض مثالیں ہم کو بحر دل مشمن میں ملتی ہیں۔ مثلاً غالب کا وہ مشہور قطعہ جو چکنی ڈلی کے عطیہ پر کہا گیا تھا۔  
ہے جو صاحب کے کعب دست پہ یہ چکنی ڈلی  
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے  
اس کی بحر ”دل مشمن مجنون مقطوع“ ہے (فعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلاتن)  
بحر مضارع مشمن، اخرب کفوف مقصور و محذوف میں بھی ہم کو اس کی مثالیں ملتی ہیں۔  
مثلاً تیر کا وہ قطعہ جو تیر نے لکھنؤ کے ایک مشاعرہ میں برجستہ کہا تھا:-

کیا برد و باش پوچھو ہو یورپ کے ساکنو

ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پیکار کے

اس کی تقطیع "مفعول، فاعلات مفاعیل فاعلن" ہے۔ (مضارع مثنیٰ حزب مکھون محذوف)

ایک بار لکھنؤ کے بعض امراؤ نے سودا سے اس مصرع پر برجستہ گزرا لگانے کی فرمائش کی :- "اے سنگ نازی میں تو کامل نہ ہو سکا"

سودا نے فوراً دوسرا مصرع کہہ کر شعر پورا کر دیا :- "شیشہ گداز نہ ہو کے بنادل نہ ہو سکا"

اس کی بھر بھی وہی "مضارع مثنیٰ" کی ہے۔

ایک بار (بحوالہ آب حیات) دربار میں مرشد زادے آئے اور بادشاہ کے کان میں کوئی بات کہہ کر فوراً واپس جانے لے گئے۔ حکیم حسن شاہ

خاں نے عرض کی "صاحب عالم اس قدر جلدی میں آنا اور پھر فوراً واپس جانا کیسا؟" صاحب عالم کی زبان سے بے ساختہ یہ مصرع نکل گیا :-

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

استاد ذوق موجود تھے، انھوں نے فوراً پہلا مصرع موزوں کر کے سنا دیا :-

لائی حیات آئے، قضا لے چل چلے

اس کی بھر بھی وہی "مضارع مثنیٰ" ہے۔

نواب آصف الدولہ نے ایک مصرع کہا :- "وہ کون ہے جو یار کی لاد خبر مجھے"

اور اس پر مصرع لگانے کا انعام ایک ہزار اعلان کیا۔ وہیں کہیں ایک شہید بھی کھڑا ہوا تھا اس نے سنتے ہی اس پر دوسرا مصرع لگا دیا کہ

"اے سیل اشک تو ہی بہا دے اُدھر مجھے"

راجہ شتاب رائے (عظیم آباد) کے دربار میں ظریف الملک نے ایک غزل پڑھی جس کا قافیہ لالیاں اور جالیاں تھا۔ دربار میں ایک

مسخرہ بھی سننا چاہیے "جگنو میاں" کہتے تھے۔ اس نے غزل سن کر کہا کہ آپ نے سب قافیے باندھے لیکن "تالیاں" رہ گیا، ظریف الملک نے

برجستہ یہ شعر کہہ کر سنا دیا :-

جگنو میاں کی دُم جو چپکتی ہے رات کو

سب دیکھ دیکھ اس کو بجاتے ہیں "تالیاں"

اس شعر کی بھر بھی وہی "مضارع مثنیٰ" کی ہے۔

اُردو میں بعض مثالیں برجستہ گوئی کی رباعی کی بھر میں بھی ملتی ہیں لیکن کم۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو میں فی البدیہہ شعر کہنے کے لئے

بکریل اور مضارع زیادہ فطری بکریں ہیں۔

برجستہ گوئی یا جلد شعر نظم کرنے کی ضرورت مثنوی کے لئے زیادہ ضروری ہے اور اسی لئے اس کی بھر میں بھی بہت چلتی ہوئی ہوتی ہیں۔

غواصی کی مثنوی "سہمت الملوک و بدیع الجمال"۔ سراج اور نگ آبادی کی مثنوی "بوستان خیال"۔ میر تقی میر کی غلوایاں

شعلہ عشق، خواب و خیال۔ میر حسن کی مثنوی کمرالبیان، سب کی سب بھر متقارب مثنیٰ محذوف، میں ہیں (مفعول مفعول، مفعول مفعول)

بلکہ فارسی کی بھی اکثر مثنویاں یہاں تک کہ فردوسی کا شاہنامہ بھی اسی بھر میں ہے۔ یہ بھر مثنوی کے لئے اس لئے زیادہ موزوں ثابت ہوئی کہ

وہ بھر متذکر سے قریب تر ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا، رباعی کا وزن بھی برجستہ گوئی کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ یہ بھر ہرچ ہے اور خالص عجمی اختراع ہے

رباعی کے اہل عجم۔ ذہر، اوزان مقرر کئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مقبول اوزان وہ ہیں جو "ہزج مسدس آخری" سے تعلق رکھتے ہیں

اُردو کی بعض غلوایاں بھی بھر ہزج میں لکھی گئی ہیں اور فارسی میں بدیہہ گوئی کی مثالیں بھی زیادہ تر اسی وزن میں ملتی ہیں۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

(۱) جب سلطان سمر نے اتر کے غلات خوارزم پر فوج کشی کی تو انور سی سے کچھ کہنے کی فرمائش کی۔ اس نے فی البدیہہ یہ رباعی لکھ کر پیش کر دی :-

اے شاہ ہمہ ملک جہاں حسب تراست      وز دولت و اقبال جہاں کسب تراست  
امروز بیک حملہ ہزار اسپ بگیر،      فردا خوارزم و صد ہزار اسپ تراست  
یہ رباعی کاغذ پر لکھ کر تیر کے ذریعہ سے قلعہ کے اندر پہنچائی گئی۔ وہاں سے وطواط نے اسی وقت اس کا یہ جواب لکھ کر بھیج دیا کہ :-  
اے شہ کہ بجاست مئے صاف ست نہ دورد      اعدائے ترا ز غصہ خوں باید خورد  
گر خشم تو اے شاہ بود رستم گردد      یک خرز ہزار اسپ نتواند برد  
پھر جب قلعہ فتح ہوا اور وطواط کو جو رنگ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے فوراً یہ رباعی پیش کر دی :-  
در طوق ورتی زمانہ از ظلم بشتست،      عدل شکستگی کرد درست  
اے بر تو قبائے سلطنت آمد حجت      ہاں تا چہ کنی کہ نوبت دولت تست  
اور اس کی جاں بچتی ہو گئی۔

(۲) طابنائی، سلطان مرزا حسن کے دربار کا شاعر تھا اور حاکمی کے متعلق اس کا خیال تھا کہ وہ فی البدیہہ کہنے سے عاجز ہیں، اتفاق سے ایک دن جاتی بھی دربار میں پہنچ گئے تو سلطان مرزا حسن نے ان سے کہا کہ میں چار چیزوں کے نام لیتا ہوں ان کو آپ نظم کر دیجئے۔ وہ نام یہ تھے :- چراغ، غریب، نردبان، ترنج۔ جاتی نے اسی وقت برجستہ یہ رباعی نظم کر دی :-  
اے نقشۂ چراغ دولت بدر منیر      غریب شدہ سیدۂ اعداوت ذوق تیر  
بر پلۂ نردبان ہمت نہ پائے      از اوج فلک ترنج دولت برگیر  
اس کے بعد مرزا حسن نے نہائی کے سامنے چار لفظ، منتقل، طاس، شرح شمس، کلاہ ند۔ پیش کئے اور اس سے بھی ان کو فی البدیہہ نظم کرنے کی فرمائش کی، اس نے اسی وقت یہ رباعی کہی :-

چوں منتقل اگرچہ دود آہے داریم،      بر طاس فلک نہ کار گاہے داریم  
با سخن ز شرح شمس گویا      ما نیز از ہر ند کلاہے داریم  
(۳) سلمان ساوجی اور سراچ قزوینی دونوں بڑے ذہین و طباع شاعر تھے، ایک بار جنس شعر و سخن میں ان سے فرمائش کی گئی کہ اس مصرعہ پر گرہ لگائیں :

اے باد صبا میں ہمہ آوردہ تست

سلمان نے برجستہ یہ رباعی کہی :-

اے آب رواں سرور آوردہ تست      اے سرو چہاں، چمن سر آوردہ تست  
اے غنچہ عروس باغ پروردہ تست،      اے باد صبا میں ہمہ آوردہ تست  
اس کے بعد سراچ نے بھی اسی وقت یہ رباعی نظم کی :-

اے ابر بہار خار پروردہ تست،      اے خار درون غنچہ خوں خورده تست  
گل سرزوش دلاہ مست و نرگس مخمور      اے باد صبا میں ہمہ آوردہ تست

(۴) ملہ قیوں کے آخری فرمانروا طفیل خاں کی قید سے چھوٹ کر جب اس کا چچا نکش خاں والی خراسان کے پاس پہنچا تو اسے

عراق پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ تکش خاں نے ایک جرار فوج لیکر عراق پر حملہ کر دیا۔ جب فریقین کی فوجیں صف آرا ہوئیں تو طفل خاں نے اسی وقت ایک برجستہ رباعی کہی۔

رو، جوشن من بیمار تا بر پوشم ، کیں کار بمن فتادہ تا خود کو ششم  
تا سیف بکف، گرز و سپر بردوشم من ملک عراق را بجاں نفرو ششم  
اور نہایت سختی سے مقابلہ کیا۔ لیکن نتیجہ نا موافق نکلا اور وہ مارا گیا۔ تکش خاں نے طفل خاں کا سر کاٹ کر اس کا جسم ایک درخت سے ہٹا دیا۔ — اس منظر کو دیکھ کر اسی وقت ایک شاعر نے یہ رباعی نظم کی۔

امروز قہرا ملک بہاں دل تنگے ست ، فیروزہ چرخ ہر زمانے رنگے ست  
وی از سر تو تا بہ فلک یک گز بود امروز ز سر تا بدم فرنگے ست  
(۵) جب اکبر نے فیضی کو طلب کر کے ملک الشعراء کا خطاب اسے دیا تو اس نے اسی وقت برجستہ یہ رباعی پڑھی :-  
اسے شب زکنتی آں ہمہ پرخاش کو دوشش راز دل من چناں کن فاش کو دوشش  
دیدای چه دراز بود دوشیند ششم ہاں اسے شب وصل آں چناں باش کو دوشش  
اسی طرح جب اکبر اس کے بستر مرگ پر آیا تو اس نے فی البدیہہ یہ رباعی نظم کی :-

دیدای کہ فلک بمن چہ نہر گئی کرد مرغ دل از نفس شب آہنگی کرد  
آں سینہ کہ عالمے درومی عجیب تا نیم نفس بر آدرم تنگی کرد  
فیضی کی برجستہ گوئی کی ایک بہترین مثال اس کی وہ رباعی بھی ہے جو اس نے ملا حیدر ظاہری کی رباعی کے جواب میں کہی تھی۔  
اس کی تفصیل یہ ہے کہ شاہ عباس اولیٰ ایران نے ایک بار حیدر ظاہری کی یہ رباعی دربار اکبری میں کہی :-

دنگی بہ سپاہ و خیل و لشکر نازد رومی بہ سنان و تیغ و خنجر نازد  
اکبر بہ خزینہ بر از زر نازد عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد  
اس رباعی میں چونکہ اکبر پر چوٹ کی گئی تھی اس لئے یہ رباعی سن کر اکبر نے فیضی کی طرف دیکھا اور اس نے فوراً عرض کی کہ بندگان عالی اس کا جواب بھی سن لیا جائے اور اسی وقت یہ رباعی پڑھ دی :-

فردوس بہ سبیل و کوثر نازد دریا بہ گہر فلک بہ اختر نازد  
عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد کوئین بہ ذات پاک اکبر نازد  
اسی رباعی کے کھلم میں فیضی کو ہفت ہزاری منصب عطا ہوا تھا۔

(۶) کلم ہوائی، دربار شاہ جہاں کا ملک الشعراء تھا اور بڑا ذہین و طباع شاعر تھا۔ جب غازی جہاں نے جس کا اصلی نام پیدا تھا دیا خاں کے ساتھ ملکر بغاوت کی اور ان دونوں کا سرود بار میں پیش کیا گیا تو حکیم نے برجستہ یہ رباعی کہی :-

ایں مزدہ فتح از پئے ہم زیبا بود ایں کیفیت دو بالا چہ نشاط افزا بود  
از کشتی دریا سر پیدا ہم رفت گویا سرو حباب ایں دریا بود

(۷) امیر معزی، ملک شاہ سلجوقی کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ ایک بار ملک شاہ اپنے درباریوں کے ساتھ عید کا چاند دیکھنے قصر شاہی پر چڑھا اور اتفاق سے اسی کو سب سے پہلے امیر معزی نے فوراً یہ رباعی نظم کی :-

اے ماہ کمان شہر یارے کوئی ، درگوشیں سپہر گو شوارے کوئی  
نئے زوہ از زربعیارے کوئی یا ابرو و آن طرفہ ہمارے کوئی

بادشاہ نے خوش ہو کر خاصہ کا ایک گھوڑا عنایت کیا تو اسی وقت امیر معزی نے دوسری رباعی پیش کی :-

چوں آتش خاطر مرا شاہ بدید از خاک مرا بزمیر این ماہ کشید  
چوں آب کے تزانہ از من بشنید چوں بادیکے مرکب خاصم بخشید  
(۸) مجد ہنگر (ہم عصر شیخ سعدی) نے، خواجہ شمس الدین کی موت کی خبر سن کر فوراً یہ رباعی نظم کی :-

در ماتم شمس از شفق خوں بچکید، مہ چسبدہ بکند و زہرہ گیسو بہرید  
شب خانہ سیاہ کرد در ماتم و صبح بزد نفس سرد گرہاں بدرید  
(۹) امیر شاہی سہواری نے بھی ایک رباعی اسی رنگ کی بایستغری موت پر نظم کی تھی :-

وہ ماتم تو دہر بے شیون کرد لالہ ہمہ خون دیدہ در دامن کرد  
گل جیب قبائے ارغوانی بدرید قمری بند سیاہ در گردن کرد

(۱۰) شاہ سنجری شاعرانہ صحبتوں میں ایک خاتون "ہستی" بھی شریک ہوا کرتی تھی جسے برجستہ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ ایک بار جشن طلب میں یہ بھی شریک تھی کہ کسی ضرورت سے باہر نکلی، دیکھا کہ برف باری ہو رہی ہے۔ جب واپس آئی تو سنجر نے پوچھا کہ باہر کیا رنگ ہے۔ اس نے فی الہدیہ یہ رباعی پڑھی :-

شما فلک اسب سعادت زیر کرد وز جملہ خسرواں ترا تحسین کرد  
تا در حرکت سمند زریں لغلت برگل نہ ہند پائے زمیں سیمیں کرد

(۱۱) نظام الدین استرآبادی سلطان نکش کے دربار کا بڑا مقبول شاعر تھا۔ ایک بار اس کے دشمنوں نے کچھ ایسے جھوٹے الزام اس پر لگائے کہ سلطان پر ہم جوگیا اور حکم دیا کہ فوراً اس کا سر کاٹ کر لایا جائے۔ جب یہ لوگ نظام الدین کے پاس پہنچے تو اس نے منت سماجت کر کے ان لوگوں کو اس پر راضی کر لیا کہ سر کاٹنے کی جگہ وہ خود اسے دربار میں لے چلیں، چنانچہ جس وقت یہ پابند بجزیر دربار میں لایا گیا اور کھینچ دیکھا تو اس نے فی الہدیہ یہ رباعی پڑھی :-

من خاک تو در چشم خرد می آرم عذرت نہ یکے نہ وہ کہ صد می آرم  
سرخواستہ بدست کس نتواں داد می آیم و بر گردن خود می آرم

(یعنی میرا سر ایسا نہ تھا کہ میں کسی اور کے ہاتھ بھیجتا اس لئے میں خود اسے لایا ہوں اور حضور میں پیش کرتا ہوں) سنجر یہ رباعی سن کر اس قدر خوش ہوا کہ محفل کا تمام سالان اسی وقت اس کو بخشش کر دیا۔

اس قسم کی برجستہ گوئی کی مثالیں فارسی ادب میں بہ کثرت نظر آتی ہیں، لیکن آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے اکثر رباعی کی بحر میں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رباعی کی بحر عجمی شاعروں کے لئے زیادہ طبعی بحر تھی اور اسی لئے وہ اس وزن میں بہ آسانی بہرہ گوئی کر سکتے تھے۔ عربی ادب میں ہم کو بہرہ گوئی کی بہت مثالیں ملتی ہیں، لیکن ان میں سے اکثر وہی ہیں جو وہاں کے طبعی اوزان سے تعلق رکھتی ہیں اس میں شک نہیں کہ برجستہ گوئی کا مادہ ایک فطری و دلیت ہے اور ہر شاعر میں اس کی اہلیت پائی باقی، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس اہلیت کا اظہار زیادہ تر انھیں اوزان و بحر میں ہو سکتا ہے جو بشر سے قریب تر ہیں اور گفتگو کے لب و لہجہ کو زیادہ سے زیادہ اپنے اندر قائم رکھ سکتے ہیں۔

مرثیہ نگاری اور میراثی ڈاکٹر محمد حسن خاروقی کا بیسٹ مقالہ جس میں جدید اصول نقد کے پیش نظر میراثی کے فن مرثیہ نگاری سے بالکل نئے زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت ۶۔ فیبر نگار گھنٹو

# وحشتِ ملکتوی

## (ان کی شخصیت اور شاعری)

(نظیر صدیقی)

اُردو ادب پر عجیب وقت آ پڑا ہے۔ ابھی ہم ایک ادیب یا شاعر کے نام سے فارغ بھی نہیں ہو پاتے کہ دوسرے کے مرنے کی خبر آجاتی ہے۔ مجاز، قاضی عبدالغفار، بیچود دہلوی اور پنڈت کیفی کی دائمی جدائی میں ہماری آنکھیں اشکبار اور ہمارے دل سوگوار تھے ہی کہ وحشت صاحب بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ وہ اگلے لوگوں میں سے تھے اور اگلے لوگوں میں جا ملے۔ ان کی وفات نے ہم سے صرف ایک کامل الفن شاعر کو چھین لیا بلکہ ایک عظیم انسان کو بھی۔ وحشت صاحب ایک عظیم انسان تھے۔ سماجی اور سیاسی نقطہ نظر سے نہیں۔ اخلاقی و تہذیبی نقطہ نظر سے۔ اس بات کو وہ سب لوگ جانتے اور مانتے ہیں جنہیں ان سے دو چار مرتبہ بھی ملے کا شرف حاصل رہا ہے۔

جن لوگوں نے وحشت صاحب کو کتابوں اور رسالوں میں دیکھا ہے وہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ”شخص“ کے اعتبار سے وحشت صاحب کیا تھے اور کیسے تھے۔ انھیں ذاتی طور پر جاننے والوں کی زبان اور زبانِ قلم دونوں پر آج اس قسم کے فقرے رواں ہیں کہ ”ایک عظیم انسان انسانوں سے اُٹھ گیا“ میں نے اپنی زندگی میں ان سے بہتر مخلص انسان اب تک کسی کو نہیں دیکھا۔ اخلاق اور شرافت کا ایسا مجسمہ میری نظر سے نہیں گزرا، وہ فرشتوں کے درمیان آدمی سمجھے جائیں گے۔ لیکن آدمیوں کے درمیان فرشتہ تھے، وہ آدمی نہیں ولی تھے۔ یہ اور اسی قبیل کے بہت سے فقرے زبانوں سے نکل کر کانوں سے ٹکرا رہے ہیں۔ لیکن سچ پوچھئے تو وحشت صاحب نہ ولی تھے نہ فرشتہ۔ وہ محض انسان تھے۔ اس قسم کے انسان جس کے بارے میں حاتی نے کہا ہے کہ:-

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا  
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

وحشت صاحب جن خوبیوں کے انسان تھے ان خوبیوں کا انسان بننے میں انھیں کتنی مشقت اور کتنی ریاضت سے کام لینا پڑا اس کا حال ان کے سوا کسی اور کو کیا معلوم، لیکن انھیں دیکھ کر اور ان سے مل کر محسوس یہی ہوتا تھا کہ ایک انسان کی حیثیت سے وہ جو کچھ اور جیسے کچھ ہیں اس میں ان کی کوششوں اور محنتوں کو کوئی دخل نہیں۔ جیسے ان کی خوبیاں ان کی زندگی کے بنیادی اصول نہیں بلکہ ان کی فطرت کے بنیادی تقاضے تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ کلکتہ میں اور آخری چند سال ڈھاکہ میں گزرے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ کلکتہ سے لیکر ڈھاکہ تک ان کے جاننے والوں نے انھیں زندگی کے مختلف دور اور مختلف حال میں دیکھا لیکن تمام دیکھنے والوں کو وہ ہمیشہ یکساں نظر آئے۔ یہ سرگوشی کہیں بھی سننے میں نہیں آتی کہ جوانی کے وحشت بڑھاپے کے وحشت سے یا کلکتہ کے وحشت ڈھاکہ کے وحشت سے مختلف تھے۔ ان کی شخصیت کا یہ کتنا بڑا حسن ہے کہ آج ان کی وفات کے بعد ان کی تعریف میں کچھ کہتے یا لکھتے وقت

کسی کو نہ تو اپنے ضمیر کے خلاف کچھ کہتا پڑ رہا ہے اور نہ اس اصول پر کاربند ہونے کی ضرورت پیش آرہی ہے کہ مردوں کو اچھے ناموں سے یاد کرو۔ آج اگر ہم وحشت صاحب کی اچھائیوں کا گنگا رہے ہیں تو صرف اس لئے کہ ہم اس کے سوا اور کچھ کبری نہیں رکھتے۔ اس یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وحشت صاحب میں کوئی کمزوری تھی ہی نہیں۔ ہوگی۔ لیکن ہم ان کی کمزوریوں کے متعلق داغ کے الفاظ پر اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ

سچ ہے بے غیب ہے خدا کی ذات  
نقد میں کیا جائیں کیا بُرائی ہے

وحشت صاحب کے تمام اوصاف کو ایک لفظ میں جمع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے بلند اخلاق آدمی تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت کو بیان کرنے کے لئے "بلند اخلاق" سے زیادہ جامع لفظ شاید ہی کوئی اور ہو۔ مگر اس لفظ کی ساری جامعیت کے اوپر اس میں ان کی شخصیت کے سارے پہلو نہیں سما پاتے۔ بہر حال اس سے بڑھ کر ان کے اخلاق کی خوبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے تمام نئے والوں کو ان کے اخلاق پر اخلاص کا گمان ہوتا تھا۔ وہ اخلاقی خلوص کی بجائے مخلصانہ اخلاق کے قابل تھے ان کے اخلاق کی انتہا یہ تھی کہ انھیں اپنے شاگرد کو شاگرد تک کہنے میں تامل ہوتا تھا مبادا اس سے اس کے وقار پر حرج آئے چنانچہ اگر ان سے کوئی پوچھتا کہ فلاں صاحب آپ کے شاگردوں میں سے ہیں تو جواب ملتا کہ "جی نہیں" وہ تو خود ہی بڑے خوش گوشا عرصہ۔ البتہ مجھ سے کبھی کبھار شورہ کرنا کرتے ہیں۔ اس باب میں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ "مشرقی بنگال میں اردو" کے مصنف پروفیسر اقبال عظیم نے لکھا ہے کہ "ایک مرتبہ اکبر حیدری نے مولانا کے پاس ایک نظم بغرض اصلاح بھیجی۔ جب لفظ مولانا کے ہاتھوں میں پہنچا ان کے کچھ عزیز تلامذہ ان کی خدمت میں حاضر تھے۔ لفظ کی رنگینی اور تکلف سے فطری طور پر انھیں شوق پیدا ہوا کہ خط پڑھیں والے کا نام معلوم کریں۔ سب نے الگ الگ اصرار کیا۔ لیکن مولانا نے لفظ جیب میں رکھ لیا اور مال گئے۔ کچھ دنوں بعد کسی طرح حقیقت کھلی۔ لیکن مولانا کو نہ قہولہ تھا نہ قبولے۔"

اخلاق کے تصور کے ساتھ کچھ تنکافات بھی وابستہ رہے ہیں۔ عام طور پر کسی کے خلیق یا خوش اخلاق ہونے کی دلیل یہ سمجھی جاتی ہے کہ جب آپ اس کے یہاں جائیں تو وہ آپ کو چائے ضرور پلائے۔ پان ضرور کھلائے اور سگریٹ ضرور پیش کرے، اگر آپ کھانا کھاٹے کے وقت وارد یا نازل ہوئے چوں تو کھر میں فاضل کھانا نہ ہونے کے باوجود وہ آپ سے اسرار کرے کہ کھانا کھا کر جائیے۔ میں نے وحشت صاحب کو اس قسم کے تنکافات پر مبتلا ہونے کبھی نہیں دیکھا۔ مگر ان کے ایک عزیز شاگرد کا بیان ہے کہ جب تک وہ کلکتہ میں رہے ایسا کبھی نہ ہوا کہ کوئی ان سے ملنے گیا اور چائے پان کے بغیر واپس آیا۔ لیکن ڈھاکہ آنے کے بعد وحشت صاحب اپنے حالات کی بنا پر لوگوں کی خاطر دلائل سے معذور ہو گئے۔ یہاں تو انھیں اتنا میسر نہ تھا کہ اپنے مہانوں کو اپنے کمرے میں بٹھا کر بات چیت کر سکیں۔ جب کوئی ان سے ملنے جاتا تو اپنے فلیٹ کے باہر لازم سے کرسیاں منگو کر جہان کو بٹھاتے اور خود بیٹھتے۔

گزشتہ چھ سال کے اندر وحشت صاحب کی جسمانی قوت میں جو تدریجی انحطاط پیدا ہوا وہ میری آنکھ کے سامنے کا واقعہ ہے۔ وہ فلیٹ جس میں انھوں نے اپنی زندگی کے آخری چھ سال گزارے تیسری منزل پر ہے۔ یا تو وہ اس قابل تھے کہ پہلی منزل سے تیسری منزل تک تمام زینوں کو بغیر کسی سہارے کے ملے کر بیٹھتے تھے یا پھر رفتہ رفتہ ایسے ہو گئے کہ دیوار کا سہارا لے بغیر دروازہ تک نہ آسکتے تھے۔ لیکن ضعیفی و ناتوانی کے اس عالم میں بھی جب تک وہ اپنے جہان کو کرسی پر نہ بٹھالیتے خود نہ بیٹھتے۔ اگر کرسیاں کم ہوتیں تو جب تک لازم کرسی لاکر رکھنا وہ لافانیوں کے اصرار کے باوجود ان کے ساتھ کھڑے رہتے۔ بڑی بات یہ تھی کہ اس خشکی و انحطاط کے باوجود ان کے چہرے پر خوشی اور خوش دلی کی ٹھنائیاں رہتی جو ملنے والوں کے لئے خیر مقدم کی حیثیت رکھتی تھی۔

وحشت صاحب سے میری پہلی ملاقات غشت ۱۹۷۷ء میں ہوئی۔ اس سے قبل جب کہ وہ کشمیر (مشرقی پاکستان) میں قیام پذیر تھے

میرے ان کے درمیان ایک ادبی معاملہ کے سلسلہ میں خط و کتابت چوچکی تھی۔ حلقہٴ اربابِ فوق ڈھاکہ کے جلسہ میں جب ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو قمر صدیقی مرحوم جو ان کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے ان سے میرا تعارف کرانے لگا۔ میرا نام سنتے ہی وحشت صاحب نے کہا: انھیں تو میں جانتا ہوں۔ میں اس زمانہ میں بی۔ اے کا طالب علم اور دائرہٴ ادب ڈھاکہ کا سکریٹری تھا۔ ہر چھینے میں دائرہ کی دو ایک نشستیں ضرور ہوا کرتی تھیں۔ لیکن ہم لوگ وحشت صاحب اور شادانی صاحب جیسے بزرگوں کو دائرہ کی صرف غیر معمولی نشستوں میں مدعو کیا کرتے تھے۔ وحشت صاحب نے دائرہ کی نشست میں شریک ہونے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ وہ بڑی خوشی سے ہمارے دعوت قبول کرتے اور انتہائی باہنری وقت کے ساتھ جلسے میں تشریف لاتے۔ وحشت صاحب کی باہنری وقت ان کے جاننے والوں کے درمیان ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس باب میں ان کا ایک لطیفہ بہت مشہور ہے۔ ایک مرتبہ وحشت صاحب مشاعرے میں شرکت کی غرض سے جا رہے تھے ان کے ساتھ ان کے بعض تلامذہ اور احباب بھی جانے والے تھے جو پہلے سے ہارڈ اسٹیشن پر موجود تھے۔ سوہ اتفاق سے اس دن ٹرین پر وحشت صاحب کے پہنچنے پر ایک دروازہ کی تاخیر ہو گئی۔ گاڑی وقت مقررہ پر چل پڑی۔ لیکن فوراً ہی کسی وجہ سے رک گئی۔ اتنے میں وحشت صاحب آ پہنچے۔ انھیں دیکھتے ہی کسی شاگرد یا دوست نے کہا۔ مولانا! گاڑی تو چل پڑی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف آپ کے لئے رک گئی۔ اس پر وحشت صاحب نے کہا:- ”میں نے زندگی بھر وقت کا لحاظ رکھا ہے۔ کہا وقت ایک دن بھی میرا لحاظ نہ رکھے گا“ چونکہ پاکستان جیسے نئے ملک میں لوگ وقت کی باہنری کو اپنا فرض نہیں سمجھتے اور نتیجتاً کوئی جلسہ وقت معینہ پر شروع نہیں ہوتا اس لئے جب ہم لوگ وحشت صاحب کو دائرہ کے جلسوں میں مدعو کرتے تو ان سے یہ بھی کہہ دیتے کہ مولانا! جلسہ کا وقت تو پانچ بجے رکھا گیا ہے مگر آپ چھ بجے تشریف لائے گا تاکہ آپ کو اور لوگوں کے آنے کا انتظار نہ کرنا پڑے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے سجاد حیدر ریلدرم کے متعلق لکھا ہے کہ ”وہ تمام آداب ان میں رہے جو محض کی جان و جواز ہیں۔ ان آداب کو وہ اس لطف اور آسانی سے برتتے تھے جیسے ایک تندرست سافٹ لیتا ہے یا ایک حسین اپنے حسن کا حامل ہوتا ہے“ یہاں ریلدرم اور وحشت کا تقابل مقصود نہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ رشید صاحب کے یہ جملے وحشت صاحب پر بھی لفظ ب لفظ صادق آتے ہیں وحشت صاحب جب کسی مشاعرے کی صدارت کرتے تو چار زانو ہو کر بیٹھتے اور اسی وضع میں مشاعرے کی ساری رات اس طرح گزار دیتے جیسے بیٹھنے کی یہی وضع ان کے لئے سب سے زیادہ آرام دہ ہے۔

وحشت صاحب کی طبیعت میں متانت اور خرافت دونوں کی دھوپ چھاؤں پائی جاتی تھی۔ ان کی شخصیت سنجیدگی اور تکلفی کے دکھن امتزاج سے عبارت تھی۔ یہاں پھر مجھے رشید احمد صدیقی کے دو ایک ایسے جملے یاد آ رہے ہیں جو انھوں نے لکھے تو میں سجاد حیدر ریلدرم کے متعلق لیکن جو وحشت صاحب پر بھی حزن بہ حزن صادق آتے ہیں۔ رشید صاحب کے جملے یہ ہیں:- ”ان کی بے تکلفی میں دو ستارہ اور شریفانہ شان پائی جاتی تھی۔ وہ اسی حد تک تکلف کرتے تھے جس حد تک شرافت اور سلیقے کا اقتضا ہوتا تھا۔ اور بے تکلف بھی اسی حد تک ہوتے تھے جس حد تک بے تکلفی حسن معاشرت کا جزو اعظم سمجھی جاتی ہے۔“

ڈھاکہ آنے کے بعد جب وحشت صاحب کی صحت کمزور سے کمزور تر ہونے لگی تو میں نے انھیں دائرہ کی نشستوں میں مدعو کرنا ترک کر دیا۔ صاحب میں نے یہ دیکھا کہ وحشت صاحب سے ان کے گھر پر بھی ملنا ان کے لئے رحمت سے خالی نہیں تو میری ان کی ملاقات کے وقفے طویل طویل نہ ہوتے گئے۔ اب مجھے ان سے کوئی بات دریافت کرنا ہوتی تو میں انھیں خط لکھ کر دریافت کر لیتا۔ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے رہا ب کلم سے میری خط و کتابت رہی ہے۔ لیکن جواب کے معاملہ میں جیسی مستندی میں نے وحشت صاحب میں دیکھی وہی کسی کے ہاں نظر نہ آتی۔ اس باب میں ان کی مستندی کا ذکر کرتے ہوئے اقبال اعظم نے یہاں تک لکھا ہے کہ ”اگر ریڈیو کا کوئی خط آ گیا جس کا جواب میں خاص تاریخ کو جانا ہے تو جواب لگانے میں بند کر کے پیسے ہی سے رکھ دیا جائے گا اور اس کی نشت پر وہ تاریخ صبح کو دی جائے گی“ اب اسے دیکھ کے حائلے کرنا ہے؟

معاصرانہ چٹنگ ادیبوں اور شاعروں کی عام کمزوری ہے۔ وحشت صاحب کی ذات میں اس کمزوری کا شائبہ ملک نہ تھا۔ وہ نہ تو خود کبھی اس مرض کا شکار ہوئے اور نہ انھوں نے اپنے ارد گرد والوں کو اس مرض کا شکار ہونے دیا۔ ان کا اخلاق اور ان کا انکسار اس مرض کے گرفتاروں کے لئے معالجے کا حکم رکھتا تھا۔

وحشت صاحب ہمدرد منکر المراج، صلح کل اور مریخاں مریخ قسم کے آدمی واقع ہوئے تھے۔ وہ نہ دوسروں پر اعتراض کرتے تھے اور نہ اپنے آپ پر دوسروں کے اعتراض کا جواب دیتے تھے اور اگر کبھی جواب دیتے بھی تو اس انداز سے کہ معترض کو ناگوار نہ ہو۔ ان کے ایک شاگرد نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ کسی نے ان کے ایک شعر پر اعتراض کیا۔ وحشت صاحب کے شاگردوں میں سے کوئی صاحب اس اعتراض کو لے کر ان کے پاس گئے اور کہا کہ حضور! اس شعر پر یہ اعتراض کیا گیا ہے۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟۔ وحشت صاحب نے فرمایا کہ ”چونکہ یہ اعتراض وحشت کے شعر پر ہے اس لئے صحیح ہے اگر کسی اور کے شعر پر یہ اعتراض ہوتا تو میں اس کی تردید میں فلاں کا یہ شعر پیش کرتا اور فلاں کا وہ شعر۔ غرض کہ اسی وقت وحشت صاحب نے اعتراض کے جواب میں اساتذہ کے کلام سے دس بارہ شعر سند کے طور پر پیش کر دیے۔

وحشت صاحب محبت و محروم کا مجسمہ تھے۔ وہ کوئی ایسا کام کرنے یا کوئی ایسی بات کہنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے جس سے کسی کی دل آزاری یا دل شکنی ہو۔ انھیں دوسروں کا پاس خاطر اس حد تک عزیز تھا کہ وہ دوسروں کی ”خوشی خاطر“ سب کچھ گوارا کر لیتے اور بھگتے کو طیارہ رہتے۔ جب ان کا مجموعہ کلام ”ترانہ وحشت“ شائع ہوا تو میں نے ان سے کہا کہ مولانا! مجھے اس کتاب کا نام کچھ زیادہ پسند نہیں آیا۔ کہنے لگے۔ خود مجھے بھی یہ نام کچھ زیادہ پسند نہیں۔ لیکن میں کیا کروں۔ یہ نام فلاں صاحب نے انتخاب کیا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ یہی نام رکھا جائے۔ یہ بات سن کر میں دم بخود رہ گیا۔ یہ کتنا بڑا ایثار تھا کہ جو چیز قیامت تک ان کے نام سے وابستہ رہے گی اس کا نام رکھنے میں انھوں نے کسی اور کی پسند کو اپنی پسند پر ترجیح دی۔

وحشت صاحب کی بعض خوبیاں ایسی ہی تھیں کہ ان کی تعریف ہر شخص کرے گا لیکن انھیں اپنانے کے لئے طیار کوئی بھی نہ ہوگا۔ معمولی سے معمولی رسالہ اور گھٹیا سے گھٹیا اخبار بھی ان سے عزت مانگ سکتا تو وہ اسے مایوس نہ کرتے۔ صرف اس لئے کہ کسی کو یوں کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کی سیرت کے اس پہلو کی عظمت کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ گھٹیا رسالوں اخباروں میں اپنے جگر پاروں کو دیکھ کر فن کار کے دل پر کیا گزرتی ہے۔

وحشت صاحب کبھی ان توقعات کو سمجھنے اور پورا کرنے سے پہلو ہی کرتے نہیں پائے گئے جو لفظوں میں ظاہر نہیں کی جاتیں بلکہ جو کسی خاص موقع محل کا تقاضا بن کر ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً کسی عزیز یا دوست کی شادی یا کسی کامیابی کے موقع پر شاعر سے یہ توقع واجبہ ہوتی ہے کہ وہ اس تقریب میں سہرا یا مبارکباد کا قطعہ ضرور پڑھے گا۔ یہ توقع جس قدر عام ہے شاعر کے لئے اتنی ہی کوفت انگیز بھی ہے بسا اوقات شعرا حضرات اپنے عزیز اور دوست کی فرمائش اور اصرار کے باوجود کچھ لکھ کر نہیں لاتے۔ لیکن میں نے وحشت صاحب کو ایسے موقعوں پر ایسے موقعوں کے تقاضے کو اپنے دل سے پورا کرتے دیکھا۔ ان کے مجموعہ کلام ”ترانہ وحشت“ میں بھی ایسے اشعار اور قطعات کی تعداد خاصی ہے جو خاص تقریبات کے لئے کہے گئے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ”خیال خاطر احباب“ ان کی شخصیت کا کتنا اہم جزو تھا۔

مرحوم کی سیرت کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے دوستوں اور شاگردوں کے دکھ درد میں اسی دل سوزی سے شریک ہوتے جو قریب ترین رشتہ داروں کا حصہ ہوا کرتی ہے۔ ڈھاکہ میں ان کے دو شاگرد پروفیسر عبدالقیوم حسرت نعمانی اور قمر صدیقی کا انتقال ہوا اس زمانہ میں وحشت صاحب سے میری ملاقات بہت کم ہوا کرتی تھی۔ لیکن میں نے بعض معتبر لوگوں سے سنا کہ مولانا کی موجودگی میں جب کہیں اور جہاں کہیں حسرت نعمانی یا قمر صدیقی کا ذکر آجاتا ہے وہ آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔

اگرچہ مولانا پڑھانے لوگوں میں سے تھے پھر بھی ان کے مزاج میں مذہبیت کو کوئی خاص دخل نہ تھا۔ میں نے انھیں عام بوڑھے مسلمانوں کی طرح گفتگو میں اسلام کا قصیدہ یا مسلمانوں کا مشربہ پڑھتے کبھی نہیں سنا، ہندو مسلم تنازع یا تعلقات کے متعلق بھی کبھی کوئی فقرہ ان کی زبان سے سننے میں نہیں آیا۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں وہ نماز کے بھی پابند نہ تھے۔ مگر انھیں آنحضرتؐ سے دلی شفقتی ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ ہر سال ایک مرتبہ اپنے یہاں محفل میلاد منعقد کرتے جس میں میلاد کے رسمی خطبے کے بعد اپنی لکھی ہوئی نعتیہ غزلیں پڑھتے یا کسی سے پڑھواتے۔ محفل میلاد میں شرکت کے لئے وہ اپنے احباب اور تلامذہ کے نام دعوت نامے بھیجتے تھے۔ اس دعوت نامے کا مضمون ہمیشہ ایک ہی ہوتا۔ جب تک قوی نے ساتھ دیا وہ دعوت نامے اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجتے رہے۔ بعد میں چھپا ہوا دعوت نامہ بھیجنے لگے۔ جب مجھے پہلی مرتبہ محفل میلاد میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تو حیرت ہوئی کہ انھیں میرا پتہ کیونکر معلوم ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد خیال آیا کہ ان کے ڈھاکہ آنے سے قبل میرے ان کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی تھی اسی زمانہ سے میرا پتہ ان کے پاس محفوظ تھا۔ مولانا کی یہ بڑی خصوصیت تھی کہ وہ جس سے ایک بار مل جیتے اسے کبھی نہ بھولتے اور جس کا پتہ ایک مرتبہ دریافت یا درج کر لیتے اسے ہمیشہ محفوظ رکھتے وحشت صاحب مشرقی تہذیب و تمدن کے آدر دہ و پیر در دہ تھے۔ لیکن ان میں اصول پرستی اور انضباط پسندی (Discipline) اہل مغرب کی سی تھی۔ میرے ایک دوست جو کلکتہ میں ان کے ہم محلہ رہ چکے ہیں ان کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں وحشت صاحب اسلام کالج کلکتہ میں آ رہے تھے ان کا معمول یہ تھا کہ ہر روز کالج جانے کے لئے وہ اس ٹرام (Tram) پر آ جاتے جو ہمارے دوست کے مکان کے بالمقابل تھا۔ لیکن اگر ٹرام کے دروازے پر دو آدمی بھی کھڑے رہتے تو وہ اس پر سوار نہ ہوتے خواہ ٹرام کے اندر ایک سے زیادہ سیٹ کیوں نہ ہو۔ انھیں یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ وہ دروازے پر کھڑے رہنے والوں کو زحمت دے کر ٹرام میں داخل ہوں چنانچہ انھیں ہر روز کئی ٹرام چھوڑ دینا پڑتی اور کافی دیر تک کھڑے رہنا پڑتا۔

اپنی تعریف اور دوسروں کی شکایت انسانی فطرت کی عام کمزوری ہے۔ لیکن میں نے وحشت صاحب کو اپنی تعریف اور دوسروں کی شکایت کرتے کبھی نہیں پایا۔ انھیں کسی سے اپنا دکھ درد تک بیان کرنے کی عادت نہ تھی۔ گزشتہ دو تین سال کے اندر جب کہ ان کی صحت بہت مضبوط ہو چکی تھی۔ میں جب کبھی ملا اور ملنے وقت میں نے پوچھا کہ مولانا! مزاج کیسا ہے تو انھوں نے ایک حزیں تبسم کے ساتھ یہ کہہ کر کہ اب مزاج کیا پوچھتے ہیں موضوع گفتگو بدل ڈالا۔ ان کی زندگی کا آخری سال بہت سخت گزرا۔ ذیابیطس کے پرانے مرض نے مرض کے علاوہ اور قوی کے بڑھتے ہوئے فصحلال نے انھیں نہ صرف چلنے پھرنے سے معذور کر دیا تھا بلکہ صاحب فراموش بنا کر رکھ دیا تھا۔ ایک سال تک بستر پر پڑے پڑے شانے چھل گئے۔ اس دوران میں ایک مرتبہ وہ میڈیکل کالج ڈھاکہ میں بھی داخل کئے گئے۔ لیکن مالی وقتوں کی بنا پر وہاں دو تین ہفتے سے زیادہ نہ رہ سکے۔ یہ بڑی اذیت ناک بات ہے کہ ان کے خاندان ان کے احباب اور ان کے تلامذہ میں صاحب استطاعت لوگ موجود۔ لیکن کوئی ان کے کام نہ آیا۔ انھوں نے کسی سے اس بات کی شکایت تک نہیں کی۔ یہ ان کا ظرف تھا۔

گزشتہ ایک سال کے دوران میں میں ان کی خدمت میں صرف دو مرتبہ حاضر ہوا۔ اس کے قبل ان کے بعض احباب و تلامذہ سے سن چکا تھا کہ اب کوئی ان سے ملنے جاتا ہے تو بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ میں ایسے مناظر سے ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں کیونکہ ایسے مواقع پر میری زبان گنگ ہو جاتی ہے اور الفاظ میرا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے مواقع پر بعض مصیبت زدہ کی تسکین دہلی کے لئے جو کچھ کہا جاتا ہے اس کی حیثیت میرے نزدیک ”مہذب جھوٹ“ سے زیادہ نہیں اور مجھ میں ”مہذب جھوٹ“ ہونے کی صلاحیت بالکل نہیں۔ اس بنا پر میرا دل چاہا کہ اب وحشت صاحب سے نہ ملوں تو بہتر۔ لیکن پھر خیال آیا کہ میں وحشت صاحب کے مقررین میں سے نہیں۔ لہذا مجھے دیکھ کر وہ ہرگز آبدیرہ نہ ہوں گے۔ چنانچہ ایک دن شام کو میں ان کے یہاں جا پہنچا۔ بندہ کمرے کے کردہ میں گیا۔ میں نے سلام کیا تو جواب میں صرف ان کے لب بٹے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس کے بعد وہ چادر سے اپنے ایک ہاتھ

نکلنے کی کوشش کرنے لگے جیسے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھانا چاہتے ہوں۔ میں ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پلنگ سے لگی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس دن مولانا کے ضعف کا یہ عالم تھا کہ اس قدر قریب بیٹھنے کے باوجود ان کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ جب میں نے پوچھا کہ مولانا اس وقت آپ کے جسم میں کوئی خاص تکلیف تو نہیں، تو جواب میں یہ کہہ کر کہ کون سی تکلیف ہے جو میں برداشت نہیں کر رہا ہوں، آبدیدہ ہو گئے میں دل میں سخت نادم ہوا کہ ان سے کتنا احمقانہ سوال کر گیا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مولانا سے کیا بات کروں۔ کچھ دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کو خاموش دیکھتے رہے۔ اب یاد نہیں کہ میں کن الفاظ کے ساتھ ان سے رخصت ہوا۔ مولانا کے ایک صاحبزادے علی امام ہمارے کالج میں انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ دوسرے یا تیسرے دن ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہ ابا تمھاری بڑی تعریف کر رہے تھے کہ میری عیادت کے لئے آئے۔ میں یہ تعریف سن کر نہایت شرمندہ ہوا کہ میں نے عیادت میں اتنی تاخیر کی۔ مجھے اوبھلا جانا چاہئے تھا اور کئی بار جانا چاہئے تھا اور ایسا سوال ہرگز نہ کرنا چاہئے تھا جو ان کے آسنوؤں کا محرک ہو۔ تعجب ہے کہ مولانا نے اتنی کوتاہیوں کے باوجود میرے اخلاق کے مداح ہیں۔ دراصل یہ ان کی بلند اخلاقی ہے اور بس۔

اس واقعہ کے دو ایک مہینے کے بعد بعض احباب کے ساتھ میں پھر ان کی عیادت کو گیا۔ اس مرتبہ ضعف نسبتاً کچھ آدازہ قدرے صاف سنائی دیتی تھی۔ ہم لوگ ان کی تکلیف کے خیال سے پانچ منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔ اب کی عیادت میں تیسرے دن میں ان کے محلہ میں ایک شخص سے ملنے گیا۔ واپسی میں جی چاہا کہ پھر ایک مرتبہ مولانا سے مل لوں۔ چنانچہ ان۔۔۔ فلیٹ پر چلا گیا۔ لیکن دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے خیال آیا کہ ان سے ملنا ایک اذیت ناک صورت سامنا کرنے کے برابر ہے۔ لہذا آج رہنے دو۔ پھر کسی دن سہی۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ دن آئے، خبر آئی کہ مولانا وہاں پہلے جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا کرتا۔

مولانا سے عقیدت اور محبت رکھنے والوں کے لئے ان کی تدفین کا منظر بھی کچھ کم دل خراش نہ تھا۔ ہر سات کے موسم میں عظیم پورہ قبرستان کا ایک تہائی حصہ خراب ہو جاتا ہے۔ اور ساری زمین اس درجہ نرم ہو جاتی ہے کہ ایک دو ہاتھ کھودنے پر پانی نکل آتا ہے۔ چنانچہ مولانا کی قبر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اگرچہ ان کے جنازے کو پانی میں رکھنے کی بجائے کھلے کے تنوں پر رکھا گیا۔ لیکن قبل اس کے کہ قبر بند کی جائے کھلے کے تنے اور جنازے کا پھیلا دھڑپانی میں ڈوب چکا تھا۔ روح کے پرواز کر جانے کے بعد خالی غولی جسم کی کیا قیمت۔ پھر بھی اس صورت حال کو دیکھ کر دل کو سخت چوٹ لگی اور کئی دنوں تک یہ اذیت ناک منظر میرے ذہن پر طاری رہا۔

وحشت صاحب کی وفات سے دو ایک مہینے قبل ان کے ایک شاگرد عابد دانا پوری جو حکومت مشرقی پاکستان میں ایک معمولی عہدے پر ملازم ہیں انہوں نے وحشت صاحب کے نام سرکاری وظیفہ جاری کرانے کے لئے سلسلہ جنبانی شروع کی۔ ان کی مسلسل کوششوں کی بدولت حکومت مشرقی پاکستان وحشت صاحب کو وظیفہ دینے پر آمادہ ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی وظیفہ کے اجرا کا مسئلہ دفتری کارروائی کی آخری منزل سے گزر رہا تھا کہ خود وحشت صاحب کی زندگی کی آخری منزل آگئی۔ مرحوم کے جنازے میں جو لوگ شریک تھے ان میں سے بعض جذبات کی رو میں آکر یہ شکایت کر رہے تھے کہ ہماری حکومت ادیبوں اور شاعروں کے حقوق سے کس درجہ غافل واقع ہوئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حکومت کو ادیبوں اور شاعروں کے حقوق سے غافل کی بجائے ناواقف کہنا بہتر ہوگا۔ آج جو لوگ اور جس قسم کے لوگ برسرِ اقتدار ہیں وہ شعر و ادب کی قدر و قیمت کیا جانیں۔ ابھی تو ہماری قوم اور ہمارے ادب حکومت کو جذب قوموں سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ کرکٹ کی سرپرستی سے کھینچنے کی ابتدا ہو چکی ہے۔

آج ادیبوں اور شاعروں کی موت ہماری تہذیبی ہمتیوں کے احساس کا ذریعہ بن گئی ہے۔ جب کوئی ادیب یا شاعر مرتا ہے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمارا 'ادب اور آرٹ' ہمارے ادیب اور آرٹسٹ قوم اور حکومت کی کتنی بے التفاتیوں کے شکار رہا ہے۔

اے بے انتہائیوں کے پیش نظر ہم برہم بھی ہوتے ہیں اور بیزار بھی۔ غلین بھی اور غضبناک بھی۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں دس فیصدی لوگ نام نہاد تعلیم یافتہ ہوں، اور نوے فیصدی جاہل محض اور جن کے جاہل محض رہنے میں برسرِ اقتدار طبقے کا مفاد پوشیدہ ہو وہاں شعروادب کی سماجی قدر شناسی اور سرکاری سرپرستی کیونکر ممکن ہے؟

بنگال کے اردو شاعری میں وحشت صاحب کی حیثیت وہی ہے جو بہار میں شاد عظیم آبادی کی اور پنجاب میں اقبال کی ہے جس طرح بہار اور پنجاب کے اردو شاعروں میں سب سے نمایاں نام شاد اور اقبال کا ہے اسی طرح بنگال کے اردو شاعروں میں سب سے ممتاز نام وحشت صاحب کا ہے۔

وحشت صاحب نے صرف اردو ہی میں نہیں فارسی میں بھی شاعری کی ہے۔ ایسی شاعری جس کی داد اقبال جیسے شاعر نے دی ہے۔ انھوں نے صرف شاعری ہی نہیں کی مضامین بھی لکھے ہیں۔ اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی۔ انھیں انگریزی زبان پر بھی غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی اردو شاعری ہی ہے۔

یہاں ان کی اردو شاعری سے میری مراد ان کی غزلوں سے ہے۔ ویسے انھوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ رباعیاں بھی کہی ہیں۔ لیکن نظم نگاری سے ان کی طبیعت کو کوئی خاص مناسبت نہ تھی اور رباعی کی طرف انھوں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔

بڑی عجیب بات ہے کہ جہاں ایک طرف وحشت صاحب کو حالی، شبلی، اقبال، حسرت موہانی، نظم طباطبائی، اکبر الہ آبادی، ظہیر دہلوی، صفی لکھنوی، ظفر علی خاں اور نیاز فتح پوری جیسے مشاہیر ادب نے خراج تحسین پیش کیا وہاں دوسری طرف بیسویں صدی کے ممتاز نقادوں میں سے کسی ایک نے بھی ان کی شاعری پر کوئی مستقل مضمون نہیں لکھا۔ یہ بڑی المناک بات ہے کہ کوئی شخص شعروادب کی خدمت میں ساری زندگی گزار دے لیکن اس کے باوجود وہ ملک کے ممتاز نقادوں کی توجہ سے محروم گزر جائے۔

وحشت صاحب کی زندگی میں ان کے بعض "نماز مندوں" نے ان پر مضامین ضرور لکھے لیکن ان کی تنقیدی حیثیت مشتبہ ہے۔ وحشت صاحب سے متعلق اگر کوئی تنقیدی مضمون میری نظر سے گزرا ہے تو وہ آشد کا کوئی کا ہے۔ اگرچہ ان کا مضمون بھی جامع نہیں لیکن انھوں نے وحشت صاحب کی شاعری کے جن پہلوؤں پر جو باتیں کہی ہیں وہ بڑی جچی تلی ہیں۔ ان سے اختلاف کرنا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

کسی شاعر کو سمجھنے اور پرکھنے میں شعرو سخن کے متعلق اس کے تصورات و نظریات سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اس باب میں وحشت صاحب کے تصورات و نظریات نے کبھی کسی مضمون کی شکل تو اختیار نہیں کی لیکن ان کے متعدد مقطع اور بعض اشعار ان کے شعری تصورات و نظریات کی نمایندگی ضرور کرتے ہیں۔ اپنی غزل گوئی کے سلسلہ میں انھوں نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ وہ "طرز کہن" کے دلدادہ ہیں اور غزل کا لطف طرز کہن ہی سے وابستہ ہے۔

دلدادہ ہوں میں شعر میں طرزِ قدیم کا قائم ہے سر میں نشہٴ حسام کہن ہنوز

طرزِ جدید میں ہے وہی شیوہٴ قدیم بھرتے ہیں جامِ نو کو شرابِ کہن سے ہم

غزل کا لطف ہے وابستہٴ طرزِ کہن وحشت خیالِ خاطر اصحابِ جدت آشنا کب تک

تنقیدی نقطہٴ نظر سے "طرز کہن" ایک مبہم لفظ ہے اور اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ "طرز کہن" سے وحشت صاحب کا مقصود کیا ہے۔ اور اصحابِ جدت آشنا سے ان کا اشارہ کن شاعروں اور کن جدت طرازیوں کی طرف ہے۔ لیکن جب اشعار پر نظر پڑتی ہے

ہے حرفِ حرفِ اس کی غزل کا حدیثِ شوق خوش ہیں کلامِ وحشت شیوہٴ ہیاں سے ہم

نیازِ عشق و نیازِ حسن کا دلکش ہے افسانہ وہی اک داستانِ دہرائی جاتی ہے زمانہ میں

اور ہی ٹھہرا ہے دشت اب تو معیار سخن علم فن کا تھا تجھے دعویٰ وہ باطل ہو گیا

تو پتہ چلتا ہے کہ ”طرز کہن“ سے ان کی مراد یہ ہے کہ غزل کا موضوع صرف ”حدیث عشق“ ہو۔ وہ ”نیا ز عشق“ اور ”ناز حسن“ کے افسانوں سے آگے نہ بڑھے۔ یعنی اس میں سماجی اور سیاسی حقائق کو راہ نہ دی جائے۔ اور بہان میں سحت و صنعت کا غلط کار کھا جائے کہا جا سکتا ہے کہ اگر ”طرز کہن“ سے دشت صاحب کا مفہوم یہی ہے تو انھوں نے غزل کے قدیم سرمائے کے ساتھ کچھ انصاف نہیں کیا کیونکہ ”قدیم غزل“ بھی سماجی اور سیاسی حقائق سے خالی نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو غزل کا کوئی دور یا کوئی شاعر ایسا نہیں جس نے اپنے آپ کو صرف حسن و عشق کے دائرے میں بند کر لیا ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ اردو غزل میں سماجی اور سیاسی حقائق کے بیان کو جواہریت اور مقبولیت بیسویں صدی میں حاصل ہوئی وہ اس سے پہلے حاصل نہ تھی۔ انیسویں صدی کے آخر تک بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک غزل کا غالب موضوع حسن و عشق ہی تھا۔ خود دشت صاحب نے جس زمانے میں شاعری شروع کی وہ زمانہ عبارت تھا ان لوگوں کی شاعری سے جس کی شاعری زندگی اور زمانہ کے مطالبات سے قطعاً بیگانہ تھی۔ میری مراد داغ، امیر اور جلال سے ہے۔ یہاں میں سرید کی تحریک اور حالی کے وجود سے انکار نہیں کر رہا ہوں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس وقت کی دنیا کی شاعری میں جو آوازیں سب سے زیادہ مقبول تھیں وہ ان ہی تین شاعروں کی آوازیں تھیں۔ دشت صاحب پر اگرچہ غالب کا جادو چل چکا تھا پھر بھی وہ داغ، امیر اور جلال کے اثر سے بچ سکے۔ یہ اور بات کہ وہ اپنے آپ کو ان شاعروں کی اغزشوں سے بڑی حد تک بچائے گئے۔

دشت صاحب پر داغ کی گرفت بہت مضبوط رہی ہے۔ اتنی مضبوط کہ آج سے چند سال قبل جب میں نے ان سے سوال کیا تھا کہ آپ کے نزدیک غزل کے اعتبار سے میر کے بعد سب سے بڑا شاعر کون ہے تو انھوں نے جواب میں داغ ہی کا نام لیا تھا۔ داغ سے انھیں بڑی بڑی عقیدت تھی جس کا اظہار انھوں نے ایک شعر ہی میں کیا ہے

میں تو ہوں معتقد داغ غزل میں دشت

جس کی ہر بات ہم آہنگ اثر ہوتی ہے

غالب کے پرستار ہونے کے باوجود داغ سے ایسی عقیدت یقیناً حیرت انگیز ہے۔ لیکن دشت صاحب کے یہاں داغ کا اثر کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ کم از کم ”دیوان دشت“ میں غالب کے پہنچے پہلو داغ بھی، دہوہ گز نظر آتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھتے چلیے۔

جان اس کی اداؤں پہ نکلتی ہی رہے گی	یہ چھپر جو چلتی ہے سو چلتی ہی رہے گی
ظالم کی تو عادت ہے سستاتا ہی رہے گا	اپنی بھی طبیعت ہے بہلتی ہی رہے گی
دل رشک، عداوت سے ہے سپرد سر آتش	یہ شمع تری بزم میں جلتی ہی رہے گی
عمرہ ترا دھوکا یو نہیں دیتا ہی رہے گا	تلوار ترس کوچہ میں پہلتی ہی رہے گی
اگر آں پیر وہ کچھ نہیں تو اک آن میں کچھ ہیں	کروٹ مری تقدیر بدلتی ہی رہے گی
انہاں میں، شوخی میں، شرارت میں، سیما میں	واں ایک سال بات نکلتی ہی رہے گی
دیکھ کر مجھ کو جو وہ سال ما جان گئے	جی کے اراد دل بیتا کے قربان گئے
بے قرار سی طبیعت، کو لگی رہتی ہے	کس کی شوخی کے دل و دیں مے قربان گئے
”ابہ گفت“ تمنا کا پہنچنا معنوم،	ہر ترسے ہو رنق نفس کی روش بان گئے
اس لڑن بھی ہو عنایت کی نظر سے ساقی	بہم بھی اک بار کہیں ”لا نرب قربان گئے“
ربا اغیار سے تیرا کسے آتا ہوتا یقین	ہم تو کب ماننے والے تھے مگر مان گئے
شوخی عشق کہ ہم ہو گئے رسوائے جہاں	خوبی حسن کہ سب آپ کو پہچان گئے

پڑا مال لے کر آپ نے کی بے رنجی اچھی بغل میں لے کے دل چلتے ہوئے تھی دل لگی اچھی  
 عیادت کے بھیجا ہے میرے پاس دشمن کو نکالی ہے دوا عالم نے میرے درد کی اچھی  
 نہ آفت دوستوں سے ہے نہ دشمن سے عداوت نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی  
 بلا قصیر مجھ سے کہنی گئے یہ بانگین اچھا عدو سے بے تکلف مل گئے یہ سادگی اچھی  
 مجھ سے رکھتے وہ خاک کیا اخلاص غیر سے بھی انھیں نہ سخت اخلاص  
 وہ کئی لفظ جانتے ہی نہیں مہر، الفت، کرم، وفا اخلاص  
 غیر پر بھی جتا رہے تھے آج ہم نے دیکھا ہے آپ کا اخلاص  
 بچپن کے دن تیرے، تو گزرتے تھے میرے ساتھ اب کس کے ساتھ کشتی ہیں راتیں شباب کی

ان اشعار میں جو "دیوانِ وحشت" سے نقل کئے گئے ہیں، غالب اور داغ کی پرچیاں ایک دوسرے سے ٹکراتی نظر آ رہی ہیں۔ "دیوانِ وحشت" کے بعد کے کلام میں داغ کا کوئی مستقل اثر تو نہیں ملتا لیکن کہیں کہیں جھلک ضرور ملتی ہے مثلاً ترانہٴ وحشت کے ان اشعار کی سادگی شوخی اور طرزِ ادا کے بارے میں آپ کیا کہیں گے۔

روزِ حساب ڈر ہو مجھ کیا حساب کا میرا حساب کیوں ہو میں ہوں کس حساب میں  
 اسے زاہد اپنے نفس پر اتنا بھی جبر کیا مگر ثواب نے تجھے ڈالا عذاب میں  
 ہنسنے کی عرض حال پر میرے سہی نہیں دل کی لگی کا ذکر ہے یہ دل لگی نہیں  
 وہ بزمِ عیش میں بیٹھے ہیں ان کو یاد کہاں کہ مجھ سے دور کوئی میرا بے قرار بھی ہے  
 ہاں ہاں یہی ہے رسمِ ترا کیا تصور ہے دل کو چراگے آنکھ چرا نا ضرور ہے  
 کیا ہے کہ آج پنتے ہو گزرا کے راہ سے دیکھو ادھر نگاہ ملا کر نگاہ سے  
 چویش ہوں برابر کی نہ یہ کم ہے نہ وہ کم معنی ہے جواب اس کی جفا میری وفا کا  
 آج کچھ آفتِ ٹپکتی ہے نگاہِ یار سے ہائے کیا لذت چپکتی ہے نگاہِ یار سے  
 جانے کی جھلکتی ٹپکتی ہے نگاہِ یار سے آتے ہی زحمت ٹپکتی ہے نگاہِ یار سے

داغ کے زمانہ میں داغ کے بعد جن شاعروں کی بڑی دھوم تھی وہ امیر اور جلال ہیں۔ جیسا کہ "ترانہٴ وحشت" میں خود وحشت صاحب نے ایک جگہ اعتراف کیا ہے وہ قدرتی طور پر ان شاعروں کے رنگِ کلام سے متاثر تھے۔ لیکن ان کی شاعری میں امیر اور جلال کے اثرات کی الگ الگ نشاندہی آسان نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وحشت صاحب پر امیر اور جلال انفرادی طور پر اثر انداز نہ ہوئے بلکہ ان پر کسی حد تک وہ چیز اثر انداز ہوئی جسے ہم کھنویت کہتے ہیں۔ چنانچہ اس کھنویت کے اثر سے ان کے یہاں رعایتِ لفظی جنازہ سرمہ اور شانہ سے متعلق اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ مگر ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ وحشت صاحب پر کھنویت کا کوئی خاص اثر نہیں تو غلط نہ ہوگا۔ بہر حال اس رنگ کے چند شعر دیکھ لیجئے۔

آئے تو اور جنازے میں بھی ہو گئے شریک ہاں بندہ پرورد آپ کا وعدہ وفا ہوا  
 خیال کچھ تو کرب اسے تیغِ یار تو میرا ہوا ہو نہ پئے تو پئے ہو مسیرا  
 کون حیرتِ حسن آرائش کا دیوانہ ہوا آنکھ میں سرمہ لگا، بالوں میں بھی شانہ ہوا  
 نقدِ دل کی کیا حقیقت تھو، دکانِ حسن میں بن گیا سوداگر ان زلفوں کا سودا ہو گیا  
 شانہ عشق کیسے پڑیج میں ہے سینہ چاک سرمہ مفتون نگاہِ فتنہ ساماں ہو گیا

خاک میں کس دن طاقی ہے مجھے، اس سے لئے کی تمنا دیکھئے  
آنکھوں میں اس نے سرمہ لگایا نہیں بنوڑ اور دل کا شکار غمزدہ مردم شکار ہے  
بنی ہے بات یہ کس کی کہ اب اپنی بگڑتی ہو چڑھا ہے کون نظروں میں جو عالم ہم اترتے ہیں

دشت صاحب نے اپنے مقطعوں میں جن شاعروں سے متاثر ہونے کا اعتراف کیا ہے ان میں غالب اور داغ کے علاوہ  
عرفی، فانی، ظہوری اور میر بھی ہیں۔ علاوہ انہیں ارشد کا کسی نے ان کے کلام پر مومن کے اثر کی مثالیں دی ہیں اور اقبال عظیم  
نے دشت صاحب کا ذوق سے بھی متاثر بتا دیا ہے۔ مجھے دشت صاحب پر ذوق کا اثر اتنا ہی نظر آتا ہے کہ ذوق کی طرح دشت  
صاحب کے یہاں بھی اخلاقی مضامین نے ایسے شعری شکل اختیار کر لی ہے جنہیں اخلاقاً شعر کہا جاسکتا ہے اور بس۔

دشت صاحب کے باب میں اثرات کی فہرست جتنی بھی طویل ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ ان پر غالب اور غالب ہی کا ہے۔ غالب  
سے اردو کے اور بھی کئی شعراء متاثر ہوئے ہیں جو دشت صاحب کے ہم عصر تھے۔ مثلاً عزیز لکھنوی، وفادام پوری، حسرت موہانی  
اقبال، فانی بدایونی اور اثر لکھنوی وغیرہ۔ اس بنا پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دشت صاحب کی غالب پرستی کوئی خاصہ خصوصیت  
نہیں بلکہ اردو شاعری کی تاریخ کا ایک اہم میلان ہے۔ اس میلان کے بہت سے محرکات ہوں گے لیکن ان میں جو بات مجھے سب سے  
نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ داغ اور امیر کی شاعری کے رد عمل نے غالب پرستی کی شکل اختیار کی اور یہی غالب پرستی جدید غزل کا  
سنگ بنادہی۔ یہ بات میں اس بنا پر کہہ رہا ہوں کہ ابھی جن غالب پرستوں کے نام لئے گئے ہیں وہ سب کے سب جدید غزل کے معمار  
کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی نے بھی اس جدید غزل کو نہیں اپنایا جس کی ابتدا حالی کی اس قسم کی غزلوں سے ہوئی تھی۔

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھانکے چھوڑا جس گھر سے سراٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا

دیکھ اسے امید کیجو ہم سے نہ تو کنا را تیرا ہی رہ گیا ہے لے دے کے اک سہارا

سمن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا یہ دفتر کسی دن ڈھونا پڑے گا

حالی کی اس قسم کی غزلیں داغ اور امیر کی شاعری کا رد عمل اتنا نہیں جتنا کہ وہ ایک بڑی معاشرتی اور تہذیبی تحریک  
یعنی سرسید تحریک کا منطقی نتیجہ ہیں۔ داغ اور امیر کی سطحی شاعری کا رد عمل شاعری میں جس بلندی اور گہرائی کا تقاضی تھا وہ بلند  
اور گہرائی تقریباً بعد شاعروں میں غالب کے سوا اور کہاں مل سکتی تھی۔ پھر چونکہ اس زمانے کے لوگوں کے لئے غالب کا رنگ حالی  
جدید رنگ سے زیادہ انوس تھا اس لئے نفساقتی طور پر داغ اور امیر کے رنگ سے بغاوت کرنے والوں کے لئے غالب کی کشش اور  
بھی بڑھ گئی۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ جدید غزل کی ابتدا غالب پرستی سے ہوئی۔

غالب سے متاثر ہونے والوں پر غالب کا اثر کس کس شکل میں نمودار ہوا ہے یہ ایک ایسا سوال ہے جو اپنے جواب کے لئے ایک  
مستقل مضمون چاہتا ہے۔ چونکہ غالب کی شاعری بہت پہلو دار واقع ہوئی ہے اس لئے غالب سے متاثر ہونے والے اپنے اپنے ذہن  
و ذوق کے مطابق ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔ آل احمد سرور نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اقبال اور غالب  
غالب سے متاثر ہوئے۔ "اباں نے غالب کی شعاعی کو اختیار کر لیا۔ فانی نے غالب کے اسلوب فکر کو۔ اس قسم کا امتیازی فرق وہ  
غالب پرستوں کے درمیان بھی دکھایا جاسکتا ہے لیکن یہاں چننا اس کی ضرورت نہیں کیونکہ ان صفحات میں گفتگو صرف دشت صاحب  
کی شاعری سے ہے۔ مجھے دشت صاحب اور دوسرے غالب پرستوں میں سب سے بڑا فرق جو نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ دشت صاحب  
کے لئے غالب (obedience) کی حیثیت رکھتے ہیں اور دوسرے غالب پرستوں کے لئے اثر (influence) کی حیثیت رکھتی ہے۔  
دشت صاحب نے غالب سے استفادہ کم کیا۔ ان کی تقلید زیادہ کی۔ انہوں نے غالب کی تقلید کو اپنی شاعری کا نصب العین  
بنالیا۔ دشت ہمیں متبع غالب ہے آرزو"

بقول ارشد کا کوئی۔ ”دشتِ صاحب کے تمام کلام کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں جس بات کی سب سے زیادہ خواہش اور کوشش کی وہ یہی کہ لوگ انھیں ”غالبِ دوہاں“ مان لیں۔ اپنے آپ کو غالبِ دوہاں منوانے کے لئے انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو ان کے پس میں تھا۔ انھوں نے غالب کی زمینوں میں غزلیں کہیں، غالب کی طرح فارسی الفاظ و ترکیب سے آراستہ زبان استعمال کی، بیان میں غالب کی سی جدت اور ندرت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ کلام میں ”تماثلِ ترکیب“ کا اہتمام کیا۔ کہیں غالب کے مضامین کو اپنایا اور کہیں غالب کے سے مضامین پیدا کئے۔ ان کاوشوں کا حاصل یہ نکلا کہ دشتِ صاحب اور غالب میں وہ ظاہری مشابہت ضرور پیدا ہو گئی جو دوسرے غالب پرستوں کو نصیب نہ ہو سکی۔ مگر دشتِ صاحب کے مندرجہ ذیل اشعار غالب کے اشعار میں ملا دئے جائیں تو یہ پہچانا دشوار ہو گا کہ کون سا شعر کس کا ہے۔

ہوں میں اک شمع کہ ہے منتظر موجہ باد	دیکھئے کب وہ عنایت کی نظر کرتے ہیں
لذتِ عشق ہے وابستہ بے مہرئی دوست	حیف ان نالوں پہ جو دل میں اثر کرتے ہیں
وضع نادائی اربابِ محبت ہے ہے	خشک ہوتا ہے جگر چشم جو ترکہ کرتے ہیں
بگڑنا گئی خویش و بگڑتی دہر	ہوں میں وہ جس کوئی جس کا خریدار نہیں
کچھ اگر ہے تو ہے دل جوئی دشمن کا گلہ	ورنہ کچھ شکوہ بے مہرئی دل دار نہیں
حسن ! یہ تیرے کمرے میں کہ بائیں ہمہ شوق	طاقت دید نہیں، قوت گفتار نہیں
چاہتے ہو کہ میں پھر کھاؤں فریبِ غم	لب پہ اقرار کہاں ہے اگر انکار نہیں
جس کا سہ ہوں جو رد کردہ بازار ہوں میں	کوئی نے جلے مجھے میرے خریدار کے پاس
دل گو رہا ہے وقت ستم ہائے روزگار	روش ہے داغِ عشق سے یہ آنجن ہنوز
وہ دل کہ تھا حرفِ ستم ہائے روزگار	آخر کو پائمال غم یار ہو گیا
آہ اس آہ کو کہئے جو لب تک نہ گئی	داغ اس داغ کو کہئے جو نمایاں نہ ہوا
سبب عار ہے وہ چشم کہ گریاں نہ ہوئی	باعثِ ننگ ہے وہ زخم کہ خنداں نہ ہوا
چلتا رہا ہمیشہ میں اک طرزِ خاص پر	یعنی فریبِ غم دیر و حرم نہ تھا
اندھے دل فریبی اندازِ ضبطِ عشق	اک موجِ خوی تھی دل میں اور آنکھوں میں نم تھا
کون جانے کہ یہ کافر نظری کس کی ہے	خبر اتنی ہے کہ ثابت مرا ایماں نہ رہا
کیوں مجھ کو زخموں رفتہ کئے دیتی ہے یارب	وہ بوسے دل آویز کہ ہمدوش صبا ہے
ہاں ذوقِ ستم مرزدہ کہ وہ ہے سببِ آزار	سرگرم دل آزاری ار باپ وفا ہے
انکار اسے شہنشاہِ عرشِ نیاز سے	الزامِ مجھ پہ گریہ بے اختیار کا
تم وہ بیدرد کہ رونے کو گلہ کہتے ہو	ہم وہ مسکین کہ جفا کو بھی وفا کہتے ہیں
نظر آتی مبدل نور سے ظلمتِ زمانے کی	دلِ نابیک گر خود مایلِ صدق و صفا ہوتا

۱۔ ایک صنعت ہے جس میں تمام فقرے ایک ہی وزن کے ہوتے ہیں۔ مثلاً غالب کے یہ اشعار:

ادب ہے اور یہی گفتگو تو کیا کیجے	حیا ہے اور یہی کوگو تو کیا کہئے
حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجے	ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہئے

امیدیں خاک میں مل گئیں تیرے تغافل سے کوئی کیونکر حریف وعدہ صبر آزا ہوتا  
عرض نماز عشق سے غافل نہیں اس کی نظر ناز کمال حسن نے ہر چند اسے خود ہیں کیا  
وہ جنوں عشق میرا کہ جو بن گیا مصیبت وہ فسون حسن تیرا کہ جو ہو گیا فساد

یہ اور اس قسم کے اشعار کو دیکھ کر حالتی، ظہیر دہلوی اور شوق قدوائی نے دشت صاحب کو غالب ثانی ہونے کی سند دیدی اور  
بعد میں تمام لوگوں نے ان کی اس حیثیت کو تسلیم کر لیا۔ دشت صاحب کے اس کمال کا اعتراف کرتے وقت دو باتوں پر غور کرنا ضروری  
ہے۔ اول تو یہ کہ شعر و ادب میں تقلیدی کارناموں کی قدر و قیمت کیا ہے۔ دوم یہ کہ کسی بڑے ادیب یا بڑے شاعر کی مکمل تقلید  
یا اس کا ثانی بننا ممکن بھی ہے۔ اس بات کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ تقلید خواہ سو فی صدی کامیاب کیوں نہ ہو بہر حال وہ سر  
دہے کی چیز ہے۔ فریق گو رکھپوری نے بالکل صحیح کہا ہے کہ ”اس شاعر کا کلام قدر اول کی چیز نہیں ہو سکتا جو صاحب طرز نہیں۔  
جس میں انفرادی خلاقیت نہ ہو۔ جو ایک الگ شاعرانہ حیثیت نہ رکھتا ہو۔ حقیقی شاعر ایک نئے ذوق کی داغ بیل ڈالتا ہے ہلکے  
تھیم احساسات کو نئے طریقوں سے چمکاتا ہے۔ ہمارے شعور کے لئے ایک نیا سانچہ طیار کرتا ہے۔“ اس لحاظ سے اگر دیکھیں تو شاعری  
میں دشت صاحب کا سب سے بڑا کمال ان کی سب سے بڑی کمزوری بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادیب یا شاعر کا فرض اپنی شخصیت  
کی ترجمانی کرنا ہے نہ کہ دوسرے ادیب یا شاعر کی شخصیت کا ترجمہ۔ ایک شاعر دوسرے شاعر کی شخصیت کا ترجمہ کرنے میں کامیاب  
ہو بھی نہیں سکتا۔ تیر کے انداز پر بہتوں کا جی لہجایا اور بہتوں نے ان کی تقلید بھی کی۔ لیکن کامیابی کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ اس کی اصل  
وہ یہ نہیں کہ تیر اپنے مقلدوں سے بڑے شاعر تھے بلکہ یہ کہ تیر اور ان کے مقلدوں کی شخصیت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اگر  
خود تیر اپنے مقلدوں کی تقلید کرتے تو وہ بھی اتنے ہی ناکام رہتے جتنا ان کے مقلد ناکام رہے۔ تیر نے تقلید سے متعلق  
سارے مسائل کا حل ایک شعر میں پیش کر دیا ہے

ہم سے خوش زمزمہ کہاں یوں تو

لب و لہجہ ہزار رکھتے ہیں

تقلید کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہی ہے کہ ”لب و لہجہ ہزار“ رکھنے کے باوجود وہ شخصیت گرفت نہیں آتی جس کی  
تقلید کی جاتی ہے۔ غالب اور دشت صاحب کے کلام کی تمام تر مشابہتوں کے باوجود دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اس باب میں  
سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دشت صاحب نے غالب کے پرستار و پیرو ہونے کے باوجود غالب کو پورے طور پر پہچان  
ہی نہیں کیا۔ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ دشت صاحب غالب کی طرح پہلو دار شخصیت کے مالک نہ تھے۔ جو رنگارنگی غالب کی  
شخصیت میں پائی جاتی تھی وہ دشت صاحب کے یہاں نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ دشت صاحب کے یہاں وہ تنوع اور وسعت  
وہ گیرائی اور گہرائی نہیں ملتی جو غالب کے یہاں ملتی ہے۔ جیسا کہ شروع میں کہہ چکا ہوں دشت صاحب غزل میں طرز کہن  
کے دلدادہ تھے اور ان کے نزدیک ”طرز کہن“ کے معنی یہ تھے کہ غزل ”حدیث شوق“ تک محدود رہے۔ چنانچہ دشت صاحب  
کی شاعری کا محور نیاز عشق اور ناز حسن کے افسانے ہیں اور میں۔ ان کے یہاں زندگی کے دوسرے تجربات برائے نام ہیں۔  
ان کی شاعری میں زندگی اور زمانے کا وہ شعور نہیں ملتا جس نے غالب کو حیات و کائنات کا مبصر اور اپنے عہد کا ترجمان بنا  
دیا اور موضوعات کو تو جانے دیجئے خود حسن و عشق کی شاعری میں دشت صاحب کے یہاں وہ لطافتیں اور نزاکتیں، وہ نفسیاتی  
گہرائی اور تجرباتی مونگائی نہیں ملتی جو غالب کے یہاں نظر آتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دشت صاحب کی شاعری میں حسن و عشق  
سے متعلق پاکیزہ اور بلند پایہ اشعار کا فقدان ہے۔ لیکن غالب کے مندرجہ ذیل قسم کے اشعار کا جواب غالب ثانی کے یہاں کہاں ملے گا  
اور کیونکر ملے گا۔ وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یا رب دل کے پار جو مری کوتاہی قسمت سے مڑ گئی ہو گئیں

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے  
 عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا درد کی دوا پانی درد بے دوا پایا  
 سادگی و پرکاری، بخود ہی و ہشیاری حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا  
 ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال کہ گرنہ ہو تو کہاں جاؤں ہو تو کیونکر جو

غالب اور دشت صاحب کے درمیان ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ غالب فام (form) کے اعتبار سے کلاسیک (classical) تھے لیکن content کے اعتبار سے بڑی حد تک رومانٹک واقعہ ہوئے تھے یعنی *classic in form and romantic in content* اس کے برعکس دشت صاحب *classic in form and classic in content* دو دونوں کے اعتبار سے *classic* ہیں۔ غالب کے یہاں بھی روایتی مضامین و خیالات کا عمل دخل خاصا ہے۔ لیکن ان کی شاعری میں رومانی قدریں زیادہ نمایاں ہیں۔ مثلاً تخیل کی پرستش، جذبہ کا دھڑکا، انانیت کا اظہار، انفرادیت پر اصرار، دین بزرگاں سے انحراف، اپنے زمانہ کی مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی قدروں کی طنز تشکیک آمیز رو۔ وغیرہ۔ دشت صاحب کی شاعری میں تقلید، اعتدال پسندی اور نظم و ضبط کی کارفرمائی اس حد تک ہستی ہے کہ فن زندگی پر غالب نظر آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ دشت صاحب کی شاعری زندگی سے زیادہ فن کی پرستار ہے۔ وہ بھی فن کے روایتی تصور کی پرستار۔ ورنہ فن کا جدید تصور تو یہ ہے کہ حقیقی اور مکمل فن وہی ہے جو زندگی کو اس کے تمام خد و خال کے ساتھ، جذبات کو ان کی تمام لرزشوں اور گرمیوں کے ساتھ اور تجربات کو ان کی تمام پیچیدگیوں اور بے ربطیوں کے ساتھ اسیر کر لے۔ دور حاضر کی بیشتر ادبی تحریکات فن کے اسی تصور پر مبنی ہیں۔ لیکن دشت صاحب کا فن زندگی کو ایک خاص سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ ادب کی اصلاح میں اس سانچے کو روایت کہتے ہیں۔ ادب میں روایت کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن اردو شاعری میں روایت کے استعمال کا بڑا ناقص تصور کارفرما ہے۔ ہمارے اکثر شعرا یہ سمجھتے رہے ہیں کہ قدما کے خیالات و مضامین کو اپنے لفظوں میں دہرا دینا اور ان کی تشبیہات و استعارات سے کام لیتے رہنا روایت کو بروئے کار لانے کا مترادف ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ میرے نزدیک روایت کا صحیح استعمال یہ ہے کہ کسی روایت کے چھپے ہوئے امکانات کی تکمیل کی جائے۔ دشت صاحب کی شاعری روایت کے اس تصور کی آئینہ دار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں روایتی تصورات اور خیالات زیادہ ہیں۔ دشت صاحب کی روایت پرستی نے ان کی شاعری کو نفسیاتی واقفیت اور جذباتی صداقت سے بالکل محروم تو نہیں کیا لیکن ان دونوں عناصر کو اس حد تک مجروح ضرور کیا کہ مجموعی طور پر ان کا عشق کتابی اور ان کی شاعری روایتی معلوم ہوتی ہے۔

غالب اور دشت کے کلام کے معنوی فرق اسے قطع نظر اگر آپ دونوں کے انداز بیان کا تقابلی مطالعہ کریں تو دونوں میں نمایاں مشابہت کے باوجود بڑا فرق نظر آئے گا۔ اس فرق کی سب سے اچھی مثالیں دشت صاحب کے وہ اشعار ہیں جن کے مضامین غالب سے مستعار ہیں۔ غالب اور دشت صاحب کے چند متشدد معنی اشعار ملاحظہ ہوں :-

## غالب

ہم بھی تسلیم کی خود دالیں گے  
 بے نیازی تیری حادث ہی سہی  
 گو ہاتھ میں جنبش نہیں آگے نہیں آؤں  
 رہنے دو ابھی سا خرو و جارح سے

## دشت

ادھر تو نے ترقی دی ادائے بے نیازی کو  
 ادھر عشاق نے بھی خوں تسلیم و رضا دالی  
 ہے میری آنکھ کا نور اور میرے دل کا سورہ  
 وہ جام ہے جو مرے دستِ رشہ دار میں ہے

غلط نکلے جہاں تک بھر کو خود داری کے دھوے تھے  
ترسے آگے حقیقت کھل گئی ساری مسہل کی  
بہتر وہ ہے کہ اس سے کہنے نہ شوق دل کا  
ہر چیز نکتہ دال ہے لیکن ہے نکتہ چیں بھی  
مرا مقصد کہ وہ خوش مری خاموشی سے  
ان کو اندیشہ کہ یہ بھی کوئی فریاد نہ ہو  
چڑی مشکل ہے یہ طور گر نازک مزاجی کا  
کہ میری خاموشی ان کے لئے فریاد ہو جائے  
عشق کا درد ہے اور اس کو میں رکھتا ہوں عزیز  
جاننا ہوں کہ یہ آخر کو دوا ہوتا ہے  
کیوں لوگ نکتہ چینی پر آمادہ ہو گئے  
وحشت مجھے کمال کا دعویٰ کہاں ہوا  
ایک دریا تھا غم پہاڑ کا  
قطرہ جو دیدہ تر سے نکلا  
ہزاروں ہیں کھیرے زندگی کے ان میں بھنس جاتا  
جو اپنا دل نہ تیرے گیسوؤں میں مبتلا ہوتا  
وہی مطلوب ہے دل کو کہ جس سے ہوزیاں میرا  
مری ترکیب میں اک جزو بربادی بھی شامل ہے

دل بھر طوائف کوئے لامت کو جائے ہے  
پندار کا صنم کردہ ویراں کئے ہوئے  
نکتہ چیں ہے، غم دل اس کو سنائے ڈبے  
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے  
تم وہ نازک کہ خاموشی کو فغاں کہتے ہو  
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا  
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا  
ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنرمیں کیسا تھے  
بے سبب ہوا غالب دشمن آسمان اپنا  
دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب  
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا مسطوطاں نکلا  
غم اگرچہ جاگسل ہے پہاڑ کہیں کہ دل ہے  
غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا  
مری تعبیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی  
ہوئی برق خرمین کا ہے خون گرم و جھٹل کا

ان اشعار کے تقابل اور تجربے سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے اشعار کتنے پہلو دار اور دشتِ صاحب کے اشعار کتنے یک رنگ ہیں۔ غالب کے اشعار کتنے تصور زار (imaginative) اور خیال انگیز (imaginative) ہیں۔ صاحب کے اشعار میں تصور زائی ہوتی ہے نہ خیال انگیزی۔ غالب جتنا کچھ کہتے ہیں اس سے زیادہ تخیل کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ دشتِ صاحب جتنا کچھ کہنا چاہتے ہیں اس سے کم کہتے ہیں نہ زیادہ۔ اگر مزیت اور ایماٹ غالب کے انداز بیان کی ممتاز خوبی ہے تو صفائی اور سیدھا پن دشتِ صاحب کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ غالب کا انداز بیان بسا اوقات epigrammatic ہوتا ہے۔ دشتِ صاحب کے اسلوب کو اپنی بہت ساری خوبیوں کے باوجود - نظم ہونا نہیں آتا۔ جو لطف و لطافت اور تاثیر و ترفن غالب کے یہاں ملتا ہے وہ دشتِ صاحب کے یہاں ہر پایا جاتا۔ جہاں غالب کے اشعار سے ان کی شوخ طبعی اور ذہانت ٹپکتی ہے وہاں دشتِ صاحب کے اشعار میں ان کی مسکینی اور شرافت جھلکتی ہے۔

یہاں غالب اور دشتِ صاحب کے کلام کے اندرونی فرق سے متعلق جو باتیں کہی گئیں وہ کم و بیش دشتِ صاحب کے ان اشعار پر صادق آتی ہیں جن پر غالب کا دھوکا ہوتا ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بادی النظر میں دشتِ صاحب کے کلام پر غالب کا دھوکا ہوتا ضرور ہے اور اس دھوکے کے اسباب وہی ہیں جن کی طرف گزشتہ صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے جو لوگ غالب اور دشتِ صاحب کی ظاہری مشابہت سے گزر کر اندرونی مشابہتوں کے تلاشی ہوں گے انھیں مایوسی بھی ہوگی اور غالباً

دعوت صاحب کو غالب ثانی ماننے سے انکار بھی۔ یہ اور بات کہ جب کوئی شخص کسی خاص حیثیت سے مشہور یا مقبول ہو جاتا ہے تو اس کی وہ حیثیت تنقید کی زد میں آنے کے باوجود بسا اوقات محفوظ رہتی ہے۔ اگر تنقید کی سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کوئی بھی بڑا شاعر اپنا ثانی نہیں پیدا ہونے دیتا اس بنا پر نہ تو ”غالب ثانی“ کی ترکیب کوئی معنی رکھتی ہے اور نہ کسی کو ”غالب ثانی“ کہنا کوئی معنی رکھتا ہے۔ دعوت صاحب کو زیادہ سے زیادہ غالب اسکول کا شاعر کہنا چاہئے اور بس۔

جس طرح غالب، بیدل، حزیں، ظہوری، عرقی اور نظیری سے متاثر ہوتے ہوئے آخر میں تیسری طرف آئے اسی طرح دعوت صاحب، داغ، امیر، جلال، ظہوری، عرقی، فغانی اور غالب کے اثرات قبول کرتے ہوئے آخر میں تیسری طرف متوجہ ہوا بقول انھیں کے ہے

خاتمہ دعوت کا کیا کہنا جہاں شعر میں ہم کلام میرزا ہے ہم نواسے تیرے  
حسرت موہانی نے ان کے اس دعوے کی تصدیق یوں کر دی ہے

غربی اشعار دعوت کا نہ پوچھو کچھ مرہ میر و مرزا کا زمانہ شاعری یاد آگیا  
لیکن دعوت صاحب تیسری طرف سے آزاد نہ ہو سکے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خود تیسری  
رنگ میں اتنا نہ رہے جتنا تیسری طرف کے رنگ میں رنگ گئے۔ اس کی مثال دیکھئے۔ دعوت صاحب کا ایک شعر ہے  
کوئی کہتا نہیں کچھ اس نگاہ فتنہ سامان کو مرا ہی دل ہمیشہ مورد الزام ہوتا ہے  
اس شعر کو پڑھ کر یقیناً آپ کو تیسری طرف کا یہ شعر یاد آگیا ہوگا

چاہئے گا ہم یہ خوباں جو دھرتے ہیں گناہ ان سے بھی پوچھے کوئی تم اتنے کیوں پیارے ہوئے  
یہی تو نفس مضمون کے اعتبار سے یہ شعر سعدی کے اس شعر کا آزاد ترجمہ ہے کہ

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل تو دادم  
باید اول بہ تو گفتن کہ چہین خوب چرائی

لیکن تیسری طرف میں بھی جو سادگی، معصومیت اور گھلاوٹ سمجھ دی ہے اس میں سے کوئی چیز دعوت صاحب کے شعر میں نہ آئے  
بلکہ ”نگاہ فتنہ سامان“ اور ”مورد الزام“ کی قاری ترکیبیں سن کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تیسری طرف کے مضمون کو غالب کے اسلوب میں  
پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دعوت صاحب کے وہ اشعار جو درد و غم اور یاس و حسرت کے مضامین پر مبنی ہیں ان میں سے پہلے  
اسی رنگ میں ہیں چند مثالیں دیکھتے چلیے

یہ رنگ کس میری حوصلہ فرسان ہو کیونکر نہ واقف کوئی مجھ سے اور نہ کوئی آشنا میرا  
سختی کش فراق کا کیا پوچھتے ہو سال وہ موت سے قریب ہے جو تم سے دور ہے  
نہ کہنے کی مجھے عادت نہ سنا خلق کا شیوہ کوئی جانے تو کیا جانے کہ ہے احوال کیا میرا  
امید کا ہے تقاضا کہ نا امید می کا دل ستم زدہ بیتاب عرض حال ہوا  
آداب راحت طلب دل تو نے تو کھو یا ہمیں عشق رہے تو کوئی نعمت کہاں پاتے ہیں ہم  
صوف و وفا ہوا کہ شہید جفا ہوا اے دل نتیجہ ایک ہے ہونا جو تھا ہوا  
سرا پا کر زو تھا ایک دن اسکی منزل ہے مریع یاس کا ہوں داستان حسرت مل ہوں

ان اشعار کی تاثیر سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ان میں تاثیر کی وہ شدت نہیں جو تیسری طرف کا حصہ ہے۔ درد و غم کے اظہار کے لئے زبان جس قدر سادہ ہو اتنی ہی مؤثر ہوتی ہے۔ لیکن نا انصافی ہوگی اگر اس کا اعتراف نہ کیا جائے کہ دعوت

۱۔ کہ یہاں تیر و غائب کے استزاج نے کہیں کہیں ایسے نشتر کی شکل اختیار کر لی ہے جو صرف اس استزاج ہی کا نتیجہ ہو سکتا تھا مثلاً

دل شکستہ نہیں اب بقید محسوسات نہ شکر لطف ہے مجھ کو نہ شکوہ بیداد  
حالی جہن خزاں میں بھی ایسا کبھی ہوا نہ تھا اپنا جو حال ہو گیا رنگ بہار دیکھ کر  
آہ و فغان و نالہ و فساد تا کب، آخر دل شکستہ نے بھی دے دیا جواب

نو میدی دیاس پار سو ہے ات! کس کے امیدوار ہیں ہم  
شوق پھر کو چڑھ جاتا کاسنا ہے مجھے میں کہاں جاتا ہوں، کوئی لئے جاتا ہے مجھے  
جسٹا ہوں حال پر اپنے جہاں رونے کا موقع تھا کیا ہے شکر کے پردے میں قسمت کا گلا میں نے  
مستروں کا ہائے رے دل میں ہجوم آرزوؤں کا نتیجہ دیکھئے،

دل والے ہیں واقع مری بربادی دل سے ہر چند کہ یہ واقعہ مشہور نہیں ہے،  
وہ کام میرا نہیں جس کا نیک ہوا انجام وہ راہ میری نہیں جو گئی ہو غفلت کو  
اپنا بھی وہی حال ہوا راہ وفا میں، جو حال ہوا کرتا ہے ارباب وفا کا

تری نگاہ سمجھتی ہے یا نہیں دیکھوں لب فحوش میں کوئی سوال پنہاں ہے  
جو ہے اتنی بے قراری تو تڑپ کے جانی تیری اٹھیں ہوتے ہوتے ہوگی خبر اپنے نیم جاں کی  
ہمارے پاؤں میں تو تم نے زنجیر وفا ڈالی تمھارے ہاتھ سے کیوں رشتہ ہر دم چھوٹا

آخری شعر سے وحشت صاحب کی زندگی کا ایک بڑا اندوہناک واقعہ وابستہ ہے۔ کلکتہ کے دوران قیام میں ان کا ایک  
جواں سال لڑکا پاگل ہو گیا اور فسادات کے زمانہ میں ایسا گم ہوا کہ آج تک اس کا پتہ نہیں چلا۔ جب اس کے جنوں میں شدت  
پیدا ہوئی تو کسی نے وحشت صاحب کو مشورہ دیا کہ اس لڑکے کو گھر میں بالیدہ کر رکھئے تاکہ کسی حادثے کا شکار نہ ہونے پائے  
جب وحشت صاحب نے اس لڑکے کے پاؤں میں زنجیر ڈالنا چاہی تو اس نے دلدوز لگا ہوں سے وحشت صاحب کو دیکھا  
اور ان کا یہ شعر پڑھ دیا ہے

ہمارے پاؤں میں تو تم نے زنجیر وفا ڈالی تمھارے ہاتھ سے کیوں رشتہ ہر دم چھوٹا  
وحشت صاحب کے ہاتھ سے ”رشتہ ہر دم چھوٹا“ تو نہیں چھوٹا تھا۔ لیکن یہ شعر سن کر ان کے ہاتھ سے ”زنجیر احتیاط“ ضرور چھوٹ گئی۔

وحشت صاحب کی غزلوں میں لمبی بحر وں کا استعمال کم ہے۔ تقریباً آٹھ نو غزلیں لمبی بحر وں میں ہیں اور بس۔ ان میں سے تین  
غزلوں کو چھوڑ کر باقی غزلوں کا انداز بیان وہی ہے جو ان کی عام غزلوں کا ہے۔ لیکن ان تین غزلوں کی نہ صرف زبان اور طرز بیان  
ان کی عام غزلوں سے مختلف ہے بلکہ ایک حد تک ان کا مزاج بھی۔ پہلے یہ دونوں غزلیں ملاحظہ ہوں گے

اب حد سے سوا ہے بارالم کیا شکل رہا پانے کی جب اور نہ کوئی راہ ملے کیوں راہ نہ لوں میخانے کی  
دُعا متلون جب خود ہے کیوں رنگ نہ ہوا پتا بدلیں کچھ وقت حرم میں گزرے اگر کچھ میرے بتجانے کی  
ہے آتش الفت شعلہ فشاں جلتا ہے کوئی تو چھنے دو ہے شمع کی بیشک شاں ہی، پروانہ کوہ پروانے کی  
لے جلوہ پنہاں راہ ترا پردے میں رہے تو کیسے ہے گوچہ کو نہ دیکھے کوئی مگر شہرت ہے ترے افسانے کی  
ایوس نہ ہواے دل میرے گرا اپنے خدا سے صبر طلب ہوتے ہی ہو گا رام وہ بت کچھ بات نہیں گہرائی کی  
ہیں دست اگر بیاں حسن و عشق اب کیسے کس کی بات رہے دل بھی ہے تڑپنے کا نگر، خوان کی سہی تڑپانے کی  
انداز نہیں دونوں افسوں گراں دل کی وحشت تیریں کیا کم ہے تبسم کی شوقی، پھر اس پہ ادا شریانی کی

درد آ کے بڑھا دو دل کا تم یہ کام تمہیں کیا مشکل ہے بیمار بنانا آساں ہے ہر جہزِ مہرِ داد مشکل ہے  
الزام نہ دیں گے مجھ کو، تسکین میں کوئی کی نہ کمی وعدہ تو وفا کا تم نے کیا، کیا کیجئے ایسا مشکل ہے  
دل توڑ دیا تم نے میرا اب جوڑ چکے تم ٹوٹے کو وہ کام نہایت آساں تھا، یہ کام بلا کا مشکل ہے  
آغاز سے ظاہر ہوتا ہے انجام جو ہونے والا ہے انداز زمانہ کہتا ہے پوری ہو تمنا مشکل ہے  
موقوف کرو اب فکر سخن وحشت نہ کرو اب ذکر سخن جو کام کہ بے حاصل ٹھہرا دل اس میں لگانا مشکل ہے

اسی رنگ تغزل کی ترقی یافتہ صورت ان کی یہ غزل ہے

یہ رابطہ ظاہر داری کا کیوں مجھ کو دکھایا جاتا ہے وہ مجھ سے نہیں ہے پر شہرہ جو مجھ سے چھپایا جاتا ہے  
کیا اس کی مشیت کی حکمت، کیا اپنی وجہ نا کامی ہوں اس کے سمجھنے سے قاصر جو مجھ کو بتایا جاتا ہے  
آسان مہر اس کا نہیں مٹتے ہی مٹے گا نقشِ امید کل پھر وہ بنایا جائے گا جو آج مٹایا جاتا ہے  
نقدیر کا ہر دن ردنا ہے یعنی کہ چرخِ ارمانوں کا ہر روز جلایا جاتا ہے ہر روز بھایا جاتا ہے  
اللہ رس زو۔ مجبوری خود مجھ کو حیرت ہوتی ہے جو بار اٹھانا پڑتا ہے کیونکر وہ اٹھایا جاتا ہے  
یہ بھی ہے تماشا آفت کا جو بات ہے وہ نادانی کی منظور نہیں ہے ربطِ جنسِ ربط ان سے بڑھایا جاتا ہے

جب شعر و سخن سے وحشت کو باقی نہ رہی ہو دلچسپی

حیران ہوں پھر کیوں محفل میں یہ شخص بلایا جاتا ہے

نیا زنجیرِ ری نے اس غزل کی داد دیتے ہوئے لکھا تھا کہ ”اگر یہ رنگ ان کے کلام میں ابھی ابھی پیدا ہوا ہے تو میں ان کو مبارکباد دیتا ہوں کیونکہ ان کی جوانی کی شاعری کے سامنے تو لوگوں کا صرف سر جھکتا تھا لیکن اب ان کے اس رنگ کے سامنے روح در زانو ہوتی ہے۔“ مجھے نیا زنجیر صاحب کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان کی شاعری کا عام رنگ یہی ہوتا تو ان کی انفرادیت کے متعلق آج دورائیں نہ ہوتیں۔ مگر افسوس کہ وہ اس رنگ میں صرف ایک ہی غزل دے سکے۔

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان کی تمام تر شاعری تقلید ہی تقلید ہے۔ کیا ان کے یہاں اپنی کوئی آواز نہیں۔ آخر انھوں نے اردو غزل کو دیا۔ یہ وہ سوال ہے جس سے میں بچنا چاہتا تھا۔ مگر وحشت صاحب کے کسی نقاد کا اس سوال سے بچنا ممکن نہیں۔ خیر اب آپ کو میرے جواب سے اتفاق ہو یا نہ ہو مگر اسے سن لیجئے۔ جس شاعر کا نصب العین اپنے آپ کو اپنے محبوب ترین شاعر کا ثانی یا جانشین بنانا ٹھہر چکا ہو اس کی شاعری بظاہر تقلید کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے لیکن جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا تقلید کا نتیجہ *model* کی دوبارہ تخلیق نہیں بلکہ ایک ایسی چیز کی تخلیق ہوتا ہے جو *model* سے ظاہری اور سطحی مشابہتیں رکھنے کے باوجود بنیادی اور اندرونی طور پر اس سے مختلف ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر تقلید ہمیشہ ایک نئے رنگ کی تخلیق میں نتیج ہوتی ہے چنانچہ وحشت صاحب کی شاعری بھی غالب کی شاعری سے بظاہر مشابہ ہونے کے باوجود اندرونی طور پر اس سے مختلف انداز کی چیز ہے اور اسی اختلاف میں وحشت صاحب کی انفرادیت پوشیدہ ہے۔ یہ اور بات کہ وہ انفرادیت بہت جاندار اور باذوق نظر نہیں جانتا اور باذوق نظر انفرادیت اسی شاعر کی ہوتی ہے جو اپنی ایک شخصیت اور اپنا ایک مزاج رکھتا ہے اور کسی کا مستند ہونے کے باوجود اپنی شخصیت اور اپنے مزاج کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اس کی بہترین مثال خود غالب کی ذات ہے۔ وحشت صاحب کی طرح غالب بھی بہتوں سے متاثر ہوئے اور انھوں نے بہتوں کی تقلید بھی کی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری میں ان کی

اپنی شخصیت اور ان کا اپنا مزاج سب سے نمایاں ہے۔ یہ بات وحشت صاحب کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ جب آپ ان کے اشعار سنیں گے تو پہلے لمحے میں آپ کا ذہن غالب کی طرف چلا جائے گا۔ لیکن پھر فوراً محسوس ہوگا کہ یہ غالب کی آواز نہیں کسی کی ہے اور لفظ ”کسی“ کے ساتھ ہی وحشت صاحب کا نام ذہن میں آجائے گا کیونکہ وحشت صاحب کے سوا کسی اور کی آواز غالب کی آواز سے اتنی ملتی جلتی نہیں ہے۔ لیکن وحشت صاحب کی شاعری صرف اسلوب کے اعتبار سے ایک انسانہ ہی جاسکتا ہے مزاج اور مواد کے اعتبار سے نہیں۔ ان کی شاعری ہمیں کسی نئے طرز احساس سے روشناس نہیں کراتی۔ ان کے یہاں نہ حسرت کی طرح حسن و عشق کی کوئی خاص فضا ملتی ہے نہ فانی کی طرح زندگی کی طرف کوئی خاص رویہ۔ نہ اسفر کی طرح عازہ سرستی، نہ جگر کی طرح ”خیریں دیوانگی“ سے ”مقدس سنجیدگی“ کی طرف ارتقا۔ نہ یگانہ کی طرح زندگی سے الگ ہونے کا حوصلہ اور نہ فرافق کی طرح حیات و کائنات سے ہم آہنگ ہونے کا جذبہ۔ وحشت صاحب ان شاعروں میں سے ہیں جو استاد ہیں اور شاعر بعد میں۔ ان کے یہاں لفظوں کا استعمال فن کا راز نہ کم، استادانہ زیادہ ہے۔ وہ زبان و بیان کے حقوق کا لیا زیادہ رکھتے ہیں شعرا و شاعریت کے حقوق کا کم۔ وہ محاوروں کے صحیح استعمال اور لفظوں کے صحیح انتخاب میں بڑی کاوش کرتے ہیں لیکن اس بات پر نظر نہیں رکھتے کہ یہ محاورہ یا وہ لفظ غزل کے مزاج سے کس حد تک ہم آہنگ ہے۔ جس طرح وحشت صاحب استاد پہلے ہیں اور شاعر بعد میں اسی طرح ان کی شاعری بھی اور روایتی پہلے ہے، حقیقی اور انفرادی بعد کو۔ باریں ہمہ وحشت کو ہرید غزل کے مہماروں میں شمار کرنا چاہئے۔ موجودہ غزل اور موجودہ نسل پر وحشت صاحب کا کوئی اثر نہیں مگر ان کا احسان ضرور ہے کہ انھوں نے آردو غزل کو داغ، امیر اور جلال کی سطح سے بلند کرنے والوں کا ہاتھ بٹایا۔ پھر یہ کہ کلام پنجنگی اور پاکیزگی کے اعتبار سے وہ آردو کے مانے ہوئے استاد سخن میں کسی سے دوسرے درجہ پر نہیں۔ اس لحاظ سے آردو کی تاریخ میں ان کی جگہ یقینی بھی ہے اور محفوظ بھی۔ آردو غزل کا کوئی انتخاب وحشت صاحب کے اشعار کے بغیر مکمل نہیں جاسکتا۔ اب ان کے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ ہوں۔

دیکھا ہے چشم شوق نے تجھ کو ؟ غلط غلط	تو بلوہ گر جہاں تھا وہاں کس کو ہوش تھا ؟
وقت سبک خرام کا کھایا کیا خریب	فردا کا انتظار تھا دیکھا تو دوش بھتا
تو نے اے جمعیت دل کی ہوس	اور بھی مجھ کو پریشاں کر دیا
عنایت کی نظر دیکھی نہ آثارِ کرم پائے	پھر آخر کس لئے تیرا مزاج لے دل نہیں ملتا
مجاں ترکِ محبت نہ ایک بار ہوئی،	خیالِ ترکِ محبت تو بار بار ہوئی
وہ ابتدا کی چشمِ کرم بھولتی نہیں	گو بعد اس کے مجھ پر ستم بار بار ہوا
میں ان کی بزم سے کچھ نامراد بھی نہ چلا	بے قدر شوق اگر بامراد آنے سکا
اس نگاہِ شریکوں نے کر دیا رسوا ہمیں	ہائے وہ افسوں کو جو آخر کو افسانہ ہوا
وصل اس کا ہو میرا اس کو قسمت چاہئے	ہجر ہی سے دوستی کی ابتدا کرتے ہیں ہم
ایک یاد عیش جس پر ہوں قرباں ہزار عیش	لے کر چلے ہیں ساتھ تری آنکھوں سے ہم
زندگی کے مسئلے بھی کس قدر پیچیدہ ہیں	آرزوئے سود میں اکثر زیاں کرتے ہیں ہم
ضرورت تم کو کیا مجھ سے تکلف کی تو صانع کی	یہی انداز وہ ہیں جو مجھے مایوس کرتے ہیں
کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف	ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں
اپنی شان بے نیازی پوچھیں کیا کیا ہیں ناز	کاش تم اس شوق کو جانو جو میرے دل میں

ابھی اس کا نتیجہ نہ ہو پیشانی، کسی کی بزم سے اٹھا ہے شاماں کوئی  
 آپ جب محفل میں ہیں تو شمع کیوں لائیں یہاں ہم جہاں موجود ہوں، کیوں کوئی پروا نہ رہے  
 کوئی بوجھے دل مجبور اربابِ مروت سے کہ پاس دوستی بھی کس قدر دشوار ہوتا ہے  
 خیال تک نہ کیا اہل انجمن نے کبھی تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے  
 پتا ملتا نہیں جنسِ وفا کا اب زمانے میں کہیں سے ہاتھ گر لگتی تو نذر دوستاں کرتے  
 مزہ آتا اگر گزری ہوئی باتوں کا افسانہ کہیں سے ہم بیاں کرتے کہیں سے تم بیاں کرتے  
 تقاضا ہے یہی مہر و وفا کا اس کو کیا کہئے کو اک بیگانہ مہر و وفا کو آشنا کہئے  
 تم نے جو چاہا کیا کون تمہیں دے الزام ہم اگر شکر نہ کرتے تو شکایت ہوتی،  
 طبیعت یاس کی جانب جو مایل ہوتی جاتی ہے دل بیتاب کو تسکین حاصل ہوتی جاتی ہے  
 نہیں بے دلی کوئی زندگی، میں سکون دل کا حریف ہوں غم عاشقی ہے اگر بلا تو مجھے بلا کی تلاش ہے  
 بھلا ہی دیتے ہیں اس کو جو گزرا بزمِ عالم سے ہے سب کو اپنی اپنی فکر، یاد رنگاں کیسی  
 گزر رہی ہو جو نامرادی ہی میں شب و روز زندگی یقین آئے تو کیسے آئے مراد دل کی کبھی ملے گی  
 خوشی کی تجھے زندگی مبارک تجھے زندگی سے خفا کرنے والے  
 نہو رنج سے میرے افسردہ خاطر مجھے رنج میں مبتلا کرنے والے  
 فریاد کہ دیتا نہیں تو رخصت فریاد اتنا بھی ستم اے ستم آرا نہیں کرتے  
 کیا کہتے ہو وحشت کہ وہ بیت دشمن دیں ہے کچھ پاس تو تم بھی دل و دیں کا نہیں کرتے  
 اک وصل کی تدبیر ہے اک پھر میں جینا جو کام کہ کرنے ہیں وہ دشوار بہت ہیں

## رعایتی اعلان

من و ہزداں۔ مذہبی استفسار و جوابات۔ نگارستان۔ جاسٹان۔ شہوانیات۔ مکتوبات نیازتین حقے۔  
 انتقادیات۔ مالہ و ما علیہ۔ حسن کی عیاریاں۔ شہاب کی سرگزشت۔ فلاسفہ قدیم۔ مذاکرات نیاز۔ فراست المید۔  
 نقاب اٹھ جانے کے بعد

میزان  
 عظیم

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف بیالیس روپے میں مل سکتی ہیں  
 مینجر نگار لکھنؤ

# مطالعہ کائنات

## (فلکیات کے بعض دلچسپ حقائق)

(نیاز فچوری)

جس وقت سے انسان نے سوچنا شروع کیا، اس جستجو سے کبھی خالص نہیں رہا کہ وہ کہاں سے کہاں آیا ہے، کس طرح آیا ہے اور اسے کہاں جانے ہے۔ اسی فکر و جستجو نے سیکڑوں فلاسفوں و حکماء اور نہ جانے کتنے ماہرین سائنس پیدا کر دیے، لیکن اس سوال کا صحیح جواب آج تک کوئی نہیں دے سکا۔ اس میں شک نہیں کہ اہل سائنس کی ترقیاں حیرت انگیز ہیں اور مادی حقائق کی دریافت کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ لیکن یہ تمام کاوشیں صرف ”کیا“ تک محدود ہیں اور جب ”کیوں“ کا سوال سامنے آتا ہے تو سب دم بخود رہ جاتے ہیں۔ انھوں نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ جب دو مادی چیزیں آپس میں ملتی ہیں تو اس سے ایک تیسری چیز اور پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے، اس کا جواب ان کے پاس نہیں۔ عہد حاضر کی سب سے زیادہ اور اہم دریافت، آٹم ہے جس کی بے پناہ قوت نے آج دنیا کو لرزہ بر اندام کر رکھا ہے۔ لیکن اس میں اتنی زبردست قوت کہاں سے آئی، اس وقت تک اس کا علم کسی کو نہیں اور نہ آئندہ اس راز کے انکشاف کی توقع کی جاسکتی ہے۔

الغرض حقائق مادی تک تو انسانی پہنچ گیا ہے۔ لیکن ”کہہ حقیقت“ تک اس کی دسترس اب تک نہیں ہو سکی اور نہ شاید کبھی ہو سکے۔ عرفی نے اسی خیال کو اس طرح ظاہر کیا ہے:-

کہہ ذات تو بہ ادراک نہ شاید دانست      ویر سخن نہیر: اندازہ اور اک من است  
اور بیدل جب مطالعہ کائنات کے سلسلہ میں انسانی عجز و نارسائی کو محسوس کرتا ہے تو بے اختیار کہہ اٹھتا ہے:-

بحر بیتاب کہ آں گوہر نایاب کجا است      چرخ سرگشتہ کو خوشید جہانتاب کجا است  
دیر زیں غصہ در آتش کہہ ننگ ست صلم      کعبہ زیں درد سیہ پوش کجا است

خیر باتیں تو اس عالم کی ہیں جس سے مادیوں کو کوئی تعلق نہیں ہے لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے۔ جب ہم مادی نقطہ نظر سے کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں تو بھی اخیر میں ہمیں اسی ادراک و اعتزاز کرنا پڑتا ہے کہ:- ”کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں مہم دار“

آئیے ہم آپ بھی اسی حیرت آباد کی سیر کریں اور خود مادیوں ہی کے انکشافات کو سامنے رکھ کر دیکھیں کہ کائنات کے چہرے سے جو گوشہ نقاب اٹھایا ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔

مطالعہ قدرت کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جس نے انسان کو حیرت میں ڈالا ہوگا غالباً آسمان ہے۔ انسان نے اول اول جب ستاروں کو دیکھا ہوگا تو وہ حیران رہ گیا ہوگا کہ خدا میں یہ بے شمار کھرمے ہوئے روشن نقطے کیا ہیں اور معلوم نہیں اس نے اپنے دل میں کیا سوچا ہوگا، لیکن اب کو ان کی حقیقت بہت کچھ ہمیں معلوم ہو گئی ہے۔ انسان کی حیرت کی کوئی حد انتہا نہیں۔ کیونکہ یہ بے شمار ستارے جو ہمیں رات کو منکشا نظر آتے ہیں ان میں سے اکثر ہمارے ہی نظام شمسی کے آفتاب کی طرح، بجائے خود آفتاب کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے گرد و خد اجائے اور کتنے ماتحت ستارے باکرے ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں۔ پھر یہ حال تو ان ستاروں کا ہے جو ہمیں نظر آتے ہیں، لیکن وہ ستارے ہمارے

انتہائی دوری کی وجہ سے ہمیں نظر نہیں آتے، ان کی تعداد کا اندازہ تو ہوئی نہیں سکتا، کیونکہ انسان اب تک کوئی ذریعہ ایسا دریافت نہیں کر سکا جو اس پردہ حجاب میں اس کی مدد کر سکے۔

جب ہم ان ستاروں کو دیکھتے ہیں تو دوسرا سوال ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ یہ کونسا عالم وجود میں آئے، یعنی کائنات کی تخلیق کب اور کیوں ہوئی۔ اس میں شک نہیں یہ اس سے زیادہ اہم سوال ہے، لیکن صدیوں کی کاوش و جستجو کے بعد حکما و سائنس دانوں نے چند نظریے ضروریات پیش کئے ہیں جن سے اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔

(۱) پہلا نظریہ یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق جس میں ہماری زمین بھی شامل ہے مادہ (Matter) کے اُن ذہنی ذرات سے ہوئی ہے جنہیں آٹم (Atom) یا "جوہر فرد" کہتے ہیں اور وہ اس قدر چھوٹے ہیں کہ ہم قوی ترین خوردبین کے ذریعہ سے بھی انہیں نہیں دیکھ سکتے۔

(۲) دوسرا نظریہ یہ ہے کہ آٹم یا جوہر فرد یا اجزاء، لائیوٹروپی کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ ان میں ایک مرکزی یا بنیادی حصہ ہوتا ہے جسے اصطلاحاً پروٹن (Proton) یا مرکزی سالمہ کہتے ہیں اور جس سے ہر وقت مثبت (Positive) بجلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ دوسرا پروٹن حصہ ہر پروٹن (Electron) کا ہے جو ہر وقت پروٹن (مرکزی سالمہ) کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں اور جن سے ہر وقت منفی (Negative) بجلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ہر عنصر یا مادہ جس سے کائنات کی تعمیر ہوئی ہے مجموعہ ہے انہیں سالموں اور برقیاروں کا جن کی تعداد مختلف عناصر میں مختلف ہوتی ہے اور جن میں

بیشی ممکن نہیں۔ مثلاً ہائیڈروجن کو لیجئے کہ وہ مرکب ہے ایک سالمہ اور ایک برقیار سے۔ یا ہیلیم (Helium) جو مرکب ہے چار سالموں اور دو برقیاروں سے وغیرہ وغیرہ لیکن فطرت کا نظام یہ ہے کہ جس مادہ یا عنصر کے تینے سالمے اور ہر تپا سے مقرر ہیں وہ ہمیشہ آتے ہیں ان کے اور ان میں کمی زیادتی ممکن نہیں۔ (۳) تیسرا نظریہ یہ ہے کہ جس چیز کو ہم فلا سے تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل فلا نہیں ہے جس وقت ہم روشنی ستاروں کو دیکھتے ہیں تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی شے ایسی مائل نہیں ہے جو ان کی روشنی کو ہم تک نہ پہنچنے دے اور ہم اسی کو فلا یا فضا کے بیڑے کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فلا بیڑے ایک تنگ یا شفاف اداسے سے جو آفتاب اور دوسرے بے شمار سیاروں سے نکل کر ہر وقت منتشر ہوتا رہتا ہے۔

(۴) چوتھا نظریہ یہ ہے کہ جب دو آٹم یا سالمے باہم گزریں زیادہ قریب آجاتے ہیں تو ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اس تصادم سے گرمی یا حرارت پیدا ہوتی اور پھر آٹم چھوٹے آٹم کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور یہ عمل بار بار جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ فضا میں ایک گرم و روشن بادل کی صورت اختیار کر لے جسے اصطلاح میں نیولا (Nebula) کہتے ہیں اور اس کی صورت ایک روشنی گیس کی سی ہوتی ہے۔

اب ان چاروں نظریوں کو سامنے رکھ کر خود کیجئے تو تخلیق کائنات کے تدریجی عمل کی صورت یہ قرار پائے گی کہ اب سے اربوں سال پہلے فضا میں بہت بڑا جلا پیدا ہوا جس کے اندر بے شمار آٹم ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے اور پھر زیادہ حجم بنانے والے آٹموں کے بعض حصے دوران گردش میں ان ٹوٹ ٹوٹ کر علحدہ ہوئے گئے اور اپنی دنیا الگ بناتے رہے جنہیں ہم ستارے کہتے ہیں۔ ان پیدا ہونے والے سیاروں میں بہت سے آفتاب بھی تھے اور انہیں میں سے ایک ہمارا آفتاب بھی ہے۔

جب ہمارا آفتاب بن گیا تو وہ اپنے بتولا کے اندر ربوں سال تک چکر کھاتا رہا اور اس دوران میں بار بار ایسا ہوا کہ بتولا کے دوسرے حصے سے گرمی گردش کرتے ہوئے اس کے پاس سے گزرے، جن میں بعض اتنے بڑے تھے کہ ان کی کشش سے آفتاب کے بعض ٹکڑے علحدہ ہو گئے، لیکن یہ کشش قوی نہ تھی کہ وہ آفتاب کی حد کشش سے بالکل علحدہ ہو جاتے اس لئے وہ آفتاب سے جدا ہونے کے بعد بھی اس کے گرد چکر لگانے لگے اور یہی وہ سیارگان توابع ہیں جن سے ہمارا نظام شمسی بنا ہے اور جن میں ایک ثابت۔ یارہ ہمارا کرہ زمین بھی ہے۔

دور بین سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ فضا کے تمام ستارے ایک سے نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض جو حال ہی میں آفتاب بنے ہیں جدید و متشعل ہو رہے ہیں اور اسی لئے ان کی روشنی ہم کو بہت تیز نظر آتی ہے بعض ایسے ہیں جو علحدہ اپنی طرف سے قریب قریب آتے ہیں اور حرارت کم ہونے کی وجہ سے سرخ گند کی طرح فضا میں پکے لگ رہے ہیں۔ بعض وہ ہیں جو ابھی آگ میں پختہ نہیں ہوئے لیکن اپنا مادہ فضا میں منتشر کرتے کرتے بہت سکڑ گئے ہیں اور فضا کی منزل سے قریب تر آگئے ہیں۔

# مطالعہ کائنات

## (فلکیات کے بعض دلچسپ حقائق)

(نیا زفق پوری)

جس وقت سے انسان نے سوچنا شروع کیا، اس جستجو سے کبھی خالص نہیں رہا کہ وہ کہاں سے کہاں آیا ہے، کس طرح آیا ہے اور اسے کہاں جانے ہے۔ اسی فکر و جستجو نے سیکڑوں فلاسفہ و حکماء اور نہ جانے کتنے ماہرین سائنس پیدا کر دیے، لیکن اس سوال کا صحیح جواب آج تک کوئی نہیں دے سکا۔ اس میں شک نہیں کہ اہل سائنس کی ترقیاتی حیرت ناگ ہیں اور مادی حقائق کی دریافت کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ لیکن یہ تمام کاوشیں صرف ”کیا“ تک محدود ہیں اور جب ”کیوں“ کا سوال سامنے آتا ہے تو سب دم بخود رہ جاتے ہیں۔ انھوں نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ جب دو مادی چیزیں آپس میں ملتی ہیں تو اس سے ایک تیسری چیز اور پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے، اس کا جواب ان کے پاس نہیں۔ عہد حاضر کی سب سے زیادہ اور اہم دریافت، آٹم ہے جس کی بے پناہ قوت نے آج دنیا کو لرزہ بر اندام کر رکھا ہے۔ لیکن اس میں اتنی زبردست قوت کہاں سے آئی، اس وقت تک اس کا علم کسی کو نہیں اور نہ آئندہ اس راز کے انکشاف کی توقع کی جاسکتی ہے۔

الغرض حقائق مادی تک تو انسانی پہنچ گیا ہے۔ لیکن ”کہہ حقیقت“ تک اس کی دسترس اب تک نہیں ہو سکی اور نہ شاید کبھی ہو سکے۔ عرفی نے اسی خیال کو اس طرح ظاہر کیا ہے:-

کہہ ذات تو بہ ادراک نہ شاید دانست      دیں سخن نہیر بہ اندازہ ادراک من است  
اور بیدل جب مطالعہ کائنات کے سلسلہ میں انسانی عجز و نارسائی کو محسوس کرتا ہے تو بے اختیار کہہ اٹھتا ہے:-

بحر بیتاب کہ آں گوہر نایاب کجاست      چرخ سرکشہ کہ خورشید جہان تاب کجاست  
دیر زبیں غصہ در آتش کہہ ننگ مست صم      کعبہ زبیں در دسیہ پوش کجاست

خیر یہ باتیں تو اس عالم کی ہیں جس سے مادیین کو کوئی تعلق نہیں ہے لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے۔ جب ہم مادی نقطہ نظر سے کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں تو بھی اخیر میں ہمیں اسی ادراک و اعتزاز کا پڑتا ہے کہ:- ”کس نکشود و نکشاید بہ حکمت اہم مہمارا“

آئیے ہم آپ بھی اسی حیرت آباد کی سیر کریں اور خود مادیین ہی کے انکشافات کو سامنے رکھ کر دیکھیں کہ کائنات کے چہرے سے جو گوشہ نقاب اٹھا یا ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔

مطالعہ قدرت کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جس نے انسان کو حیرت میں ڈالا ہو گا غالباً آسمان ہے۔ انسان نے اول اول جب ستاروں کو دیکھا ہو گا تو وہ حیران رہ گیا ہو گا کہ فضا میں یہ بے شمار کچھڑے ہوئے روشن نقطے کیا ہیں اور معلوم نہیں اس نے اپنے دل میں کیا سوچا ہو گا، لیکن اب ان کی حقیقت بہت کچھ ہمیں معلوم ہو گئی ہے۔ انسان کی حیرت کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ کیونکہ یہ بے شمار ستارے جو ہمیں رات کو مجسمات نظر آتے ہیں ان میں سے اکثر ہمارے ہی نظام شمسی کے آفتاب کی طرح، بجائے خود آفتاب کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے گرد فضا جانیے اور کتنے ماتحت ستارے باکرے ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں۔ پھر یہ حال تو ان ستاروں کا ہے جو ہمیں نظر آتے ہیں، لیکن وہ ستارے یا کوسے جو

انتہائی دوری کی وجہ سے ہمیں نظر نہیں آتے، ان کی تعداد کا اندازہ تو ہوئی نہیں سکتا، کیونکہ انسان اب تک کوئی ذریعہ ایسا دریافت نہیں کر سکا جو اس پروردہ حجاب میں اس کی مدد کر سکے۔

جب ہم ان ستاروں کو دیکھتے ہیں تو دوسرا سوال ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ کیونکر عالم وجود میں آئے، یعنی کائنات کی تخلیق کب اور کیونکر ہوئی۔ اس میں شک نہیں یہ اس سے زیادہ اہم سوال ہے، لیکن صدیوں کی کاوش و جستجو کے بعد حکما و نے چند نثریے ضروریات پیش کئے ہیں جن سے ہم اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔

(۱) پہلا نقطہ یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق جس میں ہماری زمین بھی شامل ہے مادہ (Matter) کے اٹھ دہائی ذرات سے ہوئی ہے جنہیں ہم آٹم (Atom) یا "جوہر فرد" کہتے ہیں اور وہ اس قدر چھوٹے ہیں کہ ہم تو ہی ترین خوردبین کے ذریعہ سے بھی انہیں نہیں دیکھ سکتے۔

(۲) دوسرا نقطہ یہ ہے کہ آٹم یا جوہر فرد یا اجزاء، لایتنجری کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ ان میں ایک مرکزی یا بنیادی حصہ ہوتا ہے جسے اصطلاح میں پروٹون (Proton) یا مرکزہ می کہتے ہیں اور جس سے ہر وقت مثبت (Positive) بجلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ دوسرا پروٹون یا حصہ برقیاتیو (Electron) کا ہے جو ہر وقت پروٹون (مرکزہ می) کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں اور جن سے ہر وقت منفی (Negative) بجلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ہر عنصر یا مادہ جس سے کائنات کی تعمیر ہوئی ہے مجموعہ ہے انہیں سالموں اور برقیاتوں کا، جن کی تعداد مختلف عناصر میں مختلف ہوتی ہے اور جن میں کمی

بیشی ممکن نہیں۔ مثلاً ہائیڈروجن کو نیچے کوہ مرکب ہے ایک سالمہ اور ایک برقیاتیو سے۔ یا ہیلیم (Helium) جو مرکب ہے چار سالموں اور دو برقیاتوں سے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن فطرت کا نظام یہ ہے کہ جس مادہ یا عنصر کے نیچے سالمے اور برقیاتوں پر مشتمل ہوں وہ ہمیشہ اتنے ہی رہیں گے اور ان میں کمی زیادتی ممکن نہیں۔

(۳) تیسرا نقطہ یہ ہے کہ جس چیز کو ہم خلا سے تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل خلا نہیں ہے۔ جس وقت ہم روشن ستاروں کو دیکھتے ہیں تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ آگ ان کے درمیان کوئی شے ایسی حائل نہیں ہے جو ان کی روشنی کو ہم تک نہ پہنچنے دے اور ہم اسی کو خلا یا فضا کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فضا بسیط البرزخ ہے ایک تنگ یا شفاف اداسے سے جو آفتاب اور دوسرے بے شمار سیاروں سے نکل کر ہر وقت منتشر ہوتا رہتا ہے۔

(۴) چوتھا نقطہ یہ ہے کہ جب دو آٹم یا سالمے یا جہد گزیرا قریب آجاتے ہیں تو ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، اس تصادم سے گرمی یا حرارت پیدا ہوتی ہے اور بڑا آٹم چھوٹے آٹم کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور یہ عمل برابر جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ فضا میں ایک گرم و روشن بادل کی صورت اختیار کر لیتا ہے جسے اصطلاح میں نیولا (Nebula) کہتے ہیں اور اس کی صورت ایک روشن گیس کی سی ہوتی ہے۔

اب ان چاروں نظریوں کو سامنے رکھ کر سوچیں کہ اگرچہ تو تخلیق کائنات کے تاریخی عمل کی صورت یہ قرار پائے گی کہ اب سے اربوں سال پہلے فضا میں ایک بہت بڑا نیولا پیدا ہوا جس کے اندر بے شمار آٹم ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے اور پھر زیادہ جہد بنانے والے آٹموں کے بعض حصے دوران گردش میں ان سے ٹوٹ ٹوٹ کر علحدہ ہوئے گئے اور اپنی دنیا الگ بناتے رہے جنہیں ہم ستارے کہتے ہیں۔ ان پیدا ہونے والے سیاروں میں بہت سے آفتاب بھی تھے اور انہیں میں سے ایک ہمارا آفتاب بھی ہے۔

جب ہمارا آفتاب بن گیا تو وہ اپنے نیولا کے اندر اربوں سال تک چکر لگاتا رہا اور اس دوران میں بار بار ایسا ہوا کہ نیولا کے دوسرے بہت سے گرمے گردش کرتے ہوئے اس کے پاس سے گزرے، جن میں بعض اتنے بڑے تھے کہ ان کی کشش سے آفتاب کے بعض ٹکڑے علحدہ ہو گئے، لیکن یہ کشش اتنی قوی نہ تھی کہ وہ آفتاب کی حد کشش سے بالکل علحدہ ہو جاتے، اس لئے وہ آفتاب سے جدا ہونے کے بعد بھی اس کے گرد چکر لگانے لگے اور یہی وہ سیارگان تو ہیں جن سے ہمارا نظام شمسی بنا ہے اور جن میں ایک تاہم۔ یا رہ ہمارا کرہ زمین بھی ہے۔

دور بین سے دیکھتے تو معلوم ہوگا کہ فضا کے تمام ستارے ایک سے نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض جو حال ہی میں آفتاب بنے ہیں حدود پر مشتمل ہیں اور اسی لئے ان کی روشنی ہم کو بہت تیز نظر آتی ہے بعض ایسے ہیں جو جگہ جگہ پر قریب قریب آتے ہیں اور حرارت کم ہونے کی وجہ سے سرخ گندہ کی طرح فضا میں پکڑے لگا رہے ہیں۔ بعض وہ ہیں جو اپنی آگ میں پھنکے ہوئے ہیں لیکن اپنا مادہ فضا میں منتشر کرنے کرتے بہت سست گئے ہیں اور فضا کی منزل سے قریب تو آگئے ہیں۔

ہمارا آفتاب بھی رفتہ رفتہ اپنی حرارت کھوتا جا رہا ہے اور آہستہ آہستہ سکڑنا جاتا ہے لیکن چونکہ اس کے اندر حرارت کا کافی ذخیرہ موجود ہے اور طویل ہزاروں حرارت کی تلافی اس کے آبی اجزاء کے پھٹنے سے ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے ابھی ۳۰ کروڑ سال تک اس کے ٹھنڈے ہونے کا امکان نہیں۔

کہکشاں کے بننے کے اندر علاوہ ہمارے نظام شمسی کے ایک نئے نظام شمسی پائے جاتے ہیں اس کا صحیح علم اس وقت تک نہیں ہوسکا کیونکہ کوئی دوسری قوی طیفی نہیں جو کہی جو دنیا کے کہکشاں کے تمام سیاروں کو ہمارے سامنے لائے۔ البتہ ۱۹۲۹ء مقام ورگو (Weyl) سے ایک ایسا نظام شمسی نظر آیا جس کے آفتاب کی روشنی ہمارے آفتاب سے پندرہ ہزار گنا زیادہ ہے لیکن اس کے تحت سیارے جو اس کے گرد گھوم رہے ہیں وہ اتنے چھوٹے ہیں کہ ان کے گرد ہم ایک گھنٹہ میں چکر لگا سکتے ہیں۔

ہمارے نظام شمسی کے علاوہ دوسرے شمسی نظاموں میں بھی آثار حیات پائے جاتے ہیں یا نہیں، اس کے بابت کچھ نہیں کہا جاسکتا تاہم اس کا امکان ضرور ہے کیونکہ زندگی کے لئے ضروری ہے کہ ایک کرہ اپنے آفتاب سے نہ اس قدر قریب ہو کہ وہ شدید حرارت سے جھلس جائے اور نہ اس قدر دور کہ ٹھنڈی زیادتی سے وہ بے ہوش ہو جائے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہاں ایسے عناصر موجود ہوں جنہیں بننے کیلئے ضروری ہیں اور ان دونوں باتوں کا ہم کرہ میں پایا جانا یقینی نہیں ہے۔ ہر چند ہماری زمین کو کائنات سے وہی نسبت حاصل ہے جو دیگر کے ایک ذرے کو زمین سے حاصل ہے، لیکن باوجود اس قدر حقیر ہونے کے اس میں زندگی کے تمام شرائط موجود ہیں اور اسی پر قیاس کر کے ہم یہ حکم لگاتے ہیں کہ اگر دوسرے کرہوں کی فضا میں بھی تخلیق حیات کے یہی اسباب پائے جاتے ہیں تو وہاں بھی زندگی ہوگی ورنہ نہیں۔ مگر یہ سب کچھ ہم اپنے زمین کی بنیاد پر کہتے ہیں ورنہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے کرہوں میں شرائط حیات کچھ اور ہیں وہاں کے عناصر کی نوعیت ہم سے مختلف ہو۔ مثلاً ہمارے کرہ زمین کے عناصر میں کاربن کا وجود زندگی کی نہایت اہم شرط تسلیم کیا جاتا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ دوسرے کرہوں میں کاربن کی جگہ کوئی اور عنصر بھی کام دیتا ہو اور وہاں کی مخلوق ہم سے مختلف ہو۔

ہر چند دوسرے نظام ہائے شمسی کی تحقیقات ابھی تک مکمل نہیں ہو سکی ہیں لیکن اس سلسلہ میں بعض نہایت دلچسپ باتیں اور بھی معلوم ہوئی ہیں مثلاً یہ کہ ہزاروں ایسے سیاروں کا پتہ چلا ہے جو کسی نظام شمسی سے تعلق نہیں رکھتے یا اگر کوئی نظام ایسا ہے بھی تو وہ دوسرا کرہ سے زیادہ وسیع نہیں ہے یا یہ کہ بعض ستارے ایسے ہیں جو بنیاد پر ایک ہی نظر آتے ہیں لیکن دراصل میں وہ دو اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کا طواغ کر رہا ہے۔

ستارے اپنے ہم اور دوسری خصوصیات کے لحاظ سے دو قسم کے ہیں۔ ایک درجہ اولی کے دوسرے درجہ دوم کے۔ سب سے بڑا ستارہ قدراول کا وہ ہے جسے ۱۹۳۹ء میں Dr. O. Struve نے دریافت کیا۔ اس کا نصف قطر ایک ارب ۵۰ کروڑ میل کا ہے یعنی اس کا پورا قطر زمین و آفتاب کے فاصلے سے ۱۰ گنا زیادہ ہے۔

ہمارے نظام شمسی سے قریب ترین ستارہ Alpha Centauri (انفا سنٹار) ہے جس کی روشنی ہم تک صرف چار سال میں پہنچتی ہے اور سب سے زیادہ روشن ستارہ Sword Fish ہے جس کا وزن بے حساب پانچ کھرب ٹن فی سکندرم ہوتا جا رہا ہے۔

جو ستارے ہمیں نظر نہیں آتے وہ ہماری زمین سے اتنی دور واقع ہیں کہ ہم یا فسی کے اعداد سے ان کے فاصلہ کا تعین نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہمیں فلکیات نے فاصلے کا حساب لگانے کے لئے روشنی کی رفتار کو اس کا پیمانہ مقرر کیا ہے مثلاً اگر کسی ستارے کی روشنی ہم تک ایک سال میں پہنچتی ہے تو وہ کہیں گے کہ فلاں ستارہ ایک نورانی سال کی دوری پر واقع ہے۔ روشنی کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکندرم ہے اس لئے اگر آپ ایک نورانی سال کو اعداد میں ظاہر کریں گے تو پہلے ایک سال کے سکندرم میں گئے اور پھر اسے ۱۸۶۰۰۰ ضرب دیں گے اس طرح جو نتیجہ برآمد ہوگا وہ اتنے اعداد پر مشتمل ہوگا کہ اس کا لکھنا اور پڑھنا دونوں مشکل ہے، پھر تو ایک ہی نورانی سال کے اعداد ہوں گے، لیکن بعض ستارے جن کی روشنی ہم تک لاکھوں سال میں پہنچتی ہے ان کے اعداد



آفتاب کی سطح ہوا نہیں ہے بلکہ اس میں بڑے بڑے گہرے عاریائے جاتے ہیں جن سے ہر وقت لوہا، سوڈیم اور مین وغیرہ کی مشعلیں گیس شعلوں کی صورت میں بلند ہوتی رہتی ہے۔ آفتاب ایک آتشیں گڑھ ہے اور اس کے انتہا کی شدت کا یہ عالم ہے کہ اس کے شعاعے دو لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اوپر کو چڑھتے ہیں اور ان میں سے بعض ۸۰ ہزار میل بلکہ اس سے زیادہ بلندی تک پہنچ جاتے ہیں۔ راکٹوں پر ۱۸۰۰ میل میں اس کے ایک شعلہ کا مشاہدہ کیا گیا جو پہلے ۳۰ ہزار میل کی بلندی تک پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد یہ بلندی ۸۰ ہزار میل تک پہنچ گئی اور دوسرے گھنٹہ میں وہ ۱۰۰ ہزار میل بلند ہو گیا۔ آفتاب کی اتنی زبردست حرارت کا سبب یہ ہے کہ اس کے مادہ کے پروٹن اور برقیارے ہر وقت ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں اور اس ٹکراؤ سے غیر معمولی حرارت پیدا ہوتی رہتی ہے۔

بول اگر آپ، کبھییں تو آفتاب ایک صاف و روشن کہہ نظر آئے گا لیکن دور بین سے دیکھے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بہت سے سیاہ داغ بھی ہیں  
 واغوں کی دریافت کا فخر گیلو، و فریشیوس کو حاصل ہے جنہوں نے سب سے پہلے ۱۶۱۰ء میں انھیں دریافت کیا۔

یہ داغ دراصل وہاں کے آتش فشاں پہاڑ ہیں جن کے آتشی مادے ہر وقت نہایت تیز آندھیوں کی صورت میں نکلنے رہتے ہیں بعض اوقات دو تین یا اس سے زیادہ داغ مل کر ایک داغ بن جاتا ہے اور کبھی ایک ہی داغ تقسیم ہو کر متحدہ داغوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔

بعض وقت داغ اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ غالی آنکھ سے نظر آنے لگتے ہیں چنانچہ جون ۱۸۴۳ء میں ایک عظیم الشان داغ نظر آیا جس کا عرض ۷ ہزار میل سے زیادہ تھا۔ اس سے قبل ۱۸۳۳ء میں جو داغ نظر آئے ان کی مجموعی پیمائش تین ارب ۸ کروڑ میل تھی ۱۸۵۱ء میں داغوں کا ایک مجموعہ دکھائی دیا جس میں تنہا ایک داغ دو ارب چار سو سے زائد میل کا تھا۔ ۱۸۹۶ء میں آفتاب کے ایک کنارے پر ایک داغ نظر آیا جس کا طول چند دنوں کے بعد ۲ لاکھ ۲۵ ہزار میل ہو گیا اور عرض ۷ ہزار میل۔ یہ داغ ۴۰ دن تک قائم رہا بعض وقت داغوں میں اس قدر جلد نشی پیدا ہو جاتا ہے کہ دیکھنے سے دیکھتے ان کی شکل کچھ سے کچھ بد جاتی ہے۔ جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سطح آفتاب پر آگ کا جو ظالم ہر وقت برپا رہتا ہے اس کی صورت بھی ہمیشہ کیساں نہیں رہتی آفتاب کے داغوں کا زمین پر بھی اثر پڑتا ہے، چنانچہ جب آفتاب کی سطح پر زیادہ داغ پائے جاتے ہیں تو قطب نامی کی سمت ٹھیک شمال کی طرف نہیں رہتی بلکہ بعض ممالک کی طرف اور بعض ممالک میں مغرب کی طرف ہٹ جاتی ہے اس کے علاوہ اس سوئی کا اضطراب بھی بڑھ جاتا ہے۔ اور جیپ فروری ۱۸۹۶ء میں عظیم الشان داغ نظر آیا تو دوسرے کے وقت کچھ دیر کے لئے ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کے تاروں نے بھی کام دینا چھوڑ دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ آفتاب کائنات میں کوئی اہمیت رکھے یا نہ رکھے لیکن ہمارے لئے وہ بڑی اہم چیز ہے۔ اسی کی روشنی اور حرارت کی وجہ سے زمین کے تمام جاندار زندہ ہیں اور اس کی بدولت ہمارے باغ اور کشتیاں بار آور ہوتی ہیں۔

زمین کو چھانی حرارت آفتاب سے پہنچتی ہے اس کا اندازہ یوں کیجئے کہ اگر زمین کے گرد ۳۸ گز موٹی تہ برف کی جہم جائے تو آفتاب کی حرارت ایک پل میں اس کو گھلا کر رکھ دے یا ایک منٹ میں ۳۸ ہزار ڈیگری یا فی گھنٹہ لادے۔

نظام شمسی سے ہماری زمین کے علاوہ آٹھ سیارے اور متعلق ہیں، پہلے انھیں صرف سات (سبع سیارہ) سمجھا جاتا تھا لیکن اب ان میں دو کا اضافہ اور ہو گیا ہے۔ جن دو سیاروں کا اضافہ ہوا ہے، ان کے نام یورانوس، Neptunum اور پلوٹو. Pluto ہیں۔

یورانیوس، آفتاب سے ۱۹ ارب میل دور ہے اور پلوٹو اس سے بھی زیادہ بعید فاصلے پر واقع ہے۔ نظام شمسی کے باقی چھ سیاروں کے نام یہ ہیں:- مریخ، Mars، مشتری، Jupiter، زحل، Saturn، زہرہ، Venus، نیپچون، Neptune، عطارد، Mercury جن کے دلچسپ حالات آپ پر کبھی سنیں گے۔

(آجکل)

# مشکلات غالب

(مسلسل از جولائی ۱۹۵۶ء)

غزل (۳۵)

بھر مجھے دیدہ تر یاد آیا دل، جگر تشنہ فریاد آیا  
جگر تشنہ (سخت تشنہ)۔

شعر کا دوسرا مصرعہ پہلے پڑھا جائے اور پہلا مصرعہ اس کے بعد، تو مفہوم یہ پیدا ہوگا کہ جب دل فریاد کے لئے بیتاب ہوا تو مجھے اپنا دیدہ تر بھی یاد آیا یعنی وہ وقت یاد آگیا جب میں فریاد کے ساتھ روتا بھی رہتا تھا، لیکن اگر دونوں مصرعوں کو اپنی اپنی جگہ رکھ کر غور کیا جائے تو دوسرا مفہوم یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیٹھے بیٹھے مجھے پھر اپنا زمان اشکباری یاد آگیا اور میں پھر لذت اشکباری حاصل کرنے کے لئے فریاد پر بیتاب ہو گیا۔ دونوں صورتوں میں مفہوم قریب قریب ایک ہی سا پایا جاتا ہے۔

۲۳۔

ساد گہہائے تمنا، یعنی، پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا  
نیرنگ نظریں اضافت نہیں، بلکہ پورا فقرہ صفت ہے محبوب کی۔ مفہوم یہ ہے کہ اپنی تمناؤں کی سادگی کا کچھ ٹھکانا ہے کہ باوجود اس علم و تجربہ کے محبوب پُرفتن فریب میں مبتلا رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کرتا، میں پھر اس کی تمنا کرتا ہوں اور پھر اس سے وفا یا لطف و کرم کی توقع رکھتا ہوں۔

۹۔

کوئی دیرانی سی دیرانی ہے، دشت کو دیکھ کے گھریا دیا  
میں گھر کی دیرانی سے گھر اکبر سرا گیا، لیکن وہاں بھی وہی گھر کی سی دیرانی دیکھی اس شعر میں (بقول حالی) صرغ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ دشت اور گھر کی دیرانی بالکل ایک سی ہے۔  
لیکن اس شعر میں حسن اس وقت پیدا ہوتا جب یہ ظاہر کیا جاتا کہ میرا گھر دشت سے زیادہ دیران ہے۔ اگر پہلے مصرعہ سے یہ مفہوم پیدا ہو سکتا کہ "دشت کی دیرانی بھی کوئی دیرانی ہے" تو بیشک گھر کی دیرانی دشت سے بڑھ جاتی ہے۔ لفظ آسی نے یہ مفہوم پیدا ہونے نہ دیا۔

۱۰۔

بے جنوں پہ درکین میں اسد سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا،  
اس شعر میں غالب نے اپنے ادنیٰ و فطری عاشق و مجنون ہونے کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ جب درکین ہی میں مجنوں کے سر پر پتھر پھینکنے کا خیال مجھے پیدا ہوا تو میں رگ نکھا اور مجھے اپنا سر یاد آگیا کہ ایک وقت مجھے بھی دروانہ ہونا ہے اور میرے سر پر بھی درکے پتھر پھینکیں گے۔

## غزل (۳۶)

۳۔ قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد۔ ہاں کچھ اک رنج گرا نہاری زنجیر بھی تھا  
شعر کا مطلب صاف ہے، لیکن پہلے مصرعہ میں لفظ ہے زمانہ حال کو ظاہر کرتا ہے اور دوسرے مصرعہ میں لفظ تھا زمانہ ماضی کو۔  
اگر پہلے مصرعہ میں ہے کو تھی سمجھا جائے تو یہ تناقض دور ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس شعر کا مفہوم یہ ہو کہ جس وقت میں مقید کیا  
گیا تھا اُس وقت یہ خیال ضرور پیدا ہوا تھا کہ ممکن ہے زنجیر کا بوجھ ناقابل برداشت ہو، لیکن اب قید ہو جانے کے بعد قہری زلف  
کی یاد کے علاوہ گرا نہاری زنجیر کا خیال بھی باقی نہ رہا۔

۴۔ دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کیجھ ٹھنڈا۔ نالہ کرتا تھا دے طالب تاثیر بھی تھا  
غیر کا نالہ کرنا اور پھر تاثیر کا معنی ہونا ظاہر کرتا ہے کہ غیر کا میاب نہ تھا اور اس کی اسی ناکامی کا خیال ہمارے لئے باعث  
تسکین تھا۔ یہ شعر مومن کے رنگ کا ہے۔

## غزل (۳۷)

۱۔ لب خشک در تشنگی مردگاں کا زیارت کردہ ہوں دل آزر دگاں کا  
پہلے مصرعہ میں لب خشک کے بعد ہوں محزون ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ تشنگی شوق میں جان دے چکے ہیں میں ان کا  
لب خشک ہوں یعنی میں ان سب کی تشنگی کا منظر ہوں اور میری آزر دگی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ دنیا کے تمام آزر دہ دل میرا حرام کہتے ہیں

۲۔ ہمہ نا امیدی، ہمہ بدگمانی، میں دل ہوں فریب وفا بدگماں کا  
جس طرح فریب وفا میں مبتلا رہنے والوں کا دل ہمیشہ نا امیدی و بدگمانی کا شکار رہتا ہے، بالکل اسی طرح میں بھی فریب وفا  
میں مبتلا ہو کر یکسر نا امیدی و بدگمانی ہو گیا ہوں۔

## غزل (۳۸)

۱۔ تو دوست کسی کا بھی ستگر نہ ہوا تھا اور دل پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا  
”اے ستگر تو دنیا میں کسی کا دوست نہیں ہو سکتا، یہاں تک کہ تو نے غیروں پر وہ ظلم کئے جو کبھی مجھ پر بھی نہ کئے تھے۔“ اس شعر  
میں غالب نے ایک طنز کا ظاہر کرنا چاہا ہے کہ وہ کسی کا دوست نہیں ہو سکتا، یہاں تک کہ اغیار بھی اس کے ظلم سے بچ سکے اور ان پر  
کچھ سے زیادہ ستم روا رکھا گیا اور دوسری طرف اپنے جذبہ رشک کو ظاہر کیا ہے کہ غیروں پر ظلم بھی کیا تو ایسا جو انھیں کے لئے مخصوص  
تھا اور میں اس سے محروم رہا۔ یہ شعر بھی مومن کے رنگ کا ہے۔

(۲) چوڑا مہر خشب کی طرح دستِ قضا نے خورشید ہنوز اس کی برابر نہ ہوا تھا

ہر خشب سے مراد حکیم متفق وہ مصنوعی چاند ہے جو اس نے بعض کیمیا کی اجزاء سے بنایا تھا اور کچھ دیر روشن رہتا تھا یہ مصنوعی چاند بعد کو فنا ہو گیا۔  
غالب اسی تقبیح و تشبیہ کو سامنے رکھ کر کہنا چاہتا ہے کہ جس طرح ”ماہِ خشب“ اصلی چاند کا مقابلہ نہ کر سکا وہ حکیم متفق کو شش کو چھوڑ دیا اسی طرح قدرت نے بھی چاند کو تنہا کہ وہ محبوب کی تابشِ حسن کے مقابلہ میں غور نشید بنائے لیکن جب اس نے یہ محسوس کیا کہ اس میں کامیابی ممکن نہیں تو پھر یہ خیال ترک کر دیا اور غور نشید جیسا ناقص تھا ویسا ہی رہ گیا۔ معاذ یہ کہ میرے محبوب کی تابشِ جمال کے مقابلہ میں سورج نہیں کر سکتا۔

۳۔ توفیقِ باندازہ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گہر نہ ہوا تھا  
قدرت کا دستور ہے کہ جو شخص جتنی ہمت کرتا ہے، اتنی ہی توفیق اس کو عطا ہوتی ہے۔ قطرہ نیساں نے صرف موتی بننے کی تمنا کی اور وہ موتی بن گیا۔ لیکن وہ قطرہ اب جس نے اس سے زیادہ ہمت کی وہ آنسو بنا۔ معاذ یہ کہ آنسو کی قیمت موتی سے زیادہ ہے۔

۵۔ میں سادہ دل آزر دلی یار سے خوش ہوں یعنی سبقِ شوق کمر نہ ہوا تھا  
دوست کی آزر دلی سے میں اس لئے خوش ہوں کہ اس طرح مجھے دوبارہ اظہارِ شوق اور محبوب کو منانے کا موقع ملے گا، لیکن اس خیال کو وہ لحاظ نتیجہ وہ محض سادہ دلی سے تعبیر کرتا ہے، کیونکہ اس طرح آزر دلی یار دور نہ ہو سکے گی اور اگر مہوئی بھی تو اس کا کوئی متبادل نہیں

۷۔ جاری تھی آئندہ داغِ جگر سے مری تحصیل آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا  
مشہور ہے کہ جب آتشکدہ میں صدیوں تک آگ مسلسل روشن رہتی ہے تو اس میں ایک کیڑا پیدا ہو جاتا ہے جسے سمندر کہتے ہیں تحصیل سے مراد ”تحصیلِ آتشِ نفسی“ ہے۔ معاذ یہ کہ میرے داغِ جگر کی گرمی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب آتشکدہ میں سمندر بھی پیدا نہ ہوا تھا اور اس طرح دنیا کا کوئی آتشکدہ میرے داغِ جگر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

## غزل (۳۹)

(۱) شب کہ وہ مجلسِ فروزِ خلوت ناموس تھا رشتہ ہر شمعِ خارِ کسوتِ فانوس تھا  
خلوت ناموس = خلوت شرم و حیا۔ رشتہ شمع، شمع کے اندر کے دھاگے کو کہتے ہیں۔ کسوت = لباس۔  
مفہوم یہ ہے کہ رات کی خلوت شرم و حیا میں جب وہ جلوہ افروز ہوا تو ہر شمعِ خارِ دورِ پیراہن (مضطرب) نظر آنے لگی کیونکہ اسکی خلوت ناموس اس کی مقتضی نہ تھی کہ وہاں شمع کا وجود بھی پایا جاتا۔  
کسوت فانوس کو پیراہن اور رشتہ شمع کو خار قرار دیکر خارجی محاورہ ”خار و پیراہن“ استعمال کیا گیا ہے۔  
اس شعر میں محبوب کے تقدسِ شرم و حیا کا اظہارِ بیدل کے انداز میں کیا گیا ہے۔

۳۔ حاصلِ اُلفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو دل بدل پیوستہ گوئی ایک لبِ افسوس تھا  
مفہوم یہ ہے کہ اُلفت اگر کامیاب ہو تو بھی اس کا انجام مایوسی اور شکستِ آرزو کے سوا کچھ نہیں، یہاں تک کہ اگر

عاشق و محبوب دونوں کے دل ایک دوسرے پیوستہ (ملے ہوئے) نظر آئیں تو بھی ان کی حالت ایسی ہی رہی جیسے افسوس کی حالت میں لب ل جاتے ہیں۔

۴۔ کیا کہوں بیماری غم کی فراغت کا بیان جو کہ کھایا، خون دل بے منت کیوس تھا  
 ”کیوس“ ہضم طعام کا دوسرا درجہ ہے جب غذا معدہ میں رقیق ہو کر خون کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پہلا درجہ ہضم کیوس کہلاتا ہے۔  
 مفہوم یہ ہے کہ بیماری غم کی فراغت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ میں کھاتا ہوں وہ کیوس کی منزل سے گزرے بغیر خون بن جاتا ہے اور گویا صبح معنی میں یہ ہوسکتا ہوں کہ میں کھانا نہیں کھاتا، بلکہ خون کھاتا ہوں۔

### غزل (۴۱)

۴۔ بروئے شمش جہت در آئینہ باز ہے یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا،  
 شمش جہت (سہل طر، سہل جگہ)۔ یاں سے مراد زمانہ یا نظام فطرت ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ قدرت ناقص و کامل کا امتیاز نہیں کرتی اور اس نے چاروں طرف ”در آئینہ“ باز کر دئے ہیں اور ہر شخص اپنی قصور (وہ جیسی بھی ہو) اسکے اندر دیکھ سکتا ہے۔

۵۔ وا کر دئے ہیں شوق نے بند نقاب حسن غیر از نگاہ اب کوئی حایل نہیں رہا  
 یعنی میرے جذبہ شوق نے حسن کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے اور اس کے مطالعہ کے لئے اب اگر کوئی چیز حایل ہے تو وہ صرف نگاہ ہے درحالیہ کہ حجابات حسن دور ہونے کے بعد اس کا مطالعہ آنکھ بند کر دینے کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔

### غزل (۴۲)

۲۔ ذرہ ذرہ ساغر میخانہ نیرنگ ہے، گردش مجنوں پہ چشمکھائے بلی آشنا  
 میخانہ نیرنگ (طاسم زار عالم)۔ چشمکھائے بلی (بلی کے اشارے ہائے چشم) اُردو میں چشمک کا استعمال رنجش کے مفہوم میں بھی ہوتا ہے۔  
 مفہوم یہ ہے کہ جس طرح مجنوں کی صحرا نور دیاں صرف بلی کے اشارہ چشم کی آشنا و تابع ہیں، اسی طرح دنیا کا ذرہ ذرہ قدرت کے میخانہ نیرنگ کا ساغر ہے اور اسی کے اشاروں پر ایک ایک ذرہ کی گردش کا رہنما ہے۔ یعنی تمام مظاہر و آثار ایک خاص قانون قدرت کے پابند ہیں، جس سے انحراف ممکن نہیں۔

۳۔ شوق ہر سامان طراز نازش از باب مجبوز ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا  
 مفہوم یہ ہے کہ ہم از باب مجبوز (مجبوت) کے فرو ناز کے لئے ہمارا شوق محبت کافی ہے جو ہماری ذرہ آہسا اور قطرہ شمال ہوتا ہے۔  
 صحرا کی وسعت اور دریا کی سی سائی پیدا کر دیتا ہے۔

۵- کوہکن نقاش یک تمثال شیریں تھا اسد سنگ سے سر مار کر ہو سے نہ پیدا آسنا  
فراد محض ایک نقاش تھا جو پتھر کاٹ کر شیریں کی تصویر بنانا چاہتا تھا، اگر صحیح معنی میں عاشق ہوتا تو یہ بھی کوئی بات تھی  
کہ وہ پتھر پر سر مارتا اور شیریں سامنے نہ آجاتی۔

غزل (۴۳) و (۴۴) صاف ہیں

### غزل (۴۵)

۵- غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے در نہیاں بے شانہ سبا نہیں مٹ رہ گیاہ کا  
انسان اپنی غفلت سے اس وہم میں مبتلا ہے کہ وہ اس کی فلاح و صلاح خود اس کی کوشش و تدبیر کا نتیجہ ہے، حالانکہ  
در اصل یہ سب کچھ قدرت کی طرف سے ہوتا ہے جسے کہ گھاس ایسی حقیر چیز کی زیبائش میں بھی صبا کا ماتہ شامل ہوتا ہے۔

۲- بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کر رنگ صیدے زدام جستہ ہے اس دامگاہ کا  
عیش کو تمنا سے الگ پڑھنا چاہئے، عیش تمنا نہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ مے نوشی سے یہ تمنا رکھنا کہ وہ باعث مسرت و انبساط  
ہوگی صحیح نہیں، کیونکہ یہ ایک ایسا صید ہے جو اس دامگاہ سے نکل کر بھاگ چکا ہے۔ یعنی اگر مے نوشی سے کچھ مسرت ہوتی بھی ہے تو  
وہ ایسی ہی گریز پا ہوتی ہے جیسے کوئی صید دام میں آکر نکل جائے۔  
اسی خیال کو غالب نے دوسری جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے :-  
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاء کو

غزل (۴۶) صاف ہے

### غزل (۴۷)

(۱) لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن رنگار ہے آئینہ باد بہاری کا  
پہلا مصرع میں یہ دعویٰ لیا گیا ہے کہ لطافت بے کثافت کے یار و حاضرت بغیر مادی ذرائع کے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کا ثبوت دوسرے  
مصرع میں یہ پیش کیا گیا ہے کہ باد بہاری جو بجائے خود بڑی لطیف چیز ہے، چمن ہی کے دسات سے میراقتی ہے اور چمن کی حیثیت آئینہ  
بہار کے رنگار کی سی ہے جو کیفیت چیز ہے۔ آئینہ کے پیچھے جب تک رنگار نہ پیدا کیا جائے وہ عکس پذیر نہیں ہوتا۔

۲- حریف جوشش دریا نہیں خود داری ساحل جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا  
مفہوم یہ ہے کہ ساحل لاکھ خود دار ہو لیکن جب دریا جوش پر آتا ہے تو وہ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اسی طرح جس محفل کا  
ساقی تو ہو، وہاں ہوشیاری کا دعویٰ کن کر سکتا ہے۔

## غزل (۴۸)

- ۹۔ تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہو اے صیقل  
دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا  
ہو اے صیقل = صیقل کی خواہش -  
برسات میں آئینہ فولاد پر رنگ آجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ رنگارنگ صیقل آئینہ کا باعث ہوتا ہے۔ مدعا یہ کہ جب شوق کامل ہوتا ہے تو اس کے پورا ہو جانے کے اسباب خود پیدا ہو جاتے ہیں۔

## غزل (۴۹)

- ۱۔ اس غزل میں غالب نے موسم بہار میں لطف سے کشی کا اظہار ایک خاص انداز میں کیا ہے۔ اس میں فارسی ترکیبیں بکثرت استعمال کی ہیں، لیکن کوئی مصنوعی اشکال ان میں نہیں ہے۔

## غزل (۵۰)

- ۱۔ افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے  
جن لوگوں کی تھی درخور عقیدہ گہر انگشت  
یعنی وہ اونگھیاں جو کسی وقت موتی کی لڑی سے کھینچی تھیں آج وہی انتہائے یاس و ناکامی میں دانتوں سے کافی جا رہی ہیں۔

غزل (۵۱) صاف ہے اور نمبر (۵۲) میں صرف ایک شعر ہے اور تشریح طلب نہیں

## غزل (۵۳)

- ۱۔ آدھ خط سے ہوا ہے سرود بازار دوست  
دو دھمکے کشتہ تھا شاید خط رخسار دوست  
جس طرح شمع گل ہونے پر پروانے نظر نہیں آتے اسی طرح خط کے آنے سے بازار دوست سرود ہو گیا یعنی اس کے عشاق کم ہو گئے،  
گویا سبز خط بھی ہوئی شمع کا دھواں تھا۔

- ۳۔ خانہ ویراں سازی حیرت تماشہ کیجئے  
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتہ رفتہ رخسار دوست  
خانہ ویراں سازی (گھر جاڑنا)۔ تماشہ کیجئے (دیکھئے) فارسی میں تماشہ گردن دیکھنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ رفتہ (وادفتہ)  
محبوب ایک راستہ سے گزرتا ہے اور عاشق اس کی رفتار کو دیکھ کر محو حیرت ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں بھی گویا نقش قدم ہوں  
اور اسی طرح مجھے بھی خانہ برباد ہو جانا ہے۔

نقش قدم میں صورت صرف بربادی ہی کی نہیں بلکہ حیرت کی بھی پائی جاتی ہے اور اسی لئے غالب کا خیال "خانہ ویراں سازی حیرت" کی طرف منتقل ہوا۔

۴- عشق میں بہادری و رشک غیر نے مارا مجھے کشتہ دشمن ہوں آخر، گرم تھا بیمار دوست میں بیمار دوست ہوں اور اسی بیماری میں مجھے حلق دینا چاہئے تھی، لیکن ہوا یہ کہ دشمن پر اس کا انتقام یا ظلم زیادہ ہو گیا اور میں اس رشک سے جاں بزنہ ہو سکا۔ گویا کشتہ دوست ہونے کی جگہ مجھے کشتہ دشمن ہونا پڑا۔

۵- چشم مارو شن کہ اس بیدار و کا دل بٹا دے دیرہ پرخوں ہمارا ساغر سرشار دوست اگر ہمارا دیدہ پرخوں بیدار دوست کے نزدیک ایک ساغر لہری کی کیفیت رہتا ہے تو ہم بھی اس سے خوش ہیں اور ہم کھاسکی کوئی شکایت نہیں۔ اگر دوسرے مصرع کو پہلے پڑھا جائے اور وہ بھی خرد و تعجب کے لہجہ میں، تو مفہم زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

### غزل (۵۴)

۱- گلشن میں بند و لبست برنگِ دگر ہے آج قمری کا طوق حلقہ بیرونِ در ہے آج آج محبوب سیر گلشن کے لئے آ رہا ہے اور اس انتہام و پابندی کے ساتھ کہ کوئی دوسرا آنے پائے، یہاں تک کہ قمری کو بھی گلشن میں رسائی نہیں اور اس طرح اس کے گلے کا طوق، گویا باغ کے دروازہ کی زنجیر ہو کر رہ گیا ہے۔

۲- آتا ہے ایک پارہ دل ہر فغاں کے ساتھ تارِ نفس کند شکارِ اثر ہے آج ہمارے تارِ نفس کی گند نے آج اثر کو شکار کر لیا ہے، لیکن بدبختی سے اس اثر کی صورت یہ ہے کہ ہماری ہر فغاں دل کا ایک ٹکڑا لے کر باہر آتی ہے۔

### غزل (۵۵)

۲- کمال گرمی سعی تلاش دید نہ پوچھے برنگِ خار مرے ہائینہ سے جو ہر کینچ دیدار کے جو انتہائی کوششیں ہیں نے کی ہیں، ان کا حال مجھ سے نہ پوچھو بلکہ میرے آئینہ حیرت کو دیکھ کر معلوم کرو جس میں جوہر کی جگہ تم کو خار ہی خار نظر آئیں گے۔

(۵) بہنیم غمزہ ادا کر جنِ ودیعت ناز، بنیام پردہ زخیم جگر سے فخر کینچ ودیعت - امانت -

محبوب کا فخر ناز ایک ودیعت یا امانت تھا جسے غالب نے اپنے نہام زخم جگر میں چھار کا تھا لیکن اب وہ اپنی اس عداوت و انتہاری کا معاوضہ اس صورت سے چاہتا ہے کہ محبوب "نیم غمزہ" سے کام لے کر اس فخر کو جگر سے باہر کینچ لے۔ سوال یہ ہے کہ غالب نے "نیم غمزہ" کیوں کہا اور جگر سے فخر باہر کینچ لینا کیونکر امانت یا عداوت کا معاوضہ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے سمجھ لیجئے کہ غالب نے فخر ناز کہا ہے اور اسی کے ساتھ "نیم غمزہ" کے ساتھ اس فخر کے کینچ لینے کی عداوت کی ہے۔ اس لئے یہ تمام اشارات و جود کرنے کے بعد غمزہ کا معاوضہ ہو سکتا ہے۔

یہ سادہ الفاظ میں مفہوم یہ ہے کہ استعمال کرنا۔

ختمے کام نے کراسے باہر نکال لے اور دوبارہ پھر میرے جگر کو مجروح کر دیا۔  
یا جائے "نیم غمزہ" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ دل کو مجروح کرنے کے لئے "نیم غمزہ"  
عجاز ہوا ہے۔  
میرے قروح میں ہے سہرا کی خواہش۔  
سے مراد قروح دل سے آئینہ فلاں پر رنگ آجاتا ہے اور۔  
برسات میں آئینہ فلاں پر رنگ آجاتا ہے اور۔  
ہے تو اس کے پورا ہو جانے کے اسباب خود پیدا ہو۔

جسے آتش پہناں بروئے سفر کباب دل سمندر کھینچ  
اور آتش پہناں سے آتش محبت۔  
(سرخاں) - سمندر (آگ کا کپڑا)  
یہ ساغر دل میں آتش محبت کی شراب بھری ہوئی ہے اور وہی میں پیتا رہتا ہوں اس لئے گزک کے لئے مجھے حل سمندر  
کباب چاہئے۔

## غزل (۵۷)

اس غزل میں غالب نے اپنے اٹھ بانی پر آپ اپنا ماتم کیا ہے اور نہایت لطیف شاعرانہ انداز میں ظاہر کیا ہے کہ ایک میرے نہ ہونے  
سے دنیائے حسن و عشق کس کس طرح ویران ہوئی اور گئے کار و بار عشق مغل ہو گئے۔ معشوقوں نے غمزہ و ناز سے ہاتھ اٹھا لیا  
سرمہ لگا چھوڑ دیا۔ اہل جنوں سے جنوں نصرت ہو گیا، عشق پر سو گوارا طاری ہو گئی وغیرہ وغیرہ۔  
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے شعلہ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد  
جس طرح شمع بجھنے کے بعد اس سے دھواں اٹھتا ہے جو علامت ہے سو گوارا کی، اسی طرح میرے بعد شعلہ عشق سیہ پوش  
(دانتوں) ہو گیا، کیونکہ اب محمد سادہ سرا کہاں پیدا ہوگا جو شعلہ عشق کی گرمی کو باقی رکھ سکے۔

۵۔ درخور عرض نہیں جو سہرا پیدا کو با، لگہ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد  
وہتر (اصل ادہ) - عرض (وہ چیز جس کے ذریعہ سے جو ظاہر ہوتا ہے)۔ مفہوم یہ ہے کہ محبوب کے جو سہرا پیدا ظاہر ہونے  
کے لئے ہمیشہ کسی کسی عرض کی ضرورت تھی اور وہ عرض یا منظر میری ذات تھی اس لئے اب کہ میں نہیں ہوں، اس کی لگہ ناز  
کس کے لئے سرمہ آلود ہو۔ مدعا یہ کہ اس کی "چشم سرمگیں" کا سمجھ ہون صرف میں ہو سکتا تھا۔ اس لئے اب میں نہیں  
تو وہ کیوں سرمہ استعمال کرے، کوئی اور اس قابل ہی نہیں ہے۔

۶۔ ہے جنوں اہل جنوں کے لئے آغوش و دایہ چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد  
اس شعر میں غالب نے اپنے ذوق جنوں کی باتداری کی ہے اور وہ اس طرح کہ میرے نہ ہونے سے اب تمام اسباب جنوں درہم برہم  
ہو گئے ہیں، چاک گریباں سے جدا ہو رہا ہے اور گریباں چاک سے۔ گویا یوں سمجھو کہ جنوں اہل جنوں سے نصرت ہو رہا ہے اور وہ  
درہم دلائی جو میں نے قائم کی تھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو رہی ہے۔  
(غزل نمبر ۵۸ و ۵۹ صاف ہیں)

# باب الاستفسار

## سعودی عرب اور وہابی تحریک

### (بہ جواب استفسار)

وہابی جماعت نے مورث اعلیٰ کا نام محمد بن عبد الوہاب تھا۔ اسی لئے یہ جماعت وہابی کے نام سے مشہور ہو گئی، وہ خود اس جماعت کے افراد اپنے آپ کو موحّدین کہتے ہیں اور ابن تیمیہ کے بیان کے مطابق اہل السنّت والجماعت بھی، یہ مسائل فقہ میں امام شافعی کے تابع ہیں۔ محمد بن عبد الوہاب جن کا تعلق تیمیمی قبیلہ کی ایک شاخ بنو سنان سے تھا۔ یہ ایک گاؤں عیونہ میں پیدا ہوئے تھے جو اب ہائل ویران ہے لیکن کسی وقت آباد تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدینہ میں ہوئی۔ سلیمان گردی اور محمد حیات سندھی ان کے استاد تھے۔

ابتدائی ہی سے ان کے خیالات مردہ عقاید سے کچھ ہٹے ہوئے تھے جسے ان کے اساتذہ ”رجحان الحاد“ سے تعبیر کرتے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد عرصہ تک یہ سیر و سیاحت کرتے رہے اور پانچ سال تک بصرہ میں رہے۔ یہاں یہ قاضی حسین کے بچوں کے تالیف تھے۔ اس کے بعد یہ بغداد چلے گئے اور وہاں ۵ سال تک قیام کیا، یہاں ایک دو متمند عورت سے ان کی شادی ہو گئی اور ان کا وفات پر دو ہزار دینار کا ترکہ ان کو ملا۔ اس کے بعد یہ دو سال بغداد میں رہے اور پھر صغہان چلے گئے (یہ زمانہ نادر شاہ کی حکومت کا تھا) یہاں بارہ سال کے قیام میں انھوں نے فلسفہ، اشراقیت و تصوف کا غایر مطالعہ کیا۔ اس کے بعد وہ تم چلے گئے اور یہاں غنوی مسلک اختیار کیا۔ پھر وہ اپنے وطن عیونہ پہنچے اور یہاں چند مہینے خلوت گزریں رہنے کے بعد اپنے مسلک کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے جس کے اسول انھوں نے اپنی تصنیف ”کتاب التوحید“ میں بیان کئے ہیں۔ ان کی تبلیغ عیونہ میں زیادہ مقبول نہیں ہوئی اور خود ان کے حقیقی بھائی سلیمان اور بزرگ زاد عبد اللہ بن حسین نے ان کی مخالفت میں کتابیں لکھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں جماعتوں میں کشت و خون شروع ہو گیا اور آخر کار یہاں کے حاکم نے انہیں عیونہ سے خارج البلد کر دیا۔

یہاں سے نکل کر یہ درعیہ پہنچے جو بہت چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں کے سردار محمد بن سعود نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کا مسلک اختیار کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ آہستہ آہستہ ان کی جماعت میں شامل ہونے لگے اور انھوں نے ایک مسجد تعمیر کر کے یہاں اپنی کتاب التوحید کا درس دینا شروع کیا۔

لیکن ریاض کے شیخ دہام بن دواس نے اس تحریک کی مخالفت کی اور اس طرح محمد بن سعود اور دہام میں لڑائی شروع ہو گئی (۱۱۷۴ھ) جو ۲۸ سال تک قائم رہی، لیکن چونکہ محمد ابن سعود اور ان کا لڑکا عبدالعزیز دونوں بڑے اچھے مجاہد تھے، ان کے فوج بڑے بڑھتی گئی اور اسی کے ساتھ وہابی تحریک بھی۔

جب ۱۱۹۴ھ میں محمد بن سعود کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا عبدالعزیز برسر اقتدار ہوا تو اس نے محمد بن عبد الوہاب کو مستغلا اپنا روحانی و مذہبی پیشوا بنالیا اور اس کے دوسرے سال شریف مکہ کے پاس ایک وفد روانہ کیا اور یہاں کافی بحث و مباحثہ کے بعد وہابیوں کے مسلک کو حنبلی مسلک تسلیم کر دیا گیا۔

میں دہام جو دہابی مسلک کا سخت دشمن تھا، ریاض چھوڑ کر چلا گیا تو عبدالعزیز نے ریاض پر قبضہ کر کے نجد پر اپنا اقتدار میں شریف نے بھی ایک بار دہابیوں کا داخلہ مکہ میں ممنوع قرار دیا یا تھا لیکن چونکہ عراق اور فارس کی طرف سے آئے دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں، اس لئے یہ اقلیتی حکم منسوخ کر دیا گیا۔

جب ۱۸۹۱ء میں محمد بن عبدالعزیز نے نجد کی طرف سے اپنا اقتدار بحال کیا تو اس نے نجد کے پانچواں حصے کی طرف بڑھی اور عراق کی حدود متفق دوران میں شریف نے بھی مغرب کی طرف سے فوج کشی کی۔ لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ ۱۸۹۲ء میں بغداد میں زیادہ وسیع پیمانہ پر دہابیوں کے مقابلہ کی تیاریاں کی گئیں لیکن یہ بھی ناکام رہیں اور آخر کار صلح نامہ ہو گیا اور ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ لیکن اس کا نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا کیونکہ دہابی قبائل کی تاخت اس کے بعد بھی جاری رہی یہاں تک کہ ۱۸۹۵ء میں انھوں نے کربلا پر حملہ کر کے وہاں کی اچھی خاصی آبادی کو ہلاک کر ڈالا اور ۱۸۹۷ء میں سعود نے مکہ پر قبضہ کر کے وہاں بھی کشت و خون کا بازار گرم کیا۔ مدینہ اور جددہ میں البتہ ابن سعود کو کامیابی نہیں ہوئی اور آخر کار اسے مکہ بھی چھوڑنا پڑا کیونکہ جو فوج اس نے وہاں متعین کی تھی اسے اہل مکہ نے ختم کر دیا تھا۔

جب ۱۸۹۷ء میں عبدالعزیز اول جو دہابیوں کا امام تھا، درعیہ میں کربلا کے ایک شیعہ کے ہاتھ سے قتل ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا سعود امام مقرر ہوا اور اس نے اپنے بیٹے عبداللہ کو فوج کا جنرل مقرر کیا۔ اس دوران میں بغداد کی طرف سے اس تحریک کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ناکام رہی۔ اس کے بعد سعود نے دوبارہ حجاز پر حملہ کیا اور تین سال کے اندر مکہ، مدینہ اور جددہ پر قابض ہو گیا۔ ان کامیابیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہابیوں نے سرزمین عرب سے باہر بھی فوجی کارروائیاں شروع کر دیں یہاں تک کہ ۱۸۹۷ء میں ان کی حکومت حلب سے لیکر خلیج فارس اور بحرِ عرب تک وسیع ہو گئی۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو سلطنتِ ترکی کو فکر شروع ہوئی اور اس نے محمد علی پاشا خدیو مصر کو مقابلہ کا حکم دیا اور بمشکل تمام ۱۸۹۷ء میں مکہ اور مدینہ پر دوبارہ قابض ہو سکا۔ اس کے بعد محمد علی خود افواجِ مصر کی کمان اپنے ہاتھ میں لیکر آگے بڑھا لیکن اسے شکست ہوئی۔ حسن اتفاق سے اسی زمانہ (۱۸۹۷ء) میں سعود کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا عبداللہ جانشین ہوا، لیکن اس میں باپ کا ساعزم و ارادہ نہ تھا، اس لئے اس نے صلح کر لی اور حکومتِ ترکی کے اقتدار کو تسلیم کر لیا اور ۱۸۹۷ء میں مصر کے کمانڈر ابراہیم پاشا نے دہابیوں کے مرکز درعیہ پر قبضہ کر کے عبداللہ کو جو دہابیوں کا امام تھا گرفتار کر کے قسطنطنیہ بھیج دیا اور یہاں اس کی گردن مار دی گئی۔ لیکن ان واقعات کے بعد حجاز کی حالت تو سدھ گئی جہاں زبردست ترکی فوج متعین تھی لیکن نجد میں سعود کے ملاوٹ (دگر کی) نے ریاض کو مرکز بنا کر پھر اس تحریک میں جان ڈالی (۱۸۹۷ء) اور ۱۸۹۷ء تک خلیج فارس کے سارے علاقہ پر دہابی حکومت قائم ہو گئی۔ اس کامیابی کا سہرا زیادہ تر ترکی کے لڑکے فیصل کے سر تھا جو دہابی فوج کا سردار تھا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں کسی شخص نے جو اپنے آپ کو شاہی خاندان کا فرد ظاہر کرتا تھا، ترکی کو قتل کر ڈالا (۱۸۹۷ء) لیکن فیصل نے شمر کے سردار عبداللہ بن شمر کی مدد سے اس کو بھی گرفتار کر کے قتل کر دیا اور عبداللہ بن رشید کو حائل کا گورنر بنا دیا۔ یہ بڑا ہوشیار و محتاط شخص تھا اس نے اپنی باہمی سے ایک طرف حجاز کے مصری حاکم کو بھی خوش رکھا اور دوسری طرف ریاض کے دہابی حکمران کو بھی۔ جب ۱۸۹۷ء میں اس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا طلال اس کا جانشین ہوا۔ یہ بڑا زیرک شخص تھا، یہ اپنی ترکیبوں سے جوت، خیر اور تیمار کے علاقوں پر قابض ہو گیا اور بہت سی تجارتی آسانیاں پیدا کر کے عرب کے بدوی قبائل پر بھی اپنا کافی اثر قائم کر لیا۔ ۱۸۹۷ء میں اس نے خرابی و دماغ کی وجہ سے خودکشی کر لی اور اس کا بھائی متعب جانشین ہوا لیکن طلال کے بیٹے (بدد) نے اسے مار ڈالا جو بعد کو خود بھی طلال کے دوسرے بھائی محمد کے ہاتھ قتل ہوا۔

اسی زمانہ میں فضیل کا انتقال ہو گیا (۱۸۶۹ء) اور اس کا بیٹا عبداللہ تخت نشین ہوا لیکن اس کے بعد ہی اس کے بھائی سعود نے سے معزول کر کے خلیفہ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کا زمانہ بہت ناکام ثابت ہوا اور کافی علاقہ ہاتھ سے نکل گیا جب ۱۸۷۷ء میں اس کا انتقال ہوا تو عبداللہ پھر ریاض واپس آ گیا، لیکن بدقسمتی سے محمد بن رشید فرمانروائے حائل سے ان بن ہو گئی اور آخر کار اس شکست کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۸۳ء میں محمد بن رشید نے حملہ کر کے ریاض فتح کر لیا اور عبداللہ کو حائل بھیج کر وہاں اپنا گورنر مقرر کر دیا۔

اس کے بعد ۱۸۹۱ء میں امیر حائل کے خلاف متعدد قبائل کے سرداروں نے باہم مل کر جس میں ریاض کے شاہی خاندان کے فرد بھی شامل تھے، ابن رشید پر فوج کشی کر دی اور گو اول اول انھیں کامیابی بھی ہوئی، لیکن اخیر میں ابن رشید کامیاب ہوا اور عبداللہ حائل فیصل کے دوسرے لڑکے) نے جو ریاض کا گورنر تھا بھاگ کر کویت میں پناہ لی اور ۱۸۷۵ء تک ابن رشید نہایت اطمینان سے حکومت کرتا رہا اس کے بعد اس کا ہرادر عم زاد عبدالعزیز بن متعب تخت نشین ہوا لیکن ۱۸۹۱ء میں عبدالعزیز ابن عبدالرحمان نے اس کے خلاف فوج کشی کر کے ریاض پھر فتح کر لیا اور اس طرح وہاں وہی پرانا خاندان پھر حکمران ہو گیا اور ۱۹۰۲ء تک اس نے تمام کھوئے ہوئے علاقے واپس لے کر پھر ایک وسیع و باری حکومت قائم کر لی۔ اس کے بعد اسے ابن رشید، ترکی حکومت، فرمانروائے حجاز اور خود اپنے مزہ سے مسلسل جنگ کرنا پڑی لیکن وہ ان سب میں کامیاب ہوا اور آخر کار ۱۹۲۱ء میں حائل پر ۱۹۲۲ء میں مکہ پر ۱۹۲۵ء میں رینہ اور جدہ پر اس کا پورا قبضہ ہو گیا اور اس طرح سارا حجاز، سعودی حکومت میں شامل ہو گیا۔

## ہندوستان

ہندوستان میں دہلی تحریک کا آغاز سید احمد بریلوی سے ہوا۔ یہ رائے بریلی میں پیدا ہوئے تھے (۱۸۷۶ء) جب ۱۸۲۲ء میں یہ جج سے فارغ ہو کر ہندوستان آئے تو یہ دہلی تعلیمات سے اس درجہ متاثر تھے کہ انھوں نے لوٹ کر ہندوستان میں بھی یہ تحریک شروع کر دی اور پہلے اپنا صدر مقام قرار دیا۔ دو تین سال کے اندر کلکتہ، ممبئی وغیرہ کا دورہ کر کے بہت سے متبعین پیدا کر کے اور پشاور کی مسجد پر اپنی فوج جمع کر کے پنجاب کی سبھ حکومت کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا اور ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو جنگ شروع کر دی۔ سکھوں نے پورا مقابلہ کیا لیکن ۱۸۳۳ء میں پشاور پر سید احمد صاحب کا قبضہ ہو گیا مگر اس کے دوسرے ہی سال سکھوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

اس کے بعد ان کے متبعین ستان میں پناہ گزیں ہو گئے اور ان کے دو خلفائے جو پہلے سے تعلق رکھتے تھے جہاد کی تحریک کو جاری رکھا، مشرقی بنگال میں ان کے ایک مرید ٹیٹو میاں نے انگریزی حکومت کا مقابلہ کیا اور ۱۸۳۱ء میں یہ بھی شہید ہوئے اسکے بعد بھی ۱۸۷۱ء تک یہ سلسلہ براہ جاری رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ جہاد کی روح ختم ہو گئی اور صرف شعائر و عقاید کے لحاظ سے دہلی جات باقی رہ گئی جو اب بھی باقی ہے۔

ہندوستان کے علاوہ عراق میں بھی اس جماعت نے روسی حکومت کے خلاف جہاد کا اعلان کیا (۱۸۷۱ء) لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔

## دہلی لٹریچر

دہلی لٹریچر میں اس جماعت کے بانی محمد عبدالوہاب کی تین کتابیں: مختصر السیرۃ، کتاب التوحید، کتاب لکھنا ترغیص اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک اور کتاب روشنتہ الافکار ہے جو ان کے رسائل و فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ دہلی جماعت کے دوسرے اکابر نے بھی بعض کتابیں لکھیں، جن میں سے بعض شایع ہو چکی ہیں۔ دہلیوں کے خلاف جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی کم نہیں، اس بحث و نزاع میں ہمارے بعض اکابر علماء نے بھی سنجیدگی و متانت سے کام نہیں لیا۔ حتیٰ کہ ایک بار محض اس مسئلہ پر کہ کوا حلال ہے یا حرام، ایسے علمی احتجاج کی صورت اختیار کر لی کہ کوئوں کو اپنی جان کے لئے پڑنے پڑنے ان کی تعلیمات کا اصول یہ تھا کہ:-

۱۔ تیسری صدی ہجری سے جو بدعات مسلمانوں میں پیدا ہو گئی تھیں ان کو مٹایا جائے۔

جب ۱۸۶۱ء میں وہام جو وہابی مسلک کا سخت دشمن تھا، ریاض چھوڑ کر چلا گیا تو عبدالعزیز نے ریاض پر قبضہ کر کے نجد پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اس دوران میں شریف مکہ نے بھی ایک بار وہابیوں کا داخلہ مکہ میں ممنوع قرار دیا یا تھا لیکن چونکہ عراق اور فارس کی طرف سے آئے دسے عازمین حج کیلئے دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں، اس لئے یہ امتناعی حکم منسوخ کر دیا گیا۔

جب ۱۸۶۲ء میں محمد بن عبدالوہاب کا ۸۹ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا تو یہ وہابی تحریک مشرق کی طرف بڑھی اور عراق کی حدود متفق تک پہنچ گئی اور سلطان ترکی نے اس تحریک کو دبانے کے لئے بغداد کے پاشا کو ہدایت کی، اسی کے ساتھ متفق کے سردار (گورنر) نے بھی جو اس وقت بصرہ کا حاکم تھا، عسکری قوت سے اس تحریک کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوا اور ۱۸۶۹ء میں مار ڈالا گیا اسی دوران میں شریف مکہ نے بھی مغرب کی طرف سے فوج کشی کی۔ لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ ۱۸۶۹ء میں بغداد میں زیادہ وسیع پیمانہ پر وہابیوں کے مقابلہ کی تیاریاں کی گئیں لیکن یہ بھی ناکام رہیں اور آخر کار صلح نامہ ہو گیا اور ایک معاہدہ پر دستخط ہو گئے۔ لیکن اس کا نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا کیونکہ وہابی قبائل کی تاخت اس کے بعد بھی جاری رہی یہاں تک کہ ۱۸۷۰ء میں انہوں نے کربلا پر حملہ کر کے وہابی کی اچھی خاصی آبادی کو ہلاک کر ڈالا اور ۱۸۷۰ء میں سعود نے مکہ پر قبضہ کر کے وہاں بھی گشت و خون کا بازار گرم کیا۔

مدینہ اور جدہ میں البتہ ابن سعود کو کامیابی نہیں ہوئی اور آخر کار اسے مکہ بھی چھوڑنا پڑا کیونکہ جو فوج اس نے وہاں متعین کی تھی اسے اہل مکہ نے ختم کر دیا تھا۔

جب ۱۸۷۰ء میں عبدالعزیز اول جو وہابیوں کا نام تھا، درعیہ میں کربلا کے ایک شیعہ کے ہاتھ سے قتل ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا سعود امام مقرر ہوا اور اس نے اپنے بیٹے عبداللہ کو فوج کا جنرل مقرر کیا۔ اس دوران میں بغداد کی طرف سے اس تحریک کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ناکام رہی۔ اس کے بعد سعود نے دوبارہ حجاز پر حملہ کیا اور تین سال کے اندر مکہ، مدینہ اور جدہ پر قابض ہو گیا۔ ان کامیابیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہابیوں نے سرزمین عرب سے باہر بھی فوجی کارروائیاں شروع کر دیں یہاں تک کہ ۱۸۷۰ء میں ان کی حکومت حلب سے لیکر خلیج فارس اور بحر سرخ تک وسیع ہو گئی۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو سلطنت ترکی کو فکر شروع ہوئی اور اس نے محمد علی پاشا خدیو مصر کو مقابلہ کا حکم دیا اور بمشکل تمام ۱۸۷۰ء میں مکہ اور مدینہ پر دوبارہ قابض ہو سکا۔ اس کے بعد محمد علی خود افواج مصر کی کمان اپنے ہاتھ میں لیکر آگے بڑھا لیکن اسے شکست ہوئی۔ حسن اتفاق سے اسی زمانہ (۱۸۷۰ء) میں سعود کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا عبداللہ جانشین ہوا، لیکن اس میں باپ کا ساعزم و ارادہ نہ تھا، اس لئے اس نے صلح کر لی اور حکومت ترکی کے اقتدار کو تسلیم کر لیا اور ۱۸۷۱ء میں مصر کے کمانڈر ابراہیم پاشا نے وہابیوں کے مرکز درعیہ پر قبضہ کر کے عبداللہ کو جو وہابیوں کا امام تھا گرفتار کر کے قسطنطنیہ بھیج دیا اور یہاں اس کی گردن مار دی گئی۔ لیکن ان واقعات کے بعد حجاز کی حالت تو سدھ گئی جہاں زبردست ترکی فوج متعین تھی لیکن نجد میں سعود کے ملازم زاد (ترکی) نے ریاض کو مرکز بنا کر پھر اس تحریک میں جان ڈالی (۱۸۷۰ء) اور ۱۸۷۳ء تک خلیج فارس کے سارے علاقہ پر وہابی حکومت قائم ہو گئی۔ اس کامیابی کا سہرا زیادہ تر ترکی کے لڑکے فیصل کے سر تھا جو وہابی فوج کا سردار تھا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں کسی شخص نے جو اپنے آپ کو شاہی خاندان کا فرد ظاہر کرتا تھا، ترکی کو قتل کر ڈالا (۱۸۷۳ء) لیکن فیصل نے پھر کے سردار عبداللہ بن رشید کی مدد سے اس کو بھی گرفتار کر کے قتل کر دیا اور عبداللہ بن رشید کو حائل کا گورنر بنا دیا۔ یہ بڑا ہوشیار و محتاط شخص تھا اس نے اپنی باہمی سے ایک طرف حجاز کے مصری حاکم کو بھی خوش رکھا اور دوسری طرف ریاض کے وہابی حکمران کو بھی۔ جب ۱۸۷۳ء میں اس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا طلال اس کا جانشین ہوا۔ یہ بڑا ذریعہ شخص تھا، یہ اپنی ترکیبوں سے جون، خیر اور تیماء کے علاقوں پر قابض ہو گیا اور بہت سی تجارتی آسانیاں پیدا کر کے عرب کے بدوی قبائل پر بھی اپنا کافی اثر قائم کر لیا۔ ۱۸۷۴ء میں اس نے خرابی و دماغ کی وجہ سے خودکشی کر لی اور اس کا بھائی متعب جانشین ہوا لیکن طلال کے بیٹے (بدن) نے اسے مار ڈالا جو بعد کو خود بھی طلال کے دوسرے بھائی محمد کے ہاتھ قتل ہوا۔

اسی زمانہ میں فیصل کا انتقال ہو گیا (۱۸۶۹ء) اور اس کا بیٹا عبداللہ تخت نشین ہوا لیکن اس کے بعد ہی اس کے بھائی سعود نے اسے معزول کر کے خلیفہ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کا زمانہ بہت ناکام ثابت ہوا اور کافی علاقہ ہاتھ سے نکل گیا جب ۱۸۷۷ء میں اس کا انتقال ہوا تو عبداللہ پھر ریاض واپس آ گیا، لیکن بدقسمتی سے محمد بن رشید فرما کر اسے حائل سے ان بن ہو گئی اور آخر کار اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۸۲ء میں محمد بن رشید نے حلد کر کے ریاض فتح کر لیا اور عبداللہ کو حائل بھیج کر وہاں اپنا گورنر مقرر کر دیا۔ اس کے بعد ۱۸۹۱ء میں امیر حائل کے خلاف متعدد قبائل کے سرداروں نے باہم مل کر جس میں ریاض کے شاہی خاندان کے افراد بھی شامل تھے، ابن رشید پر فوج کشی کر دی اور گود اول اول انھیں کامیابی بھی ہوئی، لیکن اخیر میں ابن رشید کامیاب ہوا اور عبداللہ حائل (فیصل کے دوسرے لڑکے) نے جو ریاض کا گورنر تھا بھاگ کر کویت میں پناہ لی اور ۱۸۸۵ء تک ابن رشید نہایت اطمینان سے حکومت کرتا رہا اس کے بعد اس کا برادر عم زاد عبدالعزیز بن متعب تخت نشین ہوا لیکن ۱۸۹۸ء میں عبدالعزیز ابن عبدالرحمان نے اس کے خلاف فوج کشی کر کے ریاض پھر فتح کر لیا اور اس طرح وہاں وہی پرانا خاندان پھر حکمران ہو گیا اور ۱۹۰۲ء تک اس نے تمام کھوئے ہوئے علاقے واپس لے کر پھر ایک وسیع و باری حکومت قائم کر لی۔ اس کے بعد اسے ابن رشید، ترکی حکومت، فرمانروائے حجاز اور خود اپنے اعزہ سے مسلسل جنگ کرنا پڑی لیکن وہ ان سب میں کامیاب ہوا اور آخر کار ۱۹۲۱ء میں حائل پر ۱۹۲۵ء میں مکہ پر ۱۹۲۵ء میں مدینہ اور جدہ پر اس کا پورا قبضہ ہو گیا اور اس طرح سارا حجاز، سعودی حکومت میں شامل ہو گیا۔

## ہندوستان

ہندوستان میں دہائی تحریک کا آغاز سید احمد بریلوی سے ہوا۔ یہ رائے بریلی میں پیدا ہوئے تھے (۱۸۷۷ء) جب ۱۸۲۲ء میں یہ حج سے فارغ ہو کر ہندوستان آئے تو وہ دہائی تعلیمات سے اس درجہ متاثر تھے کہ انھوں نے لوٹ کر ہندوستان میں بھی یہ تحریک شروع کر دی اور پٹنہ اپنا صدر مقام قرار دیا۔ دو تین سال کے اندر کلکتہ، بمبئی وغیرہ کا دورہ کر کے بہت سے متبعین پیدا کر کے اور پشاور کی سرحد پر اپنی فوج جمع کر کے پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا اور ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو جنگ شروع کر دی۔ سکھوں نے پورا مقابلہ کیا لیکن ۱۸۳۳ء میں پشاور پر سید احمد صاحب کا قبضہ ہو گیا مگر اس کے دوسرے ہی سال سکھوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

اس کے بعد ان کے متبعین ستانا میں پناہ گزین ہو گئے اور ان کے دو خلفائے بعد پٹنہ سے تعلق رکھتے تھے جہاد کی تحریک کو جاری رکھا، مشرقی بنگال میں ان کے ایک مرید ٹیٹو میاں نے انگریزی حکومت کا مقابلہ کیا اور ۱۸۳۱ء میں یہ بھی شہید ہوئے اسکے بعد بھی ۱۸۷۱ء تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ جہاد کی روح ختم ہو گئی اور صرف شعائر و عقاید کے لحاظ سے دہائی جہاد باقی رہ گئی جو اب بھی باقی ہے۔

ہندوستان کے علاوہ حقہ میں بھی اس جماعت نے روسی حکومت کے خلاف جہاد کا اعلان کیا (۱۸۷۱ء) لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔

دہائی لٹریچر میں اس جماعت کے بانی محمد عبدالوہاب کی تین کتابیں: مختصر السیرۃ، کتاب التوحید، کتاب الکتبہ خاص دہائی لٹریچر کہتی ہیں۔ ایک اور کتاب روضۃ الافکار ہے جو ان کے رسائل و فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ دہائی جماعت کے دوسرے اکابر نے بھی بعض کتابیں لکھیں، جن میں سے بعض شایع ہو چکی ہیں۔

دہائیوں کے خلاف جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی کم نہیں، اس بحث و نزاع میں ہمارے بعض اکابر علماء نے بھی سنجیدگی و ممانعت سے کام نہیں لیا۔ حتیٰ کہ ایک بار محض اس مسئلہ پر کہ کوا حلال ہے یا حرام، ایسے عملی احتجاج کی صورت اختیار کر لی کہ کوئٹہ کو اپنی جان کے لئے چھوڑنے ان کی تعلیمات کا اصول یہ تھا کہ:-

۱۔ تیسری صدی ہجری سے جو بدعات مسلمانوں میں پیدا ہو گئی تھیں ان کو مٹایا جائے۔

۲۔ خدا کے سوا کسی اور کی پرستش کو شرک قرار دے کر ایسے مشرکین کو واجب القتل قرار دیا جائے۔

۳۔ بزرگوں کے مزاروں کی زیارت، دعاؤں میں خدا کے سوا انبیاء و ملائکہ سے استمداد، قرآن کی تادیل اور مسئلہ قدر سے انکار یہ تمام باتیں شرک سمجھی جائیں۔

اسی طرح حنبلی فقہ کے مطابق انھوں نے نماز باجماعت کو خرش قرار دیا اور تاکو کے استعمال اور داڑھی منڈوانے کو حرم قرار دیکر اس کی تعزیر مقرر کی۔

زکوٰۃ کے مسئلہ میں بھی انھوں نے حنبلی فقہ کو سامنے رکھ کر محفوظ سرمایہ کے علاوہ تنجلی نفع پر بھی زکوٰۃ واجب قرار دی۔ انھوں نے تسبیح کے استعمال کو بھی ناجائز قرار دیا اور اوراد و وظائف میں صرف انگلیوں پر شمار کرنے کا طریقہ درست سمجھا۔ انھوں نے مسجدوں میں منارہ، گنبد، نقوش و نگار کی بھی مخالفت کی۔

دہائی اپنے آپ کو اہل حدیث کہتے ہیں، یعنی اپنے ہر طرز عمل کی سند احادیث سے پیش کرتے ہیں، یہاں تک کہ قرآن سمجھنے کے لئے بھی وہ احادیث کی وساطت سے ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ حدیث و قرآن میں کسی معنوی یا عقلی تادیل کے قائل نہیں اور اس لحاظ سے وہ بہت زیادہ قدامت پسند سمجھے جاتے ہیں اور اپنے مذہبی نقشب کی وجہ سے کافی بڑنام ہیں۔ اس جماعت کے مقابلہ میں ایک دوسری جماعت اہل قرآن کی ہے جو احادیث کو نظر انداز کر کے قرآن کو قرآن ہی سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ جماعت بھی آزاد خیال نہیں، لیکن اتنی قدامت پسند بھی نہیں۔

## ”نگار“ کے پچھلے فائل

عۃ	=	جولائی تا دسمبر	=	۳۲
عۃ	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۲
عۃ	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۶
عۃ	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۹
عۃ	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۰
عۃ	=	جولائی تا دسمبر	=	۴۴
عۃ	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۶
عۃ	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۹
عۃ	=	جنوری تا دسمبر	=	۵۰
عۃ	=	جنوری تا دسمبر	=	۵۲
عۃ	=	جنوری تا دسمبر	=	۵۳

نوٹ :- صرف ایک ایک فائل موجود ہے اور سب پچھلے جلدوں کا آرڈر پونے گا اسی کو دیا جائے گا۔ قیمت محصولہ ایک روپے علاوہ ہے۔

منیر نگار لکھنؤ

# بنام میخانہ

(پروفیسر شوہر)

اک ترشح بنام میخانہ  
پھر وہی دشت، پھر وہی ہیں غزال  
وہ برستی سمندروں پہ خراب  
پھلتے رہنزار کے سائے  
جنگلوں سے وہ لہٹتے دھقان  
شام کے سر پہ آفتاب کی تھال  
پھر اسی ہم سفر کی یاد آئی،  
بتکدہ لے چلے ہیں گنگا جہل  
سامنے ہے وہ دختر زنار  
دام بردوش وہ غزال تنار  
گورے ہاتھوں میں چڑیاں دھانی  
دیپ آکاش کے بجھائے ہوئے  
برگ گل پر دکھتا انگارا  
صبح کی کو شفق کا آئینہ  
موج مے میں دھلا ہوا سا بدن  
دل کا ماتم نگاہ کا شیون  
نالہ کہکشاں، غم ناہید  
امتحان نظر کی تیاری،  
اُس کے اٹھتے ہوئے خنائی ہاتھ  
اک ہنسی لاکھ رنجشوں کا جواب  
کہ سر راہ گفتگو بھی گناہ  
قبضوں میں طال کا عالم  
آرزو کویش بدلتی ہوئی،  
اپنے شعلے کا سوکوار چراغ

اے ہجومِ سحابِ مستانہ  
پھر اسی سمت لے چلا ہو خیال  
وہ ہواؤں میں ابر کے سیلاب  
وقت شانوں پہ بال پھیلائے  
دوش پر اپنے ہل لئے وہ کسان  
دور اڑتا ہوا شفق کا گلال  
خصت اے بام و در کی تنہائی  
آستینیں نچوڑتے بادل،  
پھر تصور ہے میکدہ بکسار  
دور بستی سے شہر کے اُس پار  
عارض و رخ کی صبح سامانی  
قشقہ ماتھے پہ اک لگائے ہوئے  
قشقہ ماتھے پہ صبح کا تارا  
لب لعلیں و مرمریں سینہ  
دلع میں پھول ہاتھ میں کنگن  
قد رعنا پہ چیت پیرا ہن  
زیب گردن وہ سلک مروارید  
سادہ محرم، سفیدی ساری  
حیف اُس شرمگین سلام کے شہا  
جاگتی آنکھ، بولتا ہوا خواب  
وہ تکلف، وہ احتیاط نگاہ  
خاموشی عرض خال کا ماتم  
ہر نظر اک خلش میں ڈھلتی ہوئی  
سو مناجات ایک دل کا داغ

اے ہمالہ کو چومتے بادل  
مجھ کو ہندوستان لیتا چل!!

# ماحول

(قصا ابن فضی)

دفا و سوز و مستی کی کمی دیکھ !  
جگر کی چوٹ ، آنکھوں کی نمی دیکھ !

یہ مرگ انگیز و غم اندوز ماحول  
نہ وہ کیسو ندہ زخما کے سبب  
پیشیاں ہے کئی کی لاش پر دھوپ  
خزاں کا راج ہے حد نظر تک  
صبا آوارہ ، سبزہ بیوطن ہے  
”دماغ عطر پیرا ہن نہیں ہے“  
وہ جلوے ہی نہیں چلن کے پیچھے  
کہ فانوس خودی گل ہو گئے ہیں  
پریشاں ہیں نبات ماہ و ناہید  
وہ سلگے جبریمباؤں کے نشیمن  
وہ المیس آفریں انسان جاگا  
غمیں ہے دیدہ محراب و ممبر  
نہیں رخ پر فروزاں صبح نوخیز

خودی کے نور سے خالی سینے  
ضمیر اس کا ضمیر بے یقیں ہے  
خودی کے نور سے خالی ہیں سینے  
ہلاک تشنگی میں جام کتنے  
خرد کے چاک محتاج رہو ہیں

دفا و سوز و مستی کی کمی دیکھ !  
جگر کی چوٹ ، آنکھوں کی نمی دیکھ !

جنون و عقل کی نا محکمی دیکھ !  
مزاج آب و گل کی برہمی دیکھ !

چمن کا یہ خزاں افروز ماحول ،  
خراشوں سے بھری ہے پھول کی جیب  
کہاں وہ زندگی کا سیم گوں روپ  
لبو میں غرق ہے لالہ کمر تک  
شگوفوں کی جبینوں پر شکمن ہے  
بہار رنگ و بو اندوہ گیں ہے  
چشم شوق اب کیا خاک دیکھے  
اجائے ظلمتوں میں کھو گئے ہیں  
رہن تیرگی ہیں کتنے خورشید  
ہوئی ساکت وہ نبض برقی امین  
وہ نفس و کفر کا طوفان جاگا  
یہ روشن ظلمتیں ، انداکبر !  
غم ایام کی ہر آنچ ہے تیز

خزوف آسا دلوں کے آگینے  
نگہ صیقل ، نفس روشن نہیں ہے  
ہیں قطروں میں تلاطم کے قرینے  
بلاکش ہو گئے بدنام کتنے  
اندھیرے روشنی کی آبرو ہیں

جنون عقل کی نا محکمی دیکھ !  
مزاج آب و گل کی برہمی دیکھ !

## عبدالحمید حیرت :- (مناخیرین کے رنگ میں)

کچھ اس ادا سے پیش بیمار کر گئے وہ اور بھی کسی کو گنہگار کر گئے  
 کچھ اگر ہے تو یہی ان کے تغافل کا جواب کہ ہم اس پر بھی انہیں یاد گئے جاتے ہیں  
 حیرت کے غم کے میں خوشی کا گزر کہاں تم آگئے، تو رونق کا شان ہو گئی  
 جس کے آغوش و فانی پر درش پانی رہی موج مضطر نے اُسی ساحل کے ٹکڑے کو دئے  
 مل جائے تو بتلاؤں کہ کیا ڈھونڈ رہا ہوں شبنم میں، نسیم سحری میں گل تر میں  
 دامن شوق مرے ہاتھ سے چٹ جائیگا اس قدر کوئی کچھ آگیا، کچھ معلوم نہ تھا  
 دنیا میں کوئی ایسی مشکل ہی نہیں رکھتے تو، اور سنو، گویا ہم دل ہی نہیں رکھتے  
 ابھی سے ساز نہ چھڑو کوئی طرب انگیز ابھی کچھ اور مجھے سو گوار رہنے دو  
 اب آپ کو ہوتی دل مرحوم کی خبر اس بات کو تو ایک زمانہ بھی ہو چکا  
 یہ جذب و شوق لیکر ہم بھی کس دنیا میں آئے ہیں بدلتے ہیں جہاں بیل و نہار آہستہ آہستہ  
 کتنے ہی کئے گی ہجر کی شب رونے کو ہزار کوئی روئے  
 گل تو گل، کیاں بھی توڑی جا رہی ہیں اس طرح جیسے اس دل پر کوئی صدمہ گزرا ہی نہیں  
 تھا جگر کا درد، لیکن چارہ گر کے ہاتھ سے ایک مدت تک علاج در دسر ہوتا رہا  
 نہیں مرنے کسی کے روکنے سے وہ پروانہ کو جلنا چاہتا ہے،  
 عزم ترک آرزو بھی کچھ نہیں یہ بھی کر دیکھا دل ناکام نے  
 چمن میں کیا یہ کلیوں کا نسیم جو اب گرے شبنم نہیں ہے  
 پسند آئی، جفا ہی ان کو ورنہ ادائیں اور بھی تھیں دلبری کی  
 اک شمع تھی، سو آخر شب وہ بھی بجھ گئی حیرت کے ساتھ کون گزرا رے تمام رات  
 ایسی بھی صورتیں کہ اُس کا وہ ربط خاص ظاہر اگر نہیں ہے، تو پنہاں ضرور ہے  
 کیا ہے، کون ہے، کس سے ہے، حالت دل تم نے رکھا بھی ہے، کچھ کہنے کے قابل مجھ کو  
 وہ جو اک بات ہے دل سو ذی دلدار ہی کی کہیں جوتی ہے بھلا قول و قسم سے پیدا  
 دل شاد تھا، تو حیرت تھا لطف انجمن بھی اب حال ہے درگاہی ہل کو کسی سے کیا لوں،  
 تصور میں جس کے مزے لے رہا ہوں اُسے آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہوں  
 اس فکر میں، کہ دل کو کسی طرح کل پڑے کیا کیا نہ اضطراب کے پہلو نکل پڑے  
 کاٹے کوئی کس طرح شب غم جب دیکھے جب سحر نہیں ہے  
 اک شب کا نہیں فسانہ غم اور غم، ایک دل کی بات نہیں  
 آسمان کے جور کا بھی ذکر ہم کرتے نہیں کیا خبر چل کر کہاں سے بات جا پڑے کہاں  
 کچھ یہ نہیں کہ تم نے رلایا تو رو دئے یوں بھی ہاری آنکھ سے آنسو رواں رہے

## نیم شاہجہاں پوری :-

کسی کے غم کو جگہ دے کے گوشہ دل میں  
بند کر دیا معیار زندگی میں نے  
بھلا دیا تمہیں ناکامیوں کے عالم میں  
گناہ یہ بھی کیا ہے کبھی کبھی میں نے

## نظر شاہجہاں پوری :-

تڑپ کے ضبطِ محبت بھی کھو دیا کہ نہیں !  
اُمٹھی تو میری طرف آپ کی نگاہِ کرم  
ذرا سے بھی جلوہ ریز ہیں شمسِ قر کے ساتھ  
قرار اب دل بیتاب آگیا کہ نہیں ؟  
یہ اور بات ہے دل مطمئن ہوا کہ نہیں ؟  
یہ کیا مذاق ہے مرے ذوقِ نظر کے ساتھ

## شارق میرٹھی ایم۔ اے :-

اُن سے برا تعلق خاطر نہ پوچھیے  
لہتے ہی تیرے دیدہ و دل کا یہ حال ہے  
شارق نصیب ہو نہ سکا قرب میں کبھی  
وہ جب بھی آئے دل نہ رہا اختیار میا  
ہوں جیسے عمر بھر سے ترے انتظار میں  
وہ ایک لطفِ خاص جو تھا انتظار میں

## ڈاکٹر متین نیازی :-

اگر دنیا تجھے دیوانہ کہتی ہے تو کہنے دے  
لاکھ افسانے بنے عشق کے افسانے سے  
چٹکیاں لیتی ہے رہ رہ کر کسی کی یاد جب  
اللہ سے نزاکتِ افسانہ فراق  
وفا دارانِ الفت پر یہی الزام آتا ہے  
غم نہ بدلا کبھی عنوان بدل جانے سے  
ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بائے رہ جاتا ہے دل  
وہ کچھ دشمن بیکے نہ انھیں ہم سنا سکے

## نازش پرتابگڑھی :-

یہ اور بات ہے کہ میں شکوہ نہ کر سکوں  
اے حادثہ مجھے ذرا کھل کر پکارنا  
پورے شباب پر تھی تیری انجمن کی بات  
یہ کیا ہوا کہ چیخ اُسٹے اہل کارواں  
ہشیاروں کی محفل سے ہو کر جو اداس آئی  
مڑ مڑا کے کسے دیکھوں رگِ رنگ کے ڈھونڈھوں  
اللہ رے جنوں تجھس کے مرے  
بیدار سی بہسا نظر ہی کی دیر تھی  
ورنہ تیری نگاہ کو پہچانتا ہوں میں  
میں عالمِ جنوں میں نہ جانے کہاں رہوں  
بھونپی ہے کس گھڑی مرے دیوانہ پن کی بات  
رہبر کے ذکر میں تو نہ تھی راہزن کی بات  
تیری وہ نظر اکثر دیوانوں کو راس آئی  
نازش رہ ہستی میں تھی کس سے شناسائی  
میری نگاہ تجھ پہ بھی ہو کر گزر گئی  
پھر چ بھی چیز سامنے آئی سنور گئی

## شفقت کاظمی (رنگ حسرت)

ترے دیار میں کہتا کسی سے کیا اپنی مرے لال سے واقعہ نہ تھا کوئی لے دوست  
 نہ تھی اگرچہ میسر کوئی خوشی اے دوست ترے خیال میں اچھی گزر گئی لے دوست  
 ہاں ادائے لطف تیری نگاہ سے بھی دوائے دردِ محبت نہ ہو سکی لے دوست  
 بغیر قصد بھی تیری نگاہ لطف نواز، مری طرف کو اٹھی ہے کبھی کبھی لے دوست  
 غمِ فراق کی سختی عذابِ جاں تھی مجھے خوشا نصیب کہ پھر آپ یاد آئے ہیں  
 ہجومِ یاس میں جب جب کیا ہے یاد انھیں وہ میری پریشانی غم کو ضرور آئے ہیں  
 عجب کیا ہے اگر ہم تک نہ پیغامِ بہار آیا چمن والے اسیرانِ قفس کو یاد کیا کرتے  
 نظرِ نظر میں لئے بے شمار افسانے ترے حضور میں آئے ہیں تیرے دیوانے  
 حضورِ دوست جنھیں میں زباں سے کہہ نہ سکا نگاہِ شوق نے دُہرا دئے وہ افسانے  
 وہ ایک بات کہ اُن سے کہی تھی خلوت میں بنے ہیں آج اُسی کے ہزار افسانے

اکرم دھولیوی :-

احساسِ ناتمامی غم کو جگا دیا، اچھا کیا کہ تم نے مرا دل دکھا دیا  
 تقدیرِ نارسا کی شکایت نہیں مجھے اکثر ترے خیال نے تجھ سے ملا دیا

اکرم کہاں تک اپنی طبیعت سنبھالتے  
 آخر ہجومِ یاس نے دل کو بجھا دیا

## مطبوعات موصولہ

**چینی کی اہمیت** اردو ترجمہ ہے ایک چینی ادیب فلسفی کن یوتانگ کی انگریزی تصنیف کا جو سب سے پہلے ۱۹۳۷ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی۔ فاضل مصنف نے امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی اور لائبرنگ (جرمنی) کی دانشگاہ سے سند فضیلت حاصل کی اور پھر وطن لوٹ کر ملک کی آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ یہ چین کے ایک عیسائی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن عملاً وہ لادھب "قسم کے انسان ہیں جن کا مذہب صرف انسانیت پرستی ہوا کرتا ہے۔

یہ کتاب "عزائیات" سے تعلق رکھتی ہے اور اپنے اصل و اسلوب بیان کے لحاظ سے بڑی عجیب و غریب چیز ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ انسان کو "ازھد تا بہ لحد" کن کن پچھیدہ باتوں سے گزرنا ہوتا ہے اور "چیتے رہنے" کی خواہش و کوشش میں اسے کتنے ہفتخواتن طے کرنے پڑتے ہیں۔ اس فن پر مغربی زبانوں میں بڑا ذخیرہ تصانیف پایا جاتا ہے یہاں تک کہ "عزائیات" اب ایک بڑا وسیع علم ہو گیا ہے، لیکن "کن یوتانگ" نے غالباً یہ کتاب اسی وسعت سے گھر کر لکھی ہے جسے بالفاظ دیگر کثرت تعبیر کی وجہ سے "پریشانی خواب" کی داستان کہنا چاہئے۔

یہ کتاب اس حیثیت سے کہ مصنف کے ذاتی و آزادانہ تجربات و خیالات کا نتیجہ ہے اور مغربی ماہرین "عزائیات" کے اصول و تجربات سے بالکل غیر متاثر ہو کر لکھی گئی ہے، بڑی جہت اپنے اندر رکھتی ہے۔ اور مشرقی میلانات کی وجہ سے ہمارے ذہن و عقل کے لئے بہت زیادہ قابل قبول ہے۔

ہر چیز چینی تہذیب و ثقافت، معیشت و معاشرت ہم سے مختلف ہے، لیکن پھر بھی بہت سی باتوں میں ہماری ذہنیت اس سے ملحدہ نہیں اور اسی لئے جب ہم اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ "گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" لیکن اس کتاب کی دل میں گھر کرنے والی خصوصیت اس کا اندازہ بیان، اس کی بے تکلفانہ منطق اور اس کا لطیف مزاحیہ رنگ ہے جو ہمیں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ محسوس نہیں کرنے دیتا کہ کسی علمی کتاب یا خشک علمی مباحث کا مطالعہ کر رہے ہیں، گویا وہ ایک سہلہ کا پردہ ہے جس پر ہر آن نئے نئے رنگین مناظر ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہمارے قلب و نگاہ دونوں کو مسحور کر لیتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک ناول یا رومانی فسانہ میں اس زیادہ دلچسپی اور کیا پیدا کی جاسکتی ہے۔

اس کتاب کا ترجمہ اس لحاظ سے کہ اس میں مصنف کے لب و لہجہ کو بھی اپنے اصلی رنگ میں باقی رکھنا ضروری تھا، آسان کام نہ تھا، لیکن جناب مختار صدیقی نے جس حسن و خوبی سے اس فرض کو انجام دیا ہے وہ بجائے خود ایک بڑا ادبی کارنامہ ہے اور قابل داد و تحسین۔ تاہم ہمیں کہیں بعض الفاظ کے ترجمے کرتے وقت وہ انگریزی الفاظ کی روح کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ کاش کہ وہ اصل کتاب کو سامنے رکھ کر ایک بار اور نظر ثانی فرماتے۔

یہ کتاب مکتبہ جدید انارکلی لاہور نے بڑے اہتمام سے مجدد شایع کی ہے اور بارہ روپیہ میں وہاں سے مل سکتی ہے۔

**خیابان ایک** پاکستان کی علاقائی زبانوں میں متعدد زبانیں شامل ہیں، جن میں سندھی، پنجابی، پشتو، بلوچی، کشمیری اور پنجابی زبانوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ تمام زبانیں اپنا اپنا لٹریچر لکھتی ہیں۔ جن میں

نثر و نظم دونوں شامل ہیں۔ تقسیم ہند سے پہلے ان زبانوں کی اہمیت زیادہ تر مقامی تھی، لیکن پاکستان بننے کے بعد جب وہاں کے ثقافتی مسائل پر توجہ کرنے کی ضرورت ہوئی تو اسی سلسلہ میں یہ سوال بھی سامنے آیا کہ زبان کے علاقائی زبانوں کے مشترک مطالعہ کیا جائے اور ان کے شاہکاروں کو اردو میں منتقل کیا جائے جو ایک حیثیت سے پاکستان کی مشترک زبان نسیم کی جاسکتی ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر پاکستان کے محکمہ نشر و اطلاعات نے یہ مجموعہ شایع کیا ہے جس میں تمام علاقائی زبانوں کے منتخب منظومات کو اردو نظم میں پیش کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان تمام زبانوں میں بعض زبانیں مثل پنجابی اور بنگالی زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور سب سے کم بلوچی اور کشمیری، تاہم اسی سے انکار ممکن نہیں کہ ہر زبان خواہ وہ ارتقا کے کسی درجہ میں ہو جذباتی حیثیت سے اپنا نظریہ منجملہ رکھتی ہے، جس کے مطالعہ سے اس زبان کے بولنے والوں کی معاشرت، معیشت، نفسیات اور جذبات کا پتہ چل سکتا ہے اور انکا مطالعہ ایک مشترک کچھر کے اصول وضع کرنے کے لئے یقیناً بہت ضروری ہے۔ چنانچہ پاکستان کے حکمہ، اطلاعات نے اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر یہ انتخاب شایع کیا ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ ان مختلف زبانوں کی نظموں یا غزلوں کا ترجمہ نظم ہی میں کیا گیا ہے اور یہ ترجمہ اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ ہم کو یہ معلوم نہ ہو کہ یہ دوسری زبانوں کے تراجم ہیں تو ہم ان کو بالکل طبع زاد سمجھ سکتے ہیں۔ سندھی نظموں کی ابتدا شاہ عبداللطیف کے انکار سے ہوتی ہے جو عالمگیر کے زمانہ میں تھے۔ ان کی نظمیں یکسر تصوف پر مشتمل ہیں ان کے علاوہ چھ اور سندھی شعراء کے کلام کا انتخاب ملتا ہے۔ جن میں سب کے سب سوا ایک شیخ ایاز کے جو زمانہ حال کے شاعر ہیں متصوفانہ رنگ کے شاعر تھے۔

پنجابی زبانوں میں شاہ ابراہیم خاں اور بابا فرید، مجھے شاہ سے لیکر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم تک انیس شاعروں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے، جو اپنی معنویت کے لحاظ سے کافی دلچسپ ہے۔

پشتو میں چھ شاعروں کو سامنے رکھا گیا ہے، جن میں اس وقت کے موجودہ شاعر سمندر خاں اور ہدایت آندہ بھی شامل ہیں اور جن کی قومی اور ملی نظمیں کافی جوش اور ولولہ کی حامل ہیں۔

بلوچی زبان کا انتخاب نسبتاً کم ہے لیکن وہاں کے لوگ گیتوں کے انتخاب سے اس کمی کی تلافی کر دی گئی ہے۔

کشمیری زبان کے شاعروں میں خواجہ حبیب اللہ نوشیروزی سے لیکر چار صدی قبل کے شاعر تھے۔ عبداللہ آزاد (موجودہ عہد کے شاعر) تک آٹھ شاعروں کے کلام کو سامنے رکھا گیا ہے اور چند لوگ گیت بھی اس میں شامل ہیں۔

آخر میں بنگالی شاعری کا انتخاب ہے جو یقیناً پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہی جاسکتی ہے۔ ان شعراء کی فہرست میں سب سے زیادہ اہم قاضی نذیر اسلام ہیں۔ بنگالی حصہ ۵، صفحات پر مشتمل ہے۔ جن میں ہم کو روایتی اور غیر روایتی دونوں قسم کی شاعری کے بڑے اچھے نمونے نظر آتے ہیں۔ ترجمہ کرنے والے حضرات میں ابن انشا، حفیظ ہوشیار پوری، رشید احمد لاشاری، عبدالمجید بھٹی، افضل پرویز، خالد غزنوی، شہاب رفعت، تائیش صدیقی، رشید جہاں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ تصنیف سے جناب ڈاکٹر شوکت سزدار کی۔ اصل ان کا وہ مقالہ ہے جو انھوں نے ۱۹۷۷ء میں لکھا تھا۔ لیکن مقالہ کیا ہے پورے ۳۲۸ صفحات کی ایک مستقل تصنیف ہے جس میں انھوں نے اردو زبان کا ارتقاء اور دو زبان کا لسانی تجزیہ کر کے اس کے تاریخی ارتقا پر نہایت فاضلانہ جامع بحث کی ہے۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں جو تین ابواب پر مشتمل ہے، ان میں زبانوں کی صورتی و نسلی تقسیم، ہندوستان کی قدیم و جدید زبانوں، ان کے باہمی تعلق اور اردو زبان کے اخذ پر بڑی محققانہ گفتگو کی ہے۔

دوسرا حصہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں صوفی تہذیبوں پر بحث کی گئی ہے، دوسرے میں اخذ و اشتقاق کی

تفصیل ہے۔ تیسرے باب میں اسماء و القندودہ اسماء جو کسی خاص معنی کے لئے وضع ہوئے ہیں) کی صرفی و نحوی خصوصیات پر اظہار خیال کیا گیا ہے، چوتھے باب میں اسماء مطلقہ (وہ اسماء جن کے معنی متعین نہیں ہیں) سے بحث کی گئی ہے اور پانچویں باب میں افعال اور ان کے مشتقات سے۔

چونکہ ڈاکٹر صاحب علاوہ اردو و فارسی کے عربی و سنسکرت کے بھی ماہر ہیں اس لئے ان تمام مباحث میں تفصیل سے روشنی دینے معلومات سے کام لے کر جس انداز سے اردو زبان کے ارتقا و پرگشت کو دکھائے وہ ہر پہلو سے اس قدر مکمل ہے کہ اس میں شک ہی سے کوئی اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

دورِ حاضر میں اس موضوع پر اردو کی متعدد دکتا ہیں اس سے قبل شایع ہو چکی ہیں جن میں پروفیسر ذور کی ہندوستانی لسانیات شمس اللہ قادری کی اردو کے قدیم، پروفیسر شیرانی کی پنجاب میں اردو، خصوصیت کے ساتھ قابل ہیں، لیکن ڈاکٹر سبزواری کی یہ تصنیف اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑی جامع چیز ہے جس سے ہمیں کہیں اختلاف تو ممکن ہے، لیکن اس سے یکسر انحراف ممکن نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کی تصنیف کے وقت جن کتابوں کو سامنے رکھا ہے ان میں انگریزی کی متعدد دکتا ہیں بھی شامل ہیں اس لئے اگر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ تصنیف اپنے موضوع کے لحاظ سے قدر اول کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ اساتذہ یا طلبہ جو لسانیات سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

کتاب طائب کے حروف میں نہایت اہتمام سے مجلد شایع کی گئی ہے اور گہوارہ ادب ڈھاکہ کا یا بشیر حسین اینڈ سنز ۱۰۳ لورہٹ پور روڈ کلکتہ سے مل سکتی ہے۔ قیمت معیہ

**دین الہی کے عناصر اربعہ** جناب طائب صفوی کی تصنیف ہے جس میں اگر کے دین الہی پر نہایت فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔ اگر کا دین الہی ایک تاریخی صداقت ہے، لیکن اس کے اسباب و نتائج کا مطالعہ ہمیشہ غلط و ناقص ذرائع سے کیا گیا۔ اس موضوع پر ماکھن لال رائے جو دھری کی انگریزی تصنیف ایک جامع تصنیف سمجھی جاتی ہے، لیکن جناب طائب نے اپنی کتاب میں تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ اس کے فاضل مولف نے اس مسئلہ کا کتنا غلط مطالعہ کیا ہے۔

اس کتاب میں سب سے پہلے دین الہی کے سیاسی و مذہبی پس منظر کو پیش کیا گیا ہے اس کے بعد اس کے صوفیانہ شیعہ، ہندو پارسی و عیسوی عناصر کو سامنے رکھ کر بڑی فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔

ان مباحث کے سلسلہ میں بعض ایسے مذہبی و تاریخی حقائق بھی سامنے آگئے ہیں، جن پر اس سے قبل اتنی واضح روشنی کبھی نہیں ڈالی گئی تھی۔

اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے تاریخ و مذہب کا کتنا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اخذ نتائج کے لئے وہ کتنی غیر معمولی جہان بین سے کام لیتے ہیں۔ اس مسئلہ پر نہ صرف اردو بلکہ دوسری زبانوں میں بالکل پہلی کتاب ہے جو تحقیق کے انتہائی نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر پوری دیانت و صداقت کے ساتھ لکھی گئی ہے۔

یہ کتاب فاضل مصنف سے شمس آباد و فرخ آباد کے پتہ پر مل سکتی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

**افکارِ سعد** سید ذاکر حسین صدائے لکھنؤ کی غزلوں کا مجموعہ ہے جسے خود انھوں نے شایع کیا ہے۔ صدائے صاحب، حضور آندو مرحوم کے شاگرد ہیں اور ان کی غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے استاد سے کافی استفادہ کیا ہے اور ان کی سادہ و سلیس انداز بیان کی خصوصیت کی پوری پابندی کی ہے۔

غزلیں عامیانہ رنگ اور ایہام و تصنع سے پاک ہیں اور لکھنؤی زبان کا اچھا نمونہ۔

ضخامت ۱۲۸ صفحات - قیمت پھر - لئے کا پتہ: طعماستان پیرکالونی کراچی

پہلے سے پڑھ لیجئے، پھر ورق اٹھائے

## سالنامہ ۷۵ء

جو جنوری، فروری ۷۵ء کا مشترک پرچہ ہوگا

جنوری ۷۵ء کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوگا اور اپنی معنویت کے لحاظ سے ایک ایسا مجموعہ ہوگا جس میں آپ تمام اصنافِ سخن (غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی، نظم، ننگاری، ہجو، ننگاری، ظرافت و طنز نویسی) پر ایسے جامع مقالات نظر آئیں گے جو آپ کو ان تمام موضوعات پر دوسری کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیں گے۔ اس کی ترتیب میں ہندوستان و پاکستان کے اکثر مستند ادیبوں اور نقادوں نے حصہ لیا ہے جن کے نام ان قبل ظاہر کئے جا چکے ہیں۔

اس کی ضخامت کا ابھی کوئی صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ یقینی ہے کہ اگر ہم اسے کتابی صورت میں شائع کرتے تو اس کا حجم ۶۰۰ صفحات سے کم نہ ہوتا۔

یہ سالنامہ مستقل سالانہ خریداروں کے چندہ میں شامل ہوگا، لیکن وہ حضرات جو صرف سالنامہ لینا چاہیں گے اس کی قیمت معہ مصارف ڈاک پتے ادا کرنے پڑیں گے

وہ حضرات جن کا چندہ دسمبر ۷۴ء میں ختم ہو رہا ہے ان کے نام اس کا سالانہ دی پنی بیسے میں روا کیا جائے گا، لیکن جن کا چندہ دسمبر میں ختم نہیں ہوتا ان سے درخواست ہے کہ وہ ۸ مصارف رجسٹری ذریعہ ٹکٹ منی آرڈر روانہ کر دیں، ورنہ سالنامہ معمولی پوسٹ سے بھیجا جائے گا اور ہم اس کے پہنچنے کے ذمہ دار نہ ہوں۔

### ایجنٹ حضرات

ازراہ کرم مطلع فرمائیں کہ سالنامہ کی کتنی کاپیاں انھیں درکار ہوگی۔ قیمت فی کاپی تین روپیہ ہوگی لیکن کمیشن جو معمولاً دیا جاتا ہے، دیا جائے گا۔

### پاکستانی خریدار

اپنا چندہ 8/8، ذیل کے پتہ پر ذریعہ منی آرڈر روانہ فرما کر رسید ڈاک خانہ مع نمبر خریداری براہ راست ہمارے پاس بھیج دیں

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۱۰۵ - گارڈن ولیٹ - کراچی

”نگار“ کی مطبوعات بھی آپ کو اس پتہ سے ذریعہ وی پی سی مل سکتی ہیں

منیجر نگار

# بعض کمیاب کتابیں

(ان کتابوں پر گیش نہیں دیا جائے گا — قیمتیں علاوہ محصول ڈاک ہیں)

تذکرہ مخزن نکات	قائم	ع	کثات اصطلاحات الفنون	شیخ محمد علی	ع
تذکرہ دستورالقصاحت	یکتا	ع	جہانگیر نامہ	خواجہ ابوالحسن	ع
تذکرہ چغتایان شعراء	شفیق	ع	آئین اکبری	مصورہ حصص	ع
تذکرہ ہندی	معصی	ع	سکندر نامہ مصور	مولوی نظامی گنجوی	ع
دیوان میر حسن	میر حسن حسن	ع	دقائق نعمت	ذات عالی انشاء حسن و عشق	ع
دیوان شکر	دیوان نسیم دہلوی	ع	درہ نادرہ	میرزا محمد ہندی خاں	ع
کلیات ناسخ	امام بخش ناسخ	ع	تاریخ گلستان ہند مصور	درگا پرشاد	ع
کلیات نسیم		ع	تاریخ جامع التواریخ	فقیر محمد	ع
کلیات سودا	مرزا رفیع سودا	ع	اقبال نامہ	جہانگیری سر حصہ	ع
کلیات حسرت	فضل الحسن حسرت	ع	سیر المتاخرین	سر حصہ	ع
کلیات مومن	مومن خاں دہلوی	ع	تذکرہ دولت شاہ	دولت شاہ سمرقندی	ع
کلیات میر	میر تقی میر	ع	در بار اکبری	آزاد	ع
مکمل شرح کلام غالب	مرتبه عبدالباری آسی	ع	تذکرہ گل رعنا	عبد الغنی	ع
مرآۃ الغیب	امیر احمد امیر	ع	کلیات قطبیر	حکیم قطبیر فارابی	ع
منظر معانی دیوانی مجروح	میر محمد حسین	ع	قصاید عرفی معشی	جمال الدین	ع
دستور الشعراء (تذکرہ ثانیث)		ع	کلیات اسماعیل	اسماعیل اصفہانی	ع
کلیات جعفر زلمی	مرتبه محمد فرحت اللہ	ع	کلیات سعدی	شیخ مصلح الدین سعدی	ع
کلیات نظیر کبر آبادی	مرتبه عبدالباری آسی	ع	دیوان عرفی	جمال الدین عرفی	ع
مرآۃ انیس	جلد اول و دوم و سوم و چہارم	ع	دیوان ہلالی معشی	ہلالی	ع
مرآۃ انیس	جلد ششم	ع	دیوان قصاید غفری	حکیم ابوالقاسم	ع
مرآۃ دبیر کاں		ع	تذکرہ کالان رامپور	احمد علی خاں	ع
مرآۃ مونس		ع	تذکرہ آہ بکا	عبدالرؤف عشرت	ع
کیم اللغات		ع	ہندو شعراء		ع

نظم اللغات ... ضامن علی علیا لنت قلمی

نظم اللغات ... کورڈینل

نظم اللغات ... ضامن علی علیا لنت قلمی

نظم اللغات ... ضامن علی علیا لنت قلمی

نظم اللغات ... ضامن علی علیا لنت قلمی

نظم اللغات ... ضامن علی علیا لنت قلمی

نظم اللغات ... ضامن علی علیا لنت قلمی

نظم اللغات ... ضامن علی علیا لنت قلمی

کہ آپ کا چندہ نمبر میں ختم ہو گیا اور دسمبر کا "نگار" کے مصارف جہزی کے لئے اس کے علاوہ ہوں گے

# نگار

دہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی آئندہ روپیہ نو آنے میں دی جانی ہوگا۔ سالانہ ۵۵۵۵

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۷۰	فہرست مضامین نومبر ۱۹۵۶ء	شمار ۵
۳	ملاحظات	۳۷
۶	بغداد کی وجہ تسمیہ	۴۵
۲۲	غالب ایک صاحب طرز شاعر کی حیثیت سے	۱۹
۲۷	نظام شمس کے ماتحت کمرے	۵۴
۳۱	آرم مظفر نگری	
۳۴	ایک چینی فلسفی کے بعض دلچسپ نظریے	
	مشکلات غالب	
	باب الحرس والمناظرہ	
	منظومات :- پروفیسر شورش رضا ابن فضلی - مانی جالیسی	
	غنی احمد غنی - حسن یادور - شارق ام لے	
	عزیزہ عظیم آبادی - شفقت کاظمی	
	مطبوعات موصولہ	

## ملاحظات

### سیاسی زلزلہ

دوسری جنگ عظیم کے بعد سب سے بڑا انقلاب جس نے مغربی یورپ اور امریکہ کو ہلاک رکھ دیا، مشرقی یورپ کی سیاست کا انقلاب تھا جس نے وہاں کی اکثر ریاستوں پر سوویت اقتدار قائم کر دیا اور خود جرمنی کے دو ٹکڑے کر کے اس کا مشرقی حصہ روس کی سیاست وابستہ کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ یورپ و امریکہ کی جمہوریتوں کے لئے یہ بڑی عجیب بات تھی، کیونکہ وہ کبھی سوچ ہی نہ سکتی تھیں کہ کوہستان یورپ جو یورپ اور روسی ایشیا کے درمیان ایک قدرتی حد فاصل کی حیثیت رکھتا ہے، کسی وقت بے معنی ہو کر رہ جائے گا اور سوویت سیلاب نہ صرف یہ کہ نصف یورپ کو اپنی آغوش میں لے بیگا بلکہ اس کی بہری فوج بھارتیہ اور امریکہ کے سواحل سے بھی ٹکرائے لگیں گی۔ لیکن یہ سب کچھ ہو کر رہا اور آخر کار دنیا دو متضاد نظریوں میں تقسیم ہو کر قریب جنگ کا خواب دیکھنے لگی اور دیوانہ وار اس کی طیاروں میں مصروف ہو گئی۔

یہ تناؤ دنیا کا وہ تشنجی دور جو اسٹالن کی زندگی تک قائم رہا لیکن جب اسٹالن کے بعد روس میں بگائے اور خورشچوف کا دور شروع ہوا اور انھوں نے اسٹالن کی طرف سے دنیا کو متغیر کر کے اپنی بین الاقوامی پالیسی میں کافی تبدیلیاں پیدا کیں، تو وہ تناؤ جو اس سے قبل سوویت حکومت اور امریکہ و برطانیہ کے درمیان پیدا ہو گیا تھا، اس میں کمی پیدا ہونے لگی اور خیال کیا جانے لگا کہ اگر روس کا رجحان امن ہو تو ممکن ہے دنیا امن سے قریب تر ہو جائے گی، لیکن ہر قسم سے مشرقی یورپ کی فضا پھر ٹھنڈ ہو گئی اور پولینڈ و ہنگری نے روسی کے حکامات عملی مظاہرہ کر کے پھر پھر کا رخ بدل دیا۔

یوگوسلیویا تو اسٹائن کی زندگی ہی میں اشتراکیت تو نہیں لیکن سوویٹ اقتدار سے باہر آگیا اور مارشل ٹیٹو کے اس اقدام کو اسٹائن نے صرف اس لئے گوارا کر لیا کہ مشرقی یورپ کی دوسری ریاستوں پر ہنزو وہ پوری طرح قابو نہ پاسکا تھا، لیکن اس کے بعد کسی اور ریاست کو کمیونٹ کی تقلید کی جرأت نہیں ہوئی۔

اسٹائن کے بعد جب روس کی مستبدانہ گرفت ڈھیلی ہوئی تو ان ریاستوں نے اپنی سیاست و اقتصادیات کو خود اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش شروع کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی جرمنی میں سوویٹ حکومت کے خلاف مظاہرے شروع ہوئے اور پھر پولینڈ میں جو سب سے بڑی مشرقی یورپ کی حکومت ہے یہ احساس پیدا ہوا کہ سوویٹ کے قائم کئے ہوئے اصول اشتراکیت میں خود اپنے حالات کے لحاظ سے تبدیلی پیدا کرنا ضروری ہے۔ پولینڈ کا یہ احساس اتنا بڑا عملی احساس تھا کہ سوویٹ حکومت کو بھی صلح و آشتی سے کام لینا پڑا اور گوٹو کا کوہے اسٹائن نے قیدو رہنے ڈال دیا تھا وہاں کا لیڈر تسلیم کرنا پڑا۔ پولینڈ کی یہ کامیابی ممکن ہے عارضی ہو، دوسری ریاستوں کے لئے بھی باعث تحریک ثابت ہوگی اور ہنگری میں بھی انقلابی ہنگامے شروع ہو گئے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ روس اس پر راضی نہ ہوگا کہ ہنگری اس کی گرفت سے آزاد ہو جائے، چنانچہ اس نے اپنی فوجیں وہاں بھیج کر پھر اسی جماعت کا اقتدار قائم کر دیا ہے جو روسی پالیسی کی طرف دیکھتی ہے۔

مشرق یورپ کے اس رجحان سے مغربی یورپ کی جمہوری حکومتوں اور امریکہ کو یقیناً خوش ہونا چاہئے تھا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ان انقلابات کو اپنے لئے فال نیک نہیں سمجھتیں، کیونکہ انھیں اندیشہ ہے کہ اگر مشرقی یورپ کی دوسری ریاستوں تک یہ تحریک وسیع ہوگئی تو اس کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں، یا تو سوویٹ حکومت اس تحریک کو ختم کرنے کے لئے فوجی قوت سے کام لے گی جس سے مغربی یورپ کا متاثر ہونا ناگزیر ہے، یا اگر سوویٹ حکومت نے کوئی سخت پالیسی اختیار نہ کی تو پھر اس کا اندیشہ ہے کہ مبادا روس کی وہ جماعت جو اسٹائن کی طرف دیکھتی ہے موجودہ سوویٹ حکومت کا تختہ الٹ دے اور پھر وہی دور سامنے آجائے جس نے دنیا میں امن و سکون کے لئے بہت کم جگہ چھوڑی تھی۔

**پاکستان کا احساس کمتری** | اس دوران میں پاکستان کی بعض باتیں ہمارے لئے بہت تکلیف دہ ثابت ہوئیں اور ان سب کا تعلق اس احساس کمتری سے تھا جو بھارت کے مقابلہ میں اس کے اندر بڑھتا جا رہا ہے

(۱) نہر سوئز کے مسئلہ میں اس نے نہایت بدنامی کے ساتھ دنیا کو یہ سمجھنے کا موقع دیا کہ ہندو پاکٹ میں اس کی شرکت محض غلامانہ حیثیت رکھتی ہے اور وہ اپنے تنگ نظرانہ مصالح پر مذہب، اخلاق و انصاف سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو تمام مسلم حکومتوں میں سربرآوردہ ظاہر کر کے ہمیشہ بھی کوشش کی کہ وہ "پان اسلام" تحریک کا سب سے بڑا قایم تسلیم کیا جائے، لیکن جس وقت نہر سوئز کا سوال سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک مصری ساری اسلامی دنیا کو قربان کر دینے کے لئے آمادہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اسے یقین ہے کہ اپنے سب سے بڑے دشمن بھارت کا مقابلہ بغیر برطانیہ و امریکہ کی مدد کے اور کسی طرح کر ہی نہیں سکتا (جیسا کہ وہاں کے بعض اکابر سیاست کے ظاہر کیا ہے)

(۲) پنڈت نہرو کا سعودی عرب جانا اور وہاں ان کا برجش خیر مقدم کیا جانا، پاکستان کو اس قدر ناگوار لگتا کہ وہاں کے اخباروں نے کھلم کھلا فرما کر دئے سعودی عرب پر کیک لگتے جیسی شروع کر دی کیونکہ اگر کسی وقت اسے عربستان کے مسلمانوں کو بھارت کے خلاف اُبھارنے کی ضرورت پیش آئی تو بھارت و عرب کا اتحاد خارج ہوگا۔

۳. کتاب "مذہبی رہنما" کے سلسلہ میں بھارت کے مسلمانوں کے اضطراب کا سبب پنڈت نہرو کو قرار دیکر ان کے خلاف عامیانہ و غیر منجیدہ مظاہرہ کیا گیا اس لئے کہ پاکستان کو اسلام کا بڑا درد تھا بلکہ محض اس لئے کہ وہ دنیا اور خصوصیت کے ساتھ اسلامی دنیا کو یقین دلا سکے کہ بھارت کی نامذہبی حکومت کس درجہ متعصب ہے اور وہ اس قابل نہیں کہ جمہوری اور اسلامی حکومتیں اس سے اپنے تعلقات قائم رکھیں۔

پھر خود کیجئے کہ ان تمام باتوں کی تہ میں کون سا احساس کام کر رہا ہے، صرف یہ کہ بھارت ان کا دشمن ہے، اس کی بین الاقوامی سالہ

غیر معمولی طور پر بڑھتی جا رہی ہے، پاکستان ہر حیثیت سے اس کے مقابلہ میں بہت کمزور ہے۔ اسی کا نام احساس کمتری ہے اور یہی اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بھارتی حکومت کے خلاف طغیان، ملک اور غیر منجمد تذاویر سے کام لے۔

اس میں شک نہیں، پاکستان و بھارت کی کشیدگی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور اس کشیدگی کا اصل سبب صرف مسئلہ کشمیر ہے لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں آج تک نہیں آئی کہ پاکستان اس کو کیوں اپنا ذریعہ نجات سمجھتا ہے اور اسی سوگ میں رات دن گھلتے رہا کیوں ضروری ہے۔

کہا پاکستان کے لئے اس سے زیادہ ضروری یہ نہیں ہے کہ وہ اندرون ملک کی ابتری کو دور کرے، اپنی مالی مشکلات میں کمی پیدا کرنے کی کوشش کرے، ملک کی پیداوار کو بڑھائے، صنعتی ترقی کی طرف متوجہ ہو، سیاست خارجہ میں دوسروں کا دامن پکڑنے کی جگہ خود اپنی خود داری و خود اعتمادی سے کام لینا سیکھے اور سب سے زیادہ یہ کہ باہمی جماعتی اختلافات کو دور کر کے ملک کے اندرون و سکون کی فضا پیدا کرے اور مشرقی و مغربی پاکستان میں اتحاد کامل پیدا کر کے ایک مضبوط و پائیدار حکومت بنانے کی جدوجہد کرے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ حصول کشمیر کی کوشش نہ کرے، ہم کو اس پر اصرار نہیں کہ وہ بھارت کو اپنا دشمن نہ سمجھے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کو وہ وجود پاکستان کا اصل مقصد کیوں قرار دے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ فرض کیجئے کشمیر کا فیصلہ اس کے خلاف ہوتا ہے یا یہ کہ سیکورٹی کونسل ایک بات نامعلوم تک کوئی فیصلہ نہیں کرتی، تو اس صورت میں وہ کیا کرے گا۔ کیا وہ ہندوستان پر حملہ کر دے گا؟ یقیناً وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا جب تک یہ یقین نہ ہو کہ برطانیہ و امریکہ بھی اس کا پورا ساتھ دیں گے اور یہ یقین اسے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ پھر کتنی بڑی نااعاقبت اندیشی ہے کہ ایک خامکارانہ جذبہ انتقام پر کسی سیاست کی بنیاد قائم کی جائے اور اندرونی یا ذاتی اصلاح کو نظر انداز کر دیا جائے یہی وہ ذہنی کشمکش تھی جس نے اس وقت تک وہاں کسی سیاست کو متعین نہ ہونے دیا اور بے درپے وزارتیں بدلتی رہیں۔

پہلی وزارت تو غیر عبوری دور کی وزارت تھی اور اسے اچھے یا برے ہونے پر کوئی سکھ نہیں لگایا جاسکتا، لیکن دوسرے دور کی وزارت یقیناً اختلاف و انحطاط کی وزارت تھی، تیسری وزارت سطحی بھی تھی اور بد رنگ بھی، چوتھی وزارت دفتری قسم کی تھی جس میں وزیر اعظم کو کوئی قومی یا ممبرانہ حیثیت حاصل نہ تھی، لیکن موجودہ پانچویں وزارت سرسہروردی کی البتہ ان سب سے ایک علیحدہ نوعیت رکھتی ہے۔

اس سے قبل پاکستان کی وزارتیں نہ نامیدہ عوام کے ہاتھ میں تھیں نہ کسی سیاست دان کے ہاتھ میں، لیکن موجودہ وزیر اعظم لیڈر بھی ہے (خواہ وہ کسی مخصوص جماعت ہی کا کیوں نہ ہو) اور باہوش سیاست دان بھی۔ لیکن اس کے پیچھے جماعتی آواز بھی ہے وہ اس کے آگے ایک مخصوص سیاسی سطح نظر بھی، وہ ایک ایسا شخص ہے جو وزیر اعظم نہ رہنے کے بعد بھی ایک جماعت کا لیڈر رہ سکتا ہے اور پاکستان کی سیاست کا رخ موڑ سکتا ہے۔ ہر چند ہم یہ پیش گوئی تو نہیں کر سکتے کہ وہاں کی متلاطم فضا میں سرسہروردی کی وزارت زیادہ دیر پائیدار ہوگی، لیکن اس قدر ضرور جانتے ہیں کہ پاکستان کے موجودہ اہم سیاست میں سرسہروردی ہی کی تنہا شخصیت ایسی ہے جو پاکستان میں کسی نہ کسی حد تک جمہوریت کا مزاج پیدا کر سکتی ہے اور اگر بد قسمتی سے وہاں کی اندرونی سازشوں نے جو بڑی حد تک غیر ملکی اثرات سے تعلق رکھتی ہیں، سرسہروردی وزارت کو بھی ختم کر دیا، تو ہو سکتا ہے کہ پاکستان مغربی دامن کی اقتدار میں چلا جائے گا اور اس کی بین الاقوامی اہمیت جو یوں بھی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

## سالنامہ عہدہ کا اشتہار

منہجر

صفحہ اول پر ضرور ملاحظہ فرمائیے اور سالنامہ کی جبرٹری کے لئے ۸ کے ٹکٹ بھیجنا فراموش نہ کیجئے۔

# ”بغداد“ کی وجہ تسمیہ

(ڈاکٹر عبدالستار صدیقی)

ایران اور، اندوستان میں عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ بغداد، نوشیرواں عادل کا باغ تھا، جہاں بیٹھ کر وہ مظلوموں کی داد دے  
کیا کرتا تھا۔ لوگ اس باغ کو ”باغ داد“ کہنے لگے، اور پھر ”کثرت استعمال“ سے اضافت کا کسرہ گر گیا اور فلک اضافت کے ساتھ ”باغ“ کا  
الف بھی جاتا رہا۔ اس طرح ”باغ داد“ سے ”بغداد“ ہو گیا۔ فارسی کے فرہنگ نویسوں نے بھی اسے مان لیا۔ چنانچہ ”برہان قاطع“ میں  
”بغداد... نام شہریت از عراق عرب، و اصل آن باغ داد بودہ است بہ سبب آن کہ ہر ہفتہ یک بار نوشیرواں در آن

باغ بارعام دادے و داد دہی مظلومان کردے، و بہ کثرت استعمال بغداد شدہ است۔“

”فرہنگ انجمن آرائے ناصری“ کے مولف رضاقلی خان نے ”برہان“ پر جا بے جا حملے کئے ہیں، مگر اس معاملہ میں اُسے بھی برہان  
سے اتفاق ہے۔ ”ناصری“ کے مقدمہ میں لکھا ہے:-

”وعدت یک حرف از وسط چنانکہ بہ لفظ از اگر... و سندن از شادان... ہمچنین بغداد از باغداد“

یہاں سب سے پہلے یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا تاریخ کی رو سے یہ صحیح ہے کہ نوشیرواں ایک باغ میں بیٹھ کر مظلوموں کی فریاد سنا  
کرتا تھا، اور اگر ایسا تھا تو وہ باغ کیا اُسی جگہ تھا جہاں آس کے قبل کے منصور عباسی کا پایہ تخت آباد ہوا؟

ایران کے بادشاہوں کا حال فارسی میں سب سے زیادہ فردوسی کے ”شاهنامہ“ میں ملتا ہے۔ ”شاهنامہ“ کو ہم صحیح معنوں میں  
تاریخ نہیں کہہ سکتے، اس لئے کہ جو روایتیں ایران میں مشہور تھیں اور فردوسی کو پہنچیں اُس نے نظم کر دیں۔ اُن کی چھان بین کرنے کا  
دکوئی سامان اُس کے پاس تھا، نہ ایک شاعر کو اس کی ایسی کچھ ضرورت ہی تھی۔ پھر بھی یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ جو کچھ فردوسی نے  
لکھا ہے وہ سلسلہ بنیاد ہے اور توجہ کے قابل نہیں۔ اس لئے اُس کے ”شاهنامہ“ پر بھی ایک نظر ڈال لینا چاہئے۔ شاہنامہ میں  
بغداد کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ ان میں سے چار جگہ نوشیرواں کے پہلے کے بادشاہوں کے حال میں ہے۔  
کیانیوں کے پانچویں بادشاہ کیخسرو کے حال میں کہتا ہے:-

ہر آن کس کہ از شہر بغداد بود ابا نیزہ و تیغ و فولاد بود

کیخسرو، نوشیرواں سے تو کیا، دارا اور سکندر بھی سینکڑوں برس پہلے ہوا ہے۔ اس لئے انسا پڑے گا کہ فردوسی کے نزدیک  
نوشیرواں کے ”باغ داد“ سے بہت پہلے بغداد موجود تھا۔ البتہ یہاں ایک گنجائش ہے کہ شہر ملک کو بھی کہتے جیسے ”شہر قرون“  
خود شاہنامہ میں بہت آگاہ ہے اور ”شہر یار“ اور ”شہر چہر“ کے لفظوں میں اس کے معنی ”دیس“ ہیں، ”نگر“ نہیں۔ اس لئے کہا  
جا سکتا ہے کہ فردوسی کا مطلب ”شہر بغداد“ سے وہ ملک یا خطہ ہے جہاں اُس کے زمانہ میں بغداد آباد تھا۔

لے ”نوشیرواں دادگر“ (جو خسرو اول ہوا) اس جگہ سے شہزادہ عیسیٰ تک حکومت کی۔ خسرو ہی کی عربی صورت ”کسریٰ“ ہے۔  
خسرو پرویز (خسرو دوم) نوشیرواں کا پوتا تھا۔ ”شاهنامہ“ کلکتہ ج ۲ ص ۵۶۲

ایک اور جگہ جب فریدوں، ضحاک سے لڑنے جا رہے، یوں ہے :-

بہ اردمند اند چہ آورد رودے چال، چوں بود مرد دیہم جوے  
(اگر پہلوئی نہ دانی زباں، بہ تازی تو اردمند را دجلہ دانی -)  
سوم منزل، آن شاہ آزاد مرد لب دجلہ شہر بغداد کردے۔

اس جگہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں شاعر کا اصل مقصود تو دجلہ ہے۔ بغداد کا نام محض اضافی طور پر آگیا ہے، یعنی وہ جگہ جس پر آج کل بغداد سا باغ و بہار شہر آباد ہے۔  
گھر مشکل یہ ہے کہ فردوسی اور جگہ بھی بغداد کو یاد کرتا ہے۔ نو شیر و ان کے جد اعلیٰ ارد شیر با بکان کی تخت نشینی کا بیان اس شعر سے ہوتا ہے :-

بہ بغداد بنشست بر تخت عاج بہ سر بر نہاد آن دل افروز تاج

یہاں ایک معقول اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ ساسانی شہنشاہوں کا پایہ تخت تو داین تھا، وہیں تخت نشینی کی رسم ۱۵۴ ہوئی ہوگی۔ فردوسی شاید عراق کی جغرافیہ نہیں جانتا تھا، ارد شیر کی تخت نشینی کی شادی اُس نے خلیفہ منصور کی راجدھانی میں بجا دی۔ مگر یہی ارد شیر مرتے وقت اپنے بیٹے شاپور کو نصیحت وصیت کرتا ہے، اسی میں کہتا ہے:

بہ گیتی مرا شارسانت شش ہوا خوشگوارو پر از آب کش  
بکے خواندم "خورہ ارد شیر" ہوا مشکبوری (د) بہ جوے آب شیر  
چو "رام ارد شیر" ست شہرے دگر کزد بر سوے پارس کردم کذر  
دگر شارسان "اور مزد ارد شیر" کہ گرد زبادش جوان مرد پیر  
کزد تازہ شد کشور خوریاں پر از مردم و آب و سود و زیاں  
دگر شارسان بر کہ ارد شیر پر از باغ و پر گلشن و آب گہر  
دو در بوم بغداد و آب خرات پر از چشمہ و چار پائے و نبات

ممکن ہے یہاں بھی کوئی اعتراض وارد ہو سکے، مگر اس میں شہ نہیں کیا گیا جاسکتا کہ فردوسی "برہان قاطع" والی بغداد کی تحقیق سے بے خبر تھا، یا یوں کہنے کہ فردوسی کے زمانہ میں لوگ بغداد کو نو شیر و ان کا "باغ واد" ہرگز نہیں سمجھتے تھے، انہیں تو فردوسی اس بے باکی سے بار بار نو شیر و ان کے نام کی چیز کو کھینچ کھینچ کے صدیوں پیچھے نہ لے جاتا۔ اس کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ خود نو شیر و ان کسی باغ میں بیٹھ کر دادرسی کیا کرتا تھا۔ فردوسی کے سوا مورخوں میں سے بھی میرے علم میں تو کسی نے نو شیر و ان کی حکومت کے حال میں بغداد کا کہیں نام نہیں لیا ہے۔

فردوسی سے کوئی ساڑھے تین سو برس بعد اور "برہان قاطع" کی تالیف سے سو تین سو برس پہلے، مشہور شاعر میں حمد اللہ ستغنی قزوينی نے "نزمہ القلوب" لکھی۔ اُس میں ہے :-

"بغداد، ام البلاد عراقی عرب و شہر اسلامی است۔۔۔ و در زمانہ اکامرو بر آں زمین بہ طرف عراقی دیہہ کرخ نام بود شاپور ذوالکمرات ساختہ، و بہ طرف شرقی دیہہ باباط نام از توابع بہرمان، و گسری نو شیر و ان تخت اشد جسہ بر مہاری آن دیہے ساختہ بود و باغ داد نام کردہ۔ بغداد اسم علم آن شد۔"

۱۵ یعنی پہلوی - ۱۵ شاہ نامہ ج ۱ ص ۲۹ - ۱۵ شاہ نامہ ج ۲ ص ۱۳۹ - ۱۵ شاہ نامہ ج ۳ ص ۱۴۵ - ۱۵ نزمہ القلوب  
یہ مقالہ لاہور ۱۹۱۵ء ص ۲۳

یہاں قزوینی ایک طرف تو بغداد کو عراق کا سب سے بڑا شہر (ام البلاد) بتاتا ہے، دوسری طرف نوخیزوں کے زمانے سے صدیوں پہلے آباد ہو چکے تھے، قزوینی نے یہ نہیں بتایا کہ نوخیزوں نے اس باغ کا نام 'باغ داد' کس بنا پر رکھا ہے مشہور عرب مورخ مسعودی نے دو مختلف باتیں لکھی ہیں :-

”و باغ البستان بالفارسیۃ فقیل بغداد لاجل ذلک وقیل انہ کان موضع صنم یقال لہ باغ قبل ظہور المحمسیۃ وغلبۃ فارس علی ہذا الصقع والاول شہر کزلک ذکر ابن ابی طاہر فی کتابہ فی اخبار بغداد وغیرہ من المصنفین“ (اور باغ فارسی میں بستان کو کہتے ہیں، اسی لئے بغداد کہا گیا۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ مجوسی مذہب کے ظہور سے اور اس زمین پر فارس کا غلبہ پہلے سے تھا۔ استھان تھا ایک بت کا جس کا نام 'باغ' تھا۔ پہلا قول زیادہ مشہور ہے اور ایسا ہی

ابن ابی طاہر نے اپنی کتاب میں جو بغداد کے حالات پر ہے، کہا ہے اور اور مصنفوں نے بھی)

اب دیکھنا چاہئے کہ عربی کے اور مورخ کیا کہتے ہیں۔ اسلامی تاریخ سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ابو بکر صدیق کے عہد میں جب ایران پر فتح کبھی ہوئی تو پہلے انبار، حیرہ اور بغداد سے ہوئی (۱۳ ہجری)۔ اس زمانہ میں بغداد میں ہر چھینے بازار لگتا تھا اور بغداد پر جو حملہ ہوا اسے عرب مورخوں نے اسی لئے 'سوق بغداد' کا حملہ لکھا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ یہ بازار بہت پرانا بازار تھا۔ مسعودی نے ۳۴۵ھ میں اس پرانی بستی کو ایک بڑا شہر بنادیا اور ۳۵۵ھ میں خزانہ دفرہ وغیرہ کو نئے سے بغداد لائے گئے۔

یہ سب کچھ تو کہا گیا مگر اس بات کا کہیں ذکر نہ آیا کہ وہاں نوخیزوں نے اپنے کسی باغ میں بننے میں ایک دن بیٹھ کے مظلوموں کی دلدہی کیا کرتا تھا۔ پہلوی اور سریانی مافذوں میں بھی، جو عربی تصنیفوں سے زیادہ پڑانے میں، اس باغ کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ پھر یہ بھی نہ سمجھنا چاہئے کہ بغداد کبھی کسی ساسانی بادشاہ کا پایہ تخت نہیں رہا اور اشکانیوں سے لیکر ساسانیوں کے عہد کے آخر تک ایران کا پایہ تخت طیسفون (پارسیوں کا دار الحکومت) تھا جو بغداد سے پچیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس زمانہ میں بغداد کی حیثیت ایک بڑے گاؤں سے زیادہ نہ تھی۔ مکان جو

لے ایک بات اس بیان میں یہ بھی درست نہیں کہ سابط کو (جس کا ایرانی نام 'بلاش آباد' ہے) بغداد کے پاس بتایا ہے۔ سابط تو بغداد سے دور دار الحکومت کے پاس ہے اور اسی لئے اسے 'سابط الدائن' کہتے ہیں۔ لے بعد کہ کوکوں نے داد کو عدل کے منہ پر لے کر یہ حاشیہ چڑھا دیا کہ اسی باغ میں بیٹھ کر نوخیزوں نے مظلوموں کی داد دی کیا کرتا تھا۔ لے ابو الحسن علی ابن الحسین المسعودی بغداد میں پیدا ہوا اور غالباً ۳۵۵ھ یا ۳۵۶ھ میں مرا۔

لے جیسا کہ آگے چل کے معلوم ہو گا یہ 'باغ' نہیں بنے۔ لے کتاب التبیۃ والاشتران (لاذکر ۱۹۵۲ء) ص ۳۶۰

لے بلاذری 'فتوح البلدان' (دار الفکر بیروت) ص ۲۴۱ اور ۲۵۰، ابن اثیر 'الکامل' ج ۲ ص ۳۴۲، یاقوت ج ۱ ص ۶۹۹۔

لے بلاذری ص ۲۹۴۔ ۶۹۵۔ مسعودی 'التبیۃ والاشتران' ص ۳۶۰۔

لے خردوسی کے ہاں سابط اور سابطین کو بیکہ آیا ہے اور کہیں کہیں اس طرح کو اس کا پایہ تخت ہونا صاف ظاہر ہوتا ہے، بیسے نوخیزوں کے اپنا قہار کے حال میں :-

چو بر تخت بنشست فرخ قہاد  
سوے طیسفون شد ز شہر سطر

کلاہ بزرگی بہ سر نہاد  
کوگردن کشاں دجاں بود خمر

(شاہنامہ ج ۲ ص ۱۱۰۳)

بشیراز، فرمود، تاہرچ بود  
بیارند یکسر سوے طیسفون

ز مرداں دا گنج و گشت و درود  
سہار د بہ گنجور او رہمنون

(شاہنامہ ص ۱۲۵۱) (تبیۃ نوٹ منقوہ پر ملاحظہ ہو)

بستی میں تھے تقریباً سب کے سب کچی اینٹ کے تھے۔ جہاں تک تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کچی عمارت بھی کوئی ایسی نہ تھی جسے نوشیرواں نے بنوایا ہو۔ اس پر بھی کوئی 'باغ داد' والی کہانی کو سچ جانے، تو بھی مان لینا پڑے گا کہ نوشیرواں عادل اپنی عدالت کا اجلاس اُسی باغ کے کسی پیر کے نیچے کرتا ہوگا۔ مگر یہ بات عقل سے دور اور بہت دور ہے کہ مائیں کے آلام وہ محلوں کو چھوڑ کر وہ ہر مہفتہ پچیس میل کا سفر کر کے ایک ایسی جگہ دادرسی کرنے جاتا ہو، جہاں نہ دھوپ سے بچاؤ کی کوئی صورت تھی، نہ مینہ سے۔ جن مظلوموں کی دادرسی اس طرح سے ہوتی ہوگی ان بچاؤ پر یہ ایک دوسری مصیبت پڑتی ہوگی جس کے ڈر سے شاید بہت سے مظلوم نوشیرواں کے عدل سے اُتھ ہی دھو بیٹھتے ہوں۔

ایک اور بات بھی سوچنے کی ہے، یہ مان بھی لیجئے کہ 'بغداد' کی ادین صورت 'باغ داد' تھی، تو اُس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ایک مدت تک یہی صورت رہی، اور اُس پر بہت طویل زمانہ گزرنے کے بعد مختلف صورت وجود میں آئی ہوگی۔ نوشیرواں ستر مہر شاہ کو تخت پر بیٹھا اور تخت پر بیٹھے ہی اُسے اپنے بھتیجے کی سرکشی کا مقابلہ کرنا پڑا، پھر کئی لڑائیوں میں مصروف رہا۔ اس نے پہلے آٹھ دس برس میں اُسے اصلاحی کاموں اور دادرسی کی فرصت نہ ملی ہوگی اور منتقل طور پر کئی دواستان کے قائم کرنے کا موقع آتے جلد سے جلد کہیں سے جگہ کے لٹ بھگٹ لگا ہوگا۔ پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ جس دواستان کے لئے اُس نے ایک باغ معین کر دیا تھا اُس کا نام خود اُسی نے 'باغ داد' رکھا تھا۔ برہان کی عبارت سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ اُسے لوگ 'باغ داد' کہنے لگے۔ جب صورت یہ ہے تو یہ نام اظہر

### (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۸)

خود نوشیرواں کے کارناموں میں ہے :

سپاہ بزرگ از دامن ہرقت  
بشد رام بر زیں سوے جنگ تفت  
(شاہنامہ ص ۱۲۵۲)

پکے لشکرے از دامن براند  
کردے زمیں جزبہ دریا نہ ماند  
(شاہنامہ ص ۱۲۹۱)

اور ان شعروں سے تو یقین ہوتا ہے کہ نوشیرواں کا دواستان بھی دامن ہی میں تھا۔

دزدان شہر سوئے دامن کشید  
کہ آنجا برے گنجبار اکسید  
عکستار چنیں با چہل اوستاد  
ہمیں راند از پیش ہر حال ستاد  
چو کسری بر آمد بر تخت خویش  
گوازاں و ہماز با بخت خویش  
جہاں چوں بیٹھے شد آراستہ  
ز داد و نہ خوئی و از خواستہ  
بر آسود گیتی ز آوینتن  
بہر بجائے بیداد و خون رینتن  
جہاں نوشد از فرو ایزد می  
بمستند گفتی، دودست بدی  
نہ دانت کس غارت و مافتن  
دگر دست سوئے بدی آفتن  
جہاں بہ فرمان شاہ آمدند  
ز کسری و ہماری بہ راہ آمدند  
کے گم بہ رہ بر دم رینتے  
از آں خواستہ دزد بگرینتے  
ز دیباہ و دینار بر خشک و آب  
بہ رخشدہ روز و بہ ہلکام خواب  
نیم و نہ داد و جہاں شاہ  
نکر دے بر اندیش آں سو نگاہ  
(شاہنامہ ص ۱۶۰۹-۱۶۱۰)

کبھی تھا بھی، تو کم سے کم جلوس سے پندرہ برس (یعنی ۱۵۵۷ء سے) پہلے نہ پڑا ہوگا۔ پندرہ برس میں شاید 'باغ داد' سے عام طور پر 'بغداد' ہو گیا ہو، یعنی اضافت کا کسر و حذف ہو گیا ہو۔ اس طرح ۱۵۵۷ء تک بغداد کی یہ صورت پیدا نہ ہوئی ہوگی۔ مگر ہجرت کے تیر چوبیس برس ربیع الاول یا ربیع الثانی (یعنی مئی جون ۱۵۵۷ء) میں جب بغداد کا بازار لٹا تو اس کا نام بلاشبہ بغداد تھا، 'باغ داد' نہ تھا اور یہ فرض کرنا غلط نہ ہوگا کہ اس سے کم سے کم تیس چالیس برس پہلے بھی یہ نام بغداد ہی تھا۔ اس طرح 'باغ داد' سے بغداد ہو جانے کا زمانہ تیس پچیس برس سے زیادہ نہیں ٹھہرتا۔ یہ مدت کسی جگہ کے نام کے تلفظ کے یوں بدل جانے کے لئے بہت ہی تھوڑی ہے۔ ایسی مدت سو دو سو برس بھی ہو تو زیادہ نہیں۔

اس تخمین سے بھی 'باغ داد' والا نظریہ بہت ہی مشتبہ ٹھہرتا ہے۔ خاص کر اس شہر کے لئے جسے 'ام البلاد' کا لقب ملا ہو اور جس کے بازار کو مورخوں نے اس نام کے ابتدائی زمانہ میں 'السوق العتیق' کہا ہے۔ سرمنہری رائن سن کا تخمینہ تو یہ ہے کہ بغداد کا نام حضرت عیسیٰ سے چار ہزار برس پہلے کا ہے۔ اس رائے سے اتفاق کرنا میرے نزدیک درست نہ ہوگا مگر یہ کہنا کسی طرح غلط نہ ہوگا کہ یہ فارسی نام شدت کے زمانہ سے پہلے کا ہے یعنی فوشیر والی عادل کے زمانہ سے گیارہ بارہ سو برس پہلے کا۔

اب اس انداز سے اور تخمین کو چھوڑ کر کچھ اور ماحذول کی طرف مڑنا چاہئے، مگر اس سے پہلے دو تین باتیں سامنے آجائیں تو اچھا ہے۔ ایک یہ کہ بغداد اگر مرکب ہے تو اس کے اجزاء 'بغ' اور 'داد' ہو سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ 'داد' کے معنی عدل کے ہیں، مگر اس کے سوا اور معنی بھی ہیں۔

تیسرے بغداد کے علاوہ بھی بعض نام ایسے ہیں جن کا پہلا کلمہ 'بغ' ہے، جیسے ہرات اور مرد کے درمیان ایک قصبہ بغشور (جسے صرف 'بغ' بھی کہتے ہیں) ارمینیا میں ایک بغاوند ایک بغروند۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان ناموں میں بھی 'بغ' یا 'ہگ' آیا ہے۔ ایران کی تاریخ، جغرافیہ، مذہبیات وغیرہ پر عربی میں بہت مواد ہے اور ایسا تحقیقی مواد جس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ اسلئے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ عربی کے محققوں کی تحقیق کی رو سے بغداد کی وجہ تسمیہ کیا ٹھہرتی ہے۔ مسعودی کا بیان اور بلاذری کے حوالے اور ۳۱۷ھ کے ہیں مگر اور مصنفوں نے بغداد کی وجہ تسمیہ کی تحقیق کی ایسی کوشش کی ہے کہ اس سے مسعودی کے محل بیان کی تشریح اور تصحیح ہوتی ہے۔ مجھے جہاں تک معلوم ہے ابو عبد اللہ یا قوت حموی (متوفی ۱۲۶۶ھ) نے اپنی معجم البلدان میں سب سے زیادہ روایتیں بغداد کی وجہ تسمیہ کی نقل کی ہیں، انھیں میں 'باغ داد' والی کہانی بھی ہے، جو ایرانیوں کو بہت پسند آئی۔ مگر یا قوت کے ہاں نہ تو فوشیر والی عادل کا ذکر ہے، نہ داد کے معنی دادرسی یا عدل لئے گئے ہیں۔ یہ اضافے غالباً ایرانیوں کی طباعی کا نتیجہ ہیں۔ ستم تو یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے عربی مصنفوں میں سے بھی بعضوں نے اسی مشہور کہانی کو مان لیا۔ مفتی عبدہ صاحب اپنی 'مقاتلہ بدیع' کی شرح میں یوں لکھتا ہے :-

”وفظمنا فی الاصل فارسی مرکب من باغ بمعنی بستان و داد بمعنی العدل“

یا قوت نے جو روایتیں نقل کی ہیں :-

(۱) بعضے بھی کہتے ہیں کہ بغداد ایک شخص کا باغ تھا، کیونکہ 'باغ' بستان کو کہتے ہیں اور 'داد' کسی آدمی کا نام ہے

۱۔ بلاذری، فتح البلدان، ص ۷۴ - ۷۵، انسائیکلو پیڈیا برتانیکا، مصنفون بغداد - ۷۵ بلاذری ص ۴۰۶، یا قوت، معجم البلدان (روایتی نقل) کی اشاعت ۱۹۱۲ء - ۱۹۱۳ء - ۱۹۱۴ء، جہاں کشائی، ج ۱ ص ۱۱۸ - ۷۵ بلاذری صفحہ ۱۹۴، یا قوت، جلد ۱ صفحہ ۲۹۴ - ۲۹۵، معنی زبان میں اس کا لفظ 'بغروند' ہے - ۷۵ یا قوت، جلد ۱، صفحہ ۲۶۷ - ۲۶۸ -

۲۔ جہاں کشائی، ج ۱ ص ۱۱۸ - ۷۵ بلاذری صفحہ ۱۹۴، یا قوت، جلد ۱ صفحہ ۲۹۴ - ۲۹۵، معنی زبان میں اس کا لفظ 'بغروند' ہے - ۷۵ یا قوت، جلد ۱، صفحہ ۲۶۷ - ۲۶۸ -

(۲) اور بعضے (مجھی) کہتے ہیں کہ 'بنغ' ایک بت کا نام ہے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ مشرق کے ملک سے ایک خواجہ سرا کسریٰ کے دربار میں لایا گیا۔ کسریٰ نے اُسے ایک قطعہ زمین کا عطا کیا (وہی جو آگے چل کے بغداد کہلایا)۔ خواجہ سرا اپنے وطن میں بتوں کی پوجہ کر رہا تھا۔ اس لئے وہ بول اُٹھا، 'بنغ دادی' یعنی (بنغ) بت نے مجھے عطا کیا۔

(یہاں دادی کی (دی) سمجھ میں نہیں آتی، سوا اس کے کہ واحد مخاطب کی (دی) فرض کی جائے، مگر ایسی صورت میں عربی ترجمہ اُس سے مختلف ہونا چاہئے تھا جو 'معجم' کے متن میں ہے۔ یعنی یہ ہونا چاہئے تھا "اس بنغ، تو ہی نے مجھے یہ (زمین) عطا کی"۔

(۳) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ 'بنغ' کے معنی بتان ہیں اور داد، عطا کیا۔ چونکہ کسریٰ نے یہ باغ اُس خواجہ سرا کو دے دیا تھا، اس لئے بنغ داد کہلایا۔ (اگر یوں لیجئے تو پھر اُس باغ کا نام 'باغ دادہ' ہونا چاہئے تھا۔ مگر 'دادہ' کی صورت ساسانی عہد کی زبان میں 'داؤک' یا 'داؤگ' تھی۔ یہ معرب ہو کر (اگر پہلے الف کا حذف ہو جاتا بھی) ان لیا جائے تو 'بغدادوق' یا 'بغدادج' ہو گیا ہوتا، جیسے 'بیزق' اور 'سافج' اور موجودہ فارسی میں 'بغدادہ' ہوتا۔ لیکن ان صورتوں میں سے ایک بھی کہیں نہیں ملتی)

۴۔ حمزہ ابن الحسن نے کہا ہے کہ بغداد ایک فارسی نام ہے جو باغ دادو یا کعرب ہے، اس لئے کہ منصور کے بسائے ہوئے شہر کا ایک ٹکڑا دادو یا نام، ایک ایوان کا، باغ تھا اور بعضے ٹکڑے اُس رقبے کے وہ تھے جہاں ایک پڑنے شہر کے کچھ آثار باقی تھے، جس کی داغ بیل ایران کے کسی بادشاہ نے شہر کا نام کیا رکھنے کو کہا تھا تو کہنے والے نے جواب دیا: "علیہ وہ درود اسی خلق عا بعدا" (یعنی اسے سلام کر کے چھوڑ دو)۔ جب یہ قصہ نوکوں نے منصور کو سنایا تو اُس نے کہا: "میں نے اس کا نام مدینۃ السلام رکھا ہے" (یہ کہانی بھی بس کہانی ہی ہے۔ صحیح روایتیں کہتی ہیں "مدینۃ السلام" میں "السلام" سے خود اللہ کا نام مقصود ہے یا اس سے سلامتی مراد ہے)۔

(۵) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بغداد ملگے زمانہ میں دسوار کی ایک منڈی تھا۔ وہاں چین کے سوداگر آیا کرتے اور بہت نفع کمائے جاتے اور چین کے بادشاہ کا نام 'بنغ' تھا۔ سو یہ سوداگر جب (الامال ہو کے) اپنے دیس کو لوٹنے لگتے تو کہا کرتے "بنغ داد" یعنی یہ نفع جو ہم نے کمایا ہے، سو ہمارے بادشاہ کا عطیہ ہے۔

(یہ حکایت یوں صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ چین کی زبان فارسی سے بالکل مختلف تھی۔ چینی بھلا فارسی لفظ "داد" کیوں بولتے اور وہ بھی ایک ایسے فقرے میں جس سے چین کے بادشاہ کا شکر ادا کرنا چاہتے تھے۔ اور اگر یہ مان بھی لیجئے کہ دس میں چینی مسافر ایسا کرتے بھی تھے تو اُس سے شہر کا نام کیونکر پڑ گیا اور خود اُس شہر کے رہنے والوں نے اُسے کیونکر اختیار کر لیا۔)

۱۔ ابو عبد اللہ حمزہ بن الحسن الاصطہانی، عربی کا ادیب اور مصنف تھا۔ ۳۵۰ اور ۳۶۰ م کے درمیان کسی وقت مرا۔ تاریخی اور لغوی تحقیق میں مصروف رہا کرتا تھا اور فارسی لفظوں کی تحقیق زردشتی موبدوں وغیرہ سے کیا کرتا تھا، مگر جو اشتقاق، خاص کر ایسے فارسی لفظوں اور ناموں کے بتاتا ہے کہ عربی میں آتے ہیں، اکثر غلط ہوتے ہیں۔ سبب اس کا زیادہ تر یہ ہے کہ اسلام سے پہلے کی ایرانی زبان سے پوری واقفیت نہیں رکھتا تھا اور اُس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کھینچ مان کر کسی عربی لفظ کو ایرانی اصل سے ثابت کرے۔ خصوصاً تحریک کے اس پہلو ان نے بھروسہ کی اسل بس راہ قرار دی ہے! (معجم جلد ۱، صفحہ ۶۳)۔

۲۔ علیہ وہ درود، میری قرأت ہے۔ عربی متن کے فصول کے اختلاف ہیں:-

(۱) علیہ وہ درود - (۲) ہیز وہ درود - (۳) ہیز وہ درود - (۴) ہیز وہ درود - ان میں سے کوئی نسخہ پورا صحیح نہیں۔ ہیز، (یعنی ہیز) کی عربی ہوئی، 'خلو' وہ بدل ہے "ب" کا اور اُس کی عربی "ب"۔ اُس کے بعد درود کی پہلی صورت "درود" ہے اور اُس کی عربی ہے "سلام"

۶۔ بغداد کا لفظ سات طرح پر بولا جاتا ہے۔

(۱) بغداد - (۲) بغدادی - (۳) بغدادی صورت کو بصری کے نحوی (عربی زبان میں) جائز نہیں سمجھتے۔ اُن کا قول ہے کہ کلام عرب میں ایسا کوئی لفظ نہیں آیا ہے جس میں وال کے بعد ذال ہو۔ ابو القاسم عبدالرحمن ابن اسحق کہتے ہیں کہ میں نے (اپنے استاد) ابن السری سے کہا: پھر جو "خرواز" عربی میں اس طرح بولا جاتا ہے اُس کے بارے میں آپ کیا کہنے کا؟ انھوں نے کہا کہ وہ تو فارسی لفظ ہے، کلام عرب سے نہیں۔ اس پر میں نے کہا: پس یہی جواب اُس شخص کی طرف سے بھی دیا جائے گا جو "بغداد" بولتا ہے، اس نے کہا "بغداد" کلام عرب سے نہیں ہے۔ کسائی نے "بغداد" کو اصل کی بنا پر جائز گردانا اور وہ اور صورتیں بتائیں: (۴) بغدادیہ بغداد (۵) بغداد - ساتویں صورت یاقوت نے نہیں لکھی ہے۔ - بغدادین (د) ہے۔

۷۔ عبدالعزیز ابن ابی رواد کے سامنے کسی نے "بغداد" کہہ دیا تو کہا "بغداد" نہ کہو، اس نے کہا "بغ" ایک بت ہے اور "داد" کے معنی وہاں "مدینۃ السلام" کہو کہ "سلام" اللہ کا نام ہے اور شہر شیعہ ہیں سب اُسی کے ہیں، سو یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی کہے "مدینۃ اقدس" (ابن ابی رواد کا زمانہ ہمارا چھری کا ہے اور بغداد کی وجہ تسمیہ کے متعلق شاید اس سے پرانا قول کسی عربی کتاب میں مشکل سے ملے۔ اس کی صحت میں شبہ کرنے کی گنجائش بھی نہیں)

۸۔ کہا جاتا ہے کہ مصنف نے شہر کا نام مدینۃ السلام اس لئے رکھا کہ اس میں سلامتی کی نیک مثال ہے۔ یاقوت سے پہلے کے مصنفوں نے بھی اس بحث پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں سے فن لغت کی بنیاد پڑی جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ بھی ابن ابی رواد کے قول کے موافق ہے۔ لغت کے جگت استاد اسمعیل کے قول کو ابن قتبہ نے اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے اور جو یقینی نے کسی قدر تفصیل سے - ابن قتبہ کہتا ہے:-

<p>"وكان الأصمعي لا يقول ببغداد وينبغي عن ذلك يقول مدینة السلام لأنه سمع في الحديث ان نوح صم و داد عطية بالفارسية كانها عطية الصم".</p>	<p>اسمعی "بغداد" نہیں کہتا تھا اور لوگوں کو اس لفظ کے استعمال سے منع کرتا تھا اور مدینۃ السلام کہا کرتا، اس لئے کہ اُس نے حدیث میں سنا تھا کہ بنی ایک بت ہے اور رواد فارسی میں عطیہ کہتے تھے تو (بغداد) ایسا ہی ہوا جیسے بت یا دیوتا کا دیا ہوا۔</p>
---	--

۹۔ الزجاجی (متوفی ۳۳۰ھ) الزجاج کا شاگرد تھا اور بصری لکھا میں سے ہے۔

۱۰۔ ابواسحق ابراہیم ابن محمد ابن السری الزجاج البصری (متوفی ۳۳۰ھ) البصری کا شاگرد اور ابو القاسم الزجاجی کا استاد۔

۱۱۔ ابوالحسن علی ابن حمزة الکسائی الکوفی (متوفی ۳۸۰ھ) ایرانی الاصل تھا۔ کونہ کے لغویوں میں بہت ممتاز تھا اور ہارون الرشید کا درباری۔

۱۲۔ سجع کے متعلق اس جگہ ذال نہیں دال ہے۔ یہ چھاپے کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

۱۳۔ ابوالفتحی کتاب المعرب، ص ۲ - مختلف صورتیں ایوان کی مختلف برہوں میں ہوں گی۔ ب اوم آپس میں بدلتے ہیں جیسے بنگ (بجنگ) کو

منگ بھی بولتے ہیں، "آ" جس "اے" سے اکثر لفظوں میں بدلا ہے، "او" (و) تاب، کیلک = کاک، راکھ کی تلی، خراش = خرباش۔

منقول کا لوج غالباً اور مقاموں کے ناموں کا شان و فیر کے قیاس ہے۔ - لے دیکھو نووی تہذیب اللسان، فاللغات، جلد ۱ (دیورسٹن فلد کی

اشاعت) ص ۲۴ - لے یاقوت ج اس ۲۰۸ اور ج ۴ - ص ۵۳ - لے یاقوت ج ۴ - ص ۵۳ (۱۵۰) ص ۲۰۸ میں اسی بات کو لفظوں کی کمی

بیشی سے کہا ہے۔ - لے ابوسعید عبداللہ ابن قریب لاصمعی ص ۱۷ میں پورا اور ص ۱۸ میں فوت ہوا۔ - لے عبداللہ ابن مسلم ابن قتبہ دینوری ص ۱۷

میں پڑھا اور ص ۱۷ میں ص ۱۷ - ادب الکاتب" کا مصنف ہے۔ - لے ابو منصور موصوف ابن احمد ابن الخضر الخلیفی ص ۱۷ میں پڑھا اور

۱۴۔ ص ۱۷ - کن بلعرب من الکلام الامجی کا مؤلف ہے۔ - لے ابوالکاتب (لائون سنفلڈ) ص ۲۰

جو اہل حق پہلے اپنی تحقیق کا خلاصہ لکھتا ہے :-

”وَبَغْدَادُ اسْمُ الْعَجْمِيِّ كَانُ بِنِ لُغَةِ الْعَرَبِ وَدَاؤُ عَطِيَّةٍ“

پھر کہتا ہے :-

وَكَانَ الْأَصْمَعِيُّ يَكْمُرُهُ أَنَّ يَقُولَ بَغْدَادُ وَبَنِي عَمْرِو بْنِ  
لَهُذَا الْمَعْنَى وَيَقُولُ مَدِينَةُ السَّلَامِ .....  
قَالَ أَبُو حَاتِمٍ وَسَائِلُ الْأَصْمَعِيِّ عَنْ بَغْدَادٍ وَبَغْدَادُ  
وَبَغْدَانُ وَبَغْدَيْنُ، بَلْ يُقَالُ كُلُّ هَذَا فِكْمَرُهُ أَنَّ  
يُكَلِّمُ بَشِيئَةً مِنْهُ وَقَالَ هَذَا رَدِّي أَحْسَنُ إِنَّ يَكُونُ  
شَرًّا كَمَا قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ أَلَى بِالْذَّالِ الْمَنْقُوطَةِ مِنْ فَوْقِ  
وَكَانَ يَقُولُ مَدِينَةُ السَّلَامِ

اور اصمعی اس سے کراہیت کرتا تھا کہ بغداد کہے اور (لوگوں کو)  
اس (کے استعمال) سے منع کرتا، انھیں معنوں کی وجہ سے (جو اوپر  
بیان ہوئے) اور (بغداد کو) مدینۃ السلام کہا کرتا تھا، اصمعی کا  
شاگرد رشید ابو حاتم کہتا ہے میں نے اصمعی سے بغداد، بغداد، بغداد  
بغدان، بغدین کے بارے میں پوچھا: کیا یہ سب صورتیں صحیح ہیں؟ اصمعی نے  
پسند نہ کیا کہ وہ ان (لفظوں) کے متعلق کچھ بھی کہے اور کہا: سب  
ردی ہیں، ڈرتا ہوں کہ میں شرکاً مرتکب ہو جاؤں پھر کہا میں نے نزدیک  
منقوطہ والی صورت سے بھونٹ دی ہے وہ ہمیشہ مدینۃ السلام کہا کرتا تھا۔

اصمعی کے قول کو ابن ابی رواد کے قول سے ملائے دیکھئے تو معلوم دیتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں علماء کا اس پر اتفاق تھا کہ  
بنی کسی دیوتا یا بت کا نام تھا۔ باغ کا لفظ اس بحث میں بعد کو آیا اور وہ بھی ایرانیوں کے ذریعہ سے۔ اس نے ضرور ہی ہے کہ ایرانی نالوں  
اس لفظ (بن) کی تلاش کی جائے۔

قبل اس کے کہ ایرانی ماخذوں کی طرف رجوع کیجئے دو تین باتیں نظر کے سامنے آجائیں تو اچھا ہے :-

- ۱- فارسی میں پ اور ت آپس میں بدلتی ہیں جیسے زبان اور زخان، برغت اور فرغت وغیرہ۔
- ۲- گ کبھی غ سے بدلتا ہے جیسے لگام کی جگہ لغام، گلو سنگ (بیل کو ہانکنے کی آہ) کے بجائے غاوشنگ، چکامہ کے لئے چخامہ اور  
گلگونہ کی جگہ غلغونہ، بولتے ہیں۔
- ۳- زبر بدل کر پیش ہو جاتا ہے اور اس کی مثالیں بہت ہیں۔
- ۴- اگر فارسی کے ساتھ ایرانی ایرانی زبانیں اور ایران کے مختلف خطوں کی بولیاں بھی اس مقابلہ میں شامل کر لی جائیں تو (۲) (۳)  
(۴) کی مثالیں بہت کثرت سے ملتی ہیں۔

اب دیکھنا چاہئے کہ ”بن“ کے معنی فارسی لغت کی کتابوں میں کیا دئے ہیں :-

”بن“ فتح اول زمین کمنہ و گوارا گویند و نام بتے ہم ہست (برہان)

پہلے معنی سے ہمیں کام نہیں، یہ لفظ ہی اور ہے۔ دوسرے معنی وہی ہیں جو عربی کے لغویوں نے بتائے ہیں۔ انھیں معنوں میں

فرغانہ اور ماوراء النہر کے لوگ بن کو فتح بولتے ہیں۔ چنانچہ ”برہان“ ہی میں ہے :-

”فتح فتح اول ... بہ لغت فرغانہ و ماوراء النہر معنی بت باشد کہ عربان سنم خوانند و بمعنی معشوق و مصاحب و کسے

یا کہ بسیار دوست دارند ہم آرد است و گنایہ از جوانان خوب صورت و صاحب حسن ہم است“  
اسدی طوسی کی فرزندگی سے اس کی تصدیق ہوتی ہے:

ابو حاتم البستانی (یعنی سبستانی) جو ۲۵۰ھ میں مرا، اصمعی اور ابو عبیدہ کا شاگرد اور ابو عبیدہ قاسم ابن سلام کا ہم سبق تھا اور ابن دبیہ  
استاد۔ ۲۵۰ھ جو اہل حق، کتاب المعرب (لاکھ سنگ ۱۸۶۶ء) ص ۳۲

”فغ بیت اشد بعبارت فرغانیاں - حضری گفت :-

گفتہ فغان کم ز تو اسے بت ہزار بار  
گفتا کہ از فغان بود اندر چہاں فغان

فارسی میں ’بت‘ کے لفظ سے جو معنی استعارے کے طور پر لئے جاتے ہیں وہی فغ سے بھی - فرہنگ شوری اور اور کتابوں میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ لفظ کے پیش سے بھی ہے اور جمع فغان ہے - حضری کے شعر میں ایک اور لفظ فغان (فراد) آیا ہے - اس کے بھی دو لفظ ہیں ن کے زیر اور پیش سے جن میں سے دوسرا زیادہ صحیح ہے، پہلا زیادہ مشہور - اس شعر میں دونوں کی ن کو اگر پیش سے پڑھے تو تیس نام ہے اور عجب نہیں کہ یہی شاعر کا مقصود ہو - ممکن ہے کوئی یہ سمجھے کہ زمانہ میں جب بتوں کی پوجا ہوتی تھی تو لوگ فریاد کرتے وقت بتوں کی دہائی دیتے اور ”فغان فغان“ کہہ کے پکارتے ہوں گے، اور اس سے فغان (فغ کی جمع) کے معنی فریاد ہوئے - ایسا نہیں ہو سکتا، فغان کی پُرانی صورت افغان ہے اور اسے فغ سے تعلق نہیں - ہاں اور بہت سے لفظ ہیں جو فغ سے بنے ہیں :-

فغاک - ابلہ، بے وقوف، (اسدی، لغت قرس)

فغستان - (۱) بت خانہ (۲) بادشاہوں کی حرم سرا (۳) خوبصورتی اور حسینوں کا مجمع (برہان قاطع)

فغستان - (۱) زن و منکوحہ (۲) صورت سلاطین و امرا (برہان)

(یہ لفظ عجیب ہے - معلوم ہوتا ہے کہ اس کو پیش صرف اس لئے دیا گیا کہ فغستان سے فرق ہو جائے - اس کے دونوں معنی

کہاے ہیں یعنی ہیں)

فغشور { نام شہر بیت از ملک چین و مردم آخجا بہ غایت خوب سورت و صاحب حسن می شوند و جمیع بتان و جنگلن  
فغشور { در آں شہر می باشند - (برہان)

فغوارہ - اسے کہتے ہیں جو نگہ را بہت رکھی یا شرمندگی سے چپ ہو اور بات نہ کر سکے - ”معنی ترکیبی لغت بت مانند است - چہ فغ بت را گویند و وارہ مانند را یعنی بچہ جادو فاموش است - (برہان)

خلاصہ یہ کہ فغ فغ کے معنی عربی ہی محققوں نے نہیں فارسی والوں نے بھی بتائے ہیں - اس میں شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ تینوں ایک لفظ کے مختلف ہیچے ہیں - بتوں کا عمل و فعل و سلام سے پہلے زیادہ تھا - اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے کی ایرانی زبانوں میں ”باغ“ اور ”بغ“ کی تلاش کی جائے۔

زمانہ کے لحاظ سے ایران کی زبان کی یوں تقسیم کی جاتی ہے :-

۱ - پُرانا دور - ابتدائے تیسری صدی قبل مسیح تک -

اس دور کی زبان میں بس دو ہی چیزیں ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں :- ایک اوستا کے وہ حصے جو سکندر کے حملہ کے وقت ضائع ہونے سے بچ گئے تھے اور اب تک محفوظ ہیں، دوسرے اپنی منشی فرمانرواؤں کے کتبے یا تختی یا پیکانی شکل کے حرفوں میں پتھروں وغیرہ پر کھدے ہوئے اب بھی موجود ہیں - اوستا کی تحریر کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح کے لگ بھگ مانا گیا ہے اور یہی کتبے ۶۰۰ سے ۵۰۰ ق م تک کے ٹھہرتے ہیں - اوستا کی زبان اور کتبوں کی زبان میں تھوڑا سا فرق ہے - اس لئے کہ زردشت کی مقدس کتاب ایران کے شمال مشرقی حصے، باختر میں وجود میں آئی اور وہاں کی بولی میں ہے -

تلفہ - یہ غلط مشہور ہے کہ ”زند“ اصل کتاب ہے اور اوستا، اس کی شرح - حقیقت میں ”اوستا“ اصل متن ہے اور ”زند“ اس کا ترجمہ اور شرح (پہلوی زبان میں) ”پازند“ میں ”زند“ کی مزید تشریح ہے اور کسی قدر بعد کی پہلوی میں ہے -

چنانچہ منشی شہنشاہوں دارپوش اعظم وغیرہ کا پایہ تخت ایران کے جنوب مغربی حصے، پارس میں تھا۔ ان کے کہنے زبان کی پڑائی بولی میں ہیں، اور وہی بولی مستند شہزادی۔ آگے بڑھ کر ساسانیوں کا دربار بھی ایران کے جنوب مغربی حصہ میں رہا، اور وہیں کی زبان تحریری اور علمی زبان قرار پائی اور اب تک ہے۔۔۔۔۔ اور آج جسے ہم فارسی کہتے ہیں، وہ اسی پڑائی ایرانی زبان کی ہی صوبہ تھا۔

۲۔ درمیانی دور - تیسری صدی ق۔ م سے لے کر ساتویں صدی عیسوی تک -

اس دور میں ۲۸۰ ق۔ م سے ۲۴۴ عیسوی تک اشکانیوں کی حکومت رہی۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ کا نام ارشک تھا۔ اس نے اس کے بادشاہ 'ارشکانی' یا 'اشکانی' کہلائے۔ وطن ان لوگوں کا پہلو تھا، اور یہ وہ کوہستانی علاقہ ہے جو ملک کے وسط میں واقع تھا۔ یہ پہاڑی قوم بڑی بہادر تھی اور یہ انھیں (پہلو والوں) کی بہادری اور پہلوانی تھی جس نے ایران کو یونانی عاملوں کے پنجے سے چھڑایا۔ 'پہلوان' (جو اصل میں 'پہلو کی جمع ہے) اور 'پہلوی' اور 'پہلوانی' کے لفظ انھیں سے نسبت رکھتے ہیں۔ ہر چیز جو ممتاز اور سر بلند تھی، چنانچہ فصیح اور شستہ زبان بھی پہلوی کہلائی۔

اگرچہ پہلوی کا لقب اس دور کی فارسی کے لئے اشکانیوں سے شروع ہوا، لیکن ان کے عہد میں علم اور ادب کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں ہوئی۔ اشکانیوں کے بعد ساسانیوں کی حکومت ۲۲۴ء سے ۶۵۱ء تک رہی، اور اسی زمانہ میں پہلوی ادب کا آغاز اور عروج ہوا، جس کا سلسلہ اسلامی دور کی ابتدا تک جاری رہا۔

پہلوی ادب کے علاوہ مانی اور اُس کے پیروں کی کتابیں تیسری سے ساتویں صدی عیسوی تک مختلف وقتوں اور ایران کی مختلف بولیوں میں لکھی گئیں۔

۳۔ آخری دور - (اسلامی)۔ پہلی صدی ہجری (یعنی ساتویں صدی عیسوی) سے اب تک -

ان تینوں دوروں کی زبانوں کا فرق اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ اگر اس زمانہ کے فارسی بولنے والے کے سامنے اوستا یا مینی کتبوں کی عبارت پڑے تو وہ کچھ نہ سمجھے گا۔ مان اگر درمیانی دور کی زبان کی کوئی عبارت پڑے تو وہ اُس کے بہت سے لفظوں کو پہچان لے گا۔

اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ پڑائی ایرانی (یعنی اوستا اور مینی کتبوں کی) زبان، وید کی زبان اور سنسکرت سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ اسی طرح درمیانی دور کی فارسی اور ہندو مت میں بعض چیزیں مشترک ہیں۔ اب دیکھنا چاہئے کہ 'باغ'، 'بنج' اور 'داد' کی ان مختلف دہروں میں کیا شکلیں ہیں۔

۱۔ 'باغ' (بستان) پہلے دور میں نہیں ہے۔ دوسرے دور میں بھی شروع میں نہیں ملتا۔ البتہ آخر میں استعمال ہونے لگا تھا۔ خسرو ہمدانی کی حکومت کا اخیر سال تھا کہ خود اُسی کی فوج نے جس کے ساتھ اُس کا بیٹا خیرویہ بھی ہو گیا تھا، اُس پر نرغا کیا تو اُس نے اپنے محل سے بھاگ کر ایک باغ میں پناہ لی جس کا نام 'باغ ہندوان' تھا۔ طبری اسے 'باغ الہندوان' کہتا ہے۔ اوستا میں دباگ آیا ہے مگر اس کے معنی ہیں 'حصہ' یہی سنسکرت میں 'دباگ' ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ ترک کے جتنے کرتے ہیں جو دباگ، کا لفظ استعمال ہوتا تھا اُسی سے 'بستان' کے معنی پیدا ہوئے ہوں گے۔ میں اس کو صحیح نہیں جانتا، گو کہ یہ نہیں جاسکتا کہ باغ کی اصل کیا ہے۔

۱۔ مینی کتبوں میں یہ نام 'داری وہش' ہے، در داری اور دشتوج، ہ مضوم، ش ساکن)۔ اسی کا مخفف 'دارپوش' ہوا اور مزید تخفیف ہو کر دارا ہو گیا۔ اس کا نام پہلا تاج دار دارپوش اعظم تھا ۲۱۲ء - ۲۷۱ء ق۔ م) دارپوش دوم کی حکومت ۲۷۱ء سے ۳۰۲ء ق۔ م تک رہی۔ تیسرا دارا ہخامنی دارا ہے جس نے سکندر سے شکست کھائی۔ ۳۳۵ء سے ۳۳۰ء ق۔ م تک اس کی حکومت رہی اور اُسی پر منشا خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

۲۔ اب اس کا نام خراسان ہے۔ - ۱۔ طبری، تاریخ، جلد ۱ ص ۱۰۴۳ -

”فغ بت باشد بعبار۔ فغ نیاں۔ غصری گفت :-

گفتم فغان کنم ز تو اس بت ہزار بار  
گفتا کہ از فغان بود اندر جہاں فغان

فارسی میں ’بت‘ کے لفظ سے جو معنی استعارے کے طور پر لئے جاتے ہیں وہی فغ سے بھی۔ فغ ہنگ شعوری اور اور کتابوں میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ لفظ فغان کے پیش سے بھی ہے اور جمع فغان ہے۔ غصری کے شعر میں ایک اور لفظ فغان (فریاد) آیا ہے۔ اس کے بھی دو لفظ ہیں فغان کے زیر اور پیش سے جن میں سے دوسرا زیادہ صحیح ہے، پہلا زیادہ مشہور۔ اس شعر میں دونوں کی فغان کو اگر پیش سے پڑھے تو نہیں تمام ہے اور عجب نہیں کہ یہی شاعر کا مقصود ہو۔ ممکن ہے کوئی یہ سمجھے پڑنے زمانہ میں جب بتوں کی پوجا ہوتی تھی تو لوگ فریاد کرتے وقت بتوں کی دعاؤں دیتے اور ”فغان، فغان“ کہنے کے پکارتے ہوں گے، اور اس سے فغان (فغ کی جمع) کے معنی فریاد ہوئے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ فغان کی پرائی صورت افغان ہے اور اسے فغ سے تعلق نہیں۔ ہاں اور بہت سے لفظ ہیں جو فغ سے بنے ہیں :-

فغاک - ابلہ، بے وقوف، (اسدی، لغت فارس)

فغستان - (۱) بت خانہ (۲) بادشاہوں کی حرم سرا (۳) خواہشوں اور حسینوں کا مجمع (برہان قاطع)

فغستان - (۱) زن و منکوحہ (۲) صورت سلاطین و امرا (برہان)

(یہ لفظ عجیب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو پیش صرف اس لئے دیا گیا کہ فغستان سے فرق ہو جائے۔ اس کے دونوں معنی کہائے پر مبنی ہیں)

نام شہر بیت از ملک چین و مردم آخجا بہ غایت خوب صورت و صاحب حسن می شود و جمیع بتاں و بتگاہاں  
در آں شہر می باشند۔ (برہان)

فغوارہ - اسے کہتے ہیں جو نگہ یا بہت رسک یا شرمندگی سے چپ ہو اور بات نہ کر سکے۔ ”معنی ترکیبی لغت بت مانند است۔ چہ فغ بت را گویند و وارہ مانند را یعنی بچو جہاد خاموش است“ (برہان)

خلاصہ یہ کہ فغ فغ فغ کے معنی غریبی ہی محققوں نے، نہیں فارسی والوں نے بھی بتائے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ تینوں ایک لفظ کے مختلف لہجے ہیں۔ بتوں کا عمل و فعل و سلام سے پہلے زیادہ تھا۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے کی ایرانی زبانوں میں ”باغ“ اور ”فغ“ کی تلاش کی جائے۔

زمانہ کے لحاظ سے ایران کی زبان کی یوں تقسیم کی جاتی ہے :-

۱۔ پُرانا دور - ابتدائے تیسری صدی قبل مسیح تک -

اس دور کی زبان میں بس دو ہی چیزیں ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں :- ایک اوستا کے وہ حصے جو سکندر کے حملہ کے وقت ضائع ہونے سے بچ گئے تھے اور اب تک محفوظ ہیں، دوسرے ہینامنشی فرامزداؤں کے کتبے، یعنی یا سپکا کی شکل کے حرفوں میں پتھروں وغیرہ پر کھدے ہوئے اب بھی موجود ہیں۔ اوستا کی تحریر کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح کے لگ بھگ مانا گیا ہے اور مبنی کتبے ۶۰۰ سے ۴۰۰ ق۔ م تک کے ٹھہرتے ہیں۔ اوستا کی زبان اور کتبوں کی زبان میں سمجھوتہ سا فرق ہے۔ اس لئے کہ زردشت کی مقدس کتاب ایران کے شمال مشرقی حصے، باختر میں وجود میں آئی اور وہاں کی بولی میں ہے۔

یہ غلط فہم ہے کہ زردشت اصل کتاب ہے اور اوستا، اس کی شرح۔ حقیقت میں اوستا، اصل متن ہے اور زردشت، اس کا ترجمہ اور شرح (پہلی زبان میں) ’پازند‘ میں ’زرد‘ کی مزید تشریح ہے اور کسی قدر بعد کی پہلی زبان میں ہے۔

ہخامنشی شہنشاہوں داریوش اعظم وغیرہ کا پایہ تخت ایران کے جنوب مغربی حصے، پارس میں تھا۔ ان کے کہنے و بان کی پڑائی بولی میں ہیں، اور وہی بولی مستند ٹھہرتی۔ آگے بڑھ کر ساسانیوں کا دربار بھی ایران کے جنوب مغربی حصہ میں رہا، اور وہیں کی زبان تحریری اور علمی زبان قرار پائی اور اب تک ہے۔۔۔۔۔ اور آج جسے ہم فارسی کہتے ہیں، وہ اسی پڑائی ایرانی زبان کی کئی صورت ہے۔

۲۔ درمیانی دور - تیسری صدی ق۔ م سے لے کر ساتویں صدی عیسوی تک -

اس دور میں ۲۸۸ ق۔ م سے ۲۶۴ عیسوی تک اشکانیوں کی حکومت رہی۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ کا نام ارشک تھا۔ اس لئے اس کے بادشاہ 'ارشکانی' یا 'ارشکانی' کہلائے۔ وطن ان لوگوں کا پہلو تھا، اور یہ وہ کوہستانی علاقہ ہے جو ملک کے وسط میں واقع تھا۔ یہ پہاڑی قوم بڑی بہادر تھی اور یہ انھیں (پہلو والوں) کی بہادری اور پہلائی تھی جس نے ایران کو یونانی عاملوں کے پنجے سے چھڑایا۔ 'پہلوان' (جو اصل میں 'پہلو کی جمع ہے) اور 'پہلوی' اور 'پہلوانی' کے لفظ انھیں سے نسبت رکھتے ہیں۔ ہرچیز جو ممتاز اور سر بلند تھی، چنانچہ صبح اور شستہ زبان بھی پہلوی کہلائی۔

اگرچہ 'پہلوی' کا لقب اس دور کی فارسی کے لئے اشکانیوں سے شروع ہوا، لیکن ان کے عہد میں علم اور ادب کی طرف ذرا ابھی توجہ نہیں ہوئی۔ اشکانیوں کے بعد ساسانیوں کی حکومت ۲۲۴ء سے ۶۵۱ء تک رہی، اور اسی زمانہ میں پہلوی ادب کا آغاز اور عروج ہوا، جس کا سلسلہ اسلامی دور کی ابتدا تک جاری رہا۔

پہلوی ادب کے علاوہ مانی اور اس کے پیروں کی کتابیں تیسری سے ساتویں صدی عیسوی تک مختلف وقتوں اور ایران کی مختلف بولیوں میں لکھی گئیں۔

۳۔ آخری دور - (اسلامی)۔ پہلی صدی ہجری (یعنی ساتویں صدی عیسوی) سے اب تک -

ان تینوں دوروں کی زبانوں کا فرق اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ اگر اس زمانہ کے فارسی بولنے والے کے سامنے دوستا یا یعنی کتبوں کی عبارت پڑھے تو وہ کچھ نہ سمجھے گا۔ ہاں اگر درمیانی دور کی زبان کی کوئی عبارت پڑھی جائے تو وہ اس کے بہت سے لفظوں کو پہچان لے گا۔

اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ پڑائی ایرانی (یعنی ادستا اور یعنی کتبوں کی) زبان، وید کی زبان اور سنسکرت سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ اسی طرح درمیانی دور کی فارسی اور پراکرت میں بعضی چیزیں مشترک ہیں۔

اب دیکھنا چاہئے کہ 'باغ'، 'بنغ' اور 'داد' کی ان مختلف دوزوں میں کیا شکلیں ہیں۔

۱۔ 'باغ' (بتان) پہلے دور میں نہیں ہے۔ دوسرے دور میں بھی شروع میں نہیں ملتا۔ البتہ آخر میں استعمال ہونے لگا تھا۔ خسرو ہمدانی کی حکومت کا اخیر سال تھا کہ خود اسی کی فوج نے جس کے ساتھ اس کا بیٹا خسرو یہ بھی ہو گیا تھا، اس پر نرغا کیا تو اس نے اپنے محل سے بھاگ کر ایک باغ میں پناہ لی جس کا نام 'باغ ہندوان' تھا۔ طبری اسے 'باغ الہندوان' کہتا ہے۔ 'ادستا' میں 'بانگ' آیا ہے مگر اس کے معنی ہیں 'حصہ' یہی سنسکرت میں 'ہراگ' ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ ترک کے حصے کرنے میں جو 'بانگ' کا لفظ استعمال ہوتا تھا اسی سے 'بتان' کے معنی پیدا ہو گئے ہوں گے۔ میں اس کو صحیح نہیں جانتا، گو کہ یہ نہیں جاسکتا کہ 'باغ' کی اصل کیا ہے۔

۲۔ یعنی کتبوں میں یہ نام 'داری وہش' ہے درازی اور 'دشتوح'، 'مضموم'، 'ش ساکن'۔ اسی کا مخفف 'داریوش' ہوا اور مردم خفیف ہو کر دارا ہو گیا۔ اس کا نام پہلا تاج دار داریوش اعظم تھا ۵۲۲ء - ۴۸۵ء ق۔ م) داریوش دوم کی حکومت ۴۲۴ء سے ۴۰۴ء ق۔ م تک رہی۔ تیسرا دارا وہ تاج دار ہے جس نے سکندر سے شکست کھائی۔ ۳۳۵ء سے ۳۳۰ء ق۔ م تک اس کی حکومت رہی اور اسی پر ہخامنشی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

۳۔ اب اس کا نام خراسان ہے - ۷۴۷ء طبری، تاریخ، جلد ۱ ص ۱۰۲۳ -

۲۔ 'بنغ' کی صورت اوستا میں 'بنغ' اور 'بنگ'، یعنی کتبوں میں 'بنغ' ہے، اور معنی ہیں خدا، دیوتا۔ سنسکرت کے جھگوان یا جھگوت کا پہلا جز 'جھگ' اور یہ 'بنغ' ایک ہی لفظ ہے۔ ایران میں یہ لفظ زردشتی مذہب سے پہلے موجود تھا اور اُس زمانہ سے تعلق رکھتا جب وہاں بت پکڑتے تھے۔ یہی مسعودی نے بھی کہا ہے۔

پُرانی فارسی تقویم میں بعض مہینوں کے نام اُن سے مختلف ہیں جو اوستا میں آتے ہیں۔ چنانچہ 'مہر' کے لئے 'مینی' کتبوں میں 'باغ' یا 'باغ' یا 'دش' ہے (جس میں 'باغ' کا الٹ اصلی نہیں)۔ 'سغدی' زبان میں یہ 'مہینا'، 'نغان'، کہلاتا ہے اس میں شک نہیں کہ 'باغ' یا 'د' مرکب ہے 'بنغ' اور 'یا' سے۔ محض ترکیب کی جہت سے 'بنغ' کا تلفظ 'باغ' ہو گیا ہے۔ سولہویں مہر کو 'بنغ' کی پوجا ہوتی تھی اور ہندو دی جاتی تھی۔ ارنیا میں ایک گاؤں ہے جس کا نام 'بنگ' پرچ ہے اور جہاں ہر دیوتا کا مندر تھا۔ یہ نام بلاشبہ 'بنغ' یا 'دش' کی اوستائی ہے، اس لئے کہ 'مہر' اور 'بنغ' ایک ہی دیوتا کے دو نام ہیں۔

۳۔ 'داد' پرانا لفظ ہے۔ اس کا مادہ 'دا' ہے جو فارسی ہی میں نہیں، تقریباً سب آریائی زبانوں میں ملتا ہے۔ سنسکرت میں ہم اس کا مادہ 'دا' ہی ہے۔ یونانی لاطینی وغیرہ میں بھی اس کے مشتقات کثرت سے تھے اور ان زبانوں سے جو اور زبانیں نکلی ہیں اُن میں سے بہتوں میں ہیں۔ اس طرح پر ہماری اردو کا 'دینا' اور فارسی کا 'دادن' دونوں ایک ہی اصل سے ہیں۔ ایک زبان میں یہ مادہ 'دا' کی 'دوسری' میں 'دے' کی شکل میں دکھائی دے رہا ہے۔ فارسی میں اس سے 'داو' ہے، یعنی وہ چیز جو دی جائے یا بخشی جائے۔

۴۔ ایک دوسرا لفظ بھی 'داد' ہے جس کے معنی ہیں انسان اور حق۔ اس کا مادہ بھی پُرانی فارسی میں 'دا' ہے مگر سنسکرت 'دھا'۔ اوستا اور کتبوں کی زبان میں اس کے معنی ہیں: دھڑا، بنا، پیداکرنا، انصاف کرنا۔ 'دادار' (بنانے والا، خالق اسی سے ہے۔

۵۔ 'برہان' قاطع، وغیرہ نے جو 'باغ' اور 'دا' کو اصل قرار دیا ہے اُس میں اضافت ہے۔ اس لئے یہ بھی دیکھ لینا چاہئے کہ وہاں کے مختلف دوروں میں اضافت کی صورت کیا رہی ہے۔ پہلے مضاف پھر اُس کے اُس کے اخیر حروف پر کسرہ اور پھر مضاف الیہ۔ اس صورت کو قیام دور کی صورت نمونہ کی اصطلاح میں 'اضافہ مستوی' کہتے ہیں۔ یہی اضافت کا کسرہ تو صیغی ترکیب میں کسی استعمال ہونے لگا، مگر اُس سے بھولان بحث نہیں۔ جب مضاف اور مضاف الیہ میں گہرا میل ہو جاتا ہے اور کوئی مرکب بہت زیادہ استعمال ہونے لگتا ہے تو اُس میں سے اضافت کا کسرہ جاتا رہتا ہے جیسے 'صاحب دل' سے 'صاحب دل' اور 'برہان' کے دعوے کے مطابق 'باغ' اور 'داد' سے 'باغداد' یہ سب سب کچھ تیسرے ہی دور کی باتیں ہیں۔ دوسرے دور میں بھی یہ اضافت مستوی ملتی ہے، مگر پہلے دور میں اس کا مطلق پتہ نہیں۔

اس کے مقابلہ میں ایک دوسری صورت اضافت کی ہے کہ پہلے مضاف الیہ پھر مضاف اور دونوں کے بیچ میں کوئی تیسری چیز نہ اسے فارسی کے نحو یوں نے 'اضافہ مقلوب' کا نام دیا ہے۔ پہلے دور کی زبان میں اضافت کی یہی ایک صورت ہے، جیسے شاہان شاہ (جہاں)

۱۔ دیکھ مسعودی کا اقتباس جو اوپر (ص ۸۷) آچکا ہے۔

۲۔ ابیرونی، الآثار الباقیہ (لاہور ۱۹۱۷ء) ص ۲۲۲۔

۳۔ اس پر ایک فارسی لفظ یاد کیا۔ تین صورتیں ہیں: بنیاد، بنیاد، بنیادی (اور یہی تین صورتیں ٹ کے ساتھ) 'برہان' میں اس کے کوئی معنی د

ہیں: (۱) شاگردانہ۔ (۲) مثالی یا اُس کی قیمت جو نیا کپڑا پہننے کے وقت دی جاتی ہے، (۳) خوشی کی خبر اس لفظ کی پہلی صورت وہ

کی تصحیف ہے۔ تیسری میں ہی بڑھادی گئی ہے۔ دوسری اصل چیز ہے 'بنیاد' اس کی زاصل نہیں بعد کے زمانے کے تلفظ پر مبنی ہے۔

دہی 'بنیاد' یعنی بنیاد دار یہ لفظ اُسی 'بنغ' دیتا کی ایک بھولی ہوئی یاد ہے۔ ایک اور لفظ ہے 'بنغامہ' غول بیابانی کو کہتے ہیں

کیا عجیب کہ اس میں 'بنغ' چسپا بیٹھا ہو۔

’شاہنشاہ‘ اور ’پہر شاہنشاہ‘ ہو گیا) اسی طرح کی ترکیب ہے: ایران شہر (یعنی شہر ایران) ایران زمین وغیرہ۔  
 ’مستوی‘ اور ’مقلوب‘ کی اصطلاحوں کو دیکھ کے لوگ اکثر سمجھتے ہیں کہ وہ پڑتی یہ فنی چیز ہے مگر اصل یوں ہے کہ جسے مقلوب کہتے ہیں وہی پڑتی صورت ہے اور ’مستوی‘ نئی صورت۔ غرض کہ ’بارغ داد‘ کی ترکیب پرانی (یعنی پہلے دور کی) فارسی میں ممکن نہیں۔  
 کچھ جگہوں کے نام، جو بلاشبہ پہلے ایرانی دور یا اُس سے پہلے کے ہیں، اور عرض کے ’جا بے‘ ہیں۔ اب اشخاص کے وہ نام بھی گنائے جاتے ہیں جن کا جز ’بغ‘ ہے۔ وہ لوگ جن کے یہ نام ہیں اسلام ہی سے نہیں، ساسانیوں کے زمانہ سے بھی صدیوں پہلے گزرے ہیں۔ ایران کی تاریخ میں کوئی ساٹھ ستر آدمیوں کا ذکر آتا ہے جن کے ناموں کا پہلا جز طبع ہے۔ ان میں سے تھوٹے سے پہلے لکھے جاتے ہیں:-

۱۔ بگ دات رامنہ تلفظ بگ دت (با بگ دت) ارمینیا کے ایک علاقہ کا بادشاہ جس نے ۶۷۱ ق۔ م میں اشور کے بادشاہ سارگون سے شکست کھائی (اوستا میں ’بنو دات‘ یعنی خدا کا دیا ہوا خدا داد)

۲۔ بگ باز (اوستا کا ’باز‘ تیسرے دور کی زبان میں ’بازد‘ ہو گیا)۔ یہ وار یوش اول کا فیلڈ مارشل تھا۔ (بگ باز = دیوتا کے بازوؤں والا، دیوتا کی سی قوت والا)

۳۔ بگ پات اُسی بگ باز کا اب۔ ’پات‘ پڑتی زبان میں ’معاظت‘ کرنے والا۔ بگ پات = وہ جس کا محافظ خدا ہو۔  
 ۴۔ بگ بخش وار یوش اول کے ایک درباری کا اور در بہت سے آدمیوں کا نام تھا۔ (اس نام کے معنی ہوسے، وہ جسے خدا نے معاف کر دیا یا جس کے قصوروں سے درگزر کیا، فارسی میں دو لفظ ہیں جدا جدا۔ ایک بخشودن، جس سے امر بخش، فاعل مصدر بخشایش، اسم فاعل بخشایندہ، مضارع بخشیدہ ہے۔ دوسرا بخشیدن، جس سے امر بخش، حاصل مصدر بخشیدن، اسم فاعل بخشیدہ، مضارع بخشیدہ ہے۔ بخشیدن کے معنی ہیں دینا، عطا کرنا، اور بخشودن کے معنی معاف کرنا۔ اس نام میں جو بخش، ہے وہ اسی بخشودن سے متعلق ہے۔ بخشیدن سے نہیں۔ دوسرے دور کی زبان میں ’آہستایش‘ تھا جو تیسرے دور میں ’بخشایش‘ ہوا۔ چنانچہ ’بگ بخش‘ میں بھی دوسری کا پیش ہے۔ ’بخشیدن‘ کی جگہ دوسرے دور کی زبان میں ’بخش‘ تھا۔  
 ۵۔ بگ دوست (د دوست، پڑتا لفظ ہے۔ یعنی کتبوں میں یہ لفظ ’دوشت‘ ہے اور دوسرے اور تیسرے دور میں ’دوست‘۔ دوستار بھی اسی کی ایک صورت ہے جس میں پڑتی ’ر‘ باقی ہے۔ لوگوں نے غلطی سے ’دوستار‘ کو دوست دار سمجھا اور یونہی لکھنے پونے لگے)

۶۔ بگ فرنا (پڑتی فارسی میں ’فرنا‘، چمک دمک یا نور کو کہتے تھے۔ آج کل کے یہی لفظ ’فر‘، ہو گیا۔ بگ فرنا کو سوا نور اللہ کے اور کہا جئے؟)

۷۔ بگ کرت پارس کے دو پڑنے والوں کے نام۔ (د کرت کے معنی کیا ہوا، بنا یا ہوا)۔  
 ظاہر ہے کہ ’بارغ‘ (بستان) ان ناموں کا جز نہیں ہو سکتا۔ ان میں جو ’بغ‘ یا ’بگ‘ آیا ہے اُس کا ترجمہ سوا ’دیکھ خدا‘، ’معبود‘، ’پرستش‘ کے کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ یہی کتبوں اور اوستا میں یہ لفظ جہاں کہیں آیا ہے انہیں معنوں میں ہے۔ درمیانی زمانے میں مانی اور اُس کے ماننے والوں کی کتابوں میں بھی اس لفظ کے یہی معنی ہیں۔

۸۔ بیزک (ترکستان) میں ایک چاندی کا سک یا گیا جس پر ایک ایرانی شہر (ان صوبہ داران کی جہاں ہے اور آرمی فول میں) کو دتو لکھا ہوا ہے۔ یہ یا تو اُس صوبہ دار کا نام ہے یا کوئی دعا تیر جلد۔ یہ چینی ترکستان میں ایک گاؤں ہے۔ ترخان تورخان جہاں ۱۸۵۷ء میں ریت میں دبا ہوا ایک ہڈی کتب خانہ نکلا۔ کتاب سلامت تو ایک نہ تھی، ہاں پر اکڑہ در قول کا ایک دھیر زمین سے نکالا گیا، مگر جو نکلا مانی کے مذہب سے متعلق ہے اور اب ایران کے سرکاری عجائب گھر میں وہ سارا ذخیرہ جمع ہے۔ کچھ چیزیں شایع ہوئی ہیں، زیادہ ابھی دیے ہی رکھی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ 'ہندو' اسلام ہی سے نہیں، ساسانی حکومت سے بھی صدیوں پہلے کا نام ہے اور معنی اُس کے ہیں 'دیوتا کی دیں' یا 'خدا کی بساتی کبستی'۔

اسی سلسلے میں دور اور لفظ بھی توجہ چاہتے ہیں: 'مغفور' اور 'ہستون'۔

مغفور۔ چین کے بادشاہ کے لئے 'مغفور' خاص لقب ہے۔ ہیروڈوٹس نے اپنی کتاب 'الٹارالباقیتہ عن القرون الخالیتہ' میں اسے ملجور، لکھا ہے جو اس لفظ کی عربی (یا عربائی ہوئی) صورت ہے۔ 'مغفور' سند کی بولی ہے۔ اسے مغرب نہ سمجھا جائے۔ سندھی میں من فادسی کی ب اور پ کی تائیم مقام ہے اور فارسی میں یہ لفظ 'مغفور' ہے۔ 'بنغ' کے جو معنی اوپر لکھے جا چکے ہیں اُن کے لحاظ سے 'مغفور' کے معنی ہوئے:۔  
'خدا کا پٹا'، یہ استعارہ اور اصطلاح ہے، جیسے 'ظل اللہ'۔ ہاں، ایک بات ضرور ہے۔ چین کے بادشاہ کا یہ لقب کیسا کہ نہ 'بنغ' چینی لفظ دہندہ ہے؟ البتہ یہ ہر ممکن ہے کہ چینی زبان کا کوئی لفظ ہو، اس کا فارسی ترجمہ 'مغفور' ہو اور یہ صحیح ہے۔

جیسا کہ فرانسسی فاضل سیل دیویری نے چینی ماخذوں کی مدد سے ثابت کیا ہے، ہندوستان کے جس کیشن راجا نے 'دیو پتر' کا لقب اختیار کیا تھا اُس نے چین کے بادشاہ کے خطاب کی نقل اتاری تھی۔ چینی شہنشاہ کا لقب چینی زبان میں ملن تسوئے تھا، اُسی کا فارسی ترجمہ 'مغفور' یعنی 'مکمل' ہوا۔ ایران کے اشکانیوں کے پرکھوں نے اپنے مشرقی وطن میں اسی چینی لقب کی تقلید میں 'مغفور' کا لقب اختیار کیا اور پھر یہ لفظ مغرب کے ملکوں میں بھی پھیل گیا۔

ہستون۔ شہر فرباد کی داستان جس نے سنی ہے، کو دہستون کو جانتا ہے۔ عوام میں یہ بھی مشہور ہے کہ کسی بادشاہ نے اُس جگہ ایک ایسا محل بنوایا تھا جس میں کھم ایک بھی نہ تھا، ساری چھتیں گویا ہوا میں ٹلک رہی تھیں، اسی سے 'ہستون' نام پڑا۔ سچ ہے کہ اصح نام سے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ وہاں کوئی بے ستونوں عمارت ہوگی۔ حوالہ مستوفی نے جو حال اس پہاڑ کا لکھا ہے اُس میں ہے:-

کوہ ہستون از جبال مشہور است ..... داز سنگ سیاہ بر روست ہامون پہاڑ شدہ است بے آنکہ درد منش

وہ پائنتہ باشد ... کہ کتاب خسرو فیروز شاہ نظامی گوید اور وہ کہ خسرو ہر دیز فرباد را گفت

کہ در ہست کوہے بر گزر گاہ کہ مشکل می توان کردن بر آن راہ

۔ مہمان کوہ را بے کندہ باید چنان کہ دشمن را بشتاید

روایت نموده است و شیخ نظامی اُن جارا مشاہدہ نہ کردہ بہ تسامع سخن گفتہ است و حقیقتش آنکہ دریائے قندیس کوہ

بر روستے صحرا چشمہ بزرگ است ... بر سر آن چشمہ صفا بارگاہ ساختہ اند ... در آخر این کوہ ... صفحہ دیگر کہ چک ساختہ

۱۔ زخاؤ کی اشاعت، جل ۱۰۱۔ عربی کے اور مصنفوں نے بھی چوں لکھا ہے۔

۲۔ صفحہ میں فرقانہ شامل ہے۔

۳۔ کون نہیں جانتا کہ پور اور ایسز فارسی میں بیٹے کو کہتے ہیں۔ ایک ہی لفظ کی دو صورتیں ہیں۔ پہلے دور کی زبان میں بیٹے کو 'پ' تھ کہتے تھے (سنسکرت میں 'پ' ت ر) جو حرف پُرانی فارسی میں ت اور سنسکرت میں ت تھا وہ دوسرے دور کی زبان میں س ہو گیا۔ چنانچہ پہلوی میں 'ایسز' اور اُس کا مخفف 'ایس' ہے۔ فارسی لغت میں 'ایسز' اور 'ایسز' دونوں ہیں، بلکہ پانچویں بھی یہ لفظ دونوں طرح ملتا ہے، گھر 'ایسز' کا زیر اصلی نہیں، پ' ت کے اثر سے پیدا ہو گیا ہے۔ پ' کا اثر بیٹے پہ پڑنا کچھ ان ہونی بات تو نہیں۔ پُرانی ت پہلوی میں آکر بھی ہو گئی ہے چنانچہ 'پ' ت ر کی ایک صورت پہلوی میں 'پ' ہ رہی ہے۔ یہ ہ فارسی میں د ہو جاتی ہے۔ اس طرح 'پور' ہوا۔ اب وہ 'ایسز' (پور شاہ) میں بھی کئی جگہ آتا ہے) سو یہ 'ایسز' کا مخفف ہے۔ ہمارے دیس کی زبان میں اس کے مقابلہ میں 'پ' ت ر کا مخفف 'پوت' ہے

اند... در آخراں کوہ... صفہ دیگر کو چک ساخته اند بر سر د چشمہ... و آن صفہ صفہ شد نیز می خوانند۔ صورت  
خسرو و شیرین و فریاد و رستم و اسفندیار بر آن بنا ساخته است۔  
یہی مصنف آگے چل کے ایک اور پہاڑ کے بیان میں کہتا ہے:-  
”کوہ داسمند... نیز چوں میستور پیدا شدہ است ہے آن کہ در پایانش درہ دہشتہ باشد، سنگے سیاہ است و برشمال خانہ  
ہستق صحاب در آورده“

اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ محل کو نہیں پہاڑ کو بے ستون کہا ہے، لیکن زبان کی تاریخ اسے بھی ماننے نہیں دیتی۔ فارسی بے  
کی یونانی صورت ’اے‘ ہے، دوسرے دور کی زبان میں ’اوس‘ اور ’اے‘ تھی۔ پہلے دور کی زبان میں یہ حرف نفعی نہیں ملتا۔ اگر اس نام  
میں تھا بھی تو ’اے‘ ہو سکتا ہے۔ اور حال یہ ہے کہ اس مقام کا یہ نام کہانیوں کے وقت میں بھی نہ الف رکھتا تھا، نہ ب کی جگہ پ یا و  
اس لئے اس نام کا ’اے‘ اور ’ستون‘ سے ترکیب پانا ممکن نہیں۔

ایک اور بات بھی توجہ چاہنی ہے۔ اس کا نام ’الاکئی‘ طرح پر کیا جاتا ہے۔ مستوفی تزویجی نے ”ہستون“ کے علاوہ ’ہستون‘ اور  
’ہستان‘ بھی لکھا ہے۔ عربی مصنف عموماً ’ہستون‘ لکھتے ہیں اور یا قوت نے اسے بول ضبط کیا ہے، بہستون یا فتح ثم الکسرہ ظاہر ہوا  
تلفظ عربوں نے اربانیوں سے سنا اور جن کا توں نقل کیا مگر بعد کو خود ایران میں بدل کر سی ہو گئی اور وہ اس طرح پر کوہ اگر گئی اور اسے  
گر جانے سے کسرہ لٹچ کر سی ہو گیا۔ اس کی ایک اور مثال ’سیستان‘ ہے کہ اصل میں ’سگستان‘ تھا، گ گرا اور اس کا کسرہ لٹچ کر سی ہو گیا  
جب عرب وہاں پہنچے تو انھوں نے ’سگستان‘ سنا، گ کوچ سے بدل کر ’سجستان‘ بولنے لگے۔ پہلے دور کی زبان میں یہ نام ’سگستان‘ تھا  
ایک قوم تھی ’ساک‘۔ وہ وہاں بستی تھی۔ ’سگزی‘ (پہلوی سگیگ) اسی خطے کی طرف نسبت ہے، عربی میں ’سجستانی‘ ہے۔

ابھی یہ بات باقی ہے کہ بہستون اور بہستان کے و اور الف میں کیا تعلق ہے۔ یہ و اس نام کے جو فارسی میں عام ہے، جیسے ’نما‘  
الف ’نمود‘، ’نمود‘ وغیرہ میں ہو گیا یا ’پیمانہ‘ کی شکل ’پیمانہ‘ بھی ہے۔

’بہستان‘ پہلے دور کی زبان میں ’بغستان‘ تھا، چنانچہ پہلی صدی ق۔ م کی یونانی تصنیفوں میں یہ نام اس طرح لکھا ہوا ملتا ہے  
بگ س ت ن و ن (جس کے آخر میں و ن ایک یونانی لاحقہ ہے)

اس بغستان کی چٹان پر داریوش اعظم کے کارنامے مبنی خط میں کندہ ہیں اور یہی مبنی کتبہ سب میں بڑا ہے۔ جو کھوڑے کی مورت دہلی کو  
ہے وہ خسرو کا نہیں، داریوش اعظم کا شہدیز ہے۔ جو تصویریں خسرو پر دیز وغیرہ کی سمجھی جاتی ہیں وہ بھی داریوش اور اس کے درباریوں  
اور مفتوح بادشاہوں اور سپہ سالاروں کی ہیں، جو سر کر کے اس کے سامنے لائے گئے ہیں۔ اسی پہاڑ پر بنج دیوتا کا مندر تھا جس کے نام

۱۔ اسے ’خنت شہدیز‘ بھی کہتے ہیں۔

۲۔ نزمہ القلوب، ص ۱۹۱ - ۱۹۳۔

شیخ نظامی نے پہاڑ دیکھا نہ تھا سنی سانی ایک ات کہدی۔ شیخ مستوفی نے اسے مرث دیکھا ہی نہیں اس کی اونچان تک ناپی پھر بھی سنی سنا  
کچے بنیز سے کہ تصویریں جو وہاں بنی ہیں خسرو اور شیریں اور فریاد کی ہیں۔ اس میں اور مصنفوں نے بھی دھوکا کھایا ہے۔ اصل بول ہے  
یہ تصویریں خسرو پر دیز سے صدیوں پہلے داریوش اعظم کے زمانہ میں بنی تھیں۔

۳۔ نزمہ القلوب ص ۱۹۵۔ یہاں ’ہستون‘ ہے مگر اس سے پہلے جو کھڑا نقل ہوا ہے اس میں ’ہستون‘ بغیر و کے اور ص، ہ پہاڑ بہستان‘ آیا ہے

۴۔ ’معجم البلدان‘، ۱۸، ص ۶۹۔

۵۔ اور ’سگزی‘ کا عربی ’سجری‘ ہے۔

بھی لکھ باقی ہیں اور یہ درستی مذہب سے پہلے کی یادگار ہے

’بلغ‘ کا رخ بعد میں وہ بدل گیا اور اس طرح ’بغستان‘ سے ’بہستان‘ ہوا جس کا انا بہستون ہے۔

اب ان تینوں لفظوں کے بارے میں چوتھی صدی ہجری کے ایک محقق خوارزمی کی تحقیق پیش کی جاتی ہے جو اپنی مختصر مگر نہایت گراں قدر

تفسیر ’مفاتیح العلوم‘ میں لکھتا ہے:-

بغستان بقول کا استعان ہے اور بلغ بت ہے۔ اسی سے بغداد نام پڑا یعنی بت کا عطیہ، جیسا کہ اسمعی کا قول زایت کیا گیا ہے، اور اسی لئے بادشاہ کو بلغ کہتے ہیں اور سردار اور پیشوا کو بھی اسی سے چین کے بادشاہ کا لقب بلغ بور پڑا، یعنی بادشاہ کا بیٹا۔

ابن درستیہ ’تصنیع الفصیح‘ میں کہتا ہے کہ ’اسمعی نے جو کچھ بغداد کے اشتقاق کے بارے میں بیان کیا ہے اُس میں غلطی کی ہے، کیونکہ ایرانیوں کے جو بننے والے دتھے اصل یوں ہے کہ وہ بلغ داو ہے اور بلغ بغستان ہے اور داد ایک آدمی کا نام۔ یہ ابن درستیہ کا جھوٹا اختراع اور اُس کی بہت بھڑکی غلطی ہے، اس لئے کو بلغ کے معنی تو ایرانیوں کے ہاں خدا کے ہیں اور بادشاہ کے اور وہ بتوں کو بڑھاتے اور برکت دینے والا مانتے تھے اور بت کو بلغ کہتے تھے اور بتوں کے استعان کو بغستان۔ میرزا یحیٰی کی ’تسمیہ‘ ایرانی اُن کی پوجا کرتے اور بادشاہوں اور پیشواؤں کی تصویروں کی طرح پر اُن کی تصویریں بنایا کرتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بغداد (سے مراد) جو ’بادشاہ کا دیا ہوا‘۔

بغستان بیت الاصنام و بلغ ہوا لسنم و بزرگ سمیت بغداد، اسی عطیۃ الصنم علی ما حکى عن الاصمعي و بزرگ یسمون الملک بلغ و حکذا الامام والسید و ہ سمی ملک الصبین بلغ بور اسی ابن الملک۔

وقال ابن درستیہ فی کتابہ تصنیع الفصیح اخطاء الاداء الاصمعی فی ما ذکر من اشتقاق بغداد اذ لم تکن الفرس عبدة الاصنام انما ہو بلغ داد و بلغ و البستان و داد ہو اسم رجل و ہذا من ابن درستیہ اختراع کاذب و خطأ فاحش فان بلغ عند الفرس ہو الاله والسید و الملک کانوا یظنون الاصنام و یتبرکون بہا و یسمون الصنم بلغ و بیت الاصنام بغستان و لغری ان الفرس کانوا یعبدونہا ویصورونہا علی صورت الملوک و الاله و لعل بغداد ہی عطیۃ الملک۔

۱ ابو عبد اللہ محمد بن احمد یوسف نھا، زمی جس نے ۳۶۲ھ اور ۳۶۳ھ کے درمیان کسی وقت ’مفاتیح العلوم‘ لکھی۔

۲ ابو عبد اللہ ابن بہر بن درستیہ ۳۵۵ھ میں پیدا ہوا اور ۳۴۲ھ میں مرا۔ (مسعودی اُس سے دو برس پہلے مرا تھا اس لئے دونوں مہر تھے) ابن درستیہ لغت کے غویں اور مرہ کے شاگردوں میں سے تھا۔ بہت سی کتابوں کا مصنف تھا مگر دو تین سے زیادہ اب نہیں ملتیں۔ جہانگیر معلوم ہے ’تصنیع الفصیح‘ کا بھی کوئی نسخہ کسی معروف کتب خانہ میں نہیں ہے۔

۳ کاتب القلم (ابو العباس احمد ابن سبکی متوفی ۷۹۱ھ) کی ’معركة الآذکتاب‘ ’الفصیح‘ کی شرح تھی۔ آٹھویں صدی ہجری تک ’الفصیح‘ کی کم سے کم میں شریحیں، رد و زلی، اپنے مظلوم شریحین یا خلاصے لکھے گئے کتاب زیادہ سے زیادہ یکساں نسخے کی ہے مگر مصنف نے بیس برس کی محنت اس پر صرف کی تھی۔ جرانی منشورق بارٹ نے ۱۸۹۸ء میں اسے شائع کیا۔ بغداد کا ذکر اس میں (ص ۳۱) صرف آتا ہے:-

یقال صی بغداد و بغداد و ذکر و توث (کہتے ہیں کہ اس کی دو صورتیں ہیں:- بغداد اور بغداد اور یہ لفظ نہ کہیں بولا جاتا ہے اور سونٹ بھی)

۴ ’مفاتیح العلوم‘ (دولت علی مستشرقین خانہ فلولن کی اشاعت، لاہور ۱۸۹۹ء) ص ۱۱۵ - ۱۱۶۔

ابن درستیو نے غالباً حمزہ اصفہانی کے قول پر سروسا کر کے اُصمعی کے قول کو غلط ٹھہرایا، اور سخت دھوکے میں پڑا۔ مسعودی نے دونوں روایتیں لکھ دی ہیں اور ابن ابی طاهر اور اور صفحوں کے قول کی بنا پر کہا ہے کہ زیادہ مشہور یہی ہے کہ بغداد کا پہلا جز باغ 'دہستان' کہتے تھے۔ " اور مصنفوں میں حمزہ اصفہانی اور ابن درستیو، جو مسعودی کے معاصر تھے، ضرور شامل ہوں گے۔

خوارزمی کا محکمہ جنچا تھا ہے اور اُس کے بعد کوئی شبہ اُصمعی کے قول کے صحیح ہونے میں نہیں رہتا۔ البتہ اسنا عرض کرنا ضروری ہے کہ 'بغیور' چین کے شہزادوں کا لقب سرگز نہ تھا، بلکہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے چین کے بادشاہ کو کہتے تھے اور اسے ویسا ہی استعارہ سمجھنا چاہئے جیسا 'طل' اللہ میں ہے۔ بادشاہ کے 'ربانی' حقوق، کو یورپ ہی نہیں، کچھ کم کی قومیں بھی آج سے چند ہی صدی پہلے تک مانتی رہی تھیں۔ خوارزمی کا خیال ادھر نہیں گیا، نہیں تو یہ فقرہ شاید 'مطایع العلوم' میں بگڑ نہ پاتا۔

"ولعل بغداد ہی عطیۃ الملک"

(اور شاید بغداد سے مراد ہو: بادشاہ کا عطیہ)

(اردو)

لہ دیکھو اوپر ص ۲۹۱، اور حاشیہ — لہ

## رعایتی سلمان

من ویزواں — مذہبی استفسارات و جوابات — نگارستان — جمالستان — شہوانیات  
مکتوبات نیازتین حصے — استقادیات — ماہ و ماہ علیہ حسن کی حیا ریاں — شہاب کی سرگزشت  
فلاسفہ قدیم — مجموعہ استفسار و جواب جلد سوم فرست الید نقاب ٹھ جانے کے بعد۔

میزان  
للغرضہ

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف بیالیس روپے میں مل سکتی ہیں

نیچر نگار لکھنؤ

# غالب ایک صاحب طرز شاعر کی حیثیت سے

(ادوٹر)

دنیا کی کسی زبان میں شاعروں کی کمی نہیں، لیکن اگر آپ ان میں صرف صاحب طرز شعراء کو سامنے رکھیں تو یہ فہرست بہت مختصر ہو جائے گی۔ یہی حال ہماری زبان کے شاعروں کا ہے کہ اس میں یوں تو اساتذہ بہت ہیں، لیکن صاحب طرز شعراء انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اور انھیں میں سے ایک غالب بھی ہیں۔

غالب کے بارہ میں اس وقت تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب تک اردو شاعری کا چرچا دنیا میں موجود ہے یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ لوگ نئے نئے زاویوں سے غالب کے کلام کا مطالعہ کریں گے، اس کی فنی و معنوی خصوصیات پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالیں گے، اس کے آرٹ کی خوبیوں پر ناقدانہ گفتگو کریں گے اور یہ سب کچھ بڑے شوق سے پڑھا جائے گا۔ لیکن ایسا کیوں ہوگا؟ اس سوال کا صحیح جواب دینا دراصل ایک نفسیاتی مطالعہ ہے جو غالب سے زیادہ زمانہ کے حالات و رجحانات اور خود غالب کی ترقی پسند ذہنیت سے تعلق رکھتا ہے۔

جب تک غالب زندہ رہا، لوگ اسے بہت متوجش نگاہوں سے دیکھتے رہے یہاں تک کہ بعض نے اس کے کلام کو بھل دیے معنی قرار دینے میں بھی تامل نہ کیا۔ لیکن جب زمانہ بدلا، حالات بدلے اور حالات کے ساتھ لوگوں کی ذہنیت بدلی تو غالب اور اس کا کلام دوبارہ پیدا ہوا، اور جس چیز کو بھی پہلے جنس کا سمجھا کر رد کر دیا گیا تھا، اب اسی کو "منابع از دست رفتہ" سمجھ کر سینہ سے لگایا جانے لگا، جسے کلاچ اس سے زیادہ محبوب و مقبول شاعر اردو کا کوئی نہیں۔

بات یہ ہے کہ ہر زمانہ میں بعض ہستیاں قبل از وقت پیدا ہو جاتی ہیں جو دراصل مستقبل کی پیش گوئیاں ہوا کرتی ہیں اور جب مستقبل میں وہ وقت آتا ہے کہ انھیں پیدا ہونا چاہیے تھا تو لوگ دفعتاً چونک پڑتے ہیں اور ان میں وہ خاص عظمت و تقدس محسوس کرنے لگتے ہیں غالب بھی اپنے زمانہ کے ذوق کے لحاظ سے مستقبل کا شاعر تھا اور وہ اپنے اندر اتنے مستقبل چھپائے ہوئے تھا کہ جب کوئی مستقبل ماضی میں بدل جاتا تو پھر وہ دوسرے نئے مستقبل میں جلوہ گر ہو جاتا تھا، یہی سبب ہے کہ پچھلی ایک صدی میں شاعری اور خصوصیت کے ساتھ غزل گوئی میں جب جب ذہنی انقلاب پیدا ہوا، غالب بھی استہوار رہا، یہاں تک کہ موجودہ دور ترقی پسندی میں بعض نقاد اسی کو سب سے پہلا ترقی پسند شاعر کہتے ہیں۔

اس میں شک نہیں غالب کی شاعری ماضی کی داستان نہ تھی بلکہ مستقبل کا نفسیاتی رجحان تھی جو اول اول نا افسوس سے چیز معلوم ہوتی تھی، لیکن بعد کو وہی زمانہ کی انتہائی تمنا قرار پائی۔ غالب کے فطرتاً بڑا خود آگاہ (Self Conscious) شاعر تھا اس لئے وہ خود بھی ان پر لیڈر حقیقتوں اور اپنے اندر چھپے ہوئے امکانات سے واقف تھا اور اسی لئے وہ ایک بار اپنے عہد کی بے حسی کو دیکھ کر بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ اے۔

شہرت شرم و گشتی بھد من خواہد شدن

غالب کے عہد تک اردو غزل پر ایک ہی روش پر مبنی تھی۔ وہی بندے کے محاورے، وہی سیدھا سادہ مادہ زمرہ، وہی مقررہ تشبیہات و استعارات اور وہی ہمہ وصال کے کیساں جذبات حسن و عشق۔ گویا غزل نام تعارف سنی سنائی باتوں کا ایک بیک بیک ایوٹی

دھرتے رہنے کا اور لوگ عام طور پر اس سے داستان ہی کا سا لطف اٹھاتے تھے، لیکن غالب چونکہ فطرتاً ہی شہنشاہ، چنبیل، ندرت پسند واقع ہوا تھا، اس لئے یہ داستانیں اسے پسند نہ آئی اور وہ محافل شعریہ میں بالکل ایک نئے آہنگ کے ساتھ داخل ہوا جس کا مقصد ممکن ہے دوسروں کو چمکانا بھی ہو، لیکن اس کا مدعا زیادہ تر خود اپنے ذوق کی تسکین تھی۔

غالب کی یہ آہنگ یقیناً اس کی فطرت کا تقاضہ تھا، لیکن وہ پورا ہوا، اس کی ابتدائی تعلیم اور کلام بیدل کے مطالعہ سے، اس نے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ غالب کے طرز شاعری کی ابتدا ”رنگ بہار ایما دی بیدل“ سے ہوئی۔ لیکن چونکہ بیدل زبان نہیں بلکہ فننیل کا شاعر تھا وہ زبان کا پابند نہ تھا بلکہ اس کی زبان خود فننیل سے پیدا ہوتی تھی جو محدود رجحان بندہ و دقیق تھی، اس لئے اردو اس کی متحمل نہ ہو سکی اور آخر کار غالب کو یہ بیدلانہ رنگ جس سے اس کی اردو شاعری کی ابتدا ہوتی تھی ترک کرنا پڑا۔

ظاہر ہے کہ یہ رنگ ترک کرنے کے بعد وہ تیسرے، سودا اور حسن کے رنگ کی طرف نہ لوٹ سکتا تھا، کیونکہ یہ اس کے ذوق اور اس کی فطری دلچسپی کے خلاف تھا اس لئے اس نے خود اپنے فارسی ذوق اور دوسرے ایرانی شعراء کے کلام کو سامنے رکھ کر صرف ان فارسی ترکیب کا استعمال شروع کیا جن کی اردو متحمل ہو سکتی تھی اور اس طرح معنی آفرینی، ندرت بیان، بہت اظہار، طرکی اسلوب سے اردو غزل کو مالا مال کر دیا اور غزل کوئی کا بالکل نیا طرز پیدا کیا۔

اردو میں صاحب طرز شعراء اور بھی ہوئے ہیں، جن میں تیسرے، سودا اور حسن خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، لیکن فن اور جذبات کے لحاظ سے ان سب کا ایک خاص رنگ تھا اور اسی رنگ سے وہ الگ الگ پہچانے جاسکتے تھے، لیکن غالب کی فضا شعر بڑی وسیع و متنوع تھی۔ تیسرے کی فضا یکسر یاس و حسرت کی سو کو ارا نہ فضا تھی جس میں تیسرے کے سراپے بیٹھ کر نور سے باتیں کرنا بھی آداب کے خلاف تھا، لیکن غالب نے حسرت و یاس کے بیان میں بھی امیدوں کے نمودار نہ مطالعہ کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور انتہائی غم کی حالت میں بھی وہ طلب نشاط کی فکر سے غافل نہیں رہا۔ تیسرے کی شاعری موت کی آسودگی تھی اور غالب کی شاعری زندگی کی تڑپ۔

تیسرے کا قلم انداز کے عوامی شاعر تھے اور اس میں شک نہیں کہ اس خصوص میں ان کا کوئی ہمسرہ نظر نہیں آتا، غالب اس کے بالکل برعکس خواص کے شاعر تھے، ایک ایسے ارسا کرٹیک ( ) شاعر جو اپنی خود داری، اپنے رکھ رکھا اور اپنی عاشقانہ اہمیت کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ تاریخ کی شاعری کا حسن کیسے غارہ و مشاطگی کی شاعری تھی جس سے غالب کو دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ مومن کی شاعری، گوشت و پوست کی جنسی شاعری تھی جس میں فلسفیانہ فکر اور مصوفانہ آفاقیت کی کوئی گنجائش نہ تھی لیکن غالب کے حسن و عشق میں اور اے حسن و عشق بھی شامل تھا اور اس کی شاعری دراصل نہایت وسیع کائناتی شاعری تھی جو دل و دماغ دونوں کے انتہائی متعلقہ احساس سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ روایتی نہیں بلکہ دریافتی شاعر تھا، وہ مقلد نہیں مجتہد تھا اور ایک ایسے نئے طرز شاعری کا خلاق تھا جس سے دنیا بالکل ناواقف تھی۔

چونکہ ماضی کی روایات سے ہٹ کر کوئی نئی بات ایسی کہنا جو ذہن انسانی کو دفعتاً چونکا دے آسان نہیں، اس لئے غالب نے اس مقصد کے حصول کے لئے نئی زبان پیدا کی، نہالب و لہجہ اختراع کیا، نیا انداز بیان ایجاد کیا اور کچھ کہا اس قدر اعتماد کے ساتھ کہ ایسی بلند آہنگی سے کہا گویا وہ ایک کرکٹ تھا جس کے نیچے پر، ایک تیز و روشن شہاب ثاقب تھا جس کے دیکھنے پر دنیا مجبور ہو گئی۔ غالب کو روش عام بالکل پسند نہ تھی، وہ اپنی راہ سب سے الگ بنانا پسند کرتا تھا، لیکر کا فقیر بننا اس کی فطرت کے منافی تھا، کہہ ہوئی بات کہنے سے اسے سخت نفرت تھی، وہ ہمیشہ کوئی نئی بات نئے اسلوب سے کہنا چاہتا تھا، اس کے لئے وہ سننے والے بیان تلاش کرتا تھا، فارسی کی نئی نئی ترکیبوں سے کام لیتا تھا جن کے استعمال کا ذوق اسے بیدل کے کلام کے مطالعہ سے پیدا ہوا تھا، چنا آپ دیکھیں گے کہ: ”یک بیاباں ماندگی“۔ جنوں جولاں گدا۔ عرض گرانجانی۔ پریشانی شمع۔ وغیرہ کی متعدد ترکیبیں بالکل کی ترکیبیں ہیں۔ پھر اگر غالب کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو وہ اس خار زار سے شاید کبھی نہ نکلتا، لیکن چونکہ وہ بڑے صحیح ذوق اور طبع

لاگ تھا، اس نے خود اس نے اردو میں اس رنگ کی ناپہچانی کو محسوس کیا اور فارسی کی صرف ان ترکیبوں سے کام لینا شروع کیا جنہیں اردو کا مزاج قبول کر سکتا تھا اور یہ تھا غالب کی شاعری کا دوسرا دور پہلا دور اختراع محض اور جوشِ ندرت پسندی کا دھند تھا جس میں صرف فارسی ترکیبوں کا استعمال ہی پیش نظر رہتا تھا اور مضمون و معنی کی معقولیت نظر انداز کر دی جاتی تھی مثلاً :-

رکھا غفلت نے دور افتادہ ذوقِ فتا ور نہ

اشارتِ فہم کو ہر ناخنِ بریدہ ابرو سہتا

لیکن دوسرا دور بہت سنبھلا ہوا دور تھا جس میں فارسی تراکیب کے ساتھ تغزل کی چاشنی بھی پائی جاتی تھی اور باوجود اشکالِ پسندی و دقتِ آفرینی کے داخلی کیفیت بھی اس میں محسوس ہوتی تھی مثلاً :-

جنوں تہمت کش تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی

نک پاشِ خراشِ دل ہے لذتِ زندگانی کی

کشا کشا ہے ہستی سے کرے کیا سہی آزادی

ہوئی زنجیر، موجِ آب کو فرصتِ روانی کی

اس کے بعد غالب کی شاعری کا تیسرا اور شروع ہوا جب فارسی کی لطیف ترکیبوں کے ساتھ، زبان کی شیرینی و حلالت اور شگفتہ معنی آفرینی کے ساتھ، اندازِ بیان کی سلاست و روانی بھی شامل ہو گئی مثلاً :-

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا

نہ ہو مریا تو بیچنے کا مزا کیا

در ماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں

جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخنِ گرہ کشا تھا

اور اس دور کا ارتقاء آخر کار اس حد تک پہنچ گیا کہ غالب کی شاعری کیسر ”سحر طالع“ ہو کر رہ گئی اور اس قسم کے سہل ممتنع اشعار ان کے قلم سے نکلنے لگے :-

ہم بھی نسیم کی خو ڈالیں گے

بے نیازِ تری عادت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلک نا انصاف

آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

غالب کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ پائل مضامین کو کبھی ہاتھ نہیں لگاتے، عامیانه تشبیہات و استعارات سے ہمیشہ اجتناب کرتے ہیں اور اگر کوئی مضمون پڑنا ہو تو اس کو بھی اپنے اندازِ بیان کی ندرت سے نہا بنا دیتے ہیں۔ مثلاً ذوقِ جنت کے تصور پر نہایت عامیانه انداز میں اس طرح تنقید کرتا ہے کہ :-

کب حق پرست زادِ جنت پرست ہے حوروں پر مر رہا ہے شہوت پرست ہے

لیکن غالب کی ندرت کو ملاحظہ فرمائیے، کہتے ہیں :-

طاعت میں تار ہے نہ سئے انگلیں کی لاگ

دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

مومن کا شہدِ شجر ہے، تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یقیناً موتن کا یہ شعر اتنا بلند و پاکیزہ ہے کہ اس میں ترقی کی غمائش بظاہر نظر نہیں آتی لیکن غالب اس سے زیادہ بلند سطح پر پہنچ کر یوں کہتے ہیں :-

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال

ہم انجن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

موجودات اور مظاہرہ آثار کو دیکھ کر اعتبار و بصیرت حاصل کرنا، مشہور فلسفہ تصوف ہے جسے ورد نے یوں ظاہر کیا ہے :-

آہستہ سے پہل میان کہسار

ہر سنگ دوکانِ سنیہ نہ گریجو

غالب کی ندرت بیان و ثرون نگاہی ملاحظہ ہو۔ کہتا ہے :-

از میرتا بہ ذرہ دل دول ہے آئین

طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئین

تجلی و طور کے سلسلہ میں موصوفی پر طعن کرتا شاعروں کا بڑا دیرینہ شیوہ ہے، لیکن غالب اسی پامال خیال کو اس طرح ظاہر کرتا ہے :-

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پہ ۔۔۔ جیتے ہیں بادہ ظرف قرح خوار دیکھ کر  
استعارات و تشبیہات کا استعمال غالب سے پہلے ہی ملے تھا لیکن ان میں کوئی ندرت نہ تھی، غالب پہلا شخص تھا جس نے  
فارسی استعارے استعمال کئے اور اس خوبی کے ساتھ کہ اردو غزل میں جان پڑ گئی۔ مثلاً :-

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کب

بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی بھتا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقت سفر یاد آیا

غالب کی دوسری خصوصیت جو بہت کم کسی دوسرے شاعر میں پائی جاتی ہے، اس کی شوخی و ظرافت ہے۔ ہوا سکی زندگیاں  
کی ہر موڑ پر نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ ساقی نے انھیں ”حیدران ظریف“ ہی کہہ دیا۔ اس کے فارسی کلام میں اس کی عجیب غریب  
مثالیں ملتی ہیں لیکن اردو میں بھی ایسی دلچسپ مثالوں کی کمی نہیں۔۔۔ اس کی شوخی و ظرافت بھی عامیانہ نہیں، بلکہ خاصہ کا  
ہے جو صرف انداز بیان سے پیدا کی جاتی ہے۔ مثلاً :-

دے وہ جس قدر ذلت ہم تنہا میں ڈالیر گئے ۔۔۔ اسے آشنا نکلا ان کا پاس سب ان اپنا

کیا وہ غرور کی خسدا کی تھی زندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

غالب کی تیسری خصوصیت اس کی خودداری و خود بینی ہے۔ وہ محبت میں تذلل کا قایل نہیں، وہ رولے سولے اور اٹے اٹے  
پسند نہیں کرتا۔ وہ اگر محبت کرتا ہے تو چاہتا ہے کہ اس کی محبت کا احترام بھی کیا جائے، یہاں تک کہ وہ محبوب کے گھر جانے کا تصور  
کرتا ہے تو اس شان سے کہ :-

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

پھر اس میں خصوصیت دریا ہی کی نہ تھی بلکہ بندگی و فدائی کے تعلق میں بھی اس کی خودداری و کعبہ تک پہنچ جاتی تھی

اٹے پھر آئے دیر کعبہ اگر روانہ ہوا

غالب اس کو اپنی توہین سمجھتا تھا کہ وہ کوئی چیز چاہے اور اسے دے اور اس غم غصہ میں وہ اس حد تک کہ جاتا تھا کہ :-

ہاں اہل طلب کون سے طعنہ نہ یافت ، دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے  
غالب اپنے جذبات کے لحاظ سے بڑا شدت پسند شخص تھا اور اس کے تاثرات کی شدت کی کوئی حد و پائیاں نہ تھی۔ مثلاً محبت میں جذبہ  
اس کو لیچے کہ وہ یقیناً فطری چیز ہے، لیکن غالب کے یہاں یہ جذبہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے اور انسان تو انسان وہ خدا سے بھی  
نہ ہو سکتا ہے۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب وہ کافر و خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے۔  
یہ بات یہیں نظم نہیں ہو جاتی وہ خود اپنے آپ پر بھی رشک کرنے لگتا ہے :

میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

جب کو مجھ محبوب میں اس کے گھر کی تلاش ہو جاتے ہیں تو محبوب کا نام تک نہیں لیتے اور صرف یہ پوچھتے ہیں کہ : جاؤں کدھر کو میں  
غالب کی یہ استہزا پندری اور نزاکت خیال خالص عاشقانہ رنگ میں تو زیادہ نمایاں نہیں کیونکہ اس کا مہمان زیادہ وسیع نہیں۔  
ن جب وہ مسایل قصوف بیان کرتے پر آ جاتے ہیں تو پھر ان کی بازی کی کوئی انتہا نہیں رہتی ، اس کا کلام فلسفہ حیات اور مسائل  
مت و قصوف سے بھر پڑا ہے اور اس سلسلہ میں اس نے اتنی لطیف ، اتنی باند اس قدر اچھوتی باتیں کہی ہیں کہ اردو میں غالب  
مواہمیں کہیں اور نہیں ملتیں۔

آپ تمام شاعروں کے دو دین چھان ڈالئے لیکن غالب کے اس شعر کا جواب شاید ہی آپ کہیں مل سکے :

سہ کہاں تمنا کا دو سرا قدم یارب

ہم نے دشت املاں کو ایک نقش پاپا یا

کا خاص سبب یہ ہے کہ اس کی ترک تازانہ شاعری کے لئے بڑے وسیع میدان کی ضرورت تھی اور یہ اسے صرف قصوف ہی میں مل سکتا تھا

انگریزی زبان کا مشہور شاعر لٹن انڈھا تھا۔ اس کی تیسری بیوی نہایت حسین تھی ، لیکن اسی قدر بد مزاج  
ایک مرتبہ لارڈ بکنگھم اس سے ملنے گئے تو لٹن نے اپنی بیوی کی بڑی شکایت کی ، لارڈ نے کہا کہ : ”تم اسکی شکایت  
کرتے ہو ، حالانکہ وہ تو گلاب کا پھول ہے۔“

لٹن نے جواب دیا کہ : ”ہاں گلاب کا پھول تو ہے لیکن اس حقیقت کو میں نے اس کے رنگ سے نہیں  
بلکہ اس کے کانٹوں سے پہچانا ہے۔“

سامییرا کے شمال میں جہاں ہمیشہ برفن قائم رہتا ہے ، ایک پھول ایسا نظر آتا ہے جو سال میں صرف ایک  
مقررہ دن پر آگتا ہے ، اس کی تین پتیاں ہوتی ہیں اور اس کا قطر انچ کے برابر ہوتا ہے ۔ یہ پتیاں ایک  
ہی حزن اُگتی ہیں اور ان کا رخ شمال کی طرف ہوتا ہے اور وہ میدان میں ایسی نظر آتی ہیں جیسے برف کے بتوری  
مگنڈوں سے ڈنکی ہوئی ہوں ، جس وقت یہ پھول کھلتا ہے تو تارے کی طرح نظر آتا ہے ، اس میں پانچ بیج ہوتے  
ہیں ۔ بعض لوگ پتھر گردو میں ان بیجوں کو لے گئے اور برف سے بھرت ہوئے برف میں اس کو رکھا تو وہ دوسرے سال  
اُسی مقررہ دن پر برف کے اندر سے درخت پیدا ہو گیا ۔

# نظام شمسی کے ماتحت کمرے

(ہر سلسلہ اکتوبر)

**عطارد (Mercury)** نظام شمسی کا سب سے چھوٹا سیارہ ہے لیکن آفتاب سے سب سے زیادہ قریب۔ ہمارے چاند کی طرح اس کا بھی ہمیشہ نصف حصہ ہی آفتاب کے سامنے رہتا ہے، اس لیے وہ اس کے نصف حصہ میں ہمیشہ رات رہتی ہے اور نصف حصہ میں دن۔ وہ آفتاب کے گرد ۲۹ میل فی سکند کے حساب سے گردش کرتا ہے اور ایک صدی میں تین مرتبہ وہ زمین و آفتاب کے درمیان حائل ہوتا ہے۔

**زہرہ (Venus)** سیارہ نظام شمسی میں زمین اور عطارد کے محور کے درمیان واقع ہے۔ اسے عموماً ستارہ شام کہتے ہیں۔ اس کی گردش سورج کے گرد تقریباً دائرہ دار ہے، بیضی نما نہیں اور آفتاب سے اس کا بُعد ۶ کروڑ ۷۰ لاکھ میل ہے۔

زہرہ کا سال ۲۲۴ دن کا ہوتا ہے اور اس کی رفتار گردش ۲۲ میل فی سکند ہے۔ اس کا بھی صرف نصف حصہ آفتاب کے سامنے رہتا ہے۔ اس کے سطح پر ہر وقت گہرے بادل چھائے رہتے ہیں۔ اس کا قطر ۷۷۰۰ میل ہے یعنی زمین سے ۱۸ میل کم اور یہاں کوئی آثار حیات نہیں پائے جاتے۔

**زمین** نظام شمسی میں زمین تیسرے نمبر پر آتی ہے۔ ہمارا کردار اس وقت بہت آباد کر رہا ہے، لیکن کسی وقت یہ بھی بالکل غیر آباد تھا اور اس کی آبادی کو بہت زیادہ زمانہ نہیں گزرا ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ یہاں زندگی کی ابتدا کب سے ہوئی، لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ سب سے پہلے (جسے کروڑوں سال کا زمانہ ہوا) زندگی یہاں کے سمندروں میں ہوئی ہوگی جبکہ زمین کی خشکی کا درجہ حرارت نہایت زیادہ رہا ہوگا۔ اس وقت آرکٹک (Arctic) کے علاقہ میں جو انتہائی شمال میں واقع ہے جنگل اور پانی رہا ہوگا۔ زندگی سب سے پہلے غامض آب پودھوں کی شکل میں ظاہر ہوئی اور اندر ہی اندر اس نے مختلف صورتیں اختیار کیں، جب پانی آہستہ آہستہ خشک ہونے لگا اور خشکی کے حصے بننے لگے تو پانی کے اندر کے پودھے رفتہ رفتہ خشکی کے عادی ہونے لگے اور اس طرح زمین پر بھی سب اسے پہلے پودھے ہی وجود میں آئے۔ اس کے ۲ کروڑ سال بعد کرکٹ قسم کی کچھلی چھپلے پانی میں پیدا ہوئی اور اس میں بعد کہ جب پاؤں کا نشوونما ہوا تو وہ خشکی پر بھی رہنے لگی اور رفتہ رفتہ حیات میں ارتقاء شروع ہوا اور مختلف قسم کے جانور پیدا ہونے لگے یہاں تک کہ ۶ کروڑ سال کے اندر انسان ظہور میں آیا۔

زمین اپنے محور پر ۲۴ گھنٹے میں ایک بار گھومتی ہے اور ۳۶۵ دن میں اپنا چکر آفتاب کے گرد پورا کرتی ہے۔ زمین آفتاب سے ۹ کروڑ ۳ لاکھ میل کی دوری پر واقع ہے اور اسی بعد کی وجہ سے وہ اس قابل ہوئی کہ جاندار مخلوق پیدا کر سکے۔ اگر وہ آفتاب سے زیادہ قریب یا زیادہ دور واقع ہوتی تو شدت حرارت یا شدت برودت کی وجہ سے اس میں ذی حیات مخلوق پیدا نہ ہو سکتی۔ زمین کی شکل گیند کی طرح بالکل گول نہیں ہے بلکہ شمالی و جنوبی حصہ میں مارگی کی طرح چبٹی ہے کیونکہ جب زمین اتنی ٹھوس نہ تھی تو گردش کے وقت اس کا درمیانی حصہ پھول کر زیادہ ابھر آیا اور پھر خشک ہونے پر ویسا ہی رہ گیا۔

عطار دور دورہ کے مقابلہ میں ہمارے کرۂ زمین کو ایک خصوصیت یہ بھی حاصل ہے کہ وہ اپنا ایک ماتحت سیارہ چاند بھی رکھتا ہے جو ہمارے کاروبار حیات کے لئے بہت ضروری ہے۔

چاند کا فاصلہ زمین سے ۲۳۹۰۰۰ میل ہے۔ چونکہ وہ ہم سے زیادہ قریب ہے اور کوئی *atmosphere* نہیں رکھتا اسی لئے آفتاب کی روشنی جو اس پر پڑتی ہے چاندنی کی صورت میں ہم تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ زمین سے بہت چھوٹا ہے، زمین کا قطر ۷۹۱۰ میل ہے اور چاند کا ۲۱۶۰ میل۔

چاند ایک متعین فاصلہ پر زمین کے گرد گردش کرتا رہتا ہے، لیکن ہم کو ہمیشہ اس کا ایک ہی رخ نظر آتا ہے، کیونکہ جتنے عرصہ میں اس نے اپنی محوری گردش پوری کرتا ہے، اتنے ہی عرصہ میں وہ زمین کے گرد بھی اپنا چکر پورا کر لیتا ہے۔ چاند کی سطح ہمیں نظر آتی ہے اس میں پہاڑوں، دروں اور سطح میدانوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ پہاڑوں کی صورت ایسی ہے گویا وہ کسی وقت آتش فشاں رہے ہوں گے۔ وہاں کے خار بہت بڑے ہیں چنانچہ بعض کے دہانے ۶۰ میل کے ہیں اور گہرائی ۲۵۰۰ فٹ۔ پہاڑ بھی بہت اونچے ہیں، چنانچہ ایک پہاڑ کی چوٹی ۲۰ ہزار فٹ بلند ہے، پہاڑوں کی سطح بہت ناہموار ہے کیونکہ یہاں بارش اور ہوا کا وجود نہیں جو ان کی سطح میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکے۔

چاند کیونکہ وجود میں آیا اس کے متعلق دو نظریے قائم کئے گئے ہیں۔ ایک جرم فلکیات کا خیال ہے کہ جس طرح مشتری، زحل اور یوڑاؤس نے قوت کشش سے اپنے آس پاس کے گروں پر قبضہ کر کے اپنے اپنے چاند بنائے ہیں، اسی طرح کرۂ زمین بھی چاند پر قابض ہو گیا ہے۔ سر جارج ڈارون کا خیال ہے کہ چاند دراصل زمین ہی کا ایک ٹکڑا ہے جو ۵۰۰۰ کروڑ سال قبل اس سے کٹ کر چاند بن گیا۔ سر جیمس ہین (James Jeans) کا خیال ہے کہ تقریباً ۲۰ ہزار سال کے بعد اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے اور پھر چارے۔

چاند کے اندر بھی اسی قسم کی بعض معدنی اشیاء پائی جاتی ہیں جیسی زمین کے اندر اور اگر ہم کسی وقت اس کی سطح تک پہنچیں گے تو وہاں کی معدنیات سے کافی مستفید ہو سکتے ہیں۔

**مریخ** زمین کا چڑوسی سیارہ ہے اور اس کا رنگ سرخ ہے۔ یہ دوران گردش میں جب زمین سے بہت دور ہو جاتا ہے تو نظر نہیں آتا لیکن جب قریب آکر اس کا فاصلہ ہم سے صرف ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ میل کا رہ جاتا ہے تو نظر آنے لگتا ہے۔ اس کا فاصلہ آفتاب سے ۳۸ کروڑ ۱۰ لاکھ میل ہے اور ۲۸۷ دن میں وہ اپنی گردش آفتاب کے گرد پوری کرتا ہے۔ اس طرح اس کا سال ہمارے سال سے تقریباً دو گنا ہوتا ہے۔ وہ زمین سے بہت چھوٹا ہے اور اس کا قطر ۲۰۰۰ میل ہے۔

مریخ کی سطح پر ہم کو بہت سے رنگین جھٹے نظر آتے ہیں، سبز، سفید، زرد۔ سبز حصوں کو سمندر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور زرد حصوں کو خشکی سے۔

سائنس میں ایک ماہر فلکیات نے یہاں نہروں کے نشانات بھی پائے ہیں۔ چونکہ وہاں *atmosphere* پایا جاتا ہے اس لئے وہاں حیات کا بھی امکان ہے اور چونکہ وہ زمین سے زیادہ طویل العمر سیارہ ہے، اس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ وہاں حیات کا ظہور بھی پہلے ہوا ہوگا اور تہذیب و تمدن میں بھی اس نے ہم سے پہلے ترقی کی ہوگی، لیکن اس سے یہ بھی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اس کی ترقیاں اس وقت تک ختم ہو چکی ہوں گی اور وہاں اب سناٹا ہوگا۔ چنانچہ ڈاکٹر اسپنسر جونس کا خیال یہ ہے کہ وہاں کا *atmosphere* خشک ہو چکا ہے اور اسی کے ساتھ وہاں کی آبادی بھی۔ ڈاکٹر اسٹیوٹسن کہتے ہیں کہ مریخ نہایت سرور خشک کر رہا ہے جہاں نباتات کا پایا جانا تو ممکن ہے لیکن ہماری زمین کی طرح کے انسانوں کا وجود وہاں ممکن نہیں، — برخلات اس کے کیلی فلا میرین

(Camille Flammarion) کا خیال ہے کہ وہاں انسانی قسم کی آبادی ضرور پائی جاتی ہے اور کسی وقت ہم وہاں کے باشندوں سے پیام و سلام کا سلسلہ قائم کر سکتے ہیں۔

مریخ دو چاند رکھتا ہے، پہلا چاند قریب تر واقع ہے اور دوسرا زیادہ دور، پہلا چاند ساڑھے سات گھنٹے میں مریخ کے گرد اپنا چکر ختم کر لیتا ہے گویا جتنی دیر سے مریخ اپنی ایک گردش پوری کرتا ہے، یہ چاند تین چکر اس کے لگا لیتا ہے۔ چاند مغرب کی طرف سے طلوع کرتا ہے اور پانچ گھنٹوں میں ڈوب جاتا ہے۔ دوسرا چاند مشرق سے طلوع کرتا ہے اور دو دن کے بعد غروب کرتا ہے۔ یہ دونوں چاند مریخ سے بہت قریب واقع ہیں اور اتنے چھوٹے ہیں کہ ان کا قطر ۳۰ میل سے زیادہ نہیں۔

**مشتری (Jupiter)** اپنے حجم کے لحاظ سے نظام شمسی کا سب سے بڑا سیارہ ہے۔ اس کا قطر ۸۶۵۰۰ میل ہے اور زمین سے تیرہ سو گنا زیادہ بڑا ہے۔ اس کا ایک سال ہمارے بارہ سال کے برابر ہے اور چونکہ اس کی محوری گردش ۹ گھنٹے ۵۵ منٹ میں ختم ہو جاتی ہے اس لئے اس کا دن پانچ گھنٹے سے بھی کم ہوتا ہے۔ مشتری ہمیں نظر تو آتا ہے لیکن اس کی سطح کا کچھ حال معلوم نہیں کیونکہ وہ بہت دور ہے۔ بدولوں سے ڈھکی رہتی ہے۔ آفتاب کی حرارت اتنی زمین تک پہنچتی ہے اس کا ستائیسواں حصہ مشتری کو پہنچتی ہے، پھر بھی وہ بہت زیادہ روشن نظر آتا ہے جس کا سبب غائب ہے کہ وہ موز مشعل حالت میں ہے اور اس میں انجماد پیدا نہیں ہوا۔ اور ایسا ہونا چاہئے کیونکہ وہ اتنا بڑا کرہ ہے کہ اس کے گھٹنڈے ہونے کے لئے بھی بڑا زمانہ درکار ہے۔

جو سیارہ آفتاب سے جتنا زیادہ دور ہوتا ہے، اتنے ہی زیادہ عرصہ میں اس کا دورہ پورا ہوتا ہے، اس لئے مشتری کو ۱۲ سال کا اپنا دورہ پورا کرنے میں لگتے ہیں لیکن اس کی محوری گردش بہت تیز ہے اور اس کا قطر ۸۶۵۰۰ میل ہے۔ مشتری کے ۹ چاند ہیں۔ سب سے قریب کا چاند چھوٹا ہے، اس کے بعد کے چار چاند بڑے ہیں لیکن یہ سب ایک سطح پر گردش کرتے ہیں۔ تیسرا چاند سب سے بڑا ہے اور اس کا قطر ۵۶۰۰ میل ہے۔ چار چاند اور ہیں جو زیادہ دوری پر واقع ہیں اور سب آخری چاند جو بہت زیادہ دور ہے دوسرے چاندوں کے خلاف الٹی گردش کرتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ چاند کسی اور کرہ کا ہے جسے مشتری نے اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔

مشتری میں آثار حیات نہیں پائے جاتے، لیکن ممکن ہے اس کے کسی چاند میں زندگی کی علامات پائی جاتی ہوں۔ زحل (Saturn) زحل، آفتاب سے ۸۸ کروڑ ۶۰ لاکھ میل دور ہے اور اتنی ہی دوری پر وہ آفتاب کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ حجم میں زمین سے بڑا ہے۔ اس کا قطر ۸۷ ہزار میل ہے۔ مشتری کی طرح یہ بھی نیم منجمد حالت میں ہے اور اس کے چاروں طرف بہت موٹی بادلوں کی پائی جاتی ہے۔ آفتاب کے گرد اس کا دورہ ۲۹ ۱/۲ سال میں پیدا ہوتا ہے۔ زحل کی خصوصیت یہ ہے کہ علاوہ چاندوں کے اس کے چاروں طرف بڑے بڑے حلقے بھی پائے جاتے ہیں، جو دو بیٹیوں کی صورت میں اسے گھبرے ہوئے گردش کرتے رہتے ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان سیاہ مادی خلا پایا جاتا ہے۔ ان دونوں روشن حلقوں سے اوپر ایک اور حلقہ دریافت ہوا ہے جو نیم منجمد حالت میں ہے یہ حلقے مجموعہ میں ہزاروں چھوٹے چھوٹے گردی اجسام کا جو زحل کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ اندرونی حلقہ تیرہ میل فی گھنٹہ اور بیرونی حلقہ ۱۰ ۱/۲ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گردش کرتا ہے۔

ان حلقوں کے علاوہ زحل کے نو چاند بھی ہیں۔ چھ چاند سب سے بڑا چاند ہے جس کا قطر ۲۷۰۰ میل کا ہے۔ جو چاند سب سے زیادہ دور ہے وہ برخلان دوسرے اقمار (چاندوں) کے مشرق سے مغرب کی طرف گردش کرتا ہے۔

**یورینس (Uranus)** پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ مشتری، نظام شمسی کا آخری سیارہ ہے، لیکن ۱۷۸۱ء میں ایک اور نیا سیارہ دریافت ہوا جسے یورینس کہتے ہیں۔ یہ سیارہ آفتاب سے اٹھارہ ارب میل دور واقع ہے اور اپنا دورہ ۸۴ سال میں پورا کرتا ہے، اس کا قطر تین ہزار میل کا ہے۔ یہ کیسی حالت میں ہے اور اس کے اندر بعض ایسے معدنی مواد کا بھی پتہ چلا ہے جو زمین میں نہیں پائے جاتے۔ اس کی گردش آفتاب کے گرد تمام سیاروں سے



# آلم منظر نگری

(پروفیسر شارق ام۔ لے)

نام — محمد اسحاق  
وطن — منظر نگری  
عمر — انداز ۵۵ سال  
تصانیف — سلسبیل، کوثر و تسنیم، آہنگ سرمدی - سدرہ و طوبی

”ہماری زبان“ موزن یکم نمبر ۱۹۵۷ء میں ”حرث قنما“ مصنفہ میکش اکر سادی پبلشرز کرتے آئے خلیل الرحمن عظمیٰ نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے۔ ”ہمارے یہاں پچھلے دور میں ادبی درجہ کے شاعروں نے ادب کے بازار پر پورا جھاپا ار رکھا تھا شکر ہے اس کا اثر کم ہو رہا ہے اور اب ایسے مجموعے شائع ہو رہے ہیں جو ہر اعتبار سے توجہ کے مستحق ہیں۔ ان مجموعوں میں کوثر و تسنیم اور سدرہ و طوبی کو خاص اہمیت حاصل ہے اور انہیں سامنے رکھ کر ہم آلم کی شاعری کا تجزیہ پاسانی کر سکتے ہیں۔

یونٹو آلم نے انہیں بھی لکھی ہیں اور مثنویاں بھی لیکن ان کے فن کا کمال غزلوں میں زیادہ نمایاں ہے۔ اس لئے ہم ان کے شعور و مرتبہ کا اندازہ ان کی غزلوں کو سامنے رکھ کر کریں گے۔

غزل آلود شاعری کی اہم صنف ہے۔ اس کی مقبولیت کا آج بھی وہی عالم ہے جو سو سال پہلے تھا۔ زبان و بیان اور شاعرانہ لہجہ کی ترتیب و تہذیب کے اعتبار سے غزل کے دو خاص رنگ ہیں۔ ایک میر کا دوسرا غالب کا۔ میر کی غزل کی جان نرم و رنگ الفاظ و سادگی جذبے کی گھلاوٹ، خلوص اور سوز و گداز ہیں۔ غالب کے یہاں فکر و جذبہ کا امتزاج ہے۔ پچھلے دور میں ہمارا شاعرانہ شعور غالب سے زیادہ متاثر ہوا۔ سیلاب نے غالب اور میر کی شاعرانہ خوبیوں میں جدید رجحانات کو دخل دے کر اسے آگرہ اسکول سے منسوب کر دیا۔ آلم سیلاب کے شاگرد ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری میں آگرہ اسکول کے محاسن تمام و کمال پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آلم نے اس اسکول کی تقلید میں اپنی انفرادیت کو بھی ختم کر دیا۔ آگرہ اسکول کے محاسن شعری کو اپناتے ہوئے انھوں نے اپنا ایک علاوہ رنگ قائم کیا ہے اور اس حیثیت سے وہ اپنے عہد کے تمام شاعروں سے ممتاز ہیں۔

ہم اب تک ہیئت و تکنیک کا تعلق ہے آلم کے یہاں ہماری شاعرانہ روایتوں کا احترام پایا جاتا ہے، لیکن انھوں نے انداز بیان کو یکساں قوت دی ہے۔ کوثر و تسنیم کے دیباچہ میں سجاد قادری نے نہایت خوبی سے ان کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے:-

”مفرودہ مضامین اور روایتی موضوعات کو جدید طرز بیان کی قوتوں سے اس طرح بجائے ہیں کہ ہر لفظوں لیا اور ہر جملوں کا لگائی  
سے قریب تر نظر آنے لگتا ہے۔ فلسفہ حسن و عشق کے ساتھ حقایق حیات خود بخود ابھر آتے ہیں اور اس طرح کو احساسات کے تمام جہان کی کوشش  
پر لگا ہیں قصے کہنے لگتی ہیں۔“

مثال کے طور پر دیکھیے کہ جلوں کے ہجوم میں نگاہ کی خیرگی اور حیرت مسلسل کی تصویر کس طرح کھینچی ہے:-

جہن تو کیا در زنداں کا راستہ ملا

ہر اک طرف ہجوم بہار تھا کہ مجھے

زیادہ ہے اور اس کا رنی صرف سات گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ اس کے چار چاند بھی ہیں جو یورانیس کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ وہ چاند زیادہ دور ہے وہ ساڑھے تیرہ دن میں اور جو قریب ہے وہ ڈھائی دن میں یورانیس کے گرد اپنا چکر ختم کر دیتے ہیں۔

نیپٹون کا نظریہ کشش یہ ہے کہ تمام اجسام کر دی ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں یعنی اگر نظام شمسی کے تمام کروں کو آفتاب کی قوت کشش اپنی طرف کھینچ رہی ہے تو اس سے گرتے ہوئے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں اور اس طرح یہ سب متعلق حالت میں اپنے اپنے دائرہ کے اندر گردش میں صرف ہیں اور ایک دوسرے سے ٹکرائیں سکتے۔

جب یورانیس دریافت ہوا اور اس کا نظریہ گردش معلوم کیا گیا تو یہ بھی پتہ چلا کہ اس کے خط گردش میں کچھ گھٹاؤ بیٹھا ہے اور یہ جو دریافت شدہ سیاروں کی کشش کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس کی جستجو کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس کی گردش پر کسی اور سیارہ کی کشش کا اثر پڑتا ہے اور یہ سیارہ نیپچون ہے۔

یہ سیارہ آفتاب سے ۲ ارب ۸۰ کروڑ میل کی دوری پر واقع ہے اور اس کا قطر ۳۵ ہزار میل ہے۔ ابھی تک اس پر انجاد پیدا نہیں ہوا۔ اور ۱۲۵ سال میں اس کی گردش پوری ہوتی ہے۔

نیپچون دریافت ہونے کے بعد بھی سیارہ یورانیس کے خط گردش کا انحراف ختم نہ ہوا تو خیال ہوا کہ کوئی غیر دریافت شدہ سیارہ اور کبھی ہے جس کی کشش سے یہ انحراف پیدا ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں ۱۹۳۰ء میں ایک اور دھندلے سیارہ کا انکشاف ہوا جسے پلوٹو کہتے ہیں اور اس طرح نظام شمسی کا یہ نواں سیارہ دریافت ہوا جس کا فاصلہ آفتاب سے بنسبت زمین چالیس گنا زیادہ ہے اور ۲۵۰ سال میں اپنا دورہ پورا کرتا ہے۔ بنسبت زمین کے سورج روشنی اس کو ۵۰۰ گنا کم لگتی ہے۔

یہ نظام شمسی کا بعید ترین سیارہ سمجھا جاتا ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ آئندہ بعض اور سیارے بھی دریافت ہوں۔

نبولین کی فوج میں ایک افسر نہایت ذہین تھا لیکن اسی کے ساتھ شراب کا بھی سخت عادی تھا اور اس کا علم نبولین کو بھی تھا، ایک دن نبولین کو معلوم ہوا کہ اس نے اپنی تلوار بیچ کر شراب پی ڈالی اور بجائے اصلی تلوار کے ایک لکڑی کی تلوار میان میں ڈالی ہے۔ نبولین نے اپنے ایک دوست سے مشورہ کر کے اس افسر کو بلوایا اور کہا کہ ایک سپاہی کو قتل کی سزا دی گئی ہے اور تم اس کے قتل پر حاضر کئے گئے ہو۔

افسر نے عرض کیا کہ سپاہی بالکل بے قصور ہے اور معافی کے قابل ہے، لیکن نبولین نے کھد نہ سنا اور فوراً وہ مجرم سپاہی سامنے لایا گیا۔

سادہ فوج یہ تماشہ دیکھنے کے لئے لکڑی قلعی اور وہ افسر سخت پریشان تھا کہ کیا کرتے ہیں تو اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ کسی ترکیب سے تلوار مل جائے تو اپنے تو اپنے فرض کو ادا کرے لیکن جب اس میں کامیاب نہ ہوا تو وہ مجرم کے پاس آیا اور اپنے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر آسمان کی طرف منہ کر کے کہا کہ ”میں جانتا ہوں کہ یہ سپاہی بے خطا ہے اور میں اس کے خون سے بری الذمہ ہوں، اس لئے اگر میں سچا ہوں تو اسے خدا میری تلوار کو لکڑی کی بنا دے“ یہ کہہ کر اس نے تلوار کھینچی تو وہ لکڑی کی قلعی، اس نے سب کو مخاطب کر کے کہا کہ: ”دیکھا یہ معجزہ“ میں یہ نہ کہتا تھا کہ یہ سپاہی بے گناہ ہے۔

نبولین بہت ہنسنا اور اپنے خیمہ میں بلا کر اس سے کہا کہ آئندہ شراب کی خاطر تلوار نہ بیچنا اور جب ضرورت ہو تو میرے آبدار خانہ سے منگا لینا۔

# آلم منظر نگری

(پروفیسر شارق ام۔ لے)

نام --- محمد اسحاق  
وطن --- منظر نگری  
عمر --- انداز ۵۵ سال  
تصانیف --- سلسلہ، کوثر و تسنیم، آہنگ سرمدی - سدرہ و طوبی

”ہماری زبان“ موضوع یک سنبر سے ہے جس میں ”عزت تمنا“ مصنفہ میکش اگر آبادی پر تبصرہ کرتے ہوئے خلیل الرحمن عظمیٰ نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے: ”ہمارے یہاں پچھلے دور میں ادبی درجہ کے شاعروں نے ادب کے بازار پر بڑھ چاہے اور لکھا تھا، شکر ہے اس کا اثر کم ہو رہا ہے اور اب ایسے مجموعے شائع ہو رہے ہیں جو ہر اعتبار سے توجہ کے مستحق ہیں۔“ ان مجموعوں میں کوثر و تسنیم اور سدرہ و طوبی کو خاص اہمیت حاصل ہے اور انہیں سامنے لکھ کر ہم آلم کی شاعری کا تجزیہ و تفسیر کر سکتے ہیں۔

یونٹو آلم نے تفسیر بھی لکھی ہے اور فتویاں بھی لیکن ان کے فن کا کمال غزلوں میں زیادہ نمایاں ہے۔ اس لئے ہم آلم کے شاعروں مرتبہ کا اندازہ ان کی غزلوں کو سامنے رکھ کر کریں گے۔

غزل اور شاعری کی اہم صفت ہے۔ اس کی مقبولیت کا آج بھی وہی عالم ہے جو سو سال پہلے تھا۔ زبان و بیان اور شاعرانہ لہجہ کی ترتیب و تہذیب کے اعتبار سے غزل کے دو خاص رنگ ہیں۔ ایک تیر کا دوسرا غالب کا۔ تیر کی غزل کی جان نرم و گہ الفاظ سادگی، جذبے کی گھلاوٹ، خلاص اور سوز و گداز ہیں۔ غالب کے یہاں فکر و جذبہ کا امتزاج ہے۔ کچھلے دور میں ہمارا شاعرانہ شعور غالب سے زیادہ متاثر ہوا۔ سیلاب نے غالب اور تیر کی شاعرانہ خوبیوں میں جدید رجحانات کو دخل دے کر اسے اگر اسکول سے منسوب کر دیا۔ آلم سیلاب کے شاگرد ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری میں اگر اسکول کے محاسن تمام و کمال پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے یہی نہیں ہیں کہ آلم نے اس اسکول کی تقلید میں اپنی انفرادیت کو بھی ختم کر دیا۔ اگر اسکول کے محاسن شعری کو اپناتے ہوئے انھوں نے اپنا ایک علاوہ رنگ قائم کیا ہے اور اس حیثیت سے وہ اپنے عہد کے تمام شاعروں سے ممتاز ہیں۔

بہر حال ایک حیثیت تکنیک کا تعلق ہے آلم کے یہاں ہماری شاعرانہ روایتوں کا احترام پایا جاتا ہے، لیکن انھوں نے انداز بیان کو ایک نئی قوت دی ہے۔ کوثر و تسنیم کے دیباچہ میں عباد قادری نے نہایت خوبی سے ان کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے:-

”غرض وہ مضامین اور روایتی موضوعات کو جدید طرز بیان کی قوتوں سے اس طرح سجاتے ہیں کہ ہر مضمون نیا اور ہر موضوع سخن زندگی سے قریب تر نظر آنے لگتا ہے۔ فلسفہ، سخن و عشق کے ساتھ حقایق حیات خود بخود ابھر آتے ہیں اور اس طرح کہ احساسات کے تمام جامانی کو گتلا پر نگاہیں تھیں کہیں لگتی ہیں۔“

مثال کے طور پر دیکھیے کہ جلوؤں کے بھوم میں نگاہ کی خیرگی اور حیرت مسلسل کی تصویر کس طرح کھینچی ہے:-

ہر اک طرف بھوم بہار تھا کہ مجھے  
جہن تو کیا در زنداں کا راستہ ملا

آلم نے خود اس کا اعتراف ایک جگہ کیا ہے۔ کہتے ہیں :-

آلم کی طرز فکر شعر کو دیکھا ہے ہم نے بھی مذاق تازہ بھی ہے اور انداز کہن بھی ہے  
مکمل ہے 'انداز کہن' کی ترکیب سے آپ کو خیال ہو کہ آلم کے کلام میں فروزدگی ہی فروزدگی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے  
کہ آلم نے ماضی کی صرف مستحسن روایات کو اپنایا ہے۔ ان کے خیالات میں سبک پن کی بجائے ارتقاع ہے۔ ان کے کسی مجموعے میں کوئی شعر  
آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو معیار اخلاق پر پورا نہ اترے یا جس سے ہمارے ذوق کی تسکین نہ ہو۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ان کے کلام  
کی بنیاد جذبہ اور فکر کی ہم آہنگی پر قائم ہے۔ ہر شعر میں کوئی بات کہی گئی اور پسندیدہ لب و لہجہ کے ساتھ۔ آلم نے جہاں کہیں تصوف  
اور فلسفیانہ مضامین کو کو نظم کیا ہے وہاں بھی اسلوب میں سپاٹ پن پیدا نہیں ہونے دیا۔ مثالی کے طور پر چند شعر ملاحظہ فرمائیں :-

سرد فانیوس سے پرواز اور آگے بڑھے گرم رفتار و فائے غم کی یہ منزل نہیں  
ہوائے گرم خزاں سے رہی جو بیگانہ اسی بہار کے جلوے چمن طراز نہیں  
منزل دہر کو آرام کی منزل نہ بنا بے خبر ہوش میں آموچ کو ساحل نہ بنا  
بحر الفت میں کہاں ٹھہرتی کشتی حیات موج سے موج تو بٹی رہی ساجن نہ بنا  
اسے کیا دیکھتا محو خیال آشیائے تھا میں قفس رکھا رہا برسوں مری شاخ نشیں پر

یہ انداز بیان آلم کے یہاں آپ کو ہر جگہ ملے گا۔ رشتہ خیال، بلبلغ اور مترنم الفاظ کا استعمال، پاکیزہ لب و لہجہ اور جملہ مندی۔  
یہ ہیں آلم کی شاعری کے بنیادی عناصر۔

آلم کا مرتبہ اس بات سے اور بلند ہو جاتا ہے کہ وہ ماحول سے بیگانہ نہیں۔ وہ زمانہ کے ساتھ چلے ہیں، وقت کی آواز کو پہچانتا ہے اور  
حالات حاضرہ پر سمجھنا نگاہ ڈال کر اشاروں اشاروں میں احساسات کو شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔  
آزادی کے فوراً بعد سرزمین ہند و پاک میں جو حالات رونما ہوئے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس وقت انسانیت اور ہر برہمن میں  
کوئی امتیاز باقی نہیں رہ گیا تھا۔ دیکھئے اس خویش منظر کے زخم خوردہ کے احساسات کو اس شعر میں کس قدر عمدہ پیرایہ میں بیان کیا گیا  
ہے۔ شعر کا طنز، لب، دلجوئی و شہر سے زیادہ کارگر ہے۔

کمال گرم نگاہی تو ان کا دیکھ لیا شکست سیشہ دل کا نہیں خیال مجھے  
اس کے بعد اس تباہ کاری کے انجام کو دکھایا ہے۔ کہتے ہیں میرا کیا تھا، مجھے تو ایک دن ذاتی آغوش میں جانا ہی تھا۔ مجھے  
چھوٹا کر اہل وطن نے خود اپنے گھر کو آگ لگا دی :-

گلشن کی بلبلیاں نے خود اپنے گھر کو چھوٹا کر  
غرض آلم کی ہر غزل میں کوئی نہ کوئی شعر ایسا ضرور مل جاتا ہے جس سے حالات حاضرہ پر روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے سیاسی اشاروں  
کو نہایت لطیف انداز میں نظم کیا ہے۔ اس اعتبار سے اردو کا کوئی غزل گو ان کے مقابل نہیں۔ چند شعرا وادہ پیش نظر ہیں :-

قفس میں ہم نوا اتنا تحمل بھی نہیں دیا رہا باقی نہ احساس پر افشانی تو کیا ہوگا  
چمن میں دیکھتے ہیں لالہ و گل کو نظر والے ہمیں بھی دیکھ لیں ہم تو ہیں زخم جگر والے  
مرے حق سے چشم پوشی نہیں باغباں کو لازم ہے ابھو تو گشتاں میں مری خاک آشیانہ  
وہ نصیب گل جو سپناں جنوں ہے کب تک آئے گی گلستاں میں اسی کے منتظر بیٹھے ہیں دیوانہ  
کے کھاک پر پروانہ نے پھر بال و پر پیدا فضا نے بزم کے ذروں میں ہے نصیب شہر پیدا  
وفاؤں پر مری ایمان لے آئے چمن والے ہے ذکر غیر اب تو آشیائے وہ آشیائے میوہ

موجودہ زمانہ میں جن شعرا نے غالب کا اثر سب سے زیادہ قبول کیا ہے، ان میں فانی، اقبال، سیاب اور یگانہ کی شخصیتیں نمایاں ہیں۔ غزل کے احیاء میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان میں فانی الم پرست ہیں۔ اقبال کا پیام حیات آفریں یو یگانہ کے آرٹ میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ اور کس بل ہے۔ سیاب کے یہاں یگانہ ایسی فلسفہ طرازی تو نہیں لیکن تشنگی خیال تصور پائی جاتی ہے۔ الم کا نظریہ فانی سے متضاد ہے۔ وہ حوصلہ مند شاعر ہیں تنوہیت انھیں چھو بھی نہیں گئی۔ اقبال کا اثر ان کی نظم پر پڑا ہے۔ غزل پر نہیں۔ مزاج کے اعتبار سے الم اور یگانہ کی حیثیت برابر ہے۔ لیکن الم کے یہاں سادگی اور خلوص کی آمیزش ہے اور یگانہ کے آرٹ میں صناعتی جھانگ تشنگی خیال اور اسلوب بیان کا تعلق ہے وہ الم کو سیاب سے درشت میں لی ہے۔ مشکل سے مشکل زمین میں بھی ان کے یہاں روانی اور سلاست کی کمی نہیں۔ ان کے یہاں رفعت خیال کے ساتھ مسکور کن گنگناہٹ بھی پائی جاتی ہے۔ اس وصف میں وہ جگر مراد آبادی اور اصغر کے شریک ہیں لیکن جگر کی شاعرانہ اہلیت کا مدار سستی جذباتیت پر ہے۔ فکر اور گہرائی کی ان کے یہاں کمی ہے۔ انصاف کے یہاں قصوں ہی قصوں ہے۔ الم کے کلام میں تصوف کے ساتھ زندگی کے حقائق کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ اسی کے ساتھ الم کی شاعری پروقار بھی ہے۔ ان کی طبیعت میں ٹھہر اڑے نہیں۔ مکوں ہے بے حسنی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شعر اور ہنر ہوتا ہے اور جوڑ ان کے اشعار سے حاصل ہوتی ہے وہ دیر پا ہوتی ہے۔ اب ذیل میں ان کے کچھ منتخب اشعار دیکھتے ہیں آپ کے ساتھ ان کی شاعری کے صحیح خدو خال آجائیں :-

دوست انقلاب تھا بے چارگی کے ساتھ دنیا سمٹ گئی نکلے طبیعت کے ساتھ  
بے چارگی کے ساتھ انقلاب کو وابستہ کرنا، انقلاب سے متعلق مشرق کا اہم نظریہ ہے۔ دیکھتے شاعر نے اسے کتنے عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے اور لب و لہجہ کتنا پُر خلوص ہے :- اس کے علاوہ شاعرانہ حیثیت سے 'گاہِ ملت' کی ٹیکب کتنی حسین ہے اور اس میں کس قدر وسعت پائی جاتی ہے :-

سر منزل پہونچکر بھی ہوا مجھ کو نہ کچھ حاصل لئے بیٹھا ہوں اب میں انتظار میرے منزل کو  
یہ شعر سعی عمل نہایت عمدہ مثال ہے۔ منزل پر پہونچنے کا یہ شوق کہ وقت سے پہلے ہی ساز منزل پر پہونچ جاتا ہے، قابلِ داد ہے۔ اسی مضمون کے یگانہ کے یہ شعر بھی تعریف سے مستغنی ہیں

دھواں، صاحب نظر آیا سوا منزل کا نگاہ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا  
منزل کی دھن میں آبدہ پاہل کھڑے ہوئے شوق جرس سے دل نہ رہا اختیار میں  
اب الم کے کچھ اور پسندیدہ اشعار ملاحظہ کیجئے :

بہارِ افروز ہیں شعلے جہاں برقِ حوادث کے مرتب پھر اسی گلشن میں اپنا آئیناں کرے  
قصص میں یوں تو ذائقے سے دل کشا کرتا ہوں گھر بے چین کر دیتی ہے یاد آستیاں پھر بھی  
بہاروں میں مرتب کر تو لوں تنکے کشمیں کے ہوا کی بنشوں میں کچھ تو شاخ آئیناں شہرے  
قصص کی شام سے کرتا ہے جو صبح میں پیدا اسیری میں لئے بیٹھے ہیں وہ دیوانہ بن ہم بھی  
کوئی دل بھی نہیں محفوظ اس کی زد سے تھی میں تنگ و تازہ حوادث ہم سمجھتے تھے کہ ہم تک ہے  
ہزاروں طور لاکھوں جلیاں ہیں اسکے پہلو میں مرے دل کا گزر ہم تک نہیں پایاں غم تک ہے  
کہوں کیا اُدبہ و انوس کی لاشوں رونے والے خدا تجھ کو شعورِ عظمتِ آداب محض دے  
کوئی دیکھے نہ ان بربادوں کو حقارت سے یہ ہیں ٹوٹے ہوئے دل ان میں پوشیدہ ہیں میری  
پرتنہائی کا عالم، یہ مجھ یا اس عظمت قیامت سے الم عظمت کی پہلی شام ہوتی ہے

# ایک چینی فلسفی کے بعض دلچسپ نظریے

**نظریہ انسانیت** یونانیوں کا مذہب انسانیت سچی لفظاً فطرت سے ہے۔ یونانی اپنے دیوتاؤں کو بھی انسان سمجھتا ہے اور یہی دین آدمی کو دیوتا بنا دیتا ہے۔ یونانی دیوتا، خوش باش اور عشق پیشہ لوگ ہیں جو جھوٹ بولتے ہیں، آپس میں لڑتے رہتے ہیں، عہد و پیمان توڑتے ہیں، نیک چڑھتے اور جھگڑتے ہیں۔ یہ دیوتا بھی ساری یونانی قوم کی طرح، رتھوں کے شکاری ہیں، نیزہ بازی کے متوالے ہیں، شکار کے رہا ہیں۔ یونانیوں کی طرح یہ دیوتا بھی شادیاں کرتے ہیں، اور کئی ایک کے تو ناجائز اولاد بھی ہے! یونانیوں کے نزدیک انسانوں اور دیوتاؤں میں فرق اتنا ہے کہ دیوتاؤں کو روئے زمین پر کھلیاں برسانے کا اختیار ہے، یونانی زمین کو سرسبز بناتے ہیں، وہ انسانوں کی طرح فانی نہیں اور وہ خراب کی بجائے آجیات پیتے ہیں۔ ان دیوتاؤں کا ذکر سن کر فوراً یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ تو گہری دوستی بھی ہو سکتی ہے اور ہم آپ دیوتا پالو (دوست دیوتا) یا اتھین، یا دیوتا مرکری (پیغام رسان دیوتا) کے ساتھ کھڑے ہر ایک محبوبہ وال کر شکار کو جاسکتے ہیں اور راستہ میں اس پیغام رسان دیوتا سے گنجل مل کر باتیں کر سکتے ہیں اور وہ بیکاپ باتیں چھوڑ کر کہہ سکتا ہے کہ ”اچھا بھائی! میں کتنا میں ذرا ایک کر یہ خط فلاں، بلکہ پھونچاؤں!“ یونانیوں کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ یونانی لوگ تو دیوتا نہیں تھے۔ مگر یونانی دیوتا ضرور انسان تھے۔

**دنیا کا چینی تصور** چینیوں کو دنیا میں نہ کامل امن و سکون کی توقع ہے نہ مکمل مسرت کی۔ اس فلسفہ فطری وضاحت کے لئے ایک کہانی سنئے:-

”ایک شخص دوزخ میں تھا، اس کے آواگوں کا وقت آچکا تھا۔ اس نے خدا سے کہا، اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں ایک بار پھر آدمی کی شکل میں دنیا کو جاؤں تو میری چند شرطیں ہیں۔ خدا نے پوچھا، وہ کیا شرطیں ہیں بھائی؟ اس نے جواب دیا، شرط یہ ہے کہ اب میں ایک وزیر کے یہاں جنم لوں، اور میرے یہاں جو بیٹا پیدا ہو، وہ ایک ”اولی دھوکا“ ہو۔ یعنی وہ ایسا ہو کہ قومی امتحانات میں رٹ ڈال کر اول نمبر پر آئے۔ میرے گھر کے ارد گرد دس ہزار ایکڑ زرخیز زمین ہو۔ گھر کے پہلو میں مچھلیوں کا تالاب ہو۔ باغ میں ہر قسم کے پھلوں کے درخت ہوں، مجھے ایک نہایت خوبصورت بیوی دی جائے اور میرے لئے ماہ پسہ کر کنیزیں ہوں جو سب کی سب مجھ سے وابہ نہ محبت کرتی ہوں، میرے گھر کے کمرے چھت تک سولے اور موتیوں سے بھرے ہوتے ہوں۔ میرے گودام اناج سے بھرے ہوں۔ صندوق دولت سے بھرے ہوں، مجھے شاہی مجلس کے مشیر یا امیر الامرا کا رتبہ حاصل ہو اور میں اسی طرح باعزت اور خوشحال زندگی بسر کرتا ہوں سو برس کی عمر کو پہنچوں۔“ یہ شرائط سننے کے بعد خدا نے جواب دیا:- ”بھائی! اگر زمین پر ایسی زندگی ممکن ہو تو میں خود ہی جا کر یہ زندگی کیوں نہ اختیار کروں۔ تمہیں بھلا ایسی زندگی میں کیوں دینے لگا؟“

**جسم و روح** ہمارے مذہبی رہنما فانی انسان کی خامیوں سے تنگ آکر اور ہماری حیوانی خواہشوں سے اکتا کر بعض دفعہ یہ آواز کرتے ہیں کہ انسان بھی فرشتوں کی طرح ہوتا۔ مگر یہ نہیں سمجھتے کہ فرشتوں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ عام طور

فرشتے کا تصور یہ ہے کہ وہ جسم اور آکاشی نہیں رکھتا، لیکن کیا یہ کوئی بڑی عمدہ بات ہے۔ اگر میں فرشتہ ہو جاؤں تو میں چاہوں گا کہ میرا چہرہ خوشی نہ لہو کیوں کا سا ہو۔ مگر جب تک جلد نہ ہوگی تو خیز لڑکیوں کا سا چہرہ کہاں سے آئے گا اور پھر فرشتہ بن کر بھی تو میں سنگترے کا ٹھنڈا شربت پینا چاہوں گا۔ جب تک پیاس نہ ہوگی۔ اس کا کیا مزہ آئے گا؟ اور اگر بھوک ہو نہ ہو تو کھانے کا کیا مزہ ملے گا؟ آخر ایک فرشتہ رنگوں کے بغیر کیا تصور کر سکتی ہے؟ قلوبِ سادہ کے بغیر کیا کھانے کا؟ اور ناک کے بغیر خوشبو سے کیا لطف اٹھائے گا۔ اور جب کبھی نہ ہوگی تو کھانے میں مزہ بنتا ہے وہ کیسے محسوس کر سکے گا؟ — ایسے سکھ اور ایسے اطمینان پر خدا کا۔

میں سوچتا ہوں کہ کسی بھوت یا فرشتے کے لئے یکتائی بڑی سزا ہے کہ اس کے پاس جسم نہیں۔ وہ کسی ٹھنڈے چٹنے کو دیکھتا ہے، مگر اس میں کودنے کے لئے اس کے پاس پاؤں نہیں۔ اسے پانی کی خوشگوار ٹھنڈک سے کوئی خوشی کی لہر محسوس نہیں ہو سکتی۔ وہ بھوت یا فرشتہ، بھنی مرغانی دیکھے گا مگر اسے چکھنے کے لئے اس کے پاس زبان نہیں ہوگی۔ وہ اسے چبا نہیں سکتا۔ کیونکہ اسے دانت نہیں دے گئے۔ ذرا دیکھئے کتنی المناک بات ہے کہ ہم رو میں بن کر پھر اس دنیا میں آئیں اور اپنے بچوں کے کمرے میں چپ چاپ داخل ہوں۔ اپنے کسی بچے کو مہتر کھیلنے بولے دیکھیں، مگر ہمارے ہاتھ نہیں کہ اسے پیار کر سکیں، بازو نہیں کہ اسے گلے لگا سکیں، ہمارا سینہ نہیں کہ اس کے جسم کی جلیز آس میں سرایت کر سکے، شانے اور گتے کے درمیان کوئی جگہ نہیں کہ اس کا ننھا سا سر وہاں ٹک سکے اور کان بھی نہیں کہ اس کی پیاری آسن سکیں۔

**جسمانی حقیقتیں** پرانے وقتوں کے نازک خیالی فلسفی یہ کہتے تھے کہ انسانی دانت انسانی نہیں بلکہ شیطان ہیں۔ پھر نو افلاطونی آئے انسانی دانتوں کے وجود ہی سے انکار ہی تھے۔ جب میں کسی فلسفی کو دانت کے درد میں تڑپتا دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ کوئی نشاط پسند شاعر جب بدھنمی کے مارے کر اپنے تو بھی عجیب سماں ہوتا ہے۔ میں اس وقت سوچتا ہوں، یہ لوگ ابھی شاعرانہ اور فلسفیانہ موثرانہ فیول ہیں کیوں مشغول نہیں؟ اور اب اپنے سوچے ہوئے کال کو کیوں سہارا ہے ہیں؟ یہ اُسی طرح کیو بے چین ہیں جس طرح اک عام مرد، ایک عام عورت، جو انسانی دانتوں کو حقیقی دانت سمجھتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں، خوشی اور طلب کے تر گانے والا یہ شاعر اب کیوں لوٹ رہا ہے؟ اب وہ ترانے کہاں گئے؟ اسے پیو پتا نہیں تھا کہ انسان کا پیٹ اور اس کی آنتیں بھی حقیقہ رکھتی ہیں؟ اس وقت یہ اپنے پیٹ اور آنتوں کے فعل سے بالکل غافل ہو کر روحانی مسرتوں کے گیت گایا کرتا تھا۔ یہ نفالت کتنی سوزنا شکری ہے!

**ہمارا پیٹ** سادہ لفظوں میں یوں سمجھئے کہ انسان کی دو بڑی خواہشیں، یا حاجتیں کھانا پینا اور عورت ہیں۔ خیر کچھ دلی قسم کے حضرا نے عورت کے بغیر بھی زندگی گزاری ہے، مگر کھانا پینا کسی سے نہیں چھوٹ سکا۔ ایسے ایسے سو فی لوگ اس دنیا میں آئے جنہوں نے ساری زندگی تیاگ اور قربانی میں بسر کر دی۔ مگر کوئی منقہ سے منقہ آدمی بھی چند گھنٹے سے زیادہ کھانے کو بھول نہیں سکا۔ چار پانچ گھنٹے بعد ہمیں ہمیشہ یہ خیال آتا ہے کہ اب کھانا کب ملے گا؟ اور یہ واقعہ دن میں کم سے کم تین بار ضرور ہوتا ہے، یا زیادہ سے ز چار پانچ دفعہ بس یہ ہے اور ہم ہیں! — بڑی بڑی بین الاقوامی کانفرنسیں، بے مدنا رنگ اور دلچسپ سیاسی مسائل پر بحث کرنے کرتے کرتے کے لئے ملتوی ہو جاتی ہیں۔ دنیا جہان کی پارلیمنٹوں کو کھانے کے اوقات کے مطابق اپنے اجلاس طے کرنے پڑتے ہیں۔ اگر کسی یا ملکہ کی تاج پوشی کی رسم پانچ چھ گھنٹے کا طول کچھ جائے اور لوگ دوپہر کا کھانا کھانے لگیں تو اس موقع پوشی کو عوام کے لئے ایک مصیبت قرار جاتا ہے۔ گویا ہمارا سوچ کھانے کے گرد گھومتا ہے۔ چنانچہ جب ہمیں کسی بزرگ کی خدمات کا اعتراف بھی کرنا ہو تو ہم اس کے اعزاز ایک دعوت ملکا دیتے ہیں!!

چینی لوگ کھانے کے معاملہ میں کسی بناوٹ کے قابل نہیں۔ کوئی چینی اگر اچھی کھنی کا ایک چمچ پئے گا تو زور سے چٹنی رانے گا۔ اسکے برعکس مغربی مالک اور بعض دوسرے ملکوں میں بہ بختیری کبھی جائے گی۔ گھر میں سمجھتا ہوں کہ مغربی آداب خوراک (جن کا تقاضا یہ ہے کہ سوپ بغیر آواز پیدا جائے اور کھانا اس طرح کھایا جائے گویا بالکل مزہ نہیں آ رہا) کی وجہ سے مغرب میں اچھا کھانا پکانے کا آرٹ پنپ نہیں سکا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مغربی لوگ کھاتے وقت کیوں اتنی تمیز اور آہستگی سے بولتے ہیں اور میز پر اتنے کم سم، بڑے باقمیز اور بڑے معزز کیوں بنے رہتے ہیں؟ میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے امریکیوں کو یہ خیال نہیں آتا کہ مغربی کی ٹانگ اٹھا کر مڑے سے چبالیں۔ وہ بیچارے اس پر چھری کانٹے سے شعل فرماتے رہتے ہیں اور دل میں سخت تنگ رہتے ہیں۔ اگر کھانا اچھا ہو تو مڑے لے کر نہ کھانا میرے نزدیک سخت جرم ہے۔ جہاں تک سفر و خان کے "آداب" کا تعلق ہے تو میرے نزدیک بچے کو زندگی کی مصیبتوں کا احساس ہی پہلی دفعہ اس وقت ہوتا ہے جب اسے ان کھانے وقت چٹھا لینے سے منع کرتی ہے۔ انسانی نفسیات ہی ایسی ہے کہ اگر اپنی دلی غوطی کا اظہار نہ کیا جائے تو پھر یہ خوشی محسوس بھی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے ہو کر سوخشم، بالیلوہا اور ضعف اعصاب جیسے امراض گھیر لیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں قرضیسیوں کی مثال پر چلنا چاہئے جب بیلرا اچھا کھلت لے کر آتا ہے تو ان کے منہ سے بے اختیار "واہ" نکلتی ہے۔ اور بے پہلا فقرہ منہ میں جاتا ہے تو ان کے دل کا اطمینان اور خوشی ایک لمبی "ہوں" میں بدل جاتی ہے! بھلا کھانے کا مزہ لینے میں شرم کی کیا بات ہے؟ اور اگر کھانے اچھی ہو اور مدہ صحت مند ہو تو اس میں کیا بُرا ہے؟۔۔۔ اسی لئے تو چینی ساری دنیا سے مختلف ہیں۔ ہوسکتا ہے آپ کے نزدیک ان کے کھانے کے آداب اچھے نہ ہوں اور وہ بدتمیز ہوں، مگر وہ دعوتوں اور کھانوں کا لطف ضرور اٹھا سکتے ہیں!

میں سمجھتا ہوں کہ چینی لوگ، بودوں اور حیوانات کا علم اس لئے دیکھ سکے اور نہ اسے ترقی دے سکے کہ کوئی چینی عالم ایک مچھلی کی طرف ٹھنڈے دل سے دیکھ ہی نہیں سکتا۔ مچھلی دیکھ کر اسے فوراً یہ خیال آئے گا کہ اس مچھلی کا مزہ کیسا ہوگا اور پھر اسے خیال آئے گا کہ اسے کھا لینا ہی بہتر ہوگا۔ اسی وجہ سے کبھی کسی چینی سرجن پر اعتماد نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کوئی چینی سرجن میرا گردہ کاٹ کر اس میں سے پتھری نکالنا چاہے تو وہ پتھری کو بدل جائے گا اور فوراً میرا گردہ بھوننا شروع کر دے گا۔ اگر کوئی چینی کسی خاریشت کو دیکھے تو اسے فوراً خیال آئے گا کہ اسکا گوشت اس ترکیب سے پکا کر کھایا جائے کہ اس کا زہر جاتا رہے۔ زہر سے احتیاط کی شرط اس لئے ہے کہ یہی اس کام کا عملی اور اہم پہلو ہے ورنہ اس کام میں کوئی مزہ نہیں۔

خاریشت کے گوشت کا نمبر دوسرا ہے کہ اس کا ذائقہ کیسا ہوگا؟ باقی کی چیزیں چینی کے لئے دلچسپی نہیں رکھتیں۔ مثلاً خاریشت کے خارجیے پیدا ہوتے؟ ان سے خاریشت کیا کام لیتا ہے؟ یہ خارا اس کی کھال میں کیسے پیوست ہیں اور وہ انھیں خطرے کے موقع پر کیسے سیدھا کھڑا کر لیتا ہے؟۔۔۔ وغیرہ۔ یہ سوالات ایک چینی کے نزدیک قطعاً بیکار سوال ہیں۔ یہی حال باقی جانوروں اور پودوں کا ہے۔ چینی کے نزدیک اصل بات یہ ہے کہ ان پودوں اور جانوروں وغیرہ سے کیسے اور کیا فائدہ یا خطا اٹھایا جائے۔ باقی رہا یہ کہ وہ خود کیا ہیں؟ اس سے چینی کو کوئی سروکار نہیں۔ گویا پٹیلیوں کو تو صرف پرندوں کے نفع، بھول کے رنگ، کلیوں کی پنکھڑے اور مرغی کے گوشت سے غرض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مشرق کو مغرب والوں سے بودوں کا علم اور جانوروں کا علم پورے کے پورے یکھنے پڑے ہیں۔ مگر مغرب کو بھی مشرق سے سیکھنا پڑے گا کہ درختوں، پھولوں اور مچھلیوں، پرندوں اور حیوانات سے کیسے خطا اٹھایا جائے، کیسے ان سے لطف اندوز ہوا جائے تاکہ ان انواع و اقسام کے موجودات کے دلائل و خطوط اور حرکات کو مختلف انسانی جذبات اور کیفیات کے ساتھ ہم آہنگ محسوس کیا جاسکے۔

ست پرکاش سنگر کے بارہ حقیقت برداں، بلند پایہ اردو افسانوں کا مجموعہ "آشا و پیکھے نا!" دیدہ زیب سرورق ————— مجلد قیمت دو روپے ————— صفحات ۱۹۲

مکتبہ کردار۔ پرائی کو توالی۔ بمبئی

# مشکلاتِ غالب

(مسلسل از جولائی ۱۹۷۶ء)

## غزل (۶۰)

۱- کیوں جل گیا نہ تائب رنج یار دیکھ کر جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر جلوہٴ محبوب کو دیکھ کر مجھے جل کر خاک ہار جاتا چاہتے تھا، لیکن میری طاقتِ دیدار نے ایسا نہ ہونے دیا اور اب میں اس سے جینے لگا ہوں کہ اس نے کیوں مجھے اس سعادت و شرف سے محروم رکھا۔

۳۳- کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا "نکلتا ہوں تم کو" بے سبب آزار دیکھ کر بے سبب آزار (بغیر کسی سبب کے آزار پہنچانے والا) مفہوم یہ ہے کہ: آبروئے عشق وہیں قائم رہ سکتی ہے جہاں جفا عام نہ ہو بلکہ اس کا خاص مقصد ہو اور صرف اس شخص پر مخصوص ہو، لیکن تم اس کے پابند نہیں اور نا اہل پر بھی جفا کرتے ہو، اس لئے میں تمھاری بے ادب دیکھ کر کچھ خوش نہیں ہوں اور تمھاری طرف سے رکاوٹ کا سامنا ہوتا ہوں۔

## غزل (۶۱)

۲- نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی سفیدی دیدہٴ یعقوب کی بھرتی ہے زنداں پر سفیدی = سے مراد یہاں آنکھ کا درد ہے اور وہ سفیدی یا قلعی بھی جو صفائی کے لئے دیواروں پر پھیری جاتی ہے مفہوم یہ ہے کہ حسن جہاں بھی ہو اپنی خانہ آرائی سے باز نہیں آتا۔ حد یہ ہے کہ یوسف جب زنداں میں پہنچے تو وہاں بھی اس کی آرائش و صفائی کے سلسلہ میں دیدہٴ یعقوب کی سفیدی سے کام لیا۔ چونکہ یعقوب کی نگاہیں ہر وقت یوسف کی تلاش میں رہتی تھیں، اور یوسف بھی اپنے باپ کو بہت یاد کرتے رہتے تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ انھیں زنداں میں بھی اپنے باپ کی غنچہ آنکھوں کا خیال آیا ہوگا اور انھوں نے محسوس کیا ہوگا کہ شاید یعقوب کی آنکھیں مجھے زنداں میں بھی دیکھ رہی ہیں اور اسی کیفیت کو غالب نے زنداں پر دیدہٴ یعقوب کی سفیدی پھرنے سے تعبیر کیا ہے۔

۳۳- فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اس زمانہ سے کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر مفہوم یہ ہے کہ میں اس زمانہ سے درس بیخودی پر فنا ہوں جب مجنوں دیوارِ دبستاں پر لام الف (لا) لکھتا یعنی درس فنا کی

ابتدائی مشق کہا کرتا تھا۔ مدعا یہ کہ بخود ہی کے باب میں مجھوں بہت مشہور ہے لیکن میرے سامنے وہ طفل کتب کی حیثیت رکھتا ہے۔

۵۔ نہیں اتلیم الفت میں کوئی طواری ناز ایسا کو پشت چشم سے جس کے نہ ہو وہ مہر عنوان پر  
 "لوہار" = (دفتر) - پشت چشم = فارسی کا محاورہ ہے "پشت چشم نازک کردی" جس کے معنی ہیں غموہ اور ناز و اداسے  
 کام لینا۔ غالب نے یہاں ناقص محاورہ استعمال کر کے صرف "چشم پشت" لکھ کر یہ مفہوم پیدا کرنا چاہا ہے۔ دوسرے مصرع میں "جس کے" کی بجگہ "اس کے" ہونا چاہئے۔  
 مطلب یہ ہے کہ دنیا سے محبت میں کوئی دفتر ناز ایسا نہیں ہے جس پر اس کی (یعنی محبوب) کی "چشم پشت" سے مہر تو شوق و الفت نہ  
 کر دی ہو۔ (چشم پشت کی مشابہت مہر سے ظاہر ہے)

۶۔ بجز پردہ شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا قیامت اک ہوا سے تند ہے خاک شہیدان پر  
 چونکہ جاننا دکان محبت کا وجود پردہ شوق ناز کے سراپ کچھ نہیں ہے اس لئے اگر قیامت آئی بھی تو کیا؟ اس کی حیثیت صرف اک  
 ہوا سے تند کی ہوگی جو شہیدان محبت کی خاک کو اڑا لے جائے۔

### غزل نمبر ۶۲ و ۶۳ صاف ہیں

### غزل (۶۴)

۱۔ جنوں کی دستگیری کس سے ہوگر ہو نہ قربانی گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر  
 مفہوم یہ ہے کہ جنوں کی دستگیری یا اس کا اظہار صرف قربانی سے ہو سکتا ہے اور چونکہ میری گریباں چاک ہی نے مجھے عریاں کر کے  
 یہ جنوں کی دستگیری کی ہے۔ اس لئے میں اس کا شکر گزار ہوں۔

۲۔ بزرگ کاغذ آتش زدہ، نیرنگ بیتابی ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالی یک تپیدن پر  
 نیرنگ بیتابی، فاعل ہے "باندھے ہے" کا۔  
 مفہوم یہ ہے کہ جلع ہوئے کاغذ کی طرح، میرا نیرنگ بیتابی بھی بالی یک تپیدن پر ہزاروں آئینہ ہائے دل رکھتا ہے۔  
 یعنی جس طرح جلع ہوئے کاغذ کے حروف و نقاط چمکنے لگتے ہیں، اسی طرح میرے بالی یک تپیدن پر ہزاروں آئینہ ہائے دل نمودار ہو گئے  
 ہیں۔ اس شعر میں غالب نے خود تپیدن یا تپش کو بالی و پر قرار دیا ہے۔

۳۔ ہم اور وہ ہے سب رنج آشنا دشمن رکھتا ہے شاعر مہر سے تہمت لگ کر چشم روزن پر  
 ہے سب رنج = (بیکسی سب کے رنجیرہ ہو جائے والا) "آشنا دشمن" (دوستوں کا دشمن)  
 مفہوم یہ ہے کہ ایسے زور رنج اور بدگمانی محبوب سے ہمارا واسطہ پڑا ہے کہ روزن دیوار سے سورج کی کرن آتی ہے تو اسے  
 بھی وہ تارنگہ سمجھ کر ہم ہو جاتا ہے۔

۵۔ فنا کو سوچنا اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلشن پر  
مفہوم یہ ہے کہ اگر تو اپنی حقیقت سمجھنے کا شائق ہے تو خاشاک کی طرح آگ میں جل جا، یعنی جس طرح خاشاک کی انتہائی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ نذر آتش ہو جائے اسی طرح انسان اگر اپنی حقیقت کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کی کوشش یہ ہونا چاہئے کہ وہ جلوہ محبوب یا جلوہ خداوندی پر اپنے آپ کو فنا کر دے۔

### غزل نمبر ۶۵ و ۶۶ صاف ہیں

#### غزل (۶۵)

۲۔ ہے نازِ مفلساں، زباز دست رفتہ پر ہوں گل فروشِ شوخی داغ کہن ہنوز  
جس طرح ہاتھ سے نکلی ہوئی دولت پر مفلس فخر کرتا ہے، اسی طرح میں بھی اپنے داغناے دل کے پھولوں پر فخر کرتا ہوں۔

۳۔ مے خانہ جگر میں، یہاں خاک بھی نہیں خمیازہ کھینچے ہے بتِ بیداد فن ہنوز  
”خمیازہ“ انگڑائی کو کہتے ہیں۔ نشہ جب اُترتا ہے تو انسان جمہائی اور انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔ اس چیز کو سامنے رکھ کر غالب کہتا ہے کہ یہاں تو یہ حال ہے کہ مے خانہ جگر میں شراب (یعنی خون) کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں اور وہاں بتِ بیداد فن انگڑائی لے رہا ہے اور مزید شراب طلب کرتا ہے۔ مدعا یہ کہ خون جگر سب کا سب ختم ہو چکا اور اب ایک قطرہ خون بھی باقی نہیں کہ نذر محبوب کیا جائے۔

#### غزل (۶۸)

۱۔ حرفِ مطلب مشکل نہیں فسونِ نیاز دُعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز  
”حرفِ مطلب مشکل نہ ہونا“ کسی مطلب مشکل کو پورا نہ کر سکتا۔ مفہوم یہ ہے کہ اپنی نیاز مندوں سے کوئی ایسا کام تو نکلتا نہیں جو دشوار ہو، اس لئے اب آؤ یہی دُعا کریں کہ ”عمرِ خضر“ دراز ہو۔ یعنی ایسی چیز طلب کریں جو پہلے ہی دیجا چکی ہے۔

۲۔ نہ ہو بہ ہرزہ بہا باں نورِ دہم وجود ہنوز تیرے تصور میں ہیں نشیب و فراز  
بہ ہرزہ (بیکار)۔ مفہوم یہ ہے کہ مسئلہ وجود میں خواہ مخواہ فکر و قیاس سے کام نہ لے کیونکہ اس باب میں تیرا ہر تصور نشیب و فراز سے خالی نہیں اور تو اس کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔

۳۔ وصال، جلوہ تماشا ہے پرواغ کہاں کہ دیکھے آئینہ انتظار کو پرواز،  
جلوہ تماشا (جلوہ حسن کا تماشہ دکھانے والا)۔ پرواز (صیقل)۔ وصال دوست، اس میں شک نہیں کہ جلوہ حسن کا تماشہ ہو لیکن یہ طاقت کہاں کہ اس کے لئے آئینہ انتظار کی صیقل کیا کروں۔ یعنی وصال اپنی جگہ بہت پر لطف چیز ہے لیکن اس کا انتظار کون کرے۔

## غزل (۶۹)

- ۱- وسعت سعی کرم دیکھ کہ سرتا سرخاک گزرے ہے آبد پا ابر گہر بار ہنوز  
سرتا سرخاک (تمام روئے زمین پر) - آبر کو قطرات باراں کی وجہ سے آبد پا کہا ہے -  
مفہوم یہ ہے کہ: بخشش و کرم کی وسعت دیکھنا ہو تو ابر کو دیکھو کہ ابر باوجود آبد پا ہونے کے وہ اپنی گہر باری ترک نہیں کرتا۔
- ۲- یک قلم کاغذ آتش زدہ ہے، سفیہ دشت نقش پا میں ہے تپ گرمی رفتار ہنوز  
یک قلم دیکس (مفہوم یہ ہے کہ میرے نقش قدم میں گرمی رفتار کی تپش اب بھی اتنی باقی ہے کہ اس نے صحرا کو کاغذ  
کی طرح جلا کر رکھ دیا۔

غزل نمبر ۷۰ صاف ہے

## غزل (۷۱)

- ۱- نکل نغمہ بول نہ پردہ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز  
نکل نغمہ سے مراد نغمہ طلب ہے - پردہ ساز = ساز کے پردے جن سے نغمہ پیدا ہوتا ہے -
- ۳- لاف تلکین، فریب سادہ دلی ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز  
لاف = (شیخی) - تلکین = (صبر و ضبط) -  
اگر ہم اپنے صبر و ضبط پر فخر کریں تو یہ ہماری سادہ دلی یا نا آگہی کا فریب ہوگا، کیونکہ ہمارے سینہ میں تو ایسے راز چھپے ہوئے ہیں جو  
خود سینہ کو توڑ کر باہر آ جانے والے ہیں اس لئے اگر ہم صبر و ضبط کا دعویٰ کریں تو یہ ہماری حماقت ہوگی -
- ۵- اے ترا غمزہ یک قلم انگیز اے ترا ظلم سرسبز انداز  
انگیز (نہایت دلکش ادائے) - مفہوم یہ ہے کہ تیرا غمزہ دانا اور تیرا ظلم سب ایک ہی چیز ہیں، اس لئے ان کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے -

غزل نمبر ۷۲ صاف ہے

## غزل (۷۳)

- ۱- نہ یوں گرخس جو ہر طراوت سبزہ خط سے لگا دے خاند آئینہ میں روئے نگار آتش  
اس شعر کی بنیاد صوفیہ پر قائم ہے جس میں طراوت یا ثروت و تازگی پائی جاتی ہے - سبزہ خط سے مراد معشوق کا سبزہ خط ہے -

جو ہر کوئی اس لئے کہا کہ اس میں حس کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ روئے نگار کی تابش و گرمی کا یہ عالم ہے کہ اگر آئینہ دیکھتے وقت اس کا سبزہ خط جو ہر آئینہ کو طراوت نہ پہنچائے تو جل کر رہ جائے۔

۲۔ فروغ حسن سے ہوتی ہے حل مشکل عاشق      نہ نیکے شمع کے پاسے نکالے نہ گر خار آتش  
دوسرے مصرعے میں خار سے مراد وہ دھاگہ یا تپتی ہے جس کے جلنے سے شمع روشن ہوتی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ جس طرح اپنے شمع (یعنی خود شمع) کا خار آگ ہی سے نکلتا ہے، اسی طرح فروغ حسن ہی سے عاشق کی مشکل حل ہو سکتی ہے۔

## غزل (۴۷)

۱۔ رخ نگار سے ہے سوزِ جادو دانی شمع،      ہوئی ہے آتش گلِ آبِ زندگانی شمع،  
”آتش گل“ سے مراد رخ نگار ہے۔ معشوق کے چہرہ کو دیکھ کر شمع از راہِ رشک سوزِ دائمی میں مبتلا ہے۔ گویا شمع کی زندگانی کا سبب محض آتش گل ہے۔ یعنی اگر رخ نگار نہ ہوتا تو شمع دائمی سوز میں مبتلا نہ ہوتی۔

۲۔ کرے ہے صرت بہ ایمائے شعلہ، قصہ تمام      بطرِ اہلِ فنا ہے، فنا نہ خودانی مشیر،  
جس طرح اہلِ فنا (اہلِ عشق) خود اپنی آتشِ محبت میں حل کر ختم ہو جاتے ہیں، اسی طرح شمع کی زندگی بھی خود اسی کے شعلہ کے نذر ہو جاتی ہے۔

۳۔ غم اس کو حسرت پر روانہ کا ہے اے شعلہ      ترے لرزے سے ظاہر ہے ناتوانی شمع  
شمع کی دہر وقت لرزتی کا پتہ دہتی ہے۔ غالب، اس کی تاویل یہ کرتا ہے کہ اس کی لوکی لرزش گویا ناتوانی شمع کو ظاہر کرتی ہے۔ اور اس ناتوانی کا سبب یہ غم ہے کہ حسرت پر روانہ کو وہ کما حقہ پرانہ کر سکی۔

۵۔ ترے خیال سے روح اہتر از کرتی ہے      بہ جلوہ ریزی باد و بہ پرفشانی شمع  
دوسرے مصرعے میں ”بہ“ بے قسمیہ ہے۔ جلوہ ریزی باد (ہوا کا چلنا) - اہتر از (جھومنا) - پرفشانی شمع (شمع کی لوکی تھر تھراہٹ)  
مفہوم یہ ہے کہ تیرے خیال سے میری روح میں بھی وہی لرزشِ مسرت و احساس پیدا ہوتی ہے جو ہوا اور شمع کی لو میں پائی جاتی ہے

۶۔ نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ      شگفتگی ہے شہسبِ گلِ خزانِ شمع،  
داغِ غمِ عشق سے جو مسرت مجھے حاصل ہے اس کا حال نہ پوچھو، بس یوں سمجھ لو کہ شمع کے گلِ خزاں دیدہ پر بہارِ قربان ہو رہی ہے  
داغِ غمِ عشق کی تعبیر ”گلِ خزانِ شمع“ سے کی گئی ہے۔ اور شمع کی ”گلِ خزاں دیدہ“ سے۔

## غزل (۸۰)

۱۔ ہے کس قدر ہلاک فریبِ وفا سائے گل  
مبیکل کے کار و بار پہ ہیں خندہ ہائے گل  
مبیکل اس خیال پہ مٹی ہوئی ہے کہ بھول اس سے وفا کریں گے اور بھول اس کی اس سادہ دلی پیر نہیں رہے ہیں۔

۲۔ آزادی نسیم مبارک کہ ہر طرف ، ٹوٹے پڑے ہیں حلقہٴ دام ہوائے گل  
غالب کا یہ شعر تو بہت صاف معنوم ہوتا ہے، لیکن مفہوم کے لحاظ سے کافی مبہم ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ آزادی نسیم کی مبارک دس کو دی جا رہی ہے، خود نسیم کو یا کسی اور کو، شعر کے الفاظ سے نسیم کے سوا کسی اور کی طرف خیال نہیں جاتا اس لئے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ نسیم ہی کو اس کی آزادی کی مبارک بادی جاتی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں غور طلب امر یہ ہے کہ اس سے پہلے اس کی آزادی میں کوئی چیز حائل تھی۔

دوسرے مصرعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ”حلقہٴ دام ہوائے گل“ میں پھنسی ہوئی تھی اور اب ان حلقوں کے ٹوٹ جانے سے آزاد ہو گئی ہے۔ لیکن ”ہوائے گل“ کیا اور اس کا ”حلقہٴ دام“ کیا ہے۔ ہوا علاوہ خواہش و آرزو کے فتنائے معنی میں بھی متعلیٰ ہے اور غالباً غالب نے اسی معنی میں اس کا استعمال کیا ہے۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ فتنائے گل یا فتنائے بہار گویا نسیم کے لئے حلقہٴ دام تھی کہ وہ اس سے ہٹ کر کہیں اور نہ جاسکتی تھی، لیکن اب کہ بہار ختم ہو گئی ہے اور اس کے حلقہٴ ہائے دام ٹوٹ گئے ہیں، نسیم آزاد ہے جہاں چاہے جائے اور اسی آزادی پر اس کو مبارکباد دی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجئے کہ جب بہار کا وجود ہی ہمارے سامنے ختم ہو گیا تو ہم بونے گل کے لئے آرزوئے نسیم کیوں کریں۔

۳۔ جو تھا موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا اے وائے نالہ لبِ خونیں فزائے گل  
”موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا“ یعنی موجِ رنگ پر فریفتہ ہو گیا۔ گل کو ”لبِ خونیں فزا“ فرض کر کے افسوس ظاہر کیا ہے کہ دنیا بھی کتنی حقیقت ناشناس ہے کہ وہ بھول کو موجِ رنگ سمجھ کر اس سے خوش ہوتی ہے، حالانکہ وہ دراصل لبِ خونیں فزا ہے جس پر اظہارِ غم کرنا چاہئے۔

۴۔ ایسا دگرتی ہے اسے تیرے لئے بہار میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل  
نفسِ عطر سائے گل (بھول کی عطریت و خوشبو)۔ میرا رقیب ہے کہ وہ تجھ تک پہنچتا ہے اور میں نہیں پہنچ سکتا۔

۵۔ شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے مینائے بے شراب و دل بے ہوائے گل  
میری مینا جو شراب سے خالی ہے اور میرا دل جو خواہش گل سے آزاد ہے، یہ دونوں مجھے بادِ بہار سے شرمندہ رکھتے ہیں۔ یعنی جب شراب اور ہوائے سیر گل دونوں میرے نہیں تو پھر موسمِ بہار کا کیا لطف۔

۶۔ سطوت سے تیرے جلوہٴ حسنِ غیور کی نوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادا سائے گل  
چونکہ تیرے حسنِ غیور پر نہیں چاہتا کہ میں کسی اور پر نگاہ ڈالوں، اس لئے میں رنگِ گل کو بھی غور ہی سمجھتا ہوں اور اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

## غزل (۸۱)

- ۱- غم نہیں آزادی کو بیش از یک نفس، برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم  
”بیش از نفس“ (ایک لمحہ سے زیادہ) -  
وہ لوگ جو آزادہ رو ہیں وہ اگر کسی بات کا غم کرتے بھی ہیں تو اس کی مدت دم بھر سے زیادہ نہیں ہوتی - اس لئے اگر ہم کہیں  
کہ اپنے ماتم خانہ کی شمع ہم برق سے روشن کرتے ہیں (جس کا دم بھر سے زیادہ قیام نہیں) تو ہمارا یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔
- ۲- محفلیں برجم کرے ہے گنجفہ باز خیال میں ودق گردانی نیرنگ یک بت خانہ ہم  
جس طرح گنجفہ کھیلنے والا پتوں کو الٹا پلٹا رہتا ہے، اسی طرح ہم اپنے تصور و خیال میں پچھلی صحنوں کے اوراق (جو اپنے  
تنوع کے لحاظ سے نیرنگ بت خانہ کی حیثیت رکھتے ہیں) الٹے پلٹے رہتے ہیں۔
- ۳- باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں ہیں چراغانِ شبستانِ دل پروانہ ہم  
یک جہاں ہنگامہ (بہت زیادہ ہنگامہ) - باوجودیکہ ہماری ہستی ہنگامہ ہی ہنگامہ ہے، لیکن وہ ایسی ہی ناپائدار ہے جیسے  
پروانہ کا جل کر ایک لمحہ لئے اپنے شبستانِ دل کو روشن کر لینا۔
- ۴- ضعف سے ہے قناعت سے یہ ترکِ جستجو، ہیں وہاں تکیہ کا دہمتِ مردانہ ہم  
ہماری ترکِ جستجو کا سبب قناعت نہیں بلکہ ہماری ضعف و کمزوری ہے جس پر ہماری ہمتِ مردانہ کو کوئی جھوٹ نہیں۔ دعایہ کہ  
وہ لوگ جو ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ جاتے ہیں دراصل ہٹے کم ہمت لوگ ہیں اور اپنی اس کمزوری کو چھپانے لئے اس کو ”قناعت“  
سے تعبیر کرتے ہیں۔

غزل نمبر ۸۲ - ۸۳ - ۸۴ - ۸۵ - ۸۶ صاف ہیں

## غزل (۸۵)

- ۴- کہا کہوں تاریکی زندانِ غم، اندھیر ہے پنہ، نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں  
میرا زندانِ غم اتنا تاریک ہے کہ اگر اس کے روزن میں روشنی رکھ دی جائے تو وہ بھی نورِ صبح معلوم ہوگی۔  
قاعدہ ہے کہ تاریکی جب بہت زیادہ ہوتی ہے تو اس میں ستھوری سی سفیدی بہت نمایاں ہو جاتی ہے۔

غزل نمبر ۸۸ - ۸۹ - ۹۰ - ۹۱ صاف ہیں

## غزل (۹۲)

۲- شوق اس دشت میں دوڑا ہے مجھ کو کہ جہاں جادہ غیر از نگہ دیدہ تصویر نہیں  
میرا شوقِ جنوں مجھے ایسے صحرا میں لے گیا ہے، جہاں جادہ (راستہ) ایسا ہی معدوم ہے جیسے دیدہ تصویر میں نگاہ معدوم ہوتی ہے۔

۳- حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے جادہ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں  
آزارِ محبت میں جو لطف و مزہ ہے اس کو دیکھ کر یہ جی چاہتا ہے کہ یہ لذتِ آزار دیر تک قائم رہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ راہِ وفا تلوار کی دھار پر قائم ہے (یعنی راہِ وفا میں اول قدم ہی پر جان دینا پڑتی ہے) اور اس طرح دیر تک لذتِ آزار حاصل کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔

۴- رنجِ فوسیدیِ جاوید گوارا رہیو خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں  
اگر نالہ تاثیر کا منت کش نہیں تو میں خوش ہوں، کیونکہ اس طرح اک دائمی ناامیدی کے رنج میں مبتلا ہو جاؤں گا اور اسے گوارا کرنا پڑے گا۔

غزل نمبر ۹۳ و ۹۴ صاف ہیں

## غزل (۹۵)

۱- عشقِ تاثیر سے فوسید نہیں، جانسپاریِ شجرِ بید نہیں،  
عشقِ تاثیر سے ناامید نہیں ہے۔ کیونکہ کسی پر جان دینا کوئی بید کا درخت نہیں جو پہل نہیں لاتا۔

## غزل (۹۶)

۵- سراغِ تعبِ نالہ سے داغِ دل سے کہ شبِ رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں  
شبِ رو (چہرہ یا قزاق جو عموماً رات ہی کے وقت نکلتے ہیں) جس طرح شبِ رو کے نقشِ قدم سے اس کا سراغ لگایا جاتا ہے، اسی طرح میرے نالہ کی گرمی کا پتہ میرے داغِ دل سے چل سکتا ہے۔ یعنی اگر میرے نالہ میں اتنی گرمی ہے تو حیرت کی کہانیاں ہیں۔ داغِ دل بھی تو اتنا ہی گرم ہے۔

## غزل (۹۷)

۶- جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا ہے، کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کیابی  
جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا ہے، درست نہیں کیونکہ جب محبوب سرت سے اسکا قایل نہیں ہیں۔  
میرے منکرِ وفا کے دوستِ غیب کے اوجائے فنا پر فریب میں مبتلا ہو گیا ہے، درست نہیں کیونکہ جب محبوب سرت سے اسکا قایل نہیں ہیں۔  
میرے منکرِ وفا کے دوستِ غیب کے اوجائے فنا پر فریب میں مبتلا ہو گیا ہے، درست نہیں کیونکہ جب محبوب سرت سے اسکا قایل نہیں ہیں۔

# باب المرسلہ والمنظرہ

## بہائی مسلک

(مولانا محفوظ الحق علمی - سیالکوٹ)

جناب محترم علامہ نیاز فتحپوری — علیکم التحيات

ابتداء سے جناب کے شاندار علمی کارناموں کو دیکھ رہا ہوں اور قدر کرتا ہوں۔ جناب نے خادم کے متعلق جو الفاظ ”شکار“ میں ارشاد فرمائے ہیں، ان کے لئے ممنون و مشکور ہوں۔

ریویو جو کتاب ”قیامت“ پر تحریر فرمایا ہے۔ اس کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، لیکن اننا کہنے کی اس بات دیکھو کہ یہ ریویو آپ کی عالمانہ شان کے شایان شان نہیں ہوا۔ مجھے اس سے مفصل اور مدلل ریویو کی توقع تھی۔  
”شکار“ کے ایک فقرے سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ بہائی بھی مسلمانوں کا کوئی فرقہ ہیں۔ منتقل دین و کتاب کے دعویٰ میں کچھ متزلزل ذہنیت رکھتے ہیں، اس غلطی کا ازالہ فرمائیے۔ ایک نوٹ بعنوان ”بہائی مسلک“ ارسال ہے۔ ”شکار“ میں شایع فرما کر مرحوم منت فرمائیے۔

”بہائی مسلک“ (مولانا محفوظ الحق علمی)

مجلد ”شکار“ اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۲۴ پر ”کتاب قیامت“ کا ریویو کرتے ہوئے محترم ریویو نگار نے حسب ذیل فقرہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ اگر وہ (اہل بہاء) صاف صاف یہ کہیں کہ قرآن و محمد اپنے زمانہ کے لئے بہت کم تھے۔ اور اس وقت دنیا کو دوسرے قرآن و محمد کی ضرورت تھے تو شاید ان کی دشواریاں بہت کم ہو جائیں۔

اس فقرے سے غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے۔ کیونکہ اہل بہاء روز اول سے یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ ہر کتاب کا ایک وقت ہوتا ہے یا ہر وقت کے لئے ایک کتاب ہوتی ہے۔ ”کل اہل کتاب“ اس اصول سے جیسے قرآن کے ماننے والے تورات و انجیل کو ماننے والے تھے ان کے وقت کو ختم سمجھتے ہیں اور ان کے بعد قرآن کا زمانہ تسلیم کرتے ہیں اسی طرح اہل بہاء قرآن کے دور کو ختم سمجھتے ہیں اور اب ”کتاب اقدس“ کو عصر حاضر کے لئے آسمانی کتاب تسلیم کرتے ہیں وہ ایک مستقل دین کے تابع ہیں۔ اپنے آپ کو یہودیوں، عیسائیوں یا مسلمانوں کا کوئی فرقہ نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں خدا کے دین میں فرقہ نہیں ہوتے۔ ہاں وہ دین کو ایک سلسلہ زندہ تحریک الہی جانتے ہیں اسی سلسلہ میں ویدک دھرم - دین زردشت - دین موسوی - دین عیسوی - دین محمدی کو ایک ہی زنجیر کے حلقے سمجھتے ہیں اور ان تمام مذاہب میں جو فرقے اور تفرقے ہوئے انھیں لوگوں کی غلطی قرار دیتے ہیں۔

یہ بات نہیں کہ اہل بہاء اس بارے میں کوئی متزلزل ذہنیت رکھتے ہوں۔ قطعاً نہیں۔ وہ صاف صاف نئی کتاب اور نئے پیغمبر اور مستقل دین جدید کا اعلان کرتے ہیں تمام دنیا کے بہائی خواہ وہ دیگر اقوام میں سے آئے ہوں یا مسلمانوں میں سے۔ یہی کہتے ہیں کہ

وہ ایک نئی امت ہیں۔ کسی گزشتہ دین کا فرقہ نہیں۔ گزشتہ دنوں پاکستان کے بہائیوں نے علانیہ طور پر حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ انہیں مستقل دین کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ وہ مسلمانوں کا فرقہ نہیں ہیں۔ وہ حضرت بہاؤ اللہ کو مستقل صاحبِ کتاب و پیغمبر مبین کہتے ہیں، حضرت بہاؤ اللہ کی تمام کتب و الواح میں یہی بیانات تشریح سے موجود ہیں جس میں ایک لمحہ کے لئے ایک بہائی بچے کی ذہنیت بھی متزلزل نہیں ہے اور نہیں ہو سکتی۔ ایسے واضح امر کے متعلق متزلزل ذہنیت کا ذکر علمی دنیا میں قابلِ افسوس ہے۔ اس لئے چند فقرے اور بھی عرض ہیں کہ بہائی باوجودیکہ کتب سابقہ اور قرآن مجید کو حق سمجھتے ہیں لیکن صاف صاف کہتے ہیں کہ شریعت قرآن منسوخ ہو گئی ہے اور اب نئی شریعت کا دور ہے معاشرتی پہلو سے شریعت بہائی میں مومن وغیر مومن کی تفریق نہیں ہر قوم و ملت کے ساتھ رشتہ ناتہ کرنا جائز ہے۔ تمام حقوق بشری میں مساوات ہے۔ کسی قوم پر جزیہ نہیں۔ کسی سے جہاد بالسیف نہیں۔ محبت و دلیل سے تبلیغ ہے۔ نماز پانچ وقت نہیں، ماہ رمضان کے روزے نہیں۔ تعدد ازواج نہیں۔ سود کی حرمت نہیں۔ تعلیم و تربیت فرض قطعی ہے۔ گداگری حرام ہے۔ عورت مرد کے حقوق احترام زندگی برابر میں غلامی و بردہ فروشی ممنوع ہے۔ مذہبی۔ ملی۔ وطنی۔ سیاسی۔ لسانی اور رنگ و نسل کے تعصبات متروک و ممنوع ہیں، عالمگیر اخوت انسانی کا مفصل نظام ہے۔ بین الاقوامی امن و صلح کے مسائل و احکام ہیں۔ جنہیں صحیح تمام اہل بصیرت پسند فرما رہے ہیں اور حضرت عالم اسی طرف کھینچی چلی آرہی ہے۔ انہیں مؤخر الذکر اصول پر نظر رکھتے ہوئے ہمارے محترم علامہ نیاز بھی تحریر فرماتے ہیں کہ، ”ہم بہائی مسلک کے بلند اخلاقی اصول کے قابل ہیں اور ان کے جذبہ انسانی پرستی کی تعریف کرتے ہیں“ انصاف زندہ باد۔ بصیرت زندہ باد۔

(منگرا) کتاب ”قیامت“ پر تبصرہ کرتے وقت میں اس حقیقت سے بے خبر نہ تھا کہ اہل بہاؤ کا مسلک عام مسلمانوں کے مسلک سے جدا ہے، لیکن اس سے یقیناً حادث تھا کہ آپ تعلیم قرآنی و ہدایات رسول کو اس حد تک تقسیم یارینہ سمجھتے ہیں کہ اس احترام و باؤ کا اعلان بھی اپنے مسلک کا ضروری جزو خیال کرتے ہیں (جیسا کہ آپ کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے) میں ایسا کیوں سمجھتا تھا اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ بہائی مسلک کا پس منظر جغرافیہ، تاریخ، مذہب اور ثقافت ہر حیثیت سے دی ہے جو عام مسلمانوں کا ہے، اور دوسرے یہ کہ بہائی مبلغین نے باوجود اس کے کہ وہ قرآن سے اپنے آپ کو بالکل بے نیاز سمجھتے ہیں، اپنی تحریروں میں قرآن کا ذکر بھی برابر بار بار کیا ہے، یہاں تک کہ آپ نے بھی اپنی کتاب قیامت میں اپنے مسلک کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے آیات قرآنی کی تاویل کرنا ضروری خیال کیا۔ حالانکہ یہ بات صحیحی سمجھنا نہیں آتی کہ جب آپ قرآن کو ایک منسوخ شدہ غیر ضروری کتاب سمجھتے ہیں تو پھر آپ کیوں اس کا ذکر کریں۔ آپ اس کا احترام کریں یا نہ کریں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے جو ”محمد و قرآن“ سے بے تعلق ہو جانے کے باوجود آپ کو اس سے پوری طرح بے تعلق ہونے نہیں دیتی اور اس کا تعلق بہائی مسلک کے تخلیقی پس منظر سے ہے۔

میں اس سلسلہ میں آپ کے مسلک کی تاریخ یا اس کے عقائد پر کوئی تفصیلی اظہار خیال نہیں کرنا چاہتا، لیکن یہ قلمائے کے لئے کہ آپ کے دل سے اسلام کی پھانسی کیوں وری طرح نہیں نکل سکتی، مختصر اُچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس سے غالباً آپ کو انکار نہ ہوگا کہ دنیا کا کوئی مسلک و مذہب ایسا نہیں ہے جو اپنے پس منظر سے متاثر نہ ہو اور بہائی کا تمام پس منظر ہر حیثیت سے اسلامی تھا۔ مجھ اس کی صراحت اس جگہ غالباً بے عمل نہ ہوگی۔

۱۔ علی محمد شیری خود سادات حسین میں سے تھے اور اپنے عقائد کے لحاظ سے امامیہ بلکہ اسماعیلیہ تھے، چنانچہ ان کا مرکزی عقائد میں کی تبلیغ انہوں نے کی یہ تھا کہ مستقبل قریب میں ”مہدی مستور“ ظاہر ہوں گے اور ان سے مستفیض ہونے کے لئے کسی ”واسطۃ العقد“ (درمہائی واسطہ) کی ضرورت ہے اور وہ واسطہ ”میں ہوں“۔ پھر چونکہ اسماعیلیہ مسلک میں

روحانی مرشد کو باب کے لقب سے یاد کرتے تھے، اس نے مرزا علی محمد نے بھی اپنا لقب باب اختیار کر لیا اور پھر (بقول بعض) ”مہدی موعود“ کا۔

۲۔ جس وقت باب نے اپنی دعوت شروع کی اس وقت میرزا حسین علی (بہاؤ اللہ) بہائی مسلک کے مورث اعلیٰ کی عمر ۲۷ سال کی تھی، چونکہ آپ کا وقت اکثر مجالس علماء میں بسر ہوتا تھا اس لئے رفتہ رفتہ آپ کے اندر تعصب دینی کی مخالفت کا خیال پیدا ہوا اور انھوں نے ملا عبد الکریم قزوینی کی وساطت سے باب کا فیضان طلب کیا اور مخفی طور پر بابی مسلک کی تبلیغ کرنے لگے۔ جب ۱۲۶۳ھ میں باب اور ان کے ساتھی قتل کر دیے گئے تو میرزا بہاؤ اللہ نے کھلم کھلا تبلیغ شروع کر دی اور ”مہدی موعود“ کی حیثیت اختیار کر لی۔

۳۔ باب نے تخلیق عالم کا تعلق سات خداوندی صفات سے ظاہر کیا، قدہ - قضا - ارادہ - مشیت - اذن - اصل - کتاب - جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صوفیہ و حکماء اسلام کے خیالات سے کتنے متاثر تھے۔ انھوں نے شریعت اسلامی میں بھی بہت تبدیلیاں کیں جن کا تعلق دین و دنیا دونوں سے تھا۔

بہاؤ اللہ کی تعلیمات بھی قریب قریب وہی تھیں جو باب کی لیکن زیادہ وسیع و ترقی یافتہ صورت میں۔

باب اور بہاؤ اللہ دونوں کے آباد اجداد امامیہ مسلک کے پیرو تھے اور اکابر ایران میں ان کا شمار ہوتا تھا، ان کے تمام تبلیغی ارشادات اسی زبان میں پائے جاتے ہیں جو اس وقت مسلم آبادی کی زبان تھی اور جسے آج بھی اکثر مسلمان سمجھ سکتے ہیں۔

ان دونوں حضرات کی معاشرت و ثقافت وہی تھی جو اس وقت ایران کے اچھے مسلم گھروں میں پائی جاتی تھی۔ ان دونوں کی ابتدائی تعلیم بھی بالکل اسی سطح سے ہوئی جو اس وقت مسلمانوں میں رائج تھی اور انھوں نے اپنی تبلیغ کی کامیابی کا انحصار بھی مہدی موعود کے عقیدہ پر رکھا جو امامیہ عقیدہ تھا۔

اس میں شک نہیں انھوں نے نماز، روزہ، زکوٰۃ، نکاح و طلاق وغیرہ بہت سے معاشرتی مسائل میں اپنی ایک الگ راہ نکالی، لیکن وہ ان شعائر و اصطلاحات کو ترک نہ کر سکے۔ وہ نماز بھی پڑھتے ہیں گو پانچ وقت کی نہ ہو، وہ روزہ بھی رکھتے ہیں خواہ ۹ دن ہی کا ہو۔

الغرض ان کی شریعت کی بنیاد شریعت اسلامی ہی پر قائم ہوئی اور بہائی مذہب کا مزاج بھی اسلامی مزاج ہی رہا خواہ انھوں نے مروجہ شریعت اسلامی میں کتنی ہی تبدیلیاں کیوں نہ کی ہوں۔ یہی وہ چیز ہے جس کے پیش نظر میں نے کہا تھا کہ اسلام کی پیمائش کیوں بہائیوں کے دل سے نہیں نکلتی اور وہ کیوں اپنے لہجہ میں قرآن و محمد کے نقوش دلوں سے مٹانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

رہا یہ امر کہ بہائی مسلک والے اب قرآن کو فحش سمجھ کر ”کتاب اقدس“ کو دوسری اہامی کتاب اور رسول کی بجائے حضرت بہاؤ اللہ کو وقت حاضر کا دوسرا پیغمبر تسلیم کرتے ہیں، سو اس کے متعلق میں صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ چونکہ آپ ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے الگ الگ کتاب اور پیغمبر کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ بہائی مسلک اور کتاب اقدس بھی کوئی دریا چیز نہیں ہے اور ایک ایسے مسلک کی تبلیغ جس کو خود اس کے ماننے والے استقامت پذیر نہیں کر سکتے، مذہبی نقطہ نظر سے کس حد تک مفید ہو سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس مسلک کے اصول بڑی حد تک انسانیت پر مبنی ہیں، لیکن خود مذہب، انسانی نہیں ہے یعنی جس طرح دیگر مذاہب میں پیغمبروں اور اہمائی کتابوں کا تسلیم کرنا ضروری ہے، اسی طرح بہائی مسلک

میں بہادار اللہ کو پیغمبر اور کتاب اقدس کو الہامی کتاب ماننا ضروری شرط ہے۔

بہادار اللہ کو مذہب اسلام کا مصلح و ریفارمر ماننا تو ٹھیک ہے بشرط آنکہ انھیں مامور من اللہ سمجھ کر صرف ایک مفکر انسان کی حیثیت سے پیش کیا جائے اور ان کی کتاب اقدس کو وحی و الہام سے قطع نظر اخلاقی تعلیم کی ایک انسانی تصنیف قرار دیا جائے۔

اب زمانہ "الہام و وحی" کا نہیں اور نہ اس نوع کا دعویٰ مفید یقین ہو سکتا ہے، اس لئے اگر بہائی اپنے مسلک سے اس مذہبی رنگ کو علیحدہ کر کے اس کو صرف بلندی اخلاق و کردار کی تعلیم تک محدود رکھیں تو ان کا احاطہ عمل بہت وسیع ہو سکتا ہے اور اس صورت میں ان کو مسلمانوں سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی، کیونکہ اسلام کا اصل مقصود صرف اصلاح اخلاق و اعمال ہی تھا اور اس حیثیت سے وہ یقیناً بہت زیادہ مسلمان ہیں۔

مجھے یسین کرافٹس ہوا کہ یاکستان کے بہائیوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں سے کٹ کر ایک جداگانہ "اقلیت" قرار دیکر اپنے حقوق کا مطالبہ کیا ہے۔ ہالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی جبکہ آج تمام مسلم جماعتیں خود وہ کسی مسلک سے تعلق رکھتی ہوں، ایک ہی Common denominator سے وابستہ ہے اور اسی کو پیش نظر رکھ کر انھیں اپنی اجتماعیت استوار کرنا چاہئے۔

بخت و بدل بجائے ال، میکدہ جوئے کا اندراں  
کس نفس از جہل نرود، کس سخن از فک نخواست

## نگار کے پچھلے فائل

۱۲۲	=	جولائی تا دسمبر	=	۱۲۲
۱۳۶	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۳۶
۱۳۷	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۳۷
۱۳۸	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۳۸
۱۳۹	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۳۹
۱۴۰	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۴۰
۱۴۱	=	جولائی تا دسمبر	=	۱۴۱
۱۴۲	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۴۲
۱۴۳	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۴۳
۱۴۴	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۴۴
۱۴۵	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۴۵
۱۴۶	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۴۶
۱۴۷	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۴۷
۱۴۸	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۴۸
۱۴۹	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۴۹
۱۵۰	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۵۰
۱۵۱	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۵۱
۱۵۲	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۵۲
۱۵۳	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۵۳

نوٹ :- صرف ایک ایک فائل موجود ہے اور ہر ایک پہلے جس کا آرڈر ہوئے گا اسی کو دیا جائیگا قیمت محصول ڈاک کے علاوہ ہے۔

پیغمبر نگار لکھنؤ

## فرعون کی سزا میں (مصر جدید)

(پروفیسر شوری)

دیکھ کتے آگینے ہیں مری ٹھوکر سے چہرہ  
ہیں مے دیوار در پر ثبت کتے ماہ و سال  
کتے ٹٹے قصر ہیں تہذیب کے دامن کا چاک  
دام افکن ہے ان بجز کتے مہمد و ماہ پر  
کتے ”ظل اللہ“ میرے دام کے نچیر ہیں  
اممتوں کے خون میں ڈوبے ہیں کتے دیوتا  
لے چکا میرا غضب کتے خداؤں سے خراج  
کھا گئی کتے پیہر میرے گویستاں کی بھوک  
کتے آذر میرے سینے میں اتر کر رہ گئے  
رات کی مٹھی میں تھی آن آفتابوں کی زکات  
کے ہرئی خانوں کی جلا ننگا تھی یہ ریگ زار  
کون جانے خسر کتے تھے یہاں سینہ فگار  
کتے تابوتوں میں جڑ دی اجنبی ہاتھوں نے کیں  
کتے ہنگاموں کا گہوارہ رہی نہر سویز  
کتے بھیگے بادلوں نے پھونک دی خزن میں آگ  
بے تلاطم بھی برابر ڈوبتے جاتے تھے نوح  
موت کا ٹھنڈا پسینہ تھا جبین وقت پر  
دفعاً اک برق لہرائی مرے اہنام پر  
نیل کے ساحل سے پھر سکی ہوائے انقلاب  
آشیانے پھونک کر صیاد اپنے گھر چلے  
میزبان کا خون پی کر میہاں جاتے رہے  
اٹھ گئے اپنے صنم خانوں کو لے کر اپنے ساتھ  
اے چٹانیں توڑ کر جیتے ہوئے طوفان کی رو  
موت کی تاریکیوں میں زندگانی کے سفیر!

طپراق تاج زریں شہر اری کا غرور  
کتے محلوں کی کڑا ہیں کتے شہروں کا جاہل  
سہ جبین وقت پر کتے طب خانوں کی خاک  
پس چکے ہیں ٹھوکر دلیں کتے شہزادوں کے سر  
کتی صبحوں کے جبگر میں ظلمتوں کے تیر ہیں  
ابن آدم کا لہو پیتے رہے کتے خدا  
کتے فرعونوں کی سطوت کتے غرودوں کے تاج  
کتی صدیوں تک اٹھی ہے نیل کے سینے میں ہوک  
کتے آدم خوار ہیکل آہ بھر کر رہ گئے  
غمر بھر جن کا لہو پیتی رہی مشرق کی رات  
کتے دن اٹھتے رہے خانہ بدوشوں کے غبار  
آہ یہ وادی یہ بھٹکے قافلوں کی رہگزار  
کتے قلعوں کا ماتم تھا کنایہ رود نیل  
کیا خبر کتے سفینے تھے یہاں سلاب خیز  
کتے فاروقوں نے لوٹا اپنی جنتا کا بہاگ  
بے صلیب و دار بھی مسلوب تھی عیسیٰ کی رون  
رات کے کندھوں یہ تھا صدیوں سے تابوت سحر  
ناگہاں اک ابر چہا یا مصر کے اہرام پر  
ابر گر جا، برق کڑکی، جہوم کر اٹھا سحاب  
بولتے بت، رقص فرماتے ہوئے آذر پہلے  
سامراجی تاجروں کے کارواں جاتے رہے  
مشرقی زناریوں کے مغربی لات و منات  
زندہ باد اے نصر اے اٹھتے ہوئے سورج کی نو  
اے خوشا صبحوں کی نیت، اے اجالے کے ضمیر!

کتے دن کرتی ہے ماتم زندگی کا روح عصر  
کتے ماہ و سال میں جنتی ہے دنیا ایک نصر!!

# دنیا

(فضا ابن فضی)

شاداب، رخک، برنگ، شبنم  
دوشیزہ آرزو کا آئینہ  
رخسہ زن ساز کا مرانی  
فردوس کی نکبت پریدہ  
آہنگ حدیث و لبہ انہ  
چھوٹی ہوئی دل کو نرگس مست  
فردوس خیال ہے یہ دنیا  
بائیں ہمہ کیف و رنگ و مستی  
دنیا یہ، مری نظر میں لیکن  
ہوں رونہ ازل سے میں خدایا  
یارب! ترے اس جہاں کے اندر  
ہیں درد کے سائے گہرے گہرے  
زہراب کا شک ہے انگلیں پر  
مفلوج ہیں دوستی کے بازو  
ہونٹوں پہ دعا، دلوں میں کینہ  
آنکھیں محسوس دم شرف بینی  
وہ روح تو مری بدن میں  
قندیلیں جنوں کی سمجھ چکی ہیں  
رومی ہے کوئی نہ کوئی عطار  
احساس کا مقبرہ ہے، دنیا  
تہذیب کی ظلمتوں کا مسکن  
معمورہ آب و گل کے خالق!  
آوارہ مرگ ناگہاں ہے

انسان کی کشتوں کا مرہم  
رقاصہ زندگی کی چھاگل  
رامش گر نغمہ جوانی  
کوثر کی شراب ناچشمیدہ  
ارژنگ جمال کا فدا نہ  
رگ رگ میں نشے کا تیرہ پیت  
تکمیل جمال ہے یہ دنیا  
اے مالک کار و بار ہستی!  
اک صبح ہے ستیگی کی ضامن  
فریاد گھر، سپند آسا،  
افراط ہے رنج، عیش کمتر،  
اور ضبط پہ آنسوؤں کے پہرے  
خجر کا گماں ہے آستیں پر  
یاروں میں نہیں خلوص کی بو  
سد پارہ وفا کا آبگینہ  
دل ہیں کہ مزار بے یقینی  
جو آگ لگا دے پیرہن میں  
چنگاریاں راکھ میں دہی ہیں  
اب قلب و نظر ہیں دونوں بیکار  
اک خونچکاں حادثہ ہے دنیا  
معصوم تجلیوں کا مدفن،  
اے عقل و جنوں و دل کے خالق!  
شہکار ترا یہی جہاں ہے؟

مانا کہ بہت حسین ہے دنیا  
رہنے کی جگہ نہیں ہے دنیا

# عظمت انسان

(سعادت نظیر)

بشر کے دم سے ہے نینگی جہاں قائم      فروغِ شوق سے ہے نظمِ این و آل قائم  
 زمین تابعِ گردش ہے آسمانِ قائم      بدل بدل کے بھی ہر چیز ہے یہاں قائم  
 بلند کر دیا اتنا مذاقِ حکمت نے  
 کہ خود مجاز کو اپنا لیا حقیقت نے  
 جسکے میں کیفیتِ اضطراب رکھتا ہے      بلا کا حوصلہ کامیاب رکھتا ہے  
 نظر میں جوش و خروشِ شباب رکھتا ہے      مزاجِ آتش و برق و سحاب رکھتا ہے  
 بشر کی ذات میں اک کائنات پُہاں ہے  
 حقیقتِ ابدی ، کارِ گاہِ انساں ہے  
 چراغِ فکر ، نظرِ ظلمتوں میں جلتا ہے      بقا پذیرِ حقایق کی راہ چلتا ہے  
 قدم قدم پہ رگوں میں بہو مچلتا ہے      جوانِ ارادوں سے دریا کا رخ بدلتا ہے  
 حریت کش کشِ روشن روزگار ہے انساں  
 ہمارے گردشِ میل و نہار ہے انساں  
 اٹھے تو شعلہ آتش ، جھکے تو شاخِ ثمر      اڑے تو نکبتِ گل ہے ، چپے تو تاجِ شجر  
 بڑھے تو کاکشاں ہے ہر ایک راہ گزر      رُکے تو پھولِ تمدن کا تابِ حدِ نظر  
 سنبھالے تیشہ تو پیل میں پہاڑ کٹ جائے  
 سحرِ قریب ہو ، مرکز سے رات ہٹ جائے  
 حدودِ شام و سحر ہو کہ منزلِ مکتوم      نشاط و کیف کا عالم کہ آنسوؤں کا جہوم  
 بساطِ گل ہو کہ صحرایہ نسیم ہو کہ سموم      فضائے مہرِ مہیں ہو کہ بزمِ ماہ و نجوم  
 کہاں کہاں نہیں مظہرِ کمالِ انساں کے ؟  
 قدم قدم پہ نشاں ہیں جلالِ انساں کے  
 بشر کی فطرتِ بیدار سو نہیں سکتی      جہازِ شوق کو آندھی ڈبو نہیں سکتی  
 حیاتِ گرم روی اپنی کھو نہیں سکتی      رسومِ کہنہ سے تسکین ہو نہیں سکتی  
 جو رنگِ زلیست نہ بدلے ، وہ انقلاب نہیں  
 جو ظلمتیں نہ مٹا دے ، وہ آفتاب نہیں

## چار بیت

حضرت آئی جایی

نگہ شوق جب اک حد پہ ٹھہر جائے گی تیرے ہمراہ تمنائے نظر جائے گی  
ضبط کی حد سے اگر آگے گزر جائے گی زندگی کی شبِ غم تاباں سحر جائے گی  
اس طرح جب غاش در در جگر جائے گی پھر تو شاید مری تقدیر سحر جائے گی  
آہ مجبور نہ گسروں اثر جائے گی کم سے کم خدمتِ عشق اتنی ہی کر جائے گی  
تیرے دل تک بھی مرے دل کی خبر جائے گی جی کی جو بات ہے وہ ہی میں آتر جائے گی  
ختم ہونے ہی کو ہیں خیر سے آلامِ حیات قبرِ بیچ کفن دینے لگی شامِ حیات  
نہج کو معلوم تھا پہلے سے یہ انجامِ حیات تم سمجھتے تھے وفا موت سے ڈر جائے گی  
چہن دم بھر کا بھی قسمت کو گوارا نہ ہوا کوئی مفصلہ کبھی بیٹنے کا سہارا نہ ہوا  
تجربہ کو چاہا تھا مگر تو بھی ہمارا نہ ہوا زندگی کیا یو بھی بے آس گزر جائے گی  
آپ اب تیک تغافل کا ارادہ نہ کریں آپ یوں حوصلہ جو رکھیں پسیا نہ کریں  
آپ کچھ پاس غم اہل تمنائے کریں بے کسوں پر جو گزرتی ہے گزر جائے گی  
عالمِ نزع میں ہوں موت کھڑی ہے سر پر جان آنکھوں میں ہے اللہ سے تمنائے نظر  
کاش اُسے میں پہنچ جاؤں تیرے پاس مگر میں تو کیا جاؤں گا اب میری خبر جائے گی  
ٹھہر، طوفانی بار، یہ تو ہے مشکلِ الٰہی سہی منزل ہے مگر نامن منزلِ الٰہی  
تک تھے ہو تو یہ موجیں بھی میں مانِ الٰہی دمِ چھوڑ دو کہ ندی چڑھ کے اتر جائے گی

غنی احمد غنی :-

ہر وفا جھوٹ، ہر نگاہ فریب زندگی تو مجھے کہاں لائی  
عقل کی بات اور ہے لیکن کس کو دیوانگی نہ راس آئی؟  
دیکھ مجبورئی گزارشِ شوق لب ہے اور آنکھ بھر آئی  
ہائے وہ پائمالِ ذوقِ وفا زندگی بھی نہ جس کو راس آئی

جب بھی ہوتے ہیں کچھ انداز سکون کے پیدا تیری یاد آ کے کلچے کو منسل جاتی ہے  
دل سے بے ساختہ اسے دوست تری یاد کی تھرا جائے کیوں سردی اک آہ نکل جاتی ہے  
حادثہ ہی سہی یہ تیری محبت، لیکن زندگی اک نئے سانچے میں تو ڈھل جاتی ہے  
جب نیا موڑ رہ شوق میں آتا ہے کوئی  
اے غنی، وقت کی رفتار بدل جاتی ہے

## حسن یا ور :-

غم دوراں نے بھی پیسا غم جاناں کی طرح      دل کو ملنا تھا سو وہ مٹ گیا قصہ کوتاہ  
کچھ خبر ہے تری بیگانہ روی نے لے دوست      بن گئی سینہ سوزاں میں ہر اک سانس گراہ  
اب تو بے کیفی جذبات سے دم گھٹتا ہے      کیا مزارِ لیت کا جس میں نہ کوئی آہ نہ داہ  
زندگی بن گئی اک آہ مسلسل لیکن      دل نہ بار غم دوراں سے تراخم ہے گواہ  
زندگی بوجھ تھا یاد رہا ڈھبانا ہی پڑا  
اب یہ کیا بحث خوشی سے کب جبر و اکراہ

## شارق ام - لے :-

چاند رات  
فضا میں تیر رہے ہیں کچھ ابر کے ٹکڑے      سنا رہے ہیں بہاروں کے پرسکون قصے  
سیاہ ابر سے یوں نکلی چاند کی کشتی      کہ جیسے جھیل سے بٹا غوطہ مار کر نکلے  
بارش کیفت  
تری طرف سے چلی آرہی ہے موج نسیم      نفس نفس کو مرے چہرے پر ترقی بہ لطف عیم  
نرے خیال میں یوں ہو رہی ہے بارش کیف      کہ جیسے سینہ گل سے نکل رہی ہو شمیم

## عزیز عظیم آبادی :-

ابھی ہے بند بے جوش جنوں بہت محدود      ابھی بہت ہیں مذاق خرد کے دیوانے  
تغییرات سے نقشہ بدل گیا کیسا      مری نظر بھی جو دیکھے مجھے نہ پہچانے  
شباب تھا کہ بس اک وقفہ طلسم نفس      بہار آئی مگر کس طرح خدا جانے  
شہید لذت شرب مدام ہوں کیوں ہوں      عزیز کوئی مرے دلی کار کیا جانے

## شفقت کاظمی :-

ہمارے حال کی انہیں خبر نہ تھی مگر ہمیں      انہی سے واسطہ رہا انہی کا آسرا رہا  
کسی کے انتظار میں رہی یہ محبت مجھے      جدھر نگاہ اٹھ گئی ادھر کو دیکھتا رہا  
اگرچہ اُس کو خیریت کمال ربط تھا مگر  
کبھی کبھی وہ کاظمی ہمیں بھی پوچھتا رہا



کے حماس شاعر ضرور ہیں۔ لب و لہجہ نرم، زبان حد درجہ سلیس و آسان، انداز بیان بہت شگفتہ اور تعبیرات نفیس و پاکیزہ۔ ان میں خصوصیات سلام صاحب کی شاعری کی، جو یقیناً دل میں گھر کر لینے والی چیزیں ہیں۔

جناب سلام سندیلوی کی نظموں اور غزلوں کا دوسرا مجموعہ ہے جسے ادارہ فروغ اردو لکھنؤ نے مجلہ شایع کیا ہے **نکبت و نور** اس کی ضخامت ۱۱۲ صفحات ہے اور قیمت پچھ

اس میں شہسہ سے شہسہ تک کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ اس میں وہی خصوصیات جن کا ذکر ”سافر و مینا“ کے سلسلہ میں کیا گیا ہے، زیادہ اکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ جناب سلام بڑا دکھا ہوا دل رکھتے ہیں اور شعر دراصل وہی ہے جو دکھے ہوئے دل سے لکھا جائے۔

جناب سلام سندیلوی کے ان دونوں مجموعوں کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور میں نے ان کی نظموں اور غزلوں سے کافی لطف اٹھایا۔ ان کی شاعری کی وہ خصوصیات جو دونوں مجموعوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے اس کا جذباتی عنصر جو عمیق بھی جو فطری بھی اور متاثر کرنے والا بھی۔

**ترجمان غالب** شرح ہے دیوان غالب کی جناب شہاب الدین مصطفیٰ کی لکھی ہوئی جسے مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکٹ حیدر آباد (دکن) نے شایع کیا ہے۔

یہ کتاب یادگار ہے شہاب الدین صاحب کی متعلمانہ زندگی کی، جب اسکول دکن میں انھیں کلام غالب سمجھنا پڑتا تھا۔ اول تو اس کی مطلق ضرورت نہ تھی کہ غالب کے ہر شعر کی شرح کر کے خواہ مخواہ کتاب کے حجم کو بڑھایا جاتا۔ دوسرے یہ کہ اگر اس تحصیل حاصل میں وقت ضائع کرنا ضروری تھا تو بھر زیادہ مناسب یہ تھا کہ شعر کو بغیر کسی شرح کے جو ان کا توئی نظر کر دیا جاتا۔ مشکل اشعار کی شرح میں شہاب نے بعض جگہ طعنانہ انداز تحریر سے کام لیا ہے۔ ضخامت ۴۴ صفحات۔ قیمت، پیار روپیہ۔ سیاحت نامہ ہے جناب ڈاکٹر عبدالحق ام۔ اسے کا جو اٹالیہ کے مشہور مقامات و عمارات دیکھنے کے بعد انھوں نے قلمبند کیا **اٹالیہ** ہے۔ ڈاکٹر صاحب نہ صرف سرزمین دکن بلکہ ہندوستان کے ان مقتدر اہل فنسل و کمال میں سے ہیں جو اپنی علمی و اخلاقی خصوصیات کے لحاظ سے بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ ایسی بلند نظر رکھنے والی ہستی نے ان مقامات کو جس نگاہ سے دیکھا ہوگا، وہ خود کس قدر بلند ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے ۳۴ میں اٹالیہ کی سیاحت کی تھی، لیکن یہ سیاحت نامہ اس وقت تک شایع نہ ہو سکا تھا۔ اب اسلامیہ بک ڈپو کرنول (آندھرا) نے اسے شایع کیا ہے۔ اخیر میں وہاں کے تین اکابر، مازنی، گیری بالڈی اور مسولینی کے حالات پر بھی ہلکی سی روشنی ڈالی ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ ضخامت ۳۴ صفحات۔ قیمت پچھ

مولانا عبد اللہ عہادی کی تالیف ہے جسے مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکٹ، حیدر آباد (دکن) نے شایع کیا ہے **علم الحدیث** مولانا عہادی اس عہد کے مشہور عالم اور اپنی جامعیت علوم و فنون کی وجہ سے خصوصی امتیاز کے مالک تھے اخیر عمر میں وہ حیدر آباد کے دارالترجمہ سے وابستہ ہو گئے تھے اور یہیں انھوں نے اپنی زندگی تمام کی۔

ہر چند مولانا مرحوم نے کوئی مستقل تصنیف اپنے بعد نہیں چھوڑی، لیکن انھوں نے دارالترجمہ حیدر آباد کی جتنی جہم و نشان خدمات انجام دی ہیں وہ ان کے تراجم سے ظاہر ہیں۔

یہ کتاب بھی کوئی تحقیقی حیثیت نہیں رکھتی اور ایک مختصر مقالہ سے زیادہ نہیں، لیکن انھوں نے انھیں چند صفحات میں فلسفہ علم حدیث کے تمام نقلی و عقلی پہلوؤں پر ایسی واضح روشنی ڈال دی ہے کہ اگر ہم اس کو سامنے رکھ کر احادیث کا مطالعہ کریں تو ریب و شک کی بہت سی منزلوں سے آسانی گزر سکتے ہیں۔ ضخامت ۳۹ صفحات۔ قیمت پچھ

علامہ ابن قیم فقہائے اسلام میں بڑے مرتبہ کے فقیہ تھے اور انھوں نے اسول فقہ پر ایک بڑی اہم کتاب "اعلام المؤمنین عن رب العالمین" تصنیف کی تھی جس میں شریعت اسلامی کے اسرار و حکم اور قیام و استقامت کے طریقوں پر بڑی مفکرانہ روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب بڑی ضخیم تصنیف ہے اور اسی کے ایک مختصر حصہ کا ترجمہ مولانا محمد امجد علی صاحب نے کیا تھا جسے مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی روڈ حیدر آباد دکن نے شائع کیا ہے۔ اس میں ۹۹ مسائل کو سامنے رکھ کر بتایا گیا ہے کہ اسلام نے فلاں بات کو کیوں حرام و ناجائز قرار دیا۔

اس میں تنگ نہیں کہ حلال و حرام کی بحث باوجود اہم ہونے کے ہر مذہب میں عقلی حیثیت سے بڑی مبہم سی چیز سمجھی جاتی ہے لیکن شریعت کے سامنے اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے اور علامہ ابن قیم نے انھیں اسباب کی تحقیق کر کے بتا دی ہے کہ اسلام نے کیوں بعض چیزوں کو ممنوع قرار دیا۔ مولانا عیسیٰ نے اس حصہ کا ترجمہ نہایت خوبی سے کیا ہے اور ضرورت ہے اس کتاب کے دوسرے حصوں کا ترجمہ بھی ادارہ کی طرف سے شائع کیا جائے۔ ضخامت ۴ صفحات۔ قیمت دس آنے۔

**مصری افسانے** ترجمہ ہے سات مصری افسانوں کا جسے مولانا عبدالرحمان سورتی نے عربی سے اردو میں منتقل کیا ہے ان افسانوں کا موضوع اخلاقی ہے جن میں زیادہ تر قرآن کی کسی اخلاقی تعلیم کو ظاہر کر کے، پلاٹ کردار وضع لئے گئے ہیں۔

مصر نے فرانسیسی ادب سے متاثر ہو کر فن افسانہ نگاری میں کافی ترقی کر لی ہے اور اس زبان میں بہت سے رومانی، تاریخی اور اخلاقی افسانوں کا ذخیرہ کافی پایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے جرجی زیدان نے تاریخی ناولوں سے اس کی ابتدا کی لیکن بعد کو جب مکتبہ ادبیوں نے فسانہ نگاری کی طرف توجہ کی تو نہایت تیزی سے افسانے لکھے جانے لگے اور چند سال میں ایک بڑا ذخیرہ افسانہ آگیا۔

چونکہ فاضل مترجم نے ان افسانوں کے مصنفین کا نام نہیں لکھا ہے (حالانکہ لکھنا چاہئے تھا) اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ عرب کے ادیبوں کی ذمہ داری پیدا ہے، لیکن خود افسانوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ افسانے اخلاقی حیثیت سے خواہ کتنے ہی اچھے لیکن ادبی و فنی حیثیت سے کوئی معیاری درجہ نہیں رکھتے۔ فاضل مترجم نے غالباً اپنے رجحان طبع کو سامنے رکھ کر افسانوں کا انتخاب کیا ہے اور یہ رجحان زیادہ تر مذہبی و اخلاقی ہے جو ادبی محاسن سے کم تعلق رکھتا ہے۔

ترجمہ البتہ صاف و سلیس ہے اور چونکہ بے رنگ ہے اس لئے غالباً صحیح و درست بھی ہوگا۔ اس کتاب کا حجم ۴۴ صفحات کا کتابت و طباعت وغیرہ بہت معمولی ہے۔ قیمت ۲۵ (جو بہت زیادہ ہے) اور طے کا پتہ: انجمن ترقی تعلیم خوشاب (ضلع) مغربی پاکستان مجموعہ ہے جناب ہمیشہ چند نقش کے کلام کا جسے انھوں نے مزدوروں کے نام منسوب کیا ہے، حالانکہ اس کا ہر شعر مزدور اور سرمایہ داروں دونوں کی سمجھ سے باہر ہے اور اس کی قدر اگر کر سکتے ہیں تو وہی زندان قدح خوار جن کے سرخیل و سرگروہ خوار قاتل گورکھپوری نے ابتدائیہ کے عنوان سے اس کا تعارف کر لیا ہے۔ تاہم چونکہ دیباچہ جناب احسان دانش کا بھی اس میں شامل ہے اس لئے ایک دور کی مفروضہ نسبت مزدوروں سے ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ ابتدا میں متعدد قطععات ہیں چار چار مصرعوں کے اور اس بعد غزلیں شروع ہوئی ہیں، لیکن اگر ہم قطععات کی ظاہری و معنوی خصوصیات کو سامنے رکھیں تو یہ سارا مجموعہ غزلوں ہی کا مجموعہ آتا ہے اور غزلیں بھی وہ جو صحیح معنی میں "غنائی" کہلائے جانے کے قابل ہیں۔

یہ مجموعہ خاص اہتمام سے متعدد "نقوش شاعرانہ" کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور پیر میں مکتبہ قیصر اردو دہلی سے ملے سائز کتابی۔ ضخامت ۶۰ صفحات۔

پہلے اسے پڑھ لیجئے پھر ورق اٹھائے

## سالنامہ ۱۹۷۷ء

### جو جنوری، فروری ۱۹۷۷ء کا مشترک پرچہ ہوگا

جو جنوری ۱۹۷۷ء کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوگا اور اپنی معنویت کے لحاظ سے ایک ایسا مجموعہ ہوگا جس میں آپ کو تمام اصنافِ سخن (غزل، قصیدہ، مرثیہ، شتوی، رباعی، نظم، نثر، سنجو، نثر، غزلیت، طنز، نثری، برائے جامع مقالات نظر آئیں گے جو آپ کو ان تمام موضوعات پر دوسری کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیں گے۔

اس کی ترتیب میں ہندوستان و پاکستان کے اکثر مستند ادیبوں اور نقادوں نے حصہ لیا ہے جن کے نام اس سے قبل ظاہر کئے جا چکے ہیں۔

اس کی ضخامت کا ابھی کوئی صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ یقینی ہے کہ اگرچہ اسے کتابی صورت میں شایع کرتے تو اس کا حجم ۶۰۰ صفحات سے کم نہ ہوتا۔

یہ سالنامہ مستقل سالانہ خریداریوں کے چند میں شامل ہوگا، لیکن وہ حضرات جو صرف سالنامہ لینا چاہیں گے ان کو

اس کی قیمت مع مصارف ڈاک پتے ادا کرنا پڑیں گے

وہ حضرات جن کا چندہ دسمبر ۱۹۷۷ء میں ختم ہو رہا ہے ان کے نام اس کا سالانہ وی پی بیٹے میں روانہ کیا جائے گا، لیکن جن کا چندہ دسمبر میں ختم نہیں ہوتا ان سے درخواست ہے کہ وہ ۸ مصارفِ جبرٹری ذریعہ ٹکٹ یا منی آرڈر روانہ کر دیں، ورنہ سالنامہ معمولی پوسٹ سے بھیجا جائے گا اور ہم اس کے پہنچنے کے ذمہ دار نہ ہوں گے

### ایک نئی حضرات

ازراہِ کرم مطلع فرمائیں کہ سالنامہ کی کتنی کاپیاں انھیں درکار ہوں گی۔ قیمت فی کاپی تین روپیہ ہوگی لیکن کمیشن جو معمولاً دیا جاتا ہے، دیا جائے گا۔

### پاکستانی خریدار

اپنا چندہ 8/8 ذیل کے پتہ پر ذریعہ منی آرڈر روانہ فرما کر رسید ڈاک خانہ مع خریداری براہِ راست ہمارے پاس بھیج دیں۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۱۰۵ - گارڈن ویسٹ - کراچی

نکار کی مطبوعات بھی آپ کو اس پتہ سے ذریعہ وی پی بی مل سکتی ہیں

# بعض کیاب کتابیں

(ان کتابوں پر کیشی نہیں رہا ہے گا — قیمتیں ملادہ معمول ڈولک ہیں)

کشتان اصطلاحات الفنون	شیخ محمد علی	عشہ	تذکرہ عزیز نکات	قائم	عشہ
جہانگیر نامہ	خواجہ ابو الحسن	عشہ	تذکرہ دستور الفصاحت	یکتا	عشہ
آئین اکبری مصور مرقع	ابو الفضل فیض	عشہ	تذکرہ ہستان شعراء	شفیق	عشہ
سکندر نامہ مصور	مولوی نظامی گنوی	عشہ	تذکرہ ہندی	مصطفیٰ	عشہ
دولت نعمت خان عالی انشاء حسن و عشق		عشہ	دیوان میر حسن	میر حسن حسن	عشہ
دولت نامہ	مرزا محمد ہمدانی خاں	عشہ	دیوان شکر گون	دیوان قیم دہلوی	عشہ
تاریخ کتابیں ہند مصور	درگا پرشاد	عشہ	کیات تاریخ	ام بخش تاریخ	عشہ
تاریخ جامع التواریخ	فیروز محمد	عشہ	کیات سلیم		عشہ
اقبال نامہ چاگیر سرتحصہ	محمد شریف محمد خاں	عشہ	کیات سودا	مرزا رفیع سودا	عشہ
سیر امتاخرین سرتحصہ	غلام حسین خاں	عشہ	کیات حسرت	فضل الحسن حسرت	عشہ
تذکرہ دولت شاہ	دولت شاہ سمرقندی	عشہ	کیات مومن	مومن خاں دہلوی	عشہ
دربار اکبری	آزاد	عشہ	کیات میر	میر تقی میر	عشہ
تذکرہ گل رعنا	عبد الغنی	عشہ	کمل شرح کلام غالب	مرتبه عبدالباری آسی	عشہ
کیات تہیر	حاجیم نظیر فاریابی	عشہ	مرآۃ الغیب	امیر احمد امیر	عشہ
قصاید عرفی بخشی	جمال الدین	عشہ	منظر معانی دیوان مجروح	میر جہدی حسین	عشہ
کیات اسماعیل	اسماعیل اسفہانی	عشہ	دستور الشعراء	(تذکرہ و تانیث)	عشہ
کارات سعدی	شیخ مصطفیٰ الدین سعدی	عشہ	کیات جعفر زلی	مرتبه محمد فرحت اللہ	عشہ
دیوان عرفی	جمال الدین عرفی	عشہ	کیات نظیر اکبر آبادی	مرتبه عبدالباری آسی	عشہ
دیوان ہلالی بخشی	ہلالی	عشہ	مرآۃ انیس	جلد اول و دوم و سوم و چہارم	عشہ
دیوان تصانیف عسری	ماکیم ابوالقاسم	عشہ	مرآۃ انیس	جلد ششم	عشہ
دیوان احمد علی خاں		عشہ	مرآۃ دہیر کمال		عشہ

مرآۃ انیس ... مرآۃ انیس ... مرآۃ انیس ...

مرآۃ انیس ... مرآۃ انیس ... مرآۃ انیس ...

آپ کا چند سہ ماہی نہیں تم ہوتا تو سالانہ شہ کی جبری کہنے اور یہی آڈیٹ یا لکٹ ضرور روانہ فرمائیے

کو آپ کا چند سہ ماہی نہیں تم ہوتا تو سالانہ شہ کی جبری کہنے اور یہی آڈیٹ یا لکٹ ضرور روانہ فرمائیے

داہنی طرف کا طبعی نشان علامت ہے اس امر کی آٹھ روپیہ نوٹ کے میں دی ہلی ہوگا۔ سالانہ شہ کی جبری کہنے اور یہی آڈیٹ یا لکٹ ضرور روانہ فرمائیے

نگار

ادبیر:- نیاز فتح پوری

جلد ۴۰	فہرست مضامین دسمبر ۱۹۵۶ء	شمار ۶
۱	ملاحظات	۳۴
۲	دعوتی مآ کی کہانی	۳۲
۱۶	تیر کی ایک غیر مطبوعہ شہنوی	۵۰
۲۲	شہاب شرن	۵۴
۳۰	گاہ گاہ ہذا خواں !	
۳	ادبیر	
۶	ادبیر	
۱۶	ڈاکٹر گیان چند	
۲۲	سید حامد حسین ایم اے	
۳۰	ادبیر	
	جمال الدین کا فقیر ترکیب بند محمد عباس طالب صفوی	
	مشکلات غائب	
	باب لا ستفسار (سرمد شہید)	
	منقولات	

## ملاحظات

حماہ مصر کے دور رس نتائج ۱۹۵۶ء کے آغاز ہنگ اس کے وسط تک دنیا جس راہ سے گزر رہی تھی وہ امن و سکون کی راہ تھی لیکن روس میں اشتراکینی دور ختم ہو جانے اور تمام ممالک میں امن و سکون کا جذبہ پیدا ہو جانے کی وجہ سے ایک

حد تک اطمینان سے سانس لینے کا زمانہ ضرور تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ ممکن ہے فضا کا لکھنؤ اس حد تک دور ہو جائے کہ مشرق و مغرب دونوں ایک دوسرا کو زیادہ صاف روشنی میں دیکھ سکیں۔ لیکن اتفاق سے اسی زمانہ میں جب مصر نے ہنر توین کو قومی ملکیت بنانے کا اعلان کیا تو بحرہوم میں برطانیہ و فرانس کو فوجی نقل و حرکت نے فضا کو پھر کدھر ہنا دیا۔

یہ واقعہ بظاہر ایسا نہ تھا کہ برطانیہ جس نے ہمیشہ بہت پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے، بین الاقوامی رحمان کے بالکل خلاف مقررہ حلقہ کرتا لیکن ایٹن وزارت نے جسے تاریخ برطانیہ میں شاید سب سے زیادہ اعلیٰ مذلت سے یاد کیا جائے گا، پہلا اسرائیل کو آباد کیا کہ وہ مصر کی طرف اقدام کر اور پھر خود بھی اسرائیل کو برطانیہ کے علاقہ میں بھاری شروع کر دی۔ یہاں یہ تھا کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو مصر و اسرائیل کی جنگ عالمی جنگ کی صورت اختیار کر لیتی اور برطانیہ ایسی امن پسند و صلح کل حکومت کیونکر دیکھ سکتا کہ امن و سکون کو درہم برہم ہوتا دیکھ سکتی تھی!

برطانیہ کی سیاسی دہشتہ کاریاں اور استعماری چالیں تاریخ کا کھلا ہوا واقعہ ہیں اور دنیا ان سے غور و اتفاق ہے، لیکن اس امر کا تصور صحیح سمجھنا تھا کہ استعماری انحطاط کے ساتھ اس کا توازن عقل و فراست بھی ختم ہو گیا ہے اور وہ مصر کے سہ ماہی میں ایسا احمقانہ اقدام کرے گا جس کو اس کے ایک ابتدائی طالب علم سے بھی توقع نہ ہو سکتی تھی۔

انحطاط پرکٹ کے وقت برطانیہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اسلامی ممالک میں پاکستان اور ایران ایسی دور و دراز حکومتوں کو تو رام کر سکتا ہے لیکن

نود عرب حکومتوں کی جنگاں دور کرنا اس کے بس کی بات نہیں، کیونکہ اسرائیلی حکومت قائم کر کے عربوں کے پہلو میں وہ جو فتنہ پھیل چکا تھا اسے قرب ریاستیں کبھی معاف نہ کر سکتی تھیں اور برطانیہ کو یقین ہو گیا تھا کہ مشرق وسطیٰ پر اس کا رہنمائی اقتدار بھی صرف چند دن کی بات ہے اور وہ وقت وہاں نہیں جب مصر اور تمام جزیرہ نمائے عرب روس کے زیر اثر چلا جائے گا۔ اس لئے اس نے سوچا کہ اگر اس فرصت سے جلد فائدہ نہ اٹھایا گیا تو ممالک اور زیادہ مضائقہ ہو جائیں گے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں نہر سوئز کے قصبائے کا واقعہ پیش آگیا اور یہاں نے پشیمولی فرانس و اسرائیل مصر پر حملہ کر دیا اس نیت سے کہ اس سلسلہ میں وہ نہ صرف مصر بلکہ تمام عرب ریاستوں کو پامال کر کے مشرق وسطیٰ میں پھر اپنا گھوٹا ہوا اقتدار قائم کر سکے۔

برطانیہ چاہتا تھا کہ بیک وقت بغداد پر کیٹ کی سالمیت بھی قائم رہے۔ وہ عرب ریاستوں کو بھی بلائے رکھے۔ اسرائیلی حکومت کی دوستی بھی ہاتھ سے نہ جائے اور نہ سوئز پر بھی قابض ہو جائے، لیکن وہ اس سے بے خبر تھا کہ اس ”جام دستان“ کے کھیل میں ایک اور بہت بڑا بازیگر (روس) سامنے آگیا ہے اور آخر کار برطانیہ کی اس حماقت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغداد پر کیٹ پارہ پارہ ہو گیا۔ عرب ریاستیں اس سے زیادہ بیزار ہو گئیں، نہر سوئز پر بھی وہ قبضہ نہ پاسکا اور اسرائیل کی چھوٹی سی حکومت کو بھی ہمیشہ کے لئے سخت خطرہ میں مبتلا کر دیا۔ حملہ مصر کو کیا ایک پردہ تھا جس کے اٹھنے ہی برطانیہ کے صحیح نفع و خال سامنے آگئے اور تمام دنیا نے اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا۔

اس سلسلہ میں ایک امر اور قابل غور ہے وہ یہ کہ برطانیہ و فرانس کیوں اس قدر جلد التوائے جنگ پر راضی ہوئے۔ جبکہ وہ ہمہ تن کھٹنے کے اندر پھرتے سمجھے سوئز اور سماعلیہ پر قابض ہو چکے تھے۔ اس کے کئی اسباب ہیں ایک یہ کہ برطانیہ جانتا تھا کہ نہر سوئز پر قابض ہوجانا جنگ کا اختتام نہیں بلکہ اس کا آغاز ہے کیونکہ مصر یقیناً نہر سوئز کا علاقہ واپس لینے کے لئے جنگ کو جاری رکھے گا اور اگر مصری افواج نے جلد روس اور دیگر ممالک کی مدد فراہم کئے ہوئے آلات حرب سے آراستہ ہیں، چین، روس، انڈونیشیا، سعودی عرب، اردن، شام وغیرہ ممالک کی رضا کار افواج کے ساتھ حملہ کر دیا تو پھر ٹسمبہ برطانوی و فرانسیسی فوج کے لئے ڈنکرک ہو کر رہ جائے گا اور کوئی راہ فرار ان کے لئے باقی نہ رہے گی۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ برطانوی کابینہ کے متعدد اراکان پوری طرح محسوس کرتے تھے کہ کامن ویلتھ کے بعض ممبر رجن میں مدد و ستان کو خاص اہمیت حاصل ہے) اس حملہ کے سخت مخالف ہیں اور یہ مخالفت برطانیہ کو کبھی کامیاب نہ ہونے دے گی۔ تیسرا سبب امریکہ کا دباؤ تھا جس نے برطانیہ و فرانس کو متنبہ کر دیا تھا کہ اگر جنگ ختم نہ کی گئی تو پٹرول و ڈالر کی صورت میں جس امداد کا وعدہ اس نے کیا تھا اسے وہ پورا نہ کرے گا، اور امریکہ نے یہ اقدام صرف اسلئے کیا کہ وہ فرانس و برطانیہ کے مقابلہ میں عرب ریاستوں اور ایشیائی حکومتوں سے بگاڑنا پسند نہیں کرتا چنانچہ اس سلسلہ میں امریکہ و برطانیہ کے درمیان جو سفارت و کشیدگی پیدا ہو گئی ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ صدر امریکہ نے وزیر اعظم برطانیہ اور صدر فرانس کی ملاقات تو ”وقت و دگر“ پر ٹال دی لیکن پٹرول تھرٹ کے گفتگو کرنے کے لئے وہ فوراً آمادہ ہو گیا۔

**روس کا موجودہ سیاسی موقف** جنگ مصر کے علاوہ اس زمانہ کا ایک اور اہم واقعہ ہنگری کی اور روس کی آمیزش ہے جس سے بیلا تھامی سیاست کو کافی متاثر ہوتا ہے۔ مشرقی یورپ کی حکومتوں میں روسی اقتدار سے انحراف اک قدرتی نتیجہ ہے، ان جذبات آزادی کا جو اس وقت سرزمین مشرق میں نہایت تیزی سے ابھر رہے ہیں اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ اگر حق نہیں توکل ان کو روس کے اثر سے نکل جانا ہے۔

روس کی اندرونی سیاست اس وقت بہت متزلزل ہے اور روس، ہنگری کی آمیزش ایک بڑے اضطراب کا پیش خیمہ ہے جس سے روس اور مشرقی یورپ کی حکومتوں کو درپار ہوتا ہے۔ ہنگری میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اس نے تمام مشرقی یورپ کی ریاستوں کو ہنگامت کے زیر اثر تھیں اور جن کی مجموعی آبادی ایک کروڑ سے کم نہیں ہے جبری حد تک اشتراکیت کا مخالف بنا دیا ہے اور اب وہ روسی اثر سے آزاد ہو کر اپنی سیاست و اقتصادیات کو اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہتی ہے۔

پھر دوسرے کئی اوقات ہنگری کی شورش کو دبانے میں روس کامیاب ہو جائے لیکن بالکل عارضی بات ہوگی اور روس کو سوچنا پڑے گا کہ آئندہ ان خطرات سے بچنے کے لئے اسے کیا کرنا ہے۔

جیسا کہ ہم قمبر کے نگار ہر نگار پر یکے ہیں، اس کشمکش کے درمیان نتیجہ ہو سکتے ہیں یا تو روس اپنی پوری فوج قوت سے کام لے گا، اس ہنگامہ کو ختم کر دے یا اگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو تو اسٹالین اور شرور ہو جائے گا اندیشہ ہے اور یہ دونوں باتیں دنیا کی موجودہ بین الاقوامی سیاست میں بڑا نیا پیدا کر دینے والی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اشتراکی بڑا زبردست ارگنائز تھا اور اس وقت وہاں اشتراک کا سارے عوام محکم رکھنے والا شخص کوئی اور موجود نہیں یہی وجہ ہے کہ ہنگری اور پولینڈ میں جو روسی فوجیں تعین تھیں، انھوں نے روس کا ساتھ نہیں دیا اور خود اندرون ملک کی افواج پر اسے پورا اعتماد نہیں ہے۔

الغرض روس کی اندرونی حالت اس وقت قابلِ اطمینان نہیں ہے اور اگر یہ اس موقع سے جو فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اس کا تعلق سرزمینِ یورپ سے کم اور شرق سے زیادہ ہے، اس لئے اس نے مگر کے علاقے میں برطانیہ و فرانسیس کا زیادہ ساتھ نہیں دیا اور نہ وہ مشرقی یورپ کے موجودہ اضطراب کے سلسلہ میں کوئی ایسا قدم اٹھانا چاہتا ہے جو اسے مغربی ممالک کے مسئلہ میں الجھا دے اور ہو سکتا ہے کہ امریکہ کا یہی موجودہ رجحان روس کو کسی ایسی پالیسی متعین کرنے میں مدد دے جس کا تعلق مشرق وسطیٰ سے ہے، اس جب میں وہ چین کی وساطت سے زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے، کیونکہ مشرق وسطیٰ کی طرف فوجی اقدام کرنے میں بہت سے موانع اس کے سامنے مقابل ہیں اور چین نہ صرف اس لحاظ سے کہ وہ براہِ راست مشرق وسطیٰ کی طرف اپنی فوجیں اور سامانِ حربہ آسانی سے بھیج سکتا ہے بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ متحدہ انجمنِ اقوام کا ممبر نہ ہونے کی وجہ سے اس پر کوئی بین الاقوامی دباؤ ڈالا جاسکتا ہے، زیادہ کامیاب ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے

الغرض اس وقت مقررہ اور ہنگری کے مسائل نے دنیا کی سیاست میں ایک تھام برپا کر دیا ہے اور یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے بین الاقوامی تعلقات پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔

زیادہ نہیں صرف دو سال اس طرف کی بات ہے جب جناب سہروردی نے پاکستان کے مغربی اتحاد پر بحث کرتے ہوئے پاکستان و مصر کے مسئلہ کو متنبہ کیا تھا کہ ممالکِ مغرب کے دامن سے اپنا دامن ہانڈھنا پاکستان کی موت ہے، لیکن آج وہ مسئلہ وزارت پر متکثر ہونے کے بعد اسی پالیسی کے اتنے پر جوش حامی بن گئے ہیں کہ مگر کے خلاف برطانیہ کی فوج کشی انھیں معمولی فوجی مداخلت سے زیادہ اور کچھ نظر نہیں آتی۔

وہ اس اندیشہ سے کہ برطانیہ کا یہ غلط اقدام بغداد پیکٹ کا شیرازہ منتشر کر دے۔ کانپ اٹھتے ہیں اور پھر ان کا غرض کے بعد وہ بغداد و تشریف لے جاتے ہیں تاکہ عرب ریاستوں سے گفتگو کر کے وہ بغداد پیکٹ کے احترام کو کسی طرح پھر قائم کر سکیں۔ لیکن جیمن افسوس ہے کہ اس مقصد کے لئے وہ کامیاب نہ ہو سکے اور برطانیہ کے خلاف جو برہمی عرب ریاستوں میں پیدا ہو گئی ہے اس کا ازادان سے ممکن نہ ہو سکا۔ پھر لطف یہ ہے کہ وہ اپنی اس برطانیہ فوج پالیسی کے ساتھ ساتھ اس کے بھی متوقع نتیجہ کوئی تاثر نہ کر سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا اٹھا رہی ہو تو ہم سمجھا جاتا ہے، لیکن کرنل ناصر کا یہ انکار وزارت پاکستان کی توہین ہو تو ہو لیکن پاکستان کی نہیں، کیونکہ جہاں تک وہاں کے عوام کا تعلق ہے وہ سب بغداد پیکٹ کے خلاف ہیں اور مصر کے باب میں سہروردی صاحب کی روش کو انھوں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ چنانچہ اس وقت پاکستان کے تمام عہدہ دار سی اخبار سہروردی وزارت پر تنقید کرتے ہیں کہ سب سے زیادہ اور مشرقی نکال کی حکومت کو کھلم کھلا مغربی پاکستان کو اس پالیسی کی مخالفت کر رہی ہے۔

پاکستان کی تمام بین الاقوامی سیاست میں جو برہمی کر رہی ہے وہ کشمیر کا مسئلہ ہے۔ بغداد پیکٹ میں اس کی شرکت اور امریکہ کے ساتھ پینڈیکل فروخت کر دینے کا افسانہ یہی ہے کہ وہ مسئلہ کشمیر میں ان بین الاقوامی طاقتوں کی ادا و حاصل کرے، لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ برطانیہ نے جو پاکستان کو جہادِ شہنشاہ کے خلاف جنگ پر آمادہ کر سکتا ہے، لیکن اس کی مدد نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ خود پاکستان کو اپنا دامن لگا رہا ہے اور اس کی مدد پالیسی میں کبھی کوئی ایسا تبدیلی دیکھنا پسند نہیں کر سکتے جو برطانیہ و امریکہ کے مصالح کے خلاف ہو، لیکن افسوس ہے کہ پاکستان نے ان مغربی طاقتوں کو نہیں سمجھا کہ اب وہ اس انداز میں ہو گیا ہے کہ اگر وہ اس جالی سے نکلتا بھی ہے تو کامیابی مشکل ہے۔

# دھرتی مائیک کی کہانی

(ادویٹر)

آدھی کا بجائے خود ایک "عشر خیال" ہوتا اور تمام عالم اس کو ایک "دائم خیال" نظر آتا، شاعرانہ تعبیر یہی لیکن ہے پڑی تھی تو بات۔ کائنات پڑی عظیم چیز ہے، لیکن انسان اس سے زیادہ عظیم ہے جس نے کائنات کی عظمت کو سمجھا، کارگاہ قدرت کی کوئی حد۔ دانتہا نہیں لیکن ذہن انسانی اس سے زیادہ وسیع ہے، جس نے قدرت کی اس کارگاہ کی بے پایانی کا تصور کیا۔

ہوسکتا ہے کہ خدا نے دنیا کو صرت ایک لفظ "کن" کہ کر دفعتاً اسی طرح پیدا کر دیا ہو جیسا کہ وہ نظر آتی ہے، لیکن انسان کا سمجھنا کہ ادا وہ خدا وندی کوکن کی منزل تک پہنچنے سے پہلے کتنے درمیانی منازل سے گزرنا پڑا، اتنی دلچسپ بات ہے کہ خدا کو بھی دس کی حاد دینا چاہئے۔ اور ہوسکتا ہے کہ اگر آئندہ وہ کوئی اور کائنات بنائے تو انسان ہی کی بتائی ہوئی راہوں کو سامنے رکھے۔ کیونکہ کارگیری اس میں نہیں کہ دفعتاً کسی چیز کو پیدا کر دیا جائے بلکہ کارگیری تمام ہے اس کا کہ تدریج کے ساتھ اسے وجود میں لایا جائے۔ گھار، اٹھ دفعتاً کوئی کوزہ بنا کر اس طرح پیش کر دے جیسے ایک بازگیر اپنی ٹوپی کے اندر سے خرگوش ساٹھے لے آتا ہے، تو یہ کارگیری نہیں مذاق ہے۔ کارگیری یہ ہے کہ وہ پہلے مٹی گوندھے، پھر اسے چاک پر رکھے اور چاک کو گردش دے کر آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ کے نرم دباؤ سے اس کو کوزہ میں تبدیل کرے۔ قطب مینار دیکھ کر ہم کو حیرت اس کی بندوبست پر نہیں ہوتی بلکہ ان ہاتھوں پر جنہوں نے آہستہ آہستہ اسے اس بندوبست تک پہنچایا۔ ہاتھ کی عظمت اپنی جگہ مسلم، لیکن اس کا اندازہ اس وقت تک نہ ہوسکا جب تک انسان ساہنسا سال کی کوشش کے بعد وہاں تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوا۔

اٹھ سے مریخی کے بچے کا پیدا ہو کر خود دانہ چلنے لگنا کوئی بڑا تخلیقی کارنامہ نہیں، بلکہ اس کا تعلق انسان کے کچھ سے ہے، جو بالکل مجبور و معذور پیدا ہوتا ہے، اور آہستہ آہستہ نشو و نما پا کر وہ قدرتِ خلاق کے رو برو اپنے ذہن خلاق کا آئینہ لے کر سامنے آتا ہے قانونِ قدرت یقیناً حد درجہ مستور اور نہ سمجھ میں آنے والی چیز ہے، لیکن قدرت یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ ہمیشہ اسی طرح بے جانی ہو جی جیتاں بنی رہے۔ اس لئے اس نے انسان کو پیدا کیا اور پھر انسان نے جس طرح تدریج کے ساتھ قدرت کو بے نقاب کر لیا کوشش کی، وہ بجائے خود ایک طلسم زار سے کم نہیں۔

انسان کا یہ مطالعہ اپنی ذات سے نہیں بلکہ ماحول سے شروع ہوا اور آہستہ آہستہ وسیع ہوتا رہا، یہاں تک کہ آج وہ اس منزل پر پہنچ گیا ہے جہاں اس سے غلطی کا امکان تو ہے، لیکن حماقت کا نہیں، اور وہ اس منزل تک کتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد پہنچا ہے۔ داستان بہت دلچسپ ہے۔

اس ابتدائی زمانہ کو چھوڑتے جب انسان کا تعلق زمین سے صرت مددی حاصل کرنے کی حد تک محدود تھا، لیکن جب اس سے آگے بڑھ کر اس میں گیا اور گیوں کی جتنی ہوئی اور دورِ تغزل شروع ہوا، تو فرصت کے اوقات میں اس نے یہ سوچنا شروع کیا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے، اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ زمین جس پر وہ چلتا بیٹھا ہے، کیا ہے، سورج، چاند، ستارے کیا ہیں اور مریخوں کا تغیر کیا معنی رکھتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

یہ سمجھنے کے لئے اس نے سب سے پہلے حواس ظاہری سے کام لیا اور انہیں کی مدد سے کچھ نظریے قائم کرنا شروع کئے، جو زمانہ اور

شعور کی ترقی کے ساتھ ساتھ جلتے رہے۔ یہاں تک کہ پہلے جن نظریوں کا تعلق صرف حواس ظاہری سے تھا، رفتہ رفتہ خالص ذہنی اور نامک اور علوم ریاضی سے متعلق ہو گئے اور دنیا کچھ سے کچھ نظر آنے لگی۔

ہم اس نادر کا ذکر نہیں کریں گے جب انسان زمین کو بالکل سطح چیز خیال کرتا تھا اور سورج، چاند اس کو زمین کے گرد چکر لگاتے نظر آتے تھے، ہم اس جہد کا بھی ذکر کریں گے جب سچے پہلو زمین کے گول ہونے اور آفتاب کے گرد اس کے طوائف کرنے کا نظریہ تسلیم کیا گیا، بلکہ ہم اچھے صرف ڈھائی تین سو سال قبل کا ذکر کریں گے، جب انسان نے خود کرۂ زمین کی تخلیق و حقیقت پر خود کرنا شروع کیا اور متعدد نظریے بنا کر ان کو مدد کر دینے کے بعد وہ ایک ایسے نظریے پر آکر ٹھہرا، جس پر اس وقت وہ بہت مطمئن نظر آتا ہے، حالانکہ وہ اس سے بھی انکار نہیں کر سکتا کہ جو کچھ اس نے سمجھا ہے، وہ سراسر غلط نہ ہو۔

## تخلیق زمین

اس سے قبل کہا جاتا تھا کہ زمین آفتاب ہی کا ایک ٹکڑا ہے، جس نے کسی عہد نامعلوم میں اس سے جدا ہو کر اپنی ہستی الگ قائم کر لی اور سورج کے گرد گھومتے لگا، لیکن لاپلاس نے جو فرانس کا مشہور ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا، انیسویں صدی کی ابتدا میں ایک نظریہ اور پیش کیا جسے "TIDAL THEORY" یا نظریہ دو جزر کہتے ہیں جس کی تفصیل یہ ہے کہ اب سے انہوں سال قبل ایک بہت بڑا آتشیں کرہ رقیق حالت میں آفتاب کے پاس سے گزرا جو سورج کی عظمت سے ناواقف تھا۔ پھر چونکہ سورج کی بے پناہ کشش کا دائرہ کروڑوں میل تک وسیع تھا اس لئے جب وہ آتشیں کرہ، آفتاب کے دائرہ کشش کے قریب آیا تو سورج نے اس کے آتشیں مادہ کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا، ہونا یہ چاہئے تھا کہ یہ آتشیں مادہ آفتاب میں جذب ہو جاتا، لیکن چونکہ آتشیں مادہ کے یہ تھتھے خود بھی نہایت تیز گردش میں مصروف تھے اور ہر وہ چیز جو تیزی سے گردش کرتی ہے خود اپنی بھی اک مرکزی کشش رکھتی ہے، اس لئے ان آتشیں ٹکڑوں نے آفتاب کی قوت کشش کا مقابلہ کر کے اپنے آپ کو آفتاب میں جذب ہونے سے تو بچا لیا، لیکن وہ اس کے دائرہ کشش سے باہر بھی نہ جاسکے اور آفتاب کے چاروں طرف گردش میں مصروف ہو گئے۔ انھیں ٹکڑوں کا نام نظام شمسی ہے اور انھیں جس ایک ٹکڑا وہ ہے جسے ہم "کرۂ زمین" کہتے ہیں۔ کرۂ زمین پہلے گیس یا مشتعل حالت میں تھا، لیکن رفتہ رفتہ مہلک بعد کے بعد اس میں انجمادی کیفیت پیدا ہوئی، اوپر کی سطح سخت ہونے لگی اور جب آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوئی تو اس سے ابھرنے پہلے ہونے لگے، بارش کے طوفان آنے لگے اور اس طرح آگ، پانی اور ہوا کے تصادم سے زمین کی سطح ٹھنڈی اور ہموار ہو کر آبادی کے قابل ہوئی۔

اس سلسلہ میں ایک اور نظریہ بھی سننے کے قابل ہے۔ یہ نظریہ امریکہ کے دو پروفیسروں (جیمز ہون اور مولٹن) کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس حد تک تو صحیح ہے کہ آفتاب کے پاس سے کوئی بہت بڑا آتشیں گزرا لیکن یہ صحیح نہیں کہ اس کے متعدد تھتھے یا ٹکڑے علحدہ علحدہ آفتاب کی طرف کھینچے اور مختلف کروں میں تبدیل ہو گئے، جنہیں نظام شمسی کہتے ہیں، بلکہ ہوا یہ کہ اس آتشیں کرہ کا ایک ٹکڑا اربوں میل کا چمکیسی و مشتعل حالت میں تھا، آفتاب کی طرف کھینچ کر گردش کرنے لگا اور رفتہ رفتہ اس کے اندر بہت سے ٹکڑے منجمد ہو کر ٹکڑے اور ایک دوسرے کے اندر جذب ہونے لگے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ نظام شمسی کے موجودہ سارے وجود میں آئے جن میں سے ایک زمین بھی ہے۔ اس نظریے کی بنا پر یہ ماننا پڑے گا کہ زمین کی تخلیق جادہ حیثیت ہی سے ہوئی نہ کہ گیس حیثیت سے۔ اس نظریے کو "PLANETESMAL THEORY" یا نظریہ اجرامی کہتے ہیں۔

زمین کی عمر زمین کب وجود میں آئی، اس کا صحیح علم کسی کو نہیں۔ تین سو سال پہلے زمین کی عمر کا حساب ہزاروں سال سے زمین کی عمر آگے نہ بڑھتا تھا، یہاں تک کہ بائبل نے اس کی تخلیق کا زمانہ ۴۰۰۰ سال قبل مسیح بتایا ہے۔ انیسویں صدی میں یروشٹر (USHER) نے اس کو ہزار لگا کر دیا۔ بیسویں صدی میں لارڈ کیلون نے (HELVIN) جو فلسفۂ طبیعیات کے مشہور ماہر تھے، ظاہر کیا کہ اب سے دس کروڑ سال قبل زمین میں انجمادی کیفیت پیدا ہونا شروع ہوئی ہوگی۔ پروفیسر پٹ (PETER TAIT) نے

زمین کی عمر کا اندازہ دو کھرب سال کیا۔ تھامسن (THOMSON) نے زمین کی عمر کا اندازہ اس اصول کو سامنے رکھ کر کیا کہ کتنی حرارت گننے عرصہ میں رفتہ رفتہ کم ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن جب ۱۹۰۳ء میں ریڈیم دریافت ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ اگر زمین رفتہ رفتہ ٹھنڈی ہو رہی ہے تو اسی کے ساتھ ریڈیائی حرارت بھی پیدا ہوتی رہتی ہے تو تھامسن کے اصول کو نظر انداز کر دیا گیا۔ کیونکہ زمین کا ٹھنڈا ہونا اس طرح کا نہ تھا جیسے تھوڑے سے نکالی ہوئی مدنی آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوتی ہے، بلکہ صورت یہ تھی کہ جتنی حرارت وہ کھوتی تھی قریب قریب اتنی ہی وہ پھر ریڈیائی معدنیات سے حاصل کر لیتی تھی، اس لئے اس کے سرد ہونے میں کافی وقت لگا ہوگا۔

اس حقیقت کا علم کہ زمین کے اندر بعض معدنی اشیاء ایسی بھی پائی جاتی ہیں جو زمین کو گرمی پہنچاتی رہتی ہیں، سب سے پہلے ۱۹۰۳ء میں ریڈیم کی دریافت سے ہوا، اس کے بعد پتہ چلا کہ ریڈیم خود کوئی مستقل عنصر نہیں ہے بلکہ وہ اصل عنصر دراصل یورانیئم (URANIUM) ہے جس کے ذرات کے انفجار یا پھوٹنے سے ایک اور عنصر ایوٹیم (IOTIUM) پیدا ہوتا ہے اور جب اس کے ذرات میں انفجار ہوتا ہے تو اس سے ریڈیم پیدا ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کوشش کی گئی کہ ان عناصر کے ذرات کے انفجار کا راز معلوم کیا جائے، چنانچہ ماہرین طبقات الارض و معدنیات نے کافی غور و تحقیق کے بعد دریافت کیا کہ ریڈیم کے نصف ذرات میں ۱۰۰ سال کے بعد انفجار ہوتا ہے اور باقی نصف ذرات کے انفجار کے لئے مزید ۱۰۰ سال کا راز درکار ہوتا ہے۔ اسی طرح ایوٹیم کے نصف ذرات ۴۰۰۰ سال میں پھوٹتے ہیں اور باقی نصف ذرات دوسری ۴۰۰۰ سال کی مدت میں اور یورانیئم کے ذرات کے انفجار کے لئے ۱۲ کھرب سال درکار ہوتے ہیں۔

اس دریافت کے بعد ایک طرہ تو یہ معلوم ہوا کہ اگر زمین ایک طرہ اپنی حرارت کھوتی جاتی تھی تو دوسری طرہ اسے ان عناصر کے ذرات سے گرمی بھی پہنچتی جاتی تھی کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی کی ٹھنڈی ہو جاتی اور آج وہ جاندار سے خالی ہوتی، دوسری طرہ زمین کی صحیح عمر معلوم کرنے میں بھی آسانی ہوئی اور ان عناصر کے انفجار کی مدت کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ کیا جاسکا کہ زمین کی عمر اس وقت کم از کم ڈیڑھ ارب اور زیادہ سے زیادہ تین ارب سال کے ہو سکتی ہے۔

**زمین کیونکر فنا ہوگی** اس قدر معلوم ہونے کے بعد قدرتی سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین کے عناصر کب تک اس کی گرمی قائم رکھ کر اسے دندہ رکھ سکیں گے۔ ظاہر ہے ایک وقت ایسا آئے گا جب عناصر کا انفجار بھی ختم ہو جائے گا اور اسی کے ساتھ زمین بھی اتنی سرد ہو جائے گی کہ کوئی جاندار اس میں نہ رہ سکے گا۔ اس سلسلہ میں ماہرین کا خیال یہ ہے کہ زمین ابھی جوان ہے اور اربوں سال تک وہ اپنی حرارت کو قائم رکھ سکے گی، بشرطیکہ اس دوران میں کوئی اور حادثہ اسے تباہ و برباد نہ کر دے۔ لیکن یہ حادثہ کیا ہو سکتا ہے؟ ان کی تفصیل بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

۱۔ ایک اندیشہ یہ ہے کہ اگر آفتاب کا حجم دفعتاً کسی وجہ سے بڑھ گیا یا خود اپنے عناصر کے انفجار کی وجہ سے گولہ کی طرح پھوٹ پڑا تو زمین کا تباہ ہو جانا بھی یقینی ہے۔ اس اندیشہ کے پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ کبھی کبھی بعض سیاروں کی روشنی دفعتاً بڑھ جاتی ہے اور اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ عکس ہے آفتاب کا حجم بڑھ جاتا ہو اور اس کی بڑھی ہوئی روشنی و حرارت ان سیاروں کو بھی زیادہ روشن کر دیتی ہو۔

اس وقت تک متعدد بار اس کیفیت کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے ۱۸۳۷ء قبل مسیح میں ایک نہایت تیز روشنی ستارہ دیکھا گیا، لیکن اس کی روشنی جلد ختم ہو گئی۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں ایک ستارہ اسی طرح کا دیکھا گیا اور مسلسل آٹھ سال تک اس کی غیر معمولی روشنی قائم رہی۔ پھر ۱۸۷۵ء میں ایک ستارہ اسی قسم کا نظر آیا جس کی روشنی اتنی تیز تھی کہ دوپہر کو بھی نظر آتی تھی، تین ہفتہ کے بعد اس میں کمی پیدا ہوئی اور ۱۸۷۷ء میں یہ ستارہ غائب ہو گیا۔ اس کے تیس سال بعد ایک نئے ستارہ اسی قسم کا نظر آیا اور اس کی غیر معمولی روشنی بھی عرصہ تک قائم رہی۔

۱۹۱۱ء میں ان میں سے زیادہ روشن ستارہ ایک اور نمودار ہوا، اور ۱۹۱۵ء میں اس سے بھی زیادہ ایک گرم دتا ہوا سیارہ دیکھا گیا۔

ان سیاروں کی روشنی میں غیر معمولی اضافہ کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کے حجم میں دفعتاً غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا، چنانچہ ۱۹۲۵ء میں جو سیارہ اسی قسم کا نظر آیا تھا اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا حجم ۲۱۴ گنا زیادہ بڑھ گیا تھا اور وہ زمین سے اتنی دور تھا کہ اس کی روشنی (جس کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکند ہے) ۴۲۹۸ سال میں زمین تک پہنچی تھی۔ گویا اس حد سے ۲۵۴۳ قبل مسیح میں اس سیارہ کا حجم بڑھنا شروع ہوا ہوگا۔

ان سیاروں کے اضافہ حجم کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر کسی وقت آفتاب نے بھی یہی صورت اختیار کر لی اور اس کا حجم بڑھ گیا تو عطارد اور زہرہ تو خیر فوراً ہی ختم ہو جائیں گے لیکن ان کا کیسی غلات زمین تک پھیل کر آجائے گا اور اسے بھی فنا کر دے گا۔  
۲۔ دوسرے نظریہ یہ ہے کہ دوسرے سیاروں کی طرح زمین کی محوری گردش بھی آفتاب کے گرد رفتہ رفتہ کم ہوتی جائے اور یہ دائرہ گردش رفتہ رفتہ اتنا کم ہو جائے گا کہ آفتاب کی کشش اسے اپنے اندر جذب کر لے گی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ زمین کی دو گردشیں ہیں ایک مرکزی جیسے لٹو کی گردش اپنی کیل پر اور دوسری محوری گردش آفتاب کے چاروں طرف، پھر چونکہ گردش ہی وہ چیز ہے جو اسے آفتاب سے ملنے نہیں دیتی اور زمین کی یہ گردش چونکہ رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی ہے اس لئے ایک ایسا آئے گا جب زمین اپنے مرکز پر ساکن ہو جائے گی اور اس کا ایک رخ آفتاب کی طرف کا اتنا گرم ہو جائے گا اور دوسرا رخ کا اس قدر سرد ہو جائے گا کہ دونوں رخ میں آثار حیات فنا ہو جائیں گے۔

۳۔ تیسرا نظریہ لارڈ روتھر فورڈ (RUTHERFORD) نے قائم کیا ہے یہ ہے کہ عناصر زمین کے ذرات میں جو سلسلہ انفج (EXPLOSION) کا قیام ہے وہ اگر بڑھ گیا تو ایک وقت آئے گا جب ساری زمین پر اس کی ہر دوڑ جائے گی اور کروڑوں سال کا ساڑا گیس بن کر رہ جائے گا۔

۴۔ چوتھا نظریہ امریکی ڈاکٹر ملیکان (MILLIKAN) کا ہے، وہ کہتا ہے کہ فضا میں جو نظریہ آنے والی شعاعیں بکھرے ہوئی ہیں وہ بڑی قاتل چیز ہیں اور ان کی قوت نفوذ اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وہ حیوانی خلا یا (CELLS) کو سکند کے در حصہ میں جلا کر خاک کر سکتی ہیں اور ۵۹ اینچ کی موٹی سیسہ کی چادر میں بہ آسانی نفوذ کر سکتی ہیں۔ یہ شعاعیں چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں اور اگر زمین کی مخلوق ان کی ہلاکت سے صرف اس لئے محفوظ ہے کہ زمین کے چاروں طرف کی فضا یا خلائے ہوا (ATMOSPHERE) ان شعاعوں کو زمین تک نہیں پہنچنے دیتی۔ اگر کسی وقت یہ فضا ختم ہو گئی جس کا امکان ہے تو زمین کی ہلاکت یقینی ہے۔

۵۔ چوتھا نظریہ لیکن انسورتم (LINCOLNELL SWORTH) کا ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی وقت قطب جنوبی میں آفد کی حرارت کی وجہ سے کوئی عمودی (VERTICAL) جنبش پیدا ہوئی تو اس منطقہ کی قبیلی چادر جو سات ہزار فٹ دبیز ہے پچ تمام زمین کو ڈبو دے گی اور اس کے جملہ جاندار فنا ہو جائیں گے۔

انقرض یہ ہیں متعدد نظریے جو زمین کی ہلاکت دنیا ہی کے باب میں کئے جاتے ہیں، لیکن قدرت ان میں سے کسی پر عمل کرتی ہے یا کہ پر نہیں، اس کا صحیح علم تو اسی وقت ہوگا جب زمین اس منزل سے گزرے گی۔

زمین کا وزن اور اس کی شکل زمین کا وزن معلوم کرنے کا جدید ترین طریقہ وہ ہے جسے سب سے پہلے ہنری کیونڈس (HENRY CAVENDISH) نے ۱۷۹۱ء میں اختیار کیا۔

زمین کے متعلق دو چیزیں تو معلوم ہی تھیں، ایک اس کا قطر اور دوسرے یہ کہ اس میں قوت کشش پائی باقی ہے

اے انھوں نے پہلے سسپھ کا ایک گیند بارہ انچ قطر کا بنایا اور دوسرا گیند دو انچ قطر کا اور پھر ٹورژن کانسٹ (TORSION BALANCE) ذریعہ سے معلوم کیا کہ بڑے گیند کی کشش چھوٹے گیند پر کتنی ہے، اس کے بعد اسی ذریعہ سے یہ معلوم کیا کہ زمین کی کشش اس گیند پر کتنی ہے۔ دونوں کا تناسبی مطالعہ کرنے کے بعد معلوم کر لیا کہ زمین کا وزن کتنا ہے۔

اس سے پہلے ۱۷۹۷ء اور ۱۸۷۳ء میں مختلف پہاڑیوں کی بلندی سے سادھل لٹاکر زمین کی کشش اور اس کے نقطہ انحراف کو معلوم کیا۔ پھر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ زمین کا وزن ..... ۵۹۸۵۱۶ ٹن ہے (ٹن ۲۸ من کا ہوتا ہے)۔ یعنی اگر زمین کی تمام مٹی نر پہاڑ وغیرہ کو دگر مال گاڑی میں لا دیا جائے تو اس کام کے لئے ..... ۳۷۸ سال درکار ہوں گے اور اس مال گاڑی کی لمبائی اس سلسلہ سے جو زمین اور اس کے قریب ترین ستارہ کے درمیان پائی جاتی ہے (اور جس کی روشنی زمین تک ۵۰ ہزار سال میں پہنچتی ہے) اس سے ۱۶۰ گنا زیادہ ہوگی۔

زمین بہ نسبت پانی کے ساڑھے پانچ گنا زیادہ ٹھوس ہے، یعنی اگر ترازو کے ایک پلڑے میں ایک کعب انچ مٹی رکھی جائے تو سرے پلڑے میں اس کا ہوازن پانی تو اس کے لئے ۵ پانچ کعب جگہ درکار ہوگی۔ معمولی تھیر اور جست کے مقابلہ میں زمین کا ٹھوس پن مائی گنا زیادہ ہے اور سسپھ کے مقابلہ میں نصف۔

سورج کا تکاثف یا ٹھوس پن زمین کے مقابلہ میں صرف چوتھائی ہے لیکن اس کا پھیلاؤ یا حجم ۳۳۲۰۰۰ گنا زیادہ ہے۔ چاند کا تکاثف ابتر ہے اور اس کا حجم ۱/۱۰ اسی لئے زمین کے مقابلہ میں چاند کی کشش ۱/۴ ہے۔ یعنی اگر کسی چیز کا وزنی زمین پر ۱۷ من ہے تو خرمیں وہ صرف ۲ من رہ جائے گا۔ دوسرے سیاروں میں دباؤ دوارن (WHITEDWARF) ستارہ کا تکاثف البتہ زمین سے ۶۵۰۰ گنا زیادہ ہے۔

مین کی گولائی اول اول - خیال کیا جاتا تھا کہ زمین چمپی یا مسطح ہے سب سے پہلے قبل مسیح چھٹی صدی میں فیثاغورس نے اس کا گول ہونا ظاہر کیا۔ اس کے ۳۰۰ سال بعد ارسطو طالیس نے زمین کے گول ہونے کے وہ ثبوت پیش کئے جو اس وقت م جغرافیہ کی کتابوں میں درج ہے۔ یعنی سمندر میں جہاز کا سب سے پہلے مسطور نظر آتا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ پورے جہاز کا سامنے چاند گرہن اور سورج گرہن کے وقت زمین کے سایہ کا گول نظر آنا وغیرہ وغیرہ۔

۲۵۰ قبل مسیح میں یونانی ماہر فلکیات اراتوس تعینیس (ERATOSTHENES) نے عرض البلد کے خطوط متعین کر کے زمین کے راور محیط کا اندازہ کیا۔

زادہ حال میں جو تصویریں ہوائی جہاز سے لی گئی ہیں ان سے زمین کی گولائی اور زیادہ متحقق ہوگئی ہے، لیکن یہ گولائی گیند کی سی مائی نہیں ہے بلکہ نارنگی کی طرح دونوں سرے پر جنہیں قطبین کہتے ہیں دبی ہوئی ہے۔ شمالی قطب سے جنوبی قطب کا قطر بہ نسبت خط استواء کے ۲۷ میل کم ہے، یعنی خط استواء پر زمین کا قطر ۸۰۰۰ میل ہے اور قطبین کے درمیان کا قطر ۷۷۷۷ میل کم۔ اسی لحاظ سے دونوں جگہ کشش زمین میں بھی فرق ہے، یعنی اگر کوئی چیز خط استواء کے مقامات پر ۱۶ اسٹون ہوگی تو قطب شمالی کے حصہ میں اس کا وزن ایک پونڈ ہو جائے گا۔

خط استواء پر زمین صحیح معنی میں ہر جگہ پوری طرح گول نہیں اور مختلف مقامات پر ۳۰۰ گز تک کی کمی بیشی پائی جاتی ہے۔

۱۔ ایک کٹا جس میں باریک بل دار تار کے ذریعہ سے برقی قوتوں کا فرق ناپا جاتا ہے۔

۲۔ ساہول اس فلنگر کو کہتے ہیں جسے تانے میں باندھ کر مسمار دیوار پر بندتے وقت زاویہ کی پیمائش کرتے ہیں۔

۳۔ خط استواء پر زمین کا قطر ۸۰۰۰ میل ہے۔

کیا زمین کا حجم کم ہو رہا ہے

ارہوں سال سے زمین پر بارش، ہوا اور گہر کے حلقے ہو رہے ہیں اور ان سب کا اثر زمین کی سطح پر ہوتا ہے، لیکن اگر قدرت اس کی تلافی نہ کرتی رہتی تو زمین کبھی کی غائب ہو چکی ہوتی۔ لیکن قدرت کا عمل اس طرح جاری ہے کہ جب زمین کے اجزاء بارش وغیرہ سے بہ کر سمندر میں مل جاتے ہیں تو زمین کچھ ہلکی ہو جاتی ہے اور سمندر کا حصہ وزنی ہو جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سمندر کی سطح دبتی جاتی ہے اور اس دباؤ کی وجہ سے زمین کی سطح ابھر جاتی ہے اور اس طرح دونوں کی اصلی سطح اپنے حال پر قائم رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زمین کا حجم آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہے لیکن یہ کمی بہت نحیف ہے یہاں تک کہ اپنی تخلیق کے وقت سے لیکر اس وقت تک اربوں سال میں صرف ۳۰ میل اس کا حجم کم ہوا ہے۔

زمین کے اندر کیا کیا ہے

اگر آپ زمین میں آ کر پار سوراخ کریں اور اس میں کوئی وزنی چیز ڈالیں تو وہ ۴۰ منٹ ۲۲ سکند فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کریں تو تقریباً ساڑھے پانچ دن میں پہنچیں گے، لیکن زمین کا اندرونی حصہ اس قدر گرم ہے کہ یہ تجربہ کسی طرح ممکن نہیں۔

زمین کا اندرونی مرکزی حصہ رقیق ہے یا منجمد اس کے متعلق اختلاف ہے اور یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ زمین کا قطر ۸۰۰۰ میل ہے اور جب تک ہم چار ہزار میل کی سرنگ کو کھود کر زمین کے مرکزی حصہ تک نہ پہنچیں وہاں کا صحیح حال معلوم نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ قلب زمین میں توبا اور نیکل دو دھاتیں ضرور پائی جاتی ہیں۔ زمین کی ساخت کے متعلق جو نظریہ قائم کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس کی بالائی سطح چٹان کی قسم کی ہے جو چار میل تک چلی گئی ہے، اس کے بعد گرینائٹ (GRANITE) کی پتھر صریح ہوتی ہے اس کی دھارت ۸ میل ہے، اس کے بعد باسلٹ (BASALT) یا ڈیوٹائٹ (DIABASE) کی پتھر جو ۱۲ میل تک چلی گئی ہے۔ اس کے بعد ڈونائٹ (DUNITE) پتھر کی پتھر ہے جو ۱۰۰۰ میل کی دھیر ہے، اس کے بعد رقیق حصہ شروع ہوتا ہے جو ۲۷۰۰ میل گہرا ہے۔

انسان اس وقت زمین کے اندر زیادہ گہرائی تک نہیں جاسکا ہے۔ سب سے بڑی کھدائی وہ ہے جو جنوبی افریقہ میں کی گئی ہے اور وہ دو میل سے زیادہ نہیں ہے، لیکن اتنے ہی حصہ کی مختلف گہرائیوں میں پہنچ کر جو ٹیپر کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر ستر فیٹ پر ایک درجہ گرمی بڑھ جاتی ہے اور اس حساب سے ڈھائی میل کے بعد زمین کا اندرونی درجہ حرارت ۱۰۰۰ (دو گری دو سو) میل پر دو ہزار اور ۴۰ میل پر تین ہزار سے زیادہ ہے۔

ہڈگسن (HODGSON) کا اندازہ یہ ہے کہ اگر تمام دنیا کے ذخیرہ زغال (کوئلہ) کو جمع کر کے اسے روشنی کیا جائے تو جو حرارت اس سے پیدا ہوگی اس کے مقابلہ میں زمین کی اندرونی حرارت تین گونہ زیادہ ہے اس حرارت کا اندازہ ایک حد تک ان گہرے چشموں سے ہو سکتا ہے جو زمین کی سطح پر آبل کر آگئے ہیں، مثلاً آئس لینڈ کے چشمے جن کی گرم بھاپ سے لوگ کھانا پکا لیتے ہیں اور مکاؤں کو گرم کر سکتے ہیں۔ نیوزیلینڈ میں ایک خاص مقام کی عورتوں کو جب آبلتے ہوئے پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو انھیں چشموں سے لے لیتی ہیں۔

سن فرنسکو کے قریب ایک جگہ تجربہ کے طور پر زمین میں سوراخ کیا گیا تو اس سے فی گھنٹہ ۴۵۰۰ پونڈ کے حساب سے بھاپ نکلنا شروع ہوئی جس کا دباؤ ہر مربع انچ پر ۵، پونڈ تھا۔ کیلی فورنیا میں ایک جگہ اس بھاپ کی مدد سے ہزار گھوٹوں کی قوت ایک انجن میں پیدا کی گئی۔ ان فرض زمین کے اندر قوت حرارت اور مختلف معدنی اشیاء کا جتنا بڑا ذخیرہ پایا جاتا ہے، اس کا صحیح علم

مشکل ہے لیکن اس کا تھوڑا بہت اندازہ آتش فشاں پہاڑوں سے ہو سکتا ہے جن سے پتھر کی چٹانیں گھل گھل کر اُبلنے لگتی ہیں۔

**آتش فشاں پہاڑ** اب سے قبل کچھ زمانہ تک عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آتش فشاں پہاڑوں سے جو مادہ ابھرتا ہے وہ زمین میں سے اُبلتا ہے۔ پھر چونکہ ایسے پہاڑ زیادہ تر سمندروں کے قریب ہی پائے جاتے ہیں، اس لئے قیاس کیا گیا کہ جب بانی ریس کر زمین کے اندر اس کے گرم مادہ تک پہنچتا ہے تو اس میں بیجان پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ان پہاڑوں کی چوٹیوں سے اُبل کر باہر آ جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک سبب آتش فشاں کا ہو سکتا ہے، لیکن بعض ایسے پہاڑ ہیں جن میں بھی آتش فشاں پانی گئی جو سمندر سے سیکڑوں میل دور ہیں تو اس نظر پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت ہوئی۔

چنانچہ اب جدید نظریہ اس باب میں یہ قائم کیا گیا ہے کہ ہر آتش فشاں پہاڑ کی بھی ملحدہ علحدہ ہوتی ہے اور اس کی جادو قوت ۶۰-۷۰ میل سے زیادہ گہرائی پر نہیں ہوتی۔ جب بڑی بڑی چٹانوں کا دباؤ زمین کے اس مادہ پر ہوتا ہے جو کسی شکل میں ان چٹانوں کے نیچے پایا جاتا ہے تو یہ گیس شگاف پیدا کر کے اوپر آتا چاہتی ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب کوئی آتش فشاں پہاڑ اُبلنے کو ہوتا ہے تو اس سے پہلے زلزلہ آتا ہے۔

زمین کے اندر سے جو گھسلا ہوا مادہ اُبل کر باہر آتا ہے وہ پہلے ہی سے زمین کے اندر پایا جاتا ہے جس میں پتھر، دھاتیں اور گیس سب ملی جلی ہوتی ہیں اور یہ سب کا سب باہر نہیں آ جاتا بلکہ اس کا کچھ حصہ اُبل پڑتا ہے اور باقی حصہ ٹھنڈا ہو کر زمین کے اندر ہی رہ جاتا ہے۔

یہ سمجھئے کہ آتش فشاں زیادہ تر پہاڑوں ہی سے ہوتی ہے جن کی بلندی کہیں کہیں ۲۰ ہزار فٹ ہے۔ لیکن کہیں کہیں زمین کے مسطح حصے بھی آگ اُٹھنے لگتے ہیں اور پھر لہو کے اجتماع سے ان کی شکل پہاڑ کے دہانے کی سی ہو جاتی ہے۔ لہذا اس قدر گرم ہوتا ہے کہ جب کہیں وہ بہ کر سمندر تک پہنچ جاتا ہے تو دور دور تک بانی گرم ہو جاتا ہے۔

جس وقت جولا کھی پھٹنے والا ہوتا ہے تو قدرت اس کی اطلاع پہلے ہی دے دیتی ہے۔ گھر گھر لوٹ کی آواز آنے لگتی ہے، زلزلہ کے جھٹکے محسوس ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ ابھرے جو زمین کے اندر دینی گرم حصہ تک بانی پہنچنے سے پیدا ہوتے ہیں، اوپر کی طرف چڑھتے ہیں جس سے زمین کی بالائی سطح کا پٹنہ لگتی ہے، اس کے بعد اندر دینی گرم مادہ جو پتھروں اور معدنی اشیاء کا ملبوہ ہوتا ہے، جولا کھی کے دہانے سے اُبلنے لگتا ہے اور جب یہ مادہ زیادہ ہوتا ہے تو باہر آنے کے لئے کئی دہانے بنا لیتا ہے اور پہاڑ کے پہلوؤں میں شگاف پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ ایتنا (ETNA) پہاڑ میں اس طرح ۲۰۰ دہانے نظر آتے ہیں۔

وِسوویس (VESUVIUS) مشہور جولا کھی پہاڑ ہے جو صدیوں تک ٹھنڈا رہا یہاں تک کہ اس کے آس پاس درختوں کا ایک جنگل آگ آیا اور تین شہر اس کے دامن میں مستحکم آباد ہو گئے جن میں ایک مشہور تاریخی شہر پمپائی (POMPEII) بھی تھا، لیکن ایک دن دفعتاً وہاں زلزلہ آیا (۷۹ء) اور ہزاروں عمارتیں گر گئیں، لیکن پھر بھی لوگوں نے زیادہ پروا نہ کی، یہاں تک کہ ۱۶۳۰ء میں وہ پوری قوت کے ساتھ پھوٹ پڑا اور تمام اطراف کی آبادی ہلاک ہو گئی اور مکانات ۲۰ فٹ زمین کے اندر دھنس گئے۔

اس کے ۱۵۲۱ سال بعد ۱۷۹۳ء میں پھر یہی ہوا اور ۱۸۰۰ آدمی ہلاک ہوئے۔ ۱۸۹۲ء میں پھر اس کا لہو (دھنسیں مادہ) بارہ سو فٹ کی چوٹائی میں اُبل پڑا اور بہ کر سمندر تک جا پہنچا۔ اس کے بعد ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء میں پھر آتش فشاں شروع ہوئی اور یہ اتنی سخت تھی کہ اس کی وادی میں ایک میل گہرا اور ایک میل چوڑا غار پیدا ہو گیا۔

انیسویں صدی کے اخیر میں جاوا اور سہاترا کے درمیان کرکوتا (KARAKOTA) جزیرہ کا جولا کھی جو ۲۰۰ سال سے ساکن تھا، دفعتاً پھوٹ پڑا اور جزیرہ کی ۸ مربع میل زمین کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا اور اس کا غبار تمام کرہ زمین پر چھا گیا۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ دنیا میں اس طرح کے ۳۰۰ بڑے بڑے جولا کھی پہاڑ پائے جاتے ہیں اور اگر ان سب کی آتش فشاں ہوں

کی تباہیوں کو سامنے رکھا جائے تو اس میں شک نہیں وہ آذر زمین کی ہلاکت آفرینی کی بڑی دردناک داستان ہوگی۔  
برہائے اعظم جس طرح زمین کی تخلیق کے بارے میں مختلف نظریے قائم کئے گئے ہیں، اسی طرح برہائے اعظم کے وجود میں آنے کی بابت بھی لوگوں کے نظریے مختلف ہیں۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ زمین کے خشک اور آبی حصوں کی تقسیم میں کافی تبدیلیاں ہوئی ہیں، زمین کی جنبش و حرکت سے کبھی خشک حصے پانی میں ڈوب گئے اور کبھی پانی کے اندر کی زمین اُسے خشک حصہ بن گئی اور اس طرح رفتہ رفتہ موجودہ برہائے اعظم وجود میں آئے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اول اول جب زمین بن رہی تھی اور بے شمار چھوٹے چھوٹے اجرام سماوی اپنے اپنے جذبہ کمر کے اپنے حجم کو بڑھا رہی تھی، تو ان اجرام کے ذرے کثیر مقدار میں ان مقامات پر جمع ہونے لگے جہاں بارش زیادہ ہوتی تھی، اور اس طرح خشکی کے حصے ان مقامات پر زیادہ نمایاں ہونے لگے، لیکن یہ خشک حصے کہاں کہاں کس شکل و نوعیت کے تھے اور بعد کو ان میں کیا تغیر پیدا ہوا، اس باب میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا، لیکن ماہرین طبقات الارض (GEOLOGY) کا خیال ہے کہ سمندروں میں بحر ہاسفک یا بحر الکاہل قدیم ترین سمندر ہے اور بحر اٹلانٹک اور بحر ہند بہت بعد کے سمندر ہیں۔ رہا خشکی کا حصہ اور اس کی تقسیم برہائے اعظم میں، سو اس کے متعلق ماہرین کا خیال یہ ہے کہ اب سے ۲۰ کروڑ سال قبل پانچ برہائے اعظم پائے جاتے تھے لیکن ان کی جگہ وقوع وہ نہ تھی جو اس وقت پائی جاتی ہے۔

سب سے بڑا برہائے اعظم وہ تھا جو موجودہ ہیونسس (BUCK-SAYRES) سے ہائیٹیک وسیع تھا، دوسرا برہائے اعظم منگولیا سے موجودہ نیوزیلینڈ تک پھیلا ہوا تھا اور ان دونوں برہائے اعظم کے درمیان پانی کا ایک حصہ حائل تھا جسے اب آبنائے بنگال کہتے ہیں۔ تیسرا برہائے اعظم وہ تھا جسے اب شمالی امریکہ کہتے ہیں، لیکن پہلے شمالی امریکہ کے موجودہ آٹاہ (UTAH) سے ناروے تک پھیلا ہوا تھا، چوتھا برہائے اعظم شمال کی طرف تھا (آسٹریلیا کے برابر) اور تیسرے اور چوتھے برہائے اعظم کے درمیان آبنائے آسٹریلیڈ حائل تھی۔ پانچواں سب سے چھوٹا برہائے اعظم وہ تھا جسے اب ترکستان کہتے ہیں، یہ برہائے اعظم دو خلیج رکھتا تھا، تاریم (TARIM) اور تبت، کوہستان اور ال (URAL) جو اس وقت ایشیا و یورپ کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے، پہلے بحر ساگیئیا میں صرف ایک جزیرہ تھا برطانیہ کے برابر اور موجودہ یورپ مجموعہ تھا متعدد جزائر کا۔ جن میں بارہ بڑے جزیرے تھے اور ان میں اسپین، برطانیہ (BRITANNY) اور آئرلینڈ بھی شامل تھے، چھوٹے چھوٹے متعدد جزیروں میں یوہینیا، اسکاٹ لینڈ اور انگلینڈ شامل تھے۔ ان برہائے اعظم کی شکل اور جائے وقوع ایسی تھی کہ جنوبی امریکہ سے کوئبو (لاک) تک خشکی کا سفر ہو سکتا تھا۔ جنوبی برہائے اعظم ایک بیضیادسی شکل کی خلیج بھی رکھتا تھا جو موجودہ بحر ہند کا نصف مغربی حصہ ہے۔ اس خلیج کے بالائی ساحل پر واقع تھا اور زیریں ساحل پر ممبئی۔ یہ اندازہ موجودہ پہاڑوں اور چٹانوں کی ساخت کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔

اس وقت چھ برہائے اعظم ہیں :- یورپ، ایشیا، افریقہ، امریکہ، آسٹریلیا اور اٹارکٹیا۔ بعض ماہرین جغرافیہ یورپ و ایشیا کو ایک ہی گروپ میں شامل کر کے اسے یوریشیا (EURASIA) کہتے ہیں۔

ان میں یورپ کا رقبہ جو سب سے زیادہ گنتی آبادی رکھتا ہے ۳۵ لاکھ مربع میل ہے، افریقہ کا رقبہ ۱۸۴۵۰۰۰۰ مربع میل ہے امریکہ کا ۱۶۰۰۰۰۰ مربع میل، ایشیا کا ۱۶۲۵۰۰۰۰ مربع میل، آسٹریلیا کا ۴۵۰۰۰۰۰ مربع میل اور اٹارکٹیا کا ۵۰۰۰۰۰۰ مربع میل تمام سمندروں کا مجموعی رقبہ ۱۴۰۰۰۰۰۰ مربع میل ہے۔ بحر ہاسفک کا رقبہ ۶۰۰۰۰۰۰۰ مربع میل ہے۔ اٹلانٹک کا ۳۴۰۰۰۰۰۰ مربع میل، بحر ہند کا ۱۸۰۰۰۰۰۰ مربع میل، بحر آرکٹک کا ۵۴۰۰۰۰۰۰ مربع میل اور بحر اٹلانٹک کا ۱۰۲۰۰۰۰۰۰ مربع میل۔ سب سے زیادہ شور پانی بحرِ سرخ کا ہے۔

بحر ہاسفک سب سے زیادہ گہرا سمندر ہے جس کی گہرائی کہیں کہیں ۳۰ ہزار فٹ ہے اور ۳۰۲۸ فٹ سے کم کسی جگہ نہیں ہے۔

لفظ یورپ کو بعض لوگ ساطیقی زبان سے ماخوذ سمجھتے ہیں جس کے معنی ”سرزمین غروب“ کے ہیں، لیکن ہروڈوٹس وجہ تسمیہ (مشہور یونانی مورخ) اس کا مخالف ہے وہ کہتا ہے کہ اس لفظ کے معنی کسی کو نہیں معلوم اور اس کا استعمال سب سے پہلے مناجات اپانودیتا کی نظم میں کیا گیا تھا۔

لفظ ایشیا کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اسیرا والے برعظم کو آسو (یعنی سرزمین طلوع) کے نام سے یاد کرتے تھے اور یہی لفظ ایشیا ہو گیا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ ایک ساطیقی لفظ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ”درمیانی یا وسطی“ کے ہیں یا پھر سنسکرت کے اس لفظ سے نکلا ہے جس کے معنی ”صبح“ کے ہیں۔ افریقہ کو زمانہ قدیم میں لیبیا (LIBYA) کہتے تھے لیکن چونکہ اقوام بربر کو اپنی رومنہ افریقہ کہتے تھے، اس لئے ان کے مسکن کا نام افریقہ ہو گیا۔

امریکہ کا نام فلورس کے ایک سیاح امریکن (AMERICAS) سے تعلق رکھتا ہے۔ جس نے سب سے پہلے اس سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ آسٹریلیا کی دریافت سے پہلے ہی اس لوح کے لوگ اس کے پائے جانے کا عقیدہ رکھتے تھے اور اس ذہنی سرزمین کو ٹرا آسٹریلیا (TERRA AUSTRALIA) کے نام سے پکارتے تھے، اس لئے جب یہ سرزمین دریافت ہوئی تو وہ آسٹریلیا کہلانے لگی۔

یونٹو فطرت اور زمین کی قوت کا اندازہ طوفانوں، آندھریوں اور آتش فشاں پہاڑوں سے بھی ہوتا ہے، لیکن زمین کی زلزلہ قوت کا سب سے بڑا مظاہرہ زلزلہ ہے، جو چند سکند میں لاکھوں جانداروں اور مضبوط سی مضبوط عمارتوں کو خاک میں ملا سکتا ہے۔

زلزلہ، یوں سمجھو کہ زمین کے جسم کی جھجھری ہے جس کا اثر زمین کی بالائی ذریعہ دونوں حصوں پر ہوتا ہے۔ زلزلہ گویا ایک اندرونی لہر ہے جو اوپر کی طرف آتی ہے اور چٹانوں، میدانوں، پہاڑوں اور سمندروں کو ہلا کر رکھ دیتی ہے، جو جھٹکے زمین کے زیادہ سخت ہیں جیسے پہاڑ وغیرہ ان پر کم اثر ہوتا ہے اور جو جھٹکے زیادہ نرم ہیں وہ بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ زلزلہ کی ابتدا گھڑ گھڑاہٹ سے ہوتی ہے جیسے ٹرین یا سبھاری لاری کی گھڑ گھڑاہٹ، اس کے بعد اس کی پہلی کپکپی شروع ہوتی ہے، جو آہستہ آہستہ جڑھتی ہے اور پھر کم ہو جاتی ہے، لیکن انھیں چند لمحوں کے اندر قیامت برپا کر جاتی ہے۔

زلزلہ اکثر سمندر کے اندر یا سمندر کے قریب سے شروع ہوتے ہیں اور جب ایسا ہوتا ہے تو پانی میں بڑی اونچی اونچی لہریں اٹھنے لگتی ہیں، یہاں کبھی مرتبہ وہ ۱۰۰ فٹ کی بلندی تک پہنچ جاتی ہیں اور بہت دور تک یعنی کبھی کبھی دس ہزار میل تک ان کا سلسلہ پہنچ جاتا ہے۔

صحیح ہے کہ زلزلہ کا دائرہ محدود ہوتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ کسی ایک علاقہ کا زلزلہ تمام کمرہ زمین میں محسوس کیا جائے لیکن ایسا اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی مقام پر زلزلوں کا حملہ مسلسل ہوتا ہے۔ مثلاً جاپان کدہاں ۱۸ سال کے عرصہ میں ۱۴ بار زلزلہ کے جھٹکے محسوس کئے گئے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ زلزلہ کہیں کہیں خاص زمانہ میں اور متعین وقفوں کے بعد محسوس کئے جاتے ہیں۔ بعض ماہرین نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ چاند کی پہلی اور تیسریوں تاریخوں سے اس کا خاص تعلق ہے۔

سب سے زیادہ تباہ کن زلزلہ بیسویں صدی کا وہ تھا جو ۱۹۲۳ء میں ٹوکیو اور یوکوبا میں محسوس کیا گیا۔ اس میں ۱۴۰۰۰ جانیں ضائع ہوئیں، یعنی قریب قریب اتنی ہی جانیں جتنی روس و جاپان کی جنگ (۱۹۰۵ء) میں ضائع ہوئی تھیں۔ زلزلوں کی تعداد بھی ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ اس زلزلہ میں پانچ لاکھ گھر تباہ ہوئے، ۲۰ لاکھ آدمی خانہاں برباد ہو گئے اور ۵۰ لاکھ آدمی مالی نقصان ہوا۔

اطالیہ کے زلزلہ (۱۹۱۵ء) میں ۳۷۰ شہر و قصبات تباہ ہوئے اور تیس ہزار جاں ضایع ہوئیں۔ اسی طرح ۱۹۰۶ء میں صقلیہ (سیسیلی) کے ۴۴۲ آدمی ضایع ہوئے اور ۹۵ ہزار مجروح - سمندر کے ساحل ۱۰ فٹ اونچے ہو گئے۔

یورپ میں لیبی (LIBYAN) کا وہ زلزلہ جو ۱۹۵۵ء میں آیا تھا، بڑا تباہ کن زلزلہ تھا جو ایک ہی دن میں تین بار محسوس کیا گیا اور تقریباً ۱۰ ہزار آدمی ہلاک ہوئے۔

ہندوستان میں ایک زلزلہ بہت بڑا ۱۹۳۷ء میں آیا جس نے تین لاکھ انسانوں کو فنا کیا اور دوسرا زلزلہ کوئٹہ بلوچستان کا تھا (۱۹۳۵ء) یہ صبح کو ۳ بجے محسوس ہوا اور صرف دو منٹ رہا لیکن اتنے ہی ثقیل عرصہ میں ۵۶ ہزار انسانوں کو ہلاک کر گیا۔ اس سے ۱۸ مہینے پہلے بہار میں جو زلزلہ آیا تھا وہ اس سے بھی زیادہ سخت تھا۔ اس میں بہار کے بارہ شہر و قصبات ویران و برباد ہوئے اور پورا ۱۸ ہزار مربع میل کا رقبہ ریت کے اندر دھنس گیا۔

۱۹۳۷ء میں اسی طرح کا زلزلہ چین کے صوبہ کانسو میں محسوس کیا گیا۔ اس میں بہت سے شہروں کی صورت بدل گئی، ہزاروں مکان مسمار ہو گئے، دریائوں کا بہاؤ رک گیا اور نہ جانے کتنی پہاڑیاں مسطح میدان ہو گئیں، اور ۳۰ لاکھ آدمی زمین کے اندر دھنس گئے۔

یورپ و امریکہ وغیرہ میں بھی کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو زلزلوں کی تباہ کاریوں کا شکار نہ ہوا ہو۔

پروفیسر لاسن (LAWSON) ایک بڑا قرین قیاس نگار زلزلہ کا قیام کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب زمین کے اندر کی چٹانیں جب اپنی جگہ سے سرکتی ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہیں تو ان کے ساتھ زمین کا وہ حصہ بھی جو ان سے متعلق ہے حرکت میں آتا ہے اور اسی حرکت کا نام زلزلہ ہے۔

جب سمندر میں زلزلہ آتا ہے تو بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرے غرقاب ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے جزیرے ابھر آتے ہیں۔

آپ دنیا کا نقشہ اٹھا کر دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس میں تین خطے ایسے ہیں جو بالکل سنسان و غیر آباد ریگستان ہیں۔ دو خطے انتہائی شمال و جنوب کے بالکل برف پوش ہیں، تیسرا خطہ وسط زمین میں ریگستان کا ہے جو افریقہ سے شروع ہو کر شام، عراق، عرب، بلوچستان، ایران، افغانستان اور چین تک پھیلا ہوا ہے۔

قطبین کے برفستانی حصے تو ہمیشہ سے ایسے ہی چلے آتے ہیں، لیکن ریگستانی حصہ میں بعض علاقے ضرور ایسے ہیں جو کسی وقت آباد اور سرسبز و شاداب تھے۔ افریقہ کا ریگستان گو بی (GOBI) کسی وقت سبزہ زار تھا، لیکن بعد کو وہ ریگستان میں تبدیل ہو گیا جس میں اب بھی جا بجا ٹخستان پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح عراق اور وسط ایشیا کے ریگستانی علاقے نہ صرف یہ کہ وہ کسی وقت آباد تھے بلکہ ترقی یافتہ بھی تھے، جیسا کہ بابل، فنوآ اور آگر کے کھنڈروں اور وہاں کے قدیم کتبات سے ظاہر ہوتا ہے۔

جب سے عہد تاریخ شروع ہوا ہے، اس وقت سے میکر زمانہ حال تک ریگستانی حصہ زمین میں بہت زیادہ وسعت ہو گئی ہے اور اس سے ماہرین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ زمین خشک ہوتی جا رہی ہے اور پانی کا حصہ کم ہو رہا ہے اور صحابہ بن بن کر فضا میں لٹا جاتا ہے۔ سمندروں کی سطح بھی مایل بہ نشیب ہوتی جا رہی ہے اور بہت سے جمیل نامند خشک ہو چکے ہیں، جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا بارش رفتہ رفتہ کم ہوتی جائے گی، دریا خشک ہونے لگیں گے، سمندر کی سطح گھٹتی جائے گی، لیکن یہ عمل اتنا آہستہ آہستہ ہو رہا ہے کہ انسانی زندگی پر اس کا اثر محسوس نہیں کیا جاتا۔

مغربی یورپ کے معتدل درجہ حرارت رکھنے والے ملکوں میں متعدد مثالیں ایسی ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں بعض اچھی خاصی بلند عمارتیں بھی ریت کے اندر دب گئیں، چنانچہ سوئٹھ کارنوال کا گرجا سات سال ریت کے اندر دفن رہنے کے بعد ۱۸۳۵ء میں ریت ہٹا کر باہر نکالا گیا۔

حالِ محفل دمہ حرارت رکھنے والے ملکوں کا ہے، جہاں ہوا زیادہ تیز نہیں چلتی، لیکن جن ممالک میں زیادہ آذھیال آتی

رہتی ہیں وہاں اس قسم کی مثالیں بہت ملتی ہیں، چنانچہ افریقہ وغیرہ میں تو ریت کے تودے ۶۰۰ فٹ کی بلندی تک پہنچ جاتے ہیں اور بڑی بڑی عمارتوں کو اپنے اندر لے لیتے ہیں۔

افریقہ کا ریگستانی علاقہ جس میں طرابلس وغیرہ شامل ہے سب سے بڑا ریگستان ہے جس کا رقبہ ۳۵ لاکھ مربع میل ہے (گویا یورپ کے برابر)۔ یہاں درجہ حرارت دن میں ۱۴۰ درجہ تک پہنچ جاتا ہے اور رات کو دفعتاً بہت گرجاتا ہے، اسی کے ساتھ جوا نہایت تیز چلتی ہے اس لئے اس کا اثر وہاں کی پہاڑیوں اور چٹانوں پر یہ ہوتا ہے کہ وہ ٹوٹ ٹوٹ کر میدان بنتی جاتی ہیں، یہاں اب بھی ہزاروں فٹ بلند پہاڑ پائے جاتے ہیں، لیکن ایک دن ان سب کو آہستہ آہستہ ہوا اور ریت کے حملہ سے فنا ہونا ہے۔ یہاں کے ریگستانی میں ایسے نشانات بھی ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ بعض دریاؤں کے رخ بدل گئے، بہت سے شاداب علاقے خشک ہو گئے اور متعدد آبادیاں ختم ہو گئیں۔

اس ریگستان کے اندر کیا چیزیں دب کر فنا ہو چکی ہیں، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر انڈروز کو یہاں کھدائی کے سلسلہ میں ۲۰، ۲۰ ہزار سال قبل کی اشیاء دستیاب ہوئیں جن میں بارہ انڈس طائر دیناسور کے بھی ہیں جو اب سے ایک کروڑ سال قبل پایا جاتا تھا۔ اور اس سے یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ اب سے دس لاکھ سال قبل یہاں انسان آباد ہو چکا تھا۔ یہاں ایک پہاڑ ریت کا بھی ہے جو مسلسل چھ میل تک چلا گیا ہے۔

ریگستان لیبیا کی کھدائی سے بہت سے پیرائے برش، سنگل، نقوش اور عمارتی نشانات دریافت ہوئے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ ہزاروں سال قبل یہاں شہر کے شہر آباد تھے، جنہیں بعد کو ہوا اور ریت نے تباہ کر دیا۔ اور اس کو دیکھ کر بے آفا غالب کا یہ مصرعہ یاد آ جاتا ہے:-

خاک میں کیا سورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

## رعایتی اعلان

من ویزداں — مذہبی استفسارات و جوابات — نگارستان — جہانستان — شہوانیات —  
مکتوبات نیاز تین حصے — انتقادات — مالہ و ما علیہ — حسن کی عیاریاں — شہاب کی سرگزشت —  
فلاسفہ قدیم — مجموعہ استفسار و جواب جلد سوم — فرست الید — نقاب اٹھ جانے کے بعد —

میزبان  
شعبہ

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف تین تالیس روپے میں مل سکتی ہیں

مینجر نگار لکھنؤ

# تیری ایک غیر مطبوعہ مثنوی

(کدخدائی بش سنگھ)

(ڈاکٹر گیان چند)

ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد کے کتب خانے میں دیوان تیر کا قدیم ترین مخطوطہ ہے۔ اس کی کتابت ۱۹۱۱ء میں ہوئی۔ تیر ۱۱۹۷ھ میں دلی سے لکھنؤ گئے۔ دیوان کے اس نسخہ کی مثنویوں کی فہرست ادارہ کے تذکرہ مخطوطات اردو میں ہے۔ فہرست میں منجملہ دیگر مثنویوں کے ایک مثنوی کا عنوان حسب ذیل تھا:-

”در بیان کدخدائی بش سنگھ پسر خرد راجہ ناگرل کہ بر فقیر حقہا داشتند“

عنوان دیکھ کر مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ کوئی نئی غیر مطبوعہ مثنوی ہے۔ اس کی نقل حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کئی ماہ کے بعد بھی ناکام رہا۔ آخر میں نے ڈاکٹر زکریا لکھانوی سے کہا کہ وہ اپنے کمال غلام سے فوراً اس کا نقل کر کے بھیج دیں۔ ان کے اس کرم اور اوفادہ کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے۔

راجہ ناگرل، دلی کا ایک سردار تھا۔ ۱۵۵۷ء میں جب تیر کوتلی میں فوت ہوئے تو ان کے مرنے والے چھوٹے بیٹے نے ان کو ناگرل سے متعارف کر دیا۔ ذکر تیر میں ناگرل کا تذکرہ ہے یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ کتنے سال ناگرل کی سرپرستی میں رہے لیکن یہ طے ہے کہ یہ تعلق ۱۵۷۰ء اور ۱۵۷۵ء کے درمیان تھا۔ یہ زمانہ دلی والوں کے لئے بڑی مصیبت کا دور تھا۔ آئے دن اہلی۔ مرہٹے۔ سورج مل۔ نجیب الدولہ وغیرہ دلی پر حملہ کر کے قتل و غارت کیا کرتے تھے۔

اس مثنوی میں ۷۹ اشعار ہیں جن میں دو غزلیں بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اس میں راجہ ناگرل کے بیٹے بش سنگھ کی شادی پر اظہار مسرت کیا گیا ہے۔ اس مثنوی کا ایک پُر اسرار پہلو یہ ہے کہ اس کے کئی سال بعد تیر نے ایک مثنوی ”در بیان کدخدائی نواب آصف الدولہ بہادر، لکھی۔ انھوں نے کدخدائی بش سنگھ دلی مثنوی میں کچھ ترمیم کر کے وہی نظم آصف الدولہ کی خدمت میں پیش کر دی۔ کدخدائی آصف الدولہ میں ۱۱ شعر ہیں جن میں سے ۱۰ شعروں کے توں پہلی مثنوی کے ہیں۔ ان کے علاوہ چار پانچ شعر ایسے ہیں جن میں خفیف سی ترمیم کر لی ہے۔ بعض اشعار کا ایک مصرع پہلی مثنوی کا ہے اور دوسرا یہ کہ کہ شامل کر دیا ہے۔ اشعار کی ترتیب بالکل الٹ پلٹ دی ہے۔ تقابل کے لئے چند ترمیم شدہ اشعار درج کرتا ہوں۔ ان میں سے دو شعروں میں راجہ کا ذکر کس چابکدستی سے نکال دیا ہے۔

کدخدائی بش سنگھ

کدخدائی آصف الدولہ

از سر نو جواں ہوا ہے جہاں  
کدخدائی بش سنگھ ہے یہاں

نئے سرے جواں ہوا ہے جہاں  
عیش و عشرت کے محو خود و گلاں

دستِ ماحبہ ہیں ابر نیسانی  
متصل کرتے ہیں درِ افشانی  
دے نہ وہ شیشہ اب جو باقی ہے  
مُن ایسا بھی اتفاتی ہے  
کسمانے میں ران سے اڑ جائے  
ہاتھ تپتے ہیں جیسے گل مڑ جائے  
دستِ دستور ہیر نیسانی ہے  
یعنی یک دست گوہر افشاں ہے  
ساقیا دے وہ سے جو باقی ہے  
شادی ایسی بھی اتفاتی ہے  
کسمانے میں باؤ سے آگے  
ہاں کہے عیب وہم جالانگے

میں نے ان اشعار کو اس مشترک اشعار میں شمار نہیں کیا۔ کہ خدائی بنش نگہ کو کہ خدائی آصف الدولہ کی ابتدائی شکل کہہ سکتے ہیں۔ میر دست، دوسری شاعری کو فراموش کر کے زیر بحث شاعری کے بارے میں کچھ لکھا جاتا ہے۔  
اس شاعری میں تیر نے ایسی نشاۃ فضا باندھی ہے اور اس جوش و مستی کے ساتھ ساقی سے گفتگو کی ہے کہ تیر جیسے قنوطی شاعر نے اس کی امید نہ کی جاسکتی تھی۔ شاعری کا پہلا شعر ہے:

آؤ ساقی کہ بزمِ عشرت ہے  
آؤ مطلب لے رباب اور پیٹنگ  
شادمانی سے ہو نوا پرواز،  
آؤ ساقی کہ جمع ہیں احباب  
لا کہاں ہے وہ لاکہ رنگ شراب  
آؤ ساقی کہ روشنی ہے خوب  
نارِ مشعل نے نارِ کھینچا  
کثرتِ روشنی سے شب ہے ریز  
اسا پری کو نکال شیشے سے

تین بے نظیر اشعار پیش کرتا ہوں جو ساقی سے خطاب کئے گئے ہیں :-

آؤ مطلب ہو زمزمہ پرداز،  
گلِ دلالت سے چشم باز کرے  
چھپر سازِ طرب نوا کے تئیں  
وہ بہارِ گزشتہ کو آواز  
رنگِ صحبت کو دیکھ ناز کرے  
باندرہ آواز سے ہوا کے تئیں

ع۔ دے بہارِ گزشتہ کو آواز - ۶ - باندرہ آواز سے ہوا کے تئیں - ان مصرعوں کا مصنف کوئی خدائے سخن

ہی ہو سکتا ہے۔ تیر کو موسیقی کی تاثیر کا شدید احساس تھا۔ سستی نے جس اسی انداز کا ایک شعر لکھا ہے :-

غزل اس نے چھپڑی مجھے ساز دینا  
شادی کی سواری سے متعلق شاعر کی گہرا غمی ملاحظہ کیجئے :-

پھینکتے ہیں جو دستہ دستہ گل  
برقِ پارہ جو جست جستہ ہیں  
گردنوں میں پڑیں مہایل گل  
وہ گزریں ہیں رستہ رستہ گل  
سیکڑوں ویسے بال بستہ ہیں  
ہیر جلو ہیں ہند شامل گل

تیر کی اس شاعری پر شروع سے آخر تک نشاۃ کا ارجوانی بادل چھایا ہوا ہے۔ ان اشعار میں شباب و شعر بہار و نغمہ

شراب و گل انگڑائیاں لیتے نظر آتے ہیں۔ مثنوی کی زبان آبِ زلال کی طرح صاف اور شیریں اور آبِ رواں کی طرح نرم رو ہے۔ چونکہ یہ پوری مثنوی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے اس لئے ذیل میں تمام و کمال درج کی جاتی ہے۔ اس مثنوی کے جو اشعار بعینہ کدخدائی آصفیہ لکھنؤ میں لے لے گئے اور کلمیات میر میں شایع ہو گئے ان میں ’م‘ یعنی ’مطبوعہ لکھنؤ‘ دیا گیا ہے۔ درمبارک ہادی کدخدائی بٹن سنگھ پسر خورو باجہ ناگہریں کے برقیہ نقیہ داشتند۔

آؤ ساقی کہ بزم عشرت ہے	م	چشم بدور خوب حجت ہے
از سر نو جواں ہوا ہے جہاں		کدخدائی بٹن سنگھ ہے یہاں
فرط شادی سے دل ہے جن آباد		ہر طرف ہے بہم مبارکباد
باؤ کرتی پھرے ہے پھول نثار		گلشن دہر میں ہے تازہ بہار
آؤ مطرب لے رباب اور چنگ	م	کاڑھ موخہ سے فوائے سیر آہنگ
شادمانی سے ہو نوا پرداز		اہل مجلس ہیں گوش بر آواز
یاں سواد دل خوشی کے کام نہیں		چپکے رہنے کا یہ مقام نہیں
آؤ ساقی کہ جمع ہیں احباب	م	سب جیتا ہیں عیش کے اسباب
لاؤ ہوں آفتاب ساغر زر	م	آبِ گلرنگ سے لبالب کر
آج جھوٹا ہے ابر کچھش زور	م	کچھ نظر ہے تجھے ہوا کی اور
دستِ راحب ہیں ابر نیسانی		منقول کرتے ہیں در انشائی
کرچیں زار و دشت دل کش سیر	م	میں نہ سال آج آشنا و غیر
گل نمونہ دل شلفہ سب لے گئے		خاموش فائزہ سبھوں کو دئے
زور گوہر دئے زبس ساقی		کچھ نہیں بھروسہ میں باقی
لاکھان ہے وہ لالہ رنگ شراب	م	جس سے متا گزارہ ہوں اسباب
آصفیہ غزل سرائی کر	م	کچھ مزہ سے بھی آشنا بنی
پڑھ غزل تیر کی جو ہو، یاد	م	اس کو اس فن میں کہتے ہیں استاد

ساقیا موسم جوانی ہے

کر دے بادہ کی کامرانی ہے

دے پیالہ کہ نقل مجلس عیش		خوب رواں کی بڑ باقی ہے
لاؤ آبِ کشادہ دل کو گھول		عین اداں و مہر باقی ہے
روئے خواب سے بزم کا ہے فروغ		شمع خیل سے پانی پانی ہے
رنگ گلزار ہے یہ صحبت عیش		شش بہت جو شش نجی فشانہ ہے
آؤ مطرب ہوں زمرہ پرداز	م	دے بہار گزار شستہ کو آواز
گل لالہ چہ چشم از کر	م	رنگ صحبت کو دیکھ ناز کر
چیمبر ساز مطرب نوا کے تیش	م	باندہ آواز سے ہوا کے تیش
دہد میں لاؤ سے پزستوں کو	م	یاد دے رنگ سر و دستوں کو



خوش سواری و خوش جلو خوش راہ م  
کسمانے میں ران کے اڑ جائے  
ہے تو گلگوں بہار کا خوش رنگ  
دور دو ہے اگرچہ اسپ خیال  
ہے مرصع جو اس کی زین و لگام  
باگ اس کی جو ٹک اپک جائے  
دے نہ وہ شیشہ اب جو باقی ہے  
جب سے ہے اس جہاں کی آبادی  
ہو مبارک یہ جشن خوش انجام م  
آؤ ساقی پڑھیں غزل کوئی  
موسم ابر ہے سب جو بھی ہو م  
کب تک آئینہ کا یہ حسن قبول م  
کس کو ٹپل ہے دم کشی کا داغ م  
ہے غرض عشق صرف ہے لیکن م  
ہو جو تیرا سا رنگ گل کا ہے م  
دل تمنا کدہ تو ہے یہ یہاں م  
سرکشی گل کی خوش نہیں آتی م  
پائے اس کمر کو دست شوق  
روکش تیر ہوتے نا شاعر

چھیڑ دیجئے تو پھر نہ کٹھرنے نگاہ  
ہاتھ ہلتے ہیں جیسے گل مر جائے  
کام ہے اس پہ اسکے حسن سے تنگ  
بھول جاتا ہے اس کے آگے چال  
چشم کرتے ہیں حشر کے ہر کام  
پارہ برق سا چمک جائے  
حسن ابسا بھی اتفاقی ہے  
تب سے ایسی نہیں ہوئی شادی  
دور گردوں بکام عیش مدام م  
درمیاں اب نہیں خلل کوئی  
گل ہو گلشن ہو ایک تو بھی ہو م  
منہ تیرا اس طرف کھنکھاتی ہو م  
ہو زگل ہی کی گفتگو بھی ہو م  
شرط ہے یہ کہ جستجو ایسی ہو م  
ریکیں ہم تب جب اپنی تو بھی ہو م  
ہو تو تیری ہی آرزو بھی ہو م  
ناز کرنے کو دیسا رو بھی ہو م  
جو نمایاں بہتدیر مو بھی ہو  
جب انھیں ویسی آبرو بھی ہو

## ”نگار“ کے پچھلے تین سالنامے

سالنامہ ۱۳۵۶ء جس میں علم ”فرست التحریر“ کے اصول پیش کئے گئے تھے اور جن کو دیکھ کر آپ ایک شخص کا سوا و خط دیکھ کر اس کے  
کیڑ کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ صرف ایک کاپی باقی ہے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول  
اس میں ”ڈراما اصحاب کہف“ ادیب کے قلم سے پورا شائع ہوا ہے اور ”خلافت و امامت“ کے نام پر گفتگو کا آغاز  
ہوا ہے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول  
اس میں ”تاریخ اسلامی“ کے عہد خلافت و امامت پر مختتم بحث کی گئی ہے جس کی ابتدا ۱۳۳۸ھ  
میں ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

مینجر نگار لکھنؤ

# شہاب اشرف

(بھوپال کا ایک خالص غزل گو شاعر)

(سید حامد حسین ایم۔ اے)

غزل کی نہ کوئی تعریف ہے، نہ کوئی اقلیدس اور نہ کوئی منطق۔ وہ دکھے دل کی سدا، جذبہ کی ہلک اور ہجہ کی ایک لہریش ہے۔ زندگی کی وہ انجانی مٹھاس، وہ دھیمی غلغلہ جو شاعر کے احساس میں ابھرتی ہے اور جس کا روپ اس کے ذہن میں اپنا بیتا ہوا گھونٹ کھوتا ہے، غزل کی لے میں اپنا کیف، اپنا گریز گھول دیتی ہے۔ نہ جانے کتنے تخیل کے جگنو، نہ جانے کتنی یادوں کے سائے، نہ جانے کتنے تصورات کے جھونکے، حساس شاعر کے ذہن کے دروازے سے داخل ہو کر اس کی روح میں اترتے رہتے ہیں اور اس کی روح ایک انوکھے وجود کے ساتھ ان کو اپنی تخلیق کا پیکر دیتی ہے، کرفوں کو راگ دیتی ہے اور سیالوں کو آواز۔ غزل کا شاعر ان میں سے ہر کرم کو پہچانتا ہے، ہر سائے کو نام دینا چاہتا ہے۔ اس کے لئے ہر سایہ اپنے دامن میں ایک جہان چھپائے ہوتا ہے۔ اس دنیا کو وہ اپنی ہلک دار روح میں ڈوب کر، اپنے تخیل کی چمکدار ردا اوڑھ کر، اپنے جذبہ کی کسک اپنے سینہ میں دبائے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ ایک اچھے غزل گو، بلکہ ایک خالص غزل گو کی شاعری، ایک مدہم احساس کی رو، ایک ان سنی موسیقی کے سیلان، ایک ان دیکھے قص کی حرکت کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ اسی لئے اس کی نہ کوئی تعریف ممکن ہے، نہ کوئی اقلیدس اور نہ کوئی منطق۔ غزل گو شاعر کا کردار، اس کا جذباتی کردار ہوتا ہے۔ اس کی آواز، اس کے جذبہ کی لہریش ہوتی ہے، اس کے الفاظ اس کے احساس کی پیداوار ہوتے ہیں اور اس کی تشبیہیں اس کے تجربات کی جھلکار سے پیدا ہوتی ہیں۔ غزل گو شاعر ایک داخلی فن کار ہے اور ایک عظیم فن کار، جو ذروں کے سینہ سے ستاروں کی روشنی لیتا ہے، جو قطروں سے موتی کی آب پاتا ہے اور جس کا ذہن، جن کا تخلیقی عمل ان کو ایک نیا تخلیقی حسن دیتا ہے۔

شہاب کی غزل خالص غزل ہے۔۔۔ ان کی غزلوں کے بارے میں اس سے زیادہ کہنا مشکل ہے کہ وہ ایک فضا ہے۔ یہ فضا نہ جانے کتنے زلوں سے، کتنی آوازوں سے، کتنے تجربوں اور کتنی کیفیتوں سے بنی ہے۔ اتنی رنگا رنگی کے باوجود شہاب کی شاعری میں باند آہنگی نہیں۔ اس کے ہجہ میں ایک دھیما پن ہے، ایک نرمابٹ ہے، ایک غلغلہ جیسی ہوتی ہے۔ اس شاعری کی فضا میں شام کے دھندلکوں کی سنو لائٹ، جاڑے کی راتوں کا سناٹا، گرمی کی چاندنی کی گدگدائٹ شامل ہے۔ فضا اس کے متاثر کرتی ہے کہ وہ ہمارے احساس پر وقتی طور پر اپنے پھیلاؤ، اپنی حسین گیرائی، اپنی خاموش رعنائی سے ہمارے دوسرے محسوسات پر پاد پھیلا دیتی ہے۔ شہاب کی شاعری بھی ہم کو چونکاتی نہیں، ہمارے ذہن و قلب میں تلاطم نہیں پیدا کرتی، حیات و کائنات کی پیچیدہ گتھیر میں نہیں الجھاتی۔ بس وہ ہمارے احساس پر چھا جاتی ہے، ہمارے احساس میں ایک فضا چھوٹ جاتی ہے، ایک منزل پر وہ، ایک یادیں ڈوبتی ہوئی آواز کا دھواں۔

۱۔ یوں رات، غمگدہ دل میں تری یاد آئی بجا رہا ہو کوئی دور جیسے شہنائی

۲۔ کچھ اس طرح سے اٹھیں مری سہمت وہ نظریں کہ جیسے جاگ اٹھے صبح لے کے انگڑائی

- ۳ - غم دنیا کی ان تپتی ہوئی ویران راہوں میں کسی کی یاد سائے کی طرت ہمراہ چلتی ہے
- ۴ - عروس صبح کے قدموں کی آہٹ آہی جاتی ہے شب غم زندگی جب درد سے کروٹ برتی ہے
- ۵ - فضا میں بھیجیں جاتی ہے کسی کی یاد کی خوشبو شب غم عود و عنبر کی طرح جب روئے جلتی ہے
- ۶ - کچھ اور گونجنے لگتی ہے داڑھی احساس کبھی جو ترک محبت پہ غور کرتے ہیں
- ۷ - یہ تھکی تھکی فضا میں یہ نکلے نکلے ستارے شب بیاہ چپ کھڑی ہے ترے غم میں سر جھکاؤ
- ۸ - اسے کاش تم بھی ایسے میں ہوتے مرے قریب بھینگی ہوئی شراب میں سادوں کی رات ہے

بہر تصور اپنا پیکر خود لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ایک فن کار اس پیکر کے سارے خدو خال پہانتا ہے۔ جب وہ ان خدو خال کو اپنے الفاظ میں ڈھالتا ہے تو ہم اسے تخلیق کا نام دیتے ہیں۔ لیکن یہ تخلیق خارجی و مایل سے روپ اختیار کرتی ہے۔ داخلی تجربہ، انفرادی احساس، ذہن کی فلاؤں، سینے کے ویرانوں میں رہ کر آواز نہیں پاتا جب تک فنکار اپنی تخلیقی قوت سے اپنے ذہن سے باہر کی دنیا سے وہ روحانی رشتہ نہیں پیدا کر پاتا کہ کائنات کے مظاہر سے وہ اپنے ہمراز بن سکے۔ ایک اچھے فنکار میں داخلی احساس اور تخلیق کا یہ خارجی عمل دو جداگانہ چیزیں نہیں ہوتیں، وہ پورا ایک عمل ہیں اور اگر فنکار ان دونوں میں کسی ایک پہلو میں کمزوری رکھتا ہے تو وہ یا تو روایت پرستی کی جانب جھک پڑتا ہے یا وہ ابہام کا شکار ہو جاتا ہے۔ شہاب نے غزل کی پرانی شاہراہ پر قدم اٹھایا ہے مگر جس طرح محبت کے نئے نئے ازل سے کائے جانے کے بعد بھی اپنی تپش، اپنی کسک نہ کھو سکے۔ اسی طرح شہاب کی غزل نے بھی اس راہ میں وہ نمائندگی کی ہے نشان ڈھونڈ لئے جنہوں نے ان کی شاعری کی روایت کے سایہ میں آگے بڑھنے کے لئے مجبور نہ رہا۔ شہاب کی شاعری میں ہی بات نہیں ہے کہ وہ اپنے ذہن میں کسمپاتی لجاتی، چٹکیاں لیتی ہوئی یادوں اور تجربوں کا وسیع خزانہ رکھتے ہیں بلکہ یہ بھی کہ یہ ساری داخلی وارداتیں ان کے ذہن کے پردے پر اپنے پورے خدو خال کے ساتھ ہر خارجی پیکر لے کر آتی ہیں۔ شہاب نے بڑے سبک اور لطیف اشاروں سے کام لیا ہے۔ ان کی تشبیہوں میں ایک حسین لفافہ اور مسحور کر لینے والا تاثیر ہے۔

- ۹ - کتنا آداس آداس یہ دور حیات ہے انسان کی زندگی نہیں جنگل کی رات ہے
- ۱۰ - جیسے اک برباد نشین سچپی غم سے چنچ اُٹھے یاد کسی کی آہٹ۔ دل کے گرد بہت چھلنی
- ۱۱ - لے رہی ہے کروٹ یوں شام غم کی تنہائی بیسے ڈس کے اک ناگن دفنا پلٹ جائے
- ۱۲ - یوں سکوت شام غم میں تری یاد آ رہی ہے کوئی جیسے ہلے ہلے کہیں بانسری بجائے
- ۱۳ - پاگل سپیچ بول کہیں او۔ پی کہیں سینے سے آدھی رات کے اٹھنے لگا دھواں
- ۱۴ - جیسے پتھر ڈال دے خاموش پانی میں کوئی دل میں یوں مویں اٹھیں جب سامنے تم آگئے

شہاب کے پاس نئی تشبیہیں ہیں، نئے اشارے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ تنہا نہیں ہیں۔ شہاب کے جذبہ میں بھی ایک نیا ضبط ہے، ایک گہرا رچاؤ، ایک زبردست آہنگ ہے اور یہی جذبات کی توانائی اور فراوانی ہے کہ شہاب کی غزلوں کو کیفیت کا ایک موزوں اور موثر نقش بنا دیتا ہے۔ غزل گو شاعر چھوٹے چھوٹے تجربوں، چھوٹی بھولی یادوں پر بیٹا ہے اور جہاں اس کے احساس کا گداز، اس کے دل کی آواز مدھم ہوتی ہے وہاں وہ خارجیت کا اسیر ہو جاتا ہے اور لفظی بازیگری کرنے لگتا ہے۔ شہاب کی غزل میں کیفیتوں کا سلسلہ رہتا ہے جو غزل کے شعر کو ڈھالتا، رنگ و روپ دیتا، تیور اور چتون بخشتا، فائدہ آواز دیتا چلا جاتا ہے۔ ان کی غزل میں بھرتی کے اشعار اسی لئے کم ملتے ہیں کہ ان کا احساس بھرپور ہے۔ ان کے جذبات کا تاثر پائدار ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی اثر لینے کی جس جتنی تیز ہے اتنی ہی خلاق بھی ہے۔ اسی لئے ان کی غزل میں نہ جھول کا احساس ہوتا ہے اور نہ مصنوعی آرائش کا۔

- ۱۵ - صدیاں گزر گئی ہیں کہ پتھر تراشش کر انسان ترے نقوش بدن ڈھونڈھتا رہا

- ۱۶ - کل ہی ملے تھے آج یہ ہونے لگا خیال  
دیکھتے ہوئے کسی کو چہینے گزر گئے
- ۱۷ - ادا سیوں نے کہا اب یہاں نہیں کوئی  
کبھی جو نظر ترے بام و در سے ٹکرائی
- ۱۸ - حال دل نہ کچھ پوچھو جیسے عمر بھر کوئی  
نظر کسی کا ہو اور نہ وہ کبھی آئے
- ۱۹ - آج تو ان کے پاس بھی رہ کر روح مری گھرائی ہے  
میرے ہر اک زخم کا مرہم شاید اب تنہائی ہے
- ۲۰ - اتنی دوری پہ بھی کس قدر پاس ہیں ہم  
مجھ کو دیکھا تو لوگوں کو یاد آگئے تم
- شہاب نے اپنی انگلیاں خون میں ڈبو کر اپنی غزلیں لکھی ہیں - ان کے ہر نغمہ میں ربط دل کی وہ تیز لرزش ہے کہ غزل کے الفاظ خود تھر تھرائٹے ہیں - لیکن ان میں جذبہ کا ایک ضبط شامل ہے - وہ 'اے جو سینے میں گھٹتے ہیں' وہ آنسو جو پلکوں میں آکر ٹپک جاتے ہیں نغمہ میں جب ان کی روح عریاں ہوتی ہے -

- ۲۱ - ترے غم کو گلے سے لگائے کھڑا ہوں  
زندگی اور اجل کے دو راہے پہ گم سُم
- ۲۲ - حادثہ دو جہاں سے کہہ دو پناہ لیں میری زندگی میں  
انہیں ڈرائے کا کیا زمانہ جو درد تیرا اٹھا گئے ہیں
- ۲۳ - ٹھہر ٹھہر مے مطرب پہ گیت رہنے دے  
چمک اٹھی مری پلکوں پہ آکے دل کی جلن
- ۲۴ - سینے میں ایک شعلہ جالسوز ہی کیا  
وہ اشک غم جو پی گئے دنیا کے ڈر سے ہم
- شہاب کے جذبات میں انسانی جذبہ کے سارے آثار چرھاؤ ہیں - یاس اور آس، غمزدہ و نا، خود داری اور ضبط - شہاب کا جذبہ کارگر اسی لئے ہے کہ وہ مکمل نہیں ہے - وہ روایتی نہیں ہے، وہ انسانی جذبہ ہے، تشنہ تکمیل، ناخن بر جگر - زندگی کے محبوبہ تجربات مقدس ہی نہیں ہوتے - محبت، شمار صنم پرستی ہی نہیں ہوتی - کبھی کبھی کوئی موڑ دل پر پتھر رکھ کر صنم شکنی پر بھی مجبور کر دیتا ہے اور یہ موڑ وہ ہوتا ہے جہاں انسان کی روح جاگتی ہے، اس کی خودی اپنا نقاب اٹکتی ہے اور انسان اپنا، اپنے وجود کا، اپنی محرومیوں کا احساس حاصل کرتا ہے اور شاید محرومیوں سے زیادہ یہ احساس محرومی، یہ شکست کا شعور انسان کی جذباتی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہوتا ہے - شہاب نے بھی محبت کے تقدس کے گیت نہیں گائے - لیکن وہ صنم شکنی کرنے کے بعد صنم کردہ کی دیوانی کے احساس کو نہیں بھلا سکے اور یہ گونج ان کے اشعار میں موجود ہے -

ایک منزل یہ ہے :-

- ۲۵ - مسکرا کر تیرا سر درد چھپایا ہم نے  
زہر پیتے رہے اور منہ نہ بنایا ہم نے
- ۲۶ - تھام کر دامن دل کتنی امیدیں روئیں  
کس مصیبت سے تمہیں آج بھلا یا ہم نے
- ۲۷ - نامناسب سہی لیکن یہ خیمیاں آتا ہے  
کیوں محبت میں تیری دقت گنوا یا ہم نے
- ۲۸ - اپنی وفا کی آخری بازی بھی ہار گئے  
جاتے ہیں سر جھکائے مری رہگذر سے ہم

اور پھر :-

- ۲۹ - ٹاٹا نظر آتا ہے زندگی کا سہاگ  
یہ حال ہے کہ نہ جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں
- ۳۰ - بچے تو کیسے بچے دل میں تیری یاد کی لو  
کہ تجھ سے روٹھ کے بھی تجھ کو یاد کرتے ہیں
- ۳۱ - مجھے چھوڑ بھی چکا تو، مجھے بھول بھی چکا تو  
مرے غمکدے کا در کیوں تری یاد دکھائے
- ۳۲ - قسم تو کھائی ہے تجھ سے کبھی نہ ملنے کی  
نہ جانے پھر ترے کوچہ سے کیوں گزرتے ہیں
- شہاب کی غزل سنولائی شاموں، بھیگی راتوں اور نکھری صبحوں کا خلاصہ ہے - ان کی شاعری کی فضا خوابوں سے نہیں بنی - انہیں نے ٹوٹے سپنوں کو جوڑا ہے - انہوں نے الفت کے مرمری قصر کی جگہ ہٹوں سے زیادہ اس کی شکست کی جھلکار سے اپنے ہجوم

گداز چرایا ہے۔ انھوں نے زندگی کے تجربات کو اپنے سینہ میں محض ذخیرہ نہیں کیا ہے۔ انھوں نے ان سے بات کی ہے۔ ان کی لچک اور لہک کو پکھا ہے۔ ان کو اپنے احساس میں تحلیل کیا ہے۔ ان کے خیال میں ہمیں نہیں، بلندیاں نہیں لیکن ان میں ایک آغوش کا پھیلاؤ ہے، آغوش کی گرمی، سکون اور جذبات کا دھیمہ طلاطم۔ شہاب کی شاعری اسی لئے بغیر ایک جذباتی ہمدردی اور شہاب کے ساتھ ایک محسوساتی ہم آہنگی پیدا کئے بغیر اپنی کیفیتوں کا نگار نہیں پیدا کر سکتی۔

شہاب کی غزل ان کے جذبات کے خلوص کی آئینہ دار ہے اور ایک شاعر جو کامرس کے میکا کی عمل سے وابستگی رکھنے کے باوجود اپنی تخلیقی حس اور اپنے طپتے ہوئے جذبے کی آواز سن سکے، یقیناً وہ جذبہ سے خلوص ہی رکھ سکتا ہے۔ اس کی غزل زیادہ شفاف، برجستہ اور بے تصنع جذبات سے ترکیب پاسکتی ہے۔ وہ اپنے اشعار کو زیادہ ہمدردی کے ساتھ، ذہن کے کارخانہ میں ڈھانے کے بجائے جذبہ کی بھٹی میں گرم کر سکتا ہے۔ اسی لئے شہاب کے اشعار میں ایک ناگزیر کیف، ایک ڈوب دینے والا نشہ، ایک تیرنیم کش کی غلش موجود ہے۔ اس میں تیور بھی ہیں، کیفیات بھی ہیں، انجائے تجربات بھی۔

- |      |                                       |  |
|------|---------------------------------------|--|
| ۳۳ - | مے تو عہد وفا یاد آگیا جیسے           | ادھر بھی آنکھ جھکی وہ نظر بھی شرمائی   |
| ۳۴ - | جانے ویران آنکھوں نے مری جھک کر کہا   | حسن کی ہنستی ہوئی آنکھوں میں آنسو آگئے |
| ۳۵ - | کیا جانے کیا گزرتی کبھی تم سے چھوٹ کر | تم نے نہ کی شاہ یہ احسان کر گئے        |
| ۳۶ - | دھلتی ہے تری یاد کی شبہم سے گرد غم    | دُشوار ورنہ کتنی یہ راہ حیات ہے        |
| ۳۷ - | ٹوٹ گئے جب رشتے ناتے                  | پاگل دل کیوں ان کو پکارے               |
| ۳۸ - | چھیڑ دی چاند نے اس شوخ کے خسار کی بات | آج کی رات بھی آنکھوں میں گزر جائے گی   |
| ۳۹ - | آرزو اس راہ کی دل میں جواں ہی رہی     | روز گزر۔ تو نہیں ہم کوئی دہاں ہو نہ ہو |

(نگار)

شہاب سے میں مل چکا ہوں، ان کی غزلیں ان کی زبان سے سن چکا ہوں اور ان کے بعض اشعار سے میں نے بڑا لطف اٹھایا ہے، لیکن بد قسمتی سے کبھی یہ موقع نہ مل سکا کہ وہ میرے سامنے ہوتے اور ذکر ان کی شاعری کا چھڑنا حال ہی میں جب میں بھوپال سے لوٹا تو شہاب نے ازراہ کرم اپنی بہت سی غزلیں بھی مجھے لکھ کر دیدی تھیں اور میں ان غزلوں کا انتخاب اپنی رائے کے ساتھ نگار میں شائع کرنے ہی والا تھا کہ اتفاق سے حامد حسین خان صاحب کا یہ تبصرہ پہنچ گیا اور میں نے سوچا کہ کیوں نہ اسی سلسلہ میں وہ بات بھی کہ دوں جو میں شہاب سے زبانی کہنا چاہتا تھا۔

میں جب کسی نوجوان شاعر میں صحیح غزل گوئی کی اہلیت دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے لیکن اسی کے ساتھ سب سے پہلے مجھے یہ اندیشہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گمراہ ہو جائے۔ کیونکہ اس وقت جبکہ غزل میں جدید رجحانات کے ساتھ ساتھ جدید شاعرانہ تعبیرات کی ضرورت پیش آرہی ہے، اس گمراہی سے ہمدی شعرا کو کیا اچھے خاصے مشاق شعراء بھی مشکل سے بچ سکے ہیں۔

وہ گمراہی یا بے راہ روی کیا ہے اس کی تفصیل کا تو موقع نہیں لیکن اجمالاً یوں سمجھئے کہ اس کا تعلق جذبات و تاثرات سے تو اتنا نہیں ہے جتنا ”فن و زبان“ اور لب و لہجہ سے ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو فن کے مقابلہ

میں ”جذبات“ کی قربانی کو بھی گوارا کر لیتے ہیں، لیکن فن کو بالکل نظر انداز کر دینا بھی مجھے پسند نہیں کیونکہ ”شاعری“ کا مضمون صرف اسلوب بیان کا مضمون ہے اور اسلوب بیان کا تعلق صحت زبان اور انتخاب الفاظ دونوں سے ہے۔ اچھی بات کو اچھے الفاظ ہی میں کہنا چاہئے۔

اس میں شک نہیں شہباز کی شاعری واقعی غنائی شاعری ہے اور جیسا کہ فاضل تبصرہ نگار نے ظاہر کیا ہے یکسر کیفیات و تاثیرات کا نتیجہ ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں اس میں کچھ ایسی چیز بھی پائی جاتی ہے جو نہ ہوتی تو اچھا تھا، یعنی کہیں شربِ صفا ہے تو مینا شفاف نہیں، کہیں مینا شفاف ہے تو بادہ نہ رہا۔ !

اس کی وضاحت میں بعض انھیں اشعار سے کرنا مناسب سمجھتا ہوں جنھیں فاضل تبصرہ نگار نے مسلسل تبصرہ پیش کیا ہے۔

خدا بیٹے اور بارہویں شعر کو لیجئے ان دونوں میں ایک ہی جذبہِ تعبیر ہے، ایک ہی اسلوب بیان ہے، لیکن دونوں میں یوں دہا نکلتا ہے، حالانکہ اس کو ہمیشہ بہت نمایاں بروزن قیاس استعمال کرنا چاہئے تاکہ اس کا صوتی اثر باقی رہے۔

شہباز کے ان دونوں شعروں کو سن کر مجھے ایک خاتون کا شعر یاد آگیا :-

بالنہری بچہ ہی تھی دور کہیں ..... دیکھو اور جدہ یاد آئے ہونم  
شہباز اپنے شعروں میں اس تنہی کو پوری طرح ظاہر کر سکتے جو اس خاتون کے شعر میں ابائی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا سبب مرد و عورت کا فرق ہو۔

بارہویں شعر میں کہیں کا لفظ ہے کار ہے۔

چوتھے شعر میں صبح کو ”عروس صبح“ کہنا تو بہت لطیف بات ہے لیکن اس کے ”قدموں کی آہٹ“ کا ذکر وجدان و ذوق کے معانی ہے۔ علاوہ اس کے شبِ غم کی بے قراریوں میں، عروس صبح کی ”قدموں کی آہٹ“ آہی جانا، عجیب بات ہے، درد و کرب کی رات میں تو عاشق ہمیشہ بھی محسوس کرتا ہے کہ ”شاید اس رات کی صبح ہونا ہی نہیں“ نہ یہ کہ ادھر درد نہ کھوٹ لی اور ادھر فوراً صبح بھی نہیں، عروس صبح کے قدموں کی آہٹ آنے لگی۔ ان لفظی و معنوی اخلاط کو یوں دور کیا جاسکتا تھا :-

عروس صبح بھی گھونگھٹ اٹھنا بھول جاتی ہے

چوتھے شعر کے پہلے مصرعہ میں ”وادی احساس“ غزل کی زبان نہیں اور نہ اس مصرعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ احساس کیا ہے جو ترکِ محبت کے بعد شاعر کے دل و دماغ میں پیدا ہوا، اس کی مراحات ضروری تھی۔

ساتویں شعر میں فضاؤں کو تھکی تھکی کہنا صمیمِ تعبیر نہیں، اسی طرح شبِ ماہ کو خاموش تو کہہ سکتے ہیں لیکن اس کا چب کھڑا ہو جانا ناقص بیان ہے، تاثیرات و احساسات لطیف کے اظہار میں ایسے الفاظ کا استعمال جو ادبی اشیاء کے لئے مخصوص ہیں، ناروا جسامت ہے۔

دسویں شعر میں ”کسی کی یاد کا دل کے گرد چلانا“ بھی بالکل اسی قسم کی ناگوار تعبیر ہے، شاعر کا کام محسوسات کو بھی ”غیر محسوسات“ بنا دینا ہے نہ کہ غیر محسوسات کو محسوسات !

گیارہواں شعر شہباز کو اپنی غزل سے نکال دینا چاہئے اس تشبیہ کو ایک مشہور ہندی دوسرے سے فرق کرنے

بھی لیا تھا اور وہ بھی کامیاب نہیں ہوئے، کیونکہ انھوں نے ”پلٹ جانے“ کی کوئی وجہ پہلے مصرعہ میں پیش نہیں کی ہندی دوسرے کا مفہوم یہ ہے :-

”شب فراق اور چاندنی رات ! گویا ایک ناگن ہے جو ڈس کر آٹ گئی ہے۔“

مشہور ہے کہ جب ناگن کاٹ کر پلٹ جاتی ہے تو پھر اس کے زہر سے بچنا ممکن نہیں، لیکن اس میں ایک اور بات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے وہ یہ کہ ناگن کا پیٹ چمکدار ہوتا ہے اور چاندنی رات کی رعایت سے اس کا ”اُٹ جانا“ ظاہر کرنا بڑی دلچسپ تعبیر ہے۔

مترہوں شعر میں ”آدھی رات کے سینہ سے دھواں اُٹھنا“ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس دھواں کو خود شہاب صاحب کے سینہ سے اُٹھنا چاہئے تھا، تاکہ دوسرا مصرعہ پہلے مصرعہ سے مربوط ہو جاتا۔

پندرہواں شعر نظم کا شعر تو ہو سکتا ہے جس کا تعلق سیاق و سباق سے ہو نہ کر غزل کا۔ علاوہ اسکے ”نفوش بدن“ کا استعمال بھی محل نظر ہے۔

اٹھا رہوں شعر کے دوسرے مصرعہ میں :- کا لفظ کبھی کے بعد آنا چاہئے۔

”انیسویں شعر میں ”سہراک“ کہنے کا کوئی موقع نہیں، اس کی جگہ ”میرے دل کے زخم کا مرہم“ زیادہ موزوں ہوتا۔

بانیسویں شعر کا پہلا مصرعہ اپنی جگہ بڑا پاکیزہ ہے، لیکن دوسرے مصرعہ سے اس کا تعلق نہیں، علاوہ اسکے ڈرائے کا کی جگہ مٹانے کا ہونا چاہئے اور اُٹھانے کی جگہ اُٹھانے کا ہونا چاہئے۔

شعر نمبر ۲۳ میں مطلب کو کیوں گیت سے روکا جاتا ہے کیا اس نے کہ اس کا کام ختم ہو چکا، حالانکہ پلکوں پر آکر دل کی جلن (یعنی آنسوؤں) کا چمک اُٹھنا تو ابتداء عشق ہے نہ کہ انتہائے عشق !

جو کچھ میں نے عرض کیا، ممکن ہے فاضل تبصرہ نگار کے نزدیک محض اقلیدس و منطق جو جس کا درخور وہ غزل میں پسند نہیں کرتے، لیکن ان کا یہ خیال بالکل ایسا ہی ہوگا جیسا میرا سمجھنا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تبصرہ و تنقید نہیں بلکہ محض قصیدہ خوانی و مدح سرائی ہے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ شاعری بھی مخصوص ”منطق“ رکھتی ہے اور حامد صاحب نے شہاب کی غزل گوئی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے بعض حصوں سے میں بھی متفق ہوں گو میں اپنے دعوے کے ثبوت میں وہ اشعار پیش نہ کرتا جو حامد صاحب نے انتخاب کئے ہیں۔

شہاب میں غنائی و عشقیہ شاعری کی بڑی اہلیت پائی جاتی ہے اور اسی نے وہ اکثر بغیر دلیف کی غزلیں سہلی ممتنع انداز میں لکھنے کی کوششیں کرتے ہیں جو سچے آتما ندر ہے۔ جذباتی شاعری کا، لیکن میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ وہ سوچتے تو ہمیشہ ”سہل ممتنع“ ہی ہیں، لیکن کبھی کبھی اس خیال سے کہ بات سپاٹ ہو کر نہ رہ جائے وہ ”مشاطی“ بھی صرف کرتے لگتے ہیں اور مشاطگی اس میں شک نہیں بڑا مشکل فن ہے، بڑا تجربہ چاہتی ہے اور اسی کے ساتھ ”کار آگاہانہ“ رہبری بھی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اچھا خاصہ خیال بدنام ہو جاتا ہے، بالکل ایسا ہی جیسے ایک خوبصورت چہرہ بدصیقل آئینہ میں۔ مثلاً شہاب کا ایک شعر ہے :-

تری لغزش قدم سے وہ چراغ لڑکھڑائے

کہ شہاب نے بھی بڑھ کر ترے رخ کی لیں بلائیں

چراغ کے لئے یقیناً ان کے سامنے سب سے پہلے ”جھلملائے“ کا لفظ آیا ہوگا، لیکن انھوں نے یہ سوچ کر کہ

”جھللائے“ تو سبھی لکھتے ہیں، کیوں نہ اسے ”لڑکھڑائے“ کر دیا جائے (خفا صکر ایسی صورت میں کہ اس سے پہلے لغزشِ قدم کا ذکر آگیا ہے)۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ صرحت اس ایک لفظ نے پورے شعر کو داغدار کر دیا۔ نئے الفاظ کی تراش خراش اور ان کے استعمال میں جدت پیدا کرنے کا خیال ہمارے یہاں مغربی ادب کے مطالعہ سے پیدا ہوا ہے اور یہ یقیناً اچھی بات ہے، لیکن غیر زبانوں کے الفاظ و محاورات کو اختیار کرتے وہ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ہماری زبان کا مزاج اور اس کا لب و لہجہ اسے گوارا کر سکتا ہے یا نہیں، اور ہمارے بعض نوجوان ادیب اس نکتہ کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔

ہر چند اس قسم کی ناروا جہارتیں شہاب کے یہاں کم پائی جاتی ہیں، تاہم ہیں ضرور اور مجھے یقین ہے کہ ان کا ذوقِ سلیم آئندہ خود اس کی اصلاح کر لے گا۔ شہاب کے اشعار میں یہ لحاظ مفہوم جا بجا ہمیں بے لٹی بھی نظر آتی ہے اور تشنگی بھی، یہ بے ربطی و تشنگی ”محذوفات“ کی نہیں بلکہ ان زامیہ ہائے خیال کی ہے جو اظہار و ابلاغ کے لئے اختیار کئے گئے ہیں۔

شہاب کے کلام میں ابھی فنی پختگی بھی پیدا نہیں ہوئی ہے اور اسی لئے اس کے جوڑ پیوند بھی کہیں کہیں ڈھیلے نظر آتے ہیں، ان کے اشعار سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ جذبات کی رو میں اتنا بہ جاتے ہیں اور خود اس سے لطف اٹھا میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ وہ شعر کے الفاظ اور اس کی ساخت پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، وہ شعر صرف اس لئے کہتے ہیں کہ خود اسے گنگنائیں اور خوش ہوں گویا وہ اس قسم کی خود تاثری (AUTO-SUGGESTION) ہے۔ جس کا تعلق صرحت ان کی ذات سے ہے، ماسوا سے نہیں۔

شہاب کی شاعری میں فطرت پرستی کی جھلک ہر جگہ نظر آتی ہے۔ وہ صبح، شام، ستارہ و کہکشاں، شب و روز کو دیکھ کر خوش نہیں ہوتے بلکہ سوچنے لگتے ہیں اور ان کا یہ انہماک ان کے اندر بڑے لطیف تاثراتِ محبت پیدا کر دیتا ہے، جنہیں وہ درد کی کسک اور دل کی مسوس میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی محبت کوئی جوش و خروش یا دلولہ جیوان و دیوانگی نہیں، بلکہ یکسر فدا دگی و سپردگی ہے، ایک خاص قسم کا ایسا نہ صرف مضبوط ہے، جسے میرزا مظہر کے اس شعر کی تفسیر کہہ سکتے ہیں:-

نے فرصتِ اشک نہ مرا رخصتِ آب ہے

دارم برنج یار غریبانہ نگاہ ہے

اور اس میں شک نہیں کہ شہاب کی یہی ”غریبانہ نگاہی“ ان کی شاعری کا بڑا حصہ ہے۔

ان کی زبان نرم ہے، لب و لہجہ میں نسائی القبا ہے اور اسی لئے ان کے شعروں کو پڑھ کر دہی لطف آتا ہے جو ہندی کے دوہوں کو پڑھ کر حاصل ہوتا ہے، کبھی کبھی شہاب کی پوری غزل اسی سوک اور اسی بروک کی داستان ہوتی ہے۔ مثلاً:-

رات آنکھوں میں گزری سحر ہو گئی	میندگی اس شبستاں میں تو سو گئی
کتنی دیران بزم جہاں ہو گئی	دل میں شاید تری آرزو سو گئی
کوئی آواز آتی نہیں ان دنوں	ساز خاموش ہے راگنی کھو گئی
مجھ کو کس بات پر یاد آتے نہیں	تم سے کتنی محبت مجھے ہو گئی

بے سبب تیرے بارے میں بہوں مجھے سوچنا ایک عادت سی اب ہو گئی  
 کس قدر دل شکستہ اٹھے آج ہم جیسے ہر شے تری بزم میں لھو گئی  
 کیا کہوں میں محبت کی محرومیاں زندگی جیسی شے رانگہاں ہو گئی  
 چھپ کے گزرے شہاب اس کے کوچہ سے ہم ایک عالم کو لیکن خسر ہو گئی  
 یہی وہ رنگِ تغزل ہے جس میں جذبہ فن پر غالب آجاتا ہے اور شاعر محض ایک پرستار محبت مغنی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

اس قسم کے اشعار ہم کو شہاب کے یہاں اور بھی ملتے ہیں۔ مثلاً :-  
 گوش ہر آواز ہے ایک زمانہ تو کیا برہنہ دل کی صدا تم بھی تو اک دن سو  
 اپنے ہی احساسِ غم سے یاں سکوں دل کو نہیں آپ توجہ بھی ملے سعی کرم فرمائے گئے  
 دل بزمِ ناز میں کہیں تصویر بن نہ جائے کہنی کسی سے آج مجھے ایک بات ہے  
 چھوڑا نہ تیری یاد نے اک لمحہ دل کا ساتھ ہم تجھ سے بے خبر رہے اور بات ہے  
 تھام کر دامنِ دل کتنی امیدیں روئیں کس مصیبت سے تمہیں آج بھلایا ہم نے  
 قسم تو کھائی ہے تجھ سے کہی نہ ملنے کی نہ جانے پھر ترے کوچہ سے کیوں گزرتا ہیں  
 آج تم نے بھی ساتھ پھوڑ دیا یونہی کیا کم تھے زندگی کے مذاب  
 اپنی محسوس آرزوئیں پر دیر تک رو کے سو گیا ہے شہاب  
 یہ ہیں وہ اشعار جن کو پڑھ کر ایک شخص اگر محبت کرنا نہیں تو محبت کی باتیں کرنا نہ ورسیکھ سکتا ہے۔

## بعض نادار کتابیں

(صرف ایک - ایک نسخہ موجود ہے)

نظام الملک طوسی .. مصنفہ عبدالرزاق کانپوری قیمت ۱۰ روپے	دیوان رنہ لکھنوی	۱۰ روپے
البراکہ .. مصنفہ ..	تذکرہ سرائے سخن	۱۰ روپے
کلیات نظیر اکبر آبادی .. مصنفہ ..	کلیات مومن	۱۰ روپے

میزان

یہ تمام کتابیں اگر ایک ساتھ لی جائیں گی تو معہ محصول دس روپے میں مل سکیں گی۔ چوتھائی قیمت پیشگی آنا ضروری ہے۔

## نگار کے بعض سائنس دانوں کی رعایتی قیمت پر

پاکستان یا جو بی نمبر - فرمانروا مان اسلام نمبر - علوم اسلامی نمبر - مستقبل کی تاباش نمبر - میزان

ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول آٹھ روپے میں مل سکتے ہیں

# گاہ گاہے بازخوان ————— جہنم کے آردہوں اور فرشتوں کے کوڑوں سے دور

(اڈیٹر)

ہمارے سامنے دو راستے ہیں، ایک وہ جو فطرت اور عالم اسباب کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے اور دوسرا وہ جو مافوق الفطرت باتوں کی جانب مائل کرتا ہے۔ یعنی ایک وہ ہے جو ہمیں تحقیق و جستجو، انکشافات و اختراع، سعی و کاوش اور رشتہ علت و معلول کی طرف متوجہ کرے راستہ و آسائش، امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے اور دوسرا وہ جو ہمیں بتاتا ہے کہ اصل دنیا یہ نہیں ہے بلکہ کوئی اور۔ اور اسی غیر معلوم دنیا کے لئے بلا حیل و حجت ہم کو قربانیاں، دعا مانگے اور عبادتیں کرتے رہنا چاہئے۔

ان دونوں راستوں میں اور کیا فرق ہے ؟

ایک بتاتا ہے کہ زندگی نام ہے اپنے اور دیگر اجزاء جس کے ساتھ ہمدردی رکھنے اور ان کے لئے اسباب راحت و سکون فراہم کرنے کا دوا کہتا ہے کہ حیات انسانی کا مقصد خداؤں اور دیوتاؤں کی پرستش ہے جو دوسری دنیا میں ہمارے اس تمام عجز و انکسار کا ابدی معاوضہ دیں گے، ایک عقل و حقایق پر اعتماد کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور دوسرا صرغ عقاید پر بھروسہ کرنے کی۔ ایک کہتا ہے کہ اپنے حواس و ادراک کی اس روشنی سے کام لو جو خود سمجھتا ہے اور پائی جاتی ہے، دوسرا کہتا ہے کہ اس مقدس روشنی کو کھل کر دو۔

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید

اس میں شک نہیں کہ ہمارے اسلاف نے جو کچھ کیا وہ اس سے زائد کچھ نہ کر سکتے تھے۔ وہ ایک مافوق الفطرت قوت پر یقین رکھتے تھے اور نتیجتاً تھے کہ اگر وہ طاعت و عبادت، دعا و قربانی نہ کریں گے تو نہ بارش و وقت پر ہوگی اور نہ ان کی کہنیاں بار آور ہوں گی۔ وہ یقین کرتے تھے کہ خدا ایک متعبد بادشاہ ہے جس کو ذرا ذرا سی بات ناگوار ہو جاتی ہے اور جو برہم ہو کر سزا دینے پر آمادہ ہوتا ہے وہ خدا خیر کے ساتھ، خدا شر کے بھی تابع تھے اور انہیں دو خداؤں کے درمیان بیم و رہا کی ”عرشہ برائیم“ زندگی بسر کیا کرتے تھے، ان کی حیات کا کوئی لمحہ فوہ سے خالی نہ گزرتا تھا اور ہر وقت وہ اس ڈر سے کانپتے رہتے تھے کہ مبادا کوئی ان سے خفیف سی خفیف گستاخی سرزد ہو جائے اور خدا ناراض ہو کر انھیں بڑی سے بڑی سزا کا مستوجب قرار دے۔

طوائف آتا تھ تو وہ سمجھتے تھے کہ یہ نتیجہ ہے انھیں کی بد اعمالیوں کا، زلزلہ آتا تھا تو وہ یقین کرتے تھے کہ خدا ان پر برہم ہو رہا ہے، دباؤ باریاں پھیلتی تھیں تو وہ اسے بھی اپنے ہی گناہوں کی پاداش جانتے تھے، اور جب چاند سورج کو گرہن آتا تھا تو اسے بھی اپنی ہی خطاؤں کا نتیجہ مانتے تھے، تمام فضا انھیں فرشتوں یا غیبی روحوں سے معمور نظر آتی تھی اور شب و روز وہ سن اس لئے الحاح و زاری کرتے تھے کہ خدا ان سے خفا ہو کر تباہ و برباد نہ کر دے، قدرت ان کے نزدیک گویا ایک سوتیلی ماں تھی جو پیشانی پر شکنیں ڈالے ہوئے ہر وقت انھیں غونچکاں آنکھوں سے دیکھتی رہتی تھی۔

آخر کار ایک زمانہ آیا جب بعض افراد سوچنے والا داغ لے کر پیدا ہوئے اور انھوں نے تمام حوادث و واقعات پر غور کرنا شروع کیا۔ انھوں نے سمجھا کہ طوفانوں اور زلزلوں کے اسباب طبیعی کچھ اور ہیں۔ سورج گرہن کے لئے ایک زمانہ معین ہے اور پہلے اس کے وقوع کی پیشانی گئی کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ سیاروں کی گردش، کرۂ زمین کے جغرافی حالات، آب و آتش کے خواص، مظاہر فطرت کے اسباب، حیات انسانی کی خصوصیات، اعضاء جسم کے وظائف معلوم کئے گئے اور دواہمہ پرستی کی زنجیر کی کچھ

کڑیاں ٹوٹیں۔

اس کے بعد کچھ زمانہ اور گزرا یہاں تک کہ مدارس کی بنیادیں پڑیں، کتابیں تصنیف کی گئیں، مفکرین کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی، علمی اکتشافات نے انسان کے دماغ کو منور کرنا شروع کیا، فکر و خیال کی آزادی بڑھی اور مانوق الفطرت کی جگہ فطرت اور اصول فطرت نے لی۔ پھر روح کے اس احساس آزادی کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہ ظاہر ہو کر رہا یعنی اختراع و ایجاد کے دروازے کھل گئے اور اب باب مذہب اپنی اور اپنے اعتقادات کی گروہیوں کو بڑی طرح محسوس کرنے لگے۔

ظاہر ہے کہ مفکرین کے مقابلہ میں ”معتقدین“ کوئی علمی و عقلی دلیل تو پیش کر نہ سکتے تھے، کیونکہ یہی ایک چیز ان کے دسترس سے دور تھی، اس لئے وہ اہل علم کے خلاف ملک میں نہایت مکر وہ پروپیگنڈے کی اشاعت پر اتر آئے اور واہمہ پرستی کے پاس جہل و تعصب کے جتنے گندے حربے موجود ہیں، ان سب کا استعمال بیک وقت شروع کر دیا گیا۔ ان کو ذریعہ شیطان بتا دیا گیا، خدا کا دشمن ظاہر کیا گیا، ان کے مٹا دینے کا نام مذہبی جہاد قرار پایا اور استعمال آتش و زنجیر اور تعذیب و تذلیل کی بعضی جہیب سورتیں بھی وہ سب بروئے کار لائی گئیں۔

پھر سب کچھ چند دن کا ہنگامہ نہ تھا، بلکہ یہ غول آشامیاں صدیوں تک جاری رہیں اور اس سلسلہ میں کوئی جرم ایسا نہ تھا جس کا ارتکاب مذہب کے نام پر جائز و مستحسن نہ قرار دیا گیا ہو۔ ایک فرقہ کہتا تھا کہ ہذبات انسانی کو فنا کر دو اور ضروریات زندگی کو کم۔ اپنے آپ کو معذور سمجھو اور آسمانی قوت پر اعتماد کامل رکھ کر تمام کام اسی پر چھوڑ دو۔ دوسری جماعت کہتی تھی کہ ہذبات انسانی اسی لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ مناسب حدود میں ان کو تسکین پہنچائی جائے اور ضروریات زندگی کا پڑھانا بھی لازم ہے۔ کیونکہ بغیر ان کے انسانوں کو اپنی قوتوں کا علم نہیں ہو سکتا اور دنیا میں کوئی ایجاد و اختراع معرض فطر میں نہیں آ سکتی۔

ایک فرقہ کا فلسفہ حیات یہ تھا کہ مال و دولت کو ٹھکرا دیا جائے اور اسباب راحت سے نفرت کی جائے، یہ لوگ فنون لطیفہ سے دشمن تھے، اچھی غذا، اچھے لباس، اچھے مکانوں سے متنفر تھے، گویا یوں سمجھئے کہ حاجی تھے غریب، افلاس کے، تنگی و گرسنگی کے، بھوکے پیٹوں کے، پیتھڑوں کے، برہنہ پائی کے اور ایک ایسے آہستہ رد عمل خود کشی کے جو دفعۃً انہیں بلکہ تدریجاً قوم کی قوم ہلاک کر دینے والا ہے۔ ان کو اس دنیا میں سوا عذاب و مصیبت کے کچھ نظر نہ آتا تھا اور دوسری دنیا ہر قسم کے اسباب نشاط و راحت سے معمور نظر آتی تھی وہ امراء اصحاب ثروت سے اور تمام ان لوگوں سے جو اپنی قوت بازو کی مدد سے راحت و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں نفرت کرتے تھے اور جنت میں سوا گد اگردوں اور بھکاریوں کے کسی اور کا درخور خیال سمجھتے تھے۔

الغرض یہ تھے وہ لوگ جنہوں نے دنیا کو ویران و غیر دلچسپ رکھنے کے لئے سدھارا، الہ تک، جہاد کیا اور کچھ زمانہ تک انھیں کامیابی بھی حاصل رہی، لیکن ذہنی و عقلی آزادی بجائے خود ایسی زبردست لذت ہے کہ ایک بار پیکر لینے کے بعد اس کا چھوڑنا محال ہے، اس لئے اس کا ذوق رفتہ رفتہ عام ہوتا گیا اور ذہن و خیال کی دنیا ہی بالکل بدل گئی۔

چنانچہ اب انسان اس جسم متحرک کا نام ہے جو ایک وقت معین تک حرکت کرتے رہنے کے بعد فنا ہو جاتا ہے، بلکہ انسان نام ہے قوائے عقل و دماغ کی ترقی کا، حرکت و عمل کا، تحقیق و جستجو کا، اعتماد ذاتی کا، اور آسمان سے پیکر زمین تک، تمام مناظر قدرت پر جہانِ فانی کا، اب وہ اس کا قایل نہیں کہ طاعت و عبادت بجائے خود کوئی تقدس و پاکیزگی ہے اور انعام خداوندی کی مستحق، اب وہ اپنے لئے کچھ بھیار نہیں کہ جزا و سزا عالم مانوق الفطرت سے متعلق ہے بلکہ وہ تقدس کا مفہوم صرف حرکت و عمل کو قرار دیتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ انسان کی دوزخ و جنت خود اسی کے اندر اور اسی دنیا میں موجود ہے اور اسے اختیار حاصل ہے خواہ وہ مجہول و بے ارادہ زندگی بسر کر کے جہنم میں چلا جائے خواہ سعی و محنت سے کام لے کر فردوس حاصل کرے۔

یہ اعتقاد کہ بادشاہ کو خدا، بادشاہ بنا کر بیچتا ہے اور رعایا کا کام مرثیہ اس کی اطاعت ہے، اب ختم ہو گیا یہ عقیدہ کہ مذہب

خدا کی بنائی ہوئی چیز ہے اور اس کے بتائے ہوئے اصول و عقاید کو بغیر چون و چرا تسلیم کرنا ہمارا فرض ہے، بہت کچھ مٹ گیا ہے، خدا کے پیچھے ہوئے بادشاہ بھی رفتہ رفتہ فنا ہو رہے ہیں اور مذہبی حکومتیں بھی محو ہوتی جا رہی ہیں۔

انگلستان میں بجائے خدا کے اب پارلیمنٹ کی حکومت ہے اور امریکہ میں مذہبی اقتدار کی جگہ رائے عامہ نے لے لی ہے، فرانس اپنی آبادی کے سوا کسی اور مافوق الفطرت قوت کو حکومت میں دخل دینے کا مستحق قرار نہیں دیتا اور روس نے یکسر مذہب سے روگردانی اختیار کر لی ہے، یورپ میں صرف ایک قیصر ولیم (شاہ جرمنی) ایسا بادشاہ تھا جو اپنے آپ کو فرستادہ خدا سمجھتا تھا سو گزشتہ جنگ میں وہ بھی ختم ہو گیا۔

انسان آزادی کامل کی اس منزل تک سخت صعوبتیں اٹھانے کے بعد پہنچا ہے اور استعمال عقل کے استحقاق کو اب اس سے کوئی نہیں چھین سکتا جس وقت تک وہ اپنی فہم و فراست کو مشعل راہ بنانے سے باز رکھا گیا، بے شک وہ کہہ سکتا تھا کہ ہل نیکی صرف خوب جہنم سے کاپتے رہنا ہے اور حصول نجات کے لئے یہی کافی ہے، لیکن اس نے دیکھا کہ تنہا یہ عقیدہ نہ اس کے لئے روزی فراہم کر سکتا ہے، نہ تن پوشی کے لئے لباس تو اس کی نگاہیں آسمان کی طرف سے زمین کی جانب مایل ہوئیں اور وہ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جو لوگ اپنے آپ کو مذہب کا پابند کہتے ہیں وہ بھی اس کی طرح جرم و معصیت کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ سقراط کو جس نے زہر کا پیالہ دیا وہ بھی مذہبی انسان تھا اور عیسیٰ کو جنھوں نے سو لی پر چڑھا دیا وہ بھی خدا ہی کے ماننے والے تھے اس لئے اس کی روح میں بغاوت پیدا ہوئی اور اس طرح سب سے پہلا جذبہ انتقاد جو مذہب کے خلاف رونما ہوا وہ خود اہل مذہب ہی کا پیدا کیا ہوا تھا۔

آپ کسی مذہب والے سے دریافت کیجئے وہ اپنے سوا تمام دنیا کو گمراہ بتائے گا اور اسی خدا کو قابل پرستش قرار دے گا جو اس نے وضع کیا ہے، دوسرے مذاہب و اقوام کے خداؤں کو وہ جھوٹا بتائے گا۔ وہ سوا اپنے معبود کے کسی اور کی عبادت کاہ کی عزت نہ کرے گا، سوا اپنے طریق عبادت کے وہ کسی اصول بندگی کا احترام نہ کرے گا، وہ اپنی قربانیوں کے مقابلہ میں دوسرے مذاہب کی قربانیوں کو خود دیکھا رہتا ہوگا تو یا اسی کا خدا، خدا ہے اور اسی کا پیغمبر پیغمبر، اسی کی کتاب الہامی صحیفہ ہے اور اسی کی دعائیں مقبول۔

اب خدا کے اس تصور کو دیکھئے جو الہامی مذاہب نے پیش کیا ہے۔ خدا کو قادر مطلق، نیاز اور کسی چیز سے متاثر نہ ہو سکے والا بتایا جاتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ کتب مقدسہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو غصہ بھی آتا ہے، وہ انتقام بھی لیتا ہے اور اپنے بندوں میں سے ایک کے ساتھ رعایت اور دوسرے کے ساتھ ظلم بھی کر سکتا ہے۔

عدن میں آدم و حوا کو خود ہی پیدا کرنا ہے اور نافرمانی و سرکشی نہیں بلکہ معمولی سی غلطی پر خود ہی اس قدر برہم ہو جاتا ہے کہ عدن سے انھیں اٹھا کر زمین پر پھینک دیتا ہے اور نہ صرف ان کے لئے بلکہ ان کی اولاد کے لئے بھی تمام عمر غم و غصہ میں مبتلا رہنا مقصوم کر دیتا ہے۔ خدا اور اتنا غصہ، خالق اور اپنے مخلوق پر اتنی برہمی! اگر وہ جانتا تھا کہ ان سے یہ غلطی ضرور ہوگی تو پیدا کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی اور اگر پیدا کیا تھا تو کیا اس کے اختیار میں نہ تھا کہ وہ غلطی نہ کر سکے والی مخلوق پیدا کرتا۔ خود ہی ان کو پیدا کیا، خود ہی برہم ہو کر انھیں مبتلائے آلام کر دیا، عجیب تماشہ ہے۔

الہامی صحائف خدا کے غصے اور جنگ و قتال کے احکام سے بھرے پڑے ہیں۔ قوموں کو اس نے برباد کیا، لبتیوں کو اس نے ویران کیا، وہائیں اس نے مسطہ کیں، آسمانی عذاب اس نے نازل کیے، حالانکہ انسان کی سرکشی یا نافرمانی بھی اس کی پیدامی ہوئی چیز تھی اور خود اسی کی مرضی تھی کہ وہ ایسا کرے، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ جب انسان کو (جن میں عورتیں اور معصوم بچے بھی شامل تھے) تباہ کرنا ہی مقصود تھا تو ان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور پیدا کیا تھا تو کیا اس کے اختیار میں نہ تھا کہ انھیں معصوم پیدا کرتا۔

ایک بار وہ ساہی دنیا کو سوائے آٹھ آدمیوں کے طوفان میں غرق کر دیتا ہے اور تمام زمین کو لاشوں سے پاٹ دیتا ہے اسکے بعد وہ صرف یہودیوں کو لطف و کرم کا مستحق سمجھتا ہے اور باقی تمام مخلوق کو بغیر کسی سبب کے مردود قرار دیتا ہے۔ نہ وہ اہل تھر کی طرف متوجہ ہوتا ہے نہ اہل ایران کی طرف، نہ اسیروں کو قابل افتخار و خیال کرتا ہے نہ یونانیوں کو (حالانکہ ان سب کا خالق بھی وہی تھا) اور صدیوں تک صرف ایک فرقہ کا خدا بنا رہتا ہے۔ کیوں؟

خدا ایک قوم کو حکم دیتا ہے کہ وہ دوسری قوم سے جنگ کر کے ان کے مردوں عورتوں اور بچوں کو ہلاک کرے اور جو زندہ باقی آجائیں انھیں لوٹ لے کر غلام بنائے۔ اس کے علاوہ وہ ادارہ غلامی قائم رکھنے کے لئے ان کی خرید و فروخت کی بھی اجازت دیتا ہے۔ بادشاہوں کے جرائم کے عوض میں رعایا کو ہلاک کرنا مناسب سمجھتا ہے اور وہ بغیر کسی وجہ کے اپنے بندوں میں سے کسی ایک جماعت سے خوش ہو جاتا ہے اور دوسری سے برہم۔ اس کا سبب؟

حقائق عالم کے لحاظ سے صحیفہ مقدسہ نے جو معلومات انسان کے سامنے پیش کی ہیں، ان کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے۔ زمین کا چپٹا وسط بتانا، طبقات الارض کا انتہائی درس ہے اور تاروں کو آسمان پر جڑا ہوا ظاہر کرنا فلکیات کا بلند ترین نظریہ۔

صحت و امراض کے متعلق دو نظریے دنیا میں رائج ہیں، ایک مذہبی، دوسرا علمی، مذہبی نظریہ یہ ہے کہ بیماریاں ارواح خبیثہ سے پیدا ہوتی ہیں جو جسم انسانی میں حلول کر جاتی ہیں اور ان ارواح خبیثہ کو مذہب کے نفوس مقدسہ ہی دور کر سکتے ہیں۔

جب تک مسیح زندہ رہے ان کی عمر شیاطین اور ارواح خبیثہ کے دور کرنے میں بسر ہوئی اور بعد کو ان کے مقدس راہبوں نے صدیوں تک یہ خدمت انجام دی، چنانچہ ازسبب و مصلیٰ میں لاکھوں کردروں شیاطین اسی طرح بھگائے جاتے رہے اور امراض کا علاج جھاڑ پھونک، دغا تعویذ اور گندوں سے ہوتا رہا، امراض کے طبیعی اسباب کا کوئی علم نہ تھا، مقدس اہل مذاہب دھماکوں کے بہانے سے ہزاروں روپیہ کھاتے تھے (فقیروں کی روزی کا مدار اسی پر ہے)۔

آخر کار جب علم بڑھا تو آہستہ آہستہ امراض کے طبیعی اسباب کا بھی علم ہوا اور ان کے دور کرنے کی طبیعی تدابیر بھی رائج ہوئیں، چنانچہ اس وقت سوا جاہل مذاہب کے جن میں ہندوستان کا مرتبہ سب سے بلند ہے، جنات یا شیاطین یا ارواح خبیثہ کا عقیدہ بالکل آٹھ گیا ہے اور جب کوئی بیمار پڑتا ہے تو بجائے دغا تعویذ کے علاج کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔

مذاہب عالم اور کتب مقدسہ کے متعلق بھی دو خیال ہیں۔ ایک جماعت (اہل مذہب) کی کہتی ہے کہ وہ بالکل الہامی ہیں اور انسانی فکر کو ان میں دخل نہیں، اور دوسری جماعت کہتی ہے کہ صحیفہ مقدسہ سب انسانوں کے دماغ کا نتیجہ ہیں اور مذہب روحا ہوا ہے صرف اس جذبہ خوف سے جو حوادث طبیعی و مظاہر قدرت کو دیکھ دیکھ کر انسان کے دل میں پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ دنیا میں کوئی قدیم قوم ایسی نہ تھی جس کا کوئی مذہب نہ رہا ہو اور طاعت و عبادت کو اس نے اپنی حفاظت و نجات کا ذریعہ خیال نہ کیا ہو، لیکن رفتہ رفتہ یہ ماہمہ پرستی کم ہوتی گئی یہاں تک کہ اب ہر ذی فہم انسان جانتا ہے کہ دنیا میں ہر واقعہ کا ایک فطری سبب ہوا کرتا ہے اور قدرت بغیر اس خیال کے کہ انسان کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں۔ اپنے کام میں مصروف ہے۔

اب مفکرین اچھی طرح واقف ہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب خود انسانوں نے وضع کئے تھے اور خدا و الہام خداوندی سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا، بن کتابوں کو وہ الہامی کہتے ہیں وہ بھی انسان ہی کے دماغ کا نتیجہ تھیں اور اسی لئے ہر قوم و زمانہ کے لحاظ سے ان میں مختلف خیالات و تعلیمات پائی جاتی ہیں۔ نہ خدا کو طاعت و عبادت کی ضرورت ہے اور نہ وہ کسی کی دعا سنتا ہے، اہل دنیا پر ہزاروں مرتبہ قحط و آلودگیوں کی مصیبتیں نازل ہوئیں بعد کوئی دنیا انھیں دور نہ کر سکی، زلزلے آتے رہے۔ جو لاکھ

آگ برساتے رہے، ہزاروں معصوم نقوش فنا ہوتے رہے اور انسان کی کسی گریہ و زاری نے خدا کو اس ہلاکت باری سے باز نہ رکھا کھیتیاں سوکھتی رہیں اور انسانوں کی دعائیں ایک قطرہ پانی کا نہ حاصل کر سکیں، وہاں بھیلیں رہیں اور خدا کے نام پر کھے ہوئے تعویذ کسی ایک تنفس کو بھی ہلاکت سے نہ بچا سکے، غلاموں کی پیٹھ کو ٹرڈوں سے بہو لہان ہوتی رہی، عورتوں کی عصمت دری کو علی الاعلان جائز رکھا گیا، شیر خوار بچے ماؤں کی آغوش سے چھین چھین کر بازاروں میں فروخت کئے گئے اور ان کی خراب و زاری ایک لمحہ کے لئے خدا کو متوجہ نہ کر سکی کہ وہ ظالم بادشاہوں کی حکومت کے بجائے آسمانی بادشاہت قائم کرتا۔

اخلاقیات کے باب میں اہل مذہب کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا نے جس فعل سے باز رکھا ہے وہی برا ہے اور جس کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ اچھا ہے۔ خود بندہ کو اس کا کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ خود کسی فعل کے مستحسن یا قبیح ہونے پر رائے ذاتی کرے گویا مذہبی انسان کسی اچھے کام کو خود اچھا سمجھ کر انجام نہیں دیتا بلکہ فرمان خداوندی کی تعمیل سمجھ کر اس کو اختیار کرتا اور صرف اس خوف سے کہ مبادا خدا برہم ہو جائے اور اسے عذاب میں مبتلا کرے۔

تقریباً تمام اہل مذہب کا عقیدہ ہے کہ ایک انسان اچھے اخلاق کا ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ وجود خدا کا قائل نہ ہو اور اگر کسی میں یہ صفت پائی بھی جائے تو بغیر خدا کو مانے ہوئے وہ بالکل بیکار ہے۔

علماء اخلاقیات کا نظریہ یہ ہے کہ نیکی و بری اشیاء کی فطرت میں موجود ہے، بعض افعال ایسے ہیں جو انسانی فطرت کا باعث ہوتے ہیں اور بعض آزار و مضائق کا سبب بن جاتے ہیں، چنانچہ اول الذکر افعال کو ہم اخلاق حسنہ کہتے ہیں اور مؤخر الذکر کو اخلاق صبیحہ یا معصیت سے تعبیر کرتے ہیں۔

اخلاق انسانی کا تعلق اسی دنیا سے ہے اور یہیں ان کے نتائج دیکھ کر ان کے ثمرے یا اچھے ہونے کا اصول قائم کیا گیا ہے، نہ خدا ان سے متاثر ہوتا ہے اور نہ دوسری دنیا میں ان کا محاسبہ کر کے جزا و سزا دینے کی ضرورت چوری کو برا سمجھنے کے لئے کسی الہام کی ضرورت نہ تھی، انسان کے تجربے نے اس کے نقصانات دیکھ کر خود اسے برا قرار دیا۔ تمام وہ جرائم جو انسان کو جسمانی اقتصادی و عمرانی نقصان پہنچاتے ہیں، ان سے اپنے آپ کو محفوظ رہنے کا احساس ہر شخص میں فطری طور پر پایا جاتا ہے اور یہی وہ احساس تھا جس نے اسے بتایا کہ نیکی کسے کہتے ہیں اور بری کس کو۔

پھر جو چیز اس لحاظ سے بری ہے وہ یقیناً بُری سمجھی جائے گی، خواہ مذہب کے نزدیک اچھی ہو۔ واقعات و تاثرات کو کوئی قوت بدل نہیں سکتی، جس طرح قدرت ایک مربع کو دائرہ ثابت کرنے سے عاجز ہے، اسی طرح وہ بری بات کو اچھی اور اچھی کو بری نہیں بنا سکتی۔

الغرض اہل مذہب نے جو نظریہ اخلاق قائم کیا ہے اس پر ایک انسان کبھی فخر نہیں کر سکتا، ایک شخص نیکی کا کام کرتا ہے صرف اس ڈر سے کہ خدا کا حکم ہے اور اس طبع سے کہ اس کا انعام دوسری دنیا میں ملے گا، دوسرا اچھے اخلاق اختیار کرتا ہے صرف اس بنا پر کہ وہ اس کا انسانی فرض ہے اور نیکی آپ اپنی جزا ہے اور دونوں کے فرق کو ہر شخص پر آسانی سمجھ سکتا ہے۔

الغرض اس وقت دو راستے ہمارے سامنے ہیں۔ ایک وہ جو مذہب کی طرف ہم کو لے جاتا ہے اور دوسرا وہ جو عقل کی طرف ہمیں لے جاتا ہے۔ سوال الذکر کا تجربہ بہت کافی ہو چکا ہے اور ہمیشہ اس کا نتیجہ ایک ہی نکلا ہے۔

فلسفین میں اس کا تجربہ کیا گیا، لیکن اہل فلسفین کی مذہبیت ان کو تباہ و برباد ہونے سے نہ بچا سکی وہ مفتوح و مغلوب ہو کر خارج المبلد کئے گئے صدیوں تک اور خداوندی کا انتظار کرتے رہے اور اس توقع پر زندہ رہے کہ خدا انھیں پھر جمع کرے گا، ان کی بستیوں، ان کے معبدوں اور قربانگاہوں کو از سر نو تعمیر کرے گا، لیکن صدیوں پہ صدیاں گزرتی گئیں اور ان کی یہ تمنا برباد ہوئی۔

اس کا تجربہ سونٹرن لینڈ میں کیا گیا لیکن وہاں بھی سوا غلامی کے اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ترقی کی تمام راہیں مسدود کر دی گئیں اور صرف انھیں لوگوں کو آزادی کے ساتھ بولنے کا حق حاصل رہا جو صاحبِ جاہ و ثروت تھے عوام سے ان کی معصوم مسرتیں چھین لی گئیں ان کے لئے ہنسنا ممنوع قرار پایا اور سوائے ریخ غلامی کے کچھ نہ ملا۔ ان لوگوں نے اور اردو وظائف، روزہ منلو، وعظ و پند بھی کو آزما کر دیکھ لیا، لیکن کوئی چیز انھیں مسرت و راحت سے آشنا نہ کر سکی۔

اسکاٹ لینڈ میں بھی مذہب کا تجربہ ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کی ماننے والی تمام آبادی کو خوش قسمت لیکن ظالم لوگوں کا غلام بن کر رہنا پڑا۔ پادری ہر خاندان میں گھس جاتے تھے اور خون و دواہمہ پرستی پھیلا پھیلا کر لوگوں کی عقلیں سلب کر رہے تھے، وہ اپنی ہدایات کو الہام ربانی کہتے تھے اور ان سے انحراف کرنے والے عذابِ خداوندی کا مستوجب قرار دیتے تھے۔ پھر اس مذہبی حکومت میں بھی وہی ہوا ہوا جو ہونا چاہئے۔ انسان غلام تھا اور غلامی کے ناقابلِ برداشت بار سے اس کی پیٹھ جھکی جا رہی تھی۔

انگلستان میں مذہبی حکومت نے جو کل کھلائے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں اس زمانہ کے قانون اس زمانہ کے ادھام و تعصبات اس قدر سخت تھے کہ خدا کی پناہ، پادری خدا کے پیٹے بنے ہوئے آسمان و زمین کی ملکیت کا دعویٰ کر رہے تھے، بہشت و دوزخ کی گتھیاں ان کے ہاتھ میں تھیں اور جس کو جہاں جی چاہتا تھا ڈھکیل دیتے تھے، نہ ان کے دلوں میں رحم تھا، نہ آنکھوں میں مروت، ادنیٰ ادنیٰ سی غلطیوں پر خارج البلد کر دینا، کوڑے لگوانا اور قید و بند میں ڈال دینا معمولی بات تھی۔

ازمنہ مظلمہ میں مذہبی زندگی کا جو نتیجہ ہوا وہ اور زیادہ ہادم انسانیت تھا۔ ہزاروں سولیاں ہر وقت خون سے تر رہتی تھیں اور بے شمار تلواریں انسانی سینے میں پیوست۔ قید خانے کھجیا کھج بھرے رہتے تھے اور سیکڑوں انسان دکھتی ہوئی آگ کے اندر پڑے ہوئے تڑپا کرتے تھے۔ کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو خدا کے نام پر روانہ نہ رکھا گیا ہو اور کوئی معصیت ایسی نہ تھی جو اس کا ارتکاب مذہب کے پردہ میں نہ ہوتا۔ الغرض یہ تھا مذہبی حکومتوں کا رنگ جو اہل مذہب نے دنیا کے سامنے پیش کیا

اب اس کے مقابلہ میں اس راستہ کو دیکھو جس کی رہنمائی عقل نے کی ہے، کیسا صداقت و سہوار راستہ رہا۔ کیسی کھلی ہوئی فضا ہے، کیسی پر بہار زمین ہے، ہر شخص دوسرے کا بوجھ ہلکا کرنے کی فکر میں ہے اور ہر داغ اسی فکر میں ہے کہ بنی نوع انسان کی راحت و مسرت کا سامان ہم پہنچائے، نہ وہاں سولیاں ہیں، نہ قید خانے، نہ جہنم کے آزدہے ہیں نہ فرشتوں کے کوٹے۔ قدرت کی وسیع فضا ہے جس سے ہر شخص کیسا فائدہ اٹھا رہا ہے، عقل و فراست کا ایک آفتاب ہے جو سب کو برابر مستفیض کرنا چاہتا ہے، انسان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، غلامی کا داغ اشرف الملوقات کی پیشانی سے ہٹ چکا ہے، ذہنی آزادی نے نہایت قسم کے چھن کھلا رکھے ہیں اور ہر فرد دوسرے سے ہم آغوش و بغل گیر نظر آتا ہے۔

جس وقت میں تاریک ماضی کی طون دیکھتا ہوں تو میرا ریشہ ریشہ کا لب اٹھتا ہے۔ سب سے پہلے مجھے وہ تنگ و تاریک غار نظر آتے ہیں۔ جہاں مقدس اژدہ گنڈ لیاں مارے ہوئے قربانیوں کا انتظار کر رہے ہیں، ان کے جڑے کھلے ہوئے ہیں، ان کی زبانیں باہر نکلی ہوئی ہیں، آنکھیں چمک رہی ہیں اور زہریلے دانت خون آلود ہیں۔ جاہل ماں باپ اپنے معصوم بچوں کو اس جہنمی دیوتا کے حضور میں پیش کرتے ہیں، وہ اس چنچے تر پتے ہوئے بچے کو اپنے بل میں لپیٹ کر میں ڈالتا ہے اور بے رحم والدین اس ہدیہ کے قبول ہونے پر خوش خوش واپس جاتے ہیں۔ اس کے بعد مجھے وہ عبادت گاہیں نظر آتی ہیں جن کو بڑے بڑے پتھروں سے تیار کیا گیا ہے، لیکن یہاں ان کی قربان گاہیں بھی خون سے رنگین ہیں اور مقدس بجاریوں کے خنجر معصوم لڑکیوں کے سینوں میں یہاں بھی پیوست نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ اور معبد سامنے آتے ہیں جہاں مقدس آگ کی روشنی کو انسانی گوشت و خون سے قائم رکھا جاتا ہے پھر چند عبادت گاہیں اور دکھائی دیتی ہیں جن کی قربان گاہیں ہیلوں اور بھیڑوں کے خون سے تر ہیں، اس کے بعد ہی مجھے کچھ اور معبد

اور بیماری کچھ اور قربان گاہیں نظر آتی ہیں جہاں انسانی آزادی کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔ خدا کے معبود تو نہایت عظیم الشان ہیں جن کسانوں کے پاس جھوپڑا تک نہیں، بیماریوں اور بادشاہوں کے جسم زکار عبادوں سے آراستہ ہیں، لیکن سیایا کے پاس جسم مانکنے کو بوسیدہ سا چھینٹا بھی نہیں۔ اور کیا دیکھتا ہوں؟ یہ کہ قید خانے انسانوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ خارج البلد خانوں پر بادھے جگے، عورتیں پہاڑوں اور صحراؤں میں ٹھکڑا رہی ہیں، آلات تعذیب حرکت میں آ رہے ہیں اور لاکھوں انسانوں کی چیخ سے نقاہیں گونج رہی ہیں۔ اُن وہ تاریک قید خانے، وہ زنجیروں کی جھنگار، وہ آگ کے بلند شعلے، وہ جھلے ہوئے سیاہ چہرے، اینٹھنے والے اعضاء وہ شکنجوں میں کسے پھنسے ہزاروں معصوم انسان اور وہ ان رگوں کے ٹوٹنے کی آوازیں، اس کے بعد جو ری نگاہ اٹھتی ہے تو افق میں مجھے ایک نئی روشنی نظر آتی ہے، انسانی جسموں کے راکھ کے ڈھیر سے ایک نیا آفتاب ذہنی آزادی للوع کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے، اب غلامی کی زنجیریں آہستہ آہستہ ٹوٹ رہی ہیں، قربان گاہیں فنا ہوتی جاتی ہیں، عبادت گاہیں سما رہی ہیں، زبان کی بندشیں اٹھتی جاتی ہیں اور ذہن و عقل کے قفل ٹوٹتے جا رہے ہیں، اب میں پھر دیکھتا ہوں، لیکن ماضی کی طرف ن بلکہ مستقبل کی طرف اور فرط مسرت سے اچھل پڑتا ہوں۔ اس وقت مجھے کیا کیا نظر آتا ہے؟ کہ: بیماری اور بادشاہ ختم ہو چکے، امامتیں نیست و نابود ہو چکی ہیں اور تمام دیوتا مفقود۔ ان کی جگہ ایک نیا مذہب رونما ہوا ہے جس کا نام آزادی ضمیر ہے۔ ایک نئی سلطنت قائم ہوئی ہے جس کی ملکہ حریت فکر و رائے اور جس کی رعایا اخوت عامہ ہے۔ ہر جگہ امن و سکون ہے اور ہر شخص مطمئن۔ نہ کوئی قید خانہ ہے، نہ بیمارستان، نہ عدالت گاہیں ہیں نہ جہنم و معاصی کی داستان۔ ایک ایسی دنیا ہے جہاں صلوات سب چیز کا گور نہیں، سوا حسن و جمال کے کوئی شے پیش نظر نہیں۔ ہر دھڑ دیکھو نور کی بادشہ ہے اور انسانی دماغ کی کھیتیاں پہاڑاڑی، عقلی کا غف دنیا کی مسرتوں میں تبدیل ہو چکا ہے اور خدا کا ڈر انسانیت کی محبت میں۔

## شمار کے پچھلے فائل

۳۷	=	جولائی تا دسمبر	=	۱
۳۸	=	جنوری تا دسمبر	=	۲
۳۹	=	جنوری تا دسمبر	=	۳
۴۰	=	جنوری تا دسمبر	=	۴
۴۱	=	جنوری تا دسمبر	=	۵
۴۲	=	جولائی تا دسمبر	=	۶
۴۳	=	جنوری تا دسمبر	=	۷
۴۴	=	جنوری تا دسمبر	=	۸
۴۵	=	جنوری تا دسمبر	=	۹
۴۶	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۰
۴۷	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۱
۴۸	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۲
۴۹	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۳
۵۰	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۴
۵۱	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۵
۵۲	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۶
۵۳	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۷
۵۴	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۸
۵۵	=	جنوری تا دسمبر	=	۱۹
۵۶	=	جنوری تا دسمبر	=	۲۰
۵۷	=	جنوری تا دسمبر	=	۲۱
۵۸	=	جنوری تا دسمبر	=	۲۲
۵۹	=	جنوری تا دسمبر	=	۲۳
۶۰	=	جنوری تا دسمبر	=	۲۴
۶۱	=	جنوری تا دسمبر	=	۲۵
۶۲	=	جنوری تا دسمبر	=	۲۶
۶۳	=	جنوری تا دسمبر	=	۲۷
۶۴	=	جنوری تا دسمبر	=	۲۸
۶۵	=	جنوری تا دسمبر	=	۲۹
۶۶	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۰
۶۷	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۱
۶۸	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۲
۶۹	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۳
۷۰	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۴
۷۱	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۵
۷۲	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۶
۷۳	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۷
۷۴	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۸
۷۵	=	جنوری تا دسمبر	=	۳۹
۷۶	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۰
۷۷	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۱
۷۸	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۲
۷۹	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۳
۸۰	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۴
۸۱	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۵
۸۲	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۶
۸۳	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۷
۸۴	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۸
۸۵	=	جنوری تا دسمبر	=	۴۹
۸۶	=	جنوری تا دسمبر	=	۵۰
۸۷	=	جنوری تا دسمبر	=	۵۱
۸۸	=	جنوری تا دسمبر	=	۵۲
۸۹	=	جنوری تا دسمبر	=	۵۳
۹۰	=	جنوری تا دسمبر	=	۵۴
۹۱	=	جنوری تا دسمبر	=	۵۵
۹۲	=	جنوری تا دسمبر	=	۵۶
۹۳	=	جنوری تا دسمبر	=	۵۷
۹۴	=	جنوری تا دسمبر	=	۵۸
۹۵	=	جنوری تا دسمبر	=	۵۹
۹۶	=	جنوری تا دسمبر	=	۶۰
۹۷	=	جنوری تا دسمبر	=	۶۱
۹۸	=	جنوری تا دسمبر	=	۶۲
۹۹	=	جنوری تا دسمبر	=	۶۳
۱۰۰	=	جنوری تا دسمبر	=	۶۴

ٹ ۱۔ صرف ایک ایک فائل موجود ہے اور سب سے پہلے جس کا آرڈر پہنچے گا اسی کو دیا جائے گا۔ قیمت محصول لاک کے علاوہ ہے۔ فی شمار لکھو

# جمال الدین کا لغتیہ ترکیب بند

محمد عباس طالب صفوی

مغربی اقوام سے ایران کا ربط و ضبط بادشاہان صفویہ کے عہد میں قائم ہو چکا تھا، لیکن مغرب کی معاشرت اور نشاۃ ثانیہ، افکار سے ایران آشنا ہوا ناصر الدین شاہ قاجار کے سفر یورپ کے بعد — چونکہ ایرانی ذہن قوم ہے اس لئے اس نے یورپ کے طرز تحقیق، کافی استفادہ کیا اور رضا شاہ پہلوی کے عہد میں ایرانی علماء نے اپنے ملک کے مخطوطات و دواوین کو مستشرقین کی طرح ایڈٹ کرنا شروع کیا۔ انھیں نایاب دواوین میں ایک دیوان "استاد جمال الدین محمد بن عبدالرزاق اصفہانی" کا بھی تھا جسے حسن وحید دشتگردی مرحوم برآمدہ ارمغان نے "وزارت فرہنگ" کی مدد سے شایع کیا تھا۔

حسن وحید دشت گردی نے دیباچے میں ظاہر کیا ہے کہ "مذکرہ نویسان متاخر" کو جلال الدین محمد بن عبدالرزاق کے نام میں اشتباہ پیدا ہو گیا تھا کہ مثلاً آذر نے آتش کدہ میں یہ تحریر کیا کہ "جمال الدین و هو عبدالرزاق از افاضل معروف اصفہاں بلکہ فاضل نمائے جہان است" اور ہریت نے ریاض العارفین میں یہ الفاظ تحریر کئے کہ "جمال اصفہانی قدس سرہ اسمش عبدالرزاق و در مایل و کمالات یگانہ آفاق بودہ" لیکن متقدمین نے جمال الدین اور ان کے باپ کے نام کو صحت کے ساتھ تحریر کیا تھا مثلاً ابن رزمک الفاظ میں "جمال الدین محمد بن عبدالرزاق الاصفہانی رحمة اللہ علیہ در وصف جہاں و اہل ایں روزگار خوش قصیدہ گفتہ است"۔ حجتہ الصدور چاپ لیڈن صفحہ ۳۳) اور شمس الدین محمد بن قیس نے المعجم میں ان الفاظ میں جمال الدین کا ذکر کیا ہے "جمال الدین بن عبدالرزاق راغت بنیغیر صلعم قصیدہ ترجیع ہست والحق سخت شیکو آمدہ"

جمال الدین محمد بن عبدالرزاق کی ولادت کے سال کے متعلق حسن وحید خاموش ہیں بہرہ نوع چونکہ علامہ اقبال نے مشہور مستشرق لٹریٹور کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ جمال الدین کا انتقال ۷۵۵ھ میں ہوا تھا اور چونکہ جمال الدین کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی کم از کم پچیس سال کی ضرورت تھی۔

چہ ماند عمر چہ پنجاہ و پنج سال گزشت  
کہ گشت سرو تو چو خیز راں بنفشہ سمن

لئے حسن وحید کا ان دونوں دلیلوں سے یہ استنباط صحیح معلوم ہوتا ہے کہ جمال الدین کی ولادت چھٹی صدی ہجری کے اوائل میں ہوئی۔ حسن وحید نے جمال الدین کے درج ذیل دو شعروں سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ جمال الدین مایل پر تشیع تھے :-

خداے عزوجل بر زمین دو شاخ نشانہ  
زیک نہال بروں آختہ حسین و حسن

کے زتیغ کبندند آب نا دادہ  
کے تیغ ہزہر آب دادہ اند حزن

علامہ اگر محض مع حسین کو دلیل تشیع قرار دیا تو پھر ہر مسلمان شاعر کو مایل پر تشیع فرض کرنا ہوگا۔ جمال الدین کا ایک شعر یہ حسن وحید نے بھی جمال الدین کے رائج العقیدہ حنفی ہونے کا بین ثبوت ہے :-

بختی احمد مرسل بت اسلام  
اجتہاد ائمہ ہدھب نعمان

حسن وحید دست گردی نے جو نسخہ مرتب کیا ہے اُس کی ابتدا ایک لغتیہ ترکیب بند سے کی ہے اور یہ ترکیب بند حقیقتاً دیوان

کی جان ہے -

حسن وحید کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ اگرچہ سعدی کا مشہور ترجیع بند مضامین عشق پر مشتمل ہے اور جمال الدین کا ترکیب بند مدح پیغمبر پر اور اگرچہ معاشقہ، مدح سے کہیں زیادہ ”دل پسند“ ہوتا ہے تاہم جو ”رشاقت و سلاست“ جمال الدین کے ترکیب بند میں ہے وہ سعدی کے ترجیع بند میں نہیں ہے۔ حسن وحید نے سعدی اور جمال الدین کے دو دو شعر بھی نقل کئے ہیں جن کا تقابل لطف سے خالی نہیں ہے -

سعدی :- (۱)	من در ہمہ قول با فصیح	در وصف شایل تو آخرس
(۲)	آخر بزرگوۃ تندرستی	فریاد دل شکستگان رس
جمال الدین (۱)	در مدح تو ہر جہاد ناطق	در وصف تو ہر فصیح آخرس
(۲)	ہم کو بس نبوت تو در پیش	ہم چتر رسالت تو از پس

ترکیب بند یہ ہے :-

اے از بر سدرہ شاہ راہت	وے قبۃ عرش تکبہ گاہت
اے طاق نہم رواقی بالا،	بشکستہ دگوشہ کلاہت
ہم عقل دویدہ در رکابت	ہم شرع خمیدہ در پناہت
اے چرخ کہود ژلذہ دہلق	در گردن پیر خافقاہت
مہ طاسک گردن سمندت	شب طرہ پرچیم سیاہت
جب بریل مقم آستانت	افلاک حسیم بارگاہت
چرخ ارچہ رفیع خاک پائت	عقل ارچہ بزرگ طفل راہت
خورد است خدا ز روئے تعظیم	سوگند بروئے ہم چو ماہت

ایزد کہ رقیب جان خسرو کرد

نام تو ردیف نام خود کرد

اے نام تو دست گیر آدم	وے خلق تو پائے مرد عالم
فراتش درت کلیم عمراں	چادش رہت مسیح مریم
از نام محمدیت میمے،	حلقہ شدہ این بلند طارم
تو در عدم و گرفتہ قدرت	اقطاع وجود زیر خاتم
در خدمت انبیا مشرف	در حرمت آدمی مکرم
از امر مبارک تو رفت،	ہم بر سر حرمت خود آدم
نا بودہ بوقت خلوت تو	لے عرش و نہ جبریل محرم
نا یافتہ عز التفاتے	پیش تو زمین و آسمان ہم

کوین نوالہ زجودت،

افلاک طفیلی وجودت،

روح اللہ با تو خمر سوارے      روح القدس رکاب دارے  
از مطبخ تو سپہر دو دے      وز موکب تو زمیں غبارے  
در شرح رموز غیب گویت      بر ساختہ عقل کاروبارے  
عفوت زگناہ عذر خواہے      مجودت ز سوال شرمسارے  
ایں کیسہ ہر تہا ز مندے      دامن عدت ہر گناہگارے  
بر بوسے شفاعت تو ماند است      ابلیس چناں امیدوارے  
بارے چہ شود اگر بشوید ؟      لطف تو گلیم خاکارے  
بی خرد گیت ناامیدی      در عہد چہ تو بزرگوارے

آنجا کہ ز تو نوالہ پیچند،

ہفت و شش و پنج و چار ہیچند

اے مند تو ورائے افلاک      صدر تو دغا کہ تودہ عاشاک  
ہر تہ آں سمت حدوث دارد      در دیدہ ہمت تو خاشاک  
ظفرائے حبلال تو لعمریک      منشور دلایت تو لولاک  
نہ حقہ و ہفت مہرہ پیشیت      دست تو و دامن تو زان پاک  
در غمہ نبوت تو آدم      پوشیدہ ہنوز خروستہ خاک  
تو کردہ اشارت از سر انگشت      مہ قرطیہ پر نیاں زدہ چاک  
در راہ تو زخم محض مرہم      بر یاقوت تو زہر عین تریاک  
نقش صفحہ رایت تو،      لولاک لما خلقت الافلاک

خواب تو دلا نیام قلبی

خوان تو ابیت عند ربی

اے آرزوئے قدر لقایت،      دے قبلہ آسماں سرایت  
در عالم نطق ہیچ ناطق،      با گفتہ سزائے تو ثنائیت  
ہر جائے کہ خواجہ غلامت      ہر جائے کہ خسروے گدائیت  
جاندار و صے عاشقان حدیث      فضل دل گمراہ دعائیت  
ہم تابش اختران ز رویت      ہم جنبش آسماں برائیت  
بر دیدہ آسماں قدم نہ      تا سرمہ کشد زخاک پائیت  
بر شہیر جبرئیل نہ زین      تا لات زند ز کبر پائیت  
اندوختہ سپہر و انجم      بر نامہ وہ یک عطائیت

اے کرہ بزیں پائے کوئین

بگزشتہ زحہ قاب تو سین



اے شریع تو چہ چوں شب روز،  
اے عقل گر کشتائے معنی  
اے تیغ تو کفر را کفن بافت  
اے مذہب با زبشت تو،  
از موی تو رنگ کسوت شب  
حلم تو شکر دوزخ آ شام  
ماہ سہ خیمہ جلالت،  
بنمودہ نشانِ روسے فردا

اے گفتہ صبیح و کردہ نصبح  
در دست تو سنگ ریزہ تسبیح

اے سایہ ز خاک برگرفته  
اے بال کشادہ باز چترت  
طوطی شکر نثارِ نطق  
انگندہ وجود را پس پشت  
از بہر قبول تو پے خویشش،  
آں جا کہ جنبت تو رفرت  
آں جا کہ نشین تو طوبی  
در مکتبہ جاں ز شوق نامت

احسن تو فیج عنکوت است  
احسن نہ کہ او من الہیوت، است

ہر آدمی کہ اد ثنا گفت  
خود خاطر شاعری پے سنب  
گرچہ نہ سنائے حضرت است  
ہر چند فضول گوئے مردیت  
در علم ہر انجہ گفت یا کرد  
زاں گفتہ و کردہ گر پیرسد  
این خواہد بود عمدہ او  
تو بخون از جسدیدہ او

چون نیست بضاعت ز طاعت  
از مانگہ وز تو شفاعت

# مشکلات غالب

(سلسلہ از جملاتی مشہد)

غزل (۹۸)

۵۔ اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُد ہے جتنا کہ وہم غیر سے ہوں بیچ و تاب میں  
غیر سے "ماسوا اللہ" مراد ہے۔ اور صوفیہ کے نزدیک واجب الوجود کے سوا جو کچھ ہے وہم ہی وہم ہے، خارج میں اس کا  
وجود کہیں نہیں۔  
مرعا یہ کہ "ماسوا اللہ" کے وہم میں مبتلا ہونا خود اپنی حقیقت سے دور ہو جانا ہے، کیونکہ اپنی حقیقت ماسوا اللہ سے نہیں ہے۔

۶۔ اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں  
شہود (دیکھنا) - شاہد (دیکھنے والا) - مشہود (جسے دیکھا جائے) - مشاہدہ (ایک دوسرے کو دیکھنا)  
غالب نے اس میں اپنے عقیدہ وحدت الوجود کا اظہار بالکل صوفیہ کی زبان میں کیا ہے۔ کہتا ہے کہ جب شہود، شاہد و مشہود سب  
ایک ہی چیز ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں تو پھر لفظ مشاہدہ کا استعمال بے معنی ہے کیونکہ مشاہدہ نام ہے ایک دوسرے کو دیکھنے کا  
اور جب یہاں کوئی دوسرا ہی نہیں تو پھر مشاہدہ کیسا ؟

۷۔ ہے مشکل نمود صورت پر وجود بجز یاں کیا دھڑ ہے قطرہ و موج و حباب میں  
اس شعر میں وحدت الوجود کا عقیدہ ظاہر کیا گیا ہے، کہتا ہے قطرہ، موج و حباب میں کیا رکھا ہوا ہے جس کو دیکھا جائے  
ان کی ہستی وہم کے سوا کچھ نہیں، یہ سب ظاہری صورتیں ہیں جن کے ذریعہ سے تجر اپنی نمائش کرتا رہتا ہے، لیکن پہلے مصرعہ کا الزام  
ہی ان اس مفہوم کے لحاظ سے مناسب نہیں کیونکہ اس میں یہ ظاہر کیا ہے کہ وجود بجز نام ہے نمود صورت کا اور نہ کہنا گویا بحر کے مقابلہ  
میں وجود صورت (یعنی قطرہ و حباب وغیرہ) کو زیادہ اہمیت دینا ہے۔

۸۔ شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں  
دوسرے مصرعہ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ معشوقوں کا حجاب میں رہنا اور سامنے نہ آنا بھی اک قسم کی بے حجابی ہے۔ پلا صوفیہ  
میں اس دعویٰ کا ثبوت یہ پیش کیا گیا ہے کہ پردہ میں رہنا گویا اپنے آپ سے بے حجاب ہو جانا ہے، حالانکہ شرم کا اقتضا ہے کہ اپنے آپ  
بھی حجاب کیا جائے۔

۱۰۔ ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاتے ہیں خواب میں

غیب غیب سے مراد ذاتِ باری ہے جو عقل و ادراک کی حدود سے باہر ہے۔ شہود سے مراد عالمِ مظاہر و آثار ہے جسے ہم ہر وقت دیکھتے رہتے ہیں۔

مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو ہم عالمِ شہود یا "ادوات" کہتے ہیں وہ بھی دراصل غیبِ غیب ہے اور ہمارا ایسا سمجھنا کہ عالمِ شہود، غیبِ غیب سے علحدہ کوئی چیز ہے، بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم خواب میں دیکھیں کہ ہم جاگ رہے ہیں حالانکہ ہم بدستور محو خواب ہیں۔

غزل نمبر ۹۹ ص ۹۹

## غزل (۱۰۰)

۳ - شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم، لوگ کہتے ہیں کہ ہے، پر ہمیں منظور نہیں

شاہد (معشوق) - ہستی مطلق (واجب الوجود)

اس شعر میں غالب نے دنیا کے موجد ہونے کا ذکر عجیب انداز میں کیا ہے، کہتا ہے کہ لوگوں کا دنیا کے بابت یہ کہنا کہ وہ ہے یعنی اس کا علحدہ وجود ہے، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ اگر وہ ہے بھی تو بالکل اس طرح جیسے معشوق کی کمر یعنی نہ ہونے کے برابر (بالکل معدوم)

مرعا یہ کہ واجب الوجود سے علحدہ کائنات کو اک جدا گانہ چیز سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

۵ - حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی عشق پر عریہ کی گول تن رنجور نہیں

عشق پر عریہ (عشق نہر آذنا، عشق جنگ جو) - گول (قابل، لاپتی)

مفہوم یہ ہے کہ عشقِ جنگ جو کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اس کا مقابلہ کیا جائے اور وہ اچھی طرح تباہ و برباد کرے، لیکن افسوس ہے میرا تن رنجور اس قابل نہیں کہ عشق کا پوری طرح مقابلہ کرے اور پوری طرح خراب و برباد ہو۔

۸ - صاف دردِ کشِ پیماؤں جم ہیں ہم لوگ وائے وہ بادہ کہ افشردہ انگور نہیں،

دردِ کش (تھپٹ تک پی جانے والا) - جم (جمشید جیسے شراب کا موجد سمجھا جاتا ہے)

مفہوم یہ ہے کہ ہم بادہ خواری میں جمشید کے مقلد ہیں اور اتنی اچھی شراب پینا چاہتے ہیں کہ اس کی تھپٹ تک نہ چھوڑیں، اس لئے اگر ہم کو انگوری شراب (جو سب سے بہتر ہوتی ہے) میسر نہیں تو اس پر افسوس کرنے کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے۔

## غزل (۱۰۱)

۵ - وائے محرومیِ تسلیم و بد حالِ وفا جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں،

بڑا (وائے کا ہم معنی ہے) - مفہوم یہ ہے کہ ہم تو فریاد اس لئے نہیں کرتے کہ غم و فسادِ تسلیم کے خلاف ہے، لیکن وہ سمجھتا ہے کہ ہم فریاد کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے۔ مرعا یہ کہ اگر وہ ہماری خاموشی کو صبر و ضبط کا نتیجہ سمجھتا تو ممکن ہے کسی وقت اہلِ بکرم ہوتا، لیکن اب یہ صورت بھی باقی نہیں

۶ - رجب تمکین گل و لالہ پریشان کیوں ہے گر چراغان سررگنزر باد نہیں  
 ”چراغان سررگنزر باد“ سے مراد وہ چراغ ہیں جو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ روشن کئے جائیں اور ہوا انہیں فوراً بجھا دے۔  
 مفہوم یہ ہے کہ گل و لالہ کا رنگ خود داری کیوں پریشان و ابتر ہے، اگر اس کی حیثیت اس چراغ کی سی نہیں جو ہوا کے  
 سامنے روشن کیا جائے۔ مدعا یہ کہ دنیا میں مسرت بڑی ناپایدار چیز ہے۔

۸ - نفی سے کرتی ہے اثبات، تراوش گویا دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجاد نہیں  
 معشوق کے دہن کو معدوم کہتے ہیں، اور یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ اس کے دہن سے ہمیشہ ”نہیں“ ”نہیں“ نکلتی ہے۔  
 اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اس کے دہن کا اثبات صرف نفی (نہیں نہیں) سے ہوتا ہے۔ یعنی اگر وہ ہر بات پر ”نہیں“ نہ کہتا تو ہمیں  
 اس کے دہن کا بھی پتہ نہ چلتا۔ نہیں سے ہاں یا عدم سے وجود کا اثبات بڑے لطیف انداز میں کیا گیا ہے۔

غزل نمبر ۱۰۲ و ۱۰۳ صاف ہیں

### غزل (۱۰۴)

۲ - دل نازک پہ اس کے دم آتا ہے مجھے غالب نہ کر ہر گرم اس کو فر کو الفت آزمانے میں  
 ہر گرم (فارسی میں سرخوشی کا مترادف ہے، لیکن کنایت کسی کام میں زیادہ منہمک ہو جانے والے کو بھی کہتے ہیں)  
 اس شعر میں غالب اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ محبوب کی الفت آزمانے کی کوشش نہ کر، کیونکہ الفت آزمائی بڑی  
 سخت چیز ہے اور محبوب کا نازک دل مشکل ہی سے اس کا تحمل ہو سکتا ہے، اس لئے نتیجہ یہ ہوگا کہ خود تمہیں کو اس سے تکلیف ہوگی

غزل نمبر ۱۰۵ - ۱۰۶ - ۱۰۷ صاف ہیں

### غزل (۱۰۸)

اہل تدبیر کی دامان گئیاں آبول پر بھی حنا باندھتے ہیں  
 جب پاؤں میں چھالے پڑ جاتے ہیں تو عموماً ان پر منہدی باندھ دیتے ہیں تاکہ چھالے اچھے ہو جائیں، لیکن غالب کہتے ہیں  
 کہ یہ چارہ سازدوں کی دامانگی اور سعی بیجا ہے، کیونکہ جب آبول پائی مجھے صحرا زور دی سے باز نہ رکھ سکی تو اس کی حنا بندی کیا  
 باز رکھ سکتی ہے۔ لیکن اس صورت میں دوسرے مصرع میں تجھی کا استعمال بے محل ہو جائے گا اس لئے تجھی کے پیش نظر شعر کا  
 دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آبول پر حنا باندھنا اگر اس لئے ہے کہ میں چل نہ سکوں تو بے معنی سی بات ہے، کیونکہ خود آبول  
 ہی مجھ کو صحرا زور دی سے باز رکھیں گے، لیکن یہ مضمون عاشقانہ شان کے خلاف ہے۔

غزل نمبر ۱۰۹ - ۱۱۰ - ۱۱۱ صاف ہیں

## غزل (۱۱۲)

۲۔ دل کو نیازِ حسرت دیدار کر چکے دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں  
مفہوم یہ ہے کہ جب ہم حسرت دیدار کے لئے اپنے دل کو تباہ و برباد کر چکے تو معلوم ہوا کہ یہ بالکل بیکاری بات تھی، کیونکہ اگر ہم کو دیدار کا کوئی موقع ملتا بھی تو ہم اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے، جبکہ ہم میں خود دیدار کی طاقت ہی موجود نہ تھی۔

۳۔ ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں  
مفہوم یہ ہے کہ اگر تجھ تک رسائی آسان نہ ہوتی، یعنی دشوار ہوتی تو یہ بات ہمارے لئے سہل ہوتی کیونکہ اس طرح ہم مایوس ہو کر خاموش بیٹھ جاتے، لیکن چونکہ تیرا ملنا ممکن نہیں ہے اور غیر بھی تجھ سے مل سکتا ہے، اس لئے نہ ہمارا شوق آرزو کم ہوتا ہے اور نہ یہ جذبہ رقابت کہ تجھ سے ہر شخص مل سکتا ہے۔

۴۔ ڈرنا ہائے زار سے میرے خدا کو مان، آخر نوائے مرغ گرفتار بھی نہیں  
خدا کو مان (خدا سے ڈر)۔ مفہوم یہ ہے کہ لوگ جب کسی طائر کو گرفتار کرتے ہیں تو اس کی بیقراری و فریاد پر انھیں رحم آجاتا ہے لیکن تو میری فریاد و زاری پر مطلق رحم نہیں کھاتا، تو کیا میرے ناہائے زار نوائے مرغ گرفتار سے بھی کم ہیں جن کا اثر تجھ پر نہیں ہوتا۔

## غزل (۱۱۳)

۱۔ نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے درخور مرے تن میں ہوا ہے تارِ اشک یاں رشتہ چشم سوزن میں  
بخیہ کے درخور (بخیہ کے قابل)۔ رشتہ (دھکا کا)۔ چشم سوزن (سوئی کا ناکہ)  
چونکہ میرا جسم زخموں کی کثرت سے اتنا تار تار ہو گیا ہے کہ ان میں ٹانگے لگانا ممکن نہیں، اور سوزن مایوس ہو چکی ہے اسلئے چشم سوزن کا تاکہ گویا اس کا تارِ اشک ہے جس سے وہ اپنی ناکامی و مایوسی کا اظہار کر رہی ہے۔

۲۔ ہوئی ہے مانع ذوق تماشہ خسانہ دیداری کفِ سیلاب باقی ہے بزمِ پنبہ روزن میں  
مفہوم یہ ہے کہ سیلابِ اشک سے ہم نے اپنے گھر کو اس لئے ویران کر دیا تھا کہ ذوقِ تماشہ کے لئے فنا و ناپادہ وسیع ہو جائے گی لیکن قسمت کی دیکھئے کہ کفِ سیلاب روزن دیوار میں روئی کی ڈاٹ ہو کر رہ گیا ہے اور اب ہم روزن دیوار سے جھانک بھی نہیں سکتے۔

۳۔ ودیعت خانہ بیداد کا شہائے مزگاں ہوں نگین نام شاہد ہے مرا ہر قطرہ خون تن میں  
میرے جسم کا ہر قطرہ خون اک نگینہ ہے جس پر کاوشِ مزگاں نے معشوق کا نام کندہ کر دیا ہے، اور میں گویا امانت دار ہوں تمام ان نگینوں کا۔ اسی مفہوم کو غالب نے دوسری جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے:-  
ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب  
خونِ جگر و دیعتِ مزگاںِ یار تھا

۴ - یہاں کس سے جو غفلت گسٹری میرے شبستاں کی شب مہر ہو جو رکھ دیں جب دیواروں کے روزن ہیں میرے شبستاں یا خواہ گاہ کی تاریکی کا یہ عالم ہے کہ اگر روزانہ دیوار میں روئی رکھ دیں تو وہ بھی چاند کی طرح روشنی دینے لگے (انتہائی تاریکی میں ہر وہ شے جو سفیدی میں ہو کافی نمایاں ہو جاتی ہے) - شدت تاریکی کے اظہار میں انتہائی مبالغہ سے کام لیا گیا ہے

۵ - نکوہش مانع بے ربطی شور جنوں آئی، ہوا ہے خندہ احباب، نجیہ جیب و دامن ہیں نکوہش (علامت و تضحیک) چونکہ احباب نے میری دیوانگی کی ہنسی اڑائی اور میں ان کی علامت و تضحیک کی وجہ سے جوش جنوں میں اپنے جیب و دامن کو چاک نہ کر سکا اس لئے یوں سمجھنا چاہئے کہ خندہ احباب نے گویا میرے جیب و دامن کے لئے نجیہ کا کام دیا - (خندہ اور نجیہ کی مشابہت ظاہر ہے)

۶ - بھلا اسے نہ سہی کچھ بھی جو جسم آتا اثر نفس بے اثر میں خاک میں، "نفس بے اثر" کہنے کے بعد یہ کہنا کہ اس میں اثر نہیں عجیب بات ہے - مفہوم یہ ہے کہ اگر میرے آہ و نالہ کا اثر اس پر نہیں ہوا تھا تو کم از کم مجھ پر تو ہونا چاہئے تھا کہ میں اپنے حال پر رحم کھا کر رہتا، لیکن معلوم ہوا کہ میرا نالہ بے اثر (اس لحاظ سے کہ محبوب کے دل میں کیفیتِ رحم نہ پیدا کر سکا) اتنا بے اثر ہے کہ خود مجھ پر بھی اس کا اثر نہ ہوا اور میں نالہ سے باز آیا -

غزل نمبر ۱۱ - ۱۱۵ - ۱۱۶ - ۱۱۷ - ۱۱۸ اصناف ہیں

### غزل (۱۱۹)

۱ - وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو، کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو مفہوم یہ ہے کہ ہمیں اس کی پروا نہیں کہ تم محبت ہی کرو - تم عداوت ہی کرو لیکن میرے ہی ساتھ غیر کہ اس میں شریک نہ کرو - پہلا مصرع اُلجھا ہوا ہے - اگر وارستہ کے معنی بے پردا کے لئے جائیں تو پھر کیوں کے بعد نہ بیکار ہو جاتا ہے - انراؤ بیان یہ چاہئے کہ ہم اس سے بے پردا ہیں کہ تم محبت ہی کرو، دوسرے مصرع کا پہلا ٹکڑا اہل گھٹو کے فوق کے مطابق ذم کا پہلوئے ہوئے ہے -

۲ - ہنگامہ دیوبنی ہمت ہے انفعال حاصل نہ کیجئے دہرے جہت ہی کیوں نہ ہو انفعال دوسرے کا اثر قبول کرتا - یہاں شرمندگی کے معنی نہیں ہیں (مفہوم یہ ہے کہ کسی اور کا اثر قبول کرتا اس سے کچھ حاصل کرنا ہمت کی کمی دلیل ہے، یہاں تک کہ اگر زمانہ سے جہت حاصل کی جلتے وہ بھی گویا زمانہ کا احسان لینا ہوگا اور یہ دیوبنی ہمت ہے - پہلے مصرع میں لفظ ہنگامہ محض برائے بیت استعمال ہوا ہے، ورنہ بغیر اس کے بھی شعر کے معنی پورے ہو جاتے ہیں -

- ۸- وارستگی بہائے بیگانی نہیں، اپنے سے کرنا غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو  
 وارستگی (آزادی) - بیگانی (مغايرت و نا آشناي)  
 مفہوم یہ ہے کہ آزادی یا آزاد روی اہل دنیا سے بیگانہ رہنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ خود اپنے آپ سے وحشت و بیگانی کا نام ہے  
 مفہوم یہ ہے کہ صحیح آزادی خود اپنے آپ کو اغراض سے آزاد رکھنے کا نام ہے۔

غزل نمبر ۱۲۰-۱۲۱ صاف ہیں

### غزل (۱۲۲)

- ۲- اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ آئینہ تاکہ دیدہٴ نچیر سے نہ ہو  
 تاکہ (جب تک) نچیر (شکار) - یعنی اس کا ذوقِ ستم تو دیکھے کہ جب تک دیدہٴ نچیر کا آئینہ سامنے نہ ہو وہ اپنی شکل دیکھتا  
 ہی نہیں - جب کوئی حاضرِ مرصفا ہے تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور ان سے حیرانی کا اظہار ہونے لگتا ہے جس کی  
 تعبیر آئینہ سے کی گئی۔

### غزل (۱۲۳)

- ۱- واں پہونچ کر جو غش آتا ہے ہم سے ہم کو صدرہ آہنگ زہیں بوسِ قدم ہے ہم کو  
 صدرہ (سوسو طرح سے) - آہنگ (آزادہ) - واں (کوچہٴ محبوب) - پئے ہم (پیہم) متواتر - فارسی میں پئے ہم  
 بھی مستعمل ہے  
 مفہوم یہ ہے کہ اس کے کوچہ میں پہونچکر جو ہم کو غش بار بار آتا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہم سوسو بار اس کا نشانِ قدم چومنے  
 کو زہیں بوس ہو جاتے ہیں۔ اگر قدم سے مراد خود اپنا قدم ہو تو مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اپنا نقشِ قدم چومنا چاہتے ہیں اس لئے کہ وہ کوچہٴ یاد  
 تک پہونچ سکا۔

- ۲- دل کو میں اور مجھے دل مجھو دفا رکھتا ہے کس قدر ذوقِ گرفتاری ہم ہے ہم کو  
 ہم (ہا ہم) - دل کو میں کے بعد "مجھو دفا رکھتا ہوں" محذوٰں ہے - مفہوم یہ ہے کہ میں اور میرا دل دونوں ایک  
 دوسرے کو مجھو دفا رکھتے ہیں، اور اس سے ظاہر ہے کہ دونوں باہم گرفتار ذوقِ گرفتاری رکھتے ہیں۔

- ۳- ضعف سے لاشِ پئے مور سے طوقِ گردن تیرے کوچہ سے کہاں طاقتِ دم ہے ہم کو  
 پئے مور (پائے مور - چینیٹھی کا پاؤں) - دم (بھاگنا، گریز کرنا، فرار)  
 مفہوم یہ ہے کہ تیرے کوچہ سے بھاگ کر کہیں اور چلا جانا ممکن نہیں، کیونکہ ہمارے ضعف کا یہ عالم ہے کہ تیرے کوچہ میں پائے  
 مور کا نشان بھی طوقِ گردن سے کم نہیں اور وہ ہمیں جانے سے باز رکھتا ہے۔

۵ - رشک ہمطی و درد اثر ہانگ مسذیں نالہ مرغ سحر، تیغ دودم ہے ہم کو،  
ہمطی (ہم سری) - پہلے مصرع کے دونوں ٹکڑوں کا تعلق نالہ مرغ سحر سے ہے - مفہوم یہ ہے کہ نالہ مرغ سحر میرے  
لئے دو دھاری تلوار ہے، یعنی ایک تکلیف تو مجھے اس رشک سے ہوتی ہے کہ وہ بھی میری ہی طرح نالہ کرتا ہے اور شاید تیرا شیدائی  
ہے اور دوسری تکلیف یہ کہ اس کی آواز میں اثر ہے اور میری آواز میں نہیں ہے۔

۹ - بتاؤ اس مزہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قسار یہ نیش ہو رگ جاں میں فرو تو کیونکر ہو  
اس شعر میں بڑی معیوب تعقید ہے - پہلے مصرع میں قرار فاعل ہے کیونکر ہو جو دوسرے مصرع کا قافیہ و ردیف ہے  
اس کی نثروں ہوگی (اگر) اس مزہ کو دیکھ کر بتاؤ کہ یہ نیشتر رگ جاں میں فرو ہو تو مجھ کو قرار کیونکر ہو (یعنی میں کیوں  
بے قرار ہوں)۔

غزل نمبر ۱۲۴ - ۱۲۵ - ۱۲۶ - ۱۲۷ - ۱۲۸ - ۱۲۹ - ۱۳۰ - ۱۳۱ - ۱۳۲ صاف ہیں

### غزل (۱۳۳)

۱ - ہے بزم بتاں میں سخن آذر دہ لبوں سے تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے  
سخن کا لبوں سے آذر دہ ہونا (بات نہ کر سکتا)  
اس شعر کے سمجھنے میں عام طور پر یہ غلطی کی جاتی ہے کہ لبوں سے سخن کی آذر دہ کی کو خود غالب سے متعلق سمجھی جاتی ہے اور  
اس طرح مختلف تاویلیں کی جاتی ہیں - حالانکہ اس کا تعلق لبوں سے ہے اور مفہوم یہ ہے کہ بزم بتاں کا یہ حال ہے کہ وہ کوئی بات  
ہی نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ ان کی خوشامد کی جائے تو وہ کچھ بولیں، اس لئے ہم ایسے خوشامد طلبوں سے سخت تنگ آگئے ہیں۔

۳ - زندان در میکدہ گشتخ ہیں زاہر زہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے  
ظرف (فارسی میں مقابل کو کہتے ہیں)  
مفہوم ظاہر ہے۔

۴ - بیداد و فنا دیکھ کہ جاتی یہی آخر ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے  
مفہوم یہ ہے کہ ہر چند میری جان کا تعلق صرت لبوں سے باقی رہ گیا تھا (یعنی جان لبوں پر رہا کرتی تھی) لیکن تقاضائے فنا  
کا ظلم دیکھئے کہ اسے یہ بھی گواہ نہ ہو اور جان و لب کا تعلق بھی اس نے توڑ دیا۔

غزل نمبر ۱۳۴ - ۱۳۵ صاف ہیں

### غزل (۱۳۶)

لپٹا پر خمی میں شعلہ آتش کا آساں ہے      ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوز غم چھپانے کی  
ہر نماں (حریر) لٹھی کھڑکی سے آگ فوراً پٹ جاتی ہے)  
دعا ہے کہ آگ ہر نماں میں پٹ کر تو اپنے آپ کو چھپا سکتی ہے لیکن میں اپنے سوز غم کو کسی طرح نہیں چھپا سکتا۔

### غزل (۱۳۷)

۱- حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھے آرزو خرامی      دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی  
آرزو خرامی (آرزو کرنا) - ڈھولی ہوئی اسامی (وہ کاشنکار جس سے لگان وصول نہ ہو سکے)  
مفہوم یہ ہے کہ جوش گریہ سے کوئی امید کامیابی کی قائم کرنا بیکار ہے، کیونکہ اک ڈوبی ہوئی اسامی کی طرح اس سے بھی کچھ حاصل وصول نہیں ہو سکتا۔

### غزل (۱۳۸)

۳- حالانکہ ہے سبلی خارا سے لار رنگ      غافل کو میرے شیشہ پے سے کا گمان ہے  
سبلی (پتھر - ضرب) - خارا (پتھر)  
مفہوم یہ ہے کہ میرا شیشہ تو پتھر کی ضرب سے لار رنگ ہے لیکن غافل یہ سمجھتا ہے کہ اس میں شراب بھری ہوئی ہے۔  
باقص شعر ہے، کیونکہ پتھر کی ضرب سے شیشہ ٹوٹ جاتا ہے لار رنگ نہیں ہو سکتا اور اگر شیشہ سے مراد دل لیا جائے تو پتھر پتھر کی ضرب کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

۴- کی اس نے گرم سینہ اہل جوس میں جا      آوے کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے  
مفہوم یہ ہے کہ اس نے سینہ سے نہیں ہے۔ جا گرم کردن کا مفہوم خاوری میں قیام کرنے اور بیٹھنے کا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اس نے سینہ اہل جوس میں اس نے اپنی جگہ بنائی ہے کہ وہ ٹھنڈا (گرمی عشق خانی ہے) اور قیام کے لئے عموماً ٹھنڈی جگہ ہی کو پسند کیا جاتا ہے۔

۵- ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا      کس سے کہوں کہ داغ، جگر کا نشان ہے  
مفہوم یہ ہے کہ غم کی شدت نے جگر کو اتنا مٹا دیا کہ اب اس کی جگہ صحت داغ رہ گیا ہے۔ اس لئے اگر میں کسی سے یہ کہوں بھی کہ یہ داغ جگر کا نشان ہے کہ اسے کون مانے گا۔

## باب الاستفسار سرد شہید

(ایک استفسار کے جواب میں)

سرد کے تمام واقعات زندگی و سوانح حیات کو پس و پیش کے ساتھ اس طرح قلمبند کر دینا کہ ان میں "حقائق ثابتہ" یا "حالات مصدقہ" تاریخی "کارنگ پیدا ہو جائے، بہت دشوار ہے، کیونکہ اول تو سرد کے ابتدائی حالات زندگی بالکل تاریکی میں ہیں اور جن واقعات سے تاریخیں لے بحث کی ہے ان میں بہت اختلافات ہیں۔

اس لئے قبل اس کے کہ اصل مسئلہ پر غور کیا جائے یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ مورخین میں سب سے زیادہ قابل اعتبار یہ ہیں کس تذکرہ نویس یا مورخ کا ہوسکتا ہے اور پھر اس کے بیان پر نقد کرنا چاہئے۔ چند سال کا عرصہ ہوا ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جنرل ہیں مولوی عبدالوہابی صاحب کا ایک مقالہ اس موضوع پر شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے تمام افغان تاریخی پر محقق تھرومر کے سرد کے واقعہ و حادثہ سے بحث کی تھی کہ سرد کے ابتدائی حالات معلوم کرنے کا ذریعہ اگر کوئی ہوسکتا ہے تو وہ صرف دبستان مذہب ہے کیونکہ اس کا مصنف خود شہید میں حیدر آباد دکن میں سرد سے ملا تھا اور بعد کے حالات کا علم زمانہ اور رنگ زیب اور عہد ابعد کے تذکرہ اور تاریخوں سے حاصل ہوسکتا ہے اس لئے اب بحث اگر ہوسکتی ہے تو صرف ان بیانات پر جو سرد کی ابتدائی حالات سے متعلق نہیں ہے اور جن میں صرف واقعہ قتل ہی کو اہم سمجھ کر بیان کیا گیا ہے۔

عہد اور رنگ زیب میں صرف دو تذکرہ نویس طاہر نصیر آبادی اور شیرخان لودی ایسے تھے جنہوں نے سرد کے قتل کا حال کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس باب میں انہیں کے بیانات کو زیادہ اہمیت دیکھائی گئی اور بعد کے تذکرہ نویسوں نے انہیں سے حالات لئے ہوں گے اور رنگ زیب کا زمانہ شہید سے ۱۰۶۱ھ تک رہا اور سرد شہید میں شہید ہوئے۔ اس لئے سب سے پہلا تذکرہ جس میں سرد کا حال لکھا گیا۔ طاہر نصیر آبادی کا ہے جو ۱۰۶۱ھ اور ۱۰۶۹ھ کے درمیان لکھا گیا (یعنی قتل سرد کے بارہ تیس سال بعد) اور اس کے بعد شیرخان لودی کا تذکرہ مرآۃ الجناب ہے جو ۱۰۷۱ھ میں (یعنی سرد کے ۲۳ سال بعد) مرتب ہوا، اسی طرح میر حسین دوست سبھلی کا تذکرہ ۱۰۶۳ھ میں لکھا گیا جو ریاض الشرا سے بھی دو برس بعد کا ہے۔ لطف علی کا آشکرہ ۱۰۷۱ھ کا ہے یعنی سرد کے ۱۰ سال بعد لکھا گیا، پھر کہ لطف علی خود ہندوستان بھی نہیں آیا تھا۔

اس لئے قریباً عہد ہونے کے لحاظ سے سب سے زیادہ قابل وثوق تذکرہ شیرخان لودی کا ہے اور مورخوں میں عاقل خاں طوسی جو عہد اور رنگ زیب کا مورخ تھا۔ علاوہ ان کے آثار الامرا اور ریاض المعاریف میں بھی ذکر ہے لیکن ان سب میں باہم کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور ہے۔

مغربی مورخین میں بریکر نے ایک سرسری بیان سرد کے عہد کے عہد اور ان کے قتل ہونے کا کیا ہے۔ منوچی نے البتہ سرد اور داراشکوہ کے تعلق کا بھی ذکر اسی سلسلہ میں کیا ہے۔

ان تمام تذکرہ دں اور تاریخوں کے ذریعہ سے جو حالات سرد کے متعلق معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں :-

سرد شہید تھا لیکن ہم سرد کا عہد سمجھتے تھے۔ تذکرہ دں میں کہیں کہیں کہ سرد کا عہد تھا۔ لیکن سرد کے عہد کے نام سے

پکارا گیا ہے۔ یہ یہودی نسل تھے اور کاشان میں پیدا ہوئے لیکن بعد کے مسلمان ہو گئے۔ علوم حکمیہ کی تحصیل انہوں نے ایباق کے مشر فاضل ماحمد الدین شیرازی، میرزا ابوالقاسم اور دیگر مشہور اساتذہ سے کی اس کے بعد چونکہ تہذیب ان کا خاندانی فدیہ معاشی تھا اس لئے وہ بھی اس طرف مایل ہوئے اور ہندوستان میں شیعہ آکر قیام کیا۔

کار و بلد اچھی طرح چل رہا تھا اور زندگی اطمینان و سکون کے ساتھ بسر ہو رہی تھی کہ ایک بقال زادہ (ایکے چند) پران کی نگاہ چوکنی اور اطمینان نظر میں ان کا توازن عقل و دماغ خراب ہو گیا۔ کار و بار کو یک لحظ ترک کر دیا اور اپنے محبوب کے دروازہ پر جا کر جہیں ساتی میں مصروف ہو گئے ان کو ابھی چند سے کس قدر اور کس انداز کی اُلفت تھی اس کا اندازہ خود سرمد کے ایک شعر سے ہو سکتا ہے جس میں وہ اپنی محبت کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں:-

نمی دانم دریں چرخ کہن دیر خداے من ایسے چندست یا غیر  
چونکہ محبت غیر معمولی تھی اس لئے ابھی چند بھی بہت متاثر ہوا اور رفتہ رفتہ سرمد کی صحبت سے وہ رنگ اس پر چڑھا جس نے یہ شعر اس سے کہلوا دیا:-

ہم مطیع فرقا نم ہم قسین در بہانم ربی بیو دانم، کافر مسلم نام  
چند دن بعد دونوں شیعہ سے روانہ ہو کر دہلی آئے یہ زمانہ شاہجہاں کا تھا۔ چند دن میں سرمد کی شہرت عام ہو گئی اور جو درجوں لوگ ان کی دیارت کو آنے لگے اور انھیں زائرین میں دارا شکوہ بھی تھا جو فطرتاً بڑا فقیر دوست اور وسیع مشرب انسان تھا شاہجہاں نے جب یہ تمام حالات سنے اور اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ سرمد بالکل برہمن رہتا ہے تو اس نے اپنے ایک امیر غلام کو دریافت حال کے لئے روانہ کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص جس کا فلسفہ لباس کے متعلق یہ ہو کہ:-

پہ شانہ لباس ہر کرا عیب بود بے عیبیاں را لباس عربانی داد  
اس نے عنایت خاں کو کیا جواب دیا ہوگا۔ امیر عنایت خاں نے واپس آکر یہ شعر شاہجہاں کے سامنے پڑھا:-

بر سر ہر برہمنہ کلمات تہمت ست کشتے کٹا ہرست از کشف عورت ست  
یہاں یہ کہ سرمد معمولی آدمی ہے اور کشف و کلمات وغیرہ جو اس کی نسبت مشہور ہیں صحیح نہیں۔ جب اورنگ زیب تخت نشین ہوا اور دارا شکوہ قتل ہوا تو طایف عبدالقوی بیچہزاری کو سرمد کے پاس بھیجا گیا۔ اس نے دریافت کیا کہ ”عرباں چرامی باشی“۔ جواب دیا کہ ”شیطان قوی ست“ اور یہ رباعی پڑھی:-

بالائے خوشے کردہ چنین پست مرا چشمے بدو جام برده ازدست مرا  
اور در بغل من ست و من در طلبش وزد بجے برہمنہ کردست مرا

لاہ عبدالقوی کے دل میں ”شیطان قوی ست“ کا ایہام کھٹک رہا تھا اس لئے اس نے علماء کو جمع کر کے قتل کا فتویٰ حاصل کیا اور اورنگ زیب کی منظوری حاصل کر کے غریب کو شہید کر دیا۔

بعض کہتے ہیں کہ مجلس علماء کو خود اورنگ زیب نے طلب کیا تھا اور وہ بھی اس جلسہ میں موجود تھا، سبب قتل کے متعلق بھی اختلاف ہے، بعض نے اس کی وجہ صرف عربانی بیان کی ہے، بعض نے کہا کہ اس کے کلام میں بعض باتیں عقاید اسلامی کے خلاف تھیں اس لئے ان کی بنا پر یہ سزا دی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ جب مجلس میں سرمد طلب گئے تو ان سے سوال کیا گیا کہ تم صرف لاکھ کیوں کہتے ہو۔ اس کے بعد الا اشد کیوں نہیں کہتے۔ انہوں نے کہا کہ میں ابھی اس نضی کے درجہ سے نہیں گذرا اس لئے آگے کی بات کیونکر کہہ سکتا ہوں، یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے اس سے پوچھا کہ ”تم نے تو دارا شکوہ کی سلطنت کے متعلق پیشین گوئی کی تھی وہ کیوں پوری نہ ہوئی۔“ سرمد نے کہا کہ ”سلطنت تو حقیقت میں

داراشکوہ ہی کوئی ہے اور وہ اس مرتبہ کی سلطنت ہے کہ تم وہاں تک پہنچے بھی نہیں سکتے۔

بہر حال اورنگ زیب اور سرد سے گفتگو ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ بالکل یقینی ہے کہ اورنگ زیب کے اشارہ اور منظر سے سرد قتل کئے گئے اور اس میں بھی شک نہیں کہ یہ قتل میرے نزدیک نہ مذہبی تھا نہ سیاسی بلکہ صرف جذبہ انتقام سے متعلق تھا۔

جب سرد قتل گاہ کی طرف چلے تو لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ راستے بالکل بند ہو گئے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اسی وقت انھوں نے چند بایاں اور تصنیف کر کے پڑھیں۔ جب جلاد آتا تو اس نے رواج کے مطابق ان کی آنکھوں پر پٹی باندھنی چاہی، لیکن انھوں نے منع کیا اور یہ شعر پڑھا:۔  
سردہ یار حریاں تیغ ایں دم بہر رنگے کہ آئی می ششاسم  
یہ شعر بھی اسی وقت آپ نے پڑھا۔

شورے شد از خواب عدم چشم کشودیم دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم  
حافل غاں رازی، دربار عالمگیری کا مورخ بیان کرتا ہے کہ جس وقت جلاد قتل کے لئے آدہ ہوا تو سرد نے یہ شعر پڑھا:۔

عربانی تن بود غبار رہ دوست آں نیز تیغ از سراوا کر دند

بعض نے اس شعر کا پڑھنا بیان کیا ہے:۔

سر بریدہ از تنم شونے کہ با یار بود قصہ گو کہ در نہ درد سر بسیار بود  
سرد کے ساتھیوں میں سے ایک شخص شاہ اسد اللہ تھے انھوں نے سرد سے کہا کہ ”کپڑے پہن لو اور کلمہ شہادت پڑھ لو تو ابھی آدہ کر دے جاؤ گے۔“ یہ سن کر سرد نے جواب دیا کہ:

دیرے سچ کہ آوازہ منصور کہن شد من از سر نو جلوہ دہم وار و رسن را

والہ داغستانی نے اپنے تذکرہ ریاض الشعرا میں لکھا ہے کہ:۔

چونکہ سرد نے داراشکوہ کے لئے بادشاہ ہونے کی پیشین گوئی کی تھی اس لئے اورنگ زیب اس سے بہت برہم تھا۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو اس نے ملا قوی قاضی القضاۃ کو بھیجا کہ شکے رہنے کا سبب دریافت کیا جائے، ملا قوی کو چونکہ سرد نے سخت جواب دیا اس لئے وہ چڑھ گئے اور واپس آکر قتل کا فتویٰ تحریر کیا اور اورنگ زیب نے کہا کہ دربار میں طلب کیا جائے اور فضلاء عصر اس سے سوال کریں۔ چنانچہ سرد دربار میں آئے اور منجملہ دیگر سوالات کے کہ ایک سوال اورنگ زیب نے داراشکوہ کے سلطنت کی پیشین گوئی کی نسبت بھی کہا، سرد نے جواب دیا کہ:۔

”اُس کو ابھی سلطنت مل گئی ہے اس لئے میرا وعدہ جھوٹ نہیں تھا۔“ اس جواب نے اورنگ زیب کو اور برہم کر دیا اور آخر کار قتل کا حکم نافذ ہوا۔

سرد جامع مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے قتل ہوئے اور وہیں دفن کئے گئے۔ تمام واقعات پر جس وقت غور کیا جاتا ہے تو یہ بات آسانی سے

سمجھ میں آ جاتی ہے کہ سرد کے قتل کرنے میں مذہبی تعصب کو اس قدر دخل نہ تھا جتنا جذبہ انتقام کو۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ سرد ایک مجذوب صفت انسان

تھا اور عقاید تصوف کے ماتحت بہت وسیع الخیال مشرب رکھتا تھا اور یہ بھی درست ہے کہ اس نے اشعار میں بہت سی باتیں ایسی ظاہر کیں جو

علماء ظاہر کے نزدیک مستوجب سزائش ہو سکتی ہیں، لیکن باوجود ان تمام باتوں کے اس کو قتل کی سزا کا مستوجب شہرنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا

تھا کیونکہ اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو بھی تسلیم کر لیا جائے کہ وہ کافر تھا، تو کیا اورنگ زیب نے سارے کافروں کو یہی سزا دی تھی۔

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ داراشکوہ سرد کا بہت معتقد تھا، چنانچہ وہ اپنی تحریر میں سرد سے بول خطاب کرتا ہے:۔

”پیروم شد من۔ ہر روز قصد ملازمت دارد میر نمی شود۔ اگر من منم پس ارادہ من معطل چڑا اگر من مستقم قصیر مرا قتل امام حسین اگر مشیت ایزدی

ست، پس یزید در جہاں کیست و اگر غیر مشیت ست پس منی یفعل اللہ ایشاء و حکم یزید چیست۔“ نہی مختار بیگ کفار می رفت شکست در

لنگر اسلام می افتاد، علماء ظاہری می گویند کہ تعلیم صبرست، انتہی و تعلیم چہ در کار۔“

مرد اس کا جواب دیتے ہیں:۔ ”انچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم“

الاحدیث دوست لکھنؤ می کہیں

اورنگ زیب داراشکوہ کا جس قدر مخالف تھا وہ تاریخ سے ظاہر ہے اور اس لئے سترہ سے بھی اس کا بہیم رہنا کسی اور تاویل کو نہیں چاہتا داراشکوہ کو وہ مسئلہ میں قتل کرتا ہے اور اس کے تین سال کے بعد اس کے میر سترہ کی زندگی کو بھی ختم کر دیتا ہے تاکہ پھر اس قسم کا کوئی فتنہ پیدا ہی نہ ہو داراشکوہ اور اورنگ زیب کے معتقدات و خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ داراشکوہ صحیح معنی میں اس تحریک پر عامل تھا جسے اگر نے ظاہر کیا تھا اور وہ مذہب کے باب میں حد درجہ آزاد تھا وہ نہایت آزاد خیال صوفی مشرب اور وسیع النظر شخص تھا وہ سمجھتا تھا کہ مذہب نام ہے صرف تزکیہ اخلاق کا اور علو نفس کا، پھر صورت و حالت جس طرح پیدا ہو جائے۔ ایک شخص کے لئے وہی مذہب ہے اور اس کو کسی مخصوص مسلک کا پابند بنانا مناسب ہے، وہ دنیا کے تمام مذاہب و اہل مذاہب کو کیساں سمجھتا تھا، تنہا اسلام ہی کو ذریعہ نجات نہ سمجھتا تھا بظن اس کے اورنگ زیب ایک سخت متعصب مسلمان تھا، علما و ظاہر کی طرح نہایت کاپا بند تھا اور اسلام کا مفہوم سمجھنے میں وہ صرف الفاظ کا متبع تھا۔ اس کا دل تصوف کی چاشنی، عشق کا سوز، محبت و ہمدردی کے گداز سے کیسرے خالی تھا۔ اور وہ سمجھتا تھا کہ ہر شخص کا فطری فرض ہے کہ وہ مسلمان ہو اور شریعت اسلامی ہی کا پابند ہو کر زندہ رہے۔ اسی کے ساتھ اگر رقابت سلطنت کو بھی شامل کر لیا جائے جو اورنگ زیب اور داراشکوہ کے درمیان قائم تھی تو ان دونوں میں منافرت کا نہایت شدید ہو جانا مستبعد نہیں داراشکوہ کو اورنگ زیب کا قتل کر دینا گو انسانی نقطہ نظر سے اچھا نہ ہو لیکن سیاسی زاویہ نگاہ سے اس کو قابل ملامت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسی طرح سترہ کے باب میں اگر یہ امر متحقق ہو جائے کہ اس کا قتل بالکل سیاسی تھا تو اورنگ زیب قابل ملامت نہیں ٹھہرتا۔ لیکن جس وقت اس زمانہ کے حالات پر نگاہ کی جاتی ہے تو ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ داراشکوہ کے معاملہ میں اورنگ زیب خواہ کتنی ہی راستی پر ہو لیکن سترہ کے معاملہ میں اس کی حیثیت ایک سفاک قاتل سے زیادہ نہیں ٹھہرتی۔

داراشکوہ کو قتل ہوئے تین سال کا زمانہ گزر جاتا ہے، اورنگ زیب کا تسلط عام ہو جاتا ہے اور کوئی شخص ایسا باقی نہیں رہتا جس کی طرف سے اندیشہ بغاوت ہو، اس لئے ایسی حالت میں اگر اورنگ زیب سترہ ایسے انسان کے قتل کو جائز رکھتا ہے جو دنیا سے علوہ و اس سے بیگانہ مجاہدوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہے، جس کا مقصود امن و سکون کے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا، تو کون کہہ سکتا ہے کہ اورنگ زیب نے اس کو استحکام سلطنت کے خیال سے قتل کرایا۔ یقیناً سترہ کا قتل اسی بغض و عناد سے وابستہ تھا جو داراشکوہ کی طرف سے اس کے دل میں جاگزیں ہو گیا تھا اور وہ اسی انسانی کمزوری کے ماتحت جو بڑے بڑے انسان کے دل میں کبھی نہ کبھی معصیت کا تخم بوسکتی ہے، مجبور ہو گیا کہ سترہ کو بھی قتل کر کے اپنی آفتش انتقام کو پوری طرح بجھا دے۔

سترہ کے حالات زندگی، سترہ کی حقیقت اور سترہ کے اقوال و افعال یقیناً اس سے بہت بلند تھے کہ اورنگ زیب ایسا ظاہر پرست، مقلد الفاظ، پابند ظواہر، خشک و عبوس انسان ان کو سمجھ سکتا، اس لئے اس کو سترہ کے الفاظ میں قابل گرفت باتیں نظر آ جانا یقینی تھا۔ اور صدر دل پیرانے کینہ سے لہریں تھا ہی، اور ظاہری تاویل کے لئے سترہ کے بعض الفاظ بھی بل گئے، اس لئے اس کو وہی کرنا چاہئے تھا جو ایسے تنگ نظر بادشاہوں نے ہمیشہ کیا ہے اور کریں گے۔

سترہ پر قربانی کا الزام رکھنا، لالہ کو جمع بنانا، یہ تو صرف بہانہ تھا ورنہ اصل سبب تو وہی تھا جسے اورنگ زیب کے خدا اس سوال نے ظاہر کر دیا جو داراشکوہ کی سلطنت کی پیشین گوئی کے متعلق طعن کی صورت میں سترہ سے کیا گیا تھا اورنگ زیب نے ظاہری شریعت کی آڑ سے مل کر اپنے طبعی اطمینان کو بہت کچھ چھپا دیا۔ لیکن دل کا کٹنا آخر کار ان سے نکل کر رہا اور وہ کھلے دربار میں اپنی اس فاش کے ظاہر کرنے سے باز نہ رہ سکا جو اس سے تین سال قبل داراشکوہ ایسے مکمل انسان کا خون پی چکا تھی۔

اورنگ زیب کے واقعات حیات و سلطنت خواہ کتنے ہی قابل تعریف کیوں نہ ہوں، لیکن سترہ کا واقعہ قتل ایک ایسا دھبہ ہے جس کو کسی تاویل سے بھی اس کے دامن کا زینت قرار نہیں دے سکتے۔

## افسانہ

## بیات بریلوی

لے رہے تھے سرمئی بادل ابھی انگڑائیاں سو رہی تھیں موج دریا کو لئے گہرائیاں  
 مستیوں پر چھا رہی تھیں حسن کی رعنائیاں جیسے اوپر والیوں کی زلف کی پرچھائیاں  
 ٹھٹھ حسینوں کے گلے تھے گومتی کے گھاٹ پر  
 ہڈیوں کی ایک گھمڑی سی پڑی تھی ٹھاٹ پر  
 ضعف کے بھونڈے شکنجے میں گھنٹی تھی تن کی کھال جھڑیوں کے جال میں جکڑا ہوا سہا ہال ہال  
 صورتِ مڑگاں سہا لیزاں ناتواں دہتِ سوال کس قدر سہا روح فرسا زندگانی کا آل  
 درمیانِ قعرِ حسرت موجِ خوں بہنے لگی  
 زیرِ لب یوں مسکرا کر بے کسی کہنے لگی  
 اُس طون منہ پھیر کر جاتا ہے کیا اے جوالو تو نے کب دیکھا مری امٹتی جوانی کا سماں  
 کہ رہے ہیں کاروانِ عمر رفتہ کے نشان سرمۂ چشمِ حسیناں ہے غبارِ کارواں  
 اب کہاں وہ رتِ سہالی وہ بہارِ اندر بہار  
 سازِ ہستی کا ہے ٹوٹا ہوا سہرا کھٹ تار  
 خود بھوک کر بجلیوں نے پھونک ڈالا آشیاں آشیاں کا ڈکر کیسا گلستاں کا گلستاں  
 کائناتِ حسن ہے سجدہ کہ رنگِ خنداں سرنگوں ہے دورِ ماضی کا نشانِ ضوفاں  
 خارِ زارِ غم سے یوں آگیا ہے تارِ زندگی  
 زندگی ہے فی الحقیقت اک خیرِ زندگی  
 کس سے کہئے کون سنتا ہے کسی کی داستاں خامشی میں سمعِ ساں جلتی ہے کائناسی زباں  
 بچکیوں کا تار بندھتا ہے دم ضبطِ فغاں گھٹ کے رہ جاتا ہو جیسے شب کی آہوں کا دھواں  
 مجھ سے برگشتہ زمیں ہے آسماں بدلا ہوا  
 دل مگر کہتا ہے پھر بھی جو ہوا اچھا ہوا  
 ساتھ لائی تھی جوانی محشرِ صد کارِ زورِ خلوتوں کو تھی کسی کی شرکتوں کی جستجو  
 رنگ لایا رکتہ رکتہ اجتماعِ رنگ و بو آگیا دامِ تمنا میں حریفِ فتنہ جو  
 ایک سہا عنوان گو کہنے کو تھے افسانے دو  
 ایک تھی دیوانگی کہنے کو تھے دیوانے دو  
 روگھا تشنہ نگاہِ شوخِ لعلِ باقی ہوئی رہ گئی دلِ تمام کر کھوئی سی شہزادی ہوئی  
 لب پہ آتی تھی دعائے شوقِ گہرائی ہوئی ہاتھ آجاتی یہ دولت ہاتھ سے جاتی ہوئی  
 جماعتی تھیں شامتیں بابِ اجابت کھول کر  
 طائرِ دل پھر پھڑپھڑاتا رہ گیا پرتول کر

اس کے لو دیتے نفس کی بھلیاں تڑپا گئیں کہا کہوں جھوٹی لگاؤٹ کی ادائیں سجا گئیں  
حسن کی شمشیری بہا رہی خود بخود گر گئیں مستیوں کی ہڈیاں ہرا کے دل پر چھا گئیں  
اس میں کچھ دل کی خطا تھی اور نہ آنکھوں کا قصور  
فی الحقیقت تقایہ سب ظالم جوانی کا فتور

مجھ سے باغی دم زدن میں دل بکھر کر ہو گیا آج آنے تک دھوئیں سے موم پتھر ہو گیا  
ہوتے ہوتے اس قدرتِ بو سے باہر ہو گیا غیر کے حق میں مسیحائی کا خوگر ہو گیا  
میں نے تسکینِ وفا دشمن پہ تکیہ کر لیا  
یوں عذابِ دہر سے ٹٹ ٹٹ کے دامن بھر لیا

کانپ اٹھا آسماں گویا زمیں تھتراتی گئی جب بہجھم رنگ و بو سے یک بیک گھبرا گئی  
روکنا چاہا مگر آواز ہی بھتراتی گئی مختصر یہ ہے کہ راوِ خیر سے کترا گئی  
مند گئیں پل بھر کو آنکھیں ہوش تک جاتا رہا  
دم مگر گھٹ گھٹ کے بھی جاتا رہا اتنا رہا

مجھ سے منہ موڑا بالآخر باقی بیدار دے بخت بگڑا جب وفا کی خود مرے صیاد نے  
ہونے والی ماں کو چھوڑا مادرِ ناشاد نے خود فروشی کا سبق سیکھا دلِ برباد نے  
اس کے پھرتے ہی قیامت سی قیامت آگئی  
آج در در ٹھوکریں کھانے کی نوبت آگئی

تھی گزارے کی جہاں میں گرچہ صورت اور بھی تھی مجھے اس کے سوا لیکن ضرورت اور بھی  
میرے حقے کا تھا کچھ ہارِ ندامت اور بھی جھانکنے کو رو گئے تھے قعرِ ظلمت اور بھی  
گر مہی بازار طاری تھی مرے مقسوم پر  
بھٹ پڑی دوشیزکی سی عصمتِ محرم پر

بن کے فردوسِ نظر گھٹکی بربکِ خار بھی تھی بیک جلوہ سراپا نور بھی اور نار بھی  
مسکراہٹ کی کرن بھی آنسوؤں کا تار بھی کشتہ شمعِ حرم بھی سندِ زنا ر بھی  
خود پر تیغِ ہوس حوا کے قاتل بچھ گئے  
یعنی میری راہ میں آنکھیں کھلیں دل بچھ گئے

ہوتے ہوتے خونِ عصمت بچھ گئی خیرت کی لاش دل کا آئینہ ہوا پھر ٹھوکر دل سے پاش پاش  
یوں جو خالی پیٹ سے نکلی صدائے دُخراش اپنے کانوں سے سنا ہے میں نے حکمِ دربارش  
سر سے اونچا ہو گیا پانی میں پیاسی رہ گئی  
مگر مجبوری کے عوض تیں اک اُداسی رہ گئی

ایک دن جب غلوٹوں سے دل کا طرفہ رنگ تھا بیسے کوئی ڈھونڈھتا پھرتا ہو کچھ کیویا ہوا  
میرے کوٹھے پر مرا شیطان کھنچ کر آ گیا یک بیک چھاتی پہ میری ایک پتھر سا لگا  
دامنِ عصیان سے دھوئے گوسہ کارِ رگے داغ

عمر رفتہ کا بھڑک کر رہ گیا دھندلا چراغ ہو گیا تازہ پل صدف جاگ کا ایک ایک داغ  
عمر گزری دیکھتے حرص و ہوس کے سبز باغ بھرتے بھرتے بھر گیا کافر جوانی کا ایلاغ  
آخر شب دفعتاً یوں ختم افسانہ ہوا  
کل جو دیوانہ تھا اپنا آج بیگانہ ہوا  
بھی رہی ہوں بھونگن باقی ہیں کچھ کرنی کے پھل یوں تو قسمت کا کھٹا کہنے کو ہوتا ہے اٹل  
بخش دے شاید ترس کھا کر خدا کے عزوجل کہتے کہتے ہو گئی وہ نقشِ آغوشِ اجل  
سوچتا ہوں تری رحمت جوش میں کب آئے گی  
کہا یہ قربانی بھی یارب رائیگاں ہی جائے گی

## ماضی اور حال

(رضا قریشی گوالیار)

اک وہ عالم تھا خواں بن کے بہار آتی تھی سنگریزوں سے ہوا کرتی تھی خوشبو پیدا  
لیکن اب ہے نگشتاں نہ شبِ بامِ کین اب نہ پھولوں میں ہو گشت نہ ستاروں میں ضیا  
نظر آتا تھا ہر اک چیز میں فطرت کا جمال پاس کی صورتیں اب دور کی تصویریں ہیں  
عہد رفتہ کے جو سورج تھے وہ اب ڈرے ہیں کہکشاں تھیں جو بہاریں وہی زنجیریں ہیں  
ڈھونڈتی رہتی تھیں طوفانوں کی اکثر نظریں اب تو ساحل کے سکوں سے بھی لرز جاتا ہوں  
چوٹ لگتی تھی تو آتا تھا تبسم مجھ کو، اب تبسم کی جگہ اشک ہی برساتا ہوں  
ہو صدا کوئی مگر گوشِ بر آواز ہوئی میں کوئی افسانہ ہو، ہوتا تھا افسانہ اپنا  
ماہِ دہختم یہ بہاریں یہ شفق تھی اپنی راتیں اپنی تھیں دن اپنے تھے زمانہ اپنا  
مرکزِ لطف و مسرت نظر آتا تھا ہلال! صبح آتی تھی تو فردوس کی خوشبو لکڑی  
پہلے آتی تھی تو لاتی تھی تبسم اکثر۔ عید آتی تو ہے اب بھی گھر آتسو دیکھو!!!؟  
کھو گئی حال کی دنیا میں وہ فردوس جہیں مٹ گئی غم کی سیاہی میں تمنا میری  
اب بھی محسوس یہی ہوتا ہے گلزاروں میں جیسے ہر پھول کی خوشبو میں ہے دنیا میری  
جھکنے لگتی تھی جہیں ہر نئے احساس کے ساتھ حرم و دیر کے سجدوں کا بھلا ذکر ہی کیا  
اب کچھ اس طرح گمراہ گئے ویراں ہو کر جیسے دنیا میں نہیں کوئی بھی دنیا کا خدا  
نہ وہ بسیمیں نہ وہ راتیں نہ وہ خوشبو نہ وہ گل زنجی سہی ہے زمانے کی ہر اک چیز رضا  
سچ تو یہ ہے وہی جینا تھا حقیقی جینا اب اس غم سے سراپا خلش و یاس ہوں میں  
تجربے زیست کے پھر حال میں کچھ ہو نہ سکے اپنے ماضی ہی کا مجموعہ احساس ہوں میں

